یوجنا



ل ۱۹۹۶ء

روپے

عباس آصف جاہ

جواہر روزگار یوجنا

ہندوستان ترقی پذیر ملک ہے اور یہ ایسے مسائل سے دوچار ہے جو کسی ترقی پذیر ملک کو عام طور پر لاحق ہوتے ہیں۔ ایک طرف وسائل کی کمی ہے دوسری طرف بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ آبادی میں ہونے والا مسلسل اضافہ اکثر ترقیاتی کاموں کے مثبت اثرات کو زائل کر دیتا ہے۔ بے روزگاری کا مسئلہ ساری دنیا میں ہے اور ترقی یافتہ دنیا بھی اس کی زد سے باہر نہیں ہے لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں غریب افراد کی بڑی تعداد موجود ہو روزگار کے نئے مواقع کی دستیابی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

شہری علاقوں کے مقابلے دیہات میں روزگار کے مواقع پیدا کرنا زیادہ اہم کام ہے۔ بے روزگار شہروں اور دیہات دونوں جگہ ہیں لیکن شہروں میں خاص کر بڑے شہروں میں روزگار کے مواقع کثیر تعداد میں موجود ہوتے ہیں لیکن دیہات میں روزگار حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اسی لیے روزگار کے نئے مواقع پیدا کرنے والی اسکیموں میں دیہی علاقوں پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔

آج ہماری گفتگو کا موضوع ہے "جواہر روزگار یوجنا"، جو حالیہ برسوں کی سب سے اہم اسکیم ہے۔ اس اسکیم کا خاص پہلو یہ ہے کہ یہ دیہی ترقی کی دو اسکیموں کا مجموعہ ہے۔ ساتویں منصوبے کے آخری برس میں یکم اپریل ۱۹۸۹ء کو روزگار کے دو پروگراموں قومی دیہی روزگار پروگرام اور بے زمین دیہی افراد کے روزگار کے پروگرام کو ملا دیا گیا۔

جواہر روزگار یوجنا کا مقصد دیہی علاقوں میں عورتوں اور مردوں کے لیے مزید سودمند روزگار کے مواقع پیدا کرنا ہے۔ اس اسکیم کے دیگر مقاصد میں دیہات میں بنیادی معاشی ڈھانچے کو مضبوط کر کے روزگار کے پائیدار مواقع پیدا کرنا/ دیہی عوام کے لیے اجتماعی اثاثے پیدا کرنا/ مشاہرے میں اضافہ کرنا اور دیہی علاقوں میں معیار زندگی میں بحیثیت مجموعی بہتری لانا۔

جواہر روزگار یوجنا کا اصل مقصد ان لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہے جو غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل اور آزاد ہوئے بندھوا مزدوروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت ۳۰ فی صد روزگار کے مواقع خواتین کے لیے مخصوص ہیں۔ جواہر روزگار یوجنا مرکزی حکومت کی اسکیم ہے جس کا نفاذ ریاستی حکومت کرتی ہے۔ اس اسکیم پر آنے والا ۸۰ فی صد خرچہ مرکزی حکومت برداشت کرتی ہے جب کہ ۲۰ فی صد خرچہ ریاستی حکومت کرتی ہے۔

پسماندہ اضلاع میں روزگار کی دیہی اسکیموں پر عمل درآمد کے دوران حاصل شدہ تجربے کی بنیاد پر ۹۴-۱۹۹۳ء سے جواہر روزگار یوجنا پر نظر ثانی کی گئی۔

جواہر روزگار یوجنا کے تین پہلو ہیں۔ پہلی اندرا آواس یوجنا اور دس لاکھ کنوؤں کی ضمنی اسکیمیں ہیں۔

دوسری ۱۲۰ ایسے اضلاع کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں پسماندگی نسبتاً زیادہ ہے۔ ان اضلاع میں جواہر روزگار یوجنا پر زیادہ تیزی سے عمل درآمد کیا جائے گا۔

روزگار کی اس اسکیم کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ خصوصی اور نئے پروجیکٹ شروع کیے جا رہے ہیں۔

جواہر روزگار یوجنا کے اول حصے کے تحت ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کو وسائل کی تقسیم ان علاقوں میں دیہی غریب افراد کی تعداد کے تناسب سے ہوتی ہے۔ کسی علاقے کی پسماندگی کا اندازہ وہاں درج فہرست ذاتوں اور قبائل کی آبادی، ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ پہلے حصے کی دو ضمنی اسکیموں اندرا آواس یوجنا اور ملین ویلز اسکیم کے لیے بالترتیب دس اور بیس فی صد رقم رکھی گئی ہے۔ ان دونوں ضمنی اسکیموں کا انتظام و انصرام ضلع پریشد کے تحت ہوتا ہے۔ اندرا آواس یوجنا اور کنویں کھودنے والی اسکیم کے علاوہ بقیہ رقم اضلاع کی مختلف دیہی پنچایتوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔

اندرا آواس یوجنا کا مقصد درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کے افراد نیز آزاد ہوئے بندھوا مزدوروں کو مفت مکانات فراہم کرنا ہے۔ اس اسکیم پر نفاذ ۸۶-۱۹۸۵ء سے جاری ہے۔ اس وقت یہ یوجنا دیہات میں روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی اسکیم کے تحت آئی تھی۔ ۹۴-۱۹۹۳ء سے اندرا آواس یوجنا کے دائرہ میں وسعت پیدا کی گئی اور اس سے فائدہ اٹھانے والوں کی فہرست میں دیہات کے ان غریب افراد کو بھی شامل کیا گیا جن کا تعلق درج فہرست ذاتوں یا قبائل سے نہیں ہے۔

اندرا آواس یوجنا کے تحت درج فہرست

باقی کور ۳ پر

سی۔۱۹۷، قدوائی نگر ایسٹ، نئی دہلی

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر عابد کرہانی

سب ایڈیٹر ڈاکٹر توحید خان

فون 6177591

تزئین و کتابت افتخار احمد خان

سرورق جتندر سنگھ

جلد : ۱۶ شمارہ : ۱

اپریل ۱۹۹۶ء (۱۲ چیتر تا ۱۰ بیساکھ شک ۱۹۱۸)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن انچارج : کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتا:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴، لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (ساؤتھ) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"
منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

پروفیسر نسیم احمد زیدی

نئی معاشی پالیسی اور اقلیتی صنعت کار

ملک میں سرکاری اور نجی حلقوں میں روزگار کے محدود مواقع کو مدنظر رکھتے ہوئے اقلیتوں کی معاشی فلاح کے لیے ضروری ہے کہ وہ صنعت و تجارت میں ترقی کریں۔ جولائی ۱۹۹۱ء میں شروع کی گئی نئی صنعتی پالیسی سے ملک میں ایک نیا صنعتی ماحول شروع ہوا ہے۔ اقلیتوں بالخصوص سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کی صنعتی ترقی کے لیے اس نئے ماحول سے ہم آہنگی ضروری ہے۔ نئی معاشی پالیسی جس کے خاص عنصر بندشوں کو نرم بنانا (LIBERALISATION) زیادہ مقابلے کے حالات پیدا کر کے پیداواروں کی مقدار اور قسم میں بہتری کرنا اور ملک کی صنعتوں کو عالمی سطح کا بنانا (GLOBALISATION) وغیرہ ہیں یہ تب ہی ممکن ہیں جب کہ ملک میں مہم جوئی (ENTREPRENEURSHIP) کو فروغ دیا جائے اور صنعتی کمزوریوں کو دور کیا جائے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نئے صنعتی ماحول میں اقلیتی صنعت کاروں کو کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے تاکہ وہ دوسرے صنعت کاروں کے ساتھ شانہ بشانہ ترقی کر سکیں۔

ہندوستان میں بڑی صنعتوں میں اقلیتی صنعت کاروں کا حصہ نہیں کے برابر ہے۔ یہ لوگ صرف گھریلو صنعتوں، بہت چھوٹی صنعتی اکائیوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں پر ہی قابض ہیں۔ سرکار ان درجوں کی صنعتوں کو کچھ خصوصی سہولتیں دیتی ہے۔ اس لیے ان صنعتوں کی درجہ بندی کے بارے میں کچھ جاننا ضروری ہے۔

گھریلو صنعتوں میں ان صنعتوں کو شامل کیا جاتا ہے جن میں عموماً خاندان کے افراد کام کرتے ہیں۔ اکثر کاروبار گھر میں ہی ہوتا ہے۔ گھر کے افراد کے ساتھ ساتھ اجرت پر بھی افراد کام کرتے ہیں۔ آگرہ میں جوتوں کا کاروبار، علی گڑھ، مرادآباد، فیروزآباد اور مرزاپور وغیرہ میں علی الترتیب تالے، پیتل کا سامان، کانچ کا سامان اور دری و قالین کی صنعتیں اس درجہ میں رکھی جا سکتی ہیں۔

صنعتوں کا دوسرا حلقہ ہے بہت چھوٹی (TINY) اکائیاں اس میں وہ اکائیاں شامل ہیں جن میں مجموعی سرمایہ کاری ۵ لاکھ روپیوں سے کم ہے۔ سرکار ان دونوں حلقوں کی صنعتوں میں قرضے، خام مال اور مال کی بکری کے سلسلہ میں کچھ خصوصی ترجیح دیتی ہے۔

چھوٹی صنعتی اکائیوں میں ان اکائیوں کو شامل کیا جاتا ہے جن میں سرمایہ کاری ۵ لاکھ روپیوں سے زیادہ اور ۲۰ لاکھ روپیوں سے کم ہے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں روزمرہ کے کاموں میں آنے والی اشیاء جیسے کپڑا، ٹیلی ویژن، کپڑے دھونے کی مشین اور بجلی کا سامان وغیرہ ہزاروں اشیاء تیار ہوتی ہیں۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو اکثر صرف ایک بار ہونے والے فائدے جیسے زمین اور مشینیں حاصل کرنے کی سہولت، بجلی کا کنکشن وغیرہ کی سہولت دی جاتی ہے جب کہ بہت چھوٹی اکائیوں کو بار بار حاصل ہونے والی سہولتیں جیسے کم سود پر قرضے، خام مال کی دستیابی اور کام کرنے والوں کے قوانین میں ڈھیلا پن اور اس حلقے میں پیدا کی جانے والی اشیاء کی سرکاری خرید میں ترجیح وغیرہ کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔

چھوٹے پیمانے اور گھریلو صنعتوں کے نئی صنعتی پالیسی کا اعلان ۶ اگست ۱۹۹۱ء کو کیا گیا۔ اس سے پہلے اسی سال ۲۴ جولائی کو بڑے پیمانے کی صنعتوں کے لیے نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا۔ نئی صنعتی پالیسی کا اہم مقصد صنعتوں پر عائد مختلف بندشوں کو ڈھیلا کرنا (LIBERALISATION) ہے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

(الف) اگر کسی صنعتی اکائی میں سرمایہ کاری کی رقم ۱ لاکھ روپے سے زیادہ تھی تب ۱۹۹۱ء سے پہلے ان صنعت کاروں کو کام شروع کرنے سے پہلے سرکار سے لائسنس لینا پڑتا تھا۔ نئی پالیسی میں ۱۵ اشیاء کے علاوہ جن میں چینی، سگریٹ اور دیگر تمباکو کی اشیاء، شراب، گولہ بارود اور دوائیاں وغیرہ شامل ہیں۔ دوسری اشیاء پر لائسنس ختم کر دیا گیا ہے۔ ان اشیاء میں بھی چھوٹے پیمانے کی صنعتوں جن میں سرمایہ کاری ۱۵ لاکھ روپے سے کم ہے ان میں لائسنس کی ضرورت نہیں۔ ایسے صنعتی اکائیوں کو صرف ضلع کے صنعتی مرکز پر رجسٹریشن کرانا پڑتا ہے۔

(ب) ۱۹۹۱ء سے پہلے صنعتوں کو خام مال اور مشینیں درآمد کرنے کے لیے لائسنس

شعبہ معاشیات۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

لینا پڑتا تھا، اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(ج) دوسرے ممالک سے تکنیکی معلومات فراہم کرنے کے لیے اب سرکار سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

(د) صنعتوں کے جن دائروں میں اب بھی سرکار کا دخل ہے ان میں طریقوں کو آسان بنایا گیا ہے اور افسران کے دخل کو کم کیا گیا ہے۔

(ہ) قرضوں کی فراہمی کو آسان بنایا گیا ہے۔

(و) کسٹم اور آب کاری محصولوں میں بھاری کمی کی گئی ہے۔

ان بندشوں کو ڈھیلا کرنے سے جہاں دیگر صنعت کاروں کے ساتھ اقلیتی بالخصوص مسلم صنعت کاروں کو فائدہ ہوا ہے وہاں سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ نئے صنعتی ماحول میں مقابلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اس مقابلے میں وہی صنعت کار پنپ سکتے ہیں جو موجودہ سہولتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور محنت اور جانفشانی سے دوسرے صنعت کاروں سے مقابلہ کریں۔ اس مضمون کا خاص مقصد ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے جن سے اقلیتی صنعت کار دوسرے صنعت کاروں سے مقابلہ کر سکتے ہیں اور نئے صنعتی ماحول میں ترقی کر سکتے ہیں۔

۱۔ قرضوں کی سہولتیں

جدید صنعتوں میں اتنے زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے کہ بغیر قرضوں کے صنعتیں قائم کرنا مشکل ہے۔ کمرشیل بینک سے لیے جانے والے قرضوں میں سود کی شرح بہت اونچی ہوتی ہے۔ اس لیے شہروں میں غیر سودی بینک کے تجربات ضروری ہیں۔ لیکن یہ بینک اتنی زیادہ رقم فراہم نہیں کر سکتے جتنی جدید صنعتوں کو ضرورت ہے۔ اس لیے ہمیں سرکار کے ذریعہ فراہم کی گئی سہولتوں کا بہتر استعمال کرنا چاہیے۔ قرضوں کے کے لیے اقلیتوں کو دو قسم کی سہولتیں دستیاب ہیں۔

(الف) وہ سہولتیں جو خصوصاً اقلیتوں کے لیے ہیں۔

(ب) عام سہولتیں جو سب کو دستیاب ہیں۔

الف: اقلیتوں میں پچھڑے طبقے کے لوگوں کو سرمایہ کاری میں مدد دینے کے لیے ۵ سو کروڑ روپے کے سرمائے سے ۹۵-۱۹۹۴ء میں سرکار نے (NATIONAL MINORITIES DEVELOPMENTS CORPORATION) قائم کیا۔ اس کارپوریشن کے ذریعہ سے کچھ صنعتوں جیسے آٹے کی مل، لوہے کی گرل اور دروازے بنانے کی ورک شاپ و تجارت جیسے سلے سلائے کپڑوں کا کاروبار، ویڈیوگرافی، ٹائپ سروس موٹر کار ورک شاپ، پی سی او/ آئی ایس ڈی کی سہولت، ڈرائی کلینک شاپ اور الیکٹرو اسٹیٹ سروس وغیرہ کے لیے قرض کی سہولت دی جاتی ہے۔ اس اسکیم میں ۵ لاکھ روپیہ تک کا قرض مل سکتا ہے۔ پوری لاگت کا ۷½ فی صد حصہ مالک کو لگانا ہوتا ہے اور ۹۲½ فی صد حصہ پر سود کی شرح ۶ فی صد سے ۷½ فی صد تک ہوتی ہے۔

ب: اپریل ۱۹۹۰ء سے لکھنؤ میں صوبائی صنعتی ترقی کا بینک (STATE INDUSTRIAL DEVELOPMENT BANK OF INDIA) قائم کیا گیا جس کا مقصد صوبے میں چھوٹی صنعتوں کو سرمایہ فراہم کرنا ہے۔ یہ بینک خاص طور سے صنعتوں کو جدید بنانے اور تکنیکی سطح کو اوپر اٹھانے کے لیے قرضے دیتا ہے۔ اس بینک کے ذریعہ دو پروگرام جاری ہیں۔

۱۔ نیشنل اکوِٹی فنڈ اسکیم

اس اسکیم کا آغاز ۱۹۸۷ء میں ہوا۔ اس کا مقصد بہت چھوٹی صنعتی اکائیوں کی توسیع تنوع اور جدید بنانے کے لیے حصہ پونجی (SHARE CAPITAL) فراہم کرنا ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء سے پہلے اس اسکیم میں ان اکائیوں کو مدد ملتی تھی جن کی کل لاگت ۵ لاکھ روپے سے کم ہو۔ لیکن ۱۹۹۲ء میں اس حد کو بڑھا کر دس لاکھ روپے کر دیا گیا ہے۔

۲۔ سنگل وِنڈو اسکیم (SINGLE WINDOW SCHEME)

اس اسکیم میں SIDBI/SFC تجارتی بینکوں سے ان صنعتی اکائیوں کو جن میں کل سرمایہ کاری ۵۰ لاکھ روپے تک ہے۔ زمین، کارخانے کی عمارت، مشینیں اور دیگر چیزوں میں سرمایہ کاری کے لیے قرضے دلاتے ہیں۔ اترپردیش میں ۹۴-۱۹۹۳ء میں ضلع اور کمشنری کی سطح پر کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ ان کمیٹیوں کو فیصلے لینے کے کافی اختیارات دیے گئے ہیں، جس سے اس اسکیم کے تحت آسانی سے قرضے مل سکیں۔ یہ اسکیم سبھی ضلعوں میں رائج ہے۔ قرضے دینے میں دیہی صنعتوں، بہت چھوٹی صنعتی اکائیوں (TINY SECTOR) اور دیگر چھوٹے پیمانے کی اکائیوں کو بالترتیب ترجیح دی جاتی ہے۔

ان اسکیموں کے علاوہ ضلع صنعتی مرکز NABARD اسکیم کے تحت بہت چھوٹی اکائیوں اور چھوٹی اکائیوں کے قائم کرنے کے لیے دس لاکھ روپے تک کے قرضے مقامی تجارتی بینکوں کے ذریعہ فراہم کراتا ہے۔ ان قرضوں کا مقصد دستکاری کو فروغ دینا ہے۔

پچھڑی ذاتوں کے سبھی افراد کے لیے یوپی میں BACKWARD CASTES FINANCE AND DEVELOPMENT CORPORATION قائم کیا گیا ہے۔ یہ ادارہ پچھڑی ذات کے لوگوں کو جن کی سالانہ آمدنی دیہی علاقوں میں ۱۱ ہزار روپے اور شہری علاقوں میں ۱۱۸۵۰ روپے سے کم ہے۔ صنعتوں، تجارت اور کاروبار قائم کرنے کے لیے بے روزگار لوگوں کو جن کی عمر ۱۸ سال اور ۵۰ سال کے درمیان ہے اور کاروبار میں ایک لاکھ روپے سے کم لگ رہا ہے تب لاگت کا ۹۲½ فی صد۔ ۷ فی صد سالانہ سود پر قرضے فراہم کرتا ہے۔ ہر ضلع میں یہ اسکیم محکمہ سماجی بہبود (SOCIAL WELFARE DEPARTMENT) کے ذریعہ چلائی جاتی ہے۔

۲۔ کوالٹی کنٹرول

سخت مقابلے کی حالت میں بازار میں صرف ان اشیا کی مانگ ہوتی ہے جن کی قسم بہتر ہو اور سامان کم لاگت پر پیدا کیا جائے۔ نئی معاشی پالیسی میں اشیا کی قسم بہتر بنانے کے لیے کئی سمتوں میں کام کرنا ضروری ہے۔

(الف) صنعتوں کو جدید بنانا

یو پی صنعتی ڈائریکٹوریٹ صنعتوں کو جدید بنانے، ان کی قسم کو بہتر بنانے اور پیداآوری میں اضافہ کرنے کے لیے سہولتیں دیتا ہے۔ خواہشمند صنعت کار ضلع صنعتی مرکز کی معرفت اس کی عرضی یو پی ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کو بھیج سکتے ہیں۔ یہ سہولت ان صنعت کاروں کو حاصل ہے جن کی صنعتی اکائی کم سے کم پانچ سال سے ضلع صنعتی مرکز میں رجسٹرڈ ہے۔ اس اسکیم میں حسب ذیل سہولتیں دستیاب ہیں۔

۱۔ ۵ سال تک ۲ ہزار روپیہ سالانہ قرض صرف ۴ فی صد سود پر حاصل ہو سکتا ہے۔

۲۔ نئی مشینیں لگنے کے بعد ایسے خام مال میں جو آسانی سے دستیاب نہیں ہے ہر سال ۲۰ فی صد کا اضافہ کر کے دیے جانے کا بندوبست ہے۔

۳۔ چیزوں کی قسم کی جانچ کرنے والی مشینوں اور اوزاروں کی خرید پر ۵۰ فی صد (زیادہ سے زیادہ ۵ ہزار روپے) کی رقم امداد میں دی جاتی ہے۔

NATIONAL SMALL INDUSTRIES CORPORATION (NSIC) نئی معاشی پالیسی کے تحت صنعتی اکائیوں کو جدید بنانے میں مدد دے رہا ہے۔ یہ ادارہ آسان قسطوں پر درآمد کی گئی مشینیں فراہم کرتا ہے۔ یہ ادارہ نئی قسم کی مشینیں بنا کر بھی صنعتوں کو دستیاب کراتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال ۴۰۰۰ کاریگروں کو نئی مشینوں کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور ہر سال دس قومی اور ۱۰ بین الاقوامی میلوں میں شرکت کر کے نئی تکنیک حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سبھی بڑے شہروں میں NSIC کی شاخیں موجود ہیں۔

(ب) اچھے قسم کے خام مال کا استعمال

کسی چیز کی قسم کافی حد تک اس بات پر منحصر ہے کہ سامان کی پیداوار میں کس کا خام مال استعمال کیا گیا ہے۔ صنعت کاروں کو چاہیے کہ عمدہ سے عمدہ خام مال استعمال کریں تاکہ دوسرے صنعت کاروں سے مقابلے میں ان کے سامان کی ہی مانگ ہو۔

نئی معاشی پالیسی میں نرم رویہ (LIBERALISATION) کی وجہ سے کسٹم محصول میں بھاری کمی کی گئی ہے۔ اب خام مال اور مشینوں کو کم محصول دے کر درآمد کیا جا سکتا ہے۔ کسٹم محصول کی زیادہ سے زیادہ شرح جو ۱۹۹۰ء میں تین سو فی صد (بے داغ فولاد پر) تک تھیں۔ ۱۹۹۵-۹۶ء کے مرکزی بجٹ میں اس کو گھٹا کر ۵۰ فی صد کر دیا گیا ہے۔ اب مصنوعی دھاگے کے خام مال پر کسٹم کی در میں ۲۵ فی صد سے ۴۵ فی صد تک بے داغ فولاد پر صرف ۲۰ فی صد مشینوں اور اس کے سامان پر ۲۵-۲۰ فی صد تک محصول دینا پڑتا ہے۔ محصول میں بھاری کمی کی وجہ سے اب بڑھیا قسم کا خام مال اور مشینیں استعمال کی جا سکتی ہیں۔

(ج) اشیا کی قسم کی گارنٹی

اشیا کی قسم کی گارنٹی کے لیے ملک میں ISI اور Q.MARK کی سہولتیں ہیں۔ اگر یہ گارنٹی حاصل کر لی جائے تب سامان کو فروخت کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں QUALITY CERTIFICATION SCHEME شروع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کا خاص مقصد چھوٹی صنعتوں میں پیدا کی جانے والی اشیا کی قسم کو بہتر بنانا ہے۔ اشیا کی قسم کو عالمی سطح پر گارنٹی دلوانے کے لیے سرکار ۹۰۰۰ ـــ ISO دلوانے میں مدد کرتی ہے۔ اس گارنٹی کے بعد اشیا کی برآمدات میں آسانی ہوتی ہے۔

۳۔ خود روزگاری

سبھی اقلیتی صنعت کاروں کے لیے صنعتوں میں لاکھوں روپیوں کی سرمایہ کاری کرنا مشکل ہے۔ ان صنعت کاروں کے لیے خود روزگاری کی اسکیمیں موجود ہیں۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(الف) نہرو روزگار اسکیم

تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے جن کی عمر ۱۸ سال سے ۳۵ سال ہو سرکار صنعت، خدمات اور چھوٹی تجارت کے لیے مالی امداد دیتی ہے۔ صنعت قائم کرنے کے لیے ۳۵ ہزار روپے کسی خدمت جیسے پی سی او۔ قائم کرنے کے لیے ۲۵ ہزار اور تجارت کے لیے ۱۵ ہزار روپے تک کے قرضے مل سکتے ہیں۔ صرف ان خاندان کے افراد کو یہ سہولت موجود ہے جن کی سالانہ آمدنی دس ہزار روپیہ سے کم ہے۔ اس میں ایک چوتھائی رقم امدادی رقم ہوتی ہے جس کو واپس نہیں کرنا ہوتا۔ یہ اسکیم ٹاؤن ایریا۔ میونسپلٹی یا کارپوریشن کے ذریعہ چلائی جاتی ہیں۔

(ب) وزیر اعظم روزگار اسکیم

ضلع کے دیہی اور شہری علاقوں کے تعلیم یافتہ لڑکوں و لڑکیوں کے لیے صنعت، خدمت یا تجارت شروع کرنے کے لیے ایک لاکھ روپیہ تک کے قرضوں کی سہولت موجود ہے۔ اس میں کاروبار کا کم از کم ۵ فی صد خود لگانا پڑتا ہے باقی کے لیے قرضہ مل سکتا ہے۔ یہ سہولت ان کو مل سکتی ہے جن کے خاندان کی سالانہ آمدنی ۲۴ ہزار روپیہ سے کم ہو اور کم سے کم عرضی گزار ہائی اسکول پاس یا فیل یا آئی۔ ٹی۔ آئی کا کورس کیے ہوئے ہو۔ سرکار ان قرضوں پر ۱۵ فی صد امداد (SUBSIDY) فراہم کرتی ہے۔ امداد کی رقم ۷½ ہزار روپے تک ہو سکتی ہے۔

۴۔ مخصوص صنعتوں کو سہولتیں.

کچھ سہولتیں ایسی ہیں جو خاص صنعتوں کو ہی دستیاب ہیں۔

(الف) ہتھ کرگھا اور کپڑے کی صنعت

یو پی کا ہینڈ لوم ڈائریکٹریٹ جس کا ہیڈ آفس کانپور میں ہے اس صنعت کی ترقی میں مدد کرتا ہے۔ ہاتھ کے کرگھے لگانے کے لیے قرضے اور سستی در پر سوت فراہم کرنے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ بنکروں کی معاشی اور سماجی حالت سدھارنے کے لیے تیار مال کو مناسب داموں پر بیچنے میں مدد کی جاتی ہے۔ سبھی شہروں میں اس ادارے کی شاخیں ہیں جن سے یہ سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔

(ب) کھادی اور دیہی صنعتیں

اس درجہ میں کھادی اور ۹۶ دیہی صنعتیں شامل ہیں۔ ہر صوبے میں ان صنعتوں کو فروغ دینے

کے لیے کھادی اور دیہی صنعتوں کا بورڈ ہے۔ اس میں صنعتی اداروں سے باہمی تعاون کی بنیاد پر صنعتیں اور انفرادی صنعتی اکائیاں رجسٹرڈ ہیں۔ ان صنعتوں کو مناسب قیمت پر خام مال فراہم کرانا، ریسرچ کے ذریعہ سے اچھی تکنیک کا استعمال، دست کاروں کو ٹریننگ اور رعایتی شرح پر سود کی سہولتیں وغیرہ فراہم کی جاتی ہیں۔ کسی بھی صنعت کو قائم کرنے کے لیے دو لاکھ روپے تک کا قرضہ مل سکتا ہے۔ سود پر جو رعایت بینک دیتے ہیں وہ رقم بورڈ بینکوں کو دیتا ہے۔ ہر ضلع میں یہ کام ضلع کھادی اور دیہی صنعتوں کے افسر کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

(ج) کھانے سے متعلق (FOOD PROCESING) صنعتیں

کھانے سے متعلق صنعتوں جیسے پھلوں اور سبزی سے تیار کی گئی اشیاء، گوشت، مچھلی اور دودھ سے تیار کی گئی چیزیں ہیں۔ چینی، کھانے کے تیل، تمباکو وغیرہ سے متعلق صنعتوں کی توسیع کی بہت گنجائش ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء کے مرکزی بجٹ میں پھل اور سبزی سے متعلق صنعتوں پر آب کاری محصول (EXCISE DUTY) ختم کر دیا گیا۔ ان صنعتوں کے لیے غیر ممالک سے تکنالوجی بغیر سرکار کی اجازت سے درآمد کی جا سکتی ہے۔

(د) چمڑے کی صنعت

تیار کیے گئے چمڑے کی برآمد کے لیے سرکار نے بہت سے قدم اٹھائے ہیں۔ اس صنعت سے متعلق خام مال اور مشینوں کی درآمد کو آسان بنا دیا گیا ہے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۹۳ء کے بعد چمڑا تیار کرنے کے لیے لائسنس لینے کی ضرورت نہیں۔ نیشنل لیدر ڈیولپمنٹ پروگرام شروع کیا گیا ہے جس کا مقصد اس صنعت میں بہتر تکنالوجی کا استعمال ہے۔ ملک کے مختلف اداروں کے ذریعہ یہ کام کیا جا رہا ہے۔ اسی پروگرام کے تحت ہندوستانی چمڑے کی امریکہ کے بازار میں شہرت کی جاتی ہے۔

۵۔ ضلع صنعتی مرکز

۱۹۷۸ء سے ہر ضلع میں ایک صنعتی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ یہ مرکز ضلع کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں چھوٹے پیمانے اور گھریلو صنعتوں کے قائم کرنے اور ان کو فروغ دینے کے لیے اوپر بتائی گئی سہولتوں میں ہر طرح سے مدد اور رہبری کرتا ہے۔

صنعت کاروں کو صرف سرکار کے ذریعہ فراہم کی گئی سہولتوں پر ہی پوری طرح منحصر نہیں رہنا چاہیے۔ ان سہولتوں کو حاصل کرنے میں کچھ دشواریاں بھی پیش آ سکتی ہیں۔ اقلیتوں کی صنعتی ترقی کے لیے کچھ دیگر باتیں بھی غور طلب ہیں۔

۱۔ باہمی تعاون

جن قوموں نے صنعت و تجارت میں ترقی کی ہے ان میں باہمی تعاون کا اہم کردار رہا ہے۔ خام مال یا تیار مال کی فروخت میں قسم اور مناسب داموں سے تجارتی میل جول بڑھتا ہے۔ بڑے صنعت کاروں کے پاس اکثر ایسے منصوبے رہتے ہیں جن کو وہ خود اپنے لیے کرنا سودمند نہیں سمجھتے۔ اس حالت میں چھوٹے صنعت کاروں کی مدد کرنے سے باہمی تعاون بڑھتا ہے۔ کاروبار میں ایک دوسرے سے گلا کاٹ مقابلہ کو چھوڑ کر تجارتی تعاون ضروری ہیں۔

۲۔ عام معلوماتی مرکز

صنعتوں میں ترقی کے لیے مختلف قسم کی معلومات بہت ضروری ہیں۔ کہاں سے اچھا خام مال حاصل ہو سکتا ہے۔ پیداوار کے جدید طریقے اور جدید تکنالوجی کیا ہے۔ کس قسم کی مشینوں کے استعمال سے پیداوار اچھی ہو سکتی ہے۔ انتظام کے بہتر طریقے، پیکنگ کے جدید طریقے کیا ہیں۔ بازار میں کس قسم کی چیزوں کی مانگ ہے۔ نئے فیشن کیا ہیں اور چیزوں کی برآمد کس طرح کی جا سکتی ہے وغیرہ۔ یہ سب معلومات انفرادی طور پر حاصل کرنا مشکل ہے۔ اس لیے ہر شہر میں عام معلومات کے مرکز باہمی تعاون سے قائم کرنا ضروری ہے۔

۳۔ پیداوار میں جدت

مقابلے کے دور میں جدت (INNOVATION) کی بہت اہمیت ہے۔ جو بھی پیداآوری کے کام کو نئے ڈھنگ سے کرتا ہے وہ مقابلے میں آگے بڑھ جاتا ہے۔ زیادہ تر دست کاری کے کاموں اور گھریلو صنعتوں میں اقلیتی صنعت کاروں کا کنٹرول رہا ہے۔ لیکن اگر دوسرے پیداکار جدت میں آگے بڑھ جاتے ہیں تب اقلیتی صنعت کاروں کے پاس ایسا کام رہ جاتا ہے جس میں فائدہ کم ہوتا ہے۔

۴۔ تکنالوجی اور سرمایہ کا میل

بہت سے سرمایہ کاروں کو تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ضرورت ہے جب کہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہت سے نوجوان کاروبار اس لیے شروع نہیں کر پاتے کہ ان کے پاس سرمایہ نہیں ہے۔ اگر دونوں کی خدمات کا میل ہو تب صنعت کار بہتر طریقہ سے کام کر سکتے ہیں اور تعلیم یافتہ لوگوں کو روزگار بھی مل سکتا ہے۔

سرکار کی سہولتوں و دیگر باتوں کے علاوہ صنعت کار اپنے تجربے سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان باتوں پر عمل کر کے نئی معاشی پالیسی میں اقلیتیں بالخصوص مسلمان صنعت کے میدان میں پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ●

ہندی خط کتابت کورس

انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کی وزارت کے تحت مرکزی ہندی ڈائرکٹوریٹ انگریزی، تامل، ملیالم اور بنگالی زبانوں کے توسط سے ۱۹۹۶ء کے لیے ہندی کے سرٹیفکیٹ، ڈپلوما خط کتابت کورسیز کا اہتمام کرے گا۔ بھارتی، غیر ملکی اور بیرون ملک رہنے والے یا سکونت پذیر ہندوستانی ان کورسیز میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ سرٹیفکیٹ کورس ابتدائی نوعیت کا ہے۔ ڈپلوما کورس اس کے بعد کا ہے۔ سرٹیفکیٹ کورس "پرویش" کے مساوی ہے۔ یہ دونوں کورس وزارت داخلہ چلاتی ہے۔ بھارت میں رہنے والے امیدواروں سے ۵۰ روپے اور بیرون ملک سے ۵۰ امریکی ڈالر یا ۳۰ پاؤنڈ یا بھارتی کرنسی میں اس کے مساوی رقم مذکورہ ہر کورس کی فیس ہے۔

او۔ پی۔ شرما

پسماندہ و اقلیتی طبقوں کے لیے تعلیمی سہولیات

کسی بھی قوم یا ملک کی ترقی کے لیے اس کا تعلیم یافتہ ہونا نہایت ہی لازمی ہے اور وہ قوم تب تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کو تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ کیا جائے۔ اسی لیے آزادی حاصل کرنے کے بعد مرکزی حکومت نے ملک کے عام لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے ایک جامع پروگرام شروع کیا تاکہ ملک کے کونے کونے میں تعلیم کو پھیلایا جا سکے اور ملک کا ہر فرد تعلیم کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہو۔ تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے حکومت کی جانب سے متعدد اسکیمیں شروع کی گئیں تاکہ ملک کا ہر شہری تعلیم یافتہ بن سکے۔

حالیہ چند برسوں کے ان پروگراموں میں مزید شدت لائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کے اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والے اور دور دراز و پسماندہ علاقوں میں رہائش پذیر اقلیتی لوگوں میں تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے مرکزی حکومت کی جانب سے متعدد اسکیمیں جامع پیمانے پر شروع کی گئی ہیں اور ان پر عمل درآمد کا کام تیزی سے جاری ہے اور اس مقصد کے لیے وافر مقدار میں رقومات دستیاب کی جا رہی ہیں اور حکومت کی جانب سے اقلیتی و پسماندہ طبقوں سے تعلق رکھنے والے طلبا کو کافی سہولیات دستیاب کی جا رہی ہیں جن میں اسکول فیس کی واپسی، مفت وردیاں و کتابیں فراہم کی جا رہی ہیں اور ان کے گھروں کے نزدیک اسکولوں و گشتی اسکولوں کا قیام عمل میں لائے جانے کے علاوہ انھیں اسکالرشپ وغیرہ کی سہولیات بھی فراہم کی جا رہی ہیں۔ حکومت کی یہ کوشش ہے کہ پسماندہ و اقلیتی طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو خواندہ بنایا جائے تاکہ وہ بھی ملک کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ ترقی کے زینے طے کر سکیں اور ترقی کے کاموں کی عمل آوری میں بھرپور حصہ لے سکیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے وزارت برائے انسانی وسائل و ترقی نے ملک کے پسماندہ علاقوں میں بسنے والے اقلیتی طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو تعلیم سے آراستہ کرنے کی غرض سے ایریا انٹینسیو پروگرام (AREA INTENSIVE PROGRAMME) نامی ایک پروگرام شروع کیا گیا ہے جس کے تحت تعلیمی طور سے پسماندہ اقلیتوں کے لیے متعدد اسکیمیں رائج کی گئی ہیں۔ تاکہ انھیں بھی تعلیمی میدان میں دوسرے طبقوں کے برابر لایا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے مرکزی سرکار ریاستی سرکاروں اور رضاکارانہ تنظیموں کو سو فی صدی مالی امداد فراہم کر رہی ہے۔

گزشتہ دو برسوں کے دوران ملک کی متعدد ریاستوں میں تعلیمی سہولیات کو توسیع دینے کی غرض سے ان اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۴ کروڑ ۷۵ لاکھ روپے کی مالی امداد فراہم کی گئی جب کہ سالِ رواں کے دوران اس مقصد کے لیے ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کی رقم مخصوص رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں کو خواندہ بنانے کی غرض سے مدرسوں کے طرزِ تعلیم کو جدید طرز پر ڈالنے کے لیے کئی اسکیموں کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ ان مدرسوں و مکتبوں میں اب سائنس، حساب، سوشل اسٹڈیز، ہندی اور انگریزی کے مضامین متعارف کروائے گئے ہیں اور ان میں زیرِ تعلیم بچوں کو درس و تدریس فراہم کرنے کی غرض سے اچھے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ اساتذہ کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں۔

گزشتہ دو سالوں کے دوران اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور ہریانہ ریاستوں کے ۸۶ مدرسوں کو جدید طرز پر لانے کے لیے ۶۷ء۲۵ لاکھ روپے کی مالی امداد فراہم کی گئی۔ اس غرض کے لیے ۴۰ لاکھ روپے کی رقم مخصوص رکھی گئی ہے۔

تعلیمی طور سے پسماندہ اقلیتوں کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے سال ۱۹۸۴ء سے متعدد کمپی ٹیٹو امتحانات متعارف کروائے گئے اور سال ۱۹۹۲ء میں اس اسکیم کو ایک نئی طرز پر ڈھالا گیا۔ اس اسکیم پر اس وقت ۲۱ یونیورسٹیوں اور ۳۳ کالجوں میں عمل درآمد ہو رہا ہے اور سال ۱۹۸۴ء سے سال ۱۹۸۵ء تک ۴۹ ہزار سے زائد طلبا و طالبات کو کوچنگ کلاسز کی سہولیات فراہم کی گئیں اور ان سے ۳ ہزار کے قریب ایسے طلبا و طالبات کمپی ٹیٹو امتحانات میں کامیاب ہو گئے۔

اس کے علاوہ ملک میں ایسے ۴۱ اضلاع جن میں اقلیتی طبقہ کے لوگوں کی اکثریت ہے۔ ان تمام تر اضلاع میں "کمیونٹی پالی ٹیکنک ادارے" قائم کیے گئے ہیں جن میں گزشتہ دس برس کے دوران ۳۴۵۰۰ افراد نے تربیت حاصل کی

باقی صفحہ ۲۴ پر

۱۱۵۔ جلبکا اسٹریٹ، جموں۔ ۱۸۰۰۰۱

نشاط اسلم

سوامی وویکانند اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی

سوامی وویکانند (۱۸۶۳ء - ۱۹۰۲ء) کا اصلی نام نریندر ناتھ تھا۔ وہ اپنے روحانی پیشوا شری رام کرشن پرم ہنس کے لائق جانشین تھے۔ رام کرشن کے پیغام کو انھوں نے "رام کرشن مشن" کے نام سے فروغ دیا۔ رام کرشن کی مانند وویکانند نے مذاہب کی یک جہتی پر زور دیا اور مذہبی رواداری کو اپنا شعار بنایا۔ ان کا قول تھا کہ مختلف مذاہب دراصل ایک ہی ذاتِ واحد تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں اور ہم بنی نوع انسان کو اس ارتقا پر لے جانا چاہتے ہیں جہاں محبت اور انسانی وقار کی سربلندی ہو اور تمام آسمانی کتابوں کی تعلیمات کا حسین امتزاج۔

سوامی وویکانند کا نصب العین تھا اہلِ وطن کو ذات پات، رنگ و نسل، چھوت چھات اور مذہبی حدود سے بالاتر کر کے مضبوط کردار کا بنانا۔ اس مقصد کی تحصیل کے لیے انھوں نے ۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۰ء تک بھارت کے طول و عرض کا پیدل سفر کیا۔ وہ مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے قصبوں اور قریوں میں گشت کرتے رہے۔ وہ بلا تفریق مذہب کسی شخص کی کٹیا میں بھی شب گزاری کر لیتے۔ اگر کوئی ہندو سوامی جی کے کسی مسلمان کے گھر قیام کرنے پر اعتراض کرتا تو وہ بلا تکلف جواب دیتے کہ بحیثیت درویش وہ تمام مذہبی حدود سے بالاتر ہیں۔ ایک دفعہ الموڑہ (اتر پردیش) کے ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے وہ تھکاوٹ سے گر کر بے ہوش ہو گئے تھے تو ایک مسلمان نے ان کی تیمارداری کی تھی اور ان کے خورد و نوش کا انتظام کیا تھا۔ سوامی جی کے سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ سفر میں وہ کسی کا، حتیٰ کہ اپنے قریب ترین معتقدوں کا ساتھ بھی پسند نہ کرتے تھے۔ تنہا سفر کرنا ان کی عادت تھی۔

سوامی وویکانند وسیع المشرب مفکر تھے۔ انھوں نے سارے مذاہب کی تعلیمات سے اکتساب کر کے نہایت دل نشیں پیرائے میں نہ صرف ملک و قوم بلکہ پوری دنیا پر اس حقیقت کو آشکار کیا کہ روحانیت دراصل حق کے قیام، اہلِ زمین کی بھلائی اور دنیا کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کی کوشش کا ہی نام ہے اور انسانی کردار کی عظمت کا سرچشمہ اسی میں پوشیدہ ہے۔ ان کا پیغام ویدانتک فلسفۂ انسانیت کو بڑے عام فہم اور ہمہ گیر انداز میں پیش کرتا ہے۔ ان کا قول تھا کہ اپنشدوں کی مرکزی تعلیم کے مطابق انسانیت ہی درحقیقت روحانیت ہے۔ دوسرے مذاہب بھی یہی تلقین کرتے ہیں کہ ہر ذی روح میں ایک روحانی قوت کار فرما ہوتی ہے جس کا اظہار اس کے ایثار، محبت اور قربانی کے توسط سے ہوتا ہے اور یہی روحانی ارتقا ہر مذہب کا نصب العین ہے۔ سوامی جی کی مذہبی تشریحات سے مذاہب کی آفاقیت کا تصور ابھرتا ہے۔ ان کے نظریات انھیں دیگر مذہبی رہنماؤں سے ممتاز بناتے ہیں۔ سوامی جی کے نظریات سے متاثر ہو کر جواہر لال نہرو اپنی تصنیف "THE DISCOVERY OF INDIA" میں انھیں ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

"ماضی کے عظیم اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے بھی وویکانند عصرِ حاضر کے مسائل کے متعلق جدید نظریات کے حامل تھے۔ ان کی باکمال شخصیت ہندوستان کے ماضی کا دامن حال سے وابستہ کرتی ہے۔"

(THE DISCOVERY OF INDIA - P - 400)

سوامی وویکانند مذاہب کے خود ساختہ ٹھیکیداروں سے سخت بیزار تھے۔ ان کی دوررس نگاہوں نے رجعت پسند عناصر کو بخوبی پہچان لیا تھا مگر مغربی مفکرین کی مانند انھوں نے ترکِ مذاہب کی تلقین نہیں کی۔ انھوں نے ہر مذہب کے عام لوگوں کو خطاب کیا اور انھیں اپنے اپنے مذہب کے اصل پیغام کو تلاش کرنے میں مدد دی۔ مسٹر نوید تا کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۷ جون ۱۸۹۵ء میں سوامی جی یوں رقم طراز ہیں۔

"میرا آئیڈیل چند الفاظ میں ہی بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے انسان کو اس کی روحانیت کی تلقین اور اس کے اندر یہ احساس جگانا کہ وہ اس قوت کو زندگی کے ہر لمحے میں کس طرح بروئے کار لا سکتا ہے۔"

اپنی ایک امریکی مداح مسز اولے بل (Mrs. OLE BULL) کو ایک خط مورخہ ۲۱ مارچ ۱۸۹۵ء سوامی جی اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"میرے مرشد (رام کرشن) کہا کرتے تھے کہ یہ ہندو مسلم اور عیسائی نام وغیرہ ہندوستانیوں کے درمیان بھائی چارے کے جذبات و احساسات کے فروغ میں

۸-۸۸- پنڈارا روڈ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۳

ستدراہ ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان روکاوٹوں کو دور کرنا ہے تاکہ لوگوں میں سچی اخوت ابھر سکے اور اس کے لیے ہمیں حد درجہ محنت کرنی ہوگی۔"

وویکا نند جی نے قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو محض اپنی پرجوش تقاریر کے ذریعہ ہی فروغ نہیں دیا بلکہ رام کرشن مشن کے تحت متعدد ادارے، اسکول، کالج، اسپتال اور تربیتی مراکز وغیرہ قائم کیے اور بلا تفریق مذہب و فرقہ سب کو ان اداروں سے یکساں مستفید ہونے کا موقع دیا۔ ان اداروں کے کارکنان ہر مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہیں اور بے لوث محبت اور بے پناہ خلوص کے ساتھ اپنے ہم وطنوں کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ مشرق اور جنوبی ہند میں سوامی وویکا نند کے پیغام کو قبول عام حاصل ہوا ہے۔ ان علاقوں میں کسی تنظیم نے خدمتِ انسانی کے وہ کارنامے انجام نہ دیے جو رام کرشن مشن کے ذریعہ انجام پا رہے ہیں۔ اکثر رہماؤں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کی وفات کے ساتھ ان کا مشن بھی دم توڑ دیتا ہے لیکن سوامی جی کا مشن ان کے پیغام کو پوری طرح درخشاں کیے ہوئے ہے۔

آج ہندوستان فرقہ پرستی کے شعلوں کی لپیٹ میں ہے۔ اہل وطن مذہب کے نام پر خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ رجعت پسند عناصر عوام کے جذبات کو بھڑکا رہے ہیں۔ ایسے نامساعد حالات میں ناگزیر ہے کہ عوام کو سوامی وویکا نند کے حیات آفریں پیغام سے روشناس کرایا جائے۔ آج سوامی جی کے ان الفاظ کو یاد کیا جائے جو انھوں نے ۱۸۹۷ء میں "مشن آف ویدانت" کے عنوان سے کمبا کونم میں پیش کیے تھے۔

"یہ دنیا آفاقی رواداری کے نظریے کی تلاش میں ہے۔ کسی بھی تہذیب کی ترویج و ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ مذہبی تعصب، کشت و خون اور ظلم و استبداد کی آہنی سلاخوں کو نہ کاٹ ڈالے۔ کسی بھی تہذیب کی سربلندی کا راز محبت، خلوص، رحم اور مذہبی رواداری میں پنہاں ہے۔ ہر چند کہ ہماری مذہبی راہیں مختلف ہیں تاہم ہمیں آپس میں ہمدرد، مددگار اور غم گسار ہونا چاہیے۔"

(COMPLETE WORKS.VOL.III P.187-88)

عصر حاضر میں سوامی وویکا نند کے پیغام کا صحیح مطالعہ اور اس کا تجزیہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ان کے پیغام میں خصوصاً نئی نسل کے لیے وافر اپیل موجود ہے۔ ان کا یہ نظریہ کسے متاثر نہ کرے گا:

"آج مذہب کے ٹھیکیداروں نے مذہب کو مردہ روایتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ انسان کو اب کردار کی ضرورت ہے۔ دنیا اب محبت کے بے لوث فرشتوں کی تلاش میں ہے۔"

(COMPLETE WORKS VOL.VIII P.489)

حقیقت یہ ہے کہ سوامی جی نے اپنی حیات میں ہی ملک کی موجودہ صورت حال کی آہٹیں سن لی تھیں، لہٰذا مستقبل کے لیے انھوں نے فلسفۂ انسانیت اور حقوق انسانی کے نسخے تجویز کیے۔ ان کی شہرۂ آفاق تقریر، جو انھوں نے شکاگو میں مذاہب کے عالمی پارلیمنٹ میں ۱۸۹۳ء میں کی تھی، ان استعارات سے پُر تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے کائناتی مذہب (UNIVERSAL RELIGION) کا تصور پیش کیا تھا اور اس کے خد و خال نمایاں کیے تھے۔

ایشیائی ملکوں میں ہندوستان کا مزاج خاص طور سے مثالی رہا ہے۔ یہاں کے باشندے شرافت، رحم دلی اور مذہبی رواداری میں لاثانی رہے ہیں۔ لیکن ہم سے ماضی میں کچھ بڑی غلطیاں سرزد ہوئیں اور اب اس سے کہیں زیادہ ہو رہی ہیں۔ ہمارے بنیادی اوصاف مادہ پرستی اور اندھادھند بے اطمانی کے باعث اپنی آب و تاب کھو بیٹھے ہیں۔ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد ہم نے اپنی روحانی ترقی کو یکسر نظر انداز کر دیا جس کا نتیجہ آج کی مسموم فضا کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ سوامی وویکا نند کا پیغام ہندوستان کی موجودہ فضا کو صاف کر سکتا ہے۔ لوگوں کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی، اخوت اور حب الوطنی کے اوصاف سے نواز سکتا ہے، بشرطیکہ ان کے پیغام پر دیانت داری اور خلوص کے ساتھ عمل پیرا ہوا جائے۔ کسی پیغام کی کامیابی کا دار و مدار اس پر عمل کرنے میں ہوتا ہے اور سوامی جی اپنے پیغام کے عملی پیکر تھے۔ یہ ہمارے لیے بڑی محرومی کی بات ہوگی اگر اس وقت ہم نے سوامی جی کی شخصیت کو نہ پہچانا اور ان کی تعلیمات کی قدر نہ کی۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور ان کا پیغام ہر دور کے لیے مشعل راہ ہے۔ عصر حاضر میں تو ان کا پیغام گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہے:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

(اقبالؔ)

دورِ جدید میں سوامی وویکا نند کے پیغام کو مشعلِ راہ بنانے کے لیے ان کی تعلیمات کو نصابِ تعلیم کا جزو لاینفک بنانا ہوگا۔ ہر ہر شہر، قصبہ اور قریہ میں ان کے مراکز قائم کرنے ہوں گے۔ رجعت پسند اور فرقہ پرست عناصر کے مردہ دلوں میں روحانیت کا جذبہ بیدار کرنا ہوگا تاکہ عوام الناس اپنے فکر و عمل کی قوت سے کام لیں اور ایسے معاشرے کی تشکیل کی کوشش کریں جو قابلِ اعتبار اور مستحکم ہو۔ ہر انسان کے اندر بصیرت اور قوتِ تمیز موجود ہے۔ ضرورت صرف اسے جلا بخشنے کی ہے۔ موجودہ صورت حال میں امن اور انسانیت کی بقا کے لیے سوامی وویکا نند کی حیات، تحریروں اور کارناموں کا صحیح مطالعہ اور تجزیہ نیز ان کے بتائے ہوئے لائحہ عمل پر کاربند ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ ●

ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ معاصرین کی نظر میں

ذاکر صاحب کی پیدائش ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد میں ہوئی جہاں ان کے والد جناب فدا حسین صاحب بغرض وکالت سکونت پذیر تھے۔ ذاکر صاحب کا آبائی وطن یوپی کے ضلع فرخ آباد کی پٹھانوں کی بستی "قائم گنج" ہے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف میں آفریدی پٹھانوں کا ایک بڑا قافلہ آکر اس علاقہ میں آباد ہو گیا۔ ان میں زیادہ تر لوگ پیشہ سے سپاہی تھے۔ ذاکر صاحب کے دادا غلام حسین ایک نڈر اور باہمت قسم کے سپاہی تھے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے، عطا حسین اور فدا حسین۔ بڑے صاحبزادے عطا حسین دکن میں فوج میں رسالدار تھے جب کہ چھوٹے صاحبزادے فدا حسین یعنی ذاکر صاحب کے والد ابتدا میں قائم گنج میں ہی رہے پھر بغرض تجارت حیدر آباد منتقل ہو گئے جہاں اپنی طبیعت کی موزونیت کے مطابق تجارت کو خیر آباد کہہ کر وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا اور اس پیشے میں خوب نام کمایا۔

ذاکر صاحب ابھی ابتدائی تعلیم ہی حاصل کر رہے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ فدا حسین کے سات لڑکے ہوئے جن کے نام علی الترتیب مظفر حسین خاں، عابد حسین خاں، ذاکر حسین خاں، زاہد حسین خاں، یوسف حسین خاں، جعفر حسین خاں اور محمود حسین تھے۔ جعفر حسین کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا۔ مظفر حسین، عابد حسین اور زاہد حسین جن کا انتقال عالم جوانی میں ہی ہو گیا کا شمار علی گڑھ کے نمایاں طالب علموں میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر محمود حسین خاں نے علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کو اپنا محور بنایا۔

ذاکر صاحب کا بچپن حیدر آباد میں گزرا جہاں عہد طفلی میں ہی وہ ایک خاندانی بزرگ حسن شاہ صاحب کے مرید ہو گئے جن کے زبردست اثرات ان کی سیرت پر ہوئے جس کا اعتراف ان کے بھائی یوسف حسین صاحب نے بھی کیا ہے۔ "نوجوانی میں ذاکر میاں کی سیرت و کردار پر ایک صوفی اور درویش حسن شاہ کا گہرا اثر پڑا جو ہمارے دادا کے دور کے عزیز ہوتے تھے۔" (نقش ذاکر)

۱۹۱۳ء میں ذاکر صاحب نے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ سائنس سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد ۱۹۱۵ء میں کرسچین کالج لکھنؤ بی۔ ایس۔ سی کرنے کی غرض سے پہنچے لیکن چند وجوہات کی بنا پر واپس علی گڑھ آ گئے اور ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے۔ کیا۔ ۱۹۱۹ء میں اقتصادیات میں ایم۔ اے کے دوران ہی ترک موالات کے زمانہ میں یونیورسٹی کے ناگفتہ بہ حالات، جن کے سبب یونیورسٹی اپنے مقام سے ہٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، سے اوب کر اور وطنی جذبہ سے سرشار ہو کر علی گڑھ چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۲۲ء میں معاشیات کی اعلا تعلیم کے لیے برلن (جرمنی) کا سفر اختیار کیا۔ وہاں اپنے جرمن استاد اشپرانگر سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان لوٹے جہاں ۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد جامعہ کی باگ ڈور سنبھالی۔

یہ زمانہ جامعہ کے لیے بڑی کسمپرسی کا تھا۔ حکومت کی بے اعتنائی، قوم کی بے توجہی اور تعلیم سے عدم دلچسپی، اپنوں کی مخالفت کے سبب جامعہ جاں بلب تھا۔ اس گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنے کی ذمہ داری ذاکر حسین نے اپنے سر بسر و چشم لی اور اس کو ایسا سنبھالا کہ حکومت سے نیم یونیورسٹی کا درجہ تسلیم کرا کر ہی دم لیا۔

۱۹۵۰ء میں بادل نخواستہ علی گڑھ کی وائس چانسلر شپ سنبھالنے کے لیے جامعہ کو خیر باد کہا، وہاں کے حالات سدھارنے کی جی توڑ کوشش کی۔ کسی حد تک کامیابی بھی ملی اور حالات کو مزید خراب ہونے سے بچا لیا لیکن اندرونی ریشہ دوانیوں اور رسہ کشیوں کے باعث جوان کے مزاج کے بالکل خلاف تھیں۔ ۱۹۵۶ء کی اسٹوڈینٹس یونین تقریب میں اپنی الوداعی تقریر کے ان جملوں کے ساتھ علی گڑھ سے رخصت لی۔

"یہ آٹھ سال میں نے جس ولولے اور خوش گوار انداز سے گزارے ہیں، اس میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں، لیکن آخر میں آپ نے مجھے دودھ دیتے دیتے اس میں مکھی بھی ڈال دی ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا خدا حافظ۔" (نقش ذاکر)

ان الفاظ میں جہاں ان کا ذہنی کرب پوشیدہ ہو ہیں اس کو ظاہر کرنے کا ان کا اسلوب انتہائی قابل تعریف ہے جس کے سبب بات دل پر نقش کر جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

۱۹۵۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کے

مکان نمبرہ ۱۲۳۵ (بالائی منزل)، گلی محل سرائے پھاٹک پنجابیاں، بلیماران ۔ دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶

اصرار پر ذاکر صاحب نے بہار کی گورنری منظور کرلی جہاں اپنے حسن انتظام کا سکہ جمایا۔ مئی ۱۹۶۲ء میں اتفاق رائے سے بطور نائب صدر جمہوریہ ہند ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس عہدے پر رہتے ہوئے ان کی شخصیت کے گوہر مزید سامنے آئے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے بعد اپریل ۱۹۶۷ء میں صدر جمہوریہ ہند کے جلیل القدر عہدے پر سرفراز ہوئے جس کو انھوں نے اپنی شخصیت سے مزید باوقار اور پُر رعب سا دیا۔ ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو دل کے جان لیوا دورے نے ان کو سنبھلنے کی مہلت نہ دی اور ہندوستان کے افق پر چمکتا ہوا یہ ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گیا۔

کسی کی شخصیت و سیرت کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں کی رائے معلوم کی جائے جو اس کے قریب رہے ہیں، جنھوں نے اس کو برتا، پرکھا اور جانچا ہے۔ چنانچہ اب ہم درج ذیل سطور میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں ان کے معاصرین کی رائے پیش کر رہے ہیں جن سے قارئین خود ان کی شخصیت و سیرت کو سمجھ لیں گے، جن اصحاب کی آرار کو مدنظر رکھا گیا ہے ان کے اسمائے گرامی ہیں ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، خواجہ غلام السیدین، پروفیسر حبیب الرحمٰن، یوسف حسین خاں صاحب، پروفیسر محمد مجیب، جناب عبداللطیف اعظمی اور کرنل بشیر حسین زیدی۔ یہ حضرات خود بلند و بانگ شخصیات کے مالک رہے ہیں۔ ملک و قوم میں ان لوگوں کو جو امتیاز حاصل رہا ہے اس سے ان کی آرار خاصی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین کا شمار ذاکر صاحب کے دوستوں کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ سے ہی دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ علی گڑھ سے نکل کر ذاکر صاحب برلن پہنچے تو عابد صاحب وہاں بھی ان کے ساتھ رہے۔ ذاکر صاحب معاشیات میں اور عابد صاحب فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ پھر جب ذاکر صاحب کا تعلق جامعہ سے ہوا تو انھوں نے عابد صاحب کو بھی وہیں بلا لیا۔ زیر نظر اقتباس میں نقوش لاہور کے جنوری ۱۹۵۵ء کے "شخصیات نمبر" میں شائع عابد حسین صاحب کے مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین:

"ذاکر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں مگر ان میں مرکزی، بنیادی حیثیت انسان دوستی کو حاصل ہے۔۔۔۔ ذاکر صاحب کی انسان دوستی۔۔۔ مرشد و معلم کی شان رکھتی ہے۔ وہ انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اس کی روح سے محبت رکھتے ہیں۔ اسے تعلیم و ہدایت کے ذریعے سنوارنا چاہتے ہیں۔"

"انسان دوستی کے بعد سب سے گہرا رنگ ذاکر صاحب کی شخصیت میں خدا پرستی کا ہے۔"

"اقتصادیات و معاشیات میں مہارت حاصل کرنے کے باوجود اقتصادی حیثیت ذاکر صاحب کا سب سے کمزور پہلو ہے۔"

"موسیقی اور مصوری میں ذاکر صاحب خاصا وسیع ذوق رکھتے ہیں اور مشرقی اور مغربی فنکاروں کے کمال سے یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں۔۔۔ شعر میں ان کی دلچسپی کا دائرہ اردو، فارسی، انگریزی، جرمن شاعری کو محیط کیے ہوئے ہے۔۔۔ علمی مشاغل میں ذاکر صاحب کو سب سے زیادہ پڑھنا اس سے کم پڑھانا اور اس سے کم لکھنا مرغوب ہے۔ کتب بینی کا ان کو۔۔۔ گہرا اور سچا شوق ہے۔"

"ذاکر صاحب اردو، انگریزی تقریر و تحریر پر پوری قدرت رکھتے ہیں، ان کی تقریر سادگی اور پرکاری میں ان کی شخصیت کی بولتی ہوئی تصویر اور ان کی تحریر اگر یکسوئی سے لکھی ہوئی ہو، بے ساختہ پن، جوش اور خلوص میں ان کی سیرت کا آئینہ ہوتی ہے۔"

"۔۔۔ لیڈر بننے کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے، ان میں سے اکثر ذاکر صاحب میں بڑے بڑے لیڈروں سے زیادہ موجود ہیں ــــ مردم شناسی، موقع شناسی، مصلحت بینی، شخصیت کی کشش، زبان کی طاقت، جلد فیصلہ کرنے کی قوت۔۔۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا تعلق ذاکر صاحب سے "یار غار" کی طرح تھا۔ دونوں کے درمیان طویل اور گہرا تعلق رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے جلوت اور خلوت کے رازداروں میں سے تھے۔ لہٰذا رشید صاحب کی باتیں جو انھوں نے ذاکر صاحب کے متعلق کہی یا لکھی ہیں سنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں ہیں بلکہ عینی مشاہدے اور ذاتی تجربے کی ٹھوس بنیاد پر ہیں۔ یہ باتیں انھوں نے مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ کے ۱۹۵۲ء کے ذاکر نمبر میں کہی ہیں:

پروفیسر رشید احمد صدیقی:

"ان کو ہر چیز سے دلچسپی ہے، کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جو اپنے گرد و پیش اور نزدیک و دور کی ہر طرح کی معمولی و غیر معمولی چیزوں اور باتوں سے اتنی بھرپور دلچسپی رکھتے ہیں جتنی کہ وہ۔ ان کی یہ صلاحیت ان کی سیرت و شخصیت کے بہت سے اہم دلکش پہلوؤں کو بے نقاب کرتی ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کسی حال میں امید و اخلاص کا دامن نہ چھوڑتے ہیں نہ دوسرے کو چھوڑنے دیتے ہیں۔"

"ذاکر صاحب ہندوستانی پکے گانے اور مصوری کے جدید اسالیب و رجحانات کے بڑے قدردان ہیں۔ ہندوستانی موسیقی کے علاوہ یورپین موسیقی کے بھی دلدادہ ہیں۔"

"ذاکر صاحب کی ایک صفت جو ان کے درجے کے دوسرے لوگوں سے ان کو ممتاز کرتی ہے کہ کیسی ہی اہم تقریب کیوں نہ ہو اس کے لیے خطبہ لکھنا ہوگا تو وہ خود لکھیں گے، کسی دوسرے کی مدد کے خواستگار نہ ہوں گے۔۔۔ لیکن یہ تعلیم خود لکھنے کا اصول ذاکر صاحب کے لیے بلا کے جان سے کم نہیں۔"

"علی گڑھ والوں کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ جس کام کو وہ بہترین طور

یہ انجام دینا چاہتے ہیں اس کو بالعموم "گیارہویں" گھنٹے میں شروع کرتے ہیں اور بارہویں پر ختم کر دیتے ہیں۔ جہاں تک خطبہ لکھنے کا تعلق ہے ذاکر صاحب نے اس ریکارڈ کو بہتر بنانے کی مزید کوشش اس طور پر کی ہے کہ کام بارہویں گھنٹے میں شروع کیا جائے اور اس سے کچھ پہلے مکمل کر دیا جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ یونیورسٹی کے ہر چھوٹے بڑے پر ذاکر صاحب کا بحیثیت مجموعی جتنا اچھا اور دیرپا اثر پڑا ہے، کسی دوسرے کا ان سے قبل نہیں پڑا تھا۔ ذاکر صاحب نے جب اس ادارے کا کام سنبھالا تو اس کی شہرت مجروح اور عام فضا مکدر ہو چکی تھی۔۔۔ اور جب یہاں کام چھوڑا تو یونیورسٹی کی شہرت بحیثیت یونیورسٹی کے دور دور ملکوں تک پہنچ چکی تھی۔۔۔ ذاکر صاحب یہاں آئے تو یونیورسٹی کا بجٹ کم و بیش ۳۱ لاکھ تھا اور جب رخصت ہوئے تو غالباً ۴۵ لاکھ تک پہنچ چکا تھا۔"

"کوئی ضخیم کتاب یا فائل ہو، کانفرنس یا جلسہ ہو، متنازع فیہ مسئلہ ہو، ذاکر صاحب ان میں وہ تمام امور جلد سے جلد اخذ کر لیں گے جو مفید مطلب، تصفیہ طلب یا یوں کہیے جان سخن ہوں گے ـــــ پھر ان کا ذہن اتنا رسا، حافظہ قوی اور طبیعت شریفانہ ہے کہ تصفیہ یا مفاہمت کا جو فارمولہ وضع کریں گے وہ ہر فریق کے لیے قابل قبول ہوگا۔"

"ذاکر صاحب کا مطالعہ بڑا وسیع اور متنوع ہے۔۔۔ ذاکر صاحب اردو کے نئے پرانے شعرا اور ادیبوں کی تصانیف نیز نئی پرانی تحریکوں پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔"

"ذاکر صاحب اپنی پسند کے فارسی اشعار ایک بیاض میں درج کرتے رہے ہیں۔ ان اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کا فارسی کا ذوق کتنا پاکیزہ ہے۔"

"وہ ملنے والے سے اس شفقت سے پیش آتے ہیں اور اتنی عزت کرتے ہیں کہ اس میں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس کی بھی اہمیت ہے۔"

"ذاکر صاحب ہر موقع اور ہر حال میں بڑے اچھے ساتھی ہیں۔ وہ آپ کے تفریح، راحت اور رکھ رکھاؤ کا ہمہ وقت لحاظ رکھیں گے۔۔۔ اور آپ پر یہ ظاہر نہ ہو کہ وہ ایسا کر رہے ہیں۔"

"ذاکر صاحب طبیعت اور تربیت کے لحاظ سے معلم ہیں اور رہنا بھی یہی چاہتے ہیں۔ معلم کا سب سے اونچا درجہ پیغمبر ہے۔"

مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین مرحوم بھی ذاکر صاحب کے قریبی دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں، جس زمانہ میں ذاکر صاحب علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے خواجہ صاحب بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے وہاں مقیم تھے۔ خواجہ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر صاحب کے تعلیمی فکر و عمل پر روشنی ڈالی ہے جو عبداللطیف اعظمی صاحب کی کتاب "ڈاکٹر ذاکر حسین۔ سیرت و شخصیت" میں ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

خواجہ غلام السیدین:

"ذاکر صاحب کا شمار انھیں گنے چنے لوگوں میں ہے، جن پر قدرت نے صورت اور سیرت، دل اور دماغ، شرافت اور دیانت، دوستی اور قیادت کی غیر معمولی صفات ارزاں فرمائی ہیں۔"

"ذاکر صاحب ان غیر معمولی لوگوں میں سے ہیں، جن کا خیال ہے کہ قوموں کے بنانے میں معلم کے خاموش اور جانکاہ کام کی اہمیت ارباب سیاست کی تگ و دو اور شور و غل سے زیادہ ہے۔۔۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے اصول اور عمل، عقیدہ اور پالیسی میں ہم آہنگی ہے، جن کا دل ان کے دماغ سے معروف پیکار نہیں رہتا اور زبان دل کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کی تمام شخصیت میں وہ توازن جاری اور ساری ہے جو یونان کے فلاسفہ اور اسلام کے معلمین اخلاق کی نظر میں انسانیت کا بہترین جوہر ہے۔"

"میرے خیال میں ذاکر صاحب کی سب سے نمایاں صفت انسانی زندگی کی قدروں کی صحیح پرکھ ہے، وہ کاموں اور مقصد کی اضافی قدر و قیمت کا بہت صحیح اندازہ لگاتے ہیں۔ بہت سی چیزیں جو دوسرے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں، ان کی نگاہ اور ان کے دل کو کبھی مرعوب نہیں کر سکتیں۔"

"ندرت تخیل کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ انھوں نے (اوکھلا کی عمارت کا) سنگ بنیاد مشاہیر ہند میں سے نہیں رکھوایا بلکہ یہ عزت جامعہ کے سب سے کم سن طالب علم کے حصہ میں آئی۔"

"انھوں نے جامعہ کی تعلیم کا مقصد اعلا بنی نوع انسان کی خدمت قرار دیا ہے۔"

"ذاکر صاحب کی نظر میں تعلیم کا سب سے بڑا، سب سے اہم، سب سے بلند مقصد یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو سیوا کی زندگی کے لیے تیار کرے۔"

"ان کی دیانت، خلوص اور قابلیت پر شاید ان کے بدترین مخالفوں اور نقادوں نے بھی شبہ نہیں کیا۔"

"اگر ذاکر صاحب کی شخصی کشش ان کے (صاحب جاہ و ثروت) کے دلوں کو جامعہ کی طرف نہ کھینچتی تو اس درسگاہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان درجنوں قومی درسگاہوں کا ہوا جو ۱۹۲۰ء کی سیاسی تحریک کے بعد قائم ہوئی تھیں۔"

"ذاکر صاحب کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ جہاں تعلیم کے بنیادی اصولوں اور قدروں کی غیر معمولی پرکھ رکھتے ہیں وہاں ان میں یہ صلاحیت اور سلیقہ بھی ہے کہ وہ ان کو عملی جامہ پہنا سکیں۔"

"ان کی دلکش شخصیت کے لیے شمار

حسین پہلو تھے۔ ان کی شرافت اور پاک باطنی، ان کا علم و فضل، ان کی تحریر و تقریر، ان کی متنوع دلچسپیاں، ان کی انسانیت، ان کا عجز و انکسار، جو دکھاوے کے لیے نہ تھا، بلکہ ان کی فطرت کا جزو تھا۔ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ، ان کی جرأت و صداقت، دم گفتگو ان کی نرمی، دم جستجو ان کی گرمی، غرض کس کس پہلو کا کوئی ذکر کرے۔"

"ذاکر صاحب کی شخصیت اعمال و اقدار کا، جلال و جمال کا ایک نادر اور حسین امتزاج تھی۔"

پروفیسر حبیب الرحمان ہائی اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران ذاکر صاحب کے ہم سبق تھے اور بعد میں وہ ذاکر صاحب کی علی گڑھ میں وائس چانسلری کے عہد میں علی گڑھ سے وابستہ تھے اور یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم جو کہ ذاکر صاحب کا خاص موضوع تھا کے سربراہ تھے۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن:

"ذاکر صاحب اسکول کے زمانے میں بھی اپنے اسکول کے ساتھیوں کے مرشد تھے، ہر طالب علم ان کی بے انتہا عزت کرتا تھا اور ان کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔"

"بیشتر اعلا تعلیم حاصل کیے ہوئے لوگ جو ان سے دوگنی عمر کے تھے، ان مسائل (سیاسی مسائل) کے متعلق ان جیسی بصیرت نہ رکھتے تھے، اس بصیرت کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ ان میں بین اقوامی اور قومی معاملات کے متعلق صحیح جذبات اور رجحانات بھی پیدا ہو گئے۔"

"ذاکر صاحب کا مستقل نظریہ یہ رہا کہ لڑکوں کی طرف سے مایوس نہ ہونا چاہئے، اگر ان کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا رویہ رکھا جائے گا تو وہ اپنی اصلاح خود کر لیں گے۔"

"ذاکر صاحب وائس چانسلری کے زمانہ میں چند اصولوں پر سختی اور پابندی سے عامل رہے۔۔۔ دوسرے لوگوں کے نظریوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان نظریوں کے متعلق ہمدردانہ رویہ رکھا جائے۔"

(ڈاکٹر ذاکر حسین (سیرت و شخصیت) مرتبہ عبداللطیف اعظمی)

یوسف حسین خاں صاحب کو ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انھوں نے ذاکر صاحب کو لڑکپن کے زمانہ سے آخری ایام تک نہایت قریب سے دیکھا ہے۔ خاندانی روایات کے مطابق جن میں بڑوں کے نام کے ساتھ احترام کے طور پر "میاں" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ چھوٹے ہونے کے باوجود وہ انھیں ذاکر میاں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یوسف حسین خاں:

"ذاکر میاں کے مزاج میں ان کے جسم کی طرح نرمی اور ملائمت تھی۔ جسم سے زیادہ وہ دماغ سے کام لیتے تھے اور حکمت عملی سے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتے تھے۔۔۔ ان کی طبیعت میں نرمی اور بردباری کے علاوہ جو ننھیال کی دین ہے، جرأت اور حوصلہ مندی ددھیال سے ورثے میں ملی ہے، جس کی بدولت ارادے کی پختگی اور مقاصد کی والہانہ لگن ظہور میں آئی۔"

"ذاکر میاں کی زندگی کی تشکیل میں ان کی نیت اور ان کی نیکی کا بڑا دخل ہے ان کی سیرت کا جوہر بڑی ریاضت کے بعد چمکا ہے، جس کی تہہ میں زبردست قوت ارادی کارفرما ہے۔"

"ان کی ہر تحریر میں ان کی پاکیزہ اور نکھری ہوئی شخصیت کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔۔۔ وہ بڑے ہی عالی ظرف، بڑے مآل اندیش، بڑے منکسر مزاج اور متواضع، بڑے متحمل اور صابر ہیں۔ مزاج میں چشم پوشی، درگزر اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ہر معاملے میں قطعی رائے رکھتے ہوئے اس کے اظہار میں اس کا خیال رہتا کہ کسی کے دل کو چوٹ نہ لگے، نہ کسی کی ذلت و توہین ہو۔۔۔ حق گوئی کی جرأت اور انکسار پہلو بہ پہلو رہتے ہیں۔"

"قدرت نے ذاکر میاں کو غیر معمولی فراست اور فکری قابلیت ودیعت کی ہے۔ وہ جلد اپنی رائے قائم کر لیتے ہیں اور اکثر و بیشتر وہ صحیح ہوتی ہے۔"

"ذاکر میاں میں دو صفات ایسی ہیں جن سے ان کی انسان دوستی کا خمیر بنا ہے۔ وہ ہیں صداقت اور جرأت۔ اگرچہ وہ بے حد خلیق اور منکسر مزاج ہیں اور کبھی کسی کی دل آزاری یا توہین نہیں چاہتے تاہم اگر ضرورت آ پڑے تو حق بات کہنے میں بھی تامل نہ کرتے۔"

"ان کی فراست بلا کی ہے۔ کوئی چاہے کہ چھوٹی بچی باتوں یا للو پتو سے انھیں رام کرے تو وہ بڑی غلطی میں ہے۔"

"ذاکر میاں کی نجی زندگی ہمیشہ سے آئینے کی طرح پاک صاف رہی ہے۔ اس میں ہر بات ظاہر ہے۔ کوئی چیز چھپی نہیں، وہ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ ان کی سیرت کے اوصاف، پبلک زندگی اور نجی زندگی دونوں میں یکساں ہیں۔ چپراسیوں سے بھی اسی طرح اخلاق سے ملتے، جیسا دوستوں سے۔"

"ذاکر میاں فخر خاندان تو ہیں ہی لیکن وہ اس سے بھی بڑھ کر بھی بہت کچھ ہیں۔ ان کی شخصیت کی حدود بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔"

(نقش ذاکر مرتبہ عبدالحق خاں)

پروفیسر محمد مجیب بھی ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھیوں میں تھے۔ ان دونوں رفقاء کی پہلی ملاقات برلن (جرمنی) کے قیام کے دوران ہوئی تھی۔ جرمنی کا یہ تعلق ہندوستان واپسی پر بھی برقرار رہا حتیٰ کہ ملک الموت نے ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا۔ مجیب صاحب

نے ذاکر صاحب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار "وردھا تعلیمی کانفرنس" کے موقع پر اپنی تقریر میں کیا تھا۔ اس کے علاوہ ذاکر صاحب کے "تعلیمی خطبات" کے پیش لفظ میں بھی انھوں نے ذاکر صاحب کی شخصیت کی تصویر کشی کی ہے۔ ("نقش ذاکر" مرتبہ عبدالحق خاں)

پروفیسر محمد مجیب:

"غالباً اکتوبر ۱۹۲۰ء اور ستمبر ۱۹۲۳ء کے درمیانی زمانے میں یہ بات واضح ہو گئی کہ جامعہ کی غیر مشروط خدمت کرنے والوں میں سب سے زیادہ صلاحیت ذاکر صاحب میں ہے۔"

"ذاکر صاحب کی شخصیت کا کچھ ایسا اثر تھا، مشوروں اور بحثوں میں وہ اس طرح حاوی رہتے کہ سب کا میلان خود بخود اس طرف ہو گیا (اس طرف ہو جاتا) کہ ہر مشکل کو حل کرنے کا اہل اور اس کا ذمہ دار انھیں (ذاکر صاحب) کو بنا دیں۔"

"ذاکر صاحب کو علی گڑھ کے معاملات سے دلچسپی تھی، اس کی وجہ سے ان کے خاص لوگوں سے تعلقات بڑھے اور ان کی مصلحت اندیشی، حاضر جوابی اور ذاتی اوصاف کا ایسے حلقوں میں چرچا ہوا، جہاں شاید جامعہ کا کسی اور سلسلے میں ذکر نہ آتا۔ ۔ ۔ ذاکر صاحب شیخ الجامعہ تھے اور بنیادی تعلیم کا پرچار بھی کر رہے تھے، جن کی مصلحت اندیشی کا یہ کمال تھا کہ جامعہ سیاسی عداوتوں کی لپیٹ میں نہیں آیا اور مدرسہ ابتدا ہی میں ۔ ۔ ۔ بنیادی تعلیم کا نمونہ بن گیا۔"

"ذاکر صاحب کی بعض خوبیوں کا احساس اس وقت ہوا، جب وہ ۱۹۴۸ء کے آخر میں علی گڑھ چلے گئے۔"

(ذاکر صاحب اور تعمیر جامعہ جشن ذاکر حسین ۸ فروری ۱۹۸۷ء کے موقع پر)

عبداللطیف اعظمی صاحب جامعہ میں ذاکر حسین صاحب کے نہ صرف شاگرد رہے بلکہ انھوں نے ۱۹۴۸ء تک جب تک ذاکر صاحب جامعہ میں رہے ان کی رہنمائی میں کام بھی کیا ہے۔

عبداللطیف اعظمی:

"ذاکر صاحب جوڑ توڑ کے آدمی نہیں ہیں۔ انھوں نے عمر کا بڑا اور بہترین حصہ تعلیم کی خدمت میں کھپایا اور ہنگامی سیاست سے کلیتاً الگ تھلگ رہے۔"

"انھیں اپنی شرافت، نیکی، رواداری اور دل موہ لینے والے انداز گفتگو سے مخالفوں کو رام کرنے، دشمنوں کو دوست بنانے اور دوستوں کی دوستی کو برقرار رکھنے کا گُر خوب آتا ہے۔"

"ذاکر صاحب کی شخصیت ملکی مسائل کے حل کرنے میں جس قدر ممد و معاون ہو سکتی ہے اسی قدر ان سے بیرونی ممالک سے تعلقات کو استوار کرنے اور ان کو خوشگوار بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔"

"ان کی سب سے بڑی کمزوری مروت ہے۔ ایک حساس اور درد مند دل رکھتے ہیں۔ ۔ ۔ وضع داری کو قائم رکھنا اور انسانیت کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

(ڈاکٹر ذاکر حسین (سیرت و شخصیت)

کرنل بشیر حسین زیدی کو بھی ذاکر صاحب کی دوستی کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان دونوں حضرات کے تعلقات کی نوبت یہ تھی کہ بقول کرنل صاحب خود۔ ۔ ۔ "انتقال کے وقت تک ان کا گھر میرے اور میرے بچوں کے لیے کھلا رہا اور راشٹرپتی بھون میں بھی یہ ہدایت تھی کہ میں اور میرے بچے بغیر کسی روک ٹوک کے ان کے پاس جا سکیں۔ کئی دفعہ سیکورٹی سے نظر بچا کر مجھ سے میرے گھر بھی ملنے آجاتے تھے۔"

(نقش ذاکر)

کرنل بشیر حسین زیدی:

"ذاکر صاحب کی ذات میں جلال بھی تھا اور جمال بھی، مگر وہ دانستہ جلال کو جمال کی تہہ میں دبائے رکھتے تھے۔"

"آدمی ذہین تھے، ان کی دلچسپیاں سطحی نہیں ہوتی تھیں۔"

"ذاکر صاحب میں بہت تحمل اور بردباری تھی۔ وہ خاموشی سے بہت کچھ سہہ لیتے تھے۔"

(نقش ذاکر، مرتبہ عبداللطیف اعظمی)

آخر میں عبدالماجد دریابادی کی مختصر مگر گراں قدر رائے پر اس مضمون کا اختتام کیا جاتا ہے۔

"ہمارے ذاکر صاحب کی سیرت و کردار کا خلاصہ کوئی ایک لفظ میں اگر رکھ دینا چاہے تو وہ ایک لفظ شرافت ہوگا۔" ●

قلم کار حضرات سے

گزارش ہے کہ

(۱) مضامین / دیگر تصانیف جو یوجنا کو ارسال کریں انہیں کہیں اور چھپنے کے لئے قطعاً نہ بھیجیں۔

(۲) ہر مضمون کے آخر میں طبع زاد / غیر مطبوعہ لکھ کر اپنا دستخط، نام اور پتہ ضرور درج کریں۔

(۳) مضمون کی اصل ہمیں ارسال کریں فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۴) مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کریں۔

(۵) مضامین میں جو اقوال (QUOTATIONS) استعمال کئے گئے ہیں، ان کے سورس کا حوالہ دینا لازمی ہے۔

(۶) مضامین میں انگریزی الفاظ کا استعمال بدرجہ مجبوری ہی کریں۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں۔

(ادارہ)

رئیس صدیقی

فخرِ ہند — ستیہ جیت رے

بنگال کے ایک بہت ہی ممتاز، ذہین اور مہذب خاندان سے تعلق رکھنے والے ستیہ جیت رے کا کنبہ فن و ادب کی دنیا میں خاص طور پر مشہور رہا۔ ان کے والد سوکمار رے ملا کے ذہین اور عقل مند آدمی تھے۔ وہ اپنے وقت کے ایک ممتاز ادیب اور مصوّر بھی تھے۔ ستیہ جیت رے کے دادا اوپندر کشور رے، رابندر ناتھ ٹیگور کے گہرے دوست، ایک مانے ہوئے اسکالر، مشہور ادیب اور فنِ موسیقی کے ماہر تھے۔

دو ڈھائی برس کی عمر میں ان کے والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ والد کی موت پورے خاندان کے لیے ایک سانحہ ثابت ہوئی۔ کاروبار تباہ ہو گیا اور گھر کے سب ہی افراد کو مفلسی نے آگھیرا۔ مجبور ہو کر ستیہ جیت رے کی والدہ کو اپنے بھائی کے گھر منتقل ہونا پڑا۔ اس وقت ستیہ جیت رے کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ اپنے بیٹے کی پرورش اچھے ڈھنگ سے ہو سکے، یہ سوچ کر ان کی والدہ نے ایک اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت بھی کر لی۔ ستیہ جیت رے اپنے والد کی موت سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ بڑے ہو کر فلم کار بننے پر اپنی فلموں میں کسی کردار کی موت کا سین پیش کرتے وقت اپنے والد کی جاں کنی کے منظر کو کبھی بھلا نہ پائے۔

ستیہ جیت رے کے ماموں جو کہ ان کے سرپرست بھی تھے ایک شریف اور رحم دل انسان تھے۔ ۱۹ برس کی عمر میں ستیہ جیت رے نے کلکتہ کے پریزیڈنسی کالج سے اقتصادیات میں ڈگری حاصل کی اور پھر وہ ٹیگور کے شانتی نکیتن چلے گئے جہاں انھوں نے مصوّری اور موسیقی کی تعلیم پائی۔ ٹیگور کی موت کے بعد ستیہ جیت رے نے شانتی نکیتن کو خیرباد کہہ دیا اور بلاک میکنگ سے اپنے روزگار کی ابتدا کی۔ وہ ایک برٹش ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ایک کمرشیل آرٹسٹ کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے اور انھیں چند ماہ کے لیے انگلینڈ جانے کا موقع ملا جہاں سینے آرٹ سے ان کی خوابیدہ دلچسپی بیدار ہو گئی۔ انگلینڈ میں دورانِ قیام انھوں نے تقریباً سو فلمیں دیکھیں جن میں امریکہ اور انگلینڈ کی متعدد کلاسیکی فلمیں بھی تھیں۔ انھوں نے وہاں کی ممتاز فلمی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں اور فلم آرٹ کو واضح طور پر سمجھنے کی پوری پوری کوشش بھی کی۔

۱۹۵۲ء سے ستیہ جیت رے فلم کے کلا مندر میں داخل ہوئے اور آخری دم تک ان کی سوچ فلم آرٹ سے وابستہ رہی۔

انھوں نے اپنی زندگی میں صرف ۳۶ فلمیں بنائیں۔ ۲۸ فیچر فلمیں۔ ایک ٹیلی فلم اور سات ڈاکومینٹری فلمیں۔ "شطرنج کے کھلاڑی" ان کی پہلی ہندی فلم تھی جو منشی پریم چند کے افسانے "شطرنج کے مہرے" کی بنیاد پر از سرِ نو لکھی گئی تھی، جس میں اودھ کی زوال پذیر حکومت کا دورِ دکھایا گیا ہے۔

"چارولتا" کو بعض نقاد ستیہ جیت رے کی بہترین فلم قرار دیتے ہیں۔ دراصل ٹیگور کی اس کہانی کا موضوع وہی ہے جس پر آج تک بمبئی کے فلم ساز کم از کم ۵۰ فلمیں بنا چکے ہیں۔

جاپان کے ایک مشہور فلم کار اکیرا کروساوا نے کہا تھا کہ "ستیہ جیت رے کی فلموں کو نہ دیکھنے کا مطلب ہے کہ اس دنیا میں رہ کر سورج اور چاند کو محسوس نہ کرنا۔ ان کی فلموں کو دیکھ کر ان پر تبصرہ کرنا بھی مشکل ہے کیوں کہ شعر نہ سمجھا جاتا ہے اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے بلکہ محسوس کیا جاتا ہے۔ ستیہ جیت رے کی فلمیں بھی سمجھنے یا سمجھانے سے زیادہ محسوس ہی کی جا سکتی ہیں۔"

جن خصوصیات کی بنا پر ان کی فلموں کو امتیاز حاصل ہوا ان میں پہلی خصوصیت یہ تھی کہ ستیہ جیت رے اپنی فلموں کے ماسٹر ڈائرکٹر تھے۔ یعنی وہ اپنی فلم کے ڈائرکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ رائٹر، ایڈیٹر، میوزک ڈائرکٹر، کیمرہ مین اور ڈیزائنر بھی خود ہی ہوتے تھے۔

ستیہ جیت رے کی اپنی قیافہ شناسی نے بھی ان کی فلموں کو بڑی جلا بخشی ہے۔ وہ فلم میں حالات، واقعات، ماحول اور کردار کے مزاج کے تحت انسانی جذبات، احساسات اور تاثرات پیش کرنا بخوبی جانتے تھے۔ بچوں کے دکھ سکھ کو سمجھنے کا علم انھیں اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملا تھا۔ وہ بچوں کی نفسیات سے بھی خوب واقف تھے۔

ستیہ جیت رے کی اکثر فلموں کے خاموش مناظر خود اتنا "بولتے" ہیں کہ ان کو دیکھنے والے

باقی صفحہ ۴۲ پر

---

۹۶ سرسوتی کنج سوسائٹی، ۲۵۔ مدر ڈیری روڈ، دہلی ۹۲

نثار احمد صدیقی

مسلح افواج - ایک پُر وقار پیشہ

بلند حوصلہ اور جوان عزم رکھنے والے نوجوانوں کے لیے فوج ایک پرکشش پیشہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "فوج" محض پیشہ نہیں ہے بلکہ ایک طرزِ زندگی ہے۔ یہ زندگی کا وہ راستہ ہے جو آدمی کو ایک بالکل مختلف سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ فوج کی تربیت ایک خام سے نوجوان کو ایسا کندن بنا دیتی ہے جو حوالدار عبدالحمید، کیپٹن شاہجہاں، میجر کمار اور مانک بھاشیہ جیسے شہیدانِ وطن کے لہو کی طرح عروسِ وطن کے ماتھے کی افشاں بن کر دمکتا ہے اور مستقبل کے نوجوانوں کو جرأت و شجاعت کی داستانیں سنا کر ان کے شوق کی لے تیز کرتا ہے۔

جنگ ہو یا امن۔ فوج ہمیشہ مصروفِ عمل رہتی ہے۔ اس کے کام کی نوعیت سطح اور افرادی قوت کی گنجائش حکومت کی پالیسی کے مطابق کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ملک کی جغرافیائی سرحدوں کا دفاع، فوج کا بنیادی اور اولین فریضہ ہوتا ہے۔ روزگار کی صورتِ حال کی وجہ سے فوج میں آنے کے خواہش مند نوجوانوں کی تعداد میں سال بہ سال اضافہ ہو رہا ہے کیوں کہ یہاں انھیں صرف محفوظ ملازمت ہی دستیاب نہیں ہوتی بلکہ بغیر کسی خرچ کے کوئی ہنر سیکھنے یا اعلا تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بھی میسر آتے ہیں۔ فوج کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھنے والے کا بنیادی کام ملک کا دفاع ہے۔ جو لوگ فوج میں آنے کی خواہش رکھتے ہیں انھیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی تربیت کا بنیادی نکتہ یہ ہوتا ہے کہ وقت پڑنے پر دشمن کو ختم کر دینا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ خود بھی نشانہ بن سکتے ہیں۔

بریہ (آرمی) بحریہ (نیوی) اور فضائیہ (ایئرفورس) مسلح افواج کے تین شعبے ہیں۔ ہر شعبہ کا بنیادی کام ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان تینوں افواج کا ہر شعبہ متعدد ذیلی شعبوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ فوج کو صرف لڑاکا جوانوں اور افسروں کی ہی ضرورت نہیں ہوتی اسے ڈاکٹر، انجینئر، منتظم، اساتذہ اور دیگر متعدد ہنر مندوں اور تکنیکی مہارت رکھنے والے افراد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے دفاعی سائنس میں تکنیکی مہارت بڑھتی جا رہی ہے، ویسے ویسے تکنیکی صلاحیتیں رکھنے والوں کی طلب و اہمیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

مسلح افواج، ہر طرح کی صلاحیتیں رکھنے والے نوجوانوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہیں۔ بیشتر نوجوان جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر وطن کی خدمت کے لیے آتے ہیں۔ مہم جو نوجوانوں کو خطرات سے کھیلنے کا شوق اس راستے پر لے کر آتا ہے۔ سیاحت کے شوقین ہواؤں میں اڑنے اور سمندروں میں سفر کرنے کی لگن لے کر آتے ہیں اور کچھ لوگ ہوتے ہیں جو سخت کوشی کو ایک چیلنج سمجھ کر یہ راستہ اختیار کرتے ہیں۔

نظم و ضبط، فوج کی زبردست تنظیم کی بنیادی طاقت ہے۔ جو لوگ فوج میں شامل ہوتے ہیں انھیں اپنی زندگی کو نظم و ضبط کا عادی بنانا پڑتا ہے۔ نظم و ضبط قبول کرنا ہوتا ہے اور احکامات کی تعمیل کرنا ہوتی ہے دوسروں کے ساتھ مل جل کر ایک ٹیم کی صورت میں کام کرنے اور ہم کار ساتھیوں سے مانوس ہونے کی صلاحیت بھی لازمی ہے۔ فوجی سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ صاف ستھرا، خوش لباس اور سلیقہ مند ہو۔ لڑاکا فوج کے افراد کو خصوصاً سخت جان اور مضبوط جسم کا ہونا چاہیے۔ اپنے پیشے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جوش، ولولہ جذباتی، حوصلہ، اطاعت اور رفاقت کی خصوصیات بھی ضروری ہیں۔ فوج کے افسر بالعموم پیشہ ورانہ قابلیت کے حامل ہوتے ہیں اور انھیں انتظامی اور تنظیمی امور انجام دینے ہوتے ہیں۔ انھیں اپنے محدود حلقۂ اختیار میں قائدانہ ذمہ داریاں پوری کرنا ہوتی ہیں۔ فوج کے جوان اپنے افسروں کے کردار اور عمل سے تحریک پاتے ہیں۔ مسلح افواج کا پیشہ اختیار کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ملک اور بیرونِ ملک کسی بھی جگہ کسی بھی موسم میں کام کرنا ہوگا۔

فوج کے تین بڑے شعبے ہیں جنھیں بریہ (آرمی) بحریہ (نیوی) اور فضائیہ (ایئرفورس) کہا جاتا ہے۔ اس مضمون میں بری فوج کے بارے میں معلومات دی جا رہی ہیں۔

بری فوج کی تنظیم سیکشن سے کور کی سطح تک ہوتی ہے۔ رجمنٹ یا بٹالین بری فوج کی تنظیم کا ایک درمیانہ یونٹ ہے۔ ہر رجمنٹ بٹالین ایک خاص کام کی ماہر ہوتی ہے اور اس کے افسروں اور جوانوں کا انتخاب اس خاص مہارت کی صلاحیت رکھنے والے افراد میں سے کیا جاتا ہے۔ رجمنٹ کو دورانِ جنگ یا اس سے پہلے ان

کلامی محلہ، اورنگ آباد-۸۲۴۱۰۱- بہار

کی خدمات کی نوعیت کے پیش نظر تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

لڑاکا بازو

یہ وہ فوجی دستے ہوتے ہیں جنھیں جنگ میں براہ راست مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ لڑاکا فوج تین حصوں میں مشتمل ہوتی ہے۔ (۱) رسالہ (آرمرڈ) (۲) پیدل (انفینٹری) (۳) بری فضائیہ (آرمی ایوی ایشن)

معاون بازو

اس شعبہ کے افراد کو بھی لڑنے کی تربیت دی جاتی ہے لیکن ان کا بنیادی کام لڑاکا شعبہ کی اس طرح مدد کرنا ہے کہ وہ لڑائی جاری رکھ سکے، معاون بازو کے بدرج ذیل حصے ہیں۔ (۱) توپخانہ (آرٹلری) (۲) انجینئرز۔

معاون خدماتی

لڑاکا بازو اور معاون بازو دونوں عملی جنگ میں براہ راست شریک ہوتے ہیں لیکن معاون خدماتی کے شعبوں کے افراد بنیادی طور پر لڑاکا فوج کا حصہ نہیں ہوتے۔ وقت پڑنے پر یہ بھی لڑ سکتے ہیں لیکن ان کا بنیادی کام لڑنے والے دونوں شعبوں (لڑاکا بازو، معاون بازو) کو ایسی خدمات مہیا کرنا ہے جن کی مدد سے جنگ جاری رکھی جا سکے۔ معاون شعبوں میں درج ذیل نام شامل ہیں۔ (۱) آرمی سروس کور (۲) آرمی میڈیکل کور (۳) آرڈیننس کور (۴) کور آف الیکٹریکل اینڈ میکنیکل انجینئرز (۵) آرمی سگنلز کور (۶) کور آف ملٹری پولیس (۷) آرمی ایجوکیشن کور (۸) آرمی ڈینٹل کور (۹) انٹر سروسز پبلک ریلیشنز۔ فوج کے اہم لڑاکا دستوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

رسالہ: ٹینک جنگ کا فیصلہ کن ہتھیار ہے۔ قدیم دور میں جنگیں گھوڑوں پر بیٹھ کر لڑی جاتی تھیں۔ آج ٹینکوں پر بیٹھ کر لڑی جاتی ہیں۔ رسالہ کا کام دشمن کی صفوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دینا۔ اسے تتر بتر کر دینا، دشمن کے حوصلے پست کرنا اور بالآخر اسے تباہ و برباد کرنا ہے۔ یہ آہنی جوان اور افسر ہی ہوتے ہیں جو رسالے میں شامل ہو کر وطن کا دفاع کرتے ہیں۔ ان کو عرف عام میں بکتر بند دستے بھی کہا جاتا ہے۔

پیدل فوج (انفینٹری): پیدل سپاہی لڑاکا فوج کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ یہ فوج کے وہ دستے ہیں جو دشمن کا دو بدو مقابلہ کرتے ہیں اسے کرتے ہیں اور آگے بڑھ کر علاقہ فتح کرتے ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ فوج کا وہ شعبہ ہے جس کے لیے پوری فوج سرگرم عمل رہتی ہے۔ پیدل فوج کے ہر افسر اور جوان کے سامنے ہر وقت ایک چیلنج رہتا ہے۔ ان کی تربیت خاص انداز سے کی جاتی ہے جو انھیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ سخت ترین حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ چست ہوں اور سوچنے اور عمل کرنے میں ہر دم مستعد ہوں۔ پیدل فوج کے دستے پیدل بھی آگے بڑھتے ہیں اور بکتر بند گاڑیوں میں اور ہیلی کاپٹر کے ذریعہ بھی آگے پہنچائے جاتے ہیں۔

توپخانہ (آرٹلری): محاذ سے قدرے فاصلے پر رہتے ہیں۔ دشمن کے مورچوں پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگا کر اسے نیست و نابود کرنے کا کام توپ خانے کا ہے۔ ہلکی، درمیانی اور بھاری توپیں کام کرنے والوں کو ٹیم ورک کے ذریعہ بالکل درست نشانہ لگانے کا چیلنج دیتی ہیں۔ اب ایسی توپیں بھی آگئی ہیں جنھیں کسی گاڑی کے ذریعے کھینچنا نہیں ہوتا بلکہ وہ خود حرکت کرتی ہیں، آگے بڑھتی ہیں اور دشمن پر آگ برساتی ہیں۔

کمانڈو (ایس ایس جی): اسپیشل سروسز گروپ کے جانباز کئی ہنروں کے ماہر ہوتے ہیں۔ یہ وہ سرفروش ہوتے ہیں جنھیں کسی بھی مشن پر کسی بھی وقت اعتماد کے ساتھ بھیجا جا سکتا ہے۔ بہترین تربیت یافتہ اور انتہائی نوعیت کے نظم کے پابند، جسمانی اور ذہنی طور پر اعلاترین صلاحیتوں کے حامل، یہ ہمیشہ جنگ کے پیچیدہ اور خصوصی مرحلوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ ایس ایس جی کا نشان افتخار صرف ان ہی کے سینوں پر آویزاں کیا جاتا ہے جو صرف "بہترین" ہوں۔

فضائی دفاع: حساس اور نازک آلات اور ہتھیاروں کے استعمال کے ماہر افراد آرمی ایئر ڈیفنس میں شامل ہوتے ہیں ان کا مقصد زمین پر لڑنے والی فوج کا فضائی حملے سے دفاع کرنا ہے۔ اس شعبہ کے افراد کو فنی مہارت کی بہترین تربیت دی جاتی ہے۔ راڈار کا استعمال سکھایا جاتا ہے۔ توپ خانہ، میزائل، فائر کنٹرول اور ٹریکنگ وہ چند شعبے ہیں جن میں ان کی تربیت اور فنی مہارت کی آزمائش ہوتی ہے۔

بری فضائیہ (آرمی ایوی ایشن): یہ بری فضائی شعبہ ہے۔ اس شعبہ کے افراد دشمن کے علاقے میں جا کر جاسوسی کرتے ہیں۔ اس کی نقل و حرکت کی خبر لاتے ہیں اور کم بلندی پر پرواز کر کے دشمن کو تباہ کرتے ہیں۔ کوبرا گن شپ ہیلی کاپٹر اس شعبہ کا بنیادی ہتھیار ہے۔ محاذ جنگ پر فوجی دستوں، ہتھیار، گولہ بارود اور دیگر ضروری سامان کی فراہمی بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

انجینئرز: انجینئر پیدل فوج کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ یہ رسد کی گاڑیوں اور رسالے کے دستوں کے لیے راستے بناتے ہیں، نہروں اور دریاؤں پر پل تعمیر کرتے ہیں، رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں، بارودی سرنگیں بچھاتے ہیں یا انھیں صاف کرتے ہیں اور لڑنے والی فوج کی پیش قدمی کو جاری رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔

بری فوج میں انٹرمیڈیٹ کامیاب نوجوانوں کو بطور افسر شامل کیا جاتا ہے اور ضروری تعلیم و تربیت کے بعد انھیں سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز کر کے چند افراد اور ساز و سامان کا ذمہ دار بنایا جاتا ہے۔ افسر کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے یونٹ کے جوانوں اور ماتحت افسروں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے، تربیت کا شیڈول بنائے اور یونٹ کے انتظامی امور کو چلائے۔ ماتحت افسر بھی تربیت کا شیڈول مرتب کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ تربیت کب اور کس انداز سے دی جائے گی اس کا فیصلہ افسر کرتا ہے۔ افسر کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اپنے ماتحت افسروں اور جوانوں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھے۔ اگر یونٹ کے کسی جوان کو کوئی مشکل درپیش ہو تو افسر اسے مشورہ دے کر اس کی مشکل حل کر سکتا ہے۔ جوانوں اور ماتحت افسروں کا اعتماد حاصل کیے بغیر افسر اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام نہیں دے سکتا۔

جنگ کے دوران افسر کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ اپنے یونٹ کے لیے "فیصلے" کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افسر کو نہ صرف ہر قسم کے ہتھیاروں اور اسلحہ سے واقف ہونا چاہیے جو

باقی کور ۳ پر

فروغ صبا جامی

جان بچانے والے آلات

ایک چھوٹا سا فوکر طیارہ شمالی یورپ اور ان میں کہیں لاپتا ہو گیا اس پر متعدد مسافر سوار تھے جن کا سراغ نہ لگایا جا سکا۔ اس قسم کے حادثات کی صورت میں مسافروں کی جانیں بچانے کے لیے ان کی فوری تلاش ضروری ہوتی ہے۔ لیکن اگر برف باری، گھنے جنگل، دشوار گزار پہاڑی راستوں، وسیع صحراؤں یا ایسی ہی کسی رکاوٹ کے باعث سراغ نہ مل سکے تو امداد پہنچانے میں شدید دشواری ہو سکتی ہے اور زخمیوں کو فوری طبی امداد نہ ملنے کی صورت میں جانی نقصان کا خدشہ ہوتا ہے۔

کبھی زلزلہ، طوفان، سیلاب وغیرہ کے واقعات رونما ہوتے ہیں تو بڑی تعداد میں لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ تباہ شدہ عمارتوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کو تلاش کر کے نکالنا سب سے اہم اور پہلا کام ہوتا ہے۔ لیکن ٹوٹی پھوٹی عمارتوں میں ملبہ ہٹا کر تلاش کرنا بہت دقت، محنت طلب اور وقت کا کام ہے۔ امدادی کارکنوں کو اس سلسلے میں سب سے زیادہ دشواری اس صورت میں پیش آتی ہے کہ ممکن ہے جس جگہ وہ گھنٹوں محنت کر کے ملبہ ہٹا کر عمارت کے اندر پہنچیں، وہاں کوئی بھی نہ ہو اور برابر کی عمارت میں کوئی امداد کا منتظر انتظار ہی کرتا رہ جائے۔

آپ کو جان کر خوشی ہوگی کہ اب ان تمام مسائل کا حل تلاش کر لیا گیا ہے۔ چند سال قبل کی بات ہے سوئزرلینڈ کے برف زاروں میں ایک خاتون برف پر پھسلنے کے کھیل سے لطف اندوز ہو رہی تھیں، اس دوران وہ کافی دور نکل گئیں اور ایک مقام پر جا کر برف میں دھنس گئیں۔ امدادی جماعت نے ان کو صرف ۹ منٹ کے اندر تین فٹ گہری برف سے بے ہوش، لیکن زندہ حالت میں نکال لیا۔ یوں ان کی جان بچ گئی۔ اتنی گہری برف سے ان کا سراغ ایک چھوٹے سے آلے کی مدد سے لگایا جا سکا جو انھوں نے اسی روز صبح خریدا تھا۔ اس آلے کو "پرسنل لوکیٹر" (ذاتی تعین کرنے والا) کہا جاتا ہے۔ یہ آلہ مختصر سی پٹیوں کے ایک جوڑے کی شکل میں ہے جس کو آپ اپنے جوتوں سے منسلک کر سکتے ہیں یا کپڑوں سے ٹانک سکتے ہیں۔

اس آلے میں یہ خوبی ہے کہ جب کسی ڈی ٹیکٹر (تلاش کرنے والا آلہ) سے خورد موجیں (مائیکرو ویور) نشر کی جاتی ہیں تو یہ آلہ انھیں وصول کر کے ان میں تبدیلی پیدا کرتا ہے اور پھر انھیں واپس نشر کر دیتا ہے۔ ڈی ٹیکٹر ایک بندوق نما آلہ ہے جو ایک ٹرانسپونڈر (لمبر پائی آلہ) اور ہیڈ فون پر مشتمل ہوتا ہے۔ ڈی ٹیکٹر واپس آنے والی خورد موجوں کو آواز میں تبدیل کر دیتا ہے اور ہیڈ فون پر ان آوازوں کو سنا جا سکتا ہے۔

ڈی ٹیکٹر کے انٹینا پر بتیاں نصب ہوتی ہیں جو موصول ہونے والی موجوں کی نہ صرف شدت کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ اس سے سمت کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے۔ ڈی ٹیکٹر کو ہیلی کاپٹر یا چھوٹے امدادی طیارں وغیرہ میں رکھا جا سکتا ہے اور زمین پر تلاش کے دوران ہاتھ میں اٹھایا جا سکتا ہے۔ ایک ہیلی کاپٹر اس کی مدد سے صرف ایک منٹ میں ۳۱ ہزار مربع فٹ کے علاقے کی چھان بین کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گم شدہ فرد یا شئے ۳۱ ہزار مربع فٹ رقبے کے اندر ہے تو اسے صرف ایک منٹ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

"پرسنل لوکیٹر" چھ سو فٹ دور تک موجود فرد کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ یہ بہت کم قیمت ہے۔ اس سے نشر ہونے والا جوابی اشارہ ڈی ٹیکٹر کو تیس فٹ گہری برف سے بھی موصول ہو جاتا ہے۔ یہ آلہ کوہ پیماؤں، یا تودے پھسلنے کے نتیجے میں دب جانے والے افراد کی تلاش میں بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے آپ سوچ رہے ہوں کہ یہ آلہ تو صرف برف میں کام آ سکتا ہے۔ برف تو آسانی سے توڑی جا سکتی ہے اور ضرورت تو زیادہ تر زلزلوں یا حادثات وغیرہ کی صورت میں متاثرہ عمارتوں میں پھنس جانے والے افراد کی تلاش کی ہوتی ہے۔ اس کے لیے کیا کیا جائے گا؟ تو نوید ہو کہ چارہ گروں سے اس کا بھی علاج دریافت کر لیا ہے۔

یہ جدید طرز کا راڈار ڈبل روٹی رکھنے والے ڈبے سے مشابہ ہے۔ اس سے بھی خورد موجوں کے اشارے نشر ہوتے ہیں۔ اس کے استعمال کے لیے ایک بنیادی نکتہ یہ ہے کہ چوں کہ تنفس اور حرکت قلب زندہ انسان میں ہر وقت جاری رہتے ہیں۔ یہ قدرت کی طرف سے بہت بڑا اشارا ہے۔ انسان بیدار ہو یا عالم خواب میں ہو یا بے ہوش ہو یا کسی وجہ سے امداد کے لیے آواز نہ دے سکتا ہو، اس کے وجود کے اندر یہ قدرتی عمل جاری رہتے ہیں۔ چناں چہ یہ آلہ بہر صورت کسی ذی روح کا سراغ دے دے گا۔ اس سے بھی خورد موجی اشارے نشر ہوتے ہیں اور اس

باقی صفحہ ۳ پر

کلامی محلہ نزد مسجد۔ اورنگ آباد، بہار۔ ۸۲۴۱۰۱

محمد جنید صدیقی

ذیابطیس شکری

ذیابطیس کی بیماری میں اس تیزی سے اضافہ بھی موجودہ زمانے کی دین ہے۔ اب سے قبل یہ بیماری شاذ و نادر ہی ملتی تھی، البتہ اس کے بارے میں صحیح معلومات نہ ہونے اور اس کی دواؤں کے بارے میں جانکاری نہ ہونے کی وجہ سے اس کو ایک لاعلاج مرض سمجھا جاتا تھا۔ لیکن میڈیکل سائنس کی ترقی کے اس دور میں ذیابطیس ایک معمولی بیماری بن گئی ہے۔ گو کہ ابھی تک اس بیماری سے مستقل طور سے چھٹکارا پانے کا کوئی علاج دریافت نہیں ہوا ہے لیکن دواؤں اور پرہیز کی بدولت اب یہ مرض خطرناک نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن مریض کو ہمیشہ ہی دوا اور پرہیز کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔

ہمارا جسم ایک مشین کی طرح ہے اس میں ۲۴ گھنٹے کچھ نہ کچھ عمل چلتا رہتا ہے۔ جسم کو اپنے اعمال صحیح طور پر انجام دینے کے لیے بہت سے ترشحات و رطوبات وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں میں سے ایک رطوبت انسولین بھی ہے۔ یہ معدہ سے جڑے ہوئے ایک غدد بانقراس (PANCREAS) کے ذریعہ ترشح ہوتی ہے اور ہماری غذا میں موجود شکر کو ہضم کرنے میں مدد کرتی ہے۔ شکر جسم انسانی کے لیے ایک ایسی ضروری شے ہے جو انرجی میں تبدیل ہو کر جسم کے تمام اعضا کو قوت بخشتی ہے۔ لہٰذا اگر شکر صحیح طور پر ہضم نہیں ہوگی تو اعضا انرجی نہ ملنے کی وجہ سے اپنا کام صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے اور انسان زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسولین کی کمی کے سبب غذا میں موجود شکر انرجی میں تبدیل نہ ہو کر پیشاب کے ذریعہ جسم سے باہر خارج ہو جاتی ہے۔

جسم میں حرارت اور توانائی کو پیدا کرنے کے لیے شکر کا کچھ نہ کچھ حصہ گلائی کوجن کی شکل میں تبدیل ہو کر مستقل استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اس کا کچھ حصہ جگر میں بھی جمع رہتا ہے جو جسم میں شکر کی کمی و بیشی کے اعتبار سے استعمال ہوتا رہتا ہے۔ جسم میں موجود چربی بھی شکر کی عدم موجودگی اس مقصد کے لیے کام آتی ہے۔ اس طرح جسم میں شکر کا توازن بنا رہتا ہے۔

ذیابطیس کی بیماری میں بانقراس نام کے غدد سے انسولین کا ترشح یا تو بالکل بند ہو جاتا ہے یا اس کی مقدار کم ہو جاتی ہے جو جسم میں شکر کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔ اس ہارمون کی کمی کی وجہ سے ایک طرف تو نشاستہ دار غذاؤں سے حاصل کی ہوئی شکر خلیات کو نہیں مل پاتی دوسری طرف یہ خون میں جمع ہونے لگتی ہے اور جب خون میں اس کی مقدار زیادہ بڑھ جاتی ہے تو یہ شکر گردوں سے پیشاب کے ذریعہ خارج ہونے لگتی ہے اور پیشاب کے ذریعہ شکر کے مستقل اخراج کے ساتھ پانی اور نمک کی بھی اچھی خاصی مقدار خارج ہونے لگتی ہے۔ اگر یہ صورت کنٹرول نہ کی جائے تو مریض دن بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ مختلف قسم کی دوسری بیماریوں کا حملہ ہونے لگتا ہے اور بالآخر مریض موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

ذیابطیس کے مریض کو کیسے پہچانا جائے، دراصل شروع میں اس مرض کی کوئی ایسی ظاہری علامات جیسے بخار، درد، دست وغیرہ نہیں ہوتیں جس سے مریض خود اپنے مرض کا احساس کر سکے۔ اسی لیے اس مرض کا پتا اکثر کسی دوسرے مرض کے سبب پیشاب وغیرہ کی جانچ کرانے پر ہوتا ہے۔ اس مرض کی ظاہری علامات کے طور پر مریض کو بہت زیادہ پیاس لگتی ہے، زیادہ بھوک لگتی ہے اور پیشاب بھی بار بار اور زیادہ آتا ہے۔ پیاس کے سبب منھ خشک رہتا ہے۔ بھوک کی وجہ سے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کھانے کو دل چاہتا ہے۔ پیشاب کے سبب اکثر رات میں بھی کئی کئی بار اٹھنا پڑتا ہے۔ اگر کھلی جگہ پیشاب کیا جائے تو پیشاب میں شکر ہونے کے سبب اس کے چاروں طرف چیونٹیاں جمع ہونے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی جسم پر خارش بھی ہو جاتی ہے۔ ٹانگوں میں اکثر درد رہتا ہے اور پھوڑے پھنسیاں یا زخم پیدا ہو جائیں تو بہت دیر سے ٹھیک ہوتے ہیں اور ذرا سی غفلت اکثر ناسور کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور مریض پر مختلف بیماریوں کے حملے ہونے لگتے ہیں۔

ذیابطیس کے مرض میں غذا کا بڑا اہم رول ہے۔ ۴۰ سال سے زیادہ عمر کے مریض اکثر صرف کھانے پینے میں احتیاط برت کر ہی بیماری پر قابو پا سکتے ہیں۔ انسولین کی ایجاد کے بعد ذیابطیس کے مریضوں کو اب سخت پرہیز بھی نہیں کرنا پڑتا۔ البتہ مریض کو خاص خاص نشاستہ دار غذاؤں اور مٹھاس سے پرہیز کرنا

لیکچرر فیکلٹی آف میڈیسن جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

پڑتا ہے چوں کہ اس قسم کی شکر سیدھے خون میں شامل ہو جاتی ہے اور یہ غذائیں وزن بھی بڑھاتی ہیں اس لیے ذیابطیس کے مریض کو ہر قسم کی مٹھائیوں، حلوے، کیک، پیسٹری، شربت اور جیم وغیرہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ میدہ، چاول اور شکر قندی کا استعمال بھی احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے۔ روٹی بغیر چھنے آٹے کی استعمال کرنی چاہیے اور اگر کوئی اور مرض لاحق نہ ہو تو پروٹین خوب استعمال کرنی چاہیے۔ سبھی قسم کے گوشت، نیز انڈے، مچھلی، مرغ وغیرہ کھائے جا سکتے ہیں۔ پھل بھی تھوڑی تھوڑی مقدار میں استعمال کرتے رہنا چاہئیں کیوں کہ پھلوں کا میٹھاس نسبتاً کم نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس مرض میں اپنے وزن کو کنٹرول میں رکھنا بہت ضروری ہے — ذیابطیس کے مریض کو اپنی غذا کو چھوٹی چھوٹی خوراکوں میں تقسیم کر لینا چاہیے تاکہ ایک وقت میں جسم کے اندر تھوڑی تھوڑی شکر بنے اور استعمال ہو جائے۔

ذیابطیس کے مریض کے لیے ورزش بھی اہم ہے کیوں کہ ورزش کے ذریعہ شکر استعمال ہو جاتی ہے اور جسم میں چربی جمع ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ ایسے مریضوں کو ورزش اپنے روزمرہ کے معمولات میں شامل کر لینی چاہیے۔ ورزش خاص طور پر ان مریضوں میں زیادہ مفید ہے جو غذائی پرہیز سے اپنی بیماری قابو میں رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ورزش خالی پیٹ ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ ذیابطیس کے مریضوں کے لیے صبح کا وقت ورزش کے لیے بہترین وقت ہے اور سب سے اچھی ورزش پیدل چلنا ہے۔ چار پانچ کلومیٹر پیدل چلنا بہترین ورزش ہے۔

شکر کے مریض کو دونوں صورتوں میں یعنی دوا اور پرہیز میں غفلت کرنے یا ضرورت سے زیادہ دوا استعمال کرنے پر بے ہوشی کا دورہ پڑ جاتا ہے اس کو قوما بھی کہتے ہیں۔ اس لیے دونوں کی علامتوں کو پہچان کر اور غشی کا صحیح سبب جان کر تدبیر کی جائے۔ مثلاً شکر کی کمی کے سبب غشی تیزی سے آتی ہے جب کہ شکر زیادہ ہونے کے سبب پیدا ہونے والی غشی کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ نیز شکر کی کمی کے سبب پیدا ہونے والی غشی میں جلد گیلی اور چپچپی ہوتی ہے مریض کو گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ مریض کو بھوک زیادہ لگتی ہے اور پیاس کا احساس کم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس شکر کی زیادتی کے سبب پیدا ہونے والی غشی میں جلد خشک ہو جاتی ہے۔ مریض کو غنودگی ہونے لگتی ہے۔ سانس پھول جاتا ہے اور سانس میں میٹھے پھلوں کے رس کی سی بو آنے لگتی ہے۔ اس طرح کی غشی میں بھوک نہیں لگتی جب کہ پیاس کی شدت ہوتی ہے اور مریض کو اکثر قے ہوتی ہے۔

ذیابطیس کے مریض کے لیے ضروری ہے کہ وہ چند مندرجہ ذیل اصولوں پر ضرور عمل کرے۔

۱- اپنے معالج یا ڈاکٹر کی ہدایتوں پر پوری طرح عمل کرے۔
۲- علاج و پرہیز مستقل رکھا جائے اگرچہ مرض میں زیادتی بھی نہ رہے۔
۳- ذیابطیس کے مرض کو معمولی مرض سمجھیں اور مایوس نہ ہوں۔
۴- جسم کا وزن کسی بھی صورت میں نہ بڑھنے دیں۔
۵- جسم کی صفائی کی طرف خصوصی توجہ دیں تاکہ کوئی INFECTION نہ ہونے پائے۔
۶- اس مرض میں چوں کہ جلد کی حس کمزور ہو جاتی ہے اس لیے گرم چیزوں کو پکڑتے وقت احتیاط رکھیں کیوں کہ اکثر اوقات جلد جل جاتی ہے اور اس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا۔
۷- روزانہ پیشاب میں شکر کی جانچ کریں۔
۸- اگر ڈاکٹر انسولین کا ٹیکہ تجویز کرے تو گھبرائیں نہیں اور ٹیکہ خود لگانا سیکھ لیں۔ مریض کو چاہیے کہ انسولین کے بارے میں پوری معلومات رکھیں۔
۹- اپنے پاس تھوڑی مقدار میں شکر ہر وقت ساتھ رکھیں۔
۱۰- کسی بھی دوا کا استعمال خواہ طاقت کے انجکشن ہی کیوں نہ ہوں۔ بغیر ڈاکٹر کے مشورے کے استعمال نہ کریں۔ کیوں کہ بعض عام دوائیں بھی مریض کو نقصان دے سکتی ہیں۔ نیز جب کسی بیماری کے سبب ڈاکٹر کے پاس جائیں تو اس کو اپنے ذیابطیس کے مرض کے بارے میں ضرور بتا دیں۔
۱۱- اپنے پاس ہر وقت ایک کارڈ رکھیں جس میں اپنا نام و پتا لکھا ہو نیز کارڈ پر یہ بھی لکھیں کہ میں ذیابطیس کا مریض ہوں۔ میری بے ہوشی اسی مرض کے سبب ہے۔ براہ کرم میرے منہ میں تھوڑی سی شکر ڈال کر ڈاکٹر کے پاس پہنچا دیں۔ ●

بقیہ: پانچ راہوں کی شناسائی

ساری انسانی برادری کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"تم سچ کہہ رہے ہو۔ آج پوری دنیا تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔"

"تم پوری دنیا کے بارے میں مت سوچو اپنے دیس کی آزادی اور جمہوریت برقرار رکھنے کی فکر کرو۔ اچھا میں چلا۔"

"نہیں، ابھی ٹھہرو۔ آج کی رات تم میرے مہمان رہو۔ اس طوفانی رات میں کہاں جاؤ گے؟ شاید صبح تک۔۔۔"

"نہیں میرے شفیق، مجھے کہیں بھی ٹھہرنا نہیں ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے جب ان ۵ راہوں کا سراغ لگایا گیا تھا تو ان ہی راستوں سے ہوتا ہوا دنیا کے سارے دیسوں سے گزرا تھا۔ اس رات بھی ایسا ہی طوفان آیا تھا۔ لیکن مجھے ٹھوکر نہیں لگی تھی اور اب تو یہ راستہ میرا جانا پہچانا ہے۔ اس بار بھی میں ان ہی راستوں سے ان ۵ راہوں پر چلنے اور عمل کرنے کا پیغام دینے کے لیے نکلا ہوں، اگر انسان کش برادری نے میری باتوں پر توجہ نہیں دی اور جنگ اور خانہ جنگی پر آمادہ رہی تو نہ تم رہو گے اور نہ تمہارا خواب پایۂ تکمیل تک پہنچ سکے گا۔ ویسے اس زمین پر آئے دن زلزلے آتے رہتے ہیں، آندھیاں چلتی رہتی ہیں اور طوفانی ہواؤں سے ہزاروں جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ ملک کا کروڑوں، اربوں کا نقصان ہوتا ہے اور اس طرح بہتوں کے خواب پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتے۔ تم لوگ کتنے ناداں ہو کہ اپنی زمین کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہو۔ تمہیں چاہیے کہ پہلے اس زمین کو ہر بلا سے محفوظ کر لو۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہزار برس تک زندہ رہنے والی بات۔۔۔"

"ہاں، اگر تم بھی ہزاروں سال زندہ رہنا چاہتے ہو تو وقت کی قدر جانو اور جب تک جینا ہے، کسی کے لیے جیو اور اچھے کام کرو۔۔۔"

ہوا کا تیز جھونکا آیا اور میں لڑکھڑا گیا، بارش کی بوندیں بھی ٹپکنے لگیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا پھر اس انسان کی طرف نظر اٹھائی۔ مگر۔۔۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

میں آج بھی سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ ان ۵ راہوں کو چھوڑ کر میرا وجود کہاں پڑا ہوا ہے۔۔۔! کہیں پر تو نہیں!! پھر؟ ●

ڈاکٹر عرفان علیمی

مرضِ جذام — ناقابلِ علاج نہیں

جذام جسے کوڑھ بھی کہتے ہیں، ایک مزمن مرض ہے جو مائیکو بیکٹیریم لیپرے نامی جرثومے کے ذریعے ہوتا ہے اور اعصاب و جلد کو متاثر کرتا ہے۔ یہ ایک معمولی درجے کا متعدی مرض ہوتا ہے لیکن صرف ۲۰ فی صد مریض ہی متعدی ہوتے ہیں۔ جذام کے متعدی مریضوں کے ساتھ طویل عرصے تک رہنے سے یہ مرض صحت مند آدمی کو بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اس شخص کو جو متعدی مریضوں کے ساتھ رہتا ہوا سے یہ مرض لاحق ہو، کیوں کہ ۹۰ فی صد افراد میں جذام کے خلاف قدرتی طور پر قوتِ مدافعت موجود ہوتی ہے۔ اس مرض کے جراثیم عام طور پر بچپن ہی سے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس وقت اس مرض کے خلاف قوتِ مدافعت کا فقدان ہوتا ہے۔ جراثیم کے جسم میں داخل ہونے اور علامات کے ظاہر ہونے میں چند مہینوں سے لے کر ۴۰ سال تک کا طویل عرصہ لگ سکتا ہے۔

اس مرض کے سلسلے میں عموماً لوگ غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے موروثی مرض سمجھتے ہیں تو کچھ لوگ کسی مخصوص غذا کے استعمال کو اس کا سبب مانتے ہیں جیسے دودھ اور انڈے کے ایک ساتھ استعمال کو اس مرض کا سبب سمجھتے ہیں جب کہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہے۔

جذام کے مریضوں کے بچے صحت مند اور توانا پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں ایسے والدین جن کو متعدی قسم کا مرض ہو اور وہ اپنا علاج بھی نہ کر رہے ہوں تو ان کے بچوں کو اس مرض میں مبتلا ہونے کا خطرہ بنا رہتا ہے۔

اس مرض میں جسم کے کسی بھی حصے پر سفید یا سرخی مائل دھبے ظاہر ہونے لگتے ہیں جو مختلف جسامت اور تعداد میں ایک یا اس سے زائد بھی ہو سکتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان دھبوں پر پسینہ نہیں آتا ہے اور ان دھبوں پر کٹنے، جلنے یا چبھنے کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ چوں کہ اس مرض کے جراثیم عام طور پر اعصابی تاروں کے نظام اور جلد پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے جلد پر دھبے یا گلٹیاں نکل آتی ہیں۔ ان دھبوں کی تعداد، شکل اور حجم مختلف ہوتی ہے۔

اعصابی تاروں کا نظام چوں کہ دماغ کو خطرات کی اطلاع دیتا رہتا ہے اور دماغ اعضا کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتا رہتا ہے اس لیے جب ہمیں کانٹا چبھتا ہے تو ہمیں فوراً احساس ہو جاتا ہے اور ہم اسے نکال دیتے ہیں۔ جب ہمارا ہاتھ کسی گرم چیز پر پڑتا ہے تو ہمیں فوراً احساس ہو جاتا ہے اور ہم اپنا ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس جب اعصابی تاروں کے قدرتی نظام کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے تو وہ دماغ کو باخبر کرنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے اور دماغ حفاظتی تدابیر کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جذام کے مریضوں میں کانٹا چبھنے اور آگ سے جلنے کا احساس نہیں ہوتا ہے اور اس طرح معمولی سا کانٹا چبھنے سے اس مقام پر زخم ہو جاتا ہے۔ چوں کہ جذام کے مریض کو نہ تو زخم کا کوئی احساس ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی تکلیف ہوتی ہے اس لیے وہ اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا ہے۔ نہ تو وہ کوئی حفاظتی تدبیر اختیار کرتا ہے اور نہ ہی دوا علاج کرتا ہے جس کی وجہ سے زخم بڑھتا جاتا ہے اور اس میں سڑنے گلنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جذام کے وہی مریض بدشکلی کا شکار ہوتے ہیں جو صحیح وقت پر علاج کرانے سے گریز کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شروع میں اس مرض میں مبتلا مریض سماج کے ڈر سے اپنے مرض کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے گو کہ یہ اس کی بھول ہوتی ہے کیوں کہ مرض کے بڑھ جانے کی صورت میں وہ بدشکل ہو جاتا ہے اور تب لاکھ چھپانے پر بھی اس کا مرض سب پر ظاہر ہو جاتا ہے۔

جذام پوری طرح قابلِ علاج مرض ہے۔ جدید اور موثر ادویات کے ذریعے چھ ماہ سے دو سال تک علاج کرانے سے یہ مرض پوری طرح ختم ہو جاتا ہے۔ اب تو سرکار نے اس مرض کے علاج کے لیے علاحدہ صحتی مراکز کھولے ہیں جہاں اس مرض میں مبتلا مریضوں کی جانچ کی جاتی ہے اور دوائیں مفت دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسی فلاحی تنظیمیں بھی اس مرض کے خاتمے کے لیے مصروفِ عمل ہیں اور ضرورت مندوں کو دوائیں مفت تقسیم کرتی ہیں۔

اس مرض کے بڑھنے اور پھیلنے کا سب سے اہم سبب ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے وہ غلط تصورات ہیں جن کے سبب ہم اس مرض میں مبتلا مریضوں کے ساتھ برابر کا برتاؤ نہیں کرتے، انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا اور شادی بیاہ کرنا معیوب سمجھتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مریض احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور سماج کے ڈر سے اپنے مرض کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ اسی وجہ سے روز بروز اس مرض میں اضافہ ہو رہا ہے۔

باقی صفحہ ۳۹ پر

نوائے طب و صحت، پوسٹ آفس بیگم سرائے، الٰہ آباد ۱۵

مناظر حسین

بادام کی طبی خصوصیات

بادام خشک میووں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ درحقیقت یہ دماغ کا بہترین غذائی ٹانک ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کو اس کا استعمال ضرور کرنا چاہیے۔

شہنشاہ اکبر سے جسے مغلِ اعظم بھی کہا جاتا ہے کسی نے پوچھا۔ "تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود آپ کا دماغ بہت اچھا ہے" اس کی کیا وجہ ہے؟ اکبر کا جواب تھا۔ "میں بلاناغہ بادام استعمال کرتا ہوں۔"

دنیائے شاعری کے بے تاج بادشاہ مرزا اسداللہ خاں غالب بھی بادام کے بڑے شائق تھے اور کھانا کھانے کے بعد اس کی گریاں اکثر چبایا کرتے تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی اپنے کند ذہن اور غبی شاگردوں کے لیے ناشتے میں بادام تجویز کرتے تھے۔

بادام کی یوں تو بہت سی اقسام ہیں مگر عام طور پر دو ہی زیادہ مشہور ہیں، میٹھا بادام اور کڑوا بادام۔ میٹھا بادام اپنے کیمیائی تجزیے میں چونکہ لحمیات، فاسفورس، نشاستہ اور حیاتین رکھتا ہے اس لیے مفید ہے۔ کڑوے بادام میں ہائیڈروسیانک ایسڈ پایا جاتا ہے جو مہلک زہر ہے۔

بادام کی خاصیت گرم ہے۔ ویسے اسے گرم اور معتدل بتایا جاتا ہے۔ اثرات اور تاثیر کے لحاظ سے بادام ایک کثیر الفوائد غذا ہے۔ یہ دل و دماغ کو طاقت بخشتا ہے۔ بصارت کو تیز کرتا ہے۔ دوسری اشیاء کے ساتھ اس کا استعمال کیا جائے تو اس کے خواص مختلف ہو جاتے ہیں۔ انجیر اور شکر کے ساتھ کھانے سے قبض کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔ بادام ایک روغنی میوہ ہے لہٰذا اس کا استعمال آنتوں میں چکناہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ لاغر اور دبلے پتلے جسم کو قوت بخشتا ہے اور فربہ کرتا ہے اور انسانی صلاحیتوں کو بیدار کر کے چاق و چوبند اور چست بناتا ہے۔ خارش، جسم کی خشکی اور جسمانی اعضا کی کمزوری رفع کرنے کے لیے روغن بادام کی مالش مفید رہتی ہے۔ بادام کا حلوہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے طاقتور بنانے کے علاوہ سر درد، زکام اور نزلہ کو ختم کر دیتا ہے۔

میٹھا بادام دماغی کمزوری دور کرنے کے لیے طب میں اکسیرِ اعظم کہلاتا ہے۔ دماغ انسانی جسم میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس کی کمزوری سے بے شمار بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، سر میں درد رہنے لگتا ہے، نظر کمزور ہو جاتی ہے، کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آتی ہیں۔ آنکھوں کے سامنے اچانک اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ پڑھائی میں طبیعت نہیں لگتی۔ یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ حافظہ جواب دے جاتا ہے۔ ان سب امراض کا شافی علاج بادام ہے۔

بادام، طریقۂ استعمال اور فوائد

بادام، سونف اور مصری برابر مقدار میں لے کر کوٹ لیں اور اسے کسی شیشے کے جار میں رکھ لیں۔ اسے نصف تولہ سے ایک تولہ تک رات میں ڈھائی سو گرام دودھ کے ساتھ کھائیں۔ دودھ دستیاب نہ ہو تو سادہ ہی استعمال کریں لیکن شرط یہ ہے کہ کھانے کے بعد صبح تک پانی بالکل نہ پئیں تو بینائی میں اضافہ ہوگا اور اگر عینک لگاتے ہیں تو وہ انشاء اللہ اتر جائے گی۔

رات کو ۵ بادام پانی میں بھگو دیں۔ صبح چھوٹی الائچی کے ساتھ دانتوں سے خوب پیس کر لعاب دہن میں شامل کر کے کھائیں۔ مسلسل دماغی کام کرنے سے تکان ہو جاتی ہو تو شام کو تین چار گریاں کالی مرچوں کے ساتھ چبا لینا بے حد مفید ہے۔

یادداشت کو بہتر بنانے کے لیے دو آسان اور قیمتی نسخے تحریر کر رہا ہوں۔

۱۔ صبح نہار منہ بادام کی ۵ گریاں تھوڑے مکھن کے ساتھ کھا لیا کریں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو ۵ گریاں جیب میں ڈال کر گھر سے نکلا کریں اور آدھا آدھا گھنٹے کے وقفے سے ایک ایک گری منہ میں رکھ کر اچھی طرح چبائیں۔

۲۔ پہلے روز ۵ بادام کھائے جائیں اور پھر روزانہ ایک عدد بڑھاتے چلے جائیں یہاں تک کہ گیارہ عدد تک پہنچ جائیں۔ اس کے بعد ایک ایک بادام روزانہ کم کرتے جائیں یہاں تک کہ ۵ بادام پر آ جائیں۔ اگر موسم گرمیوں کا ہو تو بادام کی گری کو رات کے وقت پانی سے بھرے ہوئے مٹی کے برتن میں ڈال دیں اور صبح کو مصری کے ساتھ استعمال کریں۔ جاڑوں میں پانی میں بھگونے کی ضرورت نہیں۔

دماغ کی خشکی کا شافی علاج بادام سے کیا جا سکتا ہے۔ خشکی پیدا ہونے کی صورت میں سماعت بھی متاثر ہوتی ہے اور کم سنائی دیتا ہے اس کے لیے روغن بادام نہایت مفید ہے۔ طریقۂ استعمال یہ ہے کہ رات کو سوتے وقت روغن بادام کی سر میں اچھی طرح مالش کی جائے۔ دو دو بوند

موضع ڈیلی [illegible] ڈاکخانہ [illegible] ضلع گیا (بہار) [illegible]

...کھانے میں ڈال کھائے اور بطور ناشتہ کھایا جائے۔ اس کے ساتھ تین ماشہ سے ایک تولہ تک مقدار روغن بادام دودھ میں ملا کر پینے سے بھی دماغ کی خشکی ختم ہو جائے گی۔

دل کی دھڑکن اور دل کی کمزوری کے لیے شربت بادام از حد مفید ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ دس تولہ بادام، ایک تولہ چھوٹی الائچی کے دانے اور ڈیڑھ تولہ صندل کا بُرادہ لے کر ان سب کو ایک سیر عرق گلاب میں گھوٹ کر کپڑے سے چھان لیں۔ اب ڈیڑھ سیر مصری کا قوام بنائیں اور اس میں ملا کر بوتلوں میں بند کر لیں۔ حسب ضرورت ۵ تولہ شربت پانی میں ملا کر دن میں دو بار استعمال کرائیں۔

شہد اور بادام

شہد کے ساتھ بادام کا استعمال بھی دماغ کی کارکردگی اور حافظہ کو قوی بنانے کے لیے اکسیر ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ چینی کے مرتبان یا شیشے کے مرتبان میں ۲۵۰ گرام بادام، نصف کلو گرام شہد خالص میں ڈال کر دن کی دھوپ میں اور رات کو شبنم میں رکھیں۔ ۴۰ دنوں کے بعد اس مرتبان میں سے ایک بادام روزانہ کھائیں اور تھوڑا شہد مرتبان میں سے چاٹ لیں۔ چند دنوں میں ہی دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔

جب نزلے کے سبب بار بار گلے میں خراش ہوتی ہو خشک کھانسی ستا رہی ہو اور بلغم خارج ہونے میں دشواری اور سانس کی تنگی ہو تو چھ ماشے روغن بادام ایک تولہ شہد میں ملا کر بار بار چاٹنے سے حلق تر اور بلغم آسانی سے خارج ہو کر کھانسی اور سانس کی تنگی کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔ فائدہ ہونے کے بعد اس کا استعمال روک دینا چاہیے۔

بادام کی چائے تبخیر معدہ کے لیے بے حد مفید ہے۔ صبح و شام چائے بناتے وقت دودھ کے بجائے ۱۲ عدد بادام کا دودھ نکال کر دودھ کی جگہ ڈالیں۔ چینی کے بجائے اس چائے کو شہد سے میٹھا کریں اور صبح و شام استعمال کریں۔ اس سے معدہ کی شکایات تو دور ہوں گی ہی بینائی میں بھی اضافہ ہوگا۔

شہد اور روغن بادام روزانہ کھاتے رہنے سے چند ہفتوں میں اعصاب اور پھیپھڑے مضبوط ہو جاتے ہیں اور قبض کی شکایت جاتی رہتی ہے جب دماغ کی کمزوری اور خشکی سے سر درد، چکر، غصہ اور چڑچڑاپن زیادہ ہو تو چند روز دودھ میں روغن بادام ایک سے تین چمچے ملا کر پینے سے یہ شکایات دور ہو جاتی ہیں۔

نیند نہ آنا، ذہنی انتشار، دماغی پریشانی، پاگل پن، جنون، مالیخولیا اور دائمی قبض دور کرنے کے لیے صدیوں سے روغن بادام دودھ میں ملا کر استعمال کرایا جاتا رہا ہے۔ نیند لانے کے لیے روغن بادام کی مالش گھروں میں اب بھی بزرگوں کا معمول ہے۔

بادام کا استعمال چہرے کو داغ دھبوں سے نجات دینے اور افزائش حسن کے لیے بھی ہوتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ بادام کے چھلکوں کا روغن پتال جنتر کے ذریعہ کشید کر لیں اور اسے کسی صاف شیشی میں رکھ چھوڑیں بوقت ضرورت اسے دو تین بار چہرے پر مالش کرنے سے بدنما داغ دھبے، جلنے کے بعد کے زخم کا نشان، خشک داد اور چھیپ کی شکایت دور ہو جاتی ہے اور چہرہ حسین اور پُر رونق ہو جاتا ہے۔

دماغ اور اعصاب کمزور ہوں، تکان جلد آجاتی ہو، بدن میں درد رہتا ہو اور قبض کی شکایت رہتی ہو تو اس کے لیے ایک مجرب نسخہ تحریر ہے۔

مغز بادام گیارہ سے ۲۱ عدد، ایک تولہ سونف اور ڈیڑھ تولہ خشخاش چند دنوں تک بطور سردائی رگڑ کر مصری یا شکر ملا کر پینے سے مذکورہ شکایات یقیناً رفع ہو جائیں گی۔

انسانی صحت میں دانت اور مسوڑھے بھی نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔ بادام کے چھلکے جلا کر ایک تولہ گول مرچ، ایک تولہ عاقرقرحا اور دو تولے نمک لاہوری سب کو پیس کر ملا لیں۔ بطور منجن اس کے استعمال سے دانت صاف اور چمکدار اور مسوڑھے مضبوط ہوتے ہیں۔ ہمیشہ کے استعمال سے پائیریا کی شکایت بھی جاتی رہتی ہے۔ ●

یوجنا، نئی دہلی

تحقیق میں ببلیوگرافی کی اہمیت (بقیہ)

ان تمام اطلاعات کو ایک ایسے طریقہ پر ترتیب دینا چاہیے جو محقق کے لیے آسانیاں فراہم کر سکے ظاہر ہے اس ببلیوگرافی کا تعلق خالص طور پر محقق سے ہے، اس لیے وہ اپنے طریقہ کار کے مطابق انھیں ترتیب دے سکتا ہے اور جس طرح اسے کام کرنے میں آسانی ہو اس طریقہ کا وہ انتخاب کر سکتا ہے لیکن اس بات کا لحاظ ضرور رکھنا چاہیے کہ وہ اطلاعات غیر درست نہ ہوں۔ پھر ایسا بھی کرنا چاہیے کہ ان کتابوں کی ببلیوگرافی الگ تیار کر لی جائے اور اخبارات، جرائد و رسائل کی ببلیوگرافی کے لیے الگ خانہ مخصوص کر دیا جائے اور کتابوں، جرائد و رسائل کے بارے میں کچھ ایسی مختصر معلومات بھی نوٹ کی جا سکتی ہیں جو محقق کو اس کے نقطہ نظر کے تعین اور اس کے مطالعے کی شکلوں کو آسان بنا سکیں اور ان نوٹس میں یہ اضافہ بھی کرنا چاہیے کہ یہ مضمون یا تبصرہ، مقدمہ، ضمیمہ کن کتابوں یا اخبارات و جرائد میں شائع ہوا ہے۔ کیوں کہ اس سے ان کے معیار کو بھی آسانی سے سمجھا جا سکے گا۔ واضح رہے کہ یہ تمام معلومات حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی جائیں گی۔ کچھ کتابوں میں تو ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ اس میں حروف تہجی مصنف یا مولف کے نام کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے لیکن ہماری نظر میں یہ ترتیب کتابوں کے تعلق سے بنائی چاہیے۔ دلیل یہ ہے کہ کتابیں ہمارے لیے سند ہیں اور مصنف کی حیثیت ثانوی ہے۔ مواد کی فراہمی میں کتابیں اہم ہیں لیکن مصنفین کا نام درج کرنا بھی لازمی ہے۔ ذیل میں جو ترتیب قائم کی گئی ہے اس کی روشنی میں ببلیوگرافی تیار کی جا سکتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ تقسیم حتمی اور آخری نہیں ہے لیکن مندرجہ ذیل تفصیلات کا ہونا لازمی ہے۔ اگر اس میں اضافہ کیا جا سکے تو مزید آسانی ہوگی۔

۱۔ کتاب کا نام مع رسالہ/اخبار
۲۔ مصنف یا مولف کا نام
۳۔ مقام اشاعت
۴۔ ناشر یا طابع
۵۔ تاریخ اشاعت
۶۔ لائبریری کا نام/کتاب نمبر

اس طرح کوئی بھی ریسرچ اسکالر تحقیق کے دشوار گزار مرحلے سے آسانی سے گزر سکتا ہے۔ ●

سورج حقیقت اور تصوّرات

آفتاب کے متعلق دنیا بھر کے ممالک میں کئی طرح کے فسانے (MYTH) دستیاب ہیں۔ آفتاب کو کبھی دیوتا کے بطور دیکھا گیا تو کبھی ایک جنگجو کے بطور۔ یونانی دیومالا میں اسے دیوتا تصور کیا گیا اور اسے "اپالو" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اسے گھوڑوں کے رتھ کو لیے ہوئے سُوئے فلک پیش قدمی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مصری فسانے میں آفتاب کو کئی بازوؤں والے دیوتا کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے بقول زمینی زندگی انھیں کی مرہونِ منت ہے۔ ان کے مختلف ہاتھوں میں انسان کے لیے وہ ساری بخششیں موجود ہیں، جن کے طفیل اس زمین پر زندگی کا ظہور ہوا تھا۔ اسے پتھر پر تصویروں کے ذریعہ اجاگر کیا گیا ہے۔ اندازاً یہ تصویر ۳۲۰۰ ق م کی ہے۔ اسکیمو لوگوں کے خیال میں آفتاب بہ وقت شب شمالی افق میں بذریعہ کشتی سفر کرتا ہے۔ پیرو (PERU) کے "انکاس" قبیلے کے لوگ آفتاب کی بصورت دیوتا پرستش کرتے تھے۔ اس کی خوشنودی کی خاطر وہ جانوروں کی قربانی بھی دیتے تھے۔ نیوزی لینڈ کے "ماؤر" قبیلے کے عقیدے کے بموجب ایک بار ان کے ایک جنگجو کے ساتھ آفتاب کی زبردست جنگ ہوئی تھی۔ جنگ میں آفتاب کو شکست نصیب ہوئی۔ ان کے جنگجو نے آفتاب کو لنگ بنادیا۔ لہٰذا اب وہ سارا دن آسمان میں لنگ کھا کر چلتا ہے۔ آسمان میں اس کی سست روی کا یہی سبب ہے۔

اس طرح آفتاب کے متعلق مختلف فسانے گوش گزار ہوتے ہیں۔ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس کی ترقی سے قبل ہی لوگ آفتاب کی اہمیت سے روشناس تھے۔ اسی سبب وہ آفتاب کی پرستش کرتے تھے۔ سائنس کی ترقی نے آفتاب کے متعلق غلط فہمیاں دور کیں۔

A LIGHT - EMITTING MASS OF GAS IN WHICH THE ENERGY GFNERATED BY NUCLEAR REACTION IN THE INTERIOR IS BALANCFD BY THE OUTFLOW OF ENERGY TO THE SURFACE AND THF INWARD - DIRECTED GRAVITATIONAL FORCES ARE BAI ANCED BY THE OUT WARD - DIRECTED GAS AND THF RADIATION PRESSURE

بہ الفاظ دیگر ـــ ستارہ گیس کا ڈھیر ہے، جس سے روشنی خارج ہوتی ہے، جس میں اندرون سطح سے توانائی جوہری ردعمل کے نتیجے میں افزائش پاکر باہر کی جانب بہتی ہے اور سطح پر متوازن ہوجاتی ہے اور اندر کی جانب جاتی ہوئی کشش انگیز طاقتیں باہر کی طرف جاتی ہوئی گیس اور شعاع افشانی کے دباؤ سے متوازن ہوتی ہیں۔

دوسرے سیاروں کے مقابلے، آفتاب ہماری زمین سے کافی نزدیک ہے۔ اس لیے یہ ہمیں کافی بڑا اور چمکیلا دکھائی دیتا ہے۔ زمین سے آفتاب کا فاصلہ تقریباً ۱۵۰ میلین کلومیٹر یا ۹۳ میلین میل ہے۔ اس کا قطر تقریباً ۱٫۳۹ میلین کلومیٹر یا ۸۶۵۰۰۰ میل ہے۔

آفتاب سے ہمیں روشنی اور حرارت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مختلف موسموں کی تشکیل میں معاون ہے۔ مزید یہ ہمارے روزمرہ کے کاموں کے لیے بھی توانائی دیتا ہے۔ یہ ستارہ شمسی نظام کی بنیاد ہے اور زمین پر زندگی اسی کے دم سے برقرار ہے۔ یہ حرارت اور روشنی کا وسیلہ ہے، سائنس کی زبان میں۔

A STAR THAT IS THE BASIS OF THE SOLAR SYSTEM AND THAT SUSTAINS LIFE ON EARTH BEING THE SOURCE OF HEAT AND LIGHT

آفتاب کی توانائی سے ہی پیڑ، پودوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ ہوا کے کاربن ڈائی آکسائڈ کو زمین سے پانی اور معدنی نمک لے کر خوراک میں تبدیل کردیتا ہے۔ جب ہم مختلف پھل اور سبزیاں کھاتے ہیں تو ان میں پہلے سے جمع شدہ آفتاب کی توانائی ہمیں حاصل ہوجاتی ہے۔ اس سے ہم کام کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ توانائی نہ ہو تو ہم کچھ بھی نہ کرسکیں۔

ان دنوں ہم شمسی توانائی کا مختلف النوع استعمال کررہے ہیں۔ آفتاب کی حرارت سے کرۂ ارض اور اس کے قریب کی ہوا گرم ہوجاتی ہے۔ گرم ہوا ہلکی ہوکر اوپر اٹھ جاتی ہے۔ اس طرح اس خلا کو بھرنے کے لیے ٹھنڈی ہوا جست بھرتی ہے۔ اس سے ہوا بہتی ہے۔ اس ہوا میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ اس کا استعمال، ہوائی چکی چلانے میں

گنج مرا بیتیا۔ ۸۴۵۴۳۱ (بہار)

محمد حسنات الحق دہلی

لیا جاتا ہے۔ اس ہوائی چکی سے اناج کو پیسا جاتا ہے، آبپاشی کی جاتی ہے، بجلی کی فراہمی ہوتی ہے۔

اسی طرح آفتاب کی توانائی سے پن چکی چلانے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ آفتابی شعاعیں جب سمندر، تالاب اور ندیوں پر پڑتی ہیں تو ان کا پانی گرم ہو کر بھاپ بن جاتا ہے۔ اس بھاپ کے سرد ہونے پر بارش ہوتی ہے۔ اس تیز دھار والے پانی کا استعمال "پن چکی" چلانے میں کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے آفتاب ہر طرح سے ہمارا معاون و مددگار ہے۔

آفتاب سے توانائی حاصل کرنے کی ایک طویل تاریخ ہے۔ سائنس دانوں نے اس کے لیے مختلف تجربے کیے۔ اس کا آغاز ۱۶۲۵ سے ہوتا ہے، جب فرانس کے ایک انجینئر "سالومن کیکاس" نے آفتاب سے توانائی حاصل کرنے کے لیے دلانچ میں کچھ تجربے کیے۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں "جان ایرکسن" شمسی بھاپ انجن کی ایجاد میں کامیاب ہوئے۔ پھر ۱۷۷۴ء میں ایک فرانسیسی ماہر کیمیا "اینتونے لاوزئیر" نے شمسی حرارت کا تجربہ فولاد کو پگھلانے کے لیے کیا۔

شمسی توانائی کا ہم زیادہ صلاحیت سے استعمال کر سکیں، اس کے لیے متفرق سائنسی ایجادات ہوئے۔ ان میں شمسی بھٹی، شمسی بیٹری، شمسی کوکر وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

شمسی بھٹی (SOLAR FURNACE) صنعتی کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس کا استعمال دھاتوں کی صفائی میں ہوتا ہے۔ اس میں دو طرح کے آئینے لگے ہوتے ہیں۔ اول ہموار سطح والے آئینے اور دوم پیالے نما آئینے۔ آفتاب کی شعاعیں جب ہموار سطح والے آئینے پر پڑتی ہیں تو یہ انھیں پیالے نما آئینے پر منعطف (REFRECT) کر دیتا ہے۔ ان منعطف شعاعوں کو ایک بھٹی میں مرتکز کرکے اس کی توانائی کا استعمال ہوتا ہے۔ ایک شمسی بھٹی ... ۸ ڈگری فارن ہائٹ تک حرارت پیدا کر سکتا ہے۔

سردیوں میں اپنے گھروں کو گرم رکھنے کے لیے اب کوئلہ، گیس، تیل، بجلی وغیرہ کے استعمال کی ضرورت نہیں رہی۔ گھر کو گرم رکھنے کے لیے بھی ہم شمسی توانائی کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے گھر کے اوپر ایک ہموار آئینہ لگایا جاتا ہے۔ یہ شمسی شعاعوں کو مرتکز کرتا ہے۔ ان شعاعوں کی حرارت کو منسلک ایک دوسری ٹنکی (TANK) میں جمع کیا جاتا ہے۔ اس ٹنکی میں کنکر اور بجری کی پرتیں بچھی ہوتی ہیں۔ اس میں ایک پنکھا لگا رہتا ہے۔ جب ٹنکی کا یہ پنکھا چلایا جاتا ہے تو گرم ہوا نالیوں سے ہو کر گھر میں پہنچتی ہے۔ اس طریقے سے گھر کو گرم رکھا جاتا ہے۔

شمسی بیٹری (SOLAR BATTRY) آفتاب روشنی کو راست بجلی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ شمسی بیٹری "سلی کون" (SILICON) کی چادر سے بنتی ہے۔ "سلی کون" کی چادر پر جب آفتابی شعاعیں پڑتی ہیں تو اس کے الیکٹران (ELECTRON) منسلک تاروں سے ہو کر گزرنے لگتے ہیں۔ الیکٹرانوں کی رو انے کو ہی بجلی کی دھارا (ELECTRIC CURRENT) کہتے ہیں۔ شمسی بیٹری کا استعمال چھوٹے چھوٹے ٹرانزسٹرس سے آراستہ ٹیلی فون میں کیا جاتا ہے۔ خلاء میں روانہ کیے جانے والے راکٹوں میں بھی اس شمسی بیٹری کا استعمال ہوتا ہے۔

ہم کھانے کی تیاری میں بھی شمسی توانائی کا استعمال کر سکتے ہیں۔ شمسی کوکر (SOLAR COOKER) شمسی توانائی کو ایندھن کے طور استعمال کرتا ہے۔ شمسی کوکر میں ایک ایلومینیم یا شیشے کی ایک چادر ہوتی ہے جو آفتابی شعاعوں کو ایک مقام پر مرتکز کرتی ہے، جس سے بیک وقت کافی مقدار میں حرارت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے کوکر میں رکھی گئی غذا پک کر تیار ہو جاتی ہے۔

اس طور سے ہم دیکھتے ہیں کہ آفتاب ہمارے لیے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ توانائی کا کلیدی وسیلہ ہے اور لافانی توانائی کے ذخیرے کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس توانائی کا استعمال ان دور دراز کے علاقوں میں، جہاں توانائی کی رسد ایک مسئلہ ہے، استعمال کر سکتے ہیں۔ شمسی توانائی ارزاں ہوتی ہے، مزید اس سے کثافت بھی نہیں ہوتی۔ لہٰذا آفتاب توانائی کا عمدہ ترین وسیلہ ہے۔

آئیے، اسے زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی سبیل نکالیں۔ اس سے جو توانائی دستیاب ہے وہ ہمارے لیے بیش بہا خزانہ ہے، ایسا خزانہ جسے ہم جس قدر چاہیں اور جب تک چاہیں اپنے تصرف میں لیے رہیں۔ ہمہ وقت اس کی تابندگی برقرار رہنے کی امید ہے۔ ●

بقیہ: پسماندہ و اقلیتی طبقوں کے لیے سہولیات

اس طرح ان طبقوں کے لوگوں کو پیشہ ورانہ تعلیم کی سہولیات سے فیضیاب کیا گیا۔

اقلیتی فرقے کے تعلیمی اداروں کو منظوری دینے کے لیے اس سلسلے میں قواعد و ضوابط کی واضح ہدایات جاری کی گئی ہیں تاکہ ان تعلیمی اداروں کے معیار کو بڑھایا جا سکے اس کے ساتھ ہی ان میں کام کرنے والے اساتذہ کو این سی آر ٹی کے ادارہ میں سائنس، حساب، انگریزی کے مضامین کو پڑھانے کے بارے میں جدید تربیت دی جاتی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ اردو کو ترقی دینے کے لیے بھی موثر اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں۔ حکومت نے حال ہی میں یہ اعلان کیا ہے کہ حیدرآباد میں ایک نیشنل اردو یونیورسٹی قائم کی جائے گی جو کہ مولانا آزاد کے نام سے موسوم ہوگی۔

اردو کو فروغ دینے کے لیے نیشنل کونسل برائے ترقی اردو کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے جو کہ ایک قابل تعریف قدم ہے۔

ان سب تعلیمی پروگراموں کی عمل آوری پر نظر رکھنے کے لیے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے تاکہ ان پروگراموں میں تیزی لائی جا سکے۔

سرکار کی جانب سے تعلیم کو عام کرنے کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں اس کے طفیل وہ وقت جلد آ جائے گا، جب ہمارے ملک کا ہر فرد چاہے امیر ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوگا۔ کوئی بھی شہری چاہے وہ پسماندہ ہو یا اقلیت میں یا دور دراز علاقے کا رہنے والا ہو اب تعلیم کے زیور سے مالا مال ہوگا۔ تبھی ہمارا ملک سماجی و اقتصادی طور پر بھرپور ترقی کر سکے گا۔ ●

سہیل احمد ہلوری

کاربیٹ نیشنل پارک

کاربیٹ نیشنل پارک ملک کا ایک نہایت ہی خوبصورت پارک ہے جو جنگلی جانوروں کے تحفظ کے مدنظر بنایا گیا۔ یہ پارک اتر پردیش کے نینی تال و گڑھوال ضلع میں واقع ہے۔ دریائے رام گنگا کے دونوں طرف پھیلے اس پارک کو دیکھنے کے لیے ملک کے گوشے گوشے سے لوگ آتے ہیں۔ خاص کر دسمبر کے مہینے میں اور ہولی کی چھٹیوں میں تو سیاحوں کی اتنی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے کہ یہاں ٹھہرنے کے لیے جگہ ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس پارک میں قدرت کا ایک خوبصورت و دلفریب نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک طرف تو یہ میدانی علاقوں میں پھیلاد کھائی دیتا ہے تو دوسری طرف شوالک کی پہاڑی چوٹیوں پر بھی اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہے۔ دون کی وادی میں جہاں یہ میدانی علاقوں میں واقع ہے وہیں پہاڑیوں پر اس کی اونچائی دو سو میٹر سے گیارہ سو میٹر تک ہے۔ اس پارک میں جنگل، پہاڑ، میدان و دریا سب کچھ موجود ہیں۔ جنگلوں میں خونخوار جانور، دریاؤں میں بھیانک گھڑیال و مگرمچھ سیاحوں کو اپنی طرف لبھانے میں کوئی کور و کسر نہیں رکھتے۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں ایک عجیب منظر دیکھنے کو ملتا ہے اس اندھیرے پن کی وجہ سے دریا کا پانی کالا نظر آتا ہے۔

پارک کا کل رقبہ ۵۲۵٫۸ مربع کلو میٹر ہے جس کا دو تہائی حصہ یعنی ۳۲۱٫۸۶ مربع کلو میٹر نینی تال ضلع میں واقع ہے۔ اس پارک کا خاص میدانی حصہ ڈھکالا ہے جو کہ سب سے شاندی کا مقام کا مانا ہے جہاں مئی جون میں بھی ٹھنڈک پڑتی ہے۔

۱۹۳۵ء میں جب انگریزوں کو بھی جنگلی جانوروں کے تحفظ کا خیال آیا تو انھوں نے دریائے رام گنگا کے اس حصے کو اس کے لیے منتخب کیا۔ اس وقت کے گورنر جنرل مالکم ہیلی کے نام پر اس پارک کا نام "ہیلی پارک" رکھا گیا۔ ملک کی آزادی کے بعد اس کا نام بدل کر رام گنگا نیشنل پارک رکھ دیا گیا۔ اس دوران جم کاربٹ کا نام ایک مشہور شکاری کے روپ میں دنیا بھر میں پھیل چکا تھا۔ جم کاربٹ جہاں ایک اچوک نشانہ باز تھے وہیں ان کے دل میں جنگلی جانوروں کے تحفظ کا خیال بھی تھا۔ کمایوں کے کئی آدم خور شیروں کو جم کاربٹ نے مار کر سیکڑوں لوگوں کی جان بچائی تھی۔ جنگلی جانوروں اور ان کے شکار سے متعلق کاربٹ صاحب نے دو کتابیں THF MAN FATFR OF KUMAUN اور THF MAN FATER OF RUDRAPRAYAG لکھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف مضامین اس سے متعلق لکھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ کینیا (افریقہ) چلے گئے تھے جہاں ۱۹۵۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

حکومت ہند کو جب یہ احساس ہوا کہ جم کاربٹ کی جائے پیدائش اور کام کرنے کی جگہ سب کچھ اسی علاقہ میں تھی تو ۱۹۵۷ء میں اس پارک کا نام انھیں کے نام پر موسوم کر دیا گیا اور اب رام گنگا نیشنل پارک کی جگہ اس پارک کا نام "کاربیٹ نیشنل پارک" ہو گیا۔ جم کاربیٹ کے کالا ڈھونگی میں واقع مکان کو ایک میوزیم بنا دیا گیا۔

جم کاربیٹ نیشنل پارک انگریزوں کی کاوش اور سوچ کا نتیجہ ہے۔ مگر انگریزی حکومت کے قبل ۱۸۱۵ء سے ۱۸۲۰ء میں یہ علاقہ اس وقت کے علاقائی حکمرانوں کے قبضہ میں تھا۔ یہ علاقہ نہایت ہی گھنے جنگلوں سے بھرپور تھا لیکن جب یہ علاقہ انگریزوں کے ہاتھ میں آیا تو محکمۂ جنگلات کی جانب سے یہاں عمارتی لکڑیوں کی بڑے پیمانے پر کٹائی شروع ہو گئی۔ اسے دیکھتے ہوئے ۱۸۵۸ء میں حکمراں میجر سمجے نے پہلی مرتبہ ان جنگلات کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا۔ ۱۹۶۱۔۶۲ء میں دون کی وادی میں اس کے متعلق موثر اقدام اٹھائے گئے اور جنگلات کی کٹائی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ جنگلات کو آگ سے بچانے کے لیے بھی انتظام کیا گیا۔ ۱۸۶۸ء میں اس علاقے کی پوری ذمہ داری محکمۂ جنگلات کو سونپ دی گئی۔ اس سلسلے میں ۱۸۷۹ء میں اسے محفوظ علاقہ قرار دیا گیا۔ ان تمام کوششوں کے نتیجہ میں یہ جنگلی علاقہ ایک مرتبہ پھر اپنی کھوئی ہوئی بہار واپس لے آیا۔

دہلی سے مراد آباد کاشی پور ہوتے ہوئے کوئی بھی شخص رام نگر پہنچ سکتا ہے۔ پارک کی دوری دہلی سے تقریباً ۲۹۰ کلو میٹر دور ہے۔ رام نگر تک ریل یا بس کا سفر بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ رام نگر میں پارک کی جانب سے ایک دفتر کھولا گیا ہے۔ جہاں سے سیاحوں کو پارک کے متعلق مختلف معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

میر حسن روڈ۔ نو محلہ گنج۔ ہلور (سدھارتھ نگر) ۲۷۲۱۹۱، یوپی

کاربیٹ نیشنل پارک ۱۵ نومبر سے ۱۵ جون تک سیاحوں کے لیے کھولا جاتا ہے۔ پارک میں داخل ہونے کا پہلا گیٹ دھن گڑھی رام نگر سے ۱۳ کلومیٹر دور ہے۔ ڈھکالہ، سرپ ٹلیے، گیرل، بجرانی، کالاڈھو، سیلانی ریسٹ کے آرام گاہوں کے علاوہ ڈھکالہ میں عارضی ٹینٹوں کا بھی انتظام سیاحوں کے لیے کیا جاتا ہے۔ سیاحوں کو پارک میں گھمانے کے لیے پالتو ہاتھیوں کا انتظام ہے۔ ان ہاتھیوں پر چڑھ کر ہی سیاح بھیانک اور خطرناک جانوروں کو دیکھ سکتے ہیں۔

گھنے اور گنجان جنگلوں سے گھرے اس پارک میں سال، شیشم، کھیر، کتھا، سمل و روہنی وغیرہ کے درخت زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ دھن گڑھی، ڈھکالہ، کمیریا ولوکساڈ کے علاقے میں جنگلی جانور سدا سے ہی محفوظ رہے ہیں کیوں کہ یہاں ۵ کلومیٹر دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔

۱۹۷۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق کاربیٹ نیشنل پارک میں ۵۰ ذاتوں کے مختلف پستان دار (MAMMAL) جانور موجود تھے۔ ۶ قسمیں پرندوں کی تھیں۔ ۲۵ قسم کے رینگنے والے جانور تھے۔ ۱۹۴۸ء میں یہاں ۹۱ شیر، ۱۶ گلدار، ۱۷۔ ہاتھی، ۳۴ بھالو ۲۴۲۳ ۱ چیتل، ۲۴۴۱ سانبھر، ۷۸۷ کاکڑا، ۱۵۱ پاڑہ، ۱۲۹۱ سور، ۲۹۰ گھرڑ، ۴ مگرمچھ، ۲۷ گھڑیال، ۴۳۳۱ بندر اور ۵۳۵۵ لنگور تھے۔ شیر، ہاتھی، چیتل، بھالو، پاڑا اور ہرن کے جھنڈ سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ گرمیوں میں جنگلی جانوروں کے جھنڈ کے جھنڈ دریائے رام گنگا کے قریب دیکھے جا سکتے ہیں۔ رام گنگا میں ہاتھیوں کا نہانا سیلانیوں کے لیے ایک دلفریب منظر رہتا ہے۔ پارک کے ان دلفریب اور خوب صورت مناظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہونے کے لیے صرف ملک کے کونے کونے سے ہی لوگ نہیں آتے بلکہ بیرون ممالک کی بڑی بڑی ہستیاں اور اہم حضرات بھی یہاں آتے ہیں۔ اب تک کئی ملکوں کے صدر و وزرائے اعظم کا بھی دورہ ہو چکا ہے۔

یوحنا، نئی دہلی

پارک میں جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لیے مختلف قسم کے سخت سے سخت ترقوانین بنا کر سیاحوں کو لبھانے کا کام کیا گیا ہے لیکن دوسری طرف پارک کے قرب و جوار کے لوگوں کو شیر اور ہاتھیوں سے ایک دہشت اور خوف رہتا ہے۔ کیوں کہ سانولدے لال ڈھانگ اور ڈھکولی کے علاقے میں شیر اور ہاتھی ان کے پالتو جانوروں اور کھڑی فصلوں کو اپنا شکار بناتے ہیں۔

گزشتہ ۵ برسوں میں اس پارک میں آنے والوں کی تعداد میں خاصی کمی آئی ہے۔ ادھر کئی برسوں سے یہاں ابھی تک کوئی اہم شخصیت نہیں آئی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب اتر پردیش کے ترائی کے علاقے میں بڑھتی دہشت گردی ہو۔ پارک کے بیشتر کمرے خالی پڑے رہتے ہیں گزشتہ ۱۵ نومبر کو عام لوگوں کے لیے پارک کھولا گیا لیکن ماہر جنگلات ڈاکٹر گریش کمار نے اپنی رپورٹ میں اس پارک سے متعلق جو انکشاف کیا ہے وہ ایک چونکا دینے والا امر ہے۔ کسی بھی سیاح اور ماحولیات کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ ڈاکٹر کمار نے اپنے مطالعہ کے مطابق یہ انکشاف کیا ہے کہ آئندہ دو دہائیوں میں دنیا بھر میں مشہور اس کاربیٹ نیشنل پارک کے زیادہ تر درخت زیر آب آجائیں گے۔ پارک کی پچاس فی صد گھاس کے میدان اور شیشم کے درخت زیر آب ہو چکے ہیں۔ گھاس اور سبزے کی کمی کے باعث بہت سے جانوروں کے سامنے خوراک کا مسئلہ آکھڑا ہوا ہے۔

کاربیٹ پارک ملک کا سب سے پہلا نیشنل پارک ہے اور اپنی قدرتی خوب صورتی کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ مگر آج کے دور میں جس طرح ہر شعبہ میں ماحولیات کے بگڑتے توازن کا اثر پڑ رہا ہے، یہ پارک بھی اس سے اچھوتا نہیں ہے۔ پارک میں موجود جنگلی جانوروں کو فطری ماحول نہ مل پانے کی وجہ سے روز بروز ان کی تعداد میں کمی آتی رہتی ہے۔ ماحولیات کے عدم توازن کی وجہ سے پارک کے درختوں اور سبزوں میں کمی ہو جانے سے جہاں جانوروں کو خوراک ملنے میں دشواری اٹھانی پڑتی ہے وہیں دریائے رام گنگا کی آلودگی سے جانوروں کی صحت گرتی جا رہی ہے انھیں طرح طرح کے مرض آدبوچتے ہیں اور آخرکار ان کی موت ہو جایا کرتی ہے۔

لہٰذا ماہرین ماحولیات کو اس جانب اپنے ذہن کو مرکوز کرنا چاہیے اور پارک میں موجود تمام طرح کی کثافتوں کو دور کرنے کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ سیاحوں کی جانب سے پھیلائی جانے والی آلودگی کے تئیں ان کو آگاہ کرنا چاہیے جانوروں کے پینے کے لیے صاف و شفاف پانی اور ان کی غذا کا خاص انتظام کرنا چاہیے۔ اگر وقت رہتے پارک اور اس کے اطراف کے ماحولیاتی آلودگی اور کثافت کو دور کرنے کا انتظام نہ کیا گیا تو ایک دن اس پارک کی شان و شوکت مٹ جائے گی۔ جو ماحولیات کے تحفظ کے تئیں بہت افسوسناک ہوگا۔ ●

کمپیوٹر کے ذریعے زمینی ریکارڈ رکھنے کے پروجیکٹ

کمپیوٹر کے ذریعے زمینوں سے متعلق ریکارڈ رکھنے کی اسکیم کے تحت ملک کی ۲۵ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں ۲۰ پروجیکٹ شروع کیے گئے ہیں۔ مرکزی طور سے اسپانسر شدہ اس اسکیم کے تحت اب تک ۲۲۴۷ لاکھ روپے کی رقم خرچ کی جا چکی ہے۔ مرکز موجودہ مالی سال کے دوران مزید پروجیکٹوں کے لیے رقم فراہم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ مرحلے وار طریقے سے اس نظام کو پورے ملک میں شروع کرنے کا مقصد حاصل کیا جا سکے۔

امید ہے کہ زمینوں سے متعلق ریکارڈ کے نظام کی حد بندی سے مقدمات کی تعداد میں کمی آئے گی۔ دیہی علاقوں اور روزگار کے وزیر ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے حال ہی میں وزرائے اعلا کو لکھا ہے کہ وہ زمینی اصلاحات سے متعلق اقدامات پر تیزی سے عمل درآمد کرائیں۔

فردوس عنبر صدیقی

پرسنل کمپیوٹر

کمپیوٹر کے انتخاب میں اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس کا سائز اور پھیلاؤ کیا ہے۔ آپ کے دفتر یا گھر میں وہ کتنی جگہ گھیرے گا اور ضرورت پڑنے پر کیا اسے آسانی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا ہے۔ بعض اقسام کے کمپیوٹرز کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ دفتر یا گھر میں اتنی جگہ گھیر لیتے ہیں کہ جگہ کی تنگی کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ آپ کمپیوٹر کا انتخاب کرتے وقت جگہ کی گنجائش کو ضرور پیش نظر رکھیں۔ کمپیوٹر کا دوسرا اہم پہلو اس کا سفری (پورٹیبل) ہونا ہے۔ بوقت ضرورت آپ کو اپنا کمپیوٹر اس کی اصل جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ اس کے لیے کمپیوٹر کا وزن اور اس کا مجموعی سائز اتنا ہونا چاہیے کہ اسے آسانی اور سہولت کے ساتھ کسی دوسری جگہ منتقل کیا جا سکے۔ کمپیوٹر کے بعض ماڈل ایسے بھی آتے ہیں جو دوبارہ چارج ہو جانے والی بیٹری کی مدد سے بھی کام کرتے ہیں۔ آپ کو اگر اپنا کمپیوٹر وقتاً فوقتاً ایسی جگہوں پر لے جانے کی ضرورت پیش آتی ہے جہاں بجلی کی دستیابی یقینی نہیں ہوتی تو آپ کے لیے ایسا کمپیوٹر بہتر انتخاب ہو سکتا ہے جو بجلی کے ساتھ ساتھ بیٹری سے بھی چل سکتا ہو۔

گو کہ کسی بھی کمپیوٹر کے انتخاب میں اس کی کارکردگی کو ہی بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن ظاہری طور پر کمپیوٹر اور اس کے متعلقات مثلاً پرنٹر وغیرہ بھی اتنے دیدہ زیب ہونے چاہئیں کہ وہ آپ کے دفتر یا گھر کی خوبصورتی میں اضافے کا سبب بن سکیں۔ چوں کہ آپ کو کمپیوٹر کے ساتھ کافی وقت گزارنا ہوگا اس لیے بھی اس کا خوشنما ہونا ضروری ہے۔

کمپیوٹر خواہ کسی بھی مقصد کے لیے خریدا جائے اس بات کا امکان ہمیشہ رہتا ہے کہ اس کو مستقبل میں وسیع کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ اس لیے کمپیوٹر خریدتے وقت اس سلسلے میں معلوم کر لینا چاہیے کہ اس کمپیوٹر سے مطابقت رکھنے والے متعلقات آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں یا نہیں۔ کمپیوٹر تیار کرنے والی بعض کمپنیوں نے یہ طریقہ اپنایا ہوا ہے کہ وہ اپنے ابتدائی کمپیوٹر کی قیمتیں خاصی نچلی سطح پر رکھتی ہیں لیکن ان ہی کمپیوٹرز کے متعلقات کی قیمتیں کافی گراں ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ کمپیوٹر ابتدا میں تو سستے محسوس ہوتے ہیں لیکن حتمی طور پر یہ کافی گراں ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر خریدنے سے پہلے آپ اس سلسلے میں معلوم کر لیں کہ وہ متعلقات جن کی آپ کو مستقبل میں ضرورت پیش آسکتی ہے ان کی قیمتیں کیا ہیں۔ ساتھ ہی آپ یہ بھی معلوم کر لیں کہ آپ کے پسندیدہ کمپیوٹر کی بعد از فروخت کی سہولتوں کی کیا صورت حال ہے۔

کمپیوٹر کے حوالے سے ایک بات کا تذکرہ بار بار سننے میں آتا ہے اور وہ یہ کہ یہ کمپیوٹر آئی۔ بی۔ ایم۔ کمپیٹ ایبل ہے یا نہیں۔ کمپیٹ ایبل سے مراد یہ ہوتی ہے کہ آئی۔ بی۔ ایم کے تیار کردہ کمپیوٹر پروگرام اس پر چل سکتے ہیں یا نہیں۔ آئی۔ بی۔ ایم دنیا میں کمپیوٹر کے کاموں کی انجام دہی کے لیے ہزاروں اقسام کے کمپیوٹر پروگرام تیار کیے ہیں۔ لیکن ان کے اپنے کمپیوٹر خاصی گراں ہیں اس لیے دنیا بھر میں بہت سی ایسی کمپنیاں وجود میں آگئیں جنھوں نے ایسے کمپیوٹر تیار کرنے شروع کر دیے جو قیمت میں تو آئی۔ بی۔ ایم کے کمپیوٹر سے خاصے کم ہوتے ہیں لیکن وہ آئی۔ بی۔ ایم کمپیوٹر سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یعنی وہ پروگرام یا سافٹ ویئر جو آئی۔ بی۔ ایم نے اپنے کمپیوٹرز پر چلائے جانے کے لیے تخلیق کیے تھے وہ دوسری کمپنیوں کے تیار کردہ آئی۔ بی۔ ایم سے مطابقت رکھنے والے کمپیوٹروں پر بھی آسانی کے ساتھ چلائے جا سکتے ہیں۔

کمپیوٹر تیار کرنے والی بیشتر چھوٹی بڑی کمپنیاں یہ دعوا کرتی ہیں کہ ان کے تیار کردہ کمپیوٹر آئی۔ بی۔ ایم سے مطابقت رکھتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان کا یہ دعویٰ اتنا درست نہیں ہوتا۔ جتنا کہ وہ دعوا کرتے ہیں۔ اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ آئی۔ بی۔ ایم کے کچھ پروگرام اس کمپیوٹر پر چلا کر دیکھیں جو آپ خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ پروگرام اگر اس کمپیوٹر پر کسی خامی اور غلطی کے بغیر چل سکتے ہیں تو پھر یہ دعوا درست ہے۔

کمپیوٹر کے ذریعے جو بھی کام سر انجام دیے جاتے ہیں وہ پہلے ٹیلی ویژن سے مشابہ ایک مانیٹر پر نظر آتے ہیں۔ اس مانیٹر کو ویڈیو ڈسپلے بھی کہا جاتا ہے۔ اس مانیٹر یا ویڈیو ڈسپلے پر نظر آنے والی کسی تحریر کو جب آپ فائل کر دیتے ہیں تو اسے محفوظ کرنے کے لیے فلاپی ڈسک کو

کلامی محلہ، سرد مسجد، اورنگ آباد، بہار - ۸۲۴۱۰۱

منتقل کیا جا سکتا ہے یا پرنٹر کے ذریعے اس کے پرنٹس نکالے جا سکتے ہیں۔ مانیٹر یا ویڈیو ڈسپلے ٹیلی ویژن سے اس لحاظ سے مختلف ہوتا ہے کہ اس میں جو کیتھوڈ رے ٹیوب (سی۔ آر۔ ٹی) لگی ہوتی ہوتی ہے اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ کمپیوٹر سے وصول ہونے والے سگنل کو اعداد و حروف کی شکل میں اسکرین پر اجاگر کر دیتی ہے۔

کمپیوٹر کے انتخاب میں ویڈیو ڈسپلے کا معیار خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اگر یہ معیاری نہ ہوگا تو آپ زیادہ دیر تک کمپیوٹر پر کام نہ کر سکیں گے اور تھوڑی دیر بعد ہی اکتاہٹ محسوس کرنے لگیں گے۔ ویڈیو ڈسپلے کے معیار کا تعین اس بات سے کیا جاتا ہے کہ اس پر جو حروف اور اعداد و شمار نظر آئیں وہ صاف اور بالکل واضح ہوں اور انھیں پڑھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہو۔ ویڈیو ڈسپلے پر زیادہ دیر تک نظریں جمائے رہنے سے آنکھوں پر بوجھ نہ پڑتا ہو۔ اس کے علاوہ کچھ ویڈیو مانیٹرز میں اضافی خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ جو انہیں دوسروں سے زیادہ معیاری بناتی ہیں، آپ کسی قسم کا مانیٹر یا ویڈیو ڈسپلے منتخب کریں اس کا انحصار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ آپ اپنے کمپیوٹر پر کس نوعیت کا کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ویڈیو ڈسپلے یا مانیٹر مختلف اسکرین سائز میں آتے ہیں چھوٹے اسکرین پر ہر چیز بہت قریب قریب اور زیادہ مربوط (کومپیکٹ) نظر آتی ہے۔ جب کہ بڑے اسکرین پر ہر چیز زیادہ واضح اور صاف ہوتی ہے۔ اس وقت مانیٹر کے معقول ترین سائز ۵ر۳۰ سینٹی میٹر (۱۲ انچ) ۵ر۳۵ سینٹی میٹر (۱۴ انچ) ہیں۔ مانیٹر کے سائز سے مراد اس کے اسکرین کا سائز ہوتا ہے اور اسکرین کو وتراً یا ترچھا ناپا جاتا ہے۔ اچھے مانیٹر میں یہ خوبی بھی ہوتی ہے کہ اس کے اسکرین پر روشنی کو مدھم یا تیز کیا جا سکتا ہے تاکہ روشنی کو اپنی نظروں کے مطابق سیٹ کیا جا سکے۔ جن مانیٹر میں یہ آسانی نہیں ہوتی ان پر کام کرتے ہوئے بعض لوگوں کی آنکھیں تھکاوٹ محسوس کرنے لگتی ہیں اس کے علاوہ کچھ مانیٹرز میں یہ سہولت بھی ہوتی ہے کہ انھیں اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق کسی بھی سمت میں گھمایا جا سکتا ہے یا ان کو جھکایا یا اوپر کیا جا سکتا ہے۔ یہ مانیٹر ایک متحرک محور پر لگے ہوئے ہوتے ہیں۔

آپ کمپیوٹر پر اگر کوئی ایسا کام کرتے ہیں جس میں گرافکس یعنی چارٹ، گراف وغیرہ بنانے کی بھی ضرورت پیش آتی ہو تو مانیٹر ایسا ہونا چاہیے جو چارٹ اور گراف یا ڈیزائن نہایت واضح طور پر بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جو مانیٹر اعلا معیار کی گرافکس کی صلاحیت رکھتے ہیں انھیں ہائی ریزولوشن مانیٹر کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہوگا کہ ویڈیو ڈسپلے یا مانیٹر پر کمپیوٹر کی مدد سے جو بھی ڈیزائن، گراف وغیرہ بنتے ہیں یا اعداد و شمار اور تحریر وغیرہ ظاہر ہوتی ہے وہ چھوٹے چھوٹے نکات کی مدد سے بنتے ہیں۔ کم جگہ میں یہ نکات جتنے زیادہ ہوں گے ڈیزائن اور گراف اتنا ہی زیادہ اچھا بنے گا۔ ہائی ریزولوشن مانیٹر پر جو ڈیزائن اور گراف بنتے ہیں ان میں خطوط اور زاویے نہایت واضح ہوتے ہیں۔ اب نقشے وغیرہ بھی کمپیوٹر کی مدد سے تیار کیے جا سکتے ہیں۔ آپ اگر کمپیوٹر کی مدد سے یہ کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایسے کام کی نوعیت کے لحاظ سے مانیٹر اور پرنٹر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ ان کاموں کے لیے مخصوص قسم کے پرنٹر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں کمپیوٹر کے اچھے فروخت کنندگان آپ کی بہت رہنمائی کر سکتے ہیں۔

کمپیوٹر کی خریداری کا، کار کی خریداری سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح کار خریدتے وقت آپ ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ دستیاب بجٹ میں ایسی کار مل جائے جو مضبوط ہو۔ پیچیدہ نہ ہو اور اس میں خرابیوں اور ٹوٹ پھوٹ کے امکانات کم سے کم ہوں اور اگر اس میں کوئی خرابی پیدا ہو بھی جائے تو اس کی مرمت اور درستگی کی سہولت دستیاب ہو۔ یہی تمام باتیں آپ کو کمپیوٹر خریدتے وقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ کمپیوٹر خریدتے وقت یہ معلوم کرنا کہ اس کا نظام کتنا مضبوط اور قابل اعتماد ہے۔ کوئی آسان کام نہیں البتہ آپ یہ ضرور معلوم کر سکتے ہیں کہ جس کمپنی نے یہ کمپیوٹر تخلیق کیا ہے۔ اس کا سابقہ ریکارڈ کیا ہے۔ یہ کمپنی قابل اعتماد ہے یا نہیں۔ اسی سابقہ ریکارڈ کی روشنی میں آپ درست فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک کمپیوٹر کا انتخاب کرنے میں اس امر کو بھی پیش نظر رکھیں کہ اس کمپیوٹر میں اضافوں اور متعلقات لگانے کی سہولت موجود ہے۔ یہ اضافے اور متعلقات آسانی سے دستیاب ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تیار کنندہ کمپنی کی جانب سے بعد از فروخت سروس کی ضمانت اور سہولت موجود ہے۔ گو کہ یہ اصول کہ گراں چیز ہمیشہ اچھے معیار کی ہوتی ہے ہمیشہ درست ثابت نہیں ہوتا لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زیادہ سستی چیزیں ان کے معیار کو ضرور متاثر کرتی ہیں۔ اس لیے کمپیوٹر کی خریداری میں آپ صرف اس پہلو کو پیش نظر نہ رکھیں کہ اس کی قیمت اسی معیار کے دوسرے کمپیوٹر کے مقابلے میں سب سے کم ہونی چاہیے۔ ●

مشترکہ دفاعی خدمات امتحانات مئی ۱۹۹۶ء ملتوی

یونین پبلک سروس کمیشن سے جاری ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ کمیشن نے اس امر کا ایک نوٹیفکیشن جاری کیا ہے جس کی رو سے مشترکہ دفاعی خدمات امتحانات مئی ۱۹۹۶ء جو ۱۲ مئی ۱۹۹۶ء کو منعقد ہونے تھے آئندہ منعقد ہونے والے لوک سبھا اور چند ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات کے پیش نظر ملتوی کر دیے گئے ہیں۔ اب یہ امتحانات ۷ جولائی ۱۹۹۶ء کو منعقد ہوں گے۔

مذکورہ امتحانات میں شامل ہونے کے لیے تمام مجاز امیدواران کو ایڈمیشن سرٹیفکیٹ اور نظر ثانی شدہ ٹائم ٹیبل معقول وقت کے اندر جاری کیے جائیں گے۔ ●

آفاق عالم صدیقی

ہندوستانی معاشرے میں بوڑھوں کی اہمیت

دنیا کا ہر سماج ایک دوسرے سے قدرے مشترک بھی ہوتا ہے اور قدرے مختلف بھی۔ ہر سماج کے اندر کچھ خوبیاں بھی ہیں کچھ برائیاں بھی، دنیا کے ہر سماج میں کچھ نہ کچھ ایسی رسمیں اور روایتیں ہوتی ہیں جنھیں سماج کے لوگ اپنا لیے ہیں اور اس کو نبھانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہمارا ہندوستانی سماج بھی اپنی گوناگوں خوبیوں اور خامیوں کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے، آج مغربی سماج بہانگ دہل انسانیت اور فرد کی آزادی کا نعرہ لگاتا ہے اور ہمیں بھی بظاہر ایسا ہی لگتا ہے کہ سچ مچ وہ انسانیت اور فرد کی آزادی کا خواہاں ہے، مگر آپ گہرائی سے اور قریب سے مغربی سماج کو دیکھیے تو آپ یہ محسوس کیے بنا نہیں رہ سکیں گے کہ ان کے قول و فعل میں فرق ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے سماج سے بوڑھوں کو الگ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیا ان کا یہ رویّہ انسانیت سے دور نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بوڑھے بزرگ جنھوں نے انھیں جنم دیا، پالا، اپنی محبت اور شفقت ان پر نثار کر دی، ان کے لیے دکھ جھیلے انھیں زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا، انھیں بوڑھوں کو وہ اپنے سماج اور سماجی کاموں سے الگ کر دینا چاہتے ہیں مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ آج مغرب پرستی کے جوش میں ہمارے ہندوستان میں بھی اس رجحان کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے، ایک بار برنارڈ شا سے کسی نے کہا کہ نئی نسل آپ کی نسل سے زیادہ قد آور نظر آ رہی ہے، تو برنارڈ شا نے برجستہ کہا تھا کہ... جی ہاں... ظاہر ہے قد آور تو دکھائی دیں گے ہی کیوں کہ وہ ہمارے کندھوں پر کھڑے ہیں۔

اس قول میں بڑی سچائی ہے، کیوں کہ تہذیبوں کی قدر و قیمت اور عظمت و توانائی کا انحصار عمارتوں کی طرح ان کی بنیادوں پر ہوتا ہے، جس عمارت کی بنیاد جتنی مضبوط ہو گی اس کے اوپر اتنی ہی زیادہ منزلیں اٹھتی چلی جائیں گی، اگر سو منزل کی بلند و بالا عمارت کو دیکھنے کے بعد ہمارا دھیان بنیاد کی مضبوطی کی طرف نہیں جاتا ہے تو ہم اہل شعور نہیں ہیں، ظاہر سی بات ہے کہ بلند و بالا عمارت کو دیکھتے ہی دل میں اس کی بنیاد کی مضبوطی محسوس ہونے لگتی ہے، بالکل اسی طرح نئی نسل جب بھی کوئی اہم اور نمایاں کارنامہ انجام دیتی ہے تو اس میں پچھلی نسل کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہوتا ہے۔ آج دنیا ہوائی جہاز اور راکٹ سے بھی آگے نکل جانے کے لیے پر تول رہی ہے لیکن آج بھی جس آدمی نے پہلے پہل پہیہ بنایا تھا اس کی حکمت کو اس امکان سے خارج نہیں کیا جا سکتا، آج دنیا کا سب سے بڑا مرض ایڈز ہے اگر اس کا علاج کوئی ڈاکٹر تلاش لیتا ہے تو لوگ کہیں گے کہ سب سے اچھا ڈاکٹر بھی وہی۔ مگر اس بات سے اس ڈاکٹر کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی جس نے پہلے پہل ملیریا کا علاج تلاش کیا تھا۔

بالکل اسی طرح انسانی معاشرے اور سماج میں بوڑھوں کی اہمیت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا، ہندوستانی سماج نے ہمیشہ اپنے بوڑھوں کو عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ ہندوستانی بوڑھے کوئی پرانے اور فالتو پرزے نہیں بلکہ تجربے اور دانائی کے پیکر ہوتے ہیں۔

اس مشینی دور میں بھی ہندوستان میں مشترک خاندان کا تصور آج بھی زندہ ہے۔ ہندوستانی سماج اور معاشرے میں آج بھی بوڑھوں کی اہمیت مسلم ہے، خاندان میں اس کی حیثیت ایک دانشور سربراہ کی سی ہوتی ہے، وہ اپنے بال بچوں کی زندگی کی سمت مقرر کرنے میں ایک نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کے نہ صرف یہ کہ مشیر ہوتے ہیں بلکہ اس کے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں، خاص طور سے بوڑھی عورتیں گھر میں ایک نہایت ہی صحت مند کردار ادا کرتی ہیں، وہ خاندانی روایات کی امین اور پاسبان ہوتی ہیں، وہ خاندانی قانون داں ہوتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ان قوانین اور روایات کو عملی طور پر اپنانے میں نئی نسل کی معاون اور مددگار ہوتی ہیں، وہ رشتوں کے اعتبار سے سبھی قریب و دور کے رشتہ داروں کے حقوق سے واقف ہوتی ہیں اور اس واقفیت کی روشنی میں ان حقوق و فرائض کی ادائیگی کرتی ہیں اور اپنے عزیزوں سے کرواتی ہیں۔ وہ سماج اور خاندان میں رائج تمام روایات اور رسومات سے پوری طرح آگاہ ہوتی ہیں۔ آج کل کے اس جدید زمانہ میں کچھ لوگوں کو بے جا رسموں اور فرسودہ روایات کی شکایت ہو سکتی ہے، مگر یاد رہے کہ ساری رسمیں اور روایات فضول اور فرسودہ نہیں ہیں۔ ہندوستان کا صالح اور مرکب معاشرہ وہیں زیادہ سے زیادہ زندہ اور ہشاش بشاش نظر آتا ہے جہاں آج بھی پرانی قدریں، رواج اور روایتیں زندہ ہیں۔

بڑے بوڑھے نہ صرف یہ کہ ان ساری

مقام۔ پورہ۔ پوسٹ کبدیا، ضلع دربھنگہ ۸۴۶۰۰۹

باتوں کا خیال رکھتے ہیں بلکہ ان پر عمل بھی کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہندوستانی سماج آج بھی اپنے بوڑھوں کی قدر اور عزت دل سے کرتا ہے۔ ہمارے بوڑھے بزرگ عام طور پر گھر کے اندر اور کبھی کبھی گھر کے باہر بھی ثالث کے فرائض انجام دیتے ہیں، گھر کے لڑائی جھگڑے، خاندان کے بکھیڑے وہی سلجھاتے ہیں اور گھر خاندان کا ہر فرد ان کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بوڑھے بزرگ کسی جابر حکمراں کی طرح اپنے چھوٹوں پر جبراً حکم چلاتے ہیں، بلکہ آپسی صلاح مشورے، پیار محبت، اور خلوص و ایثار کو پیش نظر رکھ کر اپنی طویل زندگی کے سرد و گرم اور تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اپنے فیصلے اس طرح سناتے ہیں کہ سب ان کے فیصلے کے پابند ہو جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی بوڑھے دانائی فراست، تجربے اور خلوص و ایثار کے پیکر ہوتے ہیں، وہ ایک بڑی روایت کے حامل اور تجربے کے بھنڈار ہوتے ہیں، وہ خلوص دل سے چاہتے ہیں کہ نئی نسل کو وہ سب کچھ سونپ دیں جو اس نے برسوں کی محنت اور مشقت کے بعد حاصل کیا ہے، مگر آج کے کچھ خود غرض اور مردہ ضمیر نوجوان مغرب کی اندھی تقلید میں اپنے بوڑھوں کو زحمت سمجھتے ہیں، وہ اتنے بے حس ہوتے جا رہے ہیں کہ اپنے بوڑھے بزرگوں کے مال و اسباب کا تو ایک ایک حبہ حاصل کر لینا چاہتے ہیں، لیکن ان کی شاندار روایات کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے از کار رفتہ سمجھ کر ٹھکرا دیتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں ہے ہمارے سماج اور معاشرے میں آج ایک ایسا طبقہ بھی پنپ رہا ہے جو بالکل مغرب کی طرح بوڑھوں کو سماج سے الگ کر دینا چاہتا ہے مگر ان لوگوں کو یہ کون سمجھائے کہ بوڑھے ہندوستانی معاشرے کا اٹوٹ حصہ ہیں، جس دن انھیں توڑ دیا گیا اس دن ہمارا معاشرہ اپاہج ہو جائے گا۔

ہندوستانی معاشرے میں ایک عام برائی جو جڑ پکڑتی جا رہی ہے وہ ہے ایک عام خیال کہ یہ بوڑھے بوڑھی خواہ مخواہ کی قدامت پرستی اپنا کر گھر کا ماحول اور بچوں کے افکار بگاڑ دیتے ہیں۔ بعض ماڈرن بہوئیں بھی بہت کچھ ایسا کرتی ہیں جن سے دادا دادی کے پوتا پوتی کے ساتھ جذباتی رشتے مجروح ہونے لگتے ہیں، جس کی وجہ سے رشتوں کے تقدس کو سخت چوٹ پہنچتی ہے، حالاں کہ یہ بوڑھے بوڑھیاں بچوں کے ڈاکٹر سے زیادہ بچوں کی نفسیات داں ہوتے ہیں، اکثر ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ اچانک رات میں بچہ اٹھ کر رونے اور بلبلانے لگتا ہے تو نوجوان والدین بوکھلا جاتے ہیں، مگر ان بوڑھے بوڑھیوں میں سے کوئی آکر بچہ کو کچھ دیر غور سے دیکھتے ہیں اور مسکراتے ہوئے بچہ کو گود میں اٹھا کر کہتے ہیں کوئی خاص بات نہیں ہے بچہ کے پیٹ میں مروڑ ہے اور بوڑھی دادی پوتا ہو یا پوتی کو سینے سے چمٹائے کہیں سے ایک ڈبیہ یا پوٹلی نکال لاتی ہے اور اجوائن کے چند قطرے اس کے حلق میں ٹپکا کر نہ صرف یہ کہ اس کا درد دور کر دیتی ہے بلکہ اسے پھر سے پرسکون نیند سلا دیتی ہے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ گھر میں موجود بوڑھے بزرگوں کی وجہ سے نوجوان جوڑے کو فائدہ ہی فائدہ ہے، اس بڑھاپے میں بھی وہ شوق سے بچوں کے لیے جاگتے ہیں۔ پریشانی اٹھاتے ہیں اور نوجوان بہو اور بیٹے کو آرام پہنچاتے ہیں اور پھر اس مشینی دور میں جہاں ہر انسان مشین بنا ہوا ہے اس دور میں تو بوڑھوں کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے کیونکہ اس ماڈرن دور میں عورت اور مرد دونوں کماتے ہیں اس طرح انھیں آٹھ گھنٹے کم از کم تو باہر گزارنا ہی پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں کسی نہ کسی کا ہونا تو لازمی ہی ہے، آپ کہیں گے کہ کوئی قابل دایا یا ماہر اتالیق رکھا جا سکتا ہے، مگر آپ ذرا انسانی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر سوچیے کہ جس اپنائیت اور جس محبت و شفقت کا آپ کا بچہ طالب ہے کیا وہ آپ کے بعد آپ کے بچوں کو دایا یا اتالیق دے سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ یہ محبت، خلوص، ایثار، اپنائیت اور شفقت کا بے بہا سرمایہ آپ کے بعد ان بچوں کو صرف ان کے دادا اور دادی ہی دے سکتے ہیں۔ کچھ لوگ جو سماج میں بوڑھوں کی اہمیت اور مقبولیت سے نالاں ہیں وہ اس طرح کی بات کرتے ہیں کہ ایک خاص عمر تک ہی یہ لوگ کام کرنے کے لائق ہوتے ہیں۔

آپ نے ایسے سیکڑوں بوڑھوں کو دیکھا ہوگا جنھوں نے ریٹائر ہونے کے بعد ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں جو کسی پرجوش نوجوان نے کبھی انجام نہیں دیے ہوں گے۔ یہ بوڑھے اپنی عقل و دانش کے بل پر جب کسی بزنس کی طرف مائل ہوتے ہیں تو بڑے سے بڑے تاجروں سے لوہا منوا لیتے ہیں۔ یہی بوڑھے اپنے تجربات اور دانائی و فراست کے بل پر جب سیاست میں حصہ لیتے ہیں تو چوٹی تک پہنچ جاتے ہیں اور ملک کی باگ ڈور سنبھال لیتے ہیں۔ جب یہ قومی مسائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو برسوں سے الجھے مسئلوں کو ہفتوں میں سلجھا دیتے ہیں، ان کے مشوروں سے قوم کو مثبت سمت ملتی ہے، اس لیے اگر ہم چاہتے ہیں کہ مغرب جیسا انتشار ہمارے سماج اور معاشرے میں نہ پھیلے تو ہمیں چاہیے کہ ہم رشتوں کی عظمت اور اس کی پاکیزگی کا خلوص دل سے خیال رکھیں اور اپنے بوڑھے بزرگوں کا تقدس اور احترام اسی طرح برقرار رکھیں جس کے وہ ابتدائے آفرینش سے حق دار ہیں۔ ●

یوجنا، نئی دہلی

بقیہ: جان بچانے والا راڈار

فرد کے جسم سے ٹکراتے ہیں۔ چوں کہ متاثرہ فرد سانس لے رہا ہے اور تنفس جاری ہے۔ لہٰذا جب یہ اشارے بازگشت کی صورت میں واپس ریسیور کو موصول ہو جاتے ہیں تو انھیں ترسیمی کاغذ (گراف پیپر) پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان اشاروں میں ایک خاص قسم کی ترتیب ہوتی ہے۔ اس ترتیب کو دیکھ کر ماہرین اندازہ کر لیتے ہیں کہ اندر ملبے میں کوئی فرد زندہ ہے، پھر اس کی مدد کی جا سکتی ہے۔ اس آلے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ صرف زندہ فرد کی موجودگی کی اطلاع ہی نہیں دیتا بلکہ اس کا محل وقوع بھی بتا دیتا ہے کہ متاثرہ فرد کس گوشے میں ہو سکتا ہے۔ اس آلے کو خاص طور پر بہت زیادہ "حساس" بنایا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی بہت زیادہ زخمی اور کمزور ہو اس کی سانس اور حرکت قلب بہت کمزور پڑ گئی ہو۔ تو بھی اس کا سراغ لگا کر جان بچائی جا سکتی ہے۔ ●

راشد انور راشد

اردو غزل کا سماجی پس منظر

اس سلسلے میں کچھ عرض کرنے سے قبل ہمارے ذہن میں سماجیات کی اصطلاح واضح ہوتی چاہیے تاکہ غزل کا مطالعہ ہم اسی تناظر میں کرسکیں۔ ایسا کرنا اس لیے بھی مناسب ہوگا کہ مقالے کی مختلف کڑیوں کو سلسلے وار ڈھنگ سے ترتیب دینے میں ہمیں مدد ملے گی۔

انسان سماج میں رہتا ہے اور سماج کا ایک حصہ ہونے کی وجہ سے وہ بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر سماج کے مختلف ضابطوں اور اصولوں سے بھی جڑا ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام مرحلے وہ اسی سماج میں رہ کر طے کرتا ہے اور ایک ذی شعور و حساس مخلوق ہونے کی بنا پر بہتر سے بہتر کی تلاش ہر لمحہ اس کے آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ذہنی اور جذباتی سطح پر سماج سے اس قدر جڑے رہنے کی وجہ سے اس کے نظریات بھی خاطر خواہ تاثر قبول کرتے ہیں۔

سماجیات کی ہی مانند ادب کا بنیادی رشتہ انسان کے سماجی ماحول سے جڑا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہر لمحہ اس میں بہتر سے بہتر کی توقع بھی پروان چڑھتی ہے۔ مروّجہ اقدار سے ہٹ کر بہتر نظام کے قیام کے لیے ہم مختلف تبدیلیوں سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ادب کے مختلف اصناف موضوعات کے اعتبار سے مختلف پہلوؤں سے جڑے ہوتے ہیں، اور بلاشبہ سماج سے جڑے رہنے کی وجہ سے وہ آفاقیت کے حامل ہوجاتے ہیں۔

ادبی سماجیات کا خاص مقصد ہے سماج سے رشتے کی کھوج اور اس کی وضاحت، ادبی سماجیات کے دائرے میں سماج کے ان تمام تر پہلوؤں کی شمولیت ہوتی ہے جن کا رشتہ ادب سے قائم ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے سماج اور ادب کے رشتے کی وضاحت ہوتی ہے اور اس سلسلے میں جتنی بھی گتھیاں ہمارے ذہن میں موجود ہوتی ہیں انھیں ایک سمت مل جاتی ہے۔ ادبی سماجیات کے مطالعے کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے توسط سے ہمیں ادب اور سماج کو ایک نئے سیاق و سباق میں دیکھنے میں مدد ملتی ہے۔ ادب اور سماج ایک دوسرے کو کس طرح متاثر کرتے ہیں اور ایک سازگار اور آرائش فضا کے قیام کے لیے ان کا باہمی اشتراک کہاں تک معاون ہوتا ہے؟ ان سوالوں کے تشفی بخش جواب ہمیں ادبی سماجیات کے مطالعے کے دوران دستیاب ہوتے ہیں۔ ادب محض ذہنی آسودگی مہیا کرنے کا ایک ذریعہ نہیں ہے بلکہ بہتر سماج کی تشکیل میں بھی پوری طرح معاون ہے۔ ادبی سماجیات کے اندر انھیں تعلقات کی تلاش کی جاتی ہے۔

سماجیات کے تعلق سے غزل پر گفتگو کرتے وقت ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا ہوگا کہ شاعر خلا میں شاعری نہیں کرسکتا، زمین سے جڑے رہنے کی وجہ سے اس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ زمین کے مسائل کی جانب متوجہ ہو اور اس کا خاطر خواہ حل بھی پیش کرے، جس سماج، جس معاشرے میں وہ رہتا ہے، اس کی خوشبو اس کی شاعری میں موجود ہو، اس کے جذبات اور محسوسات کی واضح نشاندہی اس کے ذریعے ممکن ہو۔ بلاشبہ تخیل کو شاعری میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے لیکن فقط تخیل پر ہی شاعری کا دار و مدار نہیں ہوتا۔ ہم تخیل کے سہارے کتنے ہی خوبصورت خیالات شاعری میں پیش کردیں اس میں ایک خاص تاثر اس وقت پیدا ہوگا جب ہمارے جذبات اور محسوسات کی اس میں شمولیت ہوگی۔ ظاہر ہے ہمارے جذبات و محسوسات صرف ہم تک ہی محدود نہیں رہتے کیوں کہ سماج کا ایک حصہ ہونے کی وجہ سے ہم پورے معاشرے، پوری تہذیب سے منسلک ہوتے ہیں۔ لہٰذا انفرادی جذبات و احساسات مجموعی حیثیت کے حامل ہوجاتے ہیں۔

اردو ادب میں ابتدا سے ہی شاعری کی ایک عظیم روایت رہی ہے اور شاعری میں بھی مقبولیت کا تاج ہمیشہ غزل کے سر پر ہی بندھتا چلا آیا ہے، جس دور میں جو رجحان غالب رہا اس کی کامیاب عکاسی غزل کے اشعار میں ہمیشہ سے ہی پیش کی جاتی رہی ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے عہد میں عشق و عاشقی، شراب و شباب، ذاتی مسائل اور زمانے کی ناقدری کا رویّہ عام رہا۔ لہٰذا ان شاعروں نے اپنی اپنی انفرادیت کے سہارے انھیں کامیابی کے ساتھ برتا، اس لیے ہمیں زندگی کی الگ الگ تصویریں ان کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں، جہاں مسائل کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے، جہاں سماج، تہذیب اور

۳۱۹۔ ای۔ برہمپترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی، ۶۷

اشرے کو جانچنے اور پرکھنے کے رویے میں خاصا بدلاؤ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب ہم اقبال اور فیض کے عہد میں آگئے ہیں تو ایک نئے سماج کی تشکیل پاتے ہیں۔ جہاں مسائل کی نوعیت اور ساتھ ہی ٹریٹ منٹ میں بھی خاصی تبدیلی دیکھی ہوتی ہے، حالاں کہ اقبال کی شہرت ان کی فلسفیانہ نظموں کی وجہ سے ہوئی ہے لیکن اپنی غزلوں میں بھی انھوں نے ایک خاص مقصد کے تحت اصلاح معاشرہ کی تلقین کی ہے اور سماج اور قوم کی فلاح و بہبودی کے لیے کارآمد نسخے بتائے ہیں۔ فیض کے یہاں وقت اور زمانے کی آواز پر لبیک کہنے کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں ہزار بندشوں اور تمام تر اذیتوں کے باوجود غلامی کا طوق گلے سے اتار پھینکنے اور آزادی کی فضا میں سانس لینے کی خواہش ہر لمحہ پروان چڑھتی ہے۔ میر، غالب، مومن، اقبال اور فیض۔ یہ پانچ شعراء جو ذہن پر زور ڈالتے ہی سامنے آتے ہیں۔ سماجیاتی مطالعے کے تعلق سے ان کا ایک ایک دو دو شعر پیش کر کے ہم اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہیں گے۔ حالاں کہ ان کے یہاں ایسے اشعار اچھی خاصی تعداد میں مل جائیں گے لیکن فی الحال ان کا تفصیلی بیان ہمارا مقصد نہیں۔

بات ہم ۱۸ ویں صدی میں میر تقی میر سے شروع کرتے ہیں جنھیں اجڑی ہوئی دہلی کی علامت کہا جاتا ہے۔ دہلی کی زبوں حالی اور درد و کرب کا بیان ہمیں تاریخ کی کتابوں میں تو ضرور مل جائے گا لیکن اس زبوں حالی اور اس کرب کی حقیقی تصویریں تمام تر جذبوں کے ساتھ جتنی کامیابی سے ہمیں میر کے یہاں دیکھنے کو مل جائیں گی وہ تاریخ کی نادر کتابوں سے بھی دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ میر نے اپنے دل کا حال دہلی کے درد و کرب سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے کہ ہم اس درد کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس ضمن میں میر کا یہ مشہور شعر ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

دہلی کے اجڑنے اور برباد ہونے کا اتنا قریبی مشاہدہ اسی وقت ممکن ہے جب آنکھوں کے سامنے پل بھر میں زندگی کی ساری رعنائیاں دم توڑ گئی ہوں۔ زندگی کو جیتے جی موت کا کفن پہنا دیا گیا ہو۔ اس زبوں حالی کے دور میں عوام کن کن مسائل سے دوچار ہوئے، اس قیامت خیز گھڑی میں انھیں جینے کے لیے کس کس طرح گھٹ گھٹ کر مرنا پڑا، ان تمام باتوں کا بیان اتنی کامیابی کے ساتھ اسی وقت ممکن ہے جب بہ نفس نفیس شاعر نے اس دہشت ناک ماحول کو دیکھا ہو، دہلی تو بار بار اجڑی اور پھر بس بھی گئی لیکن دلوں پر جو زخم لگے وہ کسی بھی طرح نہیں بھر پائے۔ سماج اور معاشرے کا انتشار، درد، تڑپ اور سب سے بڑی بات عوام کی بے بسی اور لاچاری میر کے اس شعر کے ذریعے پوری طرح اجاگر ہوتی ہے اور اس مخصوص سماج کی تہذیب اور معاشرے میں آئے اتار چڑھاؤ کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے میں خاطر خواہ مدد کرتی ہے، شاید دہلی کو ہی دل قرار دے کر میر نے ایک جگہ اور کہا تھا ؎

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

۱۹ ویں صدی میں غالب اور مومن کا عہد تو ایک ہی تھا لیکن تجربات و مشاہدات کی سطح پر ہمیں دونوں کے یہاں کافی فرق دیکھنے کو ملتا ہے اور یہ فرق بہت حد تک دونوں کی جداگانہ سماجی حیثیت سے بھی جڑا ہے، مومن اچھے کھاتے پیتے خوشحال گھرانے سے تعلق رکھنے کی بنا پر زندگی کے اس درد و کرب سے ناآشنا رہے جو غالب کے حصے میں آیا۔ مومن نے عیش و عشرت میں زندگی گزاری۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے زندگی کے اس دکھ درد سے ناواقف رہے جہاں گھٹ گھٹ کر ہر لمحہ صدیوں کا کرب جھیلنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ہم ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک خاص کیفیت کے سہارے جذبات و احساسات کا بیان پاتے ہیں۔ زندگی کے درد و غم سے تو محفوظ رہے لیکن عشق کے مرض میں ایسے گرفتار ہوئے کہ ذہن و دل پر صرف محبوب کا تصور ہی حاوی ہو گیا اور پھر عشق و عاشقی کا بیان مختلف کیفیات کے سہارے اظہار کی نئی نئی شکلیں اختیار کرتا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کی عشقیہ شاعری کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس پورے مرحلے کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں اس ماحول، اس معاشرے کا تمام تر پس منظر بھی ذہن نشین رکھنا ہوگا۔ مومن کے متعلق مشہور ہے کہ نوجوانی کے عالم میں وہ ایک طوائف کو اپنا دل دے بیٹھے اور پھر اس کے تعلق سے محبوب کی تمام تر اداؤں اور ناز نخروں، بالخصوص پرکشش آواز کا جادو شاعری میں جذب ہو کر شائقین ادب کو مسحور کرنے لگا، یہ شعر دیکھیں یہ

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

یہ شعر اس مخصوص دور کی نشاندہی کرتا ہے جب سماج میں طوائفوں کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ امراء و شرفاء ان کے کوٹھوں پر مجرے سننے جایا کرتے اور خاص موقعوں پر خود اپنے حویلیوں میں رقص اور موسیقی کا اہتمام کرتے۔ طوائفیں اپنی آواز کا جادو جگانے اور حسن کے جلوؤں سے عاشقوں کے دلوں پر حکومت کیا کرتیں اور عاشق ان کی اداؤں پر فریفتہ ہو کر ان کے ایک اشارے پر دنیا کی ساری خوشیاں نثار کر دینے کو ہمہ وقت تیار رہتے، اس جیسے اور بھی جتنے اشعار ہیں ان کی تہہ تک پہنچنے کے بعد ہمیں اس خاص دور کی جیتی جاگتی زندگی اپنے تمام تر پس منظر کے ساتھ بالکل واضح شکل میں دکھائی دینے لگتی ہے جس خاص دور میں اس خاص شعر کی تخلیق کی گئی ہو۔

غالب کے ساتھ معاملہ کچھ حد تک اس کے برعکس رہا۔ عشق و عاشقی کے جذبوں سے معمور ہونے کے باوجود زندگی کی پریشانیوں اور مصیبتوں نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ کیف و سرمستی کی رنگینیوں کا ذکر دل نشیں انداز میں کیا جاتا۔ زندگی بھر تنگ دستی کے شکار رہے اور زمانے کی ناقدری کا احساس بار بار ستاتا رہا۔ انسان جب ہزار دشواریوں میں اپنے آپ کو گھرا پاتا ہے اور نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تو شراب کے سہارے اپنا غم، اپنی پریشانیاں بھلانا چاہتا ہے۔ اسی صورت حال کے پیش نظر غالب کو شراب نوشی کی لت لگی اور پھر جیسے وہ زندگی کا ایک اہم

حصہ بن گئی۔ ایک ایسا حصہ جس کے بغیر شخصیت کی تکمیل کا احساس ادھورا ہو، یہ شعر دیکھیں۔ ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یا پھر یہ شعر۔

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اس طرح اور بھی کئی اشعار مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں جس سے یہ امر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور میں مے کشی رندگی کا ایک خاصہ جزو بن چکی تھی لیکن حقیقی وجوہات تلاش کرنے پر یہ راز افشاں ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے زندگی کی ناہمواریوں کا ایک طویل سلسلہ کارفرما ہے، زندگی کو لطف و مسرت کے ساتھ بسر کرنے کی تمنا غالب میں بہت قوی تھی لیکن وہ دور اس میں حارج تھا۔ اس لیے شخصیت اور رو بہ انحطاط معاشرے کے تصادم کی بڑی خوب صورت تصویریں ان کے کلام میں مل جاتی ہیں۔

بہتر سماج اور معاشرے کے قیام اور قوم کی فلاح و بہبودی کا جذبہ اقبال کے یہاں غالب رجحان کی صورت میں سامنے آتا ہے، حالاں کہ انھوں نے اپنی لافانی نظموں کی بدولت اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی لیکن اپنی غزلوں کے ذریعے بھی انھوں نے اپنے خاص پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دیا اور وہ خاص پیغام تھا ہم وطنوں کو ان کی زبوں حالی کا احساس دلانا اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک نئے جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ دینا۔ زمانے کی ستم ظریفیوں کے تحت اہل قوم کے حواس اس بری طرح باختہ ہو گئے تھے کہ انھیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا اور روز افزوں اپنی بگڑتی ہوئی حالت کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ عمل پیہم سے دست بردار ہو کر تقدیر پر ہی پوری طرح قناعت کرنے لگے تھے۔ یہ صورت حال بڑی جان لیوا تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ خوابیدہ قوم کو یک لخت جھنجوڑا جائے، انھیں تازہ صورت حال سے واقف کرایا جائے، زندگی جینے کا جذبہ ان میں پیدا کیا جائے اور تقدیر پر شاکر نہ رہ کر اپنی تقدیر خود لکھنے کا جوش پیدا کیا جائے۔ شاعری کے حوالے سے یہی کام اقبال نے انجام دیا۔ انھوں نے ایک طرف نصیحت آموز باتوں کو ایک خاص پس منظر میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ۔ ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

تو دوسری طرف اپنی اہمیت کو پہچاننے کی تلقین کی، اپنی خودی کا ایک خاص معیار قائم کرنے کا مشورہ دیا۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال نے اپنی غزلوں میں بھی ایک خاص طرح کی مقصدیت کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا۔ اقبال کا یہ انداز ایک خاص دور میں موجود ایک خاص طرح کے رجحان کی عکاسی کرتا ہے اور سماجی مطالعے کے لیے مواد فراہم کرتا ہے۔

فیض نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا وہ دور کئی اعتبار سے انقلابی دور تھا جہاں فرسودہ روایت و اقدار تیزی سے پائمال ہوتی جا رہی تھیں اور زندگی کا ایک بالکل نیا رجحان فروغ پا رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک اپنے پورے شباب پر تھی اور اس کے تعلق سے نئے نئے خیالات و نظریات افکار کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔ آزادی کے متوالوں نے اجالے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے شمار تاریک راتوں کا کرب خوشی خوشی جھیلا، ملک کی آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے کتنی مصیبتیں برداشت کیں، لیکن مادر وطن پر ہزاروں جانیں نچھاور کرنے کے بعد آزادی کا سورج نمودار ہوا بھی تو تقسیم وطن کے زخم سے لہولہان تھا۔ فیض نے کہا۔ ؎

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

یہ اشعار صاف واضح کرتے ہیں کہ ان اشعار کی تخلیق صرف ویسے ہی ماحول میں ممکن تھی جہاں اس طرح کا غالب رجحان فروغ پا رہا تھا۔ مندرجہ بالا تمام اشعار کے آئینے میں اس دور کی واضح تصویریں دیکھ سکتے ہیں جو ان کی تخلیق کا سبب قرار پائیں۔ موضوع اور خیال وقت اور زمانے کے لحاظ سے تبدیلی تو ہو سکتا ہے لیکن ہزار تبدیلیوں کے باوجود اس کا دائرہ سماج، معاشرے اور تہذیب کے ارد گرد ہی گھومے گا اور سماج، معاشرے و تہذیب سے جڑے رہنے کی وجہ سے مخصوص دور کے غالب رجحانات کی شمولیت اس میں بہرحال ہوگی۔ اردو غزل نے وقت اور زمانے کے اس تقاضے کو ہمیشہ ہی اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ یہ خصوصیت آج بھی غزل میں کامیابی کے ساتھ دکھائی دیتی ہے اور یہی اس کی مقبول ترین صنف ہونے کی وجہ رہی ہے۔ ●

کیمیاوی ہتھیاروں سے متعلق کنونشن پر بین الاقوامی تربیتی کورس

کیمیاوی ہتھیاروں کے کنونشن سے متعلق معاہدہ کے نفاذ سے وابستہ عملہ کے لیے تربیتی کورس گوالیار میں منعقد ہو رہا ہے۔ بھارت دنیا کے ان چند ممالک میں سے ایک ہے جس کا انتخاب کیمیاوی ہتھیاروں کی روک تھام کے ادارے کے تحت عارضی تکنیکی سکریٹریٹ واقع ہیگ نے ایسا تربیتی کورس منعقد کرنے کے لیے کیا ہے۔

کورس کے اہتمام کا مقصد مختلف ممالک کے ان عملہ کو تربیت دینا ہے جو اپنے اپنے ملک میں کیمیاوی ہتھیاروں کے کنونشن سے متعلق معاہدے کے نفاذ کا ذمہ دار ہے۔

مذکورہ تین ہفتہ کے کورس کا افتتاح، کیمیاوی و انشیار پیٹرو کیمیکل کے محکمہ کے سکریٹری شری اے این بنرجی کریں گے۔ اس میں فرانس اور چین سمیت ۲۴ ممالک کے ۳۰ مندوبین شریک ہوں گے۔ او-پی-ای-ڈبلیو کے سینئر سطح کے ماہرین کے علاوہ دفاعی تحقیق اور ترقیاتی ادارے، وزارت خارجہ اور کیمیاوی انشیار پیٹرو کیمیکلز کے ماہرین بھی اس میں شریک ہوں گے۔ ●

صفدر حسین رضوی

حیات اللہ انصاری کی ناول نگاری: ایک جائزہ

حیات اللہ انصاری اردو ناول کی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں آپ نے اردو ناول کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ بیسویں صدی کے نصف اول کا عہد کئی اعتبار سے اہم رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس عہد کو بحرانی دور کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس عہد کے بیشتر ناولوں میں زوال آمادہ جاگیردارانہ نظام، اس کی باقیات اور انگریز سامراجیت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے تو دوسری جانب عوام کے اندر نے تعلیمی نظام اور بیرونی اثرات کے تحت قومی بیداری اور سیاسی جدوجہد کا جو شعور پروان چڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی متعدد اصلاحی تحریکیں بھی اس قومی بیداری میں اپنا رول ادا کر رہی تھیں ان ساری چیزوں کو ہم اس عہد کے ناولوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ دور ایسا تھا کہ عالمی سطح پر سیاسی اور سماجی انتشار برپا ہو رہا تھا۔ نئی نئی سائنسی ایجادات، صنعتی انقلاب اور نت نئے علوم و فنون کے اثرات نہ صرف نظریاتی سطح پر شکست و ریخت اور نئی قدروں و نظریات کی روداد اور ان کی باہمی کشمکش پر نمایاں تھے بلکہ سیاسی سطح پر بھی تغیر و تبدل اور اتھل پتھل جاری تھی۔ اسی عہد نے دو جنگ ہائے عظیم کو خون بھری آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کا سامنا بھی کیا تھا۔ اُدھر روسی انقلاب پوری دنیا کو متاثر کر رہا تھا اور اس کی سیاسی بیداری نے دیگر ممالک کو بھی سیاسی سطح پر بیدار کرنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں پر ہندوستان ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کی گرفت سے آزاد ہوا وہیں پر ایک بڑا سانحہ تقسیم کی شکل میں رونما ہوا اور ایشیا کا یہ عظیم ملک دو حصوں میں بٹ کر بکھر گیا۔ یہ سارے حالات کچھ اس طرح سے رونما ہوتے چلے گئے کہ انسانیت تھرا کر رہ گئی اور حساس دل رکھنے والے تفکرات میں گھر کر رہ گئے۔ ان حالات کو ہم اس دور کی تخلیقات میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس عہد کے بیشتر ناولوں کے موضوعات یہی حالات رہے ہیں۔ حیات اللہ انصاری بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں جنھوں نے اس عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشی و معاشرتی زندگی کی پیش کش میں اپنا منفرد انداز اختیار کیا ہے، جن کو ہم ان کے ناولوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

یوں تو حیات اللہ انصاری نے اپنا پہلا ناول ۱۴ سال کی عمر میں لکھا تھا لیکن نہ تو وہ شائع ہوا اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی پتا چلتا ہے کہ اس کا موضوع کیا تھا۔ مصنف نے بھی اس کی کوئی تفصیل نہیں لکھی ہے۔ ان کا ناول "لہو کے پھول" ۱۹۶۹ میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ یہ ناول کافی ضخیم ہے اور ۵ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ اس ناول پر پریم چند کا اثر واضح شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ اس ناول میں دیہی معاشرت اور دیہات کی تہذیبی زندگی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں اتر پردیش کے پسماندہ طبقات اور کسانوں کے مسائل ان کی محرومیاں اور ان کے استحصال کی تصویر کشی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں جدوجہد آزادی کے تناظر میں گاؤں اور شہر کے بدلتے رشتے اور تقسیم کے المیے کے خدوخال بھی اجاگر ہو کر سامنے آتے ہیں۔ کسانوں اور ان کے مسائل، مزدور اور اس کا استحصال کرنے والے زمیں داروں، مہاجن، پنڈت، انگریز حکمرانوں کے مظالم، قومی آزادی کی جدوجہد، خلافت تحریک، عدم تعاون تحریک، عدم تشدد کا فلسفہ، مسلم لیگ کے نظریات، ہندو مسلم سیاست، فرقہ واریت کا عروج اور تقسیم ملک سبھی کچھ اس ناول میں موجود ہے۔ ہندوستان کی دیہی معاشرت اور تحریک آزادی کی جدوجہد اور اس کے وہ دو محاکاتی تار و پود ہیں جن سے پورا ناول تشکیل پاتا ہے۔ پروفیسر محمد احسن اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں:

> "دیہاتی زندگی جیتی جاگتی تصویریں، کیسے دلکش، سہانے، سلونے، رومانی لمحے، کرداروں کے کیسے دلنواز مرقع یہاں ملتے ہیں۔۔۔۔ پہلی جلد میں پریم چند یاد آتے ہیں لیکن پریم چند کی نقالی نہیں ہے۔ پریم چند کے جیسے مشاہدے کی زبردست قوت ہے البتہ شروع ہی سے ایک بات کا احساس ہوتا ہے۔ دیہات پسماندہ ہے اور کسان مظلوم اور غریب۔"

(محمد حسن، عصری ادب ص ۸۱-۸۰ جنوری ۱۹۷۰ء)

"لہو کے پھول" کے مطالعے کے وقت پریم چند کا یاد آنا فطری بات ہے اس لیے کہ حیات اللہ انصاری کی فکر پریم چند سے بہت قریب ہے۔ لیکن پریم چند کی پیروی یا پرتو نہیں ہے وہ جس طرح کی عکاسی اور سیاسی و معاشرتی حالات سے کام

۱۳۷، سابرمتی ہاسٹل۔ جے۔ این۔ یو نئی دہلی، ۶۷

لیتے ہیں وہ پریم چند سے آگے کا ہے۔ ڈاکٹر سید علی حیدر لکھتے ہیں:

"اس میں شمالی ہند کے ۱۹۱۱ء سے ۱۹۵۲ء تک کے سماجی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے لیکن اسے تاریخی ناول نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ ناول نگار نے تاریخی واقعات کو تخلیقی رنگ و آہنگ عطا کر کے فنکاری کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ اسی لیے تاریخی ناول نہ ہونے کے باوجود اس سے اس دور کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کی ترتیب کے لیے نتیجہ خیز مواد فراہم کیا جاسکتا ہے"

(اردو ناول سمت و رفتار، سید علی حیدر ص ۱۹۲)

حیات اللہ انصاری کے اس ناول کے متعلق ناقدین کی مختلف آرا ہیں لیکن اس کی ضخامت پر بیشتر نے اعتراض کیا ہے کہ اس ناول کی ضخامت نے اس کو غیر مربوط پلاٹ کے حوالے کر دیا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی حیات اللہ انصاری کے فن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے منفرد انداز بیان سے اس ناول کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ وہ ہندوستان کی دیہی معاشرت اور تحریک آزادی ان دونوں پہلوؤں کو کچھ اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ نہ صرف پورے ہندوستان کی سیاسی جدو جہد اور قومی بیداری کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے بلکہ ہندوستانی زندگی کے مختلف گوشے اور اس کے مختلف مسائل بھی پوری طرح سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ناول میں تحریک آزادی کو مرکزی حیثیت دے کر جدو جہد آزادی کی پوری فضا کو حد درجہ کامیابی کے ساتھ سمیٹ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ حیات اللہ انصاری نے اس پوری تحریک کو ایک خاص سیاسی ونظریاتی زاویے سے دیکھا ہے، جس کے سبب ناول میں پیش کردہ آزادی کی تصویر یک رخی بن کر رہ گئی ہے۔

فنی سطح پر بھی یہ ناول بہت ساری کمزوریوں کا شکار ہو گیا ہے خصوصاً اس کی بے جا طوالت نے اس کی اہمیت کو ختم کر دیا ہے۔ ہاں اس ناول میں چند ایک کردار ایسے آئے ہیں جو ناول کی دنیا کو متاثر کرتے ہیں۔ بعض واقعات کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے ان کو رواروی میں شامل کر لیا ہے ٹھیک اسی طرح کے کچھ کردار بھی آئے ہیں جو لمحاتی طور پر ناول کے صفحات پر عیاں ہوتے ہیں اور پھر کتاب کے اوراق میں گم ہو جاتے ہیں۔

جب اس کے محور کو تلاش کرتے ہیں تو بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول کی ابتدا اس کے خاتمے سے منسلک ہے۔ یعنی مٹی کے بنے ہوئے کھلونوں کی طرح کسان، مرد اور عورت جو ناول کے آغاز میں دبے کچلے اور بے جان ہیں آخر میں ایک لیڈر کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ وہ مختلف قسم کے افتتاحی جلسوں میں جاتے ہیں اور نلکے، کنواں اور اسپتال کا افتتاح کرتے ہیں، جو ملک میں پنج سالہ منصوبے کے تحت بن رہے ہیں۔ یعنی کس طرح سے آزادی کی جدو جہد نے مٹی سے بنے کھلونوں کو انسان بنا دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہی ناول کا مرکزی خیال ہو۔ ہاں اس ناول کے متعلق تو اتنا کہا ہی جاسکتا ہے کہ مصنف سیاسی تاریخ کی عکاسی میں زیادہ الجھے نظر آتے ہیں۔ جس کے سبب انھیں اعلا ترین فلسفیانہ سطحوں تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں ملا ہے۔ جب کہ اعلا ناول نگاری تو وہی ہے کہ جو کامیاب کردار نگاری اور سچی تہذیب کی عکاسی تک ہی محدود نہ ہو بلکہ اس کے ذریعے سے گہری فکری بصیرتوں تک بھی پہنچا جاسکے اور فکری سطح سے اوپر اڑان بھر سکے۔

حیات اللہ انصاری کے ناولوں میں "گھروندہ" بھی ہے۔ یہ ناول دو تہذیبی اکائیوں کی آویزش ہے۔ مصنف نے اس ناول کے لیے دو مختلف تہذیبوں کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ اس کی کہانی دو جوشِ جنوں میں بہکے ہوئے نوجوان شہاب اور رنگین کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے۔ زمین دار گھرانے کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان جو اتفاق سے ایک بنجارن دوشیزہ پر عاشق ہو جاتا ہے اور اپنے گھر کو چھوڑ کر بنجاروں کے ساتھ جنگلوں، قریوں کی خاک چھانتا رہتا ہے اور حالات کے نشیب و فراز کا شکار بھی ہوتا ہے۔ قبیلے والے اپنے قوانین کے مطابق اس کا مختلف طرح سے امتحان لیتے ہیں اور شہاب رنگین کی محبت کی خاطر ہر امتحان سے گزرنے کے لیے آمادہ و تیار رہتا ہے۔ بالآخر قبیلے والے اس کے اخلاص اور جذبات کی قدر کرتے ہوئے رنگین سے شادی کر دیتے ہیں۔ شہاب رنگین پر اپنی زندگی کی ساری آرزوئیں اور تمنائیں نچھاور کر دینا چاہتا ہے، لیکن ساتھ ہی قبیلے کی سخت زندگی، جہالت اور پسماندگی اور روکھی سوکھی غذا سے متنفر ہو جاتا ہے اور پھر اپنے اسی ماحول میں لوٹ جاتا ہے جہاں سے چل کر وہ آیا تھا۔ ادھر رنگین کے لیے بھی شہاب کا ماحول بالکل اجنبی ہے۔ بچپن سے کھلی فضا میں سانس لینے والی وحشی لڑکی مکانوں کی حدود اور متوسط طبقے کی اخلاقی و تہذیبی پابندیوں میں گھٹن محسوس کرنے لگتی ہے اور وہ بھی پھر اسی کھلی فضا میں واپس چلی جاتی ہے۔

مصنف کا یہ ناول بھی موضوع کے لحاظ سے طوالت کا شکار ہو گیا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ بھی غیر مربوط ہے۔ ناول نگار نے جزئیات در جزئیات سے کام لیا ہے جب کہ پورے ناول کا مقصد صرف دو تہذیبی کشمکش و آویزش کو دکھانا ہے۔ شہاب اور رنگین رشتۂ ازدواج میں بندھ تو جاتے ہیں لیکن دونوں کے بیچ ایک حد فاصل قائم رہتی ہے۔ ایک تہذیب دوسری تہذیب کو شک کی نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے۔

فنی سطح پر بھی یہ ناول مکمل نہیں اترتا ہے اور نہ ہی اس ناول کو کوئی ادبی حیثیت ہی حاصل ہے۔ کیوں کہ اس ناول میں مصنف نے صرف تہذیبی کشمکش اور جنسی بے راہ روی کو ہی مد نظر رکھا ہے۔ اس لیے اس ناول کو ادبی حدود سے باہر رکھا گیا ہے۔ ہاں اتنا تو ضرور ہے کہ اس ناول کی زبان بہت ہی سلیس ہے، پیچیدہ اور مرکب الفاظ کے مقابلے سادہ الفاظ کا تناسب زیادہ ہے۔

حیات اللہ انصاری کی ناولوں میں ایک ناول "مدار" بھی ہے جو ایک بالقوہ ناول ہے۔ اس ناول نے "لہو کے پھول" اور "گھروندہ" کو اپنے فن اور موضوع کے لحاظ سے بہت

پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس ناول کے لیے انھوں نے ایک انوکھے اور منفرد موضوع کو اپنایا ہے۔ پروفیسر محمد حسن اس کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

"حیات اللہ انصاری انوکھے اور نرالے افسانہ نگار ہیں۔ وہ کسی کے مقلد نہیں۔ اپنی راہ خود بنانے والے فنکار ہیں۔ اس بار انھوں نے فضا، کردار سبھی کچھ نئے ڈھنگ کے چنے ہیں اور اردو میں ایک انوکھے موضوع کا ناولٹ ہی نہیں لکھ ڈالا بلکہ شاید سرشار کے فسانۂ آزاد کے بعد ایسا بھرپور "پکارسک" شاید ہی کبھی لکھا گیا ہو۔"

(عصری ادب، محمد حسن، جولائی ۱۹۸۱ء ص ۱۴۷)

اس ناول کا موضوع بظاہر صرف اتنا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان جذباتی رشتے خواہ کتنے ہی مستحکم کیوں نہ ہو جائیں لیکن لطف ہم زبانی اگر نہ ہو تو زبان کی دوری یگانگت کو ختم کر دیتی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس اس ناول کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

"مدار" میں اس سارے کشمکش کی بنیاد زبان ہے۔ حیات اللہ انصاری نے بڑی فنکارانہ چابک دستی سے ناولٹ میں مادری زبان کی فوقیت کو جتایا ہے اور بتایا ہے کہ مادری زبان کا رشتہ اہم ترین انسانی رشتوں اور جذبوں پر ترجیح رکھتا ہے۔"

(ترقی پسند ادب کا ۵۰ سالہ سفر، قمر رئیس، ص ۳۱۳-۳۱۴)

مصنف نے اس ناول میں زبان کے مسئلے پر بہت زیادہ بحث کی ہے۔ دو مختلف تہذیب اور زبان کے پروردہ ایک دوسرے کے قریب تو ضرور آجاتے ہیں اور ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگتے ہیں لیکن زبان کی تفریق نے دونوں کے درمیان ایک ملک بوس دیوار کھڑی کر دی ہے جس کو گرانے میں وہ ناکام رہتے ہیں اور یہی تفریق محبوب و محب کو جدا کر دیتی ہے۔ مصنف نے اس واقعہ کے پس پردہ اردو زبان کی زبوں حالی اور اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو بیان کیا ہے۔ جس کو ہم چھوٹی چھوٹی اور خوبصورت علامتوں اور اشاروں کی شکل میں اس ناول میں دیکھ سکتے ہیں۔ مصنف نے روزا اور فوجی افسر کے کردار کے تحت زبان کی اہمیت پر بھرپور بحث کی ہے۔ یہ دونوں کردار اپنی زبان پر اٹل ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر فتح حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ یہ زبان ان کے درمیان شروع ہی سے ایک حد فاصل قائم رکھتی ہے۔

"روزا میں تم کو باقاعدہ بیوی بنا سکتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ تم اپنی انگریزی درست کر لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ ۔ روزا پر جو رد عمل ہوا وہ بالکل خلاف توقع تھا۔ وہ چڑ گئی۔۔۔ اور کہنے لگی۔
تم کیوں نہ میری مادری زبان سیکھ لو؟"

(مدار، حیات اللہ انصاری ص ۷۵)

حیات اللہ انصاری نے اس ناول کے موضوع کو روزا کے کردار کی معرفت پوری طرح سے بیان کر دیا ہے۔ زبان کیا ہے؟ اور اس کے فوائد کیا کیا ہیں؟ اور یہ فوائد کس کس طرح سماج کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں اور اس کی بقا کے لیے انسان کو کیا کیا کرنا چاہیے؟ ان ساری باتوں پر مصنف نے تفصیلی بحث کی ہے اور حقیقت بھی تو یہی ہے کہ انسان کی شناخت اس کی اپنی زبان اور تہذیب سے ہوا کرتی ہے۔ ہر فرد اپنی زبان سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے، اس بات کا احساس اس ناول میں اس وقت ہوتا ہے جب روزا حسن، جوانی، خوبصورتی ساری چیزوں کو تیاگ دیتی ہے اور ایک بوڑھے انسان کو اپنی زندگی میں رچا بسا لیتی ہے کیوں کہ وہ بوڑھا اس کا ہم زبان ہے۔ روزا یوں گویا نظر آتی ہے:

"وہ بے چارا مجھے الگ لے گیا۔ وہاں جا کر میں ٹوٹ گئی۔ مگر کیسی ڈھارس دی ہے اس نے میری اپنی ہی بولی میں۔ پھر تو میری زبان کا حال وہ ہو گیا جو پہاڑ کے اوپر سے لڑھکتے ہوئے پتھر کا ہوتا ہے۔۔۔"

(مدار، حیات اللہ انصاری ص ۱۰۵)

حیات اللہ انصاری کا یہ ناول اپنے فن، موضوع، تکنیک اور اسلوب و زبان و بیان کے اعتبار سے اردو ناول کی دنیا میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا موضوع بالکل جداگانہ اور منفرد ہے جو حقیقت نگاری سے بالکل قریب تر ہے، جس کو مصنف نے اپنی جدت طبع سے عروج تک پہنچا دیا ہے۔ نادر تشبیہات و استعارات اور اسلوب میں چھپے ہوئے علامتی و اشاراتی انداز نے اس ناول کو اور مصنف کو اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد مقام دلا دیا ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "مدار" ہر لحاظ سے قابل قبول اور لائق ستائش ناول ہے اور پورا ناول فنکارانہ بصیرت کا نمونہ ہے۔ یقیناً یہ ناول اپنے دور کے ناولوں میں اہم تخلیقات میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے کیوں کہ مصنف نے جس چیز کو جس طرح سے دیکھا ہے یا محسوس کیا ہے اس کو اسی طرح سے ناول کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ●

ریموٹ سینسنگ میں پہلا پوسٹ گریجویٹ کورس

ایشیا بحرالکاہل میں خلائی سائنس اور تکنالوجی تعلیم کے مرکز کے تحت ریموٹ سینسنگ اور جغرافیائی اطلاعات نظام میں پہلا پوسٹ گریجویٹ کورس شروع کیا گیا ہے۔ یہ کورس انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ریموٹ سینسنگ دہرہ دون میں شروع ہوگا۔ یہ مرکز اقوام متحدہ سے مربوط ہے اور اسے نومبر ۱۹۹۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ خلائی سائنس و تکنالوجی کے شعبے میں ایشیا و بحرالکاہل خطے کے ممالک کو ایسی صلاحیت پیدا کرنے کے مواقع فراہم کرائے جائیں۔

مذکورہ اولین کورس میں ۲۶ مندوبین ہوں گے جن کا تعلق ایشیا و بحرالکاہل کے ۱۵ ممالک سے ہے۔ ان ممالک میں بنگلہ دیش، عوامی جمہوریہ چین، منگولیا، میانمار، نیپال، پاکستان، فلپین، سری لنکا، تھائی لینڈ، ازبکستان اور ویتنام کے نام شامل ہیں۔ ●

شاہد اختر انصاری

تحقیق میں ببلوگرافی کی اہمیت

ابھی تک اردو زبان میں تحقیق و ترتیب کے سلسلے میں سائنٹفک انداز نظر کو پوری طرح برتا نہیں جا سکا ہے۔ مختلف یونیورسٹیوں میں سیکڑوں اسکالر تحقیق و ترتیب کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کے وسائل بڑے محدود ہیں اور ان کی زبان میں کوئی ایسا عمومی سائنٹفک نظریہ ایسا ہے بھی نہیں جو تمام لوگوں کے لیے قابل قبول ہو سکے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ریسرچ اسکالر بہت سے ایسے مسائل سے دوچار ہوتا ہے جس کا براہ راست تعلق اس ریسرچ سے نہیں ہوتا بلکہ وہ ضمنی مسائل ہوتے ہیں اور ریسرچ کے دوران اسے ان مسائل سے بھی نمٹنا پڑتا ہے۔

تحقیق میں مواد کی فراہمی کے سلسلے میں اہم مسئلہ نقطہ نظر کا تعین ہے۔ اسکالر کس نقطہ نظر سے موضوع کا جائزہ لینا چاہتا ہے یا کون سا ایسا گوشہ ہے جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکا ہے جس کو برت کر کسی صحیح نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ نقطہ نظر کی تعین کے بعد ہی مواد کی فراہمی کا مسئلہ آتا ہے اور مواد کی فراہمی میں سب سے اہم مسئلہ کتابیات کا ہوتا ہے۔

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ اردو میں تحقیق و تدوین کا کام کرنے والوں کے لیے کسی ایسے ضمنی مسائل درپیش ہوتے ہیں جو سد راہ بنتے ہیں اور اسکالر کے لیے نئے مسائل کھڑے کر دیتے ہیں۔ ببلوگرافی کی عدم موجودگی بھی انھیں محرومیوں میں سے ایک ہے۔ انگریزی ادب اور دوسرے مغربی ادب میں تحقیق کے کام سے دلچسپی رکھنے والوں نے بہت سی ایسی کتابوں کی ببلوگرافی تیار کر دی ہے، جس میں اس موضوع کے متعلق سے تمام و کمال معلومات موجود ہیں۔ اس موضوع پر اب تک جو کتابیں دستیاب ہیں ان کے بارے میں مختصر جائزہ ہوتا ہے اور ہر سال نئی کتابوں کا بھی اس میں ذکر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر عہد وسطیٰ کی غنائی شاعری پر کام کرنے والوں کے لیے رابنس کی INDEX OF MIDDLE ENGLISH VERSE اور کارلٹن براؤن کی مشہور کتاب ENGLISH RELIGIOUS AND REGIOTER OF MIDDI F DEDACTIC VERSF ہے۔ ڈاکٹر جانسن پر کام کرنے والوں کے لیے کلیفورڈ کی ببلوگرافی خاص ہے۔ اس طرح سے بے شمار ایسی ببلوگرافیاں ہیں جو ریسرچ اسکالر کو اس کی تحقیق میں تعاون دیتی رہتی ہیں جب کہ اردو میں ایسا بالکل نہیں ہے۔ چند ایک کتب خانے ہیں جو ہر سال فہرست مطبوعات شائع کرتے ہیں لیکن ان کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔ مختلف لائبریریاں اور طباعتی ادارے اس سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں پھر ایسے مقالوں کی بھی ایک فہرست مرتب کر دینی چاہیے جو مختلف یونیورسٹیوں میں لکھے جا چکے ہیں، کیوں کہ اس کی اطلاع نہ ہونے سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ وہی کام مختلف یونیورسٹیوں میں ہوتا رہتا ہے اور تحقیق کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

یہاں اس بات کی تشریح کرتے چلیں کہ ببلوگرافی سے مراد کیا ہے۔ ببلوگرافی کا عام طور سے اردو ترجمہ "کتابیات" کے لفظ سے کیا جاتا ہے اور یہ مقالے کا وہ حصہ ہوتا ہے جو اس کے آخر میں فہرست ماخذات کے طور پر شامل کر دیا جاتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مقالہ نویس نے مذکورہ کتابوں کا استفادہ کیا ہے۔ یہ کتابیات محقق کے نقطہ نظر سے اور تحقیق کے تعلق سے اس کے رویے کا بھی اشارہ دیتی ہیں۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ یہ فہرست مقالے کے اختتام کے بعد تیار کی جاتی ہے۔ لیکن ببلوگرافی سے یہاں جو مراد لی گئی ہے یا جس قسم کی ببلوگرافی کا ذکر اوپر ہو چکا ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ یہ ببلوگرافی مقالے کی ترتیب و تدوین سے پہلے تیار کی جاتی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کا پتا لگ جائے جو اس مقالے کی تیاری میں ہمارے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ ببلوگرافی مواد کی فراہمی کے سلسلے میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہے۔

اس کی شرط یہ ہوتی ہے کہ مختلف لائبریریوں سے ان تمام کتابوں کی ایک فہرست تیار کر لی جائے جو کسی بھی طور پر محقق کو اس مقالے کی ترتیب میں تعاون دے سکیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محقق اس فہرست کی مدد سے کئی ایسے نقطہ نظر کے تعین سے بچ جاتا ہے جو اس کے لیے ضمنی حیثیت رکھتے ہوں۔ ان کتابوں کی روشنی میں اپنے نقطہ نظر کی تعین میں بھی ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

مختلف لائبریریوں میں فہرست کتب کے انداز مختلف اور جداگانہ ہوتے ہیں لیکن اب ایسا ہے کہ اکثر لائبریریوں میں کیٹلاگ کی صورت میں کتابوں کے بارے میں معلومات موجود رہتی ہیں۔ اسکالر کو ان کے مطبوعوں سے ہر سال شائع ہونے والی کتابوں کے مطالعے سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

باقی صفحہ ۲۳ پر

۳۴۳۔ ستلج ہوسٹل۔ جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی۔ ۶۷

یوسف ناظم

درختوں کے سائے میں

(طنز و مزاح)

ہم جب جغرافیہ پڑھتے تھے تو ہمیں بتایا جاتا تھا کہ دنیا میں اتنا حصہ تری کا ہے اور اتنا حصہ خشکی کا۔ دنیا کی یہ پیمائش کب کی گئی تھی پتا نہیں۔ یقیناً صدیاں گزر گئی ہوں گی وہ بھی لاکھوں کروڑوں۔ اب یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے اور اس پیمائش پر نظر ثانی کی جانی چاہیے۔ نظر ثانی یوں بھی اچھی چیز ہوتی ہے۔ اس حرکت سے خاص طور پر ادیبوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے جب کبھی وہ اپنے لکھے ہوئے مضمون یا افسانے پر نظر ثانی کرتے ہیں انھیں حیرت ہوتی ہے کہ اتنی ساری غلطیاں انھوں نے کیسے کر لیں اور وہ ان میں سے ۵۰ فی صد غلطیاں منہا کر دیتے ہیں۔ منہا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پانچ صفحوں کے افسانے کو تین صفحوں کے افسانے میں منتقل کر دیتے ہیں۔ غلطیاں خود بہ خود کم ہو جاتی ہیں (بعد میں کاتب صاحبان ان میں اضافہ کر کے اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ اس حرکت کو الٹو سیدھا کرنا کہا جاتا ہے) ہمارے اس بیان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب دنیا کو پہلی مرتبہ ناپا گیا تھا تو اس کی پیمائش میں کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ زمین اس وقت بھی گھوم ضرور رہی تھی لیکن اس کے گھومنے کا کوئی منفی اثر پیمائش کرنے والوں پر نہیں ہوا تھا اور ان لوگوں نے تو خط استوا کی بھی پیمائش کر لی تھی جو سرے سے تھا ہی نہیں اور یہ خط استوا موجود نہ ہونے کے باوجود پتھر کی لکیر بن گیا۔ ہم اس وقت زمین پر نظر ثانی کرنے کی سفارش صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ دنیا میں تعمیر و تخریب کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اس لیے سمندر بھی پاٹے جا رہے ہیں، آدمیوں کے لیے زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ دنیا کے سارے آدمی اور سارے جانور اب اتنے کرۂ زمین پر نہیں رہ سکتے جتنا کہ یہ رقبے میں پہلے تھا۔ (آدمیوں اور جانوروں کا ذکر ایک ساتھ کیوں کیا گیا ہے آپ جانتے ہیں) پہلے جانور تک راستوں پر پھیل کر بیٹھ جایا بلکہ لیٹ جایا کرتے تھے۔ ہر طرف زمین ہی زمین پڑی تھی اور راستہ چلنے والے ان جانوروں کی نیند میں خلل ڈالے بغیر گزر جاتے تھے۔ گزر جانے کا مطلب یہ کہ راستہ کسی نہ کسی طرح طے کر لیتے تھے۔ اب یہ ممکن نہیں ہے۔ خود جانوروں کو اب کہیں بھی چہل قدمی تک کا موقع نہیں ملتا۔ راستوں پر چلنا (یا دم لے کر آگے چلنا یا ٹہلنا)، تو ایک طرف رہا اب وہ فٹ پاتھ پر بھی قدم نہیں رکھ سکتے۔ فٹ پاتھ عوام الناس کی رہائش گاہیں ہیں۔ ان حالات میں تری کو خشکی کا علاقہ بنانا ضروری ہو گیا تھا۔ پانی پر چلنا مشکل ہے لیکن آدمی پانی پر رہ ضرور سکتا ہے۔ اور چوں کہ اس کا شمار زندوں میں ہوتا ہے اس لیے اسے نقش بر آب نہیں کہا جا سکتا۔ یہی تری کا علاقہ جو آج انسانوں کے قدموں تلے ہے اب خشکی کا حصہ ہے اور اسی لیے زمین کی از سر نو پیمائش اور جغرافیے کی کتابوں پر نظر ثانی ضروری ہو گئی ہے۔ معلومات کے معاملے میں پرانی نسل کے کہنہ و خستہ لوگ نئی نسل کے کم سن نوجوانوں سے صرف مختلف ہی نہیں ایک لحاظ سے پسماندہ بھی ہیں۔ نئی تاریخ کے ساتھ انھیں جدید جغرافیے کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔

کچھ اطبا کا خیال ہے کہ جیسے جیسے کرۂ زمین پر خشکی کے علاقے میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آدمی کے مزاج کی خشکی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور جو بھی نومولود، چاند کے ٹکڑے کی طرح نمودار ہوتا ہے خواہ وہ دنیا میں سر کے بل ہی کیوں نہ آئے، فطرتاً خوش مزاج ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے (بشرطیکہ حالات اور ماحولیات دونوں اسے اس کی اجازت دیں) وہ مزید خشک مزاج ہوتا جاتا ہے۔ یہ فلسفہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا لیکن اطبا اس نکتے کو چھوڑتے نہیں ہیں بلکہ اس پر اور زیادہ روشنی اور روشنی کے ساتھ زور ڈال کر کہتے ہیں کہ آدمی کے خشک مزاج ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب درختوں کی چھاؤں انھیں نہیں ملتی۔ سمندر تو پاٹے جا ہی رہے تھے اب درخت بھی کاٹے جا رہے ہیں۔ ان اطبا میں سے ایک طبیب نے جنھیں شاعری سے بھی شغف رہا ہے، ایک محفل میں فرمایا کہ مصیبت تو ان لوگوں پر بھی آئی ہے جو اپنا وطن چھوڑ کر کسی بڑے شہر میں ہجرت کر گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے یہ لوگ جہاں بھی گھنی چھاؤں دیکھتے تھے بیٹھ جاتے تھے۔ اب درخت ہی نہیں رہے تو یہ بیٹھیں گے کہاں۔ غسل آفتابی کرتے اور پسینے میں نہاتے رہیں۔ خشکی اور تری کے مسئلے کے علاوہ ہم

۱۔ "الہلال" ریکلیمیشن باندرہ۔ بمبئی۔ ۴۰۰۰۵۰

نے ان درختوں کے مسئلے پر بھی غور کیا (کیوں آپ ہنسے کیوں کیا ہم غور کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے ہم غور کرنے کے علاوہ کرتے کیا ہیں۔) ہمارا خیال ہے ان دنوں شجر کاری سے زیادہ شجر بلائی ہو رہی ہے بس فرق یہ ہے کہ شجر کاری کے موقعہ پر ایک پنڈال لگتا ہے۔ سرخ ٹاٹ بچھتی ہے، ہار پھول منگوائے جاتے ہیں (تھوڑا سا پانی بھی منگوایا جاتا ہے) اور کوئی مہمان خصوصی، چھتری کی چھاؤں تلے اکڑوں بیٹھ کر پہلے سے تیار کیے ہوئے ایک گڑھے میں ایک ننھا منا پودا نصب کرتا ہے اور فوراً اپنے ہاتھ دھو لیتا ہے (یعنی اس کے ہاتھ دھلوا دیے جاتے ہیں۔) گڑھے کی خانہ پری کرنے کے بعد اس پر فوراً ایک "کتبہ" لگا دیا جاتا ہے جس میں پودے کی تاریخ ولادت اور پودہ کار کا نام درج ہوتا ہے۔ اس کتبے میں اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ کسی شاعر سے تاریخ ولادت کا شعر کہلوا کر اس پر کندہ کرایا جاسکے۔ کوئی بات نہیں کیوں کہ اس پودے کو زندہ ہی کتنے دن رہنا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ آئندہ شجر ماری کی بھی تقاریب اعلا پیمانے پر منعقد ہونے لگیں گی۔ مہمان خصوصی صرف ایک درخت پر "ضرب کاری" لگائے گا اور یہ اس بات کا اعلان ہوگا کہ مہم کا آغاز کیا جائے اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ درخت حرف غلط کی طرح مٹائے جائیں۔ دھوپ اسی طرح پھیلتی ہے اور آسمان صاف نظر آنے لگتا ہے۔ درختوں کے فوائد بھی ہوں گے لیکن ان کے نقصانات بھی بہت ہیں۔ آپ کسی بھی درخت کے نیچے کھڑے رہ کر سگریٹ سلگانا چاہیں تو درخت کی کسی ٹہنی پر کوئی ستمگر پرندہ ضرور آپ کی خاطر تواضع کرے گا اور راستہ چلنے والے لوگ آپ کا حال زار دیکھ کر ضرور ہنسیں گے؟ ایسے موقعوں پر آدمی بھول جاتا ہے کہ وہ خشک مزاج ہے۔ اس کی خشک مزاجی، صرف سیک کاموں میں صرف ہوتی ہے۔ کسی سے ہنس کر بات نہ کرو، ساتھیوں سے میل جول نہ بڑھاؤ، پیار محبت کا کوئی لفظ زبان پر نہ لاؤ— یہ ساری باتیں خشک مزاجی کے لیے لازمی ہیں اور آدمی کو ان مشاغل میں بہت مزہ آتا ہے۔ محبت بھی کرتا ہے، لیکن صرف اپنے آدمی سے۔ یہ تخصیص ایک شعار بنتی جا رہی ہے اور اسی لیے آدمی کو کہیں بھی سایہ نہیں ملتا۔ یہ خیال البتہ غلط ہے کہ سایہ صرف درختوں کا ہوتا ہے۔ آدمی میں خود اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ شجر سایہ دار بن جائے لیکن شرط یہی ہے کہ وہ آدمی ہو۔ شجر سایہ دار کی ایک خوبی جو ہمیں کسی ماہر نباتات نے بتائی تھی یہ بھی ہے کہ اس نیک طینت درخت پر پت جھڑ کا موسم اثر نہیں کرتا— اس نوبت پر ایک شعر یاد آگیا۔ پتا نہیں کس کا ہے ہم نے پڑھا تھا تو ایک جگہ لکھ لیا تھا۔

ان سے تھا کیا رشتہ مرا اور کیا یہ لگتے تھے مرے
گرنے لگے جب پیڑ سے پتے تو میں رویا بہت

ہمیں اس کمزور دل شاعر سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی لیکن اب خیال آتا ہے کہ اگر یہ شاعر کسی درخت کو گرتا دیکھ لیتا تو پتا نہیں اس کے دل پر کیا گزرتی (وہی آرا چل جاتا جو درخت پر چلا تھا) یہ خبریں بھی ہمارے کانوں تک پہنچی ہیں کہ کچھ لوگ درختوں اور پودوں پر اتنے فدا فدا رہتے ہیں کہ ان سے محو کلام ہو جاتے ہیں اور خود درختوں کو بھی زحمت سخن دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ درخت صرف آپس ہی میں سرگوشیاں نہیں کرتے آدمیوں سے باتیں کرتے ہیں لیکن شرط یہاں بھی وہی ہے کہ وہ آدمی ہوں۔ کچھ شاعروں نے یہ تک کہا ہے کہ درخت تالیاں بھی بجاتے ہیں۔ ضرور بجاتے ہوں گے شاعر کلام سنائے گا تو ظاہر ہے مشاعروں میں آج کل کے رواج کے مطابق درخت تالیاں ہی بجائیں گے۔ اب داد اسی طرح دی جانے لگی ہے۔ بعض وقت اس داد کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ بہت ہو چکا شاعر اب واپس جائے تو بہتر ہے۔ ایسے موقعوں پر شاعر اپنا صرف نصف کلام پڑھتا ہے ورنہ تالیاں بجتی رہتی ہیں— شاعروں کے اس خیال سے ہم متفق ہیں کہ درخت بھی تالیاں بجانے کا شعور رکھتے ہیں، ان میں البتہ یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ شاعروں کے گرے ہوئے مصرعے بھی اٹھائیں۔

ہم تری کے عاشق ہیں اس لیے کہ شاعری کے لیے بھی بحر ایک لازمی چیز ہے یعنی اچھی شاعری کے لیے، ورنہ ایسے شاعر بھی گزرے ہیں بلکہ موجود ہیں جن کی شاعری کا تعلق بحروں سے نہیں ہے لیکن ان پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ فن شعر گوئی سے بے بہرہ ہیں۔ ہم نے اپنی حالت پر غور کیا تو ہماری سمجھ میں یہ نکتہ آیا کہ ہم میں اب یہ ہمت تو نہیں ہے کہ ہم اس کرہ ارض پر تری کی حفاظت کے لیے کسی مہم کا آغاز کریں لیکن ہم میں ابھی اتنی سکت تو ہے کہ ہم درختوں کی حفاظت کا بیڑا اٹھائیں۔ اس میں سہولت یہ ہے کہ بیڑا اٹھانے کے لیے ہمیں کسی درخت سے مدد نہیں مانگنی ہے صرف ایک بیل درکار ہے۔ پان کے پتوں کی بیل اور زمین ابھی اتنی تنگ یا مختصر نہیں ہوئی ہے کہ بیلوں پر مصیبت آجائے۔ یہ بیڑا ہم ضرور اٹھائیں لیکن بشکل گلوری۔ اس لفظ گلوری سے کیا کیا مناظر آنکھوں کے سامنے کتھک ناچ، ناچنے لگتے ہیں۔

ایک گلوری آپ کی خدمت میں بھی پیش ہے بشرطیکہ آپ درختوں کی حفاظت کا بیڑا اٹھائیں۔

یہ ہم بھول گئے تھے کہ بیل بھی چڑھتی ہے تو درخت پر ہی چڑھتی ہے۔ درختوں کی حفاظت کا بیڑا اٹھانا اس لیے بھی ضروری ہے۔ ویسے بیل دیوار پر بھی چڑھ جاتی ہے لیکن اس بیل میں گارے، پتھر اور چونے کی خشکی ہوتی ہے۔ ایک سرسبز اور شاداب درخت کی ہم نشینی کا جمال اس میں نہیں ہوتا۔ شاہراہوں پر بھی دورویہ درخت بہت اچھے لگتے ہیں۔ صرف مسافر نواز ہی نہیں ہوتے ایسے لگتے ہیں جیسے مسافروں کو "گارڈ آف آنر" دے رہے ہوں۔ صحیح سلامی یہی ہے نہ کوئی بندوق نہ توپ اور درخت، ہمیں اس لیے بھی درکار ہیں کہ ہم ان میں جھولے ڈالیں اور محبت کی پینگیں بڑھائیں۔ ●

بقیہ: مرض جذام — نا قابل علاج نہیں

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ان غلط تصورات کو بھلا دیں جن کے سبب ہم ایسے مریضوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم خود اس مرض کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کریں اور دوسروں کو سمجھائیں اور اس مرض میں مبتلا مریضوں کے دل سے خوف و دہشت نکال دیں تبھی اس مرض پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

پانچ راہوں کی شناسائی

یہ کالی، اندھیری، خوفناک رات نہ معلوم اب تک کتنوں کی جان لے چکی ہوگی۔ کتنے مکان گر چکے ہوں گے، کتنے دل مندر کی گھنٹیوں کی طرح سینے کے اندر دھڑک رہے ہوں گے، کانپ رہے ہوں گے

بجلی کی کڑک اور چمک سے میرا دل دہلا جا رہا ہے۔ لگتا ہے سینے کی ہڈیوں کو توڑ کر اب باہر نکل جائے گا۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی ہواؤں کے تھپیڑے قدم جمنے ہی نہیں دیتے ہیں۔ میں ہواؤں کے دوش پر سوار جھولتے اور گرتے پڑتے درختوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہوا چلا جا رہا ہوں۔ اب تو راستہ بھی سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ شاید میں بھٹک گیا ہوں، ورنہ اب تک گھر ضرور پہنچ گیا ہوتا، لیکن پگڈنڈیاں شناسا لگ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدم اسی راستے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

شبنم ٹھیک ہی کہتی تھی کہ آج میں شہر نہ جاؤں، مگر میں نے اس کا کہا کب مانا ہے۔ اسے جھڑک کر شہر چلا گیا تھا۔ قومی یک جہتی کے موضوع پر پروگرام ہو، مجھے بلاوا آئے اور میں نہ جاؤں۔

لیکن شبنم کا کہا نہ مان کر آج میں نے اپنے لیے اچھا نہیں کیا ہے۔ یہ طوفانی اور ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی رات میری پریشانی بڑھا رہی ہے۔ سچ پوچھیے تو بیوی نجومی ہوتی ہے۔ اس کے من میں اپنے شوہر کے لیے کل کی بھی خبر رہتی ہے۔ ابھی تک تو خیر ہے کہ بارش نہیں ہو رہی ہے۔ اگر بارش شروع ہوگئی تو یہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔

یہ آہٹ کیسی سنائی دے رہی ہے؟ شاید کوئی جانور بھاگا جا رہا ہے۔۔۔ لیکن یہ تو انسانی سایہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک بار بجلی چمکے تو دیکھوں۔ ہاں، وہ انسان ہی ہے۔

میری طرح اپنے آپ کو بھٹکا ہوا محسوس کر رہا ہوگا۔ منزل تک پہنچنے کی اسے بھی جلدی ہوگی۔ شاید وہ بھی میری طرح کوئی راہی ہے۔ لیکن نہیں! وہ کس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اسے ٹھوکر بھی نہیں لگتی۔ اندھیرے میں اسے راستہ کیسے سجھائی دے رہا ہے۔

اس انسان تک پہنچنے کے لیے مجھے تیز تیز چلنا ہوگا، لیکن اسے رکنے کے لیے آواز کیوں نہ دوں؟

"ارے بھائی ذرا رک جاؤ۔"

اے لو، وہ رک گیا، مگر یہ کیا؟ اس کے جسم پر کپڑے کی بجائے انجیر کا پتہ کیوں ہے؟ اس کا رنگ گورا ہے، قامت دراز، ناک ستواں اور خدوخال جاذب نظر۔ اس کے باوجود وہ جنگلی کیوں نظر آ رہا ہے؟ کوئی پاگل تو نہیں؟ "تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟" میری آواز کانپ رہی ہے۔

"یہی سوال میرا بھی ہے۔"

"واہ، یہ بھی خوب رہی، سوال میں نے کیا ہے اور جواب بھی میں ہی دوں۔ خیر، مجھے بتا دینے میں کوئی جھجک یا تکلف نہیں۔۔۔"

"بس بس اتنا ہی کافی ہے۔ میں تمہارا مزاج سمجھنا چاہتا تھا۔ ویسے تمہارے بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ تم شہر سے گاؤں اپنے گھر واپس جا رہے ہو۔ لیکن تم راہ نہیں بھٹکے ہو۔ تم اپنے گاؤں کی سرحد پر آ چکے ہو۔ دیکھو، وہ سامنے ہوا کا پیڑ ہے۔ اسی کی سیدھ میں دکھن کی سمت سڑک کے کنارے تمہارا گھر ہے۔"

"لیکن تم کون ہو اور تمہیں یہ سب کیوں کر معلوم ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں جو بھی ہوں، تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ میرا لباس وہی ہے جو کبھی ہمارے آباؤاجداد پہنتے تھے۔ تم جو لباس پہنتے ہو اس سے مجھے جنگ کی بو آتی ہے۔ میں اس زمین پر ہزاروں سال سے گھوم رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ انسان کا کردار بہت گر چکا ہے اور ایٹم اور جراثیم کی جنگ سے انسان خوفزدہ بھی ہے۔ انسانیت، انسانیت کے علم برداروں کے گلے سے لپٹی ہوئی بلبلا رہی ہے۔ میں دنیا کے لوگوں کو ان کا عہد یاد دلانے کے لیے نکلا ہوں کیوں کہ آج سے ہزاروں سال پہلے ہمارے ارباب دانش نے بدی کی پانچ راہوں کا سراغ لگایا تھا، جن کا نام انھوں نے کام، کرودھ، موہ، لوبھ اور اہنکار رکھا تھا۔ پھر ان سے بچنے کے لیے انھوں نے نیکی کی پانچ راہوں کو تلاش کیا اور ان کا نام ایثار، امن، فراخ دلی، غیر جانب داری اور عجز رکھا۔ ان پانچ راہوں کا پیغام ہندوستان سے ہی دنیا کے دوسرے ملکوں میں پہنچا تھا اور انھوں نے اس پر کاربند رہنے کا عہد کیا تھا۔ لیکن آج پھر کام، کرودھ، موہ اور لوبھ میں پڑ کر لوگ

باقی صفحہ پر

مارواڑی کالج، بھاگلپور (بہار)

غزلیں

مصور سبزواری

تعمیرِ خرابی میں بگڑنا بھی ہمیں تھا
شداد کی جنت تھے اجڑنا بھی ہمیں تھا

ہم کون چراغِ تہِ داماں تھے نہ بجھتے؟
سفاک ہواؤں سے تو لڑنا بھی ہمیں تھا

اک دائرہ وقت میں قیدی تھے رُتوں کے
کھلنا بھی ہمیں، پیڑ سے جھڑنا بھی ہمیں تھا

بنیاد خلاؤں میں کہیں اپنی پڑی تھی
پانی پہ جڑیں تھیں تو اکھڑنا بھی ہمیں تھا

سر پر تھا میرِ وصل، زمیں پر تھے ستارے
ہم بھول گئے صبح بچھڑنا بھی ہمیں تھا

انجام یہی حد سے گزر جانے پہ ہوتا
پھیلائے تھے جب پاؤں سکڑنا بھی ہمیں تھا

پوسٹ آفس، فرخ نگر، ضلع گوڑگاؤں (ہریانہ)

رفیق الزماں

آنکھوں کو سبزہ زار دلوں کو قرار دے
چہروں پہ زندگی ہو اک ایسی بہار دے

بے برگ موسموں کو اٹھا لے زمین سے
دینا ہے گر تو پیڑ کوئی سایہ دار دے

پھر آسماں سے بھیج کتابیں ورق ورق
پھر میرے انتخاب کو مجھ پر اتار دے

بھر دے لہو کے چھینٹوں سے اس زندگی میں رنگ
کچھ خاک بے لباس کو نقش و نگار دے

تاریکیوں میں رکھ دے کبھی روشنی کے پھول
جلتا ہوا چراغ سرِ رہ گزار دے

ہونٹوں کو تشنگی کے سمندر دیے مگر
یہ تشنگی بجھا تو کبھی، آبشار دے

چاہے تو بار بار مٹا میری خاک کو
چاہے تو بار بار مجھے تو سنوار دے

گر معرکہ ٹھہر لے دونوں میں اے خدا
نیزے ہزار ہوں تو مجھے سر ہزار دے

وہم و گماں کی دھوپ سے نکلوں میں اے رفیقؔ
مجھ کو مرے وجود کا کچھ اعتبار دے

۴۰۔اے، پاکٹ الیف، میور وہار، فیز II دہلی ۔ ۱۱۰۰۹۱

نسیم بے چینؔ دہلوی

موم سا گرمیِ دل سے پگھلنا چاہیے
وقت جس سانچے میں ڈھالے ہم کو ڈھلنا چاہیے

حلقہ رنج و الم سے یوں نکلنا چاہیے
اب ہمیں بھی زندگی کا رخ بدلنا چاہیے

ہو چکے برباد و رسوا اپنے اقدامات سے
ٹھوکریں کھائیں بہت، اب تو سنبھلنا چاہیے

راہ سے آنکھوں کی، دل میں آئیے بہرِ خدا
اک دیا تو دل کے سونے گھر میں جلنا چاہیے

لوگ کھو جاتے ہیں اکثر آج کل کی بھیڑ میں
سوچ کر بے چینؔ اب گھر سے نکلنا چاہیے

اے ۸-۴۰۸ سیکٹر ۔ ۲ ڈاکٹر امبیڈکر نگر، نئی دہلی ۔ ۶۲

غزلیں

اقبال کرشن

(در بحر رجز مثمن مطوی
[مفتعلن مفتعلن مفتعلن مفتعلن])

مردہ تھا میں زندہ ہوا، روتا تھا میں خندہ ہوا[1]
دولت عشق آنے سے میں دولت پائندہ ہوا

مرگ حاصل میں پسا، پا میں لگا زندہ ہوا
شوق اجل میں جو مٹا، زیست کا کارندہ ہوا

اس کی لگی ٹھوکروں سے انجم رخشندہ ہوا
میری چمک سے یہ فلک پھر سے درخشندہ ہوا

قعر ملت میں پڑا ذرۂ ناچیز تھا میں
مرشد کامل کے سبب گوہر تابندہ ہوا

بخیہ گری کی مجھے تنبیع نہ دو چارہ گرو
میں تو ہوں وہ چاک رفو کا جو نہ شرمندہ ہوا

باد مخالف کے تلاطم میں وہی سن کے ترر
حلقۂ اشجار کی تاریکی میں رقصندہ ہوا

ملک بقا میں جو رہا مرگ پہ خود قہقہہ زن
عاقبتاً دشت فنا میں وہی نالندہ ہوا

---

[1] مولانا روم: مردہ بودم زندہ شدم گریہ بودم خندہ شدم
دولت عشق آمد و من دولت پائندہ شدم

۲۲۔ ڈی، ساگر دت لین۔ کلکتہ۔ ۷۳۰۰۰۷

شہپر رسول

مرا لہو بھی ہو، دیوار بھی ہو، سر بھی ہو
تو آج گنبد بے در میں ایک در بھی ہو

یہاں جو ہم ہیں بلا شہر و بے دیار و اماں
کہیں ہمارے خیالات کا نگر بھی ہو

حسوں کے دیس سے نکلیں جو دوسرا میں بسیں
ہمارے واسطے صحرا بھی اور گھر بھی ہو

شدید حبس کے عادی تو ہو چکے ہیں مگر
کبھی ہوا کا کہیں پاس سے گزر بھی ہو

مگر یہ سوچنا تا حال بھی غلط ہی رہا
کہ تخت و تاج بھی، قلعہ بھی ہو، ظفر بھی ہو

●

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

بی۔ اے۔ شاہد

ان کی تصویر لیے بیٹھا ہوں
اپنی تقدیر لیے بیٹھا ہوں

بے نشاں برق بھی تو کر نہ سکی
خاک تعمیر لیے بیٹھا ہوں

گوہر اشک مجھ سے آ لے لے
غم کی جاگیر لیے بیٹھا ہوں

اپنے ماضی کو تو بھی دیکھ آ کے
تیری تحریر لیے بیٹھا ہوں

دے گیا لطف، ذوق اسیری کا
خود ہی زنجیر لیے بیٹھا ہوں

خون دل مانگتا ہے اک اک شعر
خامۂ میر لیے بیٹھا ہوں

نطق حالات کا ہوا قیدی
ذوق تقریر لیے بیٹھا ہوں

بر کف دست پارۂ سیماب
دل کی تصویر لیے بیٹھا ہوں

مل گئی ان کے در کی خاک مجھے
شاہد اکسیر لیے بیٹھا ہوں

معرفت ایس واجد حسین عابدی۔ ۱۲/۲۱۹ چرباوالی گلی کرسوان مکانپور

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

آلودگی سے پاک شہروں کی جانب

دنیا کے بہت سے شہر بیسویں صدی کے وسط کی اپنی حدود سے کہیں آگے تیزی سے پھیلتے جا رہے ہیں۔ کروڑوں لوگ، جو دنیا کے شہری باشندے کہلاتے ہیں، اب ایسے حالات میں رہ رہے ہیں، جو ان کی صحت کے لیے مضر ہیں اور یہاں تک کہ ان سے ان لوگوں کی زندگیوں تک کو خطرہ لاحق ہے۔

عالمی یوم صحت ۱۹۹۶ء کے لیے صحت سے متعلق عالمی تنظیم نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے، وہ ہے — "بہتر زندگی کے لیے آلودگی سے پاک شہر"۔ اس موضوع میں مذکورہ صورت حال پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ صحت سے متعلق عالمی تنظیم نے اس موضوع کا انتخاب اس صدی کی شروعات سے شہروں کی بڑے پیمانے پر توسیع کی وجہ سے کیا ہے، کیوں کہ اس کا اثر شہری باشندوں کی صحت پر پڑ رہا ہے۔

آلودگی سے پاک شہروں سے متعلق پروگرام اب تک کافی کامیاب رہا ہے۔ یہ پروگرام دنیا بھر کے ایک ہزار سے زیادہ شہروں میں خاص طور سے کم آمدنی والے لوگوں کی صحت پر توجہ مرکوز کرنے کے سلسلے میں نمونے کے طور پر شروع کیا گیا ہے۔ بہت سی شہری کونسلیں صحت اور ماحولیات سے متعلق امور کی تشہیر کے لیے "آلودگی سے پاک شہروں" کے نعرے کا استعمال کر رہی ہیں۔ کچھ مقامات پر اس موضوع کو وسیع تر کر دیا گیا ہے تاکہ اس میں "آلودگی سے پاک جزائر"، "آلودگی سے پاک گاؤں" اور یہاں تک کہ "آلودگی سے پاک اسکولوں" جیسے سماج کے دیگر شعبوں کو بھی شامل کیا جائے۔

صحت کے لیے مفید ماحول

۱۵ سال کے اندر اندر، ۲۰ سے ۳۰ شہروں میں دو کروڑ سے زیادہ لوگ ہوں گے۔ یہ تعداد اس وقت آسٹریلیا کی آبادی سے قدرے زیادہ ہوگی۔ جیسے جیسے شہروں کی توسیع ہوتی ہے ویسے ویسے صحت پر ان کے مضر اثرات میں اضافہ ہوتا ہے۔ آلودگی سے پُر شہر کی وجہ سے ہیضے، غذائیت کی کمی، دماغی بیماری، حادثات اور سانس کی شدید بیماریوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

ماحول کو صحت کے لیے زیادہ مفید بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ گھروں، گاؤوں، آس پڑوس، اسکولوں، کالجوں، فیکٹریوں، دفتروں، بازاروں، شاپنگ سینٹروں، شہروں، ضلعوں وغیرہ کے ماحول کو صحت کے لیے زیادہ سازگار بنایا جائے۔

آلودگی سے پاک شہروں سے متعلق تحریک

دنیا بھر میں آلودگی سے پاک شہروں سے متعلق پروجیکٹوں سے پتا چلا ہے کہ شہروں میں خاص طور سے غریب ترین لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانا ممکن ہے۔ ان پروجیکٹوں سے میونسپل حکام اور عوام کے درمیان ایک نئے اشتراکِ عمل کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ایک ایسا اشتراکِ عمل، جس کا مقصد شہری مسائل حل کرنا ہے۔

شہروں کے بہت سے مسائل ایک جیسے ہیں۔ مثلاً بہت زیادہ ٹریفک اور شور، آبادی، غیر مناسب اور ناکافی مکانات، صحتی دیکھ بھال کی سہولیات اور بنیادی ضروریات مثلاً خوراک، پانی، صفائی ستھرائی اور توانائی تک غیر منصفانہ رسائی۔ لیکن شہروں میں آلودگی سے پاک بننے کی صلاحیت بھی ایک جیسی ہی ہے۔ اس صلاحیت کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں ان کی حوصلہ افزائی کرنا عالمی صحت تنظیم کے آلودگی سے پاک شہروں سے متعلق پروگرام کا مقصد ہے، جو ۱۹۹۶ء میں یوروپ میں شروع کیا گیا ہے اور تب سے اس پروگرام کو عالمی طور سے اپنا لیا گیا ہے۔

یہ تحریک شہروں میں عوام کی صحت کو بہتر بنانے کے لیے عالمی صحت تنظیم کے "سب کے لیے صحت" کے اصولوں کو لاگو کرتی ہے۔ اس کی جڑیں دنیا کے بہت سے حصّوں، خاص طور سے لاطینی امریکہ میں نیز ایشیا کے کچھ حصّوں، خاص طور سے جاپان میں ہیں۔ اس تحریک کی شروعات کے سلسلے میں دو سنگِ میل تھے — صحتی فروغ کے لیے اوٹاوا منشور، جو ۱۹۸۶ء میں اختیار کیا گیا تھا اور ایڈیلیڈ اعلانیہ جو ۱۹۸۸ء میں اختیار کیا گیا تھا۔

شہروں میں خسرہ

عالمی یوم صحت سے شہری مسائل اور ان کے حل پر از سر نو توجہ مرکوز ہوتی ہے۔ شہروں میں خسرے سے پیدا شدہ خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے اس بیماری سے سب لوگوں کو محفوظ کرنے کی تاریخ کے طور پر عالمی یوم صحت، ۱۹۹۶ء اپنانے کے سلسلے میں ان تمام ممالک کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، جن میں خسرا صحت عامّہ کا ایک مسئلہ بنا ہوتی ہے۔

اگرچہ بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی حسب معمول خدمات کی وجہ سے عالمی طور سے خسرے کا ٹیکہ لگانے کی تقریباً ۸۰ فی صد سطح حاصل کر لی

گئی ہے، لیکن یہ خدمات ای۔ پی۔ آئی نشانے والی بیماریوں پر قابو پانے کے سلسلے میں کافی نہیں ہیں۔

ایک عوامی مہم میں ان علاقوں اور لوگوں کو خاص طور سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے، جو مانع رہے ہیں۔ کھسرے کے ٹیکوں کی موثر ترسیل کو یقینی بنانے کے لیے نئی نئی حکمت عملیوں جیسے گھر گھر جانے کی حکمت عملی اپنانے کی ضرورت ہوگی۔ عمر کی مقررہ حد نو مہینے سے پانچ سال تک کر دی جانی چاہیے۔

مہم میں دیگر انٹیجین کو شامل کرنا ممکن ہو سکتا ہے کیوں کہ کھسرے کے زیادہ خطرے والے اضلاع میں نیونٹیل ٹیٹنس اور پولیو کا زیادہ خطرہ بھی ہوگا۔ اس سلسلے میں وٹامن اے پر بھی توجہ دی جانی چاہیے۔

کمیونٹی کی شمولیت

آلودگی سے پاک شہروں سے متعلق پروجیکٹ کے سلسلے میں ایک اہم قدم ٹاسک فورس مقرر کرنا ہے تاکہ مختلف میونسپل اور سرکاری ایجنسیوں کے درمیان تعاون میں مدد کی جائے نیز ان مختلف لوگوں اور انتظامی گروپوں کی نشاندہی کرنے کے کام میں مدد ملے، جنھیں پروجیکٹ میں شامل کیا جانا چاہیے۔ یہ ٹاسک فورس معلومات اکٹھا کرتی ہے اور ان کا جائزہ لیتی ہے، ترجیحی امور کے بارے میں کلیدی افراد سے رابطہ قائم کرتی ہے، میونسپل صحتی منصوبے کی وضاحت کرنے کے سلسلے میں مدد کرتی ہے اور جہاں تک ممکن ہے، زیادہ سے زیادہ ذرائع سے پروجیکٹ کے لیے امداد اور تعاون حاصل کرتی ہے۔

قومی امداد اور تعاون بھی انتہائی مفید ہے کچھ ممالک نے تو آلودگی سے پاک شہروں سے متعلق قومی کمیٹی تک قائم کر دیے ہیں، جو اس بات کو یقینی بنانے کے لیے مقامی سرکاری کوششوں میں مدد کرتے ہیں کہ کمیونٹی کے تمام لوگ، خواہ وہ کتنے بھی غریب کیوں نہ ہوں، معیارِ صحت کو بہتر بنانے کی کوششوں میں شامل ہو سکیں۔

سب سے زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ اب ایک عالمی نظام ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ صحت سے متعلق عالمی تنظیم اقوام متحدہ کی دیگر ایجنسیوں، خاص طور سے انسانی بستیوں سے متعلق اقوام متحدہ مرکز، اقوام متحدہ ترقیاتی پروگرام، آئی۔ ایل۔ او اور عالمی بینک کے ساتھ مل کر شہروں میں رہن سہن کے حالات کو بہتر بنانے کے سلسلے میں عالمی کوششیں کر رہی ہے۔ جون ۱۹۹۶ء میں ان ایجنسیوں کے نمائندے "انسانی بستیوں کے بارے میں دوسری اقوام متحدہ کانفرنس" "ہیبیٹیٹ ۲" کے سلسلے میں استنبول میں جمع ہوں گے، جس میں عالمی صحت تنظیم کا آلودگی سے پاک شہروں سے متعلق پروگرام خاص دلچسپی کا موضوع ہوگا۔ ●

مرارجی ڈیسائی پر ڈاک ٹکٹ

محکمہ ڈاک مورخہ ۱۰ اپریل کو مرارجی ڈیسائی پر ایک ڈاک ٹکٹ کا اجرا کر رہا ہے۔ ان کا ایک سال پہلے آج کے دن انتقال ہوا تھا، کچھ ہی عرصے قبل ان کا صد سالہ یوم پیدائش منایا گیا تھا۔ ملک کی جدوجہد آزادی میں ان کا بھرپور حصہ تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک کے دوران انھوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

۱۹۳۷ء میں موصوف بمبئی قانون ساز اسمبلی کے لیے رکن منتخب ہو گئے، پہلی کانگریس کی حکومت میں وہ جنگلات کے وزیر بنے۔ اس کے بعد وہ بمبئی کی وزارت میں وزیر خزانہ اور وزیر داخلہ بنے۔ ۱۹۵۲ء میں وہ ریاست کے وزیر اعلیٰ بنے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ مرکزی وزارت میں بہ حیثیت وزیر تجارت و صنعت رہے، بعد ازاں انھوں نے وزیر خزانہ کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۷۷ء کے لوک سبھا انتخابات میں انھوں نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ جولائی ۱۹۷۸ء کو وہ سبکدوش ہو گئے۔ ان کی لمبی اور غیر معمولی قومی خدمات کے صلہ میں ان کو ملک کے اعلیٰ ترین سول اعزاز "بھارت رتن" سے نوازا گیا تھا۔ ●

بقیہ: فخر ہند ستیہ جیت رے

کھیں سنتے سنتے، حیران رہ جاتی ہیں۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے فلموں کے سلسلے میں جو کچھ سیکھا ہے وہ امریکی فلموں سے ہی سیکھا ہے۔ وہ پہلے ہندوستانی، دوسرے ایشیائی اور دنیا کے چھٹے فلم کار تھے، جنھیں گولڈن پکچر آرٹ پر ماہرانہ قدرت حاصل ہونے کی بنا پر ہالی وڈ نے خصوصی آسکر ایوارڈ سے نوازا۔

فلمی ایوارڈ کے علاوہ ان کی قابل قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے پہلے بھی ان کو اعزازات اور انعامات سے نوازا جاتا رہا۔

۱۹۷۶ء میں آنجہانی رے نے "میگسیسے ایوارڈ" حاصل کیا۔

۱۹۷۱ء میں انھیں "اسٹار آف یوگوسلاویہ" کا خطاب ملا اور پھر ۱۹۷۸ء میں منعقدہ برلن فلم فیسٹیول میں ان کو خصوصی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

۱۹۸۲ء میں کانس (CANNES) فلم فیسٹیول میں زبردست خراج تحسین کے علاوہ ان کو خصوصی طلائی شیر پیش کیا گیا۔

۱۹۸۵ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور ۱۹۸۷ء میں فرانس کا لیجن ڈی ہا نیور (LEGION D HONNEUR) جیسے ایوارڈ بھی ان کو دستیاب ہوئے۔ علاوہ ازیں ۱۹۹۱ء کے کانس (CANNES) فلم فیسٹیول میں رے سے متعلق ایک تہنیتی البم کا اجرا کیا گیا اور ساتھ ہی ان کے فوٹو گرافس کی نمائش بھی کی گئی۔

ان بین اقوامی انعامات و اعزازات کے علاوہ ـــــ

۱۹۷۳ء میں دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۷۴ء میں لندن کے رائل کالج آف آرٹس نے اور ۱۹۸۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے "ڈی لٹ" کی اعزازی سند بھی پیش کی۔

آنجہانی رے کو ۱۹۷۶ء میں "پدم وبھوشن" کا خطاب اور ۱۹۸۴ء میں "دلوا صاحب پھالکے" ایوارڈ ملا۔

فلم کو اظہار کا ذریعہ بنا کر ستیہ جیت رے نے ہماری حقیقی زندگی، مسائل اور سماجی اتھل پتھل کو پوری سچائی، پوری ایمانداری اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ جیوں کا تیوں پیش کرنے کا جو حوصلہ اور جرأت دکھائی ہے، اس اسٹائل کو برسہا برس چھوا نہ جا سکے گا اور اس اچھوتی اور دشوار گزار راہ پر بخیر و خوبی شاید ہی کوئی جانباز چل سکے۔ وہ بلاشبہ فخر ہند تھے۔

ترتیب

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

سب ایڈیٹر : ڈاکٹر توحید خان

فون 6177591

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : جیتندر سنگھ

جلد: ۱۶ شمارہ: ۲

مئی ۱۹۹۶ء (۱۱ بیساکھ تا ۱۰ جیٹھ تک ۱۹۱۸)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زر سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زر سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن انچارج: کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق

خط وکتابت کا پتا:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (ساؤتھ) نئی دہلی ۶۶-۱۱

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطہ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ظفر محفوظ نعمانی

آبی آلودگی مسائل اور حل

ماحولیاتی آلودگی : ایک نظر

عالمی ماحولیاتی آلودگی سے پیدا شدہ ناقابل تلافی نقصانات فطرت کے لیے ایک زبردست خطرہ بن گئے ہیں۔ عالمی ماحولیاتی و ترقیاتی کمیشن WORLD COMMISSION ON ENVIRONMENT AND DEVELOPMENT نے اپنی رپورٹ میں یہ انکشاف کیا ہے کہ ہر سال چھ ملین ہیکٹیر پیداوار کے لائق زمین ناقص الاستعمال ریگستان میں تبدیل ہو رہی ہے جو تقریباً ایک ملک سعودی عربیہ کے رقبہ کے برابر ہے۔ گیارہ ملین ہیکٹیر جنگلات ہر سال ضائع ہو رہے ہیں۔ عمل تیزابیت (ACID PRECIPITATION) کا براہ راست اثر زرخیز زمینوں پر پڑ رہا ہے۔ عالمی درجہ حرارت میں تدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ گرین ہاؤس اثرات (GREEN HOUSE EFFECTS) سے ساحلی علاقے زیر آب ہو رہے ہیں اور ملکی معیشت غرق ہو رہی ہے۔ متواتر زہریلی گیس کے اخراج سے حفاظتی اوزون کے پرت (OZONE LAYER) میں سوراخ واقع ہو چکا ہے جس کی وجہ سے جلدیاتی کینسر (SKIN CANCER) کے واقعات دن بہ دن بڑھتے جا رہے ہیں۔ آبی سلسلہ خوراک (OCEAN FOOD CHAIN) کا توازن بگڑ چکا ہے۔ زمین دوز سطح آب (UNDER GROUND WATER TABLE) میں مستقل کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ اس صورت حال کو مصور اگر کسی بڑے (LAND SCAPE) یا کینوس (CANVAS) میں نقش کرے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین ایک زخمی پرندے کی طرح نڈھال ہے اور مزید پرواز سے اس کے پر جلتے ہیں۔

پانی کی اہمیت

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کرۂ ارض کا تین حصہ (یعنی ۷۱ فی صد) سمندروں پر مرلوط ہے۔ زمین میں دستیاب پانی کا ۹۷٫۱۶ فی صد سمندروں میں پایا جاتا ہے۔ ۲٫۸ فی صد برفیلی چٹانوں کی صورت میں ہے۔ صرف ۰٫۳۱ فی صد حصہ ہی تازہ پانی موجود ہے۔ اس کا تقریباً ۴ فی صد حصہ زمین کی گہری پرتوں میں محفوظ ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہم لوگ صرف ۰٫۱۲۴ فی صد پانی پر منحصر ہیں جو مختلف ذرائع مثلاً ندیوں، چشموں، جھیلوں، کنوؤں اور زمین دوز پانی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پانی کی یہ قلیل مقدار بھی آلودگی سے پاک نہیں ہے۔ جس کے مضر نتائج صحت عامہ میں گڑبڑی، جان لیوا آبی بیماریوں کی شرح میں اضافہ اور لاکھوں لوگوں کے لقمۂ اجل ہونے کے واقعات کی صورت میں موجود ہیں۔ انسانی صحت پر آبی آلودگی کے مضر اثرات کی وجہ یہ بھی ہے کہ انسانی جسم کا ۷۰ فی صد حصہ خود پانی ہے۔ مزید ۵۰ فی صد سے ۹۰ فی صد نباتات اور حیوانات کا جسمانی وزن پانی کی وجہ سے قائم ہے۔

آبی آلودگی : تعریف

اس سے قبل کہ ہندوستان میں آبی آلودگی کا جائزہ لیا جائے اور اس کے سدباب کا پتا لگایا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آبی آلودگی کا صحیح تصور ہمارے سامنے ہو۔ دراصل پانی کا اپنے معتدل حالات و خصوصیات سے انحراف ہی آبی آلودگی کی پہچان ہے۔ معتدل حالات میں تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ انسانی، نباتاتی، حیوانی، صنعتی اور کاروباری طور پر پیدا ہونے والے فاسد مادے، فضلات اور کوڑا کرکٹ وغیرہ ہیں۔ میک گرا ہل انسائیکلوپیڈیا نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

کیمیائی مادیاتی عمل سے ہونے والی فطری معیار میں کمی کو آبی آلودگی کہتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں اس کی وضاحت یوں ہے :

غیر ضروری فاسد مادوں کا پانی میں تحلیل ہونا اور آبی نظام کے توازن میں خلل پڑنا ہی آبی آلودگی ہے

دوسرے مقاموں پر کچھ یوں درج ہے۔

پانی میں ناموزوں مادیات کے تحلیل ہونے کے باعث پیدا ہونے والی فطری اور طبعی تبدیلی آبی آلودگی ہے۔

پارلیمانی ہند کے آبی آلودگی انسدادی قانون (THE WATER PREVENTION AND CONTROL OF POLLUTION ACT) میں آبی آلودگی کی جامع تعریف پیش کی ہے۔

انسانی، صنعتی، نباتاتی، زرعی فاسد مادیات کے اخراج اور تحلیل سے پانی میں پیدا شدہ طبعی، کیمیائی اور نباتاتی تبدیلی جو گھریلو، صنعتی اور زرعی استعمال کے لیے ناقص استعمال اور مضرات

لکچرر سینٹر فار ایڈوانسڈ سوشیو لیگل اسٹڈیز، ہمدرد یونیورسٹی، ہمدرد نگر، نئی دہلی-۶۲ 11

جو آبی آلودگی کہلاتی ہے۔

آبی آلودگی کی قسمیں

آلودہ پانی مختلف حالات میں پائے جاتے ہیں۔ دراصل سطح آلودگی سے اس کا تعین ہوتا ہے۔ LIEBSMANN نے ۱۹۶۲ء کی اپنی تحقیق کے ذریعہ مندرجہ ذیل چار قسموں کی نشاندہی کی ہے۔

۱- POLYSAPROBIC : پولی سیپروبک، آبی آلودگی کی منتہائے مقام ہے۔ آکسیجن کی موجودگی برائے نام ہوتی ہے۔ اس پانی کو پینے کے لائق بنانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس کی سب سے بڑی پہچان اس میں پائی جانے والی بدلو ہے۔

۲- (I-MESOSAPROBIC) : پولی سیپروبک کے مقابلتاً MESOSA PROBIC میں مقدار آلودگی تھوڑی کم ہوتی ہے۔ آکسیجن کی موجودگی اس میں بھی کم ہوتی ہے AMINO ACID زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ پینے کے لائق یہ پانی نہیں مانا جاتا ہے۔

۳- (B-MESOSAPROBIC): آکسیجن کی کمی اس پانی میں بھی پائی جاتی ہے۔ البتہ بیکٹریائی زندگی اور نشوونما کے لیے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ اس آلودگی کو دور کرنے کے لیے بیکٹریا کو ختم کرنا ضروری ہے۔

۴- (OLIGOSAPROBIC) مندرجہ بالا تینوں قسموں میں OLIGOSAPROBIC میں آکسیجن کی مقدار زیادہ پائی جاتی ہے۔ بیکٹریا کی موجودگی برائے نام ہوتی ہے۔ عام استعمال کے لیے یہ پانی موزوں تصور کیا جاتا ہے۔

آبی آلودگی کا صحیح تعین دراصل پانی میں پائے جانے والے کیمیائی اور حیاتیاتی مطالبۂ آکسیجن (CHEMICAL AND BIOLOGICAL OXYGEN DEMAND) سے ہوتا ہے۔ جہاں ان دونوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے اس پانی کے آلودہ ہونے میں قطعاً شک کی گنجائش نہیں ہے۔ حیاتیاتی، حیوانی اور نباتاتی نظام زندگی میں کیمیائی اور حیاتیاتی مطالبۂ آکسیجن کا خاطر خواہ مقدار میں پایا جانا اشد ضروری ہے۔

آبی آلودگی کے ذرائع

سب سے پہلے فرگوسن (FERGUSON) نے آبی آلودگی کے ذرائع اور اس کے مضر نقصانات کا پتا لگایا تھا۔ آبی آلودگی کے مختلف ذرائع ہیں۔ عام طور پر مندرجہ ذیل ذرائع آبی تحفظ کے لیے ایک سنگین خطرہ بن گئے ہیں

۱- گھریلو یا بلدیاتی آلودگی

(DOMESTIC AND MUNCIPAL POLLUTION)

۲- صنعتی آلودگی

(INDUSTRIAL POLLUTION)

۳- زرعی آلودگی

(AGRICWLTURAL POLLUTION)

۴- مادی یا فضلاتی آلودگی

(SOLID WASTE POLLUTION)

۵- حرارتی آلودگی

(THERMAL POLLUTION)

۶- جہازی آلودگی

(SHIPPING WATER POLLUTION)

۷- ریڈیائی فاسد آلودگی

(RADIO-ACTIVE WASTE POLLUTION)

روز بروز کل کارخانوں اور نئی تکنیکی جدت کے زیر اثر صنعتی، حرارتی اور ریڈیائی آلودگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زیادہ تر آلودگی کی وجہ گھریلو اور بلدیاتی سطح پر پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے نتائج اور اثرات اتنے مضر نہیں ہیں جتنا کہ کارخانوں کے ذریعہ پھیلائی ہوئی گندگی۔ گھریلو اور بلدیاتی آلودگی کی سب سے بڑی وجہ دنیا کی ۷۰ فی صد آبادی کا بغیر کسی فضلاتی صفائی اور آبی پاکیزگی کے نظام پر منحصر ہونا ہے۔ ایک اوسط ہندوستانی خاندان ۵ کلوگرام فی ہفتہ گندگی خارج کرتا ہے۔ بمبئی شہر میں روزانہ ۳۵ ٹن کوڑا کرکٹ (GARBAGE) اور ۲ ملین ٹن فاسد مادے پانی میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ صرف درجہ اول کے شہروں سے روزانہ ۸۲۰۰ ملین لیٹر فضلات کا اخراج ہوتا ہے جس میں ۵۵ فی صد گھریلو اور بلدیاتی سطح پر اور ۴۰ فی صد کارخانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ مرکزی آلودگی انسدادی بورڈ (CENTRAL POLLUTION CONTROL BOARD) کی ۱۹۸۴ء کی رپورٹ اس امر کی مزید تصدیق کرتی ہے مقدس گنگا کی آلودگی میں سے تین چوتھائی آلودگی بلدیاتی ذرائع سے پیدا ہو رہی ہے۔ اس کا ۸۸ فی صد حصہ درجہ اول کے ۲۷ قابل ذکر شہر جو گنگا کے کنارے آباد ہیں، سے آتا ہے۔ کل کارخانے ۲۵ فی صد گندگی پھیلا رہے ہیں البتہ کانپور، کلکتہ اور دیگر صنعتی شہروں میں صورت تشویشناک ہے۔

ہندوستان میں آبی آلودگی: ایک جائزہ

ہندوستان کی بیشتر ندیاں آلودہ ہو چکی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تین ہزار شہروں میں ۷ فی صد شہر ایسے ہیں جہاں پانی کی صفائی کا انتظام ہے۔ صرف دہلی میں دو سو ملین لیٹر گندہ پانی جمنا ندی میں داخل ہوتا ہے۔ بمبئی اور کلیان کے بیچ واقع دو سو سے زائد کارخانے گندے پانی بہا ڈالتے ہیں۔ پریار ندی تو صرف کالے کیمیائی رقیق کا نالا بن چکی ہے۔ مقدس گنگا ہردوار سے کلکتے تک ایک نہ ختم ہونے والی ندی ہے، جس میں سیکڑوں شہروں کے فضلات، ہزاروں کارخانوں کی گندگی اور لاتعداد نیم جلی لاشیں بہتی رہتی ہیں۔ یہی آلودگی ۲۵۰ ملین آبادی کے لیے ایک خطرہ بن گئی ہے۔ بڑودہ اور ملا اس میں واقع منی ماہی اور کدم ندی کے ایک لیٹر پانی میں ۹۰ ملی گرام لوہا، ۲۷۵ ملی گرام پارہ، ۱۳۱۴ ملی گرام نکل اور ۳۲ گرام جستہ پایا جاتا ہے۔ اس کے استعمال سے پیدا شدہ بیماریوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عالمی صحت ادارے (WORLD HEALTH ORGANISATION) کی ایک رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ "دنیا میں ہر چوتھا بستر آبی آلودگی سے متاثر مریض کے لیے مخصوص ہے"۔ ہندوستان میں ان مریضوں کی کل کارخانوں میں غیر حاضری اور صنعتی پیداوار میں رکاوٹ سے چھ سو کروڑ روپے کا سالانہ خسارہ ہوتا ہے۔ گوشوارہ نمبر ا کے مطالعے سے مزید تفصیلات پر روشنی پڑتی ہے۔ پانی میں تحلیل مختلف النوع آلودہ مادوں سے پیدا شدہ بیماریوں کی فہرست اس کا ثبوت ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

آلودہ پانی میں تحلیل شدہ مادے سے پیدا ہونے والی بیماریاں

مادے	بیماریاں
پارہ MFRCURY	پیٹ میں درد، سردرد، ڈائریا
لیڈ LFAD	خون کی کمی، قے، بھوک کی کمی، دماغ جگر اور گردے میں تکلیف
آرسینک ARSENIC	دماغی خلل، کوفت (TFNSION) پھیپھڑے کا کینسر، السر، گردے میں تکلیف
کیڈمیم CADMIUM	ڈائریا، نشوونما میں رکاوٹ، گردے میں گڑبڑی، دماغی خلل، اور HYPFRTFNSION
تانبہ COPPFR	کوما، بخار، ہائپرٹنشن
بیریم BARIUM	قے، ڈائریا، فالج
جستہ ZINC	قے
سیلینیم SFLENIUM	جگر، گردے، SPLFFN کا نقصان، بخار، NFRVOUSNESS
	قے، LOW BLOOD PRESSURF، اندھاپن اور موت
ہیکساویلینٹ کرومیم HFXAVALENT CHROMIUM	آنت کا السر، دماغی نظام میں گڑبڑی، کینسر
کوبالٹ COBALT	ڈائریا، LOW BLOOD PRESSURF، پھیپھڑے میں جلن، ہڈیوں میں سوزش

ماخذ اورینٹیل انسائیکلوپیڈیا آف انوائرنمنٹ اینڈ اکالوجی، نئی دہلی ۱۹۹۴ء/انسائیکلوپیڈیا آف انوائرنمنٹل پولیوشن اینڈ کنٹرول، نئی دہلی۔

آبی آلودگی کی روک تھام

آبی آلودگی کے سد باب کی تلاش ایک ضروری امر ہے۔ اس کا مقابلہ ہمیں کئی جہتوں پر کرنا پڑے گا۔ مثبت حکمت عملی اور موثر لائحہ عمل تیار کرنا وقت کی اہم ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ ملک گیر سطح پر اس کی روک تھام کے سلسلے میں حکومتی، نیم حکومتی اور رضاکارانہ تنظیموں کی جانب سے متواتر جدوجہد جاری ہے۔ آیئے ان کاوشوں کا ایک اجمالی جائزہ لیں۔

گنگا ایکشن پلان

گنگا ایکشن پلان ۱۹۸۵ء میں وضع کیا گیا۔ اس عظیم منصوبے کے تحت ۲۶۲ اسکیمیں ۲۷۰ کروڑ روپیوں کی لاگت سے شروع ہوئیں۔ درجہ اول کے ۲۷ شہروں اور درجہ دوم کے ۱۲ شہروں کا پہلے مرحلے میں انتخاب کیا گیا۔ اس منصوبہ بندی کا خاص مقصد گنگا میں گرائی جانے والی گندگی کو روکنا ہے۔ گندگی کو نئی تکنالوجی کی مدد سے صاف کیا جائے اور اس سے منسلک ذرائع سے غیر رسمی توانائی (NON-CONVENTIONAI FNERGY) حاصل کی جائے۔

اب تک دس نئے منصوبوں کو از سر نو عمل میں لایا گیا ہے۔ ۲۱ نئے منصوبوں کو منظوری دی گئی ہے۔ ANAEROBIC SLUDGE) TREATMENT TECHNOLOGY کے ذریعہ کام شروع ہو چکا ہے۔ ہندوستان ڈچ اشتراک کی صفائی مہم SANITATION PROTECT (INDO-DUTCH INTEGRAL) کی پیش کردہ تکنالوجی کو عملی شکل دی گئی ہے۔ قومی ماحولیاتی انجینئرنگ تحقیقی ادارہ (NATIONAI ENVIRONMFNTAI FNGINFERING RESEARCH INSTITUTF NEERI) ناگپور کی دریافت شدہ ROTATING BIOLOGICAI CONTRACTOR PROCESS کو فی الحال رشی کیش میں آزمایا جا رہا ہے جس کے خاطر خواہ اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ مزید تحقیق و تفتیش کا عمل جاری ہے۔ ایک ذیلی ریسرچ کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے جو وقتاً فوقتاً کلین گنگا اتھارٹی (CLEAN GANGA AUTHORITY) کو صلاح و مشورہ دیتی رہے گی۔ ملک کے دیگر موقر ادارے آلودگی گنگا کی تحقیق میں مصروف ہیں۔

- آبی اور زمینی آلودگی کی روک تھام کے لیے ہندوستانی زرعی تحقیقی ادارہ INDIAN AGRICULTURE RESEARCH INSTITUTF (ICAR) نئی دہلی۔
- حیاتیاتی تحفظ اور نگہداشت (BIOI OGICAL CONSERVATION AND MONITORING) کے سلسلے میں اسکول برائے ماحولیاتی سائنس (SCHOOI OF ENVIRONMFNTAL SCIENCES) جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔
- آبی معیار (WATER QUALITY) کی بحالی اور صفائی تکنیک (TRFATMFNT TECHNOLOGY) کا کام ہندوستانی تکنالوجی ادارہ (INDIAN INSTITUTE OF TFCHNOCOGY) بمبئی۔
- INSTREAM اور RIVER FRONT USES CONSFRVATION کی ذمہ دار اسکول برائے شہری منصوبہ بندی و تعمیرات (SCHOOI OF PLANNING AND ARCHITECTURE) نئی دہلی۔

اس کے علاوہ مرکزی انسداد آلودگی بورڈ (CFNTRAI POLI UTION CONTROI BOARD) نئی دہلی، INDIAN TOXICOLOGY RESEARCH CENTRE ITRC لکھنؤ اور بھابھا ایٹمی تحقیقاتی مرکز (BHABHA ATOMIC RESEARCH CFNTRF)

ممبئی اور ملک کے دیگر ریاستی انسداد آلودگی بورڈ (STATE POLLUTION CONTROL BOARD) ہمہ وقت آبی آلودگی کے سدباب اور امکانات کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ان تمام اداروں کی کدوکاوش کا واحد مقصد پانی میں موجود کیمیائی اور حیاتیاتی مطالبۂ آکسیجن کو فروغ دینا ہے تاکہ انسانی، نباتاتی، حیوانی زرعی اور صنعتی ضرورتوں کے لیے سودمند ثابت ہو۔

قانونی کاوشیں

موجودہ دور میں آبی آلودگی ایک بحرانی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جہاں بہت سارے سائنسی اور تکنیکی امکانات کی تلاش جاری ہے وہیں اس بات کی بھی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ قانونی سطح پر کوئی پیش رفت ہونی چاہیے۔ ۱۹۷۲ء میں اقوام متحدہ کی جانب سے اسٹاک ہوم میں منعقدہ پہلی ماحولیاتی و ترقیاتی کانفرنس میں ماحولیاتی تحفظ کے سلسلے میں مرتفع قرارداد پاس کیا گیا۔ ہندوستان نے اپنی ماحولیاتی دلچسپی اور قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے آبی آلودگی انسدادی قانون (THF WATER PREVENTION PROIFCTION ACI) ۱۹۷۴ء میں پاس کیا، جو ماحولیاتی تحفظ کے موضوع پر ملک کا سب سے جامع قانون تصور کیا جاتا ہے۔ مرکزی و صوبائی سطح پر بورڈ کے قیام کے ذریعے ہندوستان گیر پیمانے پر آبی آلودگی کی روک تھام کے سلسلے میں وسیع اختیارات دیئے گئے۔ اس کے بعد اسی سمت میں ایک دوسرا قانون ماحولیاتی تحفظ قانون (THF ENVIRONMENT PROTECTION ACT) ۱۹۸۶ء میں پارلیمان ہند نے وضع کیا۔ اس آبی آلودگی کے علاوہ بطور مجموعی ماحولیاتی آلودگی کے انسداد کے لیے مرکزی اور صوبائی بورڈ اور مستحکم بنانے کی کوشش کی گئی تاکہ یہ کلیدی رول ادا کرے۔ عدلیہ نے بھی اپنی ماحولیاتی دلچسپی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے آبی آلودگی کے بیشتر مقدمات کے سلسلے میں صنعتی اداروں کو سخت احکامات جاری کیے ہیں۔ بعض اوقات خلاف ورزی کرنے والے، کاروباری گھرانوں کو مورد سزا ٹھہرایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ملک کے نامور کارخانے مقفل بھی ہوئے ہیں۔ سپریم کورٹ کے فعال ماحولیاتی وکیل ایم۔ سی۔ مہتا نے افادۂ عام عرضی (PUBI IC INTERFST LITIGATION) کی خلاف ورزی کرنے والے کارخانوں، انسداد آلودگی بورڈ کی غفلت اور انتظامیہ کی سرد مہری پر ضرب کاری کی ہے۔ توقع کی جاتی ہے عدالت عالیہ کا ماحولیاتی رجحان (ECO-FRIFNDI Y ATTITUDF) آبی آلودگی کی روک تھام کے لیے مزید معاون اور مددگار ثابت ہوگا۔

عوامی جدوجہد

آبی آلودگی کا مسئلہ ہماری سماجی کوتاہی، غفلت اور بے توجہی کی دین ہے عدلیہ اور انتظامیہ کی کوششوں کے متوازی سماجی بیداری کا عمل بھی جاری رکھنا ضروری ہے۔ رضاکارانہ تنظیمیں، رفاہی ادارے اور بعض ماحولیاتی متحرک افراد (FNVIRONMFNTAI ACIIVISTS) ماحولیاتی اور آبی تحفظ کے لیے کوشاں ہیں۔ عوام کے مابین آبی آلودگی کے مضر نقصانات، صحت عامہ میں گڑبڑی، وسائل انسانی سے محرومی اور معیشتی خسارہ وغیرہ جیسے موضوعات پر رائے عامہ ہموار ہونی چاہیے۔ سماجی اشتراک کی عمل کے ذریعہ ہم اس پر قابو پا سکتے ہیں۔ اس احساس کا اظہار ۱۹۸۸ء میں آبی آلودگی انسدادی قانون کے ترمیمی ایکٹ میں ہوا۔ اب عوام کو براہ راست آبی آلودگی کی روک تھام کے لیے قانونی چارہ جوئی کا حق حاصل ہے۔ اس وقت "نوجوان اور گنگا" کے عنوان سے کئی پروگرام انہیں خطوط پر چل رہے ہیں۔ قومی خدمت اسکیم (NAIIONAI SFRVICF SCHFMF NSS) NAIIONAI CADFI CORPS، این۔ سی۔ سی، نہرو یووک کیندر (NFHRU YUVAK KFNDRA) گنگا بچاؤ مہم (SA GANGA COMPAIGN) وغیرہ کی کارگزاری بھی قابل ذکر ہے۔ علاوہ ازیں گنگا کے مابین ہندوستانی قومی ٹرسٹ برائے فنون و ثقافت (INDIAN NAIIONAI IRUST FOR ARI AND CUI TURAI HFRIIAGF) INTACH نے ایک نہایت دلچسپ پروگرام کا آغاز کیا ہے جو خاص کامیاب بھی ہے۔

حاصل مطالعہ

آبی آلودگی کے مضر نقصانات، صحت عامہ میں گراوٹ، وسائل انسانی کی تباہی، صنعت و حرفت کا نقصان، ملکی معیشت کا خسارہ اس بات کا متقاضی ہے کہ آبی آلودگی انسدادی مہم خواہ وہ مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ، رضاکارانہ تنظیم یا فرض شناس شہری کی جانب سے ہو ہمیں اس میں بھرپور تعاون دینا چاہیے۔ ہماری کوتاہی، غفلت اور تساہلی آنے والی نسلوں کے لیے ایک بربادی کا پیغام اور استحکام و بقائے فطرت کے لیے عظیم خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ●

بقیہ: بالوں کی حفاظت کیسے کریں

میں کنگھی بھی خوب کریں تاکہ دھول مٹی سر پر نہ جم پائے۔

اگر آپ کے پاس وقت ہے تو ریٹھا، آملہ، شیکاکائی تینوں برابر مقدار میں لے کر رات میں بھگو دیں۔ صبح انہیں ابال کر چھان لیں اور اس پانی سے سر دھوئیں۔ بال لمبے اور گھنے اور کالے ہوں گے۔

اپنی زلفوں کی اتنی صفائی ہی انہیں چمکدار و ملائم بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ لیکن جن کے بال اُڑے اُڑے روکھے، روکھے اور بیجان رہتے ہیں تو انہیں اپنے بالوں کی کچھ اور زیادہ دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ اس زیادہ دیکھ بھال کو کہتے ہیں، "کنڈیشننگ"

بازار میں طرح طرح کے کنڈیشنر دستیاب ہیں۔ جو شیمپو کرنے کے بعد لگائے جاتے ہیں اور شیمپو کی طرح انہیں جڑوں میں رگڑنا نہیں ہوتا بلکہ صرف بالوں پر لگانا ہوتا ہے۔ ان کا استعمال لیبل پر لکھی طرز کے مطابق کرنا چاہیے۔

گھر میں کنڈیشنر تیار کرنا ہو تو آسان طریقہ یہ ہے کہ دو مگ پانی میں دو چمچہ چائے پتی اُبال کر چھان لیں یا دو مگ پانی میں ایک لیمو نچوڑ دیں۔ بالوں کو آخری بار اس پانی سے دھوئیں۔

شیمپو اور کنڈیشننگ کے باوجود آپ کے بال اگر چمکدار نہیں ہوتے تو غور کریں کہ چمک میں رکاوٹ کون پیدا کر رہا ہے۔ یقیناً یہ ہوں گے دو منہ والے بال۔ ان سے رہائی کے لیے دو تین ماہ تک بالوں کی ٹرمنگ کراتے رہیے۔ اس سے آپ کے بال خوبصورت ہو سکتے ہیں۔ ●

محمد قمر الہدیٰ

اقدار پر مبنی تعلیم

جوں جوں سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے ہم اپنی روزمرہ کی زندگی کو مادی اور اقتصادی اعتبار سے خوب سے خوب تر بناتے جارہے ہیں ویسے ویسے اخلاقی، سماجی اور نفسیاتی اعتبار سے ہماری زندگی ناآسودہ اور تاریک ہوتی جارہی ہے۔ ہر ممکن آرام و آرائش کی فراہمی کے باوجود انسان غیر مطمئن اور پریشان نظر آتا ہے۔ زندگی کی خوشی اس سے دور ہوتی جارہی ہے۔ ظلم و تشدد اور طرح طرح کے جنسی جرائم روز بروز ترقی پر ہیں، جس سے ہماری روزمرہ کی زندگی بری طرح مجروح ہو رہی ہے۔ انسانی اخلاق و اقدار کی دیواریں ایک ایک کرکے نیچے آرہی ہیں۔ ہماری سماجی زندگی بھی ایک عجیب بحران سے گزر رہی ہے، لالچ، نفرت، ہوس اور نفس پرستی کا بازار ہر طرف گرم ہے۔ سیکولرزم، سوشلزم اور جمہوریت کی منزلوں تک پہنچنے میں رکاوٹیں دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ جدید طرزِ زندگی نئی نسلوں کو ہندوستان کی تاریخ و تہذیب سے لاتعلق اور دور کرتی جارہی ہے۔ سماجی و قومی یکجہتی کی دشمن طاقتیں ہمارے جمہوری سماج کو تباہ کرنے کے لیے سرگرم ہو چکی ہیں۔ آبادی میں آئے دن کا اضافہ عوام الناس کے معیارِ زندگی کو متاثر کر رہا ہے۔ تنگ نظری اور تعصبات جن کا مظاہرہ ہم اپنے سماجی ماحول میں ہر وقت دیکھ رہے ہیں ایسی چیزیں ہیں جو سماج میں مساوات کے فروغ کی راہ میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کر رہی ہیں۔ ہمارا طبیعاتی ماحول یعنی ندیاں، پہاڑ، جنگل اور حیوانات کی زندگیاں بڑی تیزی سے آلودگی کا شکار ہو رہی ہیں، جس کے نتیجے میں ہمارے معیارِ زندگی کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ نسل، فرقہ، زبان اور علاقہ پر مبنی اندازہائے فکر ہمارے سماج کو نہ صرف خانوں میں تقسیم کر رہے ہیں بلکہ یکساں قومی اور بین اقوامی اندازِ فکر کی تشکیل و تعمیر کی راہ میں رکاوٹیں بھی کھڑی کر رہے ہیں۔ آج دنیا نیوکلیائی آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھی ہے لہٰذا انسان کو امن اور بین اقوامی سمجھ داری کی ضرورت آج جتنی ہے انسانی تاریخ میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ زندگی کی لامعنویت کا یہ احساس دن بہ دن بڑھتا ہی جارہا ہے، جس کی وجہ سے ہمارے ملک کے عوام کو روز بہ روز نئے اخلاقی اور سماجی مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ جو اس وقت ہمارے ملک کے سامنے درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ملک کی سیکولرزم، سوشلزم، جمہوریت کی سالمیت اور نوعِ انسانی کی مجموعی فلاح کے لیے اس صورتِ حال سے کس طرح نمٹا جائے اور ملک کے عوام میں اپنے ماحول اور زندگی سے متعلق اقدار کے بارے میں انقلابی تبدیلی لائی جائے۔

انسانی صلاحیتوں کی نشوونما میں تعلیم ایک کلیدی رول ادا کرتی ہے۔ چوں کہ تعلیم انسانی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس لیے تعلیم سے ہر شخص کا سابقہ پڑتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر اچھی تعلیم اپنے آپ میں انسانی شخصیت کو اس کے تمام ابعاد، ذہنی، جسمانی، سماجی، اخلاقی، روحانی، جمالیاتی اور تخلیقی وغیرہ میں نشوونما اور فروغ دینے کا ایک سلسلہ ہے۔ لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر ادھر چند برسوں کے دوران شخصیت کے متوازن اور بااثر پہلو کو ہمارے تعلیمی نظام میں تشویش ناک حد تک نظر انداز کیا گیا ہے۔ تعلیمی معیار کی پستی کی اس منزل پر ہے کہ اس سے قبل کبھی نہ تھی۔ آج اس کا مقصد محض معلومات کی ترسیل اور امتحان پاس کرنے تک ہی محدود رہ گیا ہے۔ لہٰذا جب ہم اقدار اساس تعلیم کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد تعلیم کے بااثر مقاصد یعنی آدمی کی شخصیت کے سماجی، اخلاقی، جسمانی، ذہنی، روحانی اور جمالیاتی پہلوؤں کی نشوونما کی جانب توجہ منعطف کرنے سے ہے کیوں کہ آج ان پہلوؤں کی طرف کم سے کم توجہ دی جارہی ہے۔

اس پس منظر میں ضروری ہے کہ ہم ذہنی و جذباتی زندگی پر ٹکنالوجی اور مشینوں کے غلط اثرات کو ایک ایسے نظامِ تعلیم کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کریں جس کی بنیاد اخلاقی اقدار پر ہو جو ہمیں ایک اچھے انسان اور ایک اچھے شہری کی طرح خوش گوار اور خوش آئند زندگی بسر کرنے کے آداب سکھائے۔ اس مقصد کے لیے بقول خواجہ غلام السیدین "نہ صرف فکر روشن کی بے بہا صلاحیت کو بیدار کرنا ضروری ہے بلکہ صحیح اخلاقی قدروں کی پابندی بھی ناگزیر ہے" ورنہ یہ خطرہ ہمیں اور ہماری تہذیب و ثقافت کو نیست و نابود کر دے گا یا اخلاقی اور سماجی برائیاں خود غرضی، تنگ نظری، مادہ پرستی اندر ہی اندر ہمیں گھن کی طرح کھا جائیں گی۔

آج کے مشینی اور صنعتی دور میں جب آلات

۲۲۷ ستلج ہوسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ ۶۷

احساس مروت کو کچلتے چلے جا رہے ہیں، ایسے میں ایک صالح اور متوازن زندگی بسر کرنے کے لیے لازمی ہے کہ عقل کو فرمان نظر کے تابع بنایا جائے اور ایک ایسا نظام تعلیم ترتیب دیا جائے کہ عقل کی زمام "عشق" کے ہاتھوں میں ہو ورنہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ ہماری صدیوں سے بنی بنائی تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کر لے گی۔ ایک تعلیم یافتہ انسان کی پہچان یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس مختلف علوم کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہو بلکہ اس میں بصیرت اور روشن خیالی ہونی چاہیے تاکہ وہ اس کا استعمال کر کے اپنے کردار و عمل کو بہتر بنا سکے اور سماج کی بہبود میں کام آ سکے۔ اس لیے تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ وہ انسان کے ذہن کے دریچوں کو وا کر دے اور نہاں خانۂ دل میں محبت، ہمدردی اور انسان دوستی کے چراغ روشن کر دے تاکہ انسان ہر طرح کے جغرافیائی نسلی اور مذہبی تعصبات کے اندھیروں سے نکل کر عالمی برادری کی کھلی فضا میں اپنی شخصیت کی تکمیل اور نوع انسانی کی خدمت کا کام انجام دے سکے اور اس طرح صحیح معنوں میں تخلیق آدم کا حق ادا کر سکے۔

آج کے تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے میں تعلیم سے بہتر اور کوئی ذریعہ یا لائحہ عمل نہیں کہ جو اس فرض کو بہ حسن و خوبی انجام دے سکے۔ اس لیے تعلیم اس نہج پر ہونی چاہیے کہ وہ بچے کو اس کی زندگی کے دوران پیش آنے والے پے در پے تغیرات سے مطابقت پیدا کرنے کے قابل بنائے اور اس میں ایسی اہلیت بھی پیدا کرے کہ وہ انسانی معاشرے کو ان ہولناکیوں سے محفوظ رکھ سکے جو اس وقت ہمارے ملک کو درپیش ہیں نیز اسے ان راہوں کی طرف موڑ سکے جو اس کی فلاح اور بقا کی ضامن بن سکیں اور جن پر چل کر انسانی زندگی کی معنویت اور وقار کو برقرار رکھا جا سکے علاوہ ازیں ہمارے تعصبات کو دور کر سکے ہمیں زیادہ معقولیت پسند اور محتاط بنائے تاکہ ہم دوسروں کے مختلف نظریات سمجھ سکیں۔ فہم و ادراک بڑھائے، قوت تمیز کو ترقی دے تاکہ ہم کم سے کم غلطیوں کے مرتکب ہوں۔ ہماری اخلاقی فطرت کو تقویت بہم پہنچائے تاکہ ہم زندگی میں حرص و طمع سے اپنا دامن بچا سکیں ہمارے اندر پاکیزگی اور مروت کا جذبہ پیدا کرے۔ ہماری کردار سازی اور شخصیت کی نشو و نما کر کے ہمیں اس قابل بنائے کہ ہم سماج میں معقول، ذمہ دار اور مفید شہری کی طرح زندگی گزار سکیں۔ ہمارے اندر سماجی فرائض کا احساس پیدا کرے۔ سماجی کارکردگی کو ترقی دینے اور قومی تمدن کا تحفظ کرنے کے لائق بنائے۔ غرضیکہ ان انسانی اقدار کو فروغ دینا اور محفوظ رکھنا ایک اچھے تعلیمی نظام کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اس لیے ہر ملک اپنے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر مختلف صورت حال سے نمٹنے اور مقابلہ کرنے کے لیے تعلیمی نظام ترتیب دیتا ہے۔ ہمارے ملک نے بھی ۱۹۸۶ء میں ایک ایسی ہی قومی تعلیمی پالیسی کا نظام ترتیب دیا ہے۔ جس میں ماضی کی اعلا اقدار و روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی قوم کے اور اس سے بڑھ کر تمام نوع انسانیت کے لیے بہتر مستقبل کی بنیاد فراہم کی گئی ہے تاکہ آنے والی نسلیں زندگی کے مختلف، چیلنج کا مقابلہ کر سکیں اور دستیاب مواقع سے فائدہ اٹھا کر سوچنے کی صلاحیتوں کو فروغ دے سکیں اور نئے خیالات کو مسلسل طور پر عملی شکل دیں اور ان کا تخلیقی استعمال کر سکیں۔

آج ہمارے ملک میں اقدار کے زوال اور شکست و ریخت کے سبب بڑھتی ہوئی تشویش اور قنوطیت ... نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ سماجی اور اخلاقی اقدار کے لیے نصاب میں از سر نو ترتیب، ترمیم اور اضافہ کر کے تعلیم کو ایک طاقت ور اور موثر وسیلہ بنانا لازمی ہے۔ اپنی قوم کے اتحاد اور یک جہتی کی توسیع کے لیے تعلیم کو آفاقی اور ازلی اقدار پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ کیوں کہ ایسی اقداری تعلیم ظلمت پسندی، تشدد، توہم پرستی وغیرہ کو خارج کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے اور ایمانداری، وفاداری، ہمت، عقیدہ، رواداری، انصاف پسندی، انسان دوستی، امداد باہمی، مساوات، سچائی، بردباری، فرماں برداری اور رحم دلی وغیرہ جیسی آفاقی اور ابدی اقدار پیدا کرتی ہے جو ایک انسان دوست سماج پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو قومی تعلیمی پالیسی نے ۱۹۸۶ء میں ہی محسوس کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قومی تعلیمی پالیسی نے اپنی دستاویز میں تعلیمی عمل کے اصلی جوہر اور رول کے بارے میں واضح لفظوں میں لکھا ہے:

"تعلیم کا ایک بنیادی رول یہ ہے کہ پرانی ثقافت و تمدن میں حسب حال تبدیلیاں پیدا کر کے ایک نئے سماج کی تشکیل عمل میں لائی جائے، تعلیم ہی ان احساسات اور تصورات کو جلا دے سکتی ہے جو قومی یکجہتی کو فروغ دے سکیں گے اور سائنسی مزاج کی پختگی اور آزادی، قلب و روح کے حصول کو یقینی بنا کر ہمارے قومی آئین کے تین بنیادی اصولوں یعنی سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوریت کی آبیاری کریں گے۔ قومی اتحاد کے جذبے کو تقویت دینے کے لیے نئی تعلیمی پالیسی میں سارے ملک کے لیے واحد نظام تعلیم کی ضرورت کو اجاگر کیا گیا ہے جس کی اساس ایک ملکی سطح کے نصابی خاکہ پر ہوگی۔"

اس پالیسی میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ ہمارے ملک کا قومی نصابی ڈھانچہ کلیدی اور متفرق اجزا پر مشتمل ہوگا تاکہ یکسانیت کے باوجود اس میں کچھ لچک کی گنجائش باقی رہے۔ اس نصاب کے مرکزی یا کلیدی اجزا کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ۔
۲۔ آئینی فرائض و ذمہ داریاں۔
۳۔ قومی یک جہتی کے تصور کو فروغ دینے کے لیے مناسب نصابی مواد۔
۴۔ بھارت کا مشترکہ ثقافتی ورثہ۔
۵۔ انسانی مساوات جمہوریت اور سوشلزم۔
۶۔ مردوں اور عورتوں کی برابری۔
۷۔ ماحول کا تحفظ۔
۸۔ سماجی حد بندیوں کا خاتمہ۔
۹۔ محدود کنبہ کے اصول کی بجا آوری۔
۱۰۔ سائنسی مزاج کو تقویت دینا۔

جہاں تعلیم کے نصاب اور طریقہ کے بارے میں اس پالیسی میں بحث کی گئی ہے اور تجویزیں پیش کی گئی ہیں وہیں اقدار اساس تعلیم کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور واضح الفاظ میں لکھا گیا ہے:

"ہمارا سماج ثقافتی لحاظ سے بوقلموں ہے۔ ایسے سماج میں تعلیم کا ایک ضروری مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس کے ذریعہ ان آفاقی اور ازلی اقدار کو فروغ ملے جن سے قومی اتحاد اور ایکتا کا حصول یقینی بن جائے۔ اقدار کی تعلیم سے کٹر پن، مذہبی تعصب و تشدد، توہم پرستی اور تقدیر پرستی جیسے تصورات کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔"

یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے کہ ہمارے ملک کے باشعور لوگوں نے سماجی اور اخلاقی زندگی کے زوال کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا ہے اور اقدار کے فروغ سے متعلق شعور کی بیداری کے ضمن میں تعلیم کے کردار کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے بلکہ اس طرف متعدد کمیشنوں اور کمیٹیوں بالخصوص کوٹھاری کمیشن اور قومی یک جہتی کونسل سے منسلک گجیندر گڈکر کمیٹی نے بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے علاوہ ملک کے ماہرین تعلیم نے بھی ہمارے ملک میں رائج نظام تعلیم کے مختلف پہلوؤں کا بغور جائزہ لینے کے بعد اقدار حامل تعلیم کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں خواجہ غلام السیدین کا وہ خطبہ بے حد اہمیت رکھتا ہے جو انھوں نے ۱۹۶۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تقسیم اسناد کے موقع پر دیا تھا۔ انھوں نے بہت واضح الفاظ میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کو ان کے فرائض کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا

"اب ہمارے تمام سیاسی اور فکری لیڈروں کا اور خاص کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کا فرض ہے کہ وہ قومی ذہن اور پالیسی کو تنگی اور تنگ نظری کی لعنت سے محفوظ رکھیں اور کوشش کریں کہ نئی تعلیم یافتہ نسل میں ایک "عالمی انسان" کا دل و دماغ پیدا کریں جو ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی میں مذہب کے اعتبار سے اردو، ہندی، بنگالی، گجراتی میں زبان کے اعتبار سے اور پنجاب، مدراس، اترپردیش میں صوبے کے اعتبار سے بے جا تمیز نہ کرے۔ وہ اپنی زبان، اپنے صوبے، اپنے مذہب سے محبت کرے لیکن سب زبانوں، اصولوں، مذہبوں کا احترام کرے کہ اس دنیا میں بیشتر اچھی چیزیں (اور بری چیزیں بھی) نہ صرف میری ہیں بلکہ سب کی ہیں مجھے حق ہے کہ انسان کی ہر اچھی چیز پر فخر کروں اور میرا فرض ہے کہ اس کی ہر بری بات پر شرمندہ ہوں، لہٰذا تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ من و تو کا یہ تنگ امتیاز مٹا دے، ان دیواروں کو گرا دے جو ہمیں اپنے بھائیوں سے جدا کرتی ہیں۔ ان زنجیروں کو کاٹ دے جن میں ہمارے دل و دماغ اسیر ہیں۔ جب موت کی گھنٹی بجے تو یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو کہ کس کے لیے بجی ہے یہ تو دراصل تمہارے ہی لیے بجی ہے جس وقت دیا کا یہ چراغ انسان کے دل میں جل اٹھتا ہے وہ سب کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "آج کل کی راہ بھٹکی، طاقت کی بھوکی، پرتشدد دنیا میں یہ بات کیسی ہی عجیب معلوم ہو لیکن دراصل زندگی میں معنی، فیض اور دیرپا برکت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ انفرادی نفع نقصان کے تنگ تصور کو توڑ کر عالمی خیر و صلاح کا جزو بن جاتی ہے۔ لیکن یہ ذہنیت خود بخود پیدا نہیں ہوتی ضرورت یہ کہ ہمارے تمام سماجی ادارے اور تعلیم گاہیں خیر و شر اور نیک و بد کے درمیان سختی کے ساتھ محاسبہ کریں۔ ہماری یونیورسٹیوں نے اب تک اس سماجی اور اخلاقی تنقید کے فرض کو مضبوطی کے ساتھ انجام نہیں دیا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گی تو کہاں سے پیدا ہوگا وہ فکر بے باک جو کھرے اور کھوٹے میں تمیز کر سکے۔ جو حق کا ساتھ دے۔ خود کا، اپنوں کا، اپنی جماعت کا، اپنی قوم کا، اپنے ہم مذہبوں کا ساتھ نہ دے جب وہ ناحق پر ہوں، جو ناحق کی مخالفت کرے خواہ اس کا ذاتی اور جماعتی مفاد ناحق کی پاسداری کا کتنا ہی شدید تقاضا کرے خود پر بے امان تنقید کرنا ذہنی دیانت کا سب سے پہلا فرض ہے۔"

سیدین کے اس طویل اقتباس سے جو نقش ابھر کر سامنے آتا ہے وہ انسان دوستی کے جذبے کا ہے، خلوص اور محبت کے ساتھ دوسروں سے پیش آنے کا ہے۔ حق کی بے باکانہ حمایت کا ہے۔ ناحق پر سختی سے تنقید اور اس کی مخالفت کا ہے۔ علم کے ذریعے خوب سے خوب تر کی جستجو، پاکی عقل و خرد اور عفت قلب و نگاہ پیدا کرنے کا ہے اور سب سے بڑھ کر صالح انسانی تہذیب اور اخلاق کے قیام کا ہے۔ یہ وہ اعلا اقدار ہیں جس کو نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ اور نئی پبلیکیشن نے بھی ۱۹۷۹ء میں حروف تہجی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اور تعلیم کے ذریعے طلبہ میں ان اقدار کو فروغ دینا ملک کی آزادی، خود مختاری، اتحاد، سالمیت اور بقا کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ کونسل و پبلیکیشن نے جن اقدار کی بات کی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ طلبہ میں حب الوطنی کا جذبہ اور احساس پیدا کرنا تاکہ وہ اپنے ملک کے قانون، مثالی اداروں، قومی نشان، قومی جھنڈا اور قومی ترانہ کا عزت و احترام کریں۔
۲۔ ان صالح اور مثالی نمونوں کی پیروی کرنا جنھوں نے قومی جد و جہد اور آزادی میں جان پیدا کر دی تھی۔
۳۔ طلبہ میں ہندوستان کی سالمیت، خود مختاری اور اتحاد کے جذبے کو فروغ دینا اور ان کا تحفظ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔
۴۔ طلبہ کو تعلیم کے ذریعے اس لائق بنانا کہ جب ملک کو ان کی خدمت کی ضرورت پڑے تو وہ ملک کی بقا کے لیے کام آ سکیں۔
۵۔ طلبہ میں بلا امتیاز نسب، جماعت، نسل، ذات پات، مذہب، علاقہ واریت، لسانی تعصب اور جنس کے، اخوت انسانی، بھائی چارگی، رحم دلی اور ایک دوسرے کے لیے جذبۂ خیر سگالی کا احساس بیدار کرنا۔
۶۔ طلبہ میں فطری ماحول کے تحفظ اور قدرتی وسائل مثلاً جنگل، دریا، جھیل، جنگلی زندگی، علم الطیور کے بچاؤ کا میلان اور ان کے عیال کی نگہداشت کی ضرورت کا احساس بیدار کرنا۔
۷۔ طلبہ میں سائنسی مزاج، انسانیت، جستجو اور اصلاح کے لیے سرگرداں رہنے کی روح بیدار کرنا۔
۸۔ طلبہ میں اپنے ملک کے شاندار مشترکہ ثقافتی ورثے کے وارث ہونے اور تحفظ کا احساس پیدا کرنا۔
۹۔ طلبہ میں عوامی ملکیت کی حفاظت اور تشدد سے باز رہنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔
۱۰۔ اجتماعی اور انفرادی سطحوں پر خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو کی صلاحیت پیدا کرنا تاکہ ملک مسلسل خوشحالی اور ترقی پر گامزن رہے۔

ان دس بنیادی فرائض اور ذمہ داریوں کے علاوہ کچھ ایسی مہارتوں اور صلاحیتوں کی فہرست بھی دی گئی ہے جو ایک اچھے انسان، ملک کے اچھے شہری اور متوازن شخصیت کی نشو و نما کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے مثلاً برے اور غلط کاموں سے اجتناب کرنا۔ دوسروں کی ثقافت و تہذیب کی پاسداری کرنا، بھید بھاؤ اور چھوا چھوت کو ختم کرنا، اچھا شہری بننا، دوسروں کا خیال رکھنا، دوسروں کے لیے جذبۂ خیر سگالی اور امداد باہمی کی حس کو بیدار کرنا، صفائی ستھرائی

پر دھیان دینا مشترکہ مسائل اور مشترکہ فائدے کو اولیت دینا۔ نظم وضبط اور صبر وتحمل سے کام لینا۔ دوسروں کے ساتھ خوش اخلاقی، بردباری، رحم دلی، شرافت اور ہمدردی سے پیش آنا، معاملات میں جمہوری طریقہ سے فیصلہ دینا اور اس میں یقین رکھنا، محنت کشوں کا عزت واحترام کرنا، اپنے فرض کو حسن وخوبی نبھانا، حوصلہ بلند رکھنا، دوستی اور بھائی چارگی کو بڑھانا، آزادی کا خیال رکھنا، دور اندیشی سے کام لینا، اچھی عادتیں اور نیک خصلتیں پیدا کرنا، ایمانداری اور انسانیت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، سادہ، صاف ستھری، انصاف پرور اور پاکیزہ زندگی گزارنا، جانوروں کے تئیں دل میں ہمدردی کا جذبہ رکھنا، قومی اتحاد، قومی بیداری، عدم تشدد، قومی یک جہتی اور اس کو فروغ دینا اور اس سلسلے میں صحیح رہنمائی کرنا، وقت کی پابندی اور اس کا صحیح استعمال کرنا، علم کی جستجو اور تلاش میں سرگرداں رہنا، ماضی سے محبت کرنا اور اپنے اسلاف کو عزت اور احترام سے دیکھنا۔ سماجی انصاف اور سماجی خدمات میں یقین رکھنا اور پھلنے پھولنے میں مدد دینا۔ خود امدادی، خود اعتمادی، خود کفالت، خودداری، ذاتی مطالعہ، ضبط نفس اور اخوت انسانی کی صلاحیت کی نشو ونما کرنا، نیک و بد اور خیر وشر میں تمیز کی صلاحیت کو اجاگر کرنا۔ سماجی ذمہ داریوں اور جذبۂ اجتماعیت کے احساس کو بیدار کرنا۔ تمام مذاہب کا دل سے احترام کرنا۔ برابری، مساوات اور حق گوئی سے کام لینا۔ آفاقی حقائق اور عالم انسان سے محبت و پیار کا جذبہ پیدا کرنا، قومی اور شہری املاک کی قدر وقیمت کے احساس کو نمایاں کرنا۔ جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم کو پروان چڑھانے اور برقرار رکھنے میں پوری مدد دینا اور سماجی نابرابری کو دور کرنا، صرف اپنے حقوق کا ہی خیال نہ رکھنا بلکہ دوسروں کی خواہشات اور حقوق کا بھی دل سے احترام کرنا اور حتی الامکان کوشش کرنا کہ اپنی ذات سے کسی کا استحصال نہ ہو سکے۔ یہ وہ اعلا وارفع حقیقتیں ہیں، جو ملک ہی نہیں بلکہ عالم انسانیت کے لیے ایک ایسا ماحول مہیا کرتے ہیں جس میں انسان اجتماعی اور انفرادی دونوں سطح پر نشو ونما حاصل کر کے عالم انسانی کا دل و دماغ پیدا کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کے کاموں میں ہاتھ ہی نہیں بٹائیں گے بلکہ ایک دوسرے کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں تعاون بھی کریں گے۔ لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہمارا تعلیمی نظام اقدار کی بنیاد پر قائم نہ ہو اور اسکول سے قبل اقدار کی حامل تعلیم کے دو بڑے ضابطہ ذرائع یعنی گھر اور سماج کو زیر بحث نہ لایا جائے۔

بچہ کسی خلا میں پرورش نہیں پاتا بلکہ وہ ایک سوسائٹی میں رہ کر نشو ونما حاصل کرتا ہے۔ اس سوسائٹی میں سب سے پہلے بچہ کا سابقہ اپنے گھر یا خاندان سے پڑتا ہے۔ اس لیے بچے کی اولیں درسگاہ گھر کی زندگی اور خاندان کے افراد ہی ہوتے ہیں۔ پہلے ماں کی گود میں اور پھر اس کے بعد گھر والوں کی شفقت و محبت میں بچہ وہ ابتدائی حرکات وسکنات اور مشاغل سیکھتا ہے جو زندگی کو قائم رکھنے کے لیے لازمی ہیں۔ بچہ بچپن میں ماں باپ اور گھر کے دوسرے لوگوں کی بہت سی باتیں سیکھتا اور نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو بعد میں اس کی شخصیت کا جزو بن جاتی ہیں۔ کچھ تعلیمی نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ چھ سال کی عمر تک بچہ جو باتیں سیکھ لیتا ہے وہ اس کے بعد میں حاصل کی ہوئی باتوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ کیوں کہ بچہ غیر معمولی طور پر حساس ہوتا ہے اور اس عمر میں جس قسم کے تجربے اور کیفیات سے سبر دآزما ہوتا ہے اس کا اثر اس کی آئندہ زندگی پر ایک انمٹ نقش کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی عمر میں بچہ مجبوری، مخالفت، ہمدردی، خود اعتمادی اور جذبۂ محبت وغیرہ سے روشناس ہوتا ہے۔ مزید برآں بچوں کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت بھی زیادہ تر گھر کے افراد کے ذریعہ اسی عمر میں پروان چڑھتی ہے۔ یہاں وہ سب سے پہلے یہ محسوس کرتا ہے کہ کس طرح متعدد افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ باہمی احتیاج و امداد کا یہ احساس ساری اخلاقی وتمدنی تربیت کی بنیاد پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر گھر کے محدود ماحول میں ایسے مواقع موجود ہیں جن سے بچے استفادہ کر کے اپنی شخصیت اور کردار سازی کی تشکیل وتعمیر اور اپنی جبلتوں کا اظہار کر سکیں تو اس کا اثر بچوں کی زندگی پر خوش آئند ہوگا۔ برعکس اس کے کہ اگر خاندانی روایات تنگ نظری پیدا کر کے بچوں کے مشاغل اور دلچسپیوں کا میدان مقید و محدود کر دیتی ہیں تو خاندان کی تنگ نظری کی وجہ سے بچوں کی شخصیت ابھرنے نہیں پاتی اور پھر وہ اس قابل نہیں رہتا کہ نوجوانی کے دور میں اپنے بچپن کے توازن کو برقرار رکھ سکے اور نئی جبلتوں اور نئے جذبات و احساسات کے درمیان اپنی راہ نکال سکے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر ہمارے ملک کے گھروں کا جائزہ لیا جائے تو یہاں ہمیں دو واضح صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعض اوقات والدین اپنے بچوں کے ساتھ اس قدر بے جا ناز برداری اور رعایت سے کام لیتے ہیں کہ وہ بڑے ہو کر معاشرتی زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہتے یا بہت تلخ تجربے، تنگ و دو اور مشکل مراحل سے گزرنے کے بعد دوسروں کے حقوق و فرائض کا احترام کرنا سیکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے ساتھ اس قدر بے جا سختی اور ناروا سلوک کا برتاؤ کیا جاتا ہے کہ ان میں آزادی اور خود اعتمادی سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی شخصیت دب کر رہ جاتی ہے اور ان کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنے بڑوں کے ساتھ صحیح اور مستحکم تعلقات قائم نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان کی صحبت کے عمدہ اثرات سے مستفید ہو سکتا ہے اور نہ ہی اپنے، خاندان کی، معاشرے کی اور ملک و قوم کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دے سکتا ہے۔ اس لیے گھر کا فرض ہے کہ بچوں کی تربیت اس نہج پر کریں کہ ان کی مکمل شخصیت کی نشو ونما ہو سکے، کیوں کہ گھر صرف گھر ہی نہیں ہوتا بلکہ بچوں کے لیے ایک تعلیمی درسگاہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اس طرح اقدار کو فروغ دینے میں ایک کلیدی رول ادا کرتا ہے۔

انسانی زندگی کا خواہ کوئی بھی شعبہ ہو سماج کا ایک اٹوٹ حصہ ہوتا ہے کسی تعلیمی نظام کی صورت حال سماج کی مجموعی صورت حال کے تابع ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اگر سماج بہتر ہوگا تو ادارے بھی اچھے ہوں گے اور تعلیم بھی اچھی اور با اقدار ہوگی۔ اسی لیے معاشرتی طبقے کو تعلیم کا مرکز مانا گیا ہے۔ گھر کے بعد بچہ کا واسطہ سماج سے ہوتا ہے۔ سماج کا ماحول چوں کہ گھر کے ماحول سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ اس لیے بچہ پر سماج کا

بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ بچے کی عادات، لباس، مذاق، خیالات، چال ڈھال، طرزِ گفتگو، ذخیرہ الفاظ اور سیرت کو سماج ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے جو اس سماج کے اخلاقی نصب العین میں رنگا ہوتا ہے۔ معاشرتی زندگی کے آداب و رسوم، آدابِ مجلس، تہذیب و تمدن، امداد باہمی، مساوات، غریبوں کی مدد، اپنے ماضی سے محبت اور اسلاف کی تعظیم و تکریم، میل جول اور اتحاد جیسے اعلا اقدار بچے معاشرتی ماحول میں ہی سیکھتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ سماجی سطح پر پائی جانے والی برائیوں اور بدعنوانیوں کو ختم کیا جائے ورنہ بچوں پر ان کا اثر پڑنا بعید اور تعجب خیز نہیں ہے۔

انسانی اقدار کو فروغ دینے میں اسکول کلیدی رول ادا کرتا ہے کیوں کہ جیسے جیسے سماج ترقی کرتا ہے اور اس کے اندر پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں بچے کے لیے یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا سیکھیں اور کیا نہ سیکھیں۔ اس لیے ہر ملک اور ترقی یافتہ سماج اپنے تہذیبی ورثہ کی حفاظت کرنے، اپنے آدرشوں، قدروں، عقیدوں، دلچسپیوں اور ملک کو مضبوط و مستحکم بنانے اور اپنے رسم و رواج اور روایات کو برقرار رکھنے کی غرض سے اسکولوں کو ایک فعال آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اور ایسا ماحول تیار کرتا ہے کہ جس میں بچوں کی نشو و نما اور دیکھ بھال منظم طریقے سے ہو سکے جب ہم اس پس منظر میں اپنے ملک کے اسکولوں کا جائزہ لیتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہمارے اسکول بچوں کی نشو و نما کے لیے بہتر ماحول تیار کرنے کے بجائے اپنے طرزِ تعلیم اور سیکھنے سکھانے اور ضبط و نظم کی بدولت انفرادیت کو کچل کر رکھ دیتے ہیں اور بچوں کی امتیازی صلاحیتوں اور خوبیوں کو ابھرنے کے مواقع سے محروم کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حد تو یہ ہے کہ ان اسکولوں میں بچوں کی نفسیاتی اقسام کو نہ تسلیم کیا جاتا ہے اور نہ ان کی قدر کی جاتی ہے۔ جب کہ یہ ان کی زندگی کا وہ دور ہوتا ہے جب ان کے وجود کی تمام قوتیں کھیل کود کی سرگرمی اور کھلی فضا میں مصروفِ عمل ہونے کے لیے سخت بے قرار ہوتی ہیں۔ اس لیے اسکول کا فرض ہے کہ بچوں کے ذہنی اتار چڑھاؤ کو سمجھتے ہوئے ان میں اقداری تعلیم کو فروغ دینے کے لیے مندرجہ ذیل ذمہ داریوں کو نبھائے۔

۱۔ اسکول کو چاہیے کہ وہ ایک ایسا ماحول مہیا کرے جو طلبہ کے لیے دلچسپ اور پسندیدہ ہو۔

۲۔ اسکول میں مختلف قسم کے عملی کام کے مواقع فراہم ہونے چاہیے۔

۳۔ اسکول میں دست کاری کا خاص انتظام ہونا چاہیے۔

۴۔ اسکول میں دن بھر کی مصروفیات کا جو بے لوچ خاکہ آج کل رائج ہے اس میں لچک پیدا کرنی چاہیے۔

۵۔ اسکول چوں کہ سماج کا ہی ایک ادارہ ہے اس لیے اسکول کا ماحول سماجی ماحول سے ہم آہنگ ہونا چاہیے تاکہ بچوں کو اجنبیت کا احساس نہ ہو۔

۶۔ اسکول اپنے مخصوص ماحول کو ایسے تاثرات سے پاک رکھے جو بچوں کی صحیح دماغی، جسمانی، روحانی اور جمالیاتی نشو و نما کے لیے مضر ہیں۔

۷۔ اسکول مختلف عناصر میں ہم آہنگی پیدا کرے اور بچے کو ایک وسیع تر معاشرتی ماحول میں رہنا سکھائے۔

۸۔ اسکول کی برادری میں چار قسم کے رشتے ہیں

(۱) انتظامیہ اور اساتذہ کے درمیان رشتہ
(۲) اساتذہ اور اساتذہ کے مابین رشتہ
(۳) طلبہ اور طلبہ کے درمیان تعلقات
(۴) اساتذہ اور طلبہ کے مابین تعلقات

یہ رشتے اور تعلقات اسکول کی اخلاقی اور ذہنی بلند حوصلگی اور کارکردگی کا تعین کرتے ہیں اور یہ تعلقات و اشتراک بچے پر خوش آئند اثر ڈالتے ہیں، جس حد تک یہ رشتے خیر سگالی اور تعاون کی بنا پر خوشگوار اور تعمیری ہوں گے اسی حد تک اقدار کے فروغ میں مدد ملے گی۔

اسکول کے علاوہ اساتذہ پر بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو ان کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً۔

۱۔ اپنی ذات کا محاسبہ کرنا اور ہر طرح کے تعصبات سے ذہن کو پاک و صاف رکھنا۔

۲۔ اپنی شخصیت کو درپیش صورتِ حال یا حقائق سے ہم آہنگ کرنا۔

۳۔ آئندہ صورتوں کے مطابق خود کو ڈھالنا۔

۴۔ بچوں کی شخصیت کو سمجھنے کی صلاحیت کو جلا بخشنا۔

۵۔ اپنے وجدان اور احساس کی تیزی کو فروغ دینا۔

۶۔ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا اور اپنے ذہن کے دریچوں کو کھلا رکھنا۔

۷۔ اپنی ذمہ داری کو ذمہ داری کے بجائے فرض سمجھ کر نبھانا۔

۸۔ جوش و ولولے کے جذبے کے فروغ کے ساتھ ساتھ اپنی ذات میں گہرائی اور پائیداری پیدا کرنا، حق و صداقت کی روح بھی بیدار کرنا چاہیے اور حسن و جمال، نیکی اور تقدس، انصاف اور آزادی کے مظاہر بھی صحیح مشاہدے کی صفت بھی اور بچوں کے لیے ہمدردی اور محبت کا جذبہ بھی۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین :

"استاد کی کتابِ زندگی کے سرورق پر "علم" نہیں لکھا ہوتا "محبت" کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسان سے محبت ہوتی ہے، سماج جن خوبیوں کا حامل ہے ان سے محبت ہوتی ہے، ان ننھی ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل بننے والی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی کام میں اپنے دل کے لیے راحت اور اپنی روح کے لیے تسکین پاتا ہے۔"

جب تک اساتذہ کی ذات ان صفات سے مملو نہ ہوگی اس وقت تک چمن کی چمن بندی ممکن نہیں اور نہ ہی وہ نیک اور متوازن شخصیتوں کے پھول پیدا ہوں گے۔ جن کی آج ہمارے ملک و قوم اور معاشرے کو اشد ضرورت ہے۔

غرضیکہ اقدار پر مبنی تعلیم کو فروغ اور ترقی دینے کے لیے صرف اسکول ہی نہیں بلکہ گھر، سماج اور حکومت سب کو بیدار رہنا پڑے گا اور اپنی اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا پڑے گا تب جا کر وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا جو ہمارے ملک کے قائدین اور معماروں نے ملک کی آزادی کے وقت دیکھا تھا اور یہی خواب ہمارے ملک کی خوشحالی اور ترقی کا ضامن بن سکے گا۔ ●

بقیہ: بڑھتے قدم

باہمی تعاون کے ایک اقدام کے طور پر تحفے کے طور پر پیش کیں۔

آئی۔ سی۔ اے۔ آر ملک میں زرعی تحقیقات اور دوسرے ممالک کے ساتھ اس سلسلے میں باہمی تعاون کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ●

ڈاکٹر اقبال محی الدین

دیہی زرعی کہاوتیں، سائنس کی کسوٹی پر

کھیتی اور موسم سے متعلق دیہی و زرعی کہاوتیں سائنس کی کسوٹی پر آج بھی اتنی ہی کھری ہیں جتنی پانچ سو سال پہلے تھیں۔ ان میں ہندوستانی کسانوں کے صدیوں کے تجربات کا نچوڑ بھرا ہے جو پیڑھی در پیڑھی اور سینہ بہ سینہ ہوتی ہوئی آج ہم تک پہنچی ہیں۔ کسانوں کے اس انمول خزانے کو میں نے گاؤں گاؤں میں جاکر حاصل کیا ہے جن میں سائنسی معلومات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔

یہ کھیتی اور موسم سے متعلق کہاوتیں جو پانچ سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہیں جن کو پندرہویں اور سولہویں صدیوں کے شعراء نے اشعار کی لڑیوں میں گوندھ کر ہم تک پہنچایا ہے واقعی قابل تعریف ہیں۔ ان مشہور شعراء کے نام ہیں گھاگھ، بھڈر اور رحیم وغیرہ۔

ہندوستان کی ۸۰ فی صد سے بھی زیادہ آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور وہ کھیتی باڑی پر منحصر ہے۔ ہندوستان کی کھیتی زیادہ تر مانسون بارش پر منحصر ہے اس لیے یہاں کے کسان اپنے تجربات کی بنا پر ہواؤں کے رخ اور بادل کی مختلف شکلوں کو دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ بارش کب اور کتنی ہوگی یا نہیں ہوگی۔ گاؤں کی اس زرعی کہاوت میں کسانوں کا کتنا تجربہ بھرا ہے اور وہ سائنس کی کسوٹی پر کتنی پوری اترتی ہیں، اس بات کا تجزیہ ضروری ہے۔

کریا بادر جیو ڈروائے

بھورے بادر پانی لائے

(کالے بادل تو صرف دل دہلاتے ہیں مگر بارش بھورے رنگ کے بادلوں سے خوب ہوتی ہے۔)

سائنسی اعتبار سے یہ زرعی کہاوت بالکل صحیح ہے کیوں کہ نمبس (NIMBUS) نام کے بادلوں سے خوب بارش ہوتی ہے جو بھورے رنگ کے ہوتے ہیں۔ کالے رنگ کے بادل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جھوم کے گھٹا اٹھے گی اور ٹوٹ کے پانی برسے گا مگر دراصل یہ بادل صرف دل کو دہلاتے ہیں، تھوڑی بہت بارش بھی ہو جاتی ہے مگر دراصل جب بھورے رنگ کے نمبس بادل آسمان میں چھتے ہیں تو موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ اس کہاوت کے سائنسی پہلو کو سمجھنے کے لیے بادلوں کی قسمیں، ان کے رنگ اور اشکال اور ان کی زمین سے اونچائی کا جاننا بہت ضروری ہے۔

زمین سے دس ہزار فٹ کی اونچائی تک پائے جانے والے چار طرح کے بادل ہوتے ہیں۔ (۱) اسٹریٹوکیومولس (STRATOCUMULUS) یہ لڑھکتے ہوئے بادل ہوتے ہیں۔ (۲) نمبس (NIMBUS) یہ بارش کے بادل ہوتے ہیں جن کا رنگ بھورا ہوتا ہے۔ (۳) کیومولس (CUMULUS) یہ نیچے سے چپٹے اور گول چوٹی کے بادل ہوتے ہیں۔ (۴) اسٹریٹس (STRATUS) یہ کہرے جیسے بادل ہوتے ہیں جو زمین کے نزدیک ہوتے ہیں۔

زمین سے دس ہزار فٹ سے ۲۰ ہزار فٹ تک پائے جانے والے بادلوں کو درمیانی بادل کہا جاتا ہے۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ (۱) آلٹو اسٹریٹس (ALTOSTRATUS) یہ پانی جیسی شکل کے بادل ہوتے ہیں اور (۲) آلٹو کیومولس (ALTOCUMULUS) یہ گول شکل کے بادل ہوتے ہیں۔

زمین کے اوپر ۲۰ ہزار فٹ اور ۴۰ ہزار فٹ تک پائے جانے والے بادل پانچ طرح کے ہوتے ہیں۔ (۱) سیرس (CIRRUS) یہ گچھے دار بادل ہوتے ہیں۔ (۲) سیروکیومولس (CIRROCUMULUS) یہ لہردار بادل ہوتے ہیں۔ (۳) سیرو اسٹریٹس (CIRROSTRATUS) یہ پتلی چادر جیسے بادل ہوتے ہیں۔ (۴) کیومولونمبس (CUMULONIMBUS) یہ طوفانی بادل ہوتے ہیں اور بہت اونچائی تک اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ (۵) اری ڈی سینٹ (IRIDESCENT) بادل ۴۰ ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر کے بادل ہیں جن کا رنگ قوس قزح سے ملتا جلتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نمبس (NIMBUS) نام کے بھورے بادلوں سے خوب بارش ہوتی ہے اور دوسرے بادلوں سے برائے نام بارش ہوتی ہے۔ گاؤں کی یہ زرعی کہاوت کہ

"کریا بادر جیو ڈروائے

بھورے بادر پانی لائے"

سائنسی کسوٹی پر آج بھی پوری اترتی ہے جتنی پانچ سو سال پہلے صحیح تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس سائنسی دور میں جب کہ مصنوعی سیاروں کے ذریعہ موسم کی پہلے سے معلومات حاصل ہو جاتی ہیں، کسانوں کے اپنے ذاتی تجربے آج کی سائنسی کھیتی میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ صدیوں کی دانائیاں سائنس کی شکل میں ان کہاوتوں میں بھری ہوئی ہیں جن

۵۲۔ بی (ڈی۔ ڈی۔ اے فلیٹ۔ فیز I) قطب انکلیو
نزد قطب ہوٹل۔ نئی دہلی۔ ۱۶ ۔ 11

لو ہمارے کسان بھائی آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ صحیح وقت پر سینچائی، کھیت کی نرائی، کھاد و بیج کی مقدار کی معلومات، بیلوں کی اچھی قسمیں و پودوں کو بیماریوں سے بچانے کے طریقے نے آج کی کھیتی کو اپنے عروج پر پہنچا دیا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکا جب کسانوں نے ایسے تجربہ کا فائدہ اٹھایا اور سائنسی ایجادات کی مدد لی۔ عمدہ قسم کے بیج اور کیمیائی کھاد کا استعمال کرنے سے کھیتی کئی گنا بہتر ہو گئی۔

ہندوستان میں کھیتی باڑی کی معاشی اہمیت بہت ہے۔ زراعت ہی ایسی صنعت ہے جو ہندوستان کی زیادہ تر آبادی کو روزی روزگار دیتی ہے کھیتی پر منحصر بہت سے کسان ان پرانی زرعی کہاوتوں کو یا تو بھولتے جا رہے ہیں یا جانتے ہی نہیں۔ ان کو پھر سے ان کہاوتوں کو یاد دلانا بہت ضروری ہے۔ ان زرعی کہاوتوں کے مختلف پہلوؤں یعنی موسم کا چلن، سینچائی، نرائی، محنت مزدوری، پودوں کی بیماریاں، بیج کی مقدار، بیلوں کی نسلیں اور ان کی علامت، کھاد، ملی جلی کھیتی، فصل کا چکر، فصلوں کی کٹائی اور اناج فصلوں وغیرہ کو دھیان میں رکھ کر کھیتی کریں تو یقیناً ان کو بے حد فائدہ پہنچے گا۔ اب ہم ان زرعی کہاوتوں کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

ا۔ موسم سے متعلق کہاوتیں

موسم کے متعلق ہمارے کسان بھائی ایسے روزمرہ کے تجربہ کی بنا پر بتا سکتے ہیں کہ بارش ہونے کے پہلے سے کیا کیا آثار ہیں۔ اس سلسلہ میں زرعی کہاوت کہتی ہے۔

کلسا پانی گرم ہے، چڑیاں نہاویں دھور
انڈا لے چیونٹی چلے تو برکھا بھرپور

(گھڑے کا پانی اپنے آپ گرم ہو جائے اور چڑیاں مٹی میں لوٹنے لگیں اور چیونٹی منہ میں انڈے لے کر قطار سے چلنے لگیں تو یہ علامت بارش کی ہے۔ بارش کے دوران ان چیونٹیوں کو کھانا اکٹھا کرنے میں دقت ہوتی اسی لیے وہ برسات سے پہلے ہی ایسا کھانا جمع کر لیتی ہیں۔

کرو، سنیچر، بادر، رہے سینچر چھائے
نہیں کھاگھ کہیں کبھی بن برسے جائے

(اگر تین روز تک لگاتار بادل چھائے رہیں تو بارش یقینی طور پر ہوگی۔ گھاگھ اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ سنو۔ اگر بادل جمعرات، جمعہ اور سنیچر تک مستقل چھائے رہیں تو یہ بغیر برسے نہیں ہٹیں گے)

اس زرعی کہاوت میں کسان بھائیوں کا تجربہ ہے جو یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ بادل کی مستقل جماوٹ ضرور بارش لاتی ہے۔

اتر چمکے بیجوری، پروا بہو باؤ
گھاگھ کہیں بھڈر سے ردھا بھیتر لاؤ

(شمال کی سمت میں بجلی چمکے اور مشرقی ہوائیں چلتی رہیں تو بارش ضرور ہوگی۔ گھاگھ شاعر اپنے دوستوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ایسی صورت میں بیلوں اور جانوروں کو کھلے میں نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ اندر لاکر باندھنا چاہیے کیوں کہ باہر رہ کر وہ بھیگ کر بیمار پڑ سکتے ہیں)

ساون پچھوا، بھادوں پروا، آسن بہے ایسان
کاتک کنتا سیک نا ڈولے، کہاں ہیں سب کسان

(ساون کے مہینے میں مغربی ہوائیں چلیں اور بھادوں میں مشرقی ہوائیں چلیں اور شمال مشرق میں بھی ہوا چلتی رہے تو بارش یقیناً ہوگی مگر کارتک کے مہینے میں بارش نہ ہو تو فصل بہت عمدہ ہوگی اور کسانوں کے گھر اناج سے بھر جائیں گے۔

دن کے بدر، رات نی بدر
پروا بہے جھبّر جھبّر
گھاگھ کہیں کچھ ہونی ہوئی
کنواں کا پانی دھوبی دھوئی

(اگر دن میں بادل چھائے رہیں اور رات میں یہ بادل چھٹ جائیں اور مشرقی ہوائیں بھی چلتی رہیں تب بھی بارش نہیں ہوگی اور پانی کا ایسا قحط پڑے گا کہ دھوبی کو بھی کپڑا دھونے کو پانی نہیں ملے گا۔ مجبوراً اسے کنویں کے پانی سے کپڑا دھونا پڑے گا)

بھیس جو جنمے پڑوا، بہو جو جنمے دھی
سمے کلچھن جائیے، کاتک برسے مہی

(جس طرح بھینس کا بچہ کسان کے لیے زیادہ مفید نہیں ہوتا اور غریب کسان کی بہو اگر لڑکی کو جنم دے تو وہ اس کو اپنے لیے ایک بوجھ سمجھتا ہے (حالانکہ اب یہ غلط تصور ختم ہو چکا ہے اور لڑکے اور لڑکیاں دونوں برابر مانے جاتے ہیں)

اسی طرح اگر ربیع فصل بوتے ہی نومبر کے مہینے میں بارش ہوتی رہے تو اس سے بویا ہوا بیج خراب ہو جائے گا اور کسان پر بڑی تباہی آ جائے گی)

پروا سے پچھوا چلے، راںڈ مہرا او کا جر کرے
بھڈر کے من یہی وچار، ای برسی اوکری بھتار

(اگر مشرقی ہوائیں مغربی ہواؤں میں تبدیل ہو جائیں اور بیوہ عورت سنگار پٹار کرنا شروع کر دے تو بھڈر شاعر کے دل میں یہی بات آتی ہے کہ وہ ہوائیں بارش لائیں گی اور یہ عورت اپنا دوسرا بیاہ رچائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں کہ ان ہواؤں سے بارش ضرور ہوگی اور بیوہ عورت کے اندر جو تبدیلی ہو رہی ہے اور وہ بننے سنورنے لگی ہے تو یہ صاف علامت ہے کہ وہ دوسرا شوہر کر لے گی۔)

اتی کا بھلا نہ برسا، اتی کی بھلی نہ دھوپ
اتی کا بھلا نہ بولنا، اتی کی بھلی نہ چوپ

(بارش اور دھوپ دونوں کی زیادتی کھیتی کے لیے نقصان دہ ہیں۔ اسی طرح زیادہ بولنا یا بالکل خاموش رہنا بھی برا سمجھا جاتا ہے۔)

کانٹا برا کریل کا، اور بدلی کا گھام
سوت بری ہے چون کی، اور ساجھے کا کام

(کریل ایک کانٹے دار جھاڑی ہے جس کا کانٹا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے کیوں کہ وہ جھاڑ جھنکاڑ کی طرح چپک جاتا ہے۔ اسی طرح بدلی کی دھوپ بھی بہت سخت اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اس کی گرمی اور گھٹن سے پسینہ بہت ہوتا ہے جس سے آدمی پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر عورت کی سوت خواہ وہ آٹے کی ہی کیوں نہ بنا کر رکھ دی جائے، اسے عورت برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ساجھے کا کام بھی برا ہوتا ہے کیوں کہ کچھ ہی دنوں میں غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے اور ساجھے کی ہانڈی بیچ بازار میں ٹوٹتی ہے۔)

چمکے پچھم اتر اور
تب جانو پانی ہے جور

(شمال مغرب کی سمت بجلی چمکتی رہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ پانی خوب برسے گا۔)

مور پنکھ بادر اٹھے، رانڈ کاجر ریکھ
یہ برسے وہ گھر کری یا ماں مین نہ میکھ

(مور کے پنکھ کی طرح گھٹا اٹھے اور بیوہ عورت سنگار

پٹار کرنا شروع کر دے تو یہ دونوں اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ گھٹا تو ضرور برسے گی اور وہ بیوہ عورت دوسری شادی کرے گی)

ساون شکلا سپت می چھپکے اُدگے بھان
تب تک برکھا جانیئے جب تک دیو اُٹھان

(ساون کے مہینے میں آسمان میں بادل چھائے رہیں اور سورج کبھی نکلے اور کبھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ جائے اور دیو آسمان پر سوتے رہیں تب تک بارش کا موسم رہے گا)

ان زرعی کہاوتوں میں کس قدر سائنسی خزانہ بھرا ہوا ہے۔ یہ کہاوتیں صرف تجربہ کی بنا پر کہی گئی ہیں جو آج کے سائنسی دور میں بھی بالکل صحیح ہیں۔ موسم کا پہلے سے علم ہواؤں کے رخ کو دیکھ کر، بجلی کے چمکنے کی سمت کو دیکھ کر اور بادلوں کی اشکال سے کسانوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ کب اور کتنا پانی برسے گا یا بارش نہیں ہوگی۔ اسی لحاظ سے وہ کھیتی کو کامیاب بنایا کرتے تھے۔ کبھی سینچائی کے ذریعہ اور کبھی بارش کے زیادہ پانی کو کھیت سے نکال کر وہ اپنی کھیتی اور فصلوں کو کامیاب بنایا کرتے تھے۔ آج کے سائنسی دور میں جب کہ مصنوعی سیاروں کے ذریعہ موسم کا پہلے سے ہی علم ہو جاتا ہے کسان اپنی کھیتی کے سلسلہ میں ہوشیار رہتا ہے۔ پچھلے کئی سو برسوں سے بھی کسان صرف اپنے تجربہ کی بنا پر موسم کا علم حاصل کرتے تھے اور اپنی کھیتی کو کامیاب بنایا کرتے تھے۔

۲۔ پودوں کی بیماری پر زرعی کہاوتیں

کس موسم میں کون سی ہوا چلے گی اور اس کے اثرات سے پودوں اور فصلوں پر کیا اثر پڑے گا، یہ علم ہمارے کسان بھائیوں کو اپنے تجربات کی بنا پر ہے۔ اگر آسمان میں مستقل بادل چھائے رہیں اور زمین گیلی ہو تو کس فصل میں کون کون سا کیڑا لگ سکتا ہے اس کا علم زرعی کہاوتوں میں اس طرح دیا گیا ہے۔

نیچے اُود اوپر بدرائی
گھاگھ کہیں گورُوئی اب آئی

(آسمان میں بادل چھائے رہیں اور زمین گیلی ہو تو گورُوئی نام کا کیڑا فصلوں میں لگ کر ان کو تباہ کر دے گا۔)

پُوس، ماگھ بہے پُروائی
تب سرسوں کو ماہُن کھائی

(جاڑوں میں اگر پُروا ہوا (مشرقی ہوا) چلنے لگے تو ماہُن نام کا کیڑا سرسوں کی فصل کو تباہ کر دے گا۔)

گیہوں گورُوئی، گندھی دھان
بِنا آن کے مرا کسان

(گیہوں کی فصل میں اگر گورُوئی نام کا کیڑا لگ جائے اور چاول کی فصل میں گندھی نام کا کیڑا لگ جائے تو ساری فصل تباہ ہو جاتی ہے اور کسانوں کو بہت زبردست نقصان برداشت کرنا ہوتا ہے۔)

پھاگن ماس بہے پُروائی
تب گیہوں میں گورُوئی آئی

(پھاگن کے مہینے میں اگر مشرقی ہوائیں چلتی رہیں تو گیہوں کی فصل کو گورُوئی نام کا کیڑا تباہ کر دے گا)

چنا ماں سردی بہت سمائی
تاکو جان گدھیلا کھائی

(اگر بہت ٹھنڈ پڑ رہی ہو تو گدھیلا نام کا کیڑا چنے کی فصل میں لگ کر اسے خراب کر دے گا۔)

جیسا بھلا جب چنا، جیسی بھلی کپاس
اور جس کی جیسی اُدکھڑی، ان کی چھوڑو آس

(اگر چنے کی فصل میں کیڑا لگ جائے یا کپاس کی فصل میں کیڑا لگ جائے تو اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا گنے کی فصل میں لال رنگ کا کیڑا لگ جاتا ہے اور اسے پوری طرح تباہ کر دیتا ہے۔)

جیکرے اُدکھڑی لگے لوہائی
تبھی پر آوے بڑی تباہی

(گنے کی فصل میں کیڑا لگ جانے سے گنا اندر سے لال رنگ کا ہو کر خراب ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کسان کے گنے کی فصل میں لوہائی نام کا کیڑا لگ جائے تو کسان کو بہت نقصان ہوتا ہے)

فصلوں میں بیماری لگنا اور ان کیڑوں کی پہچان جو مختلف پودوں میں لگ کر اس کو خراب کر دیتے ہیں۔ اس بات کو کسان اپنے مشاہدہ کی بنا پر پہچانتے ہیں اور کیمیائی دواؤں کی ایجاد سے پہلے بھی وہ اس کا علاج کر لیا کرتے تھے اور اپنی کھیتی کو بیماریوں سے محفوظ رکھتے تھے۔

۳۔ دیگر زرعی کہاوتیں

صحیح وقت پر سینچائی، نرائی، محنت اور دیکھ بھال کی جائے تو کھیتی بہت عمدہ ہو سکتی ہے۔ کسان نقد فصلیں بو کر بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ فصلوں کی سینچائی اور کٹائی کب ہونی چاہیے، ملی جلی کھیتی کے کیا فائدے ہیں، ان کو کسان زرعی کہاوتوں کی شکل میں اچھی طرح جانتے ہیں۔

گیہوں آیا بال
کھیت ساؤ تال

(جب گیہوں کے پودے میں اناج کی بال نکل آئے تو اس وقت کھیت کو سینچنا چاہیے۔)

کالے پھول نہ پایا پانی
دھان مرا ادھ بیچ جوانی

(دھان کے پودوں میں جب کالے کالے پھول آنے لگیں تو اس کی سینچائی بہت ضروری ہے۔ اگر اس وقت پانی نہ دیا گیا تو دھان کی فصل مرجھا کر ختم ہو جائے گی)

جو کل ستارھ لگتے ہیں برسے
ناج بیار بن کوئی نہ ترسے

(اساڑھ کے مہینے میں بارش ہو جانے سے فصلیں اچھی ہوتی ہیں جس سے کسانوں کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ کوئی نہ تو اناج کے لیے پریشان رہتا ہے اور نہ ہی بیار و جانور کے لیے اناج کی کمی ہوتی ہے۔)

جَو لودہ چاہے دھوپ کو اور آم چاہے مینھ
ناری چاہے جُور کو اور بالک چاہے نیہہ

(جَو لودے کی فصل کو دھوپ چاہیے اور آم کو بارش کا پانی چاہیے تب ہی یہ دونوں فصلیں عمدہ تیار ہوتی ہیں جس طرح عورت طاقتور مرد کو پسند کرتی ہے اور بچے پیار پاکر کھل اٹھتے ہیں)

یہ ساری زرعی کہاوتیں صدیوں کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں۔ کسان اس تجربہ کا فائدہ اٹھا کر اپنی کھیتی کو ترقی دیتا ہے۔

کھیت کی نرائی بھی بہت ضروری کام ہے۔ کھر پتوار فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں اور ان کے کھاد کو چوس لیتے ہیں اور پودوں کو پنپنے نہیں دیتے۔ لہٰذا ان کھر پتوار کو کھیت سے نکالنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ بغیر نرائی کے اچھی فصل کی امید کرنا بے کار ہوتا ہے۔

دو پتی کیوں نہ نرائے
اب سینت کیوں پچھتائے

(اگر کھر پتوار کھیت سے نکال دیا ہوتا تو فصل

عمدہ ہوتی۔ جب کوڑا کرکٹ اور کھرپتوار کھیت سے نہیں نکالا اور فصل اچھی نہیں ملی تو اب پچھتانے سے کیا فائدہ؟)

کھیت بگاڑے کھرپتوار، سبھا بگاڑے دُوت
کھیتن ماں کھرپی کرے تا سے بھاگے بھوت

(کھرپتوار فصلوں کو خراب کرتا ہے جس طرح کسی محفل کو بُرے آدمی خراب کر دیتے ہیں۔ کھیتوں میں کھرپی کے ذریعہ کھرپتوار کو نکال دیا جائے تو عمدہ فصل کی امید کی جاسکتی ہے)

کھیتی میں محنت مزدوری کرنا بہت ضروری ہے۔ ذرا سا لاپروائی کھیتی کو تباہ کر سکتی ہے۔ جو لوگ کھیتی میں محنت سے جی چراتے ہیں ان کو نقصان ہی نقصان برداشت کرنا ہوتا ہے۔ زرعی کہاوتیں اس بات کو کیسے ظاہر کرتی ہیں۔

ساون میں سسرار گئے، پوس میں کھائیں گُڑا
جیٹھ میں پھیلا پوچھت ڈولیں تو ہر سے کتّا ہُوا

(جب کھیت جوتنے کا وقت آیا تو سسرال چلے گئے اور جب کھیت میں سینچائی، نرائی کا وقت آیا تو مزے سے مال پُوا کھاتے رہے اور لاپروائی برتتے رہے۔ جب کھیت سے فصل کاٹنے کا وقت آیا تو سب سے گھوم گھوم کر پوچھتے رہے کہ بھائی تمہارے کتنا اناج پیدا ہوا۔ چوں کہ خود کے تو کچھ پیدا ہوا نہیں لہٰذا دوسروں کے بارے میں ہی جانکاری حاصل کر کے دل ہی دل میں پچھتاتے رہے۔ کھیتی باڑی میں لاپروائی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے)

کھیتی راج رجائے
کھیتی بھیک منگائے

(اگر آدمی کھیتی گرہستی میں خوب محنت کرے تو نتیجہ اچھا ہوتا ہے اور اتنا اناج پیدا ہوتا ہے کہ وہ امیر ہو جاتا ہے۔ ہاں۔ اگر کھیتی کرنے میں وہ جی چُراتا رہے تو ظاہر ہے اس کے یہاں کچھ نہ پیدا ہوگا اور وہ غریب کا غریب ہی رہے گا)

کھیتی نرائی، جیسے راجہ کا انعام

(بغیر سینچائی کے کھیتی ایسی ہی سمجھیے کہ اگر ہو گئی تو قسمت ورنہ نقصان ہی نقصان ہے۔ اس کی مثال راجہ کے انعام سے دی گئی ہے کیوں کہ راجہ کب اور کس بات سے خوش ہو کر انعام دے، کوئی نہیں جانتا۔ یعنی اس بات کا کوئی بھروسہ نہیں کہ انعام ملے گا بھی یا نہیں۔ اسی طرح بغیر سینچائی کے کھیتی کی کامیابی کا کوئی بھروسہ نہیں)

اگلی کھیتی آگے آگے
پاچھل کھیتی بھاگے جاگے

(جو کسان وقت سے پہلے فصل پیدا کر کے بازار میں لے آتا ہے اس کو اس کی قیمت بہت اچھی ملتی ہے اور وہ امیر ہو جاتا ہے اور جو کسان سب سے پیچھے فصل اُگاتا ہے اس کی امیری یا غریبی اس کی قسمت پر منحصر ہے۔ اگر قسمت اچھی ہوئی تو فصل کی قیمت اچھی مل جاتی ہے اور اگر بازار میں مال پہلے ہی زیادہ آگیا تو اس کی پیداوار کی قیمت اسے زیادہ نہیں ملے گی۔ بلکہ اس کو گھاٹا بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جو چست کسان ہیں وہ اپنی فصل جلدی تیار کر کے پہلے ہی بازار اور منڈی میں لا کر اس کی دگنی اور چوگنی قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ کھیتی کرنے میں آدمی کو زیادہ ہوشیار اور محنتی ہونا چاہیے)

کس کے جوتے، کس کے بوئے، کس کے دے کیاری
لستہ میں رہ جائے تو گنا گھر کو دی ہے گاری

(کھیتی میں خوب محنت سے جوتنا، بونا اور کیاری بنا کے پانی دینا چاہیے۔ اس طرح محنت کرنے سے ایک بسوہ زمین سے ایک من سے بھی زیادہ اناج پیدا ہوگا)

تین پانی تیرہ گوڑ
تب دیکھو اُوکھی کا پوڑ

(گنے کی فصل میں تین مرتبہ پانی دینا چاہیے اور تیرہ مرتبہ اس کھیت کی گوڑائی کرنی چاہیے تاکہ گنے کی جڑیں تازہ ہوا اور سورج کی روشنی پا سکے۔ اس طریقہ سے گنے کی کھیتی عمدہ ہوگی)

کھیتی، پاتی، بینتی اور گھوڑے کا تنگ
اپنے ہاتھ سنواریے چاہے لاکھ لوگ ہوں سنگ

(کھیتی، خط، درخواست اور گھوڑے کی دیکھ ریکھ اپنے ہی ہاتھ سے کرنا چاہیے۔ دوسروں پر کام چھوڑنے سے خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے)

جیسا جی کا لیبا، ویسا پانی دیبا
بیس بیس کے کچھا ہارے، ہارے بلّم نگینا
ایکو بار نہ ہے بڑوائی، لیبا ہے نہ دیبا

(غریب کسان ربیع کی فصل کاٹ لینے کے بعد چینا اناج بوتے ہیں مگر اس کے بونے میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ محنت خود بھی کرنی پڑتی ہے اور بیلوں کو بھی محنت کرنا پڑتی ہے۔ اس محنت کے باوجود اگر ایک مرتبہ مشرقی ہوائیں چل جائیں تو ساری محنت پر پانی پڑ جاتا ہے اور فصل تباہ ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کھیتی میں محنت بھی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ ایسا اناج نہیں بونا چاہیے کہ وہ محنت کے باوجود نہ پیدا ہو)

نقد فصلوں کی پیداوار سے کسانوں کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ زرعی کہاوتیں اس کے بارے میں کہتی ہیں:

یا تو بووو کپاس اور ایکھ
یا تو کھاؤ مانگ کے بھیک

(کپاس اور گنّے کی فصل سے کسان کو فوراً روپیہ مل جاتا ہے۔ لہٰذا نقد فصلیں جیسے گنّا اور کپاس ہی بونا چاہیے تاکہ کسانوں کو خوشحالی نصیب ہو)

جس کو ہو ٹوٹا مال کا
وہ اوکھ بوئے اسُوجکا

(جس کسان کو روپیوں کی ضرورت ہو اس کو نقد فصل یعنی گنّے کی کاشت کرنا چاہیے اور گنّے کی اسُوجکا قسم بونا چاہیے جو بہت عمدہ ہوتی ہے۔ اس قسم کے گنّے سے کسان کو اچھی رقم مل سکتی ہے)

ملی جلی کھیتی کرنے کا فائدہ الگ ہی ہے کیوں کہ ملے جلے بیج میں سے جو بھی پیدا ہو گیا اس سے کسان کو فائدہ ہی ہوگا۔ زرعی کہاوت اس بات کو اس طرح ظاہر کرتی ہے:

کھیتی کرے گا جا با جا
جَو نہ لاگے تو نہ راجا

(سب اناج ملا جلا کر بونے سے جو بھی اچھی طرح پیدا ہوگا وہ کسان کے لیے فائدہ مند ہوگا)

فصلوں کی کٹائی کب ہونی چاہیے اس کے بارے میں بھی زرعی کہاوت کہتی ہے:

دو دن پچھوا، چھ پُروائی
گیہوں، جو کہ لیہو دوائی

تا کے بعد اُوسا وے جو
بھُوسا دانہ الگے ہو

(اگر دو دن تک مغربی ہوائیں چل جائیں اور چھ روز تک مشرقی ہوائیں چلنے لگیں تو گیہوں اور جَو کو اُدوا لینا چاہیے۔ دوانے سے مطلب یہ ہے کہ بیلوں کی جوڑی گیہوں یا جَو کے پودوں کے ڈھیر پر چلتے رہیں تو دانہ اور بھوسہ الگ ہو جاتا ہے اور اس دانے اور بھوسے کو الگ کرنے کے لیے ٹوکری سے اُوسا لینا چاہیے۔ اُوسانے سے مراد یہ ہے کہ مغربی خشک ہوائیں جب چل رہی ہوں تو دانہ اور بھوسے کو ٹوکری میں لے کر ہوا کے مخالف رخ پر گرانا چاہیے۔ ہوا کی تیزی سے دانہ نیچے گر جاتا ہے اور بھوسہ چوں کہ ہلکا ہوتا ہے وہ تھوڑی دور پر جا کر گر جاتا ہے۔ اس طرح دانہ اور بھوسہ الگ الگ ہو جاتا ہے۔)

یہ ساری زرعی کہاوتیں کسانوں کے تجربہ ومشاہدہ پر مبنی ہیں اور سائنس کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔

۴۔ بیلوں کی قسمیں اور ان کی طاقت پر کہاوتیں

آج بھی ہندوستان کے گاؤں میں زیادہ تر کھیتی ہل بیل کے ذریعہ ہی کی جاتی ہے۔ کچھ جگہوں پر ٹریکٹر کے ذریعہ کھیت جوتے جاتے ہیں لیکن زیادہ تر کسان ہل بیل پر ہی منحصر ہیں۔ جب بیلوں کو کھیتی میں استعمال کرنا ہی ہے تو ان کی عمدہ قسمیں اور طاقتور بیل کو ہی استعمال کیا جانا چاہیے۔ کسانوں کو اپنے برسہا برس کے تجربات کی بنا پر معلوم ہے کہ کون سے بیل ان کے کام کے ہیں اور کون سے نہیں۔ گاؤں کی زرعی کہاوتیں بیلوں کی قسموں اور ان کی طاقت کے بارے میں کہتی ہیں:

ناٹا کھوٹا بیچ کے چار ڈھر ندھر لیہو
اپنا کام نکار کے اور ہُو منگنی دیُجو

(چھوٹے اور کمزور بیلوں کی جگہ کسانوں کو مضبوط اور بڑے بیل رکھنے چاہئیں تاکہ اپنی کھیتی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی مدد کر سکیں)

مینی بیل بڑا بلوان
تنک میں کر بیہے ٹھاڑھے کان

(مینی نسل کا بیل کھیتی کے لیے بہت عمدہ ہوتا ہے اور ذرا سے اشارے سے وہ کام میں لگ جاتا ہے)

بڑسنگھا جن لیہو مُول
کنواں ماں ڈارو روپیہ کھُول

(بڑے بڑے سینگوں والا بیل کھیتی کے لیے بیکار ہوتا ہے۔ ایسے بیل کو خریدنے سے بہتر یہ ہے کہ روپیہ کنویں میں پھینک دیا جائے)

سیلا کندھا بیگن کھُرا
کبہوں نا نکلے کنتا بُرا

(سیلے کندھے اور بیگنی کھُر والے بیل بہت اچھے ہوتے ہیں)

نا مُوہے ناڈھو اُلیا گلیا
نا موہے جوتو دائیں
بیس برس تک کروں برد ئی
جو نا ملیہوں گائیں

(بیل کہتا ہے کہ اگر مجھے اُبڑکھابڑ اور بنجر زمین کو نہ جوتنا پڑے اور نہ ہی ہل میں داہنی طرف جوتنا پڑے کیوں کہ داہنی طرف کے بیل پر بہت زور پڑتا ہے اور گائے سے نہ ملوں تو میری طاقت اتنی زیادہ قائم رہے گی کہ میں بیس سال تک ہل جوت سکتا ہوں)

بیل چیکنا جُوت میں اور چیکیلی نار
یہ گاہک ہیں جان کے لاج رکھو کرتار

(اگر بیل ہل میں جوتا جائے اور وہ کھڑے ہو کر کبھی کندھے پر سے ہل کی جُوا اتار پھینکنے کی کوشش کرے تو ایسے بیل سے ہمیشہ خطرہ بنا رہتا ہے جس طرح تیز طرار عورت کسی کو بھی محفل میں بے عزت کر سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دونوں تیز ہوں تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں کسان اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتا ہے کہ اے مالک بس ہماری عزت آپ کے ہاتھ میں ہی محفوظ ہے)

سینگ مُڑے، ماتھا اُٹھا، منہ کا ہووے گول
روم نرم، چنچل کرن، تیز بیل انمول

(جس بیل کے سینگ مڑے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی پیشانی اٹھی ہوئی اور گول منہ کا ہو اور اس کے بال نرم نرم ہوں اور وہ ذرا سے اشارے پر چلنے کو تیار ہو جائے، ایسے بیل بہت عمدہ ہوتے ہیں اور کھیتی کے لیے بہت مفید ہوتے ہیں)

پونچھ میں جھبّا، اینٹھے کان
ایسا بَرد محنتی جان

(جس بیل کے مُڑے ہوئے کان ہوں اور دُم گچھے دار ہو وہ بیل بہت محنتی ہے۔

ان زرعی کہاوتوں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں صدیوں کی ذہانت، تجربات ومشاہدات کا نچوڑ بھرا ہوا ہے۔

۵۔ کھاد سے متعلق زرعی کہاوتیں

گاؤں کے رہنے والے کسانوں کو کھیتوں میں کھاد ڈالنے کا پورا تجربہ ہوتا ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ کھاد ڈالنے سے زمین کی زرخیزی کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور وہاں فصلیں اچھی پیدا ہوتی ہیں۔ کھاد کے فوائد کے متعلق زرعی کہاوتیں کہتی ہیں:

کھاد دے کوڑا ساڑے، کرم لکھا ٹری جائے
رحیم کہت سنائے کے دیکھو کھاد بنائے

(تقدیر کا لکھا بدل سکتا ہے مگر کوڑے کی کھاد اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے اور جس کھیت میں کھاد ڈالی جاتی ہے اس میں بہت اناج پیدا ہوتا ہے)

سنئی بُودے سنئی کاٹے، سنئی سارے کھیت ماں جھار
اُلٹے پلٹے دونوں جوتے، وہیں لیجے گلاّ کا جھار

(سنئی کو کھیت میں بو کر، کاٹ کر اسی کھیت میں چھوڑ دیا جائے تو وہ سڑ گل کے بہترین کھاد تیار ہو جاتی ہے۔ یہ ہری کھاد بے حد زرخیزی لاتی ہے اور جو بھی اناج اس کھیت میں بویا جاتا ہے وہ بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے)

۶۔ فصل چکر کے متعلق زرعی کہاوتیں

زمین کی زرخیزی قائم رکھنے کے لیے کھیتی میں فصل چکر کرنا ضروری ہے۔ بار بار ایک ہی چیز کو بونے سے زمین کی زرخیزی کم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے بدل بدل کر فصلیں اس کھیت میں پیدا کی جاتی ہیں تاکہ زمین کو غذائیت ان پودوں سے ملتی رہے اور اس کی طاقت اور زرخیزی قائم رہے، جو تجربہ کار کسان ہیں وہ ہمیشہ فصل

چکر کو قائم رکھتے ہیں۔ زرعی کہاوتیں فصل چکر کے بارے میں کہتی ہیں:

ساٹھی میں ساٹھی کرے اور باڑی میں باڑی
اُد کھ میں جو دھان بو دے پھونکو وا کی داڑھی

(وہ کسان بہت ہی بے وقوف ہے جو دھان اور رُوئی کی کھیتی ایک ہی کھیت میں بار بار کرے۔ دھان بونے کے بعد کپاس بونے سے زمین کی زرخیزی بہت کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا فصل کچھ نہ ملے گی۔ وہ کسان اور بھی زیادہ بے وقوف ہوگا جو گنے کی کاشت کے بعد اسی کھیت میں فوراً دھان بو دے۔ کیوں کہ گنے کی کھیتی نے زمین کی ساری زرخیزی کو چوس لیا۔ ایسے کھیت میں چاول کی کاشت کو زرخیزی نہیں ملے گی جس سے کسان کو بہت نقصان ہو جائے گا۔ ایسے کاشت کار کے لیے زرعی کہاوت یہاں تک کہتی ہے کہ اس کی داڑھی میں آگ لگا دو جو اتنا بھی فصل چکر کے بارے میں نہیں جانتا)

باڑی میں باڑی کرے اور ایکھ میں ایکھ
وے گھر یوں ہی جائیں گے سُنیں پرائی سیکھ

(کپاس کی کھیتی کے بعد اسی کھیت میں پھر سے کپاس بویا یا گنے کی فصل لینے کے بعد پھر اسی کھیت میں دوبارہ گنا بونا نہایت بے وقوفی ہوگی کیوں کہ پہلی فصل نے تو زمین کی ساری زرخیزی ختم کر دی۔ اب دوسری فصل کہاں سے ہوگی؟ اگر کسان اپنا ذہن استعمال نہیں کرے گا تو اس کو بہت نقصان اسی طرح ہوگا جیسے کوئی آدمی اپنی عقل استعمال نہ کرے اور اپنے گھر کے ہر معاملہ میں دوسروں کے کہنے پر چلے ایسے گھر عام طور پر برباد ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا کسانوں کو فصل چکر کے بارے میں پوری معلومات ہونی چاہئیں جب ہی ان کی زراعت میں ترقی ہو گی)

۵۔ بیج کی مقدار فی بیگھہ کے متعلق زرعی کہاوتیں

کتنا بیج ایک بیگھہ زمین میں بونا چاہیے، یہ ایک سائنسی علم ہے جو ہمارے ملک کا کسان اپنے تجربہ کی بنا پر جانتا ہے۔ زرعی کہاوتوں میں بیج کی مقدار کے بارے میں اس طرح بتایا گیا ہے۔

جَو، گیہوں بو دے تین پسیر
مٹر کا بیگھہ تیسے سیر
بو دے چنا پسیری تین
تین سیر بیگھہ جوہنری کین
پانچ پسیری بیگھہ دھان
تین پسیری جبڑہن مان
تلی، سرسوں انجوری جان
سوا سیر بیگھہ ساواں مان
برّے، کودوں سیر بُو داوَ
ڈھیر سیر بیگھہ تیسی ناوَ
ڈیڑھ سیر بحرا، بجری ساواں
کودوں، کاکُن سوَیا بودا
جب یہی وِدھی سے بو دے کسان
دونے لاکھ کی کھیتی جان

(ایک بیگھہ زمین میں پندرہ پندرہ سیر گیہوں اور جو بونا چاہیے اور مٹر کا بیج تیس سیر فی بیگھہ بونا چاہیے۔ چنا پندرہ سیر فی بیگھہ اور جوہری کے تین سیر فی بیگھہ بونا چاہیے۔ دو سیر موٹھی، ارہر اور ماش کا بیج اور ڈیڑھ سیر کپاس کا بیج فی بیگھہ کافی ہوتا ہے۔ بونے کے لیے ۲۵ سیر دھان فی بیگھہ اور پندرہ سیر جبڑہن کا بیج فی بیگھہ کافی ہے۔ تلی، سرسوں کا ایک ایک مٹھی بیج اور سوا سیر ساواں کا بیج مناسب ہے ایک بیگھہ کے لیے۔ برّے اور کودوں ایک ایک سیر اور ڈیڑھ سیر تیسی (تیل کا بیج) فی بیگھہ بونا چاہیے اور کودوں اور کاکُن سوا سیر فی بیگھہ بونے کے لیے کافی ہے۔ جب کسان اسی طریقہ سے اور اسی مقدار سے بیج فی بیگھہ کے حساب سے بوئے گا تو اس کو کھیتی میں دوگنا فائدہ ہوگا)

۶۔ بیج بونے کے طریقہ پر زرعی کہاوتیں

ہندوستانی کسان اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ کھیت میں بیج کتنی دوری پر بونا چاہیے۔ اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر انھوں نے اس بات کو زرعی کہاوتوں میں ظاہر کیا ہے۔

کدم کدم پر باجرہ، مینڈھ کُدونی جوار
ایسے بوئے جو کوئی گھر گھر بھرے کوٹھار

(باجرہ کا بیج ایک ایک قدم کے فاصلہ سے بونا چاہیے اور جوار کے بیج کا فاصلہ مینڈک کے کودنے کی دوری تک ہونا چاہیے۔ اس طرح پیداوار بہت عمدہ ہو گی۔ بہت قریب قریب بیج ڈالنے سے باجرہ اور جوار جھاڑ جھنکاڑ کی شکل میں اُگیں گے اور زمین کی اور پودوں کی زرخیزی کو چوس کر فصل بیکار کر دیں گے۔

سنا گھنا بن بیگڑا، مینڈک پھندے جوار
پیگ پیگ پر باجرہ، کرے دَرِیدر پار

(سنئی کی کھیتی بہت گھنی ہونی چاہیے اور جوار کے بیج کو مینڈک کے کودنے کی دوری پر بونا چاہیے۔ قدم قدم فاصلے سے باجرہ کا بیج بونا چاہیے۔ اس طریقہ سے فصل بہت عمدہ تیار ہو گی اور کسان کی غریبی دور ہو جائے گی)

پہلے لکڑی، پیچھے دھان
اس کو کہیے پوُر کسان

(دھان کی کھیتی سے پہلے جو کسان لکڑی کی فصل پیدا کر لیتا ہے دراصل وہی کامیاب کسان ہے)

ہرن چھلانگے کاکڑی، پگ پگ رہی کپاس
جائے کہو کسان سے بو دے گھنی اوکھاس

(لکڑی بونے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہرن کی چھلانگ کے فاصلہ سے بوئی جائے اور کپاس کو قدم قدم فاصلے سے بونا چاہیے مگر کسان کو اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ گنے کو بہت گھنا بونا چاہیے تب ہی اس کو عمدہ فصل ملے گی۔)

ان سب زرعی کہاوتوں کو پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سیکڑوں سال کے کسانوں کے تجربوں میں سائنسی خزانہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، جس زمانے کی یہ کہاوتیں ہیں یعنی پانچ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ کی، اس وقت سائنسی علم اتنا عروج پر نہیں تھا جتنا آج ہے۔ موسم کا پہلے سے اندازہ ہمیں مصنوعی سیاروں کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے مگر پہلے لوگ بادلوں کے اشکال، ہواؤں کے رخ اور بجلی چمکنے کی سمت کو دیکھ کر بارش کا اندازہ لگاتے تھے۔ ان زرعی کہاوتوں میں صدیوں کے مشاہدات و تجربات کا نچوڑ ہے جو سینہ بہ سینہ ہوتی ہوئی آج ہم تک پہنچی ہیں۔ یہ ہمارا علمی خزانہ ہے جس کو ہمیں سنبھال کر رکھنا ہے اور اس کو بہ حفاظت اپنی آنے

باقی صفحہ ۳۹ پر

ڈاکٹر پریم ایس شرما

دیہی نابرابریاں کم کرنے کی تدبیریں

دیہی نابرابریوں کے مطالعہ کی ضرورت سے انکار ناممکن ہے۔ بھارت میں آمدنی اور اثاثوں کا نمایاں فرق اسکالروں اور پالیسی سازوں دونوں ہی کی توجہ کا موضوع رہا ہے۔ اقتصادی نابرابریوں کو کم کرنے اور غریبی ختم کرنے کی غرض سے بھارت کے مختلف پنج سالہ منصوبوں میں سماجی انصاف کے ساتھ ترقی کو منصوبہ بند ترقی کا ایک بڑا مقصد قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ ملک میں انفرادی اور علاقائی اقتصادی نابرابریاں بہت زیادہ ہیں۔

نابرابریوں اور دیہی معیشتوں کی کارکردگی کے فرق کو الگ الگ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بین علاقائی نابرابری کا مطلب ہے ایک علاقے کے اپنے ابتدائی وسائل اور ان اقتصادی فائدوں کا پورا استعمال کرنے میں ناکامی جو اسے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں حاصل ہیں۔ اس ناکامی کا سبب انسانی ادارہ جاتی اور تاریخی عناصر ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس بین علاقائی فرق سے مراد ہے ابتدائی وسائل (جن میں بیشتر وسائل قدرتی اور جغرافیائی نوعیت کے ہوتے ہیں) کا فرق۔

انفرادی اور بین علاقائی نابرابریوں سے دو زمرے وجود میں آتے ہیں ایک وہ جو ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کے پاس وسائل ہیں (HAVES) اور دوسرا وہ جن کے پاس نہیں ہیں (HAVE-NOTS) موٹے طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ "جن کے پاس وسائل یا سہولیات ہیں" وہ زیادہ بچت کر سکتے ہیں اور اسے مدت طویل میں مزید پیداواری سرمایہ کاری کے لیے استعمال میں لا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر ان نابرابری کو بڑھنے سے روکنے کے لیے موثر اقدامات نہ کیے گئے تو یہ نابرابریاں بڑھتی ہی جائیں گی۔ اسی لیے مختلف قسم کی نابرابریوں کو کم کرنا اور مختلف علاقوں کی متوازن ترقی کو بڑھانا بھارت سمیت تمام ترقی پذیر ملکوں میں اقتصادی اور سماجی منصوبہ بندی کا ایک بڑا مقصد رہا ہے۔

ایشیائی ملکوں میں پیداوار کے بڑے ذرائع ہیں۔ بھاری آبادی، زمین، پانی اور سرمایہ اور ان کی تقسیم میں نابرابری کے سبب آمدنی، دولت اور اثاثوں کی تقسیم بھی غلط ہوئی ہے۔ آمدنی، دولت اور اثاثوں کی تقسیم کے اس انداز کا عکس اخراجات صرفہ (CONSUMPTION FXPFNDITURF) کی تقسیم میں پایا جاتا ہے اور یہ بات بھارت میں اخراجات صرفہ کی تقسیم کے بارے میں این ایس ایس او کی فراہم کردہ تفصیلات سے آشکار ہوئی ہے۔

یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ آمدنی کی تقسیم کے مختلف انداز قومی بہبود کی مختلف سطحوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ کیوں کہ بہبود اس بات پر مبنی ہوتی ہے کہ آمدنی کی تقسیم میں ضرورت مندوں اور سماج کے کمزور طبقوں کو مرفع الحال طبقوں کے مقابلے میں کتنا حصہ ملتا ہے۔ تاہم بھارت جیسے ملکوں میں جہاں سماج میں نابرابری بہت زیادہ ہے اور آمدنی کی تقسیم میں وسیع پیمانے پر نابرابری پائی جاتی ہے، قومی آمدنی میں کوئی بھی اضافہ قومی بہبود میں ایک مساوی یا متناسب اضافے کا مظہر نہیں ہوگا۔ ایسی حالت میں سماج کے کمزور طبقوں کی بہبود میں اضافے کے لیے بہرہ مندی بڑھانے، اثاثوں کی تقسیم اور روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لیے خصوصی پروگرام شروع کیے جاتے ہیں۔

بھارت میں ایسے پروگرام ہیں آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی، این۔ آر۔ ای۔ پی، آر۔ ایل۔ ای۔ جی۔ پی، جواہر روزگار یوجنا، ریگستان کی ترقی کا پروگرام وغیرہ جن کا مقصد سماج کے کمزور طبقوں کی ضرورتیں پوری کرنا ہے۔ عوام کے مختلف طبقوں میں ذرائع پیداوار کی ناقص تقسیم کئی معاملوں میں نابرابری پیدا کرتی ہے مثلاً

(ا) ادارہ جاتی مالیات اور پیداوار کے لیے ضروری چیزوں تک رسائی میں نابرابری۔

(ب) تکنیکی علم و مہارت، توسیعی مشورے وغیرہ تک رسائی میں نابرابری اور

(ج) اخراجات صرفہ میں نابرابری۔ اس سے لوگوں کی قرضداری بڑھتی ہے جو کئی دفعہ پشتوں تک چلتی ہے۔

دیہی علاقوں میں زمین کے معاملے میں نابرابری، اثاثوں کی نابرابری کی وجہ بھی ہوتی ہے اور نتیجہ بھی۔ زمین کے معاملے میں نابرابری سے اثاثے حاصل کرنے کی اہلیت میں نابرابری بڑھتی ہے۔ اس کی وضاحت آب پاشی کی سہولیات سے کی جا سکتی ہے جو زرعی ترقی اور عام ترقی میں ایک اہم رول ادا کرتی ہیں۔ بڑے کاشت کاروں کے پاس زیادہ زمین ہونے کی وجہ سے آب پاشی کی سہولیات اور تنصیبات کے لیے ان کی مانگ زیادہ ہوتی ہے۔ آب پاشی کی زیادہ سہولتوں کی

دستیابی سے قابل فروخت پیداوار بڑھانے میں مدد ملتی ہے جس سے مزید اراضی اور زرعی اثاثوں کی خرید کے لیے موافق فضا پیدا ہوتی ہے دوسرے الفاظ میں زمین کے معاملے میں نابرابری سے حصول اثاثہ جات کی اہلیت میں نابرابری پیدا ہوتی ہے، جس کا نتیجہ آگے چل کر مزید اراضی کے حصول کی اہلیت میں نابرابری کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔

زمین اور دوسرے اثاثہ جات کے ارتکاز کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سماج کا ایک طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال کرنے لگتا ہے اس کا نتیجہ زمین اور دیگر ذرائع پیداوار کے نااہل/ ناکافی استعمال کی صورت میں نکلتا ہے جس سے پیداوار کو نقصان پہنچتا ہے اور وہ کم ہونے لگتی ہے۔

دیہی آمدنیوں کی تقسیم کے انداز پر اثر ڈالنے والے اسباب میں سے حساس عنصر زمین کی تقسیم ہے اور اسی سے حیثیت، مرتبہ اور طاقت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ بھارت کے دیہی گھروں کا زرعی اثاثہ ۸۰ فی صد کی حد تک زرعی اراضی پر مشتمل ہوتا ہے۔ زمین کی تقسیم کے مسئلے پر اثر انداز ہونے والے دیگر عناصر ہیں۔

(الف) زمین کی فروخت اور خرید

(ب) اصلاحات اراضی کے اقدامات اور

(ج) شہرکاری کا عمل اور دیہی سہولیات کی ترقی۔ زمین کی تقسیم کے مسئلے پر قوانین وراثت اور پیدائش و اموات کا اثر بھی پڑتا ہے۔

اگرچہ بھارت جیسے ترقی پذیر ملکوں میں اقتصادی اور سماجی منصوبہ بندی کا مقصد مجموعی گھریلو پیداوار کے مقررہ نشانے کا حصول اور سماجی انصاف کے ساتھ ترقی رہا ہے، تاہم مطالعاتی جائزوں سے پتا چلتا ہے کہ اقتصادی فائدوں کے نچلی سطح تک نہ پہنچ پانے اور نسبتاً خوشحال طبقوں کے ذریعے ان فائدوں کا خاصا بڑا حصہ ہڑپ کر لیے جانے سے اقتصادی نابرابریوں میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ نسبتاً خوشحال طبقے یہ فائدے سامان تعیش کی خرید پر خرچ کر دیتے ہیں، جس میں زیادہ تر سامان ایسا ہوتا ہے جو غیر ممالک سے درآمد کرنا پڑتا ہے اس کا اثر کھیتوں اور ملک کے توازن ادائیگی کی صورت حال پر پڑتا ہے۔

اگرچہ چھوٹے اور حاشیائی کاشت کاروں اور بے زمین مزدوروں کے لیے زمین کی دستیابی بڑھائی جا سکے تو زمین کے معاملے میں نابرابریاں کم کی جا سکتی ہیں اور زمین اور انسان کا باہمی تناسب بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ملکیت اراضی کی حد مقرر کر لے اور اسے لاگو کرنے سے حاصل ہونے والی فاضل زمین کی تقسیم تو صرف ایک حد تک ہی صورت حال میں بہتری لا سکتی ہے۔ ایسا اس دلیل کی بنا پر کہا جا رہا ہے کہ اس طرح حاصل ہونے والی فاضل اراضی کمزور یونٹوں کو طاقتور اور پیداواری یونٹ بنانے کے لیے کافی ثابت نہیں ہو سکتی۔

سرکاری طور پر "فاضل" قرار دی گئی جو زمین (پانچ تا سات ملین ہیکٹیئر) کاشت کار برادری کے کمزور طبقوں میں تقسیم کے لیے دستیاب ہیں وہ اس سے بہت کم ہیں جو زرعی شماریات اور این ایس ایس کی فراہم کردہ تفصیلات کے مطابق حاصل ہونی چاہئیں۔ مزید یہ کہ جو فاضل زمینیں فی الحقیقت کمزور کاشت کاروں میں تقسیم کی گئی ہیں ان کا تناسب سرکاری طور پر "فاضل" قرار دی گئی زمینوں کا صرف ۲ تا ۲۵ فی صد ہی ہے۔ تاہم مغربی بنگال اور کیرالا میں صورت حال مختلف ہے۔ ان ریاستوں میں اصلاحات اراضی کے اقدامات کامیابی سے زیر عمل لائے گئے ہیں اور ان سے چھوٹے کاشت کاروں کو فائدہ پہنچا ہے۔ ۱۹۵۳-۵۴ء سے ۱۹۸۱-۸۲ء تک کی مدت میں تمام ریاستوں میں قطعات اراضی کی تقسیم کے بارے میں کچھ مطالعاتی جائزوں سے معلوم ہوا ہے کہ (۱) نمایاں نابرابریاں ابھی تک موجود ہیں (۲) قریب قریب سبھی ریاستوں میں متوسط طبقے کے ہاتھوں میں زمین کا ارتکاز بڑھ گیا ہے اور (۳) زمین کی تقسیم کی کارروائی کا ملکیت اراضی کے لحاظ سے سب سے نیچے کی سطح کے دیہی گھروں کی ایک بڑی تعداد پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔

زمین کی دستیابی کے مسئلے کی شدت کم کی جا سکتی ہے اگر زراعت کا کام کرنے والے ورکروں کو غیر زراعتی پیشوں میں لگایا جا سکے۔ لیکن اس کے امکانات روشن نظر نہیں آتے۔ حالیہ مردم شماری کے مطابق زراعتی کام کرنے والے ورکروں کی تعداد کل ورکنگ فورس کے ۷۰ فی صد کے لگ بھگ ہے۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کا زراعتی ورکروں کی غیر زراعتی پیشوں میں جذب کرنے کا تجربہ بھارت کے لیے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔ تاہم بھارت کے مختلف حلقوں میں آبادی کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے لوگ ایک خطے کے پسماندہ علاقوں سے دوسرے خطے میں نقل مکانی کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہار اور مشرقی یوپی سے بہت سے لوگ پنجاب، ہریانہ اور مغربی یوپی جیسے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ علاقوں میں کام کی تلاش میں جاتے رہتے ہیں۔ تاہم یہ بات واضح کر دی جانی چاہیے کہ بھارتی حالات میں یہ نقل مکانی غریبی کی تکلیفات کو کم کرنے کی محض ایک کوشش ہے۔

توجہ کا مرکز

زمین سے متعلق نابرابریوں اور ان کے اثرات کو کم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ تمام تر ترقیاتی کوششوں اور ترقی کے فائدے پہنچانے میں سماج کے کمزور طبقوں پر توجہ مرکوز کی جائے۔ اسے TARGET POPULATION APPROACH کہتے ہیں۔ (یعنی وہ انداز نظر جس میں آبادی کے ایک خاص حصے پر توجہ مرکوز کی جائے۔) اس کے علاوہ پسماندہ علاقوں کی ترقی کی اسکیمیں اور پروجیکٹ بھی دیہی نابرابریوں کو کم کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ بھارت سرکار نے ان دونوں طریقوں پر عمل کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ دیہی ترقی کے فروغ میں ان دونوں طریقوں کو ملانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ایک ایسے پبلک کریڈٹ سسٹم کو، جو مستحق سیکٹروں کو ترجیح دیتا ہو، کئی طرح سے دیہی نابرابریاں کم کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس سے کمزور طبقوں کا استحصال ختم ہوتا ہے، ان کی آمدنی بڑھتی ہے اور یہ غیر زمینی اثاثوں (مثلاً مویشیوں، آب پاشی کی صلاحیت وغیرہ) کی تقسیم میں ایک انقلابی تبدیلی لا سکتا ہے چوں کہ قرضے دینے میں اقتصادی طور پر کمزور کاشت کاروں کو ترجیح دینے سے کھیتی کے لیے درکار سامان اور آب پاشی کا ساز و سامان خریدنے کے لیے قرضوں کی دستیابی بڑھتی ہے۔ اس لیے اس سے دیہی سماج کے کمزور طبقوں کے لیے ایسے غیر زمینی اثاثے بڑھانے کا امکان بڑھتا

ہے۔ مارچ ۱۹۹۱ء کے دوران کمرشیل بینک ۴۲٫۴ فی صد قرضے ترجیحی سیکٹروں کو مہیا کر رہے تھے۔ بینکوں کے ذریعے دیے گئے کل قرضوں میں سے ۱۷٫۴ فی صد قرضے زرعی سیکٹر کو ملے۔ اس پالیسی سے چھوٹے اور حاشیائی کاشت کاروں اور دیہی کاریگروں وغیرہ کی مالی ضرورتیں پوری کرنے میں مدد ملی ہے۔ لیکن مارچ ۱۹۹۴ء کے دوران ترجیحی سیکٹروں کو ملنے والے قرضوں کا تناسب گھٹ کر ۳۴٫۴ فی صد اور زرعی سیکٹر کے لیے ۱۳٫۵ فی صد ہو گیا۔ اس بات کی جانچ کرنے کی ضرورت ہے کہ ترجیحی سیکٹروں کے لیے قرضوں کی اسکیموں کے تحت دیے جانے والے قرضے انہی لوگوں کو دیے جا رہے ہیں جو واقعی ضرورت مند ہیں اور جن کے لیے یہ اسکیمیں وضع کی گئی ہیں۔ زرعی سیکٹر کو بینکوں سے ملنے والے قرضوں میں کمی ایک سنگین معاملہ ہے۔ اسے جلد از جلد دور کرنے کی ضرورت ہے۔ مخصوص گروپوں کو کمرشیل بینکوں سے قرضے دلانے کے علاوہ سرکار نے کیمیاوی کھاد کے لیے دو قیمتوں کی پالیسی بھی اختیار کی ہے، جس کے تحت چھوٹے اور حاشیائی کاشت کاروں کو کیمیاوی کھاد رعایتی قیمتوں پر فراہم کی جاتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ دیہی آمدنیوں کو بڑھانے اور روزگار کے کافی زیادہ مواقع پیدا کرنے میں دیہی ترقی کے پروگراموں سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کامیاب پروجیکٹوں کے مقابلے میں دیہی ترقی کے کامیاب پروگراموں کی کمی ہے۔ لہٰذا اگر دیہی ترقی کو بامعنی بنانا ہے تو اسے وسعت دے کر پروجیکٹ کے دائرے سے پورے علاقے کی جامع ترقی کے دائرے میں لے جانا ہوگا یعنی اس میں پورے علاقے کے تمام لوگوں اور لوگوں کے زمروں اور سیکٹروں اور سرگرمیوں کو شامل کرنا ہوگا اور ان کے انحصار باہم کو اجاگر کرنا ہوگا۔ اس طرح زراعت کو دیہی ترقی کے ڈھانچے میں رکھنا ہوگا اور اسے غیر زرعی ترقی، جس میں ذیلی سہولیات کا فروغ مثلاً دیہات میں برق کاری، دیہی سڑکوں کی تعمیر اور ایگرو پراسیسنگ صنعتیں وغیرہ شامل ہیں، سے مربوط کرنا ہوگا۔

مطالعاتی جائزوں سے معلوم ہوا ہے کہ آبپاشی کی سہولیات میں اضافہ کا دیہی علاقوں میں غریبی کا تناسب کم کرنے میں ایک اہم اور مثبت اثر پڑتا ہے۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے پلان میں آب پاشی کے لیے کافی رقوم مخصوص کی ہیں۔ لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ پلان میں (پانچویں کیسے کہ ساتویں پلان میں) آب پاشی کے لیے مخصوص کی گئی رقوم خرچ نہیں کی گئیں ہیں، جس سے آب پاشی کے سیکٹر میں متوقع سرمایہ کاری اور اصل سرمایہ کاری کے درمیان کافی فرق رہا۔ ساتویں پلان کی مدت میں آبپاشی اور سیلاب کی روک تھام کے لیے کل جتنی رقم مخصوص کی گئی تھی اس میں سے ۴ فی صد کم روپیہ خرچ کیا گیا۔ ایسی صورت حال کسی بھی قیمت پر پیدا نہیں ہونی چاہیے۔

پسماندگی کے پہلو کو ذہن میں رکھتے ہوئے مرکزی حکومت اصلاح شدہ گیڈگل فارمولا کے تحت' جو ۱۹۶۹ء سے نافذ العمل ہے، مرکزی پلان امداد فراہم کر رہی ہے پسماندگی کے دو اہم پہلو جن کے تحت مرکزی امداد دی جاتی ہے یہ ہیں (الف) ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست کی آبادی (ب) فی کس آمدنی قومی اوسط سے کم ہو (اس کا اطلاق صرف ان ریاستوں پر ہے جن کی فی کس گھریلو پیداوار قومی اوسط سے کم ہے۔ علاقائی نابرابریوں کے لیے زرعی شعبے میں ذیلی ڈھانچے سہولیات مثلاً آب پاشی کی سہولیات' بجلی کی دستیابی، مواصلاتی خدمات، سڑکوں اور مارکٹنگ سہولیات وغیرہ کی کمی بھی ذمہ دار ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ زراعت کے ذیلی شعبوں اور سرگرمیوں، جدید اور روایتی صنعتوں' کامرس اور بینکنگ میں سرمایہ کاری، خصوصاً پرائیویٹ سرمایہ کاری سے قبل ذیلی سہولیات کو فروغ دیا جائے۔ شاید اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ تیز رفتار صنعتی اور اقتصادی ترقی کے لیے توانائی، ٹرانسپورٹ، مواصلاتی خدمات اور آب پاشی وغیرہ ذیلی سہولیات کو مضبوط بنا کر ایک مناسب ماحول پیدا کیا جانا چاہیے۔

ماضی میں ذیلی ڈھانچے کی سہولیات کے لیے سرمایہ کاری کے ترقیاتی اثر میں کمی واقع ہوئی جس کی وجوہات ہیں: (الف) کم صلاحیت کارکردگی (ب) دیکھ ریکھ اور مرمت وغیرہ کا ناکافی انتظام اور (ج) استعمال کنندگان کی ضرورتوں پر کم توجہ۔ اگر ذیلی ڈھانچے پر سرمایہ کاری کو کارگر اور نتیجہ خیز بنانا ہے تو ان خامیوں کو دور کرنا ضروری ہے۔

اوپر ہم نے ان مشکلات پر روشنی ڈالی ہے جو ریاستوں میں متوازن علاقائی ترقی کی راہ میں پیش آ رہی ہیں۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بین طبقاتی اور بین علاقائی نابرابریوں میں کمی لانے کے لیے درج ذیل مسائل پر بیک وقت حملہ کرنا ہوگا: (الف) زرعی پیداوار بڑھانا، خصوصاً ان علاقوں میں جو زیادہ پیداوار دینے والی اقسام سے بہرہ ور نہیں ہو سکے ہیں (ب) ترقی کے عمل میں سماج کے کمزور طبقوں کی شرکت کو یقینی بنانا اور دیہی علاقوں میں ترقی کے فائدوں کی کمزور طبقوں اور پسماندہ ریاستوں کے پچھڑے علاقوں میں بہتر تقسیم کا انتظام کرنا۔

دیہی علاقوں میں سماجی انقلاب کے ساتھ اقتصادی ترقی کے عمل کو آمدنی کی تقسیم کے طریقے کے ساتھ ملانا ہوگا خاص کر اس لیے کہ آمدنی کی تقسیم میں دیہی سماج کے کمزور طبقوں کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ مرکزی سرکار اور ریاستی حکومتیں اپنی پالیسیوں میں اس بات کو مد نظر رکھیں۔ ●

بقیہ سائنسی و تکنیکی عملے کی ترقی کے اقدامات

اور اضافہ ہوگا۔ فوری طور پر نئے مواقع نکال کر بے روزگاروں کو راحت دی جا سکتی ہے۔ سائنسی و تکنیکی بے روزگار عملے کی مدد کے لیے دو طرفہ حکمت عملی درکار ہے۔ ایک سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کو جدید لائنوں پر آراستہ کرنا اور صنعتی ترقی کی شرح بڑھانا اور اس کے ساتھ ہی برآمدات میں اضافہ کرنا، ان سب اقدامات سے ملک کی اقتصادی ترقی جڑی ہوئی ہے۔ مگر پھر بھی یہ سب مشورے کے طور پر ہیں اور ہر معاملہ اور شعبہ کی تفصیلات مہیا کرنی ہوں گی۔ ●

ڈاکٹر (مسز) اے۔ آر۔ راجیشوری

سائنسی و تکنیکی عملے کی ترقی کے اقدامات

اس حقیقت سے کوئی بھی شخص منکر نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں ابھی بے روزگاری کا مسئلہ برسوں تک چلے گا۔ ہم خواہ تعلیمی نظام میں کسی قدر بھی تبدیلی کیوں نہ لے آئیں یا آبادی میں اضافے کی روک تھام کے لیے کچھ ہی اقدامات کیوں نہ کر لیں مگر اس مسئلے کا کوئی بھی فوری حل نہیں ہوگا۔ جو بچے اس دنیا میں آ چکے ہیں اور جو اسکول میں زیر تعلیم ہیں، انھیں روزگار کی منڈی میں قدم رکھنا ہوگا۔ پیدائش پر روک تھام ایک مدت طلب مسئلہ ہے اور اس سے اس صدی کے آخری سال یا اس کے بعد ہی بھرتی کے طریق کار پر کوئی اثر واضح ہو سکتا ہے، نظام تعلیم کی تبدیلی سے دس سال یا اس کے بعد ہی صورت حال میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے۔ سر دست تو دستیاب افرادی قوت کو کھپانے کے لیے روزگار کے مواقع ہی نکالنے ہوں گے۔

حصول آزادی کے فوراً بعد بھارت میں ایسی مربوط کوششیں کی گئیں جن سے سائنس اور ٹکنالوجی کے پیداوار عمل مل سکے۔ یہ کوششیں اس خیال کے تحت تقویت پاتی رہیں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال سے سماجی اور اقتصادی ترقی ہوگی اور پیداواری صلاحیت بڑھے گی اور اس کے نتیجے میں روزگار کے مواقع میں اضافہ ہوگا۔ لیکن ہوا یہ کہ سائنس اور ٹکنالوجی کا عملہ بڑھا مگر ضرورت کی مناسبت سے نہیں اور ان کے بے پناہ اضافے نے بے روزگاری کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ اس سے سائنس اور ٹکنالوجی کے عملے کے لیے خود مسائل پیدا ہو گئے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کا عملہ ملک کا بیش قیمت اثاثہ ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ان کی تعداد ڈھائی لاکھ تھی جو بڑھ کر ۱۹۸۱ء میں ۲۸ لاکھ ۲ ہزار ہو گئی اور ۱۹۹۱ء میں ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۴۴ لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۹۲ء میں مزید اضافہ ہوا اور ان کی تعداد ۵۰ لاکھ ۷۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ ملک میں جس قدر ڈگری یافتہ لوگ ہیں ان میں ۳۰ فی صد وہ ہیں جو سائنس اور ٹکنالوجی کے عملے کے تحت آتے ہیں۔ ہندوستان کی مجموعی آبادی کے تناسب سے یہ تعداد زیادہ نہیں کہی جا سکتی۔ ملک میں اقتصادی طور پر سرگرم سائنس اور ٹکنالوجی کے عملے کی تعداد ۱۹۸۱ء میں ۱۹ لاکھ ۴۰ ہزار تھی لیکن تین لاکھ افراد بیکار تھے بے کار تھے، گویا کہ سرگرم سائنسی عملے کا ۱۵ فی صد حصہ بے کار تھا، یہ اعداد و شمار افرادی قوت کی عملی تحقیق کے ادارے نے ایک مسودے میں پیش کیے ہیں۔ اسی مسودے کی روشنی میں ۱۹۹۱ء میں اقتصادی طور پر سرگرم سائنسی عملے کی کل تعداد ۲۹ لاکھ ۳ ہزار تھی اور چار لاکھ ۶۳ ہزار سائنسی و تکنیکی عملہ بے کار تھا، اقتصادی طور پر سرگرم سائنسی و تکنیکی عملے کے تحت وہ لوگ آتے ہیں جو لیبر فورس میں شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو روزگار کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں ڈگری یافتہ افراد میں ۵۵ فی صد سائنس گریجویٹ ہیں، ۱۴ فی صد سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ہیں، ۱۵ فی صد انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کی ڈگری لیے ہوئے ہیں، دس فی صد میڈیکل اور چھ فی صد زراعت میں ڈگری یافتہ ہیں۔ یہ تناسب کم و بیش بہت سالوں سے اسی طرح چلا آ رہا ہے۔

انجینئرنگ کے ڈپلومہ والے سب سے زیادہ بے کار ہیں، جن کا تناسب ۲۰ فی صد ہے سائنس گریجویٹ میں ۶ر ۲ فی صد بے کار ہیں۔ اس کے باوجود ملک میں سائنس میں گریجویشن کرنے والوں کی بڑی تعداد یہی کر رہی ہے جن کے روزگار کے امکانات کم ہیں۔ سائنس پوسٹ گریجویٹ میں بے روزگاروں کا تناسب ۹ر۴ فی صد ہے۔ انجینئرنگ کے ڈگری یافتہ افراد میں بے روزگاری کا تناسب ۱ر۷ فی صد ہے، قومی سطح پر نمونہ جاتی سروے کی تنظیم نے ایسے اشارے دیے ہیں کہ ۱۹۹۷ء۔ ۱۹۹۵ء کے درمیان بے روزگار تکنیکی، بیشہ ورانہ گریجویٹوں اور سائنس کے پوسٹ گریجویٹوں کی تعداد گھٹے گی، اگرچہ سائنس اور ٹکنالوجی کے کوالیفائڈ عملے کی بے روزگاری پر تشویش ہے لیکن بحیثیت مجموعی میٹری کولیشن اور اس سے اوپر کی سطح کے تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہفتہ واری سطح پر بے روزگاری کی شرح ۱۵ سال سے لے کر ۲۹ سال تک کی عمر کے درمیان سب سے زیادہ یعنی ۲۷ فی صد ہے۔ حالاں کہ متوسط اور کم تر درجے کے ٹیکنیشین یا آئی ٹی آئی تربیت یافتہ لوگوں میں بڑی حد تک بے روزگاری ہے۔ اپرنٹس شپ ٹریننگ اسکیم کے تحت اپرنٹسوں کی بے روزگاری بھی کافی بڑے پیمانہ پر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق آئی ٹی آئی کی سند رکھنے والوں میں سے موٹے طور پر ۲۰ فی صد اور

اپرنٹشپوں میں سے ۱۳ فی صد بے کار ہیں۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ایک ایسا اطلاعاتی نظام مرتب کیا جائے اور ایسے اعداد و شمار مرتب کیے جائیں جن سے یہ پتہ چلے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے عملے کی فراہمی اور اس کی مانگ کی صورت حال کیا ہے اس سے افرادی قوت کی منصوبہ بندی میں مدد مل سکے گی اور تعلیم نیز روزگار کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں معیاری کام ہو سکے گا۔

اگرچہ صورت حال تو یہ ہے کہ برسر روزگار سائنس و ٹکنالوجی کے افراد بھی تنخواہ وغیرہ کے معاملے میں بہتر کام کی نوعیت کے بارے میں غیر مطمئن ہیں۔

تحقیق و ترقی کے اداروں میں کام کرنے والے سائنسی و تکنیکی عملے کی تنخواہوں کے ڈھانچے کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے اور اسی طرح صنعتی شعبوں میں تحقیق و ترقی کی یونٹوں میں کام کرنے والے عملے کی تنخواہوں سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے، اس تجزیے کی کچھ اہم باتیں درج ذیل ہیں۔

ادارہ جاتی سیکٹر میں سائنسی و تکنیکی عملے کے ۸۵ فی صد لوگ وہ ہیں جو سالانہ ایک لاکھ روپے سے بھی کم پاتے ہیں۔ صرف اعشاریہ ۱۸ فی صد عملہ ہی ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ تنخواہ پا رہا تھا اور اعشاریہ صفر دو فی صد عملہ دو لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ تنخواہ پا رہا تھا، یہ یاد رہے کہ سائنسی و تکنیکی عملے کا ۵ر۶۱ فی صد دس ہزار روپے سے لے کر ۵ ہزار روپے سالانہ تک تنخواہ پاتا ہے۔ ادارہ جاتی سیکٹر کے مقابلے صنعتی سیکٹر اس سے بہتر نظر آتا ہے پبلک سیکٹر میں تقریباً ۲۵ فی صد عملہ ۵ ہزار روپے سالانہ سے کم تنخواہ پاتا ہے اور ۸ فی صد سے زیادہ عملہ ایک لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ تنخواہ پاتا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں ۵ر۴ فی صد عملہ ۵۰ ہزار روپے سالانہ سے کم تنخواہ پا رہا ہے، البتہ ۱۴ فی صد عملہ ایک لاکھ روپے سے زیادہ تنخواہ پاتا ہے۔ درحقیقت صرف ۲ر۳ فی صد لوگ ہیں جو ڈیڑھ لاکھ اور دو لاکھ روپے سالانہ کے درمیان تنخواہ پاتے ہیں اور صرف ایک فی صد لوگ دو لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ تنخواہ پاتے ہیں۔ تحقیق و ترقی کی سرگرمیوں میں مصروف سائنسی و تکنیکی عملے کی سالانہ مجموعی یافت کا اوسط ۷۰ ہزار روپے سالانہ آتا ہے گویا کہ ۵۸ روپے فی ماہ جس میں بھتے بھی شامل ہیں۔

فی الوقت انتظامی عہدوں پر فائز عملے کی یافت کئی گنا بڑھی ہوئی ہیں اور اس کے مقابلے تحقیق و ترقی کے کاموں میں مصروف سائنسی و تکنیکی عملے کے نقد معاوضے کی رقم بہت کم ہے۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ کم تر کوالیفیکیشن والی جگہوں پر اکثر زیادہ ڈگری والے افراد بھرتی کر لیے جاتے ہیں کیوں کہ ان کی فراہمی بہت آسان اور وافر ہے۔ اس کی وجہ سے ان کو دل شکستگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر وہ اپنی جگہ مطمئن بھی نہیں رہتے۔ ایک دوسرا سبب یہ کہ ایک طرف بے روزگار افراد کی کافی تعداد ہے اور دوسری طرف بغیر بھری ہوئی خالی جگہوں کی تعداد ہے، اگرچہ یہ صورت حال ایسے سائنسی اور تکنیکی عملہ کے لیے ہے جو تحقیق و ترقی کے شعبوں میں کام کر رہا ہے، مگر یہ بات دوسری طرح کی ملازمتوں کے لیے بھی صحیح ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کا محکمہ سالانہ سروے کر کے سائنس اور ٹکنالوجی کی سرگرمیوں میں مصروف افرادی قوت کے اعداد و شمار مرتب کرتا ہے اور اس رقم کا اندازہ بھی لگاتا ہے جو اس طرح کی سرگرمیوں پر خرچ کی جاتی ہے۔ چند برسوں تک افرادی قوت سے متعلق اعداد و شمار میسر آ سکے۔ تحقیق و ترقی کے تمام اداروں میں مصروف افرادی قوت میں ۱۹۷۳ء سے لے کر ۱۹۹۲ء کے درمیانی عرصے میں کوئی خاص اضافہ دیکھنے کو نہیں ملا ان میں وہ معاون افرادی قوت بھی شامل کی جاتی ہے جو تحقیق و ترقی کے ہیں، مصروف افراد کو تکنیکی اور سائنسی سطح پر مدد دیتی ہے اور اس کے پاس بھی سائنس اور ٹکنالوجی کی کوالیفیکیشن ہوتی ہے۔ تحقیق و ترقی کے اداروں میں برسر روزگار افرادی قوت اور معاون افرادی قوت کا اضافہ ۱۹۹۲ء میں ۱۹۷۴ء کے مقابلے میں ۶ر۵ فی صد ہوا اور ۱۹۹۰ء میں یہ اضافہ ۱۹۷۴ء کے مقابلے میں ۱ر۴ فی صد ہوا۔ درحقیقت ۱۹۹۲ء میں شرح اضافہ ۱۹۸۴ء کے مقابلے میں صرف ۵ر۳ فی صد تھا اور ۱۹۸۸ء کے مقابلے میں یہ اضافہ صرف ۳ر۲ فی صد تھا، ۱۹۸۰ء کے دہے کے آخر میں روزگار کے مواقع بہت آہستہ بڑھے اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے شروع میں اضافہ ہی نہیں ہوا۔ اس کے مقابلے تحقیق و ترقی کے اخراجات میں ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۷۶-۱۹۷۵ء کے مقابلے ۷۱ فی صد اضافہ ہوا، ۹۳-۱۹۹۲ء میں یہ اضافہ ۸۶-۱۹۸۵ء کے اخراجات میں ۱۴ فی صد اضافہ ظاہر کرتا ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں یہ اخراجات ۸۹-۱۹۸۸ء کے مقابلے میں گیارہ فی صد زیادہ تھے۔ تحقیق و ترقی اس شرح ترقی سے بھی منفی رجحان کی غمازی کرتی ہے اور تحقیق و ترقی کے کاموں کے لیے عملے کی کھپت بھی گھٹی۔

تحقیق و ترقی میں روزگار اور معاون عملے کے درمیان تعلق کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کیوں کہ یہ عملہ سائنس اور ٹکنالوجی میں سب سے زیادہ کوالیفائڈ عملہ تصور کیا جاتا ہے، ملک میں تحقیق و ترقی کے بہ حیثیت مجموعی اخراجات کا اس تکنیکی عملہ سے رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تقابلی مطالعے سے سائنس اور ٹکنالوجی اخراجات کی اس رقم کا تعین کیا جا سکتا ہے جس سے کوالیفائڈ سائنسی و تکنیکی عملے کو روزگار دیا جا سکتا ہے۔ سائنسی و تکنیکی عملے کے اعداد و شمار اور اس سلسلے کی بہت سی اور معلومات کے بارے میں جانکاری کی کمی ہے۔ اس سلسلے کی معلومات کے ذرائع بھی کئی ہیں مثلاً یہ کہ غیر سائنسی و تکنیکی عملے کے لیے روزگار یا ملک کی مجموعی پیداوار یا صنعتی پیداوار کو اس مسئلے سے نہیں جوڑا گیا ہے۔

اصلاحی اقدامات

سائنس اور ٹکنالوجی کے عملے کو زیادہ سے زیادہ روزگار دینے کے لیے کچھ اقدامات کیے گئے ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

اس سلسلے میں سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کو نئی سمتیں دی گئی ہیں اور صنعتی ترقی کو بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے گویا کہ یہ اقدامات تعلیم، صنعت اور تربیت وغیرہ کے تحت آتے ہیں۔

تعلیم: ملک میں سماجی اور سیاسی

اسباب کی بنا پر اعلا تعلیم کی توسیع عمل میں آرہی ہے اور یہ توسیع نہ تو اقتصادی وجوہ سے ہے اور نہ افرادی قوت کے خیال سے۔ اس لیے بے روزگاری کو مطلوبہ سطح تک کم کرنا دشوار ہے۔ البتہ اس خیال کے پیش نظر تعلیمی نصابات اور اس کی شکلوں میں تبدیلی آئی ہے۔ یہ تبدیلی اس خیال سے کی گئی ہے جس سے تربیت پانے والوں کو روزگار حاصل کرنے میں مدد مل سکے اور بے روزگار سائنسی و تکنیکی عملے کو کھپایا جا سکے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائنس گریجویٹوں کی اتنی بڑی تعداد کو بڑھانے سے کیا فائدہ ہوتا ہے جب کہ ملک کی معیشت ان کو نہیں کھپا سکتی، ان لوگوں کو تو چھوڑ دیجیے جو سائنس میں اعلا تعلیم حاصل کرتے ہیں، یا جو زیادہ تر لیبارٹری ٹیکنیشن/استاد بنتے ہیں، ورنہ تو یہ سائنس گریجویٹس کلرک بنتے ہیں جہاں سائنس کی ہنرمندی درکار نہیں۔ درج ذیل انداز نظر اپنا کر اس مسئلے کی شدت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

——— اسکولی سطح کی تعلیم کے بعد تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانا۔

——— ذہنی رجحان کی جانچ کر کے خاص طالب علموں کو ہی سائنس کی تعلیم دلانا۔

——— ایم ایس سی / پی ایچ ڈی میں داخلوں کو محدود کرنا۔

——— درمیانہ سطح کے تکنیکی تعلیم پانے والوں کی وجہ سے ان کو روزگار نہ مل سکا۔

اور اس طرح تعلیم یافتہ افراد اور روزگار کے درمیان کافی فرق رہ گیا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انجینئرنگ کالج اور پولی ٹکنیک اداروں کے نصابات کو از سر نو ترتیب دی جانی چاہیے۔ تعلیمی ڈگریوں کو ملازمتوں کی شرائط سے الگ کر دینا صحیح سمت میں ایک قدم ہوگا۔ جہاں سے اس طرح کی کوالیفیکیشن درکار نہ ہو تو وہاں چند موجودہ کالجوں کو پیشہ ورانہ تعلیم کے کالج بنا دینا چاہیے۔

ان کالجوں میں ابتدا میں ایسے کالج شروع کر دینے چاہئیں جیسا کہ پینٹنگ، پرنٹنگ، سیاحت، انشورنس، کھاتہ نویسی، پبلک ہیلتھ، حفظان صحت کے اصول، کمرشیل پبلسٹی، فوٹوگرافی، اسٹیج کامن، اسکرپٹ رائٹنگ، صنعتی اعداد و شمار کی ترتیب، الیکٹرانکس، سنگیت وغیرہ وغیرہ پبلک ہیلتھ اور سوشیل ہائی جین کے نصابات شروع کرنے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ دیہی علاقوں میں واقع کالجوں میں پیشہ ورانہ تعلیم ایسی ہو جو آس پاس کے علاقوں کی ترقیاتی ضرورتوں سے جڑی ہو، گھریلو صنعتوں وغیرہ کی مدد سے پسماندہ علاقوں کی ترقی ممکن ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو ماہرین پر مشتمل ایسا گروپ تشکیل دینا چاہیے، جو نئے پیشہ ورانہ نصابات کے مستقبل کے امکانات کا جائزہ لے سکے۔ ملازمتوں اور چانس کے مختلف زمروں کی ضرورتوں کا پتا لگانے کے لیے اعلا سطح کی ایک تنظیم قائم کی جائے۔ ہر مرکز پر ٹریننگ کی ضرورتوں کے مطابق پروگرام تشکیل پانا چاہیے۔

یہ خیال عام ہے کہ تکنیکی تعلیم کو، خاص کر یونیورسٹی سطح کی تعلیم کی ضرورتوں کو پوری کرنے والی تعلیم ہونا چاہیے اور یہ ایسی ہو کہ اس کو حاصل کر کے کوئی نہ کوئی کام دھندہ شروع کیا جا سکے، آجرین کا عام خیال یہ ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم کتابی ہے اور اس سے عملی ہنرمندی نہیں حاصل کی جا سکی ہے، اس لیے یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ صنعتی مسائل کو حل کرنے میں خود کو ناکافی پاتے ہیں، طلبا تو کیا، استادوں کو عملی کام کا تجربہ نہیں ہوتا، اس لیے فیکٹریوں کے ماہرین ٹکنالوجی کا رابطہ یونیورسٹی کے استادوں اور پروفیسروں وغیرہ سے قائم ہونا ضروری ہے، یہ رابطہ قائم کرنا یونیورسٹی میں لازمی قرار دے دیا جائے، اس سلسلے میں کچھ ایسے اقدامات کی ضرورت ہوگی جو کہ نیچے بتائے گئے ہیں۔

(۱) استادوں کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ مشورے کے بعد کوئی کام شروع کریں۔

(۲) ایسے ماہرین ٹکنالوجی جن کی کارگزاری اچھی ہے، ان سے تعلیمی اداروں میں نگراں کا کام لیا جائے۔

(۳) صنعتوں میں کام کرنے والے انجینئروں کی ہمت افزائی کی جائے تاکہ وہ جزوی تعلیم حاصل کریں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ لے کر اعلا ڈگری حاصل کریں۔

(۴) یونیورسٹیوں اور تحقیقی لیباریٹریوں کے سائنس دانوں کو صنعتوں میں کام کرنے والے ماہرین ٹکنالوجی سے تبادلۂ خیال کرتے رہنا چاہیے۔ عمل درآمد کو آسان بنانے کے لیے قواعد و ضوابط میں ضروری رد و بدل بھی کر لینی چاہیے۔

یونیورسٹیوں کی ہمت افزائی کی جائے تاکہ وہ سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر رسمی تعلیم کو شروع کر سکیں، شام کو یا چھٹیوں کے دوران سائنس اور ٹکنالوجی کے نصابات شروع کیے جانے چاہئیں، اس سے مزید سرمایہ لگائے بغیر روزگار ملنے کے امکانات بڑھ جائیں گے اور اس سے کالجوں پر داخلہ کا دباؤ بھی کم ہو سکے گا اس سے خود روزگار کے سلسلے میں امیدواروں کی حوصلہ افزائی ہو سکے گی۔

تعلیم کا موجودہ نظام سخت گیر ضابطوں سے گھرا ہوا ہے۔ یونیورسٹی اور آئی ٹی آئی کی تعلیم کو لچک دار بنانا ضروری ہے۔ نصابات کے تعین اور نئے شعبوں اور کاموں کے امکانات کے بارے میں بھی لچک دار طریق عمل اپنانے کی ضرورت ہے۔

کالجوں کو تعلیمی مقاصد سے باخبر کرانا آسان کام نہیں، اس کے لیے اعلا انتظامی صلاحیت درکار ہے، اس کے ساتھ ہی سیاسی عزم اور چابک دستی کی بھی ضرورت ہے۔

صنعتی ترقی اور سائنسی و تکنیکی عملے کو کھپانے کے لیے دوسری بڑی ضرورت صنعتی ترقی کی شرح بڑھانے کی ہے۔ لیکن صنعتی ترقی کی شرح میں حال میں جو اتار چڑھاؤ دیکھنے کو ملا ہے اس کی بنیاد پر تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد کم کرنے کی بات خارج از امکان ہے۔ ہر طرح کے ارادے کے باوجود صنعتی ترقی کی شرح میں اب تک ۵ فی صد سے زیادہ اضافہ نہیں ہو سکا ہے، جب تک صنعتی ترقی کی شرح میں کم سے کم ۱۲ تا ۱۴ فی صد اضافہ نہ ہوگا، اس وقت تک ان کو روزگار دلانا مشکل ہے۔ صنعتی ترقی اور سائنس و ٹکنالوجی کے افراد کے روزگار کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ۱۲ تا ۱۴ فی صد شرح ترقی کے لیے بڑے پیمانے پر کوششیں درکار ہوں گی، مگر سرمایہ کاری کا موجودہ ڈھانچہ اس طرح کی ترقی کے امکانات نہیں بتاتا، اس کے لیے خصوصی اسکیموں کی ضرورت ہے اور خود روزگاری

کے لیے میدان کو وسیع کرنا ہوگا۔ ۱۹۹۰ء میں جو اقتصادی اور صنعتی پالیسیوں میں فراخ دلی کا جو عمل شروع کیا گیا، اس سے یہ دیکھنا باقی ہے کہ کیا ہم مطلوبہ شرح ترقی کا نشانہ حاصل کر سکیں گے۔ صنعتی ترقی کو بڑھانے کے لیے دو طرفہ انداز نظر درکار ہے، اس سے روزگار کے مواقع میں اضافہ ہوگا۔ یہ انداز نظر اس طرح پر ہے:۔ ایک طرف چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور دیہی صنعتوں کو بڑھانا ضروری ہے، دوسری طرف بنیادی اور بھاری صنعتوں کو آگے بڑھانا ہے۔

بے روزگاری دور کرنے کے لیے آمدنی بڑھانے اور معیشت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ ملک میں اقتصادی ترقی کے لیے بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لیے مختصر المدتی اور طویل المدتی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی گھریلو صنعتوں، دیہی صنعتوں اور زراعت پر مبنی صنعتوں کو بڑھانا ضروری ہے۔

ہمارا ملک ایک بڑا ملک ہے، یہاں کثیر آبادی ہے مگر وسائل قلیل ہیں، بلاشبہ یہاں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں، خود روزگاری اسکیموں اور کھادی گرام ادیوگوں، شہد کی مکھیوں کے پالنے، مٹی کے برتنوں کو بنانے، دھات کی دست کاریوں کی بڑی گنجائش ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بنیادی اور بھاری صنعتوں میں سرمایہ کاری کی ضرورت سے صرف نظر کر لیا جائے کیوں کہ ان کے بغیر اقتصادی اور مادی ترقی کا عمل تسلسل کے ساتھ جاری نہیں رکھا جا سکتا، دوسرے اگر ہم صرف ایسی ٹکنالوجی پر اکتفا کریں جہاں محنت کش طبقے کو کھپایا جا سکے، تو بھی یہ ایک عارضی عمل ثابت ہوگا، اس طرح کی ٹکنالوجی بہت زیادہ دلکش بھی نہیں کہی جا سکتی اور اس سے فی کارکن کام کی مقدار میں اضافہ اتنا مختصر ہوگا کہ سرمایہ لگانے کے عوض ملنے والے فائدے بہت کم ہوں گے اور اس وجہ سے کمانے والے کی آمدنی بھی مختصر رہے گی، اس لیے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور بھاری صنعتوں دونوں کو متوازن انداز میں ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔

تربیت

چوں کہ کسی بھی تبدیلی کا مقصد نوع انسانی کو فائدہ پہنچانا ہے، اس لیے تربیتی پروگرام، نیز تجدیدی پروگرام، نیز صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے پروگرام اور ایسے پروگرام بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن سے ذہن کو جلا ملے۔ اس کے ساتھ ہی انتظامی صلاحیت بڑھے۔ چناں چہ پلانٹ پر کام کرتے ہوئے تربیت، ہنرمند انسانی فروغ کے نقطہ نظر سے بہت بلند ہے، اس سے قومی سطح پر مقابلہ کی سکت کو بڑھاوا ملتا ہے، اس پروگرام کو آئی پی ٹی یعنی اِن پلانٹ تربیتی پروگرام کے نام سے پکارا جاتا ہے، اس کے ذریعے درج ذیل مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔

——— نئے ملازمین کو لینا اور ان کو تجدیدی نصاب میں تربیت دینا۔

——— ابتائی تصورات اور اعداد و شمار اور علم کو تازہ کرنا اور ان میں نئے اضافے کرنا۔

——— موجودہ عملے سے نئی ذمہ داریوں کو انجام دلوانا اور ان کو عصر حاضر کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنا۔

——— تربیتی پروگرام کے ذریعے سے اعلاترین تکنیکی جانشین سنبھالنا اور اعلا درجے کے منصب کی ذمہ داریوں کو سنبھالنا۔

——— منصوبہ بندی، نگرانی کے لیے فطری ذہن رکھنے والوں کو تلاش کرنا اور ملازمین میں کام کی بجاآوری کی ذمہ داری کا احساس کرانا۔

اس طرح کی تربیت سے ملازمین کی ترقی کے امکانات روشن ہوں گے، ہندوستان میں سرکار کی طرف سے اِن پلانٹ ٹریننگ کی کوئی سہولت نہیں دی جاتی، البتہ بالواسطہ طور پر ایسی تربیت کی ترغیب ضرور دی جاتی ہے، سرکار کی نئی اقتصادی پالیسی کے سبب صنعتی اداروں کو بین اقوامی سطح پر زیادہ مقابلہ کرنا پڑے گا، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ صنعتی ادارے اپنی پیداواری صلاحیت بڑھائیں اور اپنے مال کی لاگت کو کم کریں، اس وجہ سے اِن پلانٹ ٹریننگ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

ہندوستان میں بہت سے بڑے کارخانے، خواہ مال کی تیاری سے متعلق ہوں یا خدمات فراہم کرنے والے ہوں، تربیتی سہولتوں کا بنیادی ڈھانچہ رکھتے ہیں، البتہ اس کام میں وسائل کی قلت مانع نہیں ہونی چاہیے۔

ہندوستان میں پیشہ ورانہ تربیت کے سلسلے میں کوئی ایسی دستاویز بطور پالیسی نہیں ہے جس میں ہنرمند افرادی قوت کے لیے سرکاری حکمت عملی کی وضاحت ہو، نئی اقتصادی پالیسی کے تحت محنت کش طبقے کی تعداد کم کرنا ہے اور ان اداروں نے رضاکارانہ طور پر ریٹائر ہونے کے لیے تربیتی اسکیمیں مرتب کرنی شروع کر دی ہیں۔

سرکار نے قومی تجدیدی فنڈ کے نام سے ایک اسکیم شروع کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ رضاکارانہ طور پر ریٹائر ہونے والوں کی بحالی عمل میں آ سکے، ابھی تک اس رقم سے اس طرح کے کسی فرد کو تربیت نہیں دی گئی ہے جس سے کہ وہ دوسرے کسی کام میں خود کو کھپا سکیں، ٹکنالوجی کا از سر نو جائزہ لینے کے کاموں کے درمیان آپسی تال میل نہیں، تربیتی سرگرمیوں کی بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کے ذمہ داروں اور ٹکنالوجی کی منتقلی اور جائزہ کے ذمہ دار محکموں کے درمیان آپسی تعاون اور تال میل نہیں ہے، تربیت کی سرمایہ کاری کی اسکیمیں بالعموم محنت کش طبقے کی منڈی کے اثرات کے تحت تشکیل پاتی ہیں اور ان اسکیموں کے لیے ناکافی رقومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس طرح کے کارخانے خاص کر چھوٹے کارخانے، جدید ترین ساماں سے محروم ہوتے ہیں۔ ان مطالعوں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ چھوٹے کارخانے ہنرمند افرادی قوت دیگر وسائل پر زیادہ انحصار کرتے ہیں اور دیگر تنظیموں سے ہنرمند عملہ لیتے ہیں، اس لیے بھی اِن پلانٹ تربیت کی اہمیت کم رہ جاتی ہے۔ بہت سے کارخانے غیر ہنرمند عملہ کو بھرتی کر لیتے ہیں اور اس لیے وہ بھی اِن پلانٹ ٹریننگ کو اہمیت نہیں دیتے، اس کی اہمیت اس بات سے بھی کم ہو جاتی ہے کہ نفع خاطر خواہ نہیں ہوتا اور کارخانے کو وسائل کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تربیتی سہولتوں میں ایک اور دشواری یہ ہے کہ اس محاذ پر جو مشین لگائی جاتی ہے، وہ کمتر درجے کی ہوتی ہے اور تربیت کی غرض سے نئی اور جدید مشینوں کو دینا مہنگا پڑتا ہے۔ بالعموم

بڑے کارخانوں کے پاس بہتر قسم کا تربیتی نظام اور سہولتیں موجود ہیں، جو کہ چھوٹے کارخانوں کے پاس نہیں، اس راستہ میں بھی وسائل کی قلت مانع ہوتی ہے۔

ہندوستان کے حالات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ کارخانوں کو ٹریننگ فیکلٹی کے انتخاب پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ عام رواج یہ ہے کہ تربیت کا روایتی نظام ہی چلتا رہتا ہے، جو لوگ لائن جاب کے لیے غیر موزوں ہوتے ہیں، ان کو اس طرح کی ان پلانٹ ٹریننگ کے لیے چن لیا جاتا ہے۔ لائن جاب کے لیے آدمی کو زیادہ چاق و چوبند ہونا پڑتا ہے اور چیلنجوں سے نبرد آزمائی کی صلاحیت درکار ہے۔

مزید سرمایہ کاری سے روزگار کے مواقع نکالنے کے ضمن میں کچھ اور متبادل طریقے یہ ہیں۔

ہندی نژاد، غیر ممالک میں مقیم ہیں، یہ لوگ ہندوستانی کمپنیوں کے شیئرز میں سرمایہ کاری کرتے ہیں اور زر مبادلہ کا منافع باہر ملک میں نہیں نکالا جانا چاہیے، اس سرمایہ کاری کو قوم کے وسیع تر مفاد میں سمجھنا چاہیے اور اس سے ہندوستان میں اقتصادی فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں۔

غیر ملکوں میں ایسے ہندوستانیوں کو اب بصیرت حاصل ہے کہ وہ نئی اور مستقبل ٹکنالوجی میں سرمایہ کاری کریں۔ وہ جدید ترین ٹکنالوجی ہندوستان میں بھیج سکتے ہیں جس سے ہندوستان میں ٹکنالوجی کی کمی کو دور کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں نظام تعلیم کو یہاں کی ضرورت کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے نیز چھوٹے پیمانے کی اور بڑی صنعتوں میں سرمایہ کاری کو بڑھانی چاہیے۔ جس طرح زراعت میں توسیعی سروسز شروع کی گئی ہیں اسی طرح بڑے پیمانے کے صنعتی اداروں میں بھی توسیعی خدمات کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ صنعتی کارخانوں اور تعلیمی اداروں کے درمیان رابطہ قائم رہنا ضروری ہے۔ ان توسیعی خدمات کی وجہ سے سائنس اور ٹکنالوجی کے عملے کے بہت سے لوگوں کو کھپایا جا سکے گا، تعلیمی اداروں میں اور صنعتی اداروں میں تحقیق و ترقی کے پروگرام شروع کیے جانے چاہئیں، مختلف سائنس داں اور ماہرین کی لیبارٹری تحقیق میں ان کو توں کی نشاندہی کرے

کریں گے جو ملک کو درکار ہیں۔

ہندوستان میں ایک اندازے کے مطابق سائنس اور ٹکنالوجی کے بے روزگار افراد کی تعداد ۴ لاکھ کے آس پاس ہے۔ ان کے لیے روزگار کی فراہمی ایک مشکل کام ہے۔ اس میں ہر سال اور اضافہ ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ ہر ریاست میں دستیاب مواقع کے سلسلے میں ایک فہرست مرتب کر لی جائے، ان کی درج ذیل طریقے پر زمرہ بندی کی جائے۔

۱۔ اراضی اور آبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے درکار عملہ مثلاً زراعت، باغبانی، مویشی پروری، مچھلی پالن، جنگل بانی وغیرہ۔

۲۔ چھوٹے اور متوسط اور بڑے پیمانے کی صنعتوں میں کھپایا جانے والا عملہ اور اسی طرح کے دیگر شعبے جن کا تعلق کسی زمینی و زرعی پیشے سے نہ ہو۔

دیگر معاون شعبوں کی خدمات

اب تک ملک میں کہیں بھی اس طرح کی کوئی کوشش نہیں کی جا سکی ہے۔ اس مسئلے کا کوئی عارضی یا عبوری حل ناکافی رہے گا، اس کے لیے ایک جامع انداز نظر درکار ہے۔

۱۔ بے روزگار سائنس و ٹکنالوجی عملہ کی فہرست مرتب کی جائے، ہر امیدوار کی تعلیمی صلاحیت اور پیشہ ورانہ پس منظر بھی اس کے نام کے ساتھ ہو۔

۲۔ مناسب ماہرین کی مدد سے ایسی جابس کا پتا لگایا جائے جو خود روزگاری اسکیم کے تحت پیدا کی جا سکیں یا جہاں ان افراد کو تنخواہ والے عملے کی صورت میں ملازمت دلائی جا سکے، اس کام کے لیے قومی اور علاقائی ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے، اس میں سرکاری اور نجی سیکٹر کے افراد ہوں نیز بینک اور ترقیاتی اداروں کے نمائندے بھی ہوں۔

۳۔ ایسا طریق کار بنایا جائے جس سے تمام مطلوبہ جگہوں کو جلد سے جلد پُر کیا جا سکے، اس طرح کے اسامیوں کے لیے درکار کوالیفائڈ عملے کو جلد سے جلد تربیت دی جائے۔ امیدواروں کو غیر موزوں بتا کر ان کو موزوں بنانے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں۔

۴۔ سروے آف انڈیا، جیولاجیکل سروے آف انڈیا، زولاجیکل سروے، بوٹانیکل سروے، مٹی کے سروے، جنگلاتی سروے، ماہی گیری کے سروے کے ذریعے سے ان گوشوں کی نشاندہی کی جائے جن کو فروغ دیا جا سکتا ہو اور جہاں دستیاب وسائل سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھایا گیا ہو، اس کوشش کو اس مقصد کے تحت انجام دیا جائے کہ لوگوں کو نفع بخش روزگار مل سکے۔

۵۔ ہندوستان کے صنعتی ترقیاتی بینک، زرعی مالیات اور ترقی کی کارپوریشن، اسٹیٹ بینک آف انڈیا وغیرہ مالیاتی اداروں کو اس بارے میں واقف معلومات ہیں کہ زرعی اور صنعتی سیکٹر میں کہاں کہاں سرمایہ کاری کی جا سکتی ہے، ان کی معلومات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور مناسب اور موزوں پروجیکٹ شروع کیے جا سکتے ہیں۔

ہندوستان میں ۵ ہزار اجتماعی ترقی کے بلاک ہیں، ان کو ایسے صنعتی کمپلیکسوں میں بدل دینا چاہیے جہاں زرعی خام مال کی بنیاد پر مصنوعات کو فروغ دیا جا سکے، اس طرح سائنسی معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روزگار کے مواقع سامنے آ سکتے ہیں۔

ان تجربات اور معلومات کو سامنے رکھ کر سائنسی و تکنیکی عملے کی نیشنل ریسورس کا رپورٹس بنائی جا سکتی ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ سائنس دانوں کا پُول سائنسی و صنعتی تحقیق کی کونسل (سی ایس آئی آر) نے تیار کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ کسی بھی نئے یا پرانے پروجیکٹ کے لیے درکار موزوں عملہ دستیاب رہے، ان کو خود روزگاری اسکیموں کے تحت بھی تربیت دے کر آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

خلاصہ

ہندوستان میں سائنسی و تکنیکی عملے کی بہتات ہے، ملک کی غریبی دور کرنے میں اس سے مدد لی جا سکتی ہے اور تعلیمی نظام کو درست کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں تیار کیے جانے والے مال میں اعلا ٹکنالوجی کا عنصر کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے اور اعلا ٹکنالوجی کے حامل آئٹموں کی برآمدات بھی کم ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے سائنسی و تکنیکی عملے سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ ہندوستان میں بے روزگاری کا مسئلہ ابھی کافی دنوں تک چلے گا، آبادی میں اضافے کی روک تھام یا تعلیمی نظام کی ردوبدل سے بھی اس کا فوری حل ممکن نہیں۔ بے روزگاری کی تعداد میں ابھی

ملاحظہ صفحہ ۱۹ پر

پی۔ ایس۔ سندرم

الیکٹرانک میڈیا مستقبل کا منظر نامہ

نشر کاری کسی ملک کے خانگی ابلاغ و ترسیل کے بنیادی ڈھانچہ کا تمام دنیا میں پبلک اور پرائیویٹ ہر دو طرف سے بھاری سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ نشر کاری عمومی پیغام رسانی کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اس کے اشارے ہمہ گیر اور انتقال پذیر ہیں جن کو تار یا ریشہ تکنیک کی حاجت نہیں ہوتی۔ نشر کاری سے خریداروں کو مفت پیغام فراہم ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ منتخب طور پر استعمال کرنے والوں کو خطاب بھی کیا جا سکتا ہے۔

نشر کاری کی ریڈیائی ترسیل جس کی شروعات ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ہوئی اس میں گزشتہ دہائی میں زیادہ تر ہندسی تکنیک اور کمپیوٹر کی وجہ سے بہت سی نئی ترقیاں ہوئی ہیں۔ آج سگنل دینے اور ارتعاشی طیف کو بہتر طور سے استعمال کرنے کے لیے نئی ترقیوں پر زور دیا جا رہا ہے۔ تاہم استعمال کنندگان کی دلچسپیوں کے تحفظ کے لیے نشر کاروں کو ان کے وقت سے پیچھے چلنے، میلان کو برقرار رکھنے کا سامان کرنا پڑ رہا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابھرتی ہوئی میڈیا تکنالوجی پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے ملک میں آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن اور ٹی وی نشرگاہوں کے سلسلوں کی ترقیات کا ایک عام اندازہ کر لیا جائے۔

پہلے پنج سالہ منصوبے کے آغاز سے آل انڈیا ریڈیو نے مسلسل بتدریج فروغ کا مظاہرہ کیا ہے۔ آج اس کے نیٹ ورک میں ۱۷۵ نشری مراکز ہیں جو ۱۶۸ مکمل طور پر آراستہ نشرگاہوں، ۳۔ ریلے مرکزوں، ایک معاون مرکز اور تین خصوصی وِوِدھ بھارتی تجارتی مرکزوں پر مشتمل ہیں، جو ۸۹ء۷ فی صد آبادی کو ریڈیو نشریات فراہم کرتے ہیں۔ اس نظام میں 146MW، 49SW اور 85FM ٹرانسمیٹر ہیں۔

FM ریڈیو پیجنگ سروس کی شروعات جس میں پہلے ہی مرحلہ میں 17FM ٹرانسمیٹر استعمال ہو رہے ہیں۔ ایک بہت بڑی حالیہ ترقی ہے جس نے آل انڈیا ریڈیو کو ڈیٹا نشر کاری کے نئے دور میں داخل کر دیا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے اسکائی ریڈیو سروس کا آغاز ایک اور اہم قدم ہے جس نے ہندوستان کی کثیر لسانی آبادی کے لیے ملک کے کسی بھی گوشے میں اپنی زبان میں ریڈیو پروگرام حاصل کرنے کی سہولیات کا راستہ کھول دیا ہے۔

دوردرشن

ملک کے ٹی وی نشر کاری سلسلوں میں بھی اس دوران امید افزا ترقی کا اظہار ہوا ہے۔ فی الوقت اس سلسلے میں مختلف حجم رکھنے والی ۶۹۶ ترسیلی نشرگاہیں اور ۳۲ پروگرام پروڈکشن مراکز ہیں اس کے سگنل ہندوستان کے ۷۶ء۱۸ فی صد رقبہ کا احاطہ کرتے ہیں۔

۶۹۶ ترسیلی نشرگاہوں میں ۶۷ ٹرانسمیٹر پرائمری چینل ۲۴ ڈی۔ ڈی میٹرو چینل اور ۲ پارلیمانی کارروائیوں کو نشر کرتے ہیں۔ پرائمری چینل کو نشر کرنے والے ۶۷۰ ٹرانسمیٹروں کو اس طرح تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔	ہائی پاور ٹرانسمیٹرز	۷۴
۲۔	لو پاور ٹرانسمیٹرز	۴۷۶
۳۔	زیادہ لو پاور ٹرانسمیٹر	۱
۴۔	ٹرانسپونڈرز	۲

میٹرو ڈی۔ ڈی ۲ کے پروگراموں کی برتری ترسیل کے لیے ۳۴ ٹرانسمیٹر جن میں ۶ ہائی پاور ٹرانسمیٹر بھی شامل ہیں بڑے شہروں میں کام کر رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ۱۳ اسٹیلائٹ چینل بھی شروع کیے گئے ہیں۔ یہ پرائمری چینل، میٹرو چینل اور ۱۱ علاقائی لسانی چینل ہیں۔ ایک بین اقوامی چینل بھی شروع کیا گیا ہے۔ اس کے مستقبل کے منصوبوں میں ہندسی دباؤ تکنالوجی استعمال کرنے والے واحد ٹرانسپونڈر کے ذریعہ ۵ اور پروگراموں کی ترسیل بھی شامل ہے۔

ریڈیو :

پچھلی تین دہائیوں میں ریڈیو اور ٹی وی نشر کاری کی پروڈکشن اور اس کے بعد کے تکنیکی میدانوں میں بہت سی ترقیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں پروڈکشن اور اس کے بعد کے میدان میں بعض آلات کے ساتھ کمپیوٹر اور مائکرو کمپیوٹر دونوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہونے لگا۔ سمعی اور بصری مقناطیسی ریکارڈنگ کی تکنیکوں نے نشریاتی پروگراموں کی تخلیق میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اس دہائی میں پروگراموں

کی پیشکش کے طریقوں پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی دونوں میں نئی ٹرانسمیشن ٹکنالوجی کی کوشش جاری ہے اور کچھ کو تو نشر کاروں نے نافذ بھی کر دیا ہے۔ چوں کہ سگنل وصول کرنے والے آلات ترسیلی معیاروں کے مطابق ہونے ضروری ہوتے ہیں اس لیے ان کا صارفین پر بلاواسطہ اثر پڑتا ہے۔ تجربہ گاہوں میں فروغ یافتہ بہت سی ترسیلی تکنیکیں زیادہ تر قوامی معیار بندی کی کمی کی وجہ سے کامیاب ہوئی ہیں۔ تین نئی ٹکنالوجیاں جو آنے والے برسوں میں FM سیٹ ورک سے نافذ کی جا سکتی ہیں یہ ہیں۔ AM اسٹیریو، ڈیجیٹل آڈیو براڈ کاسٹنگ اور ڈیٹا براڈ کاسٹنگ سروس۔

AM اسٹیریو

اسٹیریو آڈیو سسٹم کو نشر کرنے کے لیے اضافی سرمایہ کاری کیے بغیر کم سے کم ترمیمات کے ساتھ AM نشریاتی ٹرانسمیٹروں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ USA اور جاپان میں AM اسٹیریو ٹرانسمیشن کو بہت سے نشر کاروں نے بڑے جوش و خروش سے پسند کیا ہے

MOTOROLA CQUAM کو ایس اے اور جاپان کا اختیار کردہ اصل معیار ہے۔ مولو سگنل L+R اور اسٹیریو سگنل L-R کو دو ایسے متوازن موڈیولیٹروں سے تبدیل کیا جاتا ہے جن کے سگنلوں کی ہیئت (فیز) QUADRATURE RF میں 90° کا فرق ہوتا ہے۔ سگنل میں سے ناموافق اجزا کو الگ کرنے کے بعد حاصل شدہ سگنل کو بڑھا کر نشریاتی ٹرانسمیٹروں کو بھیج دیا جاتا ہے اس طرح AM رسیوروں کے ساتھ مطابقت برقرار رہتی ہے اور عمدہ اسٹیریو کوالٹی بھی فراہم ہو جاتی ہے۔

جن نشر کار ٹرانسمیٹروں نے AM اسٹیریو ٹرانسمیشن تکنیک کو اختیار کیا ہے۔ پوری دنیا میں ان کی تعداد ۷۰۰ سے بھی زیادہ ہے۔ جیسے جیسے دنیا بھر کی AM نشر گاہیں AM اسٹیریو نشر گاہوں میں تبدیل ہوں گی۔ قیمتوں میں کمی آ جائے گی اور AM نشریات کو ایک نئی زندگی مل جائے گی۔

ریڈیائی نشریات میں ڈیجیٹل آڈیو نشریات ایک نیا تصور ہے جس پر ترقی یافتہ ممالک میں تجربات ہو رہے ہیں اور اس اسکیم کی ریسرچ اور ترقی اور موافق رسیوروں کے فروغ پر بھاری سرمایہ کاری کی گئی ہے سیٹلائٹ اور بری ٹرانسمیٹروں کے ذریعہ ڈیجیٹل آڈیو نشر کاری سے بہت سے CD کوالٹی آڈیو پروگراموں کی نشر و اشاعت کی جا سکتی ہے۔ آڈیو کو ڈیجیٹل بنا کر جدید ڈیٹا کمپریشن تکنیکوں کے بعد کیے جانے والے تجربات سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس کے ذریعہ بہتر طیفی صلاحیت رکھنے والی عمدہ کارکردگی موبائل رسیوروں تک کو ممکن ہے۔ DAB کے لیے استعمال ہونے والی تکنیکوں سے زیادہ قابل اعتماد کوالٹی کی نشری وصولیابی مہیا ہو جائے گی۔

ورلڈ ایڈمنسٹریٹو کانفرنس منعقدہ ۱۹۹۲ء نے ممالک کے لیے ڈیجیٹل آڈیو نشریات کے ارتعاشی طیف (فریکوئنسی اسپکٹرم) متعین کر دیے ہیں۔ یہ تعینات وائڈ بینڈ کے لیے 40 MHz (1452 1492 GHz) عالم گیر نشریات کے لیے GHz اور 2310 GHz سے 2360 اور 2535 GHz سے ۲٫۶۵۵ ہیں۔ بلاواسطہ مانگی ہائی فائی کوالٹی پروگراموں کی کثیر چینلی نشریات کے سلسلہ میں DAB ایک مثالی حل پیش کرتا ہے۔ مثلاً 7 MHz RF بینڈ کے استعمال سے ۳۳ آڈیو یک صوتی (مونو فونک) چینلوں، چینل/سیکنڈ 128 KBITS یا ۱۶ اسٹیریو فونک جوڑوں اور ایک ڈیٹا چینل کو نشر کرنا ممکن ہے۔ کثیر لسانی ممالک کے لیے DAB ایک مثالی حل ہے اور ملک کے گوشے گوشے تک اس کی رسائی ہو جائے گی نیز اس پر اپنی اپنی پسند کے پروگرام سے جا سکیں گے۔

اگرچہ زیر تکمیل رسیور دیگر الیکٹرونک پروڈکٹ کی طرح بہت مہنگے ہیں (۲۰۰ تا ۵۰۰ امریکی ڈالر) توقع کی جاتی ہے کہ مستقبل میں ارزاں ہو جائیں گے۔

ریڈیو ڈیٹا سسٹم (RDS)

ریڈیو سے ڈیٹا نشر کاری:

CCIR اور EBU کی معیار بند ریڈیو نشر کاری گزشتہ کئی برسوں سے بہت سے ملکوں میں کثرت سے استعمال ہو رہی ہے۔ ریڈیو ڈیٹا سسٹم (RDS) یا ریڈیو براڈ کاسٹ سسٹم (RBDS) ایک معیار ہے جو واضح کرتا ہے کہ FM نشر گاہ 57 KHZ سب کیریئر استعمال کر کے کس طرح ڈیٹا نشر کر سکتا ہے RDS کے بہت سے زبردست فائدے ہیں جیسے نشر گاہوں کا رسیور ڈسپلے، پروگرام ٹائپ، پروگرام سروس، ہنگامی انتباہ وغیرہ لیکن فی الوقت پیجنگ سروس سے نشر کاروں کو اچھے آثار فراہم ہوئے ہیں۔ پیجنگ کا مطلب سرگرم عمل شخص کو چوکنا کرنا ہے۔ ۱۴۔ اعداد تک کے کوڈ پیغام یا اعداد و حروف کے پیغام جو ۸۰ حروف فی پیغام سے متجاوز نہ ہوں، RDS کی پروگرام ترتیب سے خریداروں کو ترسیل کیے جا سکتے ہیں۔ ٹرانسمیٹروں کے ایک سلسلہ (نیٹ ورک) سے ایک ملیں خریداروں کو مخاطب کیا جا سکتا ہے ملک گیر سروس کے لیے USA یورپ کے بہت سے ممالک چین اور ہندوستان RDS کو پہلے ہی نافذ کر چکے ہیں۔ FM "بیس بینڈ" 76 KHz پر حرکت پذیر استعمال کے لیے ۱۶ سے ۱۹ کلو بٹس (BITS) فی سیکنڈ کی بٹ ریٹ پر ہائی ڈیٹا ریٹ نشر کاری کے لیے استحکام کے لیے تجربات پہلے سے ہو رہے ہیں ایسی سروس ٹریفک معلومات، اسٹاک مارکیٹ معلومات، حروں موسم کی پیش گوئی ڈاؤن گائیڈ مع ڈرائنگ وغیرہ کے لیے مفید ہے۔ یہ کار ڈیٹا سروسوں کا اس طریقہ سے نشر کار ٹرانسمیٹروں کے ترسیلی عمل سے بہت کفایت سے بیش قیمت معلومات مہیا کی جا سکتی ہے۔ متحرک نشری وصولیابی امکان جس میں قوی غلطی سدھار کوڈ جڑا ہوا ہو، وائرڈ ڈیٹا سروس کے مقابلے میں زیادہ کشش رکھتا ہے۔

ٹی وی۔ سے ڈیٹا نشر کاری

ٹی وی میں تیز رفتاری سے نشر کاری کا عمل آج کی حقیقت ہے۔ مختلف ممالک میں ہونے والے حالیہ مظاہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱٫۵ میگا بٹ فی سیکنڈ تک کی رفتار پر ویڈیو اور آڈیو سگنل کی کوالٹی کو متاثر کیے بغیر ڈیٹا کی ترسیل ممکن ہے۔ توقع کی

جاتی ہے کہ اس ڈیٹا نشر کاری کی معیار بندی جلدی تکمیل تک پہنچ جائے گی۔

انفارمیشن بوتھ:

ڈیٹا نشر کاری کا ایک اہم ضمنی استعمال پبلک کے استعمال کے لیے معلومات چوکیاں قائم کرنا ہے۔ یہ چوکیاں ڈیٹا کی کلید اور ڈسپلے سسٹم سے لیس ہوں گی اور اسکر یا کارڈ سے چلائی جا سکیں گی۔ استعمال کرنے والا ترسیل شدہ ڈیٹا اسنار (اسٹریم) میں سے اپنے پسند کی معلومات یا ڈیٹا حاصل کر سکتا ہے۔ اس سسٹم میں بہت زیادہ مشترک نقطۂ اتصال موجود ہوگا۔ نشر کار نیٹ ورک کی طرف سے باقاعدہ وقفوں کے بعد ڈیٹا کی تجدید کی جا سکتی ہے۔ اس سروس سے نشر کاروں کے لیے آمدنی کا ایک نیا سلسلہ پیدا ہو جائے گا۔

ٹی وی نشر کاری۔ نئی تکنالوجی۔

ٹی وی نشر کاری کے میدان میں پچھلی دہائی میں بہت سی نئی تکنالوجیاں داخل ہوگئی ہیں ان میں ہندسی ویڈیو براڈ (DVC) ہائی ڈیفینیشن ٹیلی ویژن (HDTV) اور اینہانسڈ ڈیفینیشن ٹیلی ویژن (FDTV) سب سے زیادہ اہم ہیں۔ تاہم ان میں سے کچھ تکنالوجیاں پبلک کی کم دلچسپی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی ہیں ان میں سے کچھ کا ذکر آنے والے عنوانات میں کیا گیا ہے۔

ڈیجیٹل ویڈیو کمپریشن:

اس صنعت کی توجہ کمپریشن کو استعمال کر کے روایتی مثیل (انالوگ) سسٹم سے مکمل طور پر ڈیجیٹل سسٹم کی طرف حرکت کرنا ہے۔ کمپریشن کا مقصد یہ ہے کہ موجود چینلوں میں سے ایک فالتو چینل کا اضافہ کر کے ترسیل کی فی چینل لاگت کو ڈرامائی طور پر گھٹا دیا جائے۔ اس تکنالوجی کے ذریعے ہندسیایا ہوا ویڈیو بٹ ریٹ اصل ریٹ کے ۳۴ فی صد تک لایا جا سکتا ہے فاضل معلومات کو ہٹا کر ویڈیو ذرائع کی پیش گوئیاں فطرت اور انسانی نگاہ کی نفسی بصری خصوصیات کے استعمال سے اہم معلومات کو موثر طریقے سے کوڈ کر کے اس مقصد کا حصول ہوتا ہے۔

ڈیجیٹل ویڈیو کمپریشن پروسس میں استعمال ہونے والی بنیادی الگورزم کو کوسائن کمپینسیٹڈ ڈسکریٹ کوزین ٹرانسفارم کوڈنگ DCT کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

ایک انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ آرگنائزیشن کمیٹی (ISO) جیسے موونگ پکچرز ایکسپرٹس گروپ (MPEG) کا نام دیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں تشکیل دی گئی جس کا مقصد ویڈیو اور آڈیو دونوں کے لیے بین اقوامی ڈیجیٹل کمپریشن اسٹینڈرڈ کی منزل حاصل کرنے میں مدد دینا تھا۔ MPEG نے متحرک تصویروں اور وابستہ آڈیو کو ڈیجیٹل اسٹوریج میڈیا کے ساتھ استعمال کی کوڈنگ کے لیے ۱۹۹۰ء میں پہلی بار تجویز کیا۔ بعد ازاں MPEG 2 کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا مقصد اس کمپریشن معیار کو فروغ دینا تھا جو شروع کے MPEG-1 کمپریشن مواد اور الٹے مطابقت (BACKWARD COMPATIBILITY) کے لیے خصوصی طور پر موثر ہو۔

MPEG-2 کے معیار میں بڑی تعداد میں کمپریسڈ ویڈیو سگنلوں کے ساتھ ان سے جڑے ہوئے کمپریسڈ آڈیو سگنلوں اور دیگر استعمال کنندہ واضح ڈیٹا کو ایک ہی اسٹریم میں نشر کرنے کی گنجائش ہے۔ ان تمام ترقیات کے نتیجے میں کثیر چینلی ویڈیو نشر کاری جس میں سیٹلائٹ اور بری دونوں نشر کاریاں شامل ہیں بہت سے سسٹم ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

MPEG پر مبنی ہندسی ویڈیو ترسیل نظام دنیا کے مختلف حصوں میں ابھی ترقی مراحل میں ہے جنرل انسٹرومنٹس سائنٹی فک اٹلانٹا C11 اینٹی فک اٹلانٹا NTL-TVCOM جیسے دوسرے بہت سے صنعت کار اس دوڑ میں شامل ہو گئے ہیں۔

ویڈیو کمپریشن تکنالوجی میں اس دہائی کی سب سے بڑی اہم ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ مستقبل کے ہندسی ٹی وی۔ نشر کاری نظام میں کافی لچک کی توقع کی جاتی ہے۔ ایک ہی چینل کو HDTV سروس دو توسیعی ڈیفینیشن سروسوں یا کئی اسٹینڈرڈ ڈیفینیشن سروسوں یا مجموعی طور پر سب کے لیے باری باری استعمال کیا جا سکتا ہے۔

صارف کے نقطۂ نظر سے اس تکنالوجی میں ہر دل عزیزی کی حیرت انگیز صلاحیتیں پائی جاتی ہیں چوں کہ ناظرین کو اس سے کثیر چینلوں کے استعمال کا موقع ملتا ہے۔ مزید برآں موصولہ تصاویر میں ہندسی ترسیل کے ساتھ ساتھ فطری کوالٹی بڑھوتری کے موجود ہوگی۔

اینہانسڈ ڈیفینیشن ٹی وی HDTV (FDTV)

۱۹۶۰ء کی دہائی میں رنگین ٹی وی کی شروعات ٹی وی نشر کاری کے فروغ میں ایک نہایت اہم قدم ہے جس کی پبلک میں فوری پذیرائی ہوئی۔ سیاہ سے سفید اور رنگین تصویروں میں تبدیلی کا فطری کوالٹی سدھار اس قدر کشش رکھتا تھا کہ ناظرین مہنگے داموں پر رنگین ٹی وی خریدنے پر فوری طور پر راغب ہو گئے۔ تاہم اس وقت کے مونوکروم ٹیلی ویژن سسٹم سے مطابقت کی ضرورت نے سسٹم کا ڈیزائن بنانے والوں کو بڑی حد تک پابند کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ رنگین ٹی وی بہت سے نقائص اور خامیوں سے پُر ہے۔

سٹیلائٹ کے ذریعہ بلاواسطہ (DBS) نشر کاری کے تصور کی آمد نے نشر کاروں کو ایک نادر موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ ٹی وی سگنل کی تعمیر کے انداز و نوعیت پر غور کریں چوں کہ دیکھنے والے کو ہر حالت میں فالتو آلے کی ضرورت ہوگی خواہ وہ رواں قفلی کی صورت میں ہو یا خصوصی ریسیور کی صورت میں۔ ان وجوہ سے DBS معروف ملٹی پلیکسڈ انالوگ کمپوننٹ پیکٹ سسٹم (MAC) ترسیل کے لیے ٹی وی سگنلوں کی نئی کوڈ سازی کو فروغ ہوا MAC پیکٹ سسٹم ہندسی ڈیٹا اور انالوگ ورژن کا مشترک حامل ہے۔ ڈیٹا وسائل سے کئی ہائی کوالٹی چینلوں اور متعدد ڈیٹا سروسوں کی فراہمی آسان ہو جاتی ہے۔

MAC اسلوب پیکٹ سسٹم ایک ایسا لچکدار سسٹم ہے جس سے ۴:۳ یا ۱۶:۹ کی تصویر پہلوی نسبت فراہم کی جا سکتی ہے۔ یورپ میں DBS ترسیل کے لیے FBU کے جیسے ہوئے MAC کے خاص تغیر (ویری اینٹس) D2MAC کے ریسیوروں میں عام مظاہر سے ہوتے ہیں۔ تاہم اس سے صارفین میں نئے ریسیور خریدنے کے لیے کوئی خاص دلچسپی پیدا نہ ہو سکی اور وہ بھی صرف ان کے مہنگے ہونے کی وجہ سے۔

تاہم ان تکنالوجیوں کے سلسلے میں صارفین کے رد عمل سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ کسی بھی عام مارکیٹ پیداوار کے لیے قیمت کا احساس

ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔

صارف برقیاتی پروڈکٹ کے پہلی بار سامنے آنے کے عمل میں بین اقوامی معیار بندی ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ واحد عالم گیر معیار کے فوائد کے باوجود HDTV کے لیے عالم گیر پروڈکشن معیار پر تا حال کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح ایڈوانسڈ ٹی۔ وی (AT) سسٹموں کے بارے میں بھی تذبذب کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ یکساں بین اقوامی معیار رول تک رسائی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے امکانی طور پر عوام کی پسند اور قبولیت میں رکاوٹ پیدا ہوگی جیسا کہ صارف برقیاتی مظاہروں کے تجربوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ معیار سے متعلق بے یقینی کی وجہ سے پروڈکٹ کی طلب دب جاتی ہے۔

نشر کاروں میں اس عمل پر کامل اتفاق ہے کہ بالآخر ٹی۔ وی کا طویل مستقل ہندسی نظام ہی بہتر ہے۔

مضمون کے پچھلے حصوں میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ہندسی دباؤ اور غلطی سدھار کوڈنگ تکنیک کی نفیس ترمیم کے میل پر مستقبل کے تمام ہندسی ٹی وی نشر کاری سسٹموں کی پسند کا دار و مدار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مستقبل تمام تر ہندسی نظام سے وابستہ ہے چونکہ اس میں صعود، تعامل اور وسعت پذیری کی خاصیتیں موجود ہیں۔ انالوگ سسٹم سے ہندسی سسٹم کی طرف تغیر کا عمل کیسے ہو؟ کچھ لوگوں کی نگاہ میں

PNHAMEAD TV SYSTEM HDTV کی طرف تبدل کا ذریعہ ہے جب کہ کچھ دوسرے اس کو ایک رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

اس موڑ پر یہ نزاعی صورت حال ابھی تک حل سے محروم ہے۔ آخر کون سا راستہ اختیار کیا جائے اس کا جواب صارفین کے خاطر میں تلاش کیا جائے گا۔

کثیر ذرائع ابلاغ

ڈراما پیش کشیں، ذخیرہ معلومات (اسٹوریج)، اس کی بازیافت اور ترتیبی عمل سے اشاعت یافتہ معلومات جس کا اظہار و اعلان متن، آواز، تصویر، آڈیو اور ویڈیو جیسے مختلف ذرائع ابلاغ سے ہوا ہو اس کو کثیر ذرائع ابلاغ (ملٹی میڈیا) کہتے ہیں آج ملٹی میڈیا کا جو تصور ہمارے ذہن میں ہے اس کے استعمال میں تعلیم وطب، سیاحت، بینک کاری، بیمہ، انتظامیہ ایڈورٹائزنگ اور جائداد منقولہ وغیرہ شامل ہیں۔

پیغام رسانی اور نشر کاری کی ٹکنالوجی کی تشہیر سے برقیاتی سینما مشین، چھپائی، ڈرائنگ، خاموش تصویروں کا استعمال کمپیوٹر بصری مواصلاتی آلات، طبی، قومی ویڈیو کانفرنسیں اور گھر سے تال میل رکھنے والے ویڈیو ٹرمینل جیسے مفید کار آمد استعمالات تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے۔

کیبل ٹی۔ وی تقسیم کاری کی بہت سے ملکوں میں پذیرائی ہوئی ہے۔ ان نیٹ ورکس سے ملٹی میڈیا کو گھر کے لیے مفید استعمال فراہم ہوں گے۔ کیبل ٹی۔ وی نیٹ ورک کے ذریعہ ٹی وی اور ویڈیو مشترک نشر کاری کو ہر گھر تک موثر طور پر پھیلایا جا سکتا ہے۔

وہ نشری معلوماتی سروسیں جن کے موضوعات کی تجدید کی جا سکتی ہو ایک دن مفید ذریعہ بن جائیں گی۔ سافٹ ویر کے مفید اور سہل اتصال سے ٹیلی کمپیوٹر کا تصور TC اخبار، TC ایڈورٹائزنگ TC ریفرنس سروسیں اور کثیر لسانی سروسیں مہیا کرے گا۔ مستقبل کا ٹیلی کمپیوٹر ایک ایسا لسانی راہ ہے جس سے دنیا میں بہت سے دل پسند نیٹ ورکس وجود میں آجائیں گے اور یہ ایک گھریلو چیز بن جائے گا۔

مکمل سروسی ہندسی نشر کاری (ISDB) ویڈیو، آڈیو، ٹیلی ٹیکسٹ ڈیٹا اور دوسری تصویری سروسیں جیسے فیکس، اخبارات وغیرہ جیسی مختلف مکمل سروسوں کی اشاعت کے لیے مستقبل کا بنیادی ڈھانچہ ہے۔ اس میں یہ فوائد موجود ہیں۔

- لچکدار ترسیلی چینل (سروس سماعتی کوڈوں کی منتخبہ دلنشر کردہ بہت سے غیر نشر کاری سروسیں)
- نشر شدہ و غیر نشر شدہ (ویڈیو، آڈیو، ٹیکسٹ، ڈیٹا اور فیکس) مختلف سروسوں کا وسیع دائرہ۔
- نشر کاری طریقہ میں مختلف غیر نشر کاری کا استعمال۔
- لچکداری اور وسعت پذیری۔
- ہائی کوالٹی سروسیں۔
- عام مکمل کم لاگت ریسیور۔

ISDB سٹیلائٹ نشر کار چینلوں، بری نشر کار چینلوں اور کیبل سلسلوں کو بھی استعمال کرے گا۔ ہندسی ترمیم کے ساتھ ترسیلی بٹ ریٹ ۳۲-۲۴ M6/s ملٹی چینل سیم آڈیو اور M6/s 40 ریسٹیلائٹ چینل ہوگا۔

ابھرتی ہوئی نئی ٹکنالوجیوں سے مستقبل کے منظر نامے کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے جس سے کمپیوٹر اور ابلاغ و نشر کی ٹکنالوجیوں کا بڑے پیمانے پر یکجا ہونا دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم اس وقت ہندسی دور کی دہلیز پر ہیں اور آج کا مکمل سروس ہندسی نشر کاری تصور مستقبل کی ایک حقیقت بن جائے گا۔ تیزی سے بدلتے ہوئے اس منظر نامہ میں نشر کاروں خصوصاً ترقی یافتہ ملکوں کے نشر کاروں کو مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے محتاط انداز اختیار کرنا پڑے گا۔ ملک کو ہمہ جہت سماجی اور اقتصادی ترقی کی منزل تک لے جانے کے لیے ابھرتی ہوئی نئی ٹکنالوجیوں کو موثر معلوماتی اشاعت کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیا جائے کہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اور کسی بھی نئی سروس کے نفاذ کے لیے ٹکنالوجی کی موزونیت اور اس کی سکت نظر میں رکھ کر منصوبہ بندی کی جائے۔ ●

بقیہ : آلو کھائیے

ہیں ہوتا ہے۔ کافی دنوں تک اسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے اس سے اس کی غذائیت میں کوئی کمی نہیں آتی ہے۔ اس کا اسٹوریج اناج کی طرح سہل ہے۔ بیک وقت اناجوں کی غذائیت اور سبزیوں کی قوت و توانائی دونوں ایک ہی ساتھ اس سے دستیاب ہوتی ہے۔

آلو میں اسٹارچ کثرت سے موجود ہے اس لیے بڑھاپے میں اس کے استعمال میں قدرے تخفیف کر دینی چاہیے۔ عمر ڈھلنے کے ساتھ احتیاط سے اس کا استعمال ضرورت کے موافق ہی کرنا چاہیے۔ اس عمر میں کثرت سے آلو استعمال کرنے پر چینی (SUGAR) کی مقدار بڑھنے کا خطرہ رہتا ہے مگر مکمل طور پر اسے بند کر دینے سے قوت اور توانائی میں کمی آسکتی ہے لہٰذا ایسے عمر میں آلو کا استعمال احتیاط کے ساتھ کم کریں تو اس کے منفی اثرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ●

بھگت سنگھ حب الوطنی کی ایک عظیم مثال

ایک نوجوان شخص ہے، جس نے ایک اعلا سوشلسٹ ہندوستانی جمہوریہ کا خواب دیکھا تھا، کسی حال میں بھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور اپنے عظیم اصولوں کو برقرار رکھنے کے لیے اس نے اس وقت اپنی جان قربان کر دی، جب وہ مشکل سے ۲۴ سال کا تھا۔ اس شخص کا نام بھگت سنگھ تھا، جو ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے عروج تک پہنچے اور انقلاب کی ایک علامت بن گئے۔

بھگت سنگھ ۲۷ ستمبر ۱۹۰۷ء کو پنجاب کے کھٹکر کلاں گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق محبانِ وطن کے سندھو جاٹ کنبے سے تھا۔ ان کے والد سردار کشن سنگھ غدر پارٹی کے ایک سرگرم رکن تھے اور انھوں نے اکثر اس پارٹی کی مالی طور سے امداد کی تھی۔ اس سے نوجوان بھگت سنگھ کو راس بہاری بوس اور سردار سنگھ سارابھا جیسے عظیم انقلابیوں کے قریب آنے کا موقع ملا تھا، جن کی زندگیاں اور قربانیاں بھگت کے سیاسی نظریے پر دیگر تمام اثرات کے مقابلے میں زیادہ اثر انداز ہیں۔

مکمل اسپرینٹس

محنتی، ذہین اور نظم و ضبط کے پابند بھگت سنگھ نے تاریخی پیرو کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اس زمانے کے انقلابی رہنماؤں کے ساتھ اکثر و بیشتر تعلق اور تاریخی پس منظر میں واقعات کی واضح سمجھ کی وجہ سے وہ کم عمر میں ہی ایک مکمل سیاسی اسپرینٹس بن گئے تھے۔ وہ پہلے شخص تھے، جنھوں نے برطانوی حکومت کی امداد والے تمام اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کرنے کے سلسلے میں ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہا۔

انھوں نے لاہور میں ڈی۔ اے۔ وی اسکول چھوڑ دیا پیر بھائی پرمانند اور لالہ لاجپت رائے کے شروع کردہ نیشنل (قومی) کالج میں داخلہ لے لیا۔

۱۹۲۴ء میں انھوں نے کالج چھوڑ دیا تاکہ وہ ملک کی آزادی کا عظیم نشانہ حاصل کر سکیں۔ اتر پردیش میں گنیش شنکر ودیارتھی کے ساتھ ان کا قریبی تعلق قائم ہوا اور انھوں نے ان کے اخبار کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ ان کی تحریریں بہت موثر تھیں، جن کی وجہ سے قارئین قومی کاز اور برطانوی حکومت کے ذریعے کیے جا رہے استحصال کے بارے میں سوچنے اور غور کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ودیارتھی کے ساتھ کام کرتے ہوئے ان کی ملاقات ہندوستان کے دیگر حصوں میں سرگرم انقلابیوں سے بھی ہوئی۔ وہ ہندوستانی ری پبلک ایسوسی ایشن میں شامل ہو گئے، جس کا نام بعد میں ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن رکھ دیا گیا تھا۔ یہ اتر پردیش، بنگال، بہار اور راجستھان کے انقلابیوں کا ایک ادارہ تھی۔

مذکورہ ایسوسی ایشن کے ساتھ ان کے تعلق کے نتیجے میں لاہور میں نوجوان بھارت سبھا کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس فورم نے عوام میں برطانیہ مخالف جذبات پیدا کیے۔ اس نے عام آدمی کی زبان میں مواد شائع کیا تاکہ گاؤوں کے ناخواندہ اور سیدھے سادے لوگوں میں پیغام کی تشہیر کی جائے۔

متعدد خطوں میں پنجاب، ہریانہ، ہماچل، متحدہ صوبوں، دہلی، جموں اور کشمیر کے اندرونی علاقوں میں پروپیگنڈہ کیا گیا۔ فرقہ وارانہ خطوط سے اوپر اٹھ کر یہ پیغام ایک سیکولر منشور بن گیا۔

مکمل آزادی

ان سب کوششوں کا مقصد تقسیم کرو اور حکومت کرو کی چالوں کو ناکام بنانا اور حکومت کے خلاف کارکنوں، کسانوں اور نوجوانوں کو متحد کرنا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ بھگت سنگھ نے ۱۹۲۸ء میں لاہور طلبا یونین کا اہتمام کیا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ انقلابیوں کی سرگرمیاں کتنی محدود تھیں۔ انھوں نے "مکمل آزادی" کا نشانہ حاصل کرنے کا عزم مصمم کر رکھا تھا، جنھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے ذریعے پورن سوراج (مکمل سوراج) کے دسمبر ۱۹۲۹ء کے اعلامیہ کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دی تھیں۔

جب برطانوی حکومت نے سائمن کمیشن قائم کیا تو اسے اکتوبر ۱۹۲۸ء میں قومی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لالہ لاجپت رائے نے لاہور میں بائیکاٹ مظاہرے کی قیادت کی اور بھگت سنگھ نے اس میں شرکت کی۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا، جس میں بے شمار لوگ زخمی ہوئے، جن میں لالہ لاجپت رائے بھی شامل تھے، جو بعد میں زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گئے۔ اس واقعہ سے بھگت سنگھ کو شدید دھکا لگا اور انھوں نے سپرانٹنڈنٹ سے لالہ لاجپت رائے کی موت کا بدلہ لینے کا عزم کیا۔ راج گرو، سکھ دیو اور چندر شیکھر آزاد کے ساتھ مل کر بھگت سنگھ نے ایک تفصیلی منصوبہ بنایا لیکن اس کارروائی میں اسسٹنٹ سپرانٹنڈنٹ آف پولیس، مسٹر جے پی سونڈرس مارے گئے۔

اس واقعہ سے بھگت سنگھ کو بہت زیادہ

باقی صفحہ ۳۹ پر

محمد تبریز عالم

اردو زبان کے ارتقائے کے سماجی محرکات

سماج سے زبان کا رشتہ بہت گہرا ہے یہ آپس میں اس قدر مربوط اور وابستہ ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ سماج کے پھلنے پھولنے سے زبانیں پروان چڑھتی ہیں۔ سماج کے بغیر نہ تو ہم زبان کے حدود حال متعین کر سکتے ہیں اور نہ ہی زبان کے وجود کے بغیر سماج ہی کا تصور ممکن ہے۔ مختلف زبانوں کی طرح اردو زبان بھی سماجی ضروریات کے تحت معرض وجود میں آئی۔ اس بات کی وضاحت پروفیسر احتشام حسین اپنی کتاب "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" میں یوں کرتے ہیں

"ہر زبان کی طرح اردو کو بھی سماجی ضروریات
نے جنم دیا جس میں آہستہ آہستہ تہذیبی خیالات
اور ادبی تخلیقات کے لیے جگہ نکلتی گئی۔"
(اردو ادب کی تنقیدی تاریخ)

جیسا کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ "اردو ایک ہند آریائی زبان ہے" اور عربی، ایرانی اور ہندی تہذیبوں کا حسین مرقع ہے۔ ہندوستان میں وسط اور مغربی ایشیا سے جو ترک، ایرانی اور مغل آئے ان کا مقصد تبلیغ اسلام نہیں بلکہ تجارت کرنا تھا اور یہ تاجر اپنے ساتھ ترکی اور ایرانی زبان لے کر آئے تھے اس لیے انھیں ہندوستان میں رابطے کی ایک ایسی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جو سب کے لیے آسان ہو اور یہ اس وقت ممکن تھا جب ہندوستان کے مختلف علاقوں کی بولیوں سے ہم آہنگی کی جائے تاکہ عام بول چال کی زبان وجود میں آئے اور بہ آسانی تمام لوگ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ آخر کار یہاں کے مقامی لوگوں سے ان تاجروں کا آپسی میل جول اور لین دین شروع ہوا اور وہ اس طرح آپس میں گھل مل گئے کہ کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں۔

"مسلم ذہن ہندوانہ رنگ روپ قبول
کرنے لگا اور اس نے فارسی و ترکی کی جگہ
مقامی زبانوں کو سیکھنا اور استعمال کرنا
شروع کیا۔ ہندوؤں نے عربی، فارسی اور
ترکی الفاظ کو مقامی محاوروں میں جگہ دی
اس لین دین کا مافع ہماری تہذیب کے
خزانے میں اردو زبان کی شکل میں شامل
ہوا۔" (ہندوستانی کلچر کا ارتقاء)

اس سلسلے میں ڈاکٹر عابد حسین کا یہ بیان بھی قابل ذکر ہے

"مسلمانوں کے دہلی آنے کے بعد دہلی کے
علاقے میں مقامی بولی اور فارسی کے میل
جول سے ایک مشترکہ کاروباری زبان بن
گئی تھی جو آگے چل کر اردو کہلائی۔"
(قومی تہذیب کا مسئلہ)

بیرونی ممالک سے ہندوستان میں وارد ہونے والے تاجروں کے ساتھ بچے بھی تھے، عورتیں بھی تھیں، نوکر چاکر، افسر، کاریگر، فوجی اور صنعت والے بھی تھے۔ جب ان کا مقامی باشندوں سے آپسی اختلاط شروع ہوا تو گرد و نواح میں اس زبان کی نشو و نما اور ترقی ہوئی، پھلی پھولی، بڑھی، پروان چڑھی، اس کے بعد محمد بن تغلق نے جب اپنا دارالسلطنت دہلی سے دولت آباد منتقل کیا تو بڑی تعداد میں دہلی سے لوگوں نے دکن کے لیے ہجرت کی اور ان کے ساتھ ساتھ یہ زبان بھی دکن پہنچی جہاں اس زبان کی مزید ترقی ہوئی اور یہ ایک مشترکہ زبان کی حیثیت سے دور دراز کے علاقوں میں تیزی سے ترقی کے منازل طے کرنے لگی۔ صوفیائے کرام نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور دین و مذہب کی تبلیغ کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ بعد میں یہی اردو زبان خواص و عام کے لیے وسیلۂ اظہار بنی۔

اردو زبان کی نشو و نما اور ارتقاء کے بہت سے محرکات ہیں جن میں سے چند اہم باتوں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس زبان کے ارتقاء میں جو سماجی محرکات کارفرما رہے ہیں ان میں بازار، خانقاہ اور دربار کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

بازار

اردو زبان کی ترویج و ارتقاء میں بازار نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج ہی کی طرح اس زمانے میں بھی لوگوں کی بڑی تعداد بازار میں خرید و فروخت کیا کرتی تھی۔ مختلف علاقوں اور مختلف قوموں کے لوگ ہر وقت یہاں آتے جاتے رہا کرتے تھے۔

ہندوستان میں جب بیرونی ملکوں سے قومیں آئیں تو ان کا سابقہ بازار سے پڑا۔ یہ لوگ جو زبان اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اس کو بازار میں استعمال کرنا مشکل تھا اس لیے کہ مقامی لوگ اس زبان کو نہیں سمجھتے تھے۔ باہر سے آنے والی قومیں جب مقامی دکانداروں کے پاس کوئی چیز خریدنے جاتے تھے تو ان کی بات دکاندار کی سمجھ میں نہیں آتی تھی جہاں پھر ایک رابطے کی

ریسرچ اسکالر جے این یو۔ نئی دہلی۔ ۶۷

زبان کی ضرورت پڑی تاکہ غیر ملکی قومیں اور مقامی لوگ دونوں اس زبان کو بول اور سمجھ سکیں۔ اس کے لیے دونوں نے ایک دوسرے کی زبان کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک نئی زبان وجود میں آئی جس کو دونوں قوموں کے لوگ بخوبی بول اور سمجھ سکتے تھے۔

بازار جائے تفریح بھی تھا۔ لہٰذا تفریح کی غرض سے لوگ وہاں پہنچتے تھے۔ پتنگ اور بٹیر بازی ہوتی تھی اور دوسرے طرح کے کھیل بھی کھیلے جاتے تھے۔ اس میں مختلف طرح کے لوگ حصہ لیتے تھے۔ بیرون سے آنے والی قوموں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ میلہ دیکھنے کا شوق بطور خاص بچوں میں زیادہ ہوتا ہے۔ بیرونی ملکوں سے آنے والی قومیں اپنے بچوں کو تفریح طبع کے لیے بازار لے جاتی تھیں اور کھیل تماشے دکھایا کرتی تھیں۔ وہ بچے بھی مقامی بچوں کے ساتھ مل کر کھیلوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ بازار میں تفریح کے ساتھ ساتھ مختلف قوموں کے لوگ وہاں رہتے بھی تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی رابطے کی زبان ضرور استعمال کرتے ہوں گے اور مقامی زبانوں کے میل جول سے کوئی نئی زبان ضرور وجود میں آئی ہوگی جو مشترک رہی ہوگی۔ اس مشترک زبان کی جدید شکل کو آج ہم اردو کہتے ہیں۔

خانقاہ

اردو زبان کے ارتقا میں خانقاہوں کی بڑی اہمیت ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن۔

"اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان و ادب کا جنم بازاروں میں ہوا اور تربیت خانقاہوں میں ہوئی تو غلط نہ ہوگا۔"

(اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر عہد میرتک)

خانقاہوں میں متصوفانہ تعلیم دی جاتی تھی اور اس کام کو صوفیائے کرام انجام دیتے تھے اور خانقاہوں میں صوفی حضرات رہتے بھی تھے۔

زبان کی تشکیل کرنے والوں میں درویش اور صوفی نمایاں تھے۔ باہر سے آنے والی قوموں کے ساتھ صوفیائے کرام بھی ہندوستان آئے۔ یہ لوگ انسان کے باطن سے متعلق باتیں کرتے تھے اور تزکیۂ نفس ان کا مقصد ہوتا تھا۔ لہٰذا ان کا در ہر خاص و عام کے لیے کھلا رہتا تھا۔ بلا تفریق ہر قوم و ملت کے لوگ ان کے پاس آتے اور درس سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ان کا واسطہ چوں کہ بیشتر عوام سے تھا چناں چہ اپنے خیالات کی ادائیگی کے لیے وہ ملک کے جس حصے میں پہنچے وہاں کی زبان اختیار کرلی اور عوام کو انھیں کی زبان میں تعلیم دی۔ لیکن چوں کہ بعض مذہبی اصطلاحوں کا استعمال ضروری تھا اور یہ اصطلاحیں عربی یا فارسی میں ہوتی تھیں اس لیے عربی اور فارسی کے الفاظ بھی ان بولیوں میں قدرتی طور پر شامل ہوگئے جسے آج ہم اردو کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

جن صوفی بزرگوں نے اردو کی ترقی میں نمایاں طور پر حصہ لیا مندرجہ ذیل ہیں۔

بابا فرید شکر گنج، شیخ شرف الدین بو علی قلندر، شیخ حمید الدین ناگوری، شیخ سراج الدین، امیر خسرو، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، مخدوم اشرف جہانگیر، شیخ عین الدین گنج العلم، شیخ بہاؤ الدین باجن، حضرت گیسو دراز، شاہ ہاشم علوی اور شیخ عبدالحق ردولوی وغیرہم۔ ان میں امیر خسرو اور حضرت بندہ نواز گیسو دراز اردو کی ادبی تاریخ میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ مختصر یہ کہ اردو زبان نے خانقاہوں کے ذریعے جو بے پناہ ترقی کی اسے کسی بھی حال میں بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔

دربار

مشرقی تہذیب و ثقافت میں دربار کی مرکزی حیثیت تھی۔ زبان و ادب کی ترقی میں دربار کا براہِ راست یا بالواسطہ تعلق ضرور ہوتا تھا۔ بادشاہِ وقت کی سرپرستی اور دلچسپی سے شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ لکھنؤ، فیض آباد، رامپور، عظیم آباد، بھوپال اور دکن کے دربار خصوصاً نظام حیدرآباد کا دربار اور دہلی میں خاص طور پر بہادر شاہ ظفر کا دربار۔ یہ سب اردو زبان و ادب کے اہم گہوارے تھے۔ اکثر بادشاہ بھی خود شعر کہا کرتے تھے۔ غزل گوئی بھی ہوتی تھی اور قصیدہ خوانی بھی۔ دربار میں قصیدہ کو زیادہ ترقی ملی اس لیے کہ اس میں بادشاہ کی تعریف کی جاتی تھی جس سے خوش ہوکر بادشاہ درباری شعرا کو انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔

دکن میں ادب پرور بادشاہوں کی کمی نہ تھی۔ جلد ہی وہاں اردو ادب ترقی کی منازل طے کرنے لگی اور جب محمد بن تغلق نے دولت آباد کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ اسے دکن کے عوام نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسی زمانے میں ملک کے سیاسی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ دکن میں تغلق کی حکومت ختم ہوگئی اور ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی جو تقریباً پونے دو سو برس قائم رہی۔ بہمنی خاندان کے بادشاہوں میں بیشتر ایسے تھے جو خود علمی کمالات رکھتے تھے اور علم و ادب کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ اس دور میں اردو زبان کے قدم دکن کی سرزمین پر بہت مضبوطی کے ساتھ جم گئے۔

جب بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو پانچ آزاد سلطنتیں قائم ہوئیں جن میں سے بیجاپور اور گولکنڈہ کو امتیاز حاصل ہے۔ بیجاپور میں عادل شاہی حکومت قائم ہوئی اور گولکنڈہ میں قطب شاہی۔ ان دونوں حکومتوں میں زبان و ادب اور دوسرے فنون کی بہت ترقی ہوئی۔ اکثر بادشاہوں نے خود بھی شعر و ادب میں کمال دکھایا۔ عادل شاہی اور قطب شاہی دونوں درباروں نے اردو کی بے پناہ خدمت کی۔ عادل شاہی بادشاہوں میں کئی ایسے بھی تھے جو خود اردو پڑھتے لکھتے تھے۔ ان میں سب سے مشہور ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۶۲۶ - ۱۵۸) ہے جو بڑے پایہ کا عربی علم و فن تھا۔ اس نے فن موسیقی پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب نورس" ہے۔ یہ کتاب علم موسیقی کے لحاظ سے بے مثال تخلیق ہے۔ اس دور کے نامور شاعروں میں نصرتی، رستمی، ملک خوشنود اور ہاشمی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو کی سب سے زیادہ ترقی قلی قطب شاہی دور میں ہوئی۔ اس خاندان کے تین بادشاہ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ اردو شعر و ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ خود اردو کے شاعر اور شاعروں کے سرپرست تھے۔ قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر مانا جاتا ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور نظم ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے کلام میں ایک خاص ادبی شان پائی جاتی ہے۔

باقی کور ۳ پر

منظر اعجاز

اقبال کا نظریۂ عشق

اقبال کی روایت عشق کیا ہے؟ کیوں کہ شاعری کا تعلق روایات سے اور فلسفے کا تعلق نظریات سے ہے۔ اب جہاں تک عشق کے فلسفیانہ نظریات کا تعلق ہے چوں کہ کائنات کے نظام میں کشش اور ردِ کشش کے بنیادی عوامل درج ہیں جو کہ نظام ہائے شمسی تک کا، دنیا میں اس لیے جب واقعیت سے اوپر اٹھ کر مثالیت (حقیقت) کے میدان میں گامزن ہوتے ہیں تو اسی کشش اور ردِ کشش کے عوامل کو حسن اور عشق سے عبارت کرتے ہیں۔

جیسا کہ اقبال کی زندگی کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہے کہ اقبال برہمن زاد تھے اور اس لیے ان کے آب و گل کے خمیر میں فلسفہ موجود تھا اور ان کے ریشہ ہائے دل کی تاب و تواں میں تفکر کا خون دوڑ رہا تھا

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد
میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اس لیے یہ بات زیادہ قریب الفہم ہے کہ اقبال بنیادی طور پر فلسفی تھے اور انھوں نے

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

کے طور پر شاعری کو محض اظہار کا وسیلہ بنایا۔ بہرحال فلسفیانہ نقطۂ نظر سے عشق اور حسن آفاقی اور کائناتی کشش اور ردِ کشش کے عوامل ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری میں کائنات کے اسی BI-POLAR نظام کے اعتبار سے کشش اور ردِ کشش سے حسن و عشق مراد لیا ہے۔

حیات اپنی قوتِ اظہار میں اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب اظہار کی راہ میں دشواریاں اور رکاوٹیں ہوں۔ یہی دشواریاں اور رکاوٹیں حیات کو وہ قوت محرکہ فراہم کرتی ہیں جو اس کی داخلی، غیر معین اور بے پناہ توانائی کے اظہار کا سبب بنتی ہے جب ان مسائل اور عوامل کا بیان شعری اسالیب میں ہوتا ہے تو کشش اور ردِ کشش کے لیے حسن اور عشق کی علامتیں استعمال کی جاتی ہیں اور جب یہی مسائل طبیعات یا حکمت حیات کے تناظر میں پیش کیے جاتے ہیں تو ہم کشش، ردِ کشش کے لیے قوتِ اظہار اور نفیِ اظہار کی علامتیں استعمال کرتے ہیں۔ یہی مسائل اور عوامل جب الہیاتی تناظر میں آتے ہیں تو لا اور اِلّا کے اسالیب سے عبارت ہوتے ہیں۔ اس طرح اقبال کا نظریۂ عشق حیات کی وہ قوتِ محرکہ ہے جو ذرّات کے نظام کو ایک نیوکلیس (NUCLEUS) کے تحت باندھے رہتی ہے۔ ذرات اپنے مرکز سے ایک معین دوری پر برقرار رہتے ہیں کیوں کہ اس دوری کے ٹوٹنے سے ذرات کا نظام بگڑ جاتا ہے اور ان کا وجود 'لا' کے دھماکے سے چور ہو جاتا ہے۔ جو توانائی انھیں اپنے مرکز سے ایک معین دوری پر قائم رکھتی ہے، وہ خود بھی حائل توانائی ہے جو ذرّے کے تعین کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مرکز سے بھاگنے نہیں دیتی اور یہی حسن ہے لیکن حسن و عشق کا یہ بیان اس جمالیاتی کیف سے محروم ہے جو حسن و عشق کے شاعرانہ، متغزلانہ یا ادبی بیان میں پایا جاتا ہے۔ بیان کی لذت کے لیے اور ترسیل میں شدتِ تاثیر لانے کے لیے، نظامِ واقعات میں پائے جانے والے قوانین کا دلکش اظہار فی الحقیقت شاعری کا مقصود ہے۔ یہی شاعری

گر به آتش درخونِ دل حل کردئی
یا بیچ شاعری جزویست از پیغمبری
یا سوز دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

اس طرح اقبال کا نظریۂ عشق تکوینی (تخلیقی) تفکر کی شاعرانہ ترسیل ہے۔ اس اعتبار سے اقبال کو برگساں (BERGSON) کے تخلیقی ارتقائی تصورات سے کافی مدد ملی ہے اور بقول پروفیسر یوسف حسین خاں

"اقبال کے نزدیک فطرت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسان کی تکمیل خودی کی راہ میں مزاحمت پیدا کرے۔ انسان کی فضیلت اس میں ہے کہ وہ اس پر غلبہ پائے اور تسخیر حیات کرے۔ انسان کی یہ سعی و جہد تخلیقی نوعیت رکھتی ہے۔ فطرت جو اس کی مزاحمت کرتی ہے، انسان اسی کے توسط سے اپنے ذہنی استعداد کو ظاہر کرتا اور اسے بھی اپنی شخصیت اور احساس کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ وہ اس کے ذریعے زندگی کی تمام مخفی قوتوں کو بیدار کرتا اور تکمیل حیات کرتا ہے۔ اس تخلیق و تسخیر میں انسان کو جذبۂ عشق سے بڑی مدد ملتی ہے۔ لفظ عشق کو اقبال نے نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ مجاز و حقیقت دونوں پر حاوی اور خودی کو مستحکم کرنے کا ذریعہ

حاجی لوج، شکلا روڈ، مظفرپور - ۱ ۱۴۲

ہے۔ عشق سے اقبال کی مراد وہ جوشِ وجدان ہے جو ایک قدر کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ اس کی بدولت انسان تکمیلِ ذات کے لیے جذب و تسخیر پر عمل پیرا ہوتا ہے اور ہر قسم کے موانع پر قابو پاتا ہے۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جس کا خاصہ مستی، انہماک اور جذبِ کلی ہے، اس سے انسانی ذہن زمان و مکان پر اپنی گرفت مضبوط کرتا اور لزوم و جبر کی زنجیروں سے چھٹکارا پاتا ہے۔"

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اقبال عشق کو تخلیق کی وہ محرک توانائی مانتے ہیں جو محرک توانائی کے ایک پیکیٹ (FNFRGY PACKFT) کو اپنے مرکز کے گرد رقص پر قائم رکھتی ہے اس لیے ہم عشق کو حرکت یا عمل سے عبارت کرتے ہیں اور خود اقبال نے بھی اپنے کلام میں جا بجا حرکت اور عمل کو بجائے عشق استعمال کیا ہے۔ یہی حرکت اور عمل انھیں مسجد قرطبہ کے نقش و نگار میں نظر آتے ہیں، کبھی خیبر کے میدانِ کارزار میں اور کبھی تنہائی کوہ و دمن میں۔ اقبال انسانی عمل میں داخلی ارتقا کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں جس سے ہمارے عزم و ارادہ میں وجد آفریں محرکات پیدا ہو سکیں کیوں کہ حیات کے لیے نہایت ضروری مقاصد عبوری اور حرکت دائمی ہیں۔ عقل کا تعلق مقاصد سے ہے اور عشق کا تعلق حرکت سے۔ سامنے والی منزل تک پہنچنے کے وسائل اور اہتمام عقل کے تابع ہیں لیکن ہر سامنے والی منزل آگے آنے والی منزلوں کا پیش خیمہ ہے جس کے لیے حرکی توانائی لازمی ہے۔ اس لیے اقبال عقل کی ضرورت کا انکار نہیں کرتے مگر ساتھ ہی عشق کی اہمیت اور برتری تسلیم کرتے ہیں:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبال کے نزدیک،

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

اپنے نظریۂ عشق کو انھوں نے وضاحت کے ساتھ اپنی نظم "مسجد قرطبہ" اور "ذوق و شوق" میں پیش کیا ہے:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفٰے
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے یہ بات بالکل درست کہی ہے کہ اقبال نے لفظ عشق کا استعمال نہایت وسیع معنوں میں کیا ہے۔ ان کے یہاں عشق تحریکِ حیات، تکمیلِ مقاصد، قوت ظہور بھی ہے اور ان تمام تکوینی اور تخلیقی تعبیرات کی وحدت لفظ "عشق" میں سمٹ آئی ہے۔ ●

مزدوروں کا اتحاد

یوروپ میں صنعت کاری کے ابتدائی مرحلے میں، بے رحم اقتصادی نظام سے مزدور طبقے کے تحفظ کا خیال عظیم انسان دوستوں کو آیا تھا۔ ان کو یہ خیال کسی فرقہ پرستانہ یا طبقاتی نظریے سے متاثر ہو کر نہیں، بلکہ انسانیت اور انصاف کے بہتر اور اعلا نصب العین کی وجہ سے آیا تھا، جنھوں نے مزدور تحریک کو جنم دیا۔ اگرچہ مزدور تحریک کی لہر دنیا بھر میں محسوس کی گئی تھی، لیکن یکم مئی ۱۸۸۶ء کو شکاگو واقعے کی وجہ سے مزدوروں کی تحریک میں مطلوبہ تیزی آئی اور یہ دن عالمی تاریخ کا ایک حصہ بن گیا۔

امریکہ کے تمام مزدور اپنے آجرین کے خلاف لڑائی لڑنے کے لیے متحد ہو گئے۔ یہ لڑائی لاحاصل ثابت نہیں ہوئی۔ یکم مئی ۱۸۸۶ء کو شکاگو میں ہڑتال سے پہلے وسیع پیمانے پر مظاہرے ہوئے جن کا مقصد ایک دن میں آٹھ گھنٹے کام کے پروگرام پر رضامند ہونے کے لیے آجرین پر دباؤ ڈالنا تھا، تب سے اس طرح کے مظاہرے سالانہ امر بن گئے ہیں۔

عالمی یومِ اتحاد

بیسٹیلے پر قبضہ کرنے کی صد سالہ سالگرہ منانے کے لیے ۱۸۸۹ء میں پیرس میں منعقدہ ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ یکم مئی ۱۸۹۰ء کو عالمی یومِ اتحاد کے طور پر منایا جائے۔

خصوصی اہمیت

۱۸۸۶ء سے قبل یکم مئی پورے یوروپ میں خصوصی اہمیت کی حامل تھی۔ اس کو جشن کے دن کے طور پر منایا جاتا تھا۔ اس دن رومن فلورا کی پوجا کرتے ہیں۔ یوروپ پر روم کی فتح سے یہ تقریبات متعدد دیگر یوروپی ممالک میں بھی منائی جانے لگیں۔ انگلینڈ میں یوم مئی کی تقریبات دورِ وسطیٰ میں بہت مقبول تھیں۔ خانہ جنگی کے بعد یوم مئی پر خوشی کی تقریب منانے کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

ہندوستان میں مزدوروں کی صورتِ حال

آج تمام ممالک مزدوروں کی بہبود کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ دنیا کے سات سرکردہ صنعتی ممالک میں سے ایک ملک ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں متعدد قوانین منظور کیے گئے ہیں تاکہ مزدور طبقے کے سماجی تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔ آزادی کے بعد غیر منظم شعبے کے مزدوروں سمیت تمام مزدوروں کی بہبود اور تحفظ نیز ان کے لیے سماجی انصاف کے معاملہ کو سماجی ایجنڈے میں ترجیح دی گئی ہے۔ ●

آلو کھائیے

جدید دور میں آلو سے کون آشنا نہ ہوگا۔ خواہ امیر ہو یا غریب ہر فرد کے یہاں دسترخوان پر آلو کسی نہ کسی شکل میں ضرور نمودار ہوتا ہے، جس طرح پھلوں کا بادشاہ آم ہے اسی طرح سبزیوں کا سرتاج آلو ہے۔ یہ وہ غذائی شے ہے جسے ہر کس و ناکس بے حد پسند کرتے ہیں۔ ہر عمر اور ہر ذوق کے اشخاص اسے یکساں طور پر تناول فرماتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اسے مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ کوئی اسے ساگ میں ملا کر غذا تیار کرتا ہے تو کوئی اسے مختلف سبزیوں کے ساتھ پکا کر کھاتا ہے۔ اپنی اپنی پسند کے مطابق لوگ اسے گوشت میں ملا کر قلیہ بناتے ہیں۔ مختلف غذائی اشیاء کے ساتھ اسے ملا کر استعمال کرنے سے آلو کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔ اسے جوش دے کر اس کا بالائی چھلکا ہٹا کر تیل میں اسے تل کر کھانے پر بڑا لذیذ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پکوڑے، سنگھاڑے اور اچار سبھی پسند کرتے ہیں۔ ہر موسم میں اس کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ کسی بھی غذائی چیز کے ساتھ اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

آلو کی کاشت سب سے قبل دکھن امریکہ میں شروع ہوئی۔ آج سے کئی سو سال قبل وہاں اینڈس پہاڑی (FNDS HILLS) پر مقیم امریکی انڈین (AMFRICI INDIAN) نے اس کی کاشت شروع کی۔ وہاں سے یہ یورپ کے ممالک میں آیا۔ وہاں کے باشندے مخصوص مواقع پر اس کا استعمال کرتے تھے اور وہاں اس کی کاشت صرف امراء اپنے باغوں میں بڑے شوق سے کیا کرتے تھے۔ وہاں سے ہر طرف پھیلتا ہوا یہ بھارت میں آگیا۔ اب تک اس کرۂ ارض پر کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کی کاشت نہیں ہوتی ہے۔ آج سرد علاقوں سے لے کر خشک گرم علاقوں تک ہر جگہ اس کی مختلف قسمیں اُگائی جاتی ہیں۔ اس میں غذائیت بھرپور ہے۔ اس کی کھپت بہت زیادہ ہے۔ اسی لیے آلو کی کاشت بڑھانے، اس کی حفاظت اور نئی عمدہ قسم کی فصل کی تلاش کے لیے حکومت ہند نے NATIONAI POTATO CORPORATION کا قیام کیا ہے۔ آلو دراصل پودے کے تنے کی تبدیل شدہ شکل ہے۔ پودے کے ذریعہ تیار شدہ غذائی مادہ اسٹارچ (STARCH) اس میں بھرا رہتا ہے۔ علم نباتات کی اصطلاح میں اسے GROUND MODIFIED STEM کہتے ہیں اور اس کے عام طور پر دستیاب پودے کو SOI ANUM TUBFROSUM کہتے ہیں۔

آلو جسم انسانی کی فطری نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ ۱۵۰ گرام وزن کے ایک اوسط آلو میں کاربوہائیڈریٹ ۲۳ گرام، پروٹین ۳ گرام، ریشہ ۱٫۷۲ ملی گرام، سوڈیم ۱ ملی گرام، پوٹاشیم ۵۰۷ ملی گرام، مختلف وٹامن ۱ سے ۱۵ فی صد، نیوسن ۱ فی صد، فولک ایسڈ ۸ فی صد، جستہ ۲ فی صد، میگنیشیم ۸ فی صد، PATOTHENIC ACID ۳ فی صد اور آیوڈین ۱۵ فی صد پائے جاتے ہیں۔ آلو کی ایک ممتاز خوبی یہ ہے کہ اس میں چربی (FAT) اور کولسٹرول (CHOIOSTROI) تقریباً صفر کے برابر ہے لہٰذا جگر اور قلب پر ان اجزاء کے مضر اثرات پڑنے کا خطرہ نہیں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں قلیل مقدار میں لوہا، جستہ اور معدنیات پائے جاتے ہیں۔ اس میں موجود وٹامن سی کے سبب جسم میں ہونے والے زخم جلد بھر جاتے ہیں۔ روزمرہ کی ضرورت کا تقریباً ۴۳ فی صد وٹامن آلو میں موجود رہتا ہے۔

انواع و اقسام کی عمدہ فصل کی حصولیابی کے لیے تحقیق ابھی جاری ہے۔ اب تک کی جستجو کے پیش نظر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ دو تین سالوں میں آلو کی اس نئی فصل کی دریافت ہو جائے گی جس میں غذائی اشیاء بھرپور ہوگا، جس کی کاشت بآسانی ہر قسم کی مٹی میں کی جا سکے گی اور جس کی پیداوار کی مقدار بہت زیادہ ہوگی۔ ابتدائی عمر میں جسم کے نشوونما میں اس کا استعمال کثرت سے کرنا سودمند ثابت ہوا ہے۔ تین ماہ کے بعد ہی بچوں کو آلو دیا جا سکتا ہے۔ مکمل غذائیت ہونے کے سبب یہ غذا کا متبادل بن چکا ہے لہٰذا ایسے بچے جنھیں افلاس کے سبب عمدہ اور مقوی غذا دستیاب نہیں ہے انھیں کثرت سے عمر کے مطابق آلو دال اور سبزیوں میں ملا کر دیا جائے تو یہ مقوی غذا کی کمی کو بہت حد تک پورا کر سکتا ہے۔ عام طور پر ایک اوسط آلو سے ۱۱۰ کیلوری توانائی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے استعمال سے قوت اور توانائی دونوں حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک مکمل غذا ہے۔ ہری سبزیوں کی طرح اس کا وٹامن جلد زائل

باقی صفحہ ۲۸ پر

اعزازی سکریٹری۔ اسٹڈی سینٹر، گیا

رازداں جاوید

بالوں کی حفاظت کیسے کریں

(خواتین کے لیے)

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ کیا آپ جانتی ہیں کہ آپ کے سر پر کتنے بال ہیں؟ — آپ کہیں گی کہ کیا سر کے بالوں کو گنا جا سکتا؟ لیکن سائنس نے ہار کو کہاں تسلیم کیا ہے؟

کافی کوشش کے بعد سائنس والوں نے ہمیں بالوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ سے ایک لاکھ پچاس ہزار تک بتائی ہے اور اتنے سارے بالوں کے بڑھنے کی رفتار بھی کم نہیں۔ وہ ایک ہی ماہ میں ایک سینٹی میٹر بڑھ جاتے ہیں۔ یہ حدش کے مطابق یہ رفتار کچھ کم اور زیادہ بھی ہو سکتی ہے، لیکن تا زندگی اسی رفتار سے بال نہیں بڑھتے۔ یہ بڑھتے ہیں تقریباً چھ سال تک، پھر کچھ مہینوں کا آرام اور پھر الوداع، یعنی یہ سر کی جلد سے گر جاتے ہیں۔ نئے بالوں کے آنے کے لیے! — اس طرح نئے بالوں کے آنے کا کام اور پرانے کا جھڑنے کا عمل شروع ہوتا رہتا ہے۔ اگر روزانہ آپ کے سر سے ایک سو سے ایک سو پچاس تک بال ٹوٹ جاتے ہیں تو یہ عمل، عام عمل کے مطابق ہو رہا ہے، جس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بالوں کی اس چھوٹی عمر کو جان کر آپ ان کے متعلق فکرمند نہ ہوں کہ اتنی حفاظت اور خدمت کرو اور یہ پانچ یا سات سال میں جھڑ ہی جائیں گے۔ جس طرح اسّی سال کی عمر میں بھی صحت اور خوب صورتی کے لیے انسان کوشش کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح بالوں کو صحت اور خوبصورت بنانے کے لیے ان کی دیکھ بھال ضرور ہونی چاہیے۔ کیوں کہ شخصیت میں نکھار لانے کے لیے آپ کے بال کا ایک اہم رول ہوتا ہے۔

بال چاہے سفید ہوں یا کالے، کھورے یا گھونگرالے، خوب صورت معلوم ہونے کے لیے چمکدار اور ملائم نظر آنے کے لیے کچھ ضروری شرائط ہیں۔ یعنی بال چمکدار و ملائم ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کو صحیح خوراک ملے اور اس کی دیکھ بھال اور صفائی برابر ہوتی رہے۔ کیوں کہ بالوں کی لمبائی بالوں کی جڑ سے بڑھتی ہے۔ اس لیے جڑ کو صحیح طریقے سے اس کی سینچائی بھی کرنی چاہیے یعنی سر کی جلد کو تیل سے اچھی طرح مالش کرنا چاہیے۔ یوں تو بالوں میں قدرتی طور پر تیل نکلتا ہے لیکن یہ خود بہ خود سر کی جلد پر برابر پھیل جائے یہ ضروری نہیں۔ ویسے بھی دھوپ اور دھول، ڈائی یا اسپرے کی وجہ سے بال روکھے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ناریل یا زیتون کا تیل کچھ گنگنا کرکے انگلیوں کے ذریعہ لگایا جائے۔ اس سے خون کا دوران اچھی طرح شروع ہو جائے گا اور بالوں کو ضرورت کے مطابق غذا ملے گی۔ بالوں کو کچھ دیر کھول کر دھوپ میں بھی بیٹھیں۔ اس سے بالوں کو ضرورت کے مطابق وٹامن "ڈی" بھی ملے گا اور بندھے رہنے کی وجہ سے بالوں میں جو بدبو پیدا ہو جاتی ہے، وہ نہیں ہوگی۔ تقریباً آج کل سبھی لوگ سر میں تیل لگا کر باہر نکلنا نہیں چاہتے کیوں کہ تیل لگے بالوں میں ان کا پسندیدہ اسٹائل پیدا نہیں ہو پاتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ رات میں تیل لگائے اور صبح اسے دھو ڈالے۔

لیکن جس قدر اہم تیل لگانا ہے۔ اتنا ہی اہم اسے صحیح ڈھنگ سے دھو ڈالنا بھی ہے۔ کتنے وقفے کے بعد بال کو دھونا چاہیے۔ یہ آپ کے بال پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر آپ کے بال کو روزانہ دھول، دھوپ کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ آپ کو روزانہ سر دھونا پڑے اور اگر آپ کے بال زیادہ چکنے (Oily) ہوں تو گھر میں رہتے ہوئے بھی ہر دوسرے دن آپ کو سر دھونا پڑ سکتا ہے۔ موٹے طور پر تقریباً ہفتہ میں دو بار بال دھو لینا کافی ہوتا ہے اور باقی اپنے بالوں کی ضرورت کے مطابق آپ ہی ان کی صفائی بہتر طور پر خود کر سکتی ہیں۔

زیادہ دن شیمپو چلانے کے لیے اس میں پانی مت ڈالیے کیوں کہ اس سے فائدہ نہیں ہوگا۔ اس سے شیمپو کی قوت کم ہو جاتی ہے اور بالوں کی صحیح ڈھنگ سے صفائی کے لیے زیادہ مقدار میں شیمپو لینا پڑتا ہے۔ یعنی بات برابر ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ شیمپو کرنے کے بعد آپ اپنے بالوں کو اچھی طرح دھوئیں اور خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ شیمپو سے بال اچھی طرح دھل جائے اور بال میں شیمپو لگا نہ رہ جائے۔ شیمپو کا حصہ بالوں میں رہ جانے سے آپ کے بال جھڑ سکتے ہیں، ٹوٹ سکتے ہیں یا بدرنگ بھی ہو سکتے ہیں۔

اگر آپ خشکی (Dandruf) کی زیادہ شکار رہتی ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کے بالوں میں چکنائی زیادہ ہے، جس کی وجہ سے دھول و مٹی یکجا ہو جاتی ہے اور اس گندگی کی وجہ سے کھجلی بھی ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں خشکی کے لیے خاص طور پر ملنے والے شیمپو استعمال کیجیے اور بالوں کو ہر دوسرے تیسرے دھو ڈالیے۔ بالوں

باقی صفحہ پر

ساکن مرکی خورد، پوسٹ مرکی کلاں، ضلع غازی پور، یو پی

م۔ق۔خان

کربِ آگہی

یہ کوئی ایسا تیز رفتار زندگی والا شہر نہیں کہ پڑوس میں قیامت بھی برپا ہو جائے تو ایک کی دوسرے کو کوئی خبر نہ ہو۔ یہاں تو معمولی سا کوئی عام لوگوں کی گفتگو کا موضوع بن جاتا ہے۔

اسی طرح شہاب اور ساجدہ کی ماں کا انتقال ہوا تو ہر ایک کی زبان پر اس کا ذکر تھا۔ اس کے ساتھ ہی مرحومہ کی شرافت، نیکی، پاکیزگی، خلوص، پرہیزگاری، عبادت گزاری اور پارسائی کا بھی ذکر سب لوگوں کی زبان پر تھا۔ البتہ کسی کو یہ پتا نہیں تھا کہ ان کے شوہر کا کیا نام تھا اور وہ لوگ کہاں کے اصلی باشندے تھے۔ وہ لوگ چند مہینوں سے ہی اس محلے میں رہ رہے تھے۔ جب کسی نے ان کے شوہر کو دیکھا ہی نہیں تو ان کا ذکر کیا ہوتا؟ شروع میں تو کچھ لوگوں کو اس کا تجسس ہوا تھا لیکن روز کی مشغول زندگی میں اس معمولی سی بات کی چھان بین کا بیڑا کون اٹھاتا؟

وہ یوں بستر پر پڑی تھیں جیسے ابھی ابھی غسل کر کے آئی ہوں اور ان کی آنکھ لگ گئی ہو۔ چہرے پر کرب و اذیت کا ذرہ برابر نام نہیں تھا۔ سفید ساڑی میں ملبوس ایک بچے کی طرح معصوم لگ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ موت کو انھوں نے مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا تھا۔

ان کی لڑکی ساجدہ مقامی اردو گرلز اسکول میں مدرس تھی اور شہاب ایک کمپنی میں منیجر تھا۔ دونوں با اصول اور کم آمیز تھے۔ انھیں اپنی ماں سے اس قدر محبت اور عقیدت تھی کہ وہ ماں کے ادنیٰ اشارے کو حکم سمجھتے تھے اور کبھی ماں کی خواہش کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ماں نے ان کے بچپن سے انھیں نہایت اچھے ڈھنگ سے پرورش کی تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی نہایت سلیقے سے ہوئی تھی۔ اپنے بچوں کو اخلاق و خلوص کا درس انھوں نے بچپن سے ہی دیا تھا۔

ان دونوں نے ہوش سنبھالا تو دیکھا باپ نہیں ہے اور باپ کی شفقت اور محبت سے محرومی کا احساس تھا۔ انھیں بس اس حد تک جانکاری حاصل ہوئی تھی کہ ان کا باپ اچھے کردار کا نہیں تھا۔ وہ دن رات ان کی ماں سے جھگڑتا رہتا تھا اور وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں پڑ کر ان کی ماں اور انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں اس کا بھی پتا نہیں تھا اور ان کے پاس اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے باپ کے بارے میں اپنی ماں سے کچھ دریافت کرتے۔ شروع شروع میں جب ان لوگوں نے کچھ دریافت کر کے معلومات حاصل کرنا چاہا تھا تو ماں کا چہرہ غصے سے تمتما گیا تھا اور ان کی آنکھوں میں آنسو اُبل پڑے تھے۔

ماں کی ناکامیاب ازدواجی زندگی کے ناخوشگوار حالات کا براہ راست شہاب اور ساجدہ کی زندگی پر بھی اثر پڑا۔ ساجدہ جو بڑی تھی اسے تمام مردوں سے بیزاری اور نفرت تھی۔ شہاب ابھی شادی اس لیے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی محبت و رفاقت اور ذمہ داریاں منقسم ہو جائیں گی۔

محلے کے لوگ تعزیت کے لیے آ رہے تھے چوں کہ موت رات کے دس بجے ہوئی تھی لوگوں کے آنے کا سلسلہ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک ہوتا رہا۔ ساجدہ نے مرحومہ پر سفید چادر ڈال دی تھی۔ پورا کمرہ لوبان اور اگربتی کی خوشبو اور دھوئیں سے بھرا تھا۔ ساجدہ ماں کے سرہانے بیٹھی تلاوتِ قرآن پاک کر رہی تھی اور شہاب کرسی پر بیٹھا تھا۔ پڑوس کی ایک ضعیفہ نے پیش کش کی "میں چاہتی ہوں کہ یہاں لاش کے پاس میں بیٹھوں اور تم لوگ ذرا آرام کر لو۔"

"نہیں خالہ جان! آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہم خود ہی ساری رات جاگیں گے۔ کیا میری ماں کو پھر زندہ ہونا ہے کہ مجھے رات میں جاگنا پڑے گا" ساجدہ نے کہا۔

مردوں میں سے جس نے وہاں ٹھہرنے کی خواہش ظاہر کی ان کو شہاب نے یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ اب تجہیز و تکفین کا کام تو کل صبح ہی ہوگا۔ کافی رات گزر چکی ہے اور سردی بھی بہت ہے۔

اب مرحومہ کے کمرے میں بھائی اور بہن رہ گئے۔ دیوار کی گھڑی ٹک ٹک کرتی وقت کے گھوڑے کو ہانک رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی کا تسلط تھا۔ ساجدہ نے قرآن پڑھتے پڑھتے شہاب کی طرف دیکھا۔ شہاب کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو آنسو بھی نہیں تھے۔ وہ نہایت مطمئن نظر آ رہا تھا جیسے وہ اس سانحہ کے لیے پہلے سے ہی تیار تھا۔ ساجدہ قرآن مجید پڑھتے پڑھتے رک جاتی اور پھر سسکی لینے لگتی تو شہاب قریب جا کر کہتا "آنسو بہانے اور بین کرنے کا آخر حاصل کیا ہے؟ موت برحق ہے۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ ماں نے ہماری موجودگی میں بغیر کسی تکلیف کے موت کو گلے لگایا ہے۔"

حکیم عنایت کالونی گیا، بہار۔ ۸۲۳۰۰۱

دونوں کو ماں کے تمام حرکات و سکنات یاد آرہے تھے۔ ماں نے کبھی انھیں ڈانٹا پھٹکارا نہیں۔ کبھی کسی قسم کی فرمائش نہیں کی۔ کبھی ان کے نجی معاملات میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔ ماں کی دنیا انھیں دونوں تک محدود تھی۔ ان کی خوشی، ان کی خوشحالی ہی ماں کی زندگی کا واحد مقصد رہا تھا۔ وہ دن اور رات کا زیادہ وقت نماز، تلاوت، تسبیح و ثنا میں گزارتی تھیں۔ وہ شاید ہی کبھی دوسرے کا ذکر کرتیں یا کسی کے خلاف حرف شکایت زبان پر لاتی تھیں۔ صبر و قناعت کا وہ ایک جیتا جاگتا مجسمہ تھیں۔ ماں کی موجودگی میں ان دونوں نے کبھی کسی کمی کا احساس نہیں کیا تھا۔ ماں کی موت سے ان کی زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔

نماز فجر کی اذان ہونے لگی تو شہاب نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی اور پھر آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ شہاب نے دیکھا کہ کھڑکی کی اوٹ سے کوئی شخص اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہاب کو اس شخص کی یہ حرکت بہت بری لگی۔ اس نے کرخت آواز میں کہا "تم اس کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اندر کیوں جھانک رہے ہو؟" "میں۔ میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں مرحومہ۔ ۔ ۔ ۔ کی صورت دیکھنا چاہتا ہوں" اس شخص کے چہرے پر عجیب کرب تھا۔ "کون ہے، شہاب؟ کہیں کوئی پاگل یا چور اُچکا تو نہیں؟" ساجدہ نے سرگھما کر شہاب سے دریافت کیا۔ "پتا نہیں، یہ کوئی خبطی یا پاگل ہی ہے۔ کہتا ہے وہ مرحومہ کی صورت دیکھنا چاہتا ہے" شہاب نے جواب دیا۔ "تم نے یہ نہیں دریافت کیا کہ آخر وہ ہے کون؟ اور وہ مرحومہ کا چہرہ کیوں دیکھنا چاہتا ہے؟" ساجدہ نے پھر سوال کیا۔

میرے کچھ پوچھنے کے پہلے ہی وہ کھڑکی سے پرے ہٹ چکا تھا اور پھر چپ چاپ پھاٹک سے باہر چلا گیا۔

صبح ہوئی تو غسل کے بعد کفن پہنا کر جنازہ کو باہر میدان میں لایا گیا کہ نماز جنازہ پڑھائی جائے۔ شہاب کو یہ دیکھ کر عجیب حیرت اور کوفت ہو رہی تھی کہ وہی اجنبی شخص جو صبح کھڑکی سے اندر جھانک رہا تھا پہلی صف میں تھا اور جب جنازہ اٹھایا جانے والا تھا تو وہ سب سے آگے تھا۔ نماز جنازہ کے بعد جب لوگ قبرستان کی طرف چل پڑے تو بھی وہ پیش پیش تھا۔ قبر میں جنازہ کو لٹانے کا وقت آیا تو بھی وہ پیش پیش تھا۔ البتہ وہ جب قبرستان سے گھر لوٹ رہے تھے اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔

شہاب دوسرے دن اول صبح قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تو دیکھا کہ کسی نے اگربتی جلائی تھی جو اب تک جل رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا کیوں کہ ان لوگوں کو جاننے والا یا ان کا عزیز یا رشتہ دار وہاں نہیں تھا۔ پھر اس نے سوچا شاید گورکن نے اگربتی جلائی ہو۔ وہ فاتحہ پڑھ کر لوٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ گورکن وہاں آیا اور سلام کرنے کے بعد اس نے اگربتی جلائی۔ شہاب کو پھر خیال ہوا کہ آخر اس سے پہلے اگربتی جلانے والا یہاں کون شخص تھا؟

قل کے دن بھی وہ اجنبی شخص نظر آیا لیکن لوگوں کی بھیڑ میں وہ پھر غائب ہو گیا اور شہاب اس شخص سے اکیلے میں مل سکا نہ کچھ بات کر سکا۔ شہاب اس سلسلے میں ساجدہ سے گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن ساجدہ کچھ اتنی مشغول اور غمگین تھی کہ وہ خاموش رہا۔ قل کے بعد ساجدہ نے ماں کا بکس کھولا کہ ان کے کپڑوں کو غریب اور ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کر دے۔ انھیں کپڑوں کے نیچے اسے کئی تصویریں اور خطوط ملے جو الگ الگ لفافوں میں بند تھے۔

ساجدہ نے یہ ساری چیزیں محفوظ کر لیں اور رات میں شہاب کے سامنے پیش کیں کہ جو ضروری ہوں انھیں بہ حفاظت رکھا جائے اور غیر ضروری کو ضائع کر دیا جائے۔ ایک نہایت بوسیدہ تصویر دیکھ کر شہاب کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

یہ اس کی ماں کی شاید شادی کی تصویر تھی اور ساتھ میں جس مرد کی تصویر تھی وہ اس اجنبی شخص سے بہت مشابہت رکھتی تھی۔ وہ عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ شہاب کے چہرے کے تاثرات نے ساجدہ کو بھی اس کی جانب متوجہ کر دیا "کیوں، کیا بات ہے ــــ؟ یہ تو بلاشک امی کی تصویر ہے ــــ اور شاید ــــ یہی ہمارے ابا کی تصویر ہو ــــ، تم یہ تصویر دیکھ کر رک کیوں گئے؟"

شہاب کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں لیکن اپنے جذبات کو ساجدہ سے پوشیدہ رکھتے ہوئے کہا "نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔"

اور پھر دونوں دوسری تصویریں دیکھنے لگے۔

یہ تصویریں زیادہ تر ان کے بچپن کی تھیں یا پھر ان کی ماں کی تھیں۔ خطوط کا بھی ان لوگوں نے سرسری جائزہ لینا شروع کیا۔ انھیں اتفاق سے ایک خط ملا جو ان کے باپ نے ان کی ماں کے نام لکھا تھا۔ انھیں اتنا تو پتا تھا ہی کہ ان کے باپ کا نام آفتاب احمد تھا۔

شمع! اللہ تمھیں اور بچوں کو خوش رکھے!

مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں نے اپنے والدین کی خواہشات و آرزوؤں کا احترام کرتے ہوئے تم سے شادی کر لی۔ مجھے شادی سے پہلے ذرہ برابر بھی تمہاری محبت کا پتا ہوتا تو ہرگز ہرگز میں تمہاری محبت کا خون نہیں کرتا۔ اگر تم نے شادی کی پہلی رات یا بعد میں بھی صاف صاف مجھے سب کچھ بتا دیا ہوتا تو میں ہرگز تمہارے راستے کا پتھر نہیں ثابت ہوتا بلکہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ تمہیں تمہارے عاشق سے ملا دوں۔ لیکن مجھے غصہ صرف اس بات کا ہے کہ تم نے مجھے فریب دیا۔ تم دنیا والوں کی نظر میں میری وفادار بیوی بنی رہیں اور تمہارا معاشقہ فراز احمد سے چلتا رہا۔

مجھے افسوس اور غم اس بات کا ہے کہ میرے بچے باپ کے ہوتے ہوئے یتیم ہیں کیوں کہ تمہارے پاس یا تمہارے عاشق کے پاس اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ تم دونوں سرعام اپنی محبت کا اقرار و اعتراف کر لو۔ میں نے تمہیں طلاق صرف اس لیے نہیں دیا کہ اس سے نہ صرف تمہاری بلکہ تمہارے سارے خاندان والوں کی سبکی ہوگی۔ لوگوں میں اس کا چرچا ہوگا۔ بہرحال! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم مجھے جیتے جی نہیں دیکھ سکوگی۔

بدنصیب

آفتاب احمد

خواب تمہارا کوئی نہیں ہے

ساجدہ اور شہاب نے خط پڑھ کر ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا کسی کے پاس بھی جیسے بولنے کو ایک لفظ بھی نہیں تھا۔ بس یوں ہی بے خیالی میں دونوں نے ایک اور خط کھولا ــ خط لکھنے والا فراز احمد تھا ــ فراز احمد کون تھا ابھی ابھی خط سے پتا چل چکا تھا اس لیے دونوں نے اس خط کو بغیر پڑھے تہہ کر کے رکھ دیا، کچھ دیر تک دونوں گم سم بیٹھے رہے ــ دونوں

باقی صفحہ کور ۳ پر

م۔ک۔ مہتاب

سپیرے

مجھے لوک سنگیت سننے کا شوق ہے اور یہ شوق مجھے ایسی ایسی جگہوں میں لے جاتا ہے جہاں سفید پوش یا شریف لوگ عام طور پر جانا پسند نہیں کرتے۔

ہمارے محلے کے سامنے ریلوے لائنوں کے پار جھاڑیوں کے عقب میں غریب لوگوں کی جھگیوں کی ایک بستی ہے۔ ایک صبح میں سیر سے لوٹتا ہوا اُدھر سے گزرا تو مجھے کسی جھگی سے بین کی مدھر آواز سنائی دی۔ میں آواز کا تعاقب کرتا ہوا آواز کے سار تک پہنچ گیا۔ ایک جھگی کے باہر ایک شخص چارپائی پر بیٹھا بین بجا رہا تھا۔ بین جس پر چھوٹی کوڑیاں اور آئینے لگے ہوئے تھے۔ بین پر اس شخص کی انگلیاں ایک فنکار کی طرح رقص کر رہی تھیں۔

اس شخص کا نام درشن سنگھ تھا۔ اس نے مجھے اشارے سے ایک موڑھے پر بیٹھ جانے کے لیے کہا اور میں ایک پون گھنٹہ بین اور لوک سنگیت سنتا رہا۔ درشن سنگھ کئی اقسام کی دھنیں بجا سکتا تھا۔ یہی قریب تیس چالیس برس کا گندمی رنگ کا تنومند شخص۔ کسی سانپ کی مانند چمکتی آنکھیں۔ ترشی ہوئی سیاہ گھنی داڑھی اور چمکتی ہوئی مونچھیں۔

میں اسے پانچ روپے نذرانہ دے کر چلا آیا۔

لیکن جیسے مجھے اس کی بین کے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ میں ہر ہفتے دس دن کے بعد اس کی بین سننے کے لیے وہاں جانے لگا۔ میرے وہاں جانے سے اسے بھی کچھ انعام مل جاتا تھا اور اس کی قدر افزائی بھی ہوتی تھی جس سے خوش ہو کر وہ ہر بار مجھے اپنے فن کا کمال دکھاتا تھا۔

درشن سنگھ نے مجھے بتایا کہ وہ بہت دن سے ادھر جھگی ڈال کر رہتے ہیں۔ اس کی بیوی مورتی اندر چولہے پر کھانا پکا رہی ہوتی تھی اس کے دو بچے سوہنا اور لڑکی رادھا بھی تھے۔ رادھا ماں کے پاس بیٹھی دکھائی دیتی اور لڑکا ادھر اُدھر کھیلتا یا باپ کے پاس آ بیٹھتا تھا۔ درشن کا کہنا تھا کہ بین بجانا آسان نہیں ہے اس کے لیے بہت ریاضت کرنی پڑتی ہے وہ سوہنے کو بھی بین بجانا سکھائے گا۔

میں نے اس سے کہا کہ وہ بچے کو کوئی اور کام کیوں نہیں سکھاتا؟ تو درشن کہنے لگا کہ بابو جی۔ اور کام پیسے اور پڑھائی کے بغیر نہیں ہو سکتے۔ بین بجانے پر کچھ خرچ نہیں آتا اور قدر داں لوگ خوش ہو کر ہماری روزی روٹی کے لیے کچھ دے دیتے ہیں۔ اس نے بھی یہ فن اپنے باپ سے سیکھا تھا جسے لوگ محلوں میں بلا کر بین سنتے تھے اور انعام دیتے تھے۔

درشن سنگھ جب تہمد اور کرتا پہنے چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا ہوتا ہے تو کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک سپیرا ہے لیکن وہ جب لو دس بجے کے قریب کام کے لیے نکلتا ہے تو بھیس بدل لیتا ہے۔ کانوں میں پیتل کی چوڑی بالیاں اور گلے میں موتیوں کے ہار پہن لیتا ہے۔ ان کے اوپر زعفرانی رنگ کا بڑا سا چغہ ڈال لیتا ہے اور سر پر بھی گیروے رنگ کی پگڑی باندھ لیتا ہے۔ کندھے پر لمبا سا بانس رکھ لیتا ہے جس کے دونوں طرف گیروے رنگ کے دو تھیلوں میں بانس کی ٹوکریاں رکھی رہتی ہیں جن میں اس کے سانپ ہوتے ہیں۔ پھر وہ بالکل مختلف انداز میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ بین بجاتا ہوا مختلف گلی محلوں کے چکر لگاتا ہے جہاں بین سننے کے شوقین یا سانپ دیکھنے کے خواہش مند بچے اسے روک لیتے ہیں۔

وہ لہک لہک کر بین بجانے لگتا ہے اور ٹوکریوں پر سے ڈھکن اٹھائے جاتا ہے۔ جب بین سے ٹوکری کو چھوتا ہے تو سانپ پھن اٹھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بچے تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ لوگ روپیہ آٹھ آنا اس کی جانب پھینکنے لگتے ہیں۔

درشن سنگھ کا کہنا ہے کہ یہ تو اس کا روزی کمانے کا ڈھنگ ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ بین کی آواز سن کر سانپ پھن کھڑا کر لیتے ہیں اور جھومنے لگتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سانپ کے تو کان ہی نہیں ہوتے وہ آواز سن ہی نہیں سکتا۔ بین قریب جانے سے وہ ڈر جاتا ہے اور اپنی حفاظت کے لیے پھن اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن اسے اس سے کچھ غرض نہیں۔ بچے خاص طور پر یہ تماشا دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور درشن سنگھ کو دن بھر میں تیس چالیس روپے مل جاتے ہیں، جس سے گھر اور سانپوں کا خرچ نکل جاتا ہے۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ سوچا ہی نہیں۔ وہ صبح حقہ تازہ کر کے بیٹھتا ہے اور گھنٹہ بھر بین بجانے کی ریاضت کرتا ہے۔

درشن کے پاس ایک بہت بڑا کالا ناگ بھی ہے جس کا نام اس نے اپنے باپ کے نام پر "شیو" رکھا ہوا ہے۔ درشن کہتا ہے کہ جب وہ یہ ناگ دکھاتا ہے اور جب بین نزدیک لانے

اے ۸۱/۱، پچھم وہار، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۳

سے ناگ دو فٹ اونچا کھڑا ہو جاتا ہے تو ہندو عورتیں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے سر جھکا دیتی ہیں۔ وہ آٹا اور گڑ اس کے سامنے لا کر رکھتی ہیں جس سے درشن ہر روز دو چار کلو آٹا بھی جمع کر لاتا ہے۔

درشن کو اپنے والد سے دو چیزیں وراثت میں ملی تھیں۔ ایک یہ حقہ جس پر پیتل اور چاندی کے چھلے پڑے ہوئے ہیں اور دوسرا یہ کالا ناگ جو اس کی گزر بسر کا ایک ذریعہ ہے۔

درشن کی بین اور سانپوں نے گویا مجھ پر بھی جادو کر دیا ہے اور میں بھی مہینے میں ایک دو بار اس گندی بستی میں ضرور جاتا ہوں۔

اس برس بارشیں معمول سے زیادہ ہوئی تھیں۔ لائنوں میں اور لائنوں کے پار جھاڑیوں میں پانی بھر گیا۔ دلدل ہو گئی راستے بند ہو گئے۔ میں نے سیر کے لیے اس جانب جانا چھوڑ دیا۔ نومبر میں دیوالی کے بعد مجھے ایک دن درشن کی بین کی یاد آئی اور میں اس کے لیے کچھ مٹھائی لے کر اس بستی میں گیا۔

جھگیوں کی بستی سے پانی نکل گیا تھا اور بہت سے لوگ لوٹ بھی آئے تھے لیکن پہلی سی چہل پہل نہیں تھی۔ درشن کی جھگی میں بھی کوئی رونق نہیں تھی۔ نہ چارپائی نہ حقہ نہ درشن۔ درشن کی بیوی مورتی جس کا چہرا اترا ہوا تھا چولہے پر روٹی بنا رہی تھی۔ لڑکا گلی میں کھیل رہا تھا۔

مورتی نے مجھے بڑے دلگداز لہجے میں بتایا تھا کہ جن دنوں پانی آیا تھا تو بستی سے کچھ دور پیڑ کے ایک درخت کی جڑوں سے کئی سانپ نکلے تھے۔ بستی کے سپیرے انھیں پکڑنے گئے تھے، سانپ بہت خطرناک تھے۔ ایک سانپ نے درشن کو ڈس لیا اور وہ گھر تک بھی نہیں پہنچ سکا۔

اس المیہ کے بعد اس چھوٹے سے کنبے پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ مورتی بتا رہی تھی کہ سوما ابھی نہ بین بجا سکتا ہے اور نہ ہی سانپوں کا تماشا دکھا سکتا ہے۔ میں نے مورتی سے کہا کہ وہ سومے کو کسی اور کام میں ڈال دے تو وہ کہنے لگی پیسے اور پڑھائی کے بغیر کون کام ہو سکتا ہے — مزدوری ہے، وہ میں اینٹوں کے بھٹے پر کرنے کے لیے جاتی ہوں۔ جو کچھ ملتا ہے اس سے بچوں کا پیٹ پال رہی ہوں۔ سانپ ہم نے بیچ دیئے ہیں۔

میں نے مورتی کو بتایا کہ سرکار نے غریب لوگوں کی مدد کے لیے ایک پروگرام شروع کیا ہے جس کے تحت اگر کسی کنبے کا واحد کماؤ فرد مر جائے تو اس کی بیوی بچوں کو دس ہزار روپیے کی مدد دی جاتی ہے۔ مورتی اور سومے کو میری بات پر یقین نہیں تھا۔ انھوں نے دس ہزار کی رقم نہ کبھی دیکھی تھی نہ سنی تھی لیکن جب میں نے مورتی سے فارم بھروا کر تصدیق کے بعد جمع کرا دیے اور رقم منظور ہو گئی تو وہ حیران رہ گئے کہ اگر واقعی انھیں اتنی رقم مل گئی تو وہ اس کا کیا کریں گے؟

اس کا جواب بھی میں نے ہی انھیں بتایا۔

رقم ملنے پر انھوں نے اپنی جھگی کے گرد دیوار بنوالی۔ میں نے ان سے کہا کہ گلی کی جانب چھوٹی سی دوکان بنا لیں جہاں مورتی بیٹھا کرے۔ سومے کو میں نے ایک ریڑھی بنوا دی اور سبزی منڈی میں اس کا تعارف اپنے ایک دوست سے کروا دیا۔ سوما ہر روز ریڑھی پر کچھ سبزی لے آتا۔ گلی محلوں میں فروخت کر دیتا۔ جو سبزی بچ جاتی وہ مورتی شام کو اپنی دوکان پر اونے پونے فروخت کر دیتی۔

کچھ دنوں میں ہی گویا ان کی کایا پلٹ گئی انھیں اعتماد ہو گیا کہ وہ بین ہی نہیں بجا سکتے کوئی اور کام بھی کر سکتے ہیں۔

ایک روز جب میں کام سے لوٹا تو میری بیوی نے مجھ سے کہا۔

"وہ سوما سبزی والا دوپہر کو آیا تھا۔ اس کی ریڑھی کا چالان ہو گیا ہے، کیوں کہ اس کے پاس کمیٹی کا اجازت نامہ نہیں تھا۔ اس کا کچھ کریں۔"

مجھے سومے کی ریڑھی کے چالان کی خبر سے اتنا غم نہیں ہوا جتنی خوشی اس بات سے ہوئی کہ میری بیوی نے سوما سپیرا نہیں بلکہ اسے سوما سبزی والا کہا تھا۔ ●

بقیہ: بھگت سنگھ حب الوطنی کی ایک عظیم مثال

مقبولیت حاصل ہوئی۔ بھگت نے اپنی داڑھی مونچھیں صاف کرالیں پھر پولیس کو دھوکہ دیے اور کلکتہ پہنچنے کے لیے وہ لاہور سے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے وہ اترپردیش اور بنگال کے انقلابی حلقوں میں چلے گئے۔

ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کی میٹنگ میں پبلک سیفٹی بل اور ٹریڈ ڈسپیوٹس بل کے مجوزہ جبری قوانین پر افسوس اور غصے کا اظہار کیا گیا۔ احتجاج کے طور پر یہ اسکیم بنائی گئی کہ دہلی میں امپیریل اسمبلی ہال میں، جب اس کا اجلاس چل رہا ہو بم پھینکا جائے اور اپنے آپ کو گرفتار کرایا جائے پھر عدالت کو اپنے نظریے کی تشہیر کے لیے ایک فورم کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں بھگت سنگھ اور بی۔ کے۔ دت کو نامزد کیا گیا کہ وہ مقررہ دن یعنی ۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو اس منصوبے کو عملی جامہ پہنائیں۔ جہاں جو کسی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر امپیریل اسمبلی ہال میں بم کا دھماکہ کیا گیا۔ بھگت سنگھ اور دت دونوں آسانی سے فرار ہو سکتے تھے، لیکن انھوں نے خود سے اپنے آپ کو گرفتار کرا دیا۔ بعد میں عدالت نے بم پھینکنے کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے بھگت سنگھ نے بتایا کہ یہ بم انگلینڈ کو اس کے خوابوں سے جگانے کے لیے ضروری تھا۔

آزاد ہندوستان

بھگت سنگھ نے ایک ایسے آزاد ہندوستان کا خواب دیکھا تھا، جو کہ کارکنوں اور کسانوں کی ایک اعلا سوشلسٹ جمہوریہ ہوگا۔ موت کی سزا کا انتظار کرتے ہوئے بھی انھوں نے حکام کے خلاف اپنی جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا۔ جیل میں اصلاحات کی مانگ کرتے ہوئے انھوں نے ۱۵ جون سے تین مہینے کی بھوک ہڑتال کی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو راج گرو اور سکھ دیو کے ساتھ انھیں آدھی رات کے وقت پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ●

بقیہ: دیہی اور زرعی کہاوتیں سائنس کی کسوٹی پر

والی نسلوں کے حوالے کر رہا ہے تا کہ وہ بھی اس بیش بہا خزانے سے فائدہ اٹھا سکیں اور اپنی کھیتی کے فروغ میں چار چاند لگا سکیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ساری زرعی کہاوتیں آج کی سائنس سے جڑی ہوئی ہیں اور موجودہ سائنس کی کسوٹی پر پوری طرح کھری اترتی ہیں۔ اس کا ہمیں پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ●

غزلیں

سیدل سرحدی

کسی کی محفل میں آ گئے ہم یہ سوچ کر بار بار شاید
ہوں اپنے طرزِ عمل پہ نادم کیے پہ ہوں شرمسار شاید

یہ بیکلی بیکلی فضا ہے گلشن تمام ماحول سہمی سا
لپٹ کے رویا ہے رات پھولوں سے کوئی دلدار شاید

شکستہ تاجیں فسردہ کلیاں یہ زرد پتے یہ صحن ویراں
خزاں کو آواز دے رہا ہے یہاں غرورِ بہار شاید

یہ شب کو بھی بے قراری، یہ راتوں میں اٹھ کے آہ و زاری
پڑوس میں کوئی ایسا ہے ستم زدہ دل فگار شاید

نصیحتوں کا اثر ہوا ہے یہ کوششیں کارگر ہوئی ہیں
خرد تو بھی ہوشیار بے شک جنوں بھی تھا پختہ کار شاید

سنوار دے زندگی کسی کی یا عاقبت کو خراب کر دے
تمہاری نظروں کے اک اشارے پہ اب ہے دار و مدار شاید

وہی ٹھکانہ ہے غم میں ممکن، وہیں پہ شاید بہل سکے جی
چلو چلیں میکدے میں سیدل فضا ہے خوشگوار شاید

نگینہ شعبۂ اشاعت سنت نرنکاری منڈل سنت نرنکاری کالونی، دہلی ۹

غمگیں قریشی

مہکی ہوئی ہر صبح کا عالم ہے ترا نام
اے ماہ حسیں پیار کا موسم ہے ترا نام

زخموں کو جو پھولوں کی شباہت میں بدل دے
دل والوں کی بستی میں وہ مرہم ہے ترا نام

تو میرے لیے کیا ہے یہ مت پوچھ، مگر دوست
دنیا کے لیے حسنِ مجسم ہے ترا نام

اے جانِ غزل میں تجھے کیا کہہ کے پکاروں
عشرت ہے کہیں اور کہیں غم ہے ترا نام

شہرت کا میں قائل نہیں سچائی تو یہ ہے
غمگیں کی قسمت میں بہت کم ہے ترا نام

ڈھولی کھال، سہارنپور، یو پی ۔ ۲۴۷۰۰۱

ریاض خلجی

قسمت کا ہے یہ کھیل ترے ہاتھ میں ہے
ہاری مری اے دوست ابھی مات نہیں ہے

یہ شمعِ حقائق ہے اسے کون بجھائے
یہ میری کوئی شمعِ خیالات نہیں ہے

اب ہم پہ ترے گیسوئے شب گوں کا ہے سایہ
اب ہم کو غمِ گردشِ حالات نہیں ہے

وہ بات بھی کیا بات ہے جس بات سے پیدا
دنیا کے تعلق سے کوئی بات نہیں ہے

وہ مجھ سے ریاض آج اگر دور ہیں تو کیا
سایہ بھی مرا آج مرے ساتھ نہیں ہے

۲۱۹، گلی لعل بندان، محلہ قانون گویاں، مالیر کوٹلہ ۱۴۸۰۲۳ (پنجاب)

مشعلِ مہر و وفا

رضا امروہوی

گھر کو اپنے مہرِ الفت سے درخشاں کیجیے
جذبۂ تعمیر سے جنت بداماں کیجیے

مشعلِ مہر و وفا کو یوں فروزاں کیجیے
تیرگی کی سرحدوں میں بھی چراغاں کیجیے

اپنی فہم و فکر کی رعنائیوں کے فیض سے
زیست گر دشوار ہو جائے تو آساں کیجیے

زندگی کے مقصدِ دشوار کے پیشِ نظر
اپنے گل ہائے عمل سے گھر گلستاں کیجیے

اپنے کردار و عمل کی تابشوں سے ہر گھڑی
زندگانی کی ہر اک منزل فروزاں کیجیے

اپنے اخلاص و مروت کی بدولت ہر قدم
زندگانی آپ، اپنی کیف ساماں کیجیے

رابطہ رکھیے ہمیشہ جذبۂ ایثار سے
دل کو اپنے کبر و نخوت سے گریزاں کیجیے

بی اینڈ ٹی بلاک نمبر ۲/۱/۱۳، کالی باڑی مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

رباعیات

راشد رشاد موج

معبود کو یاد لوگ کرتے کم ہیں
مرتے ہیں روز، حق پہ مرتے کم ہیں
انسان کو انساں سے ڈر ہے ہر وقت
اللہ سے لوگ موجؔ ڈرتے کم ہیں

○

کرنے کو ہیں امورِ دنیا کتنے
دل ایک ہے اور اتنے فتنے
دنیا نے مگر اتنا کس کے جکڑا
دنیا سے دور دور بھاگے جتنے

○

نکلے مطلب کے دوست دیکھے جتنے
کھائے ہیں فریبِ دل نے کتنے کتنے
میں بھول گیا سارے زمانے کے ستم
ڈھائے ہیں ظلم سب نے اتنے اتنے

○

کوئی تو ہے جس نے مجھے تڑپایا ہے
وہ کچھ تو ہے جو دل پہ مرے چھایا ہے
اے موجؔ یہ مانا مجھے دھوکا ہی سہی
دھوکا بھی یہ کتنا بڑا سرمایہ ہے

○

سورج کی کرن پیام لے کر آئی
رنگین شفق کا جام لے کر آئی
یہ بادِ نسیم بھی ہے کتنی پُرکیف
صبحِ نو کا پیام لے کر آئی

موج مارگ - فتح گڑھ، یوپی - ۲۰۹۶۰۱

عادل اسیر

جب خواب نہ دیکھو گے تو کیسی تعبیر
جب رنگ نہ ہوگا تو کہاں کی تصویر
جب آج نہ بنیاد رکھو گے عادلؔ
کل کس طرح دیوار کرو گے تعمیر

○

ہر حشمتِ وطن کو وہ ودمن سے اچھی
پژمردہ کلی سرو سمن سے اچھی
آنکھوں سے نہیں دیکھا یقیں ہے لیکن
جنت بھی نہیں ہوگی وطن سے اچھی

○

شیطاں ہے، فرشتے کا بھی گرویدہ ہے
ظاہر ترا باطن میں ہی پوشیدہ ہے
یزداں کے سوا کون سمجھ سکتا ہے
انساں تری فطرت بڑی پیچیدہ ہے

○

کاہل کو بھی پُرجوش بنا دیتا ہے
دیوانے کو باہوش بنا دیتا ہے
اندازِ مخاطبت کسی کا عادلؔ
مجھ کو ہمہ تن گوش بنا دیتا ہے

○

جس کا یہ فلک اور زمیں ہے بابا
کیا دل میں ہی پوشیدہ نہیں ہے بابا
محسوس تو ہوتا ہے یہ معلوم نہیں
سربستہ کوئی راز کہیں ہے بابا

۳۲۱۲ پھاٹک تیلیاں، ترکمان گیٹ - دہلی - ۶

نظمیں

نئے موسموں کی آہٹ

عظمیٰ ملک

بھیگی شام میں
نم مٹی کی مہک لے کر
سرسراتی ہوا
پتوں کو چھیڑتی، گنگناتی
بادلوں کے سنگ جھومتی
میرے دریچے سے
جھانک کر
شرارت سے
میرے بال چھو کر
سرگوشی میں کہہ گئی
جاگو سنو نئے موسموں کی آہٹ
سارے دریچے کھول دو
پھر دیکھنا
میں تمہارا دامن بھر دوں گی
پھولوں سے اور خوشبو سے
مانا بہت تھکی ہو تم
لیکن ابھی نہ سونا
نیند کی وادی میں اندھیروں کے سوا
کچھ بھی نہیں
دیکھو کہیں سو نہ جانا
میں تمہیں دوں گی ابھی نئی چاندنی
بارش کی پہلی بوندیں
جب پیاسی دھرتی پر برسیں گی
جب ہری گھاس کی نئی کونپلیں
پھوٹیں گی
تب میں تم سے ملوں گی
کہیں نہ کہیں

ای-۴۴- آکاش بھارتی سوسائٹی- پلاٹ نمبر ۲۲- پٹ پڑ گنج، دہلی

شمعِ محبّت جلائیے

شہناز چاندنی

آپ وفا سے آتشِ نفرت بجھائیے
توفیق ہو تو شمعِ محبت جلائیے

غم دوسروں کے اپنے سمجھ کر اٹھائیے
بیمار بے کسوں کو گلے سے لگائیے

مجبور، بے سہارا کی ہمت بڑھائیے
فٹ پاتھ سے اٹھا کے گھروں میں بسائیے

انساں ملیں تو ہاتھ نہیں، دل ملائیے
ورنہ ذرا سنبھال کے دامن بچائیے

پھولوں کے راستے میں نہ کانٹے بچھائیے
رونق چمن کی سوچ سمجھ کر بڑھائیے

دنیا کو اپنے جینے کا مقصد بتائیے
ان پڑھ جہاں ملیں انہیں پڑھنا سکھائیے

خیرات دینے والے سبھی تک نہ جائیے
محنت سے زندگی کا تعارف کرائیے

شہناز اپنے علم کے جوہر دکھائیے
چہروں پہ کیا لکھا ہے یہ پڑھ کر بتائیے

معرفت غمگیں قریشی، ڈھولی کھال، سہارنپور - ۲۴۷۰۰۱

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبر نامہ)

۱۹۹۵-۹۶ء کے دوران ریلوے پیداوار اکائیوں کی کارکردگی

۱۹۹۵-۹۶ء کے دوران ریلوے کی پیداوار یونٹوں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک یونٹ نے نشانے سے تجاوز کیا ہے۔ ۱۹۹۵-۹۶ء کے دوران بنگلور میں واقع پہیے اور ایکسل پلانٹ نے ۵۵۴۵۰ پہیے اصل نشانہ ۲۳۳۱۰ کے مقابلہ میں تیار کیے اور ۱۳۵۴ ایکسل اصل نشانہ ۱۲۱۹۴ ایکسل کے مقابلہ میں تیار کیے۔ ۱۹۹۵-۹۶ء کے دوران چترنجن کے انجن بنانے والے کارخانے (سی ایل ڈبلیو) نے ۱۳۰ اصل نشانہ کے مقابلہ میں ۱۳۵ انجن بنائے۔ اس سال کے دوران ڈیزل لوکو موٹیو ورکس نے ۱۳۸ ڈیزل انجن بنانے کا نشانہ پورا کیا۔ پھر بھی انٹیگرل کوچ فیکٹری مدراس اور راور کپلا نے مجوزہ ٹارگیٹ سے کم کارکردگی کی۔ آئی سی ایف مدراس نے مجوزہ نشانہ ۸۹۹ کے مقابلہ میں ۸۹ کوچ تیار کیے۔ یہ ایک بہت کم گراوٹ ہے۔ آر سی ایف نے صرف ۶۱۷ کوچ اصل ٹارگیٹ ۸۶۴ کے مقابلہ میں تیار کیں، یہ کمی صنعتی تعلقات کے مسائل کی وجہ سے ہوئی۔ ●

نیوکلیائی زراعت اور خوراک ٹکنالوجی

بھابھا اٹامک ریسرچ سینٹر سے مربوط "فصل فروغ پروگرام" کے تحت "فارم ۱۸ کی دالے کی قسم" جو پھپھوند سے محفوظ رہتی ہے، ۱۹۹۵-۹۶ء کے دوران کاشت کے لیے جاری کی گئی ہے۔ ایک اعلا نفع بخش بڑے دانہ والی مونگ پھلی کی قسم، ٹی کے جی ۱۹-اے کی بھی برائے کاشت کونکن علاقہ میں کاشت کے لیے جاری کی گئی۔ اسی دوران ٹی جی ۲۶، اعلا نفع بخش مونگ پھلی کی قسم جو کم لمبی گچھہ دار ہے، ربیع/گرمی کی کاشت کے لیے جاری کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ٹرامبے میں مختلف فصلوں اور ساتات کو لاحق ہونے والی کیڑے مکوڑوں کے ذریعہ پھیلنے والی بیماریوں، اناج کے ذخائر کو نقصان پہنچانے والے عناصر کے ضمن میں تجربہ کیا گیا ہے۔

۱۹۹۵-۹۶ء کے دوران تارک کے گوشت سے پروٹین پوڈر بنانے کے لیے ایک عمل دریافت کیا گیا۔ سیب کے عرق سے کسٹرڈ بنانے کے ضمن میں بھی خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے۔ "مرغ"، "سیف اور بھیڑ کے گوشت کو چار ہفتوں تک محفوظ رکھنے کے لیے گاما تابکاری سے مدد لی گئی ہے اور اس سے گوشت کی ایسی محفوظ رہنے کی صلاحیت کو متاثر کیے بغیر گوشت محفوظ رکھنے کے معاملہ میں کامیابی حاصل ہوگی۔ خشک جھینگا، کمرے کے درجہ حرارت پر چار ہفتوں تک محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ ●

برآمدکاروں کے لیے کپاس کی ۲ لاکھ گانٹھیں

حکومت نے دو لاکھ اسٹیپل کاٹن کی گانٹھیں جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ رواں کپاس سیزن میں کاشت کاروں سے کپاس کی نکاسی شروع ہو جائے۔

اس مقدار میں سے ۵۰۰۰ گانٹھیں گجرات اعلا اختیاری امداد باہمی فیڈریشن کو جاری کی گئی ہیں اور ۵۰ ہزار گانٹھیں کاٹن کارپوریشن آف انڈیا کو برائے برآمدات جاری کی گئی ہیں۔ اس ادارے کو جاری کپاس آندھرا پردیش سے حاصل کی جائے گی۔ جدید کتائی گانٹھ بندی یونٹوں کے ذریعہ برآمد کے لیے ایک لاکھ اسٹیپل کاٹن گانٹھیں جاری کی گئی ہیں۔

کپڑے کی صنعت سے متعلق کمشنر کو مشورہ دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے فیصلے کو فوری طور پر عملی جامہ پہنائے۔ ●

موسمیات کے شعبے میں بھارت۔روس اشتراک

موسمیات کے موضوع پر بھارت۔روس ضمنی ورکنگ گروپ کا پانچ روزہ اجلاس یہاں ۱۵ اپریل ۱۹۹۶ء کو شروع ہوا اور اب تک ۱۹۹۴ء کے ماسکو اجلاس میں تیار کردہ منصوبہ عمل کی پیش رفت کا جائزہ لیا اور آئندہ دو برسوں کے لیے منصوبہ عمل وضع کیے۔

ضمنی ورکنگ گروپ کے دوسرے اجلاس میں اعلا فضائی مشاہدوں کا ملا جلا مطالعہ شامل ہے۔ فی الحال بھارت۔روس باہمی تعاون پروگرام کے تحت مانسون، موسم کی تبدیلی اور فضائی اوزون کے مطالعات پر مشتمل ہے۔

بھارت۔روس موسمیات کے ضمنی گروپ کا قیام ۱۹۹۴ء کی مفاہمتی عرضداشت کے تحت عمل میں آیا جس کا تعلق سائنس اور ٹکنالوجی کے تعاون سے تھا۔ روسی فیڈرل سروس برائے ہائیڈرو میٹرولوجی و ماحولیات کے صدر شری اے۔

آئی سیڈرسکی کی سرکردگی میں وفد بھارت آیا تھا۔ ●

'ارکون' انٹرنیشنل کو ریکارڈ منافع

ارکون انٹرنیشنل لمیٹیڈ جو وزارت ریلوے کے تحت سرکاری دائرہ کار کی صنعت ہے نے ۹۷-۱۹۹۵ء کے دوران ۴۵٫۲۴ کروڑ روپے کا ریکارڈ ٹرن اوور ۴۲٫۵۱ کروڑ روپے کا منافع کمایا ہے۔ اس ادارے نے ۳۵ کروڑ روپے کا غیر ملکی زر مبادلہ بھی کمایا ہے۔

ارکون نے آئی ایس او ۲ ۹ کوالٹی انتظام سند گزشتہ ماہ جرمنی سے حاصل کی ہے۔ کمپنی برطانیہ سے یہ سند پہلے ہی حاصل کر چکی ہے۔ ارکون پہلی بھارتی تعمیراتی کمپنی ہے جس نے یہ اسناد حاصل کی ہیں۔ ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران کمپنی نے ای۔ای۔بی۔پی۔ سے سرکردہ برآمدکار شیلڈ اور دیگر ایوارڈ حاصل کیے ہیں۔ ●

ایٹمی توانائی پر ورکنگ گروپ۔۔۔

منصوبہ بندی کمیشن نے ایٹمی توانائی کے شعبہ میں ملک کی پیش رفت کا جائزہ لینے کے لیے ایک ورکنگ گروپ تشکیل دیا تھا۔ اس ورکنگ گروپ نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ ورکنگ گروپ نویں پنج سالہ پلان کے دوران جاری رکھنے کے لیے پروجیکٹوں اور اسکیموں کی بھی نشاندہی کرے گا۔

ایٹمی توانائی کے شعبہ میں خاص آر اینڈ ڈی پروگراموں کی نشاندہی کے ضمن میں ایک دس سالہ خاکہ بھی تیار کرے گا۔ یہ ورکنگ گروپ یونیورسٹیوں، آئی آئی ٹی اور دوسرے سائنسی اداروں کے ساتھ اونچی سطح پر روابط بڑھانے کے ضمن میں سفارشات بھی پیش کرے گا۔ یہ بھارتی صنعتوں کے کام کے لیے خاص ایریا کی بھی نشاندہی کرے گا۔ اس کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ یہ ورکنگ گروپ کثیر سائنسی اداروں اور قومی اشتراک کے ضمن میں سفارشات بھی تیار کرے گا۔ جس سے بھارتی سائنس داں، سرحد پار بین اقوامی پیمانہ پر ریسرچ میں حصہ لے سکیں۔ ●

لکھنؤ کا تحقیق، ڈیزائن و معیارات ادارہ

لکھنؤ کے ادارے برائے تحقیق، ڈیزائن ومعیارات (آر۔ڈی۔ایس۔او) نے انجنوں کے ڈیزائنوں کے انتخاب کے ضمن میں اور ریلوے کے تئیں نئی تکنالوجیوں کے وضع کرنے کے ضمن میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ آر۔ڈی۔ایس۔او نئے ڈیزائنوں کے وضع کرنے، معیاری سانچے کی کھوج، قانونی منظوری اور جانچ کے ضمن میں مدد کرتا ہے، یہ ریل کے انجنوں، ڈبوں، سگنلوں اور ٹیلی مواصلات کے ساز و سامان، ریلوے لائنوں کی درستی کے علاوہ مشاورتی خدمات بھی مہیا کرتا ہے۔

جانچ کرنے کی سہولیات

آر۔ڈی۔ایس۔او تحقیق اور جانچ کے ضمن میں ایسے آلات اور جدید سہولیات سے آراستہ ہے جو ریلوے سے متعلق ساز و سامان، میٹریل، قیمتی ڈیزائن اور اس کے فروغ کے لیے ضروری ہے۔

انجن سازی میں ترقی

ڈیزل انجن کی جانچ، ڈیزل انجن ریسرچ ادارہ کے مقامی معیار پر پورا اترنے کے لیے ایک تجربہ گاہ بہترین آلات و ساز و سامان کے ساتھ آراستہ ہے اس کی جانچ کے لیے چار آواز حذف کرنے والے بیڈ انگ سے موجود ہیں اس میں انجن اٹھانے کے لیے جدید ڈائنا مومیٹر لگے ہوئے ہیں جن کی طاقت ایک سے لے کر چھ ہزار ہارس پاور تک ہے۔ جانچ کرنے والے بیڈوں میں مائیکرو پروسیسر لگے ہیں، جن میں ایسا کنٹرول کرنے کا نظام ہے جو دباؤ، درجہ حرارت اور دوسرے پیرامیٹر کی ریڈنگ مہیا کرتا ہے۔ ایک وقت میں ۱۲۸ سے زیادہ پیرامیٹر ریکارڈ کیے جا سکتے ہیں۔ یہ سہولیات ایندھن کی صلاحیت بڑھانے، خود اعتمادی، ڈیزل انجن کی وزن کھینچنے کی موجودہ طاقت برقرار رکھنے اور اس نے اعلا کارکردگی حاصل کرنے کے کام آتا ہے۔

صلاحیت جانچنے کی تجربہ گاہ

یہ تجربہ گاہ پروٹو ٹائپ انجنوں، بوگیوں ریلوے کے انجن ڈبے، اسپرنگ اور دوسرے ریلوے ساز و ساماں جانچنے کے لیے ہے۔ اس میں ایک بند لوپ ہوتا ہے جس میں الیکٹرو ہائیڈرولک ماندگی جانچنے کا آلہ لگا ہوا ہے، جو وزن کھینچنے کی شرائط کے تحت پورے سائز کے ڈھانچہ کی جانچ کی سہولیات رکھتا ہے۔ ●

بھارت کی چاول پودے منتقل کرنے والی مشین ازبکستان کو

بھارت کے کم محنت کے ساتھ ہاتھ سے چلنے والی اور چاول کے پودوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والی ٹرانسپلانٹر مشین تیار کرنے میں فنی مہارت حاصل کی ہے۔ پنجاب اگریکلچر یونیورسٹی لدھیانہ نے چھ قطاروں میں ہاتھ سے چلنے والی اس مشین کو میٹ قسم کے پودے کے استعمال کے لیے تیار کیا ہے۔ یہ مشین یکساں فاصلہ پر قطاروں میں پودوں کو منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ فصل کے دنوں میں مزدوروں کی کمی کے مسئلہ پر ٹرانسپلانٹر مشین کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے۔ ایک مشین ایک دن میں ایک ایکڑ رقبے کے کھیت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پودے منتقل کر سکتی ہے۔

ازبکستان کے سفیر مسٹر ایس ایم میرکاسیموف کو مشین پیش کرتے ہوئے آئی سی اے آر کے ڈی جی ڈاکٹر آر ایس پروڈا نے کہا کہ یہ مشین اندرون ملک تیار کردہ تکنالوجی کی ایک بہت بڑی کامیابی کی مظہر ہے۔

دو ممبران کی ازبک ٹیم نے جس کی سربراہی فروغ و باہمی تعاون کے ہند ازبک مرکز برائے ایس اینڈ ٹی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ای اے ذاجی دوف کر رہے تھے۔ حال ہی میں بھارت کا دورہ کیا اور اپنے تحقیقاتی فارموں کے لیے چاول ٹرانسپلانٹر مشین کی حصولی کے سلسلے میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ازبکستان اسٹیٹ کمیٹی کے صدر نے بغیر کسی معاوضے کے مشین فراہم کرنے کی درخواست کی تھی۔ حالاں کہ یہ چاول ٹرانسپلانٹرز مشین تجارتی بنیاد پر ہندوستانی بازاروں میں دستیاب ہیں۔ آئی سی اے آر نے ان میں سے دو مشین

باقی صفحہ ۱ پر

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی. کے. بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر . عابد کرہانی

سب ایڈیٹر ڈاکٹر توحید خان

فون 6177591

تزئین وکتابت افتخار احمد خان

سرورق : جیتندر سنگھ

جلد ۱۴۰ شمارہ ۳۰

جون ۱۹۹۶ء (۱۱ جیٹھ تا ۱۰ اساڑھ شک ۱۹۱۸)

قیمت فی شمارہ ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن): ڈی۔ ایس۔ گاندھی

مضامین سے متعلق

خط وکتابت کا پتا:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴

لیول ۷، آر. کے. پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

اعجاز بن ضیا اوگانوی

ماحولیاتی آلودگی، انسداد اور ہماری ذمہ داریاں

ماحولیات پر اگر بادی النظر میں نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں حیوانیاتی، جماداتی اور نباتاتی کائنات اس میں مضمر دکھائی دیں گی۔ لیکن اس زمرہ میں کچھ اور گہرائی کے اندر اترنے کی کوشش کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جیسے زمین، آب و ہوا، ندی نالے اور پہاڑ، یہاں تک کہ مادیات جو قدرت کی طرف سے ہمیں ودیعت ملی ہے باہم ضابطے کے تحت طبیعاتی، حیوانیاتی جماداتی اور نباتاتی زندگیوں پر اثر انداز کرتی رہتی ہے۔ اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی قدرت کے مختلف عناصر میں توازن بگڑ جانے سے ماحولیاتی نظام غیر مستقل ہو جاتا ہے۔ اس غیر استقامت کو ماحولیاتی آلودگی کہتے ہیں اور اس کے برعکس کائنات کے تمام نظام و عناصر کو اعتدال و توازن میں رکھے جانے کو ماحولیاتی تحفظ کہتے ہیں۔ ماحولیات آج کا دشوار گزار اور شعلہ بار مسئلہ ہے، آج اس بات کی نہایت اہم ضرورت آن پڑی ہے کہ ہم تمام عالمی برادری اتفاق رائے سے اس کے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے بنی نوع اور رفاہ عامہ کی بات سوچیں اور اس پر عمل کریں۔

آج بھی ہندوستان کی اکثریت اپنی روایتی میتھالوجی پر گامزن ہے۔ اسی لیے یہاں درختوں کو دھارمک استھان حاصل ہے اور اس کی بھی پوجا ہوتی ہے۔ یقینی طور پر مذہبی روایت کے پس پردہ پیڑ پودوں کے تحفظ کا یہ عمل ہزاروں سال سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے باوجود آج ماحولیاتی آلودگی دنیا کے نظام کو درہم برہم کرنے پر تلی ہے، یہ اژدھے کی مانند اپنے دہانے کھولے تمام ذی روح کو نگل جانے کے درپے ہے، آخر کیوں؟

درخت کی لکڑیاں ایندھن کے کام میں لائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اوزار، ربر، لاکھ، جڑی بوٹی، پھل پھول اور میوے وغیرہ جنگلوں اور پودوں کی سوغات ہیں جو گود سے لے کر گور تک انسان کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوتے ہیں، یہاں تک کہ حشرات الارض جو اس کائنات کا بہترین اثاثہ ہے ان جنگلی جانور، چرند و پرند کی زندگیوں کو سنوارنے میں بھی پیڑ پودوں کا اہم رول رہا ہے۔ ارض بسیط پر پھیلے ہوئے جنگل قدرت کی جانب سے ہمیں یہ بہترین عطیہ ہے جو نایید ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کے ذریعہ گھاس پھوس، پھل پھول اور پتے ہمارے جانوروں کو آسودہ کرتے ہیں۔ بظاہر ان سے یہ پیٹ بھر کر اپنی بھوک مٹاتے ہیں خود کو زندہ رکھتے ہیں انہیں گھاس پھوس، پھل پھول اور پتوں جیسی حقیر شئے کے توسط سے دودھ، گھی، مکھن، پنیر، اون اور گوشت وغیرہ دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کی پتیاں جہاں آندھی اور طوفان سے ہمیں محفوظ رکھتی ہیں اور موسلادھار بارش سے زمین کے کٹاؤ کو بچاتی ہے۔ وہیں سڑ گل کر قیمتی کھاد اور مٹی میں تبدیل ہو جاتی ہیں، جس پر ہماری زمین کی قوت زرخیزی منحصر کرتی ہے۔ درخت کی جڑیں زمین کو اپنی گرفت میں جکڑے رہتی ہیں جس سے زمین کے کھوکھلے پن سے ہمیں نجات ملتی ہے۔ جنگل کے مناسب تختے ہوں تو بارش حسب منشا اور بروقت ہوتی ہے جس پر ہماری کاشت کا دار و مدار ہے، نہیں تو خشک سالی اور سیلاب جیسی آفتوں سے ہمیں نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، جو نہایت تباہ کن ہوتے ہیں، درخت شور و غل اور تمام آلودہ عناصر اور آب خارات کو خود میں ضم کر کے آب و ہوا کو حسین، خوشگوار اور امن و اماں کا ماحول بناتے ہیں، درخت اپنے پچاس سالہ زندگی میں جتنا کچھ دیتا ہے اس کی قیمت پچاس لاکھ روپے آنکی گئی ہے۔

جنگلوں کا ہماری زندگی میں خاص اہمیت ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر ہمارے قانون داں تدوین ضابطہ میں بھی اس حقیقت کو قبول کرتے ہوئے ہندوستانی آئین کی ساتویں شق میں ماحولیاتی تحفظ کو شامل کیا ہے۔ آئین کی دفعہ ۴۸ "اے" کے تحت ریاستی حکومتوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ جنگل کی رکھ رکھاؤ، ہریالی اور خوشحالی کے لیے درج ذیل ہدایتوں پر عمل کریں۔

جنگل سے حاصل شدہ کچے مالوں کو صنعت و حرفت میں اس طرح استعمال کریں تاکہ فطرت اور انسان میں توازن قائم رہے۔ ہریالی کے لیے ایک خصوصی کمیٹی کی تشکیل سرمائے کا نظم اور وقتاً فوقتاً اس کی روداد مرکز کو دینا، زراعت کی ترقی پر زیادہ زور، ہریالی، جشن تقریب شجرکاری پر حوصلہ افزائی کے انعامات اور دیگر کارآمد تدابیر تاکہ زیادہ سے زیادہ خوشحالی ہو اور شجرکاری کی جانب لوگوں کا رجحان بڑھے۔

اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں کہ آبادی کے اضافے سے جنگلوں کا سینہ چھلنی ہوا ہے، اس کے تباہ کاری میں بڑھتی ہوئی آبادی مسلسل زک پہنچاتی رہی ہے۔ عمارتوں کی تعمیر اور صنعتوں کے لیے لازمی لکڑیوں کی حصولیابی کی وجہ سے بھی جنگلوں پر برعکس اثر پڑا ہے۔ جہاں فورسٹ آفیسر

اردو مترجم، بہار قانون ساز اسمبلی۔ پٹنہ۔ ۱۵ ۸

۔مانے طور پر اپنے حق و اختیار کے زعم میں نقطہ اعتدال سرحد نہ صرف پار کرتے ہیں بلکہ اس سے کہیں آگے بڑھ زیادہ سے زیادہ جنگلوں کو کٹوا لیتے ہیں وہیں جنگلوں جوری پر انحصار کرنے والی جماعتیں لگا ہے گا ہے اور ری جیسے اس کو تہس نہس کرتی رہی ہیں۔ صدیوں ے انھیں جنگلوں میں چرند پرند بلا اشتباہ چر چگ ہے ہیں، جس کی وجہ سے نئی گھاس کو نہ تو اُگنے کا قع نصیب ہوتا ہے اور نہ پرانے کو پنپنے کا اور نہ ، کسی ضابطے اور کسی طور ان کی افزائش کی کوشش کی ی ہے جس سے سا تاتی کائنات کا پنپنا دشوار ، گیا ہے۔

آدیباسی فرقوں میں حرکت الزراعت (MOVABLE AGRICULT) یعنی "جھوم" کی روایت بھی جنگلوں کی بربادی میں بڑا حصہ ہے۔ چونکہ کہ دی باسیوں کے کھونٹھ کا نے یہی جنگل ہیں، یہیں ے انھیں آب و قوت حیات ملتا ہے، انھیں جنگلوں پر ، کی زندگی کا سارا دار و مدار ہے لیکن اس کی ہمیت سے بے نیاز یہ جنگلوں کو بے دردی سے ، اتھ کاٹ چھانٹ کر جلا دیتے ہیں اور وہاں اسی ، کاشت کاری کرتے ہیں، دو تین سال تک اس نئی میں کی زرخیزی برقرار رہتی ہے اور پھر قدر سے پیداوار میں جب کمی واقع ہونے لگتی ہے تو یہ نئی ، ل کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں ایک نئے جنگل کی میں تلاش ہوتی ہے، چونکہ ان کے پاس زمین ، قوت زرخیزی بڑھانے کے لیے مناسب ذرائع ہیں ہوتے، ان کے پاس کوئی سرکاری پلان یا منصوبہ ہیں ہوتا اس لیے یہ خود ساختہ پلان کے تحت ایک ئے جنگل کی طرف نکل پڑتے ہیں اور اپنی مروجہ روایت کے تحت اس جنگل کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کرتے ہیں۔ حشر تو معلوم ہی ہے۔ اس سے جنگلوں ے کٹاؤ کا مسئلہ تو بھیانک ہے ہی ساتھ ہی ساتھ میں پر اتنے گھاؤ لگتے ہیں کہ یہ کھوکھلی ہونے لگتی ہے ور جنگل میں چھدراپن نمایاں ہونے لگتا ہے۔ جنگل بے ستر اور ننگے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

جنگلوں میں جانوروں کی گھس بیٹھ، مطلق العنان مویشی پروری، آتش زدگی، تعمیرات سڑک، صنعت کاروں ، یلغار، تجارتی پھلوں کی پیداوار، کیڑے مکوڑوں در بیماریوں کا حملہ۔ جنگلوں کو تباہ کرنے میں کئی ترقیاتی منصوبے کا بھی بہت ہی گہرا تعلق ہے جیسے تلاش معدنیات، اس کی کھدائی وغیرہ۔ جنگلوں کے لیے ترقیاتی منصوبے بے ضرر اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ جگہ دوسرے جنگل لگائے جائیں تاکہ قدرت کا نظام اعتدال میں رہے۔ جنگی سطح پر شجر کاری کا منصوبہ عمل میں لایا جائے۔

ہر سال شجر کاری کے نام پر برسات میں جگہ جگہ ہلکے ہلکے گڈھے کھود کر کچھ پیڑ پودے یقینی طور پر لگا دیے جاتے ہیں لیکن ان کی دیکھ ریکھ رکھ رکھاؤ اور پرورش و پرداخت کا مناسب انتظام نہیں ہونے سے زیادہ تر یہ ننھے پودے پانی کے فقدان یا دیگر وجوہ کی بنا پر برباد ہو جاتے ہیں اور آئندہ سال پھر ایک نئی اسکیم کے تحت اس روایت کو دہرائی جاتی ہے۔ اس سے شجر کاری کا منصوبہ پائے تکمیل کو بھلے ہی نہ پہنچے مگر سرکاری سرمائے کا اسراف تو ضرور ہوتا ہے۔ سرکار تو منصوبے تیار کرتی ہے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جد و جہد بھی کرتی ہے مگر ان لوگوں کو کیا کیجیے جب ایسے اہم منصوبے اور یوجناؤں کے ساتھ کھل کھیل کر مذاق کرتے ہیں انہیں کیا معلوم کہ وہ اپنی تجوریوں میں نوٹوں کی گڈیوں کو تہہ نہیں کرتے بلکہ یہ انسانیت کا مجسمہ جوں جمع کرتے ہیں، نسل آدم کی ہڈیوں کو سجانے میں لگے ہیں جب کہ اس میں ان کا مجسمہ جوں اور ان کی ہڈیاں بھی شامل ہیں۔

ملک میں عمارتی لکڑیوں اور جلاون کی لکڑیوں کا شدید بحران پیدا ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی سیلاب، خشک سالی اور زمین کے کٹاؤ سے ملک کو بہت زیادہ خسارہ ہوتا رہا ہے۔ تقریباً ۲۵ لاکھ ہیکٹر زمین ہر سال سیلاب زدہ ہو جاتی ہے۔ ۱۴ لاکھ ہیکٹر یعنی ۴۳ فی صد قطعہ اراضی کٹاؤ سے اثر انداز ہوتی ہے اگر سطحی زرخیز اراضی کا تخمینہ لگایا جائے تو تقریباً ۷ کروڑ روپے کی اراضی کے معدنیاتی عناصر ہر سال ندیوں کے لہروں کے ساتھ سمندر کی تاریک تہوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ ۶ کروڑ ٹن سے بھی زیادہ مٹی ہر سال بہہ کر بے مصرف ہو جاتی ہے، جس کا زیادہ تر حصہ سمندروں کا لقمہ بن جاتا ہے۔

آج عالمی آب و ہوا میں جو حیرت انگیز تبدیلی ہو رہی ہے اس کے پس پردہ جنگلوں کے خسارے کی ایک خاص وجہ ہے، نتیجتاً کرۂ ارض زیادہ گرم ہوتی جا رہی ہے، پہاڑوں پر برف بننے کا سلسلہ جاری ہے، گرم آب و ہوا کی بنا پر اس کے پگھلنے کی روایت قدر سے بڑھتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے یہ قیاس اغلب ہے کہ کرۂ ارض کا ایک بڑا حصہ (تین حصہ پانی کے علاوہ) زیر آب ہو سکتا ہے گزشتہ کچھ برسوں میں یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ کئی سمندر کے ساحل ان کی چپیٹ میں آ کر ان میں ضم ہو گئے ہیں۔ ان کی آبی سطح میں بھی آئے دن اضافہ ہی اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر اسے روکا نہ گیا تو کچھ عرصہ بعد کرۂ ارض کا زیادہ تر حصہ سمندروں کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہوگا پھر ہمیں کہاں رہنے بسنے کی جگہ ملے گی۔ —

چراگاہ برباد ہو رہے ہیں، حیوانات کے زندگیاں دو بھر ہو گئی ہیں، جلاون کا بحران لگاتار بڑھ رہا ہے، ملک کی تقریباً ۸ لاکھ ہیکٹر زمین ہر سال کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے، معدنیات کی تیز روی سے فصل اور جنگل چوپٹ ہوتے جا رہے ہیں۔ گاؤں کے گاؤں ویران ہو رہے ہیں، جھیلیں سوکھ رہی ہیں، ندی کے پانی میں آلودگی کے سبب مچھلیوں کی افزائش قریب قریب رک سی گئی ہے، جس کے نتیجے میں ماہی گیروں کی زندگی تعطل پذیر ہے اور ایک اندازے کے مطابق ملک میں ہر سال ۱۳ لاکھ ہیکٹر جنگل تلف ہو رہے ہیں۔

جنگلوں کی بربادی سے جنگلی جانور ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندوستانی چیتا جو اپنی رفتار اور ستاں کے لیے دنیا بھر میں مشہور تھا آج پوری طرح سے تقریباً غائب ہو گئے ہیں۔ آدیباسیوں کی رہائش زندگی بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ ان کی معاشرت و معیشت جنگلوں کی بقا پر منحصر تھا۔ جنگلوں سے ملنے والے قند مول، پھل پھول ان کی پرورش و پرداخت کرتے تھے، جڑی بوٹیاں ان کو صحت مند رکھتی تھیں، لیکن آج جنگلوں کے کٹاؤ اور ناپیدگی سے وہ شہروں کی جانب منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

آزادی کے بعد ملک میں جنگلوں کی ترقی کے بارے میں سرکاری سطح پر ایک احساس آیا اور سال کے بعد "زیادہ درخت لگاؤ" جیسی سرکاری مہم ظاہر ہوئی، ۱۹۵۰ء میں مرکز نے اس پوری مہم کو ایک نیا نام دیا "جشن تقریب جنگل"، رسمی طور پر یہ روایت آج تک جاری ہے۔ شمالی ہند میں ہمالیہ

سے جنگل کی افسوسناک بربادی کے خلاف پہاڑی عورتوں نے جس تحریک کو انقلابی شکل دی وہ قابلِ تعریف ہے۔ "چپکو تحریک" اب کافی آگے بڑھ چکی ہے۔ نیوزی لینڈ کے ۹۱ سالہ ڈاکٹر ریسرچ سینٹ باربیکر جنہیں MAN OF THE TREES کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، چپکو تحریک سے جڑے کارکنوں کو مبارک باد دینے ہندوستان تک آئے تھے۔ کیرل کا "خاموش جزیرہ" (SILENT VALLEY) نے بھی قوم کی توجہ ماحولیاتی تحفظ کی جانب مرکوز کیا تھا۔

ترقی عامہ کے نظریہ سے معاشرتی، معاشی روایت کو بنائے رکھنے کے لیے ماحولیاتی تحفظ اس قدر اہم ہے جس قدر کہ معاشی و اقتصادی ترقی۔ پہلا عملی قدم ضابطہ تحفظ ۱۹۸۰ء کی شکل میں حاصل ہوا جس میں مرکزی حکومت کی قبل از وقت اجازت کے بغیر اور غیر جنگلاتی کاموں کے لیے جنگلاتی زمین کے استعمال پر پابندی لگائی گئی ہے۔ ضابطے کے اہتمام کو مزید سخت بنانے کے نظریہ سے ۱۹۸۸ء میں اس ضابطے میں ترمیم کی گئی

مرکزی اہتمام منصوبہ (CENTRAL SPONSORED PLAN) حیوانیاتی مداخلت سے جنگلوں کی حفاظت بنیادی سہولیات کی ترقی کے تحت اقتصادی تعاون فراہم کرائی جاتی ہے۔ ریاستوں اور زیر انتظام ریاستوں کو ۳۰٫۹ کروڑ روپے فراہم کرائے جا چکے ہیں، سال ۹۳-۱۹۹۲ء کے لیے ۳٫۲۵ کروڑ روپے کا نظم کیا گیا تھا۔ مرکزی وزیر ماحولیات و جنگلات نے ہدایت دی تھی کہ تلافی جنگلات کاری منصوبہ اس طرح تیار کی جانی چاہیے کہ دو سال کے اندر ہی تمام کام پایہ تکمیل تک پہنچا دیے جا سکیں۔ اس کے تحت ۱۴۱۰ ہیکٹر زمین پر تلافی جنگلات لگائے جا چکے ہیں اور سال ۱۹۹۳ء کے موسموں کے دوران ایک لاکھ ہیکٹر زمین پر جنگل لگانے کا منصوبہ تھا۔ اسی طرح ہر سال اس میں اضافہ ہو رہا ہے مگر نتیجہ صفر۔

"جنگلات کی لامتناہی کٹائی سرسبز ہوتے پہاڑ، سرسبز و شاداب میدان کی بجائے دھواں دھار میدان، صنعتی اکائیوں کا بڑھتا ہوا جال مزید پیڑ پودے کو کاٹ چھانٹ کر تیزی سے عمارت سازی، بڑھتی آبادی کی ضرورت کی تکمیل کے لیے اگر موزوں ٹھہرائے جا سکتے ہیں تو ایسے خطرناک انجام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ قدرتی عدم توازن ذی روح کے لیے کافی خطرناک ہو سکتا ہے۔"

(روزنامہ قومی تنظیم، پٹنہ، مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۹۶ء)

یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے ماحولیات سے متعلق نصاب تعلیم اور تجربہ گاہ کی ہمت افزائی کے لیے ایک خصوصی کمیٹی کی تشکیل کی ہے۔ ملک کی چند یونیورسٹیاں ماحولیاتی سائنس میں علم نباتات اور علم طبیعات سے متعلق نکات کو اہمیت دیتے ہوئے ایم۔ اے ڈگری کے نصاب تعلیم کا نظم کر رہی ہیں اس میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی، اے پی سنگھ یونیورسٹی، ریوا، نیشنل یونیورسٹی، راجکوٹ، مدورائی یونیورسٹی اور نارتھ ایسٹرن ہل یونیورسٹی شیلانگ بھی شامل ہیں۔ دیگر کچھ یونیورسٹیوں نے تو عمومی ایم اے کی نصاب تعلیم میں بھی ماحولیاتی تعلیم کو شامل کر دیا ہے۔ اندرا گاندھی نیشنل فارسٹ اکیڈمی ایسٹ فارسٹ سروس کالج اور فارسٹ رینجر کالج اپنے ملازمین کو جنگلاتی نظام کے مختلف پہلوؤں کی جانب تربیت دیتے ہیں۔

ساتویں پنج سالہ منصوبہ کے تناظر میں آٹھویں پنج سالہ منصوبہ کے دوران دوگنے سے بھی زیادہ اراضی میں جنگل لگائے جائیں گے۔ آٹھویں منصوبہ میں ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ہیکٹر مزید اراضی میں جنگل کاری کی تجویز ہے۔ جب کہ گزشتہ منصوبہ کے دوران ۸۲ لاکھ ہیکٹر اراضی پر جنگل لگائے گئے تھے اس سے نہ صرف جنگل کی افزائش ہو گی بلکہ دیہی اور آدیباسی لوگوں کے لیے جلاون کی لکڑی اور مویشیوں کے لیے چارہ بھی آسانی سے میسر ہو سکے گا۔ قومی غیر کاشت (بنجر) اراضی بورڈ نے اس بلند قامت نشانے کی حصولیابی کے لیے متحدہ غیر کاشت اراضی ترقیاتی پروجیکٹ لائحہ عمل کے تحت ۵۴ کروڑ روپے کی رقم ریزرو کی گئی ہے۔ جب کہ گزشتہ سال اسی پروجیکٹ کے تحت ۳۴ کروڑ کی خاص رقم الاٹ کی گئی تھیں۔

ملک میں بشمول غیر کاشت اراضی مختلف قسم کی اراضیات پر شجر کاری کا نشانہ ہر سال مرکز اور ریاستوں کے منصوبوں میں مقررہ سرمائے کے مطابق طے کیا جاتا ہے۔ سال ۹۱-۱۹۹۰ء اور ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران بالترتیب ۱۳ لاکھ ۹۰ ہزار اور ۱۶ لاکھ ہیکٹر سے زیادہ اراضی میں درخت لگانے اور ۵۴۱ کروڑ پودے تقسیم کرنے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔

دنیا میں بھی بڑھتی ہوئی آلودگی کے انسداد کے لیے آج عالمی سطح پر سائنسی، سیاسی، سماجی اور عوامی تنظیمیں بڑی سنجیدگی سے اس مسئلے کا حل دریافت کرنے میں کوشاں ہیں۔ لیکن کامیابی کی رفتار بے حد سست ہے۔ ۱۹۰۰ء میں دنیا میں جنگلوں کا رقبہ ۷۰۰ کروڑ ہیکٹر کے قریب تھا۔ ۱۹۷۵ء میں صرف ۲۸۹ کروڑ ہیکٹر زمین میں ہی جنگل بچے تھے۔ ۲۰۰۰ء تک دنیا میں صرف ۲۳۷ کروڑ ہیکٹر میں ہی جنگل رہ جائیں گے یعنی ۱۲ فی صد زمین پر ہی جنگل بچ رہنے کی امید ہے۔ جب کہ کم از کم ۳ فی صد زمین پر جنگل ضرور ہونے چاہییں۔

جنگل کاری کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اسی جشن تقریب جنگلات لائحہ عمل کو عملاً آگے بڑھائیں۔ ہر بچے کے لیے ایک درخت کا نعرہ آج نہایت ہی اہم ضرورت ہے۔ اس نعرہ کو روبہ عمل لانے کے لیے ضروری ہے کہ سڑکوں، نہروں، ریلوے لائنوں کے کنارے اور جہاں کہیں بھی آسانی سے شجر کاری کی جا سکے عمل پیرا ہونا لازمی ہے اور اس کاز کے لیے تمام کارکنوں کی ہمت افزائی انعامات وغیرہ کی صورتوں میں کی جائے۔ سردار پٹیل کے لفظوں میں "اگر ہمیں ریگستان کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکنا ہے اور انسانی تمدن کی حفاظت کرنی ہے تو جنگلاتی سرمائے کے خسارے پر لازمی طور پر پابندی لگانی ہو گی۔"

معاشرتی طور پر جنگلات کا کشادہ لائحہ عمل اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے تحت نہر، ریل راستوں اور سڑکوں کے کنارے درخت لگائے جائیں۔ شہری ضابطہ جنگلات کے تحت پارک، چھوٹے جنگلات، تحفظاتی اور سبز تختوں کی تعمیر کی جائے۔ اندوختہ جنگلات (RESERVE FOREST) میں ایماندار اور وفادار فارسٹ آفیسر تقرر کیے جائیں صحرائی ترقیات بلدیہ یا ایسی ہی دیگر تنظیمیں ہوں جو پہاڑوں پر، میدانوں میں اور ان علاقوں

میں جہاں سے جنگل کٹ گئے ہوں شجر کاری کریں۔ آدی باسیوں کی زندگیاں ان ہی جنگلوں سے جڑی ہیں، اس لیے ان کی ترقی اور روزگار کے لیے دیگر پیشے سے انھیں جوڑا جائے۔ شجر کاری لائحۂ عمل کو مزید منظم اور فعال انگیز بنایا جائے۔ اسکول، کالج سطح پر بیداری کی رفتار تیز کی جائے۔

اصلاح اراضی، آب پاشی، شہری منصوبہ، تعمیرات عمارت منصوبہ، متعدی امراض، ضبط رمان اور عیش وعشرت فراہم کرنے کے لیے ضابطے پر فعال انگیز طور سے عمل درآمد کرانا اور مرکزی حکومت وسائل انسانی کے فروغ میں صنعت وحرفت پر نگرانی رکھنا تاکہ وہ ماحولیات کو آلودہ نہ ہونے دیں۔

جنگلوں کی بربادی کے مسئلے کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے تعلیمی لائحۂ عمل کے منصوبے میں از سر نو ترمیم کی ضرورت ہے، جس میں جنگلوں کے آس پاس رہنے والے لوگوں کو سماجی پروگرام کے توسط سے ہونے والی افادیت کی کامیاب کوشش کی جانی چاہیے۔ غیر رسمی طور پر تعلیم بالغاں مراکز اور کشادہ خدمات کے توسط سے مختلف معاشرتی لائحۂ عمل میں دیہی عوام کو شامل کرتے ہوئے جنگلوں کے درختوں اور جنگلی جانوروں کے تحفظ کے بارے میں پیش کردہ ضابطہ قانونی اہتمام اور پیش کردہ اختیارات و فرائض کے بارے میں دیہی عوام کو روشناس کرایا جانا چاہیے۔ ریاستی اور مرکزی سرکار کے ذریعہ پیش کردہ قوانین سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔

جنگلوں کے تحفظ سے ماحولیات کی صفائی، پانی کی آلودگی سے نجات، چراگاہوں کی ترقی وغیرہ باتوں کا علم، نمائش لگا کر پروجیکٹر سے سلائڈ اور فلموں کے ذریعہ عام لوگوں کو فراہم کرائی جانی چاہیے۔ جنگلوں کی کشادگی کے لیے دیہی عورتوں کی مختلف تنظیموں اور تنظیم اصلاح معاشرہ کا تعاون زیادہ درخت لگانے کے پروگراموں میں سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ اس پروگرام سے متعلق عرف عام کو اکسایا جائے

انھیں باتوں کے زیر اثرات اور زیادہ وسیع کرنے کے لیے اور زیادہ روپے کا انتظام کیا گیا ہے۔ بنجر زمین کو اور زیادہ کارآمد بنانے کے لیے مزید منظم کیا گیا ہے۔ اس سمت ریاستی حکومتیں بھی سخت اور ٹھوس کارروائی کا آغاز کیا ہے۔ اس طرح زراعتی اور صنعتی انقلاب کے بعد ماحولیاتی انقلاب کے دیباچے تیار کیے جا رہے ہیں اور سماج کے ہمہ جہت کوشش سے یہ کام مکمل طور پر کامیاب و کامران بنایا جا سکتا ہے۔

یہ بات تو حتمی طور پر مان لی گئی ہے کہ ہندوستان جیسے ترقی یافتہ ملک میں ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ اس قدر سنگین ہو چکا ہے کہ قدرتی نباتات کے پے در پے بربادی کا انسداد اگر فوری طور پر نہ کیا گیا، کوئی کارآمد اور موثر قدم نہیں اٹھائے گئے اور روزافزوں صنعتی ترقی کے آگے انسانی فلاح و بہبود کو نظرانداز کر دیا گیا تو قیاس اغلب ہے کہ آنے والے دنوں میں آبادی کے تیز رفتار اس مسئلے کو اتنا خطرناک بنا دے گی اس کی روک تھام مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے گی۔

لیکن یہ کام نہ صرف سرکار کا ہے بلکہ اس ملک کے ہر شہری کا ہے۔ اپنا اپنا محاسبہ کریں اور اس پر کمربستہ ہو جائیں۔ آلودگی سے ماحولیات کو پاک کرنے کے لیے ہمہ جہت کوشش کرنی ہوگی تاکہ نظام قدرت کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ بنی آدم کے ساتھ ساتھ تمام ذی روح اس کرۂ ارض پر چین کی سانس لے سکے اور صحت مند زندگی گزار سکے۔ ●

بقیہ کور ۳، اقلیتوں کے لیے قومی کمیشن

۲۔ ۱۵ نکاتی پروگرام کے قانونی درجہ کے مطابق اقلیتوں کی بہبود کے لیے ہر ریاست میں ایک الگ محکمے کا قیام، جس میں اقلیتوں سے متعلق پروگرام ہوں۔

۳۔ اقلیتی امیدواروں کی مرکزی پولیس فورسیز میں بھرتی کے ضمن میں تعلیمی اور دوسری لیاقتوں میں مزید نرمی برتی، یہ نرمی ان ہی لائنوں پر ہے جو پہلے ہی سے درج فہرست ذاتوں / درج فہرست قبائل امیدواروں کے لیے رائج ہے۔

۴۔ اقلیتی امیدواروں کی ریاستی پولیس فورسیز میں بھرتی کے ضمن میں تعلیمی اور دوسری لیاقتوں میں مزید نرمی، یہ نرمی ان ہی لائنوں پر ہے جو پہلے ہی سے درج فہرست ذاتوں / درج فہرست قبائل امیدواروں کے لیے رائج ہیں۔

۵۔ عیسائی پرسنل لا میں ان کی متفقہ منظوری پر مبنی ترمیم کا قانون بنانا۔

۶۔ جس ریاست میں اقلیتوں کی دس فی صد یا اس سے زائد آبادی ہے، وہاں ان کی بہبود کے لیے ایک الگ محکمہ کا قیام (آبادی کا تناسب ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہوگا)۔

۷۔ درج فہرست ذاتوں سے متعلق افراد جو عیسائیت یا اسلام اختیار کر لیتے ہیں جیسا کہ سکھ مت اور بدھ مت اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ان کو مراعات / قانونی فوائد حسب سابق حاصل رہیں گے۔

۸۔ قومی کمیشن برائے اقلیت (این سی ایم) ایکٹ ۱۹۹۲ء میں ترمیم کی گئی تاکہ کمیشن کو تحفظ انسانی حقوق ایکٹ ۱۹۹۳ء کے طرز پر تفتیشی اختیارات حاصل ہو جائیں۔

۹۔ کمیشن کی جانب سے قانونی سفارشات کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے پیش کرنا۔ اس کی مدت چھ ماہ ہے۔ جیسا کہ کمیشن آف انکوائری ایکٹ میں منظور ہے۔

۱۔ مہاراشٹر کا متنی بل، جس میں سرکار سے یہ سفارش کی گئی ہے کہ وہ صدر جمہوریہ ہند کو مشورہ دے کہ وہ اس بل کے ضمن میں اپنی منظوری نہ دیں۔

۱۱۔ جینیوں کی اقلیتوں کی فہرست میں شمولیت۔

۱۲۔ مہاراشٹر میں اقلیتی کمیشن کا قیام۔ کمیشن کا ایک علاقائی دفتر ممبئی میں قائم ہوگا۔

اقلیتوں کے قومی کمیشن نے سابقہ قومی کمیشن کی چودھویں سالانہ رپورٹ وزیر بہبود کو ۹ فروری ۱۹۹۵ء کو پیش کر دی ہے۔ ●

شکیل جہانگیری

جانور — ہمارے دوست

جنگلاتی زندگی چار خاص وجوہ سے ہمارے لیے انتہائی اہم ہے۔

اول ۔ جانوروں اور پودوں کی ہر نسل دوسری نسلوں سے مختلف ہوتی ہے اور اس طرح فطرت کو خوب صورت بنانے میں ان کا اہم حصہ ہے۔ بہت سے لوگ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ فطرت کے اس حسن نے زندگی کو بہت بڑی نعمت عطا کی ہے۔ اسی خوبصورتی نے ہماری جانب دوشانہ سیر و سیاحت اور دیگر سیر و تفریحات کو عروج بخشا ہے۔

دوم ۔ جانوروں اور پودوں کی جنگلی نسلیں ہمیں بہت سی قیمتی اشیا فراہم کرتی ہیں مثلاً لکڑی اور دیگر تجارتی پیداوار، ریشہ، گوشت اور دوسری خوردنی اشیا، چمڑا اور فر وغیرہ۔ بہت سے ملکوں میں جنگلی نسلوں کی مالی قدر و قیمت وہاں کی اقتصادیات میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

سوم ۔ جنگلی جانوروں کا مطالعہ بہت سے حیاتی عوامل کے بارے میں قابل قدر معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس مطالعے نے سائنس دانوں کو یہ جاننے میں کافی مدد پہنچائی ہے کہ انسان کے جسم کی اندرونی ساخت کیا ہے اور وہ کیسے کام کرتا ہے اور انسانی حرکات و سکنات کس طرح وجود میں آتی ہیں — سائنس دانوں نے جنگلی زندگی کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ بھی دریافت کیا ہے کہ انسانی زندگی ماحولیاتی آلودگی سے کس طرح متاثر ہوتی ہے۔ پھر اس نے اسی مخلوق کے مطالعے کے نتیجے میں طبی معلومات اور مصنوعات بھی حاصل کی ہیں۔

اس کے علاوہ جانور انسان کے لیے بالواسطہ طور پر بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً پیڑ پودے ہماری زندگی کی بہت سی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی سخت ضرورت ہے، لیکن جس طرح ہمیں اپنی زندگی کے کاروبار کو جاری رکھنے میں نباتات کی ضرورت ہے اسی طرح نباتات یعنی پیڑ پودوں کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے جانوروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ جانوروں کے بغیر بیشتر پودوں کی افزائش نسل کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر بہت سے پھول والے پودے نسل چلانے کے لیے شہد کی مکھیوں کے محتاج ہیں، جو ان کے زرِ گل کو ایک پودے سے دوسرے پودے تک لے جا کر تناسل کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اکثر شاہ بلوط کے درخت اپنی سپاری کے ذریعے اُگتے ہیں۔ گلہری درخت سے سپاری کو توڑ کر لے جاتی ہے اور زمین میں دفن کر کے بھول جاتی ہے۔ جب کسی ہرن کا کھُر اس مقام پر پڑتا ہے تو سپاری زمین کی گہرائی میں دھنس جاتی ہے اور اُگ آتی ہے۔ اکثر چڑیاں درختوں اور پودوں کے بیج اپنی چونچ میں دبا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ کو پرواز کرتی ہیں اور اس طرح یہ بیج اپنے اصل پودوں سے سیکڑوں میل کی دوری پر اُگ آتے ہیں۔ بیشتر جانوروں کے مردہ جسم سڑ گل کر زمین کو زرخیز بناتے اور پیڑ پودوں کو غذا فراہم کرتے ہیں۔ بعض جانور ٹھوس اشیا کو اکٹھا کر کے اپنے ماحول میں تبدیلی بھی پیدا کرتے ہیں مثلاً ساحلِ سمندر پر رہنے والے جانور سمندر سے چونا جذب کر کے چونے کا پتھر بناتے ہیں۔

زمین پر انسان کے سب سے پہلے ساتھی جانور ہی تھے۔ اس نے جانوروں کے بارے میں اس وقت معلومات حاصل کیں جب اس نے ان کو اپنی غذا کے لیے شکار کیا اور بعض جانوروں نے اسے اپنی خوراک کے لیے شکار بنایا۔ متمدن زندگی کی طرف سب سے پہلی عظیم پیش رفت اس وقت ہوئی جب آدمی اور کتا پہلی بار ایک دوسرے کے دوست بنے۔ غالباً کتا پہلا جانور ہے جس کو آدمی نے پالتو بنایا۔ ابتدائی دور میں انسان نے ان جانوروں کے شکار میں مدد کے لیے کتے کو استعمال کیا جن کو وہ اپنی غذا کے طور پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بعد میں لوگوں نے ان جانوروں کو پالنا سیکھا جن کا گوشت انھیں مرغوب تھا۔ تقریباً بارہ سو سال پہلے ان مویشیوں کو پالتو بنایا گیا جو فی زمانہ جنوبی روس میں پائے جاتے ہیں۔ مشرقِ بعید میں تبتی عوام نے اپنے یہاں پائے جانے والے قوی الجثہ بیل کو پالتو بنایا۔ شمالی یورپ کے ایک دور دراز علاقے لیپ لینڈ میں لوگ پالتو ہرنوں کے ریوڑ رکھتے تھے۔ جنوبی امریکہ کے ریڈ انڈین لوگ بکریاں پالتے تھے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بھیڑ اور بکری کو سب سے پہلے مویشی کی حیثیت سے پالنا شروع کیا گیا کیوں کہ ان کا گوشت لذیذ تھا۔ بعد میں ان کے مو، کھال اور اون کو لباس اور پناہ گاہیں بنانے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ گھوڑے بھی پہلے پہل گوشت حاصل کرنے کے لیے پالے جاتے تھے پھر آہستہ آہستہ انسان نے ان پر سواری کرنا سیکھا اور باربرداری کے لیے ان کو استعمال کرنا شروع کیا۔ عرب اور بابل میں اونٹ کو سواری اور باربرداری کے لیے پالا گیا۔ تقریباً پانچ ہزار سال قبل شمالی

معرفت عقیل نعمانی، میر گنج بریلی ۔ ۲۴۳۵ ۳

افریقہ میں گدھے کو سامان ڈھونے کے لیے پالنا شروع کیا گیا۔ قدیم مصری عوام بلی کو اپنے اناج کے ذخیروں کو چوہوں سے محفوظ رکھنے کے لیے پالتے تھے۔

کبوتر پہلا پالتو پرندہ ہے۔ تقریباً پانچ ہزار سال قبل بحر اوسط کے نزدیک رہنے والے عوام کبوتروں کو گوشت حاصل کرنے کی غرض سے پالتے تھے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں سب سے پہلے مرغ کو پالتو بنایا گیا تاکہ اس کے گوشت سے غذائی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ آغاز تاریخ کے دور میں ہنس اور بطخیں پالی جاتی تھیں۔ کولمبس کی دریافت امریکہ سے پہلے وہاں کے ریڈ انڈین عوام اس علاقے میں جسے اب میکسیکو کہتے ہیں، ترکی مرغ کو غذا کے لیے پالتے تھے۔

حتیٰ کہ حشرات الارض بھی انسانی خدمت گار کے طور پر پالے جاتے رہے ہیں۔ سینکڑوں سال سے شہد کی مکھیاں نہ صرف شہد کشید کرتی رہی ہیں بلکہ بہت سے مقامات پر پھل دار درختوں پر افشانیٔ زرِ گل کا کام بھی انجام دیتی رہی ہیں اور اس طرح پھلوں کی پیداوار کا سبب بنی ہیں۔

کئی ہزار سال پہلے چینیوں نے ریشم کے کیڑے کو پالنا شروع کیا اور اس کے بنائے ہوئے کویوں سے ریشم حاصل کیا۔ امریکی چوہا، عام چوہا اور دیگر کترنے والے جانور طبی تحقیقات میں تجربے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ طبی ماہرین ایسی نو ایجاد دوائیں انسانوں کو دینے سے پہلے انہیں جانوروں پر استعمال کرکے دیکھتے ہیں۔ جانوروں سے ہمیں بہت سی اہم دوائیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انسولین جسے ہم بیماری کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

یہ امر ناقابلِ فراموش ہے کہ ہر دور میں ہر مرحلے پر جانوروں نے انسان کے ممد و معاون ہونے کا ثبوت دیا ہے مثلاً گھوڑا جس نے ایک طرف بڑے بڑے جنگی معرکے سر کرنے میں انسان کی مدد کی ہے تو دوسری جانب سائنسی ایجادات سے قبل کے زمانے میں نقل و حمل کا سب سے بہترین ذریعہ رہا ہے۔ یہی نہیں، ہماری سماجی زندگی میں بھی اس کی اہمیت مسلّم رہی ہے۔ شہ سوارِ اسپ سماج میں بلند مرتبے کا مالک ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر دولہا کی شان و شوکت بڑھانے کے لیے اسے گھوڑے پر سوار کرکے دلہن کے گھر لے جاتے تھے۔ بیشتر دیہی علاقوں میں آج بھی یہ طریقہ رائج ہے۔ گھوڑے کے علاوہ ہندوستان میں ہاتھی کو بھی غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔

ماضی میں دشمن کی فوجوں کا قلع قمع کرنے میں ہاتھی نے ایک طاقتور اور جاں نثار سپاہی کا کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو بلند سماجی مرتبے کی علامت بھی تصور کیا جاتا رہا ہے۔ کسی شخص کی دولت و ثروت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاتا تھا کہ اس کے پاس کتنے ہاتھی ہیں۔ کسی صاحبِ حیثیت شخص کی امیری کا ذکر ہوتا تو کہا جاتا تھا کہ فلاں کے دروازے پر ہاتھی جھول رہے ہیں۔ امیروں کے یہاں رشتے طے کرتے وقت دیگر مطالبات کے ساتھ دولہا والوں سے یہ مانگ بھی کی جاتی تھی کہ برات میں اتنے ہاتھی ضرور ہونے چاہئیں۔ ہمارے لوک گیتوں میں ہاتھی اور گھوڑے کا وجود آج بھی اس امر کی شہادت دیتا ہے۔

ریت کے اونچے اونچے ٹیلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اونٹوں پر سوار انسانی قافلوں کا تصور کیجیے اور سوچیے کہ یہ ایک جانور ہی ہے جو انسان کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے خود صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ سورج کی تمازت سے جھلستی ہوئی ریگستان کی زمین پر اس دراز قد جانور نے آدمی کو نقل و حمل کی جو سہولت مہیا کی ہے اس کے پیش نظر اسے "ریگستانی جہاز" بھی کہا جاتا ہے۔

صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ اس دور میں بھی نقل و حمل کے ذریعے کے طور پر گھوڑے، اونٹ اور گدھے کی اہمیت برقرار ہے۔ کچے، تنگ، ٹیڑھے میڑھے اور سنگلاخ راستوں میں بار برداری کی خدمت یہی مخلوق انجام دیتی ہے۔ حال ہی میں کیے گئے ایک سروے سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے ملک میں روزانہ جتنا تیل موٹر گاڑیوں میں خرچ ہوتا ہے اتنا ہی اور خرچ ہوتا اگر ہمارے مویشی نقل و حمل کی خدمت انجام دینے کے لیے موجود نہ ہوتے۔

ہمارے مویشی غذائی ضروریات کو پورا کرنے اور زراعت کے کام میں مدد دینے کے علاوہ ہماری معیشت کا بھی ایک اہم حصہ ہیں۔ خاص طور پر دیہات کے بیشتر لوگ آج بھی اپنی روزی روٹی کے لیے مویشیوں کی تجارت پر انحصار کرتے ہیں۔

جنگلی جانوروں کے شکار کی شکل میں انسان زمانۂ قدیم سے اپنی تفریحات کے مواقع حاصل کرتا رہا ہے۔ مہم جویانہ مزاج رکھنے والے لوگ خطرناک جنگلی جانوروں مثلاً شیر، چیتا، گینڈا، فیل مست اور بھیڑیے وغیرہ کا شکار کرکے اپنے جوہرِ شجاعت کی نمائش کرتے رہے ہیں۔ ہمارے کلاسیکی کھیلوں میں گھوڑسواری کے مقابلے محبوب اور اعلیٰ ترین تفریحی مشاغل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ عہدِ وسطیٰ کے بادشاہ اور راجے مہاراجے دو ہاتھیوں کو باہم متصادم کرکے اپنی تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرتے تھے۔ اسی طرح نوابین کے عہد میں بیشتر شہروں اور قصبات میں مرغ بازی، کبوتر بازی اور بٹیر بازی جیسے مشاغل عوام و خواص کی تفریحات کا اہم ذریعہ تھے۔

بچوں کے لیے جانور اور پرندے خاص طور پر کشش رکھتے ہیں۔ خوب صورت چڑیوں اور چھوٹے جانوروں جیسے کتا، بلی، خرگوش اور سفید چوہے وغیرہ پالنے میں ان کی خاص دلچسپی رہتی ہے۔ وہ ان سے کھیلتے اور خوش ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ جانور ان کی نشوونما میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان پالتو جانوروں میں کتا ایک ایسی مخلوق ہے جو نہ صرف اپنی دلنواز حرکتوں سے مالک کا دل خوش کرتا ہے بلکہ وقت پڑنے پر جاں نثاری کے اعلیٰ نمونے بھی اس نے پیش کیے ہیں۔ اسی لیے کتے کی وفاداری ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

لیکن آج ہمارے ان دائمی اور ازلی دوستوں کی بقا کو زبردست خطرات کا سامنا ہے۔ تجدید جنگلات، ماحولیاتی آلودگی اور کثرتِ شکار کی وجہ سے بہت سی جنگلی نسلیں نایاب ہو گئیں، کچھ قریب الفنا ہیں اور بیشتر کی تعداد مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس صورتِ حال نے موجودہ زمانے کے انسانوں کو کئی اندیشوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ لیکن یہ بات کسی قدر قابلِ اطمینان ہے کہ دیگر ممالک کی طرح ہماری حکومت نے بھی جنگلاتی زندگی کی حفاظت اور کمیاب جانوروں کی نسل کو فروغ دینے کے لیے دانشمندانہ منصوبہ بندی کے ساتھ مؤثر اقدامات کیے ہیں۔ لیکن حکومت کے

باقی صفحہ ۳۶ پر

سہیل احمد ہلوری

خطرے میں ہے جنگلی جانوروں کا وجود

اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑھتی ہوئی آبادی اور ترقی کے نام پر انسان نے بے دریغانہ جنگلوں کا صفایا کیا ہے۔ لالچ اور زیادہ منافع کمانے کی غرض سے انسان فطرت سے چھیڑ چھاڑ کرتا آرہا ہے، جس کے نتیجے میں آج ماحولیات کو بے حد نقصان پہنچا ہے۔ ایک طرف انسان اپنی زراعت کی زمین بڑھانے، مکان بنانے یا ایندھن اور آرائش کے سامان مہیا کرنے کی غرض سے جنگلوں کو کاٹ رہا ہے تو دوسری طرف جنگلاتی زندگی کو بھرپور نقصان پہنچا رہا ہے۔ ایک تو جنگلات کی کمی ہو جانے سے اس میں رہنے والے جانوروں کو فطری ماحول نہیں مل پاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ خود بخود مر جاتے ہیں یا قریب کی بستیوں میں بھاگ کر شکار ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف انسان اپنے مفاد کی خاطر جانوروں کا شکار کرتا ہے اور اس کے مختلف اعضاء فروخت کر کے کثیر رقم حاصل کرتا ہے۔ جس کے باعث آج دنیا کے بہت سے جانوروں کی نسلیں ناپید ہو گئی ہیں۔

دنیا بھر میں پائے جانے والے سر سے دھڑ جانوروں کی تعداد کا ۵ فی صد حصہ ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ روئے زمین پر پائی جانے والی ۷۵ ہزار جنگلاتی نسلوں میں سے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کی ۵ ہزار دیگر کچھ بڑے کیڑوں کی ۴ ہزار ریڑھ والے جانوروں کی ۶ ہزار ۵ سو، مچھلیوں کی ۲ ہزار، خشکی و پانی میں رہنے والے جانوروں کی ۱۴۰، رینگنے والے جانوروں کی ۴۴۰ نسلیں ہیں۔ لیکن اب ان کی تعداد میں بڑی تیزی سے کمی آرہی ہے۔ آج ناپید ہونے والے جانوروں کی تعداد کی رفتار تین فی گھنٹہ ہے اور اس کے ذمہ دار ہیں ہم اور آپ۔ یعنی انسان۔ اگر حالت یہی رہی تو ۲۰۰۰ء تک روئے زمین سے دس لاکھ اور ۲۰۱۵ء تک کل نسلوں کا ایک چوتھائی حصہ ناپید ہو جائے گا۔ فطرت اور فطری اشیاء کے تحفظ کے لیے تشکیل کی گئی ایک بین اقوامی کمیٹی سے متعلق افسروں کا کہنا ہے کہ پودوں کی کسی ایک نسل کے ناپید ہونے سے کیڑے مکوڑوں، جانوروں و دیگر پودوں کی دس سے تیس نسلیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کمیٹی کے مطابق ۹۵ برسوں میں جنگلاتی زندگی اور پرندوں کی تقریباً ۳۰ نسلیں ناپید ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ آٹھ سے دس برسوں میں تقریباً ایک ہزار پرندوں اور جانوروں کا روئے زمین سے صفایا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہے۔

جنگلی جانوروں کے تیزی سے ناپید ہونے سے فکرمند ہو کر جنگلاتی زندگی کی ایک بین اقوامی سوسائٹی نے ایسے دس جانوروں کی فہرست پیش کی ہے جنھیں سب سے زیادہ تحفظ کی ضرورت ہے۔ سائبیریائی سارس، کالے بھالو، ہرن، شیر اور ہندوستانی گینڈے کا اگر فوری طور پر موثر تحفظ نہ کیا گیا تو یہ جانور بہت جلد دنیا سے مٹ جائیں گے۔ حکومت ہند نے جنگلاتی زندگی کے تحفظ کو تشویشناک ڈھنگ سے لیتے ہوئے ۱۹۵۲ء میں پہلی مرتبہ ناپید ہونے والے جنگلی جانوروں کو تحفظ دینے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس وقت ایسی ۱۳ نسلوں کی نشاندہی کی گئی تھی جن کے تحفظ کی اشد ضرورت تھی۔ آج یہ تعداد بڑھ کر ۱۳۷ پر آپہنچی ہے۔ ان میں پستاندار ۳۸ پرندے اور ۱۸ رینگنے والے جانور ہیں۔ INTERNATIONAI NATURF SECURITY ORGANISTION کی ریڈ ڈاٹا نے بھارت کے ایسے جانوروں کی جو فہرست جاری کی ہے اس میں سے پستاندار کی ۱۶ نسلیں، پرندوں کی ۵ نسلیں اور رینگنے والے جانوروں کی ۳ نسلیں اندیشۂ ناپیدگی کی شکار ہیں۔ اس کے علاوہ INDIAN FOREST LIFF AND SECURITY INSTITUTF جن ہندوستانی جنگلی جانوروں کو ناپید ہونے سے بچانے کے لیے کوشاں ہے ان کی فہرست کچھ زیادہ ہی طویل ہے۔ خاص کر ایسی نسلوں میں ہلانک گبن، ٹوپی والے لنگور، سنہرے لنگور، خارس لیف بندر، ہسپیڈ خرگوش، چنکارا، راجستھانی بلی، مشکی ہرن، گینڈا، ہندوستانی بھیڑیا، ایشیائی شیر و جنگلی لومڑی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سائبیریائی سارس، سوہن چڑیا جیسے پرندے، اسکیپرس اوننگ براؤن، قیصر ہند اور ٹینٹانٹس لیڈر ڈالی جیسی تتلیاں، کچھوے و گنگا میں پائی جانے والی ڈالفن وغیرہ نسلوں کا وجود خطرے میں ہے۔

ان نسلوں کی ناپیدگی کی ایک بڑی وجہ تو جنگلوں کی کٹائی ہے، دوسری وجہ ہے ان جانوروں کی غیر قانونی تجارت۔ ان جانوروں کو صرف اس لیے مارا جاتا ہے کہ ان کی منہ مانگی رقم وصول کی جائے۔ آج دنیا میں اس طرح کی اسمگلنگ سے ۲۰۰۰ کروڑ ڈالر سے زائد کمایا جا رہا ہے۔ جانوروں

مہر حسن روڈ نو بہار گنج۔ ہلور، سدھارتھ نگر۔ یوپی، ۲۷۲۱۹۱

کے مختلف اعضا مختلف کاموں میں استعمال ہوتے ہیں۔ کہیں خوبصورتی بڑھانے والے مرکبات تیار کیے جاتے ہیں تو کہیں ان سے گھروں کی سجاوٹ یا دوائیں بنائی جاتی ہیں۔ ہندوستانی شیروں میں کمی کی وجہ خاص طور سے یہی ہے۔ اس صدی سے پہلے ملک میں شیروں کی تعداد ۴۰ ہزار سے بھی زائد تھی لیکن دواؤں کے بننے کی وجہ سے ان کا اس قدر شکار ہوا کہ اب ان کی تعداد گھٹ کر ۳۷۵۰ ہی رہ گئی ہے۔ صرف شیر کی ہی نہیں بلکہ ہاتھیوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ہندوستان میں ہاتھیوں کی تعداد ۳۰ سے ۵۰ ہزار کے درمیان ہے۔ ہاتھیوں کی گھٹتی تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے ان کے تحفظ کے لیے ۹۳-۱۹۹۲ء سے PROJECT ELEPHANT نام سے ایک منصوبہ چلایا ہے۔

اپنی موٹی کھال اور سینگوں کے لیے مشہور ہندوستانی گینڈے کا اتنی بے دردی سے شکار کیا گیا کہ اب وہ آسام کے کازی رنگا پارک میں ہی کچھ سو کی تعداد میں سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ ہرن اور مشکی ہرن کی نسلیں بھی اپنے وجود کے لیے خطرے کو جھیل رہی ہیں۔ سنگائی ہرن اور کالا ہرن کا وجود ختم ہونے کو ہے۔ پوری دنیا میں ہر سال تقریباً ۳۲۵ کلوگرام مشک کی غیر قانونی تجارت ہوتی ہے۔ اس کے لیے تقریباً چھ ہزار مشکی ہرن موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں۔ منی پور کے جنگلوں سے سنگائی ہرن ختم ہو چکے ہیں۔ پورے ملک میں اب ان کی تعداد صرف ۵۰ ہی رہ گئی ہے۔ بندر کی قسم کے جانور ہُلا اور گبّن، سنکوبھ لنگور اور سنہرے لنگور ختم ہو چکے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں آسام کے جنگلوں میں آخری بار سنہرے لنگور دیکھے گئے تھے۔ اپنی خوب صورت بناوٹ، سنہرے بال و رنگیں دم کی وجہ سے انسانوں نے بڑی بے دردی سے اس کا شکار کر کے اسے ناپید ہی کر دیا۔ یہی نہیں تقریباً ایک لاکھ خرگوش کی آنکھیں ہر سال شیمپو کی صنعت میں جھونک دی جاتی ہیں۔ آفٹر شیو لوشن کی جلن کے تجربے کے لیے منی پگ (چھوٹے سور) کی کھال سے بال اکھاڑ کر ان پر لوشن کے اثر کو پرکھے جانے کے لیے ہر سال لاکھوں منی پگز مارے جاتے ہیں۔ جوتے بنانے کے لیے ناگوں و اجگر کے شکار کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح نہ جانے کیا کیا بنانے کے لیے کون کون سے جانوروں کا شکار ہو رہا ہے۔

جنگلاتی زندگی کے تحفظ کے لیے دنیا بھر میں بہت سی قومی تفریح گاہیں اور پناہ گاہیں بنائی گئی ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں تحفظ جنگلات قانون بنایا گیا، جس کے تحت بہت سے علاقوں کو جنگلی جانوروں کے تحفظ اور ان کی نسلوں کو فروغ دینے کے لیے قومی پارک و پناہ گاہیں بنائی گئیں۔ جس کے مثبت نتیجے سامنے آ رہے ہیں۔ مگر ہمارے لیے یہ افسوسناک بات ہے کہ ایک بہت بڑے جغرافیائی علاقے کا مالک ہونے کے باوجود بھی جنگلاتی زندگیوں اور تحفظ ماحولیات کے لیے ملک میں صرف ۸۰ قومی پارک اور ۴۴۱ پناہ گاہیں ہیں جو ۷۰۰۴۸ مربع کلومیٹر کے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ملک کے کل جغرافیائی علاقے کا صرف سوا چار فی صد ہے۔ ان تمام پریشانیوں کے باوجود جنگلی زندگیوں کی نسلیں بڑھانے اور ان کے تحفظ کی امیدوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جنگلوں اور جنگلی جانوروں کی پناہ گاہوں کے قرب و نواح میں ہو رہے غیر قانونی قبضہ پر روک لگائی جائے۔ جنگلوں اور اس میں رہنے والے جانوروں کے تحفظ کے لیے بنائے گئے قوانین پر سختی سے عمل کرنا چاہیے۔ اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ آج ملک کے ہر باشندے کو جنگلی جانوروں سے بنی کسی چیز کے استعمال نہ کرنے کا عہد کر لینا چاہیے۔ ●

بقیہ۔ ٹیوبرکلوسس (ٹی۔ بی)

کم ہونا، بھوک نہ لگنا، بلغم میں خون آنا، سینے میں درد ہونا، سستی و تھکاوٹ معلوم ہونا اور کمزوری کا بڑھنا اس مرض کے خاص علامات ہیں۔

تشخیص

(۱) اس مرض کا شک ہونے پر بلغم کی جانچ کرانا چاہیے کیوں کہ بلغم میں اس مرض کے جراثیم موجود ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ بلغم کی جانچ کرانے پر مرض کے جراثیم ملیں ہی۔ علاوہ ازیں خون کی خاص جانچ بھی اس مرض کی تشخیص میں معاون ہوتی ہے جیسے ESR کی جانچ۔ پھیپھڑوں کی ٹی بی میں سینے کا X-RAY سب سے اہم ہوتا ہے۔ آج کل ہر شہر میں اس کے لیے سرکاری اسپتال اور صحتی مراکز موجود ہیں جہاں مفت X-RAY اور دیگر امتحانات کی سہولتیں موجود ہیں۔

احتیاط و علاج

مرض کی تشخیص ہو جانے پر مریض کو طویل عرصے تک پابندی سے دوائیں لینی پڑتی ہیں۔ اگر مریض معالج کے مشورے کے مطابق پابندی سے ادویات کا استعمال کرے تو اس مرض سے نجات حاصل کر سکتا ہے لیکن بیشتر مریض تھوڑا آرام ہونے کی صورت میں ادویات کا استعمال بند کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے کچھ دنوں بعد پھر یہ مرض پوری شدت اور تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ اس وقت ادویات کا اثر مرض پر پہلے کے مقابلے کم ہو جاتا ہے اور مریض کو صحت یاب ہونے میں وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ معالج کے مشورے کے مطابق دوائیں پابندی سے لیں۔ آج کل بازار میں اس مرض سے چھٹکارا دلانے والی موثر ادویات موجود ہیں جن کے مستقل استعمال سے کم مدت میں ہی مریض مکمل طور پر صحت یاب ہو سکتا ہے جیسے RIFAMPICIN، ETHAMBUTAL اور PYRAZINAMIDE وغیرہ ہے۔ آج کل تقریباً ہر شہر میں ایسے سرکاری اسپتال اور صحتی مراکز موجود ہیں جہاں اس مرض کی دوائیں غریب و نادار لوگوں کو مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

اس مرض سے نجات حاصل کرنے کے لیے دواؤں کے ساتھ ساتھ متوازن غذا لیں، کھلی ہوا میں رہیں اور پابند زندگی گزاریں۔ شراب سے پرہیز کریں، سگریٹ نوشی ترک کر دیں۔ اگر گھر میں کسی کو یہ مرض ہو جائے تو گھر کے دیگر افراد کی بھی جانچ کرائیں۔ کھانستے یا چھینکتے وقت منہ پر کپڑا یا رومال رکھ لیں۔ فرش پر جا بجا تھوکنے سے پرہیز کریں۔

اس مرض سے محفوظ رہنے کے لیے بچے کو ایک سے تین ماہ کے درمیان BCG کا ٹیکہ لگوائیں۔ یہ ٹیکہ بھی سرکاری اسپتالوں میں مفت لگایا جاتا ہے۔ کھلی ہوا، دھوپ، بہتر غذا، احتیاطی تدابیر و ٹیکے لگوا کر اس مرض سے بچا جا سکتا ہے۔

●

مشیل آصف (علیگ)

جنگل اور ماحولیات

انسان کی زندگی کے لیے کثافت اور آلودگی سے پاک ماحول اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کرہ ارض پر موجود تمام جاندار اور نباتات کے لیے ناگزیر ہے۔ اس لیے اب یہ انتہائی ضروری ہو جاتا ہے کہ ماحولیات کو نقصان پہنچانے والے عناصر کی نشاندہی کی جائے اور اسے دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔ مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ آج انسان اپنے مفاد اور اپنی ترقی کے نشے میں ایک جانب اپنی مادی آسائشوں کی فراوانی کرتا جا رہا ہے وہیں دوسری جانب اپنی اس ترقی کے لیے ماحولیات کو پوری طرح نظر انداز کر رکھا ہے۔ اس طرح مسلسل نظر انداز کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ اب جب کہ ماحولیات کو خطرناک حد تک نقصان پہنچ چکا ہے اور اس کے برے اثرات انسان اور کرۂ ارض کے تمام ذی روح پر اثر انداز ہونے لگے ہیں۔ ہم نے اسے محفوظ رکھنے میں اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش شروع کی ہے۔

ہندوستان میں سات کروڑ پچاس لاکھ ہیکٹر یعنی اس ملک کے زمینی خطے کے کل ۲۲ فی صد (۱۹۸۰ء کے مطابق) حصے میں جنگلات موجود ہیں جن میں صرف دو کروڑ ۷۰ لاکھ ہیکٹر ہی گھنے جنگلوں سے گھرے ہوئے ہیں جب کہ ہندوستان کے کل جغرافیائی رقبہ اور یہاں کی آبادی کی مناسبت سے ملک کے ۳۳ فی صد حصے میں جنگلات کا ہونا لازمی ہے۔ ۱۹۵۲ء میں حکومت ہند کی جانب سے بنائے گئے جنگلات پالیسی میں ملک کے ۳۳ فی صد حصے میں جنگلات لگانے پر زور دیا گیا تھا لیکن آج تک یہ ممکن نہیں ہو سکا بلکہ جنگلوں کے فی صد میں اور بھی کمی آتی گئی اور اب ہندوستان کے کل ۱۰ فی صد حصے پر ہی جنگلات باقی بچ گئے ہیں۔

جنگل ہمارے ماحولیات کو ہموار کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کے لیے قدرت کا نایاب تحفہ بھی ہے۔ مگر انسان کی لاعلمی یا پھر دانستہ طور پر صدیوں سے اسے کاٹا جا رہا ہے اور اس کے استعمال کے باعث اس کی بقا کو خطرہ لاحق ہے۔ جنگلوں کے بے انتہا کاٹے جانے کے سبب ہمارے ماحولیات پر نہایت برے نتائج پڑنے شروع ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کے ارتقائی سفر کے آغاز میں جہاں کرۂ ارض کے ۷۰ فی صد حصے میں جنگلات تھے وہیں آج صرف ۱۶ فی صد حصے میں جنگلات پائے جاتے ہیں۔ اس لیے آج جنگلوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ماحولیات کو متناسب بنائے رکھنے کے لیے ہمیں اس فکر کو پروان چڑھانا لازمی ہے کہ جنگلوں کی بقا کے بغیر اس کرۂ ارض کی بقا ممکن نہیں۔

جنگل اور اس کی نباتات کرۂ ارض کے وجود کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں کیوں کہ یہ سورج کی روشنی کے تعاون سے فوٹو سنتھیسس کے ذریعہ اپنے لیے خوراک فراہم کرتی ہیں اور ساتھ ہی ماحول میں موجود زہریلی گیس کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) اور آکسیجن (O) کے تناسب کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ہماری زمین کو گرم ہونے سے بھی بچاتی ہیں۔ اس طرح جنگلوں کے ختم ہونے سے پوری دنیا کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو رہا ہے اور اس کے برے اثرات سامنے آ رہے ہیں مثلاً عمارتی لکڑیوں اور ایندھن کی کمی ہوتی جا رہی ہے، نباتات اور جانوروں کے وجود کے لیے خطرہ پیدا ہو رہا ہے، مٹی کے کٹاؤ میں اضافہ ہو رہا ہے، مٹی کی قوتِ پیداوار میں کمی آ رہی ہے، سیلاب کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں، بنجر اور ریگستانی حصوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور گرین ہاؤس اثرات کے سبب تیزابی بارش جیسے مہلک حادثات کے ہونے کے امکانات بڑھ رہے ہیں۔

جنگلوں کے کاٹے جانے اور ماحولیات کو نقصان پہنچانے میں مندرجہ ذیل وجوہات قابل ذکر ہیں جس کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۱۔ سرکاری پالیسیوں میں موجود کمیوں پر نظر ثانی۔
۲۔ جھوم کھیتی جس کے تحت پودوں کو جلا دیا جاتا ہے۔
۳۔ جنگلوں میں آگ پھیلنا۔
۴۔ باندھ، سڑکیں اور مختلف ترقیاتی پروگرام کی غرض سے جنگلوں کو تباہ کرنا۔
۵۔ کیڑے مکوڑے اور دیمکوں اور امراض کی یلغار۔

سیکٹر I، ہارون نگر، پھلواری شریف، پٹنہ

۶۔ تیزی سے شہروں کا وجود میں آنا۔

اگر اب بھی مذکورہ بالا کمزوریوں اور خامیوں پر توجہ دی جائے تو ہم ایک بڑی حد تک جنگلوں کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

جنگلوں کی حفاظت اور ان کی ترقی کے لیے پہلی دفعہ انگریزی حکومت نے شعبۂ جنگلات کی بنیاد ڈالی تھی بعد میں اُسے ۱۸۷۸ء میں بدلا گیا تھا اور اس کے لیے علاحدہ آئین بنایا گیا تھا۔ ماحولیاتی مسائل کے بڑھ جانے کی وجہ سے چوتھے پنج سالہ منصوبے کے دوران مرکزی حکومت ہند نے ۱۹۷۲ء میں ایک ماحولیاتی مشاورتی کمیٹی کی تشکیل کی جس کا مقصد ماحولیاتی مسائل پر غور کرنا اور ان کا حل تلاش کرنا تھا۔ اس مشاورتی کمیٹی کی سفارش پر ۱۹۸۰ء میں ایک الگ شعبۂ ماحولیات وجود میں آیا۔ ۱۹۸۵ء میں اس شعبے کو ایک نئے وزارت جنگلات میں تبدیل کردیا گیا۔ اس وزارت کو ماحولیاتی اور جنگلاتی ترقی کے پروگرام پر خاص توجہ دینا تھا۔ مگر اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود آج تک جنگلوں کے استعمال پر نہ تو روک لگ پائی ہے اور نہ ہی ماحولیات کو آلودگی اور کثافت سے پاک کیا گیا ہے۔

الغرض ہمارے ملک میں جنگلوں کی حفاظت اور ان کی بقا کے لیے اہم اقدام اٹھائے جانے چاہئیں تاکہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں ماحولیات پر پڑنے والے نقصانات اور اس کے برے اثرات پر قابو پایا جاسکے۔ ان اقدام میں مندرجہ ذیل باتیں اہمیت کی حامل ہوسکتی ہیں۔

۱۔ عوام میں پودوں کی حفاظت کا رجحان پیدا کیا جائے۔
۲۔ عمارتی لکڑیوں اور دیگر سامان کے لیے کاٹے گئے درختوں کی جگہ اتنی ہی مقدار میں نئے پودے لگائے جائیں۔
۳۔ ایندھن کے لیے سوکھی اور بے کار لکڑیاں کاٹی جائیں۔
۴۔ جنگلوں کے قدرتی ذخائر کی حفاظت کی جائے۔
۵۔ ندیوں، جھیلوں اور نالوں کے بہاؤ والے خطوں پر درخت لگائے جائیں۔
۶۔ راجستھان اور سمندری علاقوں میں بننے والے ریگستانی خطے کے بڑھنے پر قابو پانے کی کوشش کی جائے۔
۷۔ دیہی باشندوں اور آدیباسیوں کے لیے ایندھن، چارہ گاہ اور دیگر چھوٹی موٹی پیداوار کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئے اقدام اٹھائے جائیں۔
۸۔ لکڑیوں کے استعمال کا اچھا متبادل تلاش کیا جائے۔
۹۔ راجیو گاندھی کے ذریعہ چلائی گئی نئے پودوں کو لگانے کی اسکیم کو ترقی دی جائے۔
۱۰۔ جنگلوں اور ماحولیات کی حفاظت کے لیے حکومت ہند کے ذریعہ بنائے گئے قوانین کو سختی سے نافذ کیا جائے۔ ان میں۔

۱۔ پانی کی آلودگی پر قابو پانے کا قانون ۱۹۷۴ء
۲۔ ہوا کی آلودگی پر قابو پانے کا قانون ۱۹۸۱ء اور
۳۔ فیکٹری قانون و جراثیم کش قانون اہم ہیں۔

اس کے علاوہ جنگلات کی حفاظت اور انتظام میں ریاستی محکموں، رضاکار تنظیموں اور دیہی علاقوں کے افراد و فرقوں کے درمیان تعاون پیدا کر کے ماحولیات اور جنگلات کی وزارت کے مشترکہ نظام کو فروغ دینا ہوگا، نیز نئے طریقہ کار و ترغیبات شروع کرنے ہوں گے۔ اس کے لیے عوام، غیر سرکاری تنظیموں، ماہرین سماجیات اور محققین کو ایک امدادی کردار ادا کرنا ہوگا۔ ●

بقیہ: دیہی عورتیں اور دیہی ترقی

مختلف جماعتوں کی دیہی عورتوں کے لیے متوقع مہارتیں

دیہی عورتوں کو سود مند روزگار فراہم کرنے اور مردوں کے برابر مزدوری حاصل کرنے میں آنے والی رکاوٹوں کا ذکر کیا جاچکا ہے مگر ان سماجی اور معاشی رکاوٹوں کے باوجود ان کے حل کے طریقے تلاش کرنے ہوں گے۔ یہ حل کچھ رکاوٹوں کے لیے مختصر عرصے اور کچھ کے لیے لمبے عرصے کی پالیسیوں کی شکل میں ہوسکتے ہیں۔

روزگار کی خواہش مند عورتیں بالخصوص غریب کسان خاندان یا بے زمین مزدور خاندان کی ہوتی ہیں۔ بطور جائزہ لینے کے لیے ان دونوں ہی خاندان کی دیہی عورتوں کے لیے موجود مہارت اور سہولتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی ضرورتوں کا الگ الگ تجزیہ کرنا چاہیے۔ روزگار فراہم کرنے والے متعدد پروگراموں اور پالیسیوں کو بناتے وقت ان میں غریبی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے والی دیہی بے زمین عورتوں کو اولیت دینی چاہیے سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعہ پیدا شدہ روزگار کے نئے طریقوں سے عورتوں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ تربیت کے لیے موجود مواقع کا جائزہ لینا ہوگا اور ان میں مناسب اصلاح کے ذریعہ وسعت دینا ہوگا۔

جہاں تک غریب عورتوں کا تعلق ہے انھیں ایسی تربیت دی جانی چاہیے تاکہ انھیں نسبتاً زیادہ مزدوری پر روزگار حاصل ہوسکے۔ ان کے لیے بچوں کی دیکھ بھال، دیہی ہنرمندی، کتائی بنائی، چٹائی بننے، مرغی پالنے، شہد کی مکھی پالنے، سلائی اور تصویر کشی وغیرہ کی تربیت خود روزگار حاصل کرنے اور مزدوری پانے دونوں ہی حیثیت سے کافی مفید ہوسکتی ہے۔

دیہی عورتوں کی ترقی، قومی پیداوار میں ان کی حصہ داری اور سماج میں اہم کردار ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں ریزرویشن کے ذریعہ خاص مواقع فراہم کیے جائیں۔ ان کی سماجی دشواریوں کو ختم کرنے کے واسطے انھیں خصوصی ہمت افزائی، امداد اور رہبری کی ضرورت ہے۔ یہ تبھی ممکن ہوسکتا ہے جب سماج کا ایک بڑا حصہ انھیں مساوات اور برابری کا درجہ بخشے اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے مواقع فراہم کرے۔ حکومت کو اس جانب خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ سیاسی شعور اور معاشی امداد کے ذریعہ حکومت عورتوں کی خود کفالت اور قومی پیداوار کے میدان میں اہم رول ادا کرسکتی ہے لیکن اس جانب عورتوں کو خود باشعور ہونا پڑے گا اور انھیں دیہی سطح سے لے کر قومی سطح تک اپنے حقوق کی لڑائی کو مضبوطی سے لڑنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا پڑے گا۔

ہندوستان کی معیشت میں خواتین کا حصّہ

مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں دونوں کا تعاون بے حد اہم ہے۔ دور حاضر میں اکثر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ خواتین نے اب روزی روٹی کمانے میں ہاتھ بٹانا شروع کیا ہے۔ اس سے قبل وہ محض گھر کی زینت تھیں۔ ان کا کام روزمرہ کے گھریلو کام کاج اور بچوں کی پرورش اور پرداخت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ عہد وسطیٰ میں یہ خیال عام تھا تاہم اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال میں جزوی صداقت ہے۔ اصل صورت حال ازمنہ قدیم سے یہ رہی ہے کہ سماج کا تھوڑا سا نام نہاد طبقہ جسے اعلا طبقہ خیال کیا جاتا تھا، خواتین کو گھر کی زینت سمجھتا تھا۔ اس طبقہ کی خواتین پردہ کرتی تھیں اور گھروں تک محدود رہتی تھیں مگر غریب اور مزدور طبقے یا نچلے طبقے کی عورتوں نے ہر دور میں اپنے گھر کے مردوں کے شانہ بہ شانہ روزی روٹی کمانے میں ہاتھ بٹایا بلکہ اکثر ان سے زیادہ محنت کی ہے کیوں کہ ان خواتین پر بچوں کی پیدائش سے لے کر ان کی پرورش اور گھریلو کام کاج بھی ان کے ذمہ ہوتا تھا۔ ہندوستان کے متعلق توقعات لفظ بہ لفظ سچ ہے۔

ازمنہ قدیم سے ہندوستان بنیادی طور پر زرعی ملک رہا ہے۔ تعلیم کا رواج کم ہونے کے ساتھ ساتھ سماج میں طبقاتی تقسیم مضبوط ہوتی گئی۔ سماج کے تھوڑے سے طبقے کے علاوہ بیشتر آبادی چھوٹے موٹے کام کر کے اور اکثریت زرعی مشغلوں سے روزی حاصل کرتی تھی۔ کاشت کے کام میں خواتین کا تعاون ہر قدم پر ہوتا تھا۔ اگر ہل چلانے کا کام مرد کا تھا تو بیج ڈالنے کا کام خواتین انجام دیتی تھیں۔ آب پاشی، فصل کی کٹائی، مڑائی، صفائی، اناج کی حفاظت تمام کاموں میں خواتین نصف سے زیادہ حد تک شریک ہوتی تھیں۔ انگریزی حکومت کے دوران بھی صورت حال کم و بیش ایسی ہی رہی یعنی نام نہاد اعلا طبقے کی خواتین کے علاوہ سماج کے دیگر طبقات کی عورتیں روزی کمانے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ رہیں۔ آزادی کے بعد جب سماجی تقسیم کی نئی بنیادیں قائم ہوئیں، تعلیم عام ہوئی اور صنعتوں کی ترویج ہوئی تو سماج کے فرسودہ نظام میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی۔ بڑی تعداد میں صنعتی اداروں کے قیام سے زرعی مزدور کاشت کاری کے دھندوں سے نکل کر شہروں کی طرف جانے لگے۔ خواتین نے بھی روزگار حاصل کرنے کی جانب توجہ دی اور دھیرے دھیرے خواتین گھر و کھیت کی حدود سے نکل کر نوکری کی جانب مائل ہونے لگیں اگرچہ یہ تعداد آبادی کے لحاظ سے بہت کم رہی اور خواتین کی اکثریت اپنے پرانے طرز پر زراعت و زرعی مزدوری یا دیگر شکل میں مزدوری سے وابستہ رہی۔ خواتین کی حالت میں تبدیلی کی باتیں تو بہت ہونے لگیں مگر حقیقت حال میں اب بھی کوئی خاص تبدیلی نہ آئی۔

آزادی کے بعد ملک میں جمہوری حکومت نے سماجی بہبود کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ خواتین کو مساوی مقام و اختیارات و حقوق دیے گئے، تعلیم عام ہوتی گئی۔ سماجی تبدیلی کا عمل شروع ہوا۔ تعلیم نے عوام کو اپنے حقوق و اختیارات کے تئیں بیدار کر دیا۔ مردم شماری سے تھوڑے تھوڑے عرصے بعد مفید اعداد حاصل ہونے لگے۔ مردم شماری محض تعداد شماری نہ تھی بلکہ اس کے ذریعہ کچھ اہم اقتصادی سوالات کے جوابات بھی جمع کیے جانے لگے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں روزگار کے متعلق جانکاری بھی حاصل کی گئی کہ گزشتہ برس کس فرد نے روزگار کے سلسلہ میں کون سا کام کیا۔ آیا یہ کام جز وقتی تھا یا کل وقتی۔ جن لوگوں نے کوئی کام نہ کیا ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ کسی کام کی جستجو میں ہیں۔ ان تمام تفصیلات کے حصول کے بعد حاصل شدہ جانکاری کی بنیاد پر نتیجہ نکالا گیا کہ اتنی تعداد میں کاشت کار ہیں، اتنی تعداد میں کاشت کاری سے وابستہ مزدور ہیں، کتنے کنبہ جاتی دھندوں میں مصروف عمل ہیں وغیرہ۔

ہندوستانی معیشت میں خواتین کے حصے کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کی باقاعدہ طور پر کام کاج میں شرکت بہت زیادہ نہیں رہی ہے۔ ۱۹۹۱ء میں خواتین کو کام کاج یا روزی روٹی میں باقاعدہ شرکت ۲۲٫۷ تھی جو آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ چوں کہ اب تعلیم کی ترویج کافی ہو گئی ہے اس لیے خواتین آہستہ آہستہ مختلف پیشوں میں بھی بہ طور ملازم شامل ہو گئی ہیں۔ شہروں میں خواتین کا ملازمت کرنا ایک عام بات ہے اگرچہ خواتین کی ملازمت نے بہت سارے نئے مسائل کو جنم دیا ہے۔ ان میں بچوں کی دیکھ بھال و پرورش، گھریلو کاموں کا مسئلہ، جذباتی و نفسیاتی مسائل بہت کچھ شامل ہے۔

اردو یونٹ پریس انفارمیشن بیورو شاستری بھون نئی دہلی

خواتین کی شرکت میں گزشتہ دہائی میں محض تین فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ بھارت کی مختلف ریاستوں میں خواتین کے روزگار سے وابستہ ہونے، معاملات یا ان کی تعداد میں خاصا تضاد ہے۔ سکم میں یہ شرح ۵۳ فی صد ہے۔ بہت سی ریاستوں میں یہ شرح ۷ فی صد سے بھی کم ہے۔ اس کے علاوہ دیہی و شہری علاقوں کی شرحیں بھی خاصی مختلف ہیں تاہم دیہی علاقوں میں یہ تعداد بہرحال زیادہ ہے جس کی مختلف وجوہات ہیں۔ خواتین کے معاشی لحاظ سے سرگرم عمل نہ ہونے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ عام طور پر لڑکیوں کو لڑکوں سے کم اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر اتنی توجہ مرکوز نہیں کی جاتی۔ خیال عام ہے کہ لڑکیاں پرایا دھن ہیں لہٰذا ان پر بہت زیادہ پیسہ اور وقت صرف کرنا بے سود کام ہے۔ جہاں خواتین گھریلو صنعتوں اور فارموں پر کام بھی کرتی ہیں وہاں انھیں کام کاجی خواتین نہیں سمجھا جاتا۔ اکثر مقامات پر خواتین کا کام کاجی ہونا گھر کی آن بان کے منافی خیال کیا جاتا ہے۔ مردم شماری میں بھی یہ حقائق چھپائے جاتے ہیں۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں باقاعدہ طور پر کام کرنے والی خواتین کی تعداد چھ کروڑ ۶۰ لاکھ تسلیم کی گئی جزوی طور پر کام کرنے والیوں کی تعداد دو کروڑ ۵۰ لاکھ نکالی گئی تھی۔ باقاعدہ طور سے کام کرنے والیوں میں سے ۶ء۳۴ فی صد اپنے ہی فارموں پر کام کرتی تھیں۔ ۶ء۴۳ فی صد کاشت کاری سے وابستہ مزدوری کرتی تھیں۔ ۶ء۴ فی صد گھریلو دھندوں سے وابستہ تھیں۔ ۳ء۱۷ فی صد تعداد دیگر متفرق کاموں سے وابستہ بتائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں خواتین کو چائے باغات میں، مویشی پالنے، مچھلی پکڑنے، جنگلوں و پھلوں کے باغات میں مصروف عمل بتائی گئی تھیں۔

تعلیم کے بڑے پیمانے پر فروغ کے باوجود ابھی خواندگی کی تعداد ہر ریاست میں مساوی نہیں ہو سکی ہے۔ خواتین کی خواندگی سے بہت سے حقائق جڑے ہوئے ہیں۔ ہماری معیشت بھی بڑی حد تک خواندگی یا ناخواندگی کے ارد گرد گھومتی ہے۔

ہندوستان کے حالات کے پس منظر میں بغور مطالعہ کرنے پر واضح ہوتا ہے کہ یہاں ہر زمانے میں خواتین نے معیشت کے شعبے میں اپنا تعاون دیا ہے۔ اب یہ دیگر بات ہے کہ یہ تعاون دیگر ممالک کے مقابلے وافر نہ رہا ہو۔ نام نہاد اعلا طبقے کی خواتین کے علاوہ عام لوگوں میں خواتین کام کاج میں ایسے کنبے کے مردوں کی برابر معاون و مددگار رہی ہیں خواہ باضابطہ ان کا شمار کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ معیشت میں خواتین کی جس سطح کی شرکت کی توقع کی جاتی ہے اس کے لیے خواتین کا باقاعدہ تعلیم یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ پورے ملک کی مجموعی ترقی سچ دراصل تعلیم سے براہ راست وابستہ ہے اور خواتین اس سے الگ نہیں ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ خواتین میں تعلیم و حرفت کو فروغ دیا جائے۔ تعلیم انھیں معاش کے معاملے میں خود کفیل بنا دے گی۔ جہالت بہت ساری مصیبتوں کی جڑ ہوتی ہے، جب تعلیم عام ہوگی تو جہالت کے اندھیرے دور ہو جائیں گے اور بہت سارے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔ تعلیم کا مطلب خواندگی اور پیشہ ورانہ تربیت دونوں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچیوں کو جہاں عام رسمی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے وہیں انھیں متعلقہ صنعت و حرفت کی بھی باقاعدہ تعلیم دی جائے۔ لڑکیوں کے مخصوص آئی ٹی آئی ادارے اس کام میں کافی مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ بہت سی ریاستوں میں بڑے شہروں میں ایسے صنعتی تعلیم کے ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دیہی علاقوں میں لڑکیوں کے لیے صنعتی تربیت کے ایسے ادارے قائم کیے جائیں کیوں کہ اصل ہندوستان شہروں سے زیادہ دیہات میں بستا ہے۔ جب تک دیہی علاقے صنعت و حرفت سے بے بہرہ ہیں ترقی کا دعویٰ صحیح نہ ہوگا۔ جب خواتین خواندہ ہوں گی تو معیشت میں ان کا تعاون بھی بھرپور ہوگا اور بھارت بھی ان ممالک کی صف میں آ جائے گا جہاں کی معیشتوں میں خواتین کا حصہ مردوں کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے بہت سی کوششیں کی ہیں۔ کام جاری ہے۔ عوامی تعاون کی شرط کے ساتھ ایک دن ملک ناخواندگی کے اندھیرے سے نکل کر علم و حکمت کے راستے پر گامزن ہوگا

●

گوتم بدھ — ایک عظیم سنت

اے۔ سریکھا راؤ

پورے چاند کی حیرت کر دینے والی خوب صورتی قابلِ دید ہوتی ہے۔ پورے چاند کو عرصہ دراز سے مبارک سمجھا جاتا رہا ہے۔ بیساکھ کے مہینے کا پورا چاند بدھ مذہب کے ماننے والے لوگوں کے لیے تین طرح سے اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ جب گوتم بدھ پیدا ہوئے تھے، اس وقت پورا چاند نکلا ہوا تھا، جب انھیں گیان حاصل ہوا تھا تو اس وقت بھی پورا چاند نکل رہا تھا، انھوں نے جب 'مہاپری نروان' حاصل کیا تھا تو اس وقت بھی پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے بدھ پورنیما کی شروعات ہوئی ہے، جو ہر سال منائی جاتی ہے۔

بدھ مذہب مکمل طور سے گوتم بدھ، ان کی شخصیت اور تعلیمات کی دین ہے۔ گوتم بدھ کی زندگی اور ان کی سادہ سی تعلیمات انسان کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ اس عظیم سنت کا پیغامِ امن موجودہ ایٹمی زمانے کے لیے انتہائی موزوں ہے۔

مکتبِ فکر

بدھ مذہب میں فلسفہ، مذہب، نفسیات، طریق عمل وغیرہ بھی شامل ہے۔ گوتم بدھ کی پیدائش اور ابتدائی زندگی سے وابستہ دو اہم مقامات لومبنی اور کپل وستو ہیں، جو دونوں نیپال میں ہیں۔ بیساکھ کے مہینے میں جب موسم بہار اپنے شباب پر تھا، ساکیہ راجہ شدھودنہ اور مایا دیوی کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، جس کا نام سدھارتھ رکھا گیا تھا۔ اس وقت پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ اس موقع پر خوب خوشیاں منائی گئی تھیں۔ کپل وستو میں ان کی ابتدائی زندگی گزری، وہیں انھوں نے تعلیم حاصل کی اور وہیں ان کی شادی ہوئی۔

راجہ شدھودنہ نے اس بات کا بہت خیال رکھ

باقی صفحہ ۳۶ پر

ڈاکٹر این۔ پی۔ پاٹھک و محمد شریواستو

دیہی عورتیں اور دیہی ترقی

ہندوستان گاؤں کا ملک ہے۔ ملک کی ۷۰ فی صد سے زیادہ آبادی گاؤں میں بستی ہے اس لیے فطری طور پر ملک کی کل آبادی کی لگ بھگ ۷۰ فی صد عورتیں دیہی علاقوں میں رہتی ہیں لہٰذا دیہی ترقی میں ان عورتوں کی موثر حصہ داری ضروری اور اہم مانی جانی چاہیے لیکن ملک کے سماجی حالات اور روایتوں کی وجہ سے دیہی عورتوں کے اس اہم ترین کام کو نہ تو اہمیت دی گئی اور نہ ہی مواقع فراہم کیے گئے۔ ہمت افزائی کی تو بات ملک کے مردانہ سماج کو غالباً منظور ہی نہیں تھی۔ جب کہ سچائی یہ ہے کہ ہندوستان کی دیہی معیشت میں عورتیں نہایت ہی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

عورتیں اور سماجی و معاشی اعمال

انسان کی تہذیبی زندگی کی ترقی میں سماجی عمل ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور اس ترقی میں عورتوں کا کردار نہایت اہم اور کارآمد ثابت ہوا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بنیادی ضرورتوں کے لیے اگر کسی نے ضروری چیزوں کی تلاش کی تو اس میں عورتوں کا کردار سب سے بلند تر ہے پھر بھی اس مردانہ سماج نے اس اہم خدمت کو قبول نہیں کیا۔ مردوں نے عورتوں کو اپنا غلام بنائے رکھا اور انھیں مختلف طرح کے دقیانوسی، سماجی اور معاشی بندھنوں میں جکڑے رکھنے میں اپنی اہمیت کی بقا محسوس کی۔ یہی وجہ ہے کہ پورے ملک بالخصوص دیہی علاقوں میں عورتوں کی سماجی حالت نہایت ہی افسوسناک رہی ہے۔

۱۹ویں صدی کے بعد ہندوستانی سماج میں کچھ روشن دماغ جماعتوں کے عورتوں کی ترقی کی راہ میں اہم کام انجام دینے اور خود عورتوں کے نظریے کے مطابق انقلابی تبدیلیوں سے ان کی سماجی حیثیت میں بہتری آئی ہے اور ساتھ ہی عورتوں کے سماجی استحصال کو روکنے اور یکساں مواقع فراہم کرنے کے لیے حکومت نے بھی مختلف قانون بنائے ہیں لیکن ان کوششوں کے باوجود عورتوں کو سماجی عطا کرنے کی سمت تشفی بخش ترقی نہیں ہوئی۔ اس کے لیے عوامی آگہی کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ترقی کے قانون کے نفاذ میں موثر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

دیہی عورتوں کی سماجی اور معاشی حالات

۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق جہاں ملک کی کل خواندگی کی شرح ۵۲ر۱۱ فی صد ہے وہیں عورتوں کی خواندگی ۳۹ر۴۲ فی صد ہے۔ مرد کی خواندگی ۶۳ر۹ فی صد ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ دیہی اور شہری عورتوں کی خواندگی کے تناسب میں یہ فرق بہت زیادہ ہے۔ دیہی علاقوں میں عورتوں کی خواندگی ۱۳ر۲ فی صد ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہندوستان کی دیہی عورتوں میں ناخواندگی اب بھی ۸۵ فی صد سے زیادہ موجود ہے۔ ناخواندگی کو کم کرنے کے لیے زیادہ کوشش نہیں کی جارہی ہے۔ اس کی تصدیق اسکولوں کے مختلف درجے میں لڑکے لڑکیوں کے داخلے میں فرق سے ہوتی ہے۔

خواندگی کے میدان میں اسی طرح دیہی و شہری اور مرد و عورت کی خواندگی میں موجود اس بڑے فرق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے علمی میدان میں عورتوں کو ابھی بھی یکساں مواقع نہیں مل رہے ہیں جب کہ انھیں خصوصی مواقع کی ضرورت ہے۔ آج بہت سے دیہی خاندانوں میں لڑکیوں کی تعلیم پر ہونے والے خرچ کو فضول خرچی تصور کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ سماج کے کچھ طبقوں میں لڑکیوں کی پیدائش کو بدقسمتی کی علامت سمجھے جانے کا دقیانوسی رواج بھی موجود ہے۔ اس طرف عورتوں کی طرف بے پروائی اس کی پیدائش سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اس بے اعتنائی کی وجہ سے ہی دیہی علاقے کی عورتوں کو سود مند طور پر کردار نبھا پانے میں نااہل تصور کیا جاتا ہے اور انھیں کاشت کاری میں مشغول رہنا پڑتا ہے۔

آج بھی دیہی عورتوں کے لیے زراعت ایک اہم معاشی ذریعہ ہے لیکن وہاں بھی مرد مزدور اور عورت مزدور کی تفریق کے ذریعہ عورتوں کا معاشی استحصال کیا جارہا ہے۔ حالاں کہ مختلف قانون کے ذریعہ اسے ختم کرنے کے لیے حکومت نے کم از کم اجرت مقرر کردی ہے لیکن قومی مزدور کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ابھی عام طور سے سبھی میدانوں اور بالخصوص کھیتی کے میدان میں مردوں اور عورتوں کے درمیان مزدوری کی تفریق جاری ہے۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ نئی معاشی پالیسی سے ترقی کی شرح میں اضافہ ہوگا اور روزگار کے مواقع زیادہ فراہم ہوں گے۔ ہمارے ملک کی غریبی معاشی نہ ہو کر سماجی اور جنسی بنیادوں پر قائم ہے۔ غریبی لکیر کے نیچے وہ لوگ ہیں جو زرعی مزدور ہیں یا کمزور کسان یا چھوٹی صنعت کے مزدور مگر یلو مزدور ہیں۔ ان میں زیادہ تر شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ قبائل

طبقے کے لوگ ہیں۔ ان میں مردوں کے مقابلے عورتوں کی شرح زیادہ ہے۔

دیہی عورتوں کی معاشی حصہ داری

قومی نمونہ جانچ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ دیہی مزدوروں کی کافی بڑی تعداد خود روزگاری میں منہمک ہے یا وہ مفت گھریلو مزدور کی طرح کام انجام دے رہے ہیں اور انھیں محدود روزگار مہیا ہیں۔ حالانکہ ہر دس برس پر ہونے والی مردم شماری سے اس بات کی پوری طرح وضاحت نہیں ہوتی مگر موٹے طور پر اس کے وسیع جائزے کے لیے ان میں موجود دیہی عمل میں حصے داری کی شرح سے مدد لی جاسکتی ہے۔ مندرجہ ذیل فہرست میں دیہی عمل میں حصے داری کی شرح گزشتہ تین مردم شماری کے ذریعہ جنسی بنیاد پر پیش کی گئی ہے:۔

ہندوستان کے دیہی عمل میں حصہ داری کی شرح

(۱۹۷۱ - ۱۹۹۱ء)

مردم شماری	آبادی کی کل شرح	مرد	عورت
۱۹۷۱ء	۳۵٫۳۳	۵۳٫۷۸	۱۵٫۹۲
۱۹۸۱ء	۳۸٫۷۹	۵۳٫۷۷	۲۳٫۰۶
۱۹۹۱ء	۴۰٫۲۴	۵۲٫۵۰	۲۷٫۲

مندرجہ بالا فہرست پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۷۱ - ۱۹۸۱ء میں دیہی مرد وزن دونوں کی ہی حصہ داری کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن عورتوں کی حصہ داری کی شرح میں اضافہ نسبتاً زیادہ تیزی سے ہوا ہے۔ ۱۹۸۱ - ۱۹۹۱ء میں مرد کی حصہ داری میں کوئی معنی خیز اضافہ نہیں ہوا ہے مگر دیہی عورتوں کی حصہ داری کا تناسب ۲۳٫۰۶ سے بڑھ کر ۲۷٫۰۱ ہوگیا ہے جو یقیناً اس بات کا ثبوت ہے کہ دیہی عورتوں کے حالات میں بہتری آئی ہے۔

مختلف میدانوں میں عورتوں کا کردار

ہندوستانی دیہی عورتیں مختلف پیمانے پر مختلف رول ادا کرتی ہیں اور انھیں سلیقے سے انجام دیتی ہیں۔ کچھ خاص میدانوں میں ان کے اعمال کو مندرجہ ذیل طور سے پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) گھریلو کردار: بچوں کی پرورش کا کام صرف عورتوں کے ذریعہ ہی انجام پاتا ہے کیوں کہ یہ کام مرد نہیں کرسکتے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ گھریلو کام کاج کے تحت عورتیں خاندان کے ارکان کے ذائقے اور دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے کھانا پکانے کی ذمہ داری بھی نبھاتی ہیں۔ اس کے علاوہ پانی لانا، گھر کی صفائی کرنا اور خاندان کے رہن سہن جس میں جانوروں کا رکھ رکھاؤ بھی شامل ہے زیادہ تر عورتوں کے ہی ذمہ ہے۔ دیہی عورتیں خاندان کے بزرگوں اور معذوروں کی خاص دیکھ بھال کا کام بھی انجام دیتی ہیں۔ کچے مکاں میں رہنے والی عورتیں برسات کے خاتمے پر کم از کم ایک بار یا کسی خاص تہوار کے موقعہ پر اپنے گھروں کی رنگائی بھی کرتی ہیں۔

(۲) زرعی عمل میں عورتوں کا کردار: دیہی علاقے کی مزدور عورتوں کا ایک بہت بڑا حصہ زراعت میں مصروف ہے۔ انھیں کھاد ڈالنے، بیج بونے، گھاس پھوس ہٹانے، نرائی گڑائی، اناج کی صفائی، جمع کرنے، جانوروں کے چارے کا انتظام، جانوروں کی دیکھ بھال کرنے، باورچی خانے کے لیے سبزی اگانے اور فروخت سے متعلق روزمرہ کا کام انجام دینا پڑتا ہے۔ چائے اور کپاس جمع کرنے میں بھی وہ اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

(۳) دیہی و چھوٹی صنعتوں میں عورتوں کا کردار: ہندوستان میں دیہی اور چھوٹی صنعتوں کا کاروبار خاندانی اکائی کی سطح پر ہوتا آیا ہے۔ اس کام میں دیہی عورتوں کا کردار کافی اہمیت کا حامل ہے۔ کھلونے، دری، غالیچے، ٹوکری وغیرہ بنانے میں عورتوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

(۴) عورتوں کا خاص رول: عورتوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ خاندان میں وہ اہم رول ادا کرتی ہیں مثلاً بیوی، بہن اور ماں کی ذمہ داری نبھانے کے ساتھ ہی اپنی دلچسپی کے تحت سماج میں موجود برائیوں کے خاتمے کے لیے مجموعی طور پر تحریک چلاتی ہیں۔ ان مجموعی تحریکوں کے ذریعہ کئی ریاستوں مثلاً اتر پردیش اور آندھرا پردیش میں دیہی عورتوں کو نشہ بندی کی تحریک و بدعنوانی وغیرہ کے خاتمے میں کچھ حد تک کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ دیہی عورتوں کی ان قربانیوں کے باوجود معیشت میں ان کے کردار کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے مگر اس موضوع پر باریکی سے غور و فکر کی ضرورت ہے کیوں کہ عورتیں گھروں میں کئی ایسے کام بھی کرتی ہیں جنھیں کسی اور سے کروانے پر پیسے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ عورتوں کے ذریعہ انجام دیے گئے ایسے کام کا شمار گھریلو کام کاج میں کرلیا جاتا ہے اور یہ تصور کرلیا جاتا ہے کہ عورتوں کی معاشی حصہ داری نہیں کے برابر ہے۔

دیہی غربت کو دور کرنے کا عزم اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب کہ مرد اور عورت دونوں کو ہی سودمند روزگار کے مواقع فراہم کرائے جائیں بے شک بڑے پیمانے پر خود روزگاری میں لگے دیہاتیوں کی تعداد کا اندازہ لگانا کافی مشکل ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دیہی علاقوں کے مزدوروں کو روزگار اور بے روزگار کے خانوں میں آسانی سے تقسیم نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ سال کے چند مہینوں میں عام طور پر سبھی کو روزگار مہیا رہتا ہے اور سال کے کچھ مہینوں میں سبھی بے روزگار رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ خاندان باقاعدہ آمدنی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں ابھی بھی غیر منظم مزدور قوت کا ایک ایسا گروہ ہے جو ترقیاتی پروگراموں سے مستفید نہیں ہوسکا ہے اور یہ گروہ صرف مزدوری پر منحصر ہے۔ دیہی ترقی میں اس گروہ کے دیہی غریبوں کو شامل نہیں کیا جاسکا ہے۔

معاشی ترقی کے ڈھانچے میں تبدیلی سے عورتوں کا روزگار متاثر ہوا ہے۔ ایک سروے کے مطابق یہ محسوس کیا گیا کہ نئی تکنیک سے عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع کم ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر چاول کی نئی تکنیک کی وجہ سے ان عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع کم ہوئے ہیں جو روایتی ڈھنگ سے دھان سے چاول نکالنے کے عمل میں شامل تھیں لیکن واضح رہے کہ نئی تکنیک کے ذریعہ عورتوں سے واپس لیے وہ کام نہایت ہی تھکانے والے اور پیچیدہ تھے۔ لہٰذا ایسی صنعتوں مثلاً چاول ملوں اور دال ملوں کے ذریعہ عورتوں کو متبادل روزگار کے مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں۔ معاشی ترقی سے بھی دیہی معیشت میں متعدد تبدیلیاں ہوتی ہیں جس سے عورتوں کے روزگار کے مواقع متاثر ہوتے ہیں۔

باقی صفحہ پر

امیتابھ رنجن شکل

خواتین میں نشہ: بڑھتا رجحان

ایم ٹی وی، چینل وی، اسٹار ٹی وی اور مختلف چینلوں کے آسمانی حملے نے ہندوستانی سماج کی تہذیب اور ثقافت کی جڑیں ہلا نا شروع کر دی ہیں۔ دور درشن کے نئے نئے سیریلوں میں آزاد عورتوں کی اب تصویر دکھنا شروع ہو گئی ہے۔ جدیدیت یوروپی نقالی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ نئی کمپنیوں اور پیداوار کے ساتھ ساتھ نئی قدریں اور تہذیبیں ہندوستانی سماج میں اپنا سکہ جماتی جا رہی ہیں۔ اسی دوران ایک اور بات ایسے مغربی مزاج کی شکل میں سامنے آ رہی ہے وہ ہے —— ہندوستانی خواتین میں نشے کا بڑھتا رجحان۔

اگر سوم رس کو نشیلا مشروب سمجھ لیا جائے تو ہندوستانی خواتین میں نشے کی روایت زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ عہد وسطیٰ میں دہلی سلطنت اور بالخصوص مغل بادشاہوں کے حرموں اور محلوں میں خواتین کی نشہ خوری خاص کر شراب نوشی کی کافی مثالیں موجود ہیں لیکن شراب نوشی کرنے والی یہ جماعت موجودہ آبادی کی نسبت بہت کم تھی اور بیشتر اعلا طبقے تک ہی محدود تھی۔ یہ کبھی ہندوستانی سماج کی منظوری حاصل نہیں کر سکی۔ حالاں کہ شیڈولڈ کاسٹ قبائلی اور پسماندہ طبقے کی عورتوں میں نشے کی ایک مسلمہ روایت موجود تھی اور اب بھی بہت حد تک ہے۔ لیکن اس طبقے کی خواتین کے لیے نشہ خوری یا تو مذہبی رسم ورواج کا ایک حصہ تھی یا تہوار کے موقع پر دلچسپی کا ذریعہ۔

نشے کے رجحان کو آج ہم بالخصوص دو حصے میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ لاشعوری حالت اور شعوری حالت۔ لاشعوری حالت میں نشہ کرنے والی خواتین اس کے برے اثرات سے واقف نہیں ہوتی ہیں اور یہاں تک کہ انھیں اپنے نشے کی غلامی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ علاقائی قبیلے مثلاً چھوٹا ناگپور میں ہڑیا، شمال مشرقی ہندوستان کے علاقائی قبیلے میں چھانگ وغیرہ قبیلے میں شراب نوشی کے رجحان اس زمرے میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

دوسری قسم یعنی شعوری حالت مہذب اور جدید کہے جا رہے سماج کی خواتین میں موجود ہے۔ انھیں اپنے نشے کے رجحان اور اس کے برے اثرات کا پتا ہوتا ہے لیکن نشے کی خیالی دنیا کی کشش انھیں اپنی طرف کھینچتی جاتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایسی حالت میں کافی دور تک سفر طے کرنے والی اعلا طبقے کی خواتین اور بھی زیادہ مہذب اور جدید سمجھی جانے لگی ہیں۔

خواتین میں نشے کے رجحان کی اور بھی وجوہ ہیں جو عام طور پر مردوں میں نشے کے رجحان کے مثل ہیں۔ زیادہ دماغی تناؤ جو جدید زندگی کا ایک حصہ بن چکا ہے اور معاندانہ خاندانی ماحول بعض دفعہ خواتین کو نشہ بالعموم شراب کی طرف لے جاتا ہے۔ بعض دفعہ ذائقے کے لیے ہی لڑکیاں نشے کی خوابگاہ کے دروازے پر دستک دیتی ہیں۔ گھر خاندان سے الگ پڑھائی یا نوکری کی غرض سے شہر میں رہنے والی لڑکیاں آج کل رم، وہسکی وغیرہ عام طور پر خاص موقع پر پینے سے نہیں ہچکچاتیں۔ بعض دفعہ اپنے مرد دوستوں یا گھر میں شوہر کی ضد کی وجہ سے بھی بعض خواتین کو نشہ خوری کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔

بڑے شہروں کی فیشن پرست خواتین میں سب سے مشہور نشہ شراب ہی ہے کیوں کہ یہ عام طور پر شوہر یا دوسرے پینے والوں کے ساتھ جرم کے تصور کو کم کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں اب اسے بری نگاہ سے بھی نہیں دیکھا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شراب نوشی اب رفتہ رفتہ بالائی طبقے کے شاندار محلوں سے درمیانی طبقے کے ڈرائنگ روم تک آنے لگی ہے۔ تمباکو نوشی برائے نام جدید خواتین میں ہی زیادہ رائج ہے۔ حالاں کہ دیہی علاقے کی خواتین میں بیڑی اور تمباکو کا استعمال کافی عام رہا ہے۔ لیکن سماجی ترقی اور تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ یہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ گو کہ خواتین میں پان کھانے کا رجحان گنگا کے میدانی علاقوں میں اب بھی موجود ہے تاہم مہنگے ہوتے پان کے مسالوں نے اس پر کچھ حد تک روک لگا دی ہے۔ پانی پیک پان مسالے اب پان کی جگہ لے رہے ہیں۔ شہری علاقوں میں خواتین کا اچھا خاصہ طبقہ پان مسالہ صنعت کا محافظ بن بیٹھا ہے۔

نشہ کرنے والی عام طور پر ہر شہری خاتون کو نشے کے برے اثرات کا پتا ہوتا ہے۔ تعلیم اور ٹیلی ویژن کی توسیع کی وجہ سے اسے پتا چل چکا ہوتا ہے کہ سگریٹ پینے سے پھیپھڑوں کی بیماری ہوتی ہے، کینسر ہوتا ہے اور دل کی بیماری کا خوف بڑھ جاتا ہے۔ اس کے باوجود برائے نام جدید خواتین سگریٹ پی رہی ہیں جب کہ ایک سگریٹ زندگی کے پانچ منٹ کم کر دیتا ہے اور شراب و تمباکو نوشی حاملہ بچے پر برے اثرات کی کالی مہر لگا کر اسقاط حمل تک کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ سگریٹ

باقی صفحہ ۳۱ پر

عبدالسلام صدیقی

بچت اور کفایت شعاری: اہمیت و افادیت

ہماری زندگی میں "بچت" اور کفایت شعاری کا ایک اہم مقام ہے۔ اپنے بے جا خرچ کو ختم کر کے انسان خوشگوار اور بہترین زندگی بسر کر سکتا ہے اور بچے ہوئے پیسے کو اپنے ہمسائے، برادری اور رشتہ داروں کے آڑے وقت میں ان پر خرچ کر کے ان کا ہم نوا، ہمدم اور احسان مند ہو سکتا ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو انسانیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہر انسان کے برے وقت میں ہر انسان کام آئے اس کی مدد کرے۔ اس اعتبار سے ہمیں سب سے پہلے "بچت" اور کفایت شعاری کے مفہوم کو سمجھنا ہوگا اور یہ جاننا ہوگا کہ کس کس طرح سے ہم بچت کر سکتے ہیں اور اس سے زیادہ سے زیادہ کس طرح فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

"بچت" خرچ اور آمدنی کے مجموعے پر منحصر ہے۔ آمدنی اور خرچ کا مجموعہ اگر مثبت میں ہے تو بچت ہو گی اور اگر منفی میں ہوا تو نقصان ہوگا۔ دنیا کا کوئی بھی شخص قرض لینا نہیں چاہتا بدرجۂ مجبوری اسے مقروض بننا پڑتا ہے۔ مشہور ماہر معاشیات KAINZ کے مطابق روزگار کے مطابق بچت اور خرچ کا ایک اہم مقام ہے۔ دونوں مل کر روزگار اور آمدنی کے مقام کو متعین کرتے ہیں۔

"آمدنی میں سے استعمال شدہ خرچ کی نفی کرنے کے بعد باقی رہنے والے روپیے کو بچت کہتے ہیں۔"

دوسری جگہ پر "کینز" نے کہا ہے کہ "بچت آمدنی اور خرچ کے فرق کو کہتے ہیں۔"

"بچت" انفرادی ہو سکتی ہے اور اجتماعی بھی۔ جیسے ایک آدمی کی آمدنی ۵ سو روپیہ ہے اور خرچ ۴ سو روپیہ ہے اس طرح سو روپیہ اس کی "بچت" ہو گی۔ یہ انفرادی بچت کہلائے گی۔ اسی طرح اگر کسی ملک کی آمدنی ۵ سو کروڑ روپیہ ہے اور خرچ چار سو کروڑ روپیہ تو ملک کو سو کروڑ روپے کی بچت ہو گی۔ اسے اجتماعی یا سماجی بچت کہیں گے۔ KAINZ نے بچت لفظ کا استعمال اجتماعی بچت کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بقول "کینز" "SAVING IS AN EXCESS OF INCOME OVER EXPENDITURE" "بچت آمدنی کی خرچ پر زیادتی ہے۔"

مختلف ماہر معاشیات نے بچت کے بارے میں اپنے اپنے خیالوں کا اظہار کیا ہے۔ ایک جگہ "کینز" اپنے عام اصول میں بچت کے متعلق خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے

"بچت" ایک طے شدہ وقت کی آمدنی میں سے اسی وقت ہونے والے خرچ کا فرق ہے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ بچت موجودہ آمدنی پر منحصر ہے۔ بقول "رابرٹسن"

"بچت، ماضی کی آمدنی اور حال کے خرچ کا فرق ہے۔"

اس طرح موجودہ بچتیں ان کے مطابق ماضی کی آمدنی پر منحصر ہیں۔"

جدید ماہر معاشیات میں "بچت" کو لے کر مختلف سوالات کیے جاتے رہے ہیں۔ جیسے بچت انفرادی خصوصیت ہے یا اجتماعی یا بچت ایک برائی ہے۔ اس بارے میں مختلف لوگوں نے مختلف خیالات پیش کیے ہیں۔ معیاری نقطۂ نظر رکھنے والے ماہر معاشیات بچت کا مطالعہ انفرادی نقطۂ نگاہ سے کرتے ہیں۔ ان کے مطابق "بچت" ایک بہت بڑی انفرادی اور سماجی خصوصیت ہے۔ ہر ایک کو اپنے مشکل اوقات کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور بچت کرنی چاہیے۔ انسان کا مستقبل غیر معین ہے۔ اس لیے اس کی حفاظت اور زندگی بہترین و سہولت سے گزارنے کے لیے ہر آدمی کو وقت کو مدنظر رکھ کر ضرور بچت کرنی چاہیے۔

انسان کی یہ سب سے بڑی خوبی بتائی گئی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بچت کرے اور کم سے کم خرچ۔ کیوں کہ ایک پیسے کی بچت ایک پیسے کی آمدنی ہے۔ ماہر معاشیات بچت کو آمدنی کا ہی دوسرا طریقہ مانتے ہیں۔ انفرادی لوگوں کی بچت کا مجموعہ ہی اجتماعی بچت ہے۔ جب انفرادی بچت ایک خوبی ہے تو اجتماعی بچت بلاشک و شبہ ایک اجتماعی خصوصیت ہو گی۔

"کینز" نے بچت کا مجموعی نقطۂ نگاہ سے تجزیہ کر کے بتایا کہ یہ ایک سماجی برائی اس معنی میں ہے کہ جب لوگ اپنی انفرادی بچت کو بڑھاتے ہیں تو نتیجے کے طور پر کل "بچت" بڑھنے کی جگہ کم ہو جاتی ہے۔ اس کا روزگار اور اشیا کی پیداوار پر مخالف اثر پڑتا ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ایک آدمی کا خرچ دوسرے آدمی کی آمدنی ہے۔ اس لیے جب ایک آدمی بچت

۱۵۲- کاویری ہوسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-۶۷

کرتا ہے تو دوسرے آدمی کی آمدنی اتنا ہی کم ہو جاتی ہے اور سماج کی کل آمدنی میں اضافہ نہیں ہو پاتا۔ اس کی وضاحت دوسرے طریقے سے یوں کی جا سکتی ہے کہ جب سبھی بچت کرنا شروع کر دیں گے تو ان کی اشیا اور ان کی برآمدگی کم ہو جائے گی۔ اس میں کمی ہونے کی وجہ سے چیزوں کی برآمدگی بڑھے گی۔ چیزوں کی مانگ کم ہونے کی وجہ سے ایک تو پیداوار کرنے والے رقم کم لگائیں گے، جس کا نتیجے کے طور پر خصوصیت کے مخالف اثر پڑے گا۔ اس کی وجہ سے آمدنی میں کمی ہونے لگے گی اور لوگوں کی بچت کرنے کی ہمت ٹوٹ جائے گی اور کل بچت نہیں بڑھ پائے گی۔ اس کا دوسرا اثر یہ پڑے گا کہ مانگ کم ہونے کے نتیجے کے طور پر پیداوار کم ہوگی۔ لوگوں کو روزگار کے مواقع نہیں ملیں گے اور لوگ پریشان ہوں گے۔ اس لحاظ سے جو لوگ بچت کرتے ہیں وہ حقیقی ملکیت کو تباہ کرتے ہیں۔ اس بنیاد پر بچت کرنا ایک سماجی برائی ہے۔

جدید ماہر معاشیات کے مطابق "بچت" ایک خصوصیت ہے یا برائی اس کا انحصار ان باتوں پر ہے کہ "بچت" کس نقطۂ نظر کے تحت کی جا رہی ہے۔ جیسے ترقی پذیر ملک ہے یا بچت کا استعمال کس طور پر کیا جا رہا ہے۔ ترقی پذیر - - - - - - - - - - - - ملکوں میں معاشی ترقی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ ان ملکوں میں ملکیت اور بچت میں کمی کی وجہ سے بے روزگاری پیدا ہوتی ہے۔ اگر ان ملکوں میں بچت زیادہ ہوگی تو پیداوار زیادہ ہوگی۔ اس لیے ترقی پذیر ملکوں کے سلسلے میں "کینس" کا نظریہ اثر انداز نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ان کے لیے "بچت" ایک سماجی خوبی ہے۔ ایسے ملکوں میں "بچت" کا سیدھا اثر یہ پڑتا ہے کہ "بچت" میں اضافہ ہونے سے قیمتوں میں ہونے والا اضافہ کم ہو جاتا ہے جس سے بچت کی اور اہمیت ہو جاتی ہے۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں اسی وجہ سے "بچت" پر بہت زور دیا جاتا ہے تاکہ اس کو تبدیل کر کے ملک کو معاشی ترقی کے راستے پر گامزن کیا جا سکے۔

"کفایت شعاری" اور "بچت" میں فرق ہے۔ کفایت شعاری اگر حد سے بڑھ جائے تو یہ کنجوسی "بخل" میں شامل ہو جاتی ہے۔ کفایت شعاری کا مفہوم ہوتا ہے کہ ہمارا کام کم خرچ میں بآسانی پورا ہو جائے اور کسی طرح کی کوئی پریشانی بھی نہ ہو۔ بچت کے مقابلے میں کفایت شعاری بالکل آسان ہے۔ جیسے شادی بیاہ، خوشی کے مواقع، تہوار اور دیگر جگہوں پر ہم بآسانی کم خرچ میں کام پورا کر سکتے ہیں اور جو پیسے ضرورت سے بچ جائیں انھیں ہم ایل۔ آئی۔ سی (بیمہ) اندرا وکاس پتر، کسان وکاس پتر یا بینکوں میں فکسڈ ڈپازٹ اسکیم کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مکان بنوانا، زمین خرید لینا اور بچوں کی تعلیم و تربیت پر خرچ کر سکتے ہیں اور بچا ہوا پیسہ ہم مشکل اوقات جیسے بیماری، اچانک حادثہ وغیرہ میں استعمال کر کے دوسروں کے مقروض ہونے سے بچ سکتے ہیں۔ کفایت شعاری کر کے تھوڑا تھوڑا اگر ہم پیسہ جمع کریں گے تو ایک دن یہ اچھی خاصی رقم ہو جائے گی جس سے لڑکیوں اور لڑکوں کی شادیاں بھی بآسانی کر سکیں گے۔

بچت اور کفایت شعاری کی ہماری روزانہ کی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ اس کے ذریعے ہم ہر میدان میں ترقی کر سکتے ہیں۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے ہم اپنے بچوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دلا سکتے ہیں اور ان کی بہترین طریقے سے تربیت بھی کر سکتے ہیں۔ اپنے دوسرے بھائی بندوں، پڑوسیوں حتیٰ کہ سبھی انسانوں کی ضرورت کے وقت مالی امداد کر کے اخلاقی نقطۂ نظر سے ان کے ہمنوا اور ہمدم بن سکتے ہیں۔

"بچت" کرنے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں یا تو آمدنی بڑھائی جائے یا خرچ میں کمی کی جائے۔ آمدنی بڑھانے کے مقابلے خرچ میں کمی کرنا زیادہ آسان ہے کیوں کہ آمدنی بڑھانے کے لیے جہاں ہمیں دوسرے ذرائع اپنانے پڑیں گے وہیں ہمیں محنت بھی زیادہ کرنی پڑے گی۔ اس کے برعکس ایسے بہت سے غیر ضروری اور بے جا اخراجات ہیں جنھیں ہم جانے انجانے میں کرتے رہتے ہیں ان میں تھوڑی سی عقل سے کام لے کر کافی حد تک کمی کی جا سکتی ہے۔ جیسے شادی بیاہ، تیج و تہوار، رسم و رواج وغیرہ۔

بچت اور کفایت شعاری کے سلسلے میں جاپان ملک کی مثال نمایاں ہے جس کے شہریوں نے بچت اور کفایت شعاری کے ذریعے کیسے ترقی کی اور آج اس ملک کا دنیا میں کتنا اونچا مقام ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپان کی اقتصادی حالت بہت خستہ تھی۔ لیکن وہاں کے شہریوں نے اتنی محنت کی اور بچت و کفایت شعاری کے ذریعے اتنا پیسہ جمع کیا کہ آج اپنے ملک کو اقتصادی اعتبار سے طاقتور ملکوں کی فہرست میں لا کھڑا کیا کہ آج امریکہ بھی اس سے خطرہ محسوس کرتا ہے۔ جاپان کے سبھی شہری چھوٹے بڑے، امیر، غریب اتوار کو آٹوموبائل کا استعمال نہ کر کے سائیکل پر یا پیدل چلتے ہیں۔ اس طرح ہفتے میں وہ ایک دن کی بچت سے اربوں ڈالر زر مبادلہ بچا لیتے ہیں اور اسے ملک کی ترقی پر خرچ کرتے ہیں جب کہ جاپان پٹرول برآمد کرتا ہے اور اسی پر اس کا انحصار ہے۔ ایک عام آدمی اگر بچت کرتا ہے تو اس کی اپنی بچت تو ہوتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ ملک کی بچت اور ملک کا زر مبادلہ بچتا ہے۔ اس طرح ملک ترقی کے راستے پر گامزن ہوتا ہے۔

دوسری جانب دیہی علاقوں میں رہنے والے کسان اور مزدوروں کو ان کے خالی اوقات کا استعمال کر کے اور ان کو تربیت دے کر چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں مشغول کر کے ان کی آمدنی بڑھا سکتے ہیں جیسے سوت کاتنا، بیڑی کے پیکٹ بنانا وغیرہ۔ اس کے لیے حکومت کو بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے دیہات بھی ترقی کر سکیں۔ اس کے لیے کسانوں کو محنت کرنی ہوگی اور کفایت شعاری سے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنا اور وقت کا استعمال صحیح طریقے پر کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ دیہی علاقوں کی MIDDLE CLASS متوسط طبقے کی عورتوں کو بھی ترغیب دے کر تربیت کرنی ہوگی تاکہ وہ مردوں کے کام میں معاون ہو سکیں۔ اگر انھیں مختلف کاموں کی تربیت دی جائے جیسے سوئٹر بننا، سلائی کڑھائی، کپڑے کی کٹنگ، دیاسلائی بنانا، پیکٹ بنانا وغیرہ تو یہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسہ جمع کر سکتی ہیں۔

اسی طرح متوسط طبقے کی شہری عورتیں بھی اس طرح کے کام سیکھ کر اپنا خرچ خود نکال سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ عورتیں بازاروں سے روزانہ

باقی صفحہ ۳۹ پر

عظیم اقبال

ایک پیالی چائے

اس مذکورہ عنوان سے برطانوی مصنفہ کیتھرین مینسفیلڈ (KATHERINE MANSFIELD) نے نسائی جذبات کی کامیاب ترجمانی کے لیے ایک افسانہ لکھا تھا۔ یقین مانیے، وہ افسانہ یہاں ہرگز موضوع بحث نہیں ہے۔

اگر آپ نباتات کی لسانیات میں مہارت رکھتے ہوں تو کیمیلیا سان سینس (CAMELIA SINESIS) کا نام سن کر بہ آسانی سمجھ جائیں گے کہ مشرقی ایشیائی خطے میں دستیاب، ہمیشہ ہری بھری رہنے والی سفید پھولوں والی جھاڑی (SHRUB) چائے (TEA) کی بات کی جارہی ہے۔ اسے مختلف ممالک میں "ٹے"، "ٹیہہ"، "تھی" اور "چا"، وغیرہ مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس پودے کی خشک شدہ پتیاں مختلف طریقوں اور مختلف ادوار سے گزر کر، دلکش خوشبو سے رچ بس کر بازار میں دستیاب ہوتی ہیں۔ یہی چائے، تیکھے ذائقے کے ساتھ کھولتے پانی میں اُبل کر، چھن کر دودھ اور شکر کے ساتھ گھل مل کر پیالی میں بھر کر ہمارے سامنے پیش ہوتی ہے۔ کچھ لوگ دودھ اور شکر کے بغیر ہی چائے نوش کرتے ہیں۔ سادہ چائے میں لیموں نچوڑ کر پینے کا بھی رواج ہے۔ کچھ لوگوں کی چائے نمک کی ایک چٹکی کے بغیر بے مزہ رہتی ہے۔

صبح سویرے بستر سے اٹھتے ہی کتنوں کو چائے کی طلب ہوتی ہے۔ وہ چائے کا گھونٹ بھرے بغیر دوسری ضروریات سے فارغ ہونے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ دیگر افراد ناشتہ کے بعد چائے نوش فرماتے ہیں۔ سہ پہر میں بسکٹ، سینڈوچ، کیک یا اسی طرح کی ہلکی پھلکی چیزوں کے ساتھ چائے لی جاتی ہے۔

چائے پر مدعو کر کے آپس میں مل بیٹھنے کا بھی رواج ہے۔ چائے کی تقریب کا کوئی وقت ہوتا ہے، نہ کوئی موسم۔ یہ ایک سماجی اور ثقافتی رواج کے بطور بھی رائج ہے۔

چائے کا استعمال مشرق سے مغرب اور پھر مغرب سے مشرق میں پروان چڑھا۔ آزادی سے ایک عشرہ تھوڑا قبل تک برصغیر میں پیدا ہوئے لوگ ان دنوں کو بھولے نہ ہوں گے جب کہ دروازے دروازے تیار شدہ چائے مفت تقسیم کی جاتی تھی، تاکہ لوگ اسے پئیں، اس کے ذائقے سے مانوس ہوں اور پھر اس کی طلب کریں۔

آج چائے کے بغیر ہماری زندگی نامکمل ہے۔ یہ ہماری زندگی کا ایک جزو ہے۔ یہاں تک کہ طب نے بھی اس کی افادیت تسلیم کر لی ہے۔ اعتدال سے چائے لیتے رہنے سے بچوں میں یہ پولیو کے خلاف ایک ٹیکے ANTI POLIOVACCINE کا کام کرتی ہے۔ یہ نہ صرف سستی دور کرتی ہے اور تازہ دم کرتی ہے، بلکہ یہ ممکنہ عارضۂ قلب کے خلاف ایک دوا کا کام بھی کرتی ہے۔

چائے میں ہمارے جسم کی نشوونما کے لیے مناسب حرارے بھی موجود ہیں۔ اس ضمن میں یہ خبر دلچسپی سے بھری ہے کہ ریاست مہاراشٹر کے شہر پونہ کے نواح میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والی "چیترا بائی تو برڑے" گزشتہ ۴۲ سالوں سے محض چائے کے سہارے زندگی گزار رہی ہے۔ چیترا بائی یومیہ چار لیٹر تک چائے پی جاتی ہے۔ اس کی چائے میں دودھ ہوتا ہے نہ شکر ہوتی ہے۔ اس نے اس دوران اناج، پھل، دودھ یا دیگر اشیائے خوردنی سے مکمل اجتناب کیا ہے۔

چائے میں نکوٹین (NICOTINE) کی موجودگی اسے ضرر رساں بناتی ہے۔ اسی مادے کی موجودگی سے چائے کی لت لگ جاتی ہے۔ لت لگنے سے وقت پر چائے نہ ملنے کے سبب چائے نوشوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

ادھر ہندوستان میں چائے کی قیمتیں گزشتہ کئی برسوں سے اتار، چڑھاؤ کا شکار نہیں ہوئیں۔ اس لیے خاتونِ خانہ کو چائے کی مد پر بڑھتے ہوئے خرچ کی شکایت بھی نہیں رہتی۔

چائے ہندوستان کی روایتی برآمد کی جانے والی شئے رہی ہے۔ ساتھ ہی یہ غیر ملکی زرِ مبادلہ کے حصول کا خاص وسیلہ بھی ہے۔ بلاشبہ ہندوستان دنیا میں چائے کا سب سے بڑا برآمد کرنے والا ملک ہے۔ ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ، کناڈا، روس، مصر، ایران، آئرلینڈ وغیرہ ممالک کو چائے برآمد کرتے ہیں۔ ۱۹۷۰-۷۱ء میں ۱۴۸ اکروڑ روپے کی چائے برآمد کی گئی۔ یہ رقم بڑھ کر ۱۹۸۰-۸۱ء میں ۴۲۶ کروڑ، ۱۹۹۰-۹۱ء میں ۷۰ اکروڑ روپے ہو گئی۔ ۱۹۹۲-۹۳ء میں اس میں کمی آئی اور یہ ۴ر۹۹۳ کروڑ روپے تک ہی رہی۔

ادھر ہندوستان میں چائے کی درآمد کے فیصلے سے چائے کی صنعت پر خطرہ منڈلانے

گنج نمبر ۱، بیتیا۔ ۸۴۵۴۳۸ (بہار)

لگا ہے۔ سب سے بڑا خطرہ چائے کی صنعت میں سرمایہ کاری کرنے والوں کے لیے ہے۔

گزشتہ کئی ماہ سے جس طرح ملک میں چائے کی درآمد کو لے کر رسّہ کشی جاری ہے۔ اس سے چائے کی صنعت میں سرمایہ کاری کے نئے مواقع کی تسخیر میں دقت پیش آئے گی۔ علاوہ ازیں چائے کی درآمد سے ہندوستانی چائے کی صنعت پر دور رس اثرات پڑیں گے۔ ایک مقامی چائے تیار کرنے والے ادارے کے بقول چائے کی درآمد سے نہ صرف اس صنعت کی وسعت محدود ہو جائے گی، بلکہ ہندوستانی چائے کی قیمتوں کو عالمی بازار کے طرز پر ہی پابہ زنجیر ہونا پڑے گا۔

نئی معاشی پالیسی کا سب سے خراب اثر چائے کی صنعت پر پڑا ہے۔ پانچ سال قبل تک دنیا کا سب سے بڑا چائے برآمد کرنے والا ملک آج چائے درآمد کرنے والا ملک بن گیا ہے۔

ہندوستان کی اس بدحالی کے سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔ یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ خود چائے کی صنعت میں چائے کی درآمد کے مسئلے پر تنازعہ ہے۔

چائے کی صنعت کو درپیش مسئلہ کچھ یوں ہے۔ چائے کی روبہ زوال پیداوار اور کم ہوتی برآمد کے پیش نظر ہندوستانی چائے کی صنعت کی انتظامیہ "ٹی بورڈ" (TEA - BOARD) نے ایک خاص کمیٹی بنائی۔ اس کے سامنے نشانہ رکھا گیا کہ ۲۰۰۰ء تک چائے کی پیداوار میں اضافہ کر کے ایک ارب کلوگرام کر دیا جائے۔ مزید اس کی موجودہ برآمد بڑھا کر دوگنی کر دی جائے۔ اس کمیٹی نے صلاح دی کہ برآمد میں اضافہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ بیرون ملک سے کچھ چائے درآمد ہو اور پھر درآمد شدہ چائے کو ملکی چائے کے ساتھ ملا کر ملی جلی چائے کو از سر نو برآمد کیا جائے۔ اس کمیٹی کے سربراہ تھے کثیر قومی کمپنی یونی لیور کی شاخ، بروک بونڈ۔ لپٹن انڈیا کے صدر نشین جناب الوپ گپتا۔

حیرت ناک طور پر کمیٹی کی سفارش باقی ماندہ صنعت نے قبول نہ کی۔ سبھی بڑی کمپنیوں نے جناب گپتا اور ان کی سفارشات کو ناقابل قبول بتایا۔ ٹاٹا ٹی، ولیمسن، وارین ٹی وغیرہ کمپنیاں احتجاج میں صف آرا ہو گئیں۔ ان کی منطق یہ تھی کہ چائے کی درآمدگی سے ہندوستانی چائے کی صنعت برباد ہو جائے گی۔

کنٹمپریری ٹارگٹ پرائیویٹ لمیٹڈ (COMTEMPORARY TARGFT Pvt I td.) کے سربراہ 'پرفل گوردیا' نے کہا کہ کینیا میں چائے کی قیمتیں ہندوستان کے مقابلے کافی کم ہیں۔ وہاں سے ہندوستان میں چائے کی درآمد سے ہندوستانی بازاروں میں اس کی کثرت ہو جائے گی۔ اس سے ارزاں ہونے کے سبب ملکی چائے کی فروخت پر مخالف اثر پڑے گا۔

دوسری جانب پلانٹیشن ایسوسی ایشن کی مشاورتی کمیٹی نے ۵ر دسمبر ۱۹۹۵ء کو 'ٹی بورڈ' کو ایک مراسلہ ارسال کر کے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ بورڈ چائے کی درآمد کی تجویز پر راضی ہو گیا ہے۔ مشاورتی کمیٹی نے یہ بھی کہا کہ اخبارات میں شائع شدہ درآمدگی کی خبر کمیٹی کے سربراہ جناب الوپ گپتا کے ذاتی اظہار پر قائم ہے۔

ہندوستانی چائے ایسوسی ایشن کے صدر ایس۔ کے۔ بھسین نے کہا کہ کمیٹی کی رپورٹ حقیقتاً فصل اور برآمد میں کمی کو چائے کی درآمد کا بہانہ بنا کر پیش کر رہی ہے۔ آئیے اس ضمن میں چائے کی برآمد کے اعداد و شمار پر ایک نگاہ ڈالتے چلیں۔

سال	برآمد (لاکھ کلوگرام)	برآمد چائے کی قیمت (کروڑ روپے میں)
۹۳-۱۹۹۲ء	۱۷۷۹	۹۹۳٫۴
۹۴-۱۹۹۳ء	۱۶۱۲	۱ ۸۰٫۱
۹۵-۱۹۹۴ء	۵۲۵	۳۳٫۵

(وسیلہ: معاشی جائزہ ۔ ۹۵-۱۹۹۴ء)

جناب بھسین کے بقول چائے کی برآمد میں کمی کا سبب سوویت روس کا زوال ہے۔ مزید گزشتہ کئی سالوں سے برآمدگی میں بہتری بھی نظر آتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستانی بلینڈڈ برانڈ (BI FNDFD BRAND) غیر ممالک میں ہر دلعزیز بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ ایسے میں اس موقع پر چائے کی درآمد سے ان کوششوں کو نقصان پہنچے گا۔

'ٹاٹا ٹی' کی انتظامیہ کے ناظم الامور آر۔ کے۔ کرشن کمار کا کہنا ہے کہ داخلی بازار میں چائے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ مزید صارفین کو زیادہ قیمت پر بھی چائے دستیاب ہونے کا اندیشہ غلط ہے۔ لہٰذا ہر حال میں چائے کی درآمد ہندوستانی معیشت کے لیے ضرر رساں ثابت ہوگی۔ ان کے بقول 'ذاتی مفاد کو دھیان میں رکھ کر ہی چند لوگ جلد بازی میں چائے کی درآمد کے حق میں آواز اٹھا رہے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ درآمد ملک کی طلب نہیں، یہ کچھ اداروں کی مفاد پرستی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ چائے کی درآمد کے ضمن میں وزارت زراعت کے افسران اعلا مہر بہ لب ہیں۔ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہتے۔ وزارت کے ذرائع کے بقول ابھی تک چائے کی درآمد کا جو فیصلہ ہوا ہے، وہ ملک کے لیے کسی طور سے بھی سودمند نہیں ہے، تاہم اس معاملے میں کسی بھی اقدام سے معذوری کو وہ اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہیں۔

بہرحال چائے کی درآمدگی کو لے کر رسّہ کشی جاری ہے۔ اگر چائے درآمد کی جاتی ہے تو چائے کی صنعت سے متعلق دیگر کمپنیاں اس کے خلاف صف آرا ہو سکتی ہیں۔ وہ اس کی تیاری کر چکی ہیں۔ وزارت زراعت بھی اس سمت میں کارگر اقدام کر سکتی ہے۔

اس رسّہ کشی کا نتیجہ خواہ کچھ بھی نکلے، چائے کے لیے ہماری طلب بدستور رہے گی۔ چائے اب محتاج تعارف نہیں رہی، پھر بھی چائے کی کمپنیاں مختلف طریقوں سے اپنی تیار کردہ چائے کی برتری جتانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں۔ وہ اس کے لیے نت نئے اشتہارات کا سہارا لیتی ہیں۔

اپنے بچپن کے دنوں کے اس اشتہار کو شاید آپ بھی نہ بھولے ہوں گے، جس میں اس بات کی تلقین کی گئی تھی کہ —

"گرم چائے پیو، بہت دن جیو!"

واقعتاً ذرائع ابلاغ میں چائے کے موجودہ اشتہارات میں شاید وہ کشش نہیں جو عہد رفتہ میں اس سادہ سے قول میں تھی۔ ●

ڈاکٹر عرفان علیمی

ٹیوبرکلوسس (ٹی بی)

ایک متعدی مرض

یہ ایک قدیم ترین متعدی مرض ہے جو انسانی وجود کے ساتھ عالم وجود میں آیا۔ ہزاروں سال قبل کی مصری ممیوں میں اس مرض کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ علاوہ ازیں چین کے مخطوطات میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ تاریخ طب گواہ ہے کہ ٹیکے کی ایجاد اور موثر ادویات کے استعمال سے اس مرض پر بہت حد تک قابو کر لیا گیا تھا لیکن غربت، قوت مدافعت کی کمی، مرض کے بارے میں عدم واقفیت، گھنی آبادی، مرض کی تشخیص میں تاخیر اور نامکمل علاج کے سبب اس مرض کی رفتار تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مرض کی بڑھتی ہوئی تیز رفتاری کے سبب آج پوری دنیا دہشت زدہ ہے اور دیگر ممالک کی طرح ہمارا ملک بھی بری طرح اس مرض کی گرفت میں ہے۔ مرض کے خاتمے کی ہر ممکن کوشش کے باوجود ہمارے ملک میں ۴۔ ۳ لاکھ افراد اس موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ اس مرض کے سب سے زیادہ مریض ہندوستان، چین، بنگلہ دیش، برازیل، پاکستان، انڈونیشیا، نائجیریا، فلپائن اور ویتنام میں ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس مرض کی رفتار رک گئی تھی لیکن اب اس میں پھر تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ امراض سینہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ ایڈز کے ذمے دار وائرس ایچ۔ آئی۔ وی کے سبب یہ مرض پھر سر ابھار رہا ہے۔ اس مرض کی شدت اور ہلاکت خیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دیگر امراض کے مقابلے سب سے زیادہ اموات اس مرض کی وجہ سے ہو رہی ہے اور دنیا میں ہر سال تقریباً ۳ لاکھ افراد اس مرض کے سبب ہلاک ہوتے ہیں۔ عالمی ادارہ صحت کے ماہرین کا خیال ہے کہ مناسب احتیاطی اور حفاظتی اقدامات نہ کرنے کی صورت میں اس شرح میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔

یوں تو عورت، مرد، بچے، جوان اور بوڑھے سبھی اس مرض کا شکار ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر اس مرض کا حملہ عالم شباب میں ہوتا ہے۔ اس مرض کے لاحق ہونے کے لیے جسم کے کسی خاص عضو کی تخصیص نہیں لیکن زیادہ تر نوجوانوں کو پھیپھڑے اور بچوں کی آنتوں پر اس مرض کا حملہ ہونے کا سبب گائے کا دودھ ہے کیوں کہ زیادہ تر بچوں کی غذا کا دار و مدار گائے کے دودھ پر ہوتا ہے اور گائے کے دودھ میں عموماً اس مرض کے جراثیم موجود ہوتے ہیں۔ ویسے جسم کا کوئی بھی عضو اس مرض کی گرفت میں آ سکتا ہے جن میں عام طور پر گردے کی ٹی۔ بی، پھیپھڑے کی ٹی بی، دماغ کی جھلی کی ٹی بی، جگر اور جلد کی ٹی بی، لمفاوی گانٹھوں کی ٹی بی اور جنسی اعضا کی ٹی بی قابل ذکر ہیں۔

اسباب

اس مرض کا سبب مائکرو بیکٹریم ٹیوبرکلوسس نامی جرثومہ ہے اسی لیے اس مرض کو ٹی بی یا ٹیوبرکلوسس کہتے ہیں۔ اس مرض کے جراثیم مریض کے سانس، کھانسی، چھینک، تھوک اور بلغم کے ذریعے ہوا میں پہنچ جاتے ہیں اور کئی ماہ تک زندہ رہتے ہیں۔ جب ایک صحت مند آدمی اس ہوا میں سانس لیتا ہے تو ہوا کے ساتھ ساتھ اس مرض کے جراثیم اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور اگر صحت مند آدمی کا جسم ان جراثیم سے لڑنے میں ناکام ہوتا ہے تو یہ مرض اسے بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ (ایسی صورت میں جب کہ مریض اپنا علاج نہ کر رہا ہو یا اس کو اپنا علاج شروع کیے ابھی صرف چند دن ہوئے ہوں) اس مرض کا گہرا تعلق غیر صحت مند عادات اور رہن سہن کے انداز سے ہے۔

اطبائے قدیم نے کچھ ایسی خصوصیات کے حامل لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں اس مرض کے ہونے کی استعداد زیادہ ہوتی ہے جیسے وہ لوگ جن کا سینہ تنگ، انگلیاں لمبی ہوتی ہیں۔ بیشتر سیاہ اقوام کے لوگ اس مرض کی گرفت میں آتے ہیں۔ علاوہ ازیں طویل عرصے تک ذیابیطس میں مبتلا رہنے والے، زیادہ دماغی محنت کرنے والے اور کثرت سے مباشرت کرنے والے لوگ اس مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ ان خواتین کو بھی یہ مرض اپنا شکار بناتا ہے جو بغیر طویل وقفے کے جلدی جلدی حاملہ ہوتی ہیں۔ سگریٹ نوشی، تنگ و تاریک کمروں میں رہائش، تازہ ہوا کی کمی اور قوت مدافعت کا فقدان بھی اس مرض کا سبب بنتا ہے۔

علامات

بغیر کسی سبب کے چار ہفتوں سے زائد عرصے سے کھانسی کا آنا اور ضد حیوی ادویات کے استعمال کے باوجود کھانسی کا نہ بند ہونا، حرارت بدنیہ کا شام کے وقت بڑھ جانا، گردن میں جلد کے نیچے گانٹھوں کا ہونا جو ضد حیوی ادویات کے استعمال کے باوجود ٹھیک نہ ہونا، ٹھنڈک کا احساس ہونا، اچانک رات کو پسینہ آنا، بغیر کسی سبب کے وزن کا بتدریج

باقی صفحہ ۵۹ پر

نادرت حسین

اولمپک کھیل ـ ایتھنز سے اٹلانٹا تک

۳۵ سالہ اسلام روگم، لوسیا کا واحد ایتھلیٹ ہے جو امریکہ کے جارجیا صوبہ کے راجدھانی "اٹلانٹا" شہر میں ۱۹ جولائی ۱۹۹۶ء سے شروع ہونے والے ۲۶ویں اولمپک کھیلوں میں اپنے ملک کی نمائندگی کرے گا۔ اکثر لوگ اسلام روگم کو پاگل قرار دیتے تھے کیوں کہ سراجیو کے سرب قبضہ والے علاقہ میں بمباری اور گولیوں کی بوچھار کی پروا کیے بغیر یہ کھلاڑی، تنہا ویران سڑکوں پر گھنٹوں دوڑ کر مشق کرتا رہا، یہ ایک مثال ہے اس جذبہ، لگن اور شوق کی، جس کے تحت ۱۹۰ ملکوں سے تعلق رکھنے والے تقریباً گیارہ ہزار کھلاڑی اس صدی کے آخری اولمپک مقابلوں میں حصہ لیں گے۔

ہر چوتھے سال منعقد ہونے والے ان اولمپک کھیلوں کی ابتدا ۷۷۶ سال قبل مسیح یعنی آج سے ۲۷۷۲ سال پہلے یونان کے شہر "اولمپیا" میں ہوئی تھی، اولمپیا کی نسبت سے ان مقابلوں کا نام "اولمپک" مشہور ہو گیا، شروع میں یہ مقابلے ۲۰۰ گز کی دوڑ تک محدود تھے اور صرف ایک دن میں مکمل ہو جاتے تھے، لیکن ۵۲ سال بعد ۱۴ویں اولمپک میں "پینٹاتھلن" نامی کھیل کا اضافہ کیا گیا، جس میں دوڑ، کود اور چکہ پھینکنا شامل تھا۔ ۶۹۲ ق، م، یعنی ۲۱ویں اولمپک سے ان کھیلوں کو ۵ دن کا کر دیا گیا۔ پہلا اور آخری دن ثقافتی تقاریب کے لیے تھے اور درمیانی تین دنوں میں کھیلوں کے مقابلے ہوتے، ۳۲ویں اولمپک ۶۴۸ ق، م، میں مکے بازی اور کشتی کا ملا جلا کھیل "پیکریشن" بھی مقابلوں میں شامل کیا گیا، اس کے بعد کئی صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن رفتہ رفتہ اس میں بدعنوانیاں رائج ہوتی گئیں، انعامی مقابلوں کے ججوں کو رشوتیں دی جانے لگیں اور پیار، محبت کے فروغ کے بجائے آپسی رنجشیں اور عداوتیں پیدا ہونے لگیں بالآخر ۳۹۳ء میں شاہ روم تھیوڈوسیس نے اولمپک کھیلوں پر پابندی لگا دی، بعد کی صدیوں میں زلزلوں، سیلابوں اور غیر ملکی حملہ آوروں کے ذریعہ اولمپیا شہر ہی نیست و نابود ہو گیا اور دنیا اولمپک کھیلوں کو تقریباً فراموش کر بیٹھی۔

انیسویں صدی کے آخر میں ایک فرانسیسی "بیرن پیرے ڈی کوبرٹن" کے دل میں یہ کھیل پھر شروع کرانے کا خیال آیا، انھوں نے ۱۸۹۴ء میں "بین اقوامی کھیل کانگریس" کی بنیاد ڈالی جو بعد میں بین اقوامی اولمپک کمیٹی (آئی۔او۔سی) کے قیام کا سبب بنی، اس جدوجہد میں ان کے دوست اور معروف تاجر "اوان گلیاس ریبے" نے بھرپور تعاون کیا اور ۶ اپریل ۱۸۹۶ء کو ایتھنز، یونان میں اولمپک مقابلے دوبارہ شروع ہوئے۔ جدید دور کے اس پہلے اولمپک میں ۱۳ ملکوں کے ۳۱۱ کھلاڑیوں نے حصہ لیا اور کل ۹ کھیلوں میں مقابلے ہوئے تھے اور اب جب کہ جدید اولمپک کھیلوں کے سو سال پورے ہو چکے ہیں تو اس سال کل ۲۱ کھیلوں (بیس بال، باسکٹ بال، والی بال، مکے بازی، تلوار بازی، نشانے بازی، گھوڑ سواری، تیراکی، کشتی، سائیکلنگ، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس، کینوئنگ، ویٹ لفٹنگ، یاچنگ، واٹر پولو، جوڈو، ہاکی، فٹبال، کشتی رانی اور ایتھلیٹکس) میں مقابلے ہوں گے۔

انعامات، میڈل

وقت گزرنے کے ساتھ انعامات کی نوعیت بھی بہت بدل گئی ہے، قدیم دور کے اولمپک میں کھیلوں کے ساتھ کچھ مذہبی رسومات ادا کی جاتی تھیں نیز جانوروں کی قربانی بھی کی جاتی تھی۔ چھٹے اولمپک تک جیتنے والوں کو گوشت کا ایک ٹکڑا تبرک کے طور پر دیا جاتا تھا، ساتویں اولمپک سے جیتنے والے کو ایک تاج پہنایا جانے لگا جو زیتون کی پتیوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ پیار محبت اور بھائی چارے کے فروغ کے لیے شروع ہونے والے کھیلوں کے لیے اس وقت یہی انعام کافی سمجھا جاتا تھا۔ جدید دور کے پہلے اولمپک میں اوّل آنے والے کو چاندی کا تمغہ اور زیتون کی ایک شاخ دی جاتی تھی، دوسرے مقام پر رہنے والے کو کانسہ کا تمغہ دیا جاتا تھا، جب کہ تیسرے مقام پر رہنے والے کو کچھ انعام نہیں ملتا تھا۔ دلچسپ بات یہ کہ سونے کا میڈل اس وقت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اب پہلا مقام حاصل کرنے والے کو گولڈ میڈل یا طلائی تمغہ ملتا ہے۔ (اسے آپ سنہرا تمغہ بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ چاندی کے تمغہ پر ۶ گرام سونے سے پالش کر کے طلائی تمغہ دیا جاتا ہے) دوسرے نمبر پر آنے والے کو نقرئی تمغہ یعنی چاندی کا میڈل اور تیسرے مقام پر رہنے والے کو کانسہ کا تمغہ دیا جاتا ہے، اس کے

محلہ قاضی۔ سرد مسجد۔ سنبھار پور، یوپی

علاوہ چھٹے مقام تک آنے والے ہر کھلاڑی کو ایک سرٹیفکیٹ بھی دیا جاتا ہے۔

اولمپک نشان اور جھنڈا

اولمپک نشان پانچ دائروں یا چھلّوں پر مشتمل ہوتا ہے، یہ دائرے بائیں سے دائیں ترتیب وار نیلے، پیلے، کالے، سبز اور سرخ رنگ کے ہوتے ہیں، ان دائروں سے پانچوں براعظموں یورپ، ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا اور امریکہ کی نمائندگی ہوتی ہے اور ان دائروں کے ایک دوسرے سے ملے ہونے سے باہمی بھائی چارہ، یک جہتی اور کھیل کے جذبہ کی عکاسی ہوتی ہے، جھنڈا سفید ریشمی کپڑے کا ہوتا ہے اور اس پر بھی یہی پانچوں دائرے بنے ہوتے ہیں۔

اٹلانٹا کی خصوصیات

اولمپک کھیل دنیا کے سیاسی حالات سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۱۶ء کے کھیل پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے اور ۱۹۴۰ء و ۱۹۴۴ء کے اولمپک دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے منعقد نہیں ہو سکے، ۱۹۸ ء کے ماسکو اولمپک کا امریکہ نے بائیکاٹ کیا اور ۱۹۸۴ء کے لاس انجلس اولمپک روسی بلاک کے ذریعہ بائیکاٹ کی وجہ سے پھیکے اور ادھورے سے رہے تھے، لیکن اس مرتبہ ایسا کوئی جھگڑا سامنے نہیں ہے اور ریکارڈ تعداد میں یعنی ۱۹۷ ملکوں کے اٹلانٹا اولمپک میں شریک ہونے کا امکان ہے۔

ساڑھے تین ارب روپے سے زائد خرچ کر کے حفاظت، ٹریفک، کھانے، پینے، ٹھہرنے اور کھیلوں کے کامیاب ترین انعقاد کے لیے جدید ترین سائنس اور تکنالوجی بھرپور استعمال کیا جائے گا، جہاں کھلاڑیوں کو نشیلی اور ممنوعہ ادویات سے باز رکھنے کے لیے انتہائی حساس مشینوں کا استعمال ہوگا وہیں کھلاڑیوں اور افسران کو لانے لے جانے کے لیے "بولتی بسیں" استعمال ہوں گی، ان بسوں میں اولمپک کے سبھی پروگرام کہاں جانا ہے، کہاں کھیلنا ہے، کہاں ٹھہرنا ہے وغیرہ کے بارے میں آٹومیٹک طریقہ سے اطلاعات ملتی رہیں گی، میزبانی کے لیے ڈیڑھ ہزار ملازمین، ڈائننگ ہال میں ہر قسم کی کھانے پینے کی چیزیں ۲۴ گھنٹے موجود رہیں گے، ٹیلی ویژن پر ان کھیلوں کو دکھانے کے حقوق، بین اقوامی اولمپک کمیٹی (آئی۔او۔سی) نے تقریباً ۲۲۔ارب روپیوں میں فروخت کیے ہیں، بس اب انتظار کیجیے ۱۹ ر جولائی کا جب سب سے پہلے یونان، پھر انگریزی حروف کی ترتیب سے تمام شریک ملکوں کی ٹیمیں اور سب سے آخر میں میزبان امریکہ کی ٹیم، روایتی افتتاحی تقریب میں شریک ہو کر ۱۷ دنوں تک دنیا کی توجہ کا مرکز بنی رہیں گی۔

اولمپک کھیل ــــ ایتھنز سے اٹلانٹا تک

نمبر شمار	شہر کا نام	ملک کا نام	سن	
۱۔	ایتھنز	یونان	۱۸۹۶ء	
۲۔	پیرس	فرانس	۱۹ ء	
۳۔	سینٹ لوئی	امریکہ	۱۹ ۴ء	
۴۔	لندن	انگلینڈ	۱۹۰۸ء	
۵۔	اسٹاک ہوم	سویڈن	۱۹۱۲ء	
۶۔	برلن	جرمنی	۱۹۱۶ء	پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے منسوخ
۷۔	اینٹ ورپ	بلجیم	۱۹۲ء	
۸۔	پیرس	فرانس	۱۹۲۴ء	
۹۔	امسٹرڈم	ہالینڈ	۱۹۲۸ء	
۱۔	لاس انجلس	امریکہ	۱۹۳۲ء	
۱۱۔	برلن	جرمنی	۱۹۳۶ء	
۱۲۔	ٹوکیو، ہیلسنکی	جاپان، فن لینڈ	۱۹۴۰ء	دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے منسوخ
۱۳۔	لندن	انگلینڈ	۱۹۴۴ء	
۱۴۔	لندن	انگلینڈ	۱۹۴۸ء	
۱۵۔	ہیلسنکی	فن لینڈ	۱۹۵۲ء	
۱۶۔	میل بورن	آسٹریلیا	۱۹۵۶ء	
۱۷۔	روم	اٹلی	۱۹۶ء	
۱۸۔	ٹوکیو	جاپان	۱۹۶۴ء	
۱۹۔	میکسیکو سٹی	میکسیکو	۱۹۶۸ء	
۲۔	میونخ	جرمنی	۱۹۷۲ء	
۲۱۔	مونٹریال	کناڈا	۱۹۷۶ء	
۲۲۔	ماسکو	سوویت روس	۱۹۸ء	
۲۳۔	لاس انجلس	امریکہ	۱۹۸۴ء	
۲۴۔	سیول	جنوبی کوریا	۱۹۸۸ء	
۲۵۔	بارسلونا	اسپین	۱۹۹۲ء	
۲۶۔	اٹلانٹا	امریکہ	۱۹۹۶ء	

رفعت سروش

حبُ الوطنی کا استعارہ: مولانا حالی

مولانا الطاف حسین حالی ایک ہمہ رنگ، اور ہمہ جہت تخلیق کار ہیں، اگر نثر میں ان کی معرکہ آرا تصنیفات "یادگار غالب"، "مقدمہ شعر و شاعری" اور "حیات جاوید" امتیازی حیثیت کی حامل ہیں تو نظم میں ان کی مسدس کو بڑا درجہ ملا۔ مگر وہ صرف مسدس ہی نہیں، مثنوی کے میدان میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں اور غزل اور رباعی بھی ان کی قلمرو میں امتیازی شان رکھتی ہیں۔ وہ یک فنے شاعر نہیں تھے کہ ان پر کوئی لیبل لگا دیا جائے اور نہ یہ مستحسن بات ہے، البتہ ان کے مطالعہ کے بعد یہ تاثر ضرور پیدا ہوتا ہے کہ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے یہاں ہندوستانی قومیت کا تصور بھرپور طور پر ابھرتا ہے اور یہ امتیاز انھیں مغربی ادب سے تقرب کے باعث نصیب ہوا۔ ۱۸۶۹ء میں شیفتہ کے انتقال کے بعد جب حالی کو فکر معاش دامن گیر ہوئی تو اتفاق سے پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو۔ لاہور میں ملازمت مل گئی اور ان کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کی زبان درست کرنے کی خدمت انجام دینی پڑی۔ یہ بہت مستحسن کام تھا اور اس طرح حالی جو عربی و فارسی کے عالم تھے، انگریزی ادب کے بھی قریب آئے اور نئے خیالات اور نئے رجحانات ادب سے انھیں واقفیت حاصل ہوئی۔ چوں کہ اس سلسلے میں اردو شاعری کا دامن خالی تھا اس لیے قدرتی طور پر وہ اس خلا کے پُر کرنے کی کوشش میں منہمک نظر آئے۔ سونے پر سہاگہ کہ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے غزل گوئی اور مشاعروں سے ہٹ کر نظم گوئی اور مناظموں کی طرح ڈالی۔ یہ ایک تاریخی موڑ ہے جو نہ صرف حالی کی زندگی میں، بلکہ اردو شاعری کے پرانے ڈھانچے میں رونما ہوا۔ حالی اصلاحی مزاج کے آدمی تھے۔ انھوں نے جب موضوعاتی شاعری کی تو ان کے اندر سویا ہوا اصلاح پسند اور وطن پرست بیدار ہوا اور اس شدت سے بیدار ہوا کہ انھوں نے نظموں کے انبار لگا دیے۔ آج حالی کی وہی نظمیں جدید اردو نظم کے بنیادی حدود حال پہنچے اور ہمارا ایک سو سال سے زیادہ کا ایوانِ نظم انھیں بنیادوں پر کھڑا ہے۔

حالی کا حساس ذہن اگر نظم گوئی کی طرف مائل نہ ہوتا تو شاید محض لکیر کے فقیر بن کر وہ غالب کی روش پر چلتے رہتے۔ غالب غالب رہتے اور حالی محض ان کے ایک شاگرد۔ اگرچہ غالب نے تو قصیدے میں گریز کے طور پر یہ شعر کہا تھا۔ ؎

بہ قدرِ ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

لیکن ان کے شاگرد حالی نے اس شعر کو برتا، اسے صحیح معنوں سے ہم کنار کیا اور وسعتِ بیاں کے لیے جدید نظم کا اسلوب اپنایا — یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی کو ایک ایسا دور ملا جس میں انتشار ہی انتشار تھا۔ وہ پانی پت میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہ دور غالب و ذوق و مومن اور بہادر شاہ ظفر کا دور تھا۔ لال قلعہ کی بہار کے آخری دن تھے۔ مگر شہنشاہ ابن شہنشاہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی خلعتیں تو بانٹتے ہی تھے۔ غالب ان کے دسترخوان کے خوشہ چینوں میں تھے۔ مگر حالی کا بچپن جس پانی پت میں گزرا وہ صوفیائے کرام کی بستی تھی۔ خود حالی کے اجداد کو کسی راج دربار سے نسبت نہ تھی۔ نام نہاد "غدر" کے دو ایک سال قبل وہ پانی پت سے تحصیل علم کے لیے دہلی پہنچے اور وہاں غالب سے قربت نصیب ہوئی مگر ان کی زندگی غالب سے بالکل جداگانہ تھی۔ ظاہر ہے اس قیامت خیز دور کشاکش سے حالی کا ذہن بھی متاثر ہوا ہوگا۔ انگریزوں کا بڑھتا ہوا تسلط ان کے حواس پر طاری رہا ہوگا اور تاریخ شاہد ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت کسی نہ کسی طرح سے دہلی سے بھاگ کر لٹتے لٹاتے پانی پت پہنچے۔ کیسی کیسی ذہنی اذیتوں سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد انھیں پھر دہلی جانا پڑا۔ کیا کچھ نہ دیکھا ہوگا وہاں — وہ تاثرات ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ ؎

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دہلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

اے ۸۰۔ سیکٹر ۲۷ نوئیڈا۔ ۲۰۱۳۰۱

غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھوگے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

یہ غزل مسلسل ہے، مرثیہ ہے، حالیؔ کے دل کا درد ہے، ان کی چشمِ خوں بار کے آنسو ہیں، دہلی کی عظمت کا بیان ہے اور اس میں زیریں لہر ہے دہلی سے محبت کی، ان ثقافتی، ادبی اور تہذیبی قدروں سے حالیؔ کے قلبی لگاؤ کی ــــ اور یہی محبت اور لگاؤ دراصل حب الوطنی ہے۔ قوم و وطن کی محبت حالیؔ کے دل میں اس طرح بسی ہوئی ہے جیسے فولاد میں جوہر۔ وہ اس محبت کے اظہار کے لیے کسی عنوان زدہ شاعری کے محتاج نہیں۔ ہندوستان کے موسم، یہاں کے رسوم و رواج اور سب سے زیادہ لوگوں کا رہن سہن اور اخلاقی قدریں ان کی شاعری کا حصہ ہیں یہ ان کی حب الوطنی اوپر سے اوڑھا ہوا لبادہ نہیں، بلکہ ان کی فکر کا جزوِ لاینفک ہے۔ حالیؔ اس منظر نامے کے گواہ ہیں جب چمنِ ہند سے آزادی کی بہار کا شائبہ بھی چلا گیا۔ غزل کی زبان میں ؂

اب محو بوئے گل پہ ہوا اک دلِ حزیں
ہم کو چمن سے پاس ہے جانا بہار کا
بلبل کے آگ سی کچھ تن میں لگ رہی ہے
بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں

ماضی کی عظمتوں کی مرثیہ خوانی کا یہ انداز بھی ملاحظہ ہو ؂

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

حالیؔ صرف ماضی کی عظمتوں کا ماتم نہیں کرتے بلکہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ اس خلا کو کیسے پُر کیا جائے۔ انسانی تہذیب کے اس نقصان کی تلافی بھی ممکن ہے جب حال اپنی ذمہ داری کو سمجھے۔ نوجوان نسل سرگرمِ عمل ہو ؂

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

یہ چند اشعار حالیؔ کی غزلوں سے چنے ہیں ــــ غزل میں جو ایمائیت اور رمزیت ہوتی ہے اس کے اہتمام کے باوجود حالیؔ کا نفسِ مضمون ان اشعار کے لفظ لفظ سے چھلکا پڑتا ہے۔ دہلی ان کے لیے ایک دنیا تھی اور دہلی کا نام جہاں آباد یوں ہی تو نہیں رکھا گیا تھا۔ دہلی ہمیشہ سے ہندوستان کی تہذیب کا استعارہ رہی ہے۔ چاہے عروج کی بات ہو یا زوال کی ــــ حالیؔ نے عروج کی جھلک دیکھی اور زوال کے ماحول میں ایک مدت جیے۔ یہ کرب ان کی شاعری میں دہلی کی ثقافت اور تہذیب کی یاد کے ساتھ جگہ جگہ جھلکتا ہے ــــ لکھ رہے ہیں حکیم محمود کا مرثیہ اور محبت چھلکی پڑتی ہے دہلی اور اس کی مٹتی ہوئی تہذیب کی۔ ؂

اے جہاں آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیری اک عالم میں دھوم
تھے ہر در تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا افادہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہان آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا
تجھ پہ اے دارالخلافہ انقلاب آنے لگے
غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے
طالعِ مشفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے
تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے
دولت و اقبال کا بندھنے لگا رختِ سفر
تجھ سے اے دارالعلوم اٹھنے لگے علم و ہنر
علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیے
کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جِلا کر چل دیے
ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گئی سیلِ فنا اس کو بھی اے دلی بہا

اسی طرح غالبؔ کا مرثیہ لکھا تو اس میں شخص کی بجائے تہذیب اور اقدار کا ماتم کیا۔ ان عظمتوں پر آنسو بہائے جو غالبؔ کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات
اس کے مرنے سے مر گئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

- - - - - - - - - -

لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھوگے
غالبِ بے مثال کی صورت

- - - - - - - - - -

خاکساروں سے خاکساری تھی
سربلندوں سے انکسار نہ تھا
بے ریائی تھا زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
مظہرستان حسن فطرت تھا
معنیٔ لفظ آدمیت تھا

حالیؔ کی ان غزلوں اور نظموں کے اشعار میں ان کے دل کی کراہیں ہیں انسانی قدروں کے مٹنے کا غم ہے اور یہ غم اس لیے ہے کہ انھیں ان افراد سے محبت ہے جو ملک و قوم کی عظمتوں کے امیں ہیں۔ اس شہر یکتائے روزگار سے عشق ہے جسے جہان آباد یا دہلی کہا گیا ہے ــــ حالیؔ کا کمال یہ ہے کہ ان کی فغاں محض اشک افشانی کے لیے آمادہ نہیں کرتی۔ بلکہ ترغیبِ عمل بھی دیتی ہے، لیکن اگر حالیؔ کی شاعری اسی غم اور ماتم کے بھنور میں چکراتی رہتی تو شاید امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان کا نام بحیثیت شاعر ذہنوں سے محو ہو چکا تھا ــــ مگر حالیؔ اس مقام سے بہت آگے گئے ہیں۔ انھوں نے ان روایتی غزلوں اور مرثیوں میں جو کچھ کہا ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ ــــ مگر انھوں نے اپنی شاعری کے لیے ایک اور میدان بھی چنا جو خالص ان کا اپنا ہے اور جس کے وہ بلاشرکتِ غیرے شہنشاہ ہیں۔ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اور منصوبہ بند طریقے سے طرزِ جدید اختیار کر کے مثنوی جیسی قدیم اور پامال صنف میں فکر و فن کے نئے پھول کھلائے اور مسدس جیسی صنف کو جو اب تک انیسؔ و دبیرؔ کی میراث تھی مدوجزرِ اسلام کے پرشکوہ بیان کے لیے نئی طرز سے استعمال کیا اور ان لفظیات سے گریز کر کے جن پر انیسؔ و دبیرؔ کی چھاپ تھی، سادہ اور سلیس انداز بھی اختیار کیا اور اسی مناسبت سے بحر بھی وہ استعمال کی جس میں اب تک کوئی قابلِ ذکر مسدس نہیں لکھی گئی تھی۔

حالیؔ کی مثنویوں میں سراسر ہندوستانی فضا ہے۔ مثنوی "برکھارت" کی قرأت کیجیے

تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پروائی چل رہی ہے — دھیرے دھیرے، اور ہم کھڑے ہیں اپنے ملک کے کسی سرسبز گاؤں کے باہر۔ ہرے بھرے کھیتوں کے آس پاس۔ قریب ہی کوئی ندی لہریں لے رہی ہے۔ نظم کے لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ وطن کی ایک تصویر ہے۔ نظم خود بولتی ہے ؎

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے ہیں دل چلے ہوا کے
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں

— — — — — —

ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں
پیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
لگلوں کی ہیں ڈاریں آ کے گرتی
مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
ہیں شکر گزار تیرے برسات
انساں سے لے کے تا جمادات
گلشن کو دیا جمال تو نے
کھیتی کو کیا نہال تو نے
سوتے تو اساڑھ کا عمل تھا
اٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا
لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن
کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن

اس قدر آسان زبان میں خوب صورت نظم اب سے سوا سو سال پہلے — اور اردو میں پہلے پہل جب کہی گئی ہوگی تو ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ نئے قلم کاروں کے ذہنوں میں خیالوں کی کیسی پروائیاں چلی ہوں گی ——— جہاں تک زبان کا سوال ہے، نظیر اکبر آبادی کے یہاں عوامی زبان ملتی ہے مگر ان کی شاعری میں کوئی ایک رخ یا تخلیقی منصوبہ بندی نہیں ہے۔ ایک فقیر ہے اپنی دھن میں گاتا ہے — ہر اس چیز کو لفظوں میں پرو لیتا ہے جو سامنے آ جائے۔ نظیر کی عظمت مسلم ہے، مگر حالی کی جہات اور ہیں، دونوں کی زمینیں الگ الگ ہے۔

حالی نے کئی مثنویاں لکھیں، مگر ان کی معرکہ آرا مثنوی "حب وطن" اردو شاعری میں نئے امکانات لے کر آئی۔ انھوں نے نہایت سادہ اور عام فہم انداز میں وہ سب کچھ کہہ دیا جس پر آج قومی یک جہتی کی عمارت کھڑی ہے۔ فضا آفرینی کے لیے حالی نے جذباتی فسوں کاری سے کام لیا ہے۔ اگر یوں ہی ملک کے ہوش ربا نظاروں کی تعریف کرتے تو شاید ہوائی بات ہوتی۔ مگر حالی نے ایک ایسے پردیسی کی نظر سے دیکھا جس کے دل میں حسین مناظر کو دیکھ کر ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔ اس طرح تاثر شدید تر ہو گیا ہے ؎

اے سپہر بریں کے سیارو!
اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا
اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے نسیم بہار کے جھونکو
دہر ناپائیدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

اس مثنوی کا وہ حصہ جس میں حالی نے حب وطن کی جامع تعریف کی ہے اور اسے نئی معنویت سے آشنا کیا ہے — اس قابل ہے کہ آج کا انسان اس کا ورد کرے اور اسے تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لے تاکہ ہر لمحے اس جذبہ کو تازہ رکھ سکے، نظم کا یہ اقتباس اسم اعظم ہے جدید ہندوستان میں یک جہتی کی فضا پیدا کرنے کے لیے۔ بات دل سے نکلی ہے اس لیے پُر اثر ہے۔ جو کچھ حالی نے آج سے سوا سو سال پہلے کہا تھا وہ آج بھی وقت کی آواز ہے بلکہ کل سے زیادہ آج اس کی معنویت ہے ؎

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر
ہے کوئی ان میں خشک کوئی تر
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ
تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

اہل دولت کو ہے یہ استغنا
کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا
فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد
پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار
خوش نویسوں کو ہے یہی آزار
گر رہا چاہتے ہو عزت سے
بھائیوں کو نکالو ذلت سے
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے
علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں یہ دور آئے گا
بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا —

حالی نے "حب وطن" جیسی نظم کہہ کر اردو شاعری کو ایک نیا افق عطا کیا تھا۔ حالی کے بعد اس افق پر اقبال، جوش اور کئی اور ستارے جگمگائے لیکن مثنوی حب وطن کی تاثیر آج تک ماند نہیں پڑی ہے۔

مسدس حالی کا موضوع مدوجزر اسلام ہے، مگر اس کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ یہ نظم محض ملت اسلامیہ کے لیے ہی نہیں، محض کسی ایک قوم یا کسی ایک ملک کے لیے نہیں، بلکہ عالم انسانیت کے لیے ہے۔ حالی نے ظاہر ہے عالمی جنگوں کو نہیں دیکھا، لیکن آج دو ہولناک جنگوں کے دوزخوں سے گزرنے کے بعد عالم انسانیت نے یونائیٹڈ نیشنز کی شکل میں جو ادارہ قائم کیا ہے اس کا منشور کسی ایک قوم، رنگ، مذہب یا نسل کے لیے نہیں، پوری دنیا کے لیے ہے۔ آج دوریاں سمٹ گئی ہیں۔ جدید سائنسی ایجادات نے زندگی کو ناقابل فہم آسانیاں فراہم کی ہیں مگر اس کے باوجود آج اس روئے زمین پر انسانیت کا جو عالم ہے اس کی تصویر حالی کے اشعار سے بہتر کیا کھینچی جا سکتی ہے۔ یہ سد۔ مدوجزر اسلام کا ہے۔ مگر "مدوجزر بنی نوع انسان" کا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ حالی کی وسیع النظری کی دلیل ہے ؎

جہاز اک گرداب میں پھنس رہا ہے
پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے
کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں، ان پر خندہ زناں ہیں
کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو
کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو
نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو
بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

آج دنیا ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے۔ زندگی کے بیڑے پر کسی لمحہ بھی برا وقت آسکتا ہے اور پھر انجام وہی ہوگا جس کی جھلک حالی کی اس الہامی نظم میں ہے۔

حالی کی نظموں میں اخلاقی پہلو جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو مختلف زاویوں سے پیغام عمل دیتے ہیں۔ کسی پیشہ ور مصلح قوم یا نام نہاد رہبر کے طور پر نہیں، بلکہ ایک انسان دوست شاعر اور دلِ درد مند رکھنے والے مفکر کی حیثیت سے۔ قومی زندگی اور معاشرے کی حالت اس وقت تک نہیں سدھر سکتی جب تک عورتیں پسماندگی، ناخواندگی اور توہمات کی شکار ہیں۔ عورت اردو شاعری کا محبوب موضوع رہی ہے۔ مگر بس محبوب کی حیثیت سے۔ عورت کے سماجی درجے اور اس کی زبوں حالی پر ہمارے شعراء نے شاید حالی سے پہلے قلم اٹھایا ہی نہیں۔ حالی نے اس حقیقت کو سمجھا کہ اگر ہندوستان میں ذہنی بیداری لانی ہے تو عورت کو اس کی عظمت کا احساس دلانا ہوگا اور اسے اس حقیقت سے واقف کرانا ہوگا کہ تیری آغوش قوم کا گہوارہ ہے۔ مناجات بیوہ اور "چپ کی داد" حالی کے اصلاحی خیالات کا مرقع ہیں۔ "چپ کی داد" نظم کیا ہے۔ ایک عام ہندوستانی عورت کی زندگی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ بہ حیثیت بیٹی کے وہ باپ کے گھر میں کس طرح رہتی ہے۔ کس طرح خدمت کو اپنا شعار بناتی ہے۔ پھر سسرال میں جاکر نئے گھر اور نئے ماحول میں کیسے اپنے وجود کو اس گھر کا ایک لازمی حصّہ بناتی ہے اور جب وہ ماں بن جاتی ہے تو اس کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ یہ نظم عورت کی زندگی کا خوبصورت مطالعہ ہے۔ نہایت پاکیزہ عورت کی تصویر پیش کی ہے حالی نے، اور دراصل یہی عورت ہندوستان کی مثالی عورت ہے۔ حالی عورت سے کس محبت اور عقیدت کے جذبات سے بھرپور لہجے میں ہم کلام ہوتے ہیں ؎

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں، قوموں کی عزت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی، ڈھارس ہو تم نادار کی
دولت ہو تم نادار کی، عسرت میں عشرت تم سے ہے

"مناجات بیوہ" کے ذکر کے بغیر عورت کے بارے میں حالی کے بلند خیالات کا تذکرہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ یہ نظم ایک کمسن بیوہ کی زندگی اور اس کے درد و غم کی ایسی تصویر ہے جسے دیکھ کر سماج کے انسانیت سوز رسوم و رواج کا گھناؤنا پن بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں حالی کی قوتِ متخیلہ اپنے شباب پر ہے۔ انھوں نے کمسن بیوہ کے سینے میں اپنا دل رکھ دیا ہے اور اس کی دھڑکنوں کو نظم کیا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے پیشہ ور سماج سدھار کرنے والوں کی دھواں دھار تقریریں اور تحریریں ایک طرف اور چھوٹی بحر اور بول چال کی اردو میں یہ نظم ایک طرف۔ ؎

اے مرے زور اور قدرت والے
حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری، دکھیاری
دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن
جان پہ اپنی آپ اجیرن
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں
دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے
منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
کوئی نہیں دل کا بہلاوا
آ نہیں سکتا میرا بلاوا
آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا
کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا

- - - - - - - - -

ساون جب باغ میں آئے
پھول نہ تھے کھلنے ابھی پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں
جا سوئے ساون بن میں
پیت نہ تھی جب پایا پیتم
پیت ہوئی تو گنوایا پیتم

- - - - - - -

رہی اکیلی بھری سبھا میں
پیاسی رہی بھری گنگا میں

- - - - - - -

ریت کی سی دیوار ہے دنیا
اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یاں کا
ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
بار کبھی اور جیت کبھی ہے
اس نگری کی ریت یہی ہے

حالی کا کمال یہ ہے کہ اس نظم میں کہیں ناصحانہ انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے، نہ سماج کے ٹھیکیداروں کو برا بھلا کہا ہے —— بس ایک مجبور، بے بس اور سماج کی رسموں اور رواجوں کی ماری کمسن بیوہ عورت کے جذبات کی تصویر اس کے دل کی زبان میں کھینچ دی ہے جس کا ہر زاویہ سینے میں اترتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہے سچی شاعری کی پہچان۔ کیا یہ کم عظمت کی بات ہے کہ حالی کی شاعری میں قوم کی خستہ حالی، معاشرے کی پامالی، اخلاقی قدروں کا زوال، گوناگوں مسائل سے دوچار انسانیت کی کراہیں اور اس کے ساتھ حالات سے نبرد آزما ہونے کی قوت، مسائل سے جوجھنے کی جرأت اور انسان کے لیے ایک بہتر مستقبل کی بشارت ہے۔ فنّی طور پر وہ پامال راستوں سے ہٹ کر نئی پگڈنڈیوں پر چلے ہیں۔ انھوں نے اپنے بیان و اظہار کے پیمانے خود وضع کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے فکر کی رَو کو قومی زندگی کے دھارے سے ہم آہنگ کیا ہے۔ ایسے شاعر پر کسی بھی زبان اور کسی بھی قوم کو فخر ہو سکتا ہے —— اور ہمارا سر فخر سے اونچا ہے کہ حالی اردو کا شاعر ہے اور ہندوستانی قوم کا نورِ نظر ہے۔

ڈاکٹر زین رامش

قصّہ گوئی کی روایت: کچھ نئے فکری پہلو

قصّہ گوئی کی روایت بہت قدیم ہے۔ قصّہ گوئی کے فن پر گفتگو کرنے والوں نے اس کے سرے ماقبل تاریخ میں بھی تلاش کیے ہیں۔ ناقدین نے اندازہ کیا ہے کہ قصّہ کہنا انسان کی ابتدائی عادتوں میں سے ایک عادت ہے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب انسان نے اس دنیا میں اپنا پہلا قدم رکھا ہوگا اور بھوک نے اس کو پریشان کیا ہوگا اور قدرت کی طرف سے اس کے اندر موجود شعور نے اسے غذا کی تلاش میں ادھر ادھر کچھ تلاش پر مجبور کیا ہوگا اور اس نے جب کھانے کے لیے کچھ نہ پایا ہوگا تو جانوروں کا شکار کیا ہوگا۔ جانوروں کے شکار کی بات انسانی تاریخ کا تذکرہ کرنے والوں نے اس لیے کی ہے کہ ابتدائی زمانے کے حالات کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ گوشت خوری انسان کی بہت ابتدائی عادتوں میں سے ایک عادت ہے۔ لہٰذا اس عادت کی تکمیل اور تسکین کے لیے وہ جب شکار کی طرف مائل ہوا ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کو خطرات بھی درپیش ہوئے ہوں گے۔ کبھی بعض جانوروں کو اس نے مار لیا ہوگا تو کبھی بعض جانوروں نے اس کو مار لیا ہوگا۔

بہر حال جو بھی ہوا ہو لیکن جب جانوروں کی تلاش میں نکلے ہوئے ایک قبیلے کے لوگ جمع ہوتے ہوں گے تو اپنا اپنا حال بیان کرنے کی خواہش بھی آج ہی کی طرح ایک طاقتور خواہش رہی ہوگی اور بیان کرنے والوں نے یہ دیکھا ہوگا کہ کئی بیان کرنے والوں کے درمیان کسی کے بیان پر سننے والوں کی زیادہ توجہ ہوتی ہے اور کسی کے بیان پر کم۔ اس سے بیان کرنے والوں نے خود بہ خود یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ بیان کا کون سا انداز کامیاب ہونے والا ہے اور کون سا ناکام اور یہیں سے گویا قصّہ گوئی کے بالکل ابتدائی طریقے اور فن کی شروعات ہوتی ہے

پھر بیان کرنے والوں کا یہ دلچسپ انداز آہستہ آہستہ انھیں بیان کے ایک ایسے طرز کی طرف مائل کرتا گیا جو آگے چل کر خود بہ خود قصّے کی صورت میں ڈھل گیا۔

دلچسپ قصّہ کے بنیادی اوصاف

صرف بیان کیے جانے والے اس قصّہ کی کچھ روداد آج بھی ہمیں قصہ کی بہت طاقتور صنف داستان کے تعارف میں اور صنف داستان گوئی کے بیان میں یقیناً دستیاب ہو سکتی ہے جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کامیاب قصّہ اور کامیاب قصّہ گوئی کے لیے حسب ذیل اوصاف کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔

۱۔ دلچسپی

دلچسپی ایک ایسی بنیادی شرط اور خصوصیت ہے جس کے بغیر کوئی قصّہ کیا، آج کی بھی کوئی داستان، کوئی افسانہ، کوئی ناول کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کل کا سننے والا اور آج کا پڑھنے والا کوئی بھی سامع اور قاری کسی بھی بیان کیے جانے والے قصّے یا لکھے جانے والے افسانے کو اس وقت تک برداشت ہی نہیں کر سکتا جب تک کہ اس میں اسے خود کوئی دلچسپی نہ ہو۔

اس دلچسپی کے پیدا ہونے کے اسباب ہمارے خیال میں حسب ذیل ہیں۔

(الف) فاصلہ: قصّے میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ماضی میں خاص طور پر اور آج بھی زیادہ تر بیان کسی ایسی جگہ کا ہوتا تھا اور ہوتا ہے جو ہم سے بہت دور یا کم از کم کچھ دور ضرور ہو۔ ماضی کی داستانوں میں بالعموم بات یوں شروع کی جاتی تھی کہ "سوتا سنسار، جاگتا پاک پروردگار، یہاں سے بہت دور، بہت دور ایک ملک جس میں ایک بادشاہ رہتا تھا" یہ ایک لفظ "دور بہت دور" سننے والے کو اچانک ایک ایسی دنیا میں لے جاتا تھا جو اس کی دیکھی بھالی نہیں ہوتی تھی اور اس طرح نہ دیکھی بھالی دنیا کو دیکھنے کی خواہش سننے والے کو سنانے والے کی طرف متوجہ کر دیتی تھی اور یہ گویا قصّہ گو یا داستان گو کی کامیابی کی پہلی منزل ہوا کرتی تھی۔

(ب) تحیّر: دور پر بسے ہوئے شہر یا ملک کے تذکرے سے سننے والوں میں جو دلچسپی پیدا ہوتی تھی اس دلچسپی کو قصّہ گو حیرت انگیز واقعات کے ذکر سے دوبالا کر دیتا تھا۔ مثلاً "شہزادہ عالم کو اس کے دوست وزیر زادے نے بتایا کہ ملک نگارستان میں ایک ایسا پرندہ ہے جو انسانوں کی طرح بات کرتا ہے"

اب پرندہ کے انسان کی طرح بات کرنے کا طریقہ حیرت انگیز تو ہے ہی لہٰذا سننے والا خود بہ خود سنانے والے کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے کہ دیکھیں شہزادہ جان عالم نگارستان میں جا کر اس پرندے کو کس طرح باتیں کرتا ہوا پاتا ہے۔

---

* ارم کدہ، فخر الدین ہاؤس، سنگر لولی، پٹنہ ۴

(ج) فضا آفرینی: جب سننے والا فاصلے اور تحیّر کے ذریعہ پوری طرح سنانے والے کی گرفت میں آجاتا ہے تو اب قصّہ گو کچھ مناظر دکھاتا ہے۔ کبھی بادشاہ کا محل دکھاتا ہے، کبھی وزیر کا دسترخوان دکھاتا ہے، کبھی رانی کی خواب گاہ دکھاتا ہے قصّہ مختصر یہ کر وہ اپنے قصّے کی ایک ایسی فضا تیار کرتا ہے جو فضا سننے والے کی یا تو دیکھی بھالی نہیں ہوتی یا پھر ایک ایسی فضا تیار ہوتی ہے جس فضا میں داخل ہونے کی سننے والا ہمت نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ عام سامع یا قاری جو زیادہ تر اوسط درجے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے لیے بادشاہ کا محل وزیر کا دسترخوان اور شہزادی کی خواب گاہ ممنوعہ علاقہ ہے اور اسی لیے ان سب کے بیان میں جو فضا بنتی ہے وہ فضا قصّہ سننے والے کی اکثریت کے لیے دلچسپی کا سبب بنتی ہے۔

۲۔ مطالعہ نفسیات

قصّے کی کامیابی کے لیے دلچسپی کے ساتھ ساتھ دوسرا اہم عنصر آدمی کی نفسیات کا مطالعہ ہے چوں کہ آدمی اپنی کہنے اور دوسرے کی سننے کا عادی ہے۔ اس لیے وہ دوسرے کو سننے کے ساتھ ساتھ جاننے کا بھی خواہش مند رہتا ہے۔ یہ جاننا دراصل مطالعہ نفس کی بنیاد ہے اور انسانی نفسیات کا یہی مطالعہ قصّہ گو کو کردار کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس طرح قصّہ گوئی میں کردار نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔

۳۔ مکالمہ نگاری

جب کرداروں کا بیان ہوتا ہے تو قصّے میں آدمیوں یعنی کرداروں کی نفسیات دکھانے کا کامیاب طریقہ یہ ہے کہ ان کرداروں کو عمل کرتے ہوئے دکھایا جائے۔ اس زندگی جیسے میں کردار کا عمل جتنا ضروری ہے ہے اتنا ہی ضروری اس کا بولنا بھی ہے کیوں کہ وہ کردار اپنی گفتگو اور اپنے عمل انھیں دو ذرائع کے توسط سے گویا اپنے آپ کو پوری طرح دیکھنے اور سننے والے کے سامنے واضح کر پاتا ہے۔ کرداروں کے بولنے کا یہ سلسلہ مکالمہ نگاری کو جنم دیتا ہے۔

۴۔ مقصد

قصّہ گوئی جب تک سنانے کی منزل میں رہی اس وقت تک عام طور پر ان پڑھے لکھے والوں کے ہاتھوں میں رہی جو یا تو عالم تھے یا صوفی اور اس لیے ان دونوں حضرات نے کسی نہ کسی طور پر قصّہ گوئی کے ذریعہ اپنا کوئی نہ کوئی بنیادی مقصد، پیغام رسانی کا کام پورا کیا ہے اور اسی لیے ایک کامیاب قصّہ کی تمام شرائط کے مطابق قصہ بیان کرتے کرتے آخر میں قصّہ گو اخلاقی یا اصلاحی مقصد واضح کر دیتا ہے۔ یا پیغام دے دیتا ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ جب لکھنا پڑھنا عالموں اور صوفیوں کے طبقے سے نکل کر عام ہوا تو دنیا میں ترقی پسند تحریک نے زور پکڑا اور اس تحریک کے تحت بھی جو لکھنے والے سامنے آئے انھوں نے بھی بیان قصہ کا کوئی نہ کوئی مقصد اپنے پیش نظر ضرور رکھا، لہٰذا مقصدیت یا پیغام رسانی کا یہ سلسلہ ماضی قریب تک جاری رہا۔

یہ پہلو قصّہ گوئی کی بنیادی شرط ہو یا نہ ہو لیکن تمام قصوں میں کسی نہ کسی طور پر پایا ضرور جاتا ہے۔ قصّہ گوئی کی روایت کے تعلق سے اس مختصر گفتگو کے بعد جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا سے آج تک نثری اقسام و اصناف قصہ کے طور پر چھوٹی بڑی حسب ذیل اصناف و اقسام کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ اساطیری ڈرامہ ۲۔ بہادروں کی کہانیاں ۳۔ حکایتیں ۴۔ اولیاء کی کرامتیں ۵۔ رمزیہ قصّے (تمثیلی قصّے) ۶۔ داستان ۷۔ ناول ۸۔ افسانہ ۹۔ ڈرامہ ۱۰۔ سنائے جانے والے قصوں کا عہد جدید۔

۱۔ اساطیری ڈرامہ

اساطیری ڈراموں کا بنیادی تعلق یونان، ایران اور ہندوستان سے ہے۔ ان جگہوں میں چونکہ دیومالا یعنی اساطیر کا گہرا اثر تھا اس لیے عہد قدیم میں ان دیومالائی کرداروں کے سہارے ڈرامہ اسٹیج کیا جاتا رہا تھا اور ڈرامائی انداز میں قصّہ بیان کیا جاتا تھا۔

۲۔ بہادروں کی کہانیاں

ہمارے ہندوستان میں بہادروں کی کہانیاں بھی قصّہ گوئی کا ایک طریقہ بنی رہی ہیں، جس کے لیے "ویرگاتھا" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ جیسے قصّہ "آلہا اور دل" یا "راجا سالدھا"، اردو میں انھیں قصوں کے مماثل کچھ قصّے ایسے لکھے گئے جس میں بہادر بزرگوں کے بعض کارناموں کو نثر اور شعر میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً نثر میں قصّہ "حاتم طائی" اور شعر میں "جنگ نامہ حضرت علیؓ"

۳۔ حکایتیں

حکایتوں کا چلن بنیادی طور پر فارسی کے اثرات کے تحت شروع ہوا۔ سعدی نے اپنی مشہور کتابوں "بوستاں" اور "گلستاں" میں چھوٹی چھوٹی حکایتیں بیان کیں اور "گلستاں"، "بوستاں" کے اثرات کے تحت اردو میں بھی چھوٹے چھوٹے قصّے بیان کیے گئے۔ یہ قصّے تحریری طور پر تو کم دستیاب ہیں مگر ایک زمانے میں زبانی طور پر ان کا چلن زیادہ رہا ہے۔

۵۔ رمزیہ قصّے (تمثیلی قصّے)

رمزیہ قصّے دراصل ہمارے وہ تمثیلی قصّے ہیں جن کی ابتدا اردو میں "سب رس" سے اور انگریزی میں "پلیگرمس پروگریس" سے ہوتی ہے۔ ان قصوں کے بیان میں کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ رہتا ہے مگر اس مقصد کو قصّے کے لباس میں اس طرح چھپا دیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا مقصد کی بوریت سے بچتا ہوا قصّہ پڑھتا چلا جاتا ہے اور آخر میں خود بہ خود مقصد بھی اس پر واضح ہو جاتا ہے۔

۶۔ داستان

داستان ہمارے قصّہ گوئی کی سب سے مشہور اور طویل شکل ہے، عربی کی داستان "الف لیلہ" سے اردو کی داستان "طلسم ہوشربا" تک ایک طویل سلسلہ ہے۔ ان داستانوں میں قصّہ گوئی کے تمام عناصر رہتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ایک داستان میں کئی کئی قصّے پائے جاتے ہیں۔ پہلے داستان صرف سنانے کا فن تھی مگر اب یہ بھی تحریری طور پر محفوظ کی جا چکی ہے۔

۷۔ ناول

ناول عہد جدید کا فن ہے، جب داستانیں ختم ہوئیں تو ناول نے جنم لیا۔ ناول میں روزمرّہ کے مسائل ہماری تاریخ اور تہذیب کو بڑے کینوس پر قصّے کی شکل میں دکھایا جاتا ہے۔

۸۔ افسانہ

افسانے کی موجودہ شکل ایک بالکل ہی نئی چیز ہے جس کے ڈانڈے کسی حد تک ہمارے یہاں موجود حکایت اور کہانی سے ملائے جا سکتے ہیں۔ افسانے میں بھی ناول کی طرح انسانی زندگی بیان کی جاتی ہے مگر فرق یہ ہے کہ ناول جہاں وسعت حیات کا ترجمان ہے وہیں

باقی صفحہ ۳۱ پر

پروفیسر حاجی شمس الدین

فانی کی شاعری : چند پہلو

فانی کی زندگی بھی کچھ زندگی تھی یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیے تھا

کہنے والے شاعر شوکت علی خاں فانی کی پیدائش ایک دولت مند خاندان میں ۲۷ ستمبر ۱۸۷۹ء میں بدایوں میں ہوئی تھی۔ وہاں ان کے والد بزرگوار اچھی خاصی ملکیت کے مالک تھے۔ فانی کی ابتدائی زندگی خوب عیش و عشرت میں گزری تھی۔ انہیں زندگی کی کوئی فکر ہی نہ تھی۔ ان کے آباؤ اجداد ان کی پیدائش سے تین صدی قبل افغانستان سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور دہلی سلطنت میں انھیں خاص اعتبار حاصل تھا۔

فانی کے دادا نواب بشارت علی خاں ایک مدت تک بدایوں کے گورنر کے عہدہ پر معمور تھے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ان کے والد بزرگوار تین سو گاؤں کے مالک تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کی جائداد ختم ہوتی گئی۔

فانی کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ فانی نے جب شاعری شروع کی ان کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ ان کے والد سخت قسم کے انسان تھے اور فانی کے احساسات کا خیال کیے بغیر ہی ان کے کلام کے پہلے مجموعہ کو انھوں نے دیا سلائی دکھادی تھی جس کا اثر ان کے دل و دماغ پر اس قدر رہا کہ آخری عمر تک وہ اسے فراموش نہ کر سکے۔ ان حادثات نے ان کی زندگی پر کچھ ایسا اثر ڈالا کہ وہ جو کسی وقت خوشی و مسرت کے علم بردار سمجھے جاتے تھے غم و درد کی تصویر بن کر رہ گئے۔

فانی کے کلام میں اسلوب بیان اور ذوق سلیم دیگر شعرا کے مقابلہ میں ایک نمایاں خصوصیت رکھتے تھے۔ دیگر شعرا کے کلام کے خلاف فانی کے کلام میں جو حقیقت سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ان کا مخصوص انفرادی رنگ ہے۔

غالب کی مانند فانی کو بھی مجردات سے بحث کرنے کا خاص ذوق اور اس کے اظہار پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کو دقیق سے دقیق مسئلہ کی تشریح و تعبیر کے لیے بھی غیر مانوس یا دقیق الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے ہم عصروں کے مقابلہ میں انھیں ایک امتیازی حیثیت دی جا سکتی ہے۔

اساتذہ میں سے غالب کے بعد جس کے انداز بیان کا رنگ فانی کی شاعری پر غالب ہوا وہ میر ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میر کا سوز و گداز ان کی لطافتِ زبان اور نزاکتِ ادا فانی کی شاعری کا اصلی جوہر ہے۔ البتہ متقدم و متاخر کا فرق ہے۔ اس سلسلہ میں میر کے رنگ کے چند اشعار دیوانِ فانی سے پیش ہیں۔ ؎

فانی کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے
کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رو دیا

پھر فرماتے ہیں ؎

نازک ہے آج شاید حالت مریضِ غم کی
کیا چارہ گر نے سمجھا کیوں بار بار رو دیا

ایک جگہ فانی نے "درِ زنداں" کا کھلنا بیان کیا ہے جس پر زیادہ تفصیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شعر اپنے اندر کیفیات کا میخانہ لیے ہوئے ہے۔ فانی کہتے ہیں ؎

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

استاد مومن خاں مرحوم جہاں اردو میں ندرت ادا اور خوب صورت فارسی ترکیبوں کے موجد ہیں وہاں ان کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ ان کی غزل کی جان ان کا مقطع ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت فانی کی شاعری کا بھی ایک نمایاں جوہر ہے۔ چند مقطعے بطور نمونہ پیش ہیں ؎

کسی کے غم کی کہانی ہے زندگی فانی
زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا

خاکِ فانی کی قسم ہے تجھے اے دشتِ جنوں
کس سے سیکھا ترے ذروں نے بیاباں ہونا

جس سے رخصت فانی قریب ہے شاید
کچھ اب کی بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

جبر و اختیار حیاتِ انسانی کا ایک نہایت معرکہ آرا مسئلہ ہے جس نے حکماء، عقلاء کے مختلف گروہ پیدا کر دیے ہیں۔ یہی وہ محور ہے جس پر حشر و نشر، سزا و جزا، جنت و جہنم، خیر و شر کے مسائل گردش کرتے ہیں۔ شاعر ہماری عقل و فکر کو نہیں بلکہ جذبات و حسیات کو اپنا مخاطب بناتا ہے اور حقائق کو ایسے رنگ میں پیش کرتا ہے جو براہِ راست ہمارے قلب پر منعکس ہو جاتے ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ جس مسئلہ کی تشریح فلسفی اور حکماء ضخیم جلدوں میں نہ کر سکیں اس کو وہ ایک شعر میں آئینہ کر دے۔ "جبر و اختیار" پر فانی نے مختلف انداز سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ چند نمونے پیش ہیں۔ ؎

۷/۱۵۔ شیخ ماٹھ پارہ، رائپور، ۱ ۴۹۲۔ ایم پی

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے ہم کو
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

روداد مرگ و زیست یہ ہے قصہ مختصر
مجبور زندگی کو بھی جینا محال ہے

اور بندے ہیں جن کو دعوائے خدائی ہے
تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر

فانی کا شاعرانہ آرٹ دو حالتوں کے مقابلہ کرنے میں انتہائے کمال کو پہنچ چکا ہے۔ اپنے مفہوم کو کبھی ایک دل نشیں ترکیب اور کبھی ایک معنی خیز لفظ سے اس طرح ادا کر جاتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جاتی ہے اور سارا نقشہ اس طرح سامنے آجاتا ہے گویا سینما کی تصاویر ہیں جو چشم زدن میں موجود اور غائب ہو جاتی ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

فانی "یاسیات" کے امام ہیں۔ افسردگی و حزن کی ترجمانی ان کا خاص حصہ ہے۔ فانی نے انھیں اپنے کلام میں ایک خاص انداز سے پیش کیا ہے جس میں ان کی انفرادی حیثیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ چند نمونے ہیں۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار تیرے
یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے

شاعری کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ محض ایک اشارہ ہی اشارہ میں ساری تفصیل بیان کر دی جائے۔ ایسی حالت میں شاعر ہمیشہ خاکے پیش کرتا ہے۔ یہ کام سامع کا ہے کہ وہ میلان و مذاق کے مطابق رنگ آمیزی کرتا رہے۔ ایک شعر نمونتاً پیش ہے۔

دم لینے کی تو مہلت ملنا ہی چاہیے تھی
دن رات بحر غم میں کیا غرق چاہیے تھا

فانی کی زندگی بھی کچھ زندگی تھی یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیے تھا

ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

بلبل کو چمن کی زندگی راس آئی
پھولوں کو غریب الوطنی راس آئی
فانی کو نہ زندگی میں راس آیا کچھ
آئی بھی تو ایک موت ہی راس آئی

مختصر یہ کہ فانی کا ایک بڑا کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے رنگ خاص میں بڑی سے بڑی حقیقت کو اسی سادگی اور پرکاری کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ بسا اوقات اہل نظر بھی اس سے گزر جاتے ہیں۔ جذبات کی مصوری، تخیل کی بلندی، واقعات و واردات کی نزاکتوں کے ساتھ کامیاب طور پر بہت کم کی جا سکتی ہے۔ لیکن فانی میں یہ کمال بدرجہ اتم موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

وحشت دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

●

بقیہ: قصہ گوئی کی روایت کچھ نئے فکری پہلو

افسانہ شدت حیات کا ترجمان ہے۔ ناول میں کسی ایک آدمی کی پوری زندگی یا کوئی ایک عہد یا کوئی ایک تہذیب اپنی تمام تر تفصیلات و جزئیات کے ساتھ پیش کی جاتی ہے لیکن افسانے میں کوئی ایک واقعہ، تجربہ، حادثہ، مشاہدہ، خیالی کہانی کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور اس میں خاص توجہ اس بات پر رہتی ہے کہ جس مرکزی خیال کے تحت افسانہ لکھا جا رہا ہے اس مرکزی خیال، واقعے یا تجربے کو اپنی پوری شدت اور گہرائی کے ساتھ واضح کر دیا جائے۔

۳۔ ڈرامہ

ڈرامہ بھی فن قصہ گوئی یعنی فکشن میں داخل ہے، مگر یہ اپنے ذرائع اور تکنیک کی وجہ سے فن قصہ گوئی کی ایک عام صنف سے الگ ہو جاتا ہے جس کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ دراصل ڈرامے میں واقعہ نہ تو ناول کی طرح وسعت کا طالب ہوتا ہے اور نہ ہی افسانے کی طرح شدت کا، بلکہ یہ تو دراصل واقعے کو تصادم کے سہارے آگے بڑھاتا ہے اور یہ تصادم حیات ہی گویا ڈرامے کی بنیادی پہچان ہے۔

۴۔ سنائے جانے والے قصے کا عہد جدید

پچھلے پچاس برسوں میں سینما اور ٹی وی کے ذریعہ قصہ گوئی کی ایک بالکل نئی سمت سامنے آرہی ہے۔ یعنی اب لکھی ہوئی داستان، لکھے ہوئے ناول اور لکھے ہوئے افسانے کی جگہ دکھائے جانے والے قصے کا دور ہے۔ یعنی آج سے سیکڑوں ہزاروں برس پہلے جو قصے، قصہ گو یا داستان گو اپنے جسم کی حرکات اور اشاروں کے ذریعہ واضح کرتا تھا اور جس نے بعد میں اسٹیج ڈراموں کی شکل اختیار کر لی تھی، وہی اب اپنی زیادہ ترقی یافتہ شکل میں سینما اور ٹی وی کی شکل میں دوبارہ ہمارے لیے سننے اور پڑھنے کی چیز سے زیادہ دیکھنے کی چیز بن گئے ہیں۔ یہ صنف ابھی اپنے کمال کے مراحل طے کر رہی ہے اور آنے والا وقت بہتر طور پر اس کے شرائط طے کر سکے گا اور اس کے مقام کا تعین ہو سکے گا۔

●

بقیہ: خواتین میں نشہ بڑھتا رجحان

جان لیوا ہے اس کی مثال ہمیں پیرس میں اس سال ہوئے صحت پر لوپ میں اقوامی اجلاس سے ملتی ہے جس میں کہا گیا کہ اس کی لت دنیا بھر میں ہر سال پانچ لاکھ خواتین کی جان لے لیتی ہے۔

ایک طرف جہاں جدیدیت اور ترقی یافتہ تہذیب کا مسیحا امریکہ تمباکو نوشی کے خلاف نئے طریقے سے جنگ کا اعلان کر رہا ہے وہیں ہماری جدیدیت کے سربراہ سگریٹ کے دھوئیں سے ہندوستانی تہذیب اور سماج کو آگ میں جھونکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خواتین میں نشے کا رجحان اگر اسی طرح تیزی سے بڑھتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب شراب نوشی مخالف اشتہار میں ہاتھ میں شراب کی بوتل لیے لوٹتے ہوئے شوہر کی جگہ خواتین لے لیں۔ یوں دونوں معاملوں میں آخری لفظ ایک ہی رہے گا کہ نشہ خاندان اور سماج کا کوڑھ ہے۔

شاہد اختر انصاری

ادبی سماجیات اور ادبی مسائل

کوئی ادب خلا میں نہیں پیدا ہوتا۔ اس کا تعلق انسان، اس کی زندگی، طرز معاشرت، تہذیب و تمدن، ذوق سلیم اور وقت اور حالات کے بدلتے ہوئے معیار سے بڑا گہرا ہے۔ ادیب اور فنکار بذات خود سماج کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔ سماج میں اس کی حیثیت مختلف اسباب کے پیش نظر بدلتی رہتی ہے۔ وہ بیک وقت مختلف رشتوں اور مختلف حیثیتوں کا مالک ہوتا ہے پھر قاری کی ایک ایک سطح اور پہچان ہوتی ہے اس کی بھی ایک ایسی سماجی حیثیت ہوتی ہے۔ طرز معاشرت اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ذوق سلیم اور بدلتے ہوئے حالات کا بھی ادب فہمی اور ادب کی تخلیق میں ایک خاص رول ہوتا ہے اور جیسے جیسے حالات بدلتے جاتے ہیں تہذیب و تمدن مختلف مراحل طے کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ادب کی تخلیقی حیثیت اور اس کے افہام و تفہیم کی نوعیت بھی متاثر ہوتی اور متاثر کرتی رہتی ہے۔ ادبی سماجیات اسی مطالعے کا نام ہے جس کے تحت ادب کو سماج کے مختلف رشتوں کی روشنی میں سمجھا اور پرکھا جاسکے اور ساتھ ہی ساتھ اس آگہی کا جو ادب کے ذریعہ حاصل کی جائے اور اس کے وسیلے سے سماج کو پہچانا جاسکے۔ ادب کو سماج کے رشتوں سے اور سماج کو ادب کے وسیلے سے پہچاننے کی یہ کوشش بڑی دلچسپ بھی ہوسکتی ہے کیوں کہ اس میں صرف ہمیں سماج کے وسیلہ اظہار ہی کا علم نہیں ہوتا بلکہ اس کے آئینے میں عصری مسائل، زندگی کی بدلتی ہوئی قدریں، بدلتے ہوئے ذوق سلیم اور ان کے اسباب و محرکات سے بھی ہمیں واقفیت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا مطالعہ کرتے کرتے انداز بیان، تکنیک کے بدلتے ہوئے تصورات، زبان و بیان کے ارتقا تک بات پہنچتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ آگاہی بھی دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے کہ کس دور کا ادب سماج کو متاثر کرتا ہے اور کس دور کا ادب خود سماج سے متاثر ہوتا رہا ہے، اس کے اسباب کیا کیا ہیں؟

تخلیق کے ساتھ ساتھ تخلیق کار اور اس کی سماجی حیثیت کا مطالعہ بھی ادبی سماجیات کا ایک قابل ذکر پہلو ہے۔ تخلیق کار کی سماجی حیثیت کیا ہے، سماج کے مختلف طبقوں سے اس کا کمٹمنٹ (COMMITMENT) کس قسم کا ہے؟ اس کے پیشے، رہنے سہنے کے آداب اور عوام کے ادب پر اس کی حیثیت کی تصویر وغیرہ یہ ایسے سماجی حقائق ہیں جو ادبی سماجیات کے مطالعے کی بنیاد بنتے ہیں۔ پھر کس دور میں کس قسم کا ادب تخلیق کیا گیا۔ اس کے پس پشت کون سے خارجی و داخلی عوامل کارفرما تھے، ادب کی سرپرستی سماج کے کن طبقوں کے ہاتھ میں تھی؟ ادب کی تشریح و تعبیر کے رنگ اور انداز کیا کیا تھے، اور اس زمانے کے ادب نے کیونکر مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ قارئین کے لیے اس زمانے کے ادب کا موضوع زیادہ اہم تھا یا تکنیک؟ ان تمام عوامل کو ذہن میں رکھتے ہوئے ادب کا مطالعہ اور سماج کا مطالعہ دلچسپی اور نئی معلومات کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ ادب اور سماج کا مطالعہ اسی حیثیت سے ادبی سماجیات کا موضوع رہا ہے۔

ظاہر ہے ادب کا مطالعہ اس حیثیت سے اگر کیا جائے تو اس سے ہمیں سماجی ارتقا، عصری آگہی اور عوام اور قارئین کے بدلتے ہوئے اذواق کے تعین میں مدد مل سکے گی۔ پھر چوں کہ ادب ایک قسم کی تہذیبی دستاویز بھی ہے لیکن اس سے سماجی نتیجے نکالنا خاصا پیچیدہ اور نازک قسم کا عمل ہے کیوں کہ اس میں تخلیق کار اور قاری کی اپنی اپنی ذہنی سطح بھی داخل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے وہ تہذیب عصر کی توثیق تو کرسکتے ہیں مگر ان سے سماجی نتائج نکالنے میں گمراہیوں کے اندیشے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ادب کو سماجی دستاویز دینے میں ایک دوسری مشکل یہ بھی ہے کہ اس میں تخلیق کار کی شخصیت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فنکار اپنے عہد ہی میں زندہ رہتا ہے اور اسی کی تصویر کشی کرتا ہے مگر ایک سرکاری رپورٹ اور ادبی تخلیق میں جو فرق ہوتا ہے اس کے نازک رشتے کا علم ہونا چاہیے کیوں کہ ادبی تخلیق میں عصری آگہی اور اقدار حیات کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کی اپنی شخصیت اس کی کمٹمنٹ، تخیل اور جمالیاتی بصیرت بھی شامل ہوتی ہے۔

جب ہم ادبی سماجیات کے نقطہ نظر سے ادب کی تشریح و تعبیر کی بات کرتے ہیں تو اس میں کئی ایسی چیزیں ہیں جو قابل مطالعہ ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی مخصوص زمانے کی سماجی حیثیت

---

۳۴۳ ستلج ہوسٹل۔ جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی ۶۷

اور اس کی قدروں کا مطالعہ کیا جائے تو لازمی ہو جاتا ہے کہ اس پورے عہد کی تاریخی معلومات ہمارے پاس ہو اور اس عہد کی پوری دستاویز بھی مہیا ہو کہ کون سے طبقے برسر اقتدار تھے اور کون سے طبقے محکوم۔ اگر اسی عہد کی واقفیت ہمیں ادبی سماجیات کی روشنی میں حاصل کرنی ہے تو بھی کئی ایسے عناصر ہیں جنھیں برتے بغیر ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر مصنف کی زبان، اس کے موضوعات، خود مصنف کی سماجی حیثیت اور تخلیق کے ساتھ ساتھ سماج کے تعلق سے اس کا TREATMENT وغیرہ مصنف کی اپنی زبان اس کی سماجی حیثیت متعین کرتی ہے۔ پھر اس کے موضوعات اور ان موضوعات کے ساتھ اس کا کمٹمنٹ اور جب ہم کمٹمنٹ کی بات کرتے ہیں تو اس تعلق سے مصنف کی اپنی شخصیت اور اس کی سماجی حیثیت، اس حیثیت اور رشتے کے تعلق سے سماج کے تئیں اس کا نظریہ یہ تمام باتیں ادب کی تعبیر و تشریح میں مسائل کی حیثیت سے سامنے آتی ہیں۔ ایک ہی زمانے میں ایک ہی موضوع کے تعلق سے مختلف تخلیق کاروں کا رویہ الگ ہوسکتا ہے اور ہونا چاہیے کیوں کہ اس سے بلاشبہ بعض دوررس نتائج سامنے آتے ہیں۔ اس کی سب سے عمدہ مثال عصر حاضر میں قرۃ العین حیدر اور قاضی عبدالستار کی تخلیقات ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو کے بیشتر تخلیق کار ادب کی سماجی افادیت کے قائل ہیں اور ادب میں مساوات، غریبی اور استحصال کے خلاف جدوجہد، سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بغاوت اور جبس کے تعلق سے مختلف قسم کی تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ ان ادیبوں اور دانشوروں میں سے بیشتر ادیب ایسے ہیں جو یا تو قصبے سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر چھوٹے چھوٹے شہروں سے، وہ متوسط طبقے کے خاندان کے افراد ہیں ان میں سے کم ہی ایسے ہیں جو سرمایہ دار یا جاگیردار ہوں اور یا تو بالکل نچلے طبقے کے افراد اور انتہائی غربت کے شکار۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو کبھی سرمایہ دار اور جاگیردار تھے مگر اب وہ انھیں چھوڑ چکے ہیں اور ان کی ساری ہمدردیاں متوسط طبقے کے افراد کے ساتھ ہیں اور ان کے ہیرو استحصال اور غربت کے شکار عوام ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کی تخلیقات میں سماجی رویوں کے تعلق سے وہی رنگ جھلکے گا جس سے انھیں خاص قسم کی دلچسپی اور ہمدردی ہے پھر اسی تعلق سے ان کی زبان، بیان اور انداز تخاطب بھی ہوں گے۔ برخلاف اس کے قرۃ العین حیدر اور قاضی عبدالستار ہیں کہ جاگیردارانہ خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور اس مٹتی ہوئی تہذیب کے ہمدرد بھی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں سرمایہ داروں اور جاگیردارانہ نظام سے ہمدردی جھلکتی ہے اور اسی ہمدردی کا نتیجہ ہے کہ ان کی زبان اور تکنیک بھی اس سے متاثر ہوئی ہیں کیوں کہ طبقوں کے تفاوت سے زبان و بیان اور موضوعات میں جو فرق ہوتا ہے وہ ان کی تحریروں میں صاف طور سے جھلکتا ہے اس کے علاوہ ادب کی تعبیر و تشریح میں مختلف اصناف کا بھی دخل ہوتا ہے اور الگ الگ اصناف کے اپنے اپنے طور پر مسائل بھی ہوتے ہیں، ان کے پیرایہ بیاں میں تفاوت ہوتا ہے۔ پھر ادب اور سائنس میں تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ ادب میں کوئی چیز دو اور دو چار کر کے نہیں دیکھی جاسکتی۔ اس کا پیرایہ ادبی ہوتا ہے۔ ایسا بھی امکان ہے کہ ادبی بیانات کی گہرائی میں اترے بغیر بعض گمراہ کن نتائج تک پہنچ جایا جائے۔ مگر یہ مناسب نہیں کیوں کہ تشبیہیں اور علامتیں، استعارات حتیٰ کہ کردار و واقعات تک سماجی رویوں اور قدروں سے بنتے اور بگڑتے ہیں تو بغیر اس کو سمجھے کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا جاسکتا۔

علامتوں اور تشبیہات کا استعمال نثر کی بہ نسبت نظم میں زیادہ ہوتا ہے۔ پھر الگ الگ زمانوں میں ایک ہی قسم کے الفاظ مختلف معانی کے لیے استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ خاص طور سے غزل میں میر سے لے کر فیض اور پھر عہد حاضر کے شاعروں تک بے شمار ایسے الفاظ ہیں جو معنی بدل بدل کر ادب میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر غزل کا ایسا ایک خاص قسم کا موڈ اور مزاج ہے۔ دھیمے لہجے میں علامتوں اور استعاروں کا استعمال ہی اس کا حسن ہے۔ اس لیے جب تک غزلوں میں اس شاعری کی پوری ذہنی فضا اور سماجی حالات کو سامنے نہیں رکھا جاتا، اس سے سماجی نتیجے اخذ کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ غزلوں کے علاوہ نظم کی دوسری اصناف کا مطالعہ بھی ادبی سماجیات کے لیے دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے۔ مثنویاں خاص زمانے کی پیداوار تھیں۔ شاعر سماج کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ ایک ایسے سماج کا حسن کے دائرے سمٹے ہوئے ہیں۔ روایتی قصے اور کہانیاں جو اجتماعی زندگی کے عناصر ہیں، برخلاف اس کے غزل کہ وہ بکھرتے ہوئے سماج اور اس سے علاحدہ ہوتے شاعر کی آواز ہے۔ پھر جدید نظم کا ارتقا اور اس کے تعلق سے مختلف سیاسی و قومی مسائل، ساتھ ہی ساتھ رومانی تحریک کے اثرات، ترقی پسندی اور زبان و بیان تک میں اضافے اور تبدیلیاں سب ایسے عناصر ہیں جو ادیب اور فنکار، اس کی سماجی حیثیتیں اور ان کے TREATMENT کو واضح کرتے ہیں اور اس پورے سماجی نظام اور اس کے ارتقا کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جو میر سے لے کر عہد حاضر تک آپہنچا ہے۔

نظم کے برخلاف نثر کی تعبیر و تشریح کے اپنے الگ مسائل ہیں۔ داستان، افسانے کا پیرایہ اظہار و بیان، ڈرامے کی اپنی تکنیک وغیرہ بھی اس سلسلے میں مختلف مسائل پیدا کرتی ہیں۔ داستانوں کے سماج اور افسانوں کے سماج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ موضوع، زبان اور تکنیک کے فرق اور ان کے ساتھ مصنف کی الگ الگ وابستگی بھی اس پورے تہذیبی ارتقا کی داستاں ہے جو اردو کے دو سو سال کے عرصے کو محیط ہے۔ ڈرامے کی تعبیر و تشریح کا مسئلہ یہ ہے کہ "اندر سبھا" سے لے کر آج کے ڈراموں میں جو ارتقا ہے اس کے بدلتے ہوئے انداز اور رنگ ہیں۔ جن میں موضوع سے لے کر زبان اور پھر مصنف کی اپنی حیثیت، اس کے اختیارات بھی شامل ہیں۔ مثال کے طور پر انارکلی، ایک تاریخی ڈرامہ ہے ظاہر ہے اس کی تعبیر و تشریح ایک مسئلہ بن سکتی ہے کہ تاج کا ڈرامہ تاریخی نوعیت کا ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ تو تسلیم ہے کہ تاریخ ہی سے تاج نے اپنا

موضوع منتخب کیا ہے لیکن زبان و بیان، انداز، بدلتی ہوئی قدروں اور پھر صنف ڈرامہ کی اپنی نوعیت یہ ایسے مراحل ہیں جو سماجیاتی نقطۂ نظر سے اس مسئلے کا حل بن سکتے ہیں۔

ادبی سماجیات کے نقطۂ نظر سے ادب کی تعبیر و تشریح میں مصنف کے پیشے، سماجی حیثیت، خاندان کے ساتھ ساتھ ادبی سرپرستی اور پھر اس ضمن میں عوامی ذرائع ترسیل، اکادمیوں کا قیام، ان کے مقاصد، دائرہ کار کی بحث بھی آتی ہے۔ ظاہر ہے جس قسم کے افراد کے ہاتھوں میں ادب کی سرپرستی ہوگی اسی قسم کا ادب تخلیق کیا جائے گا اور جس قسم کے افراد اس ادب کے قارئین میں شامل ہوں گے اسی معیار کا ادب نشو و نما پا سکے گا۔ پہلے ادیب اور فنکار اور قاری کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ تھی۔ فنکار کی تخلیق بلا واسطے قاری تک پہنچتی تھی لیکن آج اس کی سماجی حیثیت بدل چکی ہے۔ شاعر اور ادیب کے ذہن سے نکلے ہوئے خیالات قاری تک پہنچتے پہنچتے اتنے مراحل سے دوچار ہوتے ہیں کہ ایک وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے ان دونوں کے درمیان۔ ظاہر ہے ابلاغ و تفہیم کے سلسلے میں یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ پھر بدلتے ہوئے حالات کے تحت فنکار اور ادیب کی حیثیت بھی بدلتی چلی جاتی ہے، جو لوگ فلموں اور دوسرے عوامی ذرائع ترسیل سے منسلک ہیں، ان کی تخلیقات اپنے اصل روپ میں قاری اور سامع تک نہیں پہنچ پاتیں اس لیے ادب کی تعبیر و تشریح مزید مسائل کھڑے کر دیتی ہے۔ اس میں ان کے اپنے مفادات بھی شامل ہیں جو ادب اور تخلیق کو ایک جنس تجارت کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ ہاں! کچھ ادیب ایسے ہیں جو عوامی ذرائع ترسیل کے عمل کو فضول کہتے ہیں اور اپنی ذات کے برملا اظہار کے لیے ایسی علامتیں اور تشبیہیں استعمال کرتے ہیں جو ان کی شخصیت کی پہچان بن سکیں، لیکن ان کے ساتھ پھر یہ مسئلہ آجاتا ہے کہ ان کو قاری کی ذہنی سطح کا اندازہ نہیں ہو پاتا یا پھر قاری ان کی ذہنی روش سے بیگانہ رہ جاتا ہے۔

گویا ادبی سماجیات کے نقطۂ نظر سے ادب کی تعبیر و تشریح اور اس کے مسائل کے تعلق سے ایسے بے شمار اسباب ہیں جو سدِّ راہ ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ادبی سماجیات سماج کو ایک فرد کے روپ میں مان کر ادب کا مطالعہ کرتی ہے ظاہر ہے جب اس کی تشریح کی جائے گی تو بھی اسے ایک فرد کے روپ میں ہی تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن ادب اور فنکار سے لے کر قاری کی ذہنی سطح تک پہنچنے کا جو طویل سلسلہ ہے، جس میں خود مصنف کی شخصیت، زبان، موضوعات اور اس کے TREATMENT شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ادب کے سرپرستی، تاجر، عوامی ذرائع ترسیل اور اس کے طریقۂ کار اور دائرہ کار کی پابندیاں بھی ہیں۔ ان سبھوں کو پیش نظر رکھ کر ہی ادب کی تعبیر و تشریح سماجیاتی نقطۂ نظر سے مفید مطلب ہو سکتی ہے۔ ●

بقیہ: جانور — ہمارے دوست

ان منصوبوں کو بہتر طور پر کامیاب بنانے کے لیے عوامی تعاون انتہائی ضروری ہے۔

یہ شعور بیدار ہو جانے کے بعد کہ دنیا کے تمام جاندار اپنی بقا کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہیں، ہمیں یہ عہد کر لینا چاہیے کہ قدرت کے بخشے ہوئے اس عظیم سرمائے کو جسے عرف عام میں جنگلاتی زندگی کہا جاتا ہے، ہمارے ہاتھوں کسی بھی طرح کا نقصان نہ پہنچے۔ ماضی میں ہم نے جنگلاتی زندگی اور دوسرے ماحولیاتی اجزا کو جو نقصان پہنچایا ہے اس پر محض کف افسوس ملنے سے بھی نہ تو ہماری غلطیوں کا ازالہ ممکن ہے اور نہ ہم اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو سکتے ہیں بلکہ ہمیں اپنی فکر اور رویے میں ایک ایسی تبدیلی لانی ہوگی جس کے نتیجے میں ہماری زندگی کے تمام تر فیصلے ہمارے گرد و پیش کی جنگلاتی زندگی اور ماحولیاتی نظام کے تحفظ کی ضمانت ثابت ہوں۔ ہمیں اپنے ذہنوں سے اس قدیم تصور کی جڑیں اکھاڑ پھینکنی ہوں گی کہ جنگلی جانور ہمارے دشمن ہیں کیوں کہ کوئی بھی جانور خواہ وہ پالتو ہو یا جنگلی، قانونِ فطرت سے سرِمو انحراف نہیں کرتا۔ وہ اگر کسی ذی روح کا شکار کرتا ہے تو صرف اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے جو کہ ایک فطری ضرورت ہے۔ انتقام بھی ایک فطری جبلت ہے۔ جب کوئی جانور کسی انسان کے ہاتھوں مجروح ہوتا ہے تو تمام نسلِ انسانی کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ اس کے سینے میں بھڑکنے لگتی ہے اور انجام کار انسانی جانیں اس کا ہدف بنتی ہیں۔ لہٰذا دیکھا جائے تو یہاں بھی خود آدمی ہی آدمی کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے ورنہ جانور کو بھلا ہم سے کیا دشمنی ہے۔ وہ تو بے چارے ہمارے دوست ہیں اور خدا کی بنائی ہوئی ایک ایسی خوب صورت اور سادہ لوح مخلوق کہ جس کو دیکھ کر ہم اپنے ذوقِ جمال کی تسکین کرتے ہیں، جن کی دلنواز اداؤں پر ہمیں پیار آتا ہے اور جن کا وجود ہماری زندگی کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔

ہماری اخلاقیات میں محسن کشی کو بدترین جرم قرار دیا گیا ہے۔ جانور ہمارے محسن ہیں۔ کیا ہم اپنے محسنوں کا خون بہانا پسند کریں گے؟ ہرگز نہیں۔ ہمارے بہت سے دوستوں کو جنگلی جانوروں کے شکار کا بے حد شوق ہے۔ وہ شاید ہماری بات سے اتفاق نہ کریں لیکن ہم انھیں شکار سے روک تو نہیں رہے ہیں۔ آپ جنگلی جانوروں کا شکار ضرور کیجیے لیکن تیر کمان سے نہیں، بندوق اور خودکار رائفلوں سے بھی نہیں، بلکہ انھیں آپ شکار کیجیے اپنے فوٹو کیمروں سے، اپنے ویڈیو کیمروں سے اور اپنے مووی کیمرے سے۔ ان کی فطری حرکات کو کیمرے میں قید کرنا آتشیں اسلحے کی مدد سے کھیلے جانے والے شکار سے کہیں زیادہ جواں مردی اور ہمت و حوصلے کا کام ہے۔ اس طرح ذوقِ مہم جوئی کی تسکین تو ہوگی ہی ساتھ ہی جمالیاتی حظ بھی آپ کو حاصل ہوگا۔ ●

بقیہ: گوتم بدھ ایک عظیم سنت

کہ سدھارتھ کو مصائب، بیماریوں وغیرہ کا احساس تک نہ ہو۔ کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ ان سے دنیا کے رنج و غم اور مصائب کے بارے میں بات کرے۔ ان کی تعلیم پر بہت زیادہ دھیان دیا گیا اور انھیں گھوڑ سواری، تیر اندازی، مطالعے، موسیقی اور جنگ و جدل کی تربیت دی گئی۔ راجہ نے خاص طور سے شہزادے کے لیے محل اور باغات بنوائے۔ سدھارتھ کی شادی ایک خوب صورت شہزادی یشودھرا سے ہوائی۔ لیکن نوجوان سدھارتھ ان سب چیزوں سے مطمئن نہیں ہوئے۔ ●

اختر جاوید

اردو میں رومانیت

تاریخی اور فلسفیانہ سیاق و سباق میں رومانیت نو کلاسیکیت کے عقل پرستانہ رویّہ کے خلاف ایک بغاوت تھی جس کا مطلب لاطینی روایات کو ترک کر کے ادب میں ایک ایسے نظریے کی بنیاد ڈالنی تھی جس کا براہ راست تعلق جذباتیت اور وجدان و احساس سے ہو۔ اس کی ابتدا اٹھارویں صدی میں جرمنی میں ہوئی۔ شلیگل (SHELEGAL) اور شلینگ (SCHFILING) اس کے علم بردار تھے۔ شلیگل کی کتاب DRAMATIC LECTURE اور مادام دی اسٹیل کی کتاب DEL ALLEMANGE نے فرانس میں مقبولیت دلائی اس کے علاوہ روسو کے BACK TO NATURE نے بھی فرانس میں رومانوی تحریک پر اثر ڈالا۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ رومانوی تحریک فرانس انقلاب کے لیے بھی کافی حد تک ذمہ دار تھی۔ اس فکر کو انگلستان میں عام کرنے کا سہرا کولرج کو جاتا ہے، مگر یہ یاد رہے کہ رومانیت انگلینڈ اور فرانس دونوں جگہ بعض سیاسی نظریات سے وابستہ ہے۔

رومانیت کی تعریف و توضیح ایک مشکل مرحلہ ہے کیوں کہ وہ عناصر جو رومانیت کے لیے ضروری قرار دیے جاتے ہیں ان کے بارے میں مختلف خیالات موجود ہیں۔ رومانیت کی تعریف کرتے ہوئے انگریزی نقاد والٹر پیٹر (WALTER PETER) نے اس کی ایک اہم خصوصیت کی طرف توجہ دلائی ہے اس نے رومانیت کو "جذبۂ تحیر کی بازیافت" (RENAISSANCE OF WONDER) کے مترادف سمجھا تھا۔

تخیل، جذبہ اور وجدان ـــــ رومانیت کے تین محور ہیں۔ ایک رومانوی مفکر کے نزدیک احساسات و جذبات ہی کے ذریعہ حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے۔ رومانوی ادیبوں نے کلاسیکیت کے توازن اور میانہ روی کے برعکس انتہا پسندی اور جذبات کی فراوانی پر زور دیا۔ رومانوی انسان کے لیے جذبات اور جوش ہی ان کے اصل سرمایہ ہیں۔ طاقت اور عظمت اس کے اصل موضوع ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ انسانی جذبات عقل کے فرمان اور اصولوں کے تابع نہیں رہ سکتے اور رومانیت کسی اصول پرستی کے پرانے سانچے میں اپنے آپ کو مقید نہیں رکھ سکتی۔ رومانیت کی بنیاد تصوریت اور ماورائیت پر ہے اس لیے اس میں میانہ روی کی گنجائش نہیں۔ ان کے یہاں جذبات بہت شدید اور تصوریت بہت بلند ہے۔ یہ انتہا پسندی شاعروں اور ادیبوں نے ہر جگہ دکھائی ہے۔ یہ ایک انقلابی تحریک تھی اس نے تمام پرانی روایات سے بغاوت کی اور زندگی و ادب کے اصولوں کی از سر نو ترتیب کی۔ بہرکیف یہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ ۱۸ویں صدی کے اواخر اور ۲۰ویں صدی کے اوائل میں رومانیت پسندی کا اثر جو اردو ادب پر پڑا اس کا جائزہ لیا جائے اور یہ پتا لگایا جائے کہ اس نے اردو ادب کو کیا دیا۔

اردو میں یونانی اصولوں کی سخت گیری نہیں تھی اسی لیے اردو میں رومانوی تحریک کسی بغاوت کا نتیجہ قرار نہیں دی جا سکتی لیکن بعض حالات ایسے ضرور موجود تھے جو پرانی روایات سے مخالفت کا سبب بنے۔ اردو کو فارسی کے بہت سارے اصول وراثت میں ملے ہیں۔ اردو شاعری کے بارے میں جو سخت گیر اور جامد ضابطہ لکھنؤ اسکول نے اختیار کیا تھا اس کی گرفت بہت ہی سخت تھی۔ ناسخ، رشک اور وزیر کے انداز بیان میں یہ سخت گیری آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہے جہاں شاعری اور حسن کو اصول اور ضابطے کے سانچے میں ڈھالا جا رہا تھا۔ رجب علی بیگ سرور کی نثر بھی ان اصولوں سے خالی نہیں تھی اسی لیے ان بے روح، بے لوچ اور جامد اصولوں کے مقابلے میں آزادی کا جو رجحان پیدا ہوا کسی حد تک ہم اسے اس کا رد عمل قرار دے سکتے ہیں گرچہ یہ کسی منظم تحریک کی شکل میں شروع نہیں ہوئی۔

اردو ادب میں اس بندھے ٹکے اور جامد اصول اور ضابطہ بندی کے خلاف سب سے پہلے حالیؔ نے ہی آواز بلند کی، حالیؔ نے اپنی کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" میں جذبات نگاری، بلند تخیل اور جوش کی حمایت کی ہے مگر اس کے باوجود اسے رومانویت کے حامیوں میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے ادب میں حسن قدر کی اشاعت کی ہے اس کی بنیاد انفرادی آزادی رومیدی اور رومانوی جذباتیت کی بجائے سنجیدہ عقلیت اور سماجی شعور پر ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے انتہا پسندی کی بجائے میانہ روی اور اعتدال پسندی کو ابھارا ہے جو رومانویت کی روح کے منافی ہے۔ اسلوب بیان میں بھی وہ

---

۲۲۲ کاویری ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۶۷

بغاوت کے بجائے اصلاح چاہتے ہیں۔

اردو ادب میں رومانوی تحریک کو کئی غیر متوقع وسائل سے مدد ملی۔ اقبال کو بھی ایک ایسا ہی وسیلہ حاصل ہوا۔ ان کا نظریہ عشق و عقل اور مرد مومن وشاہین کا تصور رومانویت کا ہی مرہون منت ہے جس کی بنیاد تصوریت اور ماورائیت پر ہے۔ انھوں نے عشق و عقل کی جو دو بیانی کی اس میں وجدان کا عنصر داخل ہے۔ وہ جذبے اور وجدان کی بنیادی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ اقبال کے بارے میں محمد حسن لکھتے ہیں کہ

> "اقبال کی شاعری میں رومانوی اثرات
> بہت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ان کے
> یہاں جذبات اور وجدان کی افراط اور غلبہ
> اس قدر زیادہ ہے کہ اگر ان کو رومانوی
> شاعر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اقبال نے
> عقل اور عشق کے لفظوں سے نیا جہان بسایا
> اس جہان کی تعمیر میں جذبہ اور وجدان کی
> اہمیت بنیادی ہے۔"[1]

اقبال کی رومانویت کا اندازہ ان کے اشعار سے بھی ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

> بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
> عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
>
> اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
> لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جذبات کی شدت اور تخیل کی فراوانی رومانویت کے بنیادی عناصر ہیں جو ابوالکلام آزاد کے یہاں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کے تخیل کی پرواز اتنی بلند ہے کہ لاکھ کوشش کے باوجود وہ زمین پر نہیں اترتے۔ ان کی اسی انفرادیت اور تخیل نے ان کی نثر کو عام نثر نگاری کے اصولوں سے الگ کر دیا ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے بھی ابوالکلام آزاد ہمیشہ تخیل کی دنیا میں پرواز کرتے رہتے ہیں ان کے یہاں ٹھہراؤ نہیں ہے اسی لیے وہ ایک بات کو کئی ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ وہ ایک سچے رومانوی کی طرح حال کی سطحیت سے اپنی نظر ہٹا لیتے ہیں اپنے تخیل کی بلندی اور ماحول کی ہمت شکنی انھیں پست حوصلہ نہیں کرتی۔

رومانویت کی بنیاد شدت جذبات پر ہے جذبات کی یہی فراوانی سجاد حیدر یلدرم کے یہاں بھی ملتی ہے۔ ان کے مضامین نے اردو میں رومانوی تحریک کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ان کی نثر تخیل کی موج میں تھپیڑے کھاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی رومانویت اس بات میں مضمر ہے کہ ان کے تخیل کی بنیاد ماورائیت اور تصور پر ہے۔ اس کے علاوہ انفرادیت پسندی آزادی فطرت، حسن و عشق اور عورت سے محبت کے جذبے کی کارفرمائی ہے جو رومانویت کی خصوصیت ہے۔

یلدرم کی دنیا ۲۰ویں صدی کے مغربی تہذیب یافتہ ذہن کی دنیا ہے جو ۲۰ویں صدی کی مغربی تہذیب سے متاثر ہے۔ یلدرم کے افسانے میں رومانوی تحریک کے وہ سبھی عناصر موجود ہیں جو اس کو رومانوی بناتے ہیں۔ جذباتیت اور ماورائی حسن کی تلاش، رومان اور حسن کو سماجی پس منظر سے فرار کا ذریعہ بنانا اور اسے زندگی سے ہم آہنگ بنانے کے بجائے تخیل کی دنیا بسانا سبھی کچھ یلدرم کے یہاں آسانی سے ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔

یلدرم نے جن غیر حقیقی تصورات کو اپنے ادب کا اہم حصہ بنایا ہے ان کی واضح تصویریں نیاز فتح پوری کے یہاں بھی موجود ہیں۔ ایک شاعر کا انجام، نیاز فتح پوری کی ایک ماورائی محبت کی داستان ہے جس کا انجام پاگل پن اور خودکشی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔

رومانوی ادیبوں اور شاعروں نے اداسی، درد اور کرب کو اپنی شخصیت کا جوہر بنایا ہے ان کے سامنے زندگی کا کوئی پہلو بھی درد اور اداسی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا دوسرے رومانوی ادیبوں کی طرح مجنوں کے یہاں بھی یہ قنوطیت پائی جاتی ہے۔ مجنوں کی محبت کی ناکامی میں بھی یہ رومانویت موجود ہے۔ ان کے کردار ایک ایسی اجنبی دنیا کا خواب دیکھتے ہیں جس کی تعبیر میں غم و الم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان کی باتیں یکساں حد تک تصوراتی اور جذباتی ہیں اور ان کی نظریں ہمیشہ موہوم چیزوں کی تلاش کرتی رہتی ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے ایسے ناولوں کے ذریعہ اسی تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد کی۔ ان کے طرز اظہار کا انداز رومانویت سے پر ہے ان کے یہاں زندگی سے بیزاری اور بغاوت ہے۔ رومانوی سرمستی اور رنگینی ہے۔ "لیلیٰ کے خطوط" میں لیلیٰ کی زندگی سے بیزاری، آرزومندی اور اس کی مظلومیت میں وہ سب کچھ موجود ہے جو رومانویت پسندی کے عناصر تصور کیے جاتے ہیں۔

جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے اس میں رومانی رجحان سب سے زیادہ اختر شیرانی کے یہاں نظر آتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں ان کے یہاں حسن ہی اصل صداقت اور صداقت ہی حسن ہے۔ ان کے یہاں اصل عشق عورت کی خوبصورتی ہے ان کی رومانوی شاعری اداس اور درد آگیں نہیں بلکہ پر کیف ہے۔ ان کے یہاں سلمیٰ اور لیلیٰ حسن کی علامت ہیں۔ حسن اور عشق کا یہ رنگ ان کی مشہور نظم "اے عشق کہیں لے چل" میں بھی موجود ہے۔ دراصل عشق کا یہی تصور ان کی حقیقی رومانویت کا حصہ ہے۔ ان کی ایک قومی نظم "میرا سنہا حوان" میں بھی رومانویت کا وہ انداز شامل ہے۔ ان کی تبدیلی کی خواہش ایک موہوم شکل میں موجود ہے جو انھیں رومانی بنانے میں معاون ثابت ہوئی ہے۔

اردو شاعروں میں جوش ملیح آبادی کے یہاں بھی رومانویت کا یہ رنگ اپنے اصل روپ میں موجود ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے بھی جوش کو رومانی شاعروں کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ جوش نے اپنے فن میں بنیادی عنصر جذبات کو قرار دیا ہے اور وہ عقل کی بجائے جذبات کو ہی اپنا رہبر سمجھتے ہیں۔ ان کی رومانویت ان کی عشقیہ اور انقلابی شاعری دونوں میں نمایاں ہے چونکہ ان کی نگاہ میں عشق کو عبادت کا درجہ حاصل ہے اسی لیے وہ عورت کو دل بہلانے اور جذب کی تسکین کا سامان سمجھتے ہیں وہ عورت کو صرف پیار، محبت کے لیے مخصوص کرنا چاہتے ہیں اسی لیے پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ :

> "جوش کا احساس حسن رچا ہوا ہے جمالیاتی
> اور حسی شعور ہے وہ انگاروں سے دہکی اور
> پنکھڑیوں سے مہکی ہوئی جوانی کے علم بردار
> ہیں"[2]

جوش کی انقلابی شاعری میں بھی رومانوی رنگ نمایاں ہے۔ ان کا جوشیلا رویہ ہم وطنوں میں وطنیت اور قوم پرستی کا جذبہ پیدا کرنے میں ضرور

[1] اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ محمد حسن صفحہ ۲۵ [2] اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ محمد حسن

کامیاب ہو جاتا ہے مگر جوش کا تصورِ معاش کسی سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے حد درجہ جوش اور انتہا پسند خیالات کا انجام ہے۔ جوش اور دوسرے رومانوی شاعروں کے علاوہ مہدی افادی، حفیظ اور سجاد انصاری وغیرہ نے بھی رومانوی انداز سے اردو ادب کی خدمت میں حصہ لیا۔

رومانویت کے پہلو پر غور و فکر کرنے سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے کہ ادبی دنیا میں رومانویت کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ دراصل مواد، فن، موضوع، طرزِ ادا، تشبیہ و استعارہ، صنائع و بدائع اور ترکیب الفاظ میں رونما ہوتا ہے۔ اس راہ پر چلتے ہوئے شاعر اور ادیب انتہا پسندی اور جذباتیت میں اس قدر گم ہو جاتا ہے کہ وہ اصل مقصد سے بے بہرہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ چوں کہ رومانوی ادیب اور شاعر لامحدود اور لامتناہی دنیا کی سیر کرتے ہیں اس لیے عملی دنیا میں وہ کامیاب نہیں ہوتے اور اداسی و کرب ہی ان کے ہاتھ آتا ہے۔ ان کی شخصیت کا کوئی پہلو یاس و حسرت سے خالی نہیں رہتا۔ وہ اپنی تصوریت اور ماورائیت کی وجہ سے ہمیشہ غمِ جاناں کو غمِ زندگی سمجھ کر لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں اور معانی، ہیئت، طرزِ ادا اور ہر طرح کی اختراعات کی طرف جھکاؤ ہوتا ہے۔ ان میں چاند اور ستاروں کو زمیں پر اتار لانے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ رومانوی ادیبوں کی غم پرستی کے سلسلے میں محمد حسن لکھتے ہیں کہ:

> "رومانی ادیبوں اور شاعروں نے اداسی، درد اور کرب کو اپنی شخصیت کا جوہر بنایا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کا کوئی پہلو بھی درد اور اداسی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ کہیں خود موت کی آرزو کرتا ہے کہیں جوان مرگی کو مبارک بتاتا ہے۔ وہ اپنی محبوباؤں کو یا تو کسی دیو قامت اساطیری کے آہنی قلعوں میں مقید اور منتظر تصور کرتا ہے یا فراق کا گیت گاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ زندگی درد ہے انسانی جذبے اور حقیقت کے درمیان ایک مسلسل جنگ ہے اور اس کے زخموں کو وہ پھول سمجھ کر چومتا ہے اور اسی میں زندگی کا کیف اور حسن محسوس کرتا ہے۔"[1]

اس طرح اس مختصر جائزے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رومانویت پسندی میں مثبت اور منفی دونوں پہلو شامل ہیں۔ بے عملی کی دنیا میں جاکر پناہ حاصل کرنا اور ماحول سے اکتا کر فرار اختیار کرنا منفی رومانویت کی نشاندہی کرتا ہے لیکن زندگی کی دشواریوں سے آنکھیں چار کرنا اور اس کے حقائق کو چیلنج سمجھ کر اس کا مقابلہ کرنا مثبت رومانویت ہے۔

غرض رومانوی اثرات نے ادب بالخصوص اردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ایسے دور میں جب ہندوستان غلامی کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا رومانوی ادیبوں نے جمالیات اور فن کے تقاضوں پر زور دیا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو ادب میں بندھے ٹکے اصولوں سے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی فن و جمالیات کے پہلوؤں پر زور دیا جانے لگا۔ اس کا یہ اثر بھی ہوا کہ انھوں نے پرانے بت توڑ کر تصور اور تخیل کی رنگین دنیا بسائی جہاں سخت گیری کی بجائے نزاکت کا بول بالا تھا۔ ●

---

[1] اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ ڈاکٹر محمد حسن ص ۱۷

بقیہ: بچت اور کفایت شعاری کا مطلب، اہمیت و افادیت

کی استعمال ہونے والی چیزیں اکٹھا خرید کر زیادہ سے زیادہ بچت کر سکتی ہیں۔ آف سیزن میں اونی، سوتی دیگر کپڑے اور چیزیں کم دام میں خرید کر رکھ سکتی ہیں جب کہ وہی چیزیں سیزن میں دوگنے داموں میں ملتی ہیں اور یہ ضرب المثل بہت ہی مشہور ہے کہ "بوند بوند سے سمندر بنتا ہے"۔ تھوڑی تھوڑی بچت اور کفایت شعاری سے ضرورتوں کو پورا کرنا ایک دن ہمارے لیے بہت بڑا ذخیرہ ہو سکتا ہے۔ کفایت شعاری سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے ہمیں پیسہ خوب محنت سے کمانا بھی ہے اور اس کی حفاظت کرتے ہوئے اس کا صحیح اور مناسب جگہ استعمال بھی کرنا ہے تاکہ ہم اور ہمارا ملک ترقی کر سکیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بچت (SAVING) اور کفایت شعاری دونوں کی ہماری روزانہ کی زندگی میں کافی اہمیت ہے اور افادیت بھی۔ بغیر بچت کیے اور کفایت شعاری کے ہم مستقبل کی زندگی کا کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کر سکتے۔ بچت اور کفایت شعاری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ ایک سکے کے دو پہلو کے مانند زندگی میں شامل ہیں۔ روشن مستقبل کے لیے بچت اور کفایت شعاری نہایت ہی ضروری ہے۔ تبھی ہم اقتصادی، سماجی اور سیاسی طور پر مضبوط ہو سکتے ہیں اور دنیا میں اپنا اور ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں کیوں کہ کسی ملک کے شہری ہی اس ملک کو مضبوط و توانا بناتے ہیں اور یہ طے شدہ بات ہے کہ جو ملک اقتصادی اعتبار سے مضبوط ہوگا وہی طاقتور ملک ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مل کر ملک کو مضبوط و توانا بنائیں تاکہ ہمارا ملک دنیا میں روشن ہو اور ترقی کے راستے پر گامزن ہو سکے۔ ●

بقیہ کور ۲: بھارت کی خود انحصاری کی علامت

لیباریٹریوں، بھارتی فضائیہ، علمی اداروں، قومی رسدگاہوں اور پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر کی صنعتوں کو بھی ہلکا کمبیٹ طیارہ تیار کرنے کے کام میں شریک کیا گیا اور ان کا تعاون حاصل کیا گیا ہے۔

ہلکے کمبیٹ طیارے کی صورت میں ایک پیچیدہ اور بے حد قابل اعتماد دیسی سسٹم تیار کیا گیا ہے جو آئندہ صدی کے اوائل میں ملک کی ضرورتیں پوری کرے گا۔ یہ طیارہ بنانے کی کوششوں کی بدولت ملک کی تکنالوجیکل صلاحیتوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ کئی اور شعبوں میں ان صلاحیتوں کا وسیع تر استعمال کیا جا سکے گا۔

مختصر یہ کہ ایل۔ سی۔ اے اکیسویں صدی کے بھارت کی خود انحصاری کی علامت ہے۔ یہ صفِ اول کا ایسا دیسی سسٹم ہے جس پر بھارتی فضائیہ ناز کر سکے گا۔

ڈاکٹر شبانہ نذیر

بڑے دروازے والی

(مزاحیہ)

"امی "بڑے دروازے والی" نے بڑا ستایا ہے، جب دیکھو بچہ دروازے پر کھڑا ہے۔" امی نے فلاں چیز منگوائی ہے کہا ہے اس وقت دے دیجئے جلدی ہی واپس کر دیں گے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔" آٹا، دال، چاول، چینی، ماچس کی ڈبیہ، تاگے کی گٹی اور کیا کیا گنواؤں اور ہاں آج تو دوا بڈے سے ہی منگوا بھیجئے۔"

"بہن میں تو اس نیک بخت کو جب بھی کچھ دیتی ہوں تو یہی سوچ کر دیتی ہوں کہ واپس ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ویسے بات تو یہی ہے مگر جب وہ ہر بار یہ کہلواتی ہے کہ فوراً واپس کر دوں گی تو یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ مانگ نہیں رہی ہیں بلکہ ادھار لے رہی ہیں"۔۔۔ "ہاں نہیں لیتی تو وہ ادھار ہے ہیں مگر کیا کریں جب بھی واپس کرنا چاہتی ہیں شیطان ورغلا دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ پڑوسی کا سب سے زیادہ حق ہے۔ پھر کیا یہ ذرا ذرا سی چیزیں واپس کر کے ان لوگوں کو شرمندہ کرنے چلی ہو۔ کچھ ان کے جذبات کی قدر کرنا سیکھو۔ شرافت کا تقاضا تو یہی ہے کہ" بھول جایئے پڑوسیوں سے ادھار لے کر۔"

اس قسم کی باتیں آپ نے اکثر سنی ہوں گی اور مجھے امید ہے کہ آپ کے آس پاس بھی کوئی نہ کوئی بڑے دروازے والی ضرور بسی ہوں گی۔ گستاخی معاف۔۔۔ ہو سکتا ہے آپ میں سے ہی کوئی "بڑے دروازے" والی ہو۔ ارے جناب ناراض نہ ہوں نہ میرا روئے سخن آپ کی طرف ہے اور نہ ہر "بڑے دروازے والی" ایسی ہوتی ہے۔

خیر جناب جن کی چیز گئی اس سے ہمیں پوری پوری ہمدردی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسی شخصیتیں پورے محلے میں گفتگو کا موضوع بنی رہتی ہیں۔ جہاں دو لوگ جمع ہوئے کہ شروع ہوا ان کا ذکرِ خیر۔ اور ذرا ان لوگوں کے دل سے بڑے دروازے والی کی اہمیت پوچھیے جن کے پاس خالی وقت زیادہ اور گفتگو کے موضوعات کم ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کچھ نئے واقعات سنا کر کچھ پرانی وارداتیں دہرا کر اور کچھ جھوٹی سچی گڑھ کر اپنے خالی وقت کا بڑا حصہ گزار ہی دیتے ہیں اور وہ لوگ جو اب تک ان کا شکار نہیں بنے یا وہ جو ہر حال میں خوش رہنے کی قسم کھا چکے ہیں خوب لطف لیتے ہیں۔ بہرحال محلے میں ہنسنے ہنسانے کا اچھا خاصا مصالحہ تیار ہو جاتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ پڑوسیوں کا جہاں یہ فرض ہے کہ ان بڑے دروازے والی صاحبہ کو جس چیز کی ضرورت ہو فوراً مہیا کریں اور پھر واپس مانگنے کی جرأت نہ کریں اس کے علاوہ ان کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ ان صاحبہ کو تفریحی ٹیکس ادا کیا کریں۔

پیٹھ پیچھے تو ان کے خوب قصیدے پڑھے جاتے ہیں مگر کسی کی کیا مجال کہ سامنے چوں بھی کر جائے اور اس پر طرہ یہ کہ جب وہ کسی سے ملتی ہیں تو پایا تو اس مسئلہ کو بالکل ہی نظر انداز کر جاتی ہیں نہیں تو پھر یوں شروع ہوتی ہیں۔

"آپ کو اس دن بڑی زحمت دی، فلاں چیز منگوائی تھی، بہت بہت شکریہ۔ اگلے دن سے ہی برابر بھیجنے کی سوچ رہی ہوں مگر مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ بار بار بھول جاتی ہوں۔" دوسرے کو شرماحضوری میں یہی کہنا پڑتا ہے، "ارے چھوڑیئے آجائے گی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کوئی بھاگی تھوڑے ہی جا رہی ہے" اور وہ جھٹ بول اٹھتی ہیں "ہاں بہن یہ تو ہے ہی ضرورت میں اگر پڑوسی ہی کام نہ آئیں گے تو اور کون آئے گا۔ میں تو کہتی ہوں پڑوسی سگے بھائی بہن سے بھی بڑھ کر ہوتے ہیں۔" سامنے والا دل ہی دل میں صرف یہی کہہ پاتا ہے۔۔۔ مارے گئے شرافت میں۔۔۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے کوئی نہلے پہ دہلہ لگانے والا مل گیا اور اپنی دی ہوئی چیز واپس مانگنے کی جرأت کر ہی بیٹھا تو ہزار بار منگوانے اور چکر لگانے کے بعد ہار کر وہ یہی کہہ کر سر پکڑے گا" ناحق کہہ کر بات بھی کھوئی" اور اگر خدانخواستہ کسی کی چیز واپس کر بھی دی گئی تو اس کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ پہلے تو بس یہی رونا تھا کہ چیز واپس نہیں آئی ہے مگر یہاں تو انھوں نے چیز بھی واپس کر دی مگر اس حالت میں کہ اس کا آنا نہ آنا برابر ہی رہا۔

مالِ مفت دلِ بے رحم۔ یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ مزہ تو تب آتا ہے جب ان بڑے دروازے والی کا ٹکراؤ کسی لاپروا اور بھلکڑ سے پڑ جاتا ہے۔ یا ان لوگوں سے جن کا گھر زیادہ تر نوکروں کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ ایک ہماری دوست ایک دن ہم سب کو اپنے گھر لے گئیں کہ چلو بہت دن سے گپ شپ نہیں ہوئی چائے کے ساتھ ذرا گپ شپ کا پروگرام ہو جائے۔

۵۴۶/۸۔ لودھی کالونی، نئی دہلی، ۳ ۱۱

ابھی ان کے گھر پہنچے مشکل سے پانچ دس منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ نوکر نے کمرے کے دروازے پر آکر اپنی مالکن کو ادب سے بلانے کا اشارہ کیا اور پھر ایک لمحہ بعد ہی ہماری دوست کی سخت آواز ہمارے کان کے پردے سے ٹکرائی "مجھے کیا معلوم سارا دن گھر میں تم رہتے ہو کہ میں؟ اور پھر وہ صاحبہ غصہ میں بڑبڑاتی ہوئی، پیر پٹختی ہوئی واپس ہمارے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ آناً فاناً ماحول بدل گیا اور ہر طرف غصہ کی جھنجھناہٹ بکھر گئی، پتا یہ چلا کہ الماری میں چائے کے سیٹ کا ڈبہ تو موجود ہے مگر اس میں سے سیٹ غائب ہے۔ ذرا سی دیر دم لے کر وہ پھر پیر پٹختی ہوئی باورچی خانے کی طرف گئیں۔ پھر واپس آکر کھڑی ہوگئیں۔ ان کا دس بارہ سال کا بیٹا ماں کی یہ حالت دیکھ کر سہم سا گیا اور آہستہ سے بولا "ممی جب کل میں کھیلنے کے لیے راجو کو بلانے گیا تھا تو اس کے گھر میں (یعنی بڑے دروازے والی کے گھر میں) لوگ بالکل ایسے کپ میں چائے پی رہے تھے جیسے ہمارے یہاں تھے۔ ممی آنٹی نے تو اس کپ میں مجھے بھی چائے پلائی تھی۔"

بچے کی اس بات نے جیسے جلتی ہوئی آگ پر پانی ڈال دیا ہو۔ انھیں یاد آیا کہ پچھلے دنوں جب نوکر چھٹی پر گیا ہوا تھا اور ایک دن وہ جلدی جلدی دفتر جانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں کہ بڑے دروازے والی کے یہاں سے چائے کے سیٹ کا بلاوا آیا تھا۔ سیٹ دے کر یہ صاحبہ بھول گئیں اور انھیں کیا غرض پڑی تھی کہ وہ یاد رکھتیں۔

خیر جناب سیٹ واپس منگوایا گیا اور ضرور کوئی ایسا جملہ کہلوایا ہوگا کہ سیٹ فوراً واپس آبھی گیا اور ڈرائنگ روم کی میز پر سجا دیا گیا کچھ طشتریاں غائب تھیں جو بچی تھیں وہ زخمی حالت میں۔ پیالیاں تو قریب قریب سب ہی زخمی تھیں، چائے دانی تو موجود تھی مگر ڈھکن غائب تھا۔ دودھ دانی اور چینی دانی تو چھوٹی موٹی چیزیں ہیں ان کا تو وجود ہی نہیں تھا۔ بچا کھچا سامان اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ سیٹ واقعی مہنگا تھا۔ ماحول پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب ہی سیٹ کا جائزہ لینے میں محو تھے۔

اب آپ اندازہ لگائیے ہمارا تو خیر کیا ان صاحبہ کا جنھوں نے بڑے خلوص سے ہم سب کو چائے پر مدعو کیا تھا۔ غصہ اور شرمندگی کی ایک عجیب کیفیت ان پر طاری تھی وہ دانت پیس رہی تھیں کبھی سیٹ کو دیکھتی تھیں اور کبھی ہمیں۔ اور جب انھیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں تو وہ کچھ ٹھنڈی ہوئیں اور پھر اچانک ان کے منہ سے نکلا "پھٹکار ہو ان لوگوں پر جو بھول جاتے ہیں پڑوسیوں سے ادھار لے کر" اسی لمحہ ان کا نوکر بڑے میں سجے ہوئے چائے کے گلاس اور "وائے" کا سامان لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ ہم جو چائے کی امید چھوڑ چکے تھے ہم نے چائے دیکھ کر راحت کی سانس لی۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دبی دبی سی مسکراہٹ سب کے چہروں پر عیاں ہوگئی اور ہماری میزبان نے کھڑے ہو کر سب کو چائے دی اور بولیں "چلو یار چائے تو چائے ہے لوں چائنا کے سیٹ میں نہ سہی گلاسوں میں ہی سہی اور پھر ہم سب بڑے دروازے والی کے ساتھ جینا سیکھ ہی گئے ہیں۔

تکلف برطرف میں خود کافی بھلکڑ ہوں، اکثر چیز دے کر بھول جاتی ہوں مگر خیال رہے پڑوسیوں سے ادھار لے کر کبھی نہیں بھولتی۔ البتہ میرے پڑوس میں ایک بڑے دروازے والی ضرور بستی ہیں اور میں اکثر ان کا شکار بن جاتی ہوں۔ ہر بار تو بہ کرتی ہوں مگر پھر بہک جاتی ہوں۔ ایک دن اُن صاحبہ نے ہماری سلائی کی مشین منگوائی بچہ پیغام لے کر آیا اور رستے کے ماموں کو وزن اٹھانے کے لیے ساتھ لایا۔ "امی نے کہلوایا ہے کہ ذرا ایک دن کے لیے اپنی سلائی کی مشین دے دیجیے ہماری مشین اچانک خراب ہوگئی ہے۔ کل واپس کر دیں گے۔" ہم نے ایک اچھے پڑوسی ہونے کے ناطے فوراً مشین دے دی۔ ان کا کام تو مشین منگوانے کے بعد ختم ہوگیا اور اب باری آئی ہماری لاپروائی کی اور باتوں کی طرح یہ بھی بھول گئی کہ مشین واپس منگوانا میرے فرائض میں شامل ہے۔

اُدھر مشین گئی اور اِدھر شروع ہوگئی عید کی آمد آمد۔ روزے، عبادت، شاپنگ اب کیا کیا یاد رکھا جائے۔ خیر صاحب عید کی تیاری شروع ہوئی، ساڑی خریدی گئی، بچوں کے کپڑے ریڈی میڈ خریدے گئے۔ شوہر کے کپڑے درزی نے وقت پر تیار کر دیے۔ عمدہ کرتا بازار سے خریدا گیا اور لے دے کے بچا شوہر کا پاجامہ جو گھر میں سلنا تھا اور ایک پاجامہ کا سلنا ہی کیا آدھے گھنٹے میں پاجامہ تیار ہو جاتا ہے۔ ٹلتے ٹلتے چاند رات ہوگئی لیکن پھر بھی اطمینان تھا کہ ایک پاجامہ ہی تو ہے۔ خیر سب کام پورا کرنے کے بعد باری آئی پاجامہ سلنے کی اور جیب سینے چلی تو سر دھن لیا۔ پیروں تلے کی زمیں کھسک گئی۔ اب کروں تو کیا کروں اور یہ تو سارا محلہ جانتا ہے کہ "بڑے دروازے والی" عید کرنے لکھنؤ جاتی ہیں۔ یاد آیا جب مشین منگوائی تھی اس کے دو چار روز بعد ہی تو سب نے دیکھا تھا کہ ٹیکسی میں وہ لوگ گئے تھے تمام تیاریاں پوری کر کے۔ آخر مشین تھی ان کے پاس۔

سوال یہ تھا کہ اب میں کیا کروں۔ سوائے اس کے کہ پرانے پاجامے کو دھویا جائے اور کوئی چارا نہ تھا۔ خوب نیل کلف دے کر رات گئے پاجامہ دھو کر پھیلایا گیا۔ صدمہ برداشت کرنے سو چیے اور پھر پاجامہ دھونے میں اتنی دیر ہو چکی تھی کہ پاجامہ صبح تک سوکھ ہی نہیں پایا۔ پورے ایک گھنٹہ پریس کرتے رہنے کے بعد تو پاجامہ سوکھا اور جب نئے سفید براق کرتے کے ساتھ ہمارے شوہر نامدار وہ سفید ہونے کی ناکام کوشش کرتا ہوا پاجامہ پہن کر سامنے آئے تو میری گردن شرم سے جھک گئی اور میں دبے لہجے میں صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

"یہ بڑے دروازے والی" کی مہربانی ہے اور میرے شوہر نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور کہا "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے آخر پڑوسیوں کا بھی تو کچھ حق ہوتا ہے۔"

میں تو کئی مرتبہ اس حالت کو سوچ سوچ کر لطف اندوز ہوتی ہوں کہ کیا سماں ہوگا اگر ان بڑے دروازے والی کا ٹکراؤ کسی ایسی سے ہو جن کے لیے کہا جا سکے "لطف آئے گا جو ٹکرائیں گے دروازے دو" اگر جناب آپ کا اتفاق یہ نادر نظارہ دیکھنے کا ہو تو مجھے اطلاع ضرور بھجوائیں۔ ●

غزلیں

مصوّر سبزواری

جو مہرباں افق کے کنارے سے ہو جاتے
اداس خواب بھی نیلے پرندے ہو جاتے

اسی میں خیر تھی پھر تم سے مل سکے نہ کبھی
پلٹ کے ملتے تو جسموں کے سائے ہو جاتے

عجب خوف تھا میں نے ہی ہاتھ روک لیا
یہ نقش ورنہ ابھی زندہ چہرے ہو جاتے

گلے لگاتا نہ اس کو جو احتیاط سے میں
بدن کی شال کے گل سب ستارے ہو جاتے

یہ چاند تارے، شفق، پھول، ابر اور پہاڑ
جو بچے چھوتے تو چنچل کھلونے ہو جاتے

وہ میرے کپڑوں پہ کچھ لمس چھوڑ جاتا تھا
اسے بھلائے ہوئے جب زمانے ہو جاتے

پوسٹ آفس لوح، ضلع گوڑگاؤں (ہریانہ)

یعقوب عامر

زندگی میں اس کو کیا کیا چاہیے
آج کا انساں دیکھا چاہیے

ہاتھ آجائے وسیلہ کیا ضرور
ہر ضرورت کو وسیلہ چاہیے

ہم کو مژدہ ہے صدی اکیسویں
کچھ دلوں اب اور جینا چاہیے

مت کرو راہوں میں دیواریں کھڑی
چلنے والوں کو بھی رستہ چاہیے

نام کی تشہیر گو شہرت نہیں
دوستوں کو نسخہ سستا چاہیے

جن کو عامر آزمایا بارہا
اب انھیں کیا آزمانا چاہیے

غالب اپارٹمنٹس۔ پروانہ روڈ۔ پیتم پورہ، دہلی۔۳۴

شاہد اختر

اب نہ وہ دل نہ چراغِ شب وقت روشن
ہے عجب سلسلۂ حرفِ ندامت روشن

در و دریچہ ہی منور ہے نہ اب چھت روشن
خانۂ دل میں ہوئی کیسی بغاوت روشن

اب نہ وہ طاق نہ قندیلِ محبت روشن
گام در گام ہیں آثارِ قیامت روشن

میرے دالان میں اب خارِ تمنا بھی نہیں
اس کی دہلیز پہ گلہائے عقیدت روشن

جیسے تیسے ہی گزرتے ہیں شب و روز مگر
ہر خرابے میں ہے اختر تری شہرت روشن

مغلپورہ، سہسرام، بہار

غـــــــــزلیں

واجد سحری

میں کہیں، نہ رُکا روتا ہوا چھوڑ گیا
سنگ دل پیار بھرے دل کو مرے توڑ گیا

بے وفا لوگ اسے کہتے تھے لگتا تھا بُرا
اب وہی شخص مرے پیار کا رُخ موڑ گیا

یہ بھی اُٹھے ہوئے طوفاں کا ہے احساں بہت
لاکے ساحل پہ جو ڈوبے ہوئے کو چھوڑ گیا

پھر بہار آئے گی پھر شاخیں سجیں گی لیکن
ہائے وہ دل جسے پہلے ہی کوئی توڑ گیا

آج کے راہبروں سے ہے وہ جگنو بہتر
راہِ تیرہ میں جو کچھ روشنیاں چھوڑ گیا

فکر لٹنے کی نہ رہزن کا ہے شکوہ واجد
دکھ تو اس بات کا ہے ساتھ کوئی چھوڑ گیا

۲۸۔بی۔طبیہ کالج، قرول باغ۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۵

سُدھیر کمار پرواز

ایک پل بھی جب میرا کٹتا نہیں آرام سے
کیوں نہ ہو نفرت مجھے آسائشوں کے نام سے

آدمی ہی تو ہوں میں آخر کوئی پتھر نہیں
جو جیتا کب تک رہوں میں گردشِ ایام سے

بھوک اور غربت کے مارے یہ کروڑوں آدمی
کیا زمانے میں کبھی بھی پائیں گے آرام سے؟

زندگی میں آپ کا دامن نہ چھوڑوں گا کبھی
اب ڈرائے لاکھ دنیا پیار کے انجام سے

آپ جب اپنی نگاہوں سے پلا دیتے ہیں پھر
مجھ کو پینے کی ضرورت ہے بھلا کیا جام سے؟

عشق کر کے کیا ملے گا آپ کو غم کے سوا
کچھ نصیحت لیجیے پرواز کے انجام سے

جاٹو نگر سہارنپور۔ ۲۴۷۰۰۱

ضمیر یوسف

طوفاں ہے، بارش بھی ہے، بجلی ہے ہوا ہے
اک تنہا مسافر کئی خطروں میں گھرا ہے

منزل ہے نگاہوں میں نہ رستے کا پتا ہے
"ہر شخص یہاں سوچ کے صحرا میں کھڑا ہے"

سینے میں وہ ہنستے ہوئے زخموں کو چھپا کر
دنیا کو تبسم کی کرن بانٹ رہا ہے

اس دور کے انسان سے الفت کی تمنا؟
کیوں وہم کے صحرا میں شجر ڈھونڈ رہا ہے

وہ اپنے حد و حال سے انجاں ہے لیکن
اوروں کے لیے شہر میں آئینہ بنا ہے

دیکھا ہے ضمیر آنکھوں نے ایسا بھی تماشہ
شعلوں سے جو ڈرتا تھا وہ شبنم سے جلا ہے

۲/۲۷۶۔ ایس سی۔ روڈ پلاٹ نمبر ۵ بی گارڈن ہاؤڑہ۔ ۳ (ویسٹ بنگال)

تبصرے

کتاب کا نام ۔ انسائیکلوپیڈیا آف مسلم ورلڈ ۱۹۹۶ء (انگریزی)
ایڈیٹر محمد ناصر جاوید
سائز ۔ ڈیمائی
قیمت ۔ پیپر بیک ۔/295 روپے، ہارڈ باونڈ ۔/۴۰۰ روپے
پبلیشر ۔ میڈیا لائن C/51-A، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مبصر خورشید عالم

تین سال کی مستقل جدوجہد کے بعد خوبصورت دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ۸۰ صفحات پر مشتمل انسائیکلو پیڈیا آف مسلم ورلڈ، کئی لحاظ سے اہم ہے، جہاں یہ اپنی نوعیت کی منفرد اور پہلی کوشش ہے وہیں مختلف ادوار میں مسلمانوں کی ترقی کی مکمل تاریخ ہے۔ یہ معلومات افزا کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جہاں ایک حصہ اسلام کا تعارف کراتا ہے وہیں اس کے ذریعہ قائم حکومتوں اور موجودہ دور میں قائم مسلم ممالک کا تعارف بھی ہے۔ سماجی، معاشی، سائنسی و تکنالوجی اور اسپورٹس کے شعبوں میں مسلمانوں کے ذریعہ کیے جانے والے کام پر روشنی ڈالی گئی ہے بوسنیا و ہرزیگووینا، چیچنیا اور فلسطین جیسے موضوعات کو سال رواں کا عنوان قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی جمہوریاؤں کے دولت مشترکہ سے بیرونی تعلقات پر بھی خصوصی مضمون ہے۔ ایک مخصوص ٹاپیلو سیکشن ہے جس میں اہم کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

یہ کتاب سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے جس میں مختلف شعبوں میں مسلمانوں کی ترقیات پر توجہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

معاشرت، معیشت اور سائنس و تکنالوجی پر تین اہم ابواب ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان شعبوں میں مسلمانوں نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ معاشرت والے حصے میں دیگر موضوعات کے علاوہ تعلیم، یونیورسٹیز اور اس سلسلے میں ہونے والے اہم کام مثلاً آبادی، مسلم تنظیم اور مسلم دنیا میں سینما میں مسلمانوں کے رول پر بھرپور مواد موجود ہے اس کے علاوہ دنیا میں بڑی تعداد میں پائے جانے والے مہاجرین کا بھی ذکر ہے۔

معیشت والے شعبے میں پٹرول کی نعمت سے مالامال مسلم ممالک اور ان کی صنعتی ترقی بحث کا موضوع ہے اسی کے ساتھ ساتھ پٹرول کی کاشت کاری، سیر و سیاحت، معاشی صورت حال، معاشی تنظیمیں اور مختلف ادوار میں پائے جانے والے سکوں کا تعارف ہے۔ اس ضمن میں بلاسودی اسلامی بینکوں کے سسٹم کا پورا تعارف کرایا گیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بلاسودی بینک کاری بہت تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔

تیسرا اہم باب سائنس و تکنالوجی کا ہے جس میں مسلم ممالک میں سائنسی و تحقیقی اداروں کی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اسپورٹس میں مسلمانوں کی کارگزاریوں کا حصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ قومی و بین اقوامی سطح پر مسلمانوں کی شمولیت اس بات کا اشارہ کرتی ہے کہ زندگی کے اس میدان میں بھی مسلمان کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

ایک بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اس انسائیکلو پیڈیا کو ہر سال نکلنے والی ایک معلوماتی اور دستاویزی کتاب بتایا گیا ہے لیکن اس میں پیش کردہ اعداد و شمار اور مختلف شعبوں میں ہونے والے واقعات ۱۹۹۴ء تک ہی لیے گئے ہیں۔ ان خامیوں کے باوجود انگریزی کے جواں سال صحافی محمد ناصر جاوید اس بات کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بے سروسامانی میں اس طرح کی کوشش کرکے مختلف معلومات کو جمع کرنے کا ایک قابل ستائش سلسلہ شروع کر دیا ہے امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ پبلیشر سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ اگلے ایڈیشن میں اس کو UPDATE بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی اور یہ ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کہ اتنے قیمتی کام کو زیادہ بہتر طباعت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اپنی نوعیت کی منفرد، معلومات افزا، علمی و تحقیقی ذخیرے کی حیثیت سے یہ کتاب ایسی ہے جو ہر گھر کی زینت بن سکتی ہے جہاں یہ کتاب عام لوگوں کے لیے باعث کشش ہے وہیں علمی، تحقیقی اور ذرائع ابلاغ کے حلقے کے لیے ناگزیر محسوس ہوتی ہے۔ ●

نام کتاب ۔ گلدستہ
شاعر امین حزیں
قیمت ۔ ۲۰ روپے
ملنے کا پتا ۱۰۶۲، ماناپیٹھ پونہ مہاراشٹر

مبصر ۔ عادل اسیر دہلوی

جناب امین حزیں بچوں کے بزرگ

شاعر ہیں۔ زیر نظر کتاب "گلدستہ" سے پہلے وہ بچوں کی خدمت میں دو کتابیں "نگینے" اور "شگوفے" پیش کر کے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ دونوں کتابوں پر بالترتیب انعامات بھی ملے۔

اب کافی عرصہ بعد حزیں صاحب نے بچوں کے منظوم ادب میں اپنی تیسری کتاب "گلدستہ" کے نام سے پیش کی ہے، جس کی اکثر و بیشتر نظمیں ملک کے موقر اخبارات اور بچوں کے رسائل میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ علاوہ ازیں امین حزیں صاحب نے بچوں کے لیے نثر میں بھی کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

"گلدستہ" میں شامل نظموں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جناب حزیں بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ لفظوں کے انتخاب میں بچوں کی استعداد کا خیال رکھتے ہیں اور بچوں کے مزاج کے مطابق کسی واقعے یا خیال کو دلچسپ انداز میں نظم کرنے کی کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

کتاب بہت خوب صورت چھپی ہے اور تقریباً ہر نظم کے ساتھ رنگین تصاویر نے کتاب کی جاذبیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ●

نام کتاب :	بچوں کے اقبال
مؤلف .	عادل اسیر دہلوی
سنہ .	(درج نہیں ہے)
قیمت .	۱۱ روپے
پبلیشر :	سورج پرکاش، ۱۲۰۴-۱۲۰۴، چیلی قبر، نئی دہلی۔ ۶ ۱۱
مبصر .	خورشید عالم

عادل اسیر دہلوی نے اقبال کی ان ۱۵ نگارشات کو جو بچوں کے لیے مفید ہو سکتی ہیں یکجا کر کے "بچوں کے اقبال" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ڈاکٹر اقبال کی سوانح حیات پر ایک مختصر سا تعارفی مضمون ہے جس کے بعد "بچوں کے اقبال" کے عنوان سے اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ادب اطفال کے میدان میں اقبال کی اہمیت و افادیت کیا ہے: "اگرچہ اقبال نے بچوں کے لیے کم لکھا ہے لیکن اس مختصر منظوم کلام سے بھی یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان کو بچوں سے ایک خصوصی تعلق تھا۔ وہ بچوں کی اہمیت سے واقف تھے۔ ان کی نظر میں بچوں کی تربیت بھی ضروری تھی جب ہی تو انھوں نے بچوں کے لیے نصیحت آموز اخلاقی نظمیں لکھیں۔"

مؤلف نے اقبال کی نظموں کا تعارف کراتے ہوئے بعض غیر محتاط باتیں بھی کہی ہیں: "جہاں تک ہو سکے نیکی کرو۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی نظم 'بارش کا پہلا قطرہ' سے ماخوذ نظر آتی ہے ... 'محنت' اور 'بچوں کے لیے چند نصیحتیں' ایسی نظمیں ہیں جن میں موجود بعض اشعار کے خیالات مولانا الطاف حسین حالی کے کلام میں بھی مل جاتے ہیں۔" "بچوں کے اقبال" میں بانگ درا کی ۹ نظموں اور ۶ غیر مدون نظموں کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ ان ۱۵ نظموں میں سے ۶ پر علامہ نے خود ہی "ماخوذ" کی نشاندہی کر دی ہے۔

مؤلف نے نظموں کے انتخاب میں بچوں کے معیار فہم کو مدنظر رکھا ہے لیکن کوئی ایسی فہرست پیش نہیں کی ہے جس میں مشکل الفاظ کے معانی دیے گئے ہوں۔ زیر نظر کتاب کی افادیت یہ ہے کہ علامہ اقبال کی کچھ دلچسپ اور سبق آموز نظموں کا مجموعہ دستیاب ہے۔ ●

نام کتاب .	گلستاں کی کہانیاں
مؤلف	عادل اسیر دہلوی
سنہ	(درج نہیں ہے)
قیمت	۲ روپے
پبلیشر	سورج پرکاش، چیلی قبر، دہلی ۶
مبصر	خورشید عالم

ایک زمانہ تھا جب گلستاں اور بوستاں کو تعلیم کا جزو لاینفک سمجھا جاتا تھا کیوں کہ اردو دانی کے لیے فارسی و عربی کی شد بد اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی کہ انگریزی داں طبقہ کا یونانی اور لاطینی سے واقفیت ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اب وہ پہلے جیسے تو حالات نہیں رہے لیکن سعدی کی اہمیت ایک دوسرے پہلو سے بھی ہے: ادب، شائستگی اور حکمت و اخلاق ان کی نگارشات کا خاصہ ہے۔ گلستاں و بوستاں میں ایک خوبی اور بھی ہے کہ اس سے بچے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اسی خیال کے تحت عادل اسیر دہلوی نے گلستاں کی ۶ حکایتوں کا ترجمہ "گلستاں کی کہانیاں" کے عنوان سے کیا ہے۔

"گلستاں کی کہانیاں" عمدہ طباعت کا نمونہ ہیں، البتہ یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ بچوں کی نفسیات کے پیش نظر اگر کتاب میں وضاحتی خاکوں اور تصاویر و مناظر کو بھی پہلو بہ پہلو شائع کیا گیا ہوتا تو شاید کتاب زیادہ دلکش ہوتی۔ ترجمہ کی زبان بھی آسان ہے اور حکایتیں چوں کہ سعدی کی ہیں، لہٰذا دلچسپی تو رکھتی ہیں البتہ ترتیب کے لحاظ سے اگر مختصر حکایتیں یکجا ہوتیں تو بہتر تھا۔ سعدی کی حکایتیں بالعموم کسی منظوم نکتہ پر ختم ہوتی ہیں، مترجم نے ان کا منظوم ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ نثر میں ظاہر ہے کہ اتنی چاشنی باقی نہیں رہتی۔ پھر بھی بچوں کی وابستگی کا کافی سامان موجود ہے۔

سعدی کی حکایتیں چوں کہ ملوکیت زدہ معاشرہ کی ترجمان ہیں، اس لیے ان میں بہت سی غلط اور مفروضہ اقدار کی ترویج بھی ہوئی ہے۔ مترجم نے حکایتوں کے انتخاب میں اس بات کا خیال نہیں رکھا ہے کہ ملوکیت کی ترجمانی کرنے والی کہانیوں سے صرف نظر کیا جائے۔ اس سے کہیں کہیں عیب پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً چوتھی حکایت ہے "قزاق کا بیٹا بھی لٹیرا ہو گا"۔ بادشاہ سلامت کا یہ فیصلہ آج قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

دوپہر کے کھانے کی اسکیم کی توسیع

دوپہر کے کھانے کی اسکیم جو اگست ۱۹۹۵ء میں شروع کی گئی تھی اور پوری طرح سے مرکزی اسپانسر شدہ و مرکزی فنڈ سے چلنے والی اسکیم تھی، ۹۷-۱۹۹۶ء کے دوران اس کی توسیع اس ملک بھر کے ۴۴۴۶ بلاکوں تک کی جائے گی۔ ۹۸-۱۹۹۷ء تک اس اسکیم کے ذریعہ بقیہ تمام بلاکوں کا احاطہ کر لیا جائے گا۔ فی الحال یہ اسکیم ۲۴۹۹ بلاکوں میں چل رہی ہے۔

اس اسکیم کے تحت تیار غذا کی شکل میں تغذیہ یا سوکھے اناج کی شکل میں تقسیم کا کام ریاستی حکومتوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے جہاں اناج تقسیم کیا جاتا ہے، وہاں ایک بچے کو ایک ماہ میں تین کلوگرام اناج سال کے دس ماہ تک دیا جاتا ہے۔ فی الحال دوپہر کے کھانے کی اسکیم کے لیے اناج براہ راست فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے ذریعہ ضلع کی سطح پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اناجوں کی نقل و حمل کی مقامی لاگت کو سرکاری نظام تقسیم کے تحت دیے جانے والے اناج کی نقل و حمل کی شرحوں کے مساوی رکھا گیا ہے۔ تغذیہ پروگرام کا اہم مقصد غریب کنبوں کے تمام بچوں کو اسکول جانے سے قبل کی عمر میں اور پرائمری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو ہمہ گیر یکساں، موثر طریقے پر تغذیہ بخش کھانا فراہم کرانا ہے۔ ●

بھارت نے عمدگی کے لیے ایوارڈ حاصل کیا

حال ہی میں منعقدہ ہیبیٹیٹ کانفرنس میں بھارت نے یو این سی ایچ ایس کی ہدایات کے مطابق ہاؤسنگ و شہری انڈیکیٹر تیار کرکے عمدگی کے اعتراف میں دو مقتدر ایوارڈز حاصل کیے ہیں۔ یہ دونوں ٹول ہاؤسنگ و شہری امور کے پروگراموں کے بہتر و موثر انتظام کے لیے کارآمد ہیں۔ بھارت نے ترقی پذیر ممالک کی صف میں بہتر کارکردگی کے لیے ایوارڈ حاصل کیا اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر ۱۱۳ مندوب ممالک کی صف میں مجموعی کارکردگی کے لحاظ سے بہترین ملک کے طور پر ایوارڈ حاصل کیا۔

بھارت کو مذکورہ ایوارڈ غیر معمولی کوالٹی کے اعداد اور ایک خود کفیل پروسیس وضع کرنے کے لیے ملے ہیں۔ یہ پروسیس ابتدأ عطیات دینے والوں کے فنڈ سے چلی تھی بعد میں حتمی طور پر ریاستی و لوکل گورنمنٹس نے ایسی شہروں میں اس کے فنڈز فراہم کرائے۔ ●

سنگاپور میں این سی سی کیڈٹوں کی اچھی کارکردگی

این سی سی کیڈٹوں کی پانچ رکنی ٹیم جو آٹھ سے ۲۲ جون ۱۹۹۶ء کے دوران نوجوانوں کے تبادلہ پروگرام کے تحت سنگاپور گئی تھی نے اپنے وہاں کے قیام کے دوران میزبان ملک کو اپنی کارکردگی سے متاثر کیا ہے۔

سینئر انڈر آفیسر مونیتا پی جھلانی جو ڈوودرا کی ایم ایس یونیورسٹی کی طالبہ ہیں نے سنگاپور میں سالانہ تربیتی کیمپ کے دوران ۱۶-۱۰۱ رائفل فائرنگ کے لیے بہترین شاٹ کا انعام حاصل کیا۔

مونیتا کا تعلق نمبر ون ایر اسکوائڈرن نیشنل کیڈٹ کور وڈودرا سے ہے۔ دیگر مندوب ممالک میں کینیڈا، ہانگ کانگ، فلیپنز کے نام شامل ہیں۔

ونگ کمانڈر دلیپ منوہی کی قیادت میں کیڈٹ دہلی لوٹ آئے ہیں۔ انھوں نے این سی سی کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل آر موہن سے ملاقات کی۔ لیفٹیننٹ جنرل موہن نے انھیں توصیفی اسناد سے نوازا۔ ●

"اسپرٹ آف اولمپک" پر خصوصی ڈاک ٹکٹوں کا اجرا

"اسپرٹ آف اولمپک" پر دو کثیر رنگوں والے خصوصی ڈاک ٹکٹوں کا اجرا کیا گیا ہے۔ یہ ہر ایک ٹکٹ ۵ روپے کی مالیت کا ہے، جو اٹلانٹا میں آئندہ ماہ منعقد ہونے والے ۲۶ویں اولمپک کھیلوں کے موقع پر جاری کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک ٹکٹ پر ایتھینز کے مرمریں اسٹیڈیم کا عکس ہے جس کے پس منظر میں پار تھینوں (مندر) دکھایا گیا ہے۔ دوسرے ٹکٹ میں اولمپک مشعل جو پہلے کھیلوں کے اجتماع سے لائی جا رہی ہے، دکھائی گئی ہے۔

خصوصی شمارہ ، یوم آزادی ۹۶ء

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

فون : ۶۱۷۷۵۹۱

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : آرٹ سیکشن، پبلی کیشنز ڈویژن

جلد : 16 : مشترکہ شمارہ ۴ - ۵

جولائی - اگست ۱۹۹۶ء (۱۰ ساڑھ تا ۹ بھادوں ۱۹۱۸ شک)

قیمت خصوصی شمارہ : ۱۰/= روپے

زرسالانہ : ایک سال کے لیے : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرسالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں :

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) : ڈی۔ این۔ گانگلی

مضامین سے متعلق خط۔کتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو)، پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴، لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

ایک اہم زمرے پر توجہ کی ضرورت

مسافر وہی دیکھتا ہے جو اسے نظر آتا ہے، مگر سیاح وہ دیکھتا ہے جو
کچھ وہ دیکھنے کی غرض سے آیا ہے ——— گلبرٹ کیتھ چیسٹرٹن

صدیوں سے بھارت، بیرونی دنیا میں مختلف لوگوں کے لیے، مختلف وجوہ سے دلکشی کا مرکز رہا ہے۔ قدیم حملہ آوروں نے اسے بے پناہ دولت کی حامل ایک "سونے کی چڑیا" کے طور پر دیکھا جس تک رسائی آسان تھی۔ اہلِ علم اس کی صوفیانہ روحانیت اور گہرے فلسفے سے متاثر ہوئے جنھیں کچھ علم نہ تھا وہ اسے برہنہ فقیروں، سپیروں اور رسّی کا کمال دکھانے والے جادوگروں کی دھرتی تصور کرتے رہے، جب کہ دیگر لوگ محض اس کے قدرتی مناظر کی دلکشی و خوب صورتی اور نباتات و حیوانات کی حیرتناک اقسام سے مسحور ہوئے۔

برف پوش پہاڑوں کی کشش، گنگا اور برہم پُتر جیسے عظیم دریاؤں کی شان و شوکت، تھار کے ریت کے بارعب ٹیلے، گوآ کے خوب صورت ساحل اور ان کے ساتھ ساتھ عہدِ وسطیٰ کے مختلف قلعوں کی شانِ حسن، پوتر مندروں کا حسنِ تعمیر اور ہماری وراثت کے حامل آثارِ قدیمہ، جیسے مشہورِ عالم تاج کا سدا بہار، سحر اپنے اپنے ناقابلِ تقلید انداز میں ایک طویل زمانے سے دنیا کی سیر کرنے والوں کو اپنی طرف کھینچتا رہا ہے۔ یہاں کی مختلف النوع موسمیاتی حالتوں نے بھی سیاحوں کے سال کے ہر حصّے میں ہمارے ملک آتے رہنے کو ممکن بنایا ہے۔

عام طور پر، مذکورہ خوبیوں کے باعث ہندوستان کو ایک آدرش سیاحتی مرکز بن جانا چاہیے تھا، لیکن مختلف دشواریوں، جن میں چند علاقوں میں موجود بے استحکامی اور مناسب بنیادی ڈھانچے کی کمی سے لے کر جیتے جاگتے جدید ہندوستان کے بارے میں غیر ملکوں میں اب تک رائج غلط نظریات و تصورات کو دور کرنے کے لیے موثر اقدامات کا نہ ہونا شامل ہیں، کے باعث سیاحت کے فروغ میں روڑے اٹکے ہیں۔ یہاں ایک مثال پیش کرنا غیر موزوں نہ ہوگا۔ حال ہی میں سویڈن کے ایک سابق ورلڈ نمبر۔ ایک ٹینس کھلاڑی نے کلکتہ میں کھیلے جانے والے "ڈیوس کپ" میچ میں اپنے ملک کی طرف سے حصّہ لینے کے لیے بھارت آنے سے محض اس لیے انکار کر دیا کہ اسے ڈر تھا کہ اُسے یہاں کوئی مہلک بیماری لگ جائے گی۔

بہر حال، ان دشواریوں کے باوجود ٹورازم ملک کی ترقیات کے لیے ایک اہم وسیلے کے طور پر برقرار ہے ——— ایک زبردست غیر ملکی زرمبادلہ کمانے والا، روزگار کے وسیع مواقع پیدا کرنے والے اور ثقافتی تعلقات کو خلوص کے ساتھ بڑھاوا دینے والے وسیلے کی حیثیت سے ——— دستیاب اعداد و شمار کے مطابق ۹۶-۱۹۹۵ء میں سیاحت کے ذریعے کمایا گیا غیر ملکی زرمبادلہ ۹۰۰۰ کروڑ سے اوپر ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اس زمرے نے ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۷۵ لاکھ سے زائد اشخاص کو روزگار فراہم کیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دو برآمداتی میعاد والی صنعتوں یعنی سلے سلائے (ریڈی میڈ) کپڑے والے اور زیورات و

جواہر کی صنعت کے بعد یہ غیر ملکی زرمبادلہ کمانے والی تیسری بڑی صنعت ہے۔ سیاحت کی صنعت مذکورہ باقی دو صنعتوں سے اس لیے ممیز ہو جاتی ہے کہ اس کے برخلاف اُن دونوں صنعتوں کا درآمداتی عنصر کہیں بڑھا ہوا ہے۔

کیا ہمیں ان دل خوش کن اعداد و شمار کو دیکھ کر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا چاہیے جنہوں نے ملک کے سیاحتی منظر نامے پر جو بہت زیادہ شاندار نہیں ہے، ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا ہے؟ کیا ہمیں اس حقیقت سے نظریں چرا لینی چاہئیں کہ غیر ملکی سیاحوں کی بڑی تعداد پڑوسی ملکوں پاکستان اور بنگلہ دیش سے آتی ہے؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اسپین جیسا چھوٹا سا یورپی ملک یا تھائی لینڈ جیسا ایک ایشیائی پڑوسی ملک، سیاحت کو ایک زبردست صنعت میں تبدیل کر سکتا ہے تو ہم ان تمام چیزوں کا مکمل فائدہ کیوں نہیں اٹھا سکتے جو ہمیں قدرت نے بہتات میں عطا کی ہیں ——— اور اپنی مالا مال وراثت اور وقت کی کسوٹی پر کھرے اترے اپنے مربوط کلچر کا؟ بدقسمتی سے ہمارے دو بے حد خوب صورت خطے ——— جے اینڈ کے (J AND K) اور شمال مشرق NORTH-EAST ——— چند برسوں سے اس طرح بے استحکامی کا شکار ہوئے ہیں کہ یہاں سیاحوں کی آمد پر بری طرح اثر پڑا ہے۔ یہاں امن و امان واپس لانا ایک ایسا کام ہے جسے قومی سطح پر ترجیح دی جانی چاہیے۔

بہرحال، چند دیگر میدان ہیں، جن پر خاطر خواہ بہتری لانے کے لیے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پہلی ترجیح نئے ہوٹل قائم کرنے کے کام کو دی جانی چاہیے تاکہ ہوٹل کے کمروں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کیا جا سکے جو فی الحال افسوسناک حد تک قلیل ہیں۔ یہاں تک کہ ماہرین کی رائے ہے کہ بعض ایشیائی شہروں کے پاس بھی، جیسے بنکاک میں، ہمارے یہاں سے زیادہ ہوٹل کمرے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بہت مہنگے ہندوستانی ہوٹل، جو بنیادی طور پر تجارتی سفر پر نکلے مسافروں ہی کے لیے موزوں ہیں، روایتی، کبھی کبھار سفر کرنے والے سیاحوں کی ضرورتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان ہوٹلوں کے گراں نرخ جن کے بارے میں رپورٹ ہے کہ پچھلے دو سالوں میں سو فی صد کی شرح سے بڑھے ہیں وہ ایک مقررہ بجٹ لے کر چلنے والے سیاح کے لیے ایک بڑی سدِ راہ ہیں۔ چنانچہ یہ بہترین وقت ہے جب ہوٹل کی صنعت ان کم بجٹ والے سیاحوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے پر سنجیدگی سے توجہ دے۔ دیگر بنیادی ڈھانچے والے پہلوؤں پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے جیسے ہوائی اڈوں/ہوائی پٹیوں، سڑکوں، سڑک ٹرانسپورٹ، پانی کے نقل و حمل کا فروغ اور تجدید اور ثقافتی اور زیارتی مراکز پر کم قیمت قیام گاہوں کی تعمیر۔

یہ خبر خاصی حوصلہ بخش ہے کہ ڈیپارٹمنٹ آف ٹورازم ایک سیاحتی بورڈ (بورڈ آف ٹورازم) قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تاکہ مختلف سطحوں پر کمیوں اور رخنوں کو دور کر کے اس اہم زمرے کو بڑھاوا دیا جا سکے۔ سیاحت کے متواتر فروغ کے لیے بنائی گئی حکمت عملی کے ایک حصے کے طور پر مذکورہ ڈیپارٹمنٹ امداد (SUBSIDIES) اور درآمداتی رعایتوں (IMPORT CONCESSIONS) کی شکل میں مالی ترغیبات کا پیکیج دیے جانے کی سفارش کرنے کا بھی ارادہ رکھتا ہے تاکہ نجی زمرے کی شرکت میں اضافہ ہو سکے۔

یکساں طور پر اہم ہے کہ گھریلو سیاحت کو بھی آگے بڑھایا جائے جس کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ریلویز نے نجی زمرے کے اشتراک سے ریلوے نیٹ ورک پر تمام بڑے ٹورسٹ مقامات پر ایک سو ہوٹل تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا کر اس سمت میں پہل کا شرف حاصل کیا ہے، مکمل ہونے پر یہ پروجیکٹ قابل برداشت قیمتوں پر لگ بھگ ۱۰۰۰۰ ہوٹل کمرے فراہم کر سکے گا۔

یہاں احتیاط کے دو لفظ کہہ دینا ضروری ہے۔ بہت سے لوگوں نے سیاحت کو ایک بڑا POLLUTER (ماحول کو آلودہ کرنے والا) کہا ہے۔ اس سلسلے میں گوا کے ساحلوں اور مختلف پہاڑی ریسورٹز میں سیاحوں کی آمد و رفت سے ماحول کے آلودہ ہونے کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے ماحولیاتی سیاحت (ECO-TOURISM) کا نیا نیا وجود میں آیا نظریہ تیزی سے جڑ پکڑ رہا ہے۔ ہمارے پڑوسی نیپال نے ایکو۔ٹورازم کے فروغ کے محاذ پر ہم پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ اگر مناسب طریقے پر پلاننگ کی جائے تو ہم بھی اس میدان میں اچھا کام کر سکتے ہیں، خاص طور پر جب کہ ہمارے پاس نباتات اور حیوانات کا شاندار سلسلہ موجود ہے۔

ڈاکٹر میرا سیٹھ

ہندوستانی سیاحت کے توجہ طلب پہلو

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاحت کی بنیادی سہولتوں میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری ہے انسانی وسائل کی ترقی، کیونکہ ہر سطح پر ہنرمند لوگوں کی ضرورت ہے۔ دوسرا پہلو جس پر زور دینا از حد ضروری ہے وہ ہے ہماری روایتی مہمان نوازی جس کے تحت مہمان کو دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ سیاحوں کا اسی جذبے سے خیر مقدم کرنا چاہیے۔

ہندوستان میں سیاحت کی روایت بہت پرانی ہے۔ ایک مدت مدید سے غیر رسمی سیکٹر میں سیاحت کو صنعت سمجھا جاتا تھا اور ہر طبقے کے لوگ اس سے منسلک تھے۔ البتہ حکمراں طبقے کے راجا، مہاراجا کم سیاحت کرتے تھے کیوں کہ ان کے عزائم کو سیاسی طور پر مشتبہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ تو عام طور پر پڑوسی ریاستوں میں تاجپوشی کے موقع پر یا حکمراں طبقے کے شادی بیاہ میں شریک ہوتے تھے یا مذہبی امور کی انجام دہی کے لیے تیرتھ یاترا کرتے تھے جس کے دوران دیوتاؤں کو خوش کرکے اپنے گناہ دھو دینا چاہتے تھے اور آئندہ حالات کے بہتر ہونے کی دعا کرتے تھے۔

بیوپاری طبقہ جانوروں اور ٹٹوؤں پر مشتمل لمبے لمبے قافلے لے کر چلتا تھا تاکہ جگہ جگہ جاکر اپنا مال بیچ سکے۔ یہ لوگ برصغیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے پہچانے قدیم راستوں سے آتے جاتے تھے۔ ان کے سفر، بکری، آمدنی اور طریق تجارت کا پتا ان کے بہی کھاتوں سے ملتا ہے، جن کے محفوظ رکھنے کا رواج خاص طور سے راجستھان، اتر پردیش اور بنگال میں پایا جاتا ہے۔

دوسرے قسم کے سیاح تعلیم اور روحانی اقدار کے خواہاں لوگ تھے جو کہ اعلا ترین تعلیم کی خواہش میں علمی مراکز اور تیرتھ استھانوں تک جاتے تھے اور وہاں علمی مباحثوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ عام لوگ تو اپنے گاؤں سے بہت کم باہر جاتے تھے۔ کبھی کبھی تو کسی کام سے محض راجدھانی تک اور کبھی کبھی کسی مذہبی رسم کی انجام دہی کے لیے۔

بہر حال سیاحت غیر رسمی سیکٹر میں پائی جاتی تھی اور گو کہ سارے ملک میں سیاحت کی سہولتیں موجود تھیں۔ مثلاً دھرم شالہ، سرائے یا تیرتھ استھانوں میں واقع امیر لوگوں کی حویلیاں، لیکن عام طور سے یہ سب کچھ غیر منظم تھا۔ منظم سیاحت تو بیسویں صدی کی پیداوار ہے اور ہندوستان میں ایسے بدیشی سیاحوں کی آمد سے شروع ہوئی جو کہ اپنے قیام کے دوران اپنے معیار زندگی کے مطابق رہنا چاہتے تھے۔

پنج سالہ پلانوں میں سیاحت

جب ہندوستان میں منصوبہ بندی کا عمل شروع ہوا تو حیرت کی بات ہے کہ پہلے پنج سالہ پلان نے صنعتوں میں سیاحت کا کوئی ذکر نہیں کیا البتہ بنیادی سہولتوں کے مہیا کرنے پر تفصیلی بحث موجود ہے۔ صرف دوسرے پنج سالہ پلان میں سیاحت سے متعلق ایک چھوٹا سا پیرا درج ہے جس میں کہا گیا ہے کہ سیاحت کے لیے دو قسم کی اسکیمیں ضروری ہیں، ایک تو ایسی جگہوں پر بنیادی سہولتیں مہیا کرنے کے بارے میں جہاں بدیشی سیاح آتے ہیں اور دوسری جگہوں پر دیسی سیاحوں کے لیے سہولتیں مہیا کرنے سے متعلق جو نچلے اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ پہلی قسم کی اسکیموں کی ذمہ دار مرکزی سرکار ہوگی اور دوسری قسم کی اسکیم ریاستی سرکاریں انجام دیں گی جس کے لیے مرکز انھیں تھوڑی بہت امداد دے گا۔ تیسرے پنج سالہ پلان میں بھی بنیادی سہولتیں خصوصاً ہوٹل مہیا کرنے کا ذکر ہے۔ چوتھے پنج سالہ پلان میں پہلی بار تسلیم کیا گیا ہے کہ سیاحت بدیشی زرمبادلہ حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ نیز اس سے روزگار ملتا ہے اور بین اقوامی تعلقات اور افہام و تفہیم قائم ہوتی ہے۔ پانچویں پنج سالہ پلان میں سیاحت کا بہت سرسری طور پر ذکر ہے، البتہ اس کے لیے مخصوص رقم میں اضافہ کیا گیا ہے۔ چھٹے پلان میں زور دیا گیا ہے کہ سیاحت کے لیے دستیاب سہولتوں کا زیادہ

سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے اور پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر دونوں میں ہوٹلوں کی تعداد بڑھاکر سیاحوں کے ٹھہرانے کا انتظام کیا جائے۔ اس پلان میں ماحولیات کے تحفظ کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے اور مخصوص رقم میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

صنعت کا درجہ

ساتویں پلان کے مسودے میں (۱۹۸۵-۹۰) پہلی بار سیاحت کو کما حقہ اہمیت دی گئی ہے اور سیاحت کو تیزی سے ترقی دینے اور اسے صنعت کا درجہ دینے کو پلان کے مقاصد میں شامل کیا گیا ہے نیز اس امکان کا کھوج لگانے کی بات کی گئی ہے کہ سیاحت کے ذریعے کس طرح دست کاری کی بکری کو اور قومی یک جہتی کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ پلان میں تفصیلی طور پر بحث کی گئی ہے کہ بعض چنندہ سیاحتی سرکٹ کو کیسے ترقی دی جائے، غیر رو ایتی علاقوں میں سیاحت کی کیسے توسیع کی جائے، اس کی امیج کو کیسے بہتر بنایا جائے، نئی قسموں کی سیاحت یعنی مہم جوئی اور جنگلی حیوانات سے متعلق سیاحت کو کیسے فروغ دیا جائے اور بدیشی ملکوں میں ہندوستانی سیاحت کی پبلسٹی کو کیسے بہتر بنایا جائے۔

آٹھویں پنج سالہ پلان میں گزشتہ پلانوں کے دوران سیاحت کو فروغ دینے کی کوششوں پر نظر ڈالی گئی ہے اور پہلی بار یہ کہا گیا ہے کہ سیاحت کی آئندہ ترقی پرائیویٹ سیکٹر کے ذریعے ہوگی۔ ریاست کا کام محض یہ ہوگا کہ وہ ترقی سے متعلق موٹے طور پر حکمت عملی تیار کرنے اور پرائیویٹ سیکٹر کو مالی اور مادی ترغیبات دے کر ایک انقلاب آور رول ادا کرے، نیز صنعت صارف اور ماحول کے تحفظ کی تدبیروں کا سجھاؤ دے، ساتویں پلان میں ایسے خصوصی سیاحتی علاقوں کا ذکر ہے جہاں سیاحوں کی بھاری تعداد کے آنے کا امکان ہے۔

آٹھویں پلان پر عمل درآمد کے دوران سیاحت کے چار اہم پہلوؤں پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ سیاحت ایک ایسی صنعت ہے جس میں روزگار پیدا کرنے کا بہت بڑا امکان ہے۔ خدمتی سیکٹر کی یہ صنعت سرمایہ دار طبقے کو بھی روزگار دیتی ہے، مینیجروں کے طبقے کو بھی، ہنرمند مزدوروں کو بھی، فنکاروں اور اہل حرفہ کو بھی، موسیقی اور رقص کا پیشہ کرنے والوں کو بھی اور ایکٹروں کو بھی بلکہ سبزی، پھل اور پھول اُگانے والوں کو بھی۔ مطالعوں سے پتا چلا ہے کہ اس صنعت میں روزگار کے امکانات بڑھتے ہی جائیں گے۔ سیاحت کے اس پہلو کے احساس کے ساتھ ساتھ اب یہ مزید زور دیا جا رہا ہے کہ سیاحت کو نہ صرف صنعت تصور کیا جائے بلکہ اس میں سرمایہ لگانے کو ترجیح دی جائے۔ بعض ریاستیں مثلاً ہریانہ، ہماچل پردیش، آندھرا پردیش، کرناٹک، کیرالا، تامل ناڈو، آسام، میزورم، اڑیسہ، اروناچل پردیش، تری پورا، مہاراشٹر، بہار، مدھیہ پردیش اور اتر پردیش سیاحت کو صنعت کا درجہ دے چکی ہیں۔

نجی سرمایہ کاروں کو ترغیب

دوسرا پہلو جس پر زور دیا گیا ہے نجی سرمایہ کاروں کو ترغیب دینے کا ہے۔ اس سلسلے میں ہوٹل کی صنعت اور سفری ایجنسیوں بلکہ دیگر صنعت کاروں سے بھی قومی اور بین اقوامی سطح پر بہت مباحثہ ہو چکا ہے۔ ریاستی سرکاریں بھی حتی الامکان کوشش کر رہی ہیں کہ نجی سیکٹر سیاحت میں سرمایہ لگائے اور بعض ریاستوں مثلاً تامل ناڈو اور آندھرا پردیش میں پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ بدیشی سرمایہ کار بھی رفتہ رفتہ اس طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔

تناظری پلان

پلاننگ کمیشن کے کہنے پر ریاستی سرکاروں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اگلے پندرہ بیس برس کے لیے تناظری سیاحتی پلان بنائیں تاکہ بنیادی سہولتوں کی فراہمی سے متعلق وقتی کوششوں کی جگہ ایک طویل مدتی نقطۂ نظر اختیار کر کے ان کو کئی گنا ترقی دی جا سکے۔ متعدد ریاستوں نے یہ کام شروع کر دیا ہے اور ہماچل پردیش، مہاراشٹر، پنجاب، آندھرا پردیش، اتر پردیش اور راجستھان نے پلاننگ کمیشن کی ہدایات کے مطابق اپنے اپنے تناظری پلان تیار بھی کر لیے ہیں۔

مختلف سیکٹروں میں رابطہ

چوتھا پہلو جس پر زور دیا گیا ہے وہ مختلف سیکٹروں میں رابطے کے اضافے کا ہے۔ اب سیاحت و شہری ہوا بازی، ریلوے، شہری ترقی اور کلچر کی وزارتوں میں پہلے سے کہیں زیادہ روابط ہیں جس کے باعث سیاحت کے امکانات والے علاقوں میں زیادہ مرکوز اور مربوط ترقی پر زور دیا جا رہا ہے۔ کلچرل تقریبات کو سیاحت کے موسم سے منسلک کیا جا رہا ہے، سیاحتی مرکزوں کے آس پاس کلچرل علاقوں میں "شلپ گرام" بنائے جا رہے ہیں، ہتھ کرگھے کی مصنوعات اور دست کاریوں کی نمائش کے علاوہ بڑے بڑے سیاحتی مرکزوں میں "ایمپوریا" بھی کھولے جا رہے ہیں جہاں یہ مصنوعات اور دست کاریاں مسلسل دستیاب رہیں گی۔

تیز ترقی

مرکزی اور ریاستی سرکاروں کی ان کوششوں کے نتیجے میں سیاحت کو تیزی سے ترقی ملی ہے۔ اس کے لیے دوسرے پلان میں اگر ۱ر۸۵ کروڑ روپے کی رقم مخصوص تھی تو آٹھویں پلان میں ۶۱ر۳۴۴۶ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ۱۷،۰۰۰ سیاح ہندوستان آئے تھے تو ۱۹۹۵ء میں ۲ر۲۱ لاکھ سیاح۔ ۱۹۷۳ء میں ہوٹلوں کی تعداد ۱۶۷ تھی تو مارچ ۱۹۹۶ء کے آخر تک یہ تعداد ۹۷۶ ہو گئی تھی اور کمروں کی تعداد ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ء کے آخر تک ۵۷،۴۳۵ تک پہنچ گئی تھی۔ علاوہ ازیں ۶۸۳ نئے ہوٹلوں کے بنانے کی اجازت دی جا چکی ہے جس کے نتیجے میں ۳۵۴۵۲ نئے کمرے مہیا ہو جائیں گے۔ القصہ فی الحال سیاحت ہندوستان کی تیسری سب سے زیادہ زرمبادلہ کمانے والی صنعت ہو گئی ہے (محض سلے سلائے کپڑوں کی اور جواہرات و زیورات کی برآمدات سے اس سے زیادہ زرمبادلہ ملتا ہے) اندازہ ہے کہ ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران سیاحت سے ۹۱۸۶ کروڑ روپے کا زرمبادلہ حاصل ہوگا۔

جہاں تک بنیادی سہولتیں مہیا کرنے کا مسئلہ ہے اس میں بھی زبردست اضافہ ہوا ہے۔ پہلے پلان کے دوران ہماری ریلوے میں محض ۴ر۱۲۸ کروڑ مسافروں کے لے جانے کی صلاحیت تھی جو ۹۵-۱۹۹۴ء میں بڑھ کر ۵ر۳۹۱ کروڑ ہو گئی۔

ریلوں کے لیے پہلے پلان میں محض ۳۲۴ کروڑ روپے کی رقم مخصوص تھی جو آٹھویں پلان میں بڑھا کر ۲۲۰۲ کروڑ روپے کردی گئی۔ شہری ہوابازی کے لیے اگر پہلے پلان میں محض ۲۹ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تھی تو آٹھویں پلان میں ۳۹۹۸ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ آٹھویں پلان کے شروع میں انڈین ایئر لائنس کے ہوائی جہاز ملک میں ۵۰ مقامات تک اور بدیش میں دس مقامات تک اڑانیں کرتے تھے۔ اسی طرح ایر انڈیا کی بھی توسیع ہوئی ہے اور اس نے بھی نئے مقامات کو جانا شروع کردیا ہے۔ ملک میں سڑکوں کی مجموعی لمبائی جو ۱۹۵۱ء میں ۳٫۹۹ لاکھ کلومیٹر تھی ۱۹۹۲ء میں ۲۰٫۴۰ لاکھ کلومیٹر ہوگئی۔ البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ ابھی ابتدائی صحت اور عوامی صحت کی خدمات اور شہری ترقی کے سیکٹر میں بہت کچھ کرنا باقی ہے گو کہ یہ سیکٹر سیاحت سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف کلچرل سرگرمیوں میں زبردست توسیع ہوئی ہے۔

کڑوا سچ

ان سب کے باوجود یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ عالمی سیاحت میں ہندوستان کا حصہ محض ۰٫۳۶ فی صد ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ خواہ ہم بدیش میں کیسی ہی لیپا پوتی والی پبلسٹی کریں یا ملک میں پانچ ستارہ ہوٹلوں کے کلچر کو کتنا ہی پھیلائیں، سیاحت میں اس وقت تک دن دونی رات چوگنی ترقی نہیں ہو سکتی، جب تک ہماری بنیادی سہولتیں سچ مچ اس معیار کی نہیں ہو جاتیں جو کہ سیاحوں کو دنیا کے دیگر حصوں، خصوصاً فرانس، اٹلی، اسپین، انگلینڈ اور امریکہ کے سیاحتی مرکزوں میں دستیاب ہیں۔ یا کم از کم ویسی تو ہوں جو کہ تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور چین میں ملتی ہیں۔

سیاحت کو سب سے زیادہ فروغ اس وقت ملے گا جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے انسانی وسائل کی ترقی اور بہتری ہوگی۔ خواہ وہ ویٹر کا پیشہ ہو یا اعلا ترین منتظم کا، سیاحت کو ہر سطح پر ہنرمند اور تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں پبلک کو بھی یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ وہ سیاح کے ساتھ مہمانوں کا سا سلوک کریں نہ کہ ایسے گاہکوں کا جنھیں لوٹا جا سکتا ہے۔ عوام کو چاہیے کہ وہ اپنی قدیم روایات کے مطابق "مہمان" کو دیوتا سمان تصور کریں۔

ایک اور پہلو جس پر زور دینے کی ضرورت ہے عوامی صحت اور حفظان صحت کا ہے۔ خواہ وہ کلچرل سیاحت ہو یا مذہبی یاترا ہر جگہ عوامی صحت، حفظان صحت اور صفائی ستھرائی کے معیار کو بہتر بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ گو کہ ہمارے ڈاکٹر اعلا ترین معیار کے ہیں لیکن ہماری گائڈ بک میں ہندوستانی اور بدیشی سیاحوں کو اس بارے میں اچھی طرح مطلع نہیں کیا جاتا کہ کسی جگہ حفظان صحت کی کیا سہولتیں موجود ہیں۔

تیسری تدبیر جس کے ذریعے دیسی اور بدیشی سیاحوں کی تعداد میں اضافہ کیا جا سکتا ہے، ملک بھر میں سستی قیام گاہیں مہیا کرنا ہے۔ اس سے مراد محض سستے ہوٹل نہیں بلکہ پرائیویٹ سیکٹر میں وسیع پیمانے پر گیسٹ ہاؤس اور پے انگ گسٹ کا چلن ہے۔ ہندوستان کی دیسی سیاحت پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ان ہندوستانیوں کی بھاری تعداد کو جو بدیشوں کی سیاحت کرتے ہیں یہ ترغیب دی جائے کہ پہلے وہ اپنے دیس میں ہی سیاحت کریں۔ اس کے لیے پرائیویٹ سیکٹر کی حوصلہ افزائی کرنا ہوگی کہ وہ ہمارے دسیوں لاکھ نوجوانوں کے لیے سستی اقامت گاہیں مہیا کرے۔ ملحوظ رہے کہ دیسی سیاحت سے قومی یکجہتی بڑھے گی، اپنے کلچر کی قدردانی میں اضافہ ہوگا، اپنے ملک پر فخر محسوس ہوگا اور سیاحوں کی صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔

تیز تر ترقی کی ضرورت

مرکزی اور ریاستی سرکاروں نے سیاحت کی صنعت کی حوصلہ افزائی کے لیے نئی اسکیمیں شروع کی ہیں۔ اب سیاحت کو قرار واقعی ترقی دینے کے لیے متعدد مالی اور دیگر ترغیبات دی جا رہی ہیں لیکن ایسی مزید ترغیبات کو جلد تر سوچنے اور دینے کی ضرورت ہے۔ رضاکارانہ اداروں، عورتوں کے اداروں اور عام پبلک کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ سیاحت کے فروغ کے لیے سیاح کے ساتھ عزت، ہمدردی اور اخلاق کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔

بنیادی سہولتوں کے سیکٹر میں، جو کہ سیاحت کو سہارا دیتا اور سہل بناتا ہے۔ پہلے کی بہ نسبت اب کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر اضافہ کرنا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہوائی سروس کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے یعنی کہ ہوائی جہازوں کی تعداد میں اضافہ، کرائے بھاڑے کی شرح کو معقول بنانا، بین اقوامی ہوائی سروسوں کے ساتھ مزید دو طرفہ معاہدے، ہوائی اڈوں کی گنجائش اور کوالٹی کو بہتر بنانا اور قومی اور بین اقوامی ہوائی اڈوں پر مسافروں کی سہولتوں میں بہتری لانا خاص طور پر ان کے لیے اطلاعاتی سروسوں میں۔ اسی طرح سیاحتی مرکزوں تک کی ریلوے سروس میں توسیع و اضافہ کرنا اور اسٹیشنوں پر مسافروں کو معلومات فراہم کرنے کے بندوبست کو بہتر بنانا۔

سیاحت کے سلسلے میں شہری ترقی کی وزارت کا بھی تعاون ضروری ہے۔ تاکہ چھوٹے اور متوسط درجے کے شہروں کی مربوط ترقی ہو سکے خصوصاً ان شہروں کی جن کے سیاحتی مرکز بننے کا زیادہ امکان ہے۔ اسی طرح سیاحتی مراکز میں دور مواصلاتی خدمات میں بھی اضافہ کرنا ہوگا۔ آثار قدیمہ کے مراکز میں بھی سہولتوں کے اضافے کی ضرورت ہے اور جہاں بھی سیاح بہ کثرت آتے ہیں وہاں سیاحوں سے متعلق خصوصی پولیس بھی تعینات کرنا ہوگی اور سب سے بڑھ کر اگر ہندوستان کو ایک خوش حال سیاحتی مرکز بنانا ہے تو قومی اور بین اقوامی سطح پر جارحانہ انداز کی پبلسٹی پالیسی اختیار کرنی ہوگی تاکہ سیاحت میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکے۔ ●

قلم کار حضرات!

براہ کرم مضامین ورق کے ایک طرف اور خوش خط تحریر کریں۔

(ادارہ)

ہیو اور کولن گینٹزر

سیاحت۔ ایک تلاش

سیاحت ایک تلاش ہے۔ اپنے وراثت کو اور دوسروں کی وراثت کو جن کے ساتھ ہم کرۂ زمین پر رہتے ہیں، دیکھنے اور جاننے کی۔

ہندوستانی سیاحت کی ترقی میں دو باتیں آڑے آرہی ہیں ایک تو یہ کہ "سیاحت دنیا کی سرکردہ صنعت ہے اور بین اقوامی سیاحت موجودہ صدی کے اختتام تک اسلحہ سازی اور تیل کی صنعت سے آگے نکل جائے گی۔" دوسری بات یہ ہے کہ بھارت میں سیاحوں کے لیے اتنی زیادہ کشش انگیز چیزیں ہیں جن کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔" جیسا کہ ہم نے اپنی تصنیف ATTRACTIONS UNLIMITED (یعنی "لامحدود کششیں") میں بیان کیا ہے۔

یہ دونوں ہی باتیں درست ہیں لیکن لوگ اکثر پہلے بیان کو دوسرے بیان کے ساتھ جوڑنے کی غلطی کرتے ہیں اور ان کا غلط مطلب نکالتے ہیں۔ اگر سیاحت دنیا کی سرکردہ صنعت ہے اور بھارت میں سیاحوں کے لیے لامحدود کششیں موجود ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سیاحت بھارت کی سرکردہ صنعت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب سے زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ کمانے والی صنعت بھی نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی یہ نمایاں پوزیشن کچھ سالوں تک رہی تاہم قریباً دو سال پہلے جواہرات اور زیورات کی صنعت اس سے آگے نکل گئی۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جن ملکوں میں سیاحوں کی دلچسپی کی چیزیں/مقامات بھارت کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ انھوں نے شعبۂ سیاحت میں بھارت کے مقابلے میں بہت اچھا کام کیا ہے تو ہمیں ہندوستانی سیاحت کی صورت حال پر افسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر برطانیہ، سنگاپور اور مالٹا نے شعبۂ سیاحت میں ہم سے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ ترکی کے حالیہ دورے کے دوران ہم اس ملک میں جو ایک بڑی حد تک ایک ایشیائی ملک ہی ہے، خوب گھومے۔ اس کا ٹورازم اتنا منظم ہے

> جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جن ملکوں میں سیاحوں کی دلچسپی کی چیزیں/مقامات بھارت کے مقابلے میں بہت کم ہیں انھوں نے شعبۂ سیاحت میں بھارت کے مقابلے میں بہت اچھا کام کیا ہے تو ہمیں ہندوستانی سیاحت کی صورت حال پر افسوس ہوتا ہے۔

کہ سیاح کا خرچ کیا ہوا اڈالر سید ھے سب سے نچلی سطح کے لوگوں تک پہنچتا ہے۔ اس سے وہاں کے غریب لوگوں کے رہن سہن میں بڑی تبدیلی آئی ہے لیکن اس تبدیلی کے باوجود انھوں نے اپنی وراثت کو برقرار رکھا ہے۔ دراصل ترکی کی متنوع اور گوناگوں وراثت ہی سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس لیے وہاں کے عام لوگوں نے اپنی وراثت کی از سر نو دریافت کے لیے بہت محنت کی ہے۔ سڑک کے کنارے ایک عوامی ریستوراں میں ایک نانبائی لکڑی جلانے والی ایک بھٹی پر روٹیاں پکا رہا تھا۔ اس پرانے طریقے کو دیکھ کر سڑک پر سے گزرنے والے سیاح بلاتوقف ریستوراں کے اندر آجاتے تھے۔ ایسا دوسری جگہوں پر بھی ہوا۔ حال ہی میں تسمانیہ میں ایک ہندوستانی نژاد انگریز اکاؤنٹنٹ کو ایک چھوٹے سے گاؤں میں لکڑی جلانے والی ایک بھٹی میں لکڑی ڈال کر آنچ تیز کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ اس کے گاؤں میں بھی سیاح کھنچے چلے آئے۔

ترکی اور تسمانیہ میں سیاحوں کی دلچسپی کی ان دونوں جگہوں پر ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ کہ یہ دونوں جگہیں بہت اچھی شاہراہوں پر واقع تھیں۔ ہمارے بھارت میں تیز رفتار ٹریفک والی عمدہ شاہراہیں کم ہیں اور جو ہیں ان کی داشت و پرداخت کی ذمہ داری سب سے سستا ٹینڈر بھرنے والے ٹھیکیداروں پر ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مانسون کے بعد زیادہ تر شاہراہوں پر بڑے بڑے گڑھے بن جاتے

ہیں۔ جیسے ایڈونچر کے شوقین سیاحوں کے لیے بنے ہوں۔ اگر کوئی سیاح شاہراہ پر آرام اور سلامتی کے ساتھ تیز رفتار سے گاڑی نہیں چلا سکتا تو وہ اپنی سیاحت کے دوران اتنا کچھ نہیں دیکھ سکتا جتنا وہ دیکھنا چاہتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے خرچ کیے گئے ڈالروں کا حصہ ملک میں سبھی لوگوں کو یکساں طور پر نہیں پہنچتا۔

ہمارے ملک میں بہت سے کشش انگیز مقامات اس لیے ترقی سے محروم رہتے ہیں کہ وہاں سیاح کافی تعداد میں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر گڑھوال بہت خوب صورت ہے اور سوئٹزرلینڈ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ڈرامائی نوعیت رکھتا ہے لیکن گڑھوال کو سیاحوں سے اتنی زیادہ آمدنی نہیں ہوتی جتنی سوئٹزرلینڈ کو ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس کی سڑکیں اچھی نہیں ہیں اس کے علاوہ ایک دوسرے سے مطابقت نہ رکھنے والی پالیسیاں فروغ سیاحت کے راستے کی ایک اور بڑی رکاوٹ ہیں۔ قریب قریب ہر ریاستی حکومت نے کبھی نہ کبھی شراب بندی کے نظریے سے کھلواڑ کیا ہے غیر ملکی سیاح بھارت میں شراب پینے نہیں آتے وہ یہاں کھانے اور بوتل بند پانی پینے یا ہوائی جہاز چلانے والی کمپنیوں کی سرپرستی کرنے کے لیے بھی نہیں آتے۔ لیکن جو لوگ کھانے کے بعد شراب کا جام پینے کے عادی ہیں جیسا کہ زیادہ تر یوروپین کرتے ہیں، یا جنھیں لذیذ کھانے کی عادت ہے یا جو بوتل کے صاف اور محفوظ پانی سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں یا ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوائی جہاز سے جلد از جلد پہنچنا چاہتے ہیں اگر سیاحوں کو حسب منشا یہ سہولیات حاصل نہ ہوں تو انھیں تکلیف ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ چیزیں ان کی روزمرہ زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔ اس لیے وہ ایسی جگہوں پر جانا چھوڑ دیتے ہیں جہاں انھیں یہ آسائشیں میسر نہ ہو سکیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ ایسی جگہوں پر جانے کا کیا فائدہ جہاں کے لوگ ان کے تئیں لاپروائی برتیں، سیاحوں کی ضرورتوں کے تئیں عدم توجہی کی وجہ کچھ سنکی لوگوں کا یہ انداز فکر ہے کہ سیاحت ایک فضول اور بے فائدہ سرگرمی ہے۔

اس کے برعکس ایسے لوگ بھی ہیں جو سیاحت کو دودھ دینے والی گائے سمجھتے ہیں۔ جب کوئی ریاستی حکومت روپے کی کمی محسوس کرتی ہے تو ٹوورازم پر ٹیکس لگا دیا جاتا ہے۔ سیاحت سے متعلق پالیسی میں بار بار تبدیلیاں کرنے سے سیاحت پر بہت خراب اثر پڑتا ہے اور وہ ایسے "سرمایہ کاروں" کو راغب کرنے پر مائل ہو جاتی ہے جو سیاحت کی ضرورتوں سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ لیکن جن کے پاس ایسی دولت ہوتی ہے جس پر ٹیکس ادا نہیں کیا گیا ہوتا چوں کہ شعبۂ سیاحت میں منافع غیر یقینی ہوتا ہے بلکہ کئی بار نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ اس سے وہ اسے اپنے کالے روپے کو سفید بنانے کا سب سے اچھا طریقہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے ملک کے بہت سے حصوں میں ٹوورازم ایک مشتبہ تجارتی سرگرمی بن گئی ہے۔

> [illegible]
> [illegible]
> [illegible]
> کے بعد زیادہ تر شاہراہوں پر بڑے بڑے گڑھے ہو گئے ہیں۔

لیکن صرف اسی بات سے ٹوورازم ختم نہیں ہو جائے گا۔ ایٹمی بجلی گھروں، الکحل بنانے کے کارخانوں اور بڑے بڑے باندھ بنانے کو بھی تو بہت سے لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ شک بڑی حد تک لاعلمی اور آرکیسٹرا کی طرز کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے۔ لیکن ٹوورازم کی ترقی کے سلسلے میں ایک بات یہ ہوئی ہے کہ اس گندے روپے سے کنکریٹ کے ایسے ڈھابے کافی تعداد میں بننے لگے ہیں جن کی تعمیر میں ماحولیات کے نہایت بنیادی اصولوں تک کو نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ ایماندار شہری قانون کی ایسی خلاف ورزیوں کے خلاف احتجاج کرنے کے بجائے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرنا پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح جیسے صحت مند آدمی کسی گندی بیماری کے مریضوں کے علاج و بازآبادکاری میں مدد دینے کے بجائے ان سے دور رہنا پسند کرتے ہیں۔

ہمارا شہر مسوری اسی طرح کی شہری عدم توجہی کا شکار ہے۔ کسی وقت یہ ہمالیہ کے دامن میں ایک ٹھنڈا اور پرسکون شہر ہوا کرتا تھا جہاں لوگ آرام سے اپنی چھٹیاں گزارتے تھے۔ اب یہاں تعمیرات کی اتنی بھرمار ہو گئی ہے کہ شہری خدمات کا سلسلہ کبھی بھی ٹوٹ سکتا ہے تھوڑی سی بارش ہوئی نہیں کہ سڑکیں گندے پانی سے بھر کر کھلے سیوروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ گندہ پانی بہتا ہوا سدابہار چشموں میں جا ملتا ہے اور کئی ہوٹل میونسپل پانی کی سپلائی ناکافی ہونے کے سبب ان چشموں ہی سے پانی لیتے ہیں۔ اس طرح ہوٹل میں ٹھہرنے والے بیشتر مسافر خود اپنے ہی فضلات کا استعمال کرتے ہیں۔ ہم کوئی مبالغہ آرائی نہیں کر رہے ہیں یہ بات حرف بہ حرف درست ہے۔ مانسون کے دوران مسوری آنے والا کوئی بھی شخص خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ سکتا ہے۔

> اگر سیاحوں کو حسب منشا یہ سہولیات حاصل نہ ہوں تو انھیں تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ایسی جگہوں پر جانا چھوڑ دیتے ہیں جہاں انھیں یہ آسائشیں میسر نہ ہو سکیں۔

لیکن اس اندھیرے میں بھی اب روشنی کی کرن نظر آنے لگی ہے۔ مارکیٹ کی چوٹی پر واقع ہوٹلوں میں سے کئی ہوٹل ماحولیات کے بارے میں حساس ہو گئے ہیں۔ توانائی کی بچت اور سبزہ یا درخت اگانے وغیرہ پر زور دیا جا رہا ہے۔ اب تو سیاحوں کی متوسط درجے کی قیام گاہیں بھی اس قسم کے اقدامات کرنے لگی ہیں صرف اس لیے نہیں کہ تحفظ ماحولیات کا شعور

معاشی شعور پیدا کرتا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ ان کے مہمان اس قسم کے اقدامات کی مانگ کرتے ہیں۔

ٹورازم کے اعلا حلقوں میں سیاحت کے بارے میں ایک دیرپا پالیسی بنانے کا چرچا ہو رہا ہے۔ یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ پالیسی صرف حکومت ہی تیار نہیں کر رہی ہے بلکہ ٹریولنگ انڈسٹری کے ماہرین بھی یہ پالیسی بنانے میں حکومت کے ساتھ پورا تعاون کر رہے ہیں۔

> ٹورازم کے اعلا حلقوں میں سیاحت کے بارے میں ایک دیرپا پالیسی بنانے کا چرچا ہو رہا ہے۔ یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ پالیسی صرف حکومت ہی تیار نہیں کر رہی ہے بلکہ ٹریولنگ انڈسٹری کے ماہرین بھی یہ پالیسی بنانے میں حکومت کے ساتھ پورا تعاون کر رہے ہیں۔

سرکاری اور پرائیویٹ سیکٹر بھی سیاحوں کے لیے ایسے تیز رفتار ہائی وے ٹورز کا اہتمام کرنے میں ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں جن میں سڑک کے خطرات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کا ایک طریقہ ٹورسٹ ٹرینیں ہیں۔ "پیلیس آن وہیلز" ٹرین کی کامیابی کے بعد "رائل اورینٹ" چلائی گئی ہے۔ ایک خبر کے مطابق وزیر سیاحت نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ وہ چاہیں گے کہ متوسط طبقے کے مسافروں کے لیے اس طرح کی مزید خصوصی ٹرینیں چلائی جائیں۔ آمد و رفت کا ایک اور ذریعہ آبی گزرگاہیں ہیں لیکن ہمارے ملک میں آبی ٹرانسپورٹ کا کم استعمال کیا گیا ہے۔ حال ہی میں ہم نے کیرالہ کی ویمبا ناڑ لیک سے ایک ایسی جگہ تک ایک چھوٹی ٹرانسپورٹ بوٹ میں جسے ایک آرام دہ ہاؤس بوٹ کی شکل دے دی گئی تھی، سفر کیا جہاں سے قلون شہر تھوڑی دور واقع ہے۔ رات بھر کا یہ سفر بہت پرسکون رہا۔ ہمیں اس ہاؤس بوٹ میں سفر کر کے اس لیے اور بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ برسوں پہلے ہم ہی نے سب سے پہلے اس طرح کے سفر کی تجویز پیش کی تھی۔ اب انٹرنیشنل ٹور آپریٹر اس قسم کے آبی ٹورز میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں۔

آج کل سیاحوں پر عائد ٹیکس سے ہونے والی آمدنی اور اس کے استعمال کے بارے میں اور زیادہ کھلے پن کے حق میں رائے استوار ہوتی جا رہی ہے۔ ہوائی جہاز سے سفر کرنے والے مسافر برسوں سے ایئرپورٹ ٹیکس ادا کر رہے ہیں لیکن اس روپے کو کیسے خرچ کیا جا رہا ہے یہ جاننے کی مانگ کسی نے نہیں کی۔ اب اس بات کا امکان نظر آ رہا ہے کہ ٹیکس ادا کرنے والے جلد ہی یہ مطالبہ کریں گے کہ اس کی آمدنی کا ۵۰ فی صد ہوائی اڈوں پر سہولیات بڑھانے کے لیے استعمال کیا جائے اور اس خرچ کا حساب ہر ہوائی اڈے پر دیواروں پر آویزاں بورڈوں میں دکھایا جائے۔

سیمپلینر کی مثال کی پیروی کرتے ہوئے کیرالہ تھیکاڈی پارک جیسے مقبول عام قومی پارکوں کو جہاں تک ممکن ہو، خود کفیل بنایا جانا چاہیے۔ پارک دیکھنے کے لیے آنے والوں سے ہونے والی آمدنی کا ۵۰ فی صد وزیٹروں کے لیے سہولیات اور معلومات کی فراہمی پر خرچ کیا جانا چاہیے۔ تھیکاڈی کا اورینٹیشن سینٹر آج کافی خراب حالت میں ہے۔ وہ کباڑ رکھنے کا اسٹور سا بن گیا ہے اگرچہ وزیٹروں سے ہونے والی آمدنی بڑھ گئی ہے۔ ہاتھیوں کے مسکن میں کوڑے کے ڈھیر جمع ہیں۔ اگر یہ کوڑا وزیٹروں نے پھیلایا ہے تو ان سے ٹکٹ کی صورت میں وصول کیے جانے والے روپے سے اسے صاف کر دیا جانا چاہیے۔

> آمد و رفت کا ایک اور ذریعہ آبی گزرگاہیں ہیں لیکن ہمارے ملک میں آبی ٹرانسپورٹ کا کم استعمال کیا گیا ہے

یہ بھی ممکن ہے کہ عدم توجہی کی شکار تاریخی عمارتیں دنیا میں سب سے زیادہ ہمارے ملک ہی میں ہوں۔ چھوٹی تاریخی عمارتوں کی داشت و پرداخت کی ذمہ داری کمرشیل ہاؤسوں کو سونپ دی جانی چاہیے اور انھیں ایک محدود تعداد میں ایسی ہورڈنگز لگانے کی اجازت بھی دی جانی چاہیے جن پر قومی وراثت کے تحفظ سے ان کی وابستگی کا اظہار کیا گیا ہو، ہم اس بات کے حق میں ہیں کہ سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات میں داخلے کے لیے دو شرحوں کے ٹکٹ ہونے چاہئیں۔ ایک ہندوستانی سیاحوں کے لیے اور دوسرا غیر ملکی سیاحوں کے لیے۔ غیر ملکیوں کے لیے ٹکٹ کی شرح زیادہ رکھی جا سکتی ہے۔ چوں کہ ہم ٹیکس ادا کرتے ہیں اس لیے یہ سمجھا جانا چاہیے کہ ان مقامات کی دیکھ بھال کے خرچ کے لیے ہم پہلے ہی جزوی ادائیگی کر چکے ہیں۔ میانمار میں دو مختلف شرحوں کے داخلہ ٹکٹ رائج ہیں اور غیر ملکی سیاح بخوشی زیادہ شرح کا ٹکٹ خریدتے ہیں۔

سیاحوں کے لیے دوسری بڑی سہولیات میں سے ایک جس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے، عوامی بیت الخلاؤں کی سہولت ہے۔ ترکی میں سیاحوں کے استعمال میں آنے والے بیت الخلا بہت صاف ستھرے ہیں اگرچہ ان کے اندر جانے کے لیے ہندوستان کے آٹھ روپیوں کے مساوی فیس لی جاتی ہے۔ سیاحت کے ہر مقام پر دو زمروں کے بیت الخلا ہونے چاہئیں جو ہر سال مختلف کنٹریکٹروں کو بذریعہ نیلام الاٹ کیے جانے چاہئیں۔

آخر میں ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ ٹورازم کو اس وقت تک سنجیدگی سے نہیں لیا جائے گا جب تک اسے اسکولوں کے نصاب میں بطور ایک سماجی و اقتصادی مضمون کے شامل نہیں کیا جاتا۔ جب یہ مضمون بچوں کو پڑھایا جائے گا تبھی وہ ٹورازم کی اہمیت بخوبی سمجھ سکیں گے اور ان میں بھی سیر و سیاحت اور اپنی ثقافتی و تاریخی وراثت کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوگا۔

لامحدود کششوں والا ملک

بھارت ایک وسیع و عریض ملک ہے، اس سے بھی بڑا جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ یقیناً یہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے جتنا کہ سولہویں صدی کے ایک جغرافیہ داں نے مختلف نسلوں کے سیاحوں کو باور کرایا تھا۔ جرہارڈ یومرسیٹر نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر گول دنیا کا ایک نقشہ بنانے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اس کے نظریے جس میں غلط بیانی شروع سے موجود تھی، کے مطابق کوئی ملک خط استوا سے جتنا زیادہ دور ہوگا اتنا ہی زیادہ بڑا دکھائی دے گا۔ اسی لیے دنیا کے بہت سے نقشوں میں یوروپ بڑا اور بھارت چھوٹا نظر آتا ہے۔

لیکن یہ صرف ایک خیالی بات ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سچائی تو یہ ہے کہ اگر آپ برطانیہ، فرانس، جرمنی، لکسمبرگ، اٹلی، پرتگال، ہالینڈ، یونان، ڈنمارک، ناروے۔ سویڈن اور آسٹریلیا کو اکٹھے رکھیں تو مجموعی طور پر وہ اتنے بڑے نہیں ہوں گے جتنا بڑا بھارت ہے۔ آئیے ان سب ملکوں میں سائپرس، مالٹا اور موناکو کا رقبہ بھی جوڑ دیں لیکن یہ بھی کافی نہیں ہوگا۔ ان میں لک ٹینسٹین اور بلجیم کو بھی جوڑ دیجیے مگر یہ بھی کافی نہیں ہوگا۔ اب اینڈورا اور ویٹیکن سٹی کو بھی ان میں جوڑ دیجیے۔ اب بھی ان سب کا مجموعی رقبہ بھارت کے رقبے سے ۲۶۹۶۸۸،۵۶ مربع کلو میٹر کم ہوگا۔

بھارت یوروپ کے ۳۰ آزاد ملکوں کے مجموعی رقبے سے زیادہ بڑا ہے۔ اگر لندن میں بم کا کوئی دھماکہ ہوتا ہے تو کیا سیاح اسپین سے بھاگنے لگیں گے؟ اگر سویڈن میں گڑبڑ ہوتی ہے تو کیا سیاح فرانس جانے سے احتراز کریں گے؟ اور اگر ہالینڈ میں سیلاب آجائے تو آپ یہ مشورہ دیں گے کہ "ویٹیکن نہ جائیے" پھر کشمیر میں گڑبڑ کی وجہ سے سیاح گوا سے کیوں بھاگیں؟ بھارت اتنا وسیع و عریض ملک ہے کہ موٹے موٹے سرخیاں بھارت میں پائے جانے والے امن کے سمندر میں ایک ہلکی سی لہر اٹھنے کے مترادف ہیں۔

سیاحت کے لیے آپ بھارت میں اپنی ضرورت کے مطابق موسم اور علاقے کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ اگر آپ گرمی کی تلاش میں ہیں تو یہ ہندوستان میں موجود ہے۔ اگر آپ کرۂ ارض پر سرد ترین آباد جگہ ڈھونڈ رہے ہیں تو وہ بھی آپ کو بھارت میں مل سکتی ہے۔ سری نگر سے لیہہ (لداخ) جانے والی سڑک پر واقع ڈراس نامی گاؤں میں سردیوں میں سائبریا کے گاؤں جتنا کم درجۂ حرارت ریکارڈ کیا گیا ہے۔ اوپر ہمالیہ پر جو دنیا کا سب سے اونچا سلسلۂ کوہ ہے آپ کو بھری گرمیوں میں بھی برف دیکھنے کو ملے گی۔ اگر آپ نیچے میدانوں میں آئیں تو آپ دسمبر میں گلاب کے پھولوں کی بہار دیکھیں گے۔ یہاں پہاڑوں پر اسکیئنگ کی جاتی ہے۔ قطبین کے خطوں کو چھوڑ کر دنیا کی کسی اور جگہ کے مقابلے میں بھارت کے زیادہ علاقوں میں سارا سال برف جمی رہتی ہے۔ دنیا کے کسی اور ملک کی بہ نسبت بھارت میں سفید اور صاف شفاف پانی کے زیادہ چشمے ہیں جو آپ کو دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

جب آپ بھارت کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ایک بات ذہن میں رکھیے کہ یہاں سوالوں کے بندھے ٹکے جواب نہیں ہیں۔ ہو بھی نہیں سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ بھارت ہزارہا برس سے صفحۂ زمین پر موجود ہے۔ جو کچھ بھی ہوسکتا ہے وہ بار بار اس کے ساتھ ہوچکا ہے۔ قدیم ہندوستانی لٹریچر میں ایسے ہتھیاروں اور پر پلسن سسٹم کا ذکر ملتا ہے جو ایٹم بموں، راکٹوں اور غالباً سپر لیزر کا بیان ہوسکتا ہے۔ کچھ لوگوں کا یقین ہے کہ سمندری سفر کے دلدادہ ہندوستانی زمانہ قدیم میں سمندر میں سفر کرتے ہوئے دریائے نیل کے آس پاس کے زرخیز علاقے میں بس گئے تھے اور انھوں نے ہی قدیم مصری تہذیب کو جنم دیا۔ صفر اور اعشاریہ اور شطرنج کی ایجاد ہندوستانیوں ہی نے کی۔ جراحی کے اولین اسکول بھی انھوں نے ہی قائم کیے۔ چائے کی دریافت کا سہرا بھی ہندوستانیوں کے سر ہے۔ انھوں نے بے زنگ لوہا تیار کیا۔ ایشیا کے جنگی فنون کی ایجاد کی ۔ ۔ ۔ دنیا کے چار مذاہب ہندوستان ہی سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیلے۔

ایشیا کا پہلا مسیحی کلیسا اور پہلی اسلامی مسجد ان دونوں مذاہب کے مشنریوں نے تعمیر کی۔ یہ سمجھنے کی

وجہ ہے کہ جن تین دانشمندوں نے بیت الحم میں طفل جیسس سے ملاقات کی تھی کیونکہ انھوں نے "اس کا ستارہ مشرق میں طلوع ہوتے دیکھا تھا"، وہ ہندوستان ہی کے تھے اور یہ بات بھی ناممکن نظر نہیں آتی کہ جیسس نے مخفی سالوں میں ہندوستان میں تعلیم حاصل کی۔

ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے اور یہاں مسلمانوں کی تعداد اسلامی جمہوریۂ پاکستان سے زیادہ ہے۔

دراصل ہندوستان تمام مذاہب و عقائد کے تئیں رواداری برتتا رہا ہے۔ انگریز یہاں مذاہب و عقائد، فرقوں اور رسم و رواج کی کثرت کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔

بے شمار عقائد کی اس سرزمین کی تہذیب ۵۰۰۰ سال پرانی ہے۔ دنیا کے ہر نسلی گروپ کے لوگ یہاں موجود ہیں۔ یہاں سال میں پانچ موسم ہیں۔ ہر دن ایک تہوار ہوتا ہے۔ اس کے مختلف علاقے اتنا گوناگوں ہیں کہ یقین نہیں ہوتا۔ اس کا ساحل ۵۱۶،۷ کلو میٹر لمبا ہے جس پر سیر و تفریح کے لیے BEACHES بنے ہوئے ہیں۔ اس کے قومی پارکوں میں ایسے جانور بحفاظت رہ رہے ہیں جن کی نسل ختم ہونے والی ہے۔ اس کے ریگستانوں میں داستان الف لیلیٰ کی طرح کے فصیل بند شہر ہیں۔ لداخ کا بلند ترین خطہ ہے۔

ہندوستان میں ۱۶۵۲ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن وہ ان سب زبانوں کے بولنے والوں کو ملا کر ایک واحد قوم بن گیا ہے۔۔۔۔۔ یہاں اتنی پیچیدگی ہے کہ کوئی بھی ہندوستان کو سمجھنے یا اس کی تشریح کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

سب سے اچھا تو یہی ہے کہ آپ خود ہندوستان کا دورہ کریں، اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھیں اور سمجھیں۔ ●

بقیہ: ہوا بازی اور سیاحت ۔ ایک مربوط تعلق

مشترکہ مارکٹنگ کے لیے بھی حکمت عملی وضع کی جا رہی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی بڑی گھریلو ایئر لائن "انڈین ایئر لائنز"، بھی سمندر پار ملکوں کے سیاحوں کو کئی ترغیبات فراہم کر رہی ہے۔ ڈالر کی شکل میں کرایہ ادا کرنے والے غیر ملکی سیاحوں کو ملک کے کسی بھی حصے تک سفر کرنے کے لیے کرائے میں ڈسکاؤنٹ دیا جاتا ہے۔

انڈین ایئر لائنز کے پاس ۵۲ ہوائی جہازوں کا بیڑہ ہے۔ مزید ۲۵ ہوائی جہاز پرائیویٹ ایئر لائنیں اور ایئر ٹیکسی آپریٹرز چلا رہے ہیں۔ پرائیویٹ آپریٹروں کے لیے ملک کے شمال مشرقی حصے تک کچھ پروازیں چلانا لازمی ہے۔ یہ خطہ اب سیاحوں کے لیے کھولا جا رہا ہے اور سطحی ٹرانسپورٹ سے وہاں کی کئی جگہوں تک جانا آسان نہیں ہے۔

تمام گھریلو ہوائی سروسوں میں کم از کم ۲۵ فی صد نشستیں غیر ملکی سیاحوں کے لیے ریزرو ہوتی ہیں خواہ وہ انفرادی طور پر سفر کریں یا گروپ کی شکل میں۔ یہ سیٹیں فلائٹ کی روانگی سے ۲۰ گھنٹے قبل تک محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ مسافر اس کوٹا کے ٹکٹ ٹریول ایجنٹوں اور انٹر لائن پارٹنروں سے خرید سکتے ہیں۔ ادائیگی کسی بھی قابل قبول غیر ملکی کرنسی میں کی جا سکتی ہے۔

جس طرح مختلف ملکوں کے لیے شہری ہوا بازی اور سیاحت کی ترقی کے امکانات ایک جیسے ہیں اسی طرح وہ مسائل بھی یکساں ہیں جن کا انھیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ مسائل ہیں ہوائی اڈوں اور فضائی علاقوں میں بھیڑ بھاڑ۔ مسافروں کے لیے سہولیات، ماحولیاتی مسائل اور مالی وسائل کی کمی۔ ان مسائل کی وجہ بین اقوامی سیاحوں کی آمد اور ہوائی سفر دونوں میں ہونے والے اضافے ہیں۔ اس امر کا امکان ہے کہ دنیا بھر میں لوگوں کے پاس فرصت کے اوقات اور خرچ کی جا سکنے والی آمدنی میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان میں بھی مزید اضافہ ہو گا کیونکہ جب لوگوں کے پاس زیادہ پیسہ اور فرصت ہو گی تو وہ لمبی مسافتوں کا سفر کریں گے اور مختصر چھٹیاں گزارنے کے لیے بھی دلچسپی دکھائیں گے۔

تاہم جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ عالمی ٹورازم مارکیٹ میں ہندوستان کا حصہ نصف فی صد سے بھی کم ہے۔ گزشتہ سال ۳۲ لاکھ غیر ملکی جن میں پاکستانی اور بنگلہ دیشی بھی شامل تھے ہندوستان آئے۔ ایک عام سیاح اوسطاً ۲۸ روز ہندوستان میں ٹھہرتا ہے۔ بوڑھے اور کاروبار کے لیے آنے والے سیاح جن کی انفرادی سالانہ آمدنی ۴۰۰۰ ڈالر سے زیادہ ہے تین سے دس روز کے لیے ہندوستان آتے ہیں۔

امکان یہ ہے کہ مستقبل میں اور زیادہ کاروباری افراد اور خواتین ہندوستان کے دورے پر آئیں گی۔ ہوائی جہازوں کی آمد و روانگی کے شیڈول کی پابندی کے لیے اصرار بڑھے گا اور اس کے لیے نئی چنوتیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بات ماننی پڑے گی کہ تاخیر و پریشانیوں سے پاک ہوائی سفر کی سہولت سیاحت کی ترقی کی ضامن ہے۔

ایس۔ ایس۔ ایچ۔ رحمان

سیاحت کو فروغ دینے کی حکمت عملی

مصنف کا کہنا ہے کہ ہمارے سامنے اہم کام اس بات کو تسلیم کروانا ہے کہ سیاحت ترقی اور قومی یک جہتی کا ایک ذریعہ ہے۔ ان کے خیال میں مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے ہماری حکمت عملی ملک کے اندر اور باہر سیاحت کی اہمیت کے بارے میں بیداری پیدا کرنا اور اس کے لیے ضروری ڈھانچہ تیار کرنا ہونی چاہیے۔

عالمی سیاحت وہ انڈسٹری ہے جس میں ۳۵۰ بلین ڈالر کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ ہر دسواں انسان ایک مسافر ہے۔ اسپین نے رجو پانچ کروڑ سیاحوں کی میزبانی کرتا ہے اسیاحت کو فروغ دینے میں جس نمایاں کامیابی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھارت کے لیے قابل تقلید ہے۔ ہمارا ہمسایہ چین بھی اس میدان میں تیز رفتار ترقی کی جانب گامزن ہے۔ اگر ہم بھی فروغِ سیاحت پر توجہ مرکوز کریں تو ہم بھی سیاحت کے بین اقوامی منظر میں، جہاں چین اور مشرق بعید کے دوسرے ممالک کو کافی اہمیت حاصل ہے، اپنا مقام پیدا کر سکتے ہیں۔

وقت آگیا ہے کہ بھارت ایشیا کی بڑھتی ہوئی مارکیٹ میں سیاحت کے کیک کا ایک بڑا ٹکڑا حاصل کرنے کے ایک لمبی جست لگائے۔ جغرافیائی طور پر بھارت کا سیاحت کی دنیا میں جو محل وقوع ہے اس سے بہتر محلِ وقوع کی وہ خواہش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایشیا میں اتنی اچھی جگہ واقع ہے کہ وہ مشرق اور مغرب دونوں سمتوں میں بہنے والی سیاحت کی لہروں سے حاصل ہونے والے فائدوں سے مستفید ہو سکتا ہے۔

بھارت کو اپنی ہزارہا سال پرانی وراثت کی بدولت عظیم الشان وسائل ورثے میں ملے ہیں، اس کے مناظر قدرت بے حد حسین اور گوناگوں ہیں اور اس کے یہاں شاندار ثقافتوں اور مختلف قسم کے لوگوں کا خوب صورت سنگم پایا جاتا ہے اس لیے وہ عالمی سیاحت کے میدان میں بخوبی ایک اہم مقام حاصل کر سکتا ہے۔

بھارت میں سیاحوں کی خاص کشش کی چیزیں ہیں ایڈوانچر اسپورٹس، تاریخی عمارات، مشاہدۂ قدرت اور بے نظیر ثقافتی اور مذہبی تجربات اتنی کشش انگیز اور گوناگوں چیزیں انھیں بہت کم ملکوں میں دیکھنے کو ملتی ہوں گی۔

مشکل پسند رکھنے والا سیاح بھی ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں ایک تہائی سے بھی کم قیمت پر یہاں اپنی پسند کے مقامات دیکھ سکتا ہے۔

موجودہ تناظر

ہم سیاحوں کی آمد کے لیے اپنا نشانہ لگاتا بڑھاتے رہے ہیں حتیٰ کہ یہ بیس لاکھ سے پچاس لاکھ تک پہنچ گیا ہے۔ ہماری کمائی میں اتنا زیادہ اضافہ حقیقی سیاحوں یا یوں کہیے کہ فالتو وقت میں سیاحت کے لیے آنے والوں سے نہیں ہوتا جتنا کہ کاروباری سیاحوں سے ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ چھٹیاں گزارنے کے لیے آنے والے سیاحوں سے ہونے والی

اس بات کی فوری ضرورت ہے کہ کمروں کے علاوہ سیاحت کے دوسرے لوازمات مثلاً کافی تعداد میں جدید ہوائی اڈوں، ہوائی [illegible] سڑکوں، جہازوں میں زیادہ نشستوں، ہوٹلوں [illegible] خدمات، بہتر [illegible] بہتر [illegible] سیاحت اور [illegible] کے [illegible] بہتر [illegible] موزوں [illegible] سہولیات کا اہتمام کیا جائے۔

آمدنی گھٹ گئی ہے جو ایک قابل فکر معاملہ ہے۔

پانچ سال کی مدت میں ہمارے ملک میں سیاحوں کے لیے ۰۰۰... کمروں کی کمی محسوس کی گئی ہے جب کہ آئندہ ۳۶ مہینوں میں تیس ہزار کمروں کی کمی ہوگی۔ اس بات کی فوری ضرورت ہے کہ کمروں کے علاوہ سیاحت کے دوسرے لوازمات مثلاً کافی تعداد میں جدید ہوائی اڈوں،

ہوائی سروسوں، جہازوں میں زیادہ نشستوں، موثر مواصلاتی خدمات، بہتر صفائی ستھرائی، بہتر حفظانِ صحت نیز سیاحت اور سیاحوں کے تئیں بہتر رویے جیسی موزوں بنیادی سہولیات کا اہتمام کیا جائے۔ دیسی ڈھانچے کی مطلوبہ سہولیات میں اضافے کے بغیر سیاحت کو فروغ دینے کی کوششوں سے غیر مطمئن سیاحوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوگا۔

سیاحت ایک ایسی صنعت ہے جس سے روزگار پیدا ہوتا ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء جیسے ہلکے سال میں بھی ہندوستانی سیاحت کی انڈسٹری نے دس لاکھ سے زائد لوگوں کے لیے روزگار پیدا کیا۔

فائدے

ملک کے اندر عوام کو یہ محسوس کرانے کی ضرورت ہے کہ ہندوستانی سیاحت کے فروغ سے قریب قریب ہر شخص کو فائدہ ہوگا۔ کاروباری طبقے، تاجروں، دکانداروں، رہائشی ہوٹلوں، طعام خانوں، مالی سروسوں، ٹرانسپورٹ انڈسٹری، فنون اور دستکاریوں اور خوب صورت مقامات والے خطوں کو، خواہ کتنی ہی دور واقع ہوں، فائدہ پہنچے گا۔

سیاحت ایک ایسی صنعت ہے جس سے روزگار پیدا ہوتا ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء جیسے ہلکے سال میں بھی ہندوستانی سیاحت کی انڈسٹری نے دس لاکھ سے زائد لوگوں کے لیے روزگار پیدا کیا۔ اندرونِ ملک سیاحت سے ایسے فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتے۔ چونکہ سیاحت سے مختلف خطوں کے لوگوں کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا ہوتی ہے اس لیے یہ قومی یک جہتی پیدا کرنے کا شاید سب سے موثر ذریعہ ہے۔ ایک اور بات جو محسوس نہیں کی جاتی یہ ہے کہ فروغِ سیاحت سے ملک کی غیر ملکی زرِ مبادلہ کی آمدنی میں تو اضافہ ہوتا ہی ہے، مربوط اجتماعی ترقی بھی ہوتی ہے جس سے لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ بہت سی باتوں کے لحاظ سے سیاحت اپنے بل پر کھڑا رہ سکنے والا کاروبار ہے بشرطیکہ اس کے لیے مطلوبہ بنیادی ڈھانچہ فراہم کر دیا جائے۔

مثال کے طور پر سیاحت بھارت کے لیے نہ صرف غیر ملکی زرِ مبادلہ کمانے کا واحد سب سے بڑا ذریعہ ہے بلکہ یہ اس کی کثیر جہت ترقی کا سارا خرچ برداشت کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ سال کا پیٹرولیم مصنوعات کا بل ۴۰ فی صدی کی حد تک ادا کرنے کی اہل ہے۔

اہم کام

اہم کام یہ ہے کہ سیاحت کو ترقی اور قومی یک جہتی کا ایک ذریعہ تسلیم کیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بھارت کے پُرکشش مقامات کو "سیاحوں کی جنت" کے طور پر مشہور کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ بنیادی ڈھانچے کی سہولیات کو بہتر بنایا جائے۔ اور پھر "پروڈکٹ کی مارکیٹنگ" پر نتیجہ خیز انداز سے توجہ دی جائے۔ وقت آگیا ہے کہ سیاحت کے کاروبار سے وابستہ تمام طبقات موجودہ حقیقتوں اور مستقبل کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مل کر ایک موزوں حکمت عملی تیار کریں۔ اس سلسلے میں جس بات پر زور دینے کی

اہم کام یہ ہے کہ سیاحت کو ترقی اور قومی یک جہتی کا ایک ذریعہ تسلیم کیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بھارت کے پُرکشش مقامات کو "سیاحوں کی جنت" کے طور پر مشہور کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ بنیادی ڈھانچے کی سہولیات کو بہتر بنایا جائے۔ اس سلسلے میں جس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ مضبوط سیاسی عزم اور عوامی حمایت تبھی سیاحت اس ملک میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

ضرورت ہے وہ ہے مضبوط سیاسی عزم اور عوامی حمایت تبھی سیاحت اس ملک میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

سمت

بھارت کو اگلے دس برسوں میں سیاحوں کی ایک سب سے زیادہ پسندیدہ منزل بنانے کے مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے سیاحت کی انڈسٹری کو مرکزی اور ریاستی حکومتوں، شہری حکام، ہوائی کمپنیوں، ہوٹلوں، ٹریول/ ٹور/ ٹرانسپورٹ ایجنسیوں کے ساتھ گہرا تال میل قائم کر کے حکومت سے ایک آواز میں بات کرنی ہوگی تاکہ شہری آسائشوں کو بہتر بنانے، سڑک سے سفر کے لیے بہتر سڑکیں فراہم کرنے، [illegible] شاہراہیں تعمیر کرنے اور یادگار عمارات میں مہمانوں کے لیے مراکز قائم کرنے کے لیے کارروائی جلد از جلد شروع کی جا سکے۔ سیاحت کے امکانات ترقی سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے ایک تین نکاتی منصوبے پر غور کیا جا سکتا ہے۔ سیاحت کے کاز کی موثر تکمیل کو مختصر ترین انداز میں ایک ہی لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے AIM (جس کے تین حروف ہیں اے، آئی اور ایم)

اے، کے معنی ہیں سیاحت کے بارے میں AWARENESS یعنی بیداری

سماج میں سیاحت کے امکاناتِ ترقی اور اس کے اقتصادی ترقی اور سماجی تبدیلی کا ایک ذریعہ ہونے کے بارے میں بیداری ہونی چاہیے۔ ضروری ہے کہ سیاح میں اس بات کا احساس ہو کہ اس کا استقبال کیا جا رہا ہے۔ میزبان ملک میں عوام سے رابطے کے ہر مقام پر اس کے ساتھ تسلی بخش سلوک کیا جانا چاہیے۔

آئی، کا مطلب ہے انفراسٹرکچر یا بنیادی ڈھانچہ

سیاحت کی انڈسٹری کے اپنے تصورات و تجاویز نہایت واضح انداز میں بیان کیے جانے چاہئیں اور بین اقوامی اور ملکی مسافروں کی خصوصی ضرورتوں پر توجہ دی جانی چاہیے تاکہ ان کے لیے نقل و حمل

باقی صفحہ ۴۹ پر

رابندر سیٹھ

ہندوستان میں سیاحت: ایک جائزہ

سیاحت نہ صرف یہ کہ غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہے بلکہ یہ ہندوستان جیسے ایک وسیع اور متنوع ملک کے لیے یوں بھی اہم ہے کہ یہ قومی یک جہتی اور سماجی و ثقافتی یگانگت کے فروغ میں بھی معاون ہوتی ہے اور سماجی، اقتصادی ترقی میں کلیدی رول انجام دیتی ہے، امید کی جانی چاہیے کہ ارباب اقتدار اس صنعت پر خاطر خواہ توجہ کریں گے

سیاحت سماجی، اقتصادی ترقی کا اسی طرح ایک حصّہ ہے جس طرح اس سے متعلق دیگر سرگرمیاں ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ کسی مقام کی سیاحت اور مجموعی ترقی لازم و ملزوم کی طرح ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ صنعتی ترقی یافتہ مغرب بشمول شمالی امریکہ اور یورپ اور اب جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی روز افزوں اقتصادی ترقی کی مثالیں ذہن میں رکھیے تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ سیاحت اور ترقی میں ایک خاص ربط ہے۔ ہندوستان کی مثال لیجیے۔ یہاں باضابطہ سیاحت کا آغاز پچاس کی دہائی میں ہوا۔ انہی دنوں منصوبہ بند ترقی کا آغاز بھی ہوا۔ اب یہ اور بات ہے کہ آج تقریباً پچاس برس کے بعد بھی سیاحت کی عالمی تجارت میں ہندوستان کا حصّہ آٹے میں نمک برابر (اعشاریہ ۴ فی صد) ہے۔ یہاں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بین اقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک دونوں ہی نے سیاحت کو آمدنی اور روزگار کا سب سے بڑا وسیلہ قرار دیا ہے۔

سیاحت کی افادیت

سیاحت کی صنعت کے پھل پھول نہ پانے کے متعدد اسباب ہوسکتے ہیں جن پر گفتگو پھر کبھی ہوگی۔ سر دست ہم اُن ترجیحات کو لیتے ہیں جن کا روزمرّہ کی زندگی سے تعلق ہے مثلاً صحت، پانی اور اقامت گاہ لیکن اس کے لیے سیاحت کے ساتھ ہندوستان کے خصوصی تعلق کا تجزیہ ضروری ہے۔ تقریباً ۱۸ لاکھ لوگوں کو میزبانی کی خدمات سے روزگار ملتا ہے۔ اس میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو سیاحت سے وابستہ دوسرے مشاغل سے جڑے ہوئے ہیں۔ جیسے کہ جو ٹریول ایجنسیوں میں کام کرنے والے یا دیہی دستکار یا لوک کلاکار یا قالینوں کی صنعت وغیرہ سے وابستہ لوگ۔ ہندوستان جیسے جغرافیائی طور پر وسیع اور متنوع تہذیبوں والے ملک میں یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ اندرون ملک زیادہ سے زیادہ لوگ سیاحت کریں تاکہ ان میں یگانگت کا جذبہ پیدا ہو۔ بہ الفاظ دیگر سیاحت قومی یک جہتی کے فروغ اور سماجی و ثقافتی زندگی میں بیداری پیدا کرنے میں بھی معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر تمام ریاستوں سے دس فی صد لوگ بھی دوسری ریاستوں کی سیاحت کرتے ہیں تو تقریباً نو کروڑ لوگ بیک وقت سفر میں ہوں گے۔ یہ کوئی کم بڑی بات نہیں کہ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کو گھومتے پھرتے ہی اپنے ملک سے اور اپنے لوگوں سے اور زیادہ قربت کا احساس ہو۔

اس کے بعد معاملہ آتا ہے ان کو خدمات فراہم کرنے کا۔ مثلاً ان کے قیام، طعام اور ٹرانسپورٹ کا انتظام۔ ان خدمات سے ہی لاکھوں لوگوں کو روزگار حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ تو بات ہوئی اندرون ملک سیاحت کی جو اگرچہ ایک بہت اہم حصّہ ہے لیکن یہ اس گفتگو کا صرف ایک باب ہے۔ سیاحوں کے اس طبقے کو خدمات فراہم کرنے کے لیے جو بنیادی ڈھانچہ درکار ہے اس میں بھی خاصا سرمایہ لگانے کی ضرورت ہے۔ اس کا ایک اور افادی پہلو یہ ہے کہ یہ غیر ملکی سیاحت کے لیے بھی کارآمد ہوسکتا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ہوٹل اور ریسورنٹ میں، جو سیاحت کی صنعت کا بنیادی جزو ہیں۔ اگر دس لاکھ روپیے کی سرمایہ کاری کی جاتی ہے تو اس سے ۹۰ لوگوں کو روزگار حاصل ہوتا ہے جب کہ اتنا ہی پیسہ زراعت میں لگایا جائے تو تقریباً ۴۸ لوگوں کو اور کارخانوں میں تقریباً ۱۷۰ افراد کو روزگار ملتا ہے۔ اس تعداد میں اور بھی اضافہ ہوسکتا ہے

اگر آپ ہوٹلوں اور ریستورانوں سے وابستہ دیگر کاروباروں کو بھی شمار کرلیں۔ ایسے میں سب سے زیادہ الجھن اس بات پر ہوتی ہے کہ سیاحت پر ابھی لوگوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی جنھیں توجہ دینی چاہیے تھی حالانکہ اس بات کو سبھی مانتے ہیں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ حاصل ہوسکتا ہے اور یہ لوگوں کے میں یگانگت بھی پیدا کرتی ہے۔ اس رویے کی وجہ غالباً یہ خام خیالی ہے کہ سیاحت سے صرف اہل ثروت طبقے کو دلچسپی ہوتی ہے۔ اس بے اعتنائی کے باوجود ایک مزے کی بات یہ ہے کہ سیکڑوں ہزاروں سرکاری ملازمین ہر سال LEAVE TRAVEL FACILITY کا فائدہ اٹھا کر سیاحت کرتے ہیں اور گھریلو سیاحت کو خاطر خواہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔

زیارتی سیاحت

ہندوستان میں گھریلو سیاحت کا تصور خاصا قدیم ہے اگرچہ اس کا مقصد جدید سیاحت کی طرح یکسانیت سے چھٹکارا پانا نہیں بلکہ روحانی ہوتا تھا۔ صدیوں پہلے کے بنے ہوئے سرائے اور دھرم شالے جن میں سے کچھ اب بھی موجود ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ لوگ ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے کا سفر کرتے تھے۔ مذہب پر اعتقاد رکھنے والا ہر ہندو سمجھتا ہے کہ پوتر استھانوں اور تیرتھوں کی یاترا کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔ مسلمان بھی مختلف درگاہوں پر حاضری دینے پہنچتے ہیں۔ اسی طرح جینیوں، بودھوں، عیسائیوں اور سکھوں کے بھی اپنے متبرک مقامات ہیں جہاں وہ زندگی میں کم از کم ایک بار جانا ضروری سمجھتے ہیں۔

زیارتوں یا یاتراؤں سے متعلق سیاحت کا سلسلہ ہماری روایت سے ملتا ہے جسے عقائد اور اعتقادات نے اور مستحکم کیا۔ لیکن اب

آمد و رفت کے ذرائع اور ترسیل میں ترقی اور آمدنی میں اضافہ کی وجہ سے لوگوں میں اور طرح کی دلچسپیاں بھی پیدا ہوگئی ہیں۔ لوگ اپنے پریوار کے ساتھ ایسے مقامات پر جانا چاہتے ہیں جہاں وہ اپنی آنکھوں سے خوبصورت مناظر، قدیم یادگاریں وغیرہ دیکھ سکیں یا موسم کی مناسبت سے تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے پہاڑی مقامات یا ساحلی علاقوں کی سیر کرسکیں۔ یہ رجحان حال ہی میں پیدا ہوا ہے اور اب مقامی لوگ اور انتظامیہ اس بات کو ماننے لگے ہیں کہ اس نئے رجحان کی بدولت سیاحتی دلچسپی کے مقامات کی ترقی کے امکانات روشن ہوئے ہیں۔

> [illegible] اور عالمی بینک دونوں نے سیاحت [illegible] سے بڑا وسیلہ قرار دیا ہے۔

غیر ملکی سیاح

اندرون ملک سیاحت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بین الاقوامی سیاحت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ پچھلے سال کے تجزیے کے مطابق ہندوستان میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ غیر ملکی سیاح آچکے ہیں۔ اگرچہ یہ شمارہ بہت جاذب معلوم ہوتا ہے لیکن ہر سال ۵۰۰ ملین لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے ہیں اور اس حساب سے ہندوستان آنے والے سیاحوں کی تعداد بہت کم ہے۔ عالمی سیاحت کا حصہ مجموعی بین الاقوامی برآمدات کی کل آمدنی کے تقریباً آٹھ فی صد کے برابر ہے۔ سیاحت کے فروغ کی موجودہ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس میں بین الاقوامی سطح پر ۳ر۵ سے ۵ فی صد کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اربوں روپے کی تجارت اور آمدنی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بین الاقوامی سیاحت میں ہندوستان کا حصہ بہت کم ہے، ۱۹۹۵ء میں غیر ملکی سیاحوں سے تقریباً ۹ ہزار کروڑ روپے کا زرمبادلہ حاصل ہوا۔ اگر زیورات اور جواہرات کی تجارت کو حساب میں نہ رکھا جائے تو ملبوسات کی صنعت کے بعد ملک کی غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی سب سے زیادہ سیاحت سے ہوئی۔

> ہندوستان میں گھریلو سیاحت کا تصور خاصا قدیم ہے اگرچہ اس کا مقصد روحانی ہوتا تھا۔

ضمنی اثرات

پچھلے پانچ برسوں سے ملک میں اقتصادی اصلاحات کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، سیاحت پر اس کے مثبت اثرات یوں پڑے ہیں کہ اس دوران کاروباری غرض سے آنے والے غیر ملکیوں کی تعداد خوب رہی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مہمانوں کے لیے بہتر قیام و طعام اور انھیں دیگر خدمات مثلاً جدید ٹکنالوجی اور ترسیل کے وسائل فراہم کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔ سبھی جانتے ہیں کہ بالخصوص میٹرو شہروں — بمبئی، دہلی، مدراس اور بنگلور میں غیر ملکی تاجروں کی آمد و رفت میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ بڑے صنعتی گھرانوں اور سرمایہ داروں نے ہوٹل کی صنعت میں بھی سرمایہ لگانا شروع کیا بلکہ جو لوگ اس صنعت میں پہلے سے موجود تھے انھوں نے بھی اپنے کاروبار میں توسیع کی۔ اگرچہ کاروباری مقصد سے آنے والوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ایک خوش آئند بات ہے کہ اس سے آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ ملک کی اقتصادی ترقی اور غیر ملکی سرمایہ کاری کی علامت ہے لیکن اس خامی کا بھی اندازہ ہوا کہ ملک میں ڈھانچہ کی سہولیات ناکافی ہیں۔ مایوسی کی بات ہے کہ سیاحتی ایجنسیاں اور اس سے وابستہ تجارت نے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار نہیں رکھا تھا۔ اس کے طفیل سیاحتی منصوبوں کی خامیاں اور کوتاہیاں بھی اجاگر ہوئیں۔

سیاحت میں بتدریج اضافہ کے مدنظر ایسی تمام سہولیات اور مقامات پر توجہ دی گئی جن میں سیاحوں کی دلچسپی ہوسکتی ہے۔ یہاں تک کہ متعدد نئے سیاحتی مراکز بنائے گئے۔ ان میں سے بیشتر مقامات ان سیاحوں کے لیے ہوتے ہیں

جو چھٹیاں گزارنے یا تفریحِ طبع کے لیے آتے ہیں۔ لیکن ایسے میں جب کہ ان مقامات کی طرف سیاح راغب ہوئے تو کھلا کہ چھوٹی بڑی بہت سی سہولیات جو ایسے مقامات کے لیے ضروری ہوتی ہیں، ناکافی ہیں۔ بعض بنیادی چیزیں مثلاً صفائی ستھرائی، راستے، سواریاں، قیام کے بہتر انتظامات اور سب سے بڑھ کر اچھے گائڈ کی سخت کمی ہے۔

ہندوستان کے بیشتر سیاحتی مقامات پر یہ کمیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر آگرہ کو لیجیے۔ یہاں ہوٹلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر پر کافی سرمایہ لگایا گیا لیکن ان میں سے بیشتر خالی ہی رہتے ہیں جب کہ آگرہ یا اسی طرح کے دیگر سیاحتی مقامات کے قریب کے بڑے شہروں میں سیاحوں اور مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے ہوٹل کے کمرے مشکل سے خالی ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ چھوٹے مگر اچھے سیاحتی مقامات پر ایسی بنیادی سہولیات میسر نہیں کہ سیاح وہاں قیام کر سکیں۔ بڑے شہروں میں بھیڑ بھاڑ کے کا سبب ایک تو اس سلسلے کی منصوبہ بندی کی خامیاں ہیں کہ اول تو کئی وجہوں سے ہوٹلوں کی تعمیر کے لیے زمینیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ دوم یہ کہ سیاحوں کی بھیڑ کو کم کرنے کے لیے آس پاس کے سیاحتی مقامات کو ویسا پُرکشش بنانے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ دہلی۔ آگرہ، جے پور جیسی مثال متعدد دوسرے مراکز کے لیے بھی درست ہو سکتی ہے۔ مگر یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب سیاحت سے متعلق مختلف شعبے ایک دوسرے سے تال میل پیدا کریں اور اس صنعت کو زیادہ سے زیادہ پُرکشش اور منافع بخش بنانے کے لیے پیش قدمی کریں۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ پچھلے تین چار برسوں کے دوران حکام کے رویے میں مثبت تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔

خوش آئند رجحان

غیر ملکی سیاحوں کو راغب کرنے کی دشواری میں ایک بہت بڑی رکاوٹ اندرونِ ملک ہوائی پروازوں کی کمی بتائی جاتی ہے۔ لیکن اب پرائیویٹ کمپنیوں کو ہوائی خدمات شروع کرنے کی اجازت دے کر اس مسئلے پر کسی حد تک قابو پالیا گیا ہے۔ انڈین ایئر لائنز نے اپنی سروسز میں تیس A ۳۲۰ طیاروں کا اضافہ کیا ہے۔ اسی نے اپنی ایک ذیلی پرواز الائنس ایئر (ALLIANCE AIR) بھی شروع کی ہے جو خاص طور سے سیاحتی مقامات کے لیے ہے۔

پرائیویٹ کمپنیوں کو بھی نئے ہوائی اڈے بنانے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ ریاستی سرکاروں نے بھی پرامن ہوائی پٹیوں کو فیڈر سروس کے لیے کھولنے کی پیش کش کی ہے۔ کوچین اور کالی کٹ نے ہوائی اڈوں کی تعمیر میں پرائیویٹ کمپنیوں کی شرکت کی ایک نئی مثال قائم کی ہے، جب کہ بنگلور میں ایک بین اقوامی ہوائی اڈہ قائم ہوگا جو ایک پرائیویٹ کمپنی کے زیرِ انتظام ہے۔ چارٹر پروازوں کے بھی نئے امکانات کھلے ہیں۔ ادھر ریلوے نے بھی سیاحت کے فروغ میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا ہے۔ شتابدی، پیلیس آن وہیلس اور رائل اورینٹ جیسی ٹرینوں کا چلایا جانا نہایت صحیح اقدام ہے۔ اس کے بعد پرائیویٹ کمپنیوں کی طرف سے آرام دہ سیاحتی ٹرینیں بھی شروع ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ ریلوے محکمے نے ایک بڑا دانشمندانہ کام یہ کیا ہے کہ تقریباً سو مختلف ریلوے اسٹیشنوں کے باہر ہوٹل قائم کرنے کے لیے انتظامیہ سے زمینیں طلب کی ہیں تاکہ مسافروں کے لیے قیام کا انتظام بھی ہو جائے اور ریلوے کو اس سے آمدنی بھی ہو۔

میزبانی کی خدمات کو مالی سہولیات فراہم کرنے کے لیے ٹورزم فائنانس کارپوریشن (ٹی ایف سی آئی) قائم کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مرکز اور ریاستوں کے مالیاتی ادارے بھی سیاحت سے متعلق پروجیکٹوں کے قرضے فراہم کر رہے ہیں۔

اگرچہ درج بالا رجحانات ایک امید افزا تصویر پیش کرتے ہیں لیکن ان کے ساتھ کچھ اڑچنیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ زمینوں کی دستیابی کا ہے۔ گو کچھ ریاستوں نے صورت حال کو بہتر بنانے کی خاطر سرکاری زمینیں یا اکوائر کی ہوئی زمینیں الاٹ کرنے کی پیش کش کی ہے لیکن حالیہ شواہد اور تجزیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سمت کوئی خاص کام نہیں ہوا ہے۔ کسی بھی سیاحتی مقام پر اور خاص طور سے میٹرو شہروں میں نئے پروجیکٹ اس وقت تک نہیں لگائے جا سکتے جب تک کہ مناسب قیمت پر زمینیں دستیاب نہ ہوں۔ اس کے ساتھ جڑا ہوا اور اتنا ہی اہم معاملہ سڑکوں اور ٹرانسپورٹ کا ہے۔ ملک میں بہ مشکل ہی کوئی شاہراہ ایسی ہے جس پر بیک وقت چار چھ گاڑیاں چل سکتی ہوں۔ دہلی اور آگرہ کے بیچ فاصلہ صرف ۲سو کلومیٹر کا ہے لیکن سڑک کے سفر میں پانچ گھنٹے لگتے ہیں۔ پچھلے چار برسوں سے بات چل رہی ہے کہ ایکسپریس وے پروجیکٹ کی تعمیر کا کام پرائیویٹ کمپنیوں کو سونپ دیا جائے لیکن آج تک کسی بھی ایک پروجیکٹ کا کام شروع نہیں ہو سکا۔ امید بنتی ہے کہ بڑی غیر ملکی آٹوموبائل کمپنیوں کی ہندوستان میں آمد سے روڈ ٹرانسپورٹ کی صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔ بجلی اور ٹیلی مواصلات کی پوری طرح نجی کاری کے بعد بھی سفر اور سیاحت کی صنعت میں قابلِ لحاظ بہتری آئے گی۔

سیاحت کے فروغ کے لیے ان لازمی سہولیات کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ضروری ہیں۔ مثلاً یہ کہ امن و استحکام کا ماحول ہو، جہاں سیاح

پچھلے پانچ برسوں سے ملک میں اقتصادی اصلاحات کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، سیاحت پر اس کے مثبت اثرات یوں پڑے ہیں کہ اس دوران کاروبار کی غرض سے آنے والے غیر ملکیوں کی تعداد خوب رہی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مہمانوں کے لیے بہتر قیام و طعام اور ایسی دیگر خدمات مثلاً جدید ٹکنالوجی اور ترسیل کے وسائل فراہم کرنے کی طرف توجہ دی گئی۔

جانی اور مالی طور پر اپنے کو محفوظ محسوس کرسکیں۔ جہاں انہیں بات بے بات الجھنوں سے واسطہ نہ پڑے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ تمام ممالک جہاں سے سیاح آسکتے ہیں وہاں سے ہوائی آمد و رفت کی خدمات کو توسیع دیا جانا چاہیے اور اس کے لیے ہوائی سفر کی پالیسی میں کچھ نرمی پیدا کرنی ہوگی۔

سیاحت کی ترقی کے لیے ایک بے حد لازمی امر یہ ہے کہ مرکزی اور ریاستی سرکاریں اس کے تئیں سیاسی عزم و استحکام کا ثبوت دیں۔ اس کے لیے انتظامیہ کو مقامی لوگوں پر یہ باور کرانا بھی ضروری ہے کہ سیاحت سے ان کے مفاد پر کسی طرح آنچ نہیں آئے گی۔ سیاحت کا ایک دوررس پہلو یہ ہے کہ یہ معیار زندگی کو بہتر بنانے، ماحولیات کے تحفظ اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کا ایک اچھا وسیلہ ہوسکتی ہے۔ انتظامیہ کی دلچسپی کا ثبوت یہ ہوگا کہ وہ سیاحوں کو راغب کرنے کی راہ میں حائل دشواریوں کو دور کریں۔ اس سے پہلے بھی کمیوں کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں لیکن انتظامیہ کی عدم دلچسپی کے باعث یہ کوششیں کامیاب نہیں ہوسکیں۔

اس سے قطع نظر کہ قومی سیاحتی پالیسی کے فروغ کے لیے وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے اعلانات ہوتے رہتے ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن کے ایما پر ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی نے سیاحت کے فروغ کے سلسلے میں ایک بہت اہم رپورٹ پیش کی تھی۔ اس رپورٹ کی سب سے اہم سفارش یہ تھی کہ ایک قومی سیاحتی اتھارٹی قائم کی جائے، لیکن افسوس کہ اس پر اب تک عمل نہیں ہوا۔ اس رپورٹ میں غیر ملکی سیاحت کے لیے زیادہ ماہرانہ اور پیشہ ورانہ خدمات کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا تھا۔ کمیٹی کی ایک ذیلی سفارش یہ تھی کہ مربوط ترقیات کے لیے خصوصی سیاحتی مقامات بنائے جائیں اور اس کام کے لیے ایک قومی ایکشن پلان بنایا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی کوئی خاص کام نہیں ہوا ہے حالاں کہ ایک مرحلے میں اس وقت کے کابینہ سکریٹری نے ایسے ایک منصوبے کے لیے ۳۹ ہزار کروڑ مخصوص کیے تھے۔ یہ خطیر رقم منصوبے کے تمام معاملات ۔ ہوائی اڈے بنانے سے لے کر شاہراہوں پر ریستوراں کھولنے تک کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ لیکن یہ اسکیم بھی ادھوری رہ گئی۔

اب مرکزی وزارت سیاحت نے اس تصور کو ایک نئی شکل دی ہے اور ۱۵۰۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی تجویز ہے۔ امید کرنی چاہیے کہ نئی سرکار سیاحت کے باب میں اس نئے تصور کو عملی شکل دے گی۔ شرط یہی ہے کہ سرکار اس صنعت کے فروغ میں قرار واقعی دلچسپی کا اظہار کرے کہ یہ تو تسلیم شدہ ہے کہ سماجی۔ اقتصادی ترقی میں سیاحت ایک کلیدی رول انجام دے سکتی ہے۔

ہندوستان اور بعض منتخب ممالک میں سیاحوں کی آمد اور غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی کا ایک تقابلی جائزہ

ملک	سیاح (لاکھ میں)	غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی (ارب ڈالر میں)
امریکہ	۴۴۷٫۳	۵۸٫۳۷
فرانس	۶۰۵٫۸	۲۷٫۳۲
اٹلی	۲۹۱٫۸	۲۷٫۰۷
اسپین	۴۵۱٫۳	۲۵٫۰۶
سنگاپور	۶۵٫۹	۷٫۵۵
ہانگ کانگ	۹۵٫۹	۹٫۰۷
تھائی لینڈ	۶۵٫۳	۶٫۶۱
انڈونیشیا	۴۶٫۰	۷٫۹۴
ملیشیا	۷۹٫۴	۳٫۵۰
ہندوستان	۲۱٫۲	۳٫۷۶

(حوالہ: عالمی سیاحت تنظیم)

بقیہ: نیا پیکج تیار کرنے کی ضرورت

نزدیک اس کی لہریں بہت متلاطم اور پرشور ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ہندوستان سیاحوں کو ولولہ انگیز آبی کھیلوں کے مواقع پیش کرتا ہے جن میں ونڈ سرفنگ کشتی رانی اور پانی پر اسکیئنگ کے کھیل شامل ہیں۔ فی الوقت ونڈ سرفنگ کی سہولت صرف گوا ہی میں دستیاب ہیں SCUBA DIVING صرف چند تربیت دہندگان تک ہی محدود ہے جو جزائر انڈمان اور لکش دیپ سے کام کرتے ہیں۔ آبی کھیلوں میں ہماچل پردیش میں پونگ ڈیم اور میگھالیہ میں اُمیام جھیل کے سوا کوئی اور علاقہ آبی کھیلوں کے لیے ڈیولپ نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس شعبے میں بھی ویسے ہی مسائل کا سامنا ہے جیسے کہ دوسرے شعبوں میں در پیش ہیں۔ مثلاً

(الف) تربیت یافتہ انسٹرکٹروں کی کمی اور

(ب) سازوساماں کی اونچی قیمتیں جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بیرون ملک سے درآمد کیا جاتا ہے۔

بہت سی ایڈونچر سوسائٹیاں ایسی ہیں جن میں ترقی کی صلاحیت ہے اور وہ کوہ پیمائی، چٹانوں پر چڑھائی وغیرہ کے شعبے میں اچھا کام کرسکتی ہیں۔ ہمارے ملک کا جغرافیہ ایسا ہے کہ ان سرگرمیوں میں اضافے کی اچھی گنجائش موجود ہے۔

ایڈونچر ٹورازم کے علاوہ مندرجہ ذیل سرگرمیوں کے لیے بھی پیکج پروگرام تیار کیے جاسکتے ہیں:

(الف) آرکیالوجیکل ٹورز

(ب) قبائلی زندگی کا مطالعہ کرنے کے ٹور اور

(ج) ثعلب مصری کا مطالعہ کرنے کے ٹور

قبائلی زندگی کا مطالعہ کرنے کے ٹورز کا اہتمام ملک کے کئی حصوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ثعلب مصری کے مطالعے کے ٹورز کے لیے ہمالیہ اور خاص کر سکم بہتر رہے گا۔ جہاں تک آرکیالوجیکل ٹورز کا تعلق ہے ہندوستان میں آثار قدیمہ کی کمی نہیں ہے۔

اس وقت ایڈونچر کے لیے ہندوستان آنے والے سیاحوں کی تعداد کل ٹورسٹ ٹریفک کے صرف ۷ فی صد کے برابر ہے۔ اگر ایڈونچر ٹورازم کے فروغ کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں تو اس حصے میں نمایاں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ شاید ہندوستان کو ہماچل ٹورازم اور گڑھوال منڈل کی طرح کے چند اور اہل ایڈمنسٹریٹروں کی ضرورت ہے۔

تاہم یہ سمجھ لینا ایک بڑی خوش فہمی ہوگی کہ ایڈونچر کھیلوں کی کشش ہی کی وجہ سے ہندوستان آنے والے سیاحوں کی تعداد میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔ البتہ شروع میں ایڈونچر ٹورازم کو پیکج کے ایک حصے کے طور پر مقبول بنایا جانا چاہیے۔ غیر ملکی سیاح عموماً ۲۸/۷ دن ہندوستان میں ٹھہرتے ہیں اور ان سیاحوں میں ۲۵ سے ۴۵ برس تک کے لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر ہمارے پیکج میں ایک ہفتے کا ایڈونچر شامل کردیا جائے تو اس سے سیاحت سے ہونے والی آمدنی میں یقیناً نمایاں اضافہ ہوگا۔ ●

فروغ سیاحت کے لیے بنیادی ڈھانچے کی اہمیت

مصنف کا کہنا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ سیاحت (ٹورازم) کے لیے بنیادی سہولیات کے ڈھانچے کو بہتر بنایا جائے صرف ایسا کر کے ہی سیاحت کو فروغ دینے کے منصوبے کو حقیقت پسندانہ اور نتیجہ خیز بنایا جا سکتا ہے۔ مطلوبہ نتائج محض ظاہری ٹیپ ٹاپ سے نہیں، بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنا کر ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

بھارت ان چند ملکوں میں سے ایک ہے جن کی تہذیب ۵۰۰۰ سال سے زیادہ پرانی ہے۔ اس لیے یہاں سیاحوں کی دلچسپی کی اتنی چیزیں ہیں جتنی کہیں اور نہ ہوں گی۔ قدرت نے بھی اسے دل کھول کر نوازا ہے۔ یہاں بلند و بالا پہاڑ ہیں، بڑے بڑے دریا ہیں، خوب صورت سمندری کنارے ہیں، لق و دق ریگستان ہیں، گھنے جنگل ہیں اور یہاں بے شمار قسموں کے نباتات و حیوانات پائے جاتے ہیں۔ اس کی قدیم ثقافت اور تاریخی عمارات بہت شاندار ہیں اور قدرتی مناظر اتنے خوب صورت ہیں کہ اسپین جیسے مسلم مقامات سیاحت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

سیاحت کا عالمی اقتصادی حالات سے براہ راست تعلق ہے۔ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق دنیا کی اندرون ملک مجموعی پیداوار (جی ڈی پی) میں اگلے دس برسوں میں ۴ر۲ فی صد سالانہ کا اضافہ ہونا چاہیے۔ جب جی ڈی پی میں اضافہ ہوتا ہے تو عوام میں سفر کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے۔ بھارت کی اندرون ملک مجموعی پیداوار کے ۶ر۵ فی صد کی شرح سے بڑھنے کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ سیاحت میں اضافے کے لیے یہ پس منظر کافی امید افزا نظر آتا ہے۔

سفر اور سیاحت کی ترقی کے مثبت طویل مدتی امکانات ہیں۔ سفر کی تمام بڑی مارکیٹیں یا تو بڑھ رہی ہیں یا تیزی سے بحالی کی جانب گامزن ہیں۔ ٹورازم انڈسٹری دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی فورس ہے جس کی سالانہ آمدنی ۵ر۳ ٹریلین (پدم) ہے۔ ایشیا اور بحرالکاہل خطے میں تو سیاحت سے سب سے زیادہ فائدہ ہونے کی امید ہے کہ

ایشیا میں سیاحت کی گرم بازاری [illegible]

اس خطے میں سیاحت باقی دنیا کے مقابلے میں دوگنی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔

ایشیا میں سیاحت کی گرم بازاری

ایسا لگتا ہے کہ ایشیا میں سیاحت کی گرم بازاری بھارت کے پاس سے ہو کر گزر رہی ہے۔ کیوں کہ ہمارے ملک میں دنیا کے ٹورسٹ ٹریفک کے صرف ۴ر۰ فی صد سیاح آتے ہیں اور عالمی سیاحت سے ہونے والی کل آمدنی میں بھارت کا حصہ فقط ۰ر۷ فی صد ہے۔ حکام کی طرف سے شعبۂ سیاحت میں گرم بازاری کے دعوؤں کے باوجود سال ۹۶-۱۹۹۵ء میں بھارت آنے والے سیاحوں کی تعداد میں صرف دو فی صد اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ موجودہ مالی سال کے دوران سیاحوں کی آمد میں ۷ر۴ فی صد کا اضافہ ہونے کی امید ہے۔ لیکن دوسرے ایشیائی ملکوں کے مقابلے میں محض ایک قطرے کے برابر ہے۔

شعبۂ سیاحت میں سست رفتار ترقی کا پتا کوپیرز جارڈن انڈیا کے مرتب کردہ ایک مطالعاتی جائزے سے چلتا ہے۔ اس جائزے میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۹۴ء میں بھارت نے سیاحت سے صرف ۱۲۰ ملین ڈالر کمائے جب کہ چین نے ۷ر۳۲۳ ملین، انڈونیشیا نے ۵ر۴۸۸ ملین

...پاتن نے ۴۰۹۰ ملین ڈالر کمائے۔ بھارت میں سیاحوں کے مقابلتاً کم تعداد میں آنے کی ایک بڑی وجہ بنیادی ڈھانچے کی خراب صورت حال بتائی جاتی ہے۔ بنیادی سہولیات کی کمی اور موجودہ سہولیات کی ناقص کوالٹی کا سبب مالی وسائل کی قلت بتایا گیا ہے۔

بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بنانے کی ضرورت

عالمی تنظیم سیاحت (ورلڈ ٹورازم آرگنائزیشن)

بھارت کا نشانہ بیرونی ممالک سے پچاس لاکھ سیاحوں کی آمد کا ہے اس کے لیے بنیادی ڈھانچہ بہتر بنانے اور خدمت کا معیار بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ ہوٹل کے کمروں اور ہوائی جہازوں میں نشستوں کی تعداد نیز ٹرانسپورٹ اور ٹیلی مواصلات کی خدمات میں دوگنا اضافہ کرنا ہوگا۔

کا کہنا ہے کہ آنے والے سال میں بھارت میں جتنے سیاحوں کی آمد کا اندازہ لگایا گیا ہے اس میں دس فی صد کا اضافہ ہوگا۔ بھارت کا نشانہ بیرون ممالک سے پچاس لاکھ سیاحوں کی آمد کا ہے اس کے لیے بنیادی ڈھانچہ بہتر بنانے اور خدمت کا معیار بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ ہوٹل کے کمروں اور ہوائی جہازوں میں نشستوں کی تعداد نیز ٹرانسپورٹ اور ٹیلی مواصلات کی خدمات میں دوگنا اضافہ کرنا ہوگا۔ حکومت کا شعبۂ سیاحت آئندہ تین برسوں میں ۲۵۲۴ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کا ارادہ رکھتا ہے اس کے ساتھ پرائیویٹ سیکٹر کو بھی ۱۳۰۰۰ کروڑ روپے کا سرمایہ لگانا ہوگا۔ اس کے علاوہ پبلک سیکٹر کو بین اقوامی اور گھریلو ایئر لائنوں کی مسافر لانے لے جانے کی صلاحیت بڑھانے پر ۱۱۵۰۰ کروڑ روپے اور سیاحوں کے لیے کمروں کی دستیابی بڑھانے پر ۴۰۰۰ کروڑ روپے صرف کرنے ہوں گے۔

وقت آگیا ہے کہ بھارت سرکار کا محکمۂ سیاحت موجودہ صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے اور بنیادی ڈھانچے کی محدودیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مقررہ وقت میں تکمیل پانے والا منصوبہ مرتب کرے۔ کیوں کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے اور جو کچھ کرنے کی ضرورت ہے اس کے درمیان فرق روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

قیام کا بندوبست

اندازہ لگایا گیا ہے کہ آئندہ پانچ برسوں میں سیاحوں کے لیے ۷۰۰۰۰ کمروں کی کمی ہوگی۔ اس صدی کے اختتام تک ہمیں سیاحوں کے لیے ۱،۹۰ لاکھ کمرے درکار ہوں گے جب کہ فی الوقت ۵۷۰۰۰ کمرے دستیاب ہیں اور مزید ۳۰۰۰ بننے والے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر سال ہمیں کمروں کی تعداد میں تقریباً ۲۷ ہزار کمروں کا اضافہ کرنا ہوگا۔ جب کہ اس وقت ایک سال میں اوسطاً ۳۰۰۰ کمرے بنائے جا رہے ہیں۔ کمروں کی تعداد بڑھانے کے لیے ۱۰۰۰ کروڑ روپے سالانہ کی سرمایہ کاری ضرور ہوگی۔

کمروں کی کمی کی پیش بینی کئی سال پہلے کی گئی تھی اور ٹریول ایجنٹس ایسوسی ایشن آف انڈیا کی کلکتہ میں منعقدہ آخری میٹنگ میں اسے پورا کرنے کے لیے ایک باوزن دلیل پیش کی گئی تھی۔ امید کی جاتی تھی کہ موجودہ ہوٹلوں کی خالی جگہوں اور نئی جگہوں پر مزید کمرے بنانے کی اجازت دے کر اور ریاستی حکومت کو ٹورازم کے لیے زمین دینے پر آمادہ کرکے مسئلے کو حل کر لیا جائے گا مگر کچھ نہیں ہوا اور صورت حال ابتر ہوگئی۔ کمروں کی اس کمی کو دیکھتے ہوئے بیرونی ممالک کے بہت سے ٹور آپریٹر اب سنجیدگی سے بھارت کا نام اپنے ٹورسٹ کتابچوں اور پمفلٹوں سے خارج کرنے کی بات سوچ رہے ہیں۔

موجودہ اندازوں کے مطابق دہلی، بمبئی یا دوسرے میٹرو شہروں میں ہوٹل کا ایک ڈی لکس کمرہ بنانے کی لاگت تقریباً ایک کروڑ روپے ہے اور اس میں سے تقریباً نصف رقم زمین کے لیے درکار ہوتی ہے۔ کوئی بھی بجا طور پر پوچھ سکتا ہے کہ جب صرف زمین کی قیمت ہی اتنی زیادہ ہے تو ایک کم بجٹ والا ہوٹل کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

محکمۂ سیاحت کی تیار کردہ حکمت عملی کی ایک دستاویز میں تجویز کیا گیا تھا کہ شہری زمین کی حد ملکیت کے قانون میں ترمیم کرکے ٹورازم انڈسٹری کو اس قانون کی دفعات سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے اور سیاحت سے متعلقہ پروجیکٹوں کے لیے زمین کے استعمال میں تبدیلی کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اس دستاویز میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ٹورازم کے پروجیکٹوں کے لیے پانی، بجلی، گیس اور ٹیلی فون کنکشنوں کی منظوری ترجیحی بنیاد پر دی جانی چاہیے اور پانی اور بجلی گھٹے ہوئے نرخوں پر فراہم کی جانی چاہیے۔

ہوائی جہازوں میں مزید نشستوں کی فراہمی

سیاحوں کی آمد بڑھانے کے لیے بھارت آنے والی بین اقوامی فلائٹوں میں نشستوں کی تعداد میں دوگنا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ پچاس لاکھ سے ایک کروڑ سیاحوں کے آنے کا نشانہ پورا کرنے کے لیے یہ اشد ضروری ہے۔ ہوائی سفر کے لیے دستیاب بین اقوامی نشستوں کی تعداد ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ہے جب کہ اندرون ملک پرائیویٹ اور پبلک دونوں سیکٹروں کے ہوائی جہازوں میں ایک کروڑ ۷۰ لاکھ نشستیں دستیاب ہیں۔ بھارتی ماہرین کے اندازے کے مطابق ۲۰۰۳ء تک عالمی ایئر لائنوں کے مجموعی شیڈولڈ مسافری ٹریفک میں پانچ فی صد اضافہ ہونے کی توقع ہے۔ بھارت میں گھریلو ہوائی ٹریفک میں ۱۰ تا ۱۲ فی صد اور بین اقوامی ہوائی ٹریفک میں ۸ تا ۱۰ فی صد اضافہ ہونے کا اندازہ ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مانگ پیدا ہونے پر انٹرنیشنل ایئر لائنیں مطلوبہ صلاحیت پیدا

سیاحوں کی آمد بڑھانے کے لیے بھارت آنے والی بین اقوامی فلائٹوں میں نشستوں کی تعداد میں دوگنا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ پچاس لاکھ سے ایک کروڑ سیاحوں کے آنے کا نشانہ پورا کرنے کے لیے یہ اشد ضروری ہے۔

کرلیں گی۔ تاہم نشستیں بڑھانے کی اجازت دینے کے پیے فیاضانہ پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

ہوائی سروسوں میں توسیع کی راہ میں سب سے بڑی دشواری بھارتی ہوائی اڈوں کی مسافری ٹریفک کو سنبھالنے کی محدود صلاحیت ہے۔ چونکہ بھارت میں داخلے کے موجودہ مقامات پر بہت ہجوم ہے اس لیے نئے ہوائی اڈے تعمیر کرنے اور انھیں بین اقوامی ٹریفک کے معیاروں پر لانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں ہوائی اڈوں کو ٹھوس تجارتی بنیاد پر ترقی دینے کی بھی ضرورت ہے۔

ایئرپورٹ اتھارٹی آف انڈیا نے طویل اور مختصر عرصے بعد کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے منتخب ہوائی اڈوں پر بنیادی سہولیات بڑھانے کے واسطے ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ بین اقوامی ہوائی اڈوں کی ترقی کے لیے اس نے نظر ثانی کے بعد ۱۸ر۵۵۵ کروڑ روپے کے مصارف کی تجویز پیش کی ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں بین اقوامی اور گھریلو ہوائی اڈوں کی ترقی اور جدید کاری پر خرچ کی گئی رقوم کی تفصیل یوں ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۲۳ر۵۸ کروڑ روپے بین اقوامی ہوائی اڈوں پر اور ۳۸ر۵۷ کروڑ روپے گھریلو ہوائی اڈوں پر، ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۳۱ر۹۷ کروڑ روپے بین اقوامی ہوائی اڈوں پر اور ۵۴ر۲۵۳ کروڑ روپے گھریلو ہوائی اڈوں پر اور ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۵۶ر۱۷ کروڑ روپے بین اقوامی ہوائی اڈوں پر اور ۶۶ر۳۰۸ کروڑ روپے گھریلو ہوائی اڈوں پر صرف کیے گئے ہیں۔

مجموعی ہندوستانی سرمایہ کاری کراچی ہوائی اڈے کی تعمیر نو کے لیے ہانگ کانگ میں دوسرے ہوائی اڈے کی تعمیر کے لیے منظور کی گئی رقم سے کم ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ موجودہ ہوائی اڈوں کی توسیع و بہتری پر سرکار ہی بھاری سرمایہ کاری کرے اسے تو صرف زمین فراہم کرنی چاہیے اور ہوائی اڈوں کی ترقی کا کام پرائیویٹ سیکٹر کو سونپ دینا چاہیے۔

ایئرپورٹ اتھارٹی آف انڈیا کے شروع کیے ہوئے توسیع اور جدید کاری کے پروگرام کو سرگرمی سے آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اندازاً ۲۵۰۰ کروڑ روپے درکار ہوں گے اس میں سے ۱۵۰۰ کروڑ روپے پرائیویٹ سرمایہ کاری سے اور باقی رقم یا تو ایئرپورٹ اتھارٹی آف انڈیا کے اندرونی وسائل سے یا بجٹی گرانٹ سے یا بازار سے قرض کی صورت میں حاصل کی جانی چاہیے۔

> ضرورت ہے کہ [illegible] ہوائی اڈوں [illegible] بھارت [illegible] سرمایہ کاری [illegible] اور ہوائی اڈوں کی [illegible] کا کام پرائیویٹ سیکٹر کو سونپ دینا چاہیے

گھریلو ایئرلائنوں کی تنظیم نو

بھارت میں گھریلو ایئرلائنوں کی حالت بھی فکر کا باعث ہے۔ پبلک اور پرائیویٹ دونوں ہی سیکٹروں کی ایئرلائنوں کی حالت خراب ہے اگر اسے درست کرنے کے لیے فوری اقدامات نہ کیے گئے تو ان کی حالت بہتر ہو جانے اور ان کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ افسوس کی بات ہے اگرچہ حکومت یہ مانتی ہے کہ ایئرلائنیں تجارتی بنیاد پر چلائی جانی چاہئیں پھر بھی اس نے نئے ہوائی جہاز حاصل کرنے کے لیے اتنا مشکل ضابطہ بنا رکھا ہے جس میں اسے حتمی فیصلہ کرنے میں چند مہینوں کے بجائے کئی کئی

> وقت آگیا ہے کہ حکومت ہند سیاسی حکومتوں اور [illegible] کو بہتر بنانے کے لیے [illegible] حقیقت پسند [illegible] اگر ایسا کیا گیا تو ملکی ٹورسٹ ٹریفک میں بھارت کا حصہ جو پہلے [illegible] گھٹتا رہے گا۔

سال لگ جاتے ہیں۔ اس طرز عمل سے ایئرلائنوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہوائی کرایوں کی موجودہ شرحوں، ایندھن کی اونچی قیمتوں، پٹے کی زیادہ دروں اور دوسرے اخراجات مثلاً ایئرپورٹ ٹیکس، انٹرنل ایئر ٹریول ٹیکس وغیرہ کے ساتھ کسی بھی گھریلو ایئرلائن کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ گھریلو ایئرلائنوں کو ایوی ایشن ایندھن ۱۲۶ سینٹس فی گیلن کی شرح سے خریدنا پڑ رہا ہے۔ یہ قیمت بین اقوامی قیمت سے قریب قریب دوگنی ہے۔ اس کے علاوہ انھیں اپنی دس فی صد ہوائی سروسیں غیر معاشی روٹوں پر چلانی پڑ رہی ہیں۔ (انڈین ایئرلائنز اپنی ۱۷ فی صد صلاحیت ایسے روٹوں پر خرچ کر رہی ہے) اس کا منافع کمانے کی صلاحیت پر بہت خراب اثر پڑتا ہے۔

انڈین ایئرلائنز کی طاقت اس میں مضمر ہے کہ اس کے پاس جدید ہوائی جہازوں کا بیڑہ ہے جب کہ پرائیویٹ ایئرلائنوں نے زیادہ تر پرانے اور فرسودہ ہوائی جہاز پٹے پر حاصل کر رکھے ہیں۔ یہ بات دنیا بھر میں تسلیم کی جاتی ہے کہ کوئی چیز پٹے پر لینا مہنگا ثابت ہوتا ہے۔ اگر پٹے کے خرچ میں ہوائی جہاز کو مرمت یا سی اور ڈی کہلانے والی جانچ پڑتال کے لیے بدیش بھیجنے کا خرچ بھی شامل کر لیا جائے تو اس سے ایئرلائن کی مالیات پر بھاری بوجھ پڑتا ہے اور اس کے لیے کم ہندوستانی کرایے برقرار رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

بھارت کے سامنے دو راستے ہیں۔ یا تو ایندھن کی قیمتیں گھٹا کر ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں ایئرلائنیں منافع بخش طور پر چلائی جاسکیں یا پھر غیر فائدہ مند روٹوں پر ہوائی سروس مہیا کرنے کی شرط ختم کر دی جائے۔

ارباب بست و کشاد گزشتہ برسوں میں ایوی ایشن (ہوابازی) پالیسی کے لیے ایک عمدہ خاکہ تیار نہیں کر پائے ہیں۔ پبلک سیکٹر ابھی تک لال فیتہ شاہی میں جکڑا ہوا ہے اور سیاسی مداخلتوں تلے کراہ رہا ہے۔ دوسری طرف پرائیویٹ سیکٹر اپنے مجاز حکام کے واہموں اور ایڈہاک ازم کا شکار ہے۔

زمینی ٹرانسپورٹ اور ریلوے سروسز کو بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے کیوں کہ وہ بھی سیاحوں کی خدمت میں اہم رول ادا کرسکتی ہیں۔ ریلوے کو

باقی صفحہ ۴۴ پر

ایس۔ دھرم راجن

ہوابازی و سیاحت۔ ایک مربوط تعلق

مصنف نے زیرِ نظر مضمون میں خیال ظاہر کیا ہے کہ شہری ہوابازی اور فروغ سیاحت کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے اور یہ دونوں شعبے ایک دوسرے پر بہت انحصار رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک سیاح مشکلات و پریشانیوں سے مبرا ہوائی سفر چاہتا ہے اس لیے اس کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

گو ہندوستان میں سیاحت کو فروغ دینے کے منصوبے تیار کرنے والوں اور ٹریول ایجنسیوں وغیرہ نے آئندہ چار برسوں میں بھارت میں ۵۰ لاکھ بین اقوامی سیاحوں کی آمد کا نشانہ مقرر کیا ہے تاہم ایک سوال جو ایک طویل مدت سے ہمیں ان ممالک میں درپیش رہا ہے جہاں سے سیاح آتے ہیں وہ ابھی تک برقرار ہے۔ یہ سوال بین اقوامی ٹریول آپریٹروں نے ہمارے وزراء، تجارتی وفود اور سیاحت کو فروغ دینے کے خواہش مندوں کے سامنے رکھا ہے، یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہوائی سروسیں کتنی مستحکم اور معتبر ہیں اور موجودہ اور ممکنہ مارکیٹوں سے ہندوستان آنے والی پروازوں میں نشستوں کا حصول کتنا آسان ہے۔

چھٹیاں گزارنے یا تجارت کے لیے ہندوستان آنے والا مسافر اپنے سفر کا منصوبہ کافی پہلے تیار کرتا ہے۔ وہ اس بات کا یقین کرنا چاہے گا کہ سفر کے لیے آخری وقت میں کوئی تبدیلیاں نہیں ہوں گی۔ یہ بات قابلِ فہم ہے کیوں کہ ایک براعظم کے سائز کے وسیع و عریض ملک میں سیاحوں کی ایک بڑی تعداد مختلف دور دراز مقامات پر جانے کے لیے ہوائی سفر ہی زیادہ پسند کرتی ہے۔ ۹۷ فی صد غیر ملکی سیاح ہوائی سفر کرتے ہیں۔ لہٰذا سیاحت کی ترقی کا انحصار بہت بڑی حد تک شہری ہوابازی کی سہولیات پر ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں شعبے ایک دوسرے پر بہت انحصار رکھتے ہیں۔ یہ بات ان تمام ممالک پر بھی صادق آتی ہے جہاں اقتصادی پالیسی کے لیے سیاحت کو اہم سمجھا جاتا ہے۔

چناں چہ ہوابازی اور سیاحت کے شعبوں کو عالمی سیاحت کی ترقی کے لیے مل کر کام کرنا ہوگا۔

ورلڈ ٹورازم آرگنائزیشن جس کا بھارت بھی ایک رکن ہے، کے مطابق صارفین کے اخراجات کا ۱۲ فی صد سفر و سیاحت پر خرچ ہوتا ہے اور اس کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ ہوائی سفر پر خرچ کیا جاتا ہے۔ گزشتہ بیس برسوں میں بین اقوامی ہوائی سفر کے کرایوں پر ہونے والے خرچ اور بین اقوامی سیاحت سے ہونے والی وصولیوں دونوں میں عالمی جی۔ڈی۔پی کی شرح سے دوگنی شرح سے اضافہ ہوا ہے۔ ہوائی جہاز

> [illegible] حد تک شہری ہوابازی کی سہولیات پر ہے۔

سے آنے والے سیاحوں میں سے قریباً ۹۷-۹۸ فی صد سیاح لمبے فاصلوں پر واقع ممالک سے آتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ ہوابازی اور سیاحت کی پالیسیوں میں ہم آہنگی کے باوجود سیاحوں کے بڑھتے ہوئے ٹریفک کے سیاق و سباق میں کسی قومی ایئر لائن کو تحفظ دینے کے معاملے میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں ہوائی ٹریفک کو لانے لے جانے کے حقوق کا تحفظ سیاحت کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہی بھارت میں شہری ہوابازی کی پالیسیوں کو نرم بنایا گیا ہے اور پرائیویٹ ایئر لائنوں کو ان راستوں پر جن پر کہ سرکاری ایئر لائنز گزشتہ چالیس برسوں سے اپنے ہوائی جہاز چلاتی رہی ہے، اپنی ہوائی سروسیں فراہم کرنے کا لائسنس دیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے سفر و سیاحت قومی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔

دوطرفہ باہمی معاہدات کے تحت کیا جاتا ہے۔ بعض ملکوں کی ایئرلائنوں نے ہندوستان کے لیے فلائٹیں شروع کرنے یا اپنی فلائٹوں کی تعداد بڑھانے میں جو دلچسپی دکھائی ہے وہ ہندوستانی مارکیٹ کے بڑھنے کی دلیل ہے۔

سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات دیکھنے کے لیے آنے والے سیاحوں کی تعداد میں اضافے کو دیکھتے ہوئے نئی فیڈر ایئرلائنیں اور علاقائی ایئرلائنیں وجود میں آگئی ہیں، جن کی بدولت سیاحت کے بہت سے مقامات تک ہوائی سروسیں شروع ہوگئی ہیں۔ کئی ریاستوں کے سیاحتی پلانوں میں چھوٹے ایئر اسٹرپوں کی مدد کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ وہ ان ہوائی پٹیوں (AIR STRIPS) کا استعمال کر سکیں جن کا ایک عرصے سے استعمال نہیں ہو رہا ہے۔ ایسی ہوائی پٹیاں گجرات، مدھیہ پردیش اور یوپی میں ہیں۔ انھیں سرکاری مدد سے بہتر بنایا جا رہا ہے۔ مخصوص تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نئے ٹورازم سرکٹ بنائے جا رہے ہیں۔ حکومت نے بنیادی سروسوں کی فراہمی کی شرط پر کسی بھی ہندوستانی ہوائی اڈے تک چارٹرڈ فلائٹوں کی اجازت بھی دی ہے۔ گزشتہ سال تقریباً ۷سو چارٹرڈ فلائٹوں نے سیاحوں کو ہندوستان کے مختلف مقامات تک پہنچایا۔ سیاحت کو بڑھاوا دینے والی شہری ہوابازی کی ترقی ایئر اسٹرپوں کو صرف چھوٹے روٹوں پر ہوائی جہاز چلانے کا لائسنس دینے تک ہی محدود نہیں ہے۔ ذیلی ڈھانچے کی ضرورتوں میں ہوائی اڈوں کی ترقی، سروسوں کی بہتری اور توسیع اور پرزے بدلنا بھی شامل ہیں۔ ایک اہم فیصلے کے تحت حکومت نے نئے ہوائی اڈوں کی تعمیر کے لیے پرائیویٹ (غیر سرکاری) سرمایہ کاری کی اجازت بھی دی ہے۔ چنانچہ آئندہ تین چار برسوں میں بنگلور اور کوچی میں دو بڑے بین الاقوامی ہوائی اڈے بن جائیں گے جو ملک میں شہری ہوابازی کے شعبے کی ترقی میں ایک نئے طرزِ عمل کی مثال ہوں گے۔ اس کے علاوہ ایئرپورٹ اتھارٹی آف انڈیا ٹورسٹ ٹریفک کے لیے بمبئی، کلکتہ، مدراس اور ترواننت پورم کے بین الاقوامی ہوائی اڈوں کو بہتر اور جدید بنانے کے کام میں مصروف ہے۔ اس کے علاوہ وہ جے پور، کھجوراہو، وارانسی، احمد آباد اور گوا جیسے اہم مقامات پر جہاں کاروباری اور تعلیلاتی ٹریفک زیادہ رہتا ہے، ۱۲ ماڈل ایئرپورٹ بھی تعمیر کر رہی ہے۔ ذیلی ڈھانچے کی سہولیات میں اضافہ سیاحت کی ترقی میں کافی معاون ثابت ہوگا۔

سیاحت کو فروغ دینے کی پالیسیوں کے اقتصادی مقاصد میں قومی آمدنی، روزگار کے مواقع اور غیر ملکی زرِ مبادلہ کی کمائی کو بڑھانا اور علاقائی ترقی اور سرکار کی ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی میں اضافہ کرنا شامل ہیں۔ ترقی کے ان تمام پہلوؤں کے لیے شہری ہوابازی ایک مرکزی رول ادا کرتی ہے۔ ہوابازی کی نرم پالیسیوں کے نتیجے میں سیاحوں کی تعداد میں ہوئے اضافہ کے اقتصادی فائدوں کا صحیح اندازہ وسیع تر ڈاٹا (DATA) کی بنیاد ہی پر لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات ہے کہ کچھ سالوں سے محکمۂ شہری ہوابازی اور محکمۂ سیاحت کو ایک ہی وزارت کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔

> سیاحت کے فروغ [illegible] ہوسکتے ہیں بھارت جیسے شہری [illegible] ختم [illegible] پرائیویٹ ایئرلائنوں کو [illegible] سرکاری ایئرلائنز گزشتہ چالیس برسوں سے اپنے [illegible] چلاتے رہے ہیں [illegible] سروسیں فراہم کرنے کا لائسنس دیا گیا۔

اس سے ان دونوں شعبوں کے درمیان مناسب توازن برقرار رکھنا یقینی امر ہو گیا ہے۔ اتفاق سے گزشتہ دو دہائیوں میں بین الاقوامی مسافروں کے ہوائی ٹریفک اور بین الاقوامی سیاحوں کی نقل و حرکت میں ایک ہی جیسی شرحوں سے اضافہ ہوا ہے۔ جب اقتصادی ترقی کی رفتار تیز ہوتی ہے تو یہ دونوں اضافے تیزی سے بڑھتے ہیں۔ اس ضمن میں ہندوستان کے لیے خاص دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کے یوروپ اور مشرقِ بعید کے درمیان آدھے راستے پر واقع ہونے کے سبب ایشیا، بحرالکاہل کے خطے میں تیز رفتار اقتصادی ترقی یقینی امر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہوابازی اور سیاحت بھی تیزی سے ترقی کریں گی۔ مشرقِ بعید سے ملکھوکھا افراد کے چھٹیاں گزارنے یا کاروبار کے لیے جانے سے فضائی ٹرانسپورٹ میں اضافہ ہوگا اور یہ اضافہ ہندوستان جیسے سیاحتی مراکز کی اقتصادی ترقی کی رفتار بھی تیز کرے گا۔ خوش قسمتی سے ہندوستان میں سیاحت کے مشہور مراکز واقع ہیں جو دنیا کے کسی بھی حصے کے سیاحوں کے لیے خاص دلچسپی کا سبب بن سکتے ہیں۔

تاہم یہ بھی سچ ہے کہ نہ تو یہاں کی ٹورازم انڈسٹری نہ ہی شہری ہوابازی کا شعبہ اتنا اچھا کام کر رہا ہے جتنا کہ اس خطے کے دوسرے ممالک میں ہو رہا ہے۔ اس بارے میں بحث جاری ہے۔ لیکن ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیوں کہ یہاں سیاحت کی نمایاں ترقی کے تمام بنیادی لوازمات۔ مثلاً ٹریفک کی بنیاد، اقتصادی ترقی، مقاماتِ سیاحت اور سرمایہ کار موجود ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان آنے والی بین الاقوامی فلائٹوں میں سیٹوں کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ۲۰۰۰ء تک پچاس لاکھ سیاحوں کی آمد کا نشانہ ہندوستان جیسے ملک کے لیے جہاں مقاماتِ سیاحت کی فراوانی ہے، کافی چھوٹا ہے۔ بین الاقوامی فلائٹوں میں سیٹوں کی تعداد میں حتی الوسع اضافہ ضروری ہے۔ محکمۂ سیاحت کے اعلا افسران مانتے ہیں کہ بین الاقوامی ایئرلائنوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہوگی کہ وہ کلکتہ، مدراس اور دوسرے نئے ہوائی اڈوں تک اپنی پروازیں چلائیں اور انھیں ان ہوائی اڈوں پر اترنے کی اجازت دیں تبھی ان ہوائی اڈوں کا بہتر استعمال ہو سکے گا۔ ہندوستان کی بین الاقوامی فلائٹیں چلانے والی قومی ایئرلائن "ایئر انڈیا" اپنے ۲۶ ہوائی جہازوں کے بیڑے میں جدید قسم کے اوسط صلاحیت والے ایسے ہوائی جہاز شامل کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے جو طویل فاصلے کی سروس فراہم کر سکیں۔ اس سے وہ بہت سے نئے مراکز تک ہوائی سروسوں کا اہتمام کر سکے گی۔ علاوہ ازیں یوروپ اور امریکہ کی بڑی ایئرلائنوں کے ساتھ

باقی صفحہ ۱۱ پر

بی۔ این۔ مکھیجا

ہند میں سیاحت کی منصوبہ بندی

مزدوروں پر مبنی ہونے کے باعث سیاحت سے متعلق سرگرمیاں آمدنی اور روزگار پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ چنانچہ موجودہ ہندوستانی تناظر میں سیاحتی منصوبہ بندی اہمیت کی حامل ہے اور آنے والے برسوں میں اسی طرح برقرار رہے گی۔

سیاحت کیا ہے؟ موٹے طور پر ان مسافروں کی سرگرمیاں جو اپنے عام ماحول سے ہٹ کر تفریح یا بزنس یا کسی اور مقصد سے دوسرے مقامات کا سفر کرتے ہیں لیکن وہاں کسی بھی مدت تک مثلاً ایک سال سے زائد مسلسل قیام نہیں کرتے۔ خوش حالی میں اضافہ، سریع تر ذرائع سفر اور دیگر بنیادی سہولیات کی فراہمی کے باعث سیاحت میں روزافزوں ترقی ہوئی ہے اور آج وہ دنیا کی سب سے بڑی برآمداتی صنعت بن چکی ہے۔ عالمی سیاحت ادارے کے مطابق ۱۹۹۵ء میں دنیا بھر میں ۷ر۵۶ کروڑ سیاحوں کی بدولت کوئی ۶ر۳۷۲۔ ارب ڈالر کی آمدنی ہوئی۔ اور اسی سال اندازہ ہے کہ سفر و سیاحت کے نتیجے میں ۲ر۲۱ کروڑ لوگوں کو براہ راست یا بالواسطہ روزگار ملا جو کہ عالمی روزگار پانے والوں کا ۷ر۱۰ فی صد تھا۔ اس طرح سیاحت سے نہ صرف متعدد ترقی پذیر ملکوں کی بلکہ بعض ترقی یافتہ ملکوں کی بیرونی زرمبادلہ کی آمدنی میں بڑا اضافہ ہوتا ہے۔

سیاحت کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ سیاحوں کی ضرورتوں کے مدنظر بنیادی سہولتوں کے تمام پہلوؤں کو بہتر طور پر منظم کیا جائے تاکہ وہ سہولتیں زیادہ مقدار میں اور زیادہ آسانی سے دستیاب ہو سکیں۔ سیاحت سے متعلق اجزا کو مکمل ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنا ہوگا تاکہ مجموعی کارکردگی میں اضافہ ہو اور ان اجزا کی انسلاکی کڑیاں آسانی سے دستیاب ہوتی رہیں۔ یوں تو سیاحت کے فروغ کے لیے اس سے متعلق سہولتوں مثلاً ہوٹل، ریستوراں، سیر و تفریح کا سامان، نقل و حمل کے ذرائع اور خریداری کی سہولتیں مہیا کرنا ضروری ہیں، لیکن اگر سیاحت گاہ میں بنیادی سہولتیں مثلاً پانی، بجلی، سڑکیں اور دور مواصلات کے ذرائع نہ ہوں تو ہوٹل وغیرہ بھی بے معنیٰ ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا سیاحت سے متعلق منصوبہ بندی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیاحت سے متعلق بنیادی سہولتوں اور مقامی سہولتوں کو ملا کر جامع طور پر ترقی دی جائے۔

سیاحت سے متعلق اجزا کو مکمل ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنا ہوگا تاکہ مجموعی کارکردگی میں اضافہ ہو اور ان اجزا کی انسلاکی کڑیاں آسانی سے دستیاب ہوتی رہیں۔

منصوبہ بندی میں تاخیر

ہندوستان میں سیاحت کی منصوبہ بندی تاخیر سے شروع ہوئی کیوں کہ آزادی کے فوراً بعد کے برسوں میں جن شعبوں کی ترقی کے لیے وسائل مخصوص کیے گئے ان میں سیاحت کا نمبر بہت پیچھے تھا۔ وسائل چوں کہ کم تھے لہٰذا انھیں دوسرے زیادہ اہم شعبوں کے لیے مخصوص کیا گیا اور شروع کے پلانوں میں سیاحت پر کم توجہ دی گئی۔ نہ صرف سیاحت کی سہولتیں بلکہ دیگر بنیادی سہولتیں بھی کم تھیں لہٰذا حکومت نے یہاں وہاں غیر منظم اور غیر مربوط طریقے سے ہی سیاحت کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ پرائیویٹ سیکٹر نے اس سلسلے میں بہت کم پیسہ لگایا اور وہ بھی صرف بڑے شہروں میں۔

سرکاری سرگرمیاں

۱۹۴۹ء میں حکومت ہند نے نقل و حمل کی وزارت میں سیاحت سے متعلق ایک سیل (ذیلی شعبہ) کھولا تاکہ سیاحوں کو سہولتیں مہیا کرنے کی کوششوں میں ایک رابطہ قائم کیا جا سکے۔ ۱۹۵۲ء میں نیو یارک میں اور ۱۹۵۳ء میں لندن میں حکومت ہند کے سیاحتی دفتر کھولے گئے تاکہ ان ملکوں سے مزید سیاحوں کو ہندوستان بلایا جا سکے۔ ۱۹۵۴ء میں بمبئی میں پہلا ہوٹل مینج منٹ انسٹی ٹیوٹ کھولا گیا تاکہ سیاحت سے متعلق عملہ تیار کیا جا سکے۔

یہ دوسرے پنج سالہ پلان میں ہی ممکن ہو سکا کہ حکومت ہند نے پہلی بار سیاحت کے فروغ کے لیے ایک رقم مخصوص کی اور اس طرح سیاحت بھی قومی ترقیاتی پلان کا ایک جزو بن گئی۔ ۱۹۵۶ء میں حکومت ہند اشوکا ہوٹل تعمیر کر کے، ہوٹل بزنس میں داخل ہوئی اور پھر ۱۹۵۸ء میں حکومت ہند نے سیاحت کے فروغ کے پیش نظر سیاحت سے متعلق سیل کی جگہ سیاحت کا ڈائریکٹوریٹ قائم کیا۔

یہ دوسرے پنج سالہ پلان میں ہی ممکن ہو سکا کہ حکومت ہند نے پہلی بار سیاحت کے فروغ کے لیے ایک رقم مخصوص کی اور اس طرح سیاحت بھی قومی ترقیاتی پلان کا ایک جزو بن گئی۔

۱۹۶۲ء میں محکمۂ اقتصادی معاملات کے سکریٹری جناب ایل کے جھا کی سرکردگی میں جھا کمیٹی مقرر کی گئی جس نے ملک میں سیاحت کی بنیادی سہولیات فراہم کرنے کے بارے میں متعدد سجھاؤ دیے۔ چوں کہ سیاحت میں پرائیویٹ سیکٹر کا حصہ برائے نام تھا لہٰذا حکومت ہی کو کار انداز کا رول ادا کرنا پڑا اور سیاحتی سرگرمیوں میں روپیہ لگانا پڑا۔ حکومت نے اس کام کے لیے ۱۹۶۶ء میں "انڈیا ٹورازم ڈیولپمنٹ کارپوریشن" (آئی ٹی ڈی سی) قائم کیا تاکہ بنیادی سہولتیں مہیا کی جائیں اور سیاحت کو فروغ دیا جائے۔

سیاحت کے سماجی اور اقتصادی فوائد کے پیش نظر پنج سالہ پلانوں میں سیاحتی سیکٹر کے لیے مخصوص رقم میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور چوتھے پنج سالہ پلان میں پہلی بار سیاحت کے فروغ کے لیے سیاحتی سہولتوں کی توسیع اور بہتری پر زور دیا گیا۔ اس دور میں حکومت کی پالیسی میں ایک نئی تبدیلی آئی یعنی اس نے سیاحت کی بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے پرائیویٹ سیکٹر کو مالی امداد دینا شروع کیا۔ حکومت ہند نے ریاستی حکومتوں سے بھی سیاحتی سہولتوں کے فروغ میں ہاتھ بٹانے کو کہا اور ریاستی پلانوں میں بھی سیاحت کے لیے مزید رقم مہیا کی جانے لگی۔

بعد کے پنج سالہ پلان میں یعنی ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۸ء تک حکومت نے بعض مقبول سیاحت گاہوں یعنی گوا، کوولم، گلمرگ وغیرہ کی مربوط ترقی کے لیے اقدامات کیے۔ چھٹے پنج سالہ پلان میں حکومت نے سابقہ امدادی قرض اسکیم کی جگہ امدادی شرح سود پر قرض دینے کی اسکیم جاری کی تاکہ سیاحت سے متعلق سہولتوں اور ہوٹلوں کی تعداد میں اضافے کے لیے سرمایہ کاروں کو ترغیب دی جا سکے۔ اسی دوران حکومت ہند نے ایک سربراہ ادارہ "انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹورازم اینڈ ٹریول مینج منٹ" قائم کیا تاکہ سیاحتی سیکٹر کو تربیت یافتہ عملہ مل سکے۔

سیاحتی پالیسی

۱۹۸۲ء میں حکومت ہند نے پہلی بار سیاحت کے فروغ کی پالیسی کا اعلان کیا جس میں کہا گیا ہے کہ سیاحت کا فروغ ملک میں سیاحت سے متعلق سبھی اداروں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ پالیسی میں کہا گیا ہے کہ مرکز خاص طور پر بین اقوامی سیاحت کا ذمہ دار ہوگا اور ریاستیں گھریلو سیاحت کی۔ البتہ جس حد تک ضرورت ہوگی مرکز ریاستوں میں رابطے کا اور ایک تکمیلی رول ادا کرتا رہے گا۔

یہ ماننا ہوگا کہ صرف حکومت سیاحت کی ترقی کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ان تمام ایجنسیوں کو بھی جو مرکزی یا ریاستی سطح پر سیاحت سے متعلق ہیں اس کے فروغ کی مشترکہ کوشش کرنا ہوگی یعنی پبلک سیکٹر کمپنیاں، ہوائی سروسیں، ریلوے، ترسیل و رسائل کا سلسلہ، میونسپل کمیٹیاں، مقامی ادارے، تعلیمی اور کلچرل ادارے وغیرہ۔ ان سب کی مشترکہ کوششوں کا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ سیاحت کی جامع، ہمہ پہلو اور مربوط ترقی ہو تاکہ وہ ملک کی اقتصادی ترقی میں مثبت اور کارگر رول ادا کر سکے۔

یہ ماننا ہوگا کہ صرف حکومت سیاحت کی ترقی کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی لہٰذا [illegible] وغیرہ۔

گو کہ سیاحت کے فروغ کی کوششیں جاری ہیں لیکن ساتویں پنج سالہ پلان (۱۹۸۵-۹۰ء) کے شروع میں ہی جا کر اس کے بے انتہا امکانات کا واقعی احساس ہوا اور قومی ترقیاتی کونسل نے سفارش کی کہ سیاحت کو ایک صنعت کا درجہ و حیثیت دی جائے۔ چناں چہ ساتویں پلان میں سیاحت کے فروغ کو پلان کے مقاصد میں شامل کیا گیا اور سیاحت کے سیکٹر کو صنعت کا درجہ بھی دیا گیا۔

سیاحتی پروجیکٹوں میں سرمایہ لگانے کی حوصلہ افزائی کے لیے متعدد ترغیبات کا اعلان کیا گیا۔ سیاحوں کا دل لبھانے کے لیے باقاعدہ میلوں اور تقریبات کے اہتمام کا اعلان کیا گیا۔ بدیشی سیاحوں کو ہندوستان لانے کے لیے ان ملکوں میں واقع ہند کے سیاحتی دفتروں کے

سلسلے میں اضافہ کیا گیا۔ سیاحت گاہوں میں واقع ذخیروں اور سیاحت سے متعلق صنعتی اداروں کے مابین تعلقات بڑھانے کے لیے سالانہ مارکیٹنگ کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تاکہ سیاحت کے فروغ کے لیے نئے خیالات و تصورات وجود میں آسکیں۔ سیاحت کے لیے انسانی وسائل مہیا کرنے والے اداروں کی توسیع اور جدید کاری کی گئی۔

قومی سیاحتی کونسل

حکومت نے ۱۹۸۶ء میں ایک قومی سیاحتی

حکومت نے ۱۹۸۶ء میں ایک قومی سیاحتی کونسل قائم کی تاکہ سیاحت کی ترقی کے لیے مختلف مسائل کا مطالعہ ہوسکے اور اس کے لیے ایک تناظری پلان تیار ہوسکے۔ اس کمیٹی نے ۱۹۸۸ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جس میں زور دیا گیا کہ ابھی سیاحت کے فروغ میں سرکاری کوششوں اور شراکت داری کے جاری رہنے کی ضرورت ہے۔

کونسل قائم کی تاکہ سیاحت کی ترقی کے لیے مختلف مسائل کا مطالعہ ہوسکے اور اس کے لیے ایک تناظری پلان تیار ہوسکے۔ اس کمیٹی نے ۱۹۸۸ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جس میں زور دیا گیا کہ ابھی سیاحت کے فروغ میں سرکاری کوششوں اور شراکت داری کے جاری رہنے کی ضرورت ہے۔ رپورٹ میں درج ہے۔

• سیاحت کی بنیادی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے وسیع اور مختلف النوع سرگرمیوں کی ضرورت ہے جن کے لیے بھاری سرمایہ درکار ہے۔ یہ سرگرمیاں سماج کے لیے اتنی اشد ضروری ہیں کہ ان ملکوں میں بھی جہاں "آزاد منڈی" کی پالیسی رائج ہے کسی نہ کسی طور پر ریاست کی دخل اندازی ضرور ہو جاتی ہے۔ رپورٹ میں خاص طور سے کہا گیا کہ ریاستی سرکاریں جو طرح طرح کے ٹیکس لگاتی ہیں انکی ناہمواری دور کرنے کے لیے ایک مربوط نقطہ نظر کے ساتھ سیاحت کو فروغ دینا چاہیے۔ بقول رپورٹ ان عناصر کی بدولت "پیمانۂ کفایت" کے فوائد نہیں مل پاتے، سیاحتی درگاہوں کی ترقی مسخ ہو جاتی ہے اور اکثر لگے ہوئے سرمائے کا قرار واقعی استعمال نہیں ہو پاتا۔"

رپورٹ نے ملک میں سیاحت کی ترقی پر زور دیا اور متعدد سفارشات کیں جن میں سرکاری اداروں کی تشکیل نو اور سیاحتی سیکٹر میں پرائیویٹ سیکٹر کو سرمایہ لگانے کے لیے ترغیبات دینا شامل تھا۔ رپورٹ پر عمل درآمد کے سلسلے میں حکومت نے ۱۹۸۹ء میں ایک "ٹورازم فنانس کارپوریشن" قائم کیا جو کہ سیاحتی سرگرمیوں میں روپیہ لگانے کے لیے قرضے دیتا ہے۔ علاوہ ازیں ہوائی چارٹر پالیسی کو نرم کیا گیا، سفر کی رسمیات اور قاعدوں ضابطوں کو آسان بنایا گیا، ہوائی اڈوں پر سیاحوں کے لیے سہولتوں کو بہتر بنایا گیا اور پرائیویٹ سیکٹر کو سیاحتی سیکٹر میں سرمایہ لگانے کے لیے مزید رعایتیں اور ترغیبیں دی گئیں۔

قومی ایکشن پلان

مئی ۱۹۹۲ء میں حکومت نے ایک "نیشنل ایکشن پلان" وضع کیا تاکہ سیاحوں کی آمد بدیشی زرمبادلہ کے حصول اور سیاحت کے ذریعے روزگار مہیا کرنے میں قابل لحاظ اضافہ ہوسکے۔ حکمت عملی یہ تھی کہ بنیادی سہولتوں کو بہتر بنایا جائے، چنندہ علاقوں کو جامع اور مربوط ترقی دی جائے، انسانی وسائل کی ترقی سے متعلق اداروں

مئی ۱۹۹۲ء میں حکومت نے ایک نیشنل ایکشن پلان وضع کیا تاکہ سیاحوں کی آمد بدیشی زرمبادلہ کے حصول اور سیاحت کے ذریعے روزگار مہیا کرنے میں قابل لحاظ اضافہ ہوسکے۔

کی تشکیل نو کی جائے اور انھیں مضبوط بنایا جائے، سیاحت کی مارکیٹنگ سے متعلق کوششوں کو تقویت پہنچائی جائے اور سیاحتی سرگرمیوں میں تنوع لایا جائے۔ اس حکمت عملی میں سرکار اور پرائیویٹ سیکٹر دونوں کے رول پر زور دیا گیا تھا۔

چناں چہ حکومت نے خصوصی سیاحتی علاقوں کی شناخت کی تاکہ انھیں پرائیویٹ سیکٹر کے تعاون سے مربوط طور پر ترقی دی جاسکے۔ سیاحوں کے لیے قیام گاہوں میں اضافہ کرنے کے لیے ایک ترغیبی اسکیم چلائی گئی جس کے تحت پرانے محلوں، حویلیوں اور قلعوں کو جو نجی ملکیت میں تھے "ہیریٹیج ہوٹل" یعنی وراثتی سرمایہ والے ہوٹلوں میں تبدیل کیا گیا۔ علاوہ ازیں حکومت نے بعض ایسے جزیرے بھی چنے جنھیں سیاحت گاہ بنایا جاسکتا تھا اور پرائیویٹ سیکٹر کو دعوت دی کہ وہ وہاں سیاحت گاہیں بنائے۔

آٹھویں پلان میں یہ تسلیم کیا گیا کہ سیاحت ملکی اقتصادیات کے لیے بہت اہم ہے اور سیاحت سے متعلق سرگرمیوں کے لیے پالیسی کا ڈھانچہ بنایا گیا۔ آٹھویں پلان میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ سیاحت کو خاص طور پر نجی سیکٹر کی کوششوں سے ترقی دی جائے اور پبلک سیکٹر جو اب تک ترقی کی بیشتر ذمہ داری بذات خود سنبھالتا تھا اب صرف ایک انقلاب آور محرک رہے گا جب کہ پرائیویٹ سیکٹر سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ سیاحت سے متعلق بنیادی سہولتوں یعنی ہوٹل، ریستوراں، نقل و حمل وغیرہ کی تعمیر و توسیع میں سرمایہ لگائے گا۔ پلان نے حکومت کی سرگرمیوں کو محض اس حد تک محدود کر دیا ہے کہ وہ قاعدے بنائے گی، ربط قائم رکھے گی اور مشکلیں دور کرے گی۔ اقتصادی پالیسی کو نرم بنانے کے بعد سیاحت کی صنعت کو بدیشی سرمایہ کاری کے لیے ترجیحی مقام دیا گیا تھا۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ سیاحت سے متعلق پروجیکٹوں میں اگر بدیشی سرمایہ کار ۵۱ فی صد تک حصے لینا چاہیں تو اسے فوری منظوری مل جائے گی ــ اور خاص حالتوں میں تو اس سے زائد کی بھی منظوری دی جاسکتی ہے۔ جہاں تک بدیش میں رہنے والے ہندوستانیوں (این آر آئی) کا سوال ہے وہ تو ایسی اسکیموں میں صد فی صد حصے بھی لے سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں بدیشی سرمایہ کار اپنے منافع واپس اپنے وطن بھیج سکتے ہیں اور آزادانہ بدیشی ٹکنیکل

اور پیشہ ورانہ عملہ بھی مقرر کر سکتے ہیں۔

حکومت ہند نے سیاحت میں سرمایہ لگانے کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے ایک "انوسٹ منٹ سیل" بھی قائم کیا ہے جو اس قسم کے سوالات کا جواب دیتا ہے کہ سیاحتی مرکزوں میں کہاں اراضی مل سکتی ہے، کیا کیا بنیادی سہولتیں ہیں، کیا ترغیبات ہیں، کیا ضابطے ہیں جن کی پابندی کرنا ہوگی۔ کون سی متعلقہ ایجنسیاں ہیں اور کس کس بات کی منظوری لینا ہوگی۔

مستقبل میں پرائیویٹ سیکٹر کی شراکت کے سلسلے میں ابھی بہت اضافے کی گنجائش ہے۔ ساتھ ہی ساتھ حکومت کو ابھی سیاحتی منصوبہ بندی کے سلسلے میں بہت مثبت رول ادا کرنا ہے۔

قومی اہمیت

سیاحت، ہند کے لیے زر مبادلہ حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اس سے بہت سے لوگوں کو روزگار ملتا ہے۔ سیاحت سے متعلق سرگرمیوں سے خاص طور پر عورتوں، دیہی کاریگروں، تعلیم یافتہ بے روزگاروں اور نوجوانوں کو آمدنی اور روزی ملتی ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر تو محض منافع کی امید میں سرمایہ لگاتا ہے، لیکن حکومت یہ بھی دیکھتی ہے کہ سرمایہ کاری سے ملک کو کیا سماجی اور اقتصادی فائدے ہوں گے۔ لہٰذا حکومت کو سیاحت کے فروغ کے لیے سرمایہ کاری میں سہولتیں مہیا کرتے رہنا ہوگا۔ بلکہ جہاں سرمائے کی کمی ہو وہاں اس کمی کو بھی پورا کرنا ہوگا۔

ماحولیاتی تحفظ

بیشتر سیاحتی مرکزوں کی بے تحاشا ترقی سے ماحول کو سب سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا حکومت کو مناسب منصوبہ بندی کے ذریعے یہ دیکھنا ہوگا کہ بنیادی سہولتوں میں اضافہ ماحولیاتی تحفظ کے مطابق ہو۔ سرمایہ کاروں کو برابر یہ بتاتے اور سکھاتے رہنا ہوگا کہ سیاحتی پروجیکٹوں کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں ماحولیاتی مسائل بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ سرکاری ایجنسیاں، آثار قدیمہ، پھل پھول، حیوانات اور ساحل سمندر کے تفریحی مقامات کے تحفظ کے لیے بہتیرے قانون قاعدے بنا چکی ہیں اور انھیں لاگو کرتی رہتی ہیں۔

سیاحت کو ترقی دینے کے لیے منصوبہ بندی میں مارکیٹ کی مانگ کے انداز کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ حکومت اپنے دفتروں کے ذریعے بدلتی ہوئی مانگ پر نظر رکھ سکتی ہے اور اس کے مطابق مختلف النوع سیاحتی اسکیمیں پیش کر سکتی ہے جو کہ سیاحوں کی ضرورت اور مانگ پر پوری اتریں۔

رابطہ

ہندوستان میں سیاحت کے لیے بہت کچھ اور طرح طرح کی چیزیں موجود ہیں۔ بعض سیاح جگہ جگہ گھوم کر ایک جامع تجربہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت کو اول تو علاقائی سرکٹ انداز نظر کے تحت مختلف جگہوں پر بنیادی سہولتوں کی فراہمی اور انھیں ایک دوسرے سے مربوط و منسلک کرنے کی منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔ دوسرے چونکہ سیاحتی مراکز لمبے لمبے فاصلے اور وسیع علاقوں میں واقع ہو سکتے ہیں لہٰذا حکومت کو متعدد ترغیبی اسکیموں کے ذریعے اور رابطے قائم کرکے یہ دیکھنا ہوگا کہ ان علاقوں کی متوازن ترقی ہو۔

مارکیٹ کی تحقیق و ترقی

سیاحت کو ترقی دینے کے لیے منصوبہ بندی میں مارکیٹ کی مانگ کے انداز کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ حکومت اپنے دفتروں کے ذریعے بدلتی ہوئی مانگ پر نظر رکھ سکتی ہے اور اس کے مطابق مختلف النوع سیاحتی اسکیمیں پیش کر سکتی ہے جو کہ سیاحوں کی ضرورت اور مانگ پر پوری اتریں۔ سیاحت کے فروغ سے متعلق پبلسٹی اور مخالف پبلسٹی کا توڑ سیاحت کے فروغ کے لیے بے حد ضروری ہے۔ چونکہ پرائیویٹ سیکٹر کو تو محض اپنے منافع سے مطلب ہے لہٰذا حکومت کو خود سیاحوں کی مارکیٹ بڑھانے کے کام میں لگنا ہوگا تاکہ سیاحت کی ترقی سے ساری قوم کو بھرپور فائدہ ہو سکے۔

مندرجہ بالا دلائل سے واضح ہو جاتا ہے کہ سیاحت کے فروغ کی منصوبہ بندی سے حکومت پورے طور پر دست بردار نہیں ہو سکتی اور سیاحت کی منصوبہ بندی نہ صرف موجودہ حالات میں ضروری ہے بلکہ آئندہ بھی ضروری رہے گی۔ ●



برنداون گارڈن، میسور

ڈاکٹر جگموہن نیگی

سیاحت اور ترقی: چند مسائل

سیاحت کا فروغ عملی طور پر اقتصادی سرگرمیوں کے ہر میدان کا احاطہ کرتا ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ روزگار کے امکانات بڑھانے اور قومی آمدنی میں اضافہ کرنے سے قطع نظر، سیاحت ایسے بے شمار مواقع فراہم کرتی ہے جہاں انسان اپنی وراثت سے پوری طرح ہم آہنگ ہو سکے۔

زراعت، صنعت اور سیاحت — تین ایسے میدان ہیں جن پر کسی بھی ملک یا قوم کی آمدنی کا دارومدار ہوتا ہے۔ ان تینوں میں سیاحت غالباً سب سے تیز رفتار ترقی کا میدان ہے۔ صدیوں سے لوگ دور دراز کے ممالک کی سیاحت کرتے رہے ہیں، جس کا مقصد حصولِ علم، انسانی برادری کو قریب سے دیکھنا اور سمجھنا، سامانِ تجارت کی خرید و فروخت، تجارتی میلوں اور نمائشوں کو دیکھنا، تحقیق اور تلاش و جستجو وغیرہ رہا ہے۔

اس عمل سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ تجارتی سرگرمیوں نے سفر کی ضرورت کو بڑھاوا دیا ہے اور کاروباری سفر کا سیاحت کے فروغ پر کافی گہرا اثر پڑتا ہے۔ اقتصادی نظریہ سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ عملاً سیاحت کا فروغ اقتصادی سرگرمیوں کے ہر میدان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ خصوصی طور پر ہمارے ملک جیسے ترقی پذیر ممالک میں کچھ تجارتی سیکٹر اور بھی ہیں جو اپنے محدود وسائل کے باوجود اقتصادی ترقی میں اپنے رول کی زوردار وکالت کرتے ہیں۔

سیاحت کو صنعت کا درجہ حاصل ہونے سے بہت قبل ہندوستان دنیا کے ہر گوشے سے آنے والے سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتا رہا ہے۔ ان سیاحوں نے اپنے تاثرات کی شکل میں دانشوری اور علم و آگہی کے ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو سماجی مورخوں کے لیے دولتِ بیش بہا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوٹلیہ کی شہرۂ آفاق تصنیف "ارتھ شاستر" میں قدیم ہندوستانی سیاحت کی جھلک ملتی ہے، جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں

> سیاحت کو صنعت کا درجہ حاصل ہونے سے بہت قبل ہندوستان، دنیا کے ہر گوشے سے آنے والے سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتا رہا ہے۔ ان سیاحوں نے اپنے تاثرات کی شکل میں دانشوری اور علم و آگہی کے ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو سماجی مورخوں کے لیے دولت بیش بہا کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پاسپورٹ کا نظام کیا تھا، غیر ملکی سیاحوں کی نگہداشت کا ذمہ دار سرکاری محکمہ کس طرح کام کرتا تھا اور ان کو دورانِ سفر کس طرح کی رہائشی سہولیات فراہم کی جاتی تھیں۔ ہندوستان آنے والے قدیم ترین سیاحوں میں چینی سرفہرست ہیں اس لیے کہ ۴۰۰ تا ۷۰۰ کے درمیان ہندوستان آنے والے چینی زائرین کی تعداد کافی بتائی جاتی ہے۔ ان کے تجربات و مشاہدات سے قدیم ہندوستان کی تاریخ کی گراں قدر خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں مشہور زمانہ سیاح فاہیان شامل ہے جو زیارت کی غرض سے ۴۲۴ - ۳۵۹ء کے درمیان ہندوستان آیا تھا۔ ایسی ہی دوسری بڑی شخصیت جس نے ہرش وردھن کے زمانے میں ہندوستان کا دورہ کیا، ہیون سانگ کی ہے۔ وہ ۶۴۵ - ۶۲۵ء کے درمیان ہندوستان آیا تھا اور اپنی یادگار کے طور پر اس عہد کے ہندوستان کی حالت کے بارے میں دلچسپ تاثرات چھوڑ گیا۔

سیاحت کے راستے (TOURIST TRAFFIC)

بعد ازاں ہندوستان کا مغرب سے رابطہ قائم ہوا۔ یوروپ کے لوگوں نے ہندوستان میں سیاحتی دلچسپی کے مختلف مقامات پر آنا شروع کیا اور اب ہمارے ملک میں دنیا کے ہر گوشے سے سیاح آتے رہتے ہیں۔ گوشوارہ نمبر ۱

سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان آنے والے غیر ملکی سیاحوں کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے ۔

گوشوارہ نمبر ۱

۹۵۔۱۹۹۳ء میں جنوری۔ دسمبر کے دوران ہندوستان میں سیاحوں کی آمد

(بشمول پاکستانی اور بنگلہ دیشی شہری)

مقامات	۱۹۹۳ء	۱۹۹۴ء	۱۹۹۵ء	فی صد اضافہ ۹۴۔۱۹۹۳ء	۹۵۔۱۹۹۴ء
شمالی امریکہ	۲۰۶۰۷۷	۲۳۲۹۳۸	۲۶۷۱۸۸	۱۳٫۰	۱۴٫۷
سینٹرل اور جنوبی امریکہ	۱۳۳۵۰	۱۱۸۰۵	۱۶۶۷۲	۱۲٫۲	۴۱٫۲
مغربی یورپ	۶۲۴۶۲۸	۶۶۴۸۲۰	۷۵۴۱۸۲	۶٫۴	۱۳٫۴
مشرقی یورپ	۵۶۷۰۹	۶۶۰۶۰	۵۳۲۷۵	۱۶٫۵	۱۹٫۴
افریقہ	۶۱۹۷۵	۶۴۱۲۴	۸۷۲۲۸	۳٫۵	۳۶٫
مغربی ایشیا	۱۱۸۲۲۳	۱۱۴۰۹۶	۱۱۴۷۴۸	۳٫۵	۰٫۶
جنوبی ایشیا	۴۶۵۶۵۵	۴۸۰۱۴۲	۵۴۰۲۰۹	۳٫۱	۱۲٫۵
جنوب مشرقی ایشیا	۹۸۹۳۵	۱۱۳۵۳۵	۱۲۹۴۹۱	۱۴٫۸	۱۴٫۱
مشرقی ایشیا	۷۷۰۵۸	۹۳۸۴۴	۱۰۹۹۱۶	۲۱٫۸	۱۷٫۱
آسٹریلیا	۳۹۰۲۰	۴۳۸۶۵	۴۹۹۴۱	۱۲٫۴	۱۳٫۹
دیگر	۳۱۰۰	۱۱۹۴	۸۲۳	۶۱٫۵	۳۱٫۱
کل تعداد	۱۷۶۴۸۳۰	۱۸۸۶۴۳۳	۲۱۲۳۶۸۳	۶٫۹	۱۲٫۶

دو ملین سے بھی تجاوز کر جانے کے باوجود دنیا کے کل سیاحوں کا ۰٫۴ فی صد حصہ ہی ہندوستان کا رخ کرتا ہے۔
۹۴۔۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء میں جنوری سے مئی کے دوران ہندوستان آنے والے سیاحوں کی ماہانہ تعداد کا گوشوارہ نمبر ۲ سے جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۲

۱۹۹۴ء میں ہندوستان آنے والے سیاحوں کی ماہانہ تعداد (بشمول پاکستانی اور بنگلہ دیشی شہری)

	۱۹۹۴ء	سیاحوں کی آمد ۱۹۹۵ء	۱۹۹۶ء	فی صد اضافہ ۹۴۔۱۹۹۵ء	۹۵۔۱۹۹۶ء
جنوری	۱٫۹۲٫۵۵۱	۱٫۹۷٫۳۴۳	۲٫۲۲٫۴۰۲۹	۲٫۵	۱۳٫۵
فروری	۱٫۷۲٫۶۴۴	۱٫۸۷٫۶۱۴	۲٫۱۹٫۶۳۵	۸٫۷	۱۷٫۱
مارچ	۱٫۸۷٫۱۲۹	۱٫۸۸٫۲۵۲	۱٫۹۶٫۱۹۶	۰٫۶	۴٫۲
اپریل	۱٫۴۲٫۵۰۱	۱٫۴۶٫۷۱۵	۱٫۵۸٫۷۸۵	۳٫۰	۸٫۲
مئی	۱٫۳۰٫۱۸۳	۱٫۳۲٫۹۱۸	۱٫۳۲٫۸۱۳ (P)	۲٫۳	۸٫۰
کل تعداد	۸٫۱۵٫۰۰۶	۸٫۴۲٫۸۴۲	۹٫۳۱٫۴۵۸ (P)	۳٫۴	۱۰٫۵

سیاحت سے آمدنی

سیاحت سے حصول آمدنی اور روزگار کی فراہمی کا سیاحت پر ہونے والے اخراجات سے گہرا تعلق ہے ۔ سامانِ ضرورت اور خدمات پر ہونے والے اخراجات کا انحصار ان چیزوں اور خدمات کے مطالبے پر ہے ۔ اسی طرح سیاحوں کی جانب سے ہونے والے اخراجات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سیاحتی سہولیات مثلاً قیام و طعام کی سہولتیں، نقل و حمل کے ذرائع، سیر و تفریح کے ساز و سامان اور خرید و فروخت کی سہولیات کی مانگ گھٹتی ہے ۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ سیاحت سے بیرونی زر مبادلہ کی شکل میں ہونے والی آمدنی روز افزوں بڑھ رہی ہے ۔ ۱۹۹۴ء میں سیاحت سے ہونے والی آمدنی (کرایے بھاڑے کے علاوہ) ۳۲۱۴۶۶۔ ملین امریکی ڈالر تھی جب کہ اسی مدت میں ہندوستان کو حاصل ہونے والی آمدنی غیر ملکی زر مبادلہ کی شکل میں ۵۳۔۷۱۰۳ کروڑ روپے تھی اور ۹۵۔۱۹۹۴ء کے دوران اس کی شرح ۷۳۶۵٫۴۱ کروڑ روپے تھی سیاحت سے دنیا کو ۱۹۹۴ء میں ہونے والی آمدنی کا ہندوستان کا حصہ ۰٫۵ فی صد تھا۔ (گوشوارہ نمبر ۳۔ اور گوشوارہ نمبر ۴)

گوشوارہ نمبر ۳

غیر ملکی سیاحوں سے ملک کو حاصل ہونے والے آمدنی کا مجموعی اندازہ

(بشمول پاکستانی اور بنگلہ دیشی شہری)

سال	کروڑ میں روپیہ	فی صد اضافہ
۱۹۸۸ء	۱۹۹۲٫۶۴	---
۱۹۸۹ء	۲۲۹۸٫۹۰	۱۵٫۴
۱۹۹۰ء	۲۶۹۱٫۷۷	۱۵٫۸
۱۹۹۱ء	۴۱۱۰٫۵۰	۵۴٫۴
۱۹۹۲ء	۵۸۸۶٫۹۵	۴۳٫۲
۱۹۹۳ء	۶۱۴۱٫۸۱	۳٫۳
۱۹۹۴ء	۷۱۰۳٫۵۳	۱۵٫۷
۱۹۹۵ء	۸۶۴۰٫۰۲	۲۱٫۶

گوشوارہ نمبر ۴

سیاحوں سے حاصل ہونے والے غیر ملکی زرمبادلہ کا مجموعی اندازہ

(پاکستانی اور بنگلہ دیشی شہری شامل نہیں)

سال	کروڑ میں روپیہ	فی صد اضافہ
۱۹۸۸ء	۱۹۳۲٫۲۳	..
۱۹۸۹ء	۲۲۲۳٫۵۲	۱۵٫۱
۱۹۹۰ء	۲۵۷۸٫۳۲	۱۶٫۰
۱۹۹۱ء	۳۵۸۹٫۹۰	۳۹٫۲
۱۹۹۲ء	۵۷۴۱٫۸۷	۵۹٫۹
۱۹۹۳ء	۵۹۸۴٫۴۰	۴٫۲
۱۹۹۴ء	۶۹۳۸٫۶۴	۱۵٫۹
۱۹۹۵ء	۸۴۵۴٫۱۵	۲۱٫۸

رہائشی سہولیات کی صورت حال (OCCUPANCY)

ہوٹل اور دیگر رہائشی سہولیتں، سیاحتی ڈھانچے کا اہم جزو ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کی لگاتار بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر، ملک کے اکثر سیاحتی مراکز پر رہائشی سہولتوں کی بڑی کمی کا احساس کیا جا رہا ہے۔ گوشوارہ نمبر ۵ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مختلف درجات کے ہوٹلوں میں سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی شرح کیا ہے۔

۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۵ء کے دوران ہوٹلوں میں سیاحوں کی آمد کا اوسط لگاتار بڑھتا رہا ہے۔ ہوٹلوں اور قیام گاہوں میں دستیاب گنجائش کے مقابلے سیاحوں کے قیام کا تناسب ۱۹۹۱ء کے ۶۴٫۹ فی صد کے مقابلے میں لگاتار بڑھ کر ۱۹۹۵ء میں ۷۳٫۷ فی صد ہو گیا۔ بہت سے ہوٹل جہاں سیاحوں کے قیام کا اوسط ۷۰-۶۰ فی صد تھا، اب بڑھ کر ۹۵ سے ۱۰۰ فی صد تک پہنچ چکا ہے۔ (گوشوارہ نمبر ۵) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں ہوٹل سے متعلق کاروبار میں اضافے کے امکانات کافی روشن ہیں اور سیاحوں کی تعداد میں اسی طرح اضافہ ہوتا رہا تو آنے والے برسوں میں تمام اہم سیاحتی مراکز کے ہوٹلوں اور قیام گاہوں میں سیاحوں کے قیام کا اوسط کافی بڑھے گا۔ ایک اندازہ کے مطابق آئندہ پانچ برسوں میں تقریباً (۷۰۰۰) ستر ہزار کمروں کی کمی محسوس کی جا سکتی ہے۔

گوشوارہ نمبر ۵

درجات کے اعتبار سے منظور شدہ ہوٹلوں میں قیام کی اوسط شرح

درجات	۱۹۹۱ء	۱۹۹۲ء	۱۹۹۳ء	۱۹۹۴ء	۱۹۹۵ء
پانچ ستارہ	۶۹٫۲	۷۰٫۱	۶۹٫۸	۶۹٫۹	۷۲٫۶
چار ستارہ	۶۲٫۱	۶۴٫۳	۶۵٫۱	۷۲٫۳	۷۸٫۱
ہیری ٹیج	-	-	-	۵۳٫۱	۵۲٫۱
تین ستارہ	۵۹٫۵	۶۵٫۰	۶۵٫۶	۶۷٫۵	۷۶٫۷
دو ستارہ	۶۹٫۴	۶۹٫۸	۷۰٫۵	۶۵٫۴	۶۵٫۹
ایک ستارہ	۵۵٫۰	۵۷٫۶	۵۸٫۴	۷۴٫۴	۶۸٫۷
جن کی درجہ بندی ہونی ہے	۶۲٫	۶۵٫۴	۶۴٫۸	۵۰٫۱	۳۹٫۴
کل	۶۴٫۹	۶۶٫۷	۶۷٫۱	۶۹٫۳	۷۳٫۷

گوشوارہ نمبر ۶

ہوٹلوں کے درجات کے اعتبار سے ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے قیام کی اوسط شرح

درجات	۱۹۹۱ء م	۱۹۹۱ء غ م	۱۹۹۲ء م	۱۹۹۲ء غ م	۱۹۹۳ء م	۱۹۹۳ء غ م	۱۹۹۴ء م	۱۹۹۴ء غ م	۱۹۹۵ء م	۱۹۹۵ء غ م
پانچ ستارہ	۳۱٫۴	۳۷٫۸	۲۸٫۰	۴۲٫۱	۲۷٫۹	۴۱٫۹	۳۳٫۰	۳۶٫۹	۳۲٫۶	۴۰٫۰
چار ستارہ	۳۹٫۵	۲۲٫۶	۴۰٫۲	۲۳٫۹	۴۱٫۸	۲۳٫۳	۴۹٫۹	۲۲٫۴	۵۲٫۲	۲۵٫۹
ہیری ٹیج	-	-	-	-	-	-	۴۰٫۱	۱۳٫۰	۳۶٫۰	۱۶٫۱
تین ستارہ	۴۴٫۸	۱۴٫۷	۵۰٫۸	۱۳٫۲	۵۱٫۵	۱۴٫۱	۵۴٫۷	۱۲٫۸	۶۲٫۶	۱۴٫۱
دو ستارہ	۵۵٫۳	۱۴٫۱	۵۴٫۹	۱۴٫۹	۵۵٫۹	۱۴٫	۴۹٫۳	۱۶٫۱	۴۹٫۳	۱۶٫۶
ایک ستارہ	۴۵٫۵	۹٫۵	۴۸٫۷	۸٫۹	۴۹٫۳	۹٫۱	۷۳٫۳	۱٫۱	۶۵٫۰	۳٫۷
جن کی درجہ بندی ہونی ہے	۳۱٫۲	۳۹٫۶	۳۳٫۰	۳۲٫۴	۳۲٫۸	۲۲٫۰	۳۹٫۷	۱۰٫۴	۸٫۷	۳۰٫۷
کل	۳۶٫۱	۲۸٫۵	۳۶٫۲	۳۰٫۵	۳۶٫۸	۳۴٫۳	۴۱٫۳	۲۸٫۰	۴۱٫۱	۳۲٫۶

م = ملکی، غ م = غیر ملکی

گوشوارہ نمبر ۶ ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۵ء کے درمیان مختلف درجات کے ہوٹلوں اور قیام گاہوں میں ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے قیام کے اوسط کا تقابلی تجزیہ پیش کرتا ہے۔ گوشوارہ ۶ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر ملکی سیاحوں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ہی زیادہ تر ہندوستانی سیاح ہوٹلوں میں قیام کو ترجیح دیتے ہیں اور اگر زیادہ تعداد میں کفایتی ہوٹل مہیا کیے جائیں

تو یقینی ہے کہ آنے والے برسوں میں سیاحوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگا۔

گوشوارہ نمبر ۷
درجات کے اعتبار سے ہوٹلوں اور ان کے کمروں کی تعداد

	ہوٹلوں کی تعداد			کمروں کی تعداد		
	۱۹۹۲ء	۱۹۹۳ء	۱۹۹۴ء	۱۹۹۲ء	۱۹۹۳ء	۱۹۹۴ء
پانچ ستارہ	۸۲	۸۷	۹۱	۱۵۴۳۵	۱۶۵۸۰	۱۷۴۴۰
چار ستارہ	۴۹	۵۹	۵۸	۳۵۴۳	۴۱۰۴	۴۴۷۱
ہیری ٹیج	۱۹	۲۱	۲۲	۶۵۱	۶۱۶	۶۸۲
تین ستارہ	۱۱۵	۱۴۱	۱۶۳	۶۰۴۵	۷۴۷۷	۹۱۰۴
دو ستارہ	۲۳۵	۲۳۸	۲۴۰	۸۷۴۰	۸۷۴۴	۹۱۴۲
ایک ستارہ	۹۶	۱۰۱	۱۰۳	۳۱۸۲	۳۳۴۴	۳۶۰۸
جن کی درجہ بندی ہونی ہے	۲۰۲	۲۳۴	۲۳۵	۹۸۱۱	۱۰۲۸۸	۱۱۰۰۸
کل تعداد	۷۹۸	۸۸۱	۹۱۲	۴۷۴۰۷	۵۱۴۵۳	۵۵۴۵۵

گوشوارہ نمبر ۷ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ درجات اور زمروں کے حساب سے ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران دستیاب ہوٹلوں اور کمروں کی تعداد کیا تھی۔

سیاحتی اخراجات سے صرف سیاحتی سازوسامان اور خدمات وسہولیات پہنچانے والوں کو آمدنی نہیں ہوتی بلکہ اس سے روزگار کے مواقع بھی بڑھتے ہیں۔ ہوٹل والے اشیائے خورد ونوش فراہم کرنے والے، ویٹرس اور باورچی، گائڈیوں، ٹیکسیوں کے مالک اور ان کے ساتھ کام کرنے والے، ٹریول ایجنسیاں اور ان کے ملازم، تفریحی پارٹیاں، سیاحتی گائڈس اور سامان ڈھونے والے، دست کار اور سووینیر فروش اور کئی دوسرے لوگ جو سیاحوں کو سازوسامان فراہم کرتے ہیں یا سہولیات اور خدمات براہ راست سیاحت سے روزگار حاصل کرتے ہیں۔ جہاں غیر ملکی سیاحوں سے، ہوٹلوں اور غذائی سامان کے سیکٹر میں، زیادہ روزگار کے مواقع حاصل ہوتے ہیں، وہیں ملکی سیاحی سے پیدا ہونے والے روزگار کی جہتیں زیادہ متنوع ہیں اور انھیں ہمہ جہت ہنر اور تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق سیاحت سے وابستہ روزگار کے مواقع میں اضافے کی شرح ۲٫۳۵ گنا ہے، جس کے نتیجہ میں ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران سیاحت سے براہ راست ملازمت کے حصول کی تعداد ۷٫۸ ملین افراد شمار کی گئی جب کہ مذکورہ مدت میں ملازمت حاصل کرنے والوں کی مجموعی تعداد ۱۸٫۴ ملین شمار کی گئی تھی۔

سیاحتی تنظیموں کا رول

آئیے دیکھیں کہ سیاحت کے فروغ میں قومی سیاحتی تنظیموں کا کیا رول ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف ممالک میں انتظامیہ کی درجہ بندی کی نوعیت بڑی مختلف ہے۔ قومی سیاحتی تنظیموں کے مرتبے سے منسلک اہم سوال کا مرکز و محور مندرجہ ذیل نکات ہیں:

> سیاحت سے حصول آمدنی اور روزگار کی فراہمی کا سیاحت پر ہونے والے اخراجات سے گہرا تعلق ہے۔ سامان کی ضرورت اور خدمات پر ہونے والے اخراجات کا انحصار ان چیزوں اور خدمات کے مطالبے پر ہے۔

(الف) آیا قومی سیاحتی تنظیم ایک خود مختار ادارہ ہونا چاہیے یا اسے کسی وزارت سے ایک شعبہ کے طور پر وابستہ رکھنا چاہیے۔
(ب) اگر ایک شعبہ کے طور پر رکھا جائے تو اس تنظیم کا تعلق کس وزارت سے ہو؟
(ج) اس تنظیم کا دائرۂ کار اور ذمہ داری کیا ہو؟
(د) آیا قومی سیاحتی تنظیم کی حیثیت سرکاری ہو یا غیر سرکاری؟

اس وقت ۱۵ ممالک ایسے ہیں جہاں آزاد طور پر وزارتِ سیاحت موجود ہے۔ دیگر ممالک نے اپنی قومی سیاحتی تنظیموں کو مندرجہ ذیل وزارتوں سے منسلک کر رکھا ہے:

وزارتِ ثقافت اور اطلاعات۔
وزارت برائے اقتصادی امور۔
وزارتِ تعلیم۔
وزارتِ ترقیات۔
وزارتِ تجارت وصنعت۔
وزارتِ نقل وحمل (ٹرانسپورٹ) اور شہری ہوا بازی۔
وزارتِ مواصلات، ٹرانسپورٹ اور سیاحت۔

حکومتِ فرانس نے "منسٹری آف فری ٹائم" کے نام سے ایک نئی وزارت کی تشکیل کی ہے، جس کے دائرہ کار میں سیاحت شامل ہے۔ اس سے قبل وہاں "کوالٹی آف لائف منسٹری" کے تحت سیاحت کا ایک سکریٹریٹ قائم تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں، وفاقی سطح پر، سیاحت کی تشکیل کا طریقۂ کار، حکومت کے تینوں شعبے وضع کرتے ہیں۔ وہاں کی ٹریول اور ٹورزم انتظامیہ خصوصی طور پر سیاحت کے فروغ کی ذمہ دار ہے۔ ۱۹۸۱ء میں قومی سیاحت پالیسی ایکٹ منظور کیا گیا اور قومی سیاحتی پالیسی تشکیل دی گئی۔ یہ پالیسی مندرجہ ذیل بنیادوں پر قائم ہے:
(الف) سیاحت اور تفریح طبع کی صنعتیں اہم ہیں۔

(ب) سیاحت اور تفریح، روزمرہ زندگی کا زیادہ اہم حصہ بن جائے گی۔

(ج) سیاحت میں وفاقی حکومت کی دلچسپیوں کو بہتر تال میل کی ضرورت ہے۔

اس قانون کے تحت قومی سیاحتی پالیسی کاؤنسل قائم ہے، جو ایسی وفاقی پالیسیوں، مسائل اور پروگراموں میں تال میل پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے، جو سیاحت، تفریح اور وراثتی وسائل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

کناڈا میں، کناڈین آفس برائے سیاحت، شعبۂ تجارت وصنعت کی ایجنسی ہے۔

میکسیکو میں، سکریٹریٹ برائے سیاحت، بنیادی قومی سیاحتی ایجنسی ہے۔ دیگر دو ایجنسیاں، قومی سیاحتی کاؤنسل اور نیشنل فنڈ فار پروموشن آف ٹورزم بھی وفاقی سیاحتی مشینری کے کلیدی اجزا ہیں۔ چوتھا ادارہ نیشنل ہوٹیلیرا (NATIONAI HOTELERA) ایک سرکاری ہوٹل کمپنی ہے، جو کہ سرکاری سیاحتی کارپوریشن فوناٹر (FONATUR) کے ساتھ کام کرتی ہے اور اسی سے مالیہ حاصل کرتی ہے۔

جاپان میں پانچ ایجنسیاں، سیاحت کے فروغ کی ذمہ دار ہیں۔

(الف) وزارت ٹرانسپورٹ کے سکریٹریٹ سے وابستہ شعبۂ سیاحت۔

(ب) بغیر منافع کے سرکاری امداد پر چلنے والی جاپان نیشنل ٹورزم آرگنائزیشن۔

(ج) ملکی سیاحت کی حوصلہ افزائی کرنے والی جاپانی سیاحتی ایسوسی ایشن۔

(د) دی لائزاں (LIAISON) کاؤنسل برائے سیاحت۔

(ہ) دی ٹورزم پالیسی کاؤنسل۔

اس طرح بشمول ہندوستان، مختلف ممالک کے اکثر قومی سیاحتی دفاتر اپنی کارکردگی کے خطوط کے اعتبار سے داخلی طور پر ڈویژنوں اور شاخوں میں منقسم ہیں۔ ایسے دفاتر کی تعداد میں اضافے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ بین اقوامی معاشرہ میں سیر و سیاحت کی اہمیت کا احساس بڑھ رہا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ سیاحت کے فروغ پروگراموں کو ترتیب دینے میں حکومت کو اہم رول ادا کرنا ہے۔

> ہوٹلوں اور دیگر رہائشی سہولتیں، سیاحتی ڈھانچے کا اہم جزو ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کی لگاتار بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر کئی اکثر سیاحتی مراکز پر رہائشی سہولتوں کی بڑی کمی کا احساس کیا جا رہا ہے۔

توازن کا معاملہ

سیاحت کا فروغ اختلاف اور تصفیہ کا عمل ہے۔ یہ متقابل گروپوں میں توازن قائم کرنے کا معاملہ ہے یعنی نجی فائدے اور قومی مفادات کے درمیان اعتدال کا۔ سیاحت کے منظم اور مسلسل فروغ کے لیے قومی سیاحت اور پلاننگ پالیسی میں، موثر سماجی، اقتصادی اور ماحولیاتی لائحۂ عمل شامل ہونا چاہیے۔ عوامی ترسیل کی آمد اور تعلیم کا زیادہ تر ممالک میں سیاحت کے فروغ کے لیے نامعی رول ہے۔

معاشی پہلو

سیاحت، سیاحوں کو ضروری ساز و ساماں اور خدمات فراہم کرکے، میزبان ملک میں، اقتصادی عمل کی سطح کو بڑھانے کا ذریعہ ہے۔ یہ سیاحت کو برآمدی صنعت کی حیثیت سے فروغ دینے کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے۔ یہ معاشی فائدے، آمدنی اور روزگار کی صورت میں ہوتے ہیں۔ کسی علاقے میں سیاحت پر ہونے والے اخراجات، مقامی باشندوں کے لیے آمدنی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اسے سیاحت کا براہ راست اثر مانا جاتا ہے۔ ثانوی اثر یہ ہے کہ سیاحوں کی جانب سے ادا کیے گئے پیسے کو سامان کی سپلائی، خدمت گاروں کی مزدوری اور ان کے مصرف کی دوسری چیزوں کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

> سیاحوں کی تعداد میں اس طرح اضافہ ہوتا رہا تو آنے والے برسوں میں تمام اہم سیاحتی مراکز کے ہوٹلوں اور قیام گاہوں میں سیاحوں کے قیام کا [illegible] بڑھے گا۔

سیاحت میں اضافے کا تخمینہ متعلقہ ساز و سامان کی فروخت اور روزگار فراہمی پر ہونے والے اخراجات کی بنیاد پر لگایا جاسکتا ہے۔ سیاحتی مقامات پر جب خرید بڑھتی ہے تو مقامی طور پر سامان اور خدمات کی فراہمی کی مانگ بھی بڑھتی ہے، جو براہ راست اور بالواسطہ طور پر مقامی لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع بڑھاتی ہے۔ ہمارے ملک میں سیاحت کے زیر اثر ساز و ساماں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے پیداوار بڑھانے کے پورے وسائل موجود ہیں۔ اور اس طرح سیاحت پر ہونے والا پورا خرچ ملک کے اندر ہی رہ سکتا ہے۔ غیر ملکی سیاحوں سے ہونے والی آمدنی کو برآمدات کے زمرے میں شمار کیا جانا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے غیر ملکی زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح سیاحت کا فروغ ہمارے ملک کو باہری آمدنی کا ذریعہ فراہم کرتا ہے۔

روزگار کا پہلو

سیاحت کے فروغ کا سماجی پہلو یہ ہے کہ اس سے مقامی لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع بڑھتے ہیں اور متعلقہ علاقے کے لیے آمدنی کا نیا راستہ کھلتا ہے۔ اس لیے سیاحت کے فروغ کے لیے وسیع تر پروگرام تیار کیا جانا چاہیے، جس میں مقامی لوگوں کے لیے تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام شامل ہو۔ ایک مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے کے ساتھ ہوٹلوں کا تہذیبی تصادم، آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور ان کے فوائد منفی پہلوؤں پر غالب آتے جا رہے ہیں۔ آمدنی میں اضافہ، بہتر معیار زندگی، تکمیلِ ذات کا

بڑھتا ہوا احساس اور ہم پیشہ افراد اور سیاحوں کے ساتھ سماجی میل جول اور رابطہ۔ سیاحت کے فروغ کے کچھ فائدے ہیں۔

اس طرح پیدا کیے اور بڑھائے گئے مزید مالیہ یا آمدنی سے ملک میں آمدنی کی عام سطح بلند ہوتی ہے اور لوگوں کا معیار زندگی بدلتا ہے۔

ماحولیاتی پہلو

پسماندہ اور ترقی پذیر خطوں میں سیاحت کا فروغ، متعدد ماحولیاتی مسائل مثلاً پانی کی ناقص فراہمی، گندگی کے اخراج اور صفائی کا ناکافی انتظام، غذائیت کی کمی، رہائش کی

یہ نفسیاتی اور ماحولیاتی حقائق پر مبنی ہے۔ طبعی ماحول کو اس طرح تبدیل کیا جاسکتا ہے کہ آنے والوں کے لیے خوشگوار فضا قائم ہوسکے۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ یہ مقامی اور قدرتی ماحول کو بہتر بناتے ہوئے اس سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے۔ اسے مختلف تکنیکوں مثلاً نامیاتی مادوں کا استعمال، کم اونچائی والی عمارت سازی اور مناظر قدرت کی تشکیل، جو قابل دید اور غیر معمولی مقامات کی داد و تحسین پیش کرتا ہے — کے استعمال سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ممکنہ حد تک دیسی عمارتی سامان کا استعمال کیا جاسکتا

تہذیبی پہلو

سیاحت کا فروغ، مقامی تہذیب و ثقافت کی بازیافت بھی کرتا ہے، عملی طور پر ہمارے فنکار، دست کار وغیرہ بروئے کار لائے جاتے ہیں، جس کے نتیجے کے طور پر مقامی لوگوں میں اپنی تہذیبی وراثت کے تئیں نئی دلچسپی پروان چڑھتی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ملک میں سیاحت کو سماجی اور تہذیبی رابطے کے فروغ کا موثر ذریعہ بنایا جائے، ضروری ہے کہ سیاحتی سرمایہ کاری کے میدان کے ساتھ ساتھ سیاحت کے شائقین کے حلقوں میں مناسب تعلیم اور جانکاری بہم پہنچانے کی جانب بھرپور کوشش کی جائے۔

سیاحت کا فروغ اختلاف اور تصفیہ کا عمل ہے یہ متقابلہ گروپوں میں توازن قائم کرنے کا معاملہ ہے یعنی نجی فائدے اور قومی مفادات کے درمیان اعتدال کا۔

بدتر حالت، بیماری اور قوم کی تباہی پر آمادہ صورت حال کا طاقتور حل اور جاندار جواب ہے۔ ملک کی ترقی کی شرح کو کنٹرول میں لاکر اور سیاحت کی مناسب پلاننگ کے ساتھ ہمیں ماحولیاتی مسائل کا سامنا نہیں کرنا چاہیے۔ قدرتی ماحول قائم رکھنے کے لیے، تفریح گاہوں کا فروغ زمین کے کچھ حصوں کا تحفظ کرسکتا ہے۔ لائحہ عمل میں خود ضابطگی کے ساتھ ساتھ لاگت کا ایک حصہ ماحولیات کے تحفظ کے لیے مختص ہونا چاہیے تاکہ قدرتی وسائل کو تباہی سے بچایا جاسکے اور ایسے وسائل کو بڑھایا جاسکے جو قدرت کی دین ہیں۔ سیاحت مکمل نظام قدرت پر مشتمل ہے جس میں انسان اور اس کی سرگرمیاں، حیوانات، پہاڑ اور وادیاں، ندیاں اور جنگلات، سماجی اور تہذیبی نظام، نباتات و حیوانات، موسم اور آب و ہوا وغیرہ شامل ہیں۔ پورا نظام ماحولیاتی تحفظ کا متقاضی ہے، جس کو مختصراً مندرجہ ذیل طریقے سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

سیاحت = (قدرت + حیوانات + انسان اور اس کا عمل + ماحول + ماحولیات)

انسانی ماحول کا تعلق لوگوں سے ہے اور

ہے تاہم انسانی ماحول کو محفوظ اور بہتر بنائے رکھنے کا دوسرا طریقہ تاریخ اور تہذیب کا تحفظ ہے۔ سیاحت انسان کو انسانی وراثت سے ہم آہنگ بنانے کے لیے لامحدود مواقع فراہم کرتی ہے۔ دراصل سیاحت ہمارے ماضی اور حال کے درمیان پل تعمیر کرتی ہے۔

اختتامیہ

مذکورہ باتوں کے پیش نظر، ملک میں سیاحت کے فروغ کو اولین ترجیح دینے کی ضرورت ہے۔ اس سمت میں بلاشبہ دشواریاں اور رکاوٹیں ہیں، لیکن تیز رفتار ترقی کی طرف گامزن اس صنعت سے بھرپور سماجی، اقتصادی فوائد حاصل کرنے کے لیے ہندوستانی سیاحت کی صنعت کے موجودہ ڈھانچے میں ضروری تبدیلی لائی جانی چاہیے۔ ●



"منگلم بیکا" مندر، کمبھاکونم

آلوک باجپائی

سیاحت:
نیا پیکج تیار کرنے کی ضرورت

زیر نظر مضمون میں مصنف کہتا ہے کہ وقت آگیا ہے کہ ہم سیاحت کو فروغ دینے کے لیے نئے طریقے تلاش کریں ورنہ جلد ہی ہمیں کافی مشکل پیش آئے گی اور مستقبل میں ہمارے بہت سے مہمان جنوب مشرقی ایشیا کے نئے مقامات کا رخ کرنے لگیں گے جن کو قدرت نے اس سے آدھا بھی نہیں دیا جتنا کہ ہندوستان کو عطا کیا ہے۔

چند سال قبل سردیوں میں میرے ایک غیر ملکی سفر کے دوران ایک امریکی سیاح نے جو ہندوستان کے بارے میں زیادہ معلومات چاہتا تھا مجھ سے پوچھا کہ کیا ہندوستان میں گوا، راجستھان اور جنوبی ہند کے علاوہ اور بھی کچھ ہے۔ میں نے کہا "آپ اسکیئنگ (SKIING) کے لیے جائیے۔"

"کیا آپ ہندوستان میں اسکیئنگ کرسکتے ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا جیسے میں نے اس سے الاسکا میں شیر کی سفاری دیکھنے کو کہہ دیا ہو۔ مجھے اس کی لاعلمی پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیوں کہ دراصل اس کی ذمہ داری ہمیں پر ہے کہ ہم نے ہندوستان کو مندروں، تاریخی یادگاروں، ریگستانی کلچر کی سرزمین کے طور پر مشہور کیا ہے۔ کسی اور بات کے لیے نہیں۔ میں اسے کچھ دلیرانہ سرگرمیوں کے بارے میں بتانے لگا جن میں وہ حصہ لے سکتا ہے۔ میں نے اسے ان جگہوں کے نام بھی بتائے جہاں ایڈوینچر گیمز ہوتے ہیں۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم تیز رفتار تبدیلی اور جدت کے خلاف کیوں ہیں۔ سیاحت ایک ایسا شعبہ ہے جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی پالیسی پر نئے سرے سے غور کریں۔ برسوں سے ہم ہندوستان کو تاریخی یادگاروں، قدیم مندروں، مقدس گھاٹوں اور حیرت انگیز کلچر (جو خاص کر راجستھانی کلچر تک محدود ہے) کی سرزمین کے طور پر مشہور کرتے رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۹۹۴ء کے ریکارڈس کے مطابق دنیا کے ٹورسٹ ٹریفک میں ہندوستان کا حصہ فقط ۰۳۶ فی صد اور عالمی سیاحت سے ہونے والی آمدنی میں ۰۷ فی صد ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنے پیکج پروگرام از سر نو مرتب کریں اور سیاحت کو فروغ دینے کے نئے

> اس کی ذمہ داری ہمیں پر ہے کہ ہم نے ہندوستان کو مندروں، تاریخی یادگاروں، ریگستانی کلچر کی سرزمین کے طور پر مشہور کیا ہے۔ کسی اور بات کے لیے نہیں۔

طریقے تلاش کریں۔ اگر ہم نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی نہ کی تو ایسی حالت پیدا ہو جائے گی جس پر عبور پانا مشکل ہوگا اور عالمی سیاح جنوب مشرقی کے دوسرے مقامات کا رخ کرنے لگیں گے جن کو قدرت نے اس کا آدھا بھی نہیں دیا ہے جتنا ہندوستان کو دیا ہے۔ مگر جنھوں نے سیاحت کی ترقی کے لیے سوچ سمجھ کر پرزور کوششیں کی ہیں۔

دو سرگرمیاں جو ہمارے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہیں یہ ہیں:

(الف) ایڈوینچر ٹورازم (دلیرانہ سیاحت) اور

(ب) گھسی پٹی سرگرمیوں سے الگ نئی سرگرمیاں اور نئے مقامات کو اجاگر کرنا۔

اگر ہم اپنے ملک کے جغرافیہ پر محض ایک سرسری نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے بہت سے علاقے، مقامات دلیرانہ سیاحت اور نئی سرگرمیوں کے لیے موزوں ہیں۔ کسی اور ملک کے جغرافیائی حالات اتنے گوناگوں نہیں ہیں جتنے ہندوستان کے ہیں۔ یہاں کوہ ہمالیہ ہے جس کے بیشتر حصے سارا سال برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ اس کا ایک طویل سمندری ساحل ہے جو اپنے نقرئی ریت پر ناز کرتا ہے۔ اس کے قومی پارکوں میں عجیب وغریب نباتات وحیوانات پائے جاتے ہیں۔ یہاں گنگناتے اور گرجتے ہوئے پہاڑی آبشاروں کی کمی نہیں ہے جہاں ایڈوینچر گیمز کھیلے جاسکتے ہیں۔ یہاں کی قبائلی زندگی بھی اپنے

اندر ایک انوکھی دلکشی رکھتی ہے۔

ایڈوانچر ٹورازم میں ٹریکنگ، اسکیئنگ، دریائی ریفٹنگ، کوہ پیمائی، چٹانوں پر چڑھائی، ہینگ گلائڈنگ اور زیرِ آب غوطہ خوری جیسے جان ہتھیلی پر رکھ کر کھیلے جانے والے کھیل شامل ہیں۔

اسکیئنگ

اسکیئنگ مقبول ترین دلیرانہ کھیلوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک جوش آفریں اور ولولہ انگیز کھیل ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک اسکیئنگ کے لیے صرف گلمرگ (کشمیر) کا نام ذہن میں آتا تھا جہاں بین الاقوامی طور پر تسلیم کی گئی اسکیئنگ گاہ ہے۔ لیکن جموں اور کشمیر میں غیر یقینی سیاسی حالات کے سبب اسے بند کر دیا گیا۔ حکومت نے اس کھیل کی اہمیت کو دھیان میں رکھتے ہوئے ایک متبادل اسکیئنگ ریزارٹ بنانے کی کوشش شروع کر دی چنانچہ گڑھوال (اتر پردیش) میں اولی اسکیئنگ ریزارٹ وجود میں آیا۔ حکومت نے اس پروجیکٹ پر کروڑوں روپے صرف کیے ہیں جس کے نتیجے میں آج اولی اپنی جدید ترین اور اسٹیٹ آف دی آرٹ تکنالوجی اور اپنے تجربہ کار انسٹرکٹروں پر فخر کر سکتا ہے۔ اولی کو جوشی مٹھ سے جوڑنے والی کیبل کار ایشیا میں اپنی قسم کی سب سے طویل کیبل کار خیال کی جاتی ہے۔ اولی میں چیئر لفٹ، اسکی لفٹ اور آرام دہ لیگ کیبنز کی سہولیات موجود ہیں۔ وہاں ایک بڑا ریستوراں بھی ہے۔ (اولی گڑھوال) کی ڈھلانیں ہر طرح کی اسکیئنگ کے لیے موزوں ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود اولی سیاحوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف راغب نہیں کر سکا ہے۔ اس کی بڑی وجہ آسائشوں کی کمی اور ناقص انتظام ہے۔ یہاں کے چند مسائل حسب ذیل ہیں:۔

(الف) یہاں ہمیشہ گرم پانی کی کمی ہوتی ہے۔ اولی میں اکثر سیاحوں کو خون منجمد کر دینے والی سردی میں ایک بالٹی گرم پانی کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔

(ب) کمروں کو گرم رکھنے کا نظام گھسا پٹا ہے۔

> ۱۹۹۲ء کے ریکارڈ کے مطابق دنیا کے ٹورسٹ ٹریفک میں ہندوستان کا حصہ فقط ۳۴ فیصد اور عالمی سیاحت سے ہونے والی آمدنی میں [illegible] فیصد ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم ایسے پروگرام ترتیب کریں اور سیاحت کو فروغ دینے کے نئے طریقے تلاش کریں۔

انھیں لکڑی اور مٹی کا تیل جلا کر گرم رکھا جاتا ہے اور ان دونوں چیزوں کی قلت رہتی ہے۔

(ج) سازوسامان خصوصاً اسکی بوٹس کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

(د) کیفے ٹیریا کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ آرڈر کی تعمیل کافی دیر سے ہوتی ہے۔

(ر) مناسب طبی سہولیات موجود نہیں ہیں۔

اولی کے نزدیک ایک ہوائی مستقر بھی ہے۔ اگر بندوبست اور مارکیٹنگ کو منصوبہ بند انداز سے بہتر بنا دیا جائے تو اولی مستقبل میں سیاحوں کے لیے ایک کشش انگیز اور جوش آفریں مقام بن سکتا ہے۔

اولی کے علاوہ دوسرے علاقوں مثلاً ہماچل میں سولانگ نالا اور مشرقی اروناچل پردیش کو بھی ترقی دے کر اسکیئنگ کے مراکز میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

دریائی ریفٹنگ

دریاؤں میں ریفٹنگ ایک اور ولولہ انگیز ایڈوانچر گیم ہے، جس کی ترقی کی ہندوستان میں کافی گنجائش ہے۔ اس وقت دریائی ریفٹنگ رشی کیش کے قریب گنگا کے نچلے حصے میں، منالی کے قریب دریائے بیاس میں اور کسی حد تک لداخ میں دریائے سندھ میں کی جاتی ہے۔ ان تمام جگہوں پر فقط چند ایجنسیاں ہی کام کر رہی ہیں۔ ریفٹنگ کو ملک کے دوسرے حصوں میں بھی فروغ دینے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ سکم میں، تیستا میں، آسام میں، برہمپتر میں اور اروناچل پردیش میں بھرالی ریفٹنگ کے لیے بہت اچھے ہیں۔ اس کھیل کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنے والے عناصر یہ ہیں:۔

(الف) سازوسامان کی اونچی قیمتیں کیوں کہ تمام ضروری سامان بیرون ملک سے منگانا پڑتا ہے۔

(ب) تربیت یافتہ دریائی گائڈوں کی کمی۔ اہل گائڈوں کو زیادہ تر نیپال سے اجرت پر لانا پڑتا ہے۔

امید ہے کہ ریفٹنگ کا سامان جلد ہی اندرون ملک ہی تیار ہونے لگے گا اور تربیت یافتہ گائڈوں کی تعداد بھی بڑھے گی اس لیے

> اولی (گڑھوال) کی ڈھلانیں ہر طرح کی اسکیئنگ کے لیے موزوں ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود اولی سیاحوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف راغب نہیں کر سکا ہے۔ اس کی بڑی وجہ آسائشوں کی کمی اور ناقص انتظام ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مستقبل میں ریفٹنگ بہت مقبول ہو جائے گی۔

ٹریکنگ

پہاڑوں سے متعارف ہونے کا سب سے اچھا طریقہ ہے پیدل چلنا۔ ہمالیہ تو ٹریکنگ کے شائقین کے لیے جنت کا درجہ رکھتا ہی ہے، اس کے علاوہ جنوب میں نیل گری کے سلسلہ ہائے کوہ، سہیادری اور

وسطی ہند میں کوہ ست پڑا ٹریکنگ کے واسطے اچھے مقامات ہیں۔ ٹریکنگ ایک کم خرچ ایڈونچر گیم ہے۔ اس کے لیے زیادہ سازوسامان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تاہم لمبے فاصلے پا پیادہ طے کرنے کے لیے جسمانی قوت اور صبرواستقلال اور مشاہدہ قدرت کا شوق بہت ضروری ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ٹریکنگ شعبے میں کئی خامیاں موجود ہیں جنھیں فوری طور پر دور کرنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر چند توجہ طلب خامیاں یہ ہیں:۔

(الف) بہت سے ٹریکنگ راستے مناسب طور پر نشان زدہ نہیں ہیں۔

(ب) ٹریکنگ کے راستوں سے ملحقہ علاقوں کے نباتات وحیوانات کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہیں یا بہت تھوڑی سی معلومات دستیاب ہیں۔

(ج) مغربی بنگال میں سنڈک پھو، سکم میں ٹسے زونگری اور اترپردیش میں ہر کی دون کو چھوڑ کر باقی ٹریک راستوں پر ٹریکروں کے قیام کے لیے جھونپڑیاں وغیرہ موجود نہیں ہیں۔

(د) بہت سے مقبول ٹریک راستے رفتہ رفتہ خراب ہوتے جارہے ہیں کیوں کہ کئی ٹریکرز ٹریک راستوں پر کوڑا یا گندگی بکھیرتے جاتے ہیں۔

نہایت ضروری ہے کہ ہم ان مسائل کو جلد از جلد حل کرنے کی کوشش کریں، جب کہ مذکورہ بالا پہلے تین مسئلوں کا حل بڑی حد تک حکومت کے ہاتھوں میں ہے، آخری مسئلہ ٹریکنگ کا انتظام کرنے والی ٹریولنگ ایجنسیوں کی دانشمندی اور ایمانداری کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے۔

ہیراگلائڈنگ اور ہینگ گلائڈنگ

عقاب یا چیل کی طرح آسمان میں اڑنے کے شائقین کے لیے ہیراگلائڈنگ اور ہینگ گلائڈنگ سے بہتر اور کوئی کھیل نہیں ہوسکتا۔ ہیراگلائڈنگ ایک طرح سے ہینگ گلائڈنگ کی ایک اصلاح شدہ شکل ہے۔ چوں کہ ہیراگلائڈنگ میں استعمال ہونے والے پر ہینگ گلائڈنگ کے لیے استعمال ہونے والوں پروں سے دس گنا ہلکے ہوتے ہیں اس لیے اول الذکر ایڈونچر کے شائقین میں زیادہ مقبول ہوتا جارہا ہے، جب کہ موخرالذکر کو صرف مقابلوں کے لیے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ چوں کہ ہماچل پردیش

ہماچل پردیش کا محکمہ سیاحت ہماچل کو دلیرانہ کھیلوں کا مرکز بنانے کا خواہاں ہے اس لیے ریاست میں بلاسپور اور منالی کے مقامات پر ہیراگلائڈنگ کو ترقی دی جارہی ہے۔

کا محکمہ سیاحت ہماچل کو دلیرانہ کھیلوں کا مرکز بنانے کا خواہاں ہے اس لیے اس ریاست میں بلاسپور اور منالی کے مقامات پر ہیراگلائڈنگ کو ترقی دی جارہی ہے۔ اتفاق سے ہماچل ان دو مقامات میں سے ایک ہے جہاں ہینگ گلائڈنگ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے (یہاں بیر میں بلنگ کے مقام پر ہینگ گلائڈنگ چیمپئن شپ کے سالانہ مقابلے بھی منعقد کیے گئے) دوسری جگہ جہاں ہینگ گلائڈنگ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اُوٹی ہے۔

ان کھیلوں کی ترقی کے لیے خاص کر بڑے شہروں کے قریب نئے علاقوں میں ہینگ گلائڈنگ کا انتظام کیا جانا چاہیے تاکہ اپنے ملک کے سیاح بھی مختصر وقفوں

ان کھیلوں کی ترقی کے لیے خاص کر بڑے شہروں کے قریب علاقوں میں ہینگ گلائڈنگ کا انتظام کیا جانا چاہیے تاکہ اپنے ملک کے سیاح بھی مختصر وقفوں اور ختم ہفتہ کے دوران ان کھیلوں میں حصہ لے سکیں۔

اور ختم ہفتہ کے دوران اس کھیل میں حصہ لے سکیں۔ دوسرے دلیرانہ کھیلوں کی طرح اس کھیل کی ترقی میں بھی تربیت دہندگان کی کمی اور سازوسامان کی اونچی قیمتوں کا مسئلہ حائل ہے۔ اسے جلد ہی حل کرنے کی ضرورت ہے۔

جنگلی جانور

نباتات وحیوانات کے شائقین کے لیے ہندوستان جنت کی مانند ہے۔ وہ دنیا کا واحد ملک ہے جہاں چاروں قسم کی "بڑی بلیاں" پائی جاتی ہیں۔ اس کے جنگلوں میں بہت سے نادر ونایاب جانور پائے جاتے ہیں جو دوسرے ممالک میں صرف چڑیا گھروں ہی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ افریقہ کو جہاں نباتات وحیوانات کی تعداد ہندوستان سے آدھی ہے جنگلی جانوروں کی سرزمین کے بطور جانا جاتا ہے جب کہ ہندوستان ابھی تک مندروں اور سپیروں کی سرزمین کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بنیادی ڈھانچے کی کمی ہے اور اس کی مارکیٹنگ ناقص ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمارے بیشتر قومی پارکوں کو مسائل کا سامنا ہے مثلاً

(الف) جانوروں کے مسکنوں کا علم رکھنے والے محافظوں اور گائڈوں کی کمی ہے۔

(ب) قیام گاہیں بہت کم ہیں اور ان میں رہنے کے لیے بکنگ کرانے کے ضابطے کافی سخت ہیں۔

(ج) پارک کے اندر ماحول کو مکدر نہ کرنے والی ٹرانسپورٹ کی کمی مثال کے طور پر زیادہ تر گاڑیاں ایسی ہیں جو بہت شور کرتی ہیں جس کی وجہ جانوروں کو دیکھ پانا محال ہوجاتا ہے۔

(د) پارکوں کے بہت سے علاقوں میں دیکھنے والے نہیں جاسکتے جس کی وجہ سے جانور کو دیکھنے کے مواقع کم ہوجاتے ہیں۔

شمال مشرقی سیکٹر میں نئے علاقوں کے لیے کھولے جانے اور بنیادی ڈھانچے میں بہتری کے ساتھ ساتھ مارکیٹنگ بھی بہتر ہوجانے کے بعد جنگلی جانوروں کے شائقین کو ہندوستان کی طرف راغب کیا جاسکے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

پانی کے کھیل

ہندوستان میں بے شمار جھیلیں ہیں اور اس کا سمندری ساحل بھی طویل ہے۔ جہاں لکش دریپ کے پاس سمندر کی لہریں پرسکون نظر آتی ہیں وہاں گوا کے

باقی صفحہ پر

سنیل سی رائے

ہندوستانی تعمیرات کا حسن

ہندوستان میں ایک عرصے سے مختلف دلچسپیاں رکھنے والے اور مختلف مشغلوں والے سیاح آتے رہے ہیں جس کے باعث ہندوستانی سیاحت کو ایک نئی معنویت حاصل ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستانی تعمیرات کا تنوع اور ان کی حیرت انگیز شان و عظمت سمجھی نکتہ داں سیاحوں کو نشہ اور سیر کرتی ہیں۔

سیاحت کے اولیں دور میں محرک جذبہ سیر و تماشا کی خواہش تھی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا سیاحوں کی گوناگوں دلچسپیوں اور جذبہ تجسس کے باعث سیاحت میں بھی ہمہ پہلو معنویت آگئی۔

بعض سیاحوں کے لیے سیاحت کا مقصد محض یہ ہے کہ بدیشی ملکوں کی اور مختلف مقامات کی سیر کی جائے۔ دوسروں کے لیے یہ انجانی جگہوں کی دریافت کی مہم ہوسکتی ہے۔ تیسرے قسم کے لوگ محض اپنی تلاش و جستجو کی خواہش کے تحت ہندوستان کا رخ کرتے ہیں کیوں کہ ہندوستان دنیا کے وسط میں تو واقع نہیں۔

ہندوستان میں ایک مدت سے مختلف دلچسپیوں اور مشغلوں کے سیاح آتے رہے ہیں اور اس طرح یہاں سیاحت کی نوعیت بھی بدلتی رہی ہے۔ پہلے یہاں مختلف ملکوں اور علاقوں کے، جن میں چین مشرق وسطی بھی شامل تھا، مسافر آئے جنھوں نے ہندوستان کو دنیا کے دیگر حصوں میں روشناس کرایا۔ یہ لوگ دراصل آج کی طرح کے سیاح نہیں تھے بلکہ ایسے مسافر تھے جو تہذیب کے اولیں ادوار میں ہندوستان آئے اور اپنی تسلی کر کے وطن واپس ہوئے۔ ان لوگوں میں ہم البیرونی، ابن بطوطہ، فاہیان اور ہیون سانگ کا نام لے سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو آج کے سیاحوں کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے گو کہ ان میں اور آج کے سیاح میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان میں ہندوستان کی زندگی اور تہذیب کے مطالعے کی زبردست خواہش تھی۔ حال میں چند دہے قبل انہی کی طرح ہنگری کا ایک باشندہ بدھ مت کے ماخذ کی تلاش میں ہندوستان آیا۔ وہ پیدل دورہ کرتا

ہندوستان میں ایک مدت سے مختلف دلچسپیوں اور مشغلوں کے سیاح آتے رہے ہیں اور اس طرح یہاں سیاحت کی نوعیت بھی بدلتی رہی ہے۔ پہلے یہاں مختلف ملکوں اور علاقوں کے مسافر آئے جنہوں نے ہندوستان کو دنیا کے دیگر حصوں میں روشناس کرایا۔

تھا اور آخر میں تبت بھی جانے والا تھا۔ لیکن وہاں جانے کے قبل ہی وہ دارجلنگ میں بیمار پڑا اور وہیں فوت ہوگیا۔

یہ لوگ نئے نئے ملک دریافت کرنے والوں کا سا جذبہ رکھتے تھے اور ان کی مثال ان لوگوں سے دی جا سکتی ہے جو ایورسٹ پر چڑھنا چاہتے ہیں۔ وہ پیدل سفر کرتے تھے، دریاؤں کو پھلانگتے تھے اور ریتیلے صحراؤں کو پار کر کے پہاڑی چوٹیاں بھی سر کرتے تھے۔

خوش قسمتی سے اب حالات بدل گئے ہیں خاص طور سے جب سے کہ اس صدی کے اوائل میں ہوائی جہاز ایجاد ہوگیا۔ نکتہ سنج سیاح پہلے تو خود اپنے ملک میں خصوصی قسم کی سیاحت سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اپنے ملک کی سرحدوں سے آگے اسی قسم کی سیاحت کرنا چاہتے ہیں۔ خود انگلستان میں ایک عرصے تک تعمیرات کی ڈزائن میں نوآبادیوں کی تعمیرات کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ انگلینڈ کے لوگوں کے طرز زندگی پر نوآبادیوں کا اثر پڑا لیکن ان کے سرکاری تعمیرات اور اداروں پر یہ اثر خاصا نمایاں ہے۔

تعمیرات کی کشش

ہندوستان میں سیاحوں کی دلچسپی کے لیے نئے پہلو ابھارنا ضروری ہے سیاح ہندوستان

کے قدیم فن تعمیر کی تھوڑی بہت جانکاری رکھتے ہیں لیکن اس امر کی نہیں کہ یہ فن وقت کے ساتھ کیسے کیسے بدلتا گیا اور جدید فن تعمیر میں ڈھل گیا۔ چناں چہ برطانوی دور میں سارے ملک میں خصوصاً کلکتہ، مدراس اور دہلی میں بڑی شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ یہی نہیں خواہ وہ میدان ہو یا پہاڑی علاقے، ہر جگہ کی سرکاری اور مذہبی عمارتوں میں برطانوی تعمیرات کا اثر نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔

دراصل فن تعمیر کسی ملک کے تہذیبی رجحانات کا عکاس ہوتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر ماحولیات سے مختلف ہوتا ہے جو کہ شجر کاری پر مبنی ہوتا ہے چوں کہ ہندوستان میں صدیوں تک مسلسل مختلف مذاہب کے حکمرانوں کی حکومت رہی لہٰذا اس کی تعمیراتی وراثت بھی گوناں گوں ہے جیسے ہم بہت سی پنکھڑیوں والے پھول سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ یہاں ہندو دور کے اثرات بھی ہیں اور مسلم اور

میں متعدد گیلیریوں میں سنگ تراشی کے نمونوں کے ذریعے رامائن کی مکمل کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ جدید فنکار انگ کوروات کی تراشی ہوئی حسین اپسراؤں کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔

بودھوں کے غار مندر

ہندوستان میں بدھ مت نے کئی نسلوں تک سنگ تراشوں کو تحریک و تشویق دی۔ اور انھوں نے پتھر کی مورتیوں میں بے شمار حسین و جمیل نمونے چھوڑے۔ اورنگ آباد کے قریب اجنتا میں کوئی ۳۰ غار ہیں جن میں بدھ سنگ تراشی اور مصوری کے مشہور عالم نمونے ہیں۔ غاروں میں واقع ان مندروں کو ایک جنگلی گھاٹی میں پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ ان کا عہد تعمیر دوسری صدی قبل مسیح سے ساتویں صدی عیسوی تک ہے۔ یہ دو قسم کے ہیں ایک ''وہار'' یعنی بودھ راہبوں کی خانقاہ جن میں راہب رہا کرتے تھے اور دوسرے ''چیتیہ'' یعنی وہ ہال جو عبادت گاہ یا دوسرے کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ منقش باہری دروازہ اس وقت کے رائج طرز تعمیر کی نمائندگی کرتا تھا اور اس میں داخل ہوکر پہلے بڑا ہال یعنی عبادت گاہ ملتی تھی اور اطراف کی گیلری میں راہبوں کے رہنے کی جگہ تھی۔ ان کے بستر بھی پتھر کاٹ کر بنائے گئے تھے۔

[illegible]
ہندوستان کے قدیم فن تعمیر کی تھوڑی بہت جانکاری رکھتے ہیں لیکن اس امر
کی نہیں کہ یہ فن وقت کے ساتھ کیسے کیسے بدلتا گیا اور جدید فن تعمیر میں ڈھل گیا۔

اِدھر راجستھان کا ہر گوشہ ایک نئی دنیا ہے اور ایک نیا تجربہ پیش کرتا ہے۔ راجستھان کو ہندوستان کا ریت کا پٹارا کہا جاتا ہے، گوکہ اسے ریت کا سمندر کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیوں کہ یہ ریگستان ۸۰۰ کلومیٹر لمبا اور تقریباً ۳۲۰ کلومیٹر چوڑا ہے۔ مشرق وسطیٰ کو جانے والی ساری اڑانیں اس پر سے ہوکر گزرتی ہیں اور ہوائی جہاز سے اس لہراتے ریگستان کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

جیسلمیر راجستھان کا ایک اہم شہر ہے جو کہ ایک پہاڑی پر قلعہ بند شکل میں واقع ہے۔ اس میں ایک جھیل بھی ہے جو گویا نخلستان کا کام دیتی ہے۔ یہ شہر پہاڑی کی ڈھلانوں پر پتھروں سے بنایا گیا ہے اور مشرق وسطیٰ کے عمان کی یاد دلاتا ہے جو کہ اُردن کی راجدھانی ہے۔

جیسلمیر میں سب سے زیادہ دلکش چیز اس کے عمدہ ڈزائن اور باریک نقش و نگار والے گھر اور حویلیاں ہیں جو سب پتھر کی بنی ہیں۔ دیواروں پر چھینی سے جو نقش و نگار ابھارے گئے ہیں ان کی تفصیلات اور حسن زردوزی کی کڑھائی کی یاد دلاتا ہے۔

راجستھان کے ایک اور شہر جودھپور میں بھی سنگِ خام کے بنے مکانات ہیں جن کے دروازوں پر چھتریاں بنی ہیں۔ ان میں سے اکثر مسلم طرز کی عمارتوں کے گنبدوں کی یاد دلاتی ہیں۔ چوں کہ راجستھان جین مذہب کا گڑھ بھی ہے لہٰذا یہاں کے فن تعمیر پر جین اثرات بھی نمایاں ہیں۔

بدھ دور کے بھی اور ۱۷ ویں صدی کے بعد سے نوآبادیاتی دور کے بھی جواب سے کوئی ۵۰ سال قبل برطانوی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ختم ہوا۔

جو سیاح جنوبی ہند جاتے ہیں ان کے لیے وہاں کے ہندو مندر سب سے زیادہ پرکشش ثابت ہوئے ہیں۔ تامل ناڈو میں مدورائی اور دیگر جگہوں کے مندر قبل مسیح زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب ہزاروں ہندوستانی مہاجرین جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں گئے تو وہاں کے فن تعمیر میں بھی ہندوستان کے تعمیراتی اثرات جھلکنے لگے مثلاً برما، سنگاپور اور آس پاس کے ممالک ہیں۔

راقم کو دوبار کمبوڈیا کے انگ کوروات

آثار قدیمہ کے ماہرین کے لیے یہ غار

جو سیاح جنوبی ہند جاتے ہیں ان کے لیے وہاں کے ہندو مندر سب سے زیادہ
پرکشش ثابت ہوتے ہیں۔ تامل ناڈو میں مدورائی اور دیگر جگہوں کے
مندر قبل مسیح زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

مندر جانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جو وہاں کی راجدھانی نوم پنہ سے کوئی ۲۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ انگ کوروات کو اب سے کوئی ۸۰۰ برس پہلے کمبوڈیا کے (جو پہلے کمبوج کہلاتا تھا) ایک ہندو راجہ سوریہ ورمن نے تعمیر کرایا تھا۔ جن لوگوں نے کھجوراہو اور کرناٹک میں بڑے بڑے عظیم الشان مندر دیکھے ہیں انھیں انگ کوروات کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے، جس

جیسے ایلورا کے غار اس لیے بہت اہم ہیں کیوں کہ ان سے بودھ طرز تعمیر کی تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ غار یا عمارتیں الگ تھلگ کھڑی ہیں اور ان کی تعمیر میں پتھر کے علاوہ اینٹ اور لکڑی بھی استعمال ہوئی تھی جو اب بیشتر نابود ہوچکی ہے۔ غار مندر، سارے وسطی ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کا چلن وسطی ایشیا اور چین میں بھی پایا جاتا ہے۔

نوآبادیاتی عمارتیں

سیاح عام طور سے اپنے ہندوستانی سفر کا آغاز دہلی سے کرتے ہیں اور یہاں کی عمارتیں ان پر اچھا اثر ڈالتی ہیں۔ لٹینس ۱۹۱۲ء میں دہلی آیا جہاں اس نے نئی دہلی کی داغ بیل ڈالی۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ محض ۳۵ سال کے قلیل عرصے میں برطانوی حکومت رخصت ہو جائے گی۔ لٹینس ایک آئرستانی خاتون کی چودہ اولاد میں سے گیارہواں تھا۔ وہ ایک مفلوک الحال کپتان تھا جو کہ مصوری اور نقشہ کشی بھی کرتا تھا۔ اس کی رسمی تعلیم بھی محض واجبی تھی۔

سیاح عام طور سے اپنے ہندوستانی سفر کا آغاز دہلی سے کرتے ہیں اور یہاں کی عمارتیں ان پر اچھا اثر ڈالتی ہیں۔ تعمیرات میں خصوصی دلچسپی رکھنے والے سیاحوں کے لیے دہلی یوں بھی اہم ہے کیوں کہ دہلی کے مشرقی اور جنوبی مضافات قدیم سلطنتوں کے آثار قدیمہ سے بھرے پڑے ہیں۔

اس نے نئی دہلی میں جو تعمیرات چھوڑیں انھیں ڈیڑھ صدی کے نوآبادیاتی طرز تعمیر کا جو سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا محض ایک سرسری نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس نے نئے شہر کو ان پہاڑیوں کی ڈھلانوں اور وادیوں میں بسایا، جو کہ دہلی کے نواح سے دریائے جمنا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس وقت جمنا کا پانی گویا لال قلعہ کی فصیلوں سے ٹکرایا کرتا تھا۔

تعمیرات میں خصوصی دلچسپی رکھنے والے سیاحوں کے لیے دہلی یوں بھی اہم ہے کیوں کہ دہلی کے مشرقی اور جنوبی مضافات قدیم سلطنتوں کے آثار قدیمہ سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ نہ صرف روایات بلکہ آثار قدیمہ کے ماہرین کے مطابق دہلی اسی قدیم اندرپرست پر آباد ہوا ہے جسے دوسری صدی قبل مسیح کے آریوں نے بسایا تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جنوبی روس اور وسطی ایشیا سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔

لٹینس نے "سامراجی ہندوستان کی نئی دہلی" کا خاکہ تیار کرتے وقت آثار قدیمہ کے اسٹائل سے انحراف کیا تھا۔ اس نے اپنے برطانوی ساتھیوں سے کہا تھا کہ وہ ماضی کو بھول جائیں اور اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے ایک نئی ڈزائن تیار کریں۔ لیکن دہلی کی لمبی تاریخ میں برطانوی تسلط محض ایک قلیل عرصے قائم رہا اور آج بھی دہلی میں بے شمار مغل اور دیگر آثار قدیمہ ہیں۔

مغلوں نے بلکہ ان کے قبل کے حکمرانوں نے بھی اپنے طرز تعمیر میں ماحولیات کا خاص خیال رکھا تھا۔ ہندو دور کے مندر بھی، خصوصاً اڑیسہ، آسام اور مغربی بنگال کے مندر، آب و ہوا کو مدنظر رکھ کر بنائے جاتے تھے۔ ان کی چھتوں میں ایسے چھجے ضرور بنائے جاتے تھے کہ بارش کا پانی ان سے حفاظت سے بہہ جائے، جب کہ مغلوں اور ان سے قبل کے شمالی ہند کے حکمرانوں نے اس کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا تھا۔

ہماچل پردیش اور دیگر پہاڑی علاقوں کے مندروں کا اپنا الگ طرز تعمیر ہے۔ اڑیسہ اور ہماچل میں بڑا فاصلہ ہے لیکن حیرت ہے کہ ان دونوں جگہوں کے مندروں کے طرز تعمیر میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے

ہندوستان میں فرانسیسی اور پرتگیزی طرز تعمیر کا ذکر بھی مناسب ہوگا خواہ وہ رہائشی مکانات ہوں یا سرکاری یا مذہبی عمارتیں، پانڈیچری، گوا، دمن اور دیو کی عمارتوں میں فرانس اور پرتگال کے طرز تعمیر کا نمایاں اثر موجود ہے۔ جو سیاح ہندوستان کو طرز تعمیر کے لحاظ سے دیکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہاں بے شمار مواقع اور امکانات موجود ہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ ان کے پاس کافی وقت ہو تاکہ وہ یہاں کے مندروں، مقبروں اور عمارتوں کے حسن کا خاطر خواہ لطف اٹھا سکیں۔ ●

بقیہ: سیاحتی دلچسپیوں کا ایک اور گہوارہ: تامل ناڈو

وشنا کوتتائی یعنی گول قلعہ کنیا کماری سے صرف چھ کلو میٹر کی دوری پر ہے۔

کوئمبٹور اور سالیم گو کہ اپنی صنعتوں کے لیے زیادہ مشہور ہیں لیکن یہاں بھی بعض قابل دید چیزیں ہیں مثال کے طور پر امراوتی ڈیم۔

ویلور جو مدراس سے تین گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے بہت تیزی سے ایک چھوٹے سے شہر میں بدل رہا ہے۔ یہاں کرسچین مشن کالج ہاسپٹل ہے جو ایشیا کے بڑے اسپتالوں میں سے ایک ہے۔ ویلور کا قلعہ قومی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ شہری تفرقات نے اس قلعہ کی حیثیت کو متاثر کیا ہے لیکن ایک شاندار ماضی اس سے وابستہ ہے۔

قدرت نے جیسے تمل ناڈو کو ہفت رنگ مناظر عطا کیے ہیں ویسے اس نے اس دھرتی کو ایسے سپوتوں سے بھی نوازا جنھوں نے اپنے جمالیاتی تجسس کی خاطر ماضی کی شان و شوکت پر پڑے جالوں کو صاف کرنے کے لیے عمریں تج دیں۔ ایسے بھی سپوت ہیں جو یہاں سے دور رہ کر بھی یہاں کی سیاحت کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ ساؤتھ افریقہ کے ایم۔ کے بابی نائیڈو ایسے لوگوں میں سرفہرست ہیں جو نہ صرف یہ کہ آج بلکہ اس زمانے میں بھی جب کہ ہندوستان اور ساؤتھ افریقہ کے درمیان سیاسی تعلقات نہیں تھے، اپنے یہاں کے لوگوں کو تمل ناڈو کی سیاحت کی ترغیب دیتے رہے ہیں۔ ماریشش کی محترمہ سایدہ کر موجنھوں نے دنیا گھوم کر دیکھی ہے، تمل ناڈو کو سیاحت کے اعتبار سے ایک منفرد مقام دیتی ہیں۔

آج دنیا میں "دفاع" (DEFENCE) سب سے بڑی صنعت ہے لیکن اس صدی کے آخر تک میزبانی کا کاروبار جو سیاحت کا ایک بہت بڑا حصہ ہے، دنیا کی سب سے بڑی صنعت کا مقام حاصل کر لے گا۔ اس نیک خدمت کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگ سامنے آئیں گے، زیادہ سے زیادہ جائدادیں اور مال و دولت اس صنعت سے وابستہ ہو جائیں گی۔ تمل ناڈو جو دشوار زمانوں میں بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے، کل اس صنعت کے فروغ کے بعد یقیناً اور زیادہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہوگا۔ ●

نکل آنند

کاروباری سفر۔ ایک سودمند تجربہ

وہ دن گئے جب ایک کاروباری مسافر دن بھر کے کام کے بعد آرام کرنے کے لیے ایک صاف ستھرا بستر اور ایک ایئر کنڈیشنڈ کمرہ پاکر خوش ہو جاتا تھا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ آج کا کاروباری مسافر بہت کچھ چاہتا ہے۔ ہمیشہ جلدی میں ہونے اور کاروبار میں سخت مقابلے کی وجہ سے وہ نہ صرف پردہ داری بلکہ جدید ترین سہولیات کا مطالبہ کرتا ہے۔

تبدیلی کا ایک ایسا عمل ہے جو کارپوریشنوں اور کمپنیوں میں لگاتار ہوتا رہتا ہے۔ کشادہ دلی اور نرم قواعد و ضوابط کی پالیسی پر عمل آوری سے ان کی زندگی کا کوئی شعبہ اچھوتا نہیں رہا ہے۔ غیر ملکی مقابلے کا سامنا کر سکنے کے لیے ہندوستانی صنعت لگاتار اپنے پروڈکٹس، بنیادی ڈھانچے، تنظیمی کلچر، تنظیمی ڈھانچے اور اپنے گاہکوں کی امیدوں اور ضرورتوں، خصوصاً کاروباری برادری کی ضروریات کا تنقیدی جائزہ لینے پر مجبور ہو گئی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب کاروباری مسافر، کیا غیر ملکی کیا ہندوستانی، دن بھر کے سخت کام کے بعد آرام کرنے کے لیے ایک صاف ستھرا بستر اور ایک ایئر کنڈیشنڈ کمرہ پاکر خوش ہو جاتے تھے لیکن جدید کاروباری مسافروں کی ضرورتوں کی وجہ سے ایک نئی قسم کے بنیادی ڈھانچے کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ کہنے کے لیے کسی بڑے تجزیاتی مطالعے کی ضرورت نہیں ہے کہ ٹکنالوجیکل اور اقتصادی عناصر ہی ۲۵ سے ۳۰ لاکھ کاروباری مسافروں کے لیے ایسے مطالبات کرنے کی بنیادی وجہ ہیں۔ لیکن یہ بہت زیادہ آمدنی دینے والا شعبہ ہے۔ کیوں کہ آج کل کے کاروباری مسافر سفر کے دوران اپنے باسہولت قیام پر بہت روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ اور بل میں کوئی ڈسکاؤنٹ یا کٹوتی طلب نہیں کرتے جب کہ چھٹی گزارنے یا سیر و تفریح کے لیے نکلنے والے لوگ گروپوں میں سفر کرتے ہیں تاکہ گروپ ڈسکاؤنٹ کا فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن کاروباری مسافر وقت کی کمی کے سبب ہمیشہ پردہ داری اور خاص الخاص سہولیات کا طالب ہوتا ہے۔

۱۹۹۱ء کے اقتصادی بحران کے بعد ملک میں کشادہ دلی اور نرم قواعد و ضوابط کا پروگرام شروع

جدید کاروباری مسافروں کی ضرورتوں کی وجہ سے ایک نئی قسم کے بنیادی ڈھانچے کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے۔ ٹکنالوجیکل اور اقتصادی عناصر ہی ۲۵ سے ۳۰ لاکھ کاروباری مسافروں کے لیے ایسے مطالبات کرنے کی بنیادی وجہ ہیں۔ لیکن یہ بہت زیادہ آمدنی دینے والا شعبہ ہے

کر کے کنٹرول ختم کر دیے گئے، محصولات کی شرحیں کم کر دی گئیں اور غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے دروازے کھول دیے گئے۔ اقتصادی اصلاحات کے ان پانچ سالوں میں میزبانی کی صنعت نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے مستقبل کی ضروریات کا اندازہ لگایا۔

ویلکم گروپ پہلا ادارہ تھا جس نے آنے والی تبدیلیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کاروباری طبقے کی ضرورتوں کی شناخت کی۔ اس نے ہر منزل پر ایک لاؤنج، انتظامیہ افسران کے لیے کلب اور اعلا درجے کا بزنس سینٹر بنایا۔ اس جدت پسندانہ طریقے کو ریزیڈنسی کا ٹاور ماڈل اختیار کر کے نکتۂ عروج پر پہنچایا گیا۔ ٹاور ماڈل کے معنی ہیں ہوٹل کے اندر ایک ہوٹل۔

چناں چہ اب کاروباری مسافروں کو نہ صرف ہیلتھ کلب اور اسپیشلٹی ریستوراں جیسی سہولیات بلکہ جدید ترین اور اعلا درجے کی مواصلاتی سہولیات، انٹرنیٹ کے ساتھ لنک۔ ان ڈور گولف کی سہولیات بھی دستیاب ہیں۔ ویلکم گروپ تو شوہر یا بیوی کو ختم ہفتہ گزارنے کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز کاروباری مسافر کے پاس لانے کی سہولت بھی فراہم کرتا ہے۔ اس کا کمیونی کیشن سینٹر جسے سائبر کلب کہا جاتا ہے۔ ملک میں اپنی قسم کا پہلا سینٹر ہے۔ ایک اور چیز جسے سب سے پہلے شروع کرنے کا سہرا اس گروپ کے سر ہے، وہ ہے گولف ہے

جو کمپیوٹر کی مدد سے کھیلا جاتا ہے۔ یہ سہولت ان لوگوں کے لیے فراہم کی گئی ہے جو شام یا رات کو یہ کھیل کھیلنا چاہتے ہوں۔

اگرچہ ویلکم گروپ کاروباری سفر کے لیے الگ سے خصوصی سہولیات فراہم کرنے میں سب سے آگے تھا۔ دوسرے ہوٹل بھی پیچھے نہیں رہے۔ اوبرائے، میریڈیئن، حیات ریجنسی، تاج پیلیس اور تاج مان سنگھ، ہلٹن اور اشوک نے بھی اپنے یہاں کاروباری مسافروں کے لیے خصوصی سہولیات کا اہتمام کیا۔ ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کاروباری مسافروں کے لیے اس کا کلب سب سے الگ اور منفرد نوعیت کا ہے۔ تقریباً تمام ہوٹل کمرے پر ایک فیکس مشین لگانے کی پیش کش کرتے ہیں۔ جو لوگ چاہتے ہیں انھیں کال سروس کے لیے شیلر فراہم کیے جاتے ہیں۔ خام مال، خوراک کی اشیاء اور پانی کی مخصوص لیبارٹریوں میں مائکروبائلوجیکل جانچ کی جاتی ہے۔ بزنس مین ہوٹل ایک خاص حصے میں چھوٹی موٹی کانفرنسیں منعقد کر سکتے ہیں۔ ہلٹن کا دعویٰ ہے کہ اس کے یہاں ایک نہایت عمدہ بزنس سینٹر کے ساتھ ساتھ ایک اسٹار نے کلب بھی ہے۔

میزبانی کی دنیا میں ان خصوصی سہولیات کی توقع رکھتے ہوئے دنیا بھر کے کاروباری مسافر، خصوصاً امریکہ کے کاروباری مسافر یہ چاہتے ہیں کہ وہ گفت و شنید کے لیے جہاں بھی جائیں وہاں انھیں خصوصی خدمات فراہم کی جائیں۔ یہ تجربہ جو دنیا بھر میں ہو رہا ہے، کاروباری معاہدات کرنے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ ہوٹل کے اندر ایک اور ہوٹل سے مراد یہ ہے کہ گو موخرالذکر کچھ دور واقع ہوتا ہے مگر وہ ہوٹل کمپلیکس کا حصہ ہوتا ہے۔

اگرچہ ویلکم گروپ کاروباری سفر کے لیے الگ سے خصوصی سہولیات فراہم کرنے میں سب سے آگے تھا۔ دوسرے ہوٹل بھی پیچھے نہیں رہے۔ اوبرائے، میریڈیئن، حیات ریجنسی، تاج پیلیس اور تاج مان سنگھ، ہلٹن اور اشوک نے بھی اپنے یہاں کاروباری مسافروں کے لیے خصوصی سہولیات کا اہتمام کیا۔

ہندوستان جیسے ملک میں شیراٹن ٹاورز کی کامیابی کی بلند سطح سے یہ آشکار ہوتا ہے کہ کاروباری مسافروں کی ضرورتیں خاص ہوتی ہیں اور انھیں صرف تربیت یافتہ مرد اور خواتین ہی جو یہ جانتی ہوں کہ یہ ضرورتیں کیا ہیں، پورا کر سکتی ہیں۔

کاروباری مسافروں کے لیے صحیح قسم کا عملہ مامور کیا جاتا ہے جو یہ دیکھتا ہے کہ مسافر کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی اس کی خدمت شروع ہو جائے۔ اسے ہوٹل لے جانے کے لیے ایک لیموزین گاڑی کھڑی ہو۔ ہوٹل میں پہنچتے ہی اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جاتا ہے اور اسے نفاست اور عمدگی کے ساتھ بلا تاخیر پورا کیا کیا جاتا ہے تاکہ مسافر جب تک ہوٹل میں رہے اس کا قیام آرام دہ اور نتیجہ خیز ہو۔ عمدہ خدمات پانے کے بعد جب مسافر اپنے وطن لوٹتا ہے تو اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے۔ دوران سفر بھی اس کے حکم کی ویسی ہی تعمیل کی گئی جیسی کہ اس کے دفتر یا گھر میں کی جاتی ہے۔

پانچ ستارہ ہوٹلوں میں کام کرنے والے ہر شخص کو کاروباری مسافروں کی اہمیت کا احساس کرایا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ کاروباری مسافروں کی پوری تسلی کے لیے لگاتار اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کریں اور میزبانی کی صنعت میں تکنالوجی کی پیش رفتوں سے باخبر رہیں تاکہ عمدگی اور خوش سلیقگی کے ساتھ خدمات انجام دے سکیں۔

سمجھا جاتا ہے مسافر کی پوری تسلی تبھی ہوتی ہے جب اس کی انفرادی ضرورتوں کی تکمیل عجلت اور سلیقے اور انکسار کے ساتھ کی جاتی ہے۔ خدمت سادہ اور انفرادی نوعیت کی ہونی چاہیے۔ یہ خدمت اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب مسافر ہوائی جہاز سے باہر قدم رکھتا ہے۔ منتظر عملہ خوش خلقی اور خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کرتا ہے اور اسے تیار کھڑی شاندار گاڑی میں ہوٹل لے جاتا ہے۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچتے ہی اس کا بٹلر سے تعارف کرایا جاتا ہے جو علاوہ دوسرے کاموں کے اس کے گائڈ اور سکریٹری کے فرائض انجام دیتا ہے۔ مسافروں کی مہمان نوازی کی بنیاد بے داغ انفرادی خدمت ہے۔

سیاحوں کی تسلی اور خوشنودی کے لیے مکمل تربیت اور پیشہ ورانہ معیاروں کی ضرورت ہے۔ خدمت کرنے والوں میں مہمان کی ضرورتوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہونی چاہیے اور انھیں ان ضرورتوں کو بلا تاخیر پورا کرنا چاہیے۔ ●

سیاحوں کی تسلی اور خوشنودی کے لیے مکمل تربیت اور پیشہ ورانہ معیاروں کی ضرورت ہے۔ خدمت کرنے والوں میں مہمان کی ضرورتوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہونی چاہیے اور انھیں ان ضرورتوں کو بلا تاخیر پورا کرنا چاہیے۔



سیمہ سناہی، سری نگر کے قریب کا ایک منظر

سبیتا گوسوامی

سات سہیلیوں کا مسحور کن علاقہ

شمالی مشرق کا علاقہ مسحور کن پہاڑیوں اور دلکش جانوروں سے بھرپور اور حیرت انگیز شان و عظمت کا حامل ہے۔ لہٰذا یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ابھی تک اس علاقے میں سیاحوں کی آمدورفت بہت کم رہی ہے گو کہ اس کی گنجائش بہت زیادہ ہے۔

اگر آپ موجودہ زندگی کے ہنگاموں سے دور کسی چوڑے دریا کے سینے پر کسی دیسی ناؤ میں بیٹھ کر سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں، اگر شبنم سے تر گھاس والی وادیوں میں پیدل چلنا چاہتے ہیں، اگر آپ جادوئی جنگلوں میں ہوا کی سرگوشی سننا چاہتے ہیں، یا اگر آپ صرف لیٹے لیٹے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں، مختصر یہ کہ اگر آپ فطرت کی آغوش میں اپنے اعصاب کو سکون دینا چاہتے ہیں یا اس کے برعکس سنسنی خیز تجربات اور مہم جوئی کے رسیا ہیں تو شمال مشرقی علاقے میں آئیے۔ ہمالیہ کے دامن میں واقع یہ علاقہ جو پہاڑیوں اور سرسبز وادیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اپنے پُراسرار سبزہ زاروں کا راز جاننے کی دعوت دیتا ہے۔ جب کہ عظیم الشان برہم پترا کی وسعت بار بار آپ کا دل موہ لے گی۔

گو کہ اس خطے کا جغرافیہ بہت مربوط و مسلسل ہے لیکن اسے سات سہیلیوں کا دیس کہا جاتا ہے۔ پہلی سہیلی اروناچل پردیش، شمال مشرقی سرے پر واقع ہے جب کہ آسام، ناگالینڈ، تری پورا، منی پور، میگھالیہ اور میزورم جنوبی حصے میں واقع ہیں۔ اس کے باوجود تاریخ اور روایت دونوں نے اس خطے کا مجموعی نام شمال مشرق رکھ دیا ہے۔ اس خطے کے دریا ان سبھی ریاستوں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں اور اس مسحور کن علاقے کی تاریخ بناتے رہتے ہیں۔

سات سہیلیاں

اروناچل پردیش سحر خیز پہاڑیوں کا علاقہ ہے۔ اس میں گنگناتے چشمے بھی ہیں اور گرجتے دریا بھی اس کے پہاڑی جنگلی علاقے میاں مار (برما) بھوٹان اور چین کی سرحدوں کو چھوتے ہیں۔ جب اس کی برف پوش چوٹیاں سورج کی کرنوں سے جگمگاتے ہیں تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ یہاں ۲۰ سے زیادہ قبائل اور ذیلی قبیلے بستے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی الگ بول چال، لباس، رسم و رواج، عقائد تقریبات اور کلچر ہیں۔

ہمالیہ کے دامن میں واقع یہ علاقہ جو پہاڑیوں اور سرسبز وادیوں سے بھرا پڑا ہے۔ گو کہ اس خطے کا جغرافیہ بہت مربوط و مسلسل ہے لیکن اسے سات سہیلیوں کا دیس کہا جاتا ہے۔ پہلی سہیلی اروناچل پردیش، شمال مشرقی سرے پر واقع ہے جب کہ آسام، ناگالینڈ، تری پورا، منی پور، میگھالیہ اور میزورم جنوبی حصے میں واقع ہیں۔

آسام جسے لال دریا اور نیلی پہاڑیوں کا دیس کہا جاتا ہے اپنے حسین قدرتی مناظر، نایاب پھول پھل اور حیوانات، لمبے چوڑے ہرے بھرے میدانوں، گھنے جنگلوں اور سب سے بڑھ کر عظیم دریائے برہم پترا کے لیے مشہور ہے۔ جو اس سنجیدگی اور وقار کے ساتھ بہتا ہے جیسے گویا گیان دھیان میں محو ہو۔ آسام کا دوسرا نام "لوہتیہ" بھی ہے جس کے معنی ہیں "لال" جب کہ جس پہاڑی پر کامکھیہ مندر واقع ہے اس کا نام ہے "نیلا چل" یعنی "نیلا" پرانی کتابوں میں آسام کو "پراگ جیوتش پور" بھی کہا گیا ہے۔ عظیم الشان دریاؤں اور دل لبھانے والے چشموں کے اس دیس کو ملک کا حسین ترین خطہ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں کے مختلف نسلوں کے باشندے اس کی دلکشی کو چار چاند لگاتے ہیں۔

ناگالینڈ بھی اپنی شاندار سرزمین اور اونچے پہاڑیوں کے لیے مشہور ہے۔ قبائلی علاقوں میں ناگالینڈ کے مردانہ حسن کی مثال دی جاتی ہے۔ یہاں بھی مختلف قبائل، ذیلی قبائل اور کنبوں کی بھرمار ہے جن کے الگ الگ کلچر، رسم و رواج اور عادات

ہیں۔ لوگ اکثر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا ناگا مرد اپنی محبوبہ کا دل جیتنے کے لیے اب بھی کسی دشمن کا سر کاٹ کر اسے پیش کرتے ہیں۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ کیوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ ناگا لوگ بھی بدل گئے ہیں۔ تری پورا دوسری ریاستوں سے گھری ہوئی ایک ریاست ہے جو بنگلہ دیش سے متصل ہے جب کہ اس کی شمالی گردن میزورم اور آسام کے پاس ہے۔ پہلے یہ ایک دیسی ریاست ہوا کرتی تھی۔ تری پورا بھی پہاڑی علاقہ ہے جسے جا بجا وادیاں قطع کرتی ہیں اور جس کے دریا بنگلہ دیش کی طرف بہتے ہیں۔ حسین ترشے ہوئے مندر اور محل یہاں کے سبزہ زاروں کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ چند آدی واسی قبائل کو چھوڑ کر یہاں کے بیشتر لوگ بنگلہ بولتے ہیں۔

شمال مشرق کا ایک اور علاقہ منی پور ہے جو اپنی سرسبز پہاڑیوں، تابناک جھیلوں اور عجیب و غریب کلچر کے لیے مشہور ہے۔ یہاں کے فوجی فنون، دیسی کھیل اور دست کاری اور کرگھے کا کام بھی مشہور ہے۔ یہاں تقریباً دو درجن قبائل آباد ہیں جن میں میتی لوگوں کے مختلف النوع کلچر اور عقائد ریاست کی دلکشی میں خصوصی اضافہ کرتے ہیں۔

میگھالیہ کے لغوی معنی ہیں بادلوں کا دیس۔ اس کے ٹیڑھے میڑھے راستے اس طرح اوپر چلے جاتے ہیں جیسے کہ آسمان کو چھو لیں گے۔ یہ اس علاقے کی خوب صورت ترین ریاستوں میں سے ہے۔ یہاں کی پہاڑیوں اور وادیوں میں سبزے کا ہر رنگ جھلکتا ہے۔ اگر کہیں گرجتے آبشار ہیں تو کہیں رنگ برنگے پھولوں کے گرد پھڑپھڑاتی شوخ تتلیاں۔ ساری فضا لمبے لمبے صنوبر کے درختوں کی خوشبو سے بھری ہوئی ہے۔ سارا ماحول اسے سیر و تفریح کے لیے مثالی پہاڑ بنا دیتا ہے۔ اس حسین ریاست میں تین ایسے بڑے قبیلے ہیں جن میں مادری سماجی نظام قائم ہے اور عورت ہی قبیلے کی سردار ہوتی ہے۔ میزورم شمال مشرق میں سب سے زیادہ

بلندی پر واقع ریاست ہے۔ یہاں استوائی خطے کے جنگلات پائے جاتے ہیں، جن کا حسن پر سکون ہوتا ہے۔ یہاں اونچے پہاڑوں پر رہنے والے بستے ہیں جن کا طرزِ زندگی اور عقائد سب سے الگ تھلگ ہیں۔ القصہ یہ ہے شمال مشرق کا علاقہ جہاں سیمنٹ و کنکریٹ کے جنگلوں میں رہنے والے سکون کی تلاش میں آ سکتے ہیں۔

شمال مشرق میں طرح طرح کے لوگ آ کر آباد ہوئے جس کی وجہ سے یہ ایک رنگا رنگ نسلی گلدستہ بن گیا۔ یہاں آسٹرو۔ ایشیاٹک بھی پائے جاتے ہیں اور دراوڑ بھی، تبتی برمی بھی پائے جاتے ہیں اور منگول بھی اور آریہ بھی جو ما قبل تاریخ سے یہاں موجود ہیں۔

کلچرل امتزاج

شمال مشرق میں طرح طرح کے لوگ آ کر آباد ہوئے جس کی وجہ سے یہ ایک رنگا رنگ نسلی گلدستہ بن گیا۔ یہاں آسٹرو۔ ایشیاٹک بھی پائے جاتے ہیں اور دراوڑ بھی، تبتی برمی بھی پائے جاتے ہیں اور منگول بھی اور آریہ بھی جو ما قبل تاریخ سے یہاں موجود ہیں۔ اس کے باعث کلچرل امتزاج ہوا ہے اس کی ایک جھلک یہاں کے لوک گیتوں میں ملتی ہے۔ یہاں کی تقریبات بھی طرح طرح کے عقائد اور رسم و رواج پر مبنی ہیں۔ پتھر کے بنے اوزار و ہتھیار کی موجودگی سے پتا چلتا ہے کہ ما قبل تاریخ عہد میں بھی یہاں بستیاں تھیں۔ چناں چہ یہاں کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کے پتھر کے کتبے سنسکرت زبان میں ہیں۔ ۱۳ ویں صدی میں برما کے تائی شان حکمرانوں نے جو آہوم تھے اس علاقے کو فتح کیا اور یہاں آ کر بس گئے۔ آہوم عہد کے اولیں پتھر کے کتبے تائی زبان میں ہیں اور چودھویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آسامی رسم خط اور زبان پہلی بار سترہویں صدی میں استعمال ہوئے۔ آہوم راجاؤں کی حکومت اٹھارہویں صدی تک قائم رہی جب کہ اس علاقے کو مسلسل برمی حملوں اور طویل خانہ جنگیوں نے کمزور بلکہ مفلوج کر دیا۔ انجام کار ۱۸۲۶ء میں انگریزوں نے حملہ کر کے اس علاقے پر اپنا تسلط جما لیا۔

بہرحال شمال مشرق کی آب و ہوا کے باعث اب سولہویں صدی سے قبل کا کوئی آثار باقی نہیں۔ البتہ ہوین سانگ کے سفرنامے سے جو یہاں ساتویں صدی میں آیا تھا، یہ پتا چلتا ہے کہ اس علاقے میں بے شمار "دیوا مندر" تھے جن کا اب کوئی نام و نشان نہیں۔ لہٰذا ان کے تعمیراتی ڈزائن کے بارے میں بھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ کامکھیہ مندر کی بنیادیں ساتویں صدی کی ہیں۔ گو کہ موجودہ مندر سولہویں صدی میں بنا تھا۔ کامکھیہ مندر سے کوئی ۳۵ کلو میٹر شمال میں۔ پہاڑیوں کا جو سلسلہ ہے اس پر مدن کامدیو مندر کے آثار پائے جاتے ہیں جو کہ گیارہویں صدی میں تعمیر ہوا تھا اور جس میں کھجوراہو کے طرز کی جیسی سنگ تراشی کے نمونے ہیں۔ سیاحوں کی دلچسپی کا ایک اور سبب یہاں کا دھات کا کام ہے۔ کانسے، پیتل، تانبے اور ملواں دھات کی دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں نویں صدی سے ۱۸ ویں صدی تک خاص طور سے بنتی رہیں۔ یہ مورتیاں مقامی عقائد کی عکاس ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا دریائی جزیرہ

یہ تو محقق ہی بتا سکتے ہیں کہ تانتری ہندو مت کس طرح وجود میں آیا۔ غالباً مظاہر پرستی اور ہندو دھرم کے امتزاج سے شمال مشرق کے مظاہر پرست عقائد ہندو مت سے بہت قریب ہیں۔ ایک زمانے میں تو آسام کو تانترک شکتی مت کا گڑھ کہا جاتا تھا جس کا سب سے اہم مرکز کامکھیہ مندر تھا۔ لیکن سنت شنکر ادیو کے زیر اثر یہاں نئی وشنو بھگتی تحریک کا بھی ورود ہوا جس کے باعث ایک روادار قوم وجود میں آئی جس میں ہر طرح کی

آسام میں بسنت ہالی اور بہار کی آمد کے خیر مقدم میں سارا علاقہ موسیقی اور ڈھول کی تھاپ سے گونجنے لگتا ہے۔ اس تقریب کو آسامی میں "رونگالی بیہو" کہا جاتا ہے۔ سارا علاقہ بیہو یعنی عشق و محبت کے نغموں سے بھر جاتا ہے۔

روحانی اقدار کی جگہ تھی۔ بھگتی تحریک ایک ہمہ گیر سماجی تحریک بن گئی اور اس نے یہاں کی زندگی کے ہر پہلو پر یعنی کلچر، موسیقی، رقص اور زبان پر بھی اثر ڈالا۔

جائے رنگانوں کے لیے مشہور جورہاٹ کے قریب نیمتی گھاٹ سے کشتی کے ذریعے سفر کیجیے تو ایک گھنٹے بعد برہم پترا دریا میں ایک عظیم الشان جزیرہ ملتا ہے جس کا نام "ماجولی" ہے جو دنیا میں سب سے بڑا دریائی جزیرہ بتایا جاتا ہے۔ یہ وشنو بھگتی کلچر کے ایک اہم مرکز کے طور پر بھی مشہور ہے جہاں وشنو دھرم کو اصلی روپ میں محفوظ رکھا گیا ہے۔

بیہو کی رنگارنگی

آسام میں نئے سال اور بہار کی آمد کے خیر مقدم میں سارا علاقہ موسیقی اور ڈھول کی تھاپ سے گونجنے لگتا ہے۔ اس تقریب کو آسامی میں "رونگالی بیہو" کہا جاتا ہے اور سارا ماحول "بیہو" یعنی عشق و مستی کے سُروں سے بھر جاتا ہے۔ نوجوان مرد اور عورتیں ڈھول، جھانجھ اور بھینس کے سینگ کی سنگت پر تیز قدموں سے اور ہاتھ ہلا ہلا کر ناچتے ہیں۔ یہ وقت جشن منانے کا ہوتا ہے اور سارے قبیلے اپنے اپنے انداز میں اس کو مناتے ہیں۔ آسام کا "بیہو"، اروناچل پردیش کا "موپن" یا "سولنگ"، میگھالیہ کا "مانگ کرم"، میزورم کا "چپچار کٹ"، تری پورا کا "میلوما" اور منی پور کا "لے ہروبا" اس علاقے کی روایتی تقریبات ہیں جن کی بے ساختگی اور مسرت سے لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔

دلکش دست کاری

شمال مشرق کے لوگوں کی بُنائی اور کڑھائی ان کے رنگین تخیل کی عکاس ہے۔ اروناچل پردیش، ناگالینڈ، منی پور اور میزورم کے لوگ حیرت انگیز رنگوں کے میل سے اپنے روایتی ڈیزائن کے کپڑے بنتے ہیں۔ آسام میں نادر موگا سلک کا رواج ہے جو اس لیے مشہور ہے کیوں کہ یہ شہتوت کے ریشم کے کیڑوں سے نہیں بنتی، بلکہ آسام کے علاوہ دنیا کے کسی اور خطے میں یہ سنہرا ریشم نہیں پایا جاتا۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں بید اور بانس بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور سیاح نہایت ذوق و شوق سے یہاں کی بید اور بانس کی دست کاری خریدتے ہیں۔ یہاں کی ایک اور خاص چیز سونے اور رنگین موتیوں کے بنے زیورات ہیں۔ یہ بھی روایتی انداز میں بنائے جاتے ہیں۔

سیاحوں کی کشش کا ایک اور باعث "کازی رنگا قومی پارک" ہے جہاں کہ ایک سینگ والا گینڈا پایا جاتا ہے جو ہندوستان سے مخصوص ہے۔ پارک کی لمبی لمبی گھاس اور دلدلی علاقوں میں گینڈے آزادی سے پالتو مویشیوں کی طرح چرتے ہیں۔

اس علاقے میں نایاب پھول پھل اور حیوانات پائے جاتے ہیں جو کہ مناظر فطرت کی زیبائش کو دوبالا کرتے ہیں۔ ہری بھری پہاڑیاں ایسی لگتی ہیں جیسے کہ میدانوں سے آہستہ آہستہ اُگی ہوں، بے شمار دریا اور چشمے، دھان کے لہلہاتے کھیت جو موسم کے لحاظ سے ہرے یا سنہرے لگتے ہیں، ایسی سرزمین جو معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ آسمان کو چھولے گی، البتہ پہاڑیوں کے بیچ میں "جھوم" کے ایسے خطے بھی پائے جاتے ہیں جہاں جنگل کو جلا کر کھیتی کی جاتی ہے اور بعد میں اس زمین کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دیو زاد درختوں پر لٹکتے رنگا رنگ آرکڈ (ثعلب مصری) کے پھول دیکھ کر دل فطرت کی عظمت پر دنگ رہ جاتا ہے۔ چائے باغانوں کا سلسلہ اور ان میں کہیں کہیں سایہ دار درخت طرح طرح کے سبز رنگوں کی بہار دکھاتے ہیں اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔ پیلے املتاس اور لال گل مہر نیلے آکاش کے ساتھ مل کر اپنا رنگ جماتے ہیں اور شمال مشرق کے جنگلوں کی شان بڑھاتے ہیں۔

سیاحوں کی کشش کا ایک اور باعث کازی رنگا قومی پارک ہے جہاں کہ ایک سینگ والا گینڈا پایا جاتا ہے جو ہندوستان سے مخصوص ہے۔ پارک کی لمبی لمبی گھاس اور دلدلی علاقوں میں گینڈے آزادی سے پالتو مویشیوں کی طرح چرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس پارک میں ہُولک گبن (ایک قسم کا بندر)، جنگلی بھینس، دلدلی ہرن، بھونکنے والا ہرن اور بے شمار اقسام کی چڑیاں پائی جاتی ہیں۔ ماہرین نے یہاں تین سو سے زائد قسم کی چڑیاں دیکھی ہیں جن میں پانی کی چڑیاں، بطخیں اور مہاجر چڑیاں بھی شامل ہیں۔ ماہرین طیوران چہچہاتی چڑیوں کے مسکن میں ان کی عادات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ البتہ یہ آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بعض مہاجر چڑیاں کیوں آسام کے ایک چھوٹے سے گاؤں جتنگا کی پہاڑیوں پر ہر سال جاکر مر جاتی ہیں۔

اس علاقے کی مانس پناہ گاہ میں بنگال کا شیر بھی پایا جاتا ہے۔ یہ بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔

شمال مشرق میں فطرت کی فیاضی، اس کی دلکش پہاڑیاں اور دل فریب جنگلی جانور یہ سب سیاحوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ لیکن زبردست امکانات کے باوجود یہاں سیاحوں کی کوئی خاص بڑی تعداد نہیں آتی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس علاقے کے بارے میں خاطر خواہ پبلسٹی نہیں ہوتی۔

سیاحت کے بے شمار امکانات

شمال مشرق میں فطرت کی فیاضی، اس کی دلکش پہاڑیاں اور دل فریب جنگلی جانور یہ سب سیاحوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ لیکن زبردست امکانات کے باوجود یہاں سیاحوں کی کوئی خاص بڑی تعداد نہیں آتی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس علاقے کے بارے میں خاطر خواہ پبلسٹی نہیں

ہوتی۔ اس کے علاوہ سیاحوں کے لیے بنیادی سہولتوں کی بھی کمی ہے۔ ابھی سیاحت کا سارا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہے جس کے باعث تاجرانہ انداز فکر غائب ہے۔ یہاں کے قانون اور اس کے بارے میں بھی تشویش ناک خبریں چھپتی رہتی ہیں اور اس کے باعث بھی سیاح یہاں آنے سے گریز کرتے ہیں۔ البتہ حکومت نے بدیسیوں پر سے "محدود علاقہ پرمٹ" ہٹا دی ہے جس کے باعث اس علاقے میں بدیسیوں کی آمد و رفت آسان ہو گئی ہے۔

سرکاری محکموں کی بے حسی غالباً اسی وقت ٹوٹے گی جب کہ پرائیویٹ سیکٹر کے سیاحتی ادارے اس علاقے میں وسیع پیمانے پر داخل ہوں گے۔ بعض اداروں نے چند "پیکیج ٹور" شروع کیے ہیں لیکن اس کے لیے بھی حکومت کا تعاون اور رابطہ ضروری ہے۔ لہٰذا ریاستی سرکاروں

علاقے میں آتے ہیں وہ چار پانچ جگہوں کی سیر کرنا پسند کرتے ہیں۔ حال ہی میں انگلینڈ کے ایک سفری ایجنٹ نے "ایکسپلور" نامی ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس میں "آسام سفاری" کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کے باعث بہت سے بدیسی سیاح آسام آئے۔ لیکن سیاحت کے سلسلے میں اس بات کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس علاقے کی نسلی خصوصیات بگڑنے نہ پائیں۔ شمال مشرق کے لوگ فطری طور پر مہمان نواز ہیں لیکن ایسا نہ ہو کہ ان کی مہمان نوازی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کے فطری ماحول اور مقامی کلچر میں رخنہ ڈالا جائے۔

برطانیہ کے لوگ تو خاص طور سے چائے کی پتی کے دیس آسام کو دیکھ کر پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ وہ جب گہرے سبز جنگلوں میں

> چونکہ یہاں کی سیاحت بیشتر مناظر فطرت پر مبنی ہے لہٰذا محکمہ سیاحت اور جنگلات کے محکمے کے مابین قریبی تعاون اور بہتر افہام و تفہیم ضروری ہے۔ علاوہ ازیں یہاں مہم جوئی پر مبنی سیاحت کو فروغ دینے کی بھی گنجائش ہے۔

کو چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ مقامی حکام کے تخیل کو مہمیز لگانی ہے کہ سیاحت کی صنعت سے ریاست کے خزانے بھرے جا سکیں۔ چوں کہ یہاں کی سیاحت بیشتر مناظر فطرت پر مبنی ہے لہٰذا محکمہ سیاحت اور جنگلات کے محکمے کے مابین قریبی تعاون اور بہتر افہام و تفہیم ضروری ہے۔ علاوہ ازیں یہاں مہم جوئی پر مبنی سیاحت کو فروغ دینے کی بھی کافی گنجائش ہے۔ برہم پترا کے وسیع دامن پر آبی کھیل ہو سکتے ہیں جب کہ اس کے معاون دریاؤں کے شفاف پانی میں مچھلی کا شکار ہو سکتا ہے۔ سیاحوں کو پہاڑوں پر پیدل چلنے کی ترغیب دی جا سکتی ہے۔

حکومت ہند کے محکمۂ سیاحت نے "ایک ہرے تکون" کی سیاحت کی اسکیم بنائی ہے جس سے اچھے نتیجے ملنے کی امید ہے۔ یہ تکون گوہاٹی۔ شیلانگ۔ کازی رنگا پر مشتمل ہے اور اسے وسعت دے کر کاٹھمنڈو اور سکم تک بڑھایا جا سکتا ہے، کیوں کہ جو بدیسی سیاح اس

چنگھاڑتے ہاتھیوں کی آوازیں یاد کرتے ہیں تو اپنے پوتوں اور نواسوں کو عجیب و غریب کہانیاں سنانے لگتے ہیں۔ اسی طرح وہ آسام کے دل لبھانے والے سنگیت کو یاد کرتے ہیں تو انھیں اپنی گزری جوانی بھی یاد آتی ہے۔ وسط اپریل کی بیہو تقریبات اور نومبر کی چائے تقریب، جشن و مسرت کے دلدادہ سیاحوں کا دل موہ لیتی ہیں۔ لیکن ابھی اس علاقے کے باہر کے لوگوں کو اس کا بخوبی علم نہیں کہ ناگالینڈ کی خزاں کی تقریب، میزورم کی چپ چار کٹ، منی پور کے جوانوں کا جشن، میگھالے کا جشن بہار اور آسام کی بیہو اور چائے کی تقریب کتنی دلکش ہو سکتی ہیں گو کہ مرکزی محکمۂ سیاحت نے انھیں اپنی تقریبات کی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔

میرے ایک ساتھی کرسٹو فرگنس نے یہاں کا دورہ کرتے وقت ایک چاندنی رات میں کامکھیہ مندر کی پہاڑی کی چوٹی سے نظارہ کرتے ہوئے کہا تھا، "سورگ یہاں سے کتنا قریب ہے!" چاندنی رات کی اس خاموشی میں محض جھینگروں کی صدائیں آ رہی تھیں۔ فطرت کا ایسا حسن ہی دنیا کو رہنے کے قابل بناتا ہے۔

بقیہ: فروغ سیاحت کے لیے بنیادی ڈھانچے کی اہمیت

تمام اہم مقامات سیاحت تک شتابدی ایکسپریس جیسی ٹرینیں چلانی چاہئیں۔ زمینی ٹرانسپورٹ کو بہتر بنانے کے لیے مقامات سیاحت کو چار لینوں والی شاہراہوں سے جوڑنا چاہیے۔ یہ کام فوری طور پر کیا جانا چاہیے۔ شہروں کے اندر کی سڑکوں کو بھی فوری طور پر بہتر بنایا جانا چاہیے کیوں کہ کاروباری افراد اور سیاح بھی ان پر سفر کرتے ہیں۔ سیاحوں کے بذریعہ سڑک سفر کرنے کے لیے بیرون ملک سے آرام دہ کوچ اور شاندار کاریں درآمد کرنے کا انتظام بھی کیا جانا چاہیے۔

اتنی عظیم ترقی کے نتیجے میں سبھی سطحوں پر ورکروں کی کمی ہو گئی ہے۔ ایشیا۔ بحرالکاہل خطے کو ۲۰۰۵ء تک ۸۰۰۰۰ مینیجروں / انتظامیہ افسروں، ۳۴ لاکھ نفوس پر مشتمل نگراں عملے، ایک کروڑ ۲۸ لاکھ فرنٹ لائن اسٹاف کی ضرورت ہو گی۔ مختصر یہ کہ ہر روز ۲۹۰۰۰ افراد کو تربیت دینے کی ضرورت ہے۔

یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ریاستی حکومتوں کو ترغیبات بھی مہیا کرنی چاہئیں۔ مثال کے طور پر پروجیکٹ رپورٹیں تیار کرنے کے لیے ۵۰ فی صد سبسڈی دی جانی چاہیے جو ایک پروجیکٹ کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ روپے ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ تسلیم شدہ اداروں میں ٹورازم انڈسٹری کے ملازمین کی تربیت کے لیے بھی ۵۰ فی صد سبسڈی عطا کی جانی چاہیے جو تربیت پانے والوں کے لیے زیادہ سے زیادہ ۵۰۰۰ فی کس ہو سکتی ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ حکومت ہند، ریاستی حکومتیں اور ٹریڈ بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنانے کے لیے صدق دل سے کام کریں۔ صرف اسی طرح ہمارے منصوبے حقیقت پسندانہ بن سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو عالمی ٹورسٹ ٹریفک میں بھارت کا حصہ جو پہلے ہی گھٹ کر ۴ر فی صد ہو گیا ہے، بدستور گھٹتا ہی رہے گا۔ بھارت کی شرح ترقی جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں حتیٰ کہ چین سے بھی کم ہے۔ تبدیلی بنیادی سہولتوں کو بہتر بنا کر ہی لائی جا سکتی ہے، محض زبانی جمع خرچ سے نہیں۔ ●

سمیر پال

سکم آپ کا منتظر ہے

مصنف نے اس مضمون میں بتایا ہے کہ کسی بھی فیصلے کے لیے سکم کے مقامات سیاحت سکون کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کے لیے عمدہ مقامات ہیں۔ وہاں ایک مختصر قیام بھی ایک ناقابل فراموش تجربہ ہو گا۔

۵۸۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع سکم سیر و سیاحت کے لیے ایک دلکش اور عمدہ مقام ہے۔ یہاں کے قدرتی مناظر قابلِ دید ہیں۔ کنچن جنگا سے دنیا کی بلندترین چوٹی ایورسٹ تک پورے ہمالیائی سلسلۂ کوہ کا یہاں سے نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

یہاں کا قدرتی حسن اور متنوع حیاتیات سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ یہاں ہفتہ دس دن کا مختصر قیام بھی روح افزا اور فرحت بخش ہوتا ہے جس کی یاد بھلائی نہیں جاسکتی۔

سکم کی سیاحت کے لیے بہترین موسم اکتوبر تا دسمبر اور وسط فروری سے آخر مئی تک ہے۔ گرمیوں میں وہاں درجۂ حرارت ۱۳ سے ۲۱ ڈگری سیلیئس رہتا ہے۔ سردیوں میں یہ ۷ سے ۱۵ ڈگری سیلیئس ہوتا ہے۔

سکم میں شمالی بنگال کے سلی گوڑی (۱۱۴ کلومیٹر) اور نیو جلپائی گوڑی (۱۲۵ کلومیٹر) کے ریلوے اسٹیشنوں سے بذریعہ ٹرین بآسانی پہنچا جاسکتا ہے۔ قریب ترین ہوائی اڈہ باگ ڈوگرہ (۱۲۴ کلومیٹر) ہے جہاں انڈین ایئر لائنز اور پرائیوٹ ایئر لائنوں کے ہوائی جہاز جاتے ہیں۔ سکم کی راجدھانی گنگ ٹوک تک پانچ گھنٹے کا بس کا سفر بھی آسان ہے کیوں کہ اس کے لیے ایک اچھی پہاڑی سڑک موجود ہے جس پر آدھے فاصلے پر ایک آرام گاہ ہے جہاں اچھا کھانا اور عمدہ مشروبات مناسب داموں پر ملتے ہیں۔ اس کا انتظام سکم ٹورسٹ آرگنائزیشن چلاتی ہے۔

سکم میں داخل ہوتے ہی رنگ پو میں ریاستی حکومت کا ایک "لاج" ہے یہاں ٹھہرنے کے لیے جگہ عموماً آسانی سے مل جاتی ہے۔ نزدیک ہی سنگتام میں دریا کے کنارے فروٹ پروڈکٹس کو ڈبوں میں بند کرنے کی ایک فیکٹری ہے جس کا طریق کار بچوں اور بالغوں دونوں ہی کے لیے باعث دلچسپی ہے۔ گنگ ٹوک میں میور ہوٹل اور سکم ٹورسٹ آفس کے نیچے بس ٹرمینس بلڈنگ میں ملیو لیشپ ریستوراں ہے۔ چوں کہ ان دونوں کا انتظام سرکاری ہاتھوں میں ہے اس لیے ان کے نرخ واجبی ہیں۔ قصبے کے اوپر برج پر بیس منٹ کا فاصلہ پیدل طے کرکے نسائنو لچو لاج ہے۔ یہ ٹیلی ویژن ٹاور کے نزدیک واقع ہے جو بڑے بازار سے دکھائی دیتا ہے۔ مقررہ وقت پر ٹورسٹ بسیں چلتی ہیں۔ ٹیکسی والوں سے تھوڑے فاصلے کے لیے سودے بازی کرنی پڑتی ہے۔

گنگ ٹوک میں سائنو لچو لاج اور مغربی سکم میں پیمایا نگتسے کے ماؤنٹ ہینڈم لاج بھی آرام دہ قیام گاہیں ہیں اور ان کے نرخ بھی معقول ہیں۔ بحسن و خوبی چلائے جانے والے یہ لاج سیاحت کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ کئی بار انھیں نجی ہاتھوں میں سونپنے کی بات بھی چلی ہے۔ یہ دونوں لاج ایسی جگہ واقع ہیں کہ بیڈروم اور کھانے کے کمرے کی کھڑکیوں سے کنچن جنگا کے پہاڑی سلسلے کا شاندار نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ پو پھٹنے سے لے کر دن میں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ پر سورج کی کھیلتی ہوئی کرنیں مختلف رنگوں کا جلوہ دکھاتی ہیں۔

۵۸۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع سکم سیر و سیاحت کے لیے ایک دلکش اور عمدہ مقام ہے۔ یہاں کے قدرتی مناظر قابلِ دید ہیں۔ کنچن جنگا سے دنیا کی بلندترین چوٹی ایورسٹ تک پورے ہمالیائی سلسلۂ کوہ کا یہاں سے نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

پہاڑ کی چوٹی کا نظارہ کرنے کا بہترین وقت صبح سویرے ہے۔ اس سے پیشتر کہ وادیوں میں درجۂ حرارت بڑھنے لگے اور اوپر کی طرف بہتی ہوائی ہوائیں بادلوں کو ہٹا دیں۔

سکم میں ٹریکنگ کرنے والوں کے مختلف جگہوں پر سہا جھونپڑیاں ہیں جہاں ٹریکر آرام کر سکتے ہیں۔ بہت سے سیاح گنگ ٹوک جاتے ہیں اور صبح اور بعد دوپہر کے نظارے دکھانے والی ٹورسٹ بس پکڑ لیتے ہیں جو انھیں تعصب مدری کا باغ اور مریڈک کی خانقاہ تک لے جاتی ہے۔ یہ خانقاہ اس رج کے، جس پر گنگ ٹوک واقع ہے متوازی رج کے دور کے سرے پر واقع ہے۔

گنگ ٹوک کے شمال میں مانگن ہے جہاں سے کنچن جنگا کے پہاڑی سلسلے کا زیادہ قریبی نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے آگے تیستا ندی کے کنارے سینگھک اور چنگ تھانگ واقع ہیں۔ یہاں دریا میں اس کے دو معاون آکر ملتے ہیں۔ جن میں سے ایک شمال مشرق میں لاچنگ کے آگے سے اور دوسرا شمال مغرب میں لاچن کے آگے سے آتا ہے۔ یہ مقامات گھریلو سیاحوں کے لیے کھلے ہیں اور وہ پرمٹ لے کر ہی انھیں دیکھنے آ سکتے ہیں۔ یہ پابندی اس لیے لگائی گئی ہے کہ یہ جگہیں ہند چین سرحد کے نزدیک واقع ہے اور ناتھولا درّے سے گنگ ٹوک کے مشرق تک سرحد کے اس پار چینی فوجیں کافی تعداد میں تعینات ہیں۔

لاچنگ کے شمال میں گندھک کے چشمے ہیں اور اس کے شمال میں ۱۲۰۰۰ فٹ کی اونچائی پر یم تھانگ وادی ہے۔ وہاں ایک فارسیٹ ریسٹ ہاؤس ہے جہاں سیاح نیو سکم ہاؤس چانکیہ پوری دہلی میں پیشگی درخواست دینے اور گنگ ٹاک میں رابطہ قائم کرنے کے بعد قیام فرما سکتے ہیں۔

گنگ ٹاک سے قریباً ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ۱۲۲۲ فٹ کی اونچائی پر سُوگو نام کی

سکم کی سیاحت کے لیے بہترین موسم اکتوبر تا دسمبر اور وسط فروری سے آخر مئی تک ہے۔ گرمیوں میں وہاں درجہ حرارت ۱۳ سے ۲۱ ڈگری سیلسیس رہتا ہے۔ سردیوں میں یہ ۵ سے ۱۵ ڈگری سیلسیس ہوتا ہے۔

خوب صورت جھیل ہے جہاں ڈھائی گھنٹے کے بس کے سفر کے بعد پہنچا جا سکتا ہے۔ ٹیکسی آپ کو کم وقت میں لے جا سکتی ہے۔ یہ ایک مقبول پکنک اسپاٹ ہے جو سردیوں میں برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ گنگ ٹوک سے یہاں جانے کے لیے بھی پرمٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لاچن سے آگے سوگر تھانگ ہے جہاں کئی جھیلیں ہیں۔ وہاں ہر سال کچھ خاص دنوں میں ہونے والی یاک ریسنگ کافی دلچسپ ہوتی ہے۔ گنگ ٹوک ایک شہر جیسا بڑھتا ہوا قصبہ ہے جہاں کنکریٹ کے ڈھانچوں پر چھ منزلہ عمارتیں بن گئی ہیں جو روایتی انداز میں بنی ہوئی عمارتوں اور گھروں کی یکسانیت کو خراب کر رہی ہیں۔ سیاح سیدھے گنگ ٹوک جانے کی بجائے بس یا ٹیکسی سے سیدھے گیزنگ جا سکتے ہیں جہاں چھوٹے چھوٹے ہوٹل ہیں اور اس کے آگے پیما یانگسے میں محکمہ تعمیرات عامہ کا ایک گیسٹ ہاؤس ہے۔ اس گیسٹ ہاؤس میں رہنے کے لیے گنگ ٹوک میں محکمہ تعمیرات عامہ کے صدر دفاتر سے اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ گیزنگ اور پیما یانگسے کے بیچ میں ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن آفس ہے۔ شاید یہاں سے بھی اجازت کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔

پیما یانگسے کی خوب صورت خانقاہ (مٹھ) اتنی بڑی ہے کہ اس میں گھومنے اور اسے دیکھنے کے لیے تین گھنٹے چاہئیں۔ اس کے مغرب میں مکانوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ ہے جسے پریمی کہتے ہیں۔ یہاں دن میں تین مرتبہ بسیں آتی ہیں۔ اس کے آگے ایک گہری وادی کے پار یوکسم ہے۔

[illegible] سلی گوڑی (۱۱۴ کلومیٹر) اور [illegible] ریلوے اسٹیشنوں سے بذریعہ روڈ آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ قریب ترین ہوائی اڈہ باگ ڈوگرہ (۱۲۴ کلومیٹر) ہے جہاں انڈین ایئر لائنز [illegible] کے ہوائی جہاز جاتے ہیں۔

فلمی اداکار ڈینی ڈرونگ کا گھر اسی گاؤں میں ہے۔ ٹریکنگ کے بہت سے راستے یہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک راستہ ڈرونگری کو اور اس کے آگے کنچن جنگا کے بیس کیمپ کو جاتا ہے۔

مغربی سکم میں شہروں جیسا وہ ماحول نہیں ہے جیسا گنگ ٹوک میں پایا جاتا ہے۔ گنگ ٹوک میں تو اتنی عمارتیں بن رہی ہیں کہ لگتا ہے جیسے وہاں ٹاؤن پلاننگ ہے ہی نہیں۔ وہاں دارجلنگ جیسی گنجانیت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ مغربی سکم میں سیاحوں کا قیام پرسکون اور آرام دہ رہے گو یہ اور بات ہے کہ وہاں ٹھہرنے کی جگہ ملنا مشکل ہے جب کہ گنگ ٹوک میں بھی ہوٹلوں کی بھرمار ہے۔

رمبی کے پاس ہی کھیچو پالری جھیل ہے جو ایک جنگلی علاقے میں واقع ہے۔ اس کا پانی بے حد شفاف ہے۔ اس پر ایک پتا تک بہتا نہیں دکھائی دیتا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب آس پاس کے درختوں سے پتے ٹوٹ کر جھیل میں گرتے ہیں تو پرندے انھیں اٹھا لے جاتے ہیں اور پانی کی سطح صاف رہتی ہے۔

گیزنگ کے قریب تاشی ڈنگ کی خوب صورت خانقاہ ہے۔ وہاں ایک ایسا بھکشو ہے جو واحد انسان ہے جو یہ بتا سکتا ہے کہ "اوم مانی پدما ہم" پرارتھنا پتھروں پر کیسے کندہ کی گئی۔

اس ادھیڑ بھکشو کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ برسوں وہ اپنی پتھروں پر کندہ کاری کی مہارت کے بارے میں کسی کو کچھ بتانے کو تیار نہیں ہوا۔ ریاستی سرکار کے قدیم ثقافت کے تحفظ کے لیے ذمہ دار افسران کافی عرصے تک اس کی منت سماجت کرتے رہے۔ اس کے بعد ہی وہ نصف درجن نوجوان بھکشوؤں

باقی صفحہ ۵۶ پر

پردیپتا چکرورتی

ہمالیہ میں مہم جویانہ سیاحت

عظیم الشان کوہ ہمالیہ کے برف پوش، لامتناہی سلسلے کی دلفریبی بے حد و حساب ہے۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ کوہ پیمائی کے علاوہ ٹریکنگ (TREKKING) ،ریور رافٹنگ (RIVAR RAITING) ،واٹر اسکیٹنگ (SKIING ON WATER) وغیرہ مہم پسند جوشیلوں کے لیے کافی کشش رکھتے ہیں۔

وادیٔ سندھ سے وادیٔ برہم پتر کے درمیان لداخ سے اروناچل تک پھیلا ہوا دو ہزار پانچ سو کلو میٹر طویل عظیم الشان ہمالیائی سلسلہ، مادر وطن کی شمالی سرحد پر ہمہ وقت چوکس سنتری کی طرح کھڑا ہے۔ اس کی بلند برفیلی چوٹیاں ہمیشہ ہی اپنے اسرار کے جادو سے اہل نظر کو لبھاتی رہی ہیں۔ شاعروں نے اس کے حسن و جمال کے قصیدے کہے ہیں اور سنتوں نے گیان دھیان کے لیے اس کی گپھاؤں میں قیام کرنے کو ترجیح دی ہے۔ یہاں تک کہ دیہات کے عام لوگ بھی صدیوں سے ان پہاڑوں کی بلندیوں پر واقع بدری، کیدار جیسے تیرتھ استھانوں پر پہنچتے رہے ہیں۔ روایت ہے کہ کورو کشیتر کی لڑائی میں اپنے ہزاروں اقربا کی ہلاکت کے بعد پانڈوؤں نے اپنی رانی دروپدی کے ساتھ ہمالیہ کے گوشۂ عافیت میں ہی پناہ لی تھی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں برطانوی حکمرانوں نے مقامی پہاڑی باشندوں کی مدد سے ہمالیہ کے اسرار و رموز کو کھوجنے میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اس غرض سے فوجی جوانوں پر مشتمل کوہ پیماؤں کے دستے ہمالیہ کے اطراف و جوانب میں بھیجے جاتے تھے، لیکن مسلسل دو عالمی جنگ نے مزید سیاحت اور تلاش و جستجو کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران قراقرم کے آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ اونچے ننگا پربت تک قسمت آزمائی کے لیے جرمن کوہ پیماؤں کا ایک دستہ آیا، لیکن تمام افراد اس وقت چل رہی جنگ کی وجہ سے قید کر کے دہرادون کے قریب ایک چھاؤنی میں بھیج دیے گئے۔ اس دستہ کا ایک کارکن ہینرِی ہرار دہرادون کی جیل سے فرار ہو کر دریائے بھاگیرتھی کے راستے لگاتار تین مہینوں کی مسافت اور متنوع تجربات و مشاہدات سے گزر کر تبت کی راجدھانی لہاسا پہنچا۔ دورانِ سفر اس نے طویل دَرّوں اور متعدد برفیلے میدانوں کو عبور کیا۔ غالباً بغیر کسی منصوبہ کے ہمالیہ کے بلند و بالا اور دشوار گزار خطے میں ٹریکنگ کا یہ پہلا حقیقی تجربہ تھا۔

نیا موڑ

لیکن اب ۱۹۵۳ء کے بعد صورت حال بدل چکی ہے۔ اسی سال ۲۹ مئی (۱۹۵۳ء) کو نیوزی لینڈ کے ایڈمنڈ ہلیری اور دارجیلنگ، مغربی بنگال کے رہنے والے شیرپا تینزنگ نورگے کے ذریعہ، دنیا کی بلندترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو عبور کیے جانے سے حوصلہ مند نوجوانوں کے طائر تخیل کو بلند پروازی حاصل ہوئی اور مہم جوئی کا جذبہ بیدار ہوا۔ جب دارجلنگ، اترکاشی اور پھر منالی میں تربیتی ادارے قائم کیے گئے تو ایڈوانچر اسپورٹس کی حیثیت سے کوہ پیمائی کو کافی بڑھاوا ملا۔ "انڈیا ماؤنٹینیرنگ فاؤنڈیشن" کے قیام اور آسان شرحوں پر مالی امداد کے ساتھ متعلقہ ساز و سامان کے اسٹورز کی فراہمی نے کوہ پیماؤں کے حوصلے خوب بڑھائے۔ نتیجہ کے طور پر مختلف شہروں میں کوہ پیمائی کے کلب قائم کیے گئے۔ دو ناکام کوششوں کے بعد ۱۹۶۵ء میں ہندوستانی ٹیم نے پہلی بار ایورسٹ کو عبور کر لیا۔ اب ہر سال انڈین ماؤنٹینیرنگ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مختلف کلبوں کے

۲۹ مئی (۱۹۵۳ء) کو نیوزی لینڈ کے ایڈمنڈ ہلیری اور دارجیلنگ، مغربی بنگال کے رہنے والے ٹینزنگ نورگے کے ذریعہ دنیا کی بلندترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو عبور کیے جانے سے حوصلہ مند نوجوانوں کے طائر تخیل کو بلند پروازی حاصل ہونے اور مہم جوئی کا جذبہ بیدار ہوا۔

عاسب سے خطہ ہمالیہ میں متعدد مہموں کا استقام و انعقاد عمل میں آتا ہے۔

ٹریکنگ (TREKKING)

کوہ پیمائی کے علاوہ ۱۹۶۰ء کے دہے سے ہی ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں تک کی ٹریکنگ، مہم جو حوصلہ مندوں کی کثیر تعداد کے لیے باعث کشش رہی ہے۔ موجودہ صدی کے آغاز سے ہی پنڈاری (PINDARI) اور کافنی گلیشیروں (KAFNI GLACIERS) جیسے ٹریکنگ کے آسان راستے یا سندکپھو پھالت (SANDAKPHU-PHALUT) اور گومکھ جیسے تیرتھ استھانوں کو جانے والے راستے، جو کہ مقدس گنگا اور پنچ کیدار (PANCHA KEDAR) کے دہانے ہیں، کافی مشہور ہیں اور ٹریکنگ کے شائقین کی آمد و رفت یہاں برابر جاری رہتی ہے۔ لیکن ٹریکنگ کے کچھ شائقین ایسے بھی ہیں جن کی تشنگی ان راستوں سے نہیں بجھتی اور وہ ہرکی دون (HARKI DUN)، روپ کنڈ اور رونٹی سیڈل، ملن گلیشیر، مڑیل پاس، سندر ڈھنگا کول، کاگ بھسنڈی تال، وادی چناب اور سندا دیوی جیسی دشوار تر گزرگاہوں کی طرف جانا پسند کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خوش قسمت، جنھیں کوہ پیمائی کی تربیت حاصل ہے اور جن کے پاس اونچی چوٹیوں کے نقشے ہیں، سارا اُمگا لا (SARA UMGA LA)، پیناپربتی پاس اور دوسرے کئی مقامات کا رخ کرتے ہیں، جو ہنوز غیر معروف اور بے نام ہیں۔

ہمالیہ میں سرمائی کھیلوں کا مرکز و محور کشمیر، اتر پردیش اور ہماچل پردیش کے علاقے ہیں۔ برف پر اسکیٹنگ عام طور سے دسمبر کے اواخر میں شروع ہوتی ہے اور مارچ کے اختتام تک جاری رہتی ہے۔

آبی کھیل (RIVER SPORTS)

کوہ پیمائی اور ٹریکنگ کے علاوہ ہمالیہ آبی کھیلوں کے لیے بھی سازگار ماحول فراہم کرتا ہے۔ نوجوانوں نے ثابت کر دیا ہے کہ لداخ میں دریائے سندھ اور اروناچل پردیش میں برہم پتر میں آبی رافٹنگ ممکن ہے۔ گنگا میں دیوپریاگ سے رشی کیش تک اور سکم کے تیستا (TISTA) اور رنگیت (RANGEET) ندیوں میں برابر ہی آبی رافٹنگ کا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن اس کھیل میں زیادہ تر غیر ملکی کھلاڑی ہی دلچسپی لیتے ہیں۔

آبی اسکیٹنگ (SKITNG) سری نگر کے ڈل اور نگین جھیلوں میں وقت گزاری کا ایک عام مشغلہ ہے۔ موٹر بوٹ، ڈرائیور اور اسکیٹنگ کا ساز و سامان کرائے پر دستیاب ہے۔ نومشقوں کی رہنمائی کے لیے بھی ہدایات ہیں۔ کشمیر میں آبی ٹریکنگ کے لیے کرائے پر شکارے دستیاب ہیں جو سیاحوں کو دریائے جہلم اور متعدد جھیلوں کے پانچ روزہ سفر پر لے جا سکتے ہیں۔ راتیں ندی کے کنارے بنے کیمپوں میں آرام سے گزاری جا سکتی ہیں۔

ہمالیہ میں سرمائی کھیلوں کا مرکز و محور کشمیر، اتر پردیش اور ہماچل پردیش کے علاقے ہیں۔ برف پر اسکیٹنگ عام طور سے دسمبر کے اواخر میں شروع ہوتی ہے اور مارچ کے اختتام تک جاری رہتی ہے۔ کشمیر میں گلمرگ، اتر پردیش میں اَولی (AULI) اور ہماچل پردیش میں نرکندا، کفری اور منالی مختلف سطح کے برفیلے ڈھلانوں کے طویل سلسلے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ان سبھی مقامات پر لفٹ اور اسکیٹنگ کے ساز و سامان کرائے پر ملتے ہیں۔

ٹریکنگ کا شائق اپنی مرضی کا مالک ہے وہ آزاد ہے کہ جس مدت، بجٹ، راستہ اور ساتھی کا انتخاب کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں پر ٹریکنگ کے لیے لوگ کھنچے چلے آ رہے ہیں۔

حالیہ برسوں میں ہمالیہ پر اسکیٹنگ بڑی کشش کے طور پر ابھری ہے۔ نوآموزوں کو انفرادی اور احتیاجی تربیت دی جاتی ہے اور ان کے لیے چھوٹی چھوٹی ڈھلان بھی کثرت سے موجود ہیں جنھیں اپنی دوڑ کے لیے وہ منتخب کر سکتے ہیں۔ دوسری جانب تجربہ کار کھلاڑیوں کے لیے بھی میدان سازگار ہے۔ اَولی اور گلمرگ میں سے کئی کار ہزاروں فٹ کی سیدھی ڈھلان سے شاندار دوڑ لگانے کی سہولت فراہم کرتے ہیں۔

منالی اور گلمرگ میں ایک اور ہیجان خیز کھیل ہیلی اسکیٹنگ کا انتظام ہے جو مہم پسند کھلاڑیوں کو ان کی ضرورت کے مطابق پیچیدہ اور سیدھی دوڑ کے لیے متنوع راستے فراہم کرتا ہے۔ اس کھیل میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے کھلاڑیوں کو تفریح گاہ کی کافی اونچی جگہ پر پہنچا دیا جاتا ہے، جہاں سے انھیں اپنی چھلانگ نما دوڑ شروع کرنی ہوتی ہے۔

مذکورہ پانچ کوہستانی کھیلوں میں سے ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں پر ٹریکنگ کے فروغ کے امکانات کافی روشن ہیں۔ ٹریکنگ ایک فرد بھی کر سکتا ہے اور دس یا بیس افراد پر مشتمل جماعت بھی۔ ٹریکنگ میں تجربہ کی بڑی اہمیت ہے، جسے ابتدا میں آسان تر راستوں کو اپنا کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کھیل کے لیے بہت کم ساز و سامان درکار ہیں۔ ایک سلیپنگ بیگ اور ایک جھولا یا تھیلا بھی کافی ہے اور کھلاڑی آزاد ہے کہ اپنی جیب کے حساب سے جو چاہے خرچ کرے، جب کہ کوہ پیمائی، آبی رافٹنگ، اسکیٹنگ یا آبی اسکیٹنگ میں اخراجات کا انحصار منتظم کے مطالبے پر ہے۔ ٹریکنگ کا شائق اپنی مرضی کا مالک ہے، وہ آزاد ہے، جس مدت، بجٹ، راستہ اور ساتھی کا انتخاب کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں پر ٹریکنگ کے لیے لوگ کھنچے چلے آ رہے ہیں۔

مطلوبہ سہولیات

اس میدان میں بنیادی سہولتوں کی کمی بہت

بڑی رکاوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملکی اور غیر ملکی سیاح ان کھیلوں کے لیے ہندوستانی مراکز پر اتنی کثرت سے نہیں آتے جس تعداد میں وہ نیپال کا رخ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بڑی رکاوٹ ہمارا "داخلے کا پرمٹ" نظام بھی ہے۔ سیاحوں کو ہماچل پردیش اور کماؤں، گڑھوال، سکورا اگرڑھ خطے کے پورے سرحدی علاقے میں حقیقی خوبصورت مقامات تک پہنچنے سے یہ داخلہ پرمٹ سسٹم روکتا ہے۔ یہی صورت حال کچھ سال قبل تک، ہماچل پردیش کے کنور کلیا کارا علاقے کی بھی تھی۔

ہمالیائی ٹریکنگ کی گزرگاہوں میں ٹھہرنے کے مناسب اور محفوظ مقامات کا فقدان بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ پیڈاری اور ہرکی دون کے پرانے راستوں پر آٹھ دس کلومیٹر کے فاصلے سے پی ڈبلیو ڈی یا فارسٹ ریسٹ ہاؤس بنے ہیں، لیکن بمشکل تمام ان میں چھ سے آٹھ سیاح ہی قیام کر سکتے ہیں۔ حال ہی میں اترپردیش ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے ان گزرگاہوں پر کچھ لاج تیار کیے ہیں، لیکن انھوں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ ٹریکرس، ان مقامات پر اور ایسے ٹورسٹ لاج میں قیام کرنا شاذونادر ہی پسند کرتے ہیں۔ بہترین ممکنہ انتظام یہ ہو سکتا ہے کہ نیپال کی طرح لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گھر بنائیں جو کہ مقامی لوگ وہیں دستیاب چیزوں سے بہ آسانی بنا سکتے ہیں اور مناسب پیسوں پر قیام و طعام کی سہولت فراہم ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی ٹورسٹ لاج نہ ہو بلکہ دس سے بیس لوگوں کے لیے ہال نما بڑا کمرہ۔ جہاں دو منزلوں میں سونے کا انتظام ہو، پاس ہی نشیبی کنارے پر ایک پاخانہ بنا ہوا ہو تاکہ پانی کی کمیابی مسئلہ نہ بنے اور سیاح ٹوائلٹ پیپر کا بھی استعمال کر سکیں۔ قیام گاہ کے قریب ہی بڑا سا کوڑے دان رکھا ہوا ہو اور یہ لاج والے کی ذمہ داری ہو کہ وہ کوڑے کو صاف کرتا رہے۔ اس سلسلے میں مقامی لوگوں کو مناسب تربیت اور بعد ازاں قرض کی صورت میں مالی امداد دی جا سکتی ہے تاکہ وہ مطلوبہ لاج تعمیر کرا سکیں اور ٹریکنگ کرنے والوں کو قیام و طعام کی سہولت فراہم کر سکیں۔ اس طرح مقامی لوگوں کو روزگار بھی حاصل ہوگا۔ ریسٹ ہاؤس کی شکل میں صرف پختہ جنگل تعمیر کرنے اور کام میں دلچسپی نہ رکھنے والے کیئر ٹیکر مامور کر دینے سے ہمالیہ کے مقامات کی ٹریکنگ کرنے والوں کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

دارجلنگ گورکھا ہل کاؤنسل نے مغربی بنگال کے دارجلنگ ضلع میں ٹریکنگ کرنے والوں کے لیے چھوٹے چھوٹے کچھ گھر (TREKKERS HUTS) تیار کیے ہیں۔ اس سہولت کی وجہ سے ایک ٹریکر کے لیے اب اس خطے میں آزادی سے گھومنا پھرنا آسان ہو گیا ہے اور سندکپھو۔ سپالت گزرگاہ کی طرف سے، اس خطے میں کہیں بھی گزرنے کے لیے ایک سلیپنگ بیگ اور کچھ روپے کافی ہیں۔ اب ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ بے شمار سازوسامان اور ان کو ڈھونے والوں کی ایک فوج اس کے ساتھ چلے۔ ہمالیائی ٹریکنگ کے لیے اس طرح کی سہولتیں، متعلقہ سبھی ریاستوں کی انتظامیہ فراہم کر سکتی ہیں۔ اس عمل سے پہاڑی علاقوں میں پائی جانے والی بے روزگاری کو دور کرنے میں بھی کسی حد تک مدد مل سکتی ہے۔ اس طرح ہمالیہ کے علاقوں میں ٹریکنگ کرنے والوں کی بڑی تعداد کو اپنے علاقے میں آنے کے لیے راغب کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک پابندیوں اور پرمٹ کا تعلق ہے، اس کے لیے زیادہ سے زیادہ آسان طریقہ کار اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کی بھرپور حوصلہ افزائی ہو سکے۔ ٹریکنگ راستے کے مقام آغاز پر داخلہ فیس لی جائے جہاں ٹریکروں کو ہدایات دی جائیں کہ ماحول اور فضا کو آلودگی سے پاک رکھنے کے سلسلے میں ان کے فرائض کیا ہیں اور یہ بھی بتایا جا سکے کہ قیام و طعام کی سہولتیں کہاں کہاں ہیں اور درمیانی فاصلے کیا ہیں۔ ٹریکرس کو یہ بھی بتایا جانا چاہیے کہ جھرنے، ندیاں اور برفانی تودوں کے مقامات کون کون سے ہیں تاکہ وہ اپنا لائحہ عمل طے کر سکیں۔ داخلے کے تمام چیک پوسٹ کو وائرلیس کے ذریعہ متعلقہ ضلعوں کے صدر مقامات سے جوڑ دیا جانا چاہیے تاکہ ناگہانی حادثات کی صورت میں ضروری امداد بلا تاخیر بہم پہنچائی جا سکے۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نندا دیوی سینکچوری، مہم پسند کوہ پیماؤں اور ٹریکرس کے لیے جنت کا سا درجہ رکھتی ہے۔ چند سال قبل ماحولیات کے تحفظ کے نام پر اس کے دروازے ٹریکرس کے لیے بند کر دیے گئے تھے۔ یہ بات بڑی خوش آئند ہوگی کہ حقیقی مہم جویوں کو وہاں جانے کی اجازت دے دی جائے۔

البتہ آغاز سفر میں انھیں لتا گاؤں میں ہی تمام ہدایات دے دی جانی چاہئیں۔ مقامی لوگوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے کہ وہ لتا کھڑک راستے پر نندا دیوی کے نقطہ آغاز تک مناسب فاصلے پر، قیام گاہوں کی تعمیر کر سکیں تاکہ ٹریکرس کو سہولت حاصل ہو سکے۔ اس سے ہمالیائی خطے میں مہم پسند سیاحت کو کافی فروغ ملے گا۔ ●

بقیہ: سیاحت کو فروغ دینے کی حکمت عملی

اور رہائش کی کافی سہولیات اور دیگر آسائشیں اور بنیادی ڈھانچے کی سہولیات فراہم کرنے کے لیے بلا تاخیر کارروائی شروع کی جا سکے۔

'ایم' کے معنی ہیں مارکیٹنگ

ملک کے اندر بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ملک سے باہر بھی اس بارے میں بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ بھارت کیا تھا (ایک یا پانچ ہزار سالہ پرانی وراثت)، کیا ہے (ترقی کی راہ پر گامزن، عالمی دائرے میں آتے ہوئے) اور آگے چل کر کیا ہوگا (مستقبل کا نصب العین، ترقی کی منزل) سیاحت ایک نہایت پیچیدہ چیز ہے اور اس کی خاص ضرورتوں کے لیے مارکیٹنگ کے ذرائع پیدا کرنے کے لیے بے شمار ایجنسیوں کی مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایسی مارکیٹوں پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے جن کی پوری تحقیق کے بعد شناخت کی گئی ہو۔

آخری بات یہی کہنا چاہوں گا کہ AIM کے تینوں اجزا کے لیے ایک مربوط منصوبہ تیار کرنے اور اسے زیر عمل لانے کی ضرورت ہے۔

ٹی۔ پی۔ اِسّر

کرناٹک: سفر ہے شرط...

ہندوستان سنہری تکون کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں کرناٹک میں ہر طرح کے سیاحوں کے لیے دلچسپی کا سامان ہے خاص طور سے موسم گرما میں کیوں کہ اُن دنوں کرناٹک کا موسم نسبتاً خوش گوار ہوتا ہے۔

ہندوستان نے سیاحوں کو لبھانے کے لیے کبھی وہ طریقے نہیں اپنائے جو عام طور پر رائج ہیں۔ نہ ہی اس نے کبھی اس طرح کے سیاحتی کلچر پر زور دیا جیسا ایشیا کے بعض ممالک میں زوروں پر ہے جس کا مقصد دانستہ یا نادانستہ طور پر صرف ایک ہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ڈالر حاصل کیے جائیں۔

اس کے باوجود یہاں کی تہذیب و ثقافت میں دلچسپی رکھنے والے غیر ملکیوں کے لیے ہندوستان سدا سے ایک اہم حوالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کا قدیم کلچر، اس کے افکار، تعمیرات اور جمالیات لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ دنیا بھر کے فلسفیوں کے لیے ہندوستان کا سفر گویا ویدوں اور اپنشدوں کی دھرتی کی روحانی یاترا ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان نے بعض ایشیائی ممالک کی طرح جنس کا بازار نہیں کھول رکھا ہے اور نہ ہی اس کے پاس ہیں، جنوبی اٹلی اور فرینچ ریویئرا کی طرح ... سیاحوں کو راغب کرنے والے ساحل ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہندوستان کے پاس اچھے ساحل نہیں ہیں یا یہاں سمندری ... نہیں ہوتی۔ یہاں کیرالہ میں کووَلم ساحل ہے، گوا میں انجنا بیچ ہے، اڑیسہ میں سلطاپور کے ساگر تٹ ہیں۔ یہ سبھی ساحل سمندر بہت خوب صورت ہیں اور یہاں سیّاح بھی خوب آتے ہیں۔ مگر ان کی خاطر نہیں آتے ہیں۔ یہ سیاح ویسے تو ہندوستان میں اور بہت کچھ دیکھنے کے لیے آتے ہیں لیکن جب کبھی ان کا ادھر سے گزر ہوتا ہے تو وہ حیران ہو جاتے ہیں کہ ہندوستان میں بھی اتنے اچھے ساحل ہیں۔ تاہم یوروپ، امریکہ یا دیگر ممالک کے سیّاحوں کو ہندوستان

> ہندوستان کا قدیم کلچر، اس کے افکار، تعمیرات اور جمالیات لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ دنیا بھر کے فلسفیوں کے لیے ہندوستان کا سفر گویا ویدوں اور اپنشدوں کی دھرتی کی روحانی یاترا ہے

کی سیاحت کی ترغیب دینے کے لیے اس طرح کی چیزوں کی تشہیر پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہر طرح کے سیاحوں کے لیے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ ان کے لیے بھی جو کم کفایت پر سیاحت کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے بھی جنھیں ہندوستان کی تہذیب و افکار میں دلچسپی ہے، ان کے لیے بھی جو آسائش پسند ہیں، ان کے لیے بھی جو خور و نوش کے رسیا ہیں اور ان کے لیے بھی جو ویسے تو صرف تاج محل دیکھنے کے لیے آتے ہیں لیکن یہاں آ کر انھیں پتا چلتا ہے کہ یہاں تو تاج محل اور "راج محل" کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

مجھے اپنے یہاں کی سیاحتی پالیسی میں ہمیشہ یہ بات کھٹکتی ہے کہ سنہری تکون کو ہی زیادہ سے زیادہ پُرکشش بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ تاج محل، جے پور اور دہلی بلاشبہ بڑے سیاحتی مرکز ہیں۔ ان کی تاریخ اور وراثت قابلِ رشک ہے۔ یہ بھی بجا کہ ماضی کی خوش رنگ شبیہیں آج بھی ان کے در و دیوار پر نقش ہیں۔ لیکن یہاں اس سنہری تکون کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اکتوبر سے فروری کے درمیان شمالی ہند کے خوش گوار موسم میں سیاحت کے لیے اس مثلث پر خصوصی توجہ دینا درست نہیں لیکن مرطوب اور رم جھم رُت میں جنوبی ہندوستان زیادہ پُرکشش ہوتا ہے۔

گرمی کے دنوں میں جنوبی ہندوستان کے عظیم سیاحتی مراکز میں بلاشبہ کرناٹک کی آب و ہوا

سب سے خوش گوار ہوتی ہے۔ اس کے بعض عمدہ سیاحتی مراکز مثلاً میسور اور ہیلے بڈ۔ بیلور کی آب و ہوا بنگلور کی میدانی آب و ہوا جیسی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو اس عرصے میں کرناٹک کی سیاحت کا ایک لطف موسم کی ایک خوش گواری بھی ہے جیسے شمالی ہندوستان میں لوگ گرمی سے بچنے کے لیے پہاڑوں کی طرف جاتے ہیں۔ اگر جنوبی ہندوستان کے لیے بھی "پیلیس آن وہیلز" یعنی پُر آسائش ریل سفر کا اہتمام شروع کر دیا جائے تو غیر ملکی سیاح یہاں بھی جوق در جوق آئیں گے۔ سفر کا پروگرام اس طرح بن سکتا ہے کہ بنگلور سے سفر کا آغاز کیا جائے۔ اس کے بعد میسور اور باںڈی پور میں رات بھر کا قیام ہو اس کے بعد سیاحوں کو ہیلے بڈ۔ بیلور کے مندروں اور آس پاس کے قابلِ دید مقامات کی سیر کے لیے ہاسن لے جایا جائے۔ وہاں سے ہوس پیٹ، ہمپی۔ ہمپی کے قابلِ دید مقامات دکھانے کے بعد ٹرین دن کے دن بادامی کے لیے چل پڑے۔ ہوس پیٹ سے ٹرین گوا لے جائی جائے۔ اس طرح ایک ہفتے کا شاندار پروگرام اختتام کو پہنچتا ہے۔ اس سفر پر نکلے سیاحوں کو سومناتھ اور ہیلے بڈ۔ بیلور میں سنگ تراشی کے عالمی ورثے کے کچھ عظیم نمونے دیکھنے کو مل جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہمپی کے کھنڈرات ہیں جو دنیا کی کسی بھی بڑی تہذیب کی یادگار کہے جا سکتے ہیں۔

ہاسن سے بادامی، پٹڈ کل اور ایہول کا ایک روز کا سفر ہندوستان کی تہذیب و ثقافت میں دلچسپی رکھنے والوں، تاریخ کے طالب علموں اور عام سیاحوں کے لیے ایک نادر موقع ہوگا کہ وہ بچشم خود دیکھ سکیں کہ غار نما مندر عالی شان مندروں کا روپ لینے تک کس عبوری دور سے گزرے۔

پٹڈ کل میں ایک ہی مقام پر بھارت کی تقریباً تمام بڑی طرزِ تعمیر پر مبنی مندر دیکھنے کو مل جائیں گے۔ اس کے قریب ہی ایہول ہے جہاں چو کور طرز تعمیر کے قدیم ترین نمونے موجود ہیں۔

جنہیں فرصت اور فراغت میسر ہو وہ کرناٹک کی دیگر قابلِ دید چیزیں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیجاپور کا سفر۔ یہاں دکن کے سلطانوں کے زمانوں کے عظیم تعمیراتی نمونے آس پاس ہی دیکھنے کو مل جائیں گے۔ یہاں کا گول گنبد دنیا کے بڑے گنبدوں میں سے ایک ہے اور انتہائی خوب صورت۔ ہند۔ اسلامی تعمیرات کے شائقین کے لیے بیجاپور مایۂ ہفت رنگ ہے۔ اس کے علاوہ بنگلور اور میسور کے آس پاس اور بھی کئی قابلِ دید مقامات ہیں مثال کے طور پر نندی پہاڑیاں، سومناتھ پور، شیوا سمدرم آبشار۔ یہاں اس بات کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مشہور و معروف جوگ آبشار کا منظر صرف برسات کے موسم میں دلکش ہوتا ہے۔ دیگر قابلِ دید مقامات میں چکمگلور کے نزدیک واقع بابا بودان پہاڑیاں ہیں یا تمکور کے قریب کی ڈاہرہ پہاڑیاں۔ اس کے بعد بیدر کی تعمیر و تہذیب ہے۔ یہ مقام کبھی سلاطین دکن کے بہمنی راجاؤں کی راجدھانی رہا ہے۔ اس کے قلعے اور کھنڈرات مصوروں کے لیے جنت ارضی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بیدر سکھوں کے نزدیک بھی ایک متبرک مقام ہے۔ یہاں حیدر آباد سے بھی بآسانی تین گھنٹے میں پہنچا جا سکتا ہے۔

باںڈی پور کی سینکچوری (جنگلی جانوروں کی تحفظ گاہ) کے بارے میں سبھی لوگ جانتے ہیں۔ مگر جنگلی جانوروں میں خصوصی دلچسپی رکھنے والے سیاحوں کے لیے اس کے علاوہ بھی مقامات ہیں۔ مثلاً ناگر ہول اور کھارا پور۔ ان تینوں مقامات پر رہائش کا بھی معقول انتظام ہے اور جانوروں کو آزادانہ گھومتے پھرتے دیکھنے کا بھی عام خیال یہ ہے کہ کھارا پور میں سیاحوں کو ملک کی دیگر سینکچوریز کے مقابلے بہترین سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ یہاں میں اپنے متوقع سیاحوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہوں گا کہ ہندوستان میں اب جنگلی جانوروں کے تحفظ کا کلچر پروان چڑھ چکا ہے اور اب یہاں کی تحفظ گاہیں واقعی قابلِ دید ہیں۔ آنے والے سیاح یہ بھی جان لیں کہ ہندوستان میں شکار گاہیں نہیں ہیں۔

سیاحت کے باب میں یہاں کے بعض گولف کورسوں کا ذکر ضروری ہے۔ کرناٹک میں آنے والے سیاح جنہیں گولف کا شوق ہوتا ہے ان گولف کورسوں میں ضرور آتے ہیں۔ پرانے گولف کورس کے علاوہ بنگلور میں ایک اور کورس بنایا گیا ہے جس کے بارے میں گولف کے ماہرین بہت عمدہ خیال رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ فوج اور فضائیہ کے بھی گولف کورس ہیں۔ بنگلور کے قریب میں اقوامی معیار کے دو اور گولف کورس بنائے جا رہے ہیں، جن سے بجا طور پر امید کی جا رہی ہے۔ یہاں گولف کے بین اقوامی ٹورنامنٹ منعقد ہوں گے۔ بنگلور کے علاوہ میسور، ہری ہر اور بیلگام میں بھی بہت اچھے گولف کورس ہیں۔

ابتدا میں میں نے ساحلی سیاحت کی بات کی تھی۔ کرناٹک اس باب میں بھی کچھ کم پرکشش نہیں۔ منگلور، مالپے اور کروار میں

باقی صفحہ ... پر

> ہندوستان میں ہر طرح کے سیاحوں کے لیے دلچسپی کا سامان موجود ہے ان کے لیے بھی جو کم کفایت پر سیاحت کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے بھی جنہیں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت میں دلچسپی ہے، ان کے لیے بھی جو آسائش پسند ہیں، ان کے لیے بھی جو خورد و نوش کے رسیا ہیں اور ان کے لیے بھی جو ویسے تو صرف تاج محل دیکھنے کے لیے آتے ہیں لیکن یہاں آکر انہیں پتا چلتا ہے کہ یہاں تو تاج محل اور "لال قلعہ" کے علاوہ بھی بہت کچھ

> بیجاپور کا گول گنبد دنیا کے بڑے گنبدوں میں سے ایک ہے اور انتہائی خوب صورت۔ ہند۔ اسلامی تعمیرات کے شائقین کے لیے بیجاپور مایۂ ہفت رنگ ہے۔

کیرالہ۔ ایک مثالی مرکز سیاحت

مضمون نگاروں نے اس مضمون میں بتایا ہے کہ کیرالہ ویسے تو فنون اور روایتی قدروں کے لحاظ سے قدامت پسند ہے مگر مختلف سہولیات کے اعتبار سے ترقی پسند ہے، اسے دیکھنا کسی بھی سیاح کے لیے ایک خاص تجربہ ہے۔

آج سیاحت بے پناہ عالمی اہمیت کی اقتصادی سرگرمی بن گئی ہے۔ اسے روزگار پیدا کرنے، غیر ملکی زرمبادلہ کمانے اور کسی بھی ملک کی مجموعی ترقی میں مدد دینے والا ایک اہم ذریعہ سمجھا جانے لگا ہے۔ عالمی مجموعی قومی پیداوار (GNP) میں ٹورازم انڈسٹری کا حصہ ۱۹ فی صد ہے اور یہ ۲۰ کروڑ افراد (یعنی دنیا کے کل محنت کشوں کے ۱۲ فی صد) کو روزگار مہیا کرتی ہے۔ لوگ کاروبار کے لیے، سیر و تفریح کے لیے دونوں ہی مقصدوں سے سفر کرتے ہیں اور ان کی بہت بڑی اکثریت مشہور مقامات کی سیاحت کو جاتی ہے۔ ٹورازم پر عالمی اقتصادی اور سیاسی حالات کا کافی اثر پڑتا ہے۔ بیشتر صورتوں میں انسان سیاحت تبھی کرتا ہے جب وہ خوشحال ہوتا ہے اور اسے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔

پیش گوئی کی گئی ہے کہ ۲۰۰۰ء تک سیاحت سب سے بڑی انڈسٹریوں میں شمار ہونے لگے گی۔ اس پر امید پیش گوئی کی بنیاد ٹورازم کی مانگ اور سپلائی کے رجحانات ہیں۔ ٹورازم میں بدستور اضافہ ہوتا ہی رہے گا تاہم وہ اس سے مختلف شکل میں ہوگا جس میں آج ہو رہا ہے۔

کیرالہ میں سیاحت (ٹورازم) کو بہت پہلے ۱۹۸۶ء میں ایک انڈسٹری قرار دے دیا گیا تھا۔ لیکن یہ حال ہی کی بات ہے کہ اسے ایک اہم اقتصادی سرگرمی تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ اگر آج سیاح کیرالہ پر اسے ایک انوکھا مرکز سیاحت سمجھتے ہوئے اپنی توجہ مبذول کرنے لگے ہیں تو یہ ان کوششوں کی وجہ سے ہے جو گزشتہ چند برسوں میں لگاتار کی جاتی رہی ہیں۔ آج کیرالہ کو سیاحوں کی جنت سمجھا جانے لگا ہے۔ اگر وہ اپنے فنون اور روایتی قدروں کے لحاظ سے قدامت پسند ہے تو نقل و حمل، مواصلات اور قیام گاہوں کی جدید سہولیات کے اعتبار سے ترقی پسند ہے۔ اس کے قدرتی حسن اور یہاں کے لوگوں کے پرخلوص دوستانہ سلوک کی بدولت اس ریاست کی سیاحت سیاحوں کے لیے ایک خاص تجربے کا درجہ رکھتی ہے۔

پیش گوئی کی گئی ہے کہ ۲۰۰۰ء تک سیاحت سب سے بڑی انڈسٹریوں میں شمار ہونے لگے گی۔ اس پر امید پیش گوئی کی بنیاد ٹورازم کی مانگ اور سپلائی کے رجحانات ہیں۔ ٹورازم میں بدستور اضافہ ہوتا رہے گا

سحر آفریں بوقلمونی

کیرالہ میں آپ جو چاہیں گے آپ کو ملے گا۔ ایک سیاح کو بھارت میں کسی اور جگہ پر ایک بہت سے چھوٹے علاقے میں اتنی جغرافیائی گوناگونی دیکھنے کو نہیں ملے گی جتنی کہ کیرالہ میں۔ ساحل سمندر کے خوب صورت نظاروں، عقبی جھیلوں، جنگلی جانوروں کی پناہ گاہوں، سدا بہار جنگلوں، مختلف اقسام کے نباتات و حیوانات کے سبب کیرالہ بھارت کی دوسری ریاستوں سے مختلف مرکز سیاحت بن گیا ہے۔ کیرالہ کی شاندار ثقافت، فنون اور معتدل آب و ہوا سیاحوں کی کشش کی دوسری وجوہات ہیں۔ یہاں روایت اور جدیدیت دونوں ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں۔ یہاں کے مقامی تہواروں کا کلیشاندسی رنگ اور اس کے عقبی پانیوں کی خوبصورتی سیاحوں کو

بے حد متاثر کرتی ہے۔ اس سے سیاحت کے فروغ میں مدد ملتی ہے۔

کیرالہ میں آبادی کی مکمل خواندگی اور زندگی کی طبیعاتی کوالٹی کا ترقی یافتہ ممالک سے کیا جا سکتا ہے۔ اس بات سے بھی کیرالہ کو بھارت کی ریاستوں میں سیر و سیاحت کی ایک اہم ریاست بنانے میں مدد ملی ہے۔

متذکرہ بالا خصوصیات کی وجہ سے کیرالہ بھارت کے مختلف حصّوں کے سیاحوں کے ساتھ ساتھ یوروپ اور مشرق بعید کے ملکوں اور امریکہ کے سیاحوں میں بھی مقبول ہوگیا۔

> یہاں کے مقامی تہواروں کا گلیشادیسی رنگ اور اس کے مقبول پانیوں کے خوب صورتی سیاحوں کو بے حد متاثر کرتے ہے۔ اس سے سیاحت کے فروغ میں مدد ملتی ہے۔

دیوتاؤں کا اپنا دیش

جنّت نظیر کیرالہ میں قدرتی مناظر کی فراوانی ہے۔ یہاں اونچے پہاڑ ہیں، گہری گھاٹیاں ہیں، خوب صورت ساحلی تفریح گاہیں ہیں، عقبی جھیلیں، دھان کے ہرے بھرے کھیت ہیں، قدرت نے کیرالہ کو سمندری پیداوار کی دولت بھی دل کھول کر دی ہے۔ ناریل، کیلے اور شہر میں کاجو بھی خوب پیدا ہوتا ہے۔ قدرتی تحائف سے مالا مال اس ریاست کو "دیوتاؤں کا اپنا دیش" کہا جاتا ہے۔

سمندر کے دلدادگان کے لیے یہاں بہت سی ساحلی تفریح گاہیں ہیں۔ سیاح ان میں سے بہترین ساحلی تفریح گاہ کا انتخاب کر سکتے ہیں جہاں وہ تیر سکتے ہیں۔ کوولم ایک عمدہ تفریح گاہ ہے۔ باکل میں، جس کے پس منظر میں باکل کا تاریخی قلعہ ہے، ساحلی تفریح گاہ کی ترقی کے لیے ... اکروڑ کا ایک پروجیکٹ شروع کیا جا رہا ہے۔ کیرالہ کی دوسری خوبصورت ساحلی تفریح گاہیں ہیں۔ ورکلا، تروملاودم، الیپی، چیرائی اور کاپاڈ کہلانے والی وہ جگہ جہاں مشہور سیاح واسکوڈی گاما نے قدم رکھا تھا۔

کیرالہ کی عقبی جھیلیں خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پرسکون ہیں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ کیرالہ کو "مشرق کا وینس" کہا جاتا ہے۔ سیاحوں کے آنے کا موسم شروع ہوتے ہی قلون، الیپی، آکھولم، کوچین اور کمار اکم میں خوب گہما گہمی ہو جاتی ہے۔

سیاح پرسکون جھیلوں، وادیوں اور پہاڑی مقامات کی پکار سنے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں؟ کیرالہ کا سب سے اونچا پہاڑی مقام مُنّار ہے جو چائے کی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ اسی طرح کا ایک اور ہل اسٹیشن پیرمیڈ ہے جو کسی زمانے میں تراونکور کے راجاؤں کی گرمیوں کی قیام گاہ ہوا کرتا تھا۔ یہ ٹھنڈا اور چھوٹا سا ہل اسٹیشن ربڑ، چائے، قہوہ، کالی مرچ اور الائچی کے باغات سے بھرا ہوا ہے۔ بیچ بیچ میں آبشاریں اور کھلے سبزہ زار ہیں۔ کیرالہ کے دوسرے ہل اسٹیشن پون مُڈی، ہیلیام پیتھی اور ویاناد ہیں۔

> کیرالہ اپنے لوک کلاؤں (عوامی فنون) کے نشوونما زمانہ قدیم سے کرتا رہا ہے۔ کیرالہ کے زمانۂ قدیم کے لوک گیت اور لوک ناچ آج بھی وہاں کے تھیٹروں میں پیش کیے جاتے ہیں۔

قدرت کے سحر آفریں حسن کا مشاہدہ کرنے کے لیے جنگل لین سے نیچے اُتریے اور آنکھیں اٹھا کر اتھیراپلّی آبشار کو دیکھیے۔ اسی پر بس نہیں ہے۔ کیرالہ میں اور بھی حیرت انگیز آبشار ہیں مثلاً واربا چل، پلارووی اور مین مُٹی۔ یہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

کیرالہ میں جنگلات اور جنگلی جانوروں کو دیکھنے کے شائقین کے لیے بھی ان کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ اس کے جنگلات ابھی تک ہرے بھرے ہیں۔ دنیا میں سیل گری TAHR کی سب سے زیادہ آبادی اس وقت کیرالہ کے ایراوی کلم نیشنل پارک میں پائی جاتی ہے لیکن جنگلی جانوروں کی سب سے مشہور پناہ گاہ تھیکاڈی میں ہے، جس کا نام ہے پیریار وائلڈ لائف سینکچواری۔ یہ بھی پروجیکٹ ٹائیگر کے تحت آتی ہے۔ تھٹا کڈ پرندوں کی پناہ گاہ، پیرامبی کلم وائلڈ لائف سینکچواری، کمار اکم پرندوں کی پناہ گاہ، خاموش وادی (سائلنٹ ویلی) اور چنار دوسری جگہیں ہیں جہاں سیاح انواع و اقسام کے نباتات اور جانور دیکھ سکتے ہیں۔

کیرالہ کی لوک کلائیں

کیرالہ اپنی لوک کلاؤں (عوامی فنون) کی نشوونما زمانہ قدیم سے کرتا رہا ہے۔ کیرالہ کے زمانۂ قدیم کے لوک گیت اور لوک ناچ آج بھی وہاں کے تھیٹروں میں پیش کیے جاتے ہیں۔ کیرالہ کی لوک کلائیں خوب صورت اور شاندار ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوک کلائیں مذہبی اور عبادتی نوعیت کی ہیں۔ ان میں کتھاکلی ڈانس ڈرامہ اور موہنی اٹّم، تھیّام، کوڈی اٹّم، اوٹّامٹ تُھلّل، چکیار کوتّو، کرشنا انتم، پدیانی، ویلا کلی، تیرواتی را کلی قابل ذکر ہیں۔

کیرالہ کی تاریخی عمارتیں بھی اپنے شاندار فن تعمیر سے سیاحوں کو متاثر کرتی ہیں۔ اس کے بے شمار مسادر، گرجا گھر اور مساجد یہاں کی مذہبی عمارات کے فن تعمیر کی شاہد ہیں۔ پدم نابھ سوامی کا مندر جو ایک سات منزلہ مینار کی شکل کا ہے قابل دید ہے۔ سیاحوں کی دلچسپی کے دوسرے مقامات ہیں نیپیئر میوزیم، مہاراجہ کوچین کے ڈچ پیلیس کی پورٹریٹ گیلری، یہودی عبادت خانہ بولگیٹی پیلیس، پدم نابھ پیلیس اور بیکل فورٹ۔

کیرالہ کے تہوار

کیرالہ کے لوگ تہواروں کے موقع پر اپنی مستی

شرکت کرکے پورے جوش و خروش سے تہوار مناتے ہیں۔ کیرالہ کے بڑے تہوار اونم، موئی گھال والے میو پالیوں کی نمائش، ستر یشور پورم، نوراتری وغیرہ ہیں۔

محکمۂ سیاحت بھی عظیم ہاتھی مارچ، کشتیوں کی ریس، گاندھی ڈانس فیسٹی ویل، گاؤں کے میلوں، فوڈ فیسٹی ویل اور کوچین کارنیوال کا اہتمام کرتا ہے۔

اس کے علاوہ کیرالہ کی دستکاریوں کی شاندار مصنوعات جن میں ثقافت کے مختلف پہلو پیش کیے جاتے ہیں۔ ہر سیاح اپنے ساتھ یادگار کے طور پر لے جانا پسند کرے گا کیوں کہ ان کی بناوٹ انوکھی ہوتی ہے۔

کیرالہ کے قدیم مساوردہ محلات کی شاندار دیواری پینٹنگوں میں سیاح کیرالہ کے ماضی کی شوکت و عظمت دیکھ سکتے ہیں۔

کیرالہ کے کھانے

کیرالہ کے گرم اور مصالحہ دار کھانے بھی لذت دار کھانوں کے شائقین کا دل لبھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لونگ الائچی جیسے مصالحوں کی خوشبو بھی دور دراز سرزمینوں کے مسافروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

اپنی صحت کا خیال رکھنے والے مسافروں کے لیے کیرالہ ایک انوکھی سہولت مہیا کرتا ہے۔ آیورویدکے قدیم آزمودہ اور سائنٹی فک طریق علاج کے تحت روایتی جڑی بوٹیوں سے بنے ہوئے تیلوں کی مالش آپ کو سکون اور آرام دے سکتی ہے۔ یوگ آسنوں کے ذریعے بھی صحت برقرار رکھنے کے طریقے یہاں سیکھے جا سکتے ہیں۔

سیاح یہاں کیرالہ سے اپنی حفاظت کرنے کے قدیم آرٹ کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کر سکتے ہیں۔

آسان رسائی

کیرالہ میں سیاحوں کی دلچسپی کے اہم مقامات تک بآسانی پہنچا جاسکتا ہے کیوں کہ وہاں جانے کے لیے سڑکوں اور ریلوں کی سہولیات موجود ہیں۔ ترووانت پورم اور کوزی کوڈ میں بین اقوامی ہوائی اڈے ہونے کی بدولت ہوائی سروسیں بھی دستیاب ہیں۔ ایسا ہی ایک ہوائی اڈہ کوچی میں بھی بن رہا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بین اقوامی ہوائی جہازوں خصوصاً خلیجی ممالک کے ہوائی جہازوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہونے سے ہوائی ٹریفک کافی بڑھ گیا ہے۔

کیرالہ میں مسافروں کے قیام کے لیے پانچ ستارہ ہوٹلوں سے لے کر یوتھ ہوسٹل، ٹورسٹ بنگلے، یاتری نواس اور کم خرچ ہوٹلوں کی سہولیات موجود ہیں جن میں سیاح اپنے بجٹ کے مطابق قیام کرسکتا ہے۔

رہنے کی سہولیات

کیرالہ میں مسافروں کے قیام کے لیے پانچ ستارہ ہوٹلوں سے لے کر یوتھ ہوسٹل، ٹورسٹ بنگلے، یاتری نواس اور کم خرچ ہوٹلوں کی سہولیات موجود ہیں جن میں سیاح اپنے بجٹ کے مطابق قیام کرسکتا ہے۔ ہیری ٹیج ہوٹلوں کی اسکیم ایک نئی اسکیم ہے اس کے علاوہ پیئنگ گیسٹ کے طور پر رہنے کی سہولت بھی دستیاب ہے۔

کیرالہ میں جدید ترین تکنالوجی کے مطابق مواصلاتی سہولیات بھی بطریق احسن دستیاب ہیں۔

سیاحوں کی حفاظت اور سلامتی کے لیے ریاستی پولیس نے 'ٹورسٹ پولیس' کے نام سے ایک الگ شعبہ بنایا ہے جو سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات پر سیاحوں کی حفاظت کے انتظامات کرتا ہے۔

کوولم اور ورکلا وغیرہ ساحلی تفریح گاہوں پر سیاحوں کی سلامتی کے لیے لائف گارڈ سہولت فراہم کی جاتی ہے جو ملک میں اپنی طرح کی پہلی سہولت ہے۔

کٹس

کیرالہ انسٹی ٹیوٹ آف ٹورازم اینڈ ٹریول اسٹڈیز (کٹس) جو ٹورسٹ انڈسٹری کے لیے عملے کو تربیت دینے کا سرکردہ ادارہ ہے، نہ صرف ملک کے اندر بلکہ خلیج اور وسط مشرق کے حلقوں میں بھی ٹورسٹ انڈسٹری کی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے۔ ●



منی پوری رقص

مہاراشٹر میں سیاحت:

نئی چنوتیوں کا سامنا کرنے کی تیاری

مہاراشٹر جس کی ثقافتی وراثت نہایت شاندار ہے، آج کل سیاحت کو مزید فروغ دینے کے لیے نئے سرکٹوں، مزید قیام گاہوں اور نقل و حمل کی بہتر سہولیات فراہم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہاں سیاحت کے نئے پروجیکٹوں کی کامیابی کے لیے ایک ماسٹر پلان تیار کیا گیا ہے اور متعدد ترغیبات کا اعلان بھی کیا گیا ہے۔

مہاراشٹر ایک ایسی ریاست ہے جس کی ثقافتی وراثت بہت شاندار ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے سیاح دور دراز سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ ریاست صنعتی ترقی میں ملک کی دوسری ریاستوں سے آگے رہی ہے۔ یہاں متوسط طبقے کے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور یہ لوگ چھٹیوں کے دوران نئی نئی جگہوں کی سیاحت کا شوق رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہر سال تقریباً سات لاکھ غیر ملکی سیاح بھی یہاں آتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں نئے سرکٹوں، مزید قیام گاہوں، نقل و حمل کی بہتر سہولیات اور مقامات سیاحت کے بارے میں اطلاعات کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا اب یہ ریاست اس مانگ کی تکمیل کے لیے کمربستہ ہو رہی ہے اور ریاست کی آئندہ ترقی کے لیے سیاحت کی صنعت کو نمایاں اہمیت دے رہی ہے۔

مہاراشٹر ان ریاستوں میں سے ایک ہے جنھوں نے سب سے پہلے فروغ سیاحت کی پالیسی وضع کی۔ یہاں سیاحت سے متعلق پالیسی کا اعلان ۱۹۹۳ء میں کیا گیا۔ اس پالیسی کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں۔

☆ ماہرین اور مقامی سرکار کی مدد سے سیاحت کو منصوبہ بند انداز میں ترقی دینا۔

☆ سیاحوں کے شوق سیاحت کی تکمیل کے لیے ان کی دلچسپی کے مقامات کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنا۔

☆ سیاحت کی موجودہ سہولیات کو بہتر بنانا۔ منتخبہ علاقوں میں سیاحوں کو بین اقوامی معیار کی سہولیات مہیّا کرنا۔

☆ نوجوانوں اور کفایت شعار سیاحوں کے لیے واجب سہولیات فراہم کرنا۔

☆ اہم کاروباری، صنعتی اور شہری مراکز کے نزدیک تفریحی سہولیات کا اہتمام کرنا۔

☆ روزگار پیدا کرنا، خصوصاً ریاست کے اندرونی علاقوں میں۔

☆ ریاست کے قدرتی اور ثقافتی وسائل کو مربوط ترقی کے ذریعہ اُجاگر کرنا۔

☆ مقامی فنوں اور دستکاریوں کو جن میں لوک آرٹ بھی شامل ہے، ترقی دینا۔

آئندہ دس برسوں کے لیے ایک ماسٹر پلان بنایا گیا ہے اور فروغ سیاحت سے متعلق نئے پروجیکٹوں کے لیے متعدد ترغیبات کا اعلان کیا گیا ہے۔

اہم پہلو

سیاحت سے متعلق ۱۹۹۳ء کی پالیسی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ریاست کا رول بنیادی ڈھانچے کی سہولیات مہیا کرنے تک ہی محدود ہوگا اور ہوٹلوں اور آرام گاہوں کی تعمیر اور دیگر خدمات کی فراہم کا کام نجی سیکٹر پر چھوڑ دیا جائے گا۔ اس سے ممبئی، پونے اور مغربی ساحل کے علاقوں اور نواحی مقامات میں نجی شعبے کی سرمایہ کاری میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

ریاست میں حال ہی میں نجی سرمایہ کاری کے ذریعے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر اور کشتیوں اور چھوٹے جہازوں، چھوٹی بندرگاہوں اور چھوٹی ہوائی پٹیوں کی تعمیر و ترقی کا ایک کافی بڑا پروگرام شروع کیا گیا ہے۔

ثقافتی وراثت کی حفاظت

ریاستی سرکار کی سیاحتی پالیسی کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں ماحولیات اور ثقافتی وراثت کے تحفظ پر کافی زیادہ زور دیا گیا ہے۔

ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ ماحولیات اور قدیم وراثت کے تحفظ پر کوئی منفی اثر نہ پڑے۔

آج کل ریاستی حکومت نے اپنے بڑے خطوں میں تین بڑے پروجیکٹ شروع کر رکھے ہیں۔ مغربی خطے کے لیے جسے کونکن کہا جاتا ہے۔ گوآ سے ملحقہ سندھو درگ ضلع کو بطور خاص ترقی دی جا رہی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ فروغ سیاحت کی خاطر ایک پورے ضلع کو ترقی دینے کا کام ہاتھ میں لیا گیا ہے۔ وسطی خطے میں جو مراٹھواڑہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جاپان کی مالی امداد سے اجنتا ایلورا کی ترقی و تحفظ کا پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے۔ ۲۰۰ کروڑ روپے کی لاگت والے اس پروجیکٹ کا پہلا مرحلہ مکمل ہونے والا ہے۔ ودربھ خطے میں میل گھاٹ، نوے گاؤں، تادوبہ کے جنگلات اور ناگپور کے سنترے کے مشہور باغات میں "سفاریوں" کی ترقی کے ذریعہ "ایکو ٹورازم" کو فروغ دینے پر زور دیا جائے گا۔

اس کے علاوہ کئی اور مقامات کو بھی مختلف اسکیموں کے تحت ترقی دی جا رہی ہے۔ ریاستی محکمۂ سیاحت نے مہاراشٹر کو وسیع پیمانے پر سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنانے کے لیے اپنے بجٹ میں کافی اضافہ کیا ہے۔ مہاراشٹر ٹورازم ڈیولپمنٹ کارپوریشن (ایم ٹی ڈی سی) نے شعبۂ سیاحت میں سرمایہ کاری کے لیے سرمایہ کاروں کی رہنمائی کے واسطے ایک انوسٹمنٹ سیل قائم کیا ہے۔ اس کارپوریشن کی ملکیت میں خوب صورت قدرتی مناظر والے ایسے علاقے ہیں جنھیں وہ مزید ترقی کے لیے نجی صنعت کاروں کو پٹے پر دیتا ہے۔ اس نے اپنی کچھ ترقی یافتہ املاک جن میں آرام گاہیں اور تفریح گاہیں موجود ہیں، نجی صنعت کاروں کے سپرد کی ہیں۔ تاکہ وہ مختصر اور طویل المدت پٹوں پر ان کا انتظام چلائیں۔

مختصر یہ کہ ایسی سیاحت کے فروغ کے لیے جس سے ماحولیات پر کوئی خراب یا ناموافق اثر نہ پڑے، نجی کاری کی واضح پالیسی اختیار کی گئی ہے امید کی جا سکتی ہے کہ قریب مستقبل میں سیاح اور زیادہ تعداد میں مہاراشٹر کی سیر و سیاحت کے لیے آئیں گے۔

ٹرانسپورٹ

ریاست میں نقل و حمل کی بہت عمدہ سہولیات موجود ہیں۔ سڑکوں کا سلسلہ ۲۹۵۳ کلومیٹر قومی شاہراہوں، ۳۱۷۲۷ کلومیٹر ریاستی شاہراہوں، ۴۰۱۴۲ کلومیٹر بڑی ضلعی سڑکوں، ۴۴۰۳۴ کلومیٹر دوسری ضلعی سڑکوں، ۶۵۲۷۹ کلومیٹر دیہی سڑکوں اور ۳۵۰۰۰ کلومیٹر غیر زمرہ بند سڑکوں پر مشتمل ہے۔ ریاست میں ریلوں کا جال ۵۴۵۵ کلومیٹر پر محیط ہے۔ یہاں ۱۸ ہوائی اڈے/ہوائی پٹیاں ہیں۔ اور ممبئی اور نواشیوا کی دو بڑی بندرگاہوں کے علاوہ ۴۸ چھوٹی بندرگاہیں ہیں۔

ریاست میں سیاحوں کی دلچسپی کے اہم مراکز میں سے درج ذیل مقامات کے نام قابل ذکر ہیں:۔

اجنتا، ایلورا، ایلیفینٹا، کنہیری اور کرلا کی گپھائیں، مہابلیشور، ماتھیران، پنچ گنی، جوہار، ملشیج گھاٹ، امبولی، چکھال درہ، پہالہ ہل اسٹیشن اور یاتریوں کی خاص دلچسپی کے مقامات پنڈھارپور، ناسک، شرڈی، ناندیڑ، اوندھا ناگ ناتھ، ترمبکیشور، تلجا پور، گنپتی پولے، بھیم شنکر، ہری ہریشور اور شیگاؤں۔ ●

بقیہ: سکم آپ کا منتظر ہے

کو خانقاہوں اور گھروں میں رکھنے کے لیے پتھروں پر کندہ کاری کے فن کی تربیت دینے پر راضی ہوا۔

مشہور ماہر نباتات ابرٹ ہوکر نے ۱۹۲۰ء میں اس علاقے میں گھومنے کے بعد ہمالیہ کی معیشت حیوانات کے بارے میں دو جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی، اس کتاب میں جو "ہوکرز جرنل" کے نام سے مشہور ہے اس وقت کی مختلف النوع حیاتیات کا ذکر ہے۔ سنگالی رینج میں ٹریک روٹس ہیں ان کے راستے میں جھیلیں اور جنگلی پھولوں والے پودے ہیں۔ یہ زیارت کی بھی جگہ ہے کیوں کہ بارہویں صدی میں گورو پدم سمبھا نے تانترک بدھ ازم یہیں سے سکم میں پھیلایا تھا۔

سکم سرکار نے ایسی پہاڑی چوٹیوں کی شناخت کی ہے جن پر ضروری لباس اور ساز و سامان کے ساتھ ہفتہ دس روز میں چڑھائی کی جا سکتی ہے۔ حکومت مذہبی اور وراثتی ٹورازم کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ فروغ معیشت حیوانات اور ماحولیات کا بھی پورا خیال رکھتی ہے۔ پہاڑی چوٹیوں کو سر کرنے کی کوشش کرنے کے لیے دس سے بیس ہزار ڈالر تک کا محصول لیا جاتا ہے اور ریاستی حکومت کوہ پیماؤں اور ٹریکروں کو یہ ہدایت بھی دیتی ہے کہ وہ اپنا کوڑا کرکٹ اپنے راستے یا کیمپ پر نہ چھوڑیں بلکہ واپس آتے ہوئے اپنے ساتھ نیچے لیتے آئیں۔

ٹاٹا اکنامک کنسلٹینسی آرگنائزیشن اور ٹاٹا مینجمنٹ سروسز کو، ٹورازم کو، سائنٹی فک بنیادوں پر فروغ دینے کے لیے ایک مناسب پالیسی اور ماسٹر پلان تیار کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ اگرچہ ریاستی حکومت کا ایک مقصد شمالی سکم کو سیاحوں کے لیے کھولنا تھا تاہم اب ایسا لگتا ہے کہ وہ نیپال سرکار کی طرح سارا علاقہ کھول دینے کے بجائے بھوٹان سرکار کی طرح احتیاط سے کام لینا پسند کرے گی۔

ڈیموقانگ کے نزدیک ٹینڈانگ یا پینڈانگ کو دارجلنگ کے قریب واقع ٹائگر ہل کی طرح طلوع آفتاب کا منظر دیکھنے کے مقام کے طور پر فروغ دیا جا رہا ہے۔ یہاں سے کنچن جنگا سے ماؤنٹ ایورسٹ تک پورے ہمالیائی سلسلۂ کوہ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح میمنا چن کو بھی سیاحت کے ایک مقام کے طور پر ترقی دی جا رہی ہے۔ ویرانہ ٹورازم کے شائقین کے لیے ۷۰۰۰ فٹ کی بلندی ایک نئی جگہ لومی سمگانگ وادی ہے جس میں کئی جھیلیں ہیں۔

سکم محکمۂ ٹورازم پیرا گلائڈنگ اور ہینگ گلائڈنگ کی حوصلہ افزائی کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی ایڈونچر ڈویژن شمالی سکم میں چنگ تھانگ سے تلاطم خیز تیستا ندی کے کنارے واقع رنگ پو تک دریا میں رافٹنگ کے لیے پیکج پروگرام بھی منظم کرتی ہے۔ ●

ایس۔ اے۔ الاگر سامی

سیاحتی دلچسپیوں کا ایک اور گہوارہ: تامل ناڈو

تمل ناڈو بلاشبہ آرٹ اور کلچر کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں ہر ہر قدم پر سیاحوں کی کشش کا سامان موجود ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں مصنف نے تمل ناڈو کے تمام بڑے سیاحتی مقامات کا جائزہ بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

تمل ناڈو اس زمانے سے سیاحوں کی دلچسپی رہا ہے جب کہ سیاحت کا لفظ آج جیسے جدید معنی میں رائج نہیں ہوا تھا۔ آج سیاحت کا مطلب ہے ماضی کی تہذیب و ثقافت کی جو نادر یادگار رہ گئی ہیں ان سے محظوظ ہونا اور جہاں تک عہد وسطیٰ کے تمل راجاؤں کے زمانے کے ادبی و تہذیبی منظر نامے کا سوال ہے، یہ ملک کے دیگر خطوں اور تہذیبوں کے مقابلے سوا تھا۔ پرانے تمل راجاؤں نے ثقافت، فنون لطیفہ، ناٹک، رقص وغیرہ کی خوب خوب سرپرستی کی۔ اس کے نتیجے میں مجسمہ سازی، دیواروں اور ستونوں پر نقش گری، عالی شان مندر میناروں (گوپورم) جیسے فنون کو خوب فروغ ہوا۔ فن کے یہ سبھی نمونے اپنے عہد کی منھ بولتی تصویریں ہیں جو عہد بہ عہد ورثے کی صورت آج ہم تک پہنچے ہیں۔ اس زمانے میں فن کو نئے جمالیاتی ابعاد سے روشناس کرانے کے لیے مختلف اسالیب کو جس طرح شیر و شکر کیا گیا ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تب کے راجے مہاراجے بھی نہایت وسیع المشرب اور کشادہ قلب تھے۔

مدراس اب اس ریاست کی راجدھانی ہے۔ یہ شہر ملک کے دیگر میٹرو شہروں کے مقابلے زیادہ پرشکوہ، زیادہ سجل ہے۔ انگریزوں کے زمانے سے اب تک مدراس متانت اور تمکنت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ اس نے اپنے عہد کے فیشن اور کلچر کو بھی گلے لگایا لیکن اس طرح کہ کسی کو اپنے تشخص اور کردار پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ مدراس میں تمام مذاہب کی صدیوں پرانی عبادت گاہیں موجود ہیں اور یہ اس شہر

مدراس ملک کے دیگر میٹرو شہروں کے مقابلے زیادہ پرشکوہ، زیادہ سجل ہے۔ اس نے اپنے عہد کے فیشن اور کلچر کو بھی گلے لگایا لیکن اس طرح کہ کسی کو اپنے تشخص اور کردار پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ مدراس میں تمام مذاہب کی صدیوں پرانی عبادت گاہیں موجود ہیں اور یہ اس شہر کی کشادہ نظری کا ثبوت ہے۔

کی کشادہ نظری کا ثبوت ہے کہ امن و محبت اور جمالیاتی اقدار کو یہاں ہمیشہ فروغ ملا۔ خواہ وہ کپالیسور مندر کی خوب صورتی ہو، یا سینتھوم چرچ کی پرشکوہ عمارت یا ہزار چراغ مسجد کا عالیشان باب الداخلہ یا سوکارپیٹ جین مندر میں سنگ مرمر پر کندہ کیے ہوئے نقوش۔ یہ سب اس شہر کی دولت ہیں اور سیاحوں کی کشش کا ساماں۔

اس کی کشادہ سڑکیں اور خوش طبع لوگ سیاحوں کو لبھاتے ہیں۔ مدراس آنے والا کوئی بھی سیاح یہاں کے محکمۂ سیاحت کے طے کردہ پروگرام کے مطابق بھی گھوم پھر سکتا ہے اور اپنی مرضی سے بھی اپنا پروگرام ترتیب دے سکتا ہے کہ یہاں ٹرانسپورٹ کی عمدہ سہولیات دستیاب ہیں۔ شہر کے ایک کنارے پر دنیا کی دوسری سب سے بڑی بحری پٹی۔ مرینا۔ ہے مدراس کو اس بات پر فخر ہے کہ یہاں چار ساحل ہیں، حالاں کہ یہ ایک ہی سلسلہ ہے لیکن الگ الگ مقامات پر اس کے الگ الگ نام پڑ گئے ہیں۔ ایشیا کا سب سے بڑا اوپن آڈیٹوریم۔ ولّوور کوٹّم۔ آج بھی جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کے تمل نژاد سیاحوں کو ایک عہد گم گشتہ کی یاد دلاتا ہے۔ خلیج بنگال کے کنارے آباد مہابلی پورم جس کا پرانا نام

مامللاپورم تھا، اپنے جلو میں نفیس، خوش ذوق سیاحوں کے لیے عظیم اور یادگار لمحے رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پتھر نہیں تراشے گئے شاعری کی گئی ہے۔ یہاں کے بڑے بڑے شاندار مندر دراصل چٹانوں کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔ بعض بعض مندر تو کسی عمارت جتنے بڑے ہیں۔ یہ تو صاف نظر آتا ہے کہ چٹانوں کو تراش کر ایسے ایسے دلکش مجسمے بنائے گئے لیکن اس

> ایشیا کا سب سے بڑا اوپن آڈیٹوریم۔ وتوورکوٹم۔ آج بھی جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کے تمل نژاد سیاحوں کو ایک عہدِ گم گشتہ کی یاد دلاتا ہے۔

سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ ان میں ایک عہد کا شکوہ بولتا ہے۔ مدراس کے قریب ہی مدراس اور ترو کالو کندرم ہیں۔ مدراس میں سولہویں صدی کا ایک عیسائی قبرستان اور ایک ڈچ قلعہ ہے اور ترو کالو کندرم میں پہاڑی پر ایک بہت خوب صورت شیو مندر ہے۔

برطانیہ والوں نے چاہے جن وجہوں سے تمل ناڈو کو پسند کیا، فرانس والے بھی اس کا ایک حصہ چاہتے تھے۔ ایسا ہی پانڈیچری کے ساتھ بھی تھا۔ یہاں کے کوچوں اور لوگوں کے رہن سہن پر کچھ کچھ فرانسیسی اثر بھی ہے لیکن اس کا کردار ہندوستانی ہے اور یہی بات سیاحوں کو لبھاتی ہے۔ مثال کے طور پر اروولی اور آربندو آشرم۔ ہالینڈ والے بھی کچھ پیچھے نہیں رہے۔ عظیم الشان ڈینس برگ قلعہ اور چرچ ان کی یادگار ہیں۔ ڈنمارک والوں نے نہ صرف یہ کہ یہاں سے عیسائیت کی تبلیغ کی بلکہ انھوں نے ہی تمل زبان کا پہلا چھاپہ خانہ قائم کیا۔

تنجاور بر ہادیسور مندر جسے عقیدتمند بڑا مندر کہتے ہیں۔ چولا سلطان راجہ راجہ اول نے بنوایا تھا۔ یہ تعمیر کا ایسا شاندار نمونہ ہے کہ اسے 'عالمی ورثہ' قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے تمام مندروں میں اس کا مینار سب سے بلند ہے اور یہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ سال بھر میں کبھی دوپہر میں اس کا سایہ نہیں بنتا۔ ۸۰ ٹن کے ایک سلیٹی پتھر کا بنا ہوا ہے۔

تروچی قصبے کے وسط میں ۸۴ میٹر اونچی پہاڑی پر ایک قلعہ ہے جسے چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا ہے اور یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اوچی پلیار مندر اور ترو منتوامی مندر میں سنگ تراشی اور نفیس و مستعلیق نقاشی کے نمونے دیکھ کر آنکھیں حیرت میں رہ جاتی ہیں۔ نقاشی کے فن کو اس ریاست میں اتنا فروغ ہوا کہ آدمی کہیں بھی جائے اسے طرح طرح کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مدورائی اس ریاست کا سب سے پرانا شہر ہے جس کی تاریخ ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔ اس شہر سے ایک اسطور جڑا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ شیو کی جٹاؤں سے یہاں امرت برسا تھا۔ مدورائی (یا مدھورا پوری) کے مشہور میناکشی مندر کو اس اسطور سے ہی منسوب کرتے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مدورائی تقریباً دو ہزار سال سے علم و ادب کی آماجگاہ رہا ہے۔ اس کے قریب ہی ویگائی ڈیم، کوڈائی کنال، پائی اور سرو ملائی کی پہاڑیاں ہیں جن میں سات سو سے

> قدرت نے جیسے تمل ناڈو کو ہفت رنگ مناظر عطا کیے ہیں ویسے اسی نے اس دھرتی کو ایسے سپوتوں سے بھی نوازا جنھوں نے اپنے جمالیاتی تجسس کی خاطر ماضی کی شان و شوکت پر بڑے ہالوں کو صاف کرنے کے لیے عمریں تج دیں۔

بھی زیادہ اقسام کے پیڑ پودے ملتے ہیں۔ ترونولی ضلع میں کورٹالم اور اس کے پانچ آبشار بھی سیاحوں کی دلکشی کا سامان ہیں۔ مدورائی میں الاگھر کوول اور ترومالائی نایکر محل بھی قابلِ دید ہیں۔

کوڈائی کنال یا کوڈائی ایک پرسکون ہل اسٹیشن ہے جہاں فطرت کا حسن ابھی تک شہری آلودگیوں سے پاک ہے۔ سطح سمندر سے ۲۱۰۰ میٹر اونچائی پر قائم یہ ہل اسٹیشن پلانی پہاڑیوں پر ہے۔ مدورائی سے اس کی دوری تقریباً ۱۲۰ کلومیٹر ہے لیکن مدورائی، پائنی اور کوڈائی سے آمد و رفت کی سہولیات دستیاب ہیں۔ اس ہل اسٹیشن پر کئی چیزیں بڑی دلچسپ ہیں مثال کے طور پر یہ کہ یہاں دھوپ بہت چمکیلی ہوتی ہے۔ ستارہ کی شکل کی جھیل، برائنٹ پارک، سولر فزیکل لیبارٹری، پرخطر پیدل راستہ، کورنجی انداوار مندر، پلر راکس، بیر ستولا آبشار، ملور جھرنے، پیرومل چوٹیاں وغیرہ ایسی قابلِ دید چیزیں ہیں جنھیں اس ہل اسٹیشن پر آنے والا سیاح دیکھ سکتا ہے۔

رامیشورم مندر جہاں تقریباً دو ہزار سال پرانے دو 'لنگم' ہیں، ہندوستان کے متبرک ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ اس مندر کا چوتھا کاریڈور (برآمدہ) دنیا کا سب سے لمبا برآمدہ ہے۔ رامیشورم جزیرے کو میدانی علاقے سے جوڑنے والا پام بن پُل خوب صورتی کا نمونہ ہے۔ رامائن کے مطابق رام نے راون پر حملہ کرنے سے پہلے یہاں پوجا کی تھی۔

کنیا کماری ہندوستان کا جنوبی سرا ہے۔ یہ مقام بحیرۂ عرب، خلیج بنگال اور بحرِ ہند کا سنگم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ماں پاروتی نے شیو بھگوان سے شادی کرنے کے لیے پرائسچت کے طور پر یہیں کماری دیوی کا روپ دھارن کیا تھا۔ ایک پرشکوہ مندر کے علاوہ یہاں سری پد پرچ ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ اس پتھر نے ماں کے قدموں کو چوما تھا۔ اب اسے وویکانند کے آسن کے نام سے زیادہ جانا جاتا ہے کیوں انھوں نے اسی پتھر پر بیٹھ کر آخری سانس تک تپسیا کی تھی۔

اس کے نزدیک ہی سوچیندرم کا عالیشان مندر ہے۔ یہاں قدیم آرٹ کا بہت نادر خزانہ ہے

باقی صفحہ ۳۸ پر

کے۔ گوپی ناتھ

لکش دیپ سیّاحوں کی جنّت

> مصنف کا کہنا ہے کہ جزائر لکش دیپ جو ابھی حال تک گم نام تھے اور جہاں پہنچنا بھی دشوار تھا، اب سیاحوں کی جنت بن چکے ہیں۔ اوپر سے یہ خوب صورت جزائر سمندر کے چمکدار نیلگوں پانیوں پر سبز جواہرات کی مانند تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لکش دیپ کے چھوٹے مگر حسین اور مناظر قدرت سے مالامال مرجانی جزائر بحرۂ عرب کے خوبصورت مقامات ہیں۔ لکش دیپ جو ملک میں مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں سب سے چھوٹا علاقہ ہے، اپنے دلکش مناظر کی خوب صورتی اور اپنے سکون اور شانتی کے لحاظ سے ایک انوکھی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے قدرت نے ان جزائر کے حسن اور شادابی کو خود اپنی ہی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے میں بڑی احتیاط برتی ہے۔ بحرۂ عرب سے ان کی حفاظت وہ خوب صورت ساحلی جھیلیں کرتی ہیں جن کے کناروں پر مرجانی (مونگوں) کے ٹیلے ہیں۔ اوپر سے یہ جزائر سمندر کے چمکدار نیلگوں پانی پر تیرتے ہوئے سبز جواہرات کی مانند نظر آتے ہیں۔ ۳۶ جزائر میں سے آبادی صرف دس جزیروں ہی پر ہے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی کل آبادی ۵۱،۷۰۷ ہے۔

بحرۂ عرب کے ان چھوٹے چھوٹے جزیروں کا سلسلہ ساحل کیرالا سے ۲۰۰ تا ۴۰۰ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور ایک دوسرے سے ان کی دوری ۱۱ سے ۴۰۰ کلو میٹر تک ہے۔ یہ جزائر ایک خوب صورت مرجانی جنت ہیں۔

ابھی حال تک یہ جزائر ہمارے ہم وطنوں میں گمنام تھے اور یہاں پہنچنا بھی دشوار تھا۔ اب یہ جزائر سیاحوں کے لیے پرکشش مقام بن گئے ہیں۔ یہ جزائر ۱۹۵۶ء میں مرکزی نظم و نسق کا علاقہ بننے کے بعد بھی خاص سرزمین ہند سے کٹے رہتے تھے اور دونوں کے درمیان سال میں چھ مہینے کوئی بھروسے کے لائق رابطہ نہیں رہتا تھا۔ بھارت کی خاص سرزمین اور ان جزیروں کے درمیان "اوڈیم" کہلانے والی دیسی کشتیاں ہی آمد و رفت کا واحد ذریعہ تھیں۔ یہاں کے لوگوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ "اوڈیم" کشتیاں ۱۹۵۹ء تک جزائر اور خاص سرزمین ہند کے درمیان مواصلات کے لیے صرف ایک ہی مواصلاتی نظام کا استعمال کرتی تھیں اور وہ تھا سطحی نظام مواصلات۔ یہ اوڈیم کشتی (جسے چھوٹے جہاز بھی کہہ سکتے ہیں) اچھے موسم میں ملک کی خاص سرزمین تک صرف تین

چار سفر ہی کرتی تھی جس کے دوران وہ ناریلی، ناریل کے ریشے سے بنی ہوئی چیزیں اور دوسری پیداوار لے جاتی تھیں اور انھیں فروخت کرنے کے بعد چینی اور ضروری استعمال کی دوسری چیزیں لے کر لوٹتی تھیں۔ برساتی موسم کے دوران یہ جزیرے باقی ملک سے کٹے رہتے تھے۔ اچھے موسم میں چلنے والے چھوٹے جہازوں کا استعمال ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۳ء تک کیا جاتا رہا۔ سلسلۂ آمد و رفت میں ایک بڑی پیش رفت ۱۹۷۰ء میں ہوئی جب سبھی موسموں میں چلنے والا جہاز ایم۔ وی امینی دوی چلنا شروع ہوا جس میں ۲۰۰ مسافر سفر کر سکتے تھے اور ۸۰ ٹن مال لے جایا جا سکتا تھا۔ اس سے جزائر کے موسموں کے درمیان باقی ملک سے کٹے رہنے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ہفتے میں کم از کم ایک بار ڈاک کی خدمات شروع کی گئیں جو سارے سال جاری رہتی تھیں۔ اب ان جزیروں میں قریب قریب مکمل خواندگی آ گئی

> لکش دیپ جو ملک میں مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں سب سے چھوٹا علاقہ ہے، اپنے دلکش مناظر کی خوب صورتی اور اپنے سکون اور شانتی کے لحاظ سے ایک انوکھی حیثیت رکھتا ہے۔

ہے جسکو ۱۹۵۷ء میں یہ صرف ۱۵ فی صد ہی تھی۔

آج کل لکش دیپ اور باقی ملک کے درمیان جلیا قسم کے دو جہاز سبھی موسموں میں چلتے ہیں۔ ۷۰۰ مسافروں کو لے جانے والے ایک اور جہاز کا آرڈر دیا جا چکا ہے۔ CATAMARAN قسم کے دو تیز رفتار جہازوں نے جنوری ۱۹۹۲ء سے چلنا شروع کیا تھا اس کی بدولت لکش دیپ اور باقی ملک کے درمیان زیادہ قریبی رابطہ قائم ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی مزید دو تیز رفتار جہازوں کی سروس بھی شروع ہو جائے گی۔ اوڈیم کشتیاں بھی میکنائز کر دی گئی ہیں۔

۳۱ جنوری ۱۹۸۷ء کو لکش دیپ کے مختلف جزیروں اور باقی ملک کے درمیان ہیلی کاپٹر سروس شروع کی گئی۔ ۱۶ اپریل ۱۹۸۸ء کو کوچی اور اگاتی جزیرے کے درمیان فضائی سروس کے آغاز سے ایک نیا دور شروع ہوا۔ اگاتی سے دوسرے جزیروں کے لیے ہیلی کاپٹر سروس دستیاب ہے۔

۲ جنوری ۱۹۹۶ء کو اس وقت کے وزیر شہری ہوابازی و سیاحت نے اینڈروٹ میں ایک اور ہوائی اڈے کا سنگ بنیاد رکھا۔ اینڈروٹ علاقے کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اس کا رقبہ ۴۸ر۴ مربع کلو میٹر اور آبادی ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۹۱۱۹ ہے۔ زمین حاصل کرنے کے بعد اس ہوائی اڈے کی تعمیر ایک سال کی ریکارڈ مدت میں مکمل کی جائے گی۔ تعمیر پر ۲۸ کروڑ روپے کی لاگت آئے گی جس میں ہوائی اڈے کے لیے درکار ۲۷ ہیکٹیر اراضی کی قیمت شامل نہیں ہے۔ اس میں ۴۰۰۰ فٹ لمبی ہوائی پٹری ہوگی جو ۵۰ نشستوں والے ہوائی جہازوں کے لیے کافی ہوگی۔ ہوائی اڈے پر سو مسافروں کے لیے ایک ٹرمینل بلڈنگ ہوگی۔

لکش دیپ کا دوسرا سب سے بڑا جزیرہ منی کوئے ہے۔ یہ ترواننت پورم کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۴ر۴ مربع کلو میٹر اور آبادی ۸۳۱۳ ہے۔ جلد ہی ایک اور ہوائی اڈہ اس جزیرے میں تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔

ہمارے آزادی حاصل کر لینے کا علم ان جزائر کے لوگوں کو نقل و حمل اور مواصلات کی مشکلات کے سبب مہینوں بعد ہوا تھا۔ تب ان جزائر میں ایک ڈاک خانہ بھی نہیں تھا۔ مدتوں عدم توجہی کا شکار رہے ان جزیروں میں اب مواصلات کی تمام جدید سہولیات موجود ہیں، جن میں ڈاک اور تار گھر، ٹیلیکس، ٹیلی پرنٹر، ٹیلی فون اور فیکس جیسی خدمات شامل ہیں۔ لکش دیپ میں ایک ہزار آبادی پر ۷۰ ٹیلی فون ہیں جب کہ ملک میں ایک ہزار آبادی کے لیے صرف ۱۰ ٹیلی فون ہیں۔ اب وہاں ٹیلی فون کنکشن مانگ پر فوراً فراہم کیے جاتے ہیں۔ آبادی والے تمام جزیروں میں ایس ٹی ڈی / آئی ایس ڈی کی سہولیات موجود ہیں۔ علاوہ ازیں جزائر کے درمیان گروپ ڈائلنگ کی سہولیات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ جزائر کے جو لوگ ابھی حال تک دیسی کشتیوں میں سفر کرتے تھے اب ہوائی سفر کا لطف لینے لگے ہیں۔ دیسی کشتیوں سے ہوائی سفر تک کا یہ انقلاب واقعی قابل ذکر ہے۔ ہوائی سروس اور سبھی موسموں میں بحری جہازوں کی سروس شروع ہو جانے کی بدولت دنیا بھر کے سیاح گرمیوں میں امن و سکون کی تلاش میں ان جزائر میں کافی تعداد میں آنے لگے ہیں۔ کیوں کہ یہ جرائم سے پاک ہونے کی وجہ سے بہت محفوظ ہیں۔

یکم جنوری ۱۹۹۴ء کو کاواراتی جزیرے میں ایک ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح کیا گیا۔ نئی دہلی اور ترواننت پورم کے ٹی وی پروگرام بھی جزائر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس طرح ان جزائر کی باقی ملک سے دوری اور علاحدگی ایک بڑی حد تک ختم ہو گئی ہے اور پورا علاقہ وطن کی خاص سرزمین کے نزدیک آ گیا ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں میں لکش دیپ نے عظیم ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد کے بدولت معیشت کے ہر شعبے میں نمایاں ترقی کی ہے جس کی وجہ سے ان جزیروں کے قبائلی عوام کی زندگی اور ثقافت میں عظیم تبدیلیاں آئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قومی زندگی کے بڑے دھارے میں بھی شامل ہو گئے ہیں جو کثرت میں وحدت کی مثال پیش کرتا ہے۔ ●

> یہ جزائر ایک خوب صورت مرقع جنت ہیں۔ ابھی حال تک یہ جزائر [illegible] اب یہ جزائر سیاحوں کے لیے پرکشش مقام بن گئے ہیں

> آج کل لکش دیپ اور باقی ملک کے درمیان [illegible]

بقیہ کرناٹک: سفر ہے شرط ۔۔۔

خوب صورت ساحل ہیں۔ اتل میں ایک پرائیویٹ کمپنی نے شاندار RESORT بنوایا ہے۔ ہاسن اور بیجا پور کے درمیان ہوائی راستہ کھولنے کی تجویز زیر غور ہے۔ ایسا ہو جائے تو پھر کرناٹک عالمی سیاحت کے نقشے میں شامل ہو جائے گا اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ آنے والے برسوں میں یہ ریاست عالمی سیاحت کے نقشے میں ایک اہم منزل ہوگی۔ ●

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

فون : 6177591

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : جیتندر سنگھ

جلد : ۱۶ شمارہ ۰ ۶

ستمبر ۱۹۹۶ء (۱۰ر بھادر تا ۹ر آشون شک ۱۹۱۸)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) : ڈی۔ ایں۔ گاندھی

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (ویسٹ) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

ارون سی۔ مہتہ

سب کے لیے تعلیم کی حیثیت

ملک میں تعلیمی سہولیات کی قابل دید توسیع کے باوجود بھی "سب کے لیے تعلیم" کا مقصد اب تک ایک سراب ہے اور وہ بھی دور تک نظروں سے اوجھل۔ حالاں کہ اب دیہی اور شہری علاقوں کی آبادی کے ایک بڑے طبقے کو تعلیمی سہولیات مہیا ہیں لیکن بہت سے اداروں کو اب بھی وہ کم از کم بنیادی سہولیات دستیاب نہیں ہیں جو اداروں کو کارگر طریقے سے چلانے کے لیے درکار ہیں۔ اس کا انکشاف ڈی پی ای پی (DPEP) صوبوں میں معلومات فراہم کرنے کی غرض سے کیے گئے حالیہ مطالعوں سے ہوتا ہے۔ موجود اعداد و شمار اس جانب بھی اشارہ کرتے ہیں کہ قومی سطح پر لڑکوں کا مجموعی اندراج تناسب تقریباً ۱۱۵ فی صد ہے۔ پرائمری سطح پر لڑکیوں کا مجموعی اندراج تناسب (GROSS ENROLMENT RATIO) ۹۲ فی صد ہے جو لڑکوں کے مقابلے میں اب بھی کم ہے۔ حالاں کہ درج فہرست ذاتوں (۸۱ر۱۰۷ فی صد) اور درج فہرست قبائل (۸۷ر۱۰۶ فی صد) کی آبادی کے داخلہ تناسب میں اہم اضافہ ہوا ہے، جو لگ بھگ عام آبادی کے داخلہ تناسب کے مساوی ہے۔ قومی سطح پر حساب کے مطابق لڑکوں کی داخلہ شرح تقریباً ۱۲۴ فی صد ہے تاہم لڑکوں اور لڑکیوں کی داخلہ شرح میں ۲۹ فی صد کا تفاوت بھی ہے۔ کچھ ریاستیں جیسے بہار (۴۷ فی صد) مدھیہ پردیش (۳۰ فی صد)، راجستھان (۵۰ فی صد) اور اتر پردیش (۳۴ فی صد) میں داخلہ کی شرح میں یہ تفاوت بہت زیادہ ہے جو تشویش کا باعث اور خطرات کا نقیب ہے۔ اس تفاوت کے باوجود ایک وقفے کے دوران پرائمری سطح پر مجموعی اندراج شدہ تعداد میں لڑکیوں کی داخلہ شرح میں اہم اضافہ ہوا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں جہاں ان کا داخلہ تناسب ۲۸٫۱ فی صد سے کم تھا۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں بڑھ کر ۲ر۴۳ فی صد ہو گیا۔ حال ہی میں مہتہ ۱۹۹۵ نے قومی اور صوبائی سطح پر درجہ بدرجہ اسکول (GRADE TO GRADE) چھوڑنے والے بچوں کی شرح کا مطالعہ کیا ہے جس کا استعمال تعلیمی نظام کی کارگزاری سے باخبر ہونے کے لیے کیا جاتا ہے۔ تعلیمی نظام کی کارگزاری کی ایک اہم علامت کم سے کم (ان پٹ) اور مجموعی پیداوار (آؤٹ پٹ) کا تناسب برائے ۱۹۹۰ء ہے۔ جو ۱ر۲۹ ہے۔ یہ پرائمری سطح پر حساب کرنے سے آیا ہے۔ اس سے موجودہ تعلیمی میں اصلاح کی گنجائش کا اشارہ ملتا ہے۔ اسی دوران قومی سطح پر نقصان (WASTAGE) تقریباً ۲۹ فی صد رہا۔ کچھ صوبوں میں نقصانات کا فی صد قومی سطح کے نقصان سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ موجودہ اسکول چھوڑنے اور دوبارہ داخلہ لینے کی سطح پر ایک عام طالب علم کو پرائمری اسکول پاس کرنے کے لیے تقریباً ۶ر۴۴ برس درکار ہیں جو پانچ برس کی اسکولی تعلیم کی زیادہ سے زیادہ مدت کے برعکس ہے۔ ملک گیر سطح پر مجموعی نقصان ۸۲٫۶ فی صد اسکول چھوڑنے والوں اور باقی ۴ر۱۷ فی صد دوبارہ داخلہ لینے والوں کی بدولت ہوا۔

موجودہ اعداد و شمار سے مزید یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر برس بچوں کی ایک بڑی تعداد تعلیمی نظام کی پہلی کلاس میں داخلہ لیتی ہے لیکن ان میں سے زیادہ تر بچے دوسری کلاس میں داخلے ہونے سے قبل ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ ۹۰-۱۹۸۹ء میں قومی سطح پر جن لڑکوں اور لڑکیوں نے داخلہ لیا تھا ان میں ۸ر۷ فی صد لڑکوں اور ۱ر۱۵ فی صد لڑکیوں نے دوسری کلاس میں داخل ہونے سے قبل ہی اسکول کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ تاہم درجہ اول میں اسکول چھوڑنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان تفاوت کی شرح اہم نہیں ہے، دوسری طرف پرائمری سطح پر اسکول نہ چھوڑنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کا فی صد تقریباً ۵ر۴۳۔ ۶۴ اور ۱ر۴۱ ۵۶ ہے۔ اس کے مقابلے میں بنیادی سطح پر ان کا فی صد بالترتیب ۹ر۴۱۔ اور ۸۷ر۳۴ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۵۸ فی صد لڑکے اور ۶۵ فی صد لڑکیوں نے اسکول چھوڑ دیا۔ تعلیمی نظام کی کارگزاری پر اس عمل کا برا اثر ہوا۔ ہندوستان میں پرائمری تعلیم کے عام ہونے کے مقصد کے ناکامیاب ہونے میں یہ عوامل سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ ماضی قریب میں اسکول چھوڑنے والوں کی درجہ بدرجہ شرح پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے جب کہ ایلیمنٹری اور پرائمری سطح کی تعلیم پر کم۔ کیوں کہ اسکول چھوڑ کر نکل جانے والے (ڈراپ آؤٹ) پرائمری تعلیم کے عام ہونے کے راستہ میں مخل عناصر میں سب سے اہم عنصر ہیں۔ اگر اس عنصر کو باقاعدگی سے حل کیا گیا تو اسکول چھوڑنے والوں کی تیزی سے بڑھتی شرح کو کم کرنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

جس طریقے سے بنیادی سطح پر تعلیم کے میدان میں پیش رفت کی گئی ہے اسی طرح خواندگی کے میدان میں بھی اہم ترقی کی گئی ہے۔ یہ سلسلہ

جاری ہے۔ لیکن عام داخلے کی طرح عام خواندگی کا مقصد بھی ابھی تک پورا نہیں ہو سکا ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں خواندگی کی شرح ۱۸/۳۳ فی صد سے بھی کم تھی۔ ۱۹۹۱ء میں یہ شرح ۵۲/۲۱ فی صد ہو گئی ہے۔ خواتین میں خواندگی کی شرح اب بھی بہت کم ہے۔ اس (۴۰ سالہ) وقفے کے دوران ان کی خواندگی کی شرح ۸/۸۶ فی صد سے بڑھ کر ۳۹/۲۹ پہنچ گئی ہے۔ ۱۹۹۱ء میں خواندگی کی تعریف میں ترمیم کی وجہ سے ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۱ء کے دہے کے دوران اس جانب صحیح پیش رفت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ چناں چہ خواندگی کے میدان میں کی گئی پیش رفت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ خواندگی کے میدان میں پہلی دفعہ خواندگی کی شرح کا حساب ۷ برس کی عمر والے بچوں سے کیا گیا ہے۔ جب کہ اس سے قبل یہ حساب ۵ برس کے بچے اور اس سے زیادہ عمر کے بچوں سے لگایا جاتا تھا۔ بہر حال خواندگی شرح کی تعریف میں اس ترمیم کی کوئی خاص وجہ بیان نہیں کی گئی ہے سوائے اس کے کہ ایسا حکومت ہند کے شعبۂ تعلیم، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند اور پلاننگ کمیشن کے اصرار پر کیا گیا۔ اس ترمیم کی وجہ سے ۱۹۹۱ء میں خواندگی شرح ۴۲ فی صد ہو گئی۔ جب کہ ۱۹۸۱ء میں خواندگی شرح ۳۶ فی صد تھی۔ اگر اس نئی خواندگی شرح کی روشنی میں صوبائی سطح پر حساب کیا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۰۰۱ء کی مقررہ مدت تک عام خواندگی کے مقصد کو حاصل کرنا بہت سے صوبوں کے لیے ناممکن ہوگا۔ مہتہ (۱۹۹۳ء) نے بھی حال میں یہی اشارہ دیا ہے کہ ۲۰۲۷ء کے بعد بھی ملک میں عام خواندگی کے مقصد کو حاصل کرنا ممکن نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ موجود اعداد و شمار سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ ایلیمنٹری سطح پر بچوں کی ایک بڑی تعداد داخلہ لیتی ہے، جن کی عمریں ۶ برس سے کم اور ۱۳ برس سے زیادہ ہیں۔ ایج گریڈ میٹرکس (MATRIX) (عمر کی مستطیل فہرست) کے عدم موجودگی میں بنیادی سطح پر تعلیم کی صحیح پیش رفت کا اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں ایلیمنٹری سطح پر مجموعی داخلہ تناسب لڑکوں کا ۱۰۲/۵۹ فی صد اور لڑکیوں کا ۷۹/۴۵ فی صد تھا۔

مقررہ عمر سے زیادہ اور کم بچوں کے مختلف تخمینوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایلیمنٹری سطح پر بچوں کا مجموعی داخلہ تقریباً ۱۰۵ فی صد ہے۔ اگر اس تخمینہ کی روشنی میں داخلہ کی شرح دیکھی جائے تو ایلیمنٹری، پرائمری اور مڈل کی تعلیمی سطح پر مجموعی داخلہ شرح بالترتیب ۹۸/۳۷، ۸۴/۳۷ اور ۸۰/۵۰ فی صد ہوگی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یو پی ای (UPE) اور یو ای ای (UEE) دونوں کے صد فی صد خواندگی شرح کے نشانے کو حاصل کرنے کے لیے ایک عرصۂ دراز درکار ہے۔ مجموعی داخلہ شرح یہ بتاتی ہے کہ ملک میں "سب کے لیے تعلیم" کا مقصد ایک لمبے وقت تک خواب ہی رہے گا۔ حال میں اس سلسلے میں کیے گئے بہت سے مطالعوں سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے۔ اسکول میں داخلہ نہ لینے والے بچوں کے اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران ۷/۲۵ ملین لڑکوں اور ۱۵/۱۴ ملین لڑکیوں نے داخلہ نہیں لیا جن کی عمریں ۶ سے ۱۰ برس کے درمیان ہیں۔ اسی طرح ۱۱ سے ۱۳ برس کے درمیان عمر والے غیر داخل شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد ۱۲/۳۴ اور ۱۶/۴۴ ملین ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ۹۴-۱۹۹۳ء میں تقریباً ۵۱/۳۸ ملین بچوں نے اسکول میں داخلہ نہیں لیا تھا جن کی عمریں ۶ سے ۱۴ برس کے درمیان تھیں۔ ان میں لڑکیوں کا تناسب ۶۱/۵۸ فی صد تھا اور ان کی مجموعی تعداد ۳۱/۷۸ ملین تھی۔ وہ بچے جن کی عمریں ۶ سے ۱۰ برس کے درمیان ہیں۔ ان کے مقابلے میں ۱۱ سے ۱۳ برس کے درمیان عمر والے زیادہ بچے اسکول میں داخلہ نہیں لیتے ہیں۔ قومی اور صوبائی سطح پر مزید بچوں کو داخلہ دینے کی ضرورت ہے اور ان داخل شدہ بچوں کا حساب رکھنے کی بھی۔ نتائج یہ بتاتے ہیں کہ ۱۱ سے ۱۳ سال کی درمیان عمر والے ۱۵/۰۹ ملین لڑکوں اور ۱۹/۴۳ ملین لڑکیوں کے مقابلے میں ۶ سے ۱۰ سال کے درمیان عمر والے ۱۰/۴۴ ملین لڑکوں اور ۱۹/۷۳ ملین لڑکیوں کا ان کی موجودہ سطح سے داخلہ کرنا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ۲۰۰۱ء تک ملک میں یو پی ای (UPE) کے مقاصد کو حاصل کرنا ہے تو پرائمری سطح پر لڑکوں کی داخلہ تعداد میں کم از کم ۱۰/۴۸ اور لڑکیوں کی داخلہ تعداد میں ۱۰/۶۴ فی صد کا اضافہ کرنا ہوگا۔ ملک میں پرائمری تعلیم کی موجودہ حالت بالخصوص لڑکیوں کی تعلیم کو اگر مد نظر رکھا جائے تو اب سے تقریباً ۷ برسوں کے دوران لڑکیوں کے داخلہ میں ۱۰/۹۴ فی صد کا اضافہ کرنا مشکل جان پڑتا ہے۔

اس طرح یہ نتائج ابھر کر سامنے آتے ہیں کہ تمام لڑکیوں کو تعلیم کے دائرہ میں لانے اور اس تعلیمی نظام میں ان کو برقرار رکھنے کے لیے سخت کاوشوں کی ضرورت ہے۔ تجزیاتی رجحان کے مطابق ۲۰۰۱ء میں پروجکٹیڈ داخلہ تناسب لڑکوں کا ۱۱۶/۴۶ اور لڑکیوں کا ۹۰/۵۷ فی صد ہونے کا امکان ہے۔ اعداد و شمار کی روشنی میں مکرر تیار کردہ مجموعی داخلہ تناسب اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یو۔پی۔ای کا مقصد لڑکوں کے معاملے میں ۲۰۰۴-۵ء تک اور لڑکیوں کے معاملے میں ۲۰۰۷-۸ء تک حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ پروجکٹیڈ داخلہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۰۰۷-۸ء تک ۱۱ سے ۱۳ برس کی درمیانی عمر والے سبھی لڑکوں کا داخلہ ممکن ہے جب کہ تمام تر لڑکیوں کا داخلہ ایک خواب ہی رہے گا۔ تاہم غیر مجموعی تحلیل PROJECTIONS قومی سطح کے مقابلے میں ریاستی سطح پر ان کی زیادہ صحیح تصویر پیش کر سکتی ہے۔ ریاستی سطح کے پروجکشن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمل ناڈو اور کرناٹک کے علاوہ معینہ مدت ۲۰۰۱ء تک ایک بھی ریاست یو۔پی۔ای کے مقصد کو حاصل نہیں کر سکے گی۔ تمل ناڈو نے یو۔پی۔ای کے مقصد کو قبل از وقت حاصل کر لیا ہے جب کہ کرناٹک اس مقصد کو ۹۹-۱۹۹۸ء تک حاصل کرے گا۔

تاہم داخلہ پروجکشن سے ظاہر ہوتا ہے کہ چودہ بڑی ریاستوں میں سے کچھ جن میں گجرات اور [illegible] شامل ہیں، یو۔پی۔ای کے مقاصد کو ۲۰۰۷-۸ تک حاصل کر لینے کی امید ہے۔ کچھ ریاستیں جیسے آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور اڑیسہ لڑکوں کے معاملے میں یو۔پی۔ای کے مقاصد کو عنقریب مستقبل میں ہی حاصل کر لیں گی۔ لیکن لڑکیوں کے معاملے میں ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ان ریاستوں کو ایک عرصۂ دراز چاہیے۔

باقی صفحہ ۳۹ پر

سید جعفر محمود

آبادی، تعلیم اور ذرائع ابلاغ

ایک چھوٹے سے کنبے سے بڑھ کر ہزاروں سال میں انسانی برادری آج پوری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ یہ آبادی لاکھوں سالوں میں بہت ہی دھیمی رفتار سے بڑھی اور ۱۸۰۰ء میں ایک بلین تک پہنچی تھی اور اس وقت دنیا کی آبادی ۵٫۴ بلین ہے اور اب تمام جغرافیائی حدود کو توڑتی ہوئی سبھی ملکوں کے لئے خطرہ بن چکی ہے۔ دنیا کی آبادی کا سولہ فی صد حصہ بھارت میں ہے۔ دنیا کی خطہ اراضی کا ۲٫۴ فی صد لگ بھگ اسی شرح آبادی کے مطابق آباد ہے۔ اور آبادی میں اضافہ ۵٫۳ بلین سے لگ بھگ ۸۵۰ ملین اسی شرح پیداوار کے مطابق ہوا ہے آبادی کے بڑھنے کی شرح بھارت اور ساری دنیا میں کافی زیادہ ہے یعنی ہر سال دو فی صد کا اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ اگر یہ شرح پیدائش اسی طرح قایم رہی تو آئندہ ۲۵ سے ۳۰ سال میں تین بلین افراد کی تعداد، دنیا کی آبادی میں مزید بڑھ جائے گی جس میں ۴۲۵ ملین ہندوستانی بھی ہوں گے۔

آبادی کی روک تھام

گرچہ بھارت دنیا کا پہلا ملک ہے جس نے قومی خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام ۱۹۵۱ء میں شروع کیا تھا۔ اس کے بعد بہت سارے ترقی پذیر ملکوں مثلاً چین سری لنکا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا وغیرہ نے بھی اسے شروع کیا اور آبادی کی روک تھام میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اصل میں ۱۹۸۹ء میں چین میں آبادی میں اضافے کی شرح ۱٫۴ فی صد اور انڈونیشیا میں ۱٫۵ فی صد تھی قومی صحت پالیسی جسے ۱۹۸۳ء میں پارلیمنٹ کے ذریعہ شروع کیا گیا تھا۔ اس کے تحت جو کوششیں کی گئی تھیں وہ بار آور ثابت ہوئیں اس سے بچوں کی شرح پیدائش اور شرح اموات میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا۔ اعداد کی جو آخری فہرست ملی تھی اس کے مطابق شرح اموات گھٹ کر ایک ہزار میں ۱۰٫۲ فی صد تک پہنچ گئی مگر شرح پیدائش میں ہزار میں ۳۰٫۵ فی صد کا اضافہ ہو گیا۔ کچھ دوسرے ایسے بھی اعداد ملے جن کا جواب فوری طور پر حاصل کرنا مشکل ہے۔ بھوک، افلاس اور غریبی سے مارے ہوئے لوگوں کی تعداد ہندوستان میں اس وقت بڑھ کر ۱۷۰ ملین ہو گئی ہے۔ دنیا بھر میں ناخواندگان کی تعداد بڑھ کر ۹۰۰ ملین ہو گئی ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت یہ تعداد ۴۹۲ ملین ہے۔

سابق وزیر اعظم آنجہانی مسز اندرا گاندھی نے آبادی کی روک تھام کے لیے بہت کام کئے اور انھوں نے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دیگر ترقیاتی کاموں میں، اسے بھی سرفہرست رکھا۔ انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کو ایک تحریک کی صورت عطا کر دی۔ ان کی انھیں کوششوں کو تسلیم کرتے ہوئے یونائیٹڈ نیشنز نے انھیں اپنے "پاپولیشن ایوارڈ" سے نوازا تھا۔ اس سے ملک کا وقار بڑھا تھا مگر ساتھ ہی اس نے ہم پر ایک بڑی ذمہ داری کا بوجھ بھی ڈال دیا۔

تعلیمی پروگرام برائے آبادی کا تاریخی پس منظر

تعلیمی پروگرام برائے آبادی اور برائے ذرائع ابلاغ کا ایک مختصر سا تاریخی پس منظر یہاں بیان کیا جارہا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں تعلیمی پروگرام برائے آبادی کا خاکہ یونیسکو کے علاقائی دفتر کے ورکشاپ میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد طالب علموں کی مدد کرنا، نوجوانوں اور بالغوں کے درمیان باہمی تعلقات اور ہم آہنگی پیدا کرنا۔ معیار زندگی کو بہتر بنانے میں ان کی شمولیت حاصل کرنا اور ترقیاتی کاموں کو فروغ دینا وغیرہ تھا۔

۱۹۷۳ء میں ایک چلتی پھرتی علاقائی پارٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا کام تعلیم برائے آبادی اور اس کے زندگی پر ہونے والے اثرات کے بارے میں گھوم گھوم کر لوگوں کو باخبر کرنا تھا یہ ٹیم یو۔ این۔ ایف۔ پی۔ اے کی مالی امداد سے قائم ہوئی تھی۔ اس کے سارے پروگرام اور کاموں کو علاقائی مشاورتی "سیمنار" میں طے کیا جاتا تھا اور اس کی نظر ثانی بھی اسی میں کی جاتی تھی۔

اس وقت قومی تعلیمی پروگرام برائے آبادی کو ایشیا میں ۱۵ ممالک میں، اور بحرالکاہل کے دس ممالک میں روبہ عمل لایا جا چکا ہے۔ اس کام کے لئے مالی

B 2/18، ڈی۔ ڈی۔ اے فلیٹس منیرکا۔ نئی دہلی

اور تکنیکی امداد یو۔ این۔ ایف۔ پی۔ اے اور یونیسکو فراہم کر رہے ہیں۔ بہت سے ملکوں نے اس کام کے لیے نئے طرزِ عمل کا سہارا لیا ہے تاکہ اس کا فائدہ جلد از جلد اور براہِ راست ہو سکے۔ اس کے لیے انہوں نے کو کریکولر سرگرمیاں، اسٹریٹ پلے / نکڑ ڈرامے، گاؤں کے لیے اسکیمیں اور تعلیمی لیباریٹری برائے آبادی جیسی چیزوں کو شامل کیا ہے۔

تعلیم برائے آبادی اور معیارِ زندگی

یہ حقیقت پوری طرح مان لی گئی ہے کہ غریبی، ناخواندگی اور آبادی میں اضافہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ایسے خطرناک دائرے کی شکل اختیار کر بیٹھتے ہیں جو ایک دوسرے کو قوت بخشتے ہیں۔ اسی طرح خطرناک دائرہ کو توڑنے کے لیے ہمیں بہت سارے سماجی توہمات کو توڑنا پڑے گا۔ حالاں کہ یہ کام مشکل دکھائی دیتا ہے پھر بھی اسے کرنا ہی ہوگا۔ بڑھتی ہوئی آبادی سے ترقیاتی کاموں میں بہت رکاوٹ آتی ہے۔ اس سے غریبی میں اضافہ ہوتا ہے، ماحولیاتی گندگی بڑھتی ہے، ایندھن اور پانی کی قلت ہوتی ہے زمین گھٹتی جاتی ہے، جنگل کی تباہی ہوتی ہے اور شہروں میں بھیڑ بڑھتی ہے جس کی وجہ سے بڑے بڑے سلم بننے لگتے ہیں۔ گاؤں سے شہر کی جانب بڑے پیمانے پر ہجرت ہوتی ہے بے روزگاری بڑھتی ہے رہنے کے لیے مکانوں کی کمی ہو جاتی ہے، عورتوں کا رتبہ گھٹتا ہے، کم عمری میں حاملہ ہوتے، نوزائیدہ بچوں کی موت، نشے لینے کی عادت کے ساتھ ایڈز ہونے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔

تعلیم برائے آبادی کے عملی میدان میں سماجی اعتبار سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں بہ حیثیت انسان ہونے کے انسانی زندگی کے تقدس اور بنیادی ترقی کی ضمانت، جو سبھی افراد کو حاصل ہے اسی کے مطابق تعقل کی روشنی میں دیکھا جا رہا ہے۔ چھوٹا خاندان رکھنے کی پسند کو سماجی اور قومی مفاد کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ اس لیے تعلیم برائے آبادی کو ترقی کی سیڑھی ہی سمجھنا چاہئے جو ہماری سماجی قدروں کے نظام میں بھی تبدیلی پیدا کرتی ہے اور ساتھ ہی عوام کے اندر بیداری کی لہر پیدا کرتی ہے، بڑھتی ہوئی آبادی کے مضر اثرات سے انھیں باخبر کرتی ہے اور اس کی روک تھام سے جو معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوں گی اور اس سے معیارِ زندگی بہتر ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ ملک اور قوم کی بھلائی ہوگی، ان کی طرف بھی دھیان مرکوز کراتی ہیں۔

اعلا تعلیم میں پاپولیشن ایجوکیشن

اعلا تعلیمی نظام کے اندر تعلیم برائے آبادی کو اداروں کی شکل دے کر ممکن بنانے میں مرکزی وزارت برائے صحت، خاندان اور بہبود اور یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے اپنی رہنمائی فراہم کی ہے۔ انہیں دو اداروں نے باہمی طور پر اس خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ آبادی کی جسامت، ترقی اور افراد کے معیارِ زندگی میں ایک نازک رشتہ ہے۔ اسے کالجوں، یونیورسٹیوں کے ایکس ٹینشن پروگرام کی کریکولر، کو کریکولر سرگرمیاں جو مختلف کمیونٹی کے درمیان ہوتی ہیں، کے ذریعہ واقف کرانا چاہیے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یو۔ جی۔ سی نے تعلیمی کلب کھول کر تمام ۱۴۰ یونیورسٹیوں اور ۵۶۰۰ کالجوں کو اس پروگرام کے تحت شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔

آبادی کا کلب

یہ آبادی کا کلب مختلف اداروں کے طالب علموں پر مشتمل ہے۔ یہ طالب علم اپنی قوت اور وقت لگا کر مناسب سرگرمیوں کے ذریعہ کالج کے نوجوانوں اور ان کے ذریعہ معاشرے میں ماحولیات کے بارے میں بیداری پیدا کرتے ہیں۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہیے کہ بہت سارے مسائل جو ہماری زندگی سے متعلق ہیں مثلاً پیداوار، تحفظ اور اچھا طرزِ زندگی، یہ سب عام مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم برائے آبادی کی سرگرمیوں میں اگر کسی ادارے کی مدد لی جائے تو اس سے بیداری پیدا کرنے میں آسانی ہوگی، ساتھ ہی ان سطحوں پر جہاں انتخاب کرنے میں اطلاعات کی مدد بخوبی لی جا سکے اور ان انتخابات کو زندگی کی اعلا قدروں کے حصول کے لیے بہ تدریج استعمال کیا جائے، سہولت بھی حاصل ہوگی۔

چند اہم مقاصد جو تعلیم برائے آبادی کی سرگرمیوں کے لئے مدِ نظر رکھنے چاہئیں، مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) صرف دو ہی بچے رکھنے کی حوصلہ افزائی۔
(۲) شادی کے لیے عمر میں اضافہ۔
(۳) مرد عورت کے رتبہ میں برابری۔
(۴) اسپیسنگ (SPACING)
(۵) عورت کا رتبہ۔
(۶) شوہر بیوی کے درمیان ہم آہنگی۔
(۷) یونیورسل اور امیونائزیشن پروگرام
(۸) ماں اور بچوں کی صحت کی دیکھ بھال کا پروگرام۔
(۹) یونیورسل خواندگی۔
(۱۰) اطلاعات اور خدمات تک رسائی۔
(۱۱) بنیادی انسانی حقوق سے خود آگہی۔

مندرجہ بالا مقاصد کی روشنی میں تعلیم برائے آبادی کو مسائل پر مبنی پروگرام کے عنوان کے تحت تفویض کرنا چاہیئے تاکہ اس ترقیاتی پروگرام میں ہر فرد کی شمولیت ہو سکے۔

پاپولیشن ایجوکیشن اور ذرائع ابلاغ

یونیورسٹیوں اور کالجوں کے تعلیمی کلبوں کے ذریعہ منعقد کیے جانے والی تعلیمی سرگرمیاں برائے آبادی کے علاوہ، اس کام میں دوسرے ذرائع ابلاغ بھی کافی مدد فراہم کر رہے ہیں، جس سے آبادی اور معیارِ زندگی

باقی صفحہ ۳۲ پر

سنگھامترا / بھاپریہ

بال مزدوری کے مسئلے سے نمٹنے میں

بنیادی تعلیم کا رول

اس بات سے قطعی انکار کی گنجائش نہیں، بلکہ بہتوں کی رائے بھی یہی ہے کہ غریبی ہی بچہ مزدوری یا "بال مزدوری" کا اصل سبب ہے تاہم بہت سے بچے اس لئے بھی کام کرتے ہیں کہ انہیں کچھ اور کرنے کے لیے نہیں ہے اسکول یا تو دستیاب نہیں اور اگر ہیں تو بہت مہنگے ہیں۔ مغربی ملکوں کے برخلاف ہندوستان میں لازمی تعلیم ایک ایسا قانون ہے جو کتابوں میں تو ضرور ہے مگر اس سے زیادہ تر صرف نظر کیا جاتا ہے۔ نظریاتی طور پر تعلیم مفت تو ہے مگر پڑھنے یا پڑھانے والوں کو کتابیں خود ہی خریدنا پڑتی ہیں۔ کتابوں کی خریداری سے بچنے کے لیے بچوں کو اسکول ہی نہیں بھیجا جاتا۔

بال مزدوری کی اصطلاح صرف ان بچوں پر ہی عاید نہیں ہوتی جو کسی کل کارخانے میں کام کرتے ہیں بلکہ یہ اصطلاح ان بچوں پر بھی عاید ہوتی ہے جو ایسے پیشوں سے منسلک ہیں جہاں ان کی جسمانی، ذہنی اور سماجی ترقی کو خطرہ لاحق ہے۔

مسئلہ:

بال مزدوری ایک سماجی و معاشی مسئلہ ہے اس کے اصل وجوہات غریبی، بڑے بڑے کنبے، لازمی تعلیم کا مہیا نہ ہونا، ناخواندگی اور جہالت کا ہونا وغیرہ ہیں۔

بچوں کے استحصال کے کئی اسباب اور بھی ہیں مثلاً گاؤں کا اجڑ جانا، دیہی علاقوں میں کھیتی باڑی کے کام کا ختم ہونا، دیہی کاریگروں کا اپنے یہاں کے وسائل سے محروم ہو جانا وغیرہ۔

بھارت میں جو بچے اسکول نہیں جاتے انہیں مویشیوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ چھوٹے بچوں کو سنبھالنا پڑتا ہے، جلانے کے لئے لکڑیاں اکٹھا کرنی پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ کھیتوں میں کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ ان میں کچھ بندھوا مزدور بھی ہیں۔ بچے چائے کے ہوٹلوں میں، ریسٹورینٹ میں اور متوسط طبقے کے گھروں میں بطور نوکر بھی کام کرتے ہیں ان میں سے کچھ تو جسم فروشی کرنے لگتے ہیں، کچھ گلیوں اور سڑکوں پر آوارگی کرنے اور بھیک مانگنے لگتے ہیں یا پھر کوڑے دانوں سے شیشی، بوتل اور دوبارہ بکنے والی چیزیں چننے لگتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی تعداد ان چھوٹے کارخانوں میں کام کرتی ہے جہاں قالین، ماچیس بنانے، سگریٹ، پیتل کے برتن، ہیرے، شیشے کے سامان، کپڑا، ہینڈلوم کپڑا، کڑھائی کنگن اور روایتی طرز کے ہاتھوں سے بنے ساز و سامان تیار ہوتے ہیں۔

نظر انداز کئے ہوئے فرد

اسکول میں حاضری کی کمی کا مطلب بال مزدوری میں زبردست اضافہ ہونا ہے چھ سے چودہ سال کے ۸۲ ملین بچے جس میں آدھی تعداد ہندوستانی بچوں کی ہے، اسکول نہیں جاتے۔ اس طرح ہندوستان ناخواندہ اور مزدوری کرنے والے بچوں کو پیدا کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے، جہاں ابتدائی اسکولی تعلیم لازمی نہیں ہے اور نہ ہی ایسے سرکاری افسران ہیں جو گاؤں گاؤں میں جا کر یہ دیکھیں کہ بچے اسکول جاتے بھی ہیں کہ نہیں۔ اور نہ یہاں ایسا قانون ہے جو ان والدین کو اپنی گرفت میں لے جو اپنے بچوں کو اسکول سے نکال لیتے ہیں۔ صرف دس میں سے چار بچے ایسے ہوتے ہیں جو چار سال تک اسکول میں رہ پاتے ہیں اور فرسٹ گریڈ تک پہنچ پاتے ہیں جو کم سے کم لازمی خواندگی کا معیار ہے۔ اس غیر معمولی ڈراپ آؤٹ کا نتیجہ ہے جس پر تعجب کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں کہ یہاں خواندگی کی شرح بہت کم ہے یعنی صرف ۵۲ فی صد۔ لاکھوں مزدور بچے ایسے بھی ہیں جو غیر انسانی حالتوں میں رہ رہے ہیں، مگر ہمارے قومی منصوبوں میں انہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے ان میں دو کروڑ سے زائد ایسے بھی ہیں جن کی عمر ۱۴ سال سے کم ہے۔ یہی استحصال زدہ بچے گھریلو معیشت میں ۲۳ فی صد کا اضافہ کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ ہمارے ترقیاتی منصوبوں میں معدوم ہیں۔

آئی۔ ایل۔ او۔ کنونشن اور بھارت

بال مزدوری بھارت میں غیر قانونی نہیں ہے۔ گرچہ کل کارخانوں میں بچوں کو نوکر رکھنے پر پابندی عائد ہے مگر ان ہی بچوں کے زنانے اور دیہی کارخانوں میں کام کرنے پر کوئی ممانعت نہیں ہے، جہاں

کے حالات جیسے کارخانوں سے اور بھی بدتر ہیں۔ ہمارے ملک میں نچلی سطح پر عمر کی کوئی متعینہ حد نہیں ہے۔ نتیجتاً بہت ہی کم عمری میں بچوں کو نوکری پر رکھ لیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۷ء کے آئی۔ ایل۔ او۔ کنونشن میں یہ قانون پاس کیا گیا تھا کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کے کسی بھی فرد کو ایسے کسی بھی پیشہ پر لگایا نہیں جائے گا جو صحت کے لیے مضر ہو بھارت نے اس قانون پر اب تک دستخط نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۴ سال سے کم عمر کے بچوں کو بلا امتیاز و تفریق ایسے تجارتی کاموں پر لگایا جا رہا ہے جو ان کی ذہنی اور جسمانی صحت کے لئے قطعی مضر ہیں۔

بنیادی تعلیم کا رول

کسی بھی ملک میں بال مزدوری کا خاتمہ کامیابی کے ساتھ تب تک نہیں ہو سکتا جب تک تعلیم کو وہاں اولاً لازمی قرار نہ دیا گیا ہو۔ بچے جب تک آزاد رہیں گے اور اسکول نہیں جائیں گے، تب تک وہ بال مزدور بننے سے بچ نہیں سکتے۔ جاپان نے ۱۸۷۲ء میں بنیادی تعلیم کو لازمی بنا دیا تھا حالاں کہ اس وقت وہ ایک غریب ملک تھا۔ ۱۹۱۰ء تک ۹۸ فی صد بچے جن کی عمر چھ سے تیرہ سال کے درمیان تھی اسکول جانے لگے تھے۔ یہی صورت حال چین کی بھی تھی۔ ۱۹۴۹ء میں صرف ¼ بچے ہی پرائمری اسکولوں میں تھے مگر ۱۹۸۲ء تک یہ تعداد بڑھ کر ۹۳ فی صد ہو گئی جس میں ۷۰ فی صد بچے چھٹے گریڈ کو مکمل کر رہے تھے۔ ایسے تمام ملکوں میں وہاں کی حکومتوں نے تعلیم کو فرض مانا تھا۔ بجائے اسے محض حق سمجھنے کے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ بچے اسکول جائیں، خواندہ بنیں اور تب تک مزدور بننے سے بچے رہیں جب تک کہ اس لائق نہ ہو جائیں۔ حالاں کہ یہ ممالک سیاسی اور معاشی نقطۂ نگاہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں تاہم ان کی حکومتوں نے اس وقت یہ کام کیا جب آبادی کا زیادہ تر حصہ غربت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بین اقوامی سطح پر بنیادی تعلیم کے تئیں سنجیدہ تھے۔ مغرب میں بھی تمام ملکوں نے اُس وقت ہی بنیادی تعلیم کو لازمی بنا دیا تھا جب صنعتی انقلاب رونما بھی نہیں ہوا تھا۔

اندازِ نظر

کسی بھی ہندوستانی حکومت نے تعلیم کو لازمی بنانے کے لئے پیش قدمی نہیں کی۔ ۱۹۸۵ء میں ایک کمیشن بنایا گیا تھا جس کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ نئے سرے سے ہندوستان میں تعلیم کی حالت پر نظر ڈالے۔ اس نے یہ بھی صلاح نہ دی کہ اسکول کی پڑھائی کو لازمی قرار دیا جائے — ہندوستان میں موجودہ تعلیمی اداروں نے کبھی بھی لازمی تعلیم کے لئے زور نہ ڈالا اور نہ ہی مذہبی پیشواؤں، سیاسی لیڈروں، سوشل ورکروں اور ٹریڈ یونینوں نے اس کی طرف دھیان دیا۔ بھارت کے سرکاری افسران اور رہنماؤں نے بھی لازمی تعلیم کو مسترد کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ غریب خاندان مزدور ہی چاہتے ہیں تاکہ خاندان کی آمدنی کو بڑھا سکیں۔ ان کا اس بات پر یقین ہے کہ جلد سے جلد مزدور بن جانا ہی قابل قدر ہے بہ نسبت تعلیم حاصل کرنے کے۔ کیوں کہ کام کرنا ہی ایک تجربہ حاصل کرنے اور کچھ سیکھ جانے کے برابر ہے۔ جب تک غریبی دور نہیں کی جائے گی تعلیم بھی لازمی نہیں ہو سکتی۔ بھارت میں سبھی لوگوں کی یہی رائے ہے کہ اگر غریبوں کو بھی تعلیم مہیا ہو جائے گی تو بےروزگاری میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ جس سے سماجی اور سیاسی خلفشار بھی پیدا ہو جائے گا۔ نچلے طبقے کے بچوں کو دماغ کے بجائے ہاتھ سے کام لینا ہی سیکھنا چاہئے ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کوئی بھی ہنر سیکھنا آسان ہے بہ نسبت اسکول جا کر تعلیم حاصل کرنے سے اور ہنر کسی بھی پیشہ کو اختیار کر لینے سے بہ آسانی آجاتا ہے۔

والدین کا طرزِ فکر

والدین بچوں کو اسکول نہ بھیجنے یا وہاں سے انھیں نکال لینے کے، جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں، جو اسباب بیان کرتے ہیں وہ اسکول کے اخراجات، بچوں سے حاصل ہونے والی معاشی مدد کی ضرورت، گھریلو کام کاج میں ہاتھ بٹانے اور چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کرنے پر مشتمل ہیں۔ لڑکیاں روایتاً اسکول نہیں جاتیں، اور مزدور بچے خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتے۔ پرائمری فیلڈ ریسرچ جو ۱۹۸۸ء میں بی۔ ایم۔ دنیش کے ذریعہ "بچوں کی اقتصادی سرگرمیاں"۔ (ایکونومک ایکٹی وٹیز آف چلڈرن) کے موضوع پر کی گئی تھی اور ریسرچ کرناٹک کے دیہی دکھشنا کنڑا ضلع کے تین گاؤں میں کی گئی تھی۔ اس سے پتا چلا کہ وہاں کے ان کنبوں میں جہاں بہتیرے بچے ہیں، پڑھائی اور کام دونوں کو یکساں طور پر بڑھاوا ملا ہے۔ بڑے بچے چھوٹے بچوں کی اسکول اور گھر کے کاموں میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ جتنی زیادہ تعداد میں بچے ہوں گے اسی قدر کام بھی ہر ایک بچے کے ذمے ہوگا۔ پڑھے لکھے کنبے کے بالغ افراد اسکول جانے کی شرح کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اور بچوں کے اندر سے کاہلی پن کو دور کرتے ہیں۔ بقول دنیش اسکول جانے کی شرح مختلف ذات و برادری میں مختلف ہوتی ہے۔ اس کا اثر مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ گھر پر رہ کر بیڑی بنانے والے مسلمان اپنے لڑکوں کو گھر کے کام و کاج میں لگے رہنے کی ہی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مگر مشاہدہ سے یہ پتا چلا ہے کہ مسلم بچوں کے اندر شیڈیولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب بچوں کے مقابلے میں زیادہ کاہلی ہوتی ہے۔ دنیش نے یہ بھی دیکھا کہ سب سے اہم اور اوّل خرابی جو بال مزدوری کے

کے باعث پیدا ہوتی ہے وہ ہے بچوں کی صحت اور تعلیم پر اس کا برا اثر پڑنا۔ تعلیم کی کمی اور ناخواندگی کے باعث صرف بچوں پر ہی اس کا برا اثر نہیں پڑتا بلکہ پورے سماج کو براہ راست یا بالواسطہ نقصان پہنچتا ہے بالغ افراد کی ایک بڑی تعداد نے یہ کہا کہ وہ بچوں کو تعلیم سے محروم رکھنے پر اس لیے مجبور ہیں کہ وہ تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ دوسرے، بچے ان کے کام کاج میں بالواسطہ بہت مددگار ہوتے ہیں۔ بہت سے والدین نے تعلیم کی اہمیت کو مانا ہے مگر وہ بچوں سے حاصل ہونے والی مدد کا نقصان بھی اٹھانا پسند نہیں کرتے۔ ان میں بہت سے لڑکیوں کی تعلیم کو اتنا ضروری نہیں سمجھتے جتنا کہ لڑکوں کی۔ لہٰذا ان میں سے کوئی بھی لڑکے کی بجائے لڑکی کو اسکول بھیجنا پسند نہیں کرتا تاکہ لڑکا ہی تعلیم سے محروم نہ رہ جائے۔ جن والدین کے انٹرویو لیے گئے ان میں سے اکثریت نے اس بات پر یقین دہرایا کہ بچے انہیں مالی مدد پہنچانے میں اصل مددگار ہیں۔

اعلا تعلیم پر زور

بہت سے ترقی پذیر ملکوں کے برخلاف نمایاں طور پر ہندوستان میں تعلیمی بجٹ کا زیادہ حصہ اعلا تعلیم کے لیے خرچ کیا جاتا ہے اور بنیادی تعلیم کے لیے کم۔ جو دوسرے ترقی پذیر ملکوں سے بہت کم ہوتا ہے۔ اعلا تعلیم کے لئے زیادہ خرچ کرنے سے صرف متوسط طبقے ہی کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ ان اکیس ترقی پذیر ملکوں میں سے بھارت مصر کے بعد دوسرے نمبر پر آتا ہے جہاں کے نوجوان اعلا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مگر جہاں تک بنیادی تعلیم کے لئے اسکول میں حاضر ہونے والوں کے فی صد کا سوال ہے وہاں ہندوستان کا نمبر بارہواں آتا ہے۔ ورلڈ ڈویلپمنٹ رپورٹ (۱۹۹۰) کے مطابق جنوب ایشیائی ملکوں میں ۹۵ر۰ فی صد جی، ڈی، پی (G DP) بنیادی تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ یعنی پوربی ایشیائی ملکوں کے مقابلے میں ۴۴ر۱ فی صد، ذیلی سہارائی افریقہ میں ۴۴ر۱ فی صد، مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں ۰۵ر۲ فی صد۔

لازمی تعلیم فراہم نہ کرنے سے نتیجہ بہت ہی خراب نکل رہا ہے۔ جب تک والدین اپنے بچوں کو مزدور بننے سے نہیں روکیں گے، آبادی کی رفتار پر بھی قدغن نہیں لگ سکتی۔ علاوہ ازیں عورتوں کی تعلیم اور بچے پیدا ہونے کی شرح میں ایک مکمل رشتہ بھی ہے۔ ہندوستان کی ۷۵ فی صد عورتیں ناخواندہ ہیں۔

امید کی کرن

اب بھارت میں بال مزدوری کے خلاف بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اس کے لیے حکومت اور رضاکار تنظیمیں کام کر رہی ہیں جو بچوں کو اچھا مستقبل فراہم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ سی، آر، ای، ڈی، اے (CREDA) ایک ایسی تنظیم ہے جو ہندوستان میں کام کر رہی ہے۔ اس نے بال مزدوروں کو مرزا پور میں قالین بننے والے کارخانوں سے بچانے کی شروعات کر دی ہے۔ اس طرح بال مزدوری پر روک لگانے کی زبردست کوشش ہوئی ہے۔ اس تنظیم نے دس ایسے اسکول کھولے ہیں۔ جہاں تعلیم کے ساتھ کھانا بھی دیا جاتا ہے تاکہ بچے بال مزدور بننے سے بچ جائیں یہاں نہ صرف بچوں کو تعلیم اور کھانا ہی دیا جاتا ہے بلکہ سی، آر، ای، ڈی والوں نے ایک سو روپے کا وظیفہ بھی بچوں کو دینا شروع کر دیا ہے اور یہ سب چیزیں قالین کے کارخانوں کے مالکان کی عطا کی ہوئی اجرت سے زیادہ ہے۔

مشورے

یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ حکومت بنیادی تعلیم کو لازمی بنائے۔ لازمی تعلیم کو شروع کرتے وقت کچھ ایسے تادیبی اقدام بھی کرے جس سے بچوں کے لیبر مارکیٹ میں داخلہ پر پوری پابندی لگ جائے اور والدین کے ذہن میں ایک فرض کا احساس بھی جاگے۔

بچوں کو کام کرنے سے بچانے کے لیے کچھ مالی مدد بھی دینی چاہیے تاکہ حالات بدلیں مگر یہ مالی امداد صرف دو بچوں کی حد تک ہی فراہم کی جائے تاکہ اس کا اثر الٹا نہ پڑے اور بچوں کی پیدائش کی شرح میں اس وجہ سے اضافہ نہ ہو جائے۔ ان علاقوں میں جہاں بال مزدوری کی لعنت بڑے پیمانہ پر موجود ہے وہاں اسکول کی تعلیم کے بعد بچوں کو دست کاری اور پیشہ ورانہ ہنر بھی سکھایا جائے۔

بچے قوم کا بے بہا خزینہ ہیں۔ انہیں کاموں کے لئے مجبور نہ کیا جائے جس سے ان کی تعلیم اور صحت دونوں پر برا اثر پڑے۔ اور ان کی ترقی کے راستے مسدود ہو جائیں ●

بقیہ: دنیا کو درپیش سب سے بڑا چیلنج

ایک بڑی تعداد مانع حمل طریقوں کو اپناتی ہے لیکن اصل جنگ ہمیں اپنے دیہی علاقوں میں لڑنی ہوگی، ہمیں انھیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں کرانا ہوگی کہ ہماری اور ہمارے ملک کی ترقی اور خوشحالی ہمارے کنبے کے محدود ہونے میں ہی مضمر ہے۔ ●

اہلِ قلم حضرات

اب ہم قدرے ضخیم مضامین بھی ارسال کر سکتے ہیں کیونکہ "یوجنا" کے صفحات میں اضافے کے باعث اب طویل مضامین بھی شائع کیے جا سکتے ہیں۔
براہ کرم کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط تحریر کریں۔
(ادارہ)

نور اللہ خاں

بڑھتی ہوئی آبادی ـــــ

دنیا کو درپیش سب سے بڑا چیلنج

ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کا دوسرا سب سے بڑا کثیر آبادی والا ملک ہے۔ یہاں دنیا کی ۱۶ فی صد آبادی عالمی زمینی رقبے کے صرف ۲٫۴ حصے پر آباد ہے۔ اس طرح ہندوستان کی آبادی میں ہر سال ایک کروڑ ۷۰ لاکھ افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے جو کہ آسٹریلیا کی کل آبادی کے برابر ہے۔ اگر ۲٫۱۴ فی صد سالانہ کا آبادی کا یہ اضافہ اسی طرح سے جاری رہا تو آئندہ ۳۵ سالوں میں ہماری آبادی دوگنی ہو جائے گی کیوں کہ ہماری آبادی اس مدت کے پہلے ہی سال کے وسط تک ۹ کروڑ کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اگر آبادی کی موجودہ شرح اضافہ برقرار رہی تو اکیسویں صدی میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہماری آبادی ایک ارب تک پہنچ جائے گی۔

آبادی میں توقع کے لحاظ سے کہیں زیادہ تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ پوری دنیا کی آبادی اس وقت ۵٫۸ ارب ہے۔ آبادی کے ایک ارب سے دو ارب تک پہنچنے میں ۱۲۳ سال لگے ہیں جب کہ تین چار اور پانچ ارب تک پہنچنے میں ۳۲ سال، ۱۴ سال اور ۱۳ سال ہی لگے اور چھ ارب تک پہنچنے میں تو صرف ۱۱ سال ہی لگیں گے۔ توقع ہے دنیا کی آبادی ۱۹۹۸ء تک چھ ارب ہو جائے گی۔ اب سے کر ۲۰۰۰ء کے درمیان ترقی پذیر ممالک کی آبادی میں ۳۲ فی صد کا اضافہ ہوگا۔ دوسری طرف صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک کی آبادی میں صرف ۴٫۷ فی صد کا اضافہ ہوگا۔

آج آبادی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے وہ پوری دنیا کے لیے ایک زبردست چیلنج ہے۔ آبادی میں لگاتار اضافے نے وسائل میں کمی کا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ آبادی میں یہ مسلسل اضافہ مسئلہ ہی نہیں بلکہ دیگر تمام مسائل کی جڑ ہے۔ ماہرین ماحولیات، آبی فضائی اور شور سے متعلق ماحول کی خرابی کی اصل وجہ اضافۂ آبادی کو ہی قرار دیتے ہیں اور اس کے ازالے کے لیے منجملہ دیگر اقدامات کے شجرکاری کے پروگراموں کو تیزی سے بڑھانے پر زور دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر ہم نے اپنی آبادی میں اضافے کو نہیں روکا تو ہماری تمام تر ترقیاتی کوششیں ناکام ہو جائیں گی اور غریبی، بھوک، افلاس، بیماری کو دور کرنے اور اپنے عوام کو سماجی انصاف اور برابری فراہم کرنے کے ہمارے تمام خواب ادھورے رہ جائیں گے۔ افلاس و غربت اور آبادی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

بڑے شہروں کی تعداد اور ان کے سائز میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ بڑے شہر ۵۰ لاکھ یا اس سے زیادہ آبادی والے شہری مراکز ہیں۔ اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ء تک ۳۰ شہروں کی آبادی ایک کروڑ دس لاکھ یا اس سے زیادہ تک پہنچ جائے گی۔ ان میں سے ۱۷ شہر ترقی پذیر ممالک میں واقع ہوں گے۔ آبادی سے متعلق ماہرین کا خیال ہے کہ عالمی آبادی میں زیادہ تر اضافہ ترقی پذیر ممالک میں ہوگا۔

ہندوستان دنیا کا پہلا ملک ہے، جس نے ۱۹۵۱-۵۲ء میں خاندانی منصوبہ بندی کو قومی پروگرام کی حیثیت سے اختیار کیا تھا بلکہ اس سے پہلے ہی اس مسئلے کی سنگین نوعیت کو پہچان لیا گیا تھا اور ۱۹۲۳ء سے کوشش شروع کر دی گئی تھیں۔

آج اس ترقی یافتہ دور میں خاندانی منصوبہ بندی کے انتہائی آسان طریقے رائج ہونے اور اس سے واقفیت ہونے کے باوجود ہندوستان میں ابھی تک صرف پینتالیس (۴۵) فی صد جوڑے ہی خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کو اپناتے ہیں۔ اگرچہ ہمارا ملک مختلف میدانوں میں ترقی کر رہا ہے لیکن بڑھتی ہوئی آبادی کے سبب بیشتر اثرات محسوس نہیں ہوتے اور متعدد مسائل جیسے صحت بخش غذا کی کمی، عام صحت کے معیار میں گراوٹ، مناسب رہائشی انتظامات کی کمی، ماحولیات کی بگڑتی صورت حال اور دیگر سماجی مسائل میں اضافہ ہی نظر آتا ہے۔

طبی ماہرین کے مطابق ضبط تولید کا نظریہ غیر فطری نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانوں کو جانوروں سے اس سلسلے میں سبق لینا چاہیے جو کہ قدرتی زندگی بسر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی تعداد کبھی نہیں بڑھتی۔ کیوں کہ انسان نے قدرت کے اس اصول کو نظر انداز کیا ہے اس لیے اس کی آبادی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ ضبط تولید کا

۱۲۱۳۔ گلی رنگ والی، تلک بازار، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

نظریہ نیا نہیں ہے بلکہ قدیم کتابوں میں بھی اس کا ذکر موجود اور اطبا قدیم نے ضبط تولید کے سلسلے میں مختلف مانع حمل نسخے تجویز کیے ہیں۔

آج ہماری ضروریات زندگی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اخراجاتِ زندگی بھی قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان وجوہات سے ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے گراوٹ کی طرف جا رہا ہے اور اس کی بڑی وجہ ہر گھر میں بچوں کی بہتات ہے جن کی خبرگیری اور تعلیم و تربیت و پرورش و پرداخت کے لیے وقت ہی نہیں مل پاتا جس کی وجہ سے معاشرے میں کرپشن اور بدعنوانی پھیلتی ہے اور لوگ اپنی ضرورتوں کو ہر جائز اور ناجائز طریقے سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے سماج میں لاقانونیت پھیلتی ہے اور جرائم میں اضافہ ہوتا ہے۔

استا یہ ہے کہ اسپتال بھی بنیادی صحت خدمات بڑھتی ہوئی آبادی کو فراہم کرا لینے سے قاصر ہیں کیوں کہ ان کے وسائل بھی محدود ہیں اور وہ بھی مریضوں کی ایک محدود تعداد کو ہی خدمات فراہم کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صحت سے متعلق مختلف انواع خدمات کے لیے جس قدر اخراجات درکار ہیں ان کو محض سرکار نہیں فراہم کرا سکتی جیسا کہ اس سلسلے میں رضاکار اداروں، نجی شعبوں اور مختلف فرقوں کی طرف سے فلاحی کاموں کی ابتدا اور ان اداروں کا تعاون لے کر ہی ہم ان ذمہ داریوں کو نبھا سکتے ہیں۔

آبادی کی روک تھام کی جنگ کو دراصل ہمیں اپنے عوام کے ذہنوں میں جیتنا ہوگا، ان کے ذہنوں میں یہ بیداری پیدا کرنی ہوگی کہ وہ اس بات کو سمجھیں کہ ایک چھوٹا کنبہ ہی صحت مند اور خوش حال کنبہ بن سکتا ہے۔ اگر بچوں کی بہتات رہے گی تو نہ تو ان کو ہم اچھی اور تغذیہ بخش غذا فراہم کرا سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی صحت اور تعلیم کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیکڑوں خاندان تنگ دستی، کم غذائیت، بھوک، افلاس اور بیماری کا شکار ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنی خواتین کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دینی ہوگی کیوں کہ ایک خاتون کی تعلیم سے پورے کنبے اور خاندان کو فائدہ پہنچتا ہے جب کہ ایک مرد کی تعلیم محض ایک فرد کی تعلیم تک محدود رہتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنے پنچایتی راج اداروں کی بھی مدد لینی ہوگی تاکہ ان کے ذریعہ دیہی علاقوں میں ہم اپنی خواتین کو اس بارے میں متحرک اور راغب کرا سکیں اور انھیں اس بات کا احساس دلا سکیں کہ ان کی صحت کے لیے بھی یہ اشد ضروری ہے کہ وہ مانع حمل طریقے اختیار کریں اور اپنے کنبے کو صرف ایک یا دو بچوں تک ہی محدود رکھیں تاکہ ان کو اچھی غذا، اچھی تعلیم و تربیت، اچھا رہن سہن اور بود و باش فراہم کرا سکیں۔

اس سلسلے میں ایک عمدہ مثال حال ہی میں ہمیں "پلس پولیو" تحریک سے ملتی ہے جس میں سرکاری و غیر سرکاری نجی زمروں اور ذرائع ابلاغ سبھی نے اس تحریک کو کامیاب بنانے میں ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ اس تحریک کی کامیابی اور اس سے حاصل کردہ تجربہ ہمیں دوسرے شعبوں اور خصوصی طور پر خاندانی بہبود کے شعبے میں اسی طرح سے سرکاری و غیر سرکاری اداروں اور ذرائع ابلاغ کی مدد لے کر ایسی ہی تحریکیں شروع کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

بنیادی طور پر صحت کسی فرد یا کنبے کی ذمہ داری ہوتی ہے اور حکومت محض ایک امدادی رول ادا کرتی ہے لہٰذا صحت کے بارے میں پہل اور کوشش عوام کی طرف سے ہونی چاہیے تاکہ ان کا طرز زندگی بہتر اور صحت مند ہو۔

دنیا میں کم اور ناقص غذا کھانے والے بچوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ ایک مطالعے کے مطابق ملک کی راجدھانی دہلی میں ہی کوئی ۴۰ فی صد بچے اوسط سے کم وزن رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر آٹھویں بچے کو کم اور ناقص غذا ملتی ہے۔ ہمارے یہاں بچوں کی موت کی شرح ۷۸ فی ہزار ہے۔ اتر پردیش میں، جسے ملک کے ۵ وزیر اعظم مہیا کرنے کا اعزاز حاصل ہے، ۳ فی صد بچے پانچ برس کے ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ یہ سب زیادہ آبادی کے نتائج ہیں۔

شرح پیدائش ان صوبوں میں خاصی کم ہوئی ہے جہاں خواندگی کی شرح اونچی ہے اور پنچایتوں کا اشتراک و تعاون حاصل کیا گیا۔ ہماری قومی پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ ملک میں صدی ختم ہونے سے پہلے ہی صد فی صد خواندگی، مکمل روزگار اور صد فی صد صحت کے انتظامات حاصل ہو جائیں لیکن ان مقاصد کے حصول کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر شادی شدہ جوڑا محض ایک یا دو بچے پیدا کرنے کی پالیسی اختیار کرے۔

آبادی کے سنگین مسئلے سے نپٹنے کے لیے ہمیں اسے سنجیدگی سے لینا ہوگا اور مربوط کوشش کرنی ہوگی۔ سب سے پہلے اپنے دیہی عوام اور بالخصوص خواتین میں بیداری پیدا کرنی ہوگی کہ وہ اس مسئلے کی سنگین نوعیت کو اپنے کنبے اور پورے ملک کی خوشحالی کے لیے سمجھیں اور مانع حمل طریقوں پر عمل کریں۔ اس کام کے لیے ہمیں اپنے دیہی اداروں جیسے پنچایتوں وغیرہ کی بھی مدد لینی ہوگی۔ ایک سہ پہلو طریقہ اختیار کرنا ہوگا جس کی بنیاد خواندگی، تعلیم اور معلوماتی تحریک ہوگی اور اس تحریک کے ذریعہ عوام کا تعاون اور اشتراک حاصل کرنا ہوگا۔ ہر کنبے میں کم از کم ایک فرد کو روزگار مہیا کرنا ہوگا۔ تیسرا یہ کہ ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرنا ہوگی جو دو سے زائد بچے رکھتے ہوں مثلاً انھیں چناؤ میں کھڑے ہونے اور کوئی عوامی عہدہ حاصل کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ جن پروگراموں کا اثر عوام پر براہ راست پڑتا ہے مثلاً خواندگی، خاندانی منصوبہ بندی، عوامی صحت وغیرہ وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ لوگ اپنی مرضی سے ان میں شریک نہ ہوں اور ان سے تعاون نہ کریں اور انھیں کامیاب بنانے کا بہترین ذریعہ عوامی سطح کے ادارے ہیں۔ اس سلسلے میں عوام کو بھی اپنی ذمہ داریوں کو پہچاننا بہت ضروری ہے۔ شہری علاقوں میں کیوں کہ لوگ تعلیم یافتہ ہیں، اس لیے وہاں لوگ چھوٹے کنبے کی افادیت سے بہت اچھی طرح واقف ہیں اور ان کے

باقی صفحہ ۸ پر

خورشید عالم

ہندوستانی معیشت۔ ایک جائزہ

(۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۶ء)

یہ ایک حقیقت ہے کہ آزادی سے قبل ہندوستان اپنی دست کاری، فن اور ہنر کے لیے دور دور تک مشہور تھا اور اسی وجہ سے ہندوستان بین اقوامی بازار میں ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ یہاں سے سوتی، ریشمی، اونی کپڑے، زری، چینی و دیگر اشیا، سابق مشرقی ایشیا، عرب ممالک، سابق مغربی جنوبی افریقہ یورپ اور جاپان جیسے ممالک کو برآمد کی جاتی تھیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے بالخصوص انگلینڈ کے صنعتی انقلاب کے بعد مشینوں کا دور شروع ہوا جس کے نتیجے میں بھارت کی دست کاری صنعتیں متاثر ہونے لگیں اور ہندوستان کا اقتصادی ڈھانچہ چرمرانے لگا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک نے بھارت کی دو صنعتوں پٹسن اور کپڑے کو کافی نقصان پہنچا۔ تقسیم ملک کے نتیجہ میں پٹسن اور جوٹ کے کارخانے زیادہ تر تو ہندوستان کے حصے میں آئے جب کہ ان صنعتوں میں استعمال ہونے والے کچے مال کا پیداواری علاقہ پاکستان کے حصے میں چلا گیا اور صنعت بہت بُرا اثر پڑا۔

ملک کو درپیش اقتصادی مسائل سے نمٹنے اور اقتصادی ترقی کے پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۴۷ء میں ایک تین رکنی اقتصادی کانفرنس منعقد ہوئی، جس کے نتیجہ میں مالکان اور مزدوروں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا کہ تین سال تک خاموشی کا ماحول بنا کر اقتصادی ترقی میں پیش رفت کی جائے۔ یکم جولائی ۱۹۴۸ء میں آئی۔ ایف۔ سی۔ آئی (INDUSTRIAL FINANCE CORPORATION OF INDIA) کا قیام عمل میں آیا اور ۶/ اپریل ۱۹۴۸ء کو اقتصادی پالیسی کا اعلان کیا گیا جس سے حکومت کی اقتصادی پالیسی کا نقطۂ نظر واضح ہو کر سامنے آیا۔ اس کے تحت ضروری کچے مال پر لگنے والے ٹیکس میں چھوٹ دی گئی اور نئی صنعتوں کو ایک مقررہ مدت کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں نجی زمرے کی صنعتوں کو لائسنس دیے گئے۔ حکومت کی ان کوششوں سے آزادی کے محض چار سال بعد ۱۹۵۱ء میں اقتصادی انڈکس ۱۱۷/۴ ہو گیا جب کہ ۱۹۴۷ء میں یہ انڈکس ۱۰۰ تھا۔ ۱۹۵۰ء میں پلاننگ کمیشن قائم کیا گیا، اس کے ٹھیک ایک سال بعد ۱۹۵۱ء سے پانچ سالہ منصوبے کا آغاز ہوا۔ ان پانچ سالہ منصوبوں کے ذریعہ اقتصادی ترقی کی رفتار کا اندازہ درج ذیل طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔

پہلا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۵۱-۵۶ء)

اس منصوبے میں زراعت کے پیشے کو اولیت دی گئی۔ اس میں صنعتوں کے پھیلاؤ کے لیے کوئی باضابطہ اسکیم نہیں بنائی گئی اور اقتصادی ترقی کو صرف اشیاء صرفہ جیسے سوتی کپڑوں، چینی، نمک، صابن، وناسپتی، کاغذ، جڑا وغیرہ تک ہی محدود رکھا اور ساتھ ہی پہلے سے قائم صنعتوں کو مزید فعال بنانے کی کوشش کی۔ اس اسکیم کے دوسرے مرحلہ میں المونیم، لوہا، اسپات، سیمنٹ اور بھاری کیمکل وغیرہ کی پیداواری صلاحیت بڑھانے کی کوشش کی گئی لیکن وسائل کی کمی کے سبب ان کوششوں میں تیزی نہیں لائی جا سکی اس کے باوجود سیمنٹ کی صنعتوں نے کافی ترقی کی۔ صنعتی ڈھانچے کو قوت بہم پہنچانے کے لیے نجی زمرے کی کئی صنعتیں شروع کی گئیں ان میں درج ذیل قابل ذکر ہیں: ہندوستان شپ یارڈ، ہندوستان مشین ٹولس، ہندوستان اینٹی بائیوٹیکس، ہندوستان کیبلس، ہندوستان انسیکٹی سائیڈس، چترنجن لوکوموٹر ورکس، سیانیوز پرنٹ ملس اور بھارتی ٹیلیفون وغیرہ۔

پہلے پانچ سالہ منصوبے میں صنعتوں کو فوقیت نہ دیے جانے کے باوجود ان کی پیداواری صلاحیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں تجارتی گراف ۱۱۷/۴ کے مقام پر تھا جو ۱۹۵۵-۵۶ء میں بڑھ کر ۱۳۹ ہو گیا۔ اس اسکیم کے تحت انڈسٹریز میں ۲۳۶ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری ہوئی۔ اس زمرے کی کامیاب کوششوں کے نتیجہ میں ہندوستانی معیشت نے سرمایہ کاری کی بنیاد فراہم کی۔

دوسرا پنج سالہ منصوبہ (۱۹۵۶-۶۱ء)

دوسرے پانچ سالہ منصوبے نے ہندوستان میں صنعتی انقلاب کی داغ بیل ڈالی۔ پبلک سیکٹر کو ترقی کا میر کارواں بنایا۔ ابتدا ترقی کے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر سے ہوئی اور اس کی تمام تر ذمہ داری اس سیکٹر کے سپرد ہوئی، بنیادی ڈھانچے کا عمل

۸/۲ - ۲۳۴، ذاکر نگر۔ نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

شروع ہوا۔ لوہے و اسپات کے عظیم الشان کارخانے و بھٹیاں، بڑی بڑی دیو ہیکل مشینوں کے کارخانے، کل پرزے ڈھالنے کے کارخانے، سڑکیں، ریلوے، ڈاک، تار، ترسیل، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، سائنس و ٹکنالوجی، انجینئرنگ کے ادارے، بڑے بڑے ڈیم، لاتعداد کارپوریشن ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلائے جانے لگے۔

اس اسکیم پر عمل درآمد کے لیے ۱۸۱۰ کروڑ روپے خرچ کیے گئے جس کے بعد ان صنعتوں کو فروغ ملا۔ نجی زمرے میں اسٹیل کے تین بڑے کارخانے بھلائی، راورکیلا اور درگاپور جیسے پسماندہ علاقوں میں غیر ملکی تعاون سے قائم کیے گئے۔ ان علاقوں میں ان کارخانوں کے قیام کا بنیادی مقصد تھا کہ ملک کی صنعتی ترقی کے لحاظ سے پسماندہ علاقوں کی ترقی پر زور دیا جائے اس اسکیم کے دوران جہاں ایک طرف کیمیکل، سوتی کپڑے، پٹ سن، سیمنٹ، چائے، چینی، کاغذ وغیرہ صنعتوں کی پیش رفت ہوئی وہیں کچھ نئی صنعتی اشیاء جیسے بائلر، ٹریکٹر، اسکوٹر، اخباری کاغذ، گندھک، ڈی۔ ڈی۔ ٹی کی کافی تعداد میں پیداوار شروع کی گئی۔ اشیاء صرفہ جیسے سائیکل، پنکھے، سلائی مشین وغیرہ کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوا اور اسکیم کے آخر یعنی ۱۹۵۶ء میں یہ تجارتی گراف ۱۳۹ سے بڑھ کر ۱۹۴ ہو گیا۔ اس اسکیم کے دوران صنعتی پیداوار میں تقریباً ۴۰ فی صد کا اضافہ ہوا۔ اس لحاظ سے اس دوسرے پنج سالہ منصوبے نے معیشت میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا۔

تیسرا پنج سالہ منصوبہ (۶۶۔۱۹۶۱ء)

گزشتہ منصوبوں کی کامیابی کے بعد اس منصوبہ میں صنعتی سرمایہ کاری کے ساتھ ساتھ ٹکنالوجی اور انتظامی امور پر خصوصی توجہ دی گئی۔ بیرونی ملکوں پر انحصار کم کرکے سرکاری زمرے کے ساتھ ساتھ نجی زمرے پر بھی توجہ دی گئی۔ اشیاء صارفین کی پیداوار کی ذمہ داری نجی زمرے کو سونپی گئی۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ادھوری رہ گئی اسکیموں کو اس منصوبے میں فوقیت دی گئی۔ اس کے علاوہ گھریلو صنعتوں کی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے منصوبہ بنایا گیا اور کوشش کی گئی کہ روزگار مواقع کے ساتھ ساتھ صارفین اور اشیائے صرف کی پیداوار میں بھی اضافہ کیا جائے اس مقصد کے لیے ۳۰۰ صنعتی بستیاں بسانے کی اسکیم بنائی گئی۔

لیکن ۱۹۶۲ء میں چین اور ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے ساتھ جنگ نے مختلف اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں دیا اور اسی دوران دو سال کے قحط اور غیر ملکی امداد میں کمی کی وجہ سے پنج سالہ منصوبہ اپنے مقاصد کی تکمیل نہیں کرسکا بلکہ اپنے طے شدہ منصوبے میں حاصل شدہ ہدف اوسطاً ۳۰ فی صد کم رہا۔ اس جنگ کے نتیجہ میں منصوبہ کے آخری سال پہنچتے تک صنعتی پیش قدمی رک گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چوتھے پنج سالہ منصوبہ کو فوراً ہی نافذ نہیں کیا جاسکا اور اسے تین سال کے لیے ملتوی کرنا پڑا۔ اس طرح ۶۹۔۱۹۶۶ء کے درمیان معیشت کو ایک۔ ایک سال کی اسکیموں کے ذریعہ چلایا گیا اور اس کے ذریعہ ایک ایسا ماحول بنانے کی کوشش کی گئی جس سے کہ پنج سالہ منصوبوں کو دوبارہ رو بہ عمل لایا جاسکے۔ ۶۷۔۱۹۶۶ء اور ۶۸۔۱۹۶۷ء صنعتی ترقی کے لحاظ سے متاثر رہے لیکن ۶۹۔۱۹۶۸ء میں صنعتی ترقی نے دوبارہ زور پکڑا اور زیادہ تر صنعتوں کی پیداوار میں اطمینان بخش اضافہ ہوا۔

چوتھا پنج سالہ منصوبہ (۷۴۔۱۹۶۹ء)

اس منصوبے میں پیداواری صلاحیت کو بڑھانے کے لیے ایسا طریقہ اپنایا گیا جس سے درآمد اور برآمد کی حوصلہ افزائی ہو۔ ترجیحی بنیادوں پر نئے صنعتوں کو قائم کیا گیا۔ منصوبے میں صنعتوں پر کل خرچ ۲۸۶۴ر۵ کروڑ روپے ہوئے جب کہ دیہی اور گھریلو صنعتوں کے فروغ پر ۲۴۲ر۶ کروڑ روپے خرچ کیے گئے۔

چوتھا پنج سالہ منصوبہ مقاصد کے اعتبار سے بہت اہم نہیں تھا لیکن پھر بھی منصوبے کی مدت کے دوران متعین کردہ نشانوں سے حاصل کی گئی کامیابی خاصی پیچھے رہی اور ۸ سے ۱۰ فی صد کے صنعتی نشانے پر اوسطاً ۳ر۹ فی صد صنعتی ترقی حاصل کی جاسکی اور تقریباً سبھی طرح کی اشیاء کے پیداواری نشانے کو پورا نہیں کیا جاسکا۔ سب سے دھیمی رفتار اشیاء صارفین کی تھی جیسے سوتی کپڑا، چینی، صابن وغیرہ۔ البتہ درمیانی صنعتیں جیسے کوئلہ، بجلی، کیمیکل، کھاد، سیمنٹ، المونیم وغیرہ کی پیداواری صلاحیت میں قابل ذکر اضافہ ہوا لیکن یہ پیش رفت بھی کوئی اہم رول ادا نہیں کرسکی۔ اس منصوبے میں صنعتی ترقی کی سست رفتاری کے اسباب درج ذیل تھے۔ محدود مانگ، کچے مال کی عدم دستیابی، صنعتی بحران اور کوئلہ کی ضرورت سے بھی کم دستیابی وغیرہ۔ البتہ ۱۹۶۹ء میں حکومت نے بینکوں کو قومیانے کی غرض سے ان کو نجی سیکٹر سے نکال کر اپنی تحویل میں لے لیا۔

پانچواں پنج سالہ منصوبہ (۷۸۔۱۹۷۴ء)

گزشتہ منصوبوں کے ہدف اور کارکردگی کی بنیاد پر اس منصوبہ کو تیار کیا گیا۔ صنعتی خود مختاری کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف کے پہلو کو بھی منصوبہ میں شامل کیا گیا۔ کھاد، کیمیکل، اسٹیل، تیل، کوئلہ، مشین وغیرہ کی صنعتوں کو فوقیت دی گئی نیز درآمد کے دائرہ کو وسیع کرنے اس کی ترقی اور اشیاء صرفہ کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ، ناقابل استعمال اشیاء کی پیداوار پر روک، گاؤں کی سطح پر چھوٹی صنعتوں کی حوصلہ افزائی اور پسماندہ علاقوں کی ترقی کے مقاصد اس منصوبے میں شامل کیے گئے۔

پانچویں منصوبے میں صنعتی ترقی کا ہدف ۷ فی صد سالانہ مقرر کیا گیا تھا اور اس منصوبے کے کل خرچ کا تقریباً ۲۶ فی صد صنعتی ترقی کے لیے خرچ کرنا طے کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود یہ اسکیم صنعتی عمل میں سست رفتاری کو دور نہیں کرسکی اور شروع کے چار سالوں میں صنعتی ترقی کی رفتار ۵ر۹ فی صد تک ہی رہی۔ اس کے بعد ۷۶۔۱۹۷۵ء میں ۱۲ فی صد اور ۷۷۔۱۹۷۶ء میں ۹ر۶ فی صد کی صنعتی ترقی ہوئی۔

چھٹا پنج سالہ منصوبہ (۸۵۔۱۹۸۰ء)

آزادی کے تین دہے ہونے کے بعد صنعتی ترقی کا از سر نو جائزہ لیا گیا اور اسی جائزے کی بنیاد پر اگلا منصوبہ بنایا گیا۔ اس منصوبے میں سرکاری اور نجی دونوں زمروں کی صنعتی ترقی اور پیداواری صلاحیت میں اضافہ کو مقدم رکھا گیا اس کے علاوہ سرمایہ کاری کی صنعتوں کی ترقی، انجینئرنگ اشیاء اور درآمدات پر خصوصی توجہ دینا شامل تھا۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں کل خرچ کا ۲۲ر۱ فی صد صنعتی ترقی پر رہا۔ اس منصوبہ میں اپنائی گئی حکمت عملی

باقی صفحہ ۲۹ پر

فرحت عثمانی

افق ہند کا ایک درخشندہ ستارہ:
وی۔ کے۔ کرشنا مینن

وی۔ کے۔ کرشنا مینن کا شمار بھی آسمان ہندوستان کے قطب نما تاروں میں ہوتا ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ چمکتے رہیں گے اور اس ملک کے عوام کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

۱۹۴۷ء کے بعد تک بھی دنیا کے لیے کرشنا مینن ایک غیر معروف شخص تھے لیکن اس کے بعد دنیا نے دیکھا کہ وہ ہندوستان کے افق پر ایسے عیاں ہوئے کہ اقتدار اور شہرت کی منزلیں تیزی سے طے کرتے چلے گئے۔

کرشنا مینن کا پورا نام وینگالیل کرشنن کرشنا مینن تھا۔ وہ ۳ر مئی ۱۸۹۶ء کو کالی کٹ میں پنیان کارا کے مقام پر ایسے سماج میں پیدا ہوئے تھے، جو مذہب کے لحاظ سے انتہائی کٹر تھا، لیکن خود ان کے اپنے کنبے میں ان کے والد ترقی پسند اور کشادہ ذہن تھے۔ اپنے سماج اور والد کی وجہ سے انھوں نے جمود اور ترقی میں فرق محسوس کیا۔ ان کے والد کا نام کومتھ کرشنا کروپ تھا جو کداتھا ناڈ شاہی خاندان کے ایک شہزادے کے بیٹے تھے۔ وہ خود ایک خوشحال وکیل اور زمیں دار تھے۔ وہ اپنے پیشے کے تئیں انتہائی مخلص اور دیانت دار تھے۔ انھوں نے اپنے صلاحیت اور خوبیوں کی وجہ سے تلیچیری بار کے اعلا لیڈروں میں اپنا ایک مقام بنایا تھا۔ وہ ذات پات کے اختلاف و امتیاز نہیں مانتے تھے اور تہوار کے دنوں میں نچلی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اپنے گھر مدعو کرتے تھے۔ تلیچیری میں میونسپلٹی قائم کرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ دس سال تک اس کے چیئرمین رہے۔ اپنے آخری دنوں میں وہ مستقل کھدر پہنتے تھے۔ وہ ایک حساس قوم پرست تھے۔ ان کی والدہ کا نام وینگالیل لکشمی کٹی اما تھا، جو ایک باکمال موسیقار اور اسکالر تھیں۔ وہ اپنی اچھی فطرت اور بے لوث خدمت کے لیے مشہور تھیں۔ وہ دو بیٹوں اور چھ بیٹیوں کی ماں تھیں۔ کرشنا مینن ان کی اولاد میں تیسرے نمبر پر تھے۔

کرشنا مینن میں اپنے والد کی متعدد خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ بہت کم عمری میں ہی ان میں حب الوطنی کا جذبہ و جوش پیدا ہو گیا تھا۔ کرشنا مینن کے کنبے کے لوگ انھیں اتّا کہتے تھے۔ ان کا بچپن مالابار کے مختلف مقامات پر گزرا۔ ان کی ابتدائی تعلیم تلی چیری میں میونسپل سیکنڈری اسکول اور برینن ہائی اسکول میں ہوئی۔

۱۹۱۰ء میں کرشنا مینن کے گھر کے لوگ کالی کٹ منتقل ہو گئے۔ وہاں نیٹیو ہائی اسکول میں ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، جہاں سے انھوں نے ۱۹۱۳ء میں میٹرک پاس کیا۔ اسی سال انھوں نے زمورن کالج میں داخلہ لیا اور مئی ۱۹۱۵ء تک اسی کالج میں رہے۔ انھوں نے ۱۹۱۵ء میں مدراس یونیورسٹی کا انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کیا اس کے بعد وہ مدراس چلے گئے اور پریذیڈنسی کالج میں داخلہ لیا۔ وہ ایک موثر مقرر کے طور پر مشہور تھے اسکول میں کھیلوں میں وہ صرف بیڈمنٹن کی طرف راغب ہوئے۔ کالی کٹ میں زمانۂ طالب علمی میں ہی ان میں ملک کے امور میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اسی زمانے میں انھیں پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ وہ ایک آزاد ملک میں نہیں رہ رہے ہیں۔ اس طرح ان میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا ہوا اور انھوں نے ایک آزاد ہندوستان کا خواب دیکھا۔ انھوں نے اپنے ملک کے مسائل کے حل تلاش کرنے شروع کر دیے۔ کرشنا مینن کو مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ جون اسٹوارٹ مل ان کے پسندیدہ مصنف تھے۔ انھوں نے مارکس اور اینجلس کا بھی مطالعہ کیا۔ ان کا ذہن ایک جمہوری ذہن تھا۔ وہ قانون کی برتری کے نظریے کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ آزادی انسان کا ایک اضافی فائدہ نہیں ہے بلکہ یہ اس کی اپنی چیز ہے۔

تاریخ کا موضوع کرشنا مینن کے مطالعے کا واحد سب سے اہم جزو تھا۔ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے جب کرشنا مینن مدراس کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے ایسے نظریات اور خیالات بن چکے تھے جن کی بدولت وہ مستقبل میں مدبر اور رہنما بنے۔ مدراس کالج میں انھوں نے ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔

۱۹۲۸ء میں کرشنا مینن نے لندن اسکول آف اکونومکس سے فرسٹ کلاس میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اپنے خاندان کے سب سے چمکدار ستارے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے

سی۔۹۔۴ منٹو روڈ کمپلیکس نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

یونیورسٹی کالج لندن میں داخلہ لیا اور ایک بالکل ہی نئے مضمون نفسیات کا مطالعہ کیا۔ کرشنا مینن کو جانوروں سے کافی لگاؤ تھا۔ وہ ہاتھیوں کے دانت نکلوا کر انھیں گھر میں سجاوٹی چیزوں کے طور پر رکھنے کے سخت خلاف تھے۔ انھوں نے اپنا لباس اپنے والد کے لباس کی مانند رکھنے کی کوشش کی یہاں تک کہ وہ بات چیت بھی اپنے والد کے ہی انداز میں کرتے تھے۔

مدراس میں اپنے قیام کے زمانے میں کرشنا مینن نے ڈاکٹر بیسنٹ کی تحریک میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اس سے چند سال قبل جواہر لال نہرو بھی ہوم رول لیگ کی جانب راغب ہوئے تھے۔ کرشنا مینن نے کالج کی عمارت پر ہوم رول کا جھنڈا لہرایا تھا۔ ان کے اس عمل سے کالج کے انگریز پرنسپل اور اسٹاف کو بہت زیادہ تعجب ہوا تھا۔ کرشنا مینن نے اس زمانے کی ثقافتی، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔ وہ جد و جہد آزادی کے موضوع پر بھی طویل بات چیت کرتے تھے۔ آگے چل کر کرشنا مینن کی اسی عادت کی وجہ سے ان کا شمار اس صدی کے سب سے بڑے مقرر میں کیا جانے لگا۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے بی۔ اے کیا۔ اپنے والد کے اصرار پر انھوں نے مدراس لا کالج میں داخلہ لیا لیکن ایک سیاسی لہر انھیں اس کالج سے باہر لے گئی۔

مدراس سے کرشنا مینن ادیار چلے گئے جو ان کی زندگی کا ایک نیا اور اہم موڑ تھا۔ یہاں انھوں نے اپنا پورا وقت اور اپنی پوری توانائی تھیوسوفیکل سوسائٹی کے زیر اہتمام سیاسی اور سماجی کاموں پر صرف کی۔ کالج کی بین اقوامی خصوصیت نے کرشنا مینن کو نئی جہتیں عطا کیں۔ ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے ایک سیاسی کلب اور نوجوانوں کی تنظیمیں شروع کیں، جن سب میں کرشنا مینن نے انتہائی سرگرم حصہ لیا اور ان کے مقاصد کو فروغ دینے کے سلسلے میں انتہائی جد و جہد کی۔ دراصل پریزیڈنسی کالج کے زمانے سے ہی کرشنا مینن مسز بیسنٹ کے خیالات سے متاثر تھے۔ انھوں نے ہوم رول تحریک کے نظریات کی سرگرمی سے تشہیر شروع کر دی۔

ادیار میں کرشنا مینن نے دھوتی اور کرتا پہننا شروع کر دیا تھا۔ مسز بیسنٹ کے تعلیمی نظام کا مرکز نیشنل یونیورسٹی تھی، جس کے چانسلر رابندر ناتھ ٹیگور تھے۔ مینن نے اس یونیورسٹی میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا اور بعد میں اسی یونیورسٹی میں لکچرر بن گئے۔ انھوں نے اسکاؤٹنگ کی سخت تربیت لی اور ایک قابل اسکاؤٹ کمشنر بن گئے۔ انھوں نے .... مدراس میں پہلے اسکاؤٹ ٹروپ کا اہتمام کیا، جو شہر میں ماڈل ٹروپ بن گیا۔ انھوں نے سائیکل اسکواڈ اور سمندری اسکواؤٹ کا بھی اہتمام کیا۔ اسکاؤٹس کا اہتمام پہلی بڑی ذمہ داری تھی جو کرشنا مینن کے سپرد کی گئی تھی جسے انھوں نے بڑی لگن اور مستعدی سے نبھایا۔ اس کامیابی سے ان میں ایک نیا اعتماد پیدا ہوا۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ مسز بیسنٹ کی قائم کردہ ایک خصوصی تنظیم برادرس آف سروس میں شامل ہو گئے۔

مینن ۱۹۲۰ء میں مالابار واپس آ گئے۔

کرشنا مینن کے والد چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی انھیں کی طرح سے وکیل بنے، لیکن مینن نے وکالت کے پیشے کی بجائے سماجی سرگرمیوں اور سیاسی کام کو ترجیح دی۔ انھوں نے سوشل سروس لیگ قائم کی، جس کا مقصد نوجوان لوگوں کو عوام کی خدمت کرنے کا موقع دینا تھا۔ کرشنا مینن بنیادی طور سے ایک مجتہد تھے۔

۱۹۲۴ء میں کرشنا مینن مزید تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں لندن چلے گئے۔ وہاں بھی انھوں نے اپنے آپ کو زیادہ تر سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رکھا۔ وہ انگلینڈ میں تقریباً تیس سال تک رہے جو ان کی بالغ زندگی کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ سب سے پہلے ایک طالب علم کی حیثیت سے، پھر ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے، اس کے بعد ہندوستان کی آزادی کے لیے مظاہرہ کرنے والے کی حیثیت سے اور آخر میں انڈین نیشنل کانگریس اور پنڈت نہرو کے نمائندے کی حیثیت سے۔ وہ ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر بھی تھے۔

لندن پہنچنے کے بعد کرشنا مینن کو سینٹ کرسٹوفر اسکول میں بطور استاد نوکری ملی جو کہ ایک ماڈل اسکول تھا۔ کرشنا مینن کو پہلی بار ایک غیر ملکی تہذیب سے واسطہ پڑا تھا۔ لندن اسکول آف اکونومکس کے اعزازی فیلو کے طور پر منتخب ہونے والے وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ کرشنا مینن نے پی۔ ایچ۔ ڈی میں بھی داخلہ لیا لیکن اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ اپنا مقالہ مکمل نہیں کر سکے۔

کرشنا مینن نے ۱۹۳۴ء میں قانون کا اپنا مطالعہ مکمل کیا۔ کرشنا مینن غیر معمولی صلاحیت اور طاقت کے حامل انسان تھے۔ انھوں نے بے خوف و خطر ہندوستان کی آزادی کی وکالت کی۔

انگلینڈ میں اپنی زندگی کے پہلے مرحلے کے دوران کرشنا مینن نے لندن میں ہندوستانی طلبہ کے مفاد کو فروغ دینے کے کاز کے لیے بھی اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ گوور اسٹریٹ میں ہندوستانی طلبا کا ہوسٹل ان کی سرگرمی کا مرکز بن گیا تھا۔ سوائے کرشنا مینن کے کسی بھی شخص نے اس صدی میں لندن میں ہندوستانی طلبا کے کاز کے لیے اتنی زیادہ خدمات انجام نہیں دی ہیں۔ وہ ۱۴ سال تک مختلف ڈویژنوں میں لیبر پارٹی کے سرگرم رکن رہے۔ ۱۹۳۵ء میں کرشنا مینن لندن سے ہندوستان واپس آ گئے۔

اس زمانے تک ہندوستان کے بہت سے قومی رہنماؤں سے واقف ہو چکے تھے۔ جو رہنما پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے ان کے ساتھ کرشنا مینن کا براہ راست تعلق تھا۔ انھوں نے لندن اور مانچسٹر میں مہاتما گاندھی کے لیے میٹنگوں کا اہتمام کیا تھا۔ لندن میں کرشنا مینن کو کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ کا رکن بنایا گیا تھا۔ آگے چل کر وہ اس لیگ کے جوائنٹ سکریٹری بن گئے۔ کرشنا مینن نے ہندوستان کے حالات سے برطانیہ کے عوام کو آگاہ کرنے کے سلسلے میں بہت محنت کی۔ وہ یہ بات بہ خوبی جانتے تھے کہ ہندوستان کے مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ برطانیہ کے عوام کی حمایت حاصل کرنا تھا۔ انھوں نے لیگ کی سرگرمیوں کی توسیع کی۔ مقصد میں اختلاف

کی وجہ سے کرشنا مینن نے نئی انڈیا لیگ قائم کی اور وہ اس کے مشعل بردار بن گئے۔

کرشنا مینن نے برطانیہ میں انڈیا لیگ کو ہندوستان میں کانگریس پارٹی کے ساتھ وابستہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ ہندوستان کے عوام کرشنا مینن کو دیکھنے سے کافی پہلے ہی عالمی پلیٹ فارموں سے ان کی تقریروں کے ذریعے ان کے بارے میں سن چکے تھے۔ ان کی آواز ان پلیٹ فارموں سے گونج رہی تھی اور ہندوستان کی آواز ان کے ذریعے سنی جا رہی تھی۔ جینوا میں عالمی امن کانگریس اور ۱۹۳۵ء میں برسلز میں بین اقوامی امن کانفرنس میں اپنے نمائندے کے طور پر کرشنا مینن کو بھیجنے کے سلسلے میں انڈین نیشنل کانگریس کا فیصلہ ہندوستان کے کاز اور اس کی آزادی کے سلسلے میں ان کے کام کا اعتراف تھا۔

۱۹۳۲ء میں پارلیمنٹ کے تین لیبر اراکین پر مشتمل انڈیا لیگ پارلیمانی وفد ہندوستان کے دورے پر آیا تھا تاکہ وہ ہندوستان کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالات، برطانوی حکومت کے بارے میں رائے عامہ وغیرہ کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کرے۔ کرشنا مینن بھی اس وقت کے سکریٹری کی حیثیت سے آئے تھے۔ اس وفد نے جو رپورٹ پیش کی تھی اس کی اشاعت انڈیا لیگ کی تاریخ میں ایک سنگ میل تھی۔ کرشنا مینن کے لیے انڈیا لیگ ایک سیاسی جماعت سے کہیں بڑھ کر تھی۔ یہ ایک تحریک تھی جو نہ صرف ہندوستان کی آزادی کے لیے بلکہ پوری دنیا کے مظلوم لوگوں کی آزادی کے لیے کام کر رہی تھی۔ یہ لیگ جیسا کہ کرشنا مینن چاہتے تھے آزادی کے بعد تک بھی کام کرتی رہی اور اب بھی انگلینڈ میں یہ تنظیم کام کر رہی ہے۔

کرشنا مینن جس سال لندن پہنچے تھے، اسی سال وہ لیبر پارٹی کے رکن بن گئے تھے، وہ متعدد برسوں تک لائبریریوں سے متعلق کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ کرشنا مینن کئی برسوں تک لیبر پارٹی کی ہر ایک سالانہ کانفرنس میں ہندوستان کے بارے میں قرارداد پیش کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے اصولوں کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ان کے نزدیک کسی پارٹی کے کاز کے مقابلے میں ہندوستان کا کاز کہیں عظیم تھا۔ کرشنا مینن کی کوششیں بار آور ہو رہی تھیں اور ہندوستان کی آزادی بہت دور نہیں تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۵ء میں جب لیبر پارٹی برسر اقتدار آئی تو اس نے سالانہ کانفرنس میں ایک قرارداد پیش کی، جس میں ہندوستان کو آزادی دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ یہ قرارداد پیش کروانے کا سہرا تمام تر کرشنا مینن کے سر تھا۔

۱۹۳۵ء میں ملاقات کے بعد سے کرشنا مینن اور پنڈت جواہر لال نہرو میں ذہنی اور جذباتی تعلق قائم رہا۔ پنڈت نہرو سے ملاقات سے کافی پہلے کرشنا مینن نے تحریک آزادی اور ہندوستانی سیاست میں پنڈت نہرو کے کردار سے کافی ترغیب عمل حاصل کی تھی۔ اسی طرح سے پنڈت نہرو بھی ہندوستانی آزادی کے لیے انگلینڈ میں کرشنا مینن کے کردار کی اہمیت بخوبی سمجھتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں کرشنا مینن برطانیہ میں آزاد ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر مقرر ہوئے۔ پانچ سال تک اس عہدے پر فائز رہنے کے بعد وہ جون ۱۹۵۲ء میں اس عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔

۱۹۵۲ء میں کرشنا مینن نے اقوام متحدہ میں ایک مکمل مندوب کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ سب سے پہلے ۱۹۴۷ء میں انھوں نے اقوام متحدہ میں ہندوستان کی نمائندگی کی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں وہ ہندوستانی وفد کے ڈپٹی لیڈر تھے اور شریمتی وجے لکشمی پنڈت اس کی لیڈر تھیں۔ جنرل اسمبلی کا یہ ساتواں اجلاس تھا۔ ایک مدبر کی حیثیت سے یہ کرشنا مینن کی عالمی مقبولیت کی شروعات تھی۔

کرشنا مینن نے ترکِ اسلحہ کے بارے میں بھی اپنی بات کہنے کا ایک بھی موقع نہیں گنوایا۔ اپنی وفات کے وقت تک وہ اس معاملے سے جذباتی طور سے وابستہ رہے۔

کرشنا مینن نے اقوام متحدہ میں کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کے موقف کی بھرپور وکالت کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے تقریباً آٹھ گھنٹے تک ایک یادگار تقریر کی۔

۱۹۵۷ء میں پہلی بار کرشنا مینن نے شمالی بمبئی سے لوک سبھا کے لیے عام انتخابات میں ایک امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا۔ اس سے پہلے وہ مدراس سے راجیہ سبھا کے لیے منتخب کیے گئے تھے اور بغیر محکمے کے وزیر بنائے گئے تھے۔ لیکن ۱۹۵۷ء میں ان کو وزیر دفاع بنایا گیا۔ اس وقت تک ان کو ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے ترجمان، غیر ملکی پالیسی کے سلسلے میں نہرو کے مشیر اعلا، نہرو کے خصوصی ایلچی وغیرہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ جب ۱۹۵۷ء میں کرشنا مینن نے عہدہ سنبھالا تھا تو اس وقت صرف تین بڑی دفاعی تجربہ گاہیں تھیں لیکن جب ۱۹۶۲ء میں انھوں نے استعفیٰ دیا تو اس سلسلے میں پندرہ اضافے ہو چکے تھے۔ کرشنا مینن کی وجہ سے ہی پونے میں آرمڈ فورسز میڈیکل کالج شروع ہوا۔ ان کے زمانے میں بہت سے توسیعی پروجیکٹ بھی شروع ہوئے اور ہندوستان کی بحریہ نے قابلِ ذکر ترقی کی۔ پہلا طیارہ بردار جہاز وکرانت ۱۹۶۱ء میں ہندوستانی بحریہ میں شامل کیا گیا تھا۔ وزیر دفاع کی حیثیت سے کرشنا مینن کے زمانے میں عالمی توجہ کے حامل دو اہم واقعات دسمبر ۱۹۶۱ء میں گوا کا الحاق اور ۱۹۶۲ء میں چین کے ساتھ لڑائی تھے۔ ان دونوں معاملوں میں کرشنا مینن کا رول انتہائی اہم رہا تھا۔

۱۹۶۲ء میں حکومت سے سبکدوش ہونے کے بعد کرشنا مینن نے سینئر وکیل کی حیثیت سے سپریم کورٹ میں وکالت شروع کر دی اور ترقی پسند وکیلوں کے گروپ سے وابستہ ہو گئے۔ مارچ ۱۹۷۴ء میں لندن میں وہ اچانک بیمار ہو گئے جہاں وہ نہرو میموریل کے لیے رقم اکٹھا کرنے کی غرض سے گئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ کئی بار اسپتال میں داخل ہوئے۔ بالآخر ۶ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو ہندوستان کا یہ درخشندہ ستارہ ہمیشہ کے لیے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تاریخ میں کرشنا مینن کا شمار اس صدی کی اہم تخلیقی شخصیتوں میں کیا جاتا رہے گا۔

اظہار احمد

تحریکات وواقعات کی روشنی میں:

جنگ آزادی کا سفر

تاریخ کا مطالعہ ذرا غور سے کرنے پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا کوئی عہد نہیں گزرا جب انسان نے آزاد ہونے کی خواہش نہ کی ہو اور اس سلسلے میں سب سے پرانا واقعہ اسپارٹیکس کا کہا جاتا ہے، جس نے غلامی سے آزاد ہونے کی پہلی کوشش کی تھی۔ آدمی گورا ہو یا کالا، ایک بات فطری ہے کہ وہ آزاد رہنا چاہتا ہے اور اسے وہ اپنا حق سمجھتا ہے۔ اگر اس کے اس حق پر کوئی قبضہ کرتا ہے تو وہ آزاد ہونے کی کوشش کرتا ہے جس میں اسے کامیابی زیادہ اور ناکامی بہت کم ملتی ہے۔ اسی طرح کی باتیں ملکوں اور قوموں کے ساتھ بھی ہوتی ہیں۔

ہمارا ملک بھی انگریزوں کے قبضے میں تھا اور ہم غلام تھے۔ مگر غلامی کی یہ زنجیر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ٹوٹ گئی۔ لیکن یہ آزادی ہمیں اچانک یا چند دنوں ہی میں نہیں ملی بلکہ اس کے لیے صدیوں جدوجہد کرنی پڑی اور بے شمار قربانیاں دینی پڑیں۔ اس سلسلے میں "جلیانوالہ باغ" المیے کا بہت ہی اہم مقام ہے جس کا بیان آگے آئے گا۔ جدوجہد آزادی کی شروعات اگر ہم پلاسی کی جنگ سے مان لیں تو غلط نہ ہوگا جس میں انگریزوں کی جیت اور نواب سراج الدولہ کی ہار ہوئی تھی۔ عام طور سے اسی جیت کو برطانوی طاقت کے قیام کی پہلی کڑی مانا جاتا ہے۔ اس جیت کے بعد انگریز رفتہ رفتہ حکومت کرنے کے اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے گئے اور ہندوستانی عوام کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑتے چلے گئے اور جو بھی ایک محکوم کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ کرنے لگے۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ ہندوستانی ان کے ظلم و تشدد کو عذاب الٰہی مان کر خاموش رہے بلکہ اپنے اپنے طور پر صدائے احتجاج بلند کرتے رہے۔ مگر انگریزوں کے مظالم روز بروز بالخصوص مزدوروں اور کسانوں کے معاملے میں بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اس لیے اپنے حقوق کی خاطر کبھی بہار میں کسانوں، آدی باسیوں، منڈوں اور سنتھالوں نے بغاوتیں کیں تو کبھی بنگال میں گونڈوں اور کسانوں نے اور کبھی آندھرا میں رمپا بغاوت ہوئی تو کبھی منی پور میں نگیندر جیت انگریزوں کے خلاف بغاوت کی رہنمائی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مگر یہ ساری کی ساری بغاوتیں بہت ہی جلد کچل دی گئیں۔ ان کے جو رہنما تھے ان میں کچھ کو عمر قید کی سزا دی گئی تو کچھ کو پھانسی اور کچھ کو توپ کے دہانے پر رکھ کر اڑا دیا گیا۔ ان بغاوتوں سے انگریزی راج کو اک ذرا سی بے اطمینانی کے سوا کچھ بھی دیکھنے کو نہیں ملا۔ ان بغاوتوں کے کوئی خاص اثرات اس لیے مرتب نہیں ہو پائے کہ یہ ساری بغاوتیں مقامی شورشوں سے آگے نہیں بڑھ پائی تھیں اور ان کو کوئی بڑا رہنما نہیں مل پاتا تھا، جس کے سبب یہ مقامی ہو کر رہ گئیں اور انگریز حکمرانوں نے انھیں بہت جلد دبا دیا۔ مگر یہ طے ہے کہ ان بغاوتوں کا کوئی خاص نتیجہ بھلے ہی برآمد نہ ہو سکا مگر اس سے ہندوستانیوں کا انگریزی سرکار کے خلاف ذرا سا محاذ ضرور بنا اور اسی طرح بغاوتوں کا یہ غیر منظم سلسلہ چلتا رہا اور لوگوں کے ذہن پر کچھ نہ کچھ اپنا اثر چھوڑتا رہا۔ ایک وقت ۹ مئی ۱۸۵۷ء کا ایسا بھی آیا جب انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی پہلی منظم جنگ میرٹھ کے مقام پر سپاہیوں کی بغاوت سے شروع ہوئی۔ جس کے نتیجے میں کچھ علاقے آزاد ہو گئے اور ان کی حکومت کسی نہ کسی ہندوستانی کے سپرد کر دی گئی۔ یہ بغاوت بہت پر جوش ہونے ہونے کے باوجود ایک برس سے کچھ زیادہ عرصے میں ہی کچل دی گئی اور دہلی پر ستمبر ۱۸۵۷ء میں ہی انگریزوں نے پھر سے قبضہ کر لیا۔ جو لوگ تخت پر بیٹھے تھے ان میں سے کچھ کو پھانسی دے دی گئی اور کچھ ہندوستان چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ ۱۸۵۷ء کی اپنی اس جیت کے بعد انگریزوں نے بہت سی جاگیروں کا رتبہ بڑھا کر ریاست بنا دیا اور اس پر دیسی نواب راجگان کو بحال کر دیا۔ اس طرح ہندوستان دو حصوں میں بنٹ گیا۔ ایک وہ ریاستیں جن پر انگریز براہ راست حکومت کرتے اور دوسرا وہ ریاستیں جن پر ہندوستانی نواب راجگان کی شکل میں انگریز بالواسطہ طور پر قابض تھے۔

۱۸۵۷ء کی اس بغاوت کے رد عمل کے طور پر حکومت برطانیہ نے بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بالخصوص الٰہ آباد سے کانپور تک کے دیہاتوں کو اجاڑ دیا گیا جس کے سبب وہاں کے لوگوں کی زندگی اتھل پتھل

۱۱۸۔ نرمدا ہاسٹل، جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی ۶۷

ہوگئی۔ اس بغاوت میں دو باتیں دیکھنے کو ملیں۔ پہلی یہ کہ زیادہ تر باغی اپنے اپنے علاقے میں لڑ رہے تھے اور دوسری بات جو کافی اہم ہے وہ یہ کہ بغاوت کے دوران بیشتر راجگان اور سرداروں نے انگریزوں کا ساتھ دیا، جس کی وجہ سے یہ بغاوت مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو پائی۔ مگر پہلے کی بہ نسبت اس بغاوت نے انگریزوں کے ذہن پر ایسی ہیبت طاری کر دی کہ وہ خوف محسوس کرنے لگے اور انھیں ایسا لگنے لگا کہ وہ کرسیوں پر چین سے نہیں بیٹھ پائیں گے۔

تحریک آزادی میں جہاں ایک طرف کسان، مزدور اور دیگر لوگ اپنے اپنے فرائض کو انجام دے رہے تھے وہیں دوسری طرف ہمارے مذہبی رہنما بھی ان سے ذرا پیچھے نہیں تھے۔ اس وقت ہندوستان میں لگ بھگ تمام بسنے والی قوموں میں مذہبی اور سماجی اصلاحیں شروع کر دی گئی تھیں۔ ایک طرف ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے نے "برہمو سماج" کے ذریعے اصلاح کرنا شروع کیا تو دیانند سرسوتی نے "آریہ سماج" بنا کر اصلاح کی شروعات کی اور وویکانند نے "رام کرشن مشن" بنا کر۔ اسی ذمہ داری کو بنگال میں "ینگ بنگال" وغیرہ نے انجام دیا۔ مسلمانوں میں اصلاح کا یہ کام سید احمد بریلوی کر رہے تھے۔ دوسری طرف عبداللطیف "محمڈن لٹریری سوسائٹی" کے ذریعے اس فریضے کو انجام دے رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اور نام سرسید احمد خاں کا ہے جو خاصا اہم ہے۔ جنھوں نے ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ دوسری طرف دادا بھائی نوروجی نے "راست گفتار" کے ذریعے پارسیوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور سکھوں میں گرو رام سنگھ نے اصلاحی تحریک چلائی۔ جن کے پیرو انگریزی سرکار کے خلاف ہتھیار لے کر کھڑے ہو گئے۔

یہ مذہبی رہنما اپنے پیروؤں کی صرف مذہبی تربیت ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے دل و دماغ میں حب وطن کے جذبات کو بھی پروان چڑھاتے تھے۔ جس کے سبب جہاں ایک طرف مذہبی و سماجی رواداری کا زور ہوا وہیں آزادی کی شمع بھی ان کے سینوں میں آب و تاب سے روشن ہو گئی۔

ملک کی آزادی میں جہاں مزدور، کسان، مذہبی رہنما اور دیگر خاص و عام کا ذہن لگا ہوا تھا وہیں ہمارے شاعر و ادیب بھی خاموش نہیں تھے۔ ۱۹ویں صدی میں ہندوستان کی ہر ایک جدید زبان میں ادب کا فروغ ہوا۔ مذہب کے علاوہ ان لوگوں نے اپنی تخلیقات کا زیادہ تر موضوع سماجی مسائل، حب الوطنی اور قوم پرستی کو بنایا۔ اس سلسلے میں راجہ رام موہن رائے، ویر سالنگم، گوپال ہر دیش مکھ اور بھارتیندو ہریش چندر وغیرہ کا نام ہندی میں لیا جا سکتا ہے تو اردو میں علامہ اقبال، حسرت موہانی، جوش اور پریم چند وغیرہ کا۔ اس کے علاوہ بنگلہ میں رویندر ناتھ ٹیگور، بنکم چندر چٹو پادھیائے تو مراٹھی میں ہری نارائن آپٹے اور تامل میں سبرامنیم بھارتی وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے ادب نے عوام میں حب الوطنی کے جذبات ابھارنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

آزادی کی یہ تحریک چلتی رہی اور اس میں ہر طبقہ منہمک رہا۔ اسی دوران اٹھارہویں صدی کی آٹھویں دہائی میں یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ ہندوستانی قوم پرستی کافی مضبوط ہو چکی ہے اور اس میں کافی زور اور حرکت پیدا ہو گئی ہے اور وہ اب ہندوستان کے سیاسی منظر پر ایک اہم طاقت بن چکی ہے، اس لیے اسے کوئی منظم شکل دی جا سکے۔ اسی قومی تحریک کے سبب ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء میں "انڈین نیشنل کانگریس" کا وجود عمل میں آیا۔ اسی اجلاس میں کانگریس کے باضابطہ مقاصد بیان کیے گئے جس میں یہ کہا گیا کہ مختلف علاقوں کے قوم پرور سیاسی کارکنوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو ترقی دیں گے اور ذات پات، مذہب اور صوبائی تعصب بھاؤ سے اوپر اٹھ کر قومی اتحاد کو ترقی دے کر اسے مستحکم بنائیں گے اور عوام کے مطالبوں کو تشکیل دے کر حکومت کے سامنے رکھیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملک بھر میں رائے عامہ ہموار اور لوگوں کو منظم کریں گے۔ ان تمام مقاصد کو کانگریس نے اپنے سامنے رکھ کر کام کرنا شروع کیا۔ اس میں کبھی رفتار تیز ہوئی اور کبھی سست۔ کانگریس کے اولین ۲۰ برسوں یعنی ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۵ء تک کو عام طور پر معتدل دور کہا جاتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے واقعے سے قوم پرست تحریک کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا جو ۱۹۱۸ء تک چلا۔ یہ دور بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں بہت کچھ اتار چڑھاؤ اور کافی بدلاؤ بھی آیا۔ اسی زمانے میں کانگریس دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور اسی دور میں "مسلم لیگ" اور "ہندو مہاسبھا" کا وجود عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات یہ ہوئی کہ اسی عہد کے آخر میں آسمان سیاست پر گاندھی جی آفتاب کی طرح نمودار ہو گئے۔

۱۹۰۵ء میں جاپان نے روس کو شکست دے دی جس سے ہندوستانی عوام پر یہ ظاہر ہو گیا کہ کسی بھی یورپی طاقت کو شکست دی جا سکتی ہے۔ اس سے ہندوستانیوں میں قوت اعتماد پیدا ہوئی اور سودیشی جیسی تحریکیں ابھر کر سامنے آئیں۔ ان رجحانات کو پیدا کرنے والے رہنما بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال کے علاوہ آربندو گھوش بھی تھے۔ ان لوگوں کو انتہا پسند کہا گیا کیوں کہ کسی بھی معاملے پر ان کے سوچنے کا ڈھنگ کانگریس کے اعتدال پسند لوگوں سے مختلف تھا۔ اسی نظریاتی اختلاف کی بنا پر کانگریس ۱۹۰۷ء میں دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ حالاں کہ کانگریس پوری طرح اعتدال پسندوں کے ہاتھوں میں تھی لیکن ملک بھر میں انتہا پسندوں کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا اور ان کے خیالات اور طریقے عوام میں مقبول ہونے لگے، جس سے انگریز چوکنے رہنے لگے۔ اس لیے کہ انھیں انتہا پسندوں سے خطرے کی بو آنے لگی تھی۔ اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے یہ دو گروپ اپنے اپنے ڈھنگ سے کام کرتے رہے۔ ان کے علاوہ ملک کے بعض حصوں میں انقلابی دہشت پسندوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ بھی تھے جو اپنی قوت بازو کے ذریعے حکومت برطانیہ کا تختہ پلٹنے میں یقین رکھتے تھے۔ وہ خفیہ انجمنوں کے طور پر منظم تھے اور اپنے اراکین کو بارود بنانے اور اسلحہ استعمال کرنے کی تربیت دیتے تھے۔ جس میں ایم۔ برکات اللہ، خودی رام بوس، شیام جی کرشن ورما، وی ڈی ساورکر اور عبیداللہ سندھی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ انقلابی اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو پائے پھر بھی ان کی حب الوطنی، عزم اور ایثار نے ہندوستان میں قوم پرستی کے جذبے کی بیداری میں اہم رول ادا کیا۔

ایک طرف جہاں تحریکِ آزادی اپنے مقصد کی طرف قدم بہ قدم بڑھ رہی تھی وہیں دوسری طرف انگریز بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے تھے بلکہ اسے ناکام کرنے کی کوشش "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی شکل میں کرتے رہتے۔ وہ کبھی مسلمانوں کو طاقت کا لالچ دے کر تو کبھی ان کو علاحدہ قوم کا احساس دلا کر ہندوؤں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرتے اور کبھی ہندوؤں کو مذہبی دشمن بنا کر مسلمانوں کے خلاف ورغلاتے۔ اس دوران ملک میں فرقہ پرستی میں بہت اضافہ ہوا اور ایک طرف "مسلم لیگ" کا وجود عمل میں آیا تو دوسری طرف "ہندو مہاسبھا" کا۔ لیکن مسلم لیگ کے قیام کے بعد بھی مسلم عوام جوق در جوق کانگریس میں شامل ہوتے رہے۔ جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، اور مظہر الحق وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ مسلم لیگ کے بننے سے تحریکِ آزادی پر اثر پڑا لیکن بہت زیادہ نہیں اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ "لکھنؤ معاہدہ" (۱۹۱۶ء) کے تحت بچھڑے ہوئے کانگریس کے دونوں گروپ آپس میں مل گئے۔ اس کے علاوہ کانگریس اور مسلم لیگ نے بھی ساتھ مل کر کام کرنے کا عہد کیا۔ بچھڑے ہوئے کانگریسیوں کے ملنے اور مسلم لیگ کے بھی کانگریس کے ساتھ ہو جانے سے ہندوستانی رہنماؤں کی امیدوں کو بلندی ملی تو دوسری طرف تحریکِ آزادی میں ایک نئے دور کی شروعات گاندھی جی کی ہندوستان آمد سے ہوئی۔ ویسے تو وہ ہندوستان ۱۹۱۵ء ہی میں آچکے تھے مگر "چمپارن ستیہ گرہ" سے باقاعدہ جدوجہد آزادی میں کود پڑے۔ گاندھی جی کی جدوجہد کا یہ نیا طریقہ یعنی "ستیہ گرہ" اس وقت تو بہت کامیاب ثابت ہوا ہی اور آنے والے دنوں کے لیے بھی بہت مفید و کارگر رہا۔

تحریکِ آزادی کی مشعل جس طرح پورے ملک میں تیز ہوتی جا رہی تھی اسی طرح انگریزوں کے ظلم و تشدد بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ مگر ہندوستانی عوام نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور کبھی چمپارن میں ستیہ گرہ تو کبھی احمد آباد میں ہڑتال تو کبھی رولیٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ۔ اس کے علاوہ ملک کے دوسرے حصوں میں ہڑتال اور احتجاج کا سلسلہ جاری رکھا۔ سرکار ان عوامی احتجاج کا گلا گھونٹنے پر تلی ہوئی تھی اور اس کے لیے وہ کبھی عوام پر لاٹھی چارج کراتی تو کبھی گولیاں برسائی جاتیں اور کبھی رہنماؤں کی گرفتاری عمل میں آتی۔ اسی دوران دو کانگریسی رہنما ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو بھی گرفتار کر لیے گئے، جن کی عوام میں کافی مقبولیت تھی اور یہ دونوں سیکولرزم کی مثال سمجھے جاتے تھے۔

ان دو رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف امرتسر کے مقام پر جسے "جلیان والہ باغ" کہتے ہیں۔ (یہ باغ تین طرف سے اونچی دیواروں سے گھرا ہوا ہے اور باہر جانے کے لیے ایک تنگ گلی ہے) وہاں احتجاج کے لیے کثیر تعداد میں لوگ جمع ہوئے۔ جس میں بوڑھے، عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ جلسہ پُرامن چل رہا تھا کہ اچانک درندہ صفت جنرل ڈائر اپنی فوج کے ساتھ پارک میں داخل ہوا اور لوگوں کو منتشر ہونے کی وارننگ دیے بغیر اس نے اپنی فوج کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ بے رحم سپاہیوں نے نہتے اور معصوم لوگوں پر اس وقت تک مسلسل گولیاں برسائیں جب تک ان کی رائفلیں خالی نہ ہو گئیں۔ جس میں ہزاروں لوگ تو وہیں ہلاک ہو گئے اور ہزاروں زخمی ہو گئے۔ حد تو یہ کہ اس کے بعد پورے پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور عوام پر نہایت وحشیانہ ظلم و ستم ڈھایا گیا۔ اس کے علاوہ اخبارات پر پابندی لگا دی گئی اور ایڈیٹروں کو یا تو جیل بھیج دیا گیا یا جلا وطن کر دیا گیا۔ جلیانوالہ باغ کے واقعے کے بعد پورے ملک میں دہشت کا ماحول پیدا ہو گیا۔ لیکن سرکار اپنے مقصد میں پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکی اور جو شعلہ ہندوستانی عوام کے دلوں میں تحریکِ آزادی کا بھڑک اٹھا تھا وہ زیادہ دیر تک دبا نہ رہ سکا۔

یہ قتلِ عام آزادی کی جدوجہد کی تاریخ میں ایک سنگِ میل بن گیا اور تحریک میں ایک نیا موڑ لے آیا۔ ہر ہندوستانی خواہ وہ کسی بھی فرقہ، ذات یا مذہب سے تعلق رکھتا تھا اس کے دھڑکتے دل میں انگریزوں کے تئیں نفرت کے شعلوں میں اضافہ ہوا۔ یہ بات ہر ہندوستانی کے دل میں گھر کر گئی کہ ان ظالم و جابر حکمرانوں کو جتنا جلد ہو سکے سات سمندر واپس جانے پر مجبور کیا جائے۔ جلیانوالہ باغ کے واقعے سے پہلے کانگریس، انقلابی یا مسلم لیگ وغیرہ نے آزادی کے لیے جو ماحول تیار کیا تھا اس میں ان مظالم نے جلتی پہ تیل کا کام کیا اور آزادی کی جدوجہد اور جور و ستم سے ٹکرانے کا ارادہ عوام میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا۔ اس قتلِ عام نے ہندوستانیوں کو عوامی سطح پر تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دھاگے میں پرونے کا کام کیا۔

جلیانوالہ باغ کے واقعے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ رویندر ناتھ ٹیگور اور سبرامنیم آیر نے حکومت برطانیہ سے ملے "سر" کے خطاب کو واپس کر دیا۔ تو دوسری طرف گاندھی جی نے اپنا "قیصرِ ہند" کا تمغہ حکومت کو لوٹا دیا۔ اس کے علاوہ وکیلوں نے اپنی وکالت چھوڑ دی، طلبا نے سرکاری درسگاہوں کو خیرباد کہا تو دوسری طرف ملازموں نے نوکری سے استعفا دے دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں ودیشی سامان اور کپڑوں کی ہولی جلائی گئی۔ جلیانوالہ باغ کے واقعے کا عوام پر اتنا اثر ہوا کہ اسی سال سیکڑوں ہزاروں لوگوں نے اس باغ کی تیرتھ کی طرح زیارت کی۔

جلیانوالہ باغ کے سانحے کے بعد جنرل ڈائر انگلینڈ چلا گیا اور اس کو اس کے کیے گئے مظالم کے لیے سزا دینے کی بجائے ایوانِ اعلا میں اس کی تعریف کی گئی۔ بعض انگریزوں نے تو چندہ اکٹھا کر کے اس کو خراجِ تحسین پیش کیا، جس کی وجہ سے ہندوستانی عوام کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے شعلوں کی شدت میں مزید اضافہ ہوا اور بھڑکے جذبات نے تحریکِ آزادی کو اور آگے بڑھانے میں کافی مدد کی۔

مندرجہ بالا تحریکوں کے علاوہ اتحاد پیدا کرنے کے سلسلے میں "خلافت تحریک" نے بھی ایک اہم رول ادا کیا۔ جس میں علی برادران اور ابوالکلام آزاد کے علاوہ گاندھی جی بھی شامل تھے۔ قومی ہم آہنگی اور سیاسی سرگرمیوں میں اضافہ کرنے کے لیے سوامی شردھانند کو جامع مسجد کے منبر سے مسلمانوں کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی تو ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے گولڈن ٹیمپل سے ہندوؤں کو خطاب کیا۔ اس دوران آپسی اتحاد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ "ہندو مسلمان کی جے" اس وقت کے مقبول ترین نعروں میں سے ایک ہو گیا۔

ہندوستانی تحریکِ آزادی میں ۱۹۴۲ء کے

باقی صفحہ ۳۳ پر

ڈاکٹر معین الدین بقائی

خود علاجی

(سیلف ۔ میڈی کیشن)

یوں تو ہمیشہ سے ہی انسان میں خود علاجی کا مادہ رہا ہے۔ چھوٹی موٹی بیماریوں میں گھریلو چٹکلوں کا استعمال ہوتا رہا ہے کسی کو نزلہ ہوا تو ادرک کی چائے پی لی یا لونگ پان میں ڈال کر کھالی، کھانسی ہوئی تو پان کی جڑ پیس کر پان میں ڈال کر یا ملیٹھی کا چورا پان میں ڈال کر کھالیا۔ کچھ کو فائدہ ہوگیا۔ انھوں نے یہ نسخہ دوسرے کو بتلا دیا۔ جس کو نہ فائدہ ہوا، اس نے دوسرا نسخہ آزمایا، کسی بھی چیز سے فائدہ نہ ہوا تو پھر حکیم صاحب سے رجوع کیا، اب جیسے جیسے زمانہ رفتار پکڑتا گیا، انسان کے مزاج میں بھی جلدی اور پھرتی آتی گئی، تیز اثر دواؤں کی ضرورت نے سائنس دانوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ تیز اور فوری اثر کرنے والی دوائیں معلوم کریں اس طریقہ سے ایلوپیتھی کا طریقہ علاج وجود میں آیا۔ دواؤں میں کیمیکل کا استعمال ہونے لگا، اس کے نقصان سامنے آنے لگے، جس سے اس کا استعمال محدود ہوتا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں پینسلین کی ایجاد نے ساری دنیا میں تہلکہ مچادیا، کیونکہ پہلی مرتبہ ایک ایسی دوا وجود میں آئی تھی جو حقیقی طور پر جراثیم کش تھی اس کی ایجاد نے دنیا کے سامنے ایک نیا راستہ کھول دیا، نئے نئے اور تیز تر اینٹی بایوٹکس سامنے آنے لگے۔ یونانی طریقہ علاج اور آیورویدک سب پھیکے پڑتے چلے گئے۔ لوگ تیزی سے علاج کے عادی ہوتے چلے گئے، جس کی وجہ سے ڈاکٹروں نے بجائے ایک اینٹی بایوٹک کے دو دو یا تین تین اینٹی بایوٹک ایک ساتھ دینے شروع کر دیے، نتیجے کے طور پر ایک اندھی دوڑ شروع ہوگئی۔ اس میں خاص طور پر نیم ڈاکٹروں نے اپنی ساکھ بنانے کے لیے کئی کئی اینٹی بایوٹکس ملا کر دینے شروع کر دیے اس رجحان کی وجہ سے جہاں دواؤں کی کھپت بڑھ گئی وہاں قیمتیں بھی بڑھنے لگیں اسی دوران سٹیرائیڈ (STEROID) گروپ کے نئے نئے استعمال سامنے آئے جس نے جہاں ایلوپیتھی کو مزید عروج بخشا وہاں عطائی ڈاکٹروں کی بھی چاندی ہوئی۔ اب تک تو وہ صرف اینٹی بایوٹکس کا ہی استعمال کرتے تھے اب انھوں نے اس کے ساتھ اسٹیرائیڈ کا استعمال بھی کئی کئی ملا کر کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے بخار جہاں دنوں میں ٹھیک ہوتا تھا وہاں گھنٹوں میں ٹھیک ہونے لگا۔ کئی لاعلاج مرضوں میں کافی فائدہ ہوا۔ ٹائیفائیڈ جیسے موذی مرض بجائے مہینوں کے چند دن میں اچھے ہونے لگے، لوگوں میں اور تیزی کا رجحان بڑھنے لگا جس کی وجہ سے وہ صرف ایلوپیتھی طریقہ علاج پر اعتماد کرنے لگے، حکیموں اور آیورویدوں کا اپنے طریقہ علاج پر سے اعتماد اٹھنے لگا اور وہ بھی در پردہ ایلوپیتھی دواؤں خاص کر اینٹی بایوٹکس اور اسٹیرائیڈس کو شکل بدل کر استعمال کرنے لگے، یونانی طبیہ کالجوں اور آیورویدک کالجوں میں طلبا اس شرط پر پڑھنے کے لیے تیار ہوئے کہ ان کو ایلوپیتھی دوائیں بھی پڑھائی جائیں اور وہ فارغ ہو کر صرف ایلوپیتھی علاج کرنے لگے اور خود کو ڈاکٹر کہلانا پسند کرنے لگے، دواؤں کی بڑھتی ہوئی مانگ نے ٹھگوں اور چوروں کی بھی چاندی کر دی۔ انھوں نے اصل دواؤں کی نقل تیار کر لی اور مارکیٹ میں سستے داموں بکنے لگیں۔

اب ایک ایسے ماحول میں جہاں ایک طرف تو تیز اثر رکھنے والی دوائیں دستیاب ہیں دوسری طرف ملاوٹی اور نقلی دوائیں موجود ہیں، تیسری طرف تلاش معاش کی دوڑ کا انسان کو قدم قدم پر مقابلہ ہے جس کی وجہ سے اس کے پاس علاج کے لیے فرصت نہیں، مہنگائی الگ روز بہ روز بڑھ رہی ہے یہ وہ ماحول ہے جس نے آج انسان کو SELF MEDICATION یا خود علاجی کی طرف راغب کیا ہے۔

یہ آپ اپنا علاج خود کرنے کی عادت کبھی تو بوجہ مجبوری ہوتی ہے، کبھی یہ بطور تجربہ ہوتی ہے اور کبھی فخریہ طور پر ہوتی ہے۔ مجبوری کی مثال تو ایسی ہے کہ کسی کو بخار ہوا، ڈاکٹر نے کچھ دوائیں تجویز کر دیں، فائدہ ہوگیا، اب دوبارہ بخار آیا، ڈاکٹر کی فیس بچانے کے لیے پرانا نسخہ نکالا اور استعمال کر لیا، یا مصروفیت کی وجہ سے فرصت نہ ملی تو کوئی سی دوا اپنے کیمسٹ سے خرید کر کھالی ایسی دواؤں میں اکثر سر درد کی دوائیں، بخار اتارنے والی دوائیں زیادہ استعمال ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ جو بطور تجربہ یا ایڈونچر اپنا علاج خود کرتے ہیں یہ زیادہ غلط ہوتا ہے ایسے لوگ دوسرے لوگوں کی ملی جلی علامتیں دیکھ کر خود وہ دوائیں استعمال کرنے لگتے ہیں اس میں بلڈ پریشر اور شکر والے مریض زیادہ ہوتے ہیں، انھوں نے سنا کہ فلاں مریض کو فلاں دوا سے زیادہ فائدہ ہوا ہے خود بھی وہ دوا شروع کر دی، کبھی کبھی تُکّا لگ گیا، کبھی حالت بگڑ گئی اور لینے کے دینے پڑ گئے،

بقائی کلینک ۔ ۵۲۹ ۔ مٹیا محل
جامع مسجد دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو فخریہ اپنا علاج خود کرتے ہیں نہ صرف یہ کہ خود استعمال کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی کھلاتے ہیں اور اپنی ہمہ دانی کا رعب جماتے ہیں، مگر یہ ضرور کرتے ہیں کہ وہ اصلی مقدار سے بہت کم استعمال کرتے ہیں تاکہ نقصان ہونے کی صورت میں زیادہ پریشانی نہ ہو، ایسے لوگ ڈاکٹروں کے پاس علاج کراتے وقت ڈاکٹروں سے ہر دوا کے بارے میں پوچھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ کونسی علامت کی کونسی دوا ہے اور فائدہ ہونے کی صورت میں زیادہ مقدار میں کیمسٹ سے خرید کر رکھ لیتے ہیں اور اکثر دوسروں کو فری تقسیم کرکے اپنی دھاک بٹھاتے ہیں ایسے لوگ ڈاکٹروں سے ہمیشہ شاکی رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ بتاتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں ڈاکٹر کا علاج کیا تھا فائدہ نہ ہوا میں نے فلاں دوا دی فوراً فائدہ ہو گیا، وغیرہ وغیرہ اسی طریقہ پر کچھ ڈاکٹر اپنا علاج جب خود کرتے ہیں تو الجھن میں پڑ جاتے ہیں۔ کبھی دوا کی مقدار کم لیتے ہیں کبھی بہت زیادہ یا اپنے بچوں اور گھر والوں کا علاج کرتے ہیں تو بھی پریشان ہو جاتے ہیں کیوں کہ دوسرے مریضوں کو تو وہ کئی کئی دوائیں ملا کر دے دیتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ اس کے نقصانات کیا ہیں مگر خود یا اپنے قریبی عزیز کو وہ نہیں دے پاتے ایسی صورت میں وہ خود عدم اعتماد کا شکار ہوتے ہیں اس لیے دوا کو بیلنس نہیں کر پاتے اور نتیجہ میں گھر والوں کو ان پر اعتبار نہیں رہتا وہ اپنا علاج دوسری جگہ کرانا پسند کرتے ہیں۔

سمجھ دار ڈاکٹر اپنا علاج خود نہیں کرتے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ مریض کی رائے بھی مریض ہوتی ہے کیوں کہ اس وقت وہ خود مریض ہوتے ہیں اس لیے اپنے بارے میں دوا تجویز کرنے میں تشخیص غلط ہو سکتی ہے اس لیے وہ دوسرے طبیب یا ڈاکٹر کی رائے لینا بہتر سمجھتے ہیں، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری اپنے زمانے کے بہترین حکیم اور ڈاکٹر رہے ہیں، بیماری کی صورت میں حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری سے علاج کراتے اور ڈاکٹر صاحب حکیم صاحب سے رجوع کرتے۔

خود علاجی جب تک غیر مفرد دواؤں تک تھی، اتنی مضر نہ تھی جتنی کہ آج ہے، کیوں کہ اینٹی بایوٹک اور اسٹیرائڈس کی حیثیت دو دھاری تلوار کی طرح ہے کہ کاٹے گی ضرور، فائدہ کے بجائے کبھی کبھی جان چلی جاتی ہے۔ علاج کرنے والا کچھ کہہ بھی نہیں پاتا۔ ورنہ وہ ضرور یہ نصیحت کرتا کہ خدارا میری طرح سے اپنا علاج خود نہ کرنا۔

ایلو پیتھی میں جو دوائیں استعمال ہوتی ہیں اس کے بارے میں مسلسل تفصیل آتی رہتی ہے جس سے استعمال کرنے والے ڈاکٹروں کو ان کے بارے میں معلومات رہتی ہیں اور وہ ہوشیاری کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جب کہ عام آدمی کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی وہ اس کو استعمال کر لیتا ہے دوسرے نقلی اور ملاوٹی دواؤں کی شناخت نہ ہونے کی صورت میں کبھی کبھی جان کا خطرہ بھی پیدا ہو سکتا ہے اس لیے بغیر کسی ڈاکٹر کے مشورہ کے کوئی دوا خواہ وہ کتنی ہی صحیح ہو ہرگز نہ لیں کیوں کہ دواؤں کی تجویز میں مریض کی عمر، مرض اور اس کی شدت، موسم، جنس اور مریض کے مزاج کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے کسی دوا کے مضر اثرات کو ضائع کرنے کے لیے اس کے ساتھ دوسری دوائیں تجویز کی جاتی ہیں کبھی دواؤں کے آپس کے ٹکراؤ کو روکنے کے لیے کچھ ہدایتیں دی جاتی ہیں، جس سے عام آدمی واقف نہیں ہوتا، کچھ کمپاؤنڈر ڈاکٹروں کو دوا دیتے دیکھ کر خود بھی دوا دینے لگتے ہیں اور خود کو ڈاکٹر کہلوانا پسند کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کے اس مہنگے دور میں علاج بہت مہنگا اور مشکل ہو گیا ہے ہر شخص چھوٹے موٹے ٹوٹکے اور سستی دواؤں کے چکر میں ایسے لوگوں کے چنگل میں پھنس جاتا ہے جو تیر یا تکے کے اصول پر ڈاکٹری کرتے ہیں اکثر لوگوں کو اپنی اس کفایت کی بھاری فیس ادا کرنی پڑتی ہے کیوں کہ مرض بگڑنے کی صورت میں پھر علاج جو چند روپوں سے ہو سکتا تھا ہزاروں پر پہنچتا ہے، کسی کسی مریض میں RESISTENCE پیدا ہو جاتی ہے جس سے بعد میں چھوٹی موٹی دوائیں اثر نہیں کرتیں اور علاج مہنگا ہو جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے اپنا علاج اس سے کرائیں جس نے باقاعدہ اس کا علم حاصل کیا ہو اور ان دواؤں پر عبور رکھنے والا ہو۔

انسان کی جان قیمتی ہے اس کی حفاظت فرض ہے مگر اس فرض سے سبکدوش ہونے کے لیے خودکشی والے طریقے نہ اپنائیں ہو سکتا ہے کہ کسی نیم حکیم یا نیم ڈاکٹر سے فائدہ ہوا ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر مرض میں یا ہمیشہ اس سے فائدہ ہی ہوگا، جب کہ اس علم کے جاننے والے سے اگر کبھی غلطی ہو بھی گئی تو وہ اس کو سدھار تو سکتا ہے جب کہ دوسری صورت میں صحت ایک اتفاق ہے اور موت پہلی شرط۔

یاد رکھیے جاننے والا اور نہ جاننے والا برابر نہیں ہو سکتے اسی طرح کم جاننے والا اور پورا جاننے والا برابر نہیں ہو سکتے۔

اگر آپ کو کوئی ایسا مرض ہے جو بار بار ہوتا ہے تو آپ اپنے حکیم یا ڈاکٹر سے اس کے لیے کوئی دوا تجویز کرا کر رکھ لیں اور اس کو اس طبیب کی ہدایت کے مطابق ہی استعمال کریں۔

کچھ لوگ جو ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں طبی امداد فوراً نہیں مل سکتی، اس صورت میں بخار، سر درد، پیٹ کا درد یا اچانک پیدا ہونے والی بیماریوں کو فوری طور پر روکنے کے لیے اپنے ڈاکٹر یا حکیم سے مناسب دوا تجویز کر کے رکھ لیں اور اس سے متعلق ہدایات حاصل کر لیں، کسی ایسے آدمی سے مشورہ لے کر جس نے باقاعدہ علم حاصل نہ کیا ہو یا کیمسٹ سے پوچھ کر دوائیں کھانا ہرگز مناسب نہیں۔

خود اپنا علاج اور ایسی شکل میں جب کہ آپ خود ڈاکٹر یا حکیم بھی نہ ہوں نہ صرف طبی نقطۂ نظر سے غلط ہے بلکہ قانوناً جرم بھی، کیوں کہ انسان کی جان اتنی سستی نہیں کہ کچھ پیسے بچانے کی خاطر اسے ہلاکت میں ڈال دیا جائے۔ ●

بقیہ: طبِّ یونانی ۔۔۔

پر مختلف ریسرچ سینٹر قائم ہیں۔ بے شمار یونانی دوا خانے اور فارمیسیاں قائم ہیں جو دن رات یونانی دواؤں کی تیاری میں مشغول ہیں۔

غرض طب یونانی کی اہمیت و افادیت آج کے دور میں نہ صرف پہلے ہی کی طرح باقی ہے بلکہ اس میں جدید طب سے لوگوں کی کنارہ کشی کے سبب کچھ اضافہ ہی ہوا ہے●

طب یونانی، آج کے دور میں

صحت کو انسانی زندگی میں ہر دور میں اہمیت حاصل رہی ہے۔ تاریخ سے ماقبل دور میں بھی انسان جب بیمار پڑتا تو بیماری کو رفع کرنے کے لئے کچھ تدابیر کرتا جن میں جھاڑ پھونک اور ٹونا ٹوٹکا بھی شامل ہوتا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے غالباً جانوروں کو دیکھ کر، جڑی بوٹیوں کا استعمال بیماریوں کو دور کرنے کے لیے شروع کر دیا اور اس طرح طب وجود میں آئی۔ یونان میں سب سے پہلے طب کو باقاعدہ ایک فن کے طور پر رواج دیا گیا۔ پھر مشہور زمانہ حکیم بقراط اس کی تعلیم کو عام کیا۔ یوں اصول طب کی بنیاد یونان میں رکھی گئی۔

یونان سے یہ علم عرب پہنچا، جس نے یونانیوں کے علم سے استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ روم، ایران، چین و ہندوستان سے نادر کتابوں کے ترجمے کئے اور تحقیق و تدوین کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے طب کے اصولوں کو پرکھا اور اس فن کو نئی آب و تاب عطا کی۔ اس دور کے مشہور اطبا میں سے زکریا رازی، جابر بن حیان — حنین بن اسحاق، ابوالقاسم زہراوی، شیخ بوعلی سینا، ابن رشد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان میں طب عربوں کے ذریعہ پہنچی، جہاں پہلے ہی آیورویدک سسٹم موجود تھا۔ جس کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے یہ طب مغلیہ حکومت کے زیر سایہ پلی بڑھی اور آزادی کے بعد حکیم اجمل خاں نے اس روبہ زوال طریقۂ علاج کو جلا بخشی — اور ۱۹ ویں صدی کے اوائل میں آیورویدک اور یونانی طبیہ کالج، دہلی میں قائم کیا۔

انگریزی دور حکومت میں اس طب پر ایک دور کسمپرسی کا گزرا۔ انگریز اپنے ساتھ جدید طریقۂ علاج لائے جسے ایلوپیتھی کہا جاتا ہے۔ سرکاری طور پر نظر انداز کئے جانے کے باوجود دیسی طریقۂ علاج آیوروید اور یونانی دونوں عوام میں مقبول رہیں اور گو حکیموں اور ویدوں کی وہ حیثیت نہ رہی جو مغلیہ دور میں تھی لیکن عوام کے سہارے یہ طریقے چلتے رہے۔ آزادی کے بعد حکومت ہند نے دیسی طریقۂ علاج کو فروغ دینے کے لئے مختلف کمیٹیاں قائم کیں جن میں آر این چوپڑہ کمیٹی (۱۹۴۶) خاص طور پر توجہ کا مرکز بنی۔ اور اس کی سفارشات کی بنیاد پر حکومت ہند نے ۱۹۶۹ء میں ایک کونسل برائے تحقیقات طب ہندی اور ہومیوپیتھی قائم کی۔ بعد میں ۱۹۷۸ء میں اس کو چار الگ الگ کونسلوں میں بانٹ دیا گیا یونانی، ہومیوپیتھی، آروید، سدھا اور یوگا کی یہ کونسلیں اپنے میدان میں تحقیقات کی نمایاں خدمات انجام دے رہی ہیں۔

حال ہی میں حکومت ہند نے وزارت صحت میں ہندوستانی طریقۂ علاج کا ایک علاحدہ شعبہ قائم کیا ہے جس سے دیگر دیسی طریقوں کے ساتھ یونانی طب کو بھی پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے بہتر مواقع میسر ہوں گے۔ اس کے علاوہ بنگلور میں یونانی طب کے ایک قومی انسٹی ٹیوٹ کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے۔

یونان سے نکل کر عرب ہوتی ہوئی ہندوستان میں آکر بسنے والی یہ طب جو برصغیر ہندو پاک میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، اب اپنے پنجے مغربی ممالک میں گاڑ رہی ہے جہاں ایلوپیتھی طریقۂ علاج کی یک طرفہ اجارہ داری قائم ہے۔ ایلوپیتھی طریقۂ علاج نے دنیا میں تمام دیگر طریقہائے علاج کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا لیکن اس کے مضر اثرات سے تنگ آکر جن کا ذکر آئندہ صفحے میں سرسری طور پر کریں گے، لوگ اب پھر پرانے دیسی طریقوں کو اپنا رہے ہیں جن میں یونانی طب کا اپنا الگ مقام ہے۔

جدید طب' ایلوپیتھی' جسے ہم مغربی طب بھی کہتے ہیں، اپنا مقام کھوتی جا رہی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ گو اس کی دوائیں زود اثر ہیں لیکن یہ انسان کے جسم پر بہت سے منفی اثرات بھی ڈالتی ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کا اعتماد اس سے اٹھتا جا رہا ہے جدید تحقیق نے ثابت کر دیا کہ بہت سی انگریزی دوائیں صحت بخش ہونے کے بجائے مضر صحت ثابت ہو رہی ہیں اور اکثر حالتوں میں ہلاکتوں کا سبب بھی بن رہی ہے ان دواؤں کے ردِ عمل سے پیدا ہونے

۲۲۳۵ فرش خانہ محل سرائے حویلی حسام الدین بلیماران، دہلی

والی بیماریوں کو مخصوص نام آیو ٹرا جینک (IOTRAGENIC) بیماریاں دیا گیا ہے۔ ایسی دواؤں میں چند کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

کنگھیا کے پتے ۱۹۴۰ء کی دہائی میں دو دوائیں، اے سی پی، ایم اور کارٹیزن، مارکیٹ میں آئیں۔ تحقیقات سے ثابت ہوا کہ ان کا فائدہ اسپرین سے زیادہ نہیں ہے بہت معمولی فائدہ ہوتا ہے اور وہ بھی عارضی۔ اسی طرح ۱۹۴۵-۵۰ء کے عرصہ میں نزلہ زکام سے لے کر جذام اور آتشک کے لئے سلفا دواؤں کو بہت اہمیت حاصل ہوئی اس کے انجکشنوں سے مہاسوں کا علاج بھی کیا جانے لگا۔ گرتے ہوئے بالوں کو تھامنے کے لیے بھی انہیں کارگر سمجھا گیا لیکن آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ ان میں "چسن" جیسی دوا کے مضر اثرات بہت زیادہ ہیں یہاں تک کہ موت تک واقع ہو سکتی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں امریکا میں ایک دوا الگزر سلفانیلا مائیڈ بازار میں آئی لیکن آخر کار اس کے سبب اموات ہونے سے ۱۹۵۱ء میں اس پر پابندی لگا دی گئی۔

اسی طرح ۱۹۶۰ء میں خون میں کولسٹرول کی مقدار کم کرنے کے لیے ایم۔ آئی۔ آر۔ ۲۹ نامی دوا تیار کی گئی۔ لیکن ۱۹۶۲ء میں اطلاعات ملیں کہ اس کی وجہ سے آنکھوں میں موتیا بند ہو جاتا ہے، جلد خراب ہو جاتی ہے، جنسی اعضاء پر بھی برا اثر پڑتا ہے لہٰذا ۱۹۶۳ء میں اسے واپس لے لیا گیا۔

۱۹۴۹ء میں معدے کے سرطان کے لیے بیتھین نامی دوا ایجاد کی گئی، کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ یہ تو صرف مرض کی علامات کو ڈھانپ دیتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مرض رفع ہو گیا جب کہ اصل مرض جوں کا توں برقرار رہتا ہے۔ اس کے برعکس اس دوا کے استعمال سے مریض کا منہ خشک رہتا ہے، آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتی ہیں، قبض رہنے لگتا ہے۔ یہ دوا بھی تھوڑے ہی عرصہ میں ناکام ہو گئی۔ اسی طرح ویلیم نامی مسکن دوا کے مضر اثرات بھی جلد ہی معلوم ہو گئے۔ اس سے مریض پر غنودگی طاری رہتی ہے، قوت فکر متاثر ہونے لگتی ہے اور ذہن الجھا الجھا رہتا ہے، بھوک بڑھ جاتی ہے، سڑک پار کرتے ہوئے ڈر لگنے لگتا ہے وغیرہ وغیرہ

یہ ادویات عام طور پر مرض کی ظاہری علامات کو ختم کر دیتی ہیں جب کہ مرض جوں کا توں برقرار رہتا ہے۔ اس کے علاوہ شاید ہی کوئی دوا ایسی ہو جس کے مضر اثرات نہ ہوں۔ حتیٰ کہ اینٹی بائیوٹکس جن کو ایلوپیتھی طریقۂ علاج میں عظیم انقلاب سمجھا جاتا ہے اور جن سے متعدی امراض کا علاج بڑے وثوق سے کیا جاتا ہے، مضر اثرات سے بری نہیں ہیں۔ یہ اینٹی بائیوٹک جسم سے جراثیم کو دور نہیں کرتے بلکہ ان پر حملہ کر کے بیماری سے نجات دلاتے ہیں۔ اس طرح ان سے جسم کی قوت مدافعت کم ہوتی ہے اسی لئے بار بار ان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایک مریض جس دوا کی مقدار کا عادی ہو جاتا ہے اس سے زیادہ سے ہی پھر اس کا علاج کیا جا سکتا ہے کیوں کہ بیماری کے جراثیم بھی آہستہ آہستہ ان اینٹی بائیوٹکس کے عادی ہو جاتے ہیں اور ان کا اثر قبول نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدی بیماریاں جن کو ختم کرنے کا دعویٰ کیا جا چکا ہے، دوبارہ سر ابھار رہی ہیں جیسے چیچک، ملیریا، پولیو وغیرہ۔ چناں چہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اینٹی بائیوٹکس بیماری کا عارضی علاج کرتے ہیں۔ ان سے جراثیم ہلاک تو ہو جاتے ہیں لیکن مناسب ماحول ملتے ہی دوبارہ حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

مغربی طب (ایلوپیتھی) کے ان مضر اثرات کے سبب ہی مغرب میں بھی زیادہ سے زیادہ لوگ آج کل دیسی علاج پر توجہ دے رہے ہیں۔ ہندوستان میں ہی نہیں غیر ممالک جیسے انگلینڈ، امریکہ، جرمنی، جاپان، چین وغیرہ میں بھی دیسی دواؤں پر ریسرچ کی جا رہی ہے۔ جڑی بوٹی والی ادویات پر تحقیقات کے نئے نئے ادارے قائم ہو رہے ہیں۔ جگہ جگہ نباتاتی دواؤں پر سمینار اور مذاکرے منعقد کئے جا رہے ہیں۔

فلپینز (PHILIPINES) کے ایک تحقیقاتی ادارے نے حال ہی میں طبی اثرات رکھنے والے پودوں سے متعلق ایک گائیڈ بک .... شائع کی ہے

فجی میں بھی اسی طرح کا تحقیقاتی کام چل رہا ہے یہاں ایک مقامی پودے میں واقع سرطان (CANCER) خواص کا پتا چلا ہے۔ ایک اور پودے میں امراض قلب کے لیے مفید اثرات پائے گئے ہیں۔ ایک دیگر پودے کو سل و دق کے علاج کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ویتنام میں تقریباً سو پودوں کو ادویات کے اعتبار سے بہت مفید پایا گیا ہے۔ حکومت کی زیر سرپرستی بہت سی نباتاتی دواؤں سے کھانسی کا شربت، سر درد کی گولیاں، خارش کے مرہم، ماہواری کی بے قاعدگی اور دیگر امراض کی دوائیاں تیار کی جا رہی ہیں۔ یہاں حکومت نے ایک قانون کے ذریعہ ضروری قرار دیا ہے کہ ہر گاؤں میں کم از کم دو ہیکڑ قطع زمین پر دواؤں کی کاشت کی جائے۔

انڈونیشیا میں بھی جڑی بوٹیوں پر جدید تحقیقات کی جا رہی ہیں اور ان دواؤں کے استعمال کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ چین میں دیسی طب کو مغربی طب کے مقابلہ برابر کا فروغ دیا جا رہا ہے۔ ہزاروں سال پرانے نسخے وہاں آج تک مستعمل ہیں۔ بہت سی لیبارٹریاں مقامی پودوں پر تحقیقات میں مصروف ہیں۔

ہندوستان میں مغربی طب کے محققین نے آیورویدک طریق علاج کو تسلیم کر لیا ہے۔ ذیابیطس کے علاج میں کریلے کے رس سے خون میں شکر کی مقدار کو کم کیا جا سکتا ہے۔ سویڈن اور سری لنکا کی ایک مشترکہ ٹیم اس سلسلے میں مزید تحقیقات کر رہی ہے۔

طب یونانی کی طرف لوگوں کی توجہ جہاں ایک طرف مغربی طب کے مضر اثرات کے خلاف ان کا رد عمل ہے، وہیں خود

اس کی ان افادیت اور خوبیاں بھی اس کے لیے ذمہ دار ہیں۔

اس طریقہ علاج میں بنیادی طور پر مریض کا علاج بحیثیت مجموعی کیا جاتا ہے۔ یہ مجموعی انداز علاج ہی دراصل اس کی مقبولیت و افادیت کا سبب ہے۔ مریض کے ذہنی مزاجی، معاشرتی ماحول کو مدنظر رکھا جاتا ہے جب کہ طب جدید صرف مرض پر نظر رکھتی ہے یونانی طب میں قدرت سے حاصل جڑی بوٹیوں سے علاج کیا جاتا ہے جو انسان کے مزاج کے عین موافق ہوتی ہیں۔ مریض کے ماحول اور حالات کا پورے طور پر جائزہ لیا جاتا ہے اور اس کا کلی طور پر علاج کیا جاتا ہے یہ طب انسانی جسم کی دیکھ بھال اس کی طبعی مناسبت سے کرتی ہے۔ ہر انسان کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ صحت و مرض میں اس مزاج کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس لئے طب یونانی مختلف مزاجوں کے اعتبار سے علاج کرتی ہے۔ اس میں انسان کے جسمانی حالات کا بغور مطالعہ کر کے اس کی مناسبت سے دوا تجویز کی جاتی ہے۔ طب یونانی کے مطابق انسانی جسم چار بنیادی چیزوں یعنی ہوا، پانی مٹی اور آگ (دھوپ) سے بنتا ہے۔ ان چاروں چیزوں کے مختلف اوزان میں جسم میں موجودگی سے مختلف اخلاط بنتے ہیں جنھیں مزاج کہا جاتا ہے۔ یہ چار طرح کے ہوتے ہیں، خون، بلغم، صفرا اور سودا۔ جسم میں ان اخلاط کی توازن میں موجودگی صحت کی ضامن ہوتی ہے۔ ان میں عدم توازن سے آدمی بیمار ہو جاتا ہے۔ جسم کی قوت مدافعت کو خاص اہمیت حاصل ہے کچھ دواؤں کے ذریعہ قوت مدافعت کو بڑھا کر بیماری کا علاج کیا جاتا ہے اور اخلاط کے عدم توازن کو دواؤں، غذاؤں، عادت کے کنٹرول، تدابیر اور پرہیز سے واپس توازن پر لایا جاتا ہے۔

اس طریقہ علاج میں تین طرح کی ادویات استعمال کرائی جاتی ہیں نباتاتی (VEGETARIAN)، حیاتیاتی اور معدنیاتی (MINERAL) — ان میں جواہر و موتی بھی شامل ہیں۔

غذا کے کنٹرول کے ذریعہ بھی علاج میں مدد پہنچائی جاتی ہے۔ پرہیزی کھانے سے انسان کو جلد ٹھیک ہونے میں مدد ملتی ہے۔

بیماری کی شناخت میں نبض کی خاص اہمیت ہے۔ گو آج کل اس کے پہچاننے والے کم یاب ہیں۔ لیکن مسلسل تجربات سے انسان اس پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔ نبض کے علاوہ پیشاب، پاخانہ، زبان، آنکھوں کی رنگت وغیرہ کا معائنہ بھی کیا جاتا ہے۔

جراثیم کو اس طریقہ میں اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے جیسا کہ ایلوپیتھی میں۔ کیوں کہ اخلاط کے توازن سے جسم میں جراثیم سے لڑنے کی طاقت رہتی ہے اور جراثیم خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی قوت مدافعت کو مختلف ادویات سے بڑھایا جاتا ہے۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس طب میں علاج کے تین طریقے استعمال کئے جاتے ہیں، علاج بالتدبیر، علاج بالدوا، علاج بالغذا، اگر ہمیں صاف ستھری ہوا میسر ہو، خالص آب ملتی ہو۔ سونے، جاگنے، محنت و آرام کے اوقات مقرر ہوں اور ان میں اعتدال ہو تو ہماری صحت برقرار رہتی ہے۔ یہ طب انسان کی بیماریوں کا علاج قدرتی طریقہ سے کرتی ہے جو عین انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔

ان طبی اصولوں کو اپنا کر بعض اوقات اطبا نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر بعید از دلچسپی نہ ہوگا۔

ایک نوجوان مشہور طبیب رازی کے پاس آیا۔ اس کے منہ سے خون آتا تھا۔ رازی نے نبض کے ذریعہ نفث الدم کی علامات اس میں پائیں۔ رازی کے استفسار پر اس نوجوان نے بتایا کہ راستہ میں اس نے ایک تالاب سے پانی پیا تھا۔ رازی نے اس کو کائی کھلائی۔ اور یہاں تک کھلائی کہ اسے قے ہوگئی۔ قے کو دیکھا گیا تو اس میں جونک پائی گئی جو کائی سے چپک کر قے کے ذریعے باہر آگئی۔ یہ جونک پانی کے ساتھ اندر جا کر اس کے معدے کے منہ پر چپٹ گئی تھی اور جب کائی معدے میں پہنچی تو وہ اس کو چھوڑ کر کائی سے لگ گئی اور قے کے ساتھ باہر آگئی۔

ابن زہر (۱۱۶۲ء) جو اپنے عہد کا یکتا طبیب تھا اور شاہی طبیب بھی تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ایک شخص کو دیکھا جو مرض استسقار میں مبتلا تھا۔ اس نے مرض کے اسباب پر غور کیا اور حالات کا جائزہ لیا۔ اس نے دیکھا مریض کے قریب ایک مٹکا رکھا تھا۔ اس میں جہاں کا لو پانی کچھ متاثر نظر آیا، مٹکا توڑا تو اس میں ایک سڑا ہوا مینڈک برآمد ہوا۔ اس طرح اصل سبب مرض معلوم ہونے کے بعد ابن زہر نے اس کا علاج کیا اور چند ہی دنوں میں وہ مریض صحت یاب ہوگیا۔

انسانی فطرت کے مطابق ہونے کے علاوہ یہ علاج سستا اور عام فہم بھی ہے اس لیے یہ قبول عام حاصل کرتا جا رہا ہے جو لوگ مغربی معالجین کی بھاری فیس ادا کرنے سے قاصر ہیں وہ بھی اسی طرف رجوع کر رہے ہیں۔

امریکہ، یورپ اور عرب کے بیشتر ممالک اس کی افادیت کو سمجھ کر طب یونانی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ خصوصاً امریکہ، روس، اسپین اور مغربی جرمنی میں مختلف مقامات پر اس کے سینٹر قائم ہو رہے ہیں۔ طب کی عربی کتابوں کے ترجمے انگریزی میں ہو رہے ہیں جن میں اسحاق بن حسین کی کتاب "العشر مقالات فی العین" اور علی بن عباس کی کتاب "کامل الصناد" بھی شامل ہے۔

ہندوستان میں بھی یہ طب خاطر خواہ ترقی پا رہی ہے۔ آج کل اس کے رجسٹرڈ معالجین کی تعداد تقریباً پچاس ہزار ہے۔ ۲۳ یونانی کالج عوام میں اس طب کی تعلیم عام کئے ہوئے ہیں ان میں سے بعض میں ایم۔ ڈی کی ڈگریاں بھی تفویض کی جاتی ہیں حکومت کے زیر انتظام بھی ایک تحقیقاتی کونسل قائم ہے جس کے زیر سایہ تقریباً ۳۲ مقامات

باقی صفحہ پر

رئیس صدیقی

ہاکی۔ ابتدا اور ارتقا کے آئینہ میں

ھاکی کا کھیل سب سے پہلے کب، کہاں اور کیسے شروع ہوا، اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پھر بھی ہاکی کی ابتدا سے متعلق مختلف روایتیں ملتی ہیں۔

ایک روایت کے مطابق آج سے تقریباً ۴ ہزار سال پہلے ہاکی سے ملتا جلتا ایک کھیل قدیم مصر میں کھیلا جاتا تھا۔ وادیٔ نیل میں بنی حسن کے ایک مقبرے کی دیوار پر ایک تصویر بنی ہوئی ہے جس میں دو آدمیوں کو ہاکی کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مقبرے کی تعمیر دو ہزار سال قبل مسیح ہوئی تھی۔ اس نئی تحقیق سے پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہاکی کا جنم پانچ سو سال قبل مسیح فارس میں ہوا تھا۔ اس خیال کی تائید میں یہ دلیل پیش کی جاتی تھی کہ اس وقت فارس میں پولو کا کھیل بہت مقبول تھا۔ چوں کہ پولو کا کھیل گھوڑوں پر سوار ہو کر کھیلا جاتا تھا۔ اس لیے ممکن ہے کہ درمیانی طبقے کے کچھ لوگوں نے گھوڑوں کا خرچ بچانے کے لیے مڑی ہوئی چھڑی اور گیند سے یہ کھیل کھیلنا شروع کر دیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں قدیم ایران میں وہاں کے مزدور طبقے کے لوگ تفریح طبع کے لیے جھاڑی میں سے ایک چھڑی توڑ کر اس سے ایک چھوٹے اور گول پتھر کو لڑھکا کر ایک کھیل کھیلا کرتے تھے۔

جب ایران کے کچھ مزدور کام کی تلاش میں یونان گئے تو ظاہر ہے کہ اس کھیل کو بھی اپنے ساتھ لے گئے اور وہاں یہ کھیل امید سے زیادہ مقبول ہوا۔ واضح رہے کہ قدیم یونان میں یہ کھیل کھیلا جاتا تھا۔ اس بات کے بہت سے ثبوت ۱۹۲۱ء میں ایتھینس میں ملے ہیں۔ یونان میں پانچ سو سال قبل مسیح بنی ایک تصویر میں چھ آدمیوں کو ہاکی سے ملتا جلتا کھیل کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اس میں چھڑی کا مڑا ہوا حصہ اوپر کی طرف نہ مڑا ہو کر نیچے کی طرف مڑا ہوا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد اہلِ روم نے اس کھیل کو کچھ الگ ڈھنگ سے اپنایا۔ یہ کھیل مڑی ہوئی چھڑی سے کھیلا جاتا تھا۔ گیند چمڑے کی بنی ہوتی تھی۔ اس کے اندر چڑیوں کے پَر بھرے جاتے تھے۔ یہیں سے یہ کھیل دھیرے دھیرے یورپ کے دیگر ممالک میں پہنچا اور مقبول ہونے لگا۔

ہاکی کے جنم کے سلسلے میں امریکہ کا دعویٰ مختلف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً تین سو سال پہلے امریکہ کے ریڈ انڈین افراد ایک کھیل کھیلا کرتے تھے جو موجودہ ہاکی سے بہت ملتا جلتا تھا۔ اس وقت اس کھیل کے لیے کوئی متعین وقت نہیں ہوا کرتا تھا۔ مقررہ دن سورج طلوع ہونے سے پہلے گاؤں کے نزدیک میدان میں دونوں گروہوں کے سیکڑوں کھلاڑی آکر جمع ہو جاتے تھے۔ میدان کے بیچ میں دونوں گروہوں کے مکھیا میچ شروع کراتے وقت باہم مشورہ کرتے۔ جب وہ دونوں کسی فیصلہ پر متفق ہو جاتے تو پاس کھڑے کسی شخص کو اشارہ کر دیتے جو بگل بجا کر دونوں گروہوں کو کھیل شروع کرنے کا سگنل دے دیتا۔ اس کھیل میں گول کرنے کا طریقہ بھی عجیب و غریب تھا۔ ایک گاؤں کے کھلاڑی جب گیند کو لڑھکاتے ہوئے اپنے مدِ مقابل گاؤں کے کھلاڑیوں کی سرحد کے اندر داخل کر دیتے تو ایک گول مان لیا جاتا تھا۔ اس میں مار دھاڑ زیادہ ہوتی اور کھیل کم۔ اس طرح کچھ ہی دیر میں کھیل کا میدان دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی کا میدان نظر آنے لگتا۔

بہرحال کچھ صدیوں قبل یورپ کے الگ الگ ملکوں میں ہاکی سے ملتے جلتے کھیل کو الگ الگ ناموں سے پکارا جانے لگا۔ مثال کے طور پر عہدِ وسطیٰ میں فرانس کے قریبی ملکوں میں یہ کھیل "ہاکے"، کے نام سے کافی دنوں تک کھیلا جاتا رہا۔ یہاں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ فرنچ زبان میں "ہاکے" کا مطلب ہوتا ہے "گڈریے کی چھڑی"۔ فرانس میں چوں کہ سب سے پہلے ہاکی کا کھیل گڈریوں نے اپنایا تھا اس لیے یہ کھیل "ہاکے" کے نام سے جانا گیا۔

ہاکی کا کھیل آئرلینڈ میں ہارلے، اسکاٹ لینڈ میں شنٹی، انگلینڈ میں ہینڈو (HANDO) اور بینڈی (BANDY) کے نام سے مقبول ہوا۔ لیکن موجودہ ہاکی کی جس شکل سے ہم لوگ واقف ہیں اس کا جنم انگلستان میں ہوا اور سب سے پہلے ہاکی لفظ کا استعمال ۱۸۳۸ء میں کیا گیا۔

جوں جوں ہاکی کا کھیل مقبول ہوتا گیا

۹۶، سرسوتی کنج سوسائٹی، ۵ مدر ڈیری روڈ، دہلی ۹۲

اس کے قواعد و ضوابط میں سدھار ہوتا گیا۔ ۱۸۷۵ء میں یہ اصول وضع کیا گیا کہ گیند کرکٹ کی گیند کی طرح مضبوط، ٹھوس اور سفید ہونی چاہیے۔ کوئی بھی کھلاڑی اپنے کندھے سے اوپر اسٹک نہیں اٹھا سکتا اور گول زیادہ سے زیادہ پندرہ گز کی دوری سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ آگے چل کر انگلستان کے مشہور کلب "ویلڈن ہاکی کلب" نے بالکل نئے قواعد و ضوابط بنائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدید ہاکی کی پیدائش ۱۸ جنوری ۱۸۸۶ء کو اس وقت ہوئی جب برٹش ہاکی ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم، جو اس وقت پرنس آف ویلز تھے، اس ایسوسی ایشن کے پہلے صدر منتخب کیے گئے۔

اس ایسوسی ایشن نے ہاکی کے کھیل کو مزید دلچسپ بنانے کی غرض سے اس کے ایک ایک اصول کی تفصیل سے وضاحت کی۔ پہلے کسی بھی درخت کی لکڑی سے ہاکی کی اسٹک بنائی جاتی تھی۔ بعد میں اس کے لیے بید کی لچکیلی لکڑی کا استعمال کیا جانے لگا تاکہ کھلاڑی کو ہٹ کرنے میں آسانی ہو۔ موٹھ کے چاروں طرف دھاگا لپیٹ دیا جاتا تھا تاکہ پکڑ مضبوط رہے۔ ہاکی اسٹک کے نچلے سرے یعنی بلیڈ (BLADE) کی چوڑائی کو ڈھائی انچ سے دو انچ کر دیا گیا جس سے ڈربلنگ (DRIBLING) اور پاسنگ (PASSING) کی تکنیک کو ترقی ملی۔

اس درمیان ایک اسکولی معلم کی کوششوں سے امریکہ میں بھی ہاکی کا چلن شروع ہو چکا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں بین اقوامی ہاکی تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانی ممالک تھے بلجیم، فرانس، آسٹریلیا، ہنگری، اسپین اور سوئزرلینڈ وغیرہ۔

جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے، دوسرے کچھ خاص کھیلوں کی طرح ہاکی کا کھیل بھی ہندوستان میں انگریزی فوج کے ذریعے آیا۔ ۱۸۸۵ء میں کلکتہ میں سب سے پہلے ہندوستانی ہاکی کلب قائم ہوا۔ کچھ برسوں میں "بیٹن کپ" اور "آغا خان کپ" ہاکی مقابلوں کے شروع ہونے کی وجہ سے یہ کھیل ہندوستان میں بہت تیزی سے مقبول ہوا۔

۱۹۰۸ء میں ہندوستان کے پہلے "قومی ہاکی کلب" کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۳۶ء میں ہندوستان کی ناقابل فراموش کامرانیوں کی تقریباً تین دہائی کی ایک شاندار روایت شروع ہوئی اور اس آفاقی سچائی سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی ہاکی کی دنیا میں کچھ ایسے سرکردہ اور ممتاز کھلاڑی پیدا ہوئے جن پر آج بھی ہند کو فخر ہے۔

دوسرے لفظوں میں ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک بین اقوامی ہاکی کی دنیا میں ہند کی اولیت کسی بھی شک وشبہ اور بحث کی گنجائش سے بالاتر رہی ہے۔ اس شاندار کامیابی اور عظمت سے ہمکنار کرنے میں کچھ کھلاڑیوں کا اہم حصہ رہا ہے۔ مثال کے طور پر دھیان چند اور دوسرے۔ ان کھلاڑیوں نے اپنے بے مثال اور شاندار کھیل کے مظاہرے سے نہ صرف ہند میں ہاکی کی جڑیں مضبوط کیں بلکہ اسے بین اقوامی ہاکی جگت میں ایک ممتاز مقام دلایا۔ ●

بقیہ: خواتین کے اردو رسائل

طر لیے ہوئے تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود راشد الخیری تعلیم نسواں کے سچے حامی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عورتیں اپنے خیالات کا اظہار تحریری طور پر کریں تاکہ وہ زیادہ دور تک جا سکیں اور مرد وقت کی آواز کو پہچان کر اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کریں۔

راشد الخیری کی تحریروں میں ہندوستانی مسلم معاشرے کی عورتوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ پوری طرح موجزن نظر آتا ہے۔ انھوں نے اسلام میں عورت کی حیثیت اور اس کے حقوق پر اپنے مقبول رسالے "عصمت" میں روشنی ڈالی ہے۔ راشد الخیری نے "عصمت" میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو پیش کیا صرف یہی نہیں بلکہ اردو کے ابتدائی ناول نگاروں میں بھی ایک اہم مقام حاصل کیا۔ راشد الخیری وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عورتوں کی تحریروں کو "عصمت" میں شائع کر کے ان کی ہمت افزائی کی۔

۱۹۴۷ء میں "عصمت" کراچی منتقل ہو گیا اور آج بھی وہیں سے شائع ہو رہا ہے۔ "عصمت" کا کارنامہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں اردو ادب کی بہت سی مشہور خواتین نے اپنے علمی سفر کا آغاز اسی رسالے سے کیا۔

ضمیمہ

اوپر ہم نے عورتوں کے تین رسالوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔ جس میں "تہذیب النسواں" اور "عصمت" نے ایک طویل عرصے تک ادبی خدمات انجام دیں جس سے سماج کے بدلتے ہوئے مزاج کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

ان رسائل کی، جن کا تعلق عورتوں کی زندگی ان کے مسائل اور موضوعات سے تھا، اشاعت مردوں نے کی حالاں کہ "خاتون" اور "تہذیب النسواں" کو نکالنے میں عورتوں نے بھی بھرپور تعاون کیا۔ یہ عورتیں عورتوں کو تعلیم یافتہ، باصلاحیت اور روشن خیال مثالی عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھیں۔

ان رسائل نے مردوں کی توجہ عورتوں پر ہونے والی زیادتیوں کی طرف مبذول کرائی۔ چوں کہ عورتوں نے سماج کی اس بے انصافی کو خاموشی سے قبول کر لیا تھا اور نتیجے کے طور پر عورتیں اپنی ذات کے حصار میں قید ہو کر رہ گئیں۔ ان کی شخصیت کو ابھرنے کے مواقع نہیں ملے۔ ان رسائل کا مقصد عورتوں کو اس حالت سے باہر لانا تھا۔ اس لیے ان رسائل میں اس ضرورت کو مدنظر رکھ کر جو مواد شامل کیا گیا اس میں اس بات کو خاص اہمیت دی گئی تھی کہ ایسا مواد ان رسائل کے ذریعے عورتوں تک پہنچے جو انھیں گھر سے باہر کی دنیا اور اپنے حقوق سے باخبر کرا سکے۔ ان میں اتنی صلاحیت پیدا ہو سکے کہ وہ چیزوں کو رد اور قبول کر سکیں۔ حالاں کہ شروع میں یہ کام بہت مشکل تھا لیکن دھیرے دھیرے اسے ایک استحکام حاصل ہوتا گیا اور سماج میں عورت کو وہ مقام حاصل ہو گیا جہاں اس کی آواز کو سنا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل اختر

عصمت: سوانحی و ادبی خاکہ

(قسط اول)

عصمت کا تعلق پریم چند کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں کی اس نسل سے ہے، جس میں بیدی، کرشن چندر اور منٹو جیسے فنکار پیدا ہوئے۔ جنھوں نے نہ صرف دو طرح کا ہندوستان دیکھا بلکہ اس میں ان کی پرورش و پرداخت اور ذہنی تربیت بھی ہوئی، جس نے ان کے شعور کی راہیں متعین کیں۔

عصمت کی پیدائش ۲۱ر اگست ۱۹۱۵ء میں یوپی کے قصبہ بدایوں کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مرزا نسیم بیگ چغتائی، والدہ کا نام نصرت خانم عرف چھو، دادا کا نام مرزا کریم بیگ چغتائی تھا۔ ان کا سلسلہ نسب چنگیز خاں سے ملتا ہے۔ ننیہالی سلسلے کا ایک سرا حضرت عثمان غنی رضہ سے تو دوسرا سلیم چشتی سے ملتا ہے۔ اس طرح حسب نسب کے اعتبار سے عصمت کو دونوں خاندانوں کی صفات یعنی چنگیزی شان و شوکت اور جاہ و جلال اور عثمانی بزرگی و فضیلت ورثے میں ملی تھی، جس نے ان کی شخصیت کی تعمیر اور فکر و شعور کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے مزاج کی چنگیزیت ان کی شخصیت پر پوری زندگی حاوی رہی۔

عصمت اپنے دس بھائی بہنوں میں نویں تھیں۔ کثرت اولاد کی وجہ سے عصمت کی پرورش و پرداخت اس توجہ کے ساتھ نہ ہو سکی جس طرح ہونی چاہیے تھی۔ بلکہ والدین کی بے توجہی اور لاپروائی کے سبب ان کی پرورش کلی طور پر گھر کے نوکروں پر منحصر تھی، جس کا شدید احساس عصمت کو تھا۔ اپنی اس محرومی کا گلہ ان لفظوں میں کرتی ہیں:

"مجھے بذات خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ کچھ پکڑ بچوں کے جم غفیر میں ایک پا پیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی۔ نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی۔ نہ خود کو کبھی کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔"[ا]

اس کے برعکس عصمت کو بچپن ہی سے ایک کھلا اور آزاد ماحول بھی ملا تھا۔ جس نے ان کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما اور ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ جس کا اظہار عصمت یوں کرتی ہیں:

"میں جس ماحول میں پلی وہ نسبتاً آزاد تھا۔ لڑکے لڑکیوں میں زیادہ پابندیاں نہیں تھیں۔ مجھے بڑی بہنوں کی اور میری عمر میں کافی فرق تھا اس لیے میری تربیت زیادہ تر بھائیوں کے ساتھ ہوئی تھی۔ پھر میری اماں کچھ زیادہ دھل نہیں دیتی تھیں۔ اس لیے مجھے آزادی سے سوچنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"[۲]

ایک دوسرے مضمون میں اس طرح ذکر کرتی ہیں:

"بہنیں چوں کہ بڑی نکل گئیں اس لیے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ کھیل کود کا زمانہ انھیں کے ساتھ گلی ڈنڈا فٹبال اور ہاکی کھیل کر گزرا۔ پڑھائی سے بھی ان کے ساتھ ہی ہوئی۔ سچ پوچھیے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے۔ جن کی صحبت نے مجھے ان ہی کی طرح آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم و حیا جو عام طور پر درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے پنپ نہ سکی۔ چھوٹی سی عمر سے دوپٹہ اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھاڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔ سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق و چوبند تھے۔ کنبہ کا کنبہ حد درجہ بامذاق اور بیباک تھا، آپس میں چیختے، چلاتے، نئے نئے جملے تراشے جاتے، ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں، بچے بچے کی زبان پر سان رکھ جاتی۔"[۳]

جس آزادانہ ماحول میں عصمت کی تربیت ہوئی اور ان کا بچپن گزرا اس نے عصمت کی فطرت میں بچپن ہی سے بے باکی، خودسری، ضد اور باغیانہ رویے کو فروغ دیا۔ جس نے آگے چل کر ایک باغی عصمت کا روپ دھارن کر لیا۔

عصمت کے شعور کی اس بیداری میں جہاں ایک طرف گھر کی تربیت تھی تو دوسری طرف گرد و پیش کے وہ سماجی حالات و واقعات بھی تھے جن میں عصمت پرورش پا رہی تھیں۔ سماج میں موجود عدم مساوات، ناانصافی اور عورتوں پر ہو رہے مظالم سے بھی ان کا براہ راست واسطہ تھا۔ عصمت نے ان سب سے اثرات قبول کیے

۲۲۔ ماہنامہ ہاشل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی، ۹۷

ذاتی مشاہدات و تجربات نے ان کی فطرت میں موجود ان عناصر کو ایک باغیانہ اور ضدی رجحان میں تبدیل کر دیا۔

عصمت کی شخصیت اور ذہن کی تعمیر میں گھر کی تربیت، گرد و پیش کے سماجی حالات کے ساتھ ساتھ اس تعلیمی ماحول نے بھی اہم کردار ادا کیا جہاں جہاں عصمت نے تعلیم حاصل کی یوں تو عصمت کا گھرانہ تعلیم کے معاملے میں بہت روشن خیال تھا۔ لیکن ان کی تمام روشن خیالی سماج کے عام گھرانوں کی طرح صرف مردوں کی تعلیم تک محدود تھی۔ عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں وہی فرسودہ نظریہ تھا جو سماج میں عام تھا۔ اس لیے عورتوں کی تعلیم کے معاملے میں یہ گھرانہ بھی سماج کے عام گھرانوں کی طرح تھا۔ البتہ عصمت کے والد اور بڑے بھائی قدرے آزاد خیال تھے۔ لیکن گھریلو اور سماجی بندشوں کی وجہ سے بہت سی حد بندیوں کو عبور کرنے میں بڑی قباحتیں محسوس کرتے تھے۔ پھر بھی عصمت کے والد نے ان حد بندیوں کو توڑنے کی کوشش کی اور عصمت کی دو بڑی بہنوں کو کرامت حسین بورڈنگ میں داخل کرا دیا۔ عصمت بھی ساتھ بھیجی گئیں۔ لیکن خاندان والوں کے لعن طعن پر عصمت کو واپس بلا لیا گیا۔ جس واقعے کی تفصیل عصمت یوں بیان کرتی ہیں:

> "یہ اس زمانے کی بات ہے جب میری بڑی آپا کی شادی ہو گئی تھی۔ لیکن منجھلی اور سنجھلی ابھی چھوٹی تھیں۔ اور نہ جانے کیا سوجھی کہ ابا میاں نے ان دونوں کو کرامت حسین بورڈنگ میں داخل کرا دیا، میں چونکہ منجھلی بہن سے بہت مانوس تھی، مجھے بھی بھیجا گیا۔۔۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ہمیں واپس بلا لیا گیا۔ میں نے بڑے ہو کر پوچھا تو کوئی تسلی بخش جواب نہ پایا۔ بس بڑی بدنامی ہو رہی تھی۔ سارا خاندان بائیکاٹ پر تل گیا کہ تم لڑکیوں کو کرسچن بنا رہے ہو۔ ان کی شادیاں نہ ہو سکیں گی۔ سب کو ساری عمر پالنا۔ اماں نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ ابا نے ہتھیار ڈال دیے۔ میں خوش قسمت تھی کہ دیر سے پیدا ہوئی اور مجھے تعلیم پانے کا موقع ملا۔ وہ بھی کیا کیا جتن کرنے کے بعد۔"

انہی سماجی بندشوں کی وجہ سے عصمت کی تعلیم کی ابتدا روایتی اور گھریلو تعلیم سے ہوئی۔ لیکن عصمت کا ذہن اس طرح کی سکہ بند تعلیم سے پہلے ہی متنفر تھا۔ لہٰذا وہ گھر پر مولوی کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے پر رضامند نہ ہوئیں اور عصمت کی خواہش اور ان کی ضد کو دیکھتے ہوئے چند دنوں کے بعد ان کا داخلہ دھن کوٹ اسکول آگرہ کی چوتھی جماعت میں کرا دیا گیا۔ چوں کہ عصمت پڑھنے میں تیز تھیں۔ لہٰذا چند دنوں کے بعد ڈبل پرموشن پا کر چھٹی جماعت میں آ گئیں۔ کچھ دنوں کے بعد ان کا خاندان آگرہ سے علی گڑھ منتقل ہوا پھر عصمت نے علی گڑھ سے ہی مڈل پاس کیا۔ مڈل کے بعد عصمت کی تعلیم میں سماجی فرسودہ خیالی اور دقیانوسیت کے سبب پھر الجھن پیدا ہوئی۔ چوں کہ مسلم متوسط طبقے میں اس وقت تک عورتوں کی اعلا تعلیم کا تصور عام نہیں تھا۔ لہٰذا گھر کے لوگوں کو بھی خاندان اور سماج کی ان روایتوں کے احترام میں عصمت کی تعلیم روک دینی پڑی اور اس بیچ ان کی شادی کی بھی باتیں ہونے لگیں، جسے عصمت نے کسی طرح رکوایا۔ اس لیے کہ عصمت کو خانہ داری سے کہیں زیادہ دلچسپی تعلیم سے تھی۔ لہٰذا وہ تعلیم حاصل کرنے پر بضد ہو گئیں۔ تعلیم نہ دلوانے کی صورت میں گھر سے بھاگ جانے اور کرسچن ہو جانے تک کی بھی دھمکی گھر والوں کو دی۔ آخر عصمت کی ضد اور تعلیم سے ان کی بے انتہا دلچسپی کو دیکھتے ہوئے والد نے انھیں علی گڑھ جانے کی اجازت دے دی اور والدہ کو بھی اس کے لیے رضامند کر لیا۔ ان دنوں ان کے والد کا تبادلہ سانبھر ہو چکا تھا۔ عصمت علی گڑھ واپس آ گئیں۔ اور ان کا داخلہ نویں کلاس میں ہو گیا اور وہ بورڈنگ میں داخل کر دی گئیں۔ لیکن وہ دسویں کلاس میں داخلہ کی خواہش مند تھیں۔ آخر انھوں نے اپنی یہ خواہش بھی ہزار کوششوں کے بعد پوری کر لی۔ اور سکنڈ ڈویژن سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ بھائی شمیم نے بھی میٹرک کا امتحان ساتھ دیا تھا۔ لیکن وہ فیل ہو گئے۔ عصمت کے پاس ہونے کی خوشی گھر والوں کو نہ ہوئی لیکن بھائی شمیم کے فیل ہونے کا رنج سبھوں کو ہوا اور امتحان کی کامیابی پر ہونے والی پارٹی جس کی تیاری والدہ نے قبل سے کر رکھی تھی ملتوی کر دی گئی۔ دوسری طرف عصمت کی اس کامیابی پر عظیم بیگ چغتائی بے حد خوش ہوئے۔

میٹرک میں کامیابی کے بعد عصمت نے علی گڑھ ہی سے بورڈنگ میں رہ کر ایف اے کی تعلیم ۱۹۳۴ء میں مکمل کی۔ بورڈنگ کی زندگی میں وہ بہت ہی متحرک اور فعال رہیں اور ہر طرح کی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہیں جس سے وہ مختلف طرح کے تجربات و مشاہدات سے بھی دوچار ہوئیں، جو ان کی شخصیت کو نکھارنے اور سنوارنے میں بے حد اہم ثابت ہوئے۔ یہیں ان کو اپنی روم پارٹنر رسول فاطمہ سے ہم جنسی کی نفسیات کا ایک انوکھا تجربہ بھی ہوا۔ جو آگے چل کر مشہور زمانہ افسانہ "لحاف" کا محرک بنا۔

ایف اے کے بعد علی گڑھ میں عورتوں کی اعلا تعلیم کا کوئی نظم نہیں تھا۔ اس لیے عصمت کو علی گڑھ چھوڑ کر لکھنؤ آنا پڑا۔ یہاں بھی آئی ٹی کالج میں داخلے کے لیے عصمت کو اپنے والدین سے بڑی مشکل کے بعد اجازت ملی اور عصمت نے بی اے میں داخلہ لے لیا۔ یہاں کا تعلیمی ماحول اور ہاسٹل کی آزاد زندگی علی گڑھ سے بہت مختلف بلکہ بالکل الگ تھی، جس نے عصمت کے دل و دماغ اور فکر کو ایک نئی سمت اور بالیدگی عطا کی اور یہاں گزارے ہوئے یہ دو سال عصمت کی زندگی کے لیے بے حد اہم ثابت ہوئے۔ جس کا اعتراف عصمت یوں کرتی ہیں:

> "لکھنؤ میں گزارے ہوئے دو سال میری زندگی میں بہت اہم ثابت ہوئے۔ دل و دماغ کو نئی راہیں ملیں۔

نئے دروازے کھلے۔

لکھنؤ سے بی اے کرنے کے بعد پھر واپس علی گڑھ آئیں اور یہاں بی ٹی کورس میں داخلہ لیا۔ اس طرح اپنے آہنی عزم و ارادے کے سہارے تمام دشواریوں اور اڑچنوں سے گزر کر عصمت اپنی خواہش کے مطابق اپنی تعلیم کی اس منزل تک جا پہنچیں جہاں اس وقت مسلم لڑکیوں کا پہنچنا لگ بھگ ناممکن تھا۔

تکمیل تعلیم کے بعد ان کا مسئلہ ملازمت کا تھا۔ عصمت نے جس شعور اور احساس کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی وہ محض ایک شوقیہ مشغلہ نہ تھا بلکہ وہ اپنی تعلیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر خود کفیل بننا چاہتی تھیں۔ وہ جہالت اور دوسروں پر معاشی انحصار کی وجہ سے عورتوں پر ہو رہے ظلم اور استحصال سے بخوبی واقف تھیں۔ اس لیے وہ لڑکیوں کی ملازمت کو بھی اتنی اہمیت دیتی تھیں جتنی کہ تعلیم کو۔ لہٰذا انھوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ ملازمت کا فیصلہ کیا اور ریاست جاورہ کے ایک گرلس اسکول میں ہیڈمسٹریس کی حیثیت سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ تقریباً ایک سال ریاست جاورہ میں ملازمت کے بعد عصمت نے ۱۹۳۷ء میں گرلز اسکول بریلی میں اسی عہدے پر ملازمت کی پیش کش قبول کر لی۔ لیکن یہاں بھی زیادہ دنوں تک نہ رہ سکیں اور بی ٹی کے بعد جودھپور راج محل گرلز اسکول میں پرنسپل کی حیثیت سے نئی ملازمت قبول کر لی۔ جودھپور میں کچھ مدت تک پرنسپل کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دینے کے بعد عصمت ۱۹۴۱ء میں انسپکٹر میونسپل اردو اسکولز بن کر بمبئی چلی گئیں اور پھر وہیں سپرنٹنڈنٹ آف میونسپل اسکولز کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنے شوہر شاہد لطیف کی وجہ سے فلمی دنیا سے منسلک ہو گئیں اور بہت سی فلموں کے لیے کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے اور اداکاری بھی کی۔ ان کی فلمی کہانیوں میں "گرم ہوا" کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے فلم انڈسٹری کے کچے چٹھے کو بھی اپنی مختلف تحریروں میں بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے حساس ادبی شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھیں کئی فلمی ایوارڈ بھی ملے ہیں۔

علی گڑھ ہی میں بی ٹی کی تعلیم کے دوران عصمت کی ملاقات شاہد لطیف سے ہوئی۔ جو وہیں ایم اے کر رہے تھے۔ یہیں سے شاہد اور عصمت کی دوستی کا آغاز ہوا۔ یہ دوستی دہلی اور بمبئی میں مزید گہری ہوئی اور پھر دونوں نے ۲ مئی ۱۹۴۲ء کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر اس دوستی کو انجام تک پہنچایا۔ چوں کہ شادی عصمت نے اپنی پسند سے کی تھی اس لیے گھر کے بیشتر افراد اس شادی سے خوش نہیں تھے اور بڑے بھائی کو اتنا رنج ہوا کہ مرتے دم تک عصمت کی شکل نہ دیکھی۔ لیکن عصمت نے اپنی عادت کے مطابق ان سب باتوں کی کبھی پروا نہ کی اور وہی کیا جو اپنے لیے بہتر سمجھا۔ عصمت کی ازدواجی زندگی شاہد لطیف کی روشن خیالی کی وجہ سے بے حد خوش گوار گزری۔ شاہد نے عصمت کو نہ صرف برابر کا درجہ دیا بلکہ ان کے تمام جائز حقوق کا بھی پورا پورا خیال رکھا۔ شاہد لطیف ۱۹۶۷ء میں عصمت کو داغ مفارقت دے گئے اور ایک بہترین ازدواجی زندگی کا اختتام ہو گیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عصمت نے بچپن سے شادی تک کی زندگی میں وہی کیا جو ان کی طبیعت میں آیا۔ خواہ اس کے لیے انھیں کتنا ہی جتن کیوں نہ کرنا پڑا۔ لیکن کبھی اپنے آپ کو گھر والوں یا حالات کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ ان حالات کو بدلنے کی کوشش کی۔ جس کی وجہ سے ان کی خواہشات کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی۔ اس کے لیے عصمت نے شروع ہی سے احتجاج کے مختلف انداز کو جو کارگر ہو سکتے تھے اپنایا۔ اپنے جائز حق کے حصول کے لیے والدین سے لے کر اسکول اور کالج کے ذمہ داران تک سے لڑائی مول لی اور کامیابی حاصل کی اور یہی زندہ دل اور حساس انسان کی پہچان ہے۔ عصمت چوں کہ بے حد حساس تھیں۔ لہٰذا انھوں نے بچپن ہی سے حق تلفی اور غیر مساویانہ سلوک کے تئیں گھر سے ہی احتجاج کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انھوں نے اس وقت کے سماج میں مردوں کی برتری اور عورتوں کی کمتری کو بہت قریب سے دیکھا اور اس سے براہ راست خود بھی متاثر ہوئیں۔ بچپن میں کھیل کود یا کھانے پینے کا معاملہ ہو یا حصول تعلیم کا ہر سطح پر بھائیوں کے مقابلے میں بہنوں پر کم توجہ، بھائیوں کے مقابلے زندگی کی دوسری سہولیات میں بہنوں کے تئیں نابرابری کے باعث عصمت کو ہر قدم پر اپنے مساویانہ حقوق کو حاصل کرنے کا جذبہ اکساتا رہا اور بھائیوں کے برابر سہولت حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہیں جس میں بہت حد تک ان کو کامیابی ملی۔ گھوڑسواری کا معاملہ ہو یا اسکول اور کالج میں تعلیم کا، عصمت نے ہر سطح پر اپنی بات گھر والوں سے منوائی اور سماجی بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کی، کامیابی پر اپنی فتح مندی کا احساس بھی ہوا اور خود اعتمادی کی قوت میں اضافہ بھی۔ جس نے زندگی کی بڑی لڑائی لڑنے کے لیے ان کو قوت بخشی۔

یہ تو گھر کا معاملہ تھا، سماج اور گرد و پیش کے بھی حالات بہت خراب تھے۔ عورتوں کا استحصال ہر سطح پر ہو رہا تھا۔ مساویانہ حق کی بات تو الگ ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ آگرہ کا ایک تجربہ انھوں نے یوں بیان کیا:

"اور آگرہ کی ان مردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ عورت خدا نے کیوں پیدا کی۔ مری پٹی مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت، دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔ مہترانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے پاس پڑوس کی تمام ہی عورتیں آئے دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتی تھیں اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتی۔ اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے۔"[6]

عورتوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا عام رجحان سماج میں موجود تھا۔ عصمت نے ان تمام حالات کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ ان تمام حالات نے عصمت کی فکر پر اپنے اثرات مرتب کیے اور عصمت عورتوں کے تئیں سماج کے اس غیر مساویانہ رویّے پر غور و فکر کرنے پر

مجبور ہوئیں اور اس کی اصلاح کی فکر ان کے دامن گیر ہوئی اور یہیں سے عصمت کے افسانوں کا خمیر تیار ہوا جو آگے چل کر ان کی فکر کا اہم جزو بن گیا۔

عصمت کی فکر پر سماجی حالات کے ساتھ ساتھ سیاسی حالات بھی اثر انداز ہوئے۔ عصمت نے نہ صرف دو طرح کا ہندوستان دیکھا بلکہ ہر لمحہ بدلتی زندگی کا بھی بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ عصمت نے جس وقت آنکھ کھولی اس وقت ہندوستان کے منظر نامے پر زبردست تبدیلی ہو رہی تھی۔ ایک پورا سماجی نظام تھا جو بدل رہا تھا اور ایک نیا نظام اس کی جگہ لے رہا تھا۔ عصمت نے جہاں ایک طرف اس نظام کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا وہیں نئے نظام اور نئی اقدار کو پروان چڑھتے ہوئے بھی دیکھا۔ اسی دوران ہندوستان میں آزادی کی تحریک زور پکڑ چکی تھی، پھر ملک آزاد ہوا، تقسیم کا اندوہناک واقعہ پیش آیا، جس کے نتیجے میں پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ مشترکہ کلچر تباہ و برباد ہوا، بھائی چارے کی فضا مسموم ہوئی اور ہزاروں سالوں کی تہذیب و تمدن اور سماجی نظام کا پورا ڈھانچہ بکھر گیا۔ نئے سماجی آرڈر کے مطابق ایک نیا نظام وجود میں آیا۔ پورا ملک اس دردناک تاریخی سانحے سے بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر متاثر ہوا۔ ان تمام واقعات و حادثات نے عصمت کی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے وہ خود لکھتی ہیں

"ہم نے جب آنکھ کھولی تو ہندوستان غلامی کی بیڑیاں توڑ رہا تھا زندگی کے ہر شعبے میں غلامانہ اقدار اور ذہنیت دم توڑ رہی تھی۔ اس ابھرتے ہوئے ہندوستان سے ہم نے جرأت، بہادری اور قربانیاں دینے کا ادراک حاصل کیا۔
ہم نے دو دور دیکھے۔ آزادی سے پہلے اپنی ذاتی خواہشات اور مفادات کو آزادی کی خاطر قوم و ملک کی خاطر قربان کر دینا اور پھر آزادی کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی لوٹ کھسوٹ، دھاندلی اور چور بازاری دیکھی۔"[۵]

یہ تمام تبدیلیاں اس وقت وجود میں آ رہی تھیں۔ جب عصمت بلوغیت کی منزلوں میں قدم رکھ رہی تھیں اور ان کے فکر و شعور کی راہیں متعین ہونے والی تھیں۔ عصمت زندگی کی ان پیچیدگیوں سے متصادم ہوئیں۔ اور ان سے نکلنے کی راہیں ڈھونڈھیں۔ زندگی کے اس وسیع اور عمیق مشاہدے اور تجربے نے ان کے اندر زندگی کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے کا شعور بخشا اور یہی تجربات ان کی فکر کا حصہ ہے اور ان کی شخصیت کی پہچان۔

(جاری)

حواشی

۱۔ عصمت چغتائی، آپ بیتی، آپ بیتی نمبر، عس اور شخصیت نمبر، ستمبر ۱۹۷۸ء۔ جلد ۴، شمارہ ۵، مارچ ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۷۹۔
۲۔ یونس اگاسکر، عصمت چغتائی سے گفتگو، مکالمات، دہلی، دسمبر ۱۹۹۱ء جلد ۱، شمارہ ۱۲ صفحہ ۱۴۔
۳۔ حوالہ نمبر ۱ کی تفصیل۔
۴۔ عصمت چغتائی، میری آپ بیتی، آدھی عورت آدھا خواب، نئی دہلی، بیسویں صدی پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء صفحہ ۸۔۷۔
۵۔ عصمت چغتائی، "کاغذی ہے پیرہن" آج کل نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۸۔
۶۔ حوالہ نمبر ۱ کی تفصیل۔
۷۔ عصمت چغتائی، "کاغذی ہے پیرہن" آج کل، اکتوبر ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۸۔۲۷۔

بقیہ: ہندوستانی معیشت۔ ایک جائزہ

کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت نے ملک کے صنعتی قوانین میں بڑے پیمانے پر تبدیلی کی اور درآمدات و برآمدات کے مرحلے کو آسان بنایا۔ ان تمام تبدیلیوں کے ساتھ حکومت نے ۔ فی صد کی صنعتی ترقی کا ہدف مقرر کیا تھا لیکن اس منصوبے کے دوران صنعتی ترقی کا تناسب اوسطاً ۵ر۸ فی صد تک ہی حاصل کیا جا سکا۔ منصوبے کے ابتدائی تین سالوں میں صنعتی ترقی کی رفتار اوسطاً ۶ فی صد رہی، یعنی چھٹے پنج سالہ منصوبے میں صنعتی ترقی کی رفتار گزشتہ منصوبوں کی صنعتی ترقی کی رفتار سے بھی کم متعین کی گئی۔ چند صنعتوں جیسے اسپات، سیمنٹ، لوہا، کھاد، سوتی کپڑا، چینی، دوائیں وغیرہ میں ترقیاں نشانے سے بھی کم رہیں وہیں ٹیلی فون کے سامان، الیکٹرانک، کار، موٹر سائیکل وغیرہ صنعتوں میں نشانے سے بھی زیادہ پیداوار ہوئی۔

ساتواں پنج سالہ منصوبہ (۱۹۸۵-۹۰ء)

سماجی انصاف کے ساتھ اقتصادی ترقی کے مقصد سے منصوبہ بنایا گیا اور یہیں سے کھلے پن کا دور شروع ہوا۔ جس میں صنعت کے ساتھ ساتھ درآمدات و برآمدات کی پالیسی کو بھی نرم بنایا گیا۔ اس منصوبے میں بنیادی طور پر چند نکات تھے۔ جدید ٹکنالوجی کو اختیار کرنا اور صنعتی ڈھانچے کو قائم کرنے میں حائل دشواریوں کو دور کرنا۔ درآمدات والی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرنا، الیکٹرانکس اور کمپیوٹر کی صنعتوں پر زور دینا۔ درج ذیل صنعتوں کی ترقی و توسیع کے لیے کوشش کی گئی۔ اسپات، چینی، لوہا، جوٹ، سوتی کپڑا، چینی، کوئلہ، سیمنٹ، انجینیرنگ، کاغذ، الیکٹرانکس وغیرہ۔

اس لحاظ سے ساتواں پنج سالہ منصوبہ کامیاب تھا کہ اس میں صنعتی ترقی کی شرح ۷ر۸ فی صد سالانہ متعین کی گئی تھی جو کہ اس دوران ۵ر۸ فی صد رہی۔

آٹھواں پنج سالہ منصوبہ (۱۹۹۲-۹۷ء)

یہ منصوبہ اس لحاظ سے اہم تھا کہ اقتصادی ترقی کی دوڑ میں کھلا پن بین الاقوامی ماحول میں شروع ہوا۔ اس منصوبے میں صنعتی علاقوں کے پھیلاؤ، ترقی اور ان میں کھلا پن لانے کے لیے ماحول پیدا کیا گیا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے حکومت نے صنعتی، تجارتی اور غیر ملکی تجارت وغیرہ کے لائحہ عمل میں تبدیلی کر کے انہیں اور زیادہ نرم بنا دیا اور اقتصادیات کو کھلے پن اور بین الاقوامی سمت کی جانب موڑنے کی کوشش کی اور صنعتی حلقوں کے ساتھ ساتھ نجی حلقوں کی توسیع کے لیے بھی بنیادیں فراہم کی گئیں۔

●

ڈاکٹر نسیم احمد

اختر اورینوی کے افسانوں میں ماجرا نگاری

اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کا سفر کافی پھیلا ہوا اور کئی جہتوں میں ہے۔ اس لیے اس سفر کو کسی مختصر مضمون یا مقالہ میں محدود کر دینا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ افسانے کے اس طولانی سفر میں انھوں نے کئی کروٹیں بدلیں کبھی نیاز فتحپوری کے ادب لطیف سے متاثر ہوئے اور کبھی ترقی پسند تحریک کی حقیقت پسندی اور عوامی تحریک نے ان کے قلم کی رہوار پکڑی، اپنی ابتدائی زندگی کی افسانہ نگاری میں ماجرا نگاری اور قصہ گوئی میں صرف تخیلاتی سہاروں کو کام میں لاتے رہے۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا جو سراسر ایک رومانی افسانہ تھا۔ بعد میں وہ اپنے مزاج اور فکر میں خاصی تبدیلی لائے اور مختلف ملکی، غیر ملکی، سماجی، معاشرتی، سائنسی، یہاں تک کہ علامتی طرز تحریر کو اپنی فکر کا جزو بنایا۔ قصہ گوئی ایک فن ہے اور اس فن سے وہ کبھی گریزاں نہیں ہوئے، عام دلچسپی کو وہ ہر حال میں باقی رکھنا چاہتے تھے۔ ماجرا نگاری ان کی کہانیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اب تک ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں — (۱) منظر و پس منظر (۲) کلیاں اور کانٹے (۳) انار کلی اور بھول بھلیاں (۴) سیمنٹ اور ڈائنامائٹ (۵) کیچلیاں اور بال جبریل (۶) سپنوں کے دیس میں۔ اس لیے تمام افسانوں کے موضوعات قصہ گوئی اور ماجرا نگاری پر باتیں کرنا مشکل ہے۔ چند کا ذکر آگے آئے گا۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"قصہ گوئی ایک فن ہے اور یہ فن مشکل بھی ہے۔ قصہ سے متعلق واقعات بذات خود اتنے اہم نہیں ہوتے۔ ان کی اہمیت کا راز ان کے حسن ترتیب میں مضمر ہوتا ہے۔ واقعات کی فنکارانہ تنظیم و ترتیب ہی کسی متعلقہ قصہ کو حسین، دلکش یا پُر اثر بناتی ہے فنکار کا ذہن اس سلسلہ میں بڑی چھان پھٹک کرتا ہے۔ قصہ کے اجزا اس کے شعور میں سخت تنقیدی مرحلے سے گزرتے ہیں۔ ربط و نظم کے لیے وہ ان اجزا کی اہمیت اور تاثیر سے متعلق اہم فیصلے کرتا ہے۔ پھر انھیں ایک دوسرے میں اس طرح مدغم کرتا ہے کہ کثرت، وحدت میں بدل جاتی ہے اور مختلف واقعات ایک دوسرے میں ضم ہوکر ایک بن جاتے ہیں۔ دراصل ایک واقعہ کسی دوسرے واقعہ کا اشارہ ہوتا ہے۔ اس طرح قصہ اپنی منزل طے کرتا ہوا ایک انجام تک پہنچ جاتا ہے۔ ای۔ ایم۔ فاسٹر نے پلاٹ کے لیے "اس کے بعد؟ پھر اس کے بعد۔ ۔ ۔ ۔ ؟ کی کیفیت ناگزیر بتائی ہے۔ گویا ماجرا اپنے تذبذب کے اندر کی وجہ سے دلکشی کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا اختتام تک پہنچتا ہے۔ یعنی قصے سے متعلق واقعات کی کامیاب ترتیب، ان کے ربط و نظم کی خوبی اور تذبذب کی کیفیت سے عمل میں آتی ہے۔ اس طرح کسی ماجرا کے ضمنی واقعات کی ہم آہنگی اور تسلسل کی خوبیاں فن قصہ گوئی کی شرطیں ہیں۔ یہ شرطیں اتنی کڑی ثابت ہوتی ہیں کہ آئی۔ این۔ واٹ نے کامیاب ماجرا نگاری کی مثال میں صرف تین ناولوں کے نام گنائے ہیں۔ ایک فیلڈنگ کی ٹوم جون، دوسری فلابیر کی مادام بواری اور تیسری ٹالسٹائے کی وار اینڈ پیس۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کامیاب ماجرا نگاری کتنا مشکل فن ہے۔ فلابیر کی مادام بواری اور ٹالسٹائی کی وار اینڈ پیس کے پلاٹ کا سرسری جائزہ بھی اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ ماجرا نگاری سیدھی اور سپاٹ بھی ہو سکتی ہے اور پیچیدہ اور الجھی ہوئی بھی۔ مادام بواری اپنی سادگی کے باوصف فنکارانہ ماجرا نگاری کی ایک اہم مثال ہے اور وار اینڈ پیس کی پیچیدگی ہی کی وجہ سے اس کی ماجرا نگاری مثال بنی ہے۔ ہر حال میں قصہ گوئی کی پرکھ واقعات کے حسن تنظیم پر منحصر ہے۔" [1]

اختر اورینوی کی کہانیوں کے پلاٹ کافی حد تک سادہ اور سپاٹ ہیں۔ ان کی کہانیوں میں

---

[1] قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ۔ صفحہ ۹۲-۹۱ از ڈاکٹر وہاب اشرفی۔ مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۷۷ء

محلہ کوٹھی شہید۔ سہسرام، روہتاس (بہار)

کوئی حیرت انگیز واقعہ اچانک سرزد نہیں آتا بلکہ کرداروں کے تدریجی ارتقاء کے بعد ہی کوئی نیا کردار یا نیا واقعہ سامنے آتا ہے۔ "سیمنٹ " کی راشدہ، ایک ایسی لڑکی ہے جو اپنے گھر والوں سے پہلی بار جدا ہوئی وہ بھی شادی کے بعد، نازک اور حساس راشدہ، اس کا خوابناک عنفوان شباب تصورات اور تخیلات میں اور تھیوری ٹیکل گزرا اور بظاہر جب کوئی لڑکی عملی زندگی میں قدم رکھتی ہے تو اس کے خواب چکنا چور ہوتے نظر آتے ہیں۔ جب وہ اپنے شوہر ہاشم کے ساتھ ایک الگ مکان میں رہتی ہے تو اسے اچانک گھر کی یاد ستانے لگی، اسے جب یہ احساس ہوا کہ وہ اب حاملہ ہو چکی ہے تو اسے اور بھی وحشت ہوئی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ زندگی کافی ہیبت ناک ہے چناں چہ وہ ہر صورت میں موت کو گلے لگانا چاہتی تھی چاہے وہ سیمنٹ چاٹ کر ہی کیوں نہ ہو اور وہ سیمنٹ چاٹ جاتی ہے۔ مزید ارفنی کی طرح لیکن اسے اس سے ذہنی طور پر تو کوفت محسوس ہوتی ہے لیکن جسمانی طور پر کوئی اذیت نہیں پہنچتی گرچہ وہ خوفزدہ ضرور تھی، وہ اسی خوف کے تحت اپنے میکے سے اپنے بھائی کو بلوا بھیجتی ہے تاکہ وہ کسی طرح اپنے میکے چلی جائے۔ وہ ضد کرکے میکے جاتی ہے اور میکے کی روانگی کے وقت اچانک راشدہ کو ہاشم سے انتہاء پیار ہو جاتا ہے اور مجمع میں ہاشم کا ہاتھ پکڑ کر اشک آور ہو جاتی ہے۔ راشدہ نے محسوس کیا کہ ہاشم کی شخصیت مضبوطی سے اس کے ساتھ چسپاں ہے اور اس کے آنسوؤں کے ہالے میں کوئی ننھا سا فرشتہ کلکاریاں مارتا ہوا ہاشم کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے۔ دراصل یہ پلاٹ شادی شدہ جوڑے کی نفسیاتی گرہوں کو کھولنے تک محدود ہے۔ اس میں کوئی گنجلک ماحول اور پلاٹ نہیں کہ پڑھنے والا کسی الجھن میں گرفتار ہو اور واقعات کا سرا نہ جوڑ سکے۔

"پس منظر" کی شاکرہ ایک ایسے خاندان کی لڑکی ہے جہاں کنواری لڑکیاں اس طرح رکھی جاتی ہیں جیسے جیل کے خطرناک قیدی یا پاگل خانے کے تشدد پسند مریض، منحوسیت، بولو مت چوروں کی طرح دبے پاؤں چلو، لیکن شاکرہ اس گھٹن سے باہر نکلنا چاہتی ہے۔ اسے اس طرح کی قید و بند منظور نہیں۔ ڈری ڈری، سہمی سہمی زندگی اسے پسند نہیں تھی۔

اس طرح کے تصورات خیالات اور نظام زندگی کو تقویت پہنچانے والی ان کی دور کے رشتے کی خالہ بھی تھیں جو شاکرہ کی ماں کی آئے دن BRAIN WASHING کیا کرتی تھیں۔

شاکرہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر اس پر اتنے داروغن کیوں، ادھر نہ جاؤ، ادھر نہ جاؤ، یہاں تک کہ جب اس کی بہن شادی کے دن مانجھے بیٹھی تو شاکرہ کو مانجھے والے کمرے میں بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔

چودہ سال کی عمر میں شاکرہ پر کچھ نئے انکشافات ہوئے اور رنگین خواب نظر آنے لگے اور اس رنگین خواب میں کوئی مخل ہوتا تو وہ چڑچڑا جاتی، اس کی زندگی میں بلی اور خرگوش بھی اہمیت حاصل کرنے لگے اس سے خوب گود میں لے کر چومتی پچکارتی، اس عالم میں ایک طالب علم ناصر کا ناصر بھی اسے پسند آنے لگا اس لیے کہ وہ اس کے رازوں کا ایک شریک کار رہتا اور اس طرح ناصر اور شاکرہ میں ایک ہلکا رومانی رشتہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کہانی کا پلاٹ بھی نفسیاتی اور جنسی ہے۔ ایک لڑکی جو بچپن کے بعد جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوتی ہے اس کے کیسے جنسی احساسات جاگ اٹھتے ہیں۔ اس کا اندازہ آپ اس کہانی سے لگا سکتے ہیں۔ اس جنسی تصور کو عصمت چغتائی اور منٹو نے بڑی تفصیل اور بے باکی سے اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر "لحاف" (عصمت چغتائی) اور "سرکنڈوں کے پیچھے (منٹو) کا مطالعہ کافی ہوگا۔ لیکن ظاہری طور پر خالہ جان کو اس کا اندازہ نہیں ہے کہ شاکرہ کے دل میں کون سی آگ دھیرے دھیرے روشن ہو رہی ہے۔ خالہ جان کا یہ کہنا۔

"بہن ماشاءاللہ تمہاری لڑکیاں البتہ باحیا باتمیز ہیں" لیکن ؎

درو دیوار خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے۔

اس کہانی میں بھی پلاٹ کے اندر کوئی الجھن نہیں بلکہ سادگی ہے۔

شادی کے تھنے، کے دولہا بھائی، ایک بے روزگار نوجوان کی زندگی گزر رہی ہے، ان شادی کو چار سال ہو گئے ہیں لیکن نوکری اور روزگار کا دور دور تک پتا نہیں۔ اس کہانی میں اختر اورینوی نے اکبر الہ آبادی کے اس شعر کی تشریح کی ہے۔

کالج سے آرہی ہے صدا پاس پاس کی
دفتر سے آرہی ہے صدا دور دور کی

اس بے روزگاری کے ماحول میں ایک حساس نوجوان افسردگی اور پژمردگی کا احساس دل میں لیے رہتا ہے۔ جب کسی رشتہ دار کی شادی ہوتی ہے تو اس کے پاس شادی کے موقع پر تحفہ کے طور پر دینے کے لیے آنسوؤں کے چند قطرے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ روزگار کے فقدان پر ایک گہرا طنز ہے کہ ایک نوجوان ہمارے معاشرے میں بے روزگار رہ کر اپنی آرزوؤں اور حسرتوں کا خون ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔ اس سے سماج کی معاشی نابرابری بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔

شکور دادا کی ناحرازگاری البتہ ایک خاصے کی چیز ہے۔ اس کا پلاٹ ذرا کچھ گنجلک ہے لیکن مصنف نے زیادہ توجہ شکور دادا والے حصہ کو ہی دی ہے۔ ایک طرف ایک چھوٹا زمیندار گھرانہ ہے جس کی نمائندگی بابو کرامت حسین کرتے ہیں۔ بابو کرامت حسین کے عزیز و اقارب شہروں میں تعلیم پاتے اور چھٹیوں میں اپنے گھر آجاتے۔ اس طرح زندگی کے شب و روز گزر رہے تھے۔

دوسری طرف شکور دادا کا پلاٹ ہے، جن کو گاؤں کا ہر بوڑھا جوان شکور دادا ہی کہا کرتا۔ جنہوں نے ان کی جوانی دیکھی ہے ان کا بیان ہے کہ شکور دادا بہت رنگین مزاج تھے وہ گلبدن لونڈی سے اظہار تمنا فرماتے اور گلبدن کی مالکہ مسماۃ کریمن کے لیے آب رواں کے تھان، گڑ ون بوند، چھینٹ، بلبل چشم وغیرہ، سندری سہاگ تیل، کنگھی، آئینہ اور بڑے دونے میں گلاب جامن لایا کرتے تھے۔

اب شکور دادا اپنی گزر بسر کے لیے کرامت حسین سے کم لگان پر زمین لیا کرتے اور دوسروں کو زیادہ شرح لگان پر دیا کرتے تھے اور وہ ہنسی مذاق سے اپنی کمزوریوں کو چھپایا کرتے۔ دادا کی ایک بڑی آرزو امیر بننے کی تھی اور اس کے لیے وہ در پردہ کوشش بھی کرتے رہتے۔ ان کے اس خواب کو

پورا ہونے میں جن لوگوں سے مدد مل سکتی تھی وہاں ان کے قریب رہا کرتے اور جن سے ان کی اس آرزو پر پانی پھر جانے کا خدشہ رہا کرتا وہ اس سے دور رہا کرتے۔

شرفائے قریہ میں محمد ذہین سب سے زیادہ آزاد و ظریف شخص تھا اور شکور دادا اس سے بچتے تھے۔ بابو نصرت حسین کا گراہل حمید گاؤں کے ناخواندوں میں اہم ترین جھگڑا باز تھا دادا اس سے بھی کتراتے تھے۔

اس کہانی کا ایک موڑ رشید کی طرف مڑتا ہے جو شکور دادا کی آرزو کا مرکز ہے۔ اس سے امید ہے کہ اس کے روپے سے شکور دادا گاؤں کے رئیسوں کی فہرست میں آجائیں گے۔ لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس طرح مصنف اس ایک کہانی میں کئی کہانیاں کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور کئی پلاٹ ایک ساتھ چلتے ہیں اور ہر پلاٹ آخر میں اپنے مرکزی کردار کے انجام تک پہنچ جاتا ہے اور مصنف ہر ایک پلاٹ کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔

بقول ڈاکٹر عبدالمغنی اختر اورینوی کو اپنے افسانوں میں علی الترتیب "کلیاں اور کانٹے"، "کیچلیاں اور بال جبریل" اور "محشر" ذاتی طور پر پسند تھے۔ اب ذرا ان کی ماجرا نگاری کی طرف توجہ دیتے چلیں۔

"کلیاں اور کانٹے" کا پس منظر اٹکی سینی ٹوریم ہے۔ جہاں خود مصنف دو برسوں تک موت و حیات کی کشمکش سے گزرا ہے۔ اس کہانی کی نو نرسیں تھیں اور ایک خود مریض اور دس افراد پر مشتمل یہ "خاندان" تھا۔ اس کی ماجرا نگاری کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر ایک نرس کے ساتھ کوئی کہانی جڑی ہوتی ہے۔ اچھی کہانی، بری کہانی، خوشگوار واقعات، ناخوشگوار واقعات، اس کے کردار بھی کچھ جنس زدہ سے لگے۔

پلاٹ یا ماجرا نگاری کے لحاظ سے یہ کہانی کئی جہتوں سے افضل ہے اور اس میں پلاٹ در پلاٹ کئی کہانیاں جنم لیتی ہیں، ختم ہوتی ہیں اور پھر کہ دوسری کہانیوں کی بنیاد پڑتی جاتی ہے۔ ایستھر، اور کیتھرن، مارتھا، جینی، ڈولی، میگی، دلاری، سگومی اور رملو ان سبھوں کے پیچھے ایک کہانی تھی، ایک قصہ تھا۔ آنسوؤں کے چراغ جمع اور مسکراہٹوں کے پھول رقصاں تھے، ہر ایک اپنے راز لیے زندہ تھی، ایک زہر پی جاتی تھی، ایک زہر پھیلا جاتی تھی۔ احمد یوسف لکھتے ہیں:-

"اختر اورینوی کا پہلا افسانہ "بدگمان" بہارستان پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ اختر صاحب کے افسانوں میں تنوع اور ان کے یہاں ہم عصر زندگی کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ وہ فن اور تکنیک کا خاص خیال رکھتے ہیں وہ ایک اچھے انشا پرداز ہیں۔ لیکن یہی انشا پردازی ان کے افسانوں کو انفرادیت بھی بخشتی ہے اور یہی انشا پردازی ان کے افسانوں کو نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ یوں کہ وہ اکثر بے حد بلند آہنگ ہو جاتے ہیں اور افسانوں میں بڑے بکھرے سلغ دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ان کی زبان بھی جا بجا پُر تصنع ہو جاتی ہے۔ جس سے نفس مضمون کو صدمہ پہنچتا ہے انھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی مظالم کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ وہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ استحصال کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں، ان کے یہاں شہر میں رہنے والے متوسط طبقے کی زندگی اور اس کے مسائل ملتے ہیں، اختر صاحب کا مطالعہ و مشاہدہ عمیق ہے اور افسانوں میں فکر کا عنصر غالب ہے۔ ان کے مشہور افسانے ہیں، جو یہ ہیں، کیسل، ٹائپسٹ، بوڑھی ماما، سیمنٹ، پندرہ منٹ اور "کلیاں اور کانٹے"، مؤخر الذکر اردو کا پہلا طویل مختصر افسانہ ہے۔ اس افسانے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تنہا یہ افسانہ اختر اورینوی کو بحیثیت افسانہ نگار زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔" [1]

مختصر افسانے کے لیے پلاٹ کا ہونا سب سے اہم جزو ہے اور بغیر پلاٹ کے مختصر افسانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تمام اہل فن نے اسے ضروری قرار دیا ہے۔ چوں کہ افسانہ میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ انسانی خیالات، اعلیٰ فکری دلچسپی، حرکت و وجود، نفرت و محبت کے ایک دلکش روپ کا نام مختصر افسانہ ہے۔ اسی کی فنی ترتیب کا نام پلاٹ کہلاتا ہے۔ عام طور پر مختصر افسانے میں پیچیدہ پلاٹ نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے اندر انتہائی سادگی کے ساتھ تمام ممکنہ واقعات کو ایک سلسلہ کے ساتھ پیش کر دیا جاتا ہے البتہ واقعات اور اس کے تاثرات پر بڑی ہی فنکارانہ نگاہ رکھی جاتی ہے تاکہ کہانی کی وحدت تاثر کو کوئی گزند نہ پہنچے اس کے لیے ضروری ہے کہ فنکار ضروری غیر ضروری واقعات اور کم سے کم کرداروں کو سیاد ساکر افسانے کی تکمیل کرے ایک بات جس پر اہل فن متفق ہیں کہ افسانہ زندگی کی ہو بہو تصویر نہیں بلکہ اس تصویر میں فنکار آس پاس کے عوامل اور واقعات اور تخیلات سے ایک پیار رنگ بھرتا ہے واقعات میں اگر کوئی رکاوٹ آتی ہے اور قاری اس رکاوٹ کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو وہ کشمکش کہلاتی ہے۔ اختر اورینوی کے افسانہ "کوڑی کی اوٹ" سے اس کی مثال ہے۔ فنکار واقعہ نگاری اور کردار نگاری کے خوب صورت امتزاج سے اسے نقطۂ عروج عطا کرتا ہے اور موزوں اختتام یا انجام کا نام پلاٹ ہے۔ کہانی اگر مسرت کے ساتھ ختم ہوئی تو وہ طربیہ کہلاتی ہے اگر رنج و غم پر اختتام پذیر ہوئی تو اسے المیہ کہتے ہیں۔

"کیچلیاں اور بال جبریل" کا پلاٹ بھی قصوں اور ماجروں پر مشتمل ہے مصنف نے خود اسے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اس کا پلاٹ بھی پوری انسانی زندگی کائنات، موجودات، ازل اور ابد تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کہانی کے ایک ایک نقطے کے اندر ایک کہانی پوشیدہ ہے۔ اگر حرف حرف، فقروں ہی کو لیں تو سمجھ لیں کہ اس کا پلاٹ یا اس کی ماجرا نگاری کیا ہو سکتی ہے۔ زمین آسمان، جنت دوزخ، آدم و حوا، سمندر و صحرا، چاند ستارے، کوہ و بر، حیوان و شر، جبر و اختیار، اندھیرے اجالے، مزدور، شیطان فرشتہ، جزا و سزا، گنہ گار، پارسا، روح اور مادہ سب سامنے ہے ..... ----- کیچلیاں اور بال جبریل کے اندر افسانے کا ایک پلاٹ نہیں بلکہ پوری حدائق سمائی ہوئی ہے

[1] بہار میں اردو افسانہ۔ از احمد یوسف مطبوعہ زبان و ادب اردو جولائی، ستمبر ۱۹۸۹ء صفحہ ۱۴

سرگزشت آدم بھی ہے اور قصۂ روز شب بھی۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کا خیال ہے:۔

"وہ بالعموم اپنے مطالعے کے لیے کسی اشرف المخلوقات کو چن لیتے ہیں اس کے بعد حسب موقع اس کے اردگرد ایک ماحول پیدا کرکے اس کے کوائف اور امکانات کا جائزہ لیتے اور تجزیہ کرتے ہیں۔ اس انداز کار کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو وہی المیہ اور رزمیہ کی رفعت و شوکت جس کا اظہار شخصیتوں ہی کے پیچ و خم میں ممکن ہے۔ دوسرے غالباً کارگاہ حیات میں کامیابی و ناکامیابی کے لیے انفرادی ذمہ داری کا دینی احساس، بارکش حیات دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا، ہر انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔" "ہر نفس کو اپنے کیے کا اچھا اور برا مل جاتا ہے" "جو ایک ذرہ بھی نیکی کرے گا اس کو پالے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اورینوی کے شعور میں نیک و بد اور انفرادی عمل کے نتیجے میں جزا و سزا کا تصور پوری طرح جاگزیں ہے۔ اپنی شوخ گفتاری اور بعض اوقات فلسفیانہ موشگافیوں کے باوجود اورینوی اپنے خدا اور اس کے نظام کائنات سے شدید ذہنی وابستگی رکھتے ہیں۔ یہ وابستگی فن افسانہ نگاری میں کچھ اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ ہر کردار اپنے حالات میں مبتلا رہنے کے باوجود اپنی صلاحیتوں اور حوصلوں کی داد دیتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کہانی کے خاتمے پر اس کے مقدر کا اندازہ اس کے ذاتی عزائم یا کارگزاریوں سے ہی ہوتا ہے[1]

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس لیے "کیچلیاں اور بال جبریل" کا پلاٹ درحقیقت قصۂ آدم کی رنگین نوائی ہے لیکن اس کا دائرہ زمان و مکان، دنیا و کائنات سے بھی بلند ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پلاٹ کے ہوتے ہیں واقعات، کردار، واقعات اور ماحول میں سے کسی ایک سے پھوٹتے ہیں۔ اس لیے "کیچلیاں اور بال جبریل" کا پلاٹ ذہن سے ترتیب پاتا ہے اور "سپنوں کے دیس کا" پلاٹ بھی ہیں، کے ذریعہ تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ پلاٹ تو ترتیب پاجاتا ہے مگر ہیں، دونوں کے علاحدہ علاحدہ ہیں۔ دونوں اپنے اپنے عمل میں لگے ہوئے ہیں اور واقعہ کو پُر تاثیر اور پُر اثر بناتے ہیں۔

بقیہ: جنگ آزادی کا سفر

بعد ایک نیا گروپ ابھرا جس میں جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس نمایاں تھے۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا، جس نے کامگاروں اور کسانوں کو مزید منظم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ تحریک آزادی کا یہ سفر یوں ہی چلتا رہا لیکن اس میں قدرے تعطل آگیا تھا جو سائمن کمیشن کے آنے کے بعد دور ہوگیا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو قومی جھنڈا لہرایا گیا اور ہندوستان بھر میں لوگوں نے آزادی کا حلف اٹھایا۔ ۱۹۳۹ء میں نظریاتی اختلاف کی وجہ سے سبھاش چندر بوس کانگریس سے الگ ہوگئے اور انھوں نے "فارورڈ بلاک" کی بنیاد ڈالی جس کا ملک کی آزادی میں اپنا ایک الگ مقام ہے۔

مختصر یہ کہ تحریک آزادی کا یہ سلسلہ یوں ہی اتار چڑھاؤ کے ساتھ چلتا رہا اور اس دوران نئے نئے مسائل بھی پیدا ہوئے لیکن ان کی پروا کیے بغیر قومی رہنما اپنا کام کرتے رہے۔ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو گاندھی جی نے "بھارت چھوڑو" کا ملک گیر نعرہ دیا۔ جس کے بعد گاندھی جی کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے قبل پورے کانگریسی ممبران کے ساتھ ورکنگ کمیٹی پہلے ہی گرفتار ہوچکی تھی۔ ان گرفتاریوں کا علم جب عوام کو ہوا تو پورے ملک میں ایک بے چینی پھیل گئی اور جگہ جگہ ہڑتال اور پولیس سے جھڑپیں ہونی شروع ہوگئیں۔ پورا ملک پولیس راج میں بدل گیا اور ہندوستانیوں پر ظلم و تشدد کا بازار گرم ہوگیا اور تقریباً ۱۰ ہزار لوگ مارے گئے پھر بھی ہندوستانی عوام کے عزائم میں کمی نہیں آئی اور آزادی کے آخری معرکے میں عوام نے اپنے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ ان کے جوش و خروش سے مسلح افواج میں بے اطمینانی اور بیزاری پھیل گئی اور انگریزوں کو اس بات کا احساس ہو چلا کہ اب ان کی حکومت کے گنے چنے دن رہ گئے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں حکومت برطانیہ نے یہ اعلان کردیا کہ وہ ہندوستان میں اپنی حکومت ختم کرنا چاہتی ہے۔ اور آخر کار ۱۹۴۷ء میں طویل جدوجہد کے بعد ۱۵ اگست کا وہ روشن دن بھی آیا جب حق کی جیت ہوئی اور باطل کو اپنے منہ کی کھانی پڑی۔ ہندوستان نے غیر ملکی تسلط کا جوا اتار پھینکا اور اس کے تن میں زندگی اور آزادی کی لہر دوڑ گئی اور سارا ہندوستان ایک عزم کے ساتھ ترقی و عروج کی منزل کی طرف گامزن ہوگیا۔ ●

قلم کار حضرات سے

گزارش ہے کہ

(۱) مضامین/دیگر تصانیف جو یوجنا کو ارسال کریں انھیں کہیں اور چھپنے کے لیے قطعاً نہ بھیجیں۔

(۲) ہر مضمون کے آخر میں طبع زاد/غیر مطبوعہ لکھ کر اپنا دستخط، نام اور پتا ضرور درج کریں۔

(۳) مضمون کی اصل ہی ارسال کریں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۴) مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کریں۔

(۵) مضامین میں جو اقوال (QUOTATIONS) استعمال کئے گئے ہوں، ان کے سورس کا حوالہ دینا لازمی ہے۔

(۶) مضامین میں انگریزی الفاظ کا استعمال بلا جبر مجبوری ہی کریں۔

(۷) جواب طلب امور کے لیے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں۔

(ادارہ)

---

[1] اختر اورینوی کے افسانے از ڈاکٹر عبدالمغنی صفحہ ۲۹ مطبوعہ بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ ۔ ۱۹۷۷ء

جبین انجم

بیسویں صدی کے آغاز میں:

خواتین کے اردو رسائل

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ایسے رسالوں کی اشاعت عمل میں آئی جن کا تعلق عورتوں کی زندگی سے تھا، مثلاً "تعلیم نسواں" اور "آزادیٔ نسواں"، معاشرے میں عورت کی حیثیت اور ایسے فرسودہ رسم و رواج جنھوں نے عورتوں کو قید کر رکھا تھا، بعض لوگوں نے عورتوں کو اس حالت سے باہر نکالنے کی عملی کوششیں شروع کر دیں ان ہی کوششوں کا نتیجہ رسائل ہیں جنھوں نے عورتوں کو ان کے حقوق و فرائض سے پوری طرح آگاہی بخشی۔ ان رسائل نے عورت کو گھر سے باہر نکل کر سٹریٹر بنانے کی طرف متوجہ کیا اور نہ ہی آزادیٔ نسواں کے نعرے لگائے۔ بلکہ ان رسائل نے عورت کو اس کے بنیادی مقاصد اور اس کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ مبذول کرائی تاکہ ایک عورت ایک باصلاحیت آئیڈیل بیوی کے ساتھ ایک ایسی ماں بھی بن سکے جو نہ صرف تعلیم یافتہ ہو بلکہ گھرداری کی ذمہ داریوں کو بھی پوری طرح نبھا سکے اور شوہر اور بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مددگار ثابت ہو سکے۔ ان رسائل کا مقصد عورت کو خوش اسلوبی سے ان تمام ذمہ داریوں کو نبھانے کے لائق بنانا تھا۔

آج ساری دنیا میں عورت کے حقوق پر بات ہو رہی ہے لیکن اس WOMAN HOOD میں بھی ہمیں اپنے گرد و پیش ایسی بہت سی عورتیں دکھائی دیں گی جن کی حیثیت اپنے گھروں میں ثانوی درجے کی ہے۔ ان رسائل نے عورت کو آزادیٔ نسواں کا نعرہ نہیں دیا بلکہ سماج نے عورت کے لیے جو بے جا حدیں مقرر کر دی تھیں ان کی طرف نہ صرف دھیان دلایا بلکہ انھیں اس بات سے بھی باخبر کیا کہ عورتیں اگر چاہیں تو اپنی حالت کو سدھار سکتی ہیں، اس کے لیے انھیں اپنے اندر ہمت اور لڑنے کی قوت پیدا کرنی ہوگی۔

اردو کے ان چند رسالوں میں عورت سے متعلق جو مواد بیسویں صدی کے اوائل میں پیش کیا جا رہا تھا۔ اس کا ایک مطالعہ زیر نظر مضمون میں پیش کرنا مقصود ہے۔ بالخصوص اُن رسالوں کا جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی متعلم سماج کے افق پر ابھرے اور جنھوں نے عورت کی زندگی اور اس کی ضروریات اور کردار کی بڑی حد تک عکاسی کی۔ ان رسائل میں "تہذیب النسواں" ۱۸۹۸ء میں لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا "خاتون" ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک علی گڑھ سے شائع ہوتا رہا، "عصمت" ۱۹۰۸ء سے دہلی سے شائع ہوا یہ تینوں رسالے اپنے عہد کے اس لحاظ سے ممتاز رسالے سمجھے جاتے ہیں کہ انھوں نے عورت سے متعلق جن موضوعات کو پیش کیا ان میں سماجی مسائل، جائداد میں عورت کا حصہ اور پردے جیسے معاشرتی مسائل پر قلم اٹھایا گیا تھا۔

عورتوں سے متعلق مواد کی اشاعت ایک آدرش سماج کی تشکیل کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ آئیڈیل سماج کی تشکیل کا یہ عمل صرف اردو زبان کے ذریعے ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ ہندی اور بنگالی زبانوں کے لٹریچر میں بھی عورتوں کی سماجی حالت کو سدھارنے کے لیے تیزی سے کام ہو رہا تھا۔ اشاعتی پروگراموں کے تحت سماجی اصلاح کا یہ کام مذہبی جماعتوں کی عامیانہ روش سے یکسر مختلف تھا۔ مندرجہ ذیل سطروں میں ہم اردو کے اُن تین اہم رسالوں کا خصوصی نقطۂ نظر سے ایک مختصر جائزہ پیش کریں گے۔ جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے:

تہذیب النسواں

سید ممتاز علی اور ان کی اہلیہ محمدی بیگم نے ایک ہفتہ وار جریدہ ۱۸۹۸ء میں عورتوں کے لیے جاری کیا، اس رسالے کا نام "تہذیب النسواں" رکھا گیا۔ تہذیب النسواں حالاں کہ اردو میں عورتوں کا پہلا جریدہ نہیں کہا جا سکتا لیکن پہلا کامیاب جریدہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ شروع میں ملک کے عہدیداراں کو رسالے کی ایک ایک کاپی بطور تحفہ ڈاک کے ذریعے بھیجی گئی اور ان سے رسالے کے خریدار بننے کی خواہش ظاہر کی گئی تاکہ رسالے کی مالی اعانت ہو سکے۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا چناں چہ تہذیب النسواں کو بھی لوگوں کی مخالفت کو برداشت کرنا پڑا۔ جن لوگوں تک یہ رسالہ پہنچا ان میں سے بعض ایسے تھے جنھوں نے رسالے کے جواب میں فحش لیبل چسپاں کر کے رسالے کو واپس بھیج دیا، جو ایک نیک فال نہیں کہا جا سکتا تھا۔

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

کچھ مہینوں تک اس رسالے کے صرف ۶۰ یا ۷۰ ممبر ہی بنے لیکن اس سے بیگم و جناب ممتاز علی بالکل دل برداشتہ نہیں ہوئے اور اپنے مقصد پر ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہے۔ دھیرے دھیرے رسالے کی شہرت عام ہونے لگی اور اس کے خریداروں میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ چار سال کی مدت میں خریداروں کی تعداد تین سو سے چار سو تک پہنچ گئی۔ اس وقت ایک ایسے اخبار کی اشاعت جن میں عورتوں کے لیے اصلاحی مواد شائع کیا جاتا ہو یقیناً ایک مشکل مرحلہ تھا جس میں منافع کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود "تہذیب النسواں" ۱۹۰۵ء تک کامیابی سے شائع ہوتا رہا۔

ممتاز علی (۱۸۶۰ء۔۱۹۳۵ء) ایک مذہبی اور روایتی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد پنجاب میں سرکاری ملازم تھے۔ بچپن میں ایک سال خاندانی روایات کے مطابق دیوبند سے تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور چلے گئے۔ شروع میں آپ نے صرف مذہبی نمائندوں جن میں عیسائی، مسلمان اور آریہ سماجی شامل تھے، کی تقریریں سنیں اور کچھ عرصے کے بعد خود ایک اچھے مقرر کی حیثیت سے ابھر کر عوام کے سامنے آئے اور اسلامی شریعت میں عورتوں کے حقوق سے متعلق مسلم رہنماؤں کی صف میں شامل ہو گئے۔

ممتاز علی کی تصنیف "حقوق النسواں" اسلامی قانون میں عورت کی حیثیت اور اس کے مقام پر روشنی ڈالتی ہے۔ ....

....

.... حقوق النسواں میں ممتاز علی نے اسلام میں عورتوں کی اصل حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ ہمارے سماج میں عورتوں کو جو مقام دیا گیا ہے دراصل وہ اس سے بہت کم ہے جو اسلام نے عورت کو دیا ہے۔ عورت کی سماجی حیثیت اور اسلامی قانون کے مطابق عورت کی حیثیت میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ ممتاز علی نے یہ بتائی کہ غلط رسم و رواج کو مذہب کا نام دے کر زبردستی عورتوں پر تھوپا گیا ہے۔ مسلم معاشرے کی اصلاح کا واحد ذریعہ ان غلط رسم و رواج کے خلاف آواز اٹھانا ہے جس میں عورتوں کے حقوق کو نظر انداز کر کے انھیں سماج میں ثانوی حیثیت سے جینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ممتاز علی کا یہ نظریہ نہ صرف عورتوں کے لیے بلکہ ان مردوں کے لیے بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے جو عورت کو سماج میں ثانوی حیثیت پر دیکھنا چاہتے ہیں۔

ممتاز علی نے اپنی اہلیہ محمدی بیگم کی مدد سے "تہذیب النسواں" جیسا رسالہ نکالا۔ محمدی بیگم اپنے وقت کی ایک مثالی عورت اس لحاظ سے کہی جا سکتی ہیں کہ ان کے خیالات سادہ تھے لیکن عزائم بہت بلند تھے۔ جہاں وہ شوہر کے لیے بہت ممد و معاون تھیں وہیں اپنے حقوق کے معاملے میں بھی بہت قوی اور واضح خیالات رکھتی تھیں۔ محمدی بیگم نے اپنے زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر رہ کر ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ کے تعلیم حاصل کرنے کا واقعہ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ آپ کے بھائی اسکول جاتے وقت اپنی کچھ کتابیں گھر پر ہی چھوڑ کر جاتے چناں چہ محمدی بیگم نے ان کتابوں کی مدد سے پڑھنا لکھنا سیکھا۔ شوہر، ممتاز علی کی سرپرستی نے ان کی تعلیمی سرگرمیوں کو ایک نئی جلا بخشی اور انھوں نے "تہذیب النسواں" شائع کرانا شروع کر دیا۔ بہ حیثیت مدیر محمدی بیگم نے اس رسالے کی کئی سال تک خدمات انجام دیں۔ محمدی بیگم کی پوری زندگی پر نظر ڈالی جائے تو بہ خوبی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے سے کافی آگے تھیں وہ اس بات کو بہ خوبی جانتی تھیں کہ عورت کے لیے تعلیم یافتہ ہونا کتنا ضروری ہے۔ لیکن زندگی نے انھیں زیادہ مہلت نہیں دی اور ۱۹۰۸ء میں محمدی بیگم کا انتقال ہو گیا۔

"تہذیب النسواں" کی اشاعت کی پہلی دہائی میں جس وقت محمدی بیگم اس رسالے کی مدیرہ تھیں ان کا مقصد رسالے کو پردہ نشیں خواتین تک پہنچا کر ان کے ذہنوں کو منور کرنا تھا اور اس کے لیے تعلیمی، گھریلو ذمہ داریوں سے متعلق ساس بہوؤں کے درمیان برتاؤ جیسے مضامین شامل کیے گئے۔ رسالے کا بنیادی مقصد سماج میں رائج بے جا رسم و رواج کو ختم کر کے سادگی کو اپنانا تھا کیوں کہ ان رسموں کی وجہ سے معاشرے میں مستقل عورت کا استحصال ہوتا نظر آتا ہے مثال کے طور پر شادی بیاہ کے موقع پر جہیز کی رسم، آرائشی سامان اور اس کے علاوہ مختلف موقعوں پر ایسی رسمیں معاشرے میں رائج ہیں جو عورت کے استحصال کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ محمدی بیگم نے ان رسموں کے خلاف سخت احتجاج کیا۔

"تہذیب النسواں" میں مضامین کے علاوہ عورتوں سے متعلق خبریں بھی خصوصیت کے ساتھ شائع کی جاتی تھیں مثلاً عورتوں کی میٹنگوں کے بارے میں نوٹس، اسکولوں کا افتتاح اور عورتوں کی انجمنوں میں ہونے والی عورتوں کی تقریروں کا خلاصہ بھی پیش کیا جاتا تھا۔ ایک سوال و جواب کا کالم بھی تھا۔ جس میں قارئین اپنے بھیجے ہوئے سوالات کے جوابات پڑھتے تھے۔ اس کالم میں قارئیں اپنے ذاتی مسائل بھی بھیجتے تھے جن کا حل رسالے کے مخصوص گوشے میں شائع کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک ایسا خط رسالے میں شامل کیا گیا جو لڑکیوں کے انگلش پڑھانے سے تعلق رکھتا ہے۔ خط میں کہا گیا تھا کہ "آج کل بہت سی لڑکیاں انگلش سیکھنا چاہتی ہیں، لیکن ان لڑکیوں کے والدین اپنی لڑکیوں کو انگریزی پڑھانا نہیں چاہتے"۔ ان والدین کا کہنا ہے کہ انگریزی پڑھنے کی ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو گھر سے باہر دفتروں میں جا کر کام کرتے ہیں اور لڑکیاں چوں کہ گھر میں رہتی ہیں اسی لیے ان کے لیے انگریزی زبان کا سیکھنا ایک غیر ضروری عمل ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرتے وقت والدین اس نکتے کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جو لڑکے انگریزی سیکھ جاتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کی شریک حیات بھی انگریزی زبان سے واقفیت رکھتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے بہت سی عورتیں خالی بیٹھی ہوتی ہیں۔.... (تہذیب النسواں، ۱۴ اپریل صفحہ ۱۷، ۱۹۰۷ء)

"تہذیب النسواں" کی زبان عام بول چال کی زبان سے کافی قریب اور سادہ تھی۔ جہاں تک اس کے FORMAT کا تعلق ہے یہ دو طرح کا نظر آتا ہے۔ ایک فارمیٹ میں تفریح طبع سے متعلق مواد ملتا ہے اور دوسرے میں سماجی، اصلاحی اور معلوماتی مواد نظر آتا ہے۔ "تہذیب النسواں" میں

دونوں FORMAT کو ترتیب دیتے وقت توازن کو برقرار رکھا گیا ہے۔

"تہذیب النسواں" کے بعد کے شماروں کے مطالعہ سے عورتوں کی تعلیمی اور گھر سے باہر کی کارکردگیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اب "تہذیب النسواں" کی زبان پہلے کی بہ نسبت پیچیدہ نظر آتی ہے، الفاظ کے ذخیرہ میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ عورتوں کی انجمنوں کی رپورٹ اور ان کی تقریریں زیادہ مبالغہ آمیز انداز میں لکھی جانے لگیں۔ اسی طرح کی ایک رپورٹ میں ممتاز علی یوں رقم طراز ہیں:

"چار سال پہلے مسلم خواتین کی کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی، ہم سب کی دلچسپیاں اس کانفرنس سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس انجمن سے ہمیشہ یہ امید کی جائے گی کہ وہ اپنی جماعت کے لیے نمایاں خدمات انجام دے گی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔۔۔۔ لیکن بہت سے لوگوں نے سوچا کہ میں اس کانفرنس کا مخالف ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے میں اس کے حامیوں میں سے ہوں۔۔۔۔ جب میں یہ کہتا تھا کہ ابھی اس طرح کی کانفرنس کے انعقاد کا صحیح وقت نہیں آیا ہے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح کے کام کو کرنے کے لیے بہت سخت محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوا جا سکتا۔" (تہذیب النسواں، ۱۷ اپریل ۱۹۱۸ء صفحہ ۲۲-۲۲۱)

ایک اہم بات یہ ہے کہ "تہذیب النسواں" میں ان عورتوں کا نام بھی شائع کیا جاتا تھا جنھوں نے بی۔ اے، ایم۔ اے اور ڈاکٹری کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ ان کو "تہذیب النسواں" میں دلی تہنیت پیش کی جاتی تھی۔ اس طرح کی اشاعت کا اصل مقصد عورتوں کو نفسیاتی طور پر اعلا تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا۔ کیوں کہ جب خواتین قارئین ان عورتوں کا نام رسالے میں دیکھتی تو ان کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوتی کہ ان کا نام بھی اسی جگہ شامل کیا جائے۔

معاشرتی اور تعلیمی موضوعات کے علاوہ "تہذیب النسواں" میں سیاست سے متعلق عصری مسائل پر بھی مواد شائع کیا گیا۔ مثلاً پہلی عالمی جنگ کے مختلف واقعات، اتحاد و وابستگی کی تحریک اور سودیشی جیسے موضوعات کو مضامین کی شکل دے کر عورتوں کے اندر سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی بیداری کا نتیجہ تھا کہ عورتوں نے تحریک خلافت میں ترقی کے لیے فنڈ جمع کیا۔ ان عورتوں میں ایک اہم نام بیگم نذر سجاد کا ہے۔ (بیگم نذر سجاد، سجاد حیدر یلدرم کی اہلیہ اور آج کی اہم فکشن نگار قرۃ العین حیدر کی والدہ ہیں) انھوں نے کہا کہ میں یہ نہیں کہتی کہ آپ مجھے دیکھیے لیکن۔۔۔ آپ انگریزی کپڑے کو پھینک دیجیے اور صرف "سودیشی" اپنائیے۔ اب وہ دن بہت قریب ہے کہ ہم بغیر کھدر کے باہر جاتے ہوئے شرم محسوس کریں گے یا تو آپ انگریزی کپڑوں جلا دیجیے یا غریب عوام کے لیے بیچ دیجیے کیوں کہ اس وقت انھیں آپ سے زیادہ کپڑوں کی ضرورت ہے۔" (تہذیب النسواں ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۱ء، ۹۴-۷۹۹)

اس کے علاوہ "تہذیب النسواں" میں مختلف لوگوں کے سفرنامے شامل کیے گئے۔ ادبی تنقید سے متعلق مضامین بھی لکھے گئے۔ خواتین نے پڑھنے اور دیگر ایسے ہی موضوعات پر ناقدانہ مضامین لکھ کر بحث میں حصہ لیا۔ غرض کہ ۱۹۳۰ء تک آتے آتے "تہذیب النسواں" نے عوام میں کافی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔

خاتون

عورتوں میں تعلیمی تحریک کو بڑھاوا دینے کے لیے شیخ عبداللہ (۱۹۶۵-۱۸۷۴) اور ان کی اہلیہ بیگم وحید جہاں بیگم (۱۹۳۹-۱۸۸۶) نے علی گڑھ میں "خاتون" کے نام سے رسالہ جاری کیا۔ شیخ صاحب نے رواج کے خلاف ایک تعلیم یافتہ خاتون سے شادی کی۔ بیگم و شیخ عبداللہ نے ۱۹۰۴ء میں ماہنامہ "خاتون" کے عنوان سے رسالہ شائع کیا۔ یہ رسالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے عورتوں کے تعلیمی موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔

جہاں تک "خاتون" میں شامل موضوعات کا سوال ہے تو اس میں مسلم عورتوں کی تعلیم کے موضوع کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ یہ مضامین تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مدیران نے اپنے قارئین کو یہ صلاح دی کہ اپنے آس پاس کے لوگوں سے فنڈ اکٹھا کرکے لڑکیوں کے اسکول قائم کیے جائیں۔

"خاتون" کا بنیادی مقصد چونکہ تعلیم نسواں کو رواج دینا تھا اس لیے اس مقصد کے حصول کے لیے عورتوں کے نصاب، نصابی تعلیم کو بہتر بنانے، عورتوں کے لیے انگریزی تعلیم کی ضرورت، تازہ ہوا کے ساتھ ہلکی ورزش (بالخصوص پردہ نشین خواتین کے لیے) جیسے موضوعات کو مضامین کی شکل دے کر شائع کیا گیا۔ اس کے علاوہ عورتوں کی انجمنوں میں ہونے والی کارروائیوں کی رپورٹ، لڑکیوں کی اسکول کمیٹی کی رپورٹ، عورتوں کی تقریریں (جن میں بیگم بھوپال کی تقریریں بھی شامل ہیں) یہ تمام مواد "خاتون" میں شامل کیا گیا۔

۱۹۱۴ء میں ہاسٹل کی بلڈنگ کے افتتاحی جلسے میں بیگم بھوپال نے جو تقریر کی اس تقریر کو "خاتون" میں ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا گیا کہ "ہال کے دروازے بالکل بند تھے بیگم بھوپال نے کوشش کرکے ان دروازوں کو کھلوایا اور عورتوں پر تنقید کرتے ہوئے ان میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ مسلم لڑکیوں کو تعلیم کے میدان میں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس پر بھی روشنی ڈالی۔ (خاتون، فروری، مارچ ۱۹۱۴ء: صفحہ ۳۵-۵۴-۴۴)

تعلیم سے متعلق عورتوں کے خیالات بھی "خاتون" میں شامل کیے گئے۔ اس سلسلے میں دہلی کی بیگم اے۔ ڈبلیو۔ جے کے مضمون کا ذکر یہاں ناگزیر ہوگا کیوں کہ یہ مضمون تعلیم سے متعلق شائع ہونے والے دوسرے مضامین سے مختلف ہے۔ بیگم صاحبہ لکھتی ہیں کہ "آج کل میں ان حقائق کا بہت شور سنتی ہوں کہ مسلم عورت تک علم کی رسائی نہیں ہوتی اور ان عورتوں کی دلچسپی کسی بھی طرح علم حاصل کرنے میں نہیں ہے۔ لوگ اس موضوع پر میٹنگوں میں تقریریں کرتے ہیں اور اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن جب آپ ان سے یہ پوچھیں کہ انھوں نے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے کیا کیا۔۔ تو جواب ملتا ہے "کچھ نہیں"۔ ہر ایک یہی کہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہم منزل تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن کوئی اس گاڑی کو تیز کرنا نہیں چاہتا۔ انھیں لگتا ہے تو وہ دور کی بات ہے کوئی گھوڑا یا بیل لگا کر بھی اس

ڑی کی رفتار کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ اگر لوگوں کا
ں ارو یہ رہا تو ہم آگے بڑھنے کی بجائے ایک
ہ منجمد ہو کر رہ جائیں گے۔" (خاتون، اگست
۱۹۰ء؛ ۴۴۔۴۱)

"خاتون" نے تعلیم نسواں کے ساتھ امورِ
نہ داری سے متعلق معلومات، بچوں کی دیکھ
مال اور ان کی پرورش، کڑھائی کے ڈیزائن
یرہ کو بھی جگہ دی۔ "خاتون" کا یہ انداز اسے
ی حد تک "تہذیب النسواں" سے قریب
ہ دیتا ہے۔ بعض وجوہ، غالباً مدیران کی بڑھتی
ئی مصروفیت کے باعث ۱۹۱۴ء میں "خاتون"
، اشاعت کو روک دینا پڑا۔

عصمت

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں عورتوں
کے لیے اردو زبان میں جو رسائل شائع کیے گئے
ن میں ایک اہم نام "عصمت" کا بھی ہے۔ "عصمت"
شد الخیری (۱۹۳۶۔۱۸۶۸) کی سرپرستی میں ۱۹۰۸ء
ں نکلنا شروع ہوا۔ راشد الخیری اردو کے اولین
ول نگار نذیر احمد کے بھتیجے تھے۔ راشد الخیری کا
مار بھی اردو کے ممتاز ناول نگاروں میں کیا جاتا
ہے۔ اپنے مخصوص انداز کے لیے راشد الخیری کو
مصورِ غم" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ راشد الخیری
و اپنے ناولوں سے جو بھی آمدنی ہوتی وہ اسے
عصمت" کی اشاعت پر خرچ کر دیتے تھے۔

ماہنامہ "عصمت" نے اردو ادب میں ایک
بی جریدے کی حیثیت سے جلد ہی ایک مقام
صل کر لیا۔ "عصمت" نے عورتوں میں تعلیم کے
لیے کو ہی فروغ نہیں دیا بلکہ انھیں تخلیقی کاموں
کرنے کی طرف بھی راغب کیا۔ "عصمت" میں
مضامین شائع ہوئے ان کا تعلق عورتوں کی
علیم کو بڑھاوا دینا اور امورِ خانہ داری کے فرائض
ے ساتھ اپنے دور کے معاشرتی نظام کی بھی
ملاح کرنا تھا۔

عورتوں کی تعلیم اور ان کی روشن خیالی سے
تعلق راشد الخیری کے خیالات کا اندازہ ان کے
ولوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے خیال میں
ہی عورت مثالی ہو سکتی ہے جو زندگی بھر دکھ
ٹھاتی رہے لیکن صراطِ مستقیم سے نہ بھٹکے۔
ن کے ناولوں کی اکثر ہیروئن دق کا شکار ہو کر مر جاتی
تھی اور مرنے کے بعد اسے وہ عزت و احترام ملتا
تھا جو جیتے جی نہ مل سکا۔

"عصمت" کے افتتاحی شمارے میں کہانیوں
اور نظموں کے علاوہ تعلیم اور امورِ خانہ داری سے
متعلق مضامین ملتے ہیں۔ تاج محل پر ایک تبصرہ
اور تہنیتی خطوط شامل کیے گئے۔ ان خطوں
میں ایک خط وحید جہاں بیگم کا ہے اور ایک نظم
محمدی بیگم ممتاز علی کی بھی ہے۔ رسالے کے عنوان
کے ساتھ ہی ایک اور سطر لکھی نظر آتی ہے جس سے
رسالے کا مقصد کسی حد تک واضح نظر آتا ہے۔
"باعزت ہندوستانی خواتین کے لیے"۔ راشد الخیری
نے صرف تعلیمی اور خانہ داری سے متعلق مضامین
پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ سائنسی، ادبی اور معلوماتی
مضامین شائع کر کے پردہ نشین خواتین کو باہری
دنیا سے بھی متعارف کرایا۔ لیکن جہاں تک سیاسی
مضامین کا تعلق ہے اس سے پرہیز رکھا گیا۔
"عصمت" کا مقصد "حرم کی حرمت کو برقرار
رکھنا۔۔۔ اور عورتوں کے ادب کو فروغ دینا
ہے۔" (عصمت، جون ۱۹۰۸ء، ضمیمہ)

رسالے کے عنوان سے اس کے مقاصد کا
موازنہ اگر راشد الخیری کے ناولوں سے کیا جائے تو ناولوں
کا پلاٹ اور رسالے کا مقصد دونوں ہی تقریباً ایک
ہی نظر آئیں گے۔ "عصمت" نے اپنے معیار کو برقرار
رکھنے کے لیے ان تمام آداب کو ملحوظ خاطر رکھا
جو ایک باعزت مسلم معاشرے کے لیے ضروری
خیال کیے جاتے ہیں۔ لیکن "عصمت" کے قارئین
کے یہاں ہمیں ایک جمود کی کیفیت نظر آتی ہے۔

راشد الخیری عورتوں کو معاشرے میں فلاح
و بہبود کے پروگرام چلانے کا ایک ذریعہ
تصور کرتے تھے اور اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا
ہے کہ ان کے خیالات تقلیدی تھے جن کا واضح
اثر ان کی تحریروں پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ بعض
خواتین نے راشد الخیری کے اس نظریے کی سخت
تنقید کی۔ "تہذیب النسواں" میں راشد الخیری
پر تنقید کرتے ہوئے ایک خاتون نے لکھا ہے کہ
"راشد الخیری خواتین کو دوسرے لوگوں کی بہ نسبت
زیادہ بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن
ان کی تصانیف میں جو واقعات اور حادثات
ہمیں نظر آتے ہیں وہ حقیقت سے بالکل عاری
ہیں۔۔۔۔ (وہ پیش کرتے ہیں) عورتوں کی
کمزوری اور احساسِ کمتری، جس سے نہ تو معاشرے
میں کسی طرح کی ترقی کا کوئی امکان ہے اور نہ ہی
عورتیں اپنی مظلومیت کی اس تصویر کو پسند کرتی
ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ عورت کا وہ رُخ پیش
کریں جس میں ان کی صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آئیں
کہ وہ کس طرح سے حالات کا مقابلہ کر رہی ہیں۔
لیکن ان کی اس انداز کی تحریریں کسی بھی طرح معاشرے
کو فائدہ نہیں پہنچا رہی ہیں۔ (تہذیب النسواں
جولائی۔ ۱۹۲۱۔ صفحہ ۳۵۔۴۳۳)

"کیا ہماری خواتین ترقی یافتہ ہو گئی ہیں؟"
اس عنوان کے تحت ایک مضمون "عصمت" میں
شائع ہوا۔ راشد الخیری نے بدلتے ہوئے معاشرے
کی بدلتی ہوئی قدروں پر روشنی ڈالتے ہوئے
کہا: "ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ پچھلے زمانے اور
دورِ حاضر میں ہمارے یہاں کی خواتین میں کیا تبدیلیاں
آئی ہیں۔ آج کے دور کی عورتیں اپنے فرائض سے
بخوبی آگاہ ہیں وہ جان گئی ہیں کہ ان کا کام صرف
آبادی کو بڑھانا نہیں ہے بلکہ ان کا کام اس سے
کہیں بڑا ہے۔۔۔۔ اس حقیقت سے انکار نہیں
کیا جا سکتا کہ آج کل کی عورتیں اپنے گھروں کو سدھارنے
کی سخت کوششیں کر رہی ہیں، جو کہ ایک اہم تبدیلی
ہے۔ انھیں اس بات کا علم بھی ہے کہ خدا تعالیٰ نے
علم کی کھوج عورت اور مرد دونوں پر لازم کی ہے۔
(عصمت، اکتوبر، ۱۹۲۶ء صفحہ ۷۔۲)

"عصمت" کا اصلاحی مقصد جیسا کہ اوپر
ذکر آچکا ہے کہ راشد الخیری کے ناولوں سے بھی واضح
ہوتا ہے۔ راشد الخیری نے عورتوں پر ہونے والے
ظلم کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی۔ "عصمت"
نے ان اخلاقی ضابطوں کے خلاف تنقید کو نظر انداز
کیا، جنھیں "تہذیب النسواں" میں اہم جگہ دی تھی۔
اس لیے "عصمت" کو عورتوں سے زیادہ مردوں میں
مقبولیت حاصل ہوئی اور ۱۹۱۲ء میں عصمت کی
اشاعت ۹۰۰ تک پہنچ گئی جو "تہذیب النسواں"
کی چار سالہ ادبی زندگی سے کہیں زیادہ تھی۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ راشد الخیری
نے پاکیزگی اور عورتوں کے عزت و احترام کی طرف
خاصی توجہ دی۔ حالاں کہ ان کا اخلاقی ضابطہ روایتی

باقی صفحہ ۲۵ پر

پرویز احمد خان

بیدی: ادب سے فلم تک

(ایک جائزہ)

راجندر سنگھ بیدی کو تو سبھی جانتے ہیں ۔۔۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کے افسانے اتنے مقبول ہوئے کہ انھیں شہرت کی معراج تک پہنچا دیا۔ بیدی کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے ذاتی تجربوں اور تخیل کی تحلیل کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ وہ حقیقت کا ترجمان بن جاتی ہے انھوں نے افسانے کو صرف مشاہدے کی دنیا تک محدود نہیں رکھا بلکہ آفاقی بنا دیا۔ پلاٹ اور کردار نگاری دونوں میں وہ منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کے قصوں میں تذبذب اور انجام کی نفاست کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا فن رمزیت، تہ داری اور مدھم لب ولہجہ کا فن ہے۔ ان کے افسانوں پر عورت سوار ہے نہ شاعری، اور نہ محض رومانیت اور نہ جذبات بلکہ اس میں ایک توازن ہے، ایک اعتدال ہے۔ وہ پریم چند کی طرح حقیقت کے پرستار نظر آتے ہیں لیکن پریم چند کی طرح آدرش واد نہیں۔ انھوں نے دیہی زندگی پیش کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ مشاہدے کو اس وقت تک قلم بند نہیں کرتے، جب تک ذاتی تجربہ اور تخیل کی تحلیل سے اس کا مواد فراہم نہ کریں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات کیا ہیں۔ بقول محمد حسن کہ "انسان کا بے کل باطن ہے"۔

اگر بیدی کے افسانوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ انسان کی جبلی معصومیت ان کا بنیادی موضوع ہے۔ یہ جبلی معصومیت حالت کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ یہ حالت کی تبدیلی اور ماحول کی ستم ظریفی کے سبب کبھی حالات پر طنز بن کر ابھرتی ہے اور خود کبھی اس معصوم انسان پر جو اپنی معصومیت کا شکار ہو جاتا ہے ۔۔۔ پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "انسان کی فطرت بالکل سفید ہوتی ہے نہ بالکل سیاہ' اس میں دونوں رنگوں کا عجیب اتصال ہوتا ہے۔ اگر حالات گرد و پیش موافق ہوئے تو وہ فرشتہ بن جاتا ہے اور ناموافق ہوئے تو شیطان۔ وہ حالات مذکورہ کا محض ایک کھلونا ہوتا ہے "۔

بیدی کے کردار بھی حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ بھولا، ہمدوش، پان شاپ، کوکھ جلی، چیچک کے داغ، قوسین، جیب میں چھوٹا سا تھا، گالی، گرہن، غلامی، لاجونتی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ان تمام کہانیوں میں آپ کو وہی ستم ظریفانہ پہلو مل جائیں گے، جو مذکور ہیں۔

بیدی کے افسانوں کو تین حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ پہلے قسم کے افسانوں کا ذکر تو ہو چکا اس لئے یہاں دوسرے قسم کے افسانوں کا تذکرہ ہے۔ دوسرے قسم کے افسانوں میں زندگی کی حقیقتیں اتنی نکھر کر آئی ہیں اور اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں کہ وہ ہر ایک کی ذاتی زندگی معلوم ہوتی ہے۔

گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں، دکھ درد، عورت کی نفسیاتی زندگی، مرد عورت کی محبت وغیرہ کو بیدی نے افسانوں کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ گرم کوٹ، اپنے دکھ مجھے دے دو، چھوکری کی لوٹ، من کی من وغیرہ میں اسی طرح کی زندگی سامنے آتی ہے "گرم کوٹ" کی تو مثال ہی نہیں ہے یہ بیدی کی ذاتی زندگی ہے یا نہیں لیکن ایک متوسط طبقے کی زندگی ضرور ہے، جس کا کردار ایک ذمہ دار آدمی ہے۔ وہ گھریلو ضروریات کے تحت اپنی ذاتی ضروریات کا گلا گھونٹتا ہے۔ بیدی کا فن یہاں پورے طور سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔

آخری قسم کے افسانوں میں غیر معمولی اور ٹیڑھے میڑھے کردار آتے ہیں۔ مثلاً جس طرح کے "زین العابدین" "بیکار خدا" یا "لاروے" وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔

بیدی کی فلمی دنیا کا آغاز تقریباً ۱۹۴۹ء سے ہوتا ہے۔ اسی سن میں وہ بمبئی آئے اور آتے ہی اپنے قلم کا زور دکھانا شروع کر دیا۔ ان کی پہلی ملاقات ایک پنجابی ہدایت کار ڈی کیشپ سے ہوئی۔ "بڑی بہن" کا منظر نامہ اور مکالمے بیدی صاحب نے لکھے۔ پھر کیا پوچھنا۔ فلم خوب چلی۔ بیدی صاحب کی مانگ بڑھنے لگی۔ قسمت کا تختہ پلٹا کہ ان کی اگلی فلم "داغ" آئی۔ اس فلم کے ہدایت کار تھے ایم چکرورتی، ہیرو دلیپ کمار، ثمی ہیروئن۔ فلم باکس پر

۱۴۔ کاویری ہوسٹل۔ جے این یو، نئی دہلی۔

ہٹ ہوئی اور بیدی کی شہرت فلمی دنیا میں بڑھتی گئی۔ مشہور بنگالی ڈائریکٹر بمل رائے نے ان کو اپنی کمپنی میں بلا لیا۔ بمل رائے نے ایک کامیاب فلم بنائی جس کا نام "مدھومتی" تھا۔ اس کا مکالمہ بیدی صاحب نے لکھا ایک تو رومانس بھری کہانی تھی۔ اس پر دلیپ کمار کی اداکاری اور بیدی کے مکالموں نے "سونے پر سہاگہ" کا کام کیا۔ بعد میں بیدی ڈائریکٹر رشی کیش مکھرجی کے ساتھ کام کرنے لگے۔ اور "انوپما" "انورادھا" "ستیہ کام" جیسی صاف ستھری فلمیں بنائیں۔ آپ کی فلموں کی شہرت کی وجہ سے آپ کو خود فلم بنانے کا چسکہ لگا۔ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کی حیثیت سے فلم "دستک" بنائی، جو بہت مشہور ہوئی اور تجارتی اعتبار سے بھی خاصی کامیاب ہوئی۔ اس کا ہیرو سنجیو کمار اور ریحانہ سلطان ہیروئن تھی، موسیقار مدن موہن تھے۔ فلم کی کامیابی کے سبب ہیرو، ہیروئن اور موسیقار تینوں کو اس سال کا بہترین اداکار، اداکارہ اور موسیقار کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔

ان کی فلم "پھاگن" بہت بری طرح ناکام ہو گئی اور "آنکھوں دیکھی" جو گاندھی جی کے اصولوں پر بنائی گئی تھی، اس کے ناکام ہونے کے ڈر سے کوئی خریدنے کو تیار ہی نہیں ہوا۔ اس فلم پر ٹیکس معاف کروانے کے سلسلے میں وہ بہت پریشان ہوئے۔

بیدی کی شخصیت بھی عجیب تھی۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے، اس کو خلوص اور صداقت کے ساتھ پیش کر دیتے تھے، چاہے لوگ ان کا مذاق ہی کیوں نہ اڑائیں۔ بیدی صاحب نے صداقت کو پیش کرنے میں خلوص اور جذبات کا اظہار مخصوص انداز میں کیا ہے۔ یہی ان کی کامیابی ہے۔ کیوں کہ شخصیت کسی بھی شخص کے نیک و بد سے ہی مرتب ہوتی ہے۔ وہ شخص اپنی شخصیت کو کس نہج پر کتنی کامیابی کے ساتھ ڈھالتا ہے اور اس میں کتنا کامیاب ہے، اس پر منحصر ہے— بیدی صاحب ایک اچھے انسان تھے اس لئے ان کا ادب بھی اچھا ہے کیوں کہ ادب ادیب کی شخصیت سے چھن کر ہی وجود میں آتا ہے۔

ان کے مشہور ناولٹ "ایک چادر میلی سی" (جس پر انہیں ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی ملا) پر ایک فلم بنائی گئی۔ پہلی بار غالباً گیتا بالی نے بنانے کی کوشش کی اور کام بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن ان کی ناگہانی موت نے فلم کو ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ اب اس پر ہندوستان میں ایک خوب صورت فلم بن چکی ہے جو بہت مشہور ہوئی۔ ایک فلم اسی ناولٹ پر پاکستان میں بھی بنی اس سب کے باوجود بیدی کو شہرت فلمی دنیا سے زیادہ ادبی دنیا میں حاصل ہوئی اور ان کا ناولٹ "ایک چادر میلی سی" ایک ایسی مایہ ناز اور غیر فانی تصنیف ہے جو اظہر من الشمس ہے اور بیدی کی یاد دلاتی رہے گی۔ یہ سچ ہے کہ ادیب مر جاتا ہے لیکن ادب زندہ رہتا ہے۔ ●

بقیہ: سب کے لیے تعلیم کی حیثیت

اگر ٹھوس تدابیر کی جائیں تو یو۔پی۔ای اور یو۔ای۔ای کے مقاصد کو پروجکٹیڈ مدت سے قبل ہی حاصل کیا جا سکتا ہے اور ایسی کاوشوں سے ماضی کے رجحان بھی بدل سکتے ہیں۔ اس طرح ۲۰۰۱ تک یو۔پی۔ای کے مقاصد کو حاصل کرنے کی غرض سے نہ صرف موجودہ داخلہ شرح کی سطح کو برقرار رہنا ہوگا بلکہ بر وقت درجہ بدرجہ ترقی اور اسکول چھوڑنے والوں کی شرح میں بھی اہم سدھار لانا ہوگا۔ مہتہ (۱۹۹۵ء) کے مطالعوں اور این۔ایس۔ایس۔او کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچوں کی ایک بڑی تعداد اسکول اس لیے چھوڑ دیتی ہے کہ وہ بار بار فیل ہو جاتی ہے۔ بذات خود تعلیم میں ان کی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ہے۔ ریاستوں میں درجہ پنجم تک نو ڈیٹنشن NO-DETFNTION پالیسی کو نافذ کرنا تعلیمی ترقی کی شرح میں معاون ہو سکتا ہے۔ بچوں کو اسکول نہ چھوڑنے کی ترغیب کی غرض سے حال ہی میں شروع کی گئی دوپہر کے کھانے کی اسکیم جس میں پالیسی وضع کرنے والوں اور اس کے منصوبہ کار دونوں ہی کو دلچسپی ہے، کا اثر اسکول چھوڑنے والوں کی شرح پر کیا پڑتا ہے اس کا اندازہ کم از کم دس سال بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ●

بقیہ: آبادی، تعلیم اور ذرائع ابلاغ

کے مسائل کے متعلق بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ ریڈیو اس کام کو کرنے میں سب سے نمایاں رول ادا کر رہا ہے۔ یہ نہ صرف آبادی کے متعلق بلکہ خاندانی منصوبہ بندی کے تئیں بھی لوگوں کو معلومات فراہم کر رہا ہے۔

المختصر پاپولیشن ایجوکیشن (تعلیم برائے آبادی) اور ذرائع ابلاغ کے پیچھے جو فلسفہ کارفرما ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے معیارِ زندگی بہتر بنانے اور ترقی کرنے کے مقاصد پر ہی زور ڈالنا چاہیئے۔ نہ کہ صرف پروگرام کی تیاریوں پر ــــ "تعلیم برائے آبادی کے لیے حکومت کو اس وقت ملٹی میڈیا اپروچ پر مبنی ملک گیر پیمانے پر میڈیا پروگرام تیار کروانا چاہیئے جیسے ریڈیو، ٹی وی کے لیے پروٹو ٹائپ سوفٹ ویئر وغیرہ"۔

پیشہ ورانہ ایجنسیوں اور کالج کے نوجوانوں کے اشتراک سے روایتی اور لوک میڈیا پر مبنی پروگرام بھی بنانا چاہیئے تاکہ اس کام کو سرعت کے ساتھ آگے لے جایا جا سکے آبادی سے تعلق رکھنے والے ان تمام مسائل کو اچھی طرح سمجھنے اور ان کے تئیں بیداری پیدا کرنے کے لیے حکومت کو چاہیے کہ قومی اور نچلی سطح بنیادی ڈھانچے کی سہولتیں فراہم کرے جو بہت ہی لازمی ہیں۔ حالاں کہ اس وقت اس قسم کی کچھ سہولتیں تو موجود ہیں مگر وہ کارآمد نہیں ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم آبادی کے مسئلہ کو قومی مسئلہ سمجھیں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس مسئلے کو مشتہر کرنے کے لیے ایسا خاکہ۔۔۔۔ تیار کریں جو واقعی اس کام کے لیے سود مند ثابت ہو۔

جشن آزادی

سید علی شبر حسینی

جشنِ آزادی ہے مل جل کے منائیں ہم تم
دل میں پوشیدہ جو نفرت ہے مٹائیں ہم تم

نشۂ حبِّ وطن کو نہیں لازم ہے شراب
بادہ نوشوں کو بھی راز بتائیں ہم تم

دور منزل ہے ابھی راہ میں تاریکی ہے
مشعلِ وقت کی لو اور بڑھائیں ہم تم

ایسی میٹھی ہو زباں غیر بھی اپنا ہو جائے
اپنا اندازِ تکلم وہ بنائیں ہم تم

ہر خریدار کو یوں نقدِ دل و جاں مل جائے
ایسی دُکان محبت کی سجائیں ہم تم

دوست جو کل تھا اگر روٹھ گیا ہے ہم سے
اپنے سینے سے اُسے آج لگائیں ہم تم

کل تو ہم دوست تھے اور آج ہیں بھائی بھائی
مادرِ ہند کو یہ گا کے سنائیں ہم تم

آج ہر ایک کو ہو جشنِ بہاراں کا یقیں
اس طرح پھول محبت کے کھلائیں ہم تم

ہم قفس سے ہوئے آزاد حسینی ہے کرم
سجدۂ شکر میں کیوں سر نہ جھکائیں ہم تم

۶۲ پریس روڈ - نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

غزل

عطا عابدی

آئینے سے ڈرتا ہوں
عصرِ نو کا چہرا ہوں
سب کہتے ہیں اچھا ہوں
تجھ کو کیسا لگتا ہوں؟
مستقبل میں رہتا ہوں
ماضی کا ایک حصّہ ہوں
پنجرے میں کیوں رہتا ہوں
کیا میں ایک پرندہ ہوں؟
محفل روز سجاتا ہوں
پھر بھی کتنا تنہا ہوں؟
ساحل کا کھاتا ہوں فریب
بیچ سمندر تنکا ہوں
رہتا ہوں ہر دم خاموش
کس سے باتیں کرتا ہوں؟
یاد آتا ہوں اکثر میں
کس کا ٹوٹا رشتہ ہوں؟
کیوں سب کی دستار گری
کیا میں اتنا اونچا ہوں؟
پھر کیوں ہوں معذور عطاؔ
دست و بازو والا ہوں

ایم آئی ایم ایس آفس، شہزادی پاؤس، محلہ رحم خاں، دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴

غــــــــــزلیں

عباس رضا نیّر

ان اندھیروں کے کئی اور سبب ہوتے ہیں
ورنہ جگنو بھی تہِ دامنِ شب ہوتے ہیں

کیا کروں جذبۂ اظہار دباؤں کیسے
زخم چیخ اٹھتے ہیں خاموش جو لب ہوتے ہیں

دھوپ میں چلنے کی عادت ہے ہمیں بچپن سے
جلنے لگتے ہیں قدم چھاؤں میں جب ہوتے ہیں

ایسے جذبات جو رکھتے ہیں غموں سے نسبت
جب وہ الفاظ میں ڈھلتے ہیں ادب ہوتے ہیں

موم کے زینے پہ چڑھ جاتے ہیں سورج کے لیے
اس نئے عہد کے فنکار عجب ہوتے ہیں

سانحہ ہو جاتا ہے اندیشوں کا اک جمِ غفیر
جب کبھی ہم تری محفل میں طلب ہوتے ہیں

جیسے طوفان غموں کے ہیں دلوں میں نیّر
ایسے طوفان سمندر میں بھی کب ہوتے ہیں

جعفر آباد، جلال پور، فیض آباد۔ ۲۲۴۱۴۹

بدر نظیری

گرمی سے بے تاب بہت ہیں
پھر بھی ہم سیراب بہت ہیں

باغ کے اکثر پیڑ ہیں سوکھے
لیکن کچھ شاداب بہت ہیں

تعبیروں کی فصلیں کاٹیں
بُننے کو تو خواب بہت ہیں

خواہش کے بے باک پرندے
اُڑنے کو بے تاب بہت ہیں

پیار کی آنکھیں گہری جھیلیں
نظر نظر گرداب بہت ہیں

تاریکی کیوں پھیل رہی ہے
شہر میں تو مہتاب بہت ہیں

جھوٹے موتی سب کے گلے میں
سچّے نگ نایاب بہت ہیں

بدرؔ سنبھل کر چلنا ہوگا
گرنے کے اسباب بہت ہیں

اے ۲۔ ایس آر ایم، غفار منزل جامعہ نگر اوکھلا۔ ۲۵

احسان وارثی

دوست اغیار سے ہوگئے
پھول تھے خار سے ہوگئے

چشم، نوکِ سناں بن گئی
لفظ تلوار سے ہوگئے

کیفیت دل کی لکھ دی گئی
چہرے اخبار سے ہوگئے

مہکیں یادوں کی پروائیاں
زخم گلزار سے ہوگئے

تاج پگھلے تو گھنگرو بنے
قصر بازار سے ہوگئے

محتسب راہ میں مل گیا
ہم گنہ گار سے ہوگئے

حق نوائی کے مجرم تھے جو
منسلک دار سے ہوگئے

میں تو یوسف نہ تھا جانے کیوں
سب خریدار سے ہوگئے

آس ٹوٹی تو احسان ہم
گرتی دیوار سے ہوگئے

۱۳/۰۰۹۔ بازداران سہارنپور۔ ۲۴۷۰۰۱

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

محکمہ سیاحت کے مختلف شعبوں کی کارکردگی

ایک نوڈل ایجنسی کے طور پر سیاحت کا محکمہ ملک میں سیاحت کی ترقی کے لیے قومی پالیسیاں وضع کرتا ہے، پروگرام بناتا ہے، مرکزی ایجنسیوں کی سرگرمیوں میں تال میل پیدا کرتا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر کے ساتھ بھی تال میل بنائے رکھتا ہے۔

یہ محکمہ ایک ملحق دفتر سے اعانت حاصل کرتا ہے۔ اس ملحقہ دفتر کا سربراہ پالیسیوں اور پروگراموں کے لیے ایگزیکیٹیو ہدایات دیتا ہے۔ ڈائرکٹر جنرل کے آفس فیلڈ کے ۱۸ دفاتر جو ملک سے باہر ہیں اور ۲۱ دفاتر جو ملک کے اندر ہیں، کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ سمندر پار دفاتر بنیادی طور پر سیاحت فروغ اور مارکیٹنگ کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ فیلڈ دفاتر جو ملک میں واقع ہیں وہ سیاحوں کو اطلاعاتی خدمات فراہم کر رہے ہیں اور فیلڈ پروجیکٹوں کی نگرانی بھی کر رہے ہیں۔

سرکاری دائرہ کار کی صنعت بھارتی سیاحت ترقیات کارپوریشن (آئی ٹی ڈی سی) اور درج ذیل خود مختار ادارے محکمہ سیاحت کے تحت کام کرتے ہیں۔ ان میں

(۱) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹورزم اینڈ ٹریول مینجمنٹ۔

(۲) ہوٹل انتظامیہ کی قومی کونسل اور کھان پان ٹکنالوجیوں کا ادارہ اور اس کے تحت کام کرنے والے ادارے۔

(۳) آبی کھیلوں کا قومی ادارہ۔

(۴) اسکیئنگ اور کوہ پیمائی کا بھارتی ادارہ

کے نام شامل ہیں۔ ●

کدرے مکھ آئرن اور کمپنی لیمیٹیڈ کا منافع

کدرے مکھ آئرن اور کمپنی لیمیٹیڈ (کے آئی او سی ایل) جو بھارت سرکار کی ایک انٹر پرائز ہے، امید کی جاتی ہے کہ اس برس سو کروڑ روپے کا خالص منافع کمائے گی اور اس کے ذریعہ ۱۵ سو لاکھ (۱۵۰ ملین) امریکی ڈالر کا غیر ملکی زر مبادلہ حاصل کیا جائے گا جب کہ ۹۶-۱۹۹۵ء میں (۱۳۲ ملین) ۱۳۲ لاکھ کا زر مبادلہ بقدر منافع کمایا تھا۔ - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - کمپنی ایک مشترکہ سیکٹر (کدرے مکھ آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی ۳۲ کروڑ روپے) کی لاگت سے قائم کرنے کی تجویز رکھتی ہے جس کے ۱۰ ایم ای سی او این) اور "ایم سی ٹی ڈی سی" ساجھے دار ہوں گی۔ یہ اکائی ۲۲۳۰۰۰ ٹن پگ آئرن اور ۵۵۰۰۰ تاز پذیر آئرن اسپین پائپ سالانہ تیار کرے گی - - - - - - بینک مالیاتی ادارے معینہ مدت کے قرضے منظور کرنے کے مراحل میں ہیں اور توقع ہے کمپنی اس سال نومبر دسمبر میں اکویٹی اشو جاری کرے گی اور دسمبر ۱۹۹۷ء سے پیداوار شروع کرے گی۔ کچھ ممالک جیسے آسٹریلیا، کان سیکٹر میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ - - - - - - - - -

ایک آسٹریلین کمپنی نے مفصل پروجیکٹ رپورٹ پیش کی ہے جس کی لاگت ۲۵۰ کروڑ روپے ہے۔ اس پروجیکٹ کے تحت کمپنی مذکور کے آئی او سی ایل کے سالانہ کچرے / میل سے ۲۰ لاکھ ٹن قیمت کا لو بانکال کر دے گی۔

حکومت کان کنی کی صنعت میں ۵۱ فی صد کا کنٹرولنگ انٹرسٹ بنائے رکھے گی۔ حکومت اس صنعت کو۔ کور شعبہ کی صنعت خیال کرتی ہے۔ ●

جی ڈی برلا ایوارڈز برائے سال ۱۹۹۶ء کا اعلان

نائب صدر جمہوریہ ہند شری آر کے۔ نارائنن نے جی۔ ڈی۔ برلا ایوارڈز برائے سال ۱۹۹۶ء تقسیم کیے۔ انسانیت کا ایوارڈ ز ایس۔ او۔ ایس چلڈرن ولیج آف انڈیا کے صدر شری جے۔ این کول کو دیا گیا۔ دیہی اور قبائلی طبقات کو اوپر اٹھانے کے لیے ضلع کیرا کے کو آپریٹو ملک پروڈیوسر یونین اور بھارت کے ثقافتی ورثہ کے تحفظ کے لیے روسی اکاڈمی آف سائنس، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے ڈائریکٹر پروفیسر آر بی ریباکوف کو بھی ایوارڈ دیا گیا ہے۔ ایوارڈ کے تحت دو لاکھ روپے کی رقم نقد دی جاتی ہے۔

ماہر تعلیم مسٹر آر بی ریباکوف ۱۲۰ کتب و مضامین کے مصنف ہیں اور بھارت کی تاریخ و ثقافت کے مطالعات میں کافی وقت صرف کرچکے ہیں۔

وہ بھارتی ثقافت کے ان ممتاز اسکالروں میں ایک ہیں جنھوں نے ہندو مت کی نشو و نما کے پہلو پر راجہ رام موہن رائے کے عہد سے ہی توجہ مبذول کی ہے۔ ان کا مطالعہ دنیا کی ثقافت میں بھارت کا حصہ دوسری تہذیبوں سے اس کا تعلق اور مستقبل میں بھارتی ثقافت کے عالمی تہذیب پر اثرات، پر احاطہ کرتا ہے۔

یہ اعزاز شری جے۔ این کول کو حاصل ہے کہ

انھوں نے یک سوئی سے بچوں کی دیکھ بھال اور آبادکاری کا معقول انتظام کیا ہے، کیوں کہ بھارت میں ایس۔ او۔ ایس چلڈرن ویلیج کافی تعداد میں ہیں اور دنیا کے کسی ملک میں نہیں۔ وہ اپنی انتھک کوششوں سے ملک کے ۳۲ دیہاتوں میں ۸۷ متعلقہ پروجیکٹ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جہاں ۱۵۰۰۰ بچوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ جب کبھی بچوں پر کوئی قدرتی آفت یا کسی انسانی کارنامے کے نتیجہ میں کوئی سانحہ رونما ہوتا ہے تو ایس۔ او۔ ایس گاؤں اسے بچوں کو راحت دیتے ہیں۔ بھوپال میں گیس سانحہ، اتر کاشی اور لاتور میں زلزلہ جیسے حادثات میں ایس۔ او۔ ایس ویلیجز کی بنیاد ڈلوائی۔

کیرا ڈسٹرکٹ کوآپریٹو ملک پروڈیوسرز یونین کا قیام آج سے پچاس برس قبل عمل میں آیا تھا۔ اس ادارے نے اپنے اراکین، ملازمین اور کھیدا ضلع کے لیے خاطر خواہ سرمایہ جمع کرلیا ہے اس وقت یونین ۹۵۰ امداد باہمی اداروں کے ۳۵۰۰۰۰ اراکین پر احاطہ کرتی ہے اور روزانہ ۷ سے ۸ لاکھ لیٹر دودھ پیدا کرتی ہے۔ سالانہ پیداوار ۵ر۴۴۳ کروڑ روپے کے بقدر ہے اس کا ۷۰ فی صد حصہ یونین کے مالکان یعنی دودھ پیدا کرنے والوں کو ملتا ہے۔ کیرا یونین کی کامیابی نے قومی ڈیری ترقیات بورڈ کے قیام کی راہ ہموار کی تھی۔ ●

سرکاری نظام تقسیم کو از سر نو مستحکم بنایا جائے گا

۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران سرکاری نظام تقسیم کو مزید راشن دوکانیں کھول کر نئے گودام بنا کر چلتی پھرتی راشن کی نئی دوکانیں کھول کر اور زیادہ مقدار میں اناج مختص کر کے اور زیادہ مستحکم بنایا گیا ہے جن علاقوں میں غریب لوگوں کی اکثریت ہے وہاں اسے مزید مستحکم بنایا گیا ہے۔ ان علاقوں میں نئے جاری کردہ راشن کارڈوں کی تعداد ۷ر۶۵ لاکھ ہے اور واجبی قیمت کی دوکانوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی۔ اس طرح گھر سے قریب اناج دستیاب کرانے کی کوشش میں بھی کامیابی ہوئی اور ۴۰۰۰ سے زائد دکانیں گھر گھر اناج پہنچانے والی اسکیم کے تحت آگئیں۔ برس کے دوران ریاستوں کو اناج کی تقسیم کے لیے گاڑیاں خریدنے کے لیے ۵ر۵ کروڑ روپے اور ملک کے اندرونی علاقوں میں گوداموں کی تعمیر کے لیے ۵۰ فی صد امداد دی گئی تاکہ سال بھر سرکاری نظام تقسیم کے توسط سے اناج کی تقسیم برقرار رہ سکے۔ گیہوں کی تخصیص کی بالترتیب ۴ر۱۰۶ لاکھ ٹن اور ۱۵ر۱۳۱ لاکھ میٹرک ٹن ۹۵-۱۹۹۴ء کے مقابلے بڑھا کر ۳ر۱۱۱ لاکھ میٹرک ٹن اور چاول کی تخصیص ۳۵ر۱۴۴ لاکھ میٹرک ٹن کر دی گئی۔

تین مہینے کے پیشگی اناج تخصیص نظام کی شروعات کی گئی تاکہ واجبی قیمت والی دکانوں کی بالترتیب ۴ر۱۰۶ لاکھ ٹن اور ۱۵ر۱۳۱ لاکھ میٹرک ٹن پر اناج بروقت پہنچ سکے۔ سکریٹری صارفین امور، سرکاری نظام تقسیم کی صدارت میں سکریٹریوں کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ وزارت خوراک کوئلہ اور پٹرولیم کے سکریٹری حضرات بھی کمیٹی میں شامل ہیں۔

لازمی اشیا کی سپلائی کا نظام سال کے دوران خاصا اطمینان بخش رہا۔ جن اشیا کی قلت تھی انھیں بروقت درآمد کرلیا گیا جس سے قیمتوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ملک میں دالوں کی دستیابی بڑھانے کے لیے او جی ایل کے تحت درآمدات پر محصولات گھٹا کر دس سے ۵ فی صد کر دی گئیں۔ اوپن مارکیٹ میں اچھی قسم کی چینی براہ راست کھپت کے لیے جاری کی گئی۔ یہ بھی مقصد تھا کہ قیمتیں بڑھنے سے روکی جائیں۔

خوردنی تیلوں کو اوپن جنرل لائسنس کے تحت درآمد کرنے پر عائد محصول ۶۵ فی صد سے گھٹا کر ۳۰ فی صد کر دیا گیا تاکہ درآمدات کی حوصلہ افزائی ہو اور دستیابی یقینی بنی رہے۔ اس کے نتیجے میں اکتوبر ۱۹۹۵ء کے دوران ۴ لاکھ ٹن سے زائد درآمدات نجی ٹریڈروں نے کی۔ ریاستی ٹریڈنگ کارپوریشن نے بھی سرکاری نظام تقسیم کے لیے ۵ر۱ لاکھ پامولین درآمد کیا اس کے علاوہ این ڈی ڈی بی نے ۵ر۲ لاکھ ٹن کی درآمد کی۔ ان درآمدات کے نتیجے میں زیادہ مقدار میں استعمال میں آنے والے خوردنی تیلوں کی قیمت تہوار کے سیزن میں قابو میں رہ سکی۔

اس برس کے دوران ملک میں قیمتوں میں اکثر ہو جانے والے اضافے کی روک تھام کے لیے مستقبل کے تجارتی نظام پر نظر ثانی کا اقدام بھی کیا گیا۔ فارورڈ مارکیٹ کمیشن نے کوزی کوڈ میں واقع بمبئی اور کولہاپور میں فیوچر ٹریڈنگ کے لیے اضافی مراکز کھولنے کے ضمن میں مطالعہ انجام دیا۔ ایک اسٹیرنگ کمیٹی بھی قیام کی گئی تاکہ کوچین میں انٹرنیشنل پیپر ایکسچینج کھولنے کے کام میں تیزی لائی جا سکے۔ بھارتی معیارات بیورو وزارت کے تحت ایک ادارہ ہے۔ اس ادارے نے مصنوعات کی معیار بندی، درجہ بندی کے اپنے سارے فرائض میں ہمہ گیر ترقی حاصل کی۔ ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران ۳۲۸ نئے معیارات وضع کیے گئے۔ ۲۶۰۷ معیارات پر نظر ثانی کی گئی۔ معیار بندی و کوالٹی انتظام کے لیے ایک رہائشی ادارہ شروع کیا گیا۔ یہ ادارہ ترقی پذیر اور دولت مشترکہ ممالک کے لیے ایک معتمد مرکز ثابت ہوگا۔

صارفین کے تحفظ کے شعبے میں صارفین سے متعلق عدالتوں میں ڈھانچہ کو مضبوط بنانے کے لیے ایک بڑا اقدام یہ اٹھایا گیا کہ ریاستوں اور یکمشت امداد کے طور پر ۶۱ کروڑ روپے منظور کیے گئے۔ اس گرانٹ کی پہلی قسط ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران جاری کی گئی جو ۹۸۳-۲۹ کروڑ روپے ہے۔ ●

اپریل۔ جون ۱۹۹۶ء کے دوران بغیر ٹکٹ ریل مسافروں سے ۲۵ کروڑ سے زائد کی وصولی

رواں مالی سال کی پہلی سہ ماہی کے دوران بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں سے اپریل سے جون ۹۶ء کے آخر تک ۰۳ر۲۵ کروڑ روپے بطور جرمانہ وصول ہوئے جب کہ گزشتہ برس کی اسی مدت میں ۳۰ر۲۰ کروڑ روپے کی وصولی ہوئی تھی۔ اس طرح ۴ر۲۳ فی صد کا اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ وصول کردہ مجموعی رقم میں ۹۸ر۲۱ کروڑ روپے بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں سے اور ۰۵ر۳ کروڑ روپے بک کرائے گئے سامان پر عائد جرمانے سے وصول کیے گئے۔

اس مدت کے دوران بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کو پکڑنے کے لیے ڈالے گئے چھاپوں میں

۹٫۳ فی صد کا اضافہ ہوا۔ اس طرح ۲٫۰۶ لاکھ چھاپے مارے گئے۔ گزشتہ برس کی اسی مدت کے دوران ۲٫۲۳ لاکھ چھاپے ڈالے گئے تھے۔ اسی طرح بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کی تعداد میں بھی ۲۱٫۲ فی صد کا اضافہ ہوا۔ ۲۱٫۷۶ لاکھ افراد بغیر ٹکٹ کے پکڑے گئے۔ گزشتہ برس ۱۷٫۹۵ لاکھ افراد بغیر ٹکٹ پکڑے گئے تھے۔ ●

ریلوے حفاظتی فورس کے ذریعہ غیر قانونی طور سے گاڑیوں میں کوئلہ لے جانے پر چھاپے

۱۸ تا ۱۲ اگست ۱۹۹۶ء کے دوران ریلوے حفاظتی فورس نے پروشوتم ایکسپریس، راجدھانی ایکسپریس، گنگا دامودر ایکسپریس اور بہار میں دوسری گاڑیوں پر اچانک چھاپے مارے اور ۶٫۳۵ کوئنٹل کوئلہ برآمد کیا اور اس سلسلے میں ۲۳ افراد کو گرفتار کیا۔ اچانک چھاپوں کی ہدایات ریلوے کے وزیر۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ نے جاری کی تھیں۔ [redacted] شکایات موصول ہوئی تھیں کہ بہار میں گاڑیوں میں ناجائز طریقہ سے کوئلہ کی نقل و حمل ہو رہی ہے، جو مسافروں کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔

ان چھاپوں سے مسافروں کو کافی راحت ملی ہے، جنھیں سفر کے دوران بڑی مشکلات کا سامنا تھا کیوں کہ مسافر گاڑی میں ناجائز طریقہ سے کوئلے کی نقل و حمل ہوئی تھی۔ اس طرح کے چھاپے آر پی ایف کے ذریعہ کوئلہ کے ناجائز اور غیر قانونی نقل و حمل کو روکنے کے لیے جاری رہیں گے تاکہ اس کا قلع قمع ہو سکے اور مسافر آرام سے سفر کر سکیں۔ ●

مربوط اطفال ترقیات خدمات اسکیم

مربوط اطفال ترقیات خدمات (آئی سی ڈی ایس) اسکیم کو ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران عام بنایا گیا ہے۔ اب کمیونٹی ترقیات کے ۵۲۹۱ بلاکوں میں ۵۶۱۴ پروجیکٹ دستیاب ہیں اور ۲۱ بڑی شہری گندی بستیوں میں ہیں۔ اس میں ۳۱۰ شہری آئی سی ڈی ایس پروجیکٹ اور ۳۰۳ قبائلی آئی سی ڈی ایس پروجیکٹ بھی شامل ہیں۔ ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران نئے کمیونٹی بلاکوں و شہری گندی بستیوں پر احاطہ کرنے کے لیے ۵۰۰ نئے آئی سی ڈی ایس پروجیکٹ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ منظور کیے گئے۔ یہ بات انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کی وزارت کے تحت خواتین اور بچوں کی ترقیات کے محکمے کی ۱۹۹۶ء کی سالانہ رپورٹ میں کہی گئی ہے۔ خدمات کا مربوط پیکج بڑھا کر ۱۸۲٫۲۹ بچوں تک کر دیا گیا ہے۔ اس کے تحت دیہی/قبائلی و شہری گندی بستیوں کی ۳۸٫۰۷ لاکھ مائیں بھی شامل ہیں۔ تین سے چھ برس کی عمر کے ۱۰۵ لاکھ سے زائد بچے آئی سی ڈی ایس کے تحت اسکول سے قبل کی ترغیب حاصل کر رہے ہیں۔

زیر جائزہ سال کے دوران کیرالہ، مہاراشٹر، راجستھان، تامل ناڈو اور اتر پردیش میں تیسرے آئی سی ڈی ایس پروجیکٹ کی شروعات کے لیے عالمی بینک کے ساتھ ایک ڈائیلاگ شروع کیا گیا ہے۔ عالمی بینک کی مدد سے چلنے والے دو آئی سی ڈی ایس پروجیکٹ ایسے علاقوں میں پہلے سے ہی جاری ہیں جہاں قبائلی آبادی زیادہ ہے یا جو علاقے خشک سالی کا شکار ہیں۔ یہ علاقے آندھرا پردیش، اڑیسہ، بہار اور مدھیہ پردیش کے ہیں۔ یہ پروجیکٹ خواتین کی آمدنی بڑھانے والی سرگرمیاں فراہم کراتے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں کی فلاح و بہبود کا انتظام کرتے ہیں۔ عام آئی سی ڈی ایس خدمات کے ساتھ ناقص تغذیہ کے شکار بچوں کی دیکھ بھال اور تغذیہ بحالی کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ خواتین اور بچیوں کی ضروریات پر توجہ مرکوز کرانے کی غرض سے نوجوان لڑکیوں کے لیے آئی سی ڈی ایس بنیادی ڈھانچے کے استعمال سے ایک خصوصی اسکیم چلائی گئی ہے۔ یہ اسکیم ۱۱ سے ۱۸ برس کی عمر میں اسکول ترک کر دینے والی بچیوں کی فلاح پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔ یہ اسکیم ان کی ذاتی ترقی، تغذیہ، صحت، تعلیم، خواندگی، تفریح، مراکز میں دستیاب ہدایات سے ہنر مندی پیدا کرانے، تربیتی کیمپ اور کام سکھانے پر توجہ دیتی ہے۔ یہ اسکیم تمام ریاستوں و مرکزی انتظام کے علاقوں کے ۵۰۷ بلاکوں کے لیے منظور کی گئی ہے۔ تقریباً ۲۱٫۵ لاکھ لڑکیوں کو مستفید کیا گیا ہے۔ ۴۳۶۵ اطفال تعلیم مراکز کے توسط سے ایک لاکھ بچوں کو اسکول سے قبل کی تعلیم کی سہولت فراہم کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مراکز آندھرا پردیش، آسام، بہار، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان، اتر پردیش اور مغربی بنگال کی ریاستوں میں رضاکار ادارے چلاتے ہیں۔

آئی سی ڈی ایس نے ۱۹۹۵ء میں بیس برس مکمل کر لیے ہیں۔ آج یہ دنیا کا سب سے بڑا و وسیع رسائی والا پروگرام ہے جو بچوں کی ابتدائی ترقی اور نگہداشت فراہم کرتا ہے۔ ●

"رائٹس" نے ماریشس میں آبی راستوں سے متعلق ٹھیکہ حاصل کیا

وزارت ریلوے کے تحت سرکاری دائرہ کار کے ادارہ ریل انڈیا ٹیکنیکل اینڈ اکونامک سروسز لمیٹیڈ نے ماریشس میں ایک معتدبہ ٹھیکہ حاصل کیا ہے۔ یہ ٹھیکہ ماریشس کی توانائی اور آبی وسائل کی وزارت کے تحت ہائیڈرو گرافک سروے اور آبی ذخائر میں گاد بیٹھ جانے سے متعلق مطالعات پر مبنی ہے۔ مذکورہ ٹھیکہ کے تحت رائٹس آبی ذخائر کی سطح میں گاد بیٹھنے کی شرح سے متعلق مشورہ، گاد صاف کرنے کی ٹیکنیک اور آبی ذخائر کا رکھ رکھاؤ وغیرہ کے ضمن میں مشاورتی خدمات فراہم کرے گی۔ بھارت میں تکنیکی تبادلہ کے پروگراموں کے تحت ماریشس کے تکنیکی عملہ کو کام کے ساتھ تربیت بھی فراہم کی جائے گی۔

یہ پہلا موقع ہے کہ رائٹس ملک سے باہر آبی ذخائر میں گاد کے مطالعات سے متعلق مشاورتی خدمات انجام دے رہی ہے۔

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر عابد کرہانی

فون 6177591

تزئین و کتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : جیتندر سنگھ

جلد : ۱۶ شمارہ : ۷

اکتوبر ۱۹۹۶ء (۹ آشون تا ۹ کارتک شک ۱۹۱۸)

قیمت فی شمارہ ۵ روپے

سالانہ ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) : ڈی۔ ایس۔ گاندھی

مضامین سے متعلق

خط کتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (ویسٹ) نئی دہلی ۰۶۶ ۱۱

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

اعجاز بن ضیا اوگانوی

صنعتوں سے پھیلتی آلودگی ـ سبب اور انسداد

آلودگی کے لغوی معنی ہیں گندگی، ناپاکی، نجاست یا آلائش لیکن اس کو ذرا وسعت دیں تو ہم کہہ سکتے ہیں دائرہ، حلقہ یا اردگرد کا ماحول آلودہ ہونا یعنی ماحولیات کی ہر چہار جانب موجود طبیعاتی اور نباتاتی مادیت کا اجتماع۔ اس زمرہ میں ہوا، پانی، زمین وغیرہ شامل ہیں جب کہ نباتاتی مادیت کے تحت جڑی بوٹی، پیڑ پودے، جنگل وغیرہ آتے ہیں۔ اس مادہ پرستی کی دوڑ اور اقتصادی ترقی کی کشمکش کے دور میں حضرت انسان نے اصل مقصد اور اہمیت کو نظرانداز کر دیا ہے، جس کی وجہ سے ترقی کے ذرائع، وسائل کے وسائل کی پیداوار کے ساتھ ساتھ ماحولیات میں مختلف قسم کے ناپسندیدہ عناصر کی مقدار بڑھتی جا رہی ہے، جس کے نتیجے میں ماحولیات کی طبیعاتی اور نباتاتی مادیت کے درمیان قائم شدہ قدرتی توازن بگڑ رہا ہے۔ اس طرح ناپسندیدہ اور غیر ضروری عناصر کے شامل ہونے کی وجہ سے مختلف ماحولیاتی مادیت کا ناقص ہونا ہی آلودگی ہے جس کے سبب خراب ہوا، گندہ پانی، ناقص آواز کی وجہ سے انسانوں میں ہونے والی بیماریاں، مرض میں مبتلا حیوانات، فنا ہوتی ہوئی بے شمار انمول جڑی بوٹیاں اور پودے اور حیوانوں کی نسلیں، جنگلوں کا فقدان، بارش کی کمی، زرخیز زمین کا بنجر ہونا جیسے نہایت تشویشناک مسئلے ہمارے سامنے اژدہے کی مانند اپنے دہانے کھولے ہیں۔

آلودگی کی وجہ سے اور بھی بے شمار سنجیدہ مسئلے پیدا ہوئے ہیں جیسے "گرین ہاؤس ایفیکٹ" یعنی کرۂ ارض کی بڑھتی ہوئی حرارت، اوزون کی تہہ کا تدریج غائب ہونا، تیزابی بارش، عمارتوں اور شاندار قلعوں کو متاثر کرنے والے اسموگ کیسز وغیرہ۔

آلودگی پھیلنے کی کئی وجوہ ہیں مثلاً بڑھتی ہوئی آبادی، ناخواندگی، ڈیزل اور پیٹرول سے چلنے والی گاڑیاں، ہتھیار، جدید آرام و راحت اور آرائش کے مادی ذرائع، کھاد، حشرات کش ادویہ وغیرہ۔ لیکن آلودگی پھیلنے کی بنیادی وجہ ہے صنعت و حرفت۔ اس سے پھیلنے والی آلودگی "صنعتی آلودگی" کہی جاتی ہے۔ تاریخ انسانی میں صنعتی انقلاب نے حیرت انگیز تبدیلی کی ہے، اس انقلاب کے بعد مختلف قسم کی صنعتوں میں برق رفتاری کے ساتھ ترقی ہوئی، نئی تکنیک کی ترقی کے ساتھ ساتھ جدید سے جدید تر صنعتیں روبہ ارتقا ہوئی ہیں۔ ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے صنعت و حرفت خوب پھیل گئی ہے۔ سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک، ادویہ تحفظ زندگی سے لے کر حشرات کش ادویہ تک، کھاد، رنگ و روغن، پلاسٹک وغیرہ لاتعداد استعمال کی جانے والی ضروریات زندگی اور لازمی و ضروری چیزوں کی صنعتیں ارتقا پذیر ہیں۔ کسی بھی ملک کی اقتصادی خوشحالی میں صنعت و حرفت نہایت اہم جزو بن چکی ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی صنعت و حرفت کو خاطر خواہ ترقی ملی ہے۔ کئی حلقوں میں صنعتی خودکفالت حاصل کر لی گئی ہے۔ آج کا ہندوستان دنیا کے دس عظیم صنعتی ملکوں میں ہے۔ بڑی، اوسط اور چھوٹی صنعتوں کا جال بچھتا جا رہا ہے۔ صنعتی مراکز کے قیام کے ساتھ ساتھ گاؤں، شہروں اور شہر بڑے شہروں میں تبدیل ہو رہے ہیں اور بڑی تعداد میں لوگ صنعتی مراکز میں روزگار کی فراہمی کی امید میں بستے جا رہے ہیں۔ یہی ایک خاص وجہ ہے کہ ایسے مراکز گھنی آبادی کے بوجھ سے دبنے لگے ہیں۔

صنعتی ترقی کے اس سنہری پہلو کے ساتھ ساتھ اس کا ایک مایوس کن پہلو بھی سامنے آیا ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ صنعت سے پھیلتی ہوئی آلودگی، مختلف درجے کی صنعتوں میں استعمال ہونے والی کیمیا، کچے مال، ایندھن وغیرہ، مشینوں کے استعمال سے ماحولیات میں ناپسندیدہ تبدیلی ہو رہی ہے، جس کے مضر اثرات خراب اور غیر متوازن اجزا کے استعمال سے متاثر انسانی زندگیوں، حیوانات یا نباتات پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

صنعتوں سے نکلنے والے دھوئیں کاربن ڈائی آکسائیڈ، سلفر ڈائی آکسائیڈ، نائٹروجن کے آکسائیڈ، نقصان دہ ذرات اور کیمیا کی وجہ سے فضا ناقص ہوتی ہے۔ فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی بڑھتی ہوئی مقدار سے کرۂ ارض پر قدرتی گیس کا توازن بگڑ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی کی وجہ سے کرۂ ارض کی گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسے "گرین ہاؤس ایفیکٹ" کہا جاتا ہے۔ اگر زمین کی حرارت اسی طرح بڑھتی رہی تو آرکٹک اور انٹارکٹک کے عظیم قطعہ برف کی چٹانیں پگھلیں گی جس کے نتیجے میں سمندر کی آبی سطح بے انتہا بڑھ جائے گی اور ساحلی شہر یا ریاستوں کا وجود یکسر ختم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

صنعتوں سے خارج ہونے والی نقصان دہ گیسوں میں سلفر ڈائی آکسائیڈ نائٹروجن کے آکسائیڈ کی غیر ضروری زیادتی کی وجہ سے یہ

اردو شعبہ بہار قانون ساز اسمبلی، پٹنہ ۱۵ ۸۰۰ (بہار)

مادے بارش کے پانی سے مل کر تیزابی صورت اختیار کرلیتے ہیں جس سے بارش کا پانی تیزابی ہوجاتا ہے ۔ اسے تیزابی بارش بھی کہتے ہیں۔ ایسی بارش کی وجہ سے زمین کی قوت زرخیزی برباد ہوجاتی ہے، پیڑ پودوں کی فصلیں تباہ ہوجاتی ہیں۔ نہ صرف آبی وسائل (مثلاً زمین سے پھوٹنے والے چشمے) متاثر ہوتے ہیں جس سے آبی زندگیوں پر بھی برا اثر پڑتا ہے بلکہ اس کے سبب قدیم تعمیرات پر بھی برا اثر پڑتا ہے، عمارتیں کمزور پڑنے لگتی ہیں، دن بدن مخدوش ہوتی جاتی ہیں۔ آخرکار یہ ضرر رساں عمارتیں گر جاتی ہیں۔ اسے "اسٹون کینسر" کہتے ہیں۔

صنعت وحرفت میں استعمال ہونے والے کلورو فلورو کاربن یا دیگر گیسوں کے برے اثر سے کرۂ ہوائی اوزون تہہ دن بدن ختم ہوتی جارہی ہے۔ اوزون تہہ کی وجہ سے سورج سے نکلنے والی ضرر رساں بیرا بینگنی کرنیں کرۂ ارض پر پہنچ نہیں پاتیں کیونکہ اوزون تہہ انھیں جذب کرلیتی ہیں ان بیرا بینگنی کرنوں کا انسان و دیگر ذی روح پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس سے جلدی سرطان، موتیابند جیسی بیماریاں ہوسکتی ہیں۔ صنعتی آلودگی کی وجہ سے معدوم ہوتی ہوئی اوزون تہہ سے ان ضرر رساں اثرات کا خدشہ بڑھتا جارہا ہے اور صنعتوں سے کرہ ہوا میں بکھرنے والے لوہ ذرات، معدنی ریزے یا فلزات کے نہایت باریک ذرے و دیگر کیمیا کے برے اثر سے مختلف قسم کے امراض متاثرہ علاقوں میں پیدا ہوسکتے ہیں۔

صنعت وحرفت سے پھیلنے والی آلودگی کی دوسری خاص وجہ ہے صنعتوں سے خارج ہونے والے مختلف قسم کے غیر ضروری فضلات اور کیچڑ جو زیادہ تر آبی وسائل یا ندی، جھیل، سمندر میں ڈھکیل دیے جاتے ہیں یا زمین پر خشکی کے کسی حصے میں بے مقصد چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ ان غیر ضروری ضرر رساں آوارہ گرد عناصر کے برے اثرات سے پانی تیزی سے ناقص ہورہا ہے۔ گنگا، جمنا، گومتی، دامودر، لوکارو، براکر وغیرہ ندیوں کا پانی ان ندیوں کے ساحل پر واقع صنعتوں کے غیر ضروری عناصر کی وجہ سے ناقص ہوتا ہے۔ گنگا کی صفائی کا منصوبہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ صنعتوں سے خارج ہونے والے غیر ضروری فضلوں میں سیماب (مرکری) سیلیکن، کیڈمیم، نیکیل، سلور جیسے معدن، سلفیٹ، نائٹریٹ کلورائیڈ وغیرہ غیر کاربنک نمک اور کاربنک کیمیا شامل ہوتے ہیں ان کے علاوہ غیر ضروری ریڈیائی شعاعیں بھی ندی یا سمندر میں پہنچتی ہیں ان صنعتی فضلوں کی وجہ سے ناقص پانی کو استعمال کرنے والے لوگوں کو پولیو، ڈائریا، قے، آنتوں کا آشوب، آنتوں میں مروڑ، جلدی امراض وغیرہ ہوتے ہیں اس میں پلنے والی مچھلیاں و دیگر ذی روح بھی مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ نہ صرف خارجی سرچشمے اور ان کا پانی اس سے متاثر ہوتا ہے بلکہ داخلی سرچشمے یعنی زمین کے اندر کے پانی کو بھی اس سے متاثر ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ اور اس کا واضح اثر ایسے صنعتی علاقوں میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔

صنعتوں سے پھیلنے والی آلودگی کی تیسری وجہ صنعت وحرفت میں استعمال ہونے والی مشینوں سے پیدا شدہ شور، قابل سماعت آواز ہی صحت کے نقطۂ نظر سے مناسب ہے۔ غیر ضروری آواز، یا ایسی آواز جو سماعت پر بار گزرے یا صحت اثر انداز ہو اسے شور وغوغا کہتے ہیں۔ صنعت وحرفت میں لگی مشینوں کا مکمل دیکھ ریکھ و کنٹرول نہیں ہونے کی وجہ سے یا اس سے اٹھنے والی آواز کی تیزی اعتدال سے زیادہ ہونے کی وجہ سے صنعتی علاقوں میں رہنے بسنے والے لوگ شور وغل کے شکار آسانی سے ہوجاتے ہیں۔ عالمی صحت عامہ تنظیم کے مطابق صنعتی علاقوں میں آواز کا نقطۂ معیار ۷۵ ڈسمل سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے جو آواز کی زیادتی کو ناپنے کی یونٹ ہے اور اس کی پیمائش سے یہ اندازہ لگایا جاچکا ہے کہ خود ہمارے ملک میں ہی کئی شہروں اور صنعتی حلقوں میں شور کی سطح اعتدال کی حد پار کرچکی ہے۔ صوتی آلودگی کی وجہ سے نسیانی کیفیت، بہرا پن، بے خوابی، خون کا دباؤ، سیلان خون، دل کا مرض، آنکھوں کی بیماری، حمل کے دوران بچوں میں خرابی یا معذوری وغیرہ کے اثرات کے امکانات رہتے ہیں۔

صنعت وحرفت سے پھیلنے والی آلودگی کا ایک اور سبب صنعتی علاقوں میں امنڈتا ہوا انسانی سیلاب، گھنی آبادی اور خودرو جھاڑیوں کی مانند اگتی ہوئی بے شمار جھونپڑیاں بھی ہیں۔ اس گھنی آبادی کا اثر صنعتی علاقے کی آب وہوا، زمین اور ذی روح پر پڑ رہا ہے۔ گھنی آبادی والی جھونپڑپٹیوں میں اکثر پانی کا مناسب اخراج فضلے، غلاظت، پیشاب، پاخانے کا بہتر انتظام اور ان کے اخراج کی بہتر صورت نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے آب وہوا میں آلائش اور تعفن پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ گھنی آبادی والے صنعتی شہروں کے گھریلو کوڑے کرکٹ اور غلاظت کا بہاؤ بھی آس پاس کی ندی یا دیگر آبی وسائل کی طرف کردیا جاتا ہے، جس سے نہ صرف آلودگی پھیلتی ہے بلکہ اس علاقہ کے لوگ بے شمار بیماریوں سے نبرد آزما ہوتے رہتے ہیں۔

آلودگی پھیلانے میں صنعتوں کی شراکت کے نقصان دہ اثرات کو دیکھتے ہوئے ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا صنعتیں ترقی کی بجائے تباہی و بربادی کی جانب لے جائیں گی؟ کیا صنعتی ترقی کو روکنے کی ضرورت ہے؟ نہیں، قطعی نہیں۔ صنعتوں کی ترقی کے بغیر کوئی ملک خوشحال نہیں ہوسکتا، ملک کی ترقی صنعتی انقلاب میں مضمر ہے۔ صنعتی فقدان کی وجہ سے ملک کو ناقابل برداشت تکلیف اور اقتصادی پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ضرورت ہے صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی توازن کو بنائے رکھنے کی، اس کے لیے صنعتوں سے پھیلتی آلودگی کو کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ صنعتوں کے قیام عمل، اس کے چلانے اور اس کی پیداوار سے خارج ہونے والے غیر ضروری عناصر، نکلنے والی گیس مخلوط اشیا وغیرہ، مختلف پہلوؤں پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ کہیں ان سے ہماری ماحولیات کو قدرتی توازن کو، ہوا، پانی، ندی، زمین یا کسی بھی مادیت کو کوئی نقصان تو نہیں ہوگا۔ ان پہلوؤں پر غور کرکے صنعتی ترقی کو فروغ دینے سے بلا اشتباہ صنعتی آلودگی روکی جاسکتی ہے۔ صنعتوں سے پھیلنے والی آلودگی کے انسداد کے کئی طریقوں کو اپنا کر اس سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ مگر ضرورت ہے اس پر عمل کرنے کی:

(۱) صنعت کے قیام سے پہلے مجوزہ صنعت کی وجہ سے ماحولیات پر پڑنے والے نقصان دہ اثرات کا قبل از وقت جائزہ لینا چاہیے اگر مجوزہ صنعت کے قیام سے اس علاقے کی کسی بھی ماحولیاتی مادیت پر برعکس اثر پڑنے کا خدشہ ہو تو اس کے بچاؤ یا کنٹرول کے طریقے اپنانے سے متعلق مکمل انتظام کرنا چاہیے لیکن کسی بھی حالت میں ماحولیات کو آلودہ نہیں ہونے دینا چاہیے۔

(۲) صنعت کے قیام میں زرخیز زمین، یا زرعی حلقوں کی زرخیز زمین کی بجائے بے کار، ناکارہ یا زرعی اعتبار سے نامناسب علاقے کو ترجیح اور اولیت دی جانی چاہیے۔ تاکہ زرخیز علاقے یا فصلوں کو نقصان نہ پہنچے۔

(۳) صنعتوں کے قیام عمل سے پہلے اس علاقے میں شجرکاری کے عمل سے "سبز پٹی" بنا لینی چاہیے تاکہ اس علاقے میں گیسوں کے اخراج سے ہوا کا توازن نہ بگڑے۔ پیڑ پودوں کی خوراک کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے اس سے صنعتوں سے خارج ہونے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ کی غیر ضروری مقدار کرۂ ہوا میں جمع نہیں ہو پائے گی، ساتھ ہی ساتھ پیڑ پودوں کے توسط سے ماحولیات کو آکسیجن ملتی رہے گی۔

(۴) صنعتوں میں کام آنے والے کچے مال سے اگر ماحولیات کے کسی مادہ کے زیادہ سے زیادہ استعمال کا خطرہ، یا ضائع ہونے کا خدشہ ہو تو اس کچے مال کا بدل استعمال کیا جانا چاہیے مثلاً کاغذ کی صنعت میں بانس یا دیگر جنگلوں کی پیداوار کی جگہ گھاس، ردّی کاغذ کا استعمال کچے مال کی شکل میں ہوتا ہے۔

(۵) صنعت و حرفت کے قیام میں ضبط آلودگی آلات یا تدابیر کا مکمل استعمال ہونا چاہیے۔ تاکہ صنعت و حرفت سے خارج ہونے والے مضر عناصر آب و ہوا میں پھیلنے نہ پائیں، ضابطہ ضبط آلودگی اور بورڈ کے ذریعہ طے شدہ معیاروں سے زائد کوئی بھی گیس یا غیر ضروری عنصر صنعتوں سے باہر نہیں پھیلنا چاہیے اس کے لیے صنعت کاروں، متعلقہ سرکاری افسروں یا محکموں کو پوری سختی کے ساتھ ضابطے پر عمل کرنا چاہیے۔

(۶) صنعتی آلودگی کی سب سے بڑی وجہ اس سے خارج ہونے والے غیر ضروری عناصر یا کیمیا ہیں، انھیں دوبارہ استعمال کے لائق بنانے کی دیگر اشیاء یا قوت زرخیزی بڑھانے کے لیے اس پر تحقیق اور آلات کی ایجاد کی جائے اور اس پر صنعتوں کے قیام عمل سے قبل ہی پورے طور پر عمل درآمد کر لینا چاہیے تاکہ آلودگی نہ پھیلے، ماحولیات پراگندہ نہ ہوں۔

(۷) صنعتوں کا قیام حتمی طور پر گنجان اور کثیر الآباد علاقہ میں نہیں کیا جانا چاہیے۔ صنعتوں سے پھیلنے والی آلودگی کے انسداد کے لیے قومی ہی نہیں بین اقوامی سطح پر غور و خوض اور کوششیں ہو رہی ہیں کیوں کہ ماحولیاتی آلودگی ایک بین اقوامی مسئلہ بن چکی ہے۔ بڑے اور ترقی یافتہ دونوں قسم کے ملک اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں اس سے متعلق "ریو" (۱۹۹۳ء) میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ صنعتوں سے ہونے والی آلودگی کے انسداد کے لیے ضابطہ ضبط آلودگی بنایا گیا ہے۔ وزارت ماحولیات و جنگلات نے "ریو" کانفرنس کی روشنی میں "ماحولیاتی عمل منصوبہ" بنایا جس میں فضلہ بالخصوص خطرناک ماندہ عناصر میں کمی لانے اور ان کے مناسب استعمال کے ذریعہ صنعتی آلودگی کو کنٹرول کرنے کا اہتمام ہے۔

ضبط آلودگی کے لیے ریاستی سرکار نے بھی کچھ ضوابط بنائے ہیں جن میں صنعتی آلودگی کے لیے سخت انتظام ہے۔ لیکن محض قانون اور ضابطے بنا دینے سے صنعت سے پھیلنے والی آلودگی پوری طرح رک نہیں سکتی، اس کے لیے قانون کو سختی سے نافذ کرنے اور عوامی شرکت کی ضرورت ہے۔ اس میں صنعت کاروں کا بھی اہم رول ہے۔ انھیں صرف منافع کے نظریہ سے ہی نہیں صنعت لگانا اور چلانا چاہیے بلکہ صنعت کاروں کو کرۂ ارض میں پھیلنے والی آلودگی کے انسداد، متعلقہ صنعت میں اپنائے جانے والے آلات کی صحت کی جانچ، ضبط آلودگی و قوانین پر عمل قومی مفاد کو مدنظر رکھ کر کرنا چاہیے۔ صنعتی ترقی قوم کی اقتصادی ترقی میں نہایت اہم رول ادا کرتی ہے۔ صنعت کار اپنی شراکت نبھاتے ہیں لیکن کیا آلودگی کے مہلک نتائج کو روکے بغیر قوم کی اقتصادی ترقی و خوشحالی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔

صنعت قائم کرنے والے کا نظریہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے بہتر پیداوار تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے صنعت کاروں کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر صنعت سے آلودگی پھیلی تو انسانیت کو انتہائی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا جس سے نہ تو انسانیت کی فلاح ہوگی اور نہ ہی اقتصادی ترقی ہو پائے گی۔

ایک رپورٹ کے مطابق "راجدھانی (دہلی) کی تقریباً ۳۰ فی صد آبادی سانس کے کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہے اور اگر فضائی آلودگی کو دور کرنے کے لیے حکومت اور سماج نے ٹھوس اقدامات نہ کیے تو ۲۰۱۰ء تک ۸۰ فی صد سے زائد آبادی سانس کے امراض کا شکار ہو جائے گی۔ گزشتہ ایک دہائی کے دوران راجدھانی کی ہوا میں آلودگی ۷۵ فی صد سے زیادہ بڑھ چکی ہے۔

اختصار و ایجاز کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ صنعتوں سے پھیلنے والی آلودگی کو پوری طرح سے کنٹرول کر کے ہی صنعت کا قیام اور فروغ ہو تاکہ آلودگی کا انسداد ہو سکے، ترقی اور فطرت کا توازن برقرار رہے اور ملک ترقی کی راہ پر متواتر گامزن ہوتا رہے۔ ●

بقیہ: نیم کی افادیت

لیے اس دوا کے استعمال کی سفارش کی ہے۔ بنگلور، ڈزیز ریزسٹینس انسٹی ٹیوٹ (DISFASE RESISTANCE INSTITUTE) دہلی، سینٹرل ملیریا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہلی اور مہاراشٹر و گجرات کے کئی سرکاری اداروں نے بھی نیم کی افادیت پر تحقیقات کی ہیں۔ مزید کھوج جاری ہے۔ سائنس دانوں کے متواتر تجربات سے بہت سے مفید نتائج سامنے آ گئے ہیں۔ اس کی کاشت آسانی سے ہر جگہ کی جا سکتی ہے۔ اس سے فضائی آلودگی دور ہوتی ہے۔ وبائی امراض سے انسانوں کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے تیار شدہ ادویات اور اشیائے زیبائش سے کافی زر مبادلہ حاصل کیا جا سکتا ہے جس سے بھارت جیسے غریب ملک کی اقتصادیات پر مثبت اثر پڑے گا۔ عام شہریوں کی صحت اچھی ہوگی۔ ●

ڈاکٹر شفقت اعظمی

صوتی آلودگی

آواز دراصل ہوا میں لہر دار حرکت کا نام ہے، جس کی ضربیں غشائے طبلی (کان کی جھلی) پر پڑتی ہیں اور پھر اس کا اہتزاز (ارتعاش) پیغام میں منتقل کرکے دماغ کی طرف روانہ کر دیا جاتا ہے۔ آواز کی خاصیت یہ ہے کہ ہوا میں مجتمع نہیں ہوتی، مثال کے طور پر گھنٹی بجائیے یا اپنے کسی دوست سے سرگوشی کیجیے، سکنڈ کے تقریباً ہزارویں حصے (وقفے) میں آواز اپنا وجود کھو چکی ہوگی، لیکن اس کے برعکس بالخصوص تیز آوازیں انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتیں اور اس کے اثرات آسانی رفع بھی نہیں ہوتے۔

انسانی کان شور کی شدت کے وسیع تر رقبے کے لیے حساس ہوتا ہے۔ نرم یا خفیف ترین آواز جسے ہم سن سکتے ہیں، کی پیمائش صفر ڈیسی بل (ODB) سے کی جاتی ہے۔ شور کے انتہائی حدود مثلاً راکٹ کی پرواز، میدان کارزار کا شور، مثلاً تم زمین پر پانی ٹپکنے کی آواز سے ہزاروں گنا زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت (WHO) نے شور کی محفوظ حد ۴۵ ڈیسی بل مقرر کی ہے، جب کہ دہلی اور بمبئی جیسے شہروں میں شور کی سطح بالعموم ۸۵ تا ۱۱۰ ڈیسی بل کے درمیان ہوتی ہے۔

شور کو غیر مطلوبہ آواز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شور ہمارے ترسیلی نظام میں مداخلت کرسکتا ہے۔ اس سے نہ صرف عضوی بلکہ نفسیاتی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں، جن سے عادات و اطوار میں بھی فرق آجاتا ہے، جس کا بہت سے ممالک میں گہرائی سے جائزہ لیا جارہا ہے۔ تیز آواز پر کنٹرول کرنے کا قانون سختی سے نافذ کیا جارہا ہے۔

اچانک دھماکہ خیز آواز سے سماعت وقتی یا دائمی طور پر رخصت ہوسکتی ہے، تاہم بالعموم قوت سماعت سے دائمی محرومی ہمیشہ فوری طور پر اور اچانک نہیں ہوتی، بلکہ بعض دفعہ تو برسوں بعد ایسا ہوتا ہے۔ یونان میں ماحولیاتی مطالعہ سے ثابت ہوا ہے کہ ان کے حطرہ تحقیق میں ۸۰ فی صد ٹریفک کارکن سماعت کے خلل میں مبتلا ہوگئے تھے، ساتھ ساتھ وہ شدید نفسیاتی مسائل سے بھی دوچار تھے۔ حالیہ اداروں کے مطالعے کارخانوں میں کام کرنے والے ۸ ملین افراد ۸۰ تا ۸۵ ڈیسی بل کی پرخطر سطح کے حدود سے دوچار ہوتے ہیں، نتیجۃً ان میں سے ڈیڑھ ملین افراد ثقل سماعت میں مبتلا ہوچکے ہوتے ہیں۔

شہری شور کی عمومی سطح عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں بتدریج بہرا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس طرح کے شور کی عدم موجودگی کی صورت میں عمر بڑھنے کے باوجود سماعت کا خراب ہونا ضروری نہیں۔ جیسا کہ پرسکون مقام پر رہنے والوں میں ۷۰ سال کی عمر میں بھی سماعت اتنی ہی اچھی رہتی ہے، جتنی پرشور شہروں میں ۲۰ سال کی عمر میں ہوتی ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق راک اینڈ رول موسیقی نقصان دہ حد تک تیز ہوتی ہے۔ جیسا کہ توسیعی نظام (ایمپلی فیکیشن سسٹم) کی قوت بڑھنے کے ساتھ ساتھ ۱۲۵ ڈیسی بل تک سطح ریکارڈ کی گئی ہے۔ ایسا شور دردناک حد تک بڑھا ہوتا ہے جو بلاشبہ بہرا پن پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ۱۲۵ ڈیسی بل کے آواز کا تجربہ قلیل ترین مدت کے لیے بھی نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اس کے زیر اثر سماعت حتمی طور پر برباد ہوجاتی ہے۔ ۱۵ یا ۱۶ ڈیسی بل تک آواز کی سطح بڑھ جانے کی صورت میں کان کی جھلی (غشائے طبلی) اس حد تک پھٹ سکتی ہے کہ اس کی مرمت ممکن نہیں ہوتی۔

شور شرابہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماعت کی خرابیاں عارضی بھی ہوسکتی ہیں، دائمی بھی۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص انتہائی پرشور مقام پر پہنچتا ہے تو سماعتی حسّیت کی کمی کا احساس کرتا ہے، تاہم اس جگہ سے پرسکون مقام پر منتقلی کے بعد اس کی سماعت رفتہ رفتہ واپس بھی آجاتی ہے۔ یہ اضافہ سماعت کی مستقلی کی کمی کے مختلف تماسات (EXPOSURE) کی قسم پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر آئندہ تماست سے قبل افاقہ ہو تو اس کی سماعت بری طرح متاثر ہوسکتی ہے۔

گو کہ سماعتی خرابی صوتی ماحولیاتی آلودگی کا نمایاں ترین خلل ہوتا ہے، پھر بھی مسلسل صوتی تماست کے سبب قلبی عروقی تغیرات اور شریانی دمویہ کا تضییق (رگوں کا سکڑنا) واقع ہوسکتا ہے، جس کے نتیجے میں قلبی مسائل مثلاً اختلاج قلب، خفقان اور تصلب شریانات (ARTERIOSCLEROSIS) بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح روس میں کارخانوں میں کام کرنے والوں میں ضعف الدم (بلڈ پریشر) کے بڑے واقعے

اسسٹنٹ ڈائرکٹر انچارج، لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، جامعہ ہمدرد کیمپس، نئی دہلی۔ ۶۲

سامنے آتے ہیں۔

ابتداً جب آپ آواز سے لطف اندوز ہونے کے لیے پرشور ماحول میں پہنچتے ہیں تو دراصل آپ اپنے جسم کو دباؤ میں ڈالتے ہیں، جس سے دروں افرازی غدد کی کارکردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے، بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح رفتار قلب اور قلب میں کارٹی سٹروں سطح بھی بڑھ جاتی ہے۔ دباؤ اور تکان کے ساتھ ساتھ نیند کے اختلالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

ذہنی دباؤ کا پتا صوتی مطالعہ سے چلتا ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے والوں کا رجحان نفسی عضوی مسائل مثلاً قروح اور تیزابیت کے ساتھ ساتھ چڑچڑے پن اور اضطراب کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ شدید خوف و دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ آدھا سیسی کا درد (درد شقیقہ)، درد سر، تکان اور شور سے حسیت عام طور سے رونما ہوتے ہیں۔ اس سے توجہ کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے اور ارتکاز کی سطح گھٹ جاتی ہے، دماغی جو کسی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی، جس کے نتیجے میں بچوں کے حافظہ کی صلاحیت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ نفسیاتی طور پر ذہنی الجھن میں مبتلا افراد تیز آواز سے مشتعل ہو جاتے ہیں اور سکول کالج کے اوپر مداواتی اثر پڑتا ہے۔

پرشور کارخانوں میں کام کرنے والوں کے سماعتی نقصان کی رپورٹ ایک صدی بیشتر سے کی جا رہی ہے، تاہم اس کا باقاعدہ جائزہ عصر حاضر میں شدت اختیار کر گیا ہے۔ گزشتہ چار دہوں سے بڑے کارخانوں اور شعبۂ نقل و حمل (ٹرانسپورٹیشن) میں کام کرنے والوں میں بیشتر ورانہ سماعتی نقصان پر متعدد رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں۔ تقریباً ہر جائزے سے یہ تلخ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہتھ ریترانے سے ثقل سماعت (بہرا پن) کا کوئی نہ کوئی درجہ ضرور پیدا ہو گیا۔ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ شور کی سطح جیسے جیسے بلند ہوگی انسانی کارکردگی کی سطح گرتی جائے گی۔

ڈیسی بل

ڈیسی بل محض حوالاتی دباؤ (سماعت کا اقل پیمانہ) کے صوتی دباؤ کے تناسب کا پیمانہ لوگارتھم ہے۔ یہ دراصل ایک اکائی ہے جو پیمانہ کے تناسب صفر (برائے اوسط اقل قابل ادراک آواز) سے تقریباً ۱۳۰ کی شدت ظاہر کرتی ہے، یہی درد کی اوسط سطح بھی ہے۔ حتیٰ کہ ڈیسی بل سطح میں معمولی قدروں کا مطلب ہے آواز کے دباؤ میں بہت زیادہ فرق، مثال کے طور پر ۱۲۰ ڈیسی بل پر صوتی دباؤ ۸۰ ڈیسی بل سے سو گنا زیادہ ہوتا ہے۔ فقط ۳ ڈیسی بل کے اضافہ کا مطلب ہے صوتی دباؤ دگنا ہو گیا۔ یہ فرق جدول ذیل سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے:

صوتی دباؤ اور ڈیسی بل
باہمی تناسب

۰	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۱۱۰	۱۲۰
		۱۰۰		۱,۰۰۰		۱۰,۰۰۰		۱۰۰۰۰۰		۱۰۰۰۰۰۰		۱۰۰۰۰۰۰۰
		چڑیوں کی چہکی		پرسکون کمرہ (لائبریری)		ٹائپنگ		کار ہارن		بھاری ڈرل		ہوائی جہاز کی پرواز

عالمی ادارۂ صحت نے صوتی تماست کے کچھ حدود مقرر کیے ہیں جن کی توضیح جدول ذیل سے ہوتی ہے:

صوتی تماست کے مجوزہ حدود
(عالمی ادارۂ صحت (WHO) ۱۹۹۰ء)

نمبر شمار	ماحول	مجوزہ انتہائی سطح (ڈیسی بل)	اثرات
(۱)	(۲)	(۳)	(۴)
۱۔	اندرون خانہ (رات میں)	۳۵	نسبتاً اعلا سطح پر بیداری میں اضافہ۔
۲۔	اندرون خانہ (دن میں)	۴۵	نسبتاً اعلا سطح پر تکلمی ترسیل میں ابتری۔
۳۔	محلہ/شہری علاقہ (رات میں)	۴۵	نسبتاً اعلا سطح کی صورت میں سونے میں دشواریاں۔
۴۔	محلہ/شہری علاقہ (دن میں)	۵۵	نسبتاً اعلا سطح پر تکلیف میں اضافہ۔
۵۔	انڈسٹریل (پیشہ ورانہ)	۷۵	نسبتاً اعلا سطح پر سماعتی ابتری کے خطرے کی پیش قیاسی کی جا سکتی ہے۔

قلم کار حضرات سے

یوجنا " اردو " میں اب منصوبہ بندی ترقیات، سائنس اور ٹکنالوجی کے علاوہ ادبی اور عام دلچسپی کے موضوعات پر بھی مضامین شائع کیے جا رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ادب، آرٹ، کلچر، اسپورٹس، صحت وغیرہ پر مضامین درکار ہیں۔ قلم کار حضرات توجہ فرمائیں۔ مضامین بے حد مختصر ہوں اور کاغذ کے ایک طرف صاف تحریر میں لکھے ہوں۔ براہ کرم مضامین کی اصل ہی روانہ کریں، فوٹو اسٹیٹ کاپی کسی حالت میں قبول نہیں کی جائے گی۔ مضامین کے ساتھ ایسی تصاویر بھی بھیج سکتے ہیں جو متن سے متعلق ہوں۔ (ادارہ)

ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ حامد رضوی گنڈوی

فضائی آلودگی ـ ایک بڑا خطرہ

ٹھنڈی ہواؤں اور مست فضاؤں کے گرم ہواؤں اور آلودہ فضاؤں میں تبدیل ہونے کے لیے خدا کا بندہ جو کہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے پوری طرح ذمہ دار ہے۔ خدا نے تو گرم پگھلی ہوئی زمین کو ٹھنڈا اور ٹھوس بنا کر اس پر فضا قائم کر کے بارش کروائی اور اسی بارش کے پانی کے زمین پر جماؤ میں زندگی کا وجود اس دنیا پر قائم کیا اور ہماری فضا اور دیگر قدرتی طریقوں میں مکمل توازن قائم کیا لیکن خدا کے بندے نے جو اشرف المخلوقات کا درجہ رکھتا ہے، ان فضاؤں کو آلودہ کرنا شروع کر دیا۔ سائنس دانوں کے مطابق سب سے پہلی حیاتیاتی نوع جو کہ ہماری زمین پر ظاہر ہوئی وہ تقریباً ۲ ملین سال قبل ہوئی اور اشرف المخلوقات کا وجود اس زمین پر تقریباً ۴ء۱ ملین قبل ہوا اور انسانی تہذیب کی تاریخ تقریباً ۴۰۰ سال سے پہلے کی نہیں ہے۔ صنعتی انقلاب ۲۵ سال قبل واقع ہوا۔ صنعتی انقلاب سے پہلے کا انسان قدرتی ماحول کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور انسان قدرتی ماحول سے ڈر ڈر کر اس کے رحم و کرم پر اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالے کر دیتا تھا مگر صنعتی انقلاب نے انسان کے اندر ایسا شعور پیدا کر دیا کہ انسان نے اپنی بہتر زندگی کے لیے قدرتی معدنیات سے استفادہ کرنا شروع کر دیا۔

ہماری تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور تیزی سے بڑھتی ہوئی شہری زندگی گزارنے کی چاہت نے تو ہمیں یہ بڑی بڑی صنعتیں، بڑے بڑے کارخانے، یہ تیزی سے دوڑتی ہوئی موٹر گاڑیاں، چھوٹے چھوٹے انسانی خوب صورتی سے سجے سجائے گھر فراہم کیے مگر دوسری طرف ہماری صاف و شفاف فضا میں انسان کی پیدا کردہ چیزوں یا گیسوں کو زیادہ مقدار میں فضا میں جا ملایا اور ہماری فضا کو آلودہ کر کے چھوڑا جو کہ اب خود انسانی زندگی کے لیے ایک خطرہ بن گئی ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہوا بہت ساری گیسوں، نمی اور دھول گرد کا مرکب ہے جسے قدرت نے ایک خاص مقدار میں ہماری فضا کو فراہم کیا ہے مگر ہماری نادانی نے ہماری اپنی فضا میں باہری چیزوں یا گیسوں کو زیادہ مقدار میں جا ملایا جس کے باعث ہمارا سانس لینا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ فضائی آلودگی کی شکل میں آدمی، جانوروں اور پیڑ پودوں کے لیے ایک بڑا قہر آ کھڑا ہو گیا ہے۔ فضائی آلودگی کی ذمہ دار مختلف آلودہ کردہ چیزیں ہیں مثلاً مختلف گیسوں اور گرد و غبار کا مختلف ذرائع سے ہماری فضا میں خارج ہونا، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

ذرائع	آلودہ کرنے والی خاص اشیا
گھریلو ایندھن، کوئلے جلنے والا پاور اسٹیشن	کاربن ڈائی آکسائڈ، سلفر ڈائی آکسائڈ، دھواں (کوئلہ یا لکڑی کے جلنے سے)
موٹر گاڑیاں	کاربن ڈائی آکسائڈ، کاربن مونو آکسائڈ، نائٹروجن کا آکسائڈ، لیڈ مرکب۔
فیکٹریاں	کاربن ڈائی آکسائڈ، سلفر ڈائی آکسائڈ، دھواں وغیرہ۔

یوں تو ہماری دوڑتی بھاگتی زندگی کے میدان میں ڈھیروں دھواں، گیس اور گرد و غبار اگلتے کارخانے، موٹر گاڑیاں ہیں جو کہ ہماری زندگی میں بے چینی اور طرح طرح کی بیماریوں کا سبب بنتی ہیں۔ مثلاً قصبی ورم (BRONCHITIS) دمہ اور پھیپھڑوں کی بیماریاں۔ لیکن اہم ترین آلودہ کرنے والی اشیا جیسے کاربن مونو آکسائڈ، سلفر کا آکسائڈ، ہائیڈروجن سلفائڈ، ہائیڈرو کاربنس، نائٹروجن کا آکسائڈ، اوزون وغیرہ ہیں، جن کا ذکر ہم اب قدرے تفصیل سے کریں گے۔

کاربن مونو آکسائڈ

ہماری فضا میں کاربن مونو آکسائڈ کی آمد خاص طور پر دھواں اگلتی گاڑیوں سے ہوتی ہے۔ کاربن ڈائی آکسائڈ کے بعد کاربن مونو آکسائڈ ہی سب سے زیادہ آلودہ کردہ گیسوں میں ہے جو کہ مختلف مقدار میں مختلف شہروں میں فضا کو آلودہ کرنے میں لگی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں موٹر گاڑیاں کثیر تعداد میں سڑکوں پر دوڑتی اور دھواں اگلتی ہیں جس سے کاربن مونو آکسائڈ CO کا اخراج وہاں کی فضا میں لگاتار کافی مقدار میں ہوتا رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں

معرفت خالد سیف اللہ، انجن شاپ بی۔ ڈبلیو۔ ایس۔ برکاکانہ، این۔ بی۔ ایس۔ ضلع ہزاری باغ ۔۸۲۹۱۰۳ (بہار)

لوگ طرح طرح کی بیماریوں سے دوچار رہتے ہیں۔ خاص طور پر ۵۰ پی۔ پی۔ ایم PARTS PER MILLION کاربن مونو آکسائڈ کی فضا میں موجودگی سے دوران سر اور درد سر کی شکایت انسانوں میں عام ہے۔

سلفر ڈائی آکسائڈ

سلفر ڈائی آکسائڈ گیس آلودہ کرنے والی گیسوں میں سے ایک اہم گیس ہے۔ اس گیس کی پیدائش سلفر شدہ آثار متحجرہ (FOSSIL) ایندھن کے جلنے پر ہوتی ہے جب یہ گیس پانی کی اوپری سطح پر جلدی سے گھل مل جاتی ہے تو سلفیورک ایسڈ بن جاتی ہے اور تیزابی بارش کی شکل میں زمین پر آگرتی ہے جو کہ پیڑ، پودوں، جیو جنتوں، انسانوں، مچھلیوں اور دیگر پانی والے جانوروں کے لیے زہر کا کام کرتی ہے۔

نائٹروجن کے آکسائڈس

ہماری فضا میں نائٹروجن کے آکسائڈس کی ۷۰ فی صد مقدار موٹر گاڑیوں سے [illegible] اور گیسیں ہیں [illegible] مثال کے طور پر [illegible] [illegible] (FLAMMEL 900) [illegible] اور [illegible] کے دوران بھی خارج ہوتی ہے۔ ماہرین ماحولیات کے مطابق فطری گیسوں کے جلنے سے جو مصنوعی اشیا برآمد ہوتی ہیں ان میں ۵ پی۔ پی۔ ایم (PARTS PER MILLION) تک نائٹروجن ہوتا ہے اور نائٹروجن کے آکسائڈس انسانی صحت کے لیے بہت زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ یہ گیس تو کاربن مونو آکسائڈ گیس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

ہائڈروجن سلفائڈ، ہائڈروجن فلورائڈ، ہائڈروجن کلورائڈ، لیڈ مرکب، فوسجین، میتھائل آئسوسائنیٹ وغیرہ جو کہ انسانی صحت کے لیے بہت زیادہ خطرناک ہیں۔ خاص طور پر اسکول جانے والے بچوں کی دماغی بیماریوں کے ہونے میں۔

ہمارا ہندوستان بھی جو کہ دنیا کی آبادی کے ۱۶ فی صد لوگوں کی پرورش کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہاں کے لوگوں کو شہری زندگی کی دوڑ میں حرکت کے لیے ہندوستانی گاڑیاں فراہم ہیں جو کہ سلفر ڈائی آکسائڈ، نائٹروجن آکسائڈ، کاربن مونو آکسائڈ وغیرہ یہاں کی فضا میں اگلنے میں کسی دوسرے ترقی پذیر ممالک سے کچھ کم نہیں ہیں۔ مثال پیش خدمت ہے جس کو کہ ماہرین ماحولیات نے مندرجہ ذیل طور پر بیان کیا ہے۔

ہندوستانی موٹر گاڑیوں کے ذریعہ آلودگی پیدا کرنے والی اشیاء کا جزوضربی اخراج (گرام/کلومیٹر)

موٹر گاڑیوں کی قسمیں	SO 2	NOx	PM پارٹیکولیٹ میٹر	HC ہائڈرو کاربس	CO
موٹر سائیکل	۰٫۰۲	۰٫۰۷	٫۲	۱۰٫	۱۷٫
پیٹرول کے ذریعہ چلنے والی کاریں	۱۰۸	۳٫۲	٫۳۳	۶٫	۴٫
ڈیزل کے ذریعہ چلنے والی کاریں	٫۳۹	۰٫۹۹	۲٫۰	٫۲۸	۱٫۱
حرارت ڈیوٹی ڈیزل	۱۱۵	۲۱٫۰	۳٫	۲۱۱	۱۲٫۷

ہمارے شہروں میں بسنے والے لوگ اس فضائی آلودگی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ شہری سڑکوں پر دوڑتی ہوئی موٹر گاڑیاں اور ٹرک [illegible] اور [illegible] زہریلی گیس وہاں کی فضا میں اگلتے رہتے ہیں جس کی مثال اس طرح ہے

۱۹۹۰ء سینٹرل آلودگی کنٹرول بورڈ، دہلی کے مطابق آلودہ کرنے والی اشیا اس طرح ہیں۔

شہر	SO 2 سالانہ اوسط	SO 2 سب سے زیادہ	NOx سالانہ اوسط	NOx سب سے زیادہ	PM پرٹیکولیٹ میٹر سالانہ اوسط	PM پرٹیکولیٹ میٹر سب سے زیادہ
دہلی	۱۵٫۵	۳۲٫۵	۲۹٫۳	۵۱٫۵	۳۹	۵۶۸
بمبئی	۳۷٫۴	۵۶٫۷	۲۸٫۷	۳۰٫۸	۲۰۱	۲۲۸
کلکتہ	۳٫۲	۳۸٫۵	۲۸٫۷	۴۲٫۰	۲۷۳	۳۰۲
مدراس چینئی	۱۹٫۲	۵۴٫۱	۲۲٫۱	۳۳٫۱	۱۱۸	۱۴۶
کانپور	۷٫۶	۹٫۸	۱۱٫۴	۱۳٫۳	۳۵۱	۵۶۶
احمد آباد	۲۰٫۵	۳۳٫۴	۲۹٫۳	۴۲٫۸	۲۹۰	۳۵۷

ماہرین ماحولیات کے مطابق موٹر گاڑیوں کی شہر میں کثیر تعداد نے شہری علاقوں میں فضائی آلودگی کو بڑھاوا دیا ہے۔ آلودہ کردہ چیزیں جو کہ موٹر گاڑیوں سے خارج ہوتی ہیں وہ فیکٹری سے نکلی ہوئی آلودہ کن چیزوں سے اس لیے زیادہ جان لیوا ہوتی ہیں کہ موٹر گاڑیاں انسانوں کے زیادہ قریب ہوتی ہیں بہ نسبت فیکٹریوں کے۔

ہماری تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی تیزی سے شہروں کی طرف دوڑ اور تیزی سے جنگل کی کٹائی نے ہماری فضا کو آلودہ کر کے چھوڑا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم ہندوستان کے لوگ اس سے بے خبر نہیں ہیں بلکہ دوسرے ترقی پذیر ممالک سے کہیں زیادہ اپنی فضا کو پاک و صاف رکھنے کی کوشش میں لگ چکے ہیں اور کم سے کم ۳۲ فی صد حصوں میں پیڑ لگا کر، موٹر گاڑیوں میں تعمیر آلودگی چلنے والا اوزار لگا کر ہی دم لیں گے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں ہمیں صحت مند فضا میں سانس لے کر دعائیں دیں اور ایک خوشگوار ماحول میں زندگی گزار سکیں۔

سہیل احمد بٹوری

آلودگی۔ ایورسٹ پر بھی!

کوہ ہمالیہ زمانہ قدیم سے ہی ہر خاص و عام کی کشش کا محور سا ہوا ہے اور آج بھی اس کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی ہے۔ یہ کوہی سلسلہ شمال مغرب میں پامیر کی گانٹھ سے شروع ہو کر ہندوستان کے شمال مشرقی صوبوں سے گزرتی ہوئی مشرق میں برما تک اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہے۔ تقریباً ۲۵ کلومیٹر کی لمبائی اور ۲۵۰ سے ۳ کلومیٹر کی چوڑائی میں پھیلا یہ سلسلۂ کوہ ایک طرف جہاں رشی منیوں، سادھوؤں سنتوں اور فقیر درویشوں کی اقامت گاہ رہا ہے وہیں دوسری طرف اپنی غیر معمولی ساوٹ و خصوصیت کی بنا پر سائنس دانوں کے لیے ایک چیلنج سا ہوا ہے۔

ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی کا نام ہے ایورسٹ۔ ایورسٹ تقریباً ۸۸۴۸ میٹر اونچی ہے جو سال بھر برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ کوہ ہمالیہ کے شمال میں چین، جنوب میں نیپال واقع ہے۔ ۱۸۵۲ء میں سروے آف انڈیا کے چیف، کمپیوٹر رادھا ناتھ سکدار نے سب سے پہلے چوٹی نمبر ۱۵ کے نام سے نیپال ہمالیہ میں واقع 'سمر گاتھا' کے دنیا کی سب سے بلند چوٹی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس وقت اس کی بلندی ۲۹ ۲ فٹ پائی گئی تھی۔ اسی کو ہی چوٹی کا نام بعد میں اس وقت کے سرویر جنرل جارج ایورسٹ کے نام پر 'ایورسٹ' رکھا گیا۔

تقریباً ۵۰ سال سے دنیا کے مختلف ممالک کے لوگوں نے اس پر چڑھنے کی مہم جاری رکھی ہے۔ ۱۹۵۰ء سے قبل کے سبھی کوہ پیماؤں کی مہم شمال سے شروع ہوئی تھی لیکن آزادی ہند کے بعد نیپال نے اپنے راستے سبھی ملکوں کے لیے کھول دیے۔ ۱۹۵۳ء میں جو پہلا وفد ایورسٹ پر چڑھنے میں کامیاب ہوا وہ جنوبی سمت سے ہی گیا تھا۔ ایورسٹ پر چڑھنے کے لیے بھلے ہی راستے ہیں مگر کوہ پیماؤں کے کیمپ صرف دو ہی مقام پر لگتے ہیں۔ جنوبی سمت کا کیمپ کھمبو گلیشیر میں اور شمالی سمت کا کیمپ رونگ بک گلیشیر میں لگتا ہے۔ انھیں دو کیمپوں کے ذریعہ سے ہی دنیا کے تمام ممالک کوہ پیمائی کی مہم کا آغاز کرتے ہیں۔

مسلسل کوہ پیمائی نے ہمالیہ کے ماحول پر منفی اثر ڈالا ہے۔ ایورسٹ کا مشہور 'ساؤتھ کول' راستہ کوڑے کچرے سے بھر گیا ہے۔ دنیا کی چھت پر پہنچنے کی خواہش نے اس مسئلے کو اور زیادہ پیچیدہ سا ڈالا ہے۔ ایک گلیشیر پر واقع ایورسٹ مہم کے بیس کیمپ پر آٹھ میٹر کوڑے کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ساؤتھ کول کے راستے پر ٹین کے ڈبے، کھانے کے پیکٹ، ٹن او پنر، گیس کے خالی سلنڈر، بیٹریاں، رسیاں، نائلان کی سیڑھیاں، پھٹے تمبو اور کھونٹے بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ ان سب کے علاوہ بہت سے کوہ پیماؤں کی لاشیں برسوں سے وہاں پڑی ہیں۔ یہ ان بدقسمت لوگوں کی لاشیں ہیں جو ایورسٹ پر پہنچنے کی خواہش تو رکھتے تھے مگر وہ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ حسرت لیے ہی دنیا سے چلے گئے۔ ان لاشوں کو نہ تو نیچے لایا جا سکتا ہے اور نہ ہی زمین میں دفن ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ وہاں کی چٹانیں نہایت سخت ہیں۔

ایورسٹ پر آلودگی کی شروعات حالاں کہ بیس کیمپ، جو ۱۸۰ فٹ کی بلندی پر ہے، سے ہوتی ہے لیکن حقیقتاً اس کی شروعات تو وہیں سے ہو جاتی ہے جہاں سے انسان پیدل سفر شروع کرتا ہے۔ ایورسٹ پر کثافت کا سلسلہ اسی وقت سے شروع ہوتا ہے جب سب سے پہلے برطانیہ نے ایورسٹ پر جانے کے امکانات کا پتا لگانے کے لیے ۱۹۲۱ء میں پہلا وفد بھیجا۔ اب نہ صرف روز بروز کوہ پیما مہم دستوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ کوہ پیماؤں کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۸ء میں ایورسٹ پر گئی مہموں میں، چین جاپان نیپال دوستی مہم کے کوہ پیماؤں کی تعداد ۲۵۴ تھی، جو ایک ' ۔ سی مہم میں ۱۹۹ء میں منعقدہ امریکہ، ''۔ ایورسٹ مہم کا نمبر آتا ہے۔ جس میں ۷ سے ، تک کے درمیان ۹ لوگوں نے چوٹی پر پہنچنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے تب سے دو، تین چار یا پانچ ملکوں کے متحدہ دستے بھیجے کا رواج گزشتہ برسوں میں بڑھ گیا ہے۔ اس طرح کوہ پیماؤں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے نتیجے میں ایورسٹ روز بروز کثافتوں کا ڈھیر بنتی جا رہی ہے۔ ایک نظر موجودہ دور میں پھیلنے والی کثافتوں پر ڈالی جائے تو یہ بات صاف ظاہر ہو جائے گی کہ ایورسٹ اب کتنی کثیف ہو گئی ہے۔ خالی پیکنگ اور ڈبوں کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں بچی ہوئی کھانے پینے کی چیزوں کو وہاں پھینکا جاتا ہے۔ یہ مقدار کتنی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۲ ملکوں میں ہر ایک دستہ کے

باقی کور ۳ پر

میر حسن روڈ، نوبہار گنج بجنور سدھارتھ نگر۔ یوپی ۲۷۲۱۹۱

کلیم اللہ

مہاتما گاندھی ۔ ایک مردِ مجاہد

دنیا میں عام طور سے تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ پیدائشی طور پر بڑے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی کوششوں سے بڑائی حاصل کرتے ہیں اور بعض پر بڑائی زبردستی عائد کر دی جاتی ہے۔ پہلی قسم کے لوگ، جن کی پیشانی پر بچپن ہی سے بلندی کا ستارہ روشن ہوتا ہے، شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ آئنسٹائن کے لفظوں میں ایسے لوگوں کی تعداد ایک فی صد ہے۔ دوسرے قسم کے وہ لوگ ہیں جو دنیا میں اپنی محنت و مشقت کے ذریعہ بڑائی حاصل کرتے ہیں، جو دنیا کی کامیابی اور کامرانی سے بے نیاز ہو کر حقیقی نیک نامی کی تلاش کرتے ہیں اور اپنی عقل و ضمیر کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرتے ہیں۔ باوجود باد مخالف کے وہ اس راہ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی تاریخ ساز ہوتے ہیں۔ ان کی عظمت کے سامنے عقیدت کی گردن جھک جاتی ہے اور الفاظ ان کے بیان سے قاصر ہوتے ہیں۔ ایسی ہی شخصیات کی بدولت انسانیت کا سر بلند ہوتا ہے اور جن کی چمکتی روشنی میں راہِ حق تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ اپنے زمانے کو نئی قدروں سے آشنا کرتے ہیں اور بقول علام السیدین "انہیں کے طفیل، زندگی کی سعی زیادہ تیز، اس کے امکانات زیادہ وسیع اور اس کی معنویت زیادہ گہری ہوتی ہے۔"

تیسرے قسم کے لوگوں کی اکثریت ہے اور ایسے لوگ دوسرے انسانوں پر عافیت کے راستے بند کر دیتے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ فتنہ و فساد کی جڑ یہی لوگ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

باباے قوم گاندھی جی کا شمار دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ جن کے اندر قدرت نے صورت و سیرت، دل اور دماغ، شرافت اور دیانت، دوستی اور قیادت کی غیر معمولی صفات عطیہ کی تھیں اور انھوں نے ان صفات کو اس استغنا اور خود اعتمادی کے ساتھ برتا کہ ان کا شمار دنیا کی عظیم ترین شخصیات میں ہوا۔ گاندھی جی نے بیسویں صدی میں عموماً دنیا کو اور خصوصاً ہندوستانیوں کو کیا دیا؟ انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں کیا رول ادا کیا اور ان کا تاریخ میں کیا مقام ہے اور ان کے فکر و فلسفے کی عصر حاضر میں کیا معنویت ہے؟ یہ سب جاننے کے لیے ہمیں ان کی زندگی، تعلیم، فکری سرچشمے، عملی جدوجہد، سیاسی بصیرت اور ادبی و سیاسی میدان میں ان کی سرگرمیوں پر پوری طرح سے روشنی ڈالنی ہوگی۔

ابتدائی زندگی اور تعلیم

موہن داس کرم چند گاندھی کا جنم ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو کاٹھیاواڑ کی ریاست پوربندر میں ہوا۔ ان کے والد کا نام کرم چند گاندھی عرف کابا گاندھی اور ماں کا نام پتلی بائی تھا۔ کابا گاندھی کی تین نرینہ اولادوں میں یہ سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے والد راجکوٹ ریاست میں کچھ عرصہ تک وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندان ایک متمول خاندان تھا اور جس کے تمام افراد ریاستی حکومتوں کے اعلا عہدے پر فائز رہے۔ ان لوگوں نے متعلقہ ریاستوں میں اپنے فرائض کو بڑی ایمانداری اور مستعدی کے ساتھ بخوبی انجام دیا۔ شاید انھیں خوبیوں کی وجہ سے ان کا خاندان عزت اور وقار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

تعلیم و تعلم ان کے خاندان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ان کا مذہب ویشنو تھا۔ جہاں تمام رسوم کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ اخلاقی تعلیم پر بے حد زور دیا جاتا تھا۔ گاندھی جی نے تعلیم کی شروعات اپنی ماں کی سرپرستی میں کی جو نیکی اور شرافت کا مجسمہ تھیں۔ وہ اپنی زندگی میں بے حد محتاط رہتی تھیں۔ حرص و طمع سے وہ بالکل پاک تھیں۔ شوہر پرستی ان کا دھرم اور ایمان تھا۔ جو خاتون ان تمام انسانی صفات سے آراستہ ہو تو اس بات کے قوی امکان ہیں کہ ان کے بچے بھی انھیں صفات سے مزین ہوں گے۔ تو تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ وہ لوگ جو عظیم شخصیات کے زمرے میں آتے ہیں ان کی کردار سازی میں ان کی ماں کا ایک کلیدی رول رہا ہے۔ خواہ وہ خواندہ ہوں یا ناخواندہ لیکن ایسی خواتین روشن خیال ضرور ہوتی ہیں۔

حروف ابجد سے واقف ہونے کے بعد پرائمری اسکول میں گاندھی جی کا داخلہ کروا دیا گیا جہاں ان کا شمار اوسط درجے کے طالب علموں میں ہوتا تھا۔ لیکن اخلاقی معاملات میں گاندھی جی بہت ہی سخت اور کٹر تھے۔ سچائی کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ۱۸۸۷ء میں انھوں نے

---

۲۳۶ ستلج ہوسٹل۔ جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی، ۶۷

ہائی اسکول پاس کیا۔ دریں اثنا باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ گھر کا سارا بوجھ چچا کے کندھوں پر آپڑا۔ جنہوں نے صبر و تحمل کا سہارا لے کر اس کام کو بخوبی انجام دینے کی کوشش کی۔ وہ گاندھی جی کی اعلا تعلیم کے حق میں تھے لیکن گھر کی غربت اس راستے میں حائل تھی۔ بہر حال گاندھی جی نے بھاؤ نگر کے سمرداس کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن انگریزی زبان کی شد بد نہ رکھنے کے باعث انھیں کالج میں لکچر سمجھنے میں دشواری پیدا ہونے لگی۔ وہ تعلیم جاری رکھنے کی فکر میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ اگر انسان کے ارادے نیک ہوں تو خدا خود اس کی مدد کرتا ہے۔ لیکن شرط کوشش ہے۔ گاندھی جی ان مشکلات کے حل کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ وہ اسی ذہنی بحران سے دوچار تھے کہ ان کے خاندان کے ایک مخلص دوست موجی دُبے نے گاندھی کی مشکل کشائی کی۔ ویسے وہ براہمن ذات کے تھے جب کہ گاندھی جی کے خاندان کی ذات بنیا تھی لیکن ذات پات ان دونوں کے خاندانی تعلقات میں حائل نہ ہوئی۔ انھوں نے گاندھی جی کی تعلیم کے بارے میں ان کے بڑے بھائی اور ماں سے صلاح و مشورہ کیا اور بذات خود گاندھی جی سے بھی صلاح کی اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ گاندھی جی کو اعلا تعلیم یعنی بیرسٹری کے لیے انگلستان بھیج دیا چاہیے۔ اپنے اس مشورے کے حق میں انھوں نے دو جواز پیش کیے۔ اول تو بیرسٹری، بی۔ اے کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتی تھی اور نسبتاً اس میں ڈگری حاصل کرنا آسان بھی تھا۔ بیرسٹر کے مستقبل روشن تھے اور یہ امید ظاہر کی گئی تھی کہ بیرسٹر ہونے پر گاندھی جی اپنے والد کے عہدے کو بڑی آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس یونیورسٹی کی تعلیم سے مستقبل میں کلرکی سے زیادہ اور کچھ پانے کی امید نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ یونیورسٹی کی تعلیم پر خرچ زیادہ آتا تھا جب کہ بیرسٹری کی تعلیم پر کم۔

اس وقت گاندھی جی کے گھر کی حالت خستہ تھی۔ جب بیرسٹری کے لیے اخراجات کا سوال پیدا ہوا تو گھر کے ایک بزرگ نے یہ بوجھ اٹھانے کی ہمت افزا بات کی۔ جب یہ مسئلہ حل ہو گیا تو دوسرا پیدا ہو گیا۔ وہ یہ تھا کہ سمندری سفر کرنا ہندو مذہب کے خلاف تھا۔ یہ ان کے گھر والوں کی روشن خیالی ہی تھی کہ انھوں نے اس کو بالائے طاق رکھ کر گاندھی جی کو لندن جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن گاندھی جی کو یہ عہد ضرور کرنا پڑا کہ وہ لندن میں اپنی تعلیم کے دوران گوشت، شراب اور عورت کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ ۴ ستمبر، ۱۸۸ء کو وہ بمبئی ساحل سے لندن کے لیے روانہ ہو گئے اور اپنے لندن قیام کے دوران وہ اپنے وعدے پر اٹل رہے۔ یہ ان کی اولوالعزمی ہی تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس مغربی ماحول میں ان تمام قسم کی سماجی برائیوں سے پاک رکھا جس میں عام طور سے ہندوستانی طالب علم مبتلا ہو جاتے تھے۔ ارادے اور عقیدت کی یہ پختگی زندگی بھر ان کا ساتھ دیتی رہی اور سیاسی اور سماجی تحریکوں کو اصول پرستی کی راہوں پر لگائے رہی۔ لندن کو خیرباد کہنے سے قبل انھوں نے اخبار ویجی ٹیرین میں لکھا تھا کہ

”مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میں شراب اور گوشت کا استعمال کیے بغیر وطن واپس جا رہا ہوں۔“

عملی زندگی میں جد و جہد کا آغاز

تعلیم ختم کرنے کے بعد جب گاندھی جی وطن آئے تو ان کا دل یہ جان کر بجھ گیا کہ ان کی ماں اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ گاندھی جی کی سرچشمۂ حیات تھیں۔ بہر حال جذبات پر قابو پا کر زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش شروع کی۔

عصر حاضر کی طرح اس زمانے میں بھی وکالت کرنا آسان کام نہ تھا۔ بمبئی میں جب گاندھی جی اپنی وکالت جمانے میں ناکام رہے تو انھوں نے راج کوٹ کا رخ کیا اور وہاں عرائض نویس بیرسٹر کی حیثیت سے نام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ راجکوٹ کی پریکٹس کے زمانے میں پولیٹیکل ایجنٹ کے نسلی رویے سے دل برداشتہ ہو کر عملی احتجاج پر آمادہ ہو گئے اور انھوں نے پولیٹکل ایجنٹ کو پیشگی دینے سے انکار کر دیا جو اس زمانے میں وکالت جمانے کے لیے ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ اسی عرصے میں ناٹال (جنوبی افریقہ) کے ایک موکل عبداللہ نے ایک مقدمے کی پیروی کا کام ان کے سپرد کیا۔ مجبوری کے تحت گاندھی جی نے اس پیشکش کو قبول کیا اور ۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں نسلی تعصب اپنے عروج پر تھا اور جو ہندوستانی قوت لا یموت کی خاطر وہاں جاتے تھے ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ یہ سلوک گاندھی جی کے ساتھ بھی برتا گیا۔ گاندھی جی نے اس نسلی من و تو کے امتیاز کو ختم کرنے کا مصمم ارادہ کیا کیوں کہ یہ صرف وطن و قوم کا ہی نہیں بلکہ انسانیت کی بقا کا سوال تھا۔ انھوں نے ہندوستانی نو آباد کاروں کا ایک جلسہ منعقد کیا اور اس امتیازانہ رویے کے خلاف انھیں احتجاج کرنے پر آمادہ کیا اور انھیں یقین دلایا کہ سچ کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ پریٹوریا سے وطن واپس آنے والے ہی تھے کہ ان کی نظر ایک اخبار میں اس خبر پر پڑی کہ ناٹال کی قانون ساز اسمبلی میں ہندوستانی نو آباد کاروں کو حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کا ایک بل پاس ہونے والا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی تاجروں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو ہندوستانیوں نے گاندھی جی سے ہی استدعا کی کہ وہی اس سیاسی مہم کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لیں کیوں کہ ہم میں سے زیادہ تر ناخواندہ ہیں۔ اس لیے ہم سب اس سیاسی لڑائی کو لڑنے کے اہل نہیں ہیں۔

گاندھی جی نے ہندوستانیوں کی اس پیشکش کو قبول کیا اور اس قانون کے انسداد کے لیے حکمت عملی پر غور و خوض [illegible] قانون کو ”ہمارے تابوت [illegible] کیل“ سے تعبیر کیا۔ ہندوستان اور انگلستان میں سیاسی تبلیغی مہم شروع کی جس کا یہ اثر ہوا کہ پہلی دفعہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے دسمبر ۱۸۹۴ء کے اجلاس میں بیرون ہند بھارتی نو آباد کاروں کے حق رائے دہندگان سے محروم کیے جانے پر احتجاج کیا۔ چار سو آباد کاروں نے قانون کے خلاف عرضداشت بھیجی لیکن ہندوستانیوں کے احتجاج سے مقننین کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور انھوں نے بل کو قانونی شکل دے دی۔ گاندھی جی ہمت ہارے اور انھوں نے دس ہزار ہندوستانیوں کے دستخط سے ایک عرضداشت ملکۂ انگلستان کو ارسال کی کیوں کہ ان دنوں جنوبی افریقہ میں بھی انگریزوں کی حکومت تھی۔

اپنی اس سیاسی مہم میں شدت لانے کی غرض سے گاندھی جی نے ناٹال انڈین کانگریس نام کی ایک سیاسی جماعت قائم کی اور اپنی سیاسی سوجھ بوجھ سے اس جماعت کو ہمیشہ فعال رکھا اور یہ جماعت ہندوستانیوں کے حق برابری کے لیے کام کرتی رہی۔ اب سے ٹھیک سو برس قبل ۱۸۹۶ء میں گاندھی جی اپنے اہل و عیال کو جنوبی افریقہ لے جانے کی غرض سے ہندوستان آئے تھے اور انھوں نے اس وقت کے مشہور و معروف لیڈروں مثلاً فیروز شاہ مہتا، گوکھلے اور تلک جیسے عظیم رہنماؤں سے ملاقات کی۔ اور ان کو جنوبی افریقہ کے سیاسی حالات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور وہاں کے ہندوستانی باشندوں کا جن پر عرصۂ حیات تنگ تھا، بھی بالتفصیل ذکر کیا۔ وہ کانگریس اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے کلکتہ گئے۔ اس وقت گاندھی جی ہندوستان کے سیاسی حلقے میں شناسا تھے۔ اس لیے ان کو وہ اہمیت نہ دی گئی جس کے وہ حامل تھے۔ بہر حال گاندھی جی کے اندر حرص و طمع نہ تھی۔ وہ تو بے لوث، صلہ اور انعام سے بے پروا ہو کر خدمت خلق کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کسی بھی کام کو کرنا عار نہ سمجھا۔

ہندوستانیوں کے حالات سے باخبر ہونے کے لیے گاندھی جی نے ریل کے تیسرے درجے میں ملک کے طول و عرض کا سفر کیا۔ اپنے قیام ہندوستان میں وہ گوکھلے کے بہت قریب ہو گئے اور انھیں اپنا سیاسی گرو تسلیم کیا۔ ۱۹۰۲ء میں وہ ڈربن دوبارہ واپس آ گئے۔ آئے تو صرف چھ مہینوں کے لیے تھے لیکن ۱۲ برس تک رہ گئے اور یہ عہد کیا کہ "جب تک گھرے ہوئے بادل چھٹ نہ جائیں گے یا ٹوٹ کر برس نہ پڑیں گے" یہاں سے واپس نہ جاؤں گا۔

گاندھی جی اپنی اس سیاسی مہم میں کامیاب ہوئے اور ہندوستانی نو آبادکاروں کو ان کے حقوق واپس دلوائے۔

ہند کی سیاسی جدوجہد میں رول

گاندھی جی، ۱۹۱۴ء میں جب جنوبی افریقہ سے ہندوستان واپس آئے تو ہندوستانیوں نے ایک ہیرو کے مانند ان کا استقبال کیا کیوں کہ جنوبی افریقہ میں انھوں نے نسلی تعصب اور ذات پات کے خلاف ایک جہاد چھیڑا تھا اور اس جہاد میں کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ ایسا مجاہدہ ایک مرد مجاہد کے ہی بس کی بات تھی۔ اس وقت ہندوستان میں سیاسی جدوجہد اپنے شباب پر تھی۔ برطانوی حکومت کے ظلم و جور روز بہ روز بڑھتے جا رہے تھے کیوں کہ اقتدار کے استحکام کا یہی ایک ذریعہ باقی تھا۔

گاندھی جی نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی یہاں کے سیاسی حالات کا ذاتی مشاہدہ کرنے کی خاطر سفر کی تکالیف برداشت کیں۔ جب انھیں یہ احساس ہوا کہ ہندوستانی سیاست میں ان کی ضرورت ہے تو انھوں نے اس میدان میں قدم رکھا اور پانچ برس کے اندر وہ ہندوستانی سیاست کی سب سے نمایاں شخصیت بن گئے۔ ۱۹۲۰ء تک سبھی اہم قائدین ان کے پرچم تلے آ گئے تھے۔ سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو جیسے کامیاب وکیل اور تجربہ کار پارلیمانی مدن موہن مالویہ اور راجیندر پرساد جیسے عام انسانیت دوست اور ولبھ بھائی پٹیل اور گوپال آچاریہ جیسے کھرے حقیقت پسند، جواہر لال نہرو اور جے پرکاش نرائن جیسے عوام دوست اور سماج وادی رجحانات رکھنے والے چند ذہنی اختلافات کے باوجود ان سے ایک گہرا جذباتی رشتہ محسوس کرنے لگے۔ ان کے لیے وہ لیڈر ہی نہیں بلکہ باپو تھے اور عوام کے لیے تو مہاتما جیسی عقیدت کا مرکز تھے۔ چوتھائی صدی تک ہندوستانی سیاست کی گروہ بازی سے اوپر اٹھ کر وہ ایک نقطۂ اتصال و اتفاق بنے رہے۔ جیکر اور سپرو جیسے لبرل بھی ان کے ہمنوا ہو گئے اور ان کے شانہ بشانہ ملک کی آزادی کی خاطر کام کرنے لگے۔

جنوبی افریقہ میں اپنے تجربات کی بنا پر گاندھی جی نے سابرمتی میں ایک آشرم کی بنیاد ڈالی۔ یہ ضبط نفس کی تجربہ گاہ بھی تھی اور ستیہ گرہ قیدیوں کے خاندان والوں کے لیے ایک پناہ گاہ بھی۔ یہاں بھی چھوت چھات کا سوال پیدا ہوا۔ گاندھی جی نے بڑی ہی جرأت سے اس کا مقابلہ کیا، جس کے نتیجے میں احمد آباد کے امیر تاجروں نے اپنی امداد بند کر دی۔ خود کستور با گاندھی جو گاندھی جی کی شریک حیات تھیں، کو بھی آشرم میں اچھوتوں کے ساتھ رہنا گوارا نہ تھا۔ اس پر گاندھی جی بہت ہی دل برداشتہ ہوئے اور کہا کہ آپ کو دو راستوں میں سے ایک کو چننا پڑے گا۔ یا تو آپ ذات پات کے امتیاز کو ترک کر دیں یا آشرم کو خیرباد۔ بالآخر کستور با آشرم کے اچھوت خاندانوں کو اپنے خاندان کی طرح قبول کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔

گاندھی جی جب ہندوستان واپس آ کر یہاں کی نبض سے روشناس ہونے کی کوشش کر رہے تھے تو چمپارن کے راجکمار شکلا نے اپنے علاقے کا دورہ کرنے کے لیے گاندھی جی کو آمادہ کیا۔ گاندھی جی ۱۹۱۶ء میں چمپارن کے کاشت کاروں کی مشکلات سے آگاہ ہونے کے لیے پٹنہ، مظفر پور اور موتیہاری گئے۔ انتظامیہ نے امن عامہ کے خطرے کے پیش نظر ان کی آمد کے خلاف نوٹس جاری کیا۔ لیکن گاندھی جی نے اس کی خلاف ورزی کی اور اس کے حق میں یہ جواز پیش کیا کہ نوٹس کو قبول کرنا "میرے ضمیر کی آواز" کے خلاف ہوگا۔ چوں کہ مقامی کمشنر نے یہ حکم حکومت بہار کے مشورے کے بغیر کیا تھا اس لیے اسے واپس لے لیا گیا۔ گاندھی جی بدستور دورہ کرتے رہے اور متعلقہ معاملات کے بارے میں شہادتیں اکٹھا کرتے رہے۔ بالآخر ایک "زرعی کمیٹی" قائم کی گئی اور جس کے نتیجے میں کسانوں کو کافی مراعات ملیں۔ ---------

---------- اسی دوران احمد آباد کے کپڑوں کی ملوں میں مزدوروں نے مل مالکوں کے خلاف ہڑتال کر دی۔ ہڑتال نے طول پکڑا مگر گاندھی جی کی ثالثی سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا اور گلزاری لال نندہ کے لفظوں میں "موجودہ دور کی ٹیکسٹائل لیبر ایسوسی ایشن کی تشکیل میں اس کا اہم اثر ہوا"۔ جلد ہی کھیڑہ ضلع کے کسانوں میں لگان کی چھوٹ کے مسئلے پر تنازعہ

اٹھ کھڑا ہوا۔ جس کے لیے زرعی ستیہ گرہ چلانی پڑی۔ اس طرح گاندھی جی مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں سے بھی بہت قریب ہو گئے۔

گاندھی جی کی زندگی اب پوری طرح خدمت خلق کے لیے وقف تھی اور وہ شب و روز اسی ادھیڑ بن میں رہتے تھے کہ مکمل عدم تشدد کے ذریعہ کس طرح انگریزوں کے چنگل سے ہندوستانیوں کو آزاد کرایا جائے، جن کے دور حکومت میں ہندوستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ ملک کے طول و عرض میں آزادی کی جدوجہد جاری تھی۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالا باغ کا انسانیت سوز سانحہ پیش آیا۔ جس پر گاندھی جی بے حد دل برداشتہ ہوئے۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے خصوصی اجلاس میں عدم تعاون کا پروگرام گاندھی جی کی زوردار تحریک پر منظور کیا گیا۔ اب گاندھی جی قومیت اور خلافت دونوں کے رہنما بن گئے۔ برطانوی حکومت نے اپنی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے یہاں کے عوام میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ کچھ حد تک انھیں کامیابی حاصل ہوئی مگر گاندھی جی کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ اسی دوران اسکولوں کا بائیکاٹ کرکے قومی اسکول قائم کرنے کے تجربے کیے گئے۔ جامعہ ملیہ، کاشی ودیا پیٹھ اور ودیا پیٹھ اس کے نتیجے میں وجود میں آئے۔ تحریک عدم تعاون کا دوسرا شاخسانہ سودیشی اشیاء کا تھا۔ چنانچہ غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ اور کھادی کا وافر استعمال عدم تعاون کے اہم جزو بن گئے۔ کونسلوں کا بائیکاٹ بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں راوی ندی کے کنارے مکمل آزادی کا پرچم جواہر لال نہرو نے اپنے مبارک ہاتھوں لہرایا۔ ۲۶ جنوری کو یوم آزادی منائے جانے کا اعلان کیا گیا۔ اس دن لاکھوں انسانوں نے یہ عہد کیا کہ "حکومت کے آگے سر جھکانا خدا اور انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے۔" گاندھی جی نے تحریک کو اور فعال بنانے کے لیے نمک قانون توڑنے کا اعلان کیا اور ستیہ گرہیوں کی جماعت کی قیادت کی جو ڈانڈی مارچ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ حکومت جب قانون کا سہارا لے کر اس پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام رہی تو مصالحت کی پالیسی اختیار کی۔ حکومت اور گاندھی کے درمیان "اروِن معاہدہ" ہوا جس میں مکمل آزادی کی کوئی قرارداد نہ تھی۔ گاندھی جی اس معاہدے کو کانگریس اور حکومت تعلقات میں ایک نیا باب تصور کرتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں کانگریس کے مندوب کی حیثیت سے گاندھی جی نے حصہ لیا۔ کانفرنس ناکام رہی۔ گاندھی جی کو بمبئی ساحل پر پہنچتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت ملک کے تمام اہم رہنما جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے۔ تادیبی کارروائیاں زوروں پر تھیں۔ لیکن اس سے ہندوستانیوں کے جوش و ولولہ میں اور اضافہ ہی ہوا اور وہ سب جان سے بے پروا ہو کر آزادی کی جدوجہد میں شریک رہے۔ یہ ہندوستانیوں کی اولوالعزمی ہی تھی کہ کامیابی دن بہ دن ان کے قدم چوم رہی تھی اور جستہ جستہ وہ اپنی منزل مقصود کی جانب بڑھ رہے تھے۔

۱۶ اگست ۱۹۳۲ء میں برطانیہ کے وزیراعظم میک ڈونالڈ نے پسماندہ اقوام کے لیے جداگانہ انتخاب کا اعلان کیا۔ اس اعلان سے ہندوستان بھر میں ہلچل مچ گئی۔ مندروں، کنوؤں اور دوسرے عام مقامات کو شودروں کے لیے کھول دیا گیا کیوں کہ گاندھی جی نے جو ان دنوں یرودا جیل میں قید تھے اس اعلان کے خلاف مرن برت رکھا اور عام ہندوستانیوں سے یہ اپیل کی کہ ذات پات، اونچ نیچ کے امتیازات کو ختم کرکے پسماندہ اقوام کے عرصۂ حیات کو وسیع کریں۔ یہ ان کے مرن برت کا ہی نتیجہ تھا کہ یہ اعلان واپس لے لیا گیا اور پونا معاہدہ عمل میں آیا۔ گاندھی جی نے اپنے اخلاقی اور سیاسی سفر کو جاری رکھتے ہوئے آخرکار وہ منزل دیکھ لی جب ہندوستان کو ۱۹۳۵ء کا نیا برطانوی آئین ملا اور ۱۹۳۷ء میں ہوئے انتخابات میں زیادہ تر صوبوں میں کانگریس ہی اقتدار میں آئی۔ یہ خود مختار حکومت کی پہلی کڑی تھی۔

دریں اثنا گاندھی جی نے معاشرے کی اصلاح میں اپنے آپ کو معروف رکھا۔ انھوں نے دیہاتوں میں صاف پانی کی فراہمی، نشہ بندی اور سودیشی کپڑوں کے استعمال کی پرزور وکالت کی۔ وردھا طریقۂ تعلیم کے لیے ذاکر حسین کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح گاندھی جی صحیح معنوں میں "سوراج" کی بنیاد فراہم کرنے کا عظیم کام انجام دے رہے تھے۔

جولائی ۱۹۴۲ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ "ہندوستان میں برطانوی راج کا فوراً خاتمہ ہونا چاہیے"۔ ۷ اگست کو اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا اور اس میں "ہندوستان چھوڑو" تحریک پاس ہوئی۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ملک گیر پیمانے پر احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ انگریزی حکومت نے اس کو ناکام کرنے کے لیے طاقت کا سہارا لیا۔ گاندھی، نہرو اور آزاد کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے ہندوستانی اور مشتعل ہو گئے اور انھوں نے ڈاکخانوں، تھانوں اور عدالتوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑ دی گئیں۔ ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کاٹ دیے گئے۔ حکومت نے پوری قوت سے عوام کو نشانہ بنایا۔ لیکن ان کے آزادی کے بے پناہ جذبے کو دبانے میں ناکام رہے۔ ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کو رہا کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جناح گفتگو شروع ہوئی لیکن نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔ راجہ جی فارمولا میں ملک کی تقسیم کا امکان تسلیم کر لیا گیا۔ مہاتما گاندھی جی ملک کی تقسیم کو پہلے ہی مسترد کر چکے تھے۔ - - - - - - - - - - - - - - - سیاسی تعطل کو ختم کرنے کے لیے دو اور بے نتیجہ کوششیں ہوئیں۔ مسلم لیگ پاکستان کے سوال پر بضد تھی۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں کابینہ مشن آیا اور ایک مصالحتی پلان دونوں طرفین کے درمیان طے پایا۔

یہ مصالحتی پلان بھی ٹائیں ٹائیں فش ہو گیا اور اگست ۱۹۴۶ء میں بنگال میں فرقہ وارانہ تشدد پھوٹ پڑے اور یہ فرقہ پرستی کی آگ بہار اور اتر پردیش تک پھیل گئی۔ گاندھی جی نے اس آگ کو بجھانے کے لیے اپنے آپ کو اس میں جھونک دیا۔ ۱۹۴۷ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے کی حیثیت سے ہندوستان آئے۔ جنھیں برطانوی حکومت نے دوسرے وائسرایوں کے مقابلے میں زیادہ اختیار دیے تھے۔ ملک کی تقسیم کی اسکیم پیش کی گئی اور اسے دونوں فریقوں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ نے قبول کیا اور ۱۹۴۷ء کو ملک تقسیم ہو کر

باقی صفحہ ۳۷ پر

کے۔ کے۔ کھلر

جیالا وطن پرست:
شہید اودھم سنگھ

اودھم سنگھ کی ولادت ۲۶ دسمبر ۱۸۹۹ء کو پنجاب کے سنگرور ضلع میں سُنام مقام پر ہوئی۔ جب وہ دو برس ہی کے تھے، ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ کچھ عرصے بعد جب وہ سات برس کے ہوئے تو ان کے والد سردار ٹہال سنگھ بھی انھیں تنہا چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے عزیز و اقربا میں سے کسی نے بھی ان کی مالی اعانت نہیں کی۔ مجبوراً اودھم سنگھ کو اپنے چھوٹے بھائی سادھو سنگھ کے ساتھ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں سہارے کی تلاش میں بھٹکنا پڑا۔ بالآخر پنجاب کے اس وقت کے مشہور سماجی مصلح سردار سادھو سنگھ نے ان کی مدد کی اور امرتسر کے تیلی گھر مقام پر واقع یتیم خانے میں انھیں داخل کر دیا گیا۔ اس یتیم خانے میں رہ کر اودھم سنگھ نے اپنی مادری زبان پنجابی کا علم حاصل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اردو اور ہندی زبانیں بھی سیکھ لیں بعد ازاں وہ اچھی انگریزی بھی سیکھ گئے تھے لیکن ان کا ذریعہ معاش ہاتھ کی کاریگری کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں پنجاب کے عوام بے اطمینانی کے شکار تھے۔ پنجاب کے گورنر سر ڈینزل ایبٹ سن نے ۱۹۰۷ء میں وائسرائے ہند کو جو رپورٹ پیش کی تھی اس نے صورت حال کو مزید اشتعال انگیز بنا دیا تھا۔ اس رپورٹ میں پنجاب میں پھیلی ہوئی "نئی ہوا" کا ذکر تھا اور حکومت ہند کو آگاہ کیا گیا تھا کہ اگر اس وقت حالات پر قابو پانے کے لیے سخت اقدامات نہیں کیے گئے تو پنجاب کی حالت قابو سے باہر ہو جائے گی۔ پنجاب کے کسان بھی ان پر لگائے گئے مزید سرکاری ٹیکسوں کی وجہ سے بے اطمینانی کے شکار تھے۔ شہری عوام ترقی پسند تحریکات سے متاثر ہو رہے تھے۔ سارے پنجاب میں ہونے والی ہڑتالیں اور فسادات اس بات کے مظہر تھے کہ صوبے کی حالت بے حد ابتر ہو چکی ہے۔ امرتسر جو کہ نہایت امن و امان کا مقام تصور کیا جاتا تھا یکایک جنگ آزادی کا ایک محاذ بن گیا اور آزادی کے لیے کئی مقامات پر خفیہ کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ سارے صوبے میں بغاوت کی لہر پھیل گئی اور متعلقہ انگریز افسران بالکل سراسیمہ ہو گئے۔



شہید اودھم سنگھ

دوسری جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۸ء) ختم ہو چکی تھی لیکن ہندوستان کے عوام کو کوئی راحت نہیں ملی تھی اس کے برعکس سرکاری عملے نے انھیں اپنے مضبوط شکنجے میں بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ حکومت محافظت ہند قانون کا نفاذ کرنا چاہتی تھی اور یہ کہا جا رہا تھا کہ اس کے لیے اس کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمدردانہ نقطۂ نظر سے قانون نافذ کرنے کے بجائے سرکار اور بھی سخت رویہ اختیار کر رہی تھی اور ہندوستانی عدلیہ کے جرم و سزا کے قانون میں تبدیلیوں کی

سی-۸/۸۳۳۸/ وسنت کنج۔ نئی دہلی، ۱۱۰۰۷

گنجائش بتاتے ہوئے "رولٹ ایکٹ" نام سے ایک نئے ایکٹ کے نفاذ کی تجویز پیش نظر تھی۔ یہ قانون اس کمیٹی کے صدر کے نام پر رکھا گیا تھا جس نے ہندوستانی عوام کی حفاظت کے لیے اپنی سفارشات پیش کی تھیں، ساتھ ہی جنگ کے بعد کی تین بڑی مصیبتوں اناج کی کمی، بیماریوں اور قحط سالی نے ہندوستان کو بے سدھ کر دیا تھا علاوہ ازیں پنجاب کے کسانوں کی سرکوبی کے لیے جو کوششیں ہوئیں ان کی وجہ سے ہند کے عوام مشتعل ہو گئے ان کے دلوں میں آگ دہکنے لگی، سینوں میں لاوا پکنے لگا۔ اس نئے قانون نے اور بھی آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا جس کا راست نتیجہ "ستیہ گرہ" کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ جبر و استبداد کے خلاف ایک نیا ہتھیار تھا جو عوام کو مہاتما گاندھی نے سونپا تھا۔ گاندھی جی ان دنوں جنوبی افریقہ سے لوٹ کر آئے تھے اور ان کی عمر صرف ۴۹ سال تھی۔ آزادی کا نعرہ یہیں سے ہواؤں میں گونجا تھا اور اس نے ہماری تحریکِ آزادی کو نئی سمت و رفتار عطا کی تھی۔

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیاں والا باغ میں جو زبردست اور بھیانک قتل عام برپا ہوا تھا اس نے اودھم سنگھ کی زندگی میں ایک عجیب و غریب تبدیلی پیدا کر دی۔ اس دن وہ ۱۹ برس چار ماہ اور ۱۸ دن کے تھے اور ان کے دوست بھگت سنگھ کی عمر صرف ۱۲ سال تھی۔

یہ ہندوؤں اور سکھوں کے لیے ایک مقدس دن تھا۔ مسلم اور غیر مسلم لوگوں کے لیے جس میں پنجابی عیسائی بھی شامل تھے۔ یہ ایک مذہبی رواداری کا موقع تھا۔ یہ "بیساکھی" کا دن تھا اور پنجاب کے ہندو اور سکھ صافے باندھے ہوئے اور ہندو مسلم اور سکھ سبھی رنگ برنگے تہمد باندھے امرتسر میں جمع ہوئے تھے اور اس سال کی بھرپور فصل کی کٹائی کے بعد ناچنے گانے میں مصروف تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح شہر کے اسی مقام پر جمع ہونے کے لیے آئے تھے جہاں "میلہ" لگا کرتا تھا لیکن اس سال شہر کی فضا بگڑی ہوئی تھی اور انقلابیوں کی کارروائیاں زوروں پر تھیں۔ امرتسر کے قریب کے گاؤں سے آئے ہوئے کسانوں کے لیے امرتسر کچھ بدلا ہوا اور ملول محسوس ہو رہا تھا۔ درحقیقت سارا شہر گاندھی جی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری پر غم و غصے سے سرخ انگارہ بنا ہوا تھا۔

"باغ" دراصل کوئی باغیچہ نہیں تھا لیکن ایک میدان تھا جس میں چنار درخت نہیں تھے، آبشار نہیں تھے، سبزۂ خودرو ضرور تھا لیکن گھنے درختوں پر مرغانِ چمن کی خوش الحانی نہیں تھی۔ اس میدان میں تقریباً ۲۰ ہزار اشخاص جمع تھے ڈائس پر ہنس راج بول رہے تھے وہ متجسس اور پرجوش عوام کو اپنے رہنماؤں کی گرفتاری کے بارے میں سمجھا رہے تھے۔ جب ان کی تقریر جاری تھی عین اسی وقت دو فوجی گروہ جلیان والا باغ کی تنگ گلی کی طرف سے باغ کی طرف دوڑے ان کے ساتھ انگریز فوجی بھی تھے۔ سپاہی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور انھوں نے بھیڑ کی سمت اپنی بندوقوں سے نشانہ سادھا اور پھر چشم زدن میں گولیاں برسنے لگیں، شور و غوغا بلند ہوا اور ایک قیامت برپا ہو گئی۔ ہنس راج اپنے سامعین کو تسلی دیتے ہوئے چلائے "گھبرائیے نہیں، شانت رہیے، وہ لوگ ہوا میں گولیاں چلا رہے ہیں۔ بریگیڈیئر جنرل ای۔ ایچ ڈائر نے یہ بات سنی تو اس نے اتنی ہی زور سے گرج کر کہا "بندوقوں کے کندے نیچے کر کے گولیاں برساؤ، ہوا میں گولیاں کیوں چلا رہے ہو"۔ اودھم سنگھ جو کہ اس واقعے کا چشم دید گواہ تھا اس نے یہ بات اپنے کانوں سے سنی۔ تقریباً پانچ بجے شام کا وقت تھا۔ آسمان صاف تھا۔ پنجاب کے کھیتوں میں بھرپور فصل ہوئی تھی اور صنوبر اور سرسوں کی خوشبوؤں سے فضائیں معطر تھیں۔ اگرچہ گولیاں صرف دس منٹ کے لیے چلی تھیں لیکن اردگرد کے ماحول پر اس کا اثر دس گھنٹوں کے بعد بھی ختم نہیں ہوا۔ سبھی چشم دید گواہوں نے اس بات کی تائید کی تھی کہ گولیاں اس دروازے سے داغی جا رہی تھیں جس میں سے لوگ باہر نکل سکتے تھے۔ ایک بوڑھا آدمی جو اپنے بھانجے کی تلاش میں باغ میں دوڑ رہا تھا، بیان کرتا ہے کہ باغ میں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ میرے بھانجے کا جسم گولیوں سے چھلنی ہے، اس کی کھوپڑی پھوٹ گئی ہے۔ ایک گولی اوپری جبڑے کو چھیدتی ہوئی ناک کے عین نیچے سما گئی تھی۔ دو گولیاں بائیں طرف لگی تھیں۔ ایک بائیں کندھے پر اور تین ران میں، اس کے سینے پر بھی تین گولیوں کے نشان تھے۔"

چند ہی لمحوں میں جلیان والا باغ خون میں تربتر ہو گیا چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر بکھرے تھے۔ کچھ لاشیں تو نالیوں میں سے کھینچ کر نکالی گئیں۔ چاروں طرف خون بہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سارا شہر گہرے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ رتن دیوی کے لفظوں میں، جو کہ اسی وقت بیوہ ہو گئی تھی "سارا ماحول رونگٹے کھڑے کر دینے والا اور لاشوں کے ڈھیر لرزہ پیدا کرنے والے تھے"۔ اس بہادر عورت نے اس تاریک رات میں گھنٹوں تلاش کرتے رہنے کے بعد اپنے شوہر کی لاش پہچانی تھی۔ اس نے لاش کو باہر نکالا اور تن تنہا اسے کھینچتی ہوئی جنگل میں لے گئی مبادا اس پر سفید قصابوں کی نظر نہ پڑ جائے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ بتانا ناممکن ہے کہ میں اس وقت کیا محسوس کر رہی تھی۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ کچھ اوندھی پڑی ہوئی تھیں اور کچھ چت، ان میں ان گنت لاشیں معصوم بچوں کی تھیں۔ میں اس ویرانے میں جہاں کہ ہو، کا عالم تھا، تمام رات تنہا بیٹھی رہی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور کہیں دور گدھے رینک رہے تھے۔ وہ رات میں نے ہزاروں لاشوں کے درمیان اپنے شوہر کی لاش کی تلاش میں روتے روتے گزاری۔ سارا باغ خون سے شرابور تھا اور کہیں بھی بیٹھنے کے لیے خشک جگہ نہ تھی۔

اس قتل عام کے لیے نام نہاد جنرل ڈائر نے "ہنٹر کمیشن" کے روبرو بیان دیتے ہوئے کہا "میں نے اپنی موٹر سے اترتے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے جائے واردات پر پہنچ کر کیا کرنا ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ سبھی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا"۔ تفتیش کے دوران، کمیشن پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ جنرل ڈائر نے بھیڑ کو منتشر کرنے کے لیے کوئی حکم نہیں دیا تھا انھوں نے اس ضمن میں ڈپٹی کمشنر سے مشورہ لینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی جب کہ اس وقت ڈپٹی کمشنر بذات خود وہاں موجود تھے۔

جنرل ڈائر نے جلیان والا باغ کے خونیں حادثے کے بارے میں اپنا بیان ان لفظوں میں ختم کیا تھا: "میں گولیاں چلانا اپنا فرض متصور کر رہا تھا اور اس فرض کو میں نے بخوبی ادا کیا۔ میں ان کو ایسا سبق سکھانا چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر کبھی ہنس نہ سکیں۔ میں متواتر گولیاں چلاتا رہتا اگر میرے پاس اتنا اسلحہ موجود ہوتا۔ میں اسلحہ سے بھری ہوئی ایک گاڑی بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا لیکن باغ کو جانے والا راستہ زیادہ کشادہ نہ ہونے کے باعث بہ حالت مجبوری مجھے وہ گاڑی پیچھے ہی چھوڑ دینی پڑی۔ میں یہ سوچ کر گیا تھا کہ اس بار گولیاں چلیں گی اور خوب چلیں گی تاکہ مجھے یا میرے کسی ساتھی کو آئندہ گولیاں نہ چلانی پڑیں۔"

جنرل ڈائر کو ارسال کیے گئے تار میں سر مائیکل نے اس کی اس کارروائی کو منظوری عطا کی تھی۔ ان کے تار میں لکھا تھا کہ "تمہارے کارروائی درست ہے۔ لیفٹننٹ گورنر اپنی منظوری دیتے ہیں۔" جب اس قتل عام کی خبر کلکتہ پہنچی تو سبھاش چندر بوس نے ایک عظیم الشان جلسے کو مخاطب کرتے ہوئے، ہاتھ میں پستول لے کر یہ قسم لی کہ وہ اب اس انگریزی حکومت کو ہندوستان سے باہر نکال کر ہی دم لیں گے۔

جو لوگ مارے گئے تھے اس میں پڑوس کے گاؤں کا ایک حلوائی بھی تھا جو کہ میلہ دیکھنے کے لیے امرتسر آیا تھا اور وہاں پہنچ کر میلے میں اپنی چھوٹی سی دکان لگانے کی بابت سوچ رہا تھا۔ اس کے رشتے داروں کے بیان کے مطابق "میوا سنگھ کا پورا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔ اس کی کھوپڑی سے کسی فوارے کی طرح خون جاری تھا۔" مقامی کالج کے بے شمار طلبہ بھی اس میں مارے گئے اور زخمی بھی ہوئے۔

امرتسر والوں کے نزدیک یہ ایک بے حد بھیانک بیساکھی تھی۔ اس قتل عام کے متعلق "جلیان والا باغ کے شہید" نامی کتاب (جو کہ پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہوئی تھی) کے مصنف ڈاکٹر راجا رام کے خیال میں یہ شرمناک حادثہ ایک طے شدہ پروگرام کے تحت روبہ عمل لایا گیا تھا۔ اس کتاب میں ان تمام لوگوں کے نام دیے گئے ہیں جو وہاں شہید ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں چند خصوصی و ممتاز شہیدوں کے مختصر تعارف بھی دیے گئے ہیں جو کہ سرکاری دستاویزوں کی بنیاد پر تیار کیے گئے ہیں۔ "غدر" اور "تحریک آزادی" کے بعد انگریزوں کا وحشتناک اقدام امرتسر کا یہ قتل عام تھا۔ لیفٹیننٹ گورنر مائیکل او ڈائر کا یہ بیان تھا کہ فوجی اعتبار سے یہ گولیاں جنتا پر نفسیاتی اثر ڈالنے کے لیے چلائی گئی تھیں، لیکن اس بیان سے سارے ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور سارے ملک کے عوام غصے اور غم کے وفور سے بے قابو ہو گئے۔

اس قتل عام کی خبر ملتے ہی ۱۲ سالہ بھگت سنگھ اپنے اسکول نہ جا سکا اور امرتسر والی ٹرین سے وہ جلیان والا باغ میں پہنچا۔ وہاں کچھ دیر تک تو وہ ملول و سرگشتہ ہو کر سوگواری کے عالم میں کھڑا رہا۔ اس نے تھوڑی مٹی اٹھا کر اپنے سر سے لگائی اور کچھ ایک شیشی میں محفوظ کر لی۔ واپسی میں جب بس کنڈکٹر نے اس سے ٹکٹ کے پیسے طلب کیے تو پیسے نکالتے ہوئے کچھ لمحوں کے لیے اس کا ہاتھ شیشی پر ٹھہر گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو بہن نے کھانا کھانے کے لیے اصرار کیا اور ہمیشہ کی طرح اس کی مرغوب شئے آم اس کے سامنے لا کر رکھ دیے لیکن اس نے ان کی طرف دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔ جب بہن نے بہت زیادہ اصرار کیا تو وہ اسے ایک کونے میں کھینچ کر لے گیا اور شہیدوں کے خون سے رنگی ہوئی مقدس مٹی اسے دکھائی۔ بھگت سنگھ کے اہل خاندان کا کہنا تھا کہ وہ اس پاکیزہ مٹی پر بلا ناغہ روز سویرے سویرے تازہ پھول چڑھایا کرتا تھا اور اس سے تحریک حاصل کرتا رہتا تھا۔ اس دن صبح وہ دریائے راوی کے کنارے گیا اور اس نے قسم کھائی کہ وہ اس کے پانی کو کسی دن اپنے خون کی سرخی عطا کرے گا۔ اس کا مدعا آزادی کے لیے قربانی کے جوش سے تھا۔

جنرل ڈائر نے پنجاب کے گورنر کو یہ "حوصلہ" دیا کہ اس نے اس کے لیے پنجاب کو بچا لیا ہے لیکن تاریخ بڑی بے درد ہوتی ہے وہ کبھی کبھی ہی من مانی کرنے دیتی ہے۔ آئندہ پیش آنے والے حالات و واقعات نے ثابت کیا کہ چاہے ڈائر نے اپنے گورنر کو خوش کرنے کے لیے پنجاب کو بچا لینے کی بات کہی ہو لیکن اسی نے دور دیش میں بیٹھے اپنے آقاؤں اور گوری چمڑی والے حکمرانوں کے ہاتھوں سے ہندوستان کو نکالنے میں مدد کی تھی۔ سروجنی نائیڈو نے اپنی پُراثر نظم میں یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی قبر بننے والی ہے۔ سوویت روس سے لینن نے بھی امرت بازار پتریکا کے مدیر کو فرستادہ ۱۰ راپریل ۱۹۲۰ء کے مرقومہ اپنے ایک مکتوب میں اس حادثے پر اظہار افسوس کیا تھا لیکن یہ خط کسی طرح برٹش پولیس کے قبضے میں چلا گیا تھا۔

یہ ایسی خونی بیساکھی تھی جس کی یاد آج بھی ہندوستان کے عوام کو ملول و افسردہ کر دیتی ہے۔ درحقیقت یہ وہ دن تھا جب انگریزی حکومت اپنے سامراجی ہتھکنڈوں کے باوجود ہار گئی تھی۔ یہ واقعہ اس بات کا شاہد ہے کہ انگریزی حکومت اپنے سامراجی ہتھکنڈوں کو کتنے پست معیار پر لے جا سکتی ہے اس کے بعد ظلم و استبداد کا عریاں رقص شروع ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے انقلابیوں نے سامراجیوں کے چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے خود کو ایک آخری جنگ کے لیے پوری طرح مستعد کر لیا۔ بانکے دیال اور مولوی عبدالحق کے ذریعے گایا جانے والا یادگار اور باوقار گیت "پگڑی سنبھال او جٹا" جلیان والا باغ کے حادثے کے بعد پنجاب میں اس قدر مقبول ہو گیا تھا کہ سرکار اس پر پابندی عائد کرنے پر غور کر رہی تھی۔ جلیان والا باغ کے اس حادثے سے متعلق جو "بیساکھی ادب" اس وقت لکھا گیا اس نے ایک قومی حزب مخالف تیار کرنے میں تعاون دیا۔ ہر سال بیساکھی کے موقعے پر جلیان والا باغ میں جلسے منعقد کیے جاتے تھے اور اپنے ملک کی آزادی اور انگریزی حکومت کے پنجوں سے آزادی کی قسم کھائی جاتی تھی۔ اودھم سنگھ نے بھی اسی دن یہ قسم کھائی تھی اور ہر بار بیساکھی کے دن اسے دہراتا تھا۔

جنرل ڈائر نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا "میں سوچتا ہوں کہ میں نے بہت بڑا کام ایک ہی دن میں کر دکھایا ہے۔" ہنٹر کمیشن "کی رپورٹ

کے مطابق اس حادثے کے دن ۱۶۵۰ گولیاں چلی تھیں اور ۱۵۱۶ لہ آدمی مارے گئے تھے۔ رپورٹ میں کہا گیا "جلیان والا باغ ایک ایسا وسیع الرقبہ غیر کارآمد میدان ہے جو چاروں طرف سے بجری اور پتھروں کے ڈھیر سے گھرا ہوا ہے۔ یہ باغ کچھ پکے مکانوں کی دیواروں اور مکانوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس میں داخل ہونے اور نکلنے کا راستہ بے حد تنگ ہے۔ جنرل ڈائر جس طرف سے وہاں پہنچا تھا اُدھر دروازے کی دونوں جانب اونچے اونچے ٹیلے تھے۔ ایک بہت بڑی بھیڑ ان کے سامنے بکھری ہوئی تھی اور دوسرے کنارے پر باغ کے آخر میں ایک آدمی اونچے اسٹیج پر کھڑا ہو کر تقریر کر رہا تھا۔ یہ اسٹیج جنرل ڈائر اور اس کے سپاہیوں سے، جن میں نیپال کے ۲۵ گورے سپاہی اور بلوچستان کے ۲۵ بلوچ رائفلوں سے لیس اور اسلحہ جات سے بھری ہوئی دو گاڑیوں کے ساتھ آئے تھے، ایک سو پچاس گز کی دوری پر تھا۔"

قصہ مختصر یہ کہ جلیان والا باغ کے اس حادثے کے تین خاص کردار تھے۔ سر مائیکل او ڈوائر (MICHAPL O DWYFR) پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر بریگیڈیر جنرل ای۔ ایچ۔ ڈائر ہندنژاد انگریزی فوج کا افسر جس نے گولی چلانے کا حکم صادر کیا اور لارڈ زیٹ لینڈ، ہندوستان کے حکومتی معتمد۔ اودھم سنگھ اس سارے خونیں حادثے کا چشم دید گواہ تھا، اس نے اپنے اعلامیے میں یہ قسم لی تھی کہ وہ اس قتلِ عام کا بدلہ ان تینوں سے لے کر رہے گا۔ اس کی ڈائری اس کی شاہد ہے۔

اپنے اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ بذریعہ جہاز۔ غیر ممالک کے سفر پر نکل کھڑا ہوا اور سب سے پہلے جنوبی افریقہ روانہ ہوا یہاں سے وہ امریکہ چلا گیا جہاں اس کی ملاقات ان ہندوستانی انقلابیوں سے ہوئی جو اپنے مادرِ وطن کی آزادی کے لیے برسرِ پیکار تھے۔

۱۹۲۳ء میں وہ انگلینڈ پہنچے لیکن ۱۹۲۷ء کو انھیں اپنے دوست بھگت سنگھ کے بلاوے پر ہندوستان لوٹنا پڑا۔ جب وہ لاہور پہنچے تو انھیں قانون ہتھیار بندی کی خلاف ورزی کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ایک جعلی مقدمے کی کارروائی کے بعد انھیں چار سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ جب ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو لاہور کی سینٹرل جیل میں بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تھی اس وقت اودھم سنگھ ایک دوسری جیل میں قید تھے اور انھیں ۱۹۳۲ء میں اس قید سے رہائی حاصل ہوئی۔

۱۹۳۳ء میں پولیس کو چکمہ دے کر وہ جرمنی کے لیے روانہ ہو گئے۔ برلن سے وہ پھر لندن پہنچے، اپنی دلی خواہش کو دل میں چھپائے انجینئری سے متعلق ایک ٹریننگ کورس میں داخلہ لے لیا۔ انھوں نے کئی بار اپنا نام بدلا کبھی اُدے سنگھ رکھا، کبھی شیر سنگھ، کبھی فرینک ورجل اور کبھی رام محمد سنگھ آزاد۔ جلیان والا باغ کبھی کبھی ان کے رگ و پے میں غم و غصّے کے شرارے بھر دیتا تھا اور وہ بدلے کے جذبے سے بے قابو ہو جاتے تھے اس وقت تک جنرل ڈائر مر چکا تھا لیکن سر مائیکل او ڈوائر اور لارڈ زیٹ لینڈ (LORD ZETLAND) بقیدِ حیات تھے۔ وہ کسی سائے کی طرح ان کا تعاقب کرتا رہا اور ان کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھے رہا۔ اس نے ایک پستول خرید لیا تھا اور بدلے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ روزانہ پستول صاف کرتا اور موقعے کی تلاش میں گھومتا رہتا لیکن دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے رہے تاہم اسے کوئی مناسب موقع نہیں مل سکا۔

آخر ۱۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو وہ دن بھی آ گیا جس کا اسے انتظار تھا جب سر مائیکل او ڈوائر اور لارڈ زیٹ لینڈ دونوں ایک ساتھ رایل سینٹرل ایشین سوسائٹی اور ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ذریعے کیکسٹن ہال میں منعقدہ افغانستان کے متعلق ایک مذاکرے میں حصّہ لینے کے لیے آئے۔ لارڈ زیٹ لینڈ اس سیمنار کے صدر تھے اور انھیں اس کا افتتاح بھی کرنا تھا۔ اودھم سنگھ نہایت خاموشی کے ساتھ وہاں پہنچ گئے اور اسٹیج کے عین مقابل چار پانچ صفیں چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ سر مائیکل اوڈوائر نے اپنی جوشیلی تقریر کی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ ہندوستان کی مخالفت میں بول رہا تھا اور اس بات پر زور دے رہا تھا کہ حکومت کو ہندوستانیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ ترک کر کے سخت رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ جیسے ہی وہ اپنی تقریر ختم کر کے اپنی کرسی کی طرف مڑا اور سکریٹری شکریہ ادا کرنے کے لیے اٹھے اچانک ہی اودھم سنگھ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی پستول نکال کر سر مائیکل۔ اوڈوائر پر پے در پے گولیاں برسانے لگے اور پھر چشمِ زدن میں ڈوائر کی لاش زمین پر تڑپ رہی تھی اس نے جائے واردات پر ہی دم توڑ دیا۔ اس وقت شام کے ساڑھے چار بجے تھے۔ لارڈ زیٹ لینڈ کو بھی گولیاں لگیں وہ زخمی حالت میں وہاں سے لے جائے گئے۔

چاروں طرف چیخ و پکار، افراتفری اور بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ اگر اودھم سنگھ چاہتے تو موقعے کا فائدہ اٹھا کر وہاں سے فرار ہو سکتے تھے لیکن وہ ایک بہادر کی طرح اپنی جگہ خاموش کھڑے رہے اور خود ہی باآوازِ بلند اس بات کا اقرار کیا کہ میں نے مائیکل ڈوائر کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ عوام کو گھبرانے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اودھم سنگھ گرفتار کر لیے گئے۔ ۲ اپریل ۱۹۴۰ء کو انھیں عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ پُرمسرت اور سنہری موقع تھا جب انھوں نے دلیرانہ انداز میں جج کے سامنے یہ بیان دیا:

"میں نے یہ قتل اس لیے کیا ہے کہ مجھے اس آدمی سے نفرت تھی۔ اسے جو سزا ملی ہے وہ اس کا مستحق تھا۔ وہ [illegible] ایک مجرم تھا۔ وہ میرے وطن کی روح کو قتل کرنا چاہتا تھا، اس لیے میں نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ اگر آپ یقین کریں تو کہوں گا کہ میں اس شخص سے بدلہ لینے کی خاطر ۲۰ سال تک اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے بالآخر اپنا کام پورا کر لیا ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں جواں موت مرنا چاہتا ہوں بوڑھا ہو کر یا اپاہج ہو کر مرنا بے سود ہے۔ میں اپنے ملک کے عوام کی خاطر اپنی جان دے رہا ہوں۔ میں اپنے وطن کے لیے قربان ہو رہا ہوں۔ کیا لارڈ زیٹ لینڈ بھی مر گئے ہیں؟ انھیں ضرور مرنا

چاہیے۔ میں نے ان کے جسم پر گولیوں سے راست وار کیا تھا۔
میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ انگریزی حکومت میں ہندوستان کے عوام فاقوں مر رہے ہیں۔ میں اسی کی مخالفت میں اپنے ردعمل کا اظہار کر رہا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ مجھے اس سے زیادہ اور کیا عزت مل سکتی ہے کہ میں اپنے مادرِ وطن کے لیے خود کو اجل کے سپرد کر رہا ہوں۔"

جب منصف نے ان کا نام دریافت کیا تو اودھم سنگھ نے جواباً کہا کہ میرا نام اودھم سنگھ نہیں بلکہ "رام محمد سنگھ آزاد" ہے۔ "رام" لفظ کا استعمال ہندو کے لیے "محمد" مسلماں کے لیے "سنگھ" سکھ اور "آزاد" اپنے وطن عزیز کی آزادی کے لیے کیا ہے۔ اودھم سنگھ نے عدالت کے روبرو اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ میں اپنے جُرم کی پاداش میں بڑی سے بڑی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں، چاہے وہ سزا دس سال کی ہو یا بیس سال کی، یا پچاس سال کی یا پھر سزائے موت۔

انگلینڈ کے قدیم بیری کورٹ نے اسے سزائے موت دیے جانے کا اعلان کیا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اسی عدالت نے ۳۱ برس پہلے بھی سزا ایک اور ہندوستانی انقلابی مدن لال ڈھینگرہ کو بھی سنائی تھی۔

اودھم سنگھ کو لندن کی برسٹن جیل میں قید کر دیا گیا۔ جیل سے اپنے دوستوں کو لکھے گئے خطوط میں انھوں نے واضح انداز میں تحریر کیا تھا کہ انھیں قانون سے رہائی دلانے کے لیے نہ تو کوئی کاوش کی جائے اور نہ ہی اس ضمن میں کچھ روپیہ خرچ کیا جائے۔ ان کا اصرار تھا کہ اس کے بجائے اردو اور پنجابی میں لکھی ہوئی چند اچھی کتابیں بالخصوص تاریخ ہند سے متعلق کتابیں انھیں جیل میں مطالعے کی غرض سے ارسال کی جائیں۔

جب کوئی اسے "قیدی" لفظ سے مخاطب کرتا یا پکارتا تھا تو اودھم سنگھ پر اس کا فوری ردعمل ہوتا تھا۔ جیل سے مرقومہ اپنے ایک مکتوب میں اس نے لکھا تھا کہ میں قیدی نہیں ہوں۔ میں تو ملکہ انگلستان کا مہمانِ خصوصی ہوں۔ وہ میرے آرام کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ ۱۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو اس نے اپنے دوست کو لکھے گئے ایک خط میں کہا تھا: "کیا آپ مجھ پر یہ احسان کر سکتے ہیں کہ یہاں معروف رہنے کے لیے چند کتابیں مجھے فوراً ہی ارسال کر دیں۔ یہاں میرے پاس وقت ہی وقت ہے اور مجھے جس جیل میں قید کیا گیا ہے وہ بھی بہت آرام دہ ہے لیکن میں کسی اس سے بھی بہتر مقام پر جانے کے لیے کوشاں ہوں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اردو اور گرومکھی میں لکھی ہوئی چند کتابیں مجھے فوری طور پر بواپسی ڈاک ارسال فرمائیں لیکن میں آپ کو ایک بات اور لکھ رہا ہوں کہ خدارا مجھے مذہبی کتابیں ہرگز ہرگز ارسال نہ فرمائیے گا کیوں کہ میں ان پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ مجھے یقین تھا کہ سردار موہن سنگھ سے مجھے کچھ کتابیں مل سکیں گی۔ لیکن افسوس کہ وہ انگلینڈ سے واپس چلے گئے ہیں اور مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے کہ ان کی جگہ یہاں کے گردوارے کا ناظم کسے مقرر کیا گیا ہے۔ یہ خط میں برسٹن جیل سے بقلم خود تحریر کر رہا ہوں۔ مجھے ابھی یہیں قیام کرنا ہے یہاں مجھے بہت سے محافظ ملے ہیں اور ان کی نگرانی میں میری خوب دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے اور یہ میری تمنا بھی ہے کہ سزائے موت کے بعد میں پھر سے جنم لوں گا اور تب تک تم سب لوگ بوڑھے ہو چکے ہو گے۔ میں نے بھی کافی دنوں تک انتظار کیا ہے اور تب کہیں جا کر یہ فخر حاصل ہوا ہے۔ میں اپنا خط ہندوستانی میں نہیں لکھ رہا ہوں لیکن آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں کس قسم کی کتابیں چاہتا ہوں مجھے ہندوستانی تاریخ کی چند کتابوں اور ہندوستانی اخبارات وجرائد کی ضرورت ہے۔

خط تمام کر لینے کے بعد انھوں نے پس نوشت کے طور پر یہ بھی لکھا تھا کہ مجھے دیکھنے کے لیے ایک صاحب یہاں روزانہ آتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی کسی تہذیبی انجمن کے سربراہ ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ مجھ میں عیسائی مذہب کی جانب قوی رجحان پیدا کر دیں اور اس طور میرا عقیدہ تبدیل کر دیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں وہ فضول ہی اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ میں نے یہاں کی مسجد کے پیش امام صاحب کو لکھا ہے کہ وہ مجھے قرآن شریف کا ایک نسخہ ارسال فرمائیں کیوں کہ میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ وہ مجھے قرآن شریف ارسال کریں گے تاہم میں اس کا برا بھی نہیں مان سکتا کیوں کہ میں تو آج کیسے "محمد سنگھ" ہوں۔

اودھم سنگھ کرسٹن جیل میں قیدی نمبر ۱۰۱۰ کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو علی الصبح انھوں نے جوہل سنگھ کو ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا۔

"میں تمام کتابیں آپ کو واپس لوٹا رہا ہوں۔ آپ کی بڑی نوازش رہی کہ ان کتابوں کے سہارے میرے دن اچھی طرح کٹ گئے۔ کیا آپ مجھے چند کتابیں اور بھجوانے کی زحمت فرمائیں گے۔ میرا وزن بڑھ گیا ہے۔ میرا وزن اس وقت سے کم سے کم ۵ پونڈ بڑھ گیا ہے جس وقت میں "شاہی مہمان" بن کر یہاں آیا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس ملک میں رہنے والے بہت سے ہندوستانی میرے خلاف ہیں لیکن میں ان کی قطعی پروا نہیں کرتا مجھے اتنی جلدی مرنے کا کوئی غم نہیں ہے۔ میں تو پھانسی کے پھندے سے اپنا بیاہ رچاؤں گا مجھے قطعی غم نہیں ہے کیوں کہ میں تو اپنے دیش کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔"

اپنے دوست شہید بھگت سنگھ کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۳۰ء کو کتنی عقیدت کے جذبے کے ساتھ انھوں نے پھانسی کے پھندے کو گلے سے لگایا تھا اودھم سنگھ کے الفاظ میں "میرے دوست کو بچھڑے ہوئے تقریباً دس سال گزر چکے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ موت کے بعد میری ان سے ملاقات ہوگی۔ وہ وہاں میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ ۲۳ مارچ کا دن تھا اور مجھے امید ہے کہ اسی تاریخ کو مجھے بھی پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔

اسی خط میں انھوں نے اپنے ہم وطنوں سے

اپیل کی تھی کہ وہ ان لوگوں کو بیکار محنت کرنے سے باز رکھیں جو انھیں بچانے کے لیے قانون منتریوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے شب و روز کوشاں ہیں۔ اودھم سنگھ نے لکھا تھا:

"اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ میری مدد کرنے والے کون لوگ ہیں تو براہِ مہربانی انھیں ویسا کرنے کے لیے منع کر دیں۔ مجھے بے حد مسرت ہوگی کہ اس رقم کا استعمال مجھے بچانے کی بجائے ہندوستان میں تعلیم کے پرچار پر کیا جائے۔"

اپنے آخری خط میں انھوں نے شکایت کی تھی کہ ان کے دوستوں نے انھیں جیل میں مطالعے کی غرض سے جو کتابیں ارسال کی تھیں۔ وہ جیل کے گورنر نے ان کے ہاتھوں تک نہیں پہنچنے دی تھیں۔ اودھم سنگھ کے لفظوں میں "جیل کا گورنر بہت سخت آدمی ہے۔ ہر پانچ منٹ میں اس کا ذہن تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس نے تمام آدمیوں کو اپنی مذہبی کتابیں پڑھنے کے لیے اجازت دے رکھی ہے وہ چرچ میں بھی جا سکتے ہیں لیکن انگریزوں کی اس جیل میں شاید میں ہی وہ تنہا شخص ہوں جس کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے لیکن اس کی پروا کون کرتا ہے۔ میں نے ان جیسے شریف آدمی پہلے ہی بہت دیکھے ہیں تاہم یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہماری مذہبی کتابیں غسل کیے بغیر نہیں پڑھی جاتی ہیں اور یہ کم بخت مجھے دس دن کے بعد ہی غسل کرنے کی سہولت دیتا ہے۔ مجھے از حد افسوس ہے میں نے خوامخواہ آپ کو کتابیں ارسال کرنے کے لیے زحمت دی اور ڈاک میں محصول ہی آپ کا پیسہ خرچ کروایا۔ میں عدالت سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ کیا جیل میں ایسی کتابیں پڑھنا بھی جرم ہے۔

برسٹن جیل سے ان کو پین ٹون ولا جیل میں منتقل کر دیا گیا جہاں بالآخر انہیں ۱۲ جون ۱۹۴۰ء کو پھانسی دے دی گئی۔ اپنے وطن کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے وہ ۲۱ برس تک انتظار کرتے رہے تھے۔

پنجاب سرکار اور حکومت ہند کے مشترکہ تعاون سے شہید اودھم سنگھ کی "استھیاں" ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء کو ہندوستان لائی گئیں اور پالم ہوائی اڈے پر ان کے "پھولوں" کے سواگت کے لیے ملک کے تقریباً سبھی اہم رہنما پہنچ گئے تھے۔ ان کے پھول ۲۳ جولائی تک دہلی میں عوام کے درشن کے لیے رکھے گئے اور پھر دہلی سے چنڈی گڑھ ہوتے ہوئے ۳۱ جولائی ۱۹۷۴ء کو سنام پہنچائے گئے جہاں سے انھیں مقدس گنگا ندی میں بہانے کے لیے ہری دوار لے جایا گیا۔ راستے میں ہزاروں لوگوں نے امر شہید کو گلہائے عقیدت پیش کیے۔ راستوں پر دونوں طرف مجمعِ عام نظر آتا تھا جو اپنے اس جیالے وطن پرست کی جے جے کار کر رہا تھا جس نے اپنے مادرِ وطن کی آزادی کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دی۔ اودھم سنگھ شہید ہو کر بھگت سنگھ راج گرو اور سکھ دیو کے ساتھ امر ہو گیا۔ ●

بقیہ دلؔ عظیم آبادی

جب ہاتھ لگا اپنے قناعت کا خزانہ
پھر کون سی دولت ہے کہ موجود نہیں ہے

پاؤں کھینچے جس نے فرشِ عالمِ اسباب سے
بوریا بہتر ہے اس کو مسند و سنجاب سے

شاعری محبت کی کیفیات و جذبات اور واردات قلبی کے اظہار کا ذریعہ ہے، اس لیے ہر شاعر کے سامنے کسی محبوب کا تصور ہونا ضروری ہے۔ کوئی محبوب موجود نہ ہو تو جذبات و کیفیات پیدا نہ ہوں۔ عام طور پر شعرا اظہار جذبات کے لیے کسی نہ کسی محبوب کا خیال اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اسی خیالی محبوب سے مخاطب ہوتے ہیں۔ غزل کے معنیٰ محبوب سے بات کرنے کے ہیں لہٰذا وہ اپنی محبت اس سے جتاتے ہیں۔ اس کی بے مہری، بے پروائی اور تغافل کا اور ظلم و ستم کا شکوہ کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں کہیں رقیب کا، کہیں محبوب کی بے اعتنائی کا، کہیں ہجر و فراق کا تغزل نکھرتا ہے۔ دلؔ کے چند اشعار۔ ؎

اس کی سوگند وفا کا دلؔ نہ کرنا اعتبار
میرے اس کے ہو چکا ہے عہد و پیماں بارہا

○

ہم بھی لالے کی طرح داغ دکھاتے اپنا
یار اس وقت اگر باغ میں تنہا ہوتا

○

کرے کیا کوئی رہ کر دلؔ گلی میں اس کی مدت تک
جو تم تھے تو ہوا کیا اور ہم ہوتے تو کیا ہوتا

○

رخصت ہو کر صنم سے جب چلے ہم
رو رو کے ملے گلے گلے ہم

○

میں اپنے جانتے تو کسی سے نہیں ملا
کینے سے کیوں بھرا ہے دل اس بدگمان کا

دلؔ کی محبت میں پاکیزگی ہے خلوص ہے اور پاسِ ادب بھی ہے۔

بقیہ: کیمیاوی کھادیں۔ سبز انقلاب کی محرک

کوشش جاری ہیں۔ نویں ورکنگ گروپ کی رپورٹ میں اس سلسلے کی سفارشات شامل کر لی گئی ہیں تاکہ گوداموں پر مال اتارنے [illegible] چڑھانے کے کام کو جدید ڈھنگ سے انجام دیا جا سکے [illegible] کسانوں کے دروازے تک پہنچانے کا [illegible] طور پر انجام پا سکے گا اور کھاد کی فراہمی یقینی بنائی جا سکے گی۔ ●

بقیہ: ہندوستانی معیشت کو درپیش چیلنج

اور مالی دانشمندی کی ضرورت ابھی بھی بنی ہوئی ہے۔ جیسا کہ وزیر خزانہ شری پی۔ چدمبرم نے اپنی بجٹ تقریر میں کہا تھا "ہمت و حوصلہ اور ہمدردی و پیار، اصلاحات اور ضبط اور سماجی انصاف کے ساتھ ترقی" بدستور ہندوستانی اقتصادی پالیسی کے اہم اجزا بنے رہنے چاہئیں۔

مدھوبنی مصوّری:
ماضی اور حال کے آئینے میں

ہندوستان کے علاقائی عوامی آرٹ
ستھلا آرٹ (مدھوبنی مصوری) کو کچھ زیادہ
ہمیت حاصل ہے۔ جہاں ملک میں دیگر
ائی آرٹ ختم ہو رہا ہے یا ختم ہونے کی
ر پہ پہنچ چکا ہے وہیں متھلا آرٹ روز
پروان چڑھ رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ
متھلا کے فنکاروں میں اب بھی وہ جوش
و داعتمادی برقرار ہے جو صدیوں پہلے تھی۔
ور بین اقوامی سطح پر یہ آرٹ شہرت حاصل
ہا ہے اور فنکاروں کی کشش کا مرکز بھی
بنا ہے۔

متھلا آرٹ کو "مدھوبنی مصوری" کے
سے بھی جانا جاتا ہے۔ شمالی بہار میں لگ
ے تین ہزار سالوں سے متھلا کی خواتین ہی
رواج کے دیوی دیوتاؤں کی عقیدت
تہ تصویریں بناتی رہی ہیں۔ لیکن اس امر
ئی دستاویزی ثبوت دستیاب نہیں ہے۔
لی بہار کے دربھنگہ، مدھوبنی، کھگریا،
ر، مدھے پورہ، کشن گنج اور سیتامڑھی کے
ہ نیپال کے ترائی والے علاقے میں بھی خوب
ہے۔

پہلے یہ آرٹ دیواروں اور گھر آنگن
رش پر بنانا شروع ہوا اور وہاں سے کپڑوں
اغذ پر منتقل ہوتا گیا۔ پہلے یہ چاول کو پیس
بائے گئے رنگ "پٹھار" اور دیگر قدرتی
ں سے بنایا جاتا تھا، جس کی جگہ آج بازار
کے رنگوں نے لے لی ہے۔ اس
علاقائی آرٹ یا مصوری کو مختلف
ریاستوں میں مختلف ناموں سے پکارا
جاتا ہے۔ اس آرٹ کو راجستھان میں
"مانڈنا" بنگال اور آسام میں "الپنا"
گجرات میں "ساتھیا" مہاراشٹر میں
"رنگولی" اترپردیش میں "چوک پرنا"
کمایوں میں "ایپن" اور جنوبی
ہندوستان میں اسے "کولم" اور
"منڈل" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔
اس کی اپنی ایک الگ پہچان کے ساتھ
ساتھ ایک الگ خوبصورتی بھی ہے
جو کسی کو بھی اپنی طرف کھینچنے کی
خاصیت رکھتی ہے۔



دیگر عوامی آرٹ کی طرح مدھوبنی
مصوری بھی مختلف تہواروں، خاندانی
تقریبات اور مذہبی موقعوں کے ساتھ
منسلک ہے۔ متھلا کی خواتین تہواروں،
شادی بیاہ اور مذہبی موقعوں پر مختلف طرح
کی تصویروں سے گھر کی دیواروں اور آنگن کو
سجاتی ہیں۔ گھریلو تصویروں میں گھر کے
اندر اور باہر بنائے جانے والا "مانڈنا" بہت
مشہور ہے۔ مذہبی تصویر سازی (مصوری) میں
رادھا کرشن کی لیلا، رام سیتا، شیو پاروتی
کی لیلا، وشنو، کالی کے ساتھ ساتھ علاقائی
دیوی دیوتاؤں کی احترام کے ساتھ تصویر سازی
کی جاتی ہے۔

ساٹھ کی دہائی کے بعد یہ مصوری و تصویر
سازی دیواروں سے اٹھ کر کینوس اور کاغذوں
پر بھی دکھائی دینے لگی اور اس مصوری کی تجارت
بھی شروع ہو گئی۔ متھلا مصوری کو زندہ بنائے
رکھنے میں جہاں ایک طرف سیتا دیوی، گنگا
دیوی، آشا دیوی، جمنا دیوی جو مدھوبنی کے
قریب جتوار پور کی رہنے والی ہیں وہیں رانٹی
گاؤں کی شانتی دیوی، کرپوری دیوی، گوداوری
دیوی، ششیکلا دیوی، مہاسندری دیوی
اور شیون پاسوان مشہور فنکار ہیں۔ رانٹی کی
دوسری فنکاروں میں باؤ دیوی، ہیرا دیوی،

ا غالب لین، دربھنگہ (بہار)

بنارسی دہلی

اچھو دیوی وغیرہ ہیں۔ لہیریا گنج اور رانٹی پور میں سبھی کئی فنکار ہیں۔

دیگر ملکوں میں متھلا مصوری کی شناخت کرانے والوں میں آنجہانی للت نرائن مشرا، پٹیل جیکر، اپندر مہارتھی اور بھاسکر کلکرنی وغیرہ نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

آج اس مصوری کے کچھ خاص مرکز ہیں۔ مدھوبنی کے نزدیک ریام، رانٹی، بھوانی پور، جتوار پور، لہیریا گنج ہیں اس کے علاوہ شکری کے نزدیک نرائن پور اور سمری گاؤں۔ ان سبھی جگہوں میں مدھوبنی مصوری کے مرکز فعال ہیں۔ یہ سبھی علاقے متھلا کے تحت آتے ہیں۔ مدھوبنی مصوری کا فن پوری طرح خواتین کا فن ہے۔ ان ہی جگہوں کی کچھ خواتین مصوری کے شعبے میں آج بین اقوامی سطح پر بھی مشہور ہو چکی ہیں۔

جتوار پور کی شریمتی سیتا دیوی کے تصویروں کی دہلی، کلکتہ، ممبئی، اوساکا (جاپان) وغیرہ جگہوں میں نمائش ہو چکی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں انھیں قومی انعام سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ ان تصویروں اور مصوری کی یورپ کے ممالک میں بڑی مانگ ہے۔ رانٹی پور کے ڈگری لال جھا اور ان کی اہلیہ سونی دیوی کی تصویروں کی نمائش جے پور، دہلی اور پٹنہ میں ہو چکی ہے۔ رانٹی گاؤں کی شریمتی شانتی دیوی اور ان کے شوہر شیون پاسوان کو ۱۹۸۶ء میں قومی انعام دیا گیا۔ شریمتی جگدمبا دیوی کو "پدم شری" خطاب اور دیگر قومی انعام سے نوازا جا چکا ہے۔ باؤ دیوی ۱۹۸۷ء کی پہلی قومی انعام حاصل کرنے والی خاتون ہیں۔

مدھے پورہ کی نیلو یادو دہلی میں رہ کر متھلا مصوری کو نئی جہت دینے میں مصروف ہیں۔ جتوار پور کی ۵۵ سالہ ششیکلا دیوی کے آرٹ کا استعمال کئی جگہوں پر بڑی بڑی دیواروں پر کیا گیا ہے۔ دربھنگہ، مدھوبنی ریلوے اسٹیشن پر ان کی مصوری کے نمونے آج بھی موجود ہیں۔

مدھوبنی مصوری کی خوبی

مدھوبنی مصوری کا طریقہ خاصا آسان ہے اس میں فنکار بغیر نشان دہی کے رنگوں کا استعمال کرتے ہیں۔ تصویر سازی کے سامان کے نام پر بانس کی کوچی اور مختلف طرح کے کچھ قدرتی رنگ ہوتے ہیں۔ پہلے تصویر انگلیوں سے رنگی جاتی تھی پھر بانس کی کوچی کا استعمال شروع ہوا۔

تصویر سازی کے لیے قدرتی رنگ ہوتے ہیں۔ مدھوبنی مصوری کے لیے یہ رنگ زیادہ تر نباتات اور کیڑے مکوڑوں سے مقامی طور پر حاصل کیا جاتا ہے جس سے کہ یہ رنگ پکے اور نہیں اڑنے والے ہوتے ہیں۔ جیسے سیم کے پتوں سے ہرا رنگ، ہارسنگھار کے پھول اور کسم کے پھولوں سے نارنگی رنگ، ہلدی سے پیلا رنگ، نیل کے پودوں سے نیلا رنگ، کیسر کے پھولوں سے کیسریا رنگ، لاہ کے کیڑوں سے مہاور رنگ، جامن کے پھل اور چھال سے جامنی رنگ، گیندہ کے پھولوں سے کالی رنگ اور گھونگھے کے پانی سے بیگنی رنگ بنایا جاتا ہے۔

لیکن یہ قدرتی رنگ نایاب، پریشان کن اور کم چمک والے ہونے کی وجہ سے فنکاروں کی پہنچ سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ ساتھ ہی مدھوبنی مصوری کی مانگ بازاروں میں لگاتار بڑھتی جا رہی ہے اور یہ تجارتی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ آج کل مدھوبنی مصوری میں زیادہ تر بازار کا رنگ استعمال ہونے لگا ہے جو زیادہ چمکیلا اور آسانی سے دستیاب ہے۔



باقی صفحہ ۲۸ پر

ہندوستانی معیشت کو درپیش چیلنج

ہندوستان اپنی آزادی کے پچاسویں سال میں داخل ہو رہا ہے۔ اس وقت وہ اقتصادی ترقی اور خوشحالی کے ایک نئے اور جوش آفریں دور کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ ملک میں اقتصادی اصلاحات کا سلسلہ ۱۹۹۱ء میں شروع ہوا تھا اور ان اصلاحات کی بدولت آٹھویں منصوبے کے پہلے چار سالوں میں تقریباً ۵ء۹ فی صد سالانہ کی اقتصادی شرح ترقی حاصل کر لی گئی ہے جو منصوبے میں مقرر کیے گئے ۵ء۹ فی صد سالانہ اقتصادی ترقی کے نشانے سے کافی زیادہ ہے۔ آج ہندوستان کا ادائیگیوں کا توازن بھی تیزی سے بہتر ہوتا جا رہا ہے اور اقتصادی بحران پر قابو پا لیا گیا ہے۔

شعبہ جاتی لاگت کی بنیاد پر جی ڈی پی (اندرون ملک مجموعی پیداوار) کی شرح اضافہ جو ۹۵-۱۹۹۴ء میں بڑھ کر ۳ء۶ فی صد ہو گئی تھی، مزید اضافے کے ساتھ ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۷ فی صد ہو گئی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اس ترقی میں صنعتی خدمات کے شعبے کا ایک بڑا حصہ ہے۔

بڑے چیلنج

تاہم آج ہندوستانی معیشت میں زرعی شعبے کو کچھ بڑے چیلنج درپیش ہیں۔ سال ۹۶-۱۹۹۵ء میں زراعتی شعبے کی شرح ترقی ۲ء۳ فی صد تھی جو اس شعبے کی گزشتہ پانچ سالوں کی ترقی سے کم ہے۔ زرعی پیداوار میں شرح ترقی اور بھی کم (یعنی صرف ۹ء۱ فی صد) رہی ہے اور حکومت اس پر تشویش بھی ظاہر کر چکی ہے۔ زراعتی پیداوار میں کم شرح ترقی کے نتیجے میں خوراک کے سرکاری ذخیروں میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کو ایک بڑا چیلنج قرار دیتے ہوئے سرکار نے بجٹ میں آب پاشی کے شعبے کے مصارف میں مزید ۹ کروڑ روپے کا خطیر اضافہ کرنے کی تجویز شامل کی ہے۔

بجٹ میں کیمیاوی کھادوں، گہری آب پاشی کے نظاموں اور زراعت کی جدید کاری کے لیے جدید آلات کے واسطے سبسڈیوں میں توسیع کی گئی ہے۔ سرکار نے کاشت کاروں کو بروقت اور کافی قرضے دینے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ وسیع البنیاد زراعتی ترقی اور دیہی عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے ان اقدامات کی بڑی اہمیت ہے۔

مالی سیکٹر

ہندوستانی معیشت کو دوسرا بڑا چیلنج مالی سیکٹر میں درپیش ہے اگرچہ افراط زر کی شرح اب کافی نیچے تقریباً ۵ فی صد پر لائی جا چکی ہے تاہم فضول سرکاری اخراجات کو کم کرنے اور صلاحیت کارکردگی کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کفایت شعاری کے متعدد اقدامات کا اعلان کر چکی ہے۔ سرکاری اخراجات پر سخت کنٹرول ہی واحد طریقہ ہے جس سے حقیقی سود کی اونچی شرحوں کو کم کیا جا سکتا ہے اور پیداوار پر زیادہ سرمایہ لگایا جا سکتا ہے۔ مالی خسارہ کو جی ڈی پی کے تقریباً ۵ فی صد تک کی سطح پر رکھنے کے لیے مزید مالیہ حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

بنیادی ڈھانچے کا شعبہ

معیشت کے بنیادی ڈھانچے کے شعبے کو بھی ترقی دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ ہماری مستقبل کی صنعتی پیداوار صلاحیت اور پیداواریت کا انحصار اسی پر ہے۔ بنیادی ڈھانچے کے سرکاری تسلط والے شعبوں خصوصاً بجلی کے شعبے جیسے کلیدی سرکاری شعبوں میں اقتصادی اصلاحات کی سست رفتار کا مجموعی اقتصادی ترقی پر خراب اثر پڑ سکتا ہے ریلوے اور سڑک ٹرانسپورٹ اور بندرگاہوں کی صلاحیت پر بھی دباؤ بڑھ گیا ہے۔

حکومت نے اس چیلنج کا جواب ایک انفراسٹرکچر ڈیولپمنٹ فائننس کمپنی قائم کرنے کی تجویز پیش کر کے دیا ہے، جو اس شعبے کی طویل مدتی مالی ضروریات کو پورا کرے گی۔ اس کمپنی کا منظور شدہ سرمایہ حصص ۵ کروڑ روپے ہو گا۔ ہندوستان کی قومی شاہراہ اتھارٹی کے لیے بھی ۲ کروڑ روپے فراہم کیے گئے ہیں۔

سماجی سیکٹر

ان اقدامات سے ظاہر ہے کہ حکومت نے اقتصادی اصلاحات جاری رکھنے کا عزم کر رکھا ہے۔ غریبی کے خاتمے کے لیے زیادہ محنت کشوں کو روزگار دلانے والی وسیع البنیاد ترقی کے لیے بھی ایک منصوبے کا خاکہ تیار کیا گیا ہے۔ پرائمری تعلیم، صحت کی ابتدائی دیکھ بھال، پینے کے لیے محفوظ پانی کی بہم رسانی، تعمیر مکانات، دیہی سڑکوں کی تعمیر اور سرکاری نظام تقسیم کے لیے ایک سات نکاتی پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ اس میدان میں ریاستی حکومتوں کے پروگراموں کو آگے بڑھانے کے لیے ۲۵۰۰ کروڑ روپے کی ایک اضافی رقم منظور کی گئی ہے۔

خزانے کی وزارت نے بینکوں کے ذریعے عمل میں لائے جا رہے غریبی دور کرنے کے پروگراموں کا جائزہ لیا ہے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ ان پروگراموں کے فائدے حقیقتاً غریبوں تک پہنچیں، ان پروگراموں کی از سر نو تنظیم کی جائے گی۔ اگرچہ ہندوستانی معیشت کو درپیش چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے پہلے مرحلے کے اقدامات کیے جا چکے ہیں، اقتصادی نظم و ضبط

باقی صفحہ ۱۹ پر

سیس رام ولا

کیمیاوی کھادیں۔ سبز انقلاب کی محرک

اغیم کی کھاد کا استعمال مختلف فصلوں کی پیداواری صلاحیت بڑھانے میں معاون ہے اس کی مدد سے خوراکی اجناس کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکتا ہے۔

ملک میں غلہ کی پیداوار میں تدریجی طور پر اضافے کے سلسلے میں کیمیاوی کھادوں کے کھپت میں اضافے سے مدد ملی ہے۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں ملک میں ایک ہیکٹیر اراضی میں اوسطاً ایک کلو گرام سے کم کیمیاوی کھاد استعمال ہوتی تھی لیکن ۹۵-۱۹۹۴ء میں یہ بڑھ کر تقریباً ۷۴ کلوگرام ہو گئی۔ اس طرح ۵۲-۱۹۵۱ء میں ۵ کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن کے کیمیاوی کھاد استعمال میں آتی تھی جو بڑھ کر ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۱۹ کروڑ ۱۰ لاکھ ٹن سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔

ترقی

کیمیاوی کھادوں کی ضرورت کا بڑا حصہ ملک کی کیمیاوی کھادوں کی صنعت پورا کرتی ہے۔ آزادی کے فوراً بعد کیمیاوی کھادوں کی تیاری کے لیے دو کارخانے قائم کیے گئے۔ ایک سندری (بہار) میں اور دوسرا کیرالا میں کوچین کے مقام پر۔ اول الذکر کا نام فرٹیلائزرز کارپوریشن آف انڈیا ہے اور موخرالذکر کا فرٹیلائزرز اینڈ کیمیکلز ٹراونکور لمیٹیڈ۔ اس طرح اس ملک میں صنعت کاری کی بنیاد پڑی اور ملک کو خوراکی اجناس میں خودکفیل ہونے میں مدد ملی۔ ۱۹۶۰ء کے دہے کے آخری برسوں میں ملک میں سبز انقلاب آنے سے کیمیاوی کھادوں کی صنعت کو فروغ ملا اور ۱۹۸۰ء کے بعد کے عرصے میں ملک میں کیمیاوی کھادوں کی تیاری کی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔

ہندوستان میں کیمیاوی کھادوں کی تیاری کی نصب شدہ صلاحیت ۹۳٫۰۷ لاکھ ٹن نائٹروجنی اور ۲۸٫۲۲ لاکھ ٹن فاسفیٹی کھاد تک پہنچ گئی ہے۔ اب ہندوستان کا شمار دنیا میں کیمیاوی کھاد پیدا کرنے والے تیسرے سب سے بڑے ملک کے طور پر ہوتا ہے۔ امید ہے کہ ہندوستان میں ۹۷-۱۹۹۶ء کے آخر تک ۱۰۰٫۰۸ لاکھ ٹن نائٹروجنی کھاد اور ۳۱٫۱۳ لاکھ ٹن فاسفیٹی کھاد تیار ہونے لگے گی۔

ملک میں کیمیاوی کھادوں کی تیاری اور استعمال بڑھانے میں جس اسکیم نے سب سے زیادہ اثر دکھایا، وہ ہے قیمتوں کی برقراری اور سب سڈی کی اسکیم جسے ۱۹۷۷ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ کیمیاوی کھادوں کی قیمتوں کے بڑھنے سے کسان متاثر نہ ہوں اور اس سے کھاد کے استعمال پر اثر نہ پڑے۔ کیوں کہ کیمیاوی کھادوں کا بڑھا ہوا استعمال سبز انقلاب لانے میں کلیدی رول ادا کرتا رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ اندرون ملک کھادوں کی تیاری کے سلسلے میں کی جانے والی سرمایہ کاری پر معقول نفع حاصل ہو اور اس شعبے میں مزید سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ہو۔ اس کے ذریعے پیداوار بڑھی اور اس کھاد کا استعمال بھی بڑھا اور اس کے سہارے اناج کی پیداوار میں اضافے کا عمل جاری رہا۔ سرکار نے سب سڈی کی صورت میں ۹۶-۱۹۹۵ء میں اس اسکیم کے تحت ۶ ہزار کروڑ روپے ادا کیے۔

کیمیاوی کھادوں کی پیداوار کی صلاحیت میں اضافہ

اس وقت ملک میں ۵۹ بڑے سائز کے فرٹیلائزر کارخانے میں جو مختلف طرح کے نائٹروجنی اور فاسفیٹی کھاد تیار کرنے والے کارخانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۳۴ کارخانے یوریا تیار کرتے ہیں جب کہ ۹ کارخانے امونیم سلفیٹ تیار کرتے ہیں یہ ایک ذیلی پیداوار کی صورت میں تیار کیا جاتا ہے۔ تقریباً چھوٹے اور بڑے پیمانے کے ۸۰ یونٹ ان کے علاوہ ہیں جو سنگل سپر فاسفیٹ تیار کرتے ہیں۔

فاسفیٹ کے معاملے میں اندرون ملک خام مال کی کمی ہے، اس لیے اس میں خودکفیل بننے میں دشواری آرہی ہے۔ اس کے لیے تین متبادل راستے سوچے گئے ہیں۔ اندرون ملک پیداوار جو دیسی خام مال اور درآمد شدہ راک فاسفیٹ پر مبنی ہو، اس کے لیے درآمد شدہ گندھک بھی استعمال ہوتا ہے۔ اندرون ملک پیداوار جو نیم مصنوعہ مال باہر سے منگائے یعنی امونیا اور فاسفیٹی تیزاب اور تیار کیمیاوی کھاد جس کے تحت ڈی امونیم فاسفیٹ باہر سے منگائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی مونو امونیم فاسفیٹ بھی باہر سے آتا ہے اور نائٹروجنی فاسفیٹ پوٹاش بھی۔

پیداوار

۹۶-۱۹۹۵ء میں پیداوار کا نشانہ ۱۱۳ لاکھ ٹن کیمیاوی کھاد کا تھا مگر اس عرصے میں پیداوار

۱۱۳ر۳۵ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی گویا کہ حقیقی مقررہ نشانے سے اعتبار یہ تین فی صد زیادہ ۔ نائٹروجن کی پیداوار ۹۵-۱۹۹۴ء کے مقابلے میں ۱ر۵ فی صد بڑھ گئی اور فاسفیٹ کی ۲ر۶ فی صد تک ۔

صلاحیت کا استعمال

اس عرصے میں صلاحیت سے بھرپور کام لینے پر زیادہ زور رہا اور اس محاذ پر کامیابی دیکھنے کو ملی ۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں نائٹروجنی کھاد کی تیاری کے لیے صلاحیت کا ۲ر۹۱ فی صد اور فاسفیٹی کھاد کے لیے صلاحیت کا ۳ر۸۸ فی صد استعمال کیا گیا ۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں اس میں مزید اضافہ ہوا اور نائٹروجنی کھاد کے لیے ۹ر۹۶ فی صد اور فاسفیٹی کھاد کے لیے ۷ر۹۰ فی صد تک پہنچ گیا ۔ اس میں مزید اضافے کے امکانات ہیں کیوں کہ جدید ترین پلانٹ ثابت شدہ تکنالوجی کی بنیاد پر لگائے جا رہے ہیں ۔

پیداوار بڑھانے کے لیے مستقبل کی حکمت عملی

۲۴ جولائی ۱۹۹۱ء کو صنعتی پالیسی کے بارے میں جو بیان جاری کیا گیا ، اس کے مطابق فرٹیلائزر پلانٹ لگانے کے لیے کسی قسم کے صنعتی لائسنس کی ضرورت نہیں ہے ۔

کیمیاوی کھادوں کے محکمے کی زیر نگرانی پبلک سیکٹر ، کوآپریٹو سیکٹر کے کارخانے پیداوار بڑھانے کے لیے تدابیر کر رہے ہیں ، اس سلسلے کے کاموں میں کارخانوں کی توسیع اور ان کی جدید کاری کے لیے کوششیں جاری ہیں ۔ قدرتی گیس کی فراہمی میں درپیش دشواریوں کو دور کرنے کے لیے نفت پر مبنی کیمیاوی کھادوں کے پلانٹ لگائے جا رہے ہیں ۔ ایسے کارخانے بھی ہیں جہاں ہر دو طرح کے ایندھنوں سے کام لیا جا رہا ہے ۔ موجودہ پلانٹوں میں ایندھنوں کی ذخیرہ بندی کے انتظامات کیے جا رہے ہیں ، جن ملکوں میں خام مال وافر اور سستا ہے ، وہاں مشترکہ پروجیکٹ چلائے جا رہے ہیں ۔

اس حکمت عملی کو سامنے رکھ کر بہت سے ایسے پروجیکٹ شروع کیے جا رہے ہیں جن کی لاگت کا اندازہ ۷۶۵۹ کروڑ روپے ہے ۔ جب یہ پروجیکٹ چالو ہو جائیں گے تو ان سے ۱۴ر۶۳ لاکھ ایم ٹی ٹی اے یوریا اور ۱۴ر۸ لاکھ ایم ٹی پی اے این پی کے فرٹیلائزر ملنے لگے گا ۔ ایسے بہت سے پروجیکٹ زیر غور ہیں جن کی سرمایہ کاری کی لاگت کا اندازہ ۵۶۸۲۵ کروڑ روپے ہے ۔ پبلک انویسٹمنٹ بورڈ کے طریق کار کے تحت یہ سرکار کی منظوری کا انتظار کر رہے ہیں ۔

ملک میں کیمیاوی کھادوں کی تیاری کے سلسلے میں نجی سیکٹر نے اہم رول ادا کیا ہے ۔ ملک میں نائٹروجنی کھاد تیار کرنے کی جس قدر صلاحیت موجود ہے ، اس میں سے ۱۲ر۳۹ فی صد پرائیویٹ سیکٹر میں ہے ، اسی طرح فاسفیٹی کھاد تیار کرنے کی جس قدر صلاحیت ہے اس کا ۶۱ فی صد حصہ پرائیویٹ سیکٹر میں ہی ہے ۔ ملک میں نجی کمپنیاں امونیا ۔ یوریا پلانٹ لگانے کے بارے میں سوچ رہی ہیں ۔ ان پروجیکٹوں پر ۷۶ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کا اندازہ ہے ۔

توقع ہے کہ ان پروجیکٹوں پر عمل درآمد کے بعد ملک کو باہر سے نائٹروجنی کھاد منگانے کی ضرورت نہ رہے گی ۔

کیمیاوی کھادوں کا کسانوں تک پہنچانا

۹۳-۱۹۹۲ء میں پوٹاش اور فاسفیٹی فرٹیلائزر پر سے کنٹرول ہٹا لینے کے بعد ان کیمیاوی کھادوں کی قیمتوں کے فرق بڑھے اور یوریا کی قیمتیں بڑھ گئیں ، لہٰذا سرکار نے خصوصی رعایت کی ایک اسکیم چلائی جس کا تعلق کنٹرول ہٹائے گئے فرٹیلائزروں کی فروخت سے تھا اس کا مقصد بڑھی ہوئی قیمتوں سے کسانوں کو راحت دلانا تھا ۔ فرٹیلائزر پر سے کنٹرول ہٹا لیے جانے کے بعد ان کی قیمتوں میں اضافے کے سبب ان کا استعمال کم ہونے لگا تھا مگر اس رعایتی اسکیم سے یہ استعمال پھر بڑھ گیا ۔ البتہ روپے کی قدر زر کم ہونے سے نیم مصنوعہ مال کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا اور اس وجہ سے یہ رعایتی اسکیم بھی اپنے مفید اثرات خاطر خواہ نہ دکھا سکی ۔

فاسفیٹی اور پوٹاش کیمیاوی کھادوں کی کھپت میں گزشتہ دو برسوں سے کوئی اضافہ دیکھنے کو نہیں ملا ۔ ۵ جولائی ۱۹۹۶ء کو سرکار نے پالیسی سے متعلق ایک نیا قدم اٹھایا اور خصوصی رعایت کا پیمانہ اور اس کا دائرہ کافی بڑھا دیا تاکہ یہ جمود دور ہو سکے اور زمین کو تقویت دینے والے اجزا کا توازن درست ہو سکے کیوں کہ ایسا کرنا زرعی پیداواری صلاحیت بڑھانے کے لیے بے حد ضروری ہے ۔

اس نئی اضافہ شدہ اسکیم کے تحت درآمد شدہ پوٹاش کھاد پر ۱۵۰ روپے فی ٹن رعایت دی جاتی ہے ۔ ڈی اے پی منگانے پر تین ہزار روپے فی ٹن اور فرٹیلائزروں کے دیسی کمپلکسوں کے لیے بھی اسی قدر رعایت دی جاتی ہے ۔ سنگل سپر فاسفیٹ پر رعایت ۵۰۰ روپے فی ٹن ہے ۔ ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران فاسفیٹی فرٹیلائزر تیار کرنے والوں اور پوٹاش باہر سے منگانے والوں کو ۵۱۴ کروڑ ۲ لاکھ روپے دیے گئے ۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۵۰۰ کروڑ روپے دینے کا پروگرام ہے مگر یہ رقم بڑھا کر ۹۷-۱۹۹۶ء میں ۱۷۲۴ کروڑ روپے کر دی جائے گی ۔ اشیائے ضروری کی فراہمی کے قانون کے تحت محکمہ فرٹیلائزر نے ایک جامع قسم کا نظام وضع کیا ہے تاکہ یہ کھاد ملک کے کونے کونے میں کسانوں تک یقینی طور پر پہنچایا جا سکے ۔ اس سلسلے میں محکمہ ہٰذا ریاستی انتظامیہ ، صنعت ، ریلوے ، سڑکوں کے ذریعے نقل و حمل کے نظام وغیرہ سے تال میل بنائے رکھتا ہے تاکہ مال تیار کرنے والے کارخانے سے مال سپلائی کرنے والے اور گودیوں وغیرہ تک یہ کھاد بہ آسانی بھیجا جا سکے ۔

کیمیاوی کھادوں کی نقل و حمل میں ریلوں کا بڑا حصہ ہے ۔ اس میں بڑی مقدار میں اضافہ دیکھنے کو ملا ہے ۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں ریلوے کے ذریعے - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - ۱۶۰ لاکھ ٹن کیمیاوی کھادوں کا لدان ہوا جو بڑھ کر ۹۶-۱۹۹۵ء تک دو کروڑ ۳۲ لاکھ ٹن تک پہنچ گیا ۔ کیمیاوی کھادوں کی صنعت نے ریلوے کے ذمہ داروں سے کہا ہے کہ وہ کیمیاوی کھادوں کے نقل و حمل کے لیے زیادہ ویگن اور انجن وغیرہ لگائیں ۔ اس سلسلے میں بہت سی کمپنیوں مثلاً افکو ، KRIBHCO ، NFL اور IFFCO وغیرہ نے اپنا ویگن اپ رکھنے کی اسکیم میں حصہ لینے پر آمادگی ظاہر کی ہے ۔ اس طرح ریلوے کی کوششوں میں بڑی مدد ملے گی اور ریلوے ویگنوں کو بہ آسانی فراہم کر سکے گا ۔

سرکاری اور نجی سیکٹر کی مدد سے بودیوں پر مال کے اتارنے چڑھانے کی سہولتوں میں اضافہ کی

باقی صفحہ ۱۹ پر

پینے کے پانی کا قومی مشن

پانی زندگی کو باقی رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہزارہا سال پہلے ایک ہندوستانی فلاسفر نے "پانی کو خدا" کہا تھا۔ زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی سے ڈھکا ہے لیکن اس کا بہت تھوڑا سا حصہ انسانی استعمال کے لیے موزوں ہے۔ ترقی پذیر دنیا میں جو آبادی پانی سے محروم تھی، اس کے بڑے حصے کو پانی کی سپلائی کا انتظام فراہم کیا جا چکا ہے لیکن پھر بھی آبادی کے بڑے حصے کو ابھی بھی پانی کی فراہمی کو یقینی بنانا ہے۔

ہندوستان میں دیہات میں پانی کی سپلائی کے کام میں بڑے پیمانے پر ترقی دیکھنے کو ملی ہے لیکن اب بھی دیہات میں رہنے والی تین فی صد آبادی جو تقریباً ۲۷ ہزار آبادیوں پر مشتمل ہے، پانی سے محروم ہے۔ سرکار کا عزم یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۹۷ء کو ملک کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ منائی جائے گی۔

پینے کے پانی کا قومی مشن

۱۹۸۶ء میں پینے کے پانی کا قومی مشن قائم کیا گیا تاکہ پینے کے پانی کی سپلائی اور صفائی کے بین اقوامی دہے کے مقرر کردہ نشانوں کو پورا کیا جا سکے۔ اس مشن کے ذمے یہ کام تھا کہ پانی کی سپلائی اور صفائی کے پروگرام کو وقت مقررہ کے اندر پورا کرا لیا جائے۔ یہ کام اس سلسلے کی موزوں تکنالوجی کی مدد سے انجام پانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اجتماعی طور پر سب کا اشتراک عمل بھی ضروری سمجھا گیا تاکہ یہ پروگرام کامیاب ہو سکے۔

سرکار نے بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک کم سے کم مشترک پروگرام بنایا جس میں پینے کے صاف پانی کی فراہمی کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ دیہات کی تمام آبادی جس کو پانی کی فراہمی کے نظام سے استفادے کا موقع نہیں ملا ہے یا پھر کم موقع ملا ہے، اسے اس صدی کے آخر تک پینے کے پانی کی فراہمی کو یقینی بنا دیا جائے گا۔ ان برسوں میں زرعی شعبے میں پانی کی کافی مانگ بڑھی ہے اور اس کے ساتھ ہی صنعتوں کے لیے بڑی تعداد میں پانی دیا گیا جس کی وجہ سے زیر زمین پانی کی سطح کم ہوتی چلی گئی۔ ملک کے کم سے کم ۱۴۴ اضلاع ایسے ہیں جہاں پانی کے کثرت استعمال سے پانی کی سطح کم ہوتی جا رہی ہے۔ پینے کے پانی کے مشن نے اس بھیانک صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے زیر زمین پانی کے تحفظ اور زمین اس کے ذخائر کو بڑھانے کے لیے ایک بڑا پروگرام شروع کیا ہے۔

تکنیکی ترقی

پینے کے پانی کے پروگرام کی ایک بڑی کامیابی یہ ہے کہ ۲۶ لاکھ سے زیادہ ہینڈ پمپ چالو کر دیے گئے ہیں اور پائپ کے ذریعے پانی کی سپلائی کا ایک بڑا انتظام چالو کیا جا چکا ہے۔ اس سلسلے میں مارک ۱۱ اور مارک ۱۱۱ کے نام سے پکارے جانے والے ہینڈ پمپ وضع کیے گئے۔ ان کے علاوہ صارفین کے لیے اور بھی بہت سے کارآمد پمپ بھی شروع کیے گئے۔ یہ پمپ ۴۰ سے زیادہ ملکوں کو برآمد کیے جا رہے ہیں۔ اسی تکنالوجی سے سائنسی انداز پر وسائل کی دریافت ہو سکی ہے۔ سٹیلائٹ کے ذریعے ٹوپوگرافی اور ارضیاتی سروے کی مدد سے پانی کی وافر مقدار والی جگہوں کی نشاندہی کی جا چکی ہے اور مختلف مقامات پر کنوؤں کی بورنگ کا تناسب ۴۶ فی صد سے بڑھ کر ۹۴ فی صد تک پہنچ گیا ہے۔ ہندوستان میں کنوؤں کو بنانے والے رگس (برمے) تیار کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی گئی ہے اور لوہا ہٹانے والے پلانٹ اور فلورین ہٹانے والے پلانٹ بھی ملک میں تیار ہونے لگے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی پانی کے نظام سے روایتی انداز پر فائدہ اٹھانے کے طریقوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر راجستھان میں ایک وقت میں ڈھکے ہوئے زیر زمین تالاب بنانے کی روایت تھی جس میں برسات کا پانی جمع کر لیا جاتا تھا اور پھر اس کو ان مہینوں میں کام میں لایا جاتا جب کہ پانی کی قلت ہوتی۔ بارش کا پانی چھتوں پر جمع کر لیا جاتا تھا لیکن یہ روایتی طریقے اب کام میں لائے نہیں جا رہے۔ ان آزمائے ہوئے طریقوں کو دوبارہ شروع کرنا ہے۔ ان کو جدید تکنالوجیوں سے آراستہ کرنا ہے تاکہ پانی کی ہر بوند سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

معیاری پانی کا تحفظ

سرکار پانی کے معیار پر توجہ دے رہی ہے اور فلورائیڈ، آرسینک اور لوہے کی پانی میں ملاوٹ کے سبب پڑنے والے اثرات کا جائزہ لے رہی ہے۔ ملک کے ۱۲ اضلاع میں پانی میں فلورائیڈ کا مسئلہ ہے۔ مغربی بنگال میں آرسینک کا مسئلہ ہے۔ ان دونوں

باقی صفحہ ۳۰ پر

ارناکلم میں شیر خوار بچوں کی بہبود

ریاست کیرالا کا ضلع ارناکلم ایک بار پھر دنیا کی توجہ کا مرکز بننا چاہتا ہے۔ یہ ضلع شرح خواندگی میں ۱۰۰ فی صد تناسب حاصل کر لینے کے بعد ملک کا وہ ضلع بننے والا ہے جو شیر خوار بچوں کے لیے ایک دوست ضلع کی حیثیت سے نمایاں ہوگا اور اس لحاظ سے اسی نوعیت کا اولین ضلع ہوگا۔ اس سے قبل اسی سال اپریل میں کوچین کو شیر خوار بچوں کے دوست کی حیثیت سے پہلے ہی یہ مقام مل چکا ہے۔

شیر خوار بچوں کے دوست کی اصطلاح کی وضاحت یہ ہے کہ بچوں کے لیے ماں کا دودھ ایک قدرتی اور مثالی خوراک کے طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اس سے بچوں کی صحت کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے اور جذباتی اور نفسیاتی بنیادوں پر بچوں کے اپنی ماں سے رشتے استوار ہوتے ہیں۔ ماں کے دودھ میں ایسے عناصر ہوتے ہیں جو بچوں کو جراثیم اور انفیکشن سے بچاتے ہیں اور وہ بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

بچے اگر اپنی ماں کا دودھ پئیں تو اس کے اور بہت فائدے ہیں مثلاً بچوں کی پیدائش کے درمیان وقفہ بنا رہتا ہے ماں کی صحت اور بھلائی اسی عمل میں پوشیدہ ہے بلکہ یوں کہیے کہ کنبہ کے ارکان کی صحت اور قومی نظام معیشت پر اس کے اچھے اثرات وضع ہوتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ماں کے دودھ کے فائدوں کے بارے میں عوامی شعور اس قدر نہیں جاگ سکا جس قدر کہ بازاروں میں فروخت ہونے والے اس دودھ کے بارے میں لوگ جانتے ہیں۔ جو ماں کے دودھ کے بدل کے طور پر دستیاب ہے۔ اس سے متعلق دیگر مصنوعات کے بارے میں بھی لوگوں کی معلومات ماں کے دودھ کے فائدوں کے مقابلے زیادہ ہیں۔ اس لیے ماں کا دودھ پلانے کے فائدوں پر توجہ کم ہے۔

کوچین میں ایک ایسی ایسوسی ایشن بنائی گئی ہے جو ضلع کے سبھی اسپتالوں میں ایک نیا پروجیکٹ چلا رہی ہے۔ اس پروجیکٹ کا نام ہے "ہمارا ایک سپنا ہے" اس کے ذریعے اسپتالوں کے توسط سے ماں کے دودھ کے فائدوں کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔ اس ایسوسی ایشن کے سکریٹری ڈاکٹر ابراہیم نے بتایا کہ اس ضلع میں صحت کو بہتر بنانے سے متعلق سہولیات بہت اچھی ہیں اور ریاست کے تمام اضلاع کے مقابلے میں یہاں شرح پیدائش سب سے کم ہے۔ بچوں کی شرح اموات بھی سب سے کم ہے۔ یہی وہ محرکات تھے جن کے باعث اس ضلع میں اس مہم کا آغاز کرنے کے لیے حوصلہ ملا۔ انھوں نے مزید کہا کہ چونکہ ریاست میں کنبہ بندی کے طریقے عام طور پر سبھی نے اپنائے ہیں اور چھوٹے کنبے کا تصور بھی عام ہو چلا ہے، اس لیے ہر حمل بہت قیمتی ہے۔ تقریباً سبھی بچے اسپتالوں میں جنم لیتے ہیں، اس لیے شیر مادر کے فائدوں کو اسپتالوں کے ذریعے عوام تک پہنچانے کی مہم شروع کی گئی۔ اس طرح یہ تحریک ضلع میں موثر کردار ادا کرے گی۔ ایسوسی ایشن کی ایگزیکیٹو کمیٹی نے کوچین میں ۱۹۹۴ء میں پروجیکٹ شروع کیا اور اس سلسلے میں ایک عملی منصوبہ وضع کیا گیا اور ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں بچوں کے امراض کے ماہر معالجین، زچہ بچہ کے کام سے وابستہ عملے اور سینئر نرسوں کو شامل کیا گیا۔ یونیسیف نے اس سلسلے میں فنڈ لیے گئے اور رہنمائی کی۔ اور اس ادارے نے بخوشی اس سلسلے میں رہنمایانہ کردار ادا کیا۔ کوچین میں پروجیکٹ شروع کرنے سے قبل منتخبہ اسپتالوں میں ایک مطالعہ شروع کیا گیا اور یہ پتا لگایا گیا کہ ماؤں کے ذریعے اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے بارے میں صحیح صورت حال کیا ہے۔ اس مطالعے کی روشنی میں پتا چلا کہ ۷ فی صد بچے صرف چھ ہفتے تک اپنی ماں کا دودھ پیتے ہیں، ۵ فی صد بچے دس ہفتوں تک، ۲۰ فی صد بچے ۱۴ ہفتوں تک اور ۲ فی صد بچے ۱۸ ہفتوں تک ماں کا دودھ پیتے ہیں زیادہ تر مائیں گائے کے دودھ میں پانی ملا کر اور تیار شدہ پاؤڈر کو بوتل کے ذریعہ بچوں کو پلانے لگتی ہیں۔ بچوں میں دستوں کی بیماری اور کان کے انفیکشن کی بیماریاں جنم لیتی ہیں، البتہ جو بچے اپنی ماں کا دودھ کافی عرصے تک پیتے ہیں وہ ان بیماریوں سے دور رہتے ہیں۔

کامیابی کی طرف قدم

ضلع کے ۳۱۰ اسپتالوں میں سے ۱۰۹ اسپتال سرکاری ہیں اور ۲۰۱ غیر سرکاری ہیں ان میں سے ۹۵ میں زچہ بچہ کی نگہداشت کی سہولت موجود ہے۔ ان اسپتالوں میں شیر مادر کے فائدوں کو اجاگر کرنے کے لیے دس اقدامات پر مشتمل ایک جامع پروگرام وضع کیا گیا۔ سب سے پہلے ہر اسپتال میں بچوں کے علاج کے ماہر ایک ڈاکٹر کے لیے، زچہ بچہ کے کام سے وابستہ ایک ڈاکٹر کے لیے اور ایک نرس کے لیے اس سلسلے کا تجدیدی پروگرام شروع کیا گیا۔ پروجیکٹ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا اور اس گروپ کو

باقی صفحہ ۴۲ پر

شری ٹی۔ جی۔ وینکٹ رمن

سڑکیں ترقی کی جانب ایک سفر

ملک کی اقتصادی ترقی کے سلسلے میں بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے معیاری سڑکوں کا جال ایک بنیادی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں ۲۱ لاکھ کلومیٹر پر سڑکوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے ۳۴ ہزار کلومیٹر فاصلے پر شاہراہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں جس قدر فاصلے پر سڑکیں تعمیر ہیں، ان کا ۲ فی صد حصہ ایسا ہے جس پر شاہراہیں تعمیر کی گئی ہیں۔ لیکن انھیں شاہراہوں کے ذریعہ ملک میں سڑکوں کے ذریعے ٹریفک کا ۴۰ فی صد بوجھ ڈھویا جاتا ہے — شاہراہوں کے ۳۴ ہزار کلومیٹر فاصلے سے صرف ۵ فی صد سڑکیں ایسی ہیں جہاں ٹریفک ۴ قطاروں میں چلتا ہے اور ۸۰ فی صد وہ ہے جہاں یہ دو قطار میں چلتا ہے اور ۱۵ فی صد صرف ایک قطار میں چلتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سڑکوں کی موجودہ صلاحیت کو بڑھانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

مالی اخراجات

آٹھویں منصوبے میں ٹرانسپورٹ کے شعبے کے لیے منصوبے کے کل مصارف کا صرف ۱۳ فی صد حصہ ہی مختص کیا گیا اور اس میں سے سڑکوں کی تعمیر کے لیے صرف تین فی صد حصہ مخصوص رہا۔ اس میں سے بھی شاہراہوں کے لیے صرف ۰.۵۸ فی صد حصہ مختص کیا جاسکا۔ نویں منصوبے میں سینٹرل سیکٹر میں سڑکوں کی تعمیر کے لیے کل اخراجات ۳۱۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے جو قطعی ناکافی ہیں۔ قومی شاہراہوں کی کمیوں کو دور کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری درکار ہے۔ ۱۹۹۶ء کی قیمت کی بنیاد پر اس سرمایہ کاری کا اندازہ ۷۰ ہزار کروڑ روپیہ ہے۔ ریاستی شاہراہوں پر بھی کمیوں کو دور کرنے کے لیے اس قدر رقم درکار ہوگی۔

مرکزی سرکار نے بنیادی سہولت کے لیے رقومات کی ضرورت اور خاص کر سڑکوں کی تعمیر کے لیے رقم کی ضرورت کا احساس کیا ہے۔ اس لیے بجٹ میں سے اب تک سڑکوں کی تعمیر اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لیے مجموعی گھریلو پیداوار کا ساڑھے تین فی صد سے لے کر چار فی صد تک مختص کیا جاتا رہا ہے مگر اب یہ رقم بڑھا کر ۶ فی صد تک کرنے کی تجویز ہے۔ نویں پنج سالہ منصوبے میں زیادہ زور اس بات پر ہوگا کہ ایسی قومی شاہراہوں کی صلاحیت بڑھا دی جائے جن پر ٹریفک زیادہ ہے اور جن کی تعمیر سے سماج کے کمزور طبقات کو فائدہ پہنچے گا اس سلسلے میں نئے پلوں کی تعمیر کا کام فوقیت پائے گا۔

نجی سیکٹر کی شرکت

حالیہ برسوں میں رقومات کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایسی کوششیں کی گئی ہیں جن سے سرمایہ کاری بڑھے اور سڑکوں کی تعمیر کے لیے بجٹ کے علاوہ دیگر وسائل سے بھی رقم لی جائے۔ سال گزشتہ نیشنل ہائی ویز ایکٹ ۱۹۵۶ء میں ترمیم کی گئی اور سرکار کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ قومی شاہراہوں کی ترقی کے لیے نجی سیکٹر کے ساتھ معاہدے کرے اور سڑک استعمال کرنے والوں سے حاصل شدہ فیس سے سرمایہ کاری پر مناسب فائدے حاصل کیے جائیں چنانچہ اس سلسلے میں سرمایہ کاری کرنے والوں کو رعایتیں دی گئیں تاکہ وہ اپنی لگائی ہوئی رقم واپس لے سکیں۔ انفرادی پروجیکٹوں کے لیے سرکار کو اس سلسلے میں مدت اور شرحوں کے تعین کا اختیار دیا گیا۔

اس سیکٹر میں نجی سرمایہ کاری کو دلکش بنانے کے لیے بہت سی رعایتیں دی گئیں۔ سال گزشتہ بنیادی ڈھانچہ پر سرمایہ کاری سے ہونے والی آمدنی پر ٹیکسوں کو پانچ سال تک نہ لیے جانے کی رعایت کا اعلان کیا گیا۔ پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے بارہ سال کی مدت کے دوران اس آمدنی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اس طرح کے پروجیکٹوں میں سرمایہ کاری سے ہونے والی آمدنی میں سے ۴۰ فی صد رقم منہا کرنے کی اجازت دی گئی بشرطیکہ رقم اس فنڈ میں ڈالی جائے جو اس کام اور اس تعمیر کے تحت قائم کی گئی ہے۔

وزیر مالیات نے ۹۷-۱۹۹۶ء کے بجٹ پر بنیادی سہولتوں کو فروغ دینے والی مالیاتی کمپنی کے قیام کی تجویز پیش کی ہے۔ اس کا مجاز حصص سرمایہ ۵ ہزار کروڑ روپے ہوگا۔ اس میں مرکزی سرکار، ریزرو بینک آف انڈیا، بینک اور مالیاتی ادارے حصہ لیں گے۔ اس فنڈ میں سال رواں میں ۵۰۰ کروڑ روپے مرکزی سرکار نے اپنے بجٹ میں رکھے ہیں۔ ریزرو بینک آف انڈیا ابتدا میں اس میں ۵۰۰ روپے حصص سرمایہ کے

طور پر دے گا۔ بنیادی ڈھانچے سے متعلق ترقیاتی مالیاتی کارپوریشن اس میں براہ راست مالی ضمانت دینے والے اور از سر نو مالیات فراہم کرنے والے ادارے کے طور پر حصہ لے گی۔

نیشنل ہائی وے اتھارٹی

قومی شاہراہوں کی ترقی سے متعلق ادارہ ۱۹۸۸ء میں پارلیمنٹ کے قانون کے ذریعے قائم کیا گیا۔ اس قانون کا نام نیشنل ہائی وے اتھارٹی آف انڈیا ایکٹ ہے اس ادارے نے ۱۹۹۵ء میں کام شروع کیا۔ اس کے لیے پورے وقت کام کرنے والا چیئرمین اور ارکان مقرر کیے گئے۔ اس وقت قومی شاہراہوں کی ترقی اور فروغ کا کام ریاستی سرکاریں مرکزی سرکار کی ایجنسی کے طور پر انجام دے رہی ہیں۔ یہ اتھارٹی رفتہ رفتہ قومی شاہراہوں کے پروجیکٹوں کی تعمیر اور ان پر عمل درآمد کی ذمہ داری سنبھالے گی اور تعمیر کے سلسلے میں جدید تکنیک کا استعمال کرے گی۔

یہ اتھارٹی تجارتی بنیادوں پر کام کرے گی۔ ایکٹ کی مدد سے اسے وسائل جٹانے کا اختیار حاصل ہے جن سے سڑکوں کی تعمیر اور مرمت کی جا سکے۔ اس اتھارٹی کے لیے بنیادی سرمایہ کے طور پر رواں سال کے بجٹ میں ۲۰۰ کروڑ روپے فراہم کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ اتھارٹی انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انوسمنٹ کارپوریشن آف انڈیا لیمیٹیڈ جیسے اداروں کے ساتھ معاہدے کرے گی ان کے علاوہ بنیادی سہولتوں کے نظام کو پرائیویٹ بنیادوں پر چلانے اور اس کے لیے سرمایہ کاری فراہم کرنے والی خدمات جیسی تنظیموں اور ہڈکو (ہاؤسنگ اینڈ اربن ڈیولپمنٹ کارپوریشن آف انڈیا) کے ساتھ بھی سڑک کی تعمیر کے پروجیکٹ کو بڑھاوا دے گی۔

سردست مرکزی سرکار نے آندھرا پردیش، بہار، ہریانہ، راجستھان اور مغربی بنگال میں ایشیائی ترقیاتی بینک کی امداد سے چلنے والے پروجیکٹوں پر عمل درآمد کی ذمہ داری اسی اتھارٹی کو سونپی ہے۔ اس کے علاوہ سڑکوں کے کنارے دیگر سہولتوں کی فراہمی اور نجی سرمایہ کاری کو بڑھاوا دینے کی اسکیموں پر عمل درآمد کی ذمہ داری بھی اس کی ہے۔

ٹریفک کی وسط مدتی اور مختصر مدتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دو قطاروں والی نیشنل ہائی وے سیکشنوں کو مضبوط بنانے اور ان کو مزید چوڑا کرنے کے کام کو سرکار ترجیح دے رہی ہے۔ اس کے لیے بجٹ، عالمی بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک وغیرہ سے فراہم کی جا رہی ہیں۔ نویں منصوبے میں ایسی سڑکوں کو جہاں صرف ایک ہی قطار والا ٹریفک چلتا ہے، دو قطاروں والی سڑکوں میں بدلا جائے گا جہاں یومیہ کاروں کے چلنے کا اوسط ۲۵۰۰ سے زیادہ ہوگا۔ دو قطاروں والی شاہراہوں کو چار قطاروں والی شاہراہوں میں بدلنے کے لیے ایسے سات ہزار کلومیٹر فاصلے پر کام ہوگا جہاں وہیکل ٹریفک کا یومیہ اوسط ۲۵ ہزار کاروں سے زیادہ ہوگا۔

فوری عملی پلان

بڑے سائز کے سڑکوں کے پروجیکٹ پر عمل درآمد کو التوا میں ڈالتے ہوئے چھوٹے متوسط سائز کے پروجیکٹوں کو اولیت دی جائے گی۔ مثلاً یہ کہ پلوں کی تعمیر، بائی پاس (ضمنی راستوں) کی تعمیر، ریلوں کے اوپر پلوں کی تعمیر، یہ کام بھی سرمایہ کاروں کو سونپے گئے ہیں۔ اس نظام کا نام (بلڈ۔ آپریٹ۔ ٹرانسفر) یا بی۔او۔ٹی رکھا گیا ہے رواں سال میں اس نظام کے تحت بہت سے پروجیکٹوں کی تعمیر شروع ہوگی۔ نویں منصوبے میں یہ کام اور آگے بڑھے گا۔

درگ بائی پاس، راجستھان میں چھ ریل جو ریل کے اوپر سے گزریں گے، مراد آباد بائی پاس، کوئمبٹور بائی پاس، نیلور بائی پاس، امراوتی بائی پاس، نرمدا پل گجرات اور روپ نارائن برج مغربی بنگال کی تعمیر کا آغاز ہو چکا ہے۔ مہاراشٹر میں ستھانہ، بھیونڈی بائی پاس، گجرات میں ریل پل پر جلیبن روڈ اور راجستھان میں اودے پور بائی پاس کی تعمیر کے سلسلے میں معاہدوں پر دستخط کیے جا چکے ہیں۔

مستقبل کی حکمت عملی

سڑکوں کی ترقی کا مستقبل اس پر منحصر ہے کہ منڈی سے اس کے لیے کس قدر رقومات حاصل کی جا سکتی ہیں اور بجٹ میں اس سلسلے کی رقومات میں کتنا اضافہ کیا جا سکتا ہے اور سڑکوں کی تعمیر میں جدید تکنیک کو کس قدر استعمال کیا جا سکتا ہے، جس سے کہ جلد سے جلد ضرورت کی سڑکیں تعمیر کی جا سکیں۔

اس سلسلے میں ٹول ٹیکس کا ایسا نظام درکار ہے جو مستقل بنیادوں پر چلے، خاص کر ایسی سڑکوں پر جہاں دو قطار والی اور چار قطار والی سڑکیں ہیں اور جہاں کی ٹریفک بہت زیادہ ہے۔ اس طرح سے جو رقومات جمع ہوں گی ان کو سڑکوں کی تعمیر کے لیے ایک فنڈ کی صورت میں جمع کیا جانا چاہیے۔ ●

بقیہ: مدھوبنی مصوری: ماضی اور حال کے آئینے میں

آج مدھوبنی مصوری (مدھوبنی آرٹ) کی مقبولیت ہندوستان کے باہر غیر ملکوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ امریکہ، جاپان، فرانس اور روس وغیرہ ملکوں کے لوگ مدھوبنی مصوری خریدنے کے لیے کبھی کبھار بہار آتے جاتے رہتے ہیں۔

ویسے متھلا مصوری کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ابھی تک اس میں زیادہ حصہ خواتین ہی کا ہے۔ لیکن اب مرد فنکار بھی اس آرٹ کی تخلیق میں شامل ہو گئے ہیں۔ جن کا نام اب دھیرے دھیرے آ رہا ہے۔

آج امریکہ، جاپان، فرانس اور دہلی میں اس آرٹ سے متعلق کئی ادارے ہیں لیکن وہیں متھلا میں افسوس ہے کہ اس کی نشر و اشاعت اور توسیع کرنے والا کوئی ادارہ نہیں جو کہ مدھوبنی مصوری کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی نشر و اشاعت کر سکے۔

شمالی بہار کے عوام جنھیں اس مصوری سے خاص دلچسپی ہے انھوں نے عالیہ پرسول میں عوامی سطح پر اس کی مناسب تربیت کا انتظام کیا ہے تاکہ یہ فن زندہ رہے اور لوگوں میں زیادہ سے زیادہ مقبول ہو۔ ●

ڈاکٹر آر۔ سی۔ ڈھینگرہ

سرجری کی محتاج بیماریاں اور ہومیوپیتھی

عمل جراحی کے مختلف شعبوں کی جدید پیش رفت مسرت و اطمینان کا باعث ہے۔ سرجری کے میدان میں ہر روز نئی نئی تحقیقوں اور تجربوں کی خبریں سننے کو ملتی ہیں۔ ٹشو گرافٹنگ اور جسمانی اعضا کو بدلنے کی سرجری کوئی نئی بات نہیں رہی ہے۔ لیزر تھیراپی کی مدد سے سرجری کی تکنیکوں میں بھی انقلابی تبدیلیاں آگئی ہیں جن کی وجہ سے آپریشن کے دوران زیادہ خون نہیں بہنے پاتا اور انفیکشن کا خطرہ بھی کم ہو جاتا ہے۔ پھر بھی دو سوال ہمارے سامنے بنے ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کیا سرجری واقعی سرجری کی محتاج بیماریوں کو ہمیشہ کے لیے ٹھیک کر دیتی ہے اور مرض کے دوبارہ پیدا ہونے کا امکان نہیں رہتا۔ دوسرے یہ کہ انسان میں سرجری کی ضرورت والی بیماریاں کیوں بڑھ رہی ہیں۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل امراض کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے:-

- ٹیومر (رسولی) بد ضمی کا ٹیومر (FIBROIDS) مثانہ کی تھیلی کا ورم۔
- فشر، فسٹولا (بھگندر)، سیلان خون (HAEMORRHOIDS)
- ٹانسیلائٹس، گلے کے غدود کی تکالیف، پولیو، سائنوسائٹس۔
- پاؤں کے گوکھرو، مسّے وغیرہ۔
- گردے کی تکالیف، پتّے (گال بلیڈر) کی پتھری۔
- ہائیڈروسیل (نزول الماء)
- استقاط الرحم یا رحم کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا ہرنیا (آنت اتر آنا)
- پراسٹیٹ گلینڈ کا بڑھ جانا، کاربنکل یا پھوڑا، گوہانجنی اور سرجری کے محتاج زخم۔
- امراض قلب (دل کی رگوں میں رکاوٹ پیدا ہونا)
- آپریشن سے وضع حمل (ڈلیوری) وغیرہ۔

سرجری کی محتاج بیماریوں میں اضافہ باعث تشویش ہے۔ اس کی وجوہات متعدد اور متنوع ہو سکتی ہیں جن کے بارے میں کلینیکل اور لیباریٹری مطالعات اور بایو سائنس دانوں کے ذریعے تحقیق کی ضرورت ہے۔

یہ جاننے کے لیے کہ سرجری سے مرض کا مکمل علاج ہو گیا ہے یا نہیں۔ مریض کلینیکل معائنہ، جانچ اور بعد کی دیکھ بھال بہت ضروری ہے۔ کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے کیسوں میں بیماری آپریشن کے بعد بھی کسی وقت دوبارہ اپنا سر اٹھاتی ہے یا کوئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس بات میں کچھ نہ کچھ منطق ضرور ہے کہ سرجری بیماری کی وجہ کو دور نہیں کرتی۔ یہ صرف بیماری سے پیدا ہونے والے نتائج ہی کو ختم کرتی ہے۔

سرجری کی محتاج بیماریوں کا ہومیوپیتھک علاج

میں نے اپنی ہومیوپیتھک طریق علاج کی ۳۵ سالہ پریکٹس میں دیکھا ہے کہ سرجری کی محتاج بیماریوں کے ۸۰ فی صد کیس علامات کی بنیاد پر کیے جانے والے ہومیوپیتھک علاج سے ٹھیک ہو گئے۔ البتہ اس کا انحصار اس بات پر ضرور تھا کہ بیماری کس حد تک بڑھ گئی تھی اور کس مرحلے میں تھی۔ ان میں ایسے کیس بھی تھے جن میں سرجری کے بعد بھی کچھ نہ کچھ تکلیف برقرار رہی یا آپریشن کے کچھ عرصہ بعد بیماری نے پھر سر ابھارا یا پھر مریض کے جسم کے کسی اور حصّے میں اس کی علامات ظاہر ہوئیں۔ اس لیے یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ ایسے کیسوں کا مستقل اور دیرپا علاج ہومیوپیتھی سے کیا جا سکتا ہے جس میں نظریۂ کلیت کے مطابق مریض کے پورے جسم، جسمانی ساخت اور مختلف اعضا کی کارکردگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے علاج کیا جاتا ہے اور مرض کی اصل وجہ کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ابتدائی مرحلوں پر پستان کے ٹیومر کا علاج ہومیوپیتھی سے کیے جانے کی بے شمار مثالیں ہیں اور علاج کی کامیابی کی دلیل یہ ہے کہ علاج کے دس بیس سال بعد تک یہ ٹیومر دوبارہ پیدا نہیں ہوئے۔

اسی طرح گردے کی پتھری کا معاملہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ گردے کی پتھری کے آپریشن کے کچھ عرصے بعد پتھریاں پھر بننے لگیں۔ بعض مریضوں میں پہلے دائیں گردے میں، پھر بائیں میں اور اس کے بعد پھر دائیں میں اور پھر بائیں میں۔ لیکن ہومیوپیتھک طریق علاج میں دواؤں کے اثر سے پتھریاں گلنے لگتی ہیں اور گل کر پیشاب کے ساتھ بہہ جاتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ بعد میں ان کے دوبارہ پیدا ہونے کا امکان بھی نہیں رہتا (اس کی تصدیق کے لیے لیباریٹری میں مطالعات و تجربات کی ضرورت ہے)۔

سائنوسائیٹس، پولیو، گلے کے غدود اور ناک کان اور گلے کی دوسری بیماریوں میں بھی ایسے ہی نتائج دیکھنے میں آئے ہیں۔ یہ تکالیف

۴۷۳۔ گوتم نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۴۹

زکام کو دبانے کے لیے کیے جانے والے علاج سے پیدا ہوتی ہیں، جب کہ بہت سے کیسوں میں سرجری سے تسلی بخش اور دیرپا نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں، ہومیوپیتھک علاج سے ان تکالیف کا مستقل علاج ہوا۔

اسی طرح لمفےڈینیٹس (LYMPHADENTIS) اسٹیو آرتھرائٹس حتیٰ کہ آسٹیو میلی ٹیس (ہڈیوں کا ٹی بی) کے لیے جہاں اینٹی ٹیوبرکلر علاج اور بار بار کی سرجری ناکام رہی۔ ہومیوپیتھک علاج سے بہت عمدہ نتائج برآمد ہوئے اور مرض کا مستقل علاج ہو گیا۔

اسقاط الرحم یا بچہ دانی کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کی پہلی ڈگری حتیٰ کہ دوسری ڈگری کی بھی تکلیف اور بچوں کے ہرنیا کا متاثرہ عضلات اور رگ ریشوں کو ہومیوپیتھک ادویہ سے مضبوط بنا کر مستقل علاج کیے جانے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

سائنس اور میڈیکل بایوٹکنالوجی کی پیش رفتیں

وہ دن گئے جب جدید میڈیکل سائنس کے ماہرین ہومیوپیتھی کو صرف اس لیے مسترد کر دیتے تھے کہ ہومیوپیتھک ڈائلیوشنز (DILUTIONS) میں دوائی مادوں کی موجودگی کے بارے میں زیادہ پختہ اور ایسا ثبوت موجود نہیں تھا جو کیمیاوی تجزیے کے طریقے سے حاصل کیا گیا ہو۔ اب کہ سائنس کی دنیا میں بے شمار جدید پیش رفتیں ہو چکی ہیں اور باریک ترین کیمیاوی تجزیوں کے لیے جدید ترین الیکٹرانک آلات نکل آئے ہیں، ہومیوپیتھی کی قوت علاج کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ایک ہندوستانی سائنس داں ڈاکٹر اے سی۔ دتہ نے نہ صرف ہومیوپیتھی اور جدید سائنس کے درمیان گم شدہ کڑی کا پتا لگایا ہے بلکہ دواؤں کی قوت (پوٹینسی، POTENCY) کے اصول اور ہومیوپیتھک الٹرا ڈائلیوشنز (ULTRA DILUTIONS) کے طریق کار کے بارے میں مدتوں پرانے اختلافات کو بھی دور کر دیا ہے۔

ہومیوپیتھی الٹرا مائکرو میڈیسل سسٹم کی واحد دستیاب شکل ہے اور بجا طور پر علاج کا سب سے ماڈرن سائنٹفک سسٹم ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ آج ایک ڈبل بیم اسپیکٹرو فوٹومیٹر استعمال کر کے یہ پتا لگایا جا سکتا ہے کہ ہومیوپیتھک الٹرا ڈائلیوشنز میں کوئی آلودگی پیدا کرنے والا عنصر ہے یا نہیں۔ جدید علم الامراض، علم الادویہ اور مائکرو بایولوجی میں جو مائکرو اور الٹرا مائکرو تجزیاتی آلات ایجاد کیے گئے ہیں اور ریڈیائی تشخیص امراض کا جو طریقہ نکالا گیا ہے ان کا استعمال ہومیوپیتھی میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان جدید ترین آلاتِ تشخیص کی مدد سے ہم نہ صرف مرض کی تشخیص کر سکتے ہیں بلکہ مریض کی شفایابی کی رفتار پر بھی نگاہ رکھ سکتے ہیں اور اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم نے بہت سے پیچیدہ، کہنہ اور سرجری چاہنے والے ایسے امراض کا علاج کیا ہے جن کے ضمن میں جدید ادویہ ناکام رہی تھیں۔

سرجری کے لیے نئی تکنیکوں کا استعمال ایک اور شعبہ ہے جس میں جدید طریق علاج نے نمایاں پیش رفت کی ہے۔ خراب گردہ بدلنے کے آپریشن اور دل کی مسدود رگوں کی "بائی پاس سرجری" نے بہت سے مریضوں کو موت کے منہ سے نکال کر انھیں نئی زندگی دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سرجری کے اپنے فائدے ہیں اور کئی مرتبہ تو یہ مریض کی جان بچانے کے لیے ایک "وبرداں" بن جاتی ہے۔ لیکن انسان مرض کی اس انتہا کو اکثر پیٹنٹ دواؤں اور فوری فائدے کے لیے مرض کو دبا دینے والے علاج کی وجہ سے پہنچتا ہے۔ ہمارے خیال میں سرجری مرض کی وجہ کو نہیں مٹاتی، صرف مرض کی آخری صورت کو ہی ختم کرتی ہے۔ نظریۂ کلیت کے مطابق سارے جسم کو دھیان میں رکھتے ہوئے مکمل علاج کے طریقے سے بہت سی بیماریوں کو نہ صرف روکا جا سکتا ہے بلکہ ان کا علاج بھی کیا جا سکتا ہے اور ان بیماریوں میں گردے کا ناکارہ ہونا اور دل تک خون پہنچانے والی رگوں میں رکاوٹ پیدا ہونا بھی شامل ہیں۔

حرف آخر

لہٰذا بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جب تک امراض کا علاج نظریۂ کلیت کے مطابق یا یوں کہیے کہ پورے جسم کو دھیان میں رکھتے ہوئے نہیں کیا جاتا اور جب تک بیماری کو جڑ سے ختم کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی انسان میں سرجری کی طالب بیماریاں بڑھتی رہیں گی۔

وقت آ گیا ہے کہ علم الادویہ کے تمام شعبوں کے ماہرین مل کر وسیع تر پیمانے پر غیر متعصبانہ اور باقاعدہ مطالعات کریں اور دکھی اور بیمار انسانوں کے فائدے کے لیے منظم طریقے سے صحیح سمت میں تحقیق اور ریسرچ کے لیے ضروری بنیادی ڈھانچہ قائم کریں۔ ●

بقیہ: پینے کے پانی کا مشن

کے پانی کی کوالٹی کی جانچ کے لیے الگ الگ کمیشن مقرر کیے گئے ہیں۔ پانی میں بھاری پن کے مسئلے کی بھی جانچ کی گئی۔ یہ مسائل محض تکنیکی اور مالی اعتبار سے ہی قابل غور نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق اجتماعی ملکیت اور عوامی تعاون سے بھی ہے۔

دیہات میں صفائی

صفائی کے محاذ پر بالخصوص دیہی علاقوں کی صفائی کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ سال رواں میں سینٹری سنڈاسوں کی تعمیر کے لیے ایک ارب ۴۲ کروڑ ۵۳ لاکھ روپیے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ ضروریات زندگی کی اشیا کے کم سے کم قومی مشترکہ پروگرام کے تحت پینے کا صاف پانی اور صفائی کی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ یہ کام دیہی اور شہری دونوں طرح کے علاقوں میں انجام پاتا ہے۔ اس کو اعلا ترین ترجیح دی گئی ہے۔

پینے کے پانی کی فراہمی کے برعکس صفائی کا پروگرام غیر تسلی بخش ہے اس کا تعلق جلد ہمی امور سے ہے۔ حفظان صحت کے اصول، سنڈاسوں کی گندگی کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ اور دیگر متعلقہ کام اسی سے وابستہ ہیں۔ متبادل نظام مثلاً مقامی طور پر سامان فراہم کرنے کے لیے دیہی سینٹری مارٹ کا نظام شروع کیا گیا ہے۔ آئندہ پانچ برسوں میں صفائی کے پروگراموں کے تحت علاقوں میں مزید ۵۰ فی صد اضافہ ہوگا اور سماج کے سبھی طبقے اوپر سے لے کر نیچے تک اس میں دلچسپی لے رہے ہوں گے۔ اس کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ عوامی سطح پر سبھی اس کام میں تعاون کریں۔

اکیسویں صدی تک ان تمام لوگوں اور علاقوں میں صفائی کے پروگرام چل رہے ہوں گے جہاں یہ ابھی تک نہیں پہنچے ہیں مگر یہ ایک بڑا کام ہے اس کے لیے قومی سرکاروں اور بین الاقوامی برادری سے مالی امداد درکار ہوگی۔ پانی کے وسائل کے تحفظ کے لیے سب کا تعاون دیہی علاقوں کی تمام آبادی کو پینے کے صاف پانی کی یقینی فراہمی اور عوامی اشتراک عمل خاص کر پنچایت راج اداروں کا تعاون اس پروگرام کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہے۔ ●

ڈاکٹر عرفان علیمی

دردِ شقیقہ
(مائگرین)

دردِ شقیقہ کو آدھا سیسی کا درد یا مائگرین بھی کہتے ہیں۔ اس مرض میں سر کے ایک حصے میں شدید درد اٹھتا ہے۔ بعض اوقات یہ درد پورے سر میں بھی محسوس ہوتا ہے لیکن ایک حصے میں کم اور دوسرے حصے میں زیادہ ہوتا ہے۔ عموماً یہ درد صبح کے وقت ہوتا ہے۔ ویسے کسی بھی وقت اس درد کا حملہ ہو سکتا ہے۔ یہ درد کئی کئی گھنٹوں اور کبھی کبھی کئی دنوں تک مریض کو پریشان رکھتا ہے اس کے حملے بار بار ہوتے ہیں۔ درد کی شدت کی حالت میں مختلف قسم کی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں لیکن حملے کا اثر ختم ہوتے ہی مریض پورے طور پر نارمل ہو جاتا ہے۔

یہ درد مرد اور عورت دونوں کو ہوتا ہے لیکن مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو ۲-۳ گنا زیادہ ہوتا ہے۔ غالباً اس کا سبب ایام مخصوص میں ہارمونوں کی تبدیلی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۱۰ فی صد افراد اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ غریبوں کے مقابلے امیروں، دیہاتی لوگوں کے مقابلے شہری لوگوں اور جسمانی محنت کرنے والوں کے مقابلے دماغی محنت کرنے والوں میں یہ مرض زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

اسباب

اس مرض کے مختلف اسباب ہوتے ہیں لیکن اطبار جدید کا متفقہ فیصلہ ہے کہ دردِ شقیقہ کے حملے کے وقت سر کو خون فراہم کرنے والی شریانوں میں سکڑن پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے دوران خون میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، رگیں پھول جاتی ہیں اور ان کے دباؤ کے نتیجے میں درد ہونے لگتا ہے۔ کچھ اطبار کا یہ بھی خیال ہے کہ مختلف لوگوں میں اس درد کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ نزلہ زکام کا مناسب علاج نہ کرانا اور حاسد رطوبات کا بند ہو جانا بھی اس مرض کا سبب ہو سکتا ہے۔ فسادِ خون، عام جسمانی کمزوری، پرانا ملیریا، ہاضمے کی خرابی، بے خوابی، بعض امراض گردہ اور جنسی سرگرمیوں کی کثرت بھی اس مرض کے اسباب ہو سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اس مرض میں موروثی اثرات کو بھی دخل ہے۔ ذہنی پریشانی، تناؤ، شور، ٹمٹماتی روشنی، ناکامی و مایوسی، خوف و وحشت، اندیشہ و صدمہ، غدودوں کے افعال میں خرابی کا پیدا ہونا، شراب و سگریٹ، چاکلیٹ و میٹھی اشیار کی کثرتِ استعمال بھی اس مرض کے پیدا ہونے میں معاون ہوتی ہے۔

علامات

کچھ لوگوں کو دردِ شقیقہ کا حملہ ہونے سے قبل ہی کچھ ایسے اشارے مل جاتے ہیں جن سے وہ جان لیتے ہیں کہ درد کا حملہ ہونے والا ہے۔ مثلاً مریض کے مزاج میں غصہ، چڑچڑاپن، سستی، تکان، آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے تارے اور جزوی طور پر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانے کی شکایت ہو سکتی ہے۔ مریض کو متلی محسوس ہوتی ہے اور ابکائیاں آتی ہیں۔ بولنے اور سننے میں دشواری ہوتی ہے۔ کبھی کبھی جسم کا نصف حصہ کمزور بھی پڑ سکتا ہے۔ اور ہاتھ اور منھ کے چاروں طرف کا حصہ عارضی و وقتی طور پر سُن بھی پڑ سکتا ہے۔ کچھ دیر تک یہ علامات رہتی ہیں۔ اس کے بعد درد کا حملہ ہو جاتا ہے۔ جو پہلے ایک نقطے پر مرکوز ہوتا ہے پھر پھیلتے پھیلتے سر کے نصف حصے میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ درد کافی شدید ہوتا ہے۔ مریض کو روشنی سے تکلیف ہوتی ہے اور وہ اندھیرے کمرے میں رہنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔

احتیاط و علاج

اس درد سے نجات پانے کے لیے سب سے اہم اور ضروری یہ ہے کہ آپ اپنے دن بھر کے معمولات کی تفصیل نوٹ کر لیں اور خود یہ غور کریں کہ کن حالات اور کس ماحول میں کھانے پینے کی کن اشیار کے استعمال سے اکثر اس درد کا حملہ ہوتا ہے۔ اس سے پرہیز کریں۔ اپنے طرزِ زندگی کو باصول بنائیں۔ وقت پر کھانا کھانے کی عادت ڈالیں، بھوکے پیٹ رہنے سے باز رہیں۔ تلی بھنی چیزوں کے استعمال سے پرہیز کریں۔ سگریٹ اور شراب نوشی ترک کر دیں۔

اس مرض کے لیے اب تک کوئی تیر بہدف دوا تیار نہیں ہوئی ہے۔ ہاں! کچھ ایسی دافع درد دوائیں ضرور ہیں جن کے استعمال سے مریض کو راحت مل سکتی ہے اور درد کے حملے کو روکا جا سکتا ہے لیکن یہ دوائیں مضر بھی ہو سکتی ہیں لہٰذا معالج کے مشورے کے بغیر قطعاً ایسی دواؤں کا استعمال نہ کریں۔ ●

نوائے طب و صحت، پوسٹ بیگم سرائے۔ الٰہ آباد-۱۵

ایس۔اے۔حیات

نیم کی افادیت

نیم کا پیڑ انسان کے لیے قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے۔ دورِ قدیم سے ہی لوگ اس سے آشنا ہیں۔ خصوصاً ہندوستان کے دیہی علاقوں میں یہ وہاں کے تمدن کی ایک علامت بن گیا ہے۔ محققین کی رائے ہے کہ نیم کی جائے پیدائش برما ہے۔ وہاں سے یہ لوگوں کی نقل و حرکت کے دوران دیگر ممالک میں پہنچا۔ بھارت میں نیم سب سے قبل جنگلوں میں اُگایا جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے یہاں کے دیہی علاقوں میں تقریباً ہر گھر اور آنگن میں یہ لگایا جانے لگا۔ یہاں کی سمندری سطح سے لگ بھگ ۱۷ ہزار فٹ کی اونچائی والے مقامات پر یہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک مستند حقیقت ہے کہ ہرے پودے دن کے اوقات میں کاربن ڈائی آکسائڈ کرۂ ہوا سے لے کر اپنی غذا خود بناتے ہیں۔ اس عمل کو ضیائی ترکیب کہتے ہیں۔ اس عمل کے نتیجہ میں آکسیجن خارج ہوتا ہے جسے عام ذی روح بشمول انسان سانس کے ذریعہ لیتے ہیں۔ ذی روح کاربن ڈائی آکسائڈ کا اخراج کرتے ہیں جسے پودے لیتے رہتے ہیں۔ اس سے دن کے اوقات میں کرۂ ہوا میں گیسوں کا تناسب متوازن رہتا ہے۔ اس سے کرۂ ہوا کی آلودگی بہت حد تک دور ہوتی رہتی ہے لہٰذا دن کے وقت کسی پیڑ کے نیچے کافی سکون محسوس ہوتا ہے۔ نیم کے پودے میں پتیاں کافی مقدار میں اور گھنی ہوتی ہیں جہاں چہ ان کے سایہ میں کافی سکون اور ٹھنڈک ہوتی ہے۔ اسی لیے فضائی آلودگی دور کرنے کے لیے سڑکوں کے کنارے دیگر پودوں کے ساتھ ساتھ نیم کا پودا بھی لگایا جاتا ہے۔ رات میں سورج کی روشنی کی عدم موجودگی میں پودوں میں ضیائی ترکیبی کا عمل نہیں ہو پاتا ہے لہٰذا شب میں پودے کاربن ڈائی آکسائڈ نہیں لیتے ہیں بلکہ اس کے برعکس آکسیجن لیتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائڈ چھوڑتے ہیں جس سے فضا آلودہ ہو جاتی ہے اس لیے رات میں کسی پیڑ کے نیچے قیام نہیں کرنا چاہیے۔

گرمی کے موسم کے شروع ہوتے ہی نیم میں چھوٹے اور خوشبودار سفید پھول نمودار ہوتے ہیں۔ نیم وہ واحد پودا ہے جس کی جڑ سے لے کر بالائی حصہ تک انسان کے کسی نہ کسی کام آتا ہے۔ اس کی چھال، پتیاں، پھل، بیج، تیل، کھلی، گوند اور لکڑی سبھی کار آمد ہیں۔ نیم کی ٹہنیاں دَتون (مسواک) کا کام کرتی ہیں۔ قدیم زمانے سے ہی دیہی علاقوں میں اور موجودہ دور میں شہری علاقوں میں بھی نیم کا دَتون کثرت سے استعمال میں آتا ہے۔ یہ جراثیم کش ہے لہٰذا دانت اور مسوڑھوں کو امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کی پتیوں کو پانی میں اُبال کر چوٹ، موچ، زخم اور کٹے ہوئے حصہ میں پسا ہوا لیپ لگانے سے افاقہ ہوتا ہے۔ اس کی چھال کو پانی میں جوشش کر کے چھان کر پینے سے جلدی امراض میں فائدہ ہوتا ہے۔ نیم کی کھلی کھاد اور جانوروں کی غذا کی شکل میں استعمال ہوتی ہے۔ دیمک سے متاثرہ علاقوں میں نیم کی لکڑی کے بنے ہوئے دروازے اور کھڑکیاں مکانوں میں لگائے جاتے ہیں۔ اس کی چھال سے دستیاب TANIN کا استعمال چمڑوں کی صنعت میں کیا جاتا ہے۔ اس سے حاصل شدہ گوند سے ریشم کی رنگائی کی جاتی ہے۔ اس میں موجود تیل اور دیگر اشیاء سے صابن، دانت کا منجن اور زینت کی اشیاء تیار کی جاتی ہیں۔ کراسن تیل سے جلنے والے لیمپ میں نیم کا تیل محض دو فی صد آمیزش کر دینے سے مچھر اور دیگر کیڑے بھاگ جاتے ہیں۔ ناریل تیل میں نیم کا تیل ملا کر جسم پر مالش کرنے سے مچھر نہیں کاٹتے ہیں۔ کھانسی، بخار، سردی اور دیگر موسمی علالت میں اس کا پھل کھانے سے قدرے افاقہ ہوتا ہے۔

قدیم ہندوستان میں نیم تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ دیہی علاقوں میں جہاں عام طور پر طبیب دستیاب نہیں ہوا کرتے تھے وہاں لوگ چیچک سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے گھر کے دروازہ پر نیم کے *خشک بیجوں کا ہار بنا کر لٹکایا کرتے تھے۔ فی الوقت شمالی بہار میں عورتیں ناگ پنچمی تیوہار کے موقع پر ناگ (سانپ) پر نیم کی پتی چڑھاتی ہیں اور ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس پوجا سے پرستش کرنے والے لوگوں کے کنبے سانپ کے کاٹنے (SNAKE BITING) سے محفوظ رہتے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران ہمارے ملک میں ملیریا کی دواؤں کی کمی ہو گئی تھی۔ اس دوران اس کمی کو پورا کرنے کے لیے دیہی علاقوں میں لوگوں نے نیم کی پتی اور چھال اُبال کر اسے پیس کر استعمال کیا جس سے بے شمار جانیں بچ سکیں۔ انڈین ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی (INDIAN AGRICULTURAL RESEARCH INSTITUTE NEW DELHI) کے سائنس دانوں نے ۱۹۹۰ء میں نیم سے NIMBADIN تیار کیا اور فصل کو تباہ کرنے والے کیڑوں کی روک تھام کے

باقی صفحہ ۔۔ پر

---

* اعزازی سکریٹری، اسٹڈی سینٹر، گیا

ڈاکٹر جمیل اختر

عصمت ۔ سوانحی و ادبی خاکہ

عصمت کا ادبی ذوق وشوق ان کے گھریلو ماحول کا رہین منت ہے۔ انھوں نے افسانہ نگاری کی ابتدا گھر کے ادبی ماحول کے زیر اثر ہی کی۔ عصمت کا گھرانہ نہ صرف تعلیم یافتہ تھا بلکہ بھائی عظیم بیگ چغتائی خود بھی ایک بلند پایہ ادیب تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے گھر میں ہر وقت ادیبوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ہر طرح کے اخبارات ورسائل بھی آتے تھے۔ جو ذوق وشوق کو پروان چڑھانے کا ایک ذریعہ تھے۔ چوں کہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ خود گھر میں جاری تھا۔ لہٰذا عصمت کے ذہن کا اس طرف راغب ہونا فطری تھا۔ پھر اس پر بڑے بھائی کی صحبت اور سرپرستی نے بھی عصمت کے ذہن وفکر کو جلا بخشی۔ عظیم صاحب کی شخصیت نے عصمت کو بے حد متاثر کیا اور عصمت کے اندر ادبی وعلمی ذوق وشوق کو ابھارا ان کی شفقت ومحبت اور تعلیم وتربیت سے عصمت کو لکھنے کی تحریک ملی۔ جس کا اعتراف خود عصمت نے بھی کیا ہے۔ عظیم صاحب کے افسانے پڑھ کر عصمت نے کہانی لکھنی شروع کی۔ اس طرح چودہ پندرہ برس ہی کی عمر سے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ ان کہانیوں کی حیثیت مشق سخن سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر عصمت نے دوسرے افسانہ نگاروں حجاب اسماعیل، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتحپوری کو پڑھا اور ان سب سے بھی اثر قبول کر کے کہانیاں لکھیں۔ لیکن شروع کی یہ سب کہانیاں شائع نہیں ہو سکیں اور ضائع کر دی گئیں۔ عصمت نے مطالعہ اور لکھنے کا عمل جاری رکھا۔ متواتر کوششوں نے عصمت کے اندر اعتماد اور سنجیدگی پیدا کی، جس کے نتیجے میں انھوں نے اپنی کامیاب کہانی "بچپن" لکھی۔ جو مئی ۱۹۳۸ء کے "ساقی" میں شائع ہوئی۔ عصمت کی پہلی مطبوعہ کہانی یہی ہے۔ کہانی "بچپن" کے بعد ان کی دوسری تحریر ان کا ڈراما "فسادی" ہے۔ ڈراما نگاری کی طرف ان کی طبیعت کا رجحان بھی ان کے اندر بچپن ہی سے تھا۔ جب خاندان کے افراد جمع ہو کر گفتگو کرتے عصمت ان کے ڈائیلاگ نقل کرتی تھیں اور پھر بعد میں سب کو سنایا کرتی تھیں۔ اس عادت نے ان کے رجحان کو آگے بڑھایا۔ پھر دوران تعلیم نصابی ضرورتوں کے تحت یونانی اور بہت سی دوسری زبانوں کے ڈرامے پڑھے۔ لیکن دوسروں کی بہ نسبت برنارڈ شا سے زیادہ متاثر ہوئیں۔ برنارڈ شا کے ڈرامے ان کی ڈرامہ نویسی کا محرک بنے اور انھوں نے اپنا ڈرامہ "فسادی" برنارڈ شا سے متاثر ہو کر لکھا جس کا اعتراف عصمت نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ برنارڈ شا کے بعد عصمت جس دوسری شخصیت سے متاثر ہوئیں وہ "انگارے" کی رشیدہ آپا تھیں۔ جن کی پرکشش اور پُراعتماد شخصیت نے نہ صرف عصمت کے اندر خود اعتمادی پیدا کی بلکہ عصمت کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ عصمت ان کے خیالات سے براہ راست متاثر ہوئیں، جس کا اعتراف عصمت یوں کرتی ہیں:

"اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا، جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ روشن آنکھوں اور مسکراتے شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا کہ ایک دفعہ مل کر پہنا نہ جائے؟ ۔۔۔ اور میں نے بے سمجھے بوجھے ان کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر پہن لیا تھا۔۔۔ ۱۹۳۸ء میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشیدہ آپا بن چکی تھیں۔ اب ان کی سلگتی ہوئی باتیں پلے بھی پڑنے لگی تھیں۔"[21]

پھر میں نے چوری چھپے "انگارے" پڑھی۔ رشیدہ آپا ہی مجھے ایک ایسی ہستی نظر آئیں جنھوں نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کی۔ میں نے انھیں اپنا گرو مان لیا۔ علی گڑھ کی چھوٹی زہر آلود فضا میں وہ بڑی بدنام تھیں میری صاف گوئی کو انھوں نے سراہا اور پھر میں نے ان کی بتائی ہوئی کتابیں چاٹ ڈالیں۔"[22]

عصمت کے مزاج میں رشیدہ آپا کی سی بے باکی اور صاف گوئی شامل ہو گئی۔ مشرقی عورتوں کا زیور شرم وحیا، گھٹتے ہوئے جذبات، پتی ورتا، روتی بسورتی صورتوں اور قابل رحم حالت سے انھیں نفرت ہو گئی اور خیالات میں یہ تبدیلی رشیدہ آپا کی انقلابی شخصیت کے زیر اثر ہی ممکن ہو سکی۔ عصمت کے تخلیقی سفر میں انقلابی رجحان کی کارفرمائی رشیدہ آپا کی شخصیت کا عکس ہے۔

عصمت رشیدہ آپا کے ساتھ ساتھ "انگارے" کے دوسرے مصنفین کی فکر سے بھی متاثر ہوئیں اور ان کے تصورات کو بھی اپنی

۲۲۔ مہاندی ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی ۶۷

فکری اساس میں شامل کر لیا۔ عصمت کے فکری رجحان کی تربیت میں ترقی پسند تحریک کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ عصمت اس تحریک کے فکری جہات سے نہ صرف متاثر ہوئیں بلکہ باضابطہ طور پر اس تحریک سے وابستہ بھی ہو گئیں اور وہ تمام باتیں جو ترقی پسند تحریک کی اساس تھیں عصمت کی فکر کا حصہ بن گئیں اور ان کے تخلیقی سرمایے کی اساس قرار پائیں۔

اس طرح ادبی زندگی کے آغاز کے ساتھ ساتھ عصمت کی فکر کو وہ راہ مل گئی جس پر چلنے کی تڑپ ان کے اندر بچپن ہی سے تھی اور جس کا خمیر عصمت کے اندر بہت پہلے تیار ہو چکا تھا۔ فکری ہم آہنگی نے عصمت کی فکر کو پختگی فراہم کی اور عصمت اپنے تخلیقی سفر پر گامزن ہو گئیں۔ اس طرح ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ کہانی "بچپن" (ساقی مئی ۱۹۳۸ء) اور ڈرامہ "فسادی" (ساقی جنوری ۱۹۳۸ء) کے بعد دوسری کہانی "ہیرو" رسالہ "ساقی" جون ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ تیسری کہانی "گیندا" ۱۹۳۹ء میں رسالہ "نیا ادب" لکھنؤ میں شائع ہوئی۔ شروع کی زیادہ تر کہانیاں رسالہ ساقی ہی میں [illegible] ہوئیں۔ ساقی سالنامہ جنوری ۱۹۴۰ء میں عصمت کی دو کہانیاں "تکملہ" اور "ڈائن" شائع ہوئیں۔ ستمبر ۱۹۴۰ء میں "کیوں رے کتے"، نومبر ۱۹۴۰ء میں "یکہ"، دسمبر ۱۹۴۰ء میں کھلی چٹھی بنام کنٹرولر آف آل انڈیا ریڈیو شائع ہوئی۔ پھر "لحاف" "دوزخی" وغیرہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئیں۔ اس طرح ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک متعدد کہانیاں شائع ہوئیں۔ ان کہانیوں کی اشاعت کے بعد عصمت پر اعتراضات بھی ہونے شروع ہو گئے۔ لیکن عصمت نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور رسالوں کو کہانیاں بھیجتی رہیں۔ لیکن کہانی "لحاف" کے چھپنے کے بعد ادبی حلقے میں ہلچل مچ گئی۔ اس حد تک کہ عصمت کو فحش نگار قرار دے دیا گیا۔ لیکن اس کہانی کی بدولت انھیں شہرت دوام بھی ملی۔ یہ الگ بات ہے کہ مطعون بھی لے دے کی گئیں۔ اس کہانی سے متعلق عصمت لکھتی ہیں:

"مگر جب میں نے لحاف لکھا تو پھر بم پھٹ پڑا۔ ادبی اکھاڑے میں میرے پرزے اڑے۔ کچھ لوگوں نے میری حمایت میں بھی

بوجہا ہی دہلی

قلم اٹھایا۔ اس دن سے مجھے فحش نگاری کا لقب دے دیا گیا۔ لحاف سے پہلے اور لحاف کے بعد میں نے جو کچھ بھی لکھا اس پر کسی نے غور نہ کیا۔ میں جنسیات پر لکھنے والی فحش نگار مانی گئی۔ یہ تو ابھی چند سال سے نوجوان طبقے نے مجھے بتایا کہ میں فحش نگار نہیں حقیقت نگار ہوں۔۔۔۔ لحاف کا لیبل اب بھی میری ہستی پر چپکا ہوا ہے اور جسے لوگ شہرت کہتے ہیں بدنامی کی صورت میں اس افسانہ پر اتنی ملی کہ الٹی آنے لگی۔ لحاف میری چڑ بن گیا تھا۔ میں کچھ بھی لکھوں لحاف کی تہوں میں دب جاتا تھا۔۔۔ لحاف نے مجھے بڑے جوتے کھلوائے۔"[۳]

اس کہانی کے اوپر فحاشی کا مقدمہ بھی چلا، جس میں جیت گرچہ عصمت ہی کی ہوئی۔ لیکن عوامی غم و غصہ کا سلسلہ بہت دنوں تک خطوط اور بحث و مباحثے کی صورت میں جاری رہا۔

عصمت کی کہانیوں پر ہنگامے کی وجہ یہ تھی کہ عصمت نے اپنے ماحول اور معاشرے کی جنسی زندگی اور جنسی مسائل کو اپنا موضوع بنایا لوگ اس طرح کی تحریر پڑھنے کے عادی نہیں تھے اور اس پر ہنگامہ ہونا فطری تھا۔ لیکن بے باک عصمت نے ان سب باتوں کی کوئی پروا نہیں کی وہ سمجھتی تھیں کہ میں جو کچھ بھی لکھ رہی ہوں اپنے گھر، ماحول اور معاشرے کے بارے میں لکھ رہی ہوں اور ان برائیوں کو بے نقاب کر رہی ہوں جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ عصمت لکھتی ہیں:

"میری ابتدائی کہانیاں گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر لکھی گئی ہیں۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد ہی بڑی گندی باتیں کرتے ہیں۔ نہیں۔ عورتیں بھی کرتی ہیں۔ عورتوں کے پاس زیادہ وقت ہوتا ہے۔ دوپہر کو محلے بھر کی عورتیں جمع ہو کر بیٹھ جاتی تھیں اور ہم عمر لڑکیوں سے کہا جاتا تھا "چلو بھاگو تم لوگ"، میں چھپ کر پلنگ کے نیچے گھس کے، کہیں سے ان کی باتیں سن لیا کرتی تھی۔ جنس کا موضوع گھٹے ہوئے ماحول اور پردے میں رہنے والی بی بیوں کے لیے عام بات ہے۔ وہ اس پر بہت بات چیت کیا کرتی ہیں۔ میری افسانہ نگاری اس گھٹے ہوئے ماحول کی عکاسی ہے۔ فوٹوگرافی ہے۔"[۴]

اعتراضات سے عصمت کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ اعتماد کی قوت مزید مستحکم ہوئی اور وہ اپنے افسانوی سفر پر پورے اعتماد اور وقار کے ساتھ گامزن رہیں۔ ان کی شہرت بڑھنے لگی اور ہند و پاک کے تمام ادبی رسالوں میں چھپنے لگیں۔ رسالہ "ساقی" کے بعد عصمت کے افسانے درج ذیل ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔

ادب لطیف: "معائنہ" سالنامہ ۱۹۴۶ء، "ہندوستان چھوڑ دو" سالنامہ ۱۹۶۲ء۔

سیپ کراچی: "تھوڑی سی پاگل" جنوری ۱۹۷۷ء، "سونے کے گھونٹ" جنوری ۱۹۷۷ء، "خرید لو" افسانہ نمبر شمارہ ۱۵، "نوالہ" خاص نمبر شمارہ ۱۲، "لعنگا" خاص نمبر شمارہ ۲۰، "تیسرا دور" خاص نمبر شمارہ ۱۹، "عشق پر زور نہیں" شمارہ ۲، "بیکار" شمارہ ۱، "سانپ کے تلوے" شمارہ ۱۶۔

نیا دور کراچی: "اور وہ" شمارہ ۳-۴، "اردو رسم الخط بدل دیا جائے" شمارہ ۵۵-۵۶، "مٹھی مالش" شمارہ ۱۱-۱۲۔ "زہر کا پیالہ" شمارہ ۳۷-۳۸۔ "تیسرا دور" شمارہ ۵۵-۵۶، "گھر والی" شمارہ ۵۷-۵۸۔

فنون: "کلو" جولائی، اگست ۱۹۶۶ء، "نوالہ" سالنامہ ۱۹۶۸ء۔

نقوش: کایا پلٹ شمارہ (۲) ۱۹۵۲ء، گڈا گڑیا ۱۹۵۶ء، مٹھی مالش ۱۹۵۷ء، آخری داؤ ۱۹۵۹ء، باچھو ۱۹۶۴ء، چٹان ۱۹۶۵ء، بیکار ۱۹۶۳ء، زہر کا پیالہ ۱۹۶۶ء، محبوب ۱۹۶۷ء، اپریل شمارہ ۱-۲،

اکتوبر ۱۹۶۶ء۔

۱۹۷۸ء، نوالہ شمارہ (۵) ۱۹۴۸ء
خرید شمارہ (۹۔۱۰) ۱۹۴۹ء ،
اللہ کا فضل (۹۔۱۰) ۱۹۷۰ء ،
سانپ کے تلوے (۳۔۴) ۱۹۷۰ء
سوری ممی (۵۔۶) ۱۹۷۰ء، لنگا (۳۔۴) ۱۹۷۲ء، عشق پر زور نہیں، افسانہ نمبر، زرخرید بیویاں۔ ۱۹۸۷ء۔

نقوش: ننھی کی نانی، افسانہ نمبر جنوری ۱۹۵۴ء، چوتھی کا جوڑا، افسانہ نمبر دسمبر ۱۹۵۵ء، کلو کی ماں دس سالہ نمبر جون ۱۹۵۸ء، بچھو پھوپھی مئی۔ ۱۹۵۹ء، نیند افسانہ نمبر نومبر ۱۹۶۰ء، روشن سالنامہ جنوری ۱۹۶۳ء، گھونگھٹ اور گلدان افسانہ نمبر ستمبر ۱۹۷۴ء، مغل بچہ جنوری ۱۹۷۶ء۔

الفاظ علی گڑھ: مجھے کہنا ہے کچھ، مارچ تا جون ۱۹۸۰ء "تجزیہ بازی"، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء۔

گفتگو بمبئی: سوری ممی اور ننھی کی نانی ۱۹۶۷ء۔

شاعر: بے کندے کی پیالی، ۱۹۷۲ء، نئی دلہن ۱۹۷۹ء۔

شاہکار: نوالہ۔

گنگ و جمن کانپور: معائنہ۔ ۱۹۷۵ء۔

کتاب لکھنؤ: سانپ کے تلوے اور میری دوست۔

شمع: اپنا خون۔ ۱۹۷۱ء۔

روبی: پینی اور مقدس فرش ۱۹۸۳ء چھٹ رس۔

بیسویں صدی: اللہ کا فضل، ۱۹۷۰ء۔

آج کل: ڈھکوسلا، ۱۹۷۲ء اور ایک مسلسل ناول "کاغذی ہے پیرہن" ۱۳ قسطوں میں شائع ہوا۔

شب خون: گلدان، دسمبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔

ان رسائل کے علاوہ اور بہت سے ایسے رسائل ہیں، جن میں وقتاً فوقتاً عصمت کی کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان میں بہت سی کہانیاں ایسی ہیں جو اب تک شائع شدہ افسانوی مجموعوں میں سے کسی میں شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ عصمت کی ان تمام مطبوعہ کہانیوں کو جمع کر کے ایک مجموعے کی شکل میں شائع کیا جائے۔

عصمت کی بہت سی اچھی کہانیاں ہندی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ عصمت نے بچوں کے لیے بھی بہت سی کہانیاں لکھیں ہیں، جو بچوں کے رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ اب ذرا ایک نظر عصمت کی تصانیف پر بھی ڈال لیں۔

اب تک عصمت کے سات افسانوی مجموعے، سات ناول، تین ناولٹ، ڈراموں کے دو مجموعے اور ایک سوانحی ناول "کاغذی ہے پیرہن" شائع ہو چکے ہیں۔ "کاغذی ہے پیرہن" آج کل میں قسط وار شائع ہوا تھا اور پبلی کیشن ڈویژن نے ہی اکتوبر ۱۹۹۴ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

عصمت کا پہلا افسانوی مجموعہ "کلیاں" ۱۹۴۱ء میں مکتبہ اردو ادب لاہور سے شائع ہوا، اس میں کل ۱۳۔ افسانے اور چار ڈرامے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء کے درمیان لکھی ہوئی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بیشتر افسانے متوسط طبقے کے افراد خصوصاً عورتوں اور لڑکیوں کی جنسی اور نفسیاتی پیچیدگیوں، ان کے کشمکش اور گھٹن کے تجزیے پر مبنی ہے۔

دوسرا افسانوی مجموعہ 'ایک بات' ۱۹۴۲ء میں مکتبہ اردو ادب لاہور ہی سے شائع ہوا اس میں کل آٹھ افسانے شامل ہیں۔ چونکہ یہ مجموعہ "کلیاں" کے ایک سال بعد ہی منظر عام پر آگیا تھا۔ اس لیے اس میں مسائل کی نوعیت کم و بیش وہی ہے جو کلیاں میں ہے۔ صرف چند سماجی مسئلے طبقاتی تفریق اور طوائف کا مسئلہ اضافی موضوع نظر آتے ہیں اور فکر و شعور میں کلیاں کے مقابلے تھوڑی سی بیداری ضرور دیکھنے کو ملتی ہے، جس سے عصمت قدم آگے بڑھاتی نظر آتی ہیں۔

تیسرا افسانوی مجموعہ چوٹیں ہے۔ جسے ۱۹۴۲ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے شائع کیا۔ اس میں کل تیرہ افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں ان کا مشہور و ملعون افسانہ "لحاف" بھی شامل ہے جو ان کے فن کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ یہاں بھی مسائل کی نوعیت تقریباً وہی ہے جو پہلے دو مجموعے کی ہے۔ لیکن یہاں فکر و شعور میں پختگی، وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سماجی مسئلوں کی جانب دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔

چوتھا افسانوی مجموعہ "دو ہاتھ" مکتبہ اردو ادب لاہور سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل آٹھ کہانیاں شامل ہیں اور یہ آٹھوں افسانے عصمت کی فکر میں ہوئی تبدیلیوں کی واضح نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں مسائل کی نوعیت پہلے تین افسانوی مجموعے کے مقابلے الگ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں عصمت نے انسانیت کے دکھ درد کو پیش کیا ہے اور حیات انسانی کو درپیش مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ یہاں جنس اور نفسیاتی گرہ کشائی کا وہ غلبہ دیکھنے کو نہیں ملتا، جو شروع کے افسانوی مجموعے کا طرہ امتیاز ہے۔

۱۔ پانچواں افسانوی مجموعہ "چھوئی موئی" ۱۹۵۲ء میں ورائٹی بک ہاؤس لاہور نے شائع کیا۔ اس میں کل (۹) نو افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے تک پہنچتے پہنچتے عصمت کے فکری کینوس میں کافی تنوع اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ عالمگیر نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں جدید دور کے انسانوں کے پیچیدہ مسائل زیادہ ہیں۔ مفلسی، غربت، محنت کش طبقوں کا استحصال، سیاسی موقع پرستی، آبادی، تعلیم، قحط، بھوک مری اور مہنگائی جیسے موضوعات ہیں۔ سامراجی نظام کا مسئلہ، فساد، تقسیم ہند کا مسئلہ، ہجرتوں کے احوال اور انسانی رشتوں کی شکست و ریخت کی کہانی ہے اور لاتعداد ایسے مسائل ہیں جن سے اس وقت کا سماج گزر رہا تھا۔ ان افسانوں میں عصمت کی فکری بصارت و بصیرت اور نئی پختگی کا احساس ابھرتا ہے۔

"بدن کی خوشبو"، ان کا چھٹا افسانوی مجموعہ

ہے۔ جسے سرفراز احمد منظور پریس لاہور نے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔ اس میں کل سات افسانے ہیں۔ آخری افسانوی مجموعہ "لحاف" ہے۔ اسے اے۔ ایس پبلی کیشنز لاہور نے ابھی چند سال پہلے شائع کیا ہے۔ اس میں کل پندرہ افسانے شامل ہیں۔ ان دو لوں افسانوی مجموعوں میں عصمت کی سیاسی اور سماجی فکر پہلے کے مقابلے زیادہ گہری نظر آتی ہے۔ ان مجموعوں میں جنسی اور نفسیاتی مسئلہ سماجی اور سیاسی مسئلوں کے سامنے وہ اہمیت اور شدت نہیں رکھتے جو قبل کے افسانوی مجموعوں میں عصمت کی فکر کا غالب رجحان تھا۔ یہاں حالات زمانہ، معاشرے اور ماحول کی تبدیلی نے عصمت کی فکر میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ قصبے سے شہر اور وہ بھی بڑے صنعتی شہر بمبئی کی ہجرت اور یہاں کے تجربات و مشاہدات نے عصمت کے دل و دماغ میں تبدیلی پیدا کی۔ یہاں ان مسائل کی وہ اہمیت ہی نہیں رہی لہٰذا نئے مسائل اور موضوعات کا فکر میں در آنا فطری تھا۔ یہاں فلمی دنیا، صنعتی شہر اور شہری زندگی کے گوناگوں مسائل ان کی پیچیدگیاں اور الجھنیں ہیں۔ مختلف طرح کے ملکی اور عالمی مسائل ہیں۔

عصمت کا پہلا ناول "ضدی" ۱۹۴۱ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے شائع کیا۔ یہ پہلا افسانوی مجموعہ کلیاں کے بعد منظر عام پر آیا۔ عصمت کا یہ ناول ان کے چند دوستوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس ناول پر ناصر حسین کی ہدایت میں فلم بھی بن چکی ہے۔ جو بے حد مقبول ہوئی ہے۔ یہ ایک جذباتی اور رومانی ناول ہے جس پر نوجوان گروپ کی جذباتیت اور رومانیت غالب ہے۔ اس میں فکری سطح پر طبقاتی تفریق کی پیش کش کے علاوہ اور کوئی خاص بات نظر نہیں آتی ہے۔

"ضدی" کے بعد عصمت کا دوسرا ناول "ٹیڑھی لکیر" ہے۔ جسے ۱۹۴۴ء میں یوپی کا رنر رامپور نے شائع کیا۔ عصمت کی ناولوں میں اس ناول کو غیر معمولی شہرت ملی۔ اس ناول میں عصمت نے اپنے بچپن سے جوانی تک کے تجربات و مشاہدات کو بڑی عمدگی کے ساتھ سمویا ہے۔ جنسی اور نفسیاتی الجھنوں کی گرہ کشائی میں بھی فنکارانہ بصیرت اور گہرائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ عصمت کا شاہکار ناول ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے خلیل الرحمان اعظمی لکھتے ہیں:

"عصمت کا سب سے اہم کارنامہ ان کا ناول "ٹیڑھی لکیر" ہے۔۔۔۔۔ اس میں نہ صرف یہ کہ مصنفہ کا اپنا مشاہدہ اور ذاتی تجربہ جھلکتا ہے بلکہ اس میں شمن کا جیتا جاگتا کردار بہت کچھ ان کی اپنی شخصیت کی بھی غمازی کرتا ہے۔۔۔ یہ ناول صحیح معنوں میں نفسیاتی ناول ہے اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور جزئیات کے ذریعے جس طرح عصمت نے ان نفسیاتی گرہوں کو کھولا ہے وہ ایک معجزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ عصمت نے اپنے افسانوں میں جستہ جستہ جن حقائق کی ادھوری عکاسی کی تھی۔ وہ اس ناول میں ایک مکمل تصویر بن کر سامنے آگئی ہے اور غالباً "ٹیڑھی لکیر" عصمت کی وہ افسانوی تخلیق ہے جہاں انھوں نے اپنے نوجوانی کے تجربات و مشاہدات کو ایک ایک کرکے استعمال کر لیا ہے اور اب اس سرمایہ میں کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔" ۵؎

"معصومہ" عصمت کا تیسرا ناول ہے۔ ۱۹۶۱ء میں اشتیاق پبلی کیشنز دریا گنج دہلی نے شائع کیا۔ یہ ناول بمبئی کے حالات پر مبنی ہے اور اس میں معاشرے میں پھیلی ہوئی اقتصادی بد حالی کی بنیاد بنایا گیا ہے، جس کی وجہ سے معصومہ گناہوں کے دلدل میں پھنس جاتی ہے اور اس کا جنسی استحصال ہوتا ہے۔ اس ناول میں بمبئی کی فلم نگری کے کچے چٹھے کو بھی منظر عام پر لایا گیا ہے۔ یہ ناول بھی عصمت کے ذاتی تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے لیکن اس کی پیش کش دیہی و قصباتی زندگی کے مسائل کی پیش کش کے مقابلے میں اتنی کامیاب نہیں ہے۔ نہ ہی اس میں کوئی خاص فکری بالیدگی نظر آتی ہے۔ ٹیڑھی لکیر کے مقابلے یہ بے حد کمزور ناول ہے۔

چوتھا ناول "سودائی" ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس پر "بزدل" کے نام سے فلم بن چکی ہے۔ اس ناول کی کہانی اور ایک عام فلمی کہانی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ صرف مالی ضرورت کے تحت لکھا گیا ناول معلوم ہوتا ہے، جس میں عصمت کی بصیرت و بصارت کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

پانچواں ناول "جنگلی کبوتر" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں میاں بیوی کی ازدواجی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول "عجیب آدمی" ۱۹۷۴ء میں ہند پاکٹ بکس، دریا گنج نے شائع کیا۔ یہ ایک فلم ڈائرکٹر کی زندگی پر مبنی ہے۔ یہی ناول "بہروپ نگر" کے نام سے پاکستان میں شائع ہوا ہے۔

ان کا آخری ناول "ایک قطرہ خون" ہے۔ یہ واقعات کربلا پر مبنی ہے۔ اسے ۱۹۷۵ء میں "فن اور شخصیت" والے صابر دت نے شائع کیا۔ عصمت کا یہ ناول موضوع اور پیش کش دونوں کے اعتبار سے عصمت کے تمام ناولوں سے بالکل مختلف ہے۔ ٹیڑھی لکیر کے بعد عصمت کا دوسرا کامیاب ناول یہی ہے۔ یہاں عصمت کی فکر میں نمایاں تبدیلی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس ناول کی تخلیق کی کہانی عصمت یوں بیان کرتی ہے۔

"مجھ پر بچپن سے علی اصغر کی شہادت کی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ محرم کی دھوم دھام کے پیچھے جو المیہ پوشیدہ تھا وہ مجھے سوچنے پر مجبور کرتا تھا کہ دنیا میں کتنے ہی تہوار منائے جاتے ہیں جیسے "دسہرہ" یا "کرسمس" لیکن دنیا میں صرف "محرم" ہی ایسا تہوار ہے جو معصوموں پر ہونے والے مظالم کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ مرثیے سن کر میں بے حد متاثر ہوا کرتی تھی۔ میں نے انیس کے مرثیے پڑھے مجلسوں میں پورے خلوص سے شرکت کی۔ غم حسین میں مجھے دنیا کے مظلوموں کا عکس نظر آیا اور ایک دل سوز کہانی ملی۔ اس کتاب کو لکھنے کے لیے میں نے زندگی سے بھی کانٹے اور زخم چنے اور امام حسین پر جو بیتی اسے صرف پڑھا ہی نہیں محسوس بھی کیا۔ میں نے غم حسین کو مشعل راہ

ساگر، ایک قطرہ خون، "لکھی"۔[7]

اس ناول کا اسلوب اور انداز بیان بھی دوسرے تمام ناول سے بالکل مختلف ہے۔ انداز بیان کی اس تبدیلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عصمت کہتی ہیں:

> "میں نے انیس کا انداز بیان چرانے کی کوشش کی ہے اور اپنا انداز بیان بالکل بدل دیا ہے کوشش کی ہے کہ میرا ایک جملہ نہ آنے پائے۔ اپنے دل سے کچھ نہیں لکھا۔ سب کچھ کتابوں سے لیا ہے"۔[7]
>
> "میں نے اپنے طرز تحریر کو بدلنے کی کوشش کی ہے اور نئی راہ پر چلنے میں بڑا لطف آیا"۔[8]

عصمت نے واقعات کربلا کو خالص اسلامی رنگ میں نہیں دیکھا ہے بلکہ اس کے انقلابی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے اور دنیا کی تمام انقلابی تحریک کے لیے اسے مشعل راہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

افسانوی مجموعوں اور ناول کے علاوہ عصمت کے ڈراموں کے دو مجموعے "دھانی بانکیں" (۱۹۴۷ء) اور "شیطان" بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ عصمت نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں اور ناول لکھے ہیں۔ یہ تینوں ناولٹ "تین اناڑی"، "نقلی راجکمار"، "دل کی دنیا" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور بچوں میں مقبول بھی ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ عصمت کی کہانیوں اور ڈراموں کے مختلف مجموعے مختلف ناموں سے شائع ہو چکے ہیں، جن میں کہانیوں اور ڈراموں کے انتخاب شامل ہیں۔ عصمت نے افسانے، ناول، ناولٹ، ڈرامے کے علاوہ متعدد خاکے، رپورتاژ اور سفرنامے اور مضامین بھی لکھے ہیں۔

عصمت کی یہ تمام تحریریں حیات انسانی کو درپیش گوناگوں مسائل سے بھرپور ہیں اور ہمیں ان مسائل کی حقیقی اور سچی عکاسی ان کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی تحریروں میں حقائق سے چشم پوشی کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ عصمت نے زندگی کو جس انداز سے دیکھا اس کو اسی انداز میں پیش کر دیا۔ شروع سے ہی سماج کی تمام نابرابری اور ناہمواری کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کر دی اور سماج کی توجہ ان مسائل کی طرف مبذول کرائی۔ یہ سب وہ مسائل تھے جن سے اب تک بیشتر ادیبوں نے چشم پوشی کر رکھی تھی اور سماجی و اخلاقی اقدار کی پابندیوں کی وجہ سے ان مسائل کے اظہار کی جرأت نہیں کر پائے تھے۔ عصمت نے ان اخلاقی اقدار کی بے جا پابندیوں کو توڑ کر ان مسائل پر کھلے عام اظہار خیال کیا۔ جس کی وجہ سے مطعون کی گئیں اور باغی بھی قرار دی گئیں۔ لیکن عصمت نے حوصلہ پست نہیں کیا بلکہ بے باکانہ اظہار کرتی رہیں۔

ان کی تحریروں سے عصمت کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک حقیقت پسند فکشن نگار کی ہے اور یہی عصمت کی عظمت بھی ہے اور ان کی شہرت و مقبولیت کی وجہ بھی۔

عصمت کی ادبی خدمات کے صلے میں انہیں سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے کئی اہم اعزازات و انعامات بھی ملے۔ ۱۹۷۵ء میں حکومت ہند نے "پدم شری" کا خطاب دیا۔ ۱۹۹۰ء میں مدھیہ پردیش حکومت نے "اقبال سمان" سے نوازا۔ اس کے علاوہ غالب ایوارڈ، فلم فیئر ایوارڈ، گورنمنٹ آف انڈیا ایوارڈ اور پرویز شاہدی ایوارڈ بھی ملے ہیں۔ گرچہ ان اعزازات و انعامات سے عصمت کے قد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ ان انعامات کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ضرور ہوا۔

نصف صدی تک ادبی افق پر جلوہ گر رہنے کے بعد فکشن کی دنیا کی یہ نابغہ ہستی لعل و جواہر کے ڈھیر چھوڑ کر ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ●

۱۔ عصمت چغتائی، آپ بیتی، فن اور شخصیت بمبئی، ستمبر ۱۹۷۹ء جلد ۴ شمارہ ۷، مارچ ۱۹۸۰ء ص ۱۷۹

۲۔ عصمت چغتائی۔ کاغذی ہے پیرہن، آج کل مارچ ۱۹۷۹ء، ص ۹۔

۳۔ ایضاً - - - - - - - - - ص ۱۰

۴۔ یونس اگاسکر، عصمت چغتائی سے گفتگو، مکالمات، دہلی، دسمبر ۱۹۹۱ء جلد ۱، شمارہ ۱۲، ص ۱۴۔

۵۔ خلیل الرحمان اعظمی، عصمت کے ناول اور افسانے، مکالمات عصمت نمبر۔ ص ۱۴۵۔

۶۔ جلیل نار بدایونی۔ ملاقات عصمت چغتائی سے، مکالمات عصمت نمبر۔ ص ۳۲-۳۱۔

۷۔ یونس اگاسکر۔ تفصیل حوالہ نمبر ۴۔ ص ۲۸

۸۔ یونس اگاسکر۔ تفصیل حوالہ نمبر ۴۔ ص ۲۸

بقیہ: مہاتما گاندھی — ایک مرد مجاہد

آزاد ہو گیا۔ اس طرح گاندھی جی کے متحدہ آزاد ہندوستان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ اسی لیے وہ آزادی کے جشن کے وقت دہلی سے کوسوں دور کلکتہ کی گلیوں میں فسادیوں کے خلاف تن تنہا صف آرا تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ خلیج کو پاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ گاندھی جی شکستہ دل تھوڑے ہی تھے جو ان ناکامیوں سے مایوس ہو کر یکسوئی کی راہ فرار اختیار کرتے۔ وہ اپنے اس مشن میں جی جان سے لگے رہے لیکن شاید کچھ ملک دشمن لوگوں کو ان کی یہ کارگزاری راس نہ آئی اور وہ ان کی جان کے پیاسے ہو گئے۔ یہ سماج دشمن عناصر اپنے اس مذموم ارادے میں ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو کامیاب ہو گئے۔ اس روز بھی گاندھی جی حسب معمول برلا ہاؤس کی پرارتھنا سبھا میں ۵ بج کر دس منٹ پر تقریر کرنے کے لیے جا رہے تھے کہ ناتھورام ونایک گوڈسے نے ان پر گولی چلائی اور دنیا کا یہ عظیم مرد مجاہد "ہے رام" کہتے ہوئے ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

گاندھی جی کا پیغام

گاندھی جی نے بذات خود کہا کہ "عالم کے لیے میرے پاس کوئی نیا پیغام نہیں ہے۔ صداقت اور عدم تشدد پہاڑیوں کے مانند قدیم ہیں"۔ انھیں دو بنیادی مرکزوں پر گاندھی جی کے تمام فلسفے کا انحصار ہے۔ سچ کی تلاش میں انھیں عدم تشدد کے اصول سے بڑی رہنمائی ملی۔ انھوں نے عدم تشدد کو "ذریعہ" اور سچ کو "مقصد" مانا۔ ان کا خیال تھا کہ انسانی اقدار اور عدم تشدد لازم و ملزوم ہیں۔ عدم تشدد عفو و درگزر کی اعلاترین منزل ہے۔ اگر گاندھی جی کے اس فلسفۂ حیات کو صحیح طور سے عملی جامہ پہنایا جائے تو وہ ایک نسخۂ کیمیا ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ ایک صحت مند اور مہذب سماج کی تعمیر نو ہو سکتی ہے، جو عصر حاضر کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ ●

شمس قدر آزاد

دِل عظیم آبادی

محمد عابد دل عظیم آبادی ہمارے پرانے اور خوشگو شعراء میں سے ہیں۔ یہ میر و سودا کے ہم عصر تھے۔ بارہویں صدی ہجری کے آخر میں اور تیرہویں صدی کی ابتدا میں چند برسوں تک عظیم آباد میں شعر و شاعری کا چرچا رہا اس میں دل اور ان کے چھوٹے بھائی محمد روشن جوشش کی کوششوں کو خاصا دخل ہے۔ دونوں بھائی نومسلم تھے اور مشہور فارسی شاعر شیخ علی حزیں کے فیض صحبت سے مسلمان ہوئے۔ دل اپنے عہد کے مستند شعراء میں سے تھے وہ شاعری کے ساتھ ساتھ طبابت، علم ہیئت اور ریاضی سے بھی گہری دلچسپی لیتے تھے اور ان کا شمار اپنے عہد کے ممتاز اہل علم میں تھا۔ تذکرہ نگاروں نے انھیں "یگانۂ عصر" بھی لکھا۔ زبان کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے اور بعد بہ عہد ادبی و لسانی خصوصیات سے آگاہ ہونے کے لیے دل کے کلام کا مطالعہ ضروری ہے۔

دل کی شاعری موضوعات کے اعتبار سے اپنے عہد کی عام روش سے مختلف نہیں ہے اس میں صوفیانہ لب و لہجہ بھی ہے اور رندی و سرمستی کے مضامین بھی، عشق و عاشقی کی کیفیات بھی ہیں اور ہستی ناپائدار کا ماتم بھی۔ ان کے دیوان میں جا بجا ایسے اشعار نظر آتے ہیں، جو پڑھنے والوں کے لیے ادبی مسرت کا باعث ہیں۔

دل کا کلام لسانی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس میں آج سے دو سو سال پہلے کی زبان ملتی ہے۔ بہت سے ایسے الفاظ اور محاورے نظر آتے ہیں، جو آجکل متروک ہیں اور زبان کا وہ روپ بھی نظر آتا ہے۔ جو دہلی لکھنؤ کی زبان سے مختلف تھا۔

دل نے صاحب دیوان ہونے کی تمام شرائط پوری کی ہیں۔ ان کی قدردانی ان کے دور کے ارباب کمال نے کم نہیں کی ہے۔ ان کے کمال کا اعتراف ان کے معاصر تذکرہ نگاروں نے بھی کیا ہے اور ان کی تحسین بھی کی ہے۔ مگر جس خصوصیت پر تذکرہ نگاروں نے سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ وہ منظر عام پر نہ آسکی بہرحال ایسے باکمال استادوں کے دیوان سے اب تک ارباب ذوق نہ آشنا تھے اور دل کو وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے ان کا دیوان اب تک عوام کی نظروں میں نہ آسکا تھا لیکن کچھ دنوں سے تحقیقات کرنے والوں نے انھیں کھوج نکالا۔ دل کا شاعرانہ کمال غزلوں میں نمایاں ہے۔ نہ تمثیں جیست ہیں، غزلوں میں وہ بات نہیں جسے "پراگندہ خیالات" کہتے ہیں۔ مضامین میں تسلسل ہے اور غزلیں مربوط ہیں۔ میر حسن کی زبان میں وہ "مربوط گو اور مرد قابل ہیں"۔ ان کی غزل گوئی پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری ہے ان کی غزلوں کا غائر مطالعہ کیا جائے۔ دوسرے شاعروں کی طرح دل بھی اپنے بعض پیش روؤں یا معاصرین سے متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے درد، سودا، میر، فغاں اور راسخ عظیم آبادی کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اس کا اعتراف بھی کیا ہے ؎

دل یہ غزل کہی ہے فغاں کی غزل کو سن
پر اتنا ہے کہ قافیے ہم اور کر لیے

لیے گا جو میر سے کبھی دل
ابی بھی غزل سنائیے گا

راسخ کی ایک غزل ؎

راسخ خودی کو دخل نہیں بزم یار میں
یوں جاؤں واں کہ اپنے تئیں بھی خبر نہ ہو

دل ؎

کیجیے اگر گلہ دل خود رفتہ کا عبث
کس کی خبر لے وہ جسے اپنی خبر نہ ہو

دل کے دیوان کا جب تحقیقی مطالعہ کیجیے تو ان کے کلام میں کئی خاص باتیں معلوم ہوں گی جو ان کی شاعری کی خصوصیات میں داخل ہیں کہیں لکھتے ہیں کہ ؎

زور آوری فکر تو دل بس ہے اس قدر
جو قافیہ خیال میں آیا بٹھا دیا

اور کہیں کہتے ہیں کہ ؎

شعر میں حاصل نہیں دل گفتگو تقطیع کی
بس سخن کے تولنے کو فہم کی میزان ہے

تو کیا دل اپنے زمانے میں آزاد نظم گوئی کی طرفداری بھی کرتے ہیں کہ شعر میں تقطیع کی چنداں ضرورت نہیں یا ایرانی روش سے ہٹ کر شاعری کی نئی راہ ایجاد کرنا چاہتے ہیں۔ مگر انھوں نے خود کوئی نمونہ ایسا پیش نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولانا روم کے ہم خیال تھے۔

عظیم آباد کی عام سخن سنجی اور صوفیانہ شاعری بھی اپنے آپ میں ایک بے مثال تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دل ایک صوفی شاعر ہیں اور صوفیانہ کلام سے ان کا دیوان بھرا ہے۔ اس لیے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاقی تعلیم وہی ہے جو صوفیہ کی ہے یعنی تسلیم و رضا۔ فقر و فنا۔ صبر و توکل اور عمل وغیرہ اس کی مثال ان کے اشعار میں ملتی ہے ؎

باقی ہے صدا پر

داتا مارکیٹ پیر بہور۔ پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۶

م۔ک۔مہتاب

خبردار

مجھے جو خط ملا اس کا عنوان تھا "خبردار"۔ خط صرف ایک سطر کا تھا: "اگر تم نے منجیت کور کے معاملے میں مداخلت کی تو تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔" نیچے لکھا تھا "تمہارا جانی دشمن"۔

خط پاکر میں سشش و پنج میں پڑ گیا کہ میرا جانی دشمن کوئی کیوں ہو سکتا ہے۔ میں نے کسی کا کچھ بگاڑا نہیں اور جہاں تک منجیت کور کا تعلق ہے اس سے میرا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

البتہ اتنا ضرور ہے کہ منجیت کور کی لڑکی ستالو میرے لڑکے ونود کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ ونود ہی ستالو کو ہمارے گھر لایا تھا اور جب ونود نے ہمیں بتایا کہ ستالو کے ماں باپ گاؤں میں رہتے ہیں، ستالو ہوسٹل میں رہتی ہے تو ہم نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ جب بھی اداس ہو ہمارے ہاں آکر ایک دو دن گزار سکتی ہے۔ وہ ایک دو بار اتوار کے دن ہمارے ہاں ٹھہری بھی تھی۔ جب ستالو کے والدین شہر میں اس سے ملنے آئے تو وہ ان کو بھی ہمارے ہاں لے آئی تھی۔ اس کا والد سرون سنگھ اور والدہ منجیت کور دونوں ہی بہت اچھے تھے۔ گاؤں میں ان کی کھیتی تھی۔ سرون سنگھ ملازمت بھی کرتا تھا۔ کھیتی کا کام اس کے بھائی دیکھتے تھے یا اس کی بیوی منجیت کور۔

سرون سنگھ ایک بس حادثہ میں ہلاک ہو گیا تھا۔ ستالو نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی حالاں کہ میں نے منجیت کور کو یقین دلایا تھا کہ اگر منجیت کور ستالو کو تعلیم مکمل کرنے دے تو ہم اس کے سرپرست بن کر اس کی ہر ضرورت پوری کرتے رہیں گے۔

لیکن قدامت پرست دیہی معاشرے میں رہنے والی منجیت کور نے بیوہ ہو جانے کے بعد یہ مناسب خیال نہیں کیا کہ وہ شہر آتی جاتی رہے یا بن باپ کے لڑکی کو شہر میں رہنے کے لیے چھوڑ دے۔ وہ لوگوں کی اٹھتی ہوئی انگلیوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس قطع تعلق کے باوجود منجیت کور سے ہمارا خط۔کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ اپنے گھریلو معاملات کے بارے میں ہم سے مشورہ مانگ لیا کرتی تھی۔

سرون سنگھ کی ملازمت کے دوران منجیت کور متمول تو نہیں اچھی گزربسر کرنے والی عورت تھی۔ وہ جب بھی شہر آتی تھی ہمارے بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات خواہ وہ ناریل کی گری والا گاؤں کا گڑ ہی کیوں نہ ہو لے آتی تھی۔

لیکن سرون سنگھ کی وفات کے بعد اس کے دن اچھے نہیں رہے تھے۔ بھائیوں نے زمین تین حصوں میں تقسیم کر دی تھی۔ منجیت کور صرف کھیتی کی آمدنی سے اپنی دو لڑکیوں اور ایک لڑکے کی گزربسر کر رہی تھی۔

زمین کا جس ڈھنگ سے بٹوارہ کیا گیا تھا اس سے منجیت کور خوش نہیں تھی اس نے گاؤں کی پنچایت سے بھی رجوع کیا تھا۔ اول تو گاؤں کے بزرگوں نے ہی اس کی حوصلہ شکنی کی تھی کہ اسے اپنے خاندان کی عزت کا خیال رکھتے ہوئے پنچایت میں جانا ہی نہیں چاہیے۔ اور جب وہ میرے مشورے پر پنچایت میں گئی بھی تو کسی شخص نے اس کی طرفداری نہیں کی۔ سب پنچ اور ان کے حواری سرون سنگھ کے بھائیوں کے ساتھ تھے۔

ان کا کہنا تو یہ تھا کہ منجیت کور سرون سنگھ کے بھائیوں کو بدنام کرنے کے لیے پنچایت میں چلی آئی ہے حالاں کہ انھوں نے منجیت کور کو سرون سنگھ کے حصے سے زیادہ زمین دے دی ہے۔

لیکن زمین کی آمدنی سے منجیت کور اور اس کے بچوں کی گزربسر نہیں ہو رہی تھی۔ ستالو ایک بار شہر آئی تو ونود سے ملنے کے لیے ہمارے گھر چلی آئی۔ اس نے ہی ہمیں بتایا کہ ان کی مالی حالت کمزور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے والد کے وفات کے بعد منجیت کور کو کوئی فیملی پنشن نہیں ملی۔ زمین بیشک ان کے حصے میں زیادہ آئی ہے لیکن زمین ناقص ہے، ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کئی حصوں میں شورہ دار زمین ہونے کے سبب کچھ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مزارعہ بہت کم رقم دیتا ہے۔

میں نے ستالو سے کاغذات لے کر دوڑ دھوپ کی تھی۔ منجیت کور کی چار سو روپیہ فیملی پنشن منظور ہو گئی تھی۔ اگر منجیت کور کے معاملہ میں اتنی سی مداخلت کے لیے کوئی میرا جانی دشمن بن جائے تو اس میں میرا کیا گناہ ہے۔

ہاں آپ اسے مداخلت ضرور کہہ سکتے ہیں کہ سرون سنگھ کے بڑے بھائی سودا گر سنگھ

1A/۷۸ پچھم وہار نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۶۴

نے اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے لیے شانو کا رشتہ مانگا تھا اور میں نے منجیت کور سے کہا تھا کہ وہ یہ رشتہ منظور نہ کرے کیوں کہ وہ لوگ اس کی زمین کے لالچ میں یہ رشتہ مانگ رہے ہیں۔ اس کے بعد خاندان میں ناچاقی بڑھ گئی تھی اور منجیت کور نے مجھے لکھا تھا کہ وہ لوگ مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ انھوں نے شانو اور میرے لڑکے دلوند کے بارے میں گاؤں میں افواہ بھی اڑائی تھی جو کچھ دیر بعد اپنے آپ دب گئی تھی۔

منجیت کور کی کمزور مالی حالت کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس کے پاس زمین اچھی نہیں تھی۔ اگر اسے بھی زرخیز زمین ملتی تو وہ بھی سروں سنگھ کے دوسرے بھائیوں کی طرح خوشحال ہو سکتی تھی۔ زمین کے دام بڑھ گئے تھے لیکن منجیت کور کی حالت ویسی کی ویسی ہی تھی۔

ایک بار منجیت کور بچوں کو لے کر شہر آئی تو میں نے اسے بتایا کہ اب پنچایتی راج کا نیا نظام شروع ہو گیا ہے۔ پنچایتوں کو زیادہ اختیارات دے دیے گئے ہیں۔ اگر پہلی پنچایت نے اس کی عرضی پر غور کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اب ایسا نہیں ہوگا کیوں کہ یہ معاملہ سننے کا اختیار اس پنچایت کو حاصل ہو گیا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ پنچایتوں میں ایک تہائی ممبر خواتین ہیں اب اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا کہ وہ خاندان کی عزت کو نیلام کر کے انصاف حاصل کرنے کے لیے پنچایت میں کیوں آئی ہے؟

جب منجیت کور کو میں نے ان باتوں سے خبردار کیا تو اس نے رازداری کے لہجہ میں مجھے بتایا کہ ہاں ان کی پنچایت میں بھی دو بزرگ عورتیں پنچ ہیں اور ان میں سے ایک عورت تو وہ ہے جو اس سے شانو کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے مانگ رہی ہے۔

اس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے ایک وکیل دوست کے ذریعے اسے درخواست تیار کرا دی کہ مشترکہ خاندان کی زمین تین برابر حصوں میں تقسیم کی جانی چاہیے۔ زرخیز زمین بھی برابر تقسیم ہو اور بنجر بھی۔ ایک بیوہ پر مہربانی کر کے اسے زیادہ زمین کا لالچ دے کر بے انصافی نہیں ہونی چاہیے۔

اور جس روز وہ درخواست پنچایت میں پیش ہوئی منجیت کور کے ساتھ وہ وکیل بھی گیا۔ پنچایت کے کسی مرد پنچ کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ منجیت کور کو ملامت کرے کہ وہ جا کر گھر بیٹھے اس سے انصاف ہو چکا ہے۔ دونوں خواتین پنچوں نے منجیت کور کی حوصلہ افزائی کی۔ اسے بیٹھنے کے لیے کرسی دی اور اس سے کہا کہ وہ گھونگھٹ اتار کر اپنی بات پنچایت میں کہے۔

جب دونوں خواتین پنچوں نے کہا کہ ہاں اس عورت پر رحم کے نام سے ظلم کیا جا رہا ہے تو مرد پنچوں کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ منجیت کور کی درخواست میں دم ہے اور درخواست داخل کر لی گئی۔

سروں سنگھ کے بھائیوں نے زمین کی مالیت آڑے میں درخواست رد کرانے کی کوشش کی لیکن منجیت کور کے وکیل نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اور اس کے بعد مجھے وہ خط ملا جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔

لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب مجھے دھمکی دینے سے کیا حاصل تھا۔

اور میرے وکیل دوست نے دوسری پیشی کے بعد مجھے آکر بتایا کہ زمین کی تقسیم کے فیصلہ پر ضلع کی سطح پر نظر ثانی ہو رہی ہے۔ اب مجھے دھمکی دینے سے کیا حاصل تھا۔ میں نے تو صرف ایک مظلوم عورت کو نئے قانون اور اس کے حق کے بارے میں خبردار یا آگاہ کیا تھا۔

اور اب منجیت کور کو اس کے حصہ کی زمین مل چکی ہے۔ اس نے بینک سے قرضہ لے کر ٹیوب ویل بھی لگوا لیا ہے اور میری اطلاع کے مطابق اس برس اسے ربیع اور خریف دونوں فصلوں سے اچھی آمدنی ہوئی تھی۔

منجیت کور نے شانو کی شادی اسی خاتون پنچ کے لڑکے سے طے کر دی ہے۔ لڑکے اور لڑکی کی ماں دونوں شہر میں کپڑا خریدنے آئیں تو ہمارے گھر بھی آئیں۔ منجیت کور نے مجھے شادی میں شرکت کے لیے دعوت دی تو میں نے اپنی دراز میں سے وہ دھمکی بھرا خط نکال کر اسے دکھا دیا۔

شانو کی ساس نے وہ خط لے کر اپنے جیب میں رکھ لیا اور بولی

"آپ کو میں دعوت دیتی ہوں۔ آپ بچوں کو لے کر گاؤں آئیے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے کہ زمانہ کس طرح بدل رہا ہے۔"

مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں ایک نئے دور کے نقیب کی آواز سن رہا ہوں۔ ●

بقیہ: ارناکلم میں شیرخوار بچوں کی بہبود

یہ کام بطور مہم انجام دینے کے لیے کہا گیا اور اسے سماجی ذمہ داری سمجھ کر انجام دینے کے لیے کہا گیا۔ ان گروپوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اپنے عملے کو تربیت دیں۔ اور اس کام سے چوکیداروں، وارڈ بوائے اور دیگر ملازمین کو جوڑا جائے۔ یہ لوگ ماؤں کو سمجھائیں کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلا کر کیا کیا فائدے حاصل کر سکتی ہیں۔ ان لوگوں کو کہا گیا کہ وہ بے بی فوڈ بنانے والوں سے کوئی رعایت نہ مانگیں، نہ ان کی طرف سے کوئی تحفہ قبول کریں۔

امور صحت کی عالمی تنظیم اور یونیسیف کے قواعد کی روشنی میں ہر وہ اسپتال بچوں کا دوست ہونے کا درجہ حاصل کرے گا۔ اگر وہ دس نکاتی رہنما خطوط پر عمل کرے۔ ہر اسپتال میں ماں کے دودھ کے فائدوں کی پالیسی تحریری شکل میں مرتب کرنے کو کہا گیا۔ اس میں یہ واضح کرنے کو کہا گیا کہ ہر اسپتال اپنے عملے کو تربیت دے گا اور عملہ حاملہ عورتوں کو شیر مادر کے فائدے سمجھائے گا۔ بے بی فوڈ بنانے والوں کو اسپتال میں داخل عورتوں سے نہ ملنے دیا جائے اور ان کو کسی طرح کا اشاعتی مواد بانٹنے کی اجازت نہ دی جائے۔ وہ عملے یا حاملہ عورت کو کوئی تحفہ مفت نہیں دے سکتے۔ اسپتالوں کے احاطوں میں اس طرح کے تحفوں کو قبول کیا جانا ممنوع کیا گیا۔ ۱۹ اسپتالوں میں ایسی سہولتیں ہیں جہاں بچوں کی ماؤں کو دودھ پلانے کے فائدے سمجھائے جاتے ہیں۔ ان اسپتالوں کو بچوں کے دوست اسپتال کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مزید چار اسپتالوں کو بھی اسی زمرے میں لایا جا رہا ہے جس کے بعد ارناکلم پورے ملک میں بچوں کی بہبود کے لیے پہلا دوست ضلع بن جائے گا۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے کہ سارے ملک کے لوگوں کو اس کی تقلید کرنی چاہیے۔ اس میں خرچ کچھ نہیں مگر اس کے فائدے بہت زیادہ ہیں۔ ●

ایک قلندر کے نام...

(سیّد احمد خاں کی نذر)

ملکہ نسیم

بہائے علم کے دریا
سرابوں کو حقیقت دی
گماں کی رات نے پائی
یقیں کی روشنی تم سے
تمہاری فکر سے بانگِ درا بن کر
جگایا سوئے ذہنوں کو
رہے کوشاں!
کہ ہو تعلیمِ نسواں عام ملت میں
ہراک قریے میں، گھر آنگن میں، آنچل میں
سمٹ آئے نئی تہذیب
جن میں پرورش پائے ہوئے
پھولوں کی خوشبو کو
زمانے کے مقابل فخر سے رکھ کر
کریں ہندوستاں کا نام اونچا
یہ مقصد تھا تمہاری زندگی کا!
تمہیں نے ہاتھ رکھا نبضِ دوراں پر
سے تریاق اس زہر ہلاہل کا
جہالت کی رگ و پے میں جو گردش کر رہا تھا
رکھا تعلیم کے دستِ حنائی پر
چراغوں کو
سجایا آنچلوں سے پرچم فتح و ظفر تم نے
لٹائے مخزنِ تعلیم سے لعل و گہر تم نے
تمہیں نے رنگ زاروں کے مزاجوں کو بدل ڈالا
اتارے ہیں تمہیں نے قافلے
خوش رنگ پھولوں کے
جلا کر وحشتوں کی شام میں
قندیلِ آگاہی
جہالت کے برہنہ جسم کو علم و ہنر کے
پیرہن بخشے
قدامت کے اندھیروں سے نکالا قوم کو تم نے
تمدن کے چراغوں کو جلایا قریہ قریہ
بستی بستی
ہند کے گھر گھر میں تم نے روشنی بھر دی!

۳۵۴۳۔ باریوں کی گلی، موتی کٹلہ بازار۔ جے پور (راجستھان)

غزل

نثار جیراجپوری

تخیل پر دھنک چھائی ہوئی ہے
جواں جب سے یہ تنہائی ہوئی ہے

یہ کون آیا لیے چاہت کی خوشبو
معطر دل کی انگنائی ہوئی ہے

کبھی آباد تھی دل کی یہ بستی
سرِ دیوار جو ڈھائی ہوئی ہے

جو تھے کوہِ گراں لگتی تھی پہلے
وہی نظروں میں اب رائی ہوئی ہے

انھیں کے دم سے ہر جانب نثار اب
سراپے حال میں رعنائی ہوئی ہے

شبلی نیشنل پی۔ جی۔ کالج۔ اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱۔ یوپی

غـــــــــزلیں

معصوم انصاری

عکس آنکھوں میں جب اترتا ہے
ایک طوفاں سا ابھرتا ہے

میرا دشمن بھی آج کل مجھ سے
میٹھے لہجے میں بات کرتا ہے

سچ یہ ہے کہ میں جیتا ہوں
ورنہ مرنے سے کون ڈرتا ہے

وہ غم دل ہو یا غم دنیا
ہم نے سنجیدگی سے برتا ہے

بند ہو سکتی ہے گھڑی لیکن
وقت پھر بھی کہاں ٹھہرتا ہے

جب کبھی میں سوچتا ہوں بارش ہو
میرا گھر مجھ پہ طنز کرتا ہے

اب تو ہر ایک سانس پر معصوم
حادثے کا گماں گزرتا ہے

۴/۷۹۷-۱-۲۳، عاشر اسٹیمس کے پیچھے
مغل پورہ، حیدرآباد، (اے پی) ۲-۵

عبدالحمید خاں عزم یوسفی

ڈوبی جو دل کی نبض ہوئی شام زندگی
آئی قضا تو ٹوٹ گیا دام زندگی

سارے گناہ عشق حقیقی نے دھو دیے
آئینہ بن گیا مرا انجام زندگی

جب دل کو ان کے غم کی حصار اس آ گئی
ہر سانس پر ملا مجھے پیغام زندگی

رندوں میں آ بسا ہوں سرور حیات سے
پینے دو مجھ کو بادۂ آلام زندگی

ایسا شجر تلاش کرو اے مسافرو
ملتا ہو جس کے سائے میں آرام زندگی

اے عزم ان کو ملتا ہے جو خوش نصیب ہیں
حسن یقیں کی شکل میں انعام زندگی

۲۷/۳۴۸۔ سید بلڈنگ تیسری منزل
بالا کمپاؤنڈ، بھیونڈی۔ ۴۲۱۳۰۲

غلام جیلانی ساغر

گر ہمیں دہر میں کچھ نام کمانا ہو گا
دیش کے پیار کو آنکھوں میں بسانا ہو گا

آپ انسان کو انسان سمجھتے ہیں اگر
دوست جو روٹھ گیا اس کو منانا ہو گا

ناز شہرت پہ نہ عزت پہ نہ عظمت پہ کرو
اس بھری بزم سے اک روز تو جانا ہو گا

بھول جانا ہے ہمیں پچھلی چمن بندی کو
پھر نئے طرز سے گلشن کو سجانا ہو گا

امتحاں ایک ہے یہ زیست کی مہلت ساغر
لاکھ طوفاں سہی خود کو بچانا ہو گا

۱۲/۷۴۳۔ داؤد سرائے سہارنپور یوپی۔ ۲۴۷۰۰۱

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

فولاد کی پیداوار کی لاگت
تقابلی مطالعہ

صنعتی لاگتوں اور قیمتوں سے متعلق بیورو (بی آئی سی پی) نے حال ہی میں فولاد کی صنعت کی لاگت کے بارے میں ایک مطالعاتی رپورٹ میں بھارت میں تیار شدہ فولاد کی پیداواری لاگت کا کوریا اور جاپان کے ساتھ اور ملک کی قابلِ فروخت فولاد کا امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔

اس رپورٹ کے مطابق ملک میں ۹۵-۱۹۹۴ء میں تیار شدہ فولاد کی فی ٹن لاگت ۶۵ر۴۱۱ ڈالر (سیل بوکارو) اور ۵۰ر۲۶۵ ڈالر (سیل بھلائی) رہی۔ کوریا میں یہ لاگت ۷۷ر۵۰۶ ڈالر اور جاپان میں ۱۳ر۵۹۱ ڈالر رہی ہے۔

۱۹۹۴ء میں ملک میں قابلِ فروخت فولاد کی فی ٹن لاگت (سیل: ۴۰۰ ڈالر) امریکہ میں ۵۰۳ ڈالر اور برطانیہ میں ۴۲۳ ڈالر رہی۔ ●

اپریل۔ جولائی ۱۹۹۶ء کے دوران مال بھاڑے کی نقل وحمل سے ریلوے کی آمدنی

ریلوے کو موجودہ مالی سال کے پہلے چار ماہ کے دوران مال بھاڑے کی نقل وحمل سے ۲۹ر۴۳۵ کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی۔ جب کہ گزشتہ سال اسی مدت کے دوران اس محکمہ کو ۱۸ر۹۱۴ کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی۔ اس مدت کے دوران ۱۲ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن سے زائد مال بھاڑہ کی نقل وحمل عمل میں آئی۔

مال بھاڑہ کی اس مجموعی آمدنی میں سے کوئلہ کی نقل وحمل سے ۷۶ر۲۲۴ کروڑ روپے حاصل ہوئے، فولاد کے کارخانوں کے لیے خام مال سے ۲۷ر۲۵۶ کروڑ روپے، فولاد کے کارخانہ میں تیار شدہ لوہے اور فولاد کی نقل وحمل سے ۲۲ر۳۸۹ کروڑ روپے برآمد کیے جانے والے خام لوہے کی نقل وحمل سے ۱۸ر۱۰۸۱ کروڑ روپے، سیمنٹ سے ۸۴ر۳۲۴ کروڑ روپے، اناج سے ۵۷ر۳۷۴ کروڑ روپے، کھادوں سے ۱۱ر۱۶۴۱ کروڑ روپے، پٹرولیم سے ۴۵ر۸۲۲ کروڑ روپے، تیل اور اس سے متعلق اشیا اور دیگر اشیا سے ۲۱ر۵۳۴ کروڑ روپے حاصل ہوئے۔

رواں سال کے جولائی ماہ کے دوران ریلوے نے مال بھاڑے کی نقل وحمل کے ضمن میں ۱۲۱ر۱۳۱ کروڑ روپے کمائے جب کہ گزشتہ سال کی اسی ماہ کی مدت کے دوران محکمہ نے ۲۵ر۲۵۳ کروڑ روپے کی آمدنی کی تھی۔ جولائی ماہ کے دوران ۳ کروڑ تیس لاکھ ٹن سے زائد مال بھاڑے کی نقل وحمل سے عمل میں آئی۔ ●

ٹرین ڈسکرائبر سسٹم

ایک ٹرین ڈسکرائبر سسٹم ۳۵۲۵۲۴ پونڈ اسٹرلنگ کی ایف او بی لاگت سے ۲۷ مارچ ۱۹۹۴ء سے نئی دہلی کے علاقے میں نصب کیا گیا ہے۔ یہ نظام نصب کیے جانے کے دن سے ہی کام کر رہا ہے۔ یہ نظام ریل کی کارکردگی اور مسافروں کے لیے اطلاعات کی تشہیر کے سلسلے میں کافی مفید ہے۔ ●

کونکن ریلوے لائنیں

کونکن ریلوے پروجیکٹ کی ۹۲ سرنگوں میں سے، جس کی کل لمبائی ۸۴ر۸۳ کلومیٹر ہے، مجموعی طور سے ۴۲ر۱۵ کلومیٹر لمبی نو سرنگوں کے سلسلے میں ابتدا میں مختلف ناسازگار ارضیاتی حالات کی وجہ سے مسائل پیش آرہے تھے۔ یہ مسائل چھت گرنے، مٹی کے بہنے، پانی کے بہت زیادہ رساؤ وغیرہ کی شکل میں سامنے آرہے تھے۔ ان نو سرنگوں میں سے ۳ سرنگوں کو چھوڑ کر باقی سرنگیں بنا لی گئی ہیں ان تین سرنگوں میں جو گوا میں واقع ہیں تقریباً ۵۰۶ میٹر لمبا زمین دوز راستہ ابھی تیار کیا جانا باقی ہے۔ کونکن ریلوے کارپوریشن نے سرنگ تیار کرنے والے سرکردہ ملکی اور غیر ملکی انجینئروں کی مشاورتی خدمات حاصل کی ہیں۔ اس مقصد کے لیے خصوصی مشینیں بھی حاصل کی گئی ہیں اور روزانہ اعلیٰ ترین سطح پر کام کی پیش رفت کی نگرانی کی جارہی ہے۔ ●

تھانے ریلوے اسٹیشن کی تعمیر نو

ریلوے نے ممبئی میں مرکزی ریلوے پر تھانے ریلوے اسٹیشن کی تعمیر نو کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کام پر ۲۹ر۵ کروڑ روپیہ خرچ آئے گا اور اس کے لیے ۹۷-۱۹۹۶ء کے دوران ۸ر۱ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ کام شروع

کرنے اور اس کی تکمیل کے سلسلے میں یقینی طور سے مدت مقرر نہیں کی جاسکتی کیوں کہ اسٹیشن کی موجودہ عمارت سے متصل ریلوے کی زمین پر بہت سے غیر قانونی قبضے ہیں نیز دو کانیں بنی ہوئی ہیں۔ جب تک یہ غیر قانونی قبضے ہٹائے نہیں جاتے اس وقت تک تعمیر کا کام رکا رہے گا۔ ●

یورینیم اور تھوریم کی برآمدات

تھوریم کے استعمال کے بارے میں ملک سے باہر سائنسی گروپوں کے درمیان سائنسی نوعیت کا تبادلۂ خیال ہوا ہے۔ ہمارے ملک میں تجارتی پیمانے پر قابل استعمال یورینیم کے ذخائر درمیانے درجے کے ہیں ان کی خود ہمارے نیوکلیائی بجلی کے پروگرام کے لیے ضرورت ہوگی اس لیے حکومت یورینیم برآمد کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔

جاپان، برازیل اور یوروپین کمیشن کے سائنٹی فک گروپوں کے ساتھ حال ہی میں گفت و شنید ہوئی ہے۔ انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی (آئی اے ای اے) بھی اس طرح کے تبادلۂ خیال کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے۔ تاہم اس وقت تک کوئی پختہ اشتراک عمل وجود میں نہیں آیا ہے۔

۱۹۸۴ء میں ہندوستان نے ایک نیوٹرون جنریٹر سورس کے ساتھ تھوریا کی ۱۷ اچھڑیے دایکول پالی تکنیک فیڈرل ڈی لزانے سوئزرلینڈ) میں طبیعاتی مطالعہ کے لیے مہیا کی تھیں، پبلک سیکٹر کے ادارے انڈین ریئر ارتھس لیمیٹڈ (آئی آر ای) نے جو محکمہ ایٹمی توانائی کے انتظامیہ کنٹرول میں کام کرتا ہے، ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۱ء تک کے درمیان چین کو ۵۰ ٹن، امریکہ کو ۳ ٹن، فرانس کو ۱۶۰ ٹن اور ملیشیا کو ۱۲۰۰ ٹن مونورائٹ برآمد کیا ہے۔ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۶ء تک کی مدت میں اس نے مغربی جرمنی کو ۱۰ ٹن، آسٹریلیا کو ۱۰۰ ٹن، مشرقی جرمنی کو ۱۸۷ ٹن جاپان کو ۴ ٹن اور بنگلہ دیش کو ۳۰ ٹن تھوریم نائٹریٹ برآمد کیا۔ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۲ء تک کی مدت میں آئی آر ای نے مشرقی جرمنی کو ۵۷ ٹن، آسٹریلیا کو ۱۲۵ ٹن اور برطانیہ کو ۱ ٹن تھوریم آکسائڈ برآمد کیا۔

آئی آر ای نے ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۰ء تک کی مدت میں آسٹریلیا کو ۱۲۰ ٹن اور مشرقی جرمنی کو ۱۹۱۰ ٹن تھوریم اوکسیلیٹ بھی برآمد کیا۔ ●

کروم اور خام مینگانیز کی برآمدات

گزشتہ تین سالوں اور یکم اپریل ۱۹۹۶ء تا ۳۱ر جولائی ۱۹۹۶ء کے موجودہ مالی سال کے دوران خام کروم اور خام مینگانیز کی برآمدات درج ذیل ہے:-

(مقدار ٹنوں میں
قیمت ہزار روپیوں میں)

سال	خام کروم مقدار	خام کروم قیمت	خام مینگانیز مقدار	خام مینگانیز قیمت
۱۹۹۳-۹۴	۳۰۸۲۶۷	۷۳۵۲۳۳	۲۸۶۴۵۰	۳۸۰۲۸۴
۱۹۹۴-۹۵	۳۹۰۲۱۲	۱۰۲۷۳۲۲	۲۷۶۵۹۸	۳۴۵۷۱۵
۱۹۹۵-۹۶	۳۴۷۷۰۵	۱۶۰۸۴۱۲	۲۳۸۱۵۷	۳۳۴۱۴۴
۱۹۹۶-۹۷	۱۲۰	۶۱۴۷۰۰	۲۲۰۰۰۰	۳۱۰۰۰۰

ان دھاتوں کی مجموعی مانگ اور سپلائی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ●

بھاپ سے چلنے والے ریل انجنوں کا مرحلے وار خاتمہ

اس وقت ہندوستانی ریلوے میں بھاپ سے چلنے والے ریل کے ۱۷۷ انجن میٹر گیج پر اور ایسے ۲ انجن نیرو گیج پر چل رہے ہیں۔ ریلوے نے پالیسی کے طور پر فیصلہ کیا ہے کہ سیاحوں کے لیے اہمیت کے حامل کچھ سیکشنوں کو چھوڑ کر جہاں اس طرح کے ریلوے انجن کشش کا باعث ہوں گے، اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے بھاپ سے چلنے والے ریل کے انجنوں کی جگہ مرحلہ وار ڈیزل اور بجلی سے چلنے والے ریل کے انجن چلائے جائیں۔ ●

دیہی دست کاروں کے لیے اوزار

دیہی دست کاروں کو جولائی ۱۹۹۲ء سے بہتر اوزار فراہم کرائے جا رہے ہیں۔ دست کاروں کو بہتر اوزار فراہم کرانے کی اسکیم مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام (آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی) کی ایک ذیلی اسکیم ہے۔ ابتدائی طور پر اس کو صرف منتخبہ اضلاع میں شروع کیا گیا تھا لیکن بعد میں ۹۶-۱۹۹۵ء سے مرکز کے زیر انتظام علاقوں، دہلی اور چنڈی گڑھ کو چھوڑ کر پورے ملک کے لیے اس کی توسیع کر دی گئی ہے۔

اس اسکیم کے تحت بنکروں، درزیوں سوئی کا کام کرنے والوں اور بیڑی کے کاریگروں کو چھوڑ کر باقی ان تمام دست کاروں کو بہتر اوزار فراہم کیے جاتے ہیں جو کہ خط غربی کے نیچے آتے ہیں۔ اس اسکیم کا مقصد ان لوگوں کی دستکاری کے معیار، مقدار اور ان دست کاروں کی اشیا کی فروخت کی صلاحیت میں اضافہ کرنا ہے۔ ان اوزاروں کی اوسط لاگت دو ہزار روپے رہے گی۔ . . . . ان دست کاروں کو ان اوزاروں کی لاگت کا اپنی طرف سے صرف دس فی صد ادا کرنا ہوگا اور باقی ماندہ ۹۰ فی صد لاگت مرکز کی طرف سے سبسڈی کے طور پر دی جائے گی۔

اس اسکیم کے تحت ۴۵ سو روپے کی لاگت تک کے بجلی سے چلنے والے اوزاروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ لاگت والے اوزاروں پر مربوط دیہی ترقیات پروگرام کے تحت دیے جانے والے قرضوں سے احاطہ کیا جائے گا۔ ضلع کی سطح پر ڈی۔ آر۔ ڈی۔ اے یعنی ضلعی ترقیاتی ادارہ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے میں مرکزی کردار ادا کرے گا۔

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

فون 6177591

ترئین وکتابت افتخار احمد خاں

سرورق : جیتندر سنگھ

جلد ۱۶ شمارہ : ۸

نومبر ۱۹۹۶ء (۱۰ کارتک تا ۹ اگرہائن تک ۱۹۱۸)

قیمت فی شمارہ ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱ ۱۱۰

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) : ڈی۔ ایس۔ گاندھی

مضامین سے متعلق

خط کتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (ویسٹ) نئی دہلی ۶۶ ۱۱

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

پروفیسر ایس۔ آر۔ ہاشم

غریبی کی وسعتیں اور تخفیفِ غریبی کا ہمارا اندازِ نظر

پروفیسر ایس. آر. ہاشم، ممبر پلاننگ کمیشن نے کچھ عرصہ قبل نئی دہلی میں "رادھا کمل مکرجی" لیکچر دیا تھا جس میں انھوں نے ملک میں غریبی کی وسعتوں اور غریبی کم کرنے کی کوششوں کے لیے بنیادی انداز نظر پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ زیر نظر مضمون ان کے اسی لیکچر کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ (ادارہ)

اگر ہم غریبوں کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ غریبوں کی آبادی کتنی ہے اور ملک کے کن حلقوں میں ان کی اکثریت ہے، ان کی زیادہ تعداد شہری علاقوں میں ہے یا دیہی علاقوں میں اور ہمارا غریبی کا مفہوم کیا ہے۔ ان معلومات میں انھیں لوگوں کی دلچسپی ہوگی جو کسی نہ کسی طرح غریبی ختم کرنے کی کوششوں سے وابستہ ہیں۔ غریبوں کی آبادی کے بارے میں ہمارا اندازہ اور خطِ غربت کی ہماری تشریح خود غریبوں کے کسی مصرف کی نہیں ہے کیوں کہ جو لوگ غربت میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ اپنی حالت سے بخوبی واقف ہیں اور اس کا اندازہ خود لگا سکتے ہیں کہ کسی مدت میں ان کی حالت بہتر ہوئی ہے یا ابتر۔ تعداد سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ غریبی کم پھیلی ہوئی ہے یا زیادہ اس کے بھی ان کے لیے کوئی معنی نہیں ہیں۔

تعداد کی اہمیت ان کے لیے ہے جو غریب نہیں ہیں لیکن غریبی کے بارے میں فکرمند ہیں یا جن کا پالیسی سازی میں ہاتھ ہوتا ہے یا جو غریبی ختم کرنے کے لیے کچھ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے غریب آبادی کے حجم کا حقیقت پسندانہ اندازہ لگانا ضروری ہے۔ غیر حقیقت پسندانہ اندازے سے ہمارے تناظر میں فرق آسکتا ہے اور جب غریبی کے نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم ہکا بکا رہ جاتے ہیں۔

خطِ غربت کی تشریح

لہٰذا ضروری ہے کہ غریبی کی ایک سادہ سی تشریح کی جائے اور اسے سادہ اور قابل پیمائش اشاریوں میں بیان کیا جائے۔ غریبی کی تشریح صرف ایک اشاریے سے کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ غریبی کی صرف ایک ہی سمت یا عمق ہے جو وہ اشاریہ ظاہر کرتا ہے۔ غریبی بہت سی محرومیوں کو ظاہر کرتی ہے اور ان میں سب سے بڑی محرومی ہے "قوت خرید کی کمی" جس کی وجہ سے غریب زندگی کی کم از کم ضروریات کی بھی تکمیل نہیں کر سکتا۔ قوت خرید کی یہ کمی کئی اور قسموں کی بے بسی اور محرومی کی وجہ بنتی ہے مثلاً اپنی پسند کی چیز چننے کی آزادی میں کمی، کئی دوسری آزادیوں میں جو کسی فرد کو حاصل ہونی چاہئیں، کمی، تعلیم اور معیارات صحت میں گراوٹ اور عام انسانی ترقی حاصل کرنے کی صلاحیت میں سخت کمی۔ اس کے علاوہ بھی محرومیاں ہوسکتی ہیں جن کا قوت خرید میں کمی سے سیدھا تعلق نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کسی دور دراز پہاڑی علاقے میں رہنے والے لوگ سماج کے وسیع تر طبقے سے آسان رابطہ اور مواصلات کی سہولت سے محروم ہوسکتے ہیں۔ بعض محرومیاں سماجی، نسلی یا صنف پر مبنی امتیازات کی وجہ سے ہوسکتی ہیں۔ یہ سب ایک ہی اشاریے سے ظاہر نہیں کی جاسکتیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس قسم کی محرومیوں پر الگ سے غور کیا جائے۔ تاہم "اوسط فی کس ماہانہ اخراجات" سے ظاہر ہونے والی قوت خرید ایک واحد طاقتور اور سادہ اشاریہ ہے۔ جو انسانوں کی بہت سی محرومیوں کا آئینہ دار ہوسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ غریبی کی پیمائش "قوت خرید" سے کی جاتی ہے اور یہ پیمانہ ایک بڑی حد تک نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر ہمیں اس کا اندازہ ہو کہ ایک شخص یا گھر کو ایک سطح پر اپنا رہن سہن برقرار رکھنے کے لیے کم از کم کتنی قوت خرید حاصل ہونی چاہیے اور اگر قوت خرید اس سے ذرا بھی کم ہو تو اسے غریب سمجھا جائے گا۔ قوت خرید کی اس سطح کو "خط غربت" کہا جاسکتا ہے اس معنی میں کہ یہ خط آبادی کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک تو وہ جس کے پاس اتنی یا اس سے زیادہ قوت خرید ہے اور دوسرا وہ جس کے لوگوں کے پاس اتنی قوت خرید بھی نہیں ہے اور اس لیے انھیں غریب کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں خطِ غربت

کی تشریح کرنے کی کوشش پہلی بار ۱۹۶۲ء میں سرکردہ ماہرین معاشیات اور سماجی مفکروں کے ایک ورکنگ گروپ نے کی تھی۔ یہ ورکنگ گروپ پروفیسر ڈی۔ آر۔ گاڈگل، ڈاکٹر جی۔ ایس۔ گھوشی، ڈاکٹر پی۔ ایس۔ لوک ناتھن، شری ایم آر۔ مسانی، شری اشوک مہتہ، شری پیتامبر پنت، ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ، شری شری من نارائن اور شری انا صاحب سہسر بدھی پر مشتمل تھا۔ اس ورکنگ گروپ نے آئی۔ سی۔ ایم۔ آر کی (۱۹۵۸ء کی) سفارشات کے مطابق ایک کم از کم خوراک کو ذہن میں رکھنے اور ایک کم از کم معیار زندگی کے بارے میں کافی غور و خوض کے بعد کم از کم اخراجات کی ایک قومی سطح ۱۹۶۰-۶۱ء کی قیمتوں کی بنیاد پر دیہی علاقوں کے لیے ۲۰ روپے فی کس فی ماہ اور شہری علاقوں کے لیے ۲۵ روپے فی کس فی ماہ تجویز کی۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ بھی تجویز کیا کہ شہری علاقوں میں کم از کم اخراجات کی اس سطح پر ایک ہاؤسنگ سبسڈی پر بھی غور کرنا ضروری ہوگا۔ اس کے بعد خط غربت کی تشریح کرنے میں موٹے طور پر یہی انداز نظر اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ یہ اس بات پر مبنی ہے کہ رہن سہن کی سطح کم از کم ایسی ہو جس میں خوراک کی ضرورتیں اور زندگی کی دوسری ضروریات مثلاً کپڑا، مکان، صحت، تعلیم اور تفریح وغیرہ پوری ہو سکیں۔ خط غربت یہ فرض کر کے چلتا ہے کہ پبلک سامان خصوصاً صحت اور تعلیم کے شعبے میں ایک خاص سطح تک دستیاب ہوتا رہے گا، گو عملی دشواریوں کے سبب خط غربت کو، پبلک گڈز (عوامی ضرورت کے سامان) کی دستیابی میں ہونے والے تغیر کے مطابق ڈھالنا یا تبدیل کرنا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

ورکنگ گروپ کے ایسا کام ختم کر لینے کے بعد ایک خط غربت تیار کرنے کے کام میں رہن سہن کی کم از کم سطح کو ماپنے کی کوشش کی گئی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ غربت کو ماپنے کی مشق کا مقصد غربت کو کسی ٹھوس اصطلاح میں ماپنا تھا تاکہ غریبی کی سطحوں میں ہونے والی تبدیلیوں پر اس ٹھوس تشریح کی روشنی میں نگاہ رکھی جا سکے۔

تاہم غربت کی نسبتی نوعیت کو یکسر نظر انداز کرنا مشکل رہا ہے۔ حتیٰ کہ رہن سہن کی کم از کم سطح کا نظریہ بھی کسی معنی میں ایک نسبتی نظریہ ہے۔ یہ آمدنی کی سطح اور پورے سماج کی ترقی سے نسبت رکھتا ہے۔ اگر سماج کی آمدنی کی سطح میں کوئی بھاری تغیر ہوتا ہے تو 'کم از کم' کے نظریے میں بھی بھاری تبدیلی ہوگی۔

رہن سہن کی ایک 'کم از کم' سطح تلاش کرتے ہوئے ڈانڈیکر اور رتھ نے ۱۹۷۱ء میں ایک فوڈ باسکٹ (خوراک کی ٹوکری) تیار کی جو ایک شخص کو ایک دن میں ۲۲۵۰ کیلوریز (حرارے) مہیا کر سکتی تھی۔ اس ضمن میں ایک اہم بات یہ تھی کہ یہ باسکٹ صارفین کی ان ترجیحات کی بنا پر تیار کی گئی تھی جن کا انکشاف اخراجات صارفین کے بارے میں نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن (این ایس ایس او) کے ۱۹۶۰-۶۱ء کے سروے میں کیا گیا تھا۔ دراصل یہ "باسکٹ" پورے ملک کے لیے ایک اوسط "باسکٹ" ہو سکتی تھی کیونکہ یہ کسی ایک خطے کے لوگوں کی ترجیحات صرفہ کی صحیح نمائندگی نہیں کرتی تھی۔ لیکن ایسی ہی مستقل ایک علاقائی سطح پر بھی کی جا سکتی تھی۔ اخراجات صارفین کے سروے میں مندرج لاگتوں کی بنیاد پر خوراک کی اس باسکٹ کی قیمت نکال کر خوراک پر ہونے والے خرچ کی کم از کم ضروری سطح نکالی جا سکتی تھی۔ اخراجات صارفین کے سروے سے ان لوگوں کے، جو خوراک پر اتنا خرچ کرنے کو تیار تھے، مجموعی اخراجات صرفہ معلوم کر کے ایک خط غربت تیار کیا جا سکتا تھا۔ اس بات کو دہرانا ضروری ہے کہ خط غربت رہن سہن کے مجموعی اخراجات کی نمائندگی کرتا ہے جس میں خوراک پر ہونے والے خرچ کے ساتھ دوسری ضروریات کا خرچ بھی شامل ہے۔ ایک آدمی کو کم از کم جتنی کیلوریاں چاہئیں اس کا حساب لگاتے وقت صرف خوراک کے خرچ کو ہی شمار میں لایا گیا۔ غیر خوراکی اشیا کا وہی خرچ شمار میں لایا گیا جو لوگوں نے حقیقتاً خرچ کیا۔ ان لوگوں نے جو کم از کم مطلوبہ کیلوریز لینے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ڈانڈیکر اور رتھ نے خط غربت کے لیے ۱۹۶۰-۶۱ء کی قیمتوں پر دیہی علاقوں کے لیے ۱۵ روپے فی کس فی ماہ اور شہری علاقوں کے لیے ۲۲٫۵۰ فی کس فی ماہ کی سطح تجویز کی۔ ظاہر ہے کہ ڈانڈیکر اور رتھ کا تجویز کردہ خط غربت ورکنگ گروپ کے تجویز کیے ہوئے خط غربت سے کم تھا۔ اس کے بعد سے خط غربت متعین کرنے میں ڈانڈیکر اور رتھ کے انداز نظر کو ہی اپنایا گیا، لیکن ان کے تجویز کردہ اعداد کو نہیں۔

آج جس خط غربت کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اس کی جڑیں کم از کم ضرورتوں اور حقیقی کنزمپشن ڈیمانڈ کے بارے میں ۱۹۷۹ء منصوبہ بندی کمیشن کی چھٹی منصوبہ بندی کی ڈویژن کے اندر قائم کی گئی ٹاسک فورس کی سفارشوں میں پیوست ہیں۔ اس ٹاسک فورس نے اپنی سفارشات نیشنل سیمپل سروے کی ۲۸ راؤنڈ (۱۹۷۳-۷۴ء) کی تفصیلات کی بنیاد پر مرتب کیں۔ ٹاسک فورس نے کیلوریز لینے کی سطح دیہی علاقوں کے لیے ہر روز فی کس ۲۴۰۰ کیلوریز اور شہری علاقوں کے ہر روز فی کس ۲۱۰۰ کیلوریز متعین کی۔ ڈانڈیکر کے انداز نظر کو اپنانے اور ۱۹۷۳-۷۴ء کی کنزمپشن (کھپت) تفصیلات استعمال کرتے ہوئے یہ سفارش کی کہ دیہی علاقوں کے لیے خط غربت کی سطح ۴۹٫۰۹ روپے فی کس فی ماہ اور شہری علاقوں کے لیے ۵۶٫۶۴ روپے فی کس فی ماہ متعین کی جانی چاہیے۔ یہی خط غربت قیمتوں میں اضافے کے مطابق رد و بدل کے بعد سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں زیادہ تر استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ خط غربت صرف قوت خرید یعنی ایک خاص کم از کم ضروری سطح پر ضرورتوں کو پورا کرنے کی اہلیت کو ظاہر کرتا ہے۔ کوئی بھی شخص جو اتنی یا اس سے زیادہ قوت خرید رکھتا ہے وہ خط غربت سے اوپر اور غیر غریب سمجھا جاتا ہے۔ تاہم ممکن ہے کہ ایک شخص جو خط غربت سے اوپر ہے اپنی قوت خرید کو اس طرح نہ خرچ کرتا ہو کہ اس کی کم از کم ضروریات پوری ہو سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے شراب وغیرہ پر اڑاتا ہو اور اپنی خوراک کی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر ہو۔ ہمارے مقاصد کے لیے وہ اب بھی "غیر غریب" سمجھا جائے گا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ ایک آدمی کے لیے کیلوریز لینے کی ایک کم از کم حد مقرر ہے جو بنیادی اس کی غذائی ضرورتوں کے سے

تکمیل کر سکتی ہے، تاہم خط غربت سے اوپر ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی غذائی ضرورتیں یقینی طور پر پوری ہو رہی ہیں۔ دراصل غربت خط تعدیہ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ گزشتہ برسوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی آبادی کے اخراجات کے ڈھانچے میں بڑی تبدیلی رونما ہوتی رہی ہے۔ ہندوستان میں یہ تبدیلی ۷۰ کی دہائی کے آغاز سے زیادہ نمایاں رہی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ کیلوریز کی کم از کم ضروری مقدار سے زیادہ کیلوریز لے سکتے تھے وہ بھی ۔ ۔ ۔ بہتر خوراک لینے کے لیے کیلوریز کی تعداد گھٹانے لگے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ خوراک کی باسکٹ متنوع صورت اختیار کرنے لگی اور دودھ، پھلوں اور سبزیوں پر زیادہ خرچ کیا جانے لگا اور زیادہ کیلوریز مہیا کرنے والے اناج پر کم۔ یہ بات آبادی کے خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والے طبقے کے ضمن میں بھی صحیح پائی گئی۔ آئی۔ سی۔ ایم۔ آر بھی کیلوریز کی مجوزہ سطح گھٹاتی رہی ہے۔ دراصل کیلوریز کی کم از کم ضروری سطح حیاتیاتی اور غذائی ضرورتوں کے مطابق طے کیا گیا کوئی اصول ہونے کے بجائے ایک "شماریاتی مشاہدہ" ہے۔ کئی سائنس دانوں نے اور خاص کر پی۔ وی۔ سکھ آتمے نے یہ دکھایا ہے کہ دراصل جسم میں دستیاب توانائی پر اکتفا کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے اس طرح کہ اس کے عام افعال میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ اس لیے ہمیں خط غربت میں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ وہ مسلسل کم از کم ضروری کیلوریز مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔ اس کے بجائے ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیے کہ قوت خرید لگاتار حاصل ہو۔ اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ لوگوں نے اس قوت خرید کا استعمال کیسے کیا ہے۔

این۔ ایس۔ ایس۔ او نمونہ جاتی بنیاد پر گھریلو اخراجات کا ایک قومی سروے کرتی ہے۔ وہ پانچ سال میں ایک بار ۱۲۵ ہزار گھروں کے سیمپل پر مشتمل ایک بڑا سروے کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہر سال ۲۵ سے ۳۰ ہزار گھروں پر مشتمل نمونہ جاتی سروے بھی کرتی ہے۔ یہ تمام سروے مختلف گھروں کے اشیائے ضروریہ کے اخراجات کی سطح اور ڈھانچے اور خرچ کے مختلف زمروں کے بارے میں خط غربت کی مدد سے ہمیں یہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور کتنے لوگ خط غربت سے اوپر اور کتنے خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔

بہت پہلے پتا لگایا گیا تھا کہ اگر ہم این۔ ایس۔ ایس۔ او کی تفصیلات سے گھروں کے اخراجات صرف یعنی عام کھپت کی چیزوں کے اخراجات کے (CONSUMPTION EXPENDITURE) کا کل جوڑ معلوم کر لیں تو وہ "قومی نجی اخراجات صرف" (NATIONAL PRIVATE CONSUMPTION EXPENDITURE) کے اس تخمینے سے کم ہوگا جو نیشنل اکاؤنٹس اسٹیٹسٹکس نے مرتب کیا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ان دونوں کے درمیان تقریباً ۵ فی صد کا فرق تھا جو ۷۰ کی دہائی کے اختتام تک بڑھ کر دس گیارہ فی صد ہو گیا۔ منصوبہ بندی کمیشن کے ۱۹۷۹ء میں قائم کردہ ٹاسک فورس نے یہ سفارش کی کہ این۔ ایس۔ ایس کی تفصیلات سے حاصل شدہ ہندسہ کو بڑھا کر اسے نیشنل اکاؤنٹس اسٹیٹسٹکس کے ہندسہ کے برابر کر دیا جائے۔ اس کے لیے این۔ ایس۔ ایس کی تفصیلات کو ایک تطبیقی عنصر کے بقدر، جو دونوں ہندسوں کے درمیانی فرق کا تناسب ہے، بڑھانے کی ضرورت ہوگی۔ ٹاسک فورس نے یہ سفارش بھی کی کہ اسی طرح غریبی کا اندازہ لگانے سے پیشتر این۔ ایس۔ ایس تفصیلات کے تمام اخراجاتی زمروں میں اخراجات کی سطح کو بھی بڑھانا ہوگا۔ یہ تطبیق اس "سرکاری طریقہ کار" کا ایک حصہ بن گئی جو منصوبہ بندی کمیشن تب سے غربت کا اندازہ لگانے کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تطبیقی عنصر میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۸۳ء میں یہ بڑھ کر ۲۱ فی صد اور ۱۹۸۷ء میں ۲۸ تا ۳۰ فی صد ہو گیا۔ اس وقت یہ تطبیقی عنصر ۳۵ تا ۴۰ فی صد کے لگ بھگ ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک دیے ہوئے اخراجاتی زمرہ میں آپ اخراجات کی ایک سطح دیکھتے ہیں پھر اسے ۳۵ سے ۴۰ فی صد بڑھا دیتے ہیں تاکہ ۱۰۰ روپے کے جو اخراجات آپ کے مشاہدہ میں آئے تھے وہ ۱۴۰-۱۳۵ روپے کی مفروضہ سطح پر آ جائیں۔ پھر اس "تطبیق شدہ" ڈاٹا کی بنیاد پر خط غربت سے نیچے رہنے والے افراد کی تعداد کا اندازہ لگائیں۔ اس طریق کار سے غریبوں کی جو تعداد نکلے گی وہ اس سے بہت کم ہوگی جو این۔ ایس۔ ایس تفصیلات سے ان میں کوئی "تطبیق" کیے بغیر نکلے گی۔

یہ مسئلہ عالموں اور اسکالروں کو کافی عرصے سے پریشان کرتا رہا ہے۔ پروفیسر منہاس نے اس بارے میں گہری ریسرچ کی اور لکھا ہے۔

(الف) قومی سطح پر گھریلو اخراجات کا کل جوڑ نیشنل اکاؤنٹس اسٹیٹسٹکس (این۔ ایس۔ اے) کے قومی نجی اخراجات صرف (نیشنل کنزمپشن اکسپینڈیچر) جتنا نہیں ہے۔ این۔ ایس۔ اے کے نجی اخراجات صرف میں نجی اداروں کے اخراجات صرف بھی شامل ہیں۔

(ب) این۔ اے۔ ایس کے قومی نجی اخراجات صرف تمام اشیاء کی مجموعی پیداوار میں سے ایک خاص تناسب کو (جو اشیاء کی نوعیت کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے) سرمایہ سازی کے لیے گھٹانے کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جو تناسب استعمال کیے جاتے ہیں وہ پرانے اور ساکن ہیں۔ اگر سرمایہ سازی کا کمتر اندازہ لگایا جائے تو اس کا نتیجہ اخراجات صرف کے فزوں تر اندازے کی شکل میں برآمد ہو سکتا ہے اور اس امر کا غالب امکان ہے۔

(ج) اچھی طرح سے سوچ سمجھ کر کیے گئے سیمپل سروے سے حاصل ہونے والی تفصیلات جوں کی توں استعمال کی جانی چاہئیں۔ لیکن سبھی جانتے ہیں کہ اندازے کی غلطی کے تھوڑی بہت گنجائش تو رہتی ہی ہے۔ یہ پانچ فی صد یا زیادہ سے زیادہ ۱۰ فی صد ہو سکتی ہے۔ غلطی کی یہ گنجائش کمتر یا فزوں تر اندازے کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ لیکن غلطی ہمیشہ ایک ہی سمت میں نہیں ہو سکتی۔ سیمپل سروے کی تفصیلات میں بڑے پیمانے کی مداخلت اسے کسی بھی استعمال کے لائق نہیں رہنے دیتی۔ لہٰذا اگر خلوص اور دیانت داری سے یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ این۔ اے۔ ایس کی تفصیلات میں نہ صرف کل جوڑوں میں بلکہ تمام زمروں کے

اخراجات میں ۳۵ تا ۴۰ فی صد تطبیق کی ضرورت ہے تو اس سیمپل سروے کی تفصیلات کوئی بھی اندازہ لگانے کے لیے بے کار ہیں۔ اگر جوڑ بھروسے کے قابل نہیں ہے تو جوڑ کی تقسیم اور بھی کم بھروسے کے لائق ہوگی۔ اس وقت سرکاری طریقِ کار میں جو بات مضمر ہے وہ یہ ہے کہ آپ جوڑ کو تو قبول نہیں کرتے مگر جوڑ کی تقسیم کو قبول کرتے ہیں۔

(د) اس بات کی کافی شہادت موجود ہے کہ دونوں اندازوں کے فرق سے، اگر اسے مایا جاسکے تو، اخراجات کے مختلف زمروں پر کافی مختلف اثر پڑے گا۔ دراصل سب سے زیادہ اثر تو ان اشیاء پر پڑے گا جنہیں "کنز یومر ڈیو ریبلز" (دیرپا اشیائے صرف) کہا جاسکتا ہے۔ "دیرپا اشیائے صرف" کا اوپری طبقوں کے اخراجات میں ایک بڑا حصہ ہوتا ہے۔ خوراک اور خوراکی اشیاء کا فرق بہت تھوڑا ہوتا ہے اور ان اشیاء کا کمتر اخراجات والے طبقوں کی اخراجاتی ٹوکری میں بہت زیادہ حصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا خطِ غربت کے آس پاس کی آبادی کے ضمن میں فرق باقی آبادی کے مقابلے میں بہت کم ہوگا۔ یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ دیرپا اشیائے صرف کا زمرہ ایسی اشیاء کا زمرہ ہوتا ہے جنھیں سرمایہ جاتی سامان کہا جاسکتا ہے لیکن ایسا کہنا اس بات پر منحصر ہوگا کہ ان کا کیا استعمال کیا جاتا ہے۔

منصوبہ بندی کمیشن نے غریبوں کے تناسب اور تعداد کا اندازہ لگانے کے بارے میں ۱۹۸۹ء میں ایک ایکسپرٹ گروپ مقرر کیا تھا جسے غریبی کا اندازہ لگانے سے متعلق تمام متنازعہ امور پر غور کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ ایکسپرٹ گروپ (یا لکڑا والا کمیٹی) نے مسئلے پر گہرائی سے غور کرنے اور اس موضوع کے بارے میں تمام لٹریچر کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ سفارش کی کہ غریبی کا اندازہ این۔ اے۔ ایس کی تفصیلات کی سایز اور ان میں کوئی تطبیق کیے بغیر لگایا جانا چاہیے۔

ایکسپرٹ گروپ نے وقت گزرنے کے ساتھ خطِ غربت کو تازہ ترین بنانے کی سفارشات بھی پیش کیں۔ اس نے سفارش کی کہ خطِ غربت کے آس پاس رہنے والے لوگوں کے رہن سہن کے اخراجات سے تعلق رکھنے والی قیمتوں کی تبدیلیوں کو ظاہر کرنے کے لیے ایک خاص انڈکس (اشاریہ) بنایا جائے۔ ایکسپرٹ گروپ نے یہ سفارش بھی کی کہ ہر ریاست کے لیے اس کے اپنے قیمتوں کے اشاریوں کی بنیاد پر خطِ غربت الگ الگ متعین کیا جائے۔ غریبوں کی تعداد کا ریاست وار اندازہ لگانے کے بعد تمام ریاستی اندازوں کو جوڑ کر پورے ملک میں غریبوں کی تعداد کا اندازہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔ غربت کے سرکاری اندازے گوشوارہ-۱- میں اور ایکسپرٹ گروپ کے تجویز کیے ہوئے طریقے کی بنیاد پر لگائے گئے اندازے گوشوارہ-۲- میں پیش کیے گئے ہیں۔ میں ایکسپرٹ گروپ کے طریقے کی حمایت کروں گا۔ (اس لیے بھی کہ میں خود اس گروپ کا ممبر سکریٹری تھا) گوشوارہ-۲- میں دیکھا جاسکتا ہے کہ ۸۰ کی دہائی میں غربت میں کمی کا تیز تر رجحان موجود تھا۔ غریبی کی سب سے کم سطح ۸۹-۱۹۸۸ء اور ۹۰-۱۹۸۹ء میں دیکھی گئی۔ یہ تھی ۳۴ سے ۳۵ فی صد تک۔ اگلے کچھ سالوں میں غربت کی سطح بڑھ کر کم و بیش وہی ہوگئی جو ۱۹۸۷ء میں تھی اور تب سے وہ اسی سطح پر برقرار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ۹۴-۱۹۹۳ء میں اس میں کچھ کمی واقع ہوئی ہو۔

گوشوارہ نمبر ۱
غریبی کا تناسب
سرکاری اعداد و شمار

سال	غریبی کا تناسب: دیہی	غریبی کا تناسب: شہری	غریبی کا تناسب: مجموعی	خطِ غربت: دیہی	خطِ غربت: شہری	تطبیقی عنصر
۱۹۸۳ء	۴۰٫۴ (۳۲٫۶)	۲۸٫۱ (۲۱٫۸)	۳۷٫۴ (۳۰٫۱)	۱۰۱٫۸۰	۱۱۷٫۵	۱٫۲۱ (۱٫۳۳)
۸۸-۱۹۸۷ء	۳۳٫۴ (۳۰٫۰)	۲۰٫۱ (۱۷٫۹)	۲۹٫۹ (۲۶٫۹)	۱۳۱٫۸۰	۱۵۲٫۱۳	۱٫۴۲ (۱٫۲۷)
۸۹-۱۹۸۸ء	۲۲٫۵	۱۴٫۲	۲۰٫۴	۱۴۲٫۵	۱۶۴٫۴۵	۱٫۳۶
۹۰-۱۹۸۹ء	۲۰٫۳	۱۳٫۳	۱۸٫۵	۱۵۲٫۵	۱۷۶٫۱۰	۱٫۳۵
۹۱-۱۹۹۰ء	۱۹٫۷	۱۰٫۸	۱۷٫۴	۱۶۹٫۶۰	۱۹۵٫۸۰	۱٫۴۲
۱۹۹۱ء	۲۰٫۵	۱۲٫۹	۱۸٫۵	۱۹۱٫۲	۲۲ ٫۷۰	۱٫۳۵
جولائی-دسمبر ۱۹۹۲ء	۲۲٫۹	۱۳٫	۲۰٫۳	۲۱ ٫۴	۲۴۲٫۸	۱٫۴۲
۹۴-۱۹۹۳ء	۲۱٫۰	۱۴٫	۱۹٫۰	-	-	۱٫۳۵

(بریکٹ میں نظرثانی شدہ اعداد درج کیے گئے ہیں)
- نظرثانی کے بعد یہ ۲۵٫۲ فی صد ہے۔
- ۸۸-۱۹۸۷ء کے لیے تطبیقی عنصر نظرثانی کے بعد ۱٫۳۶ فی صد ہے۔

گوشوارہ نمبر۔۲

غریبی کا تناسب

ایکسپرٹ گروپ کے اعداد و شمار

سال	غریبی کا تناسب			خطِ غربت	
	دیہی	شہری	مجموعی	دیہی	شہری
۱۹۸۳ء	۴۵٫۶	۴۲٫۲	۴۴٫۸	۸۹٫۴۵	۱۱۷٫۶۴
۱۹۸۷ء۔۸۸	۳۹٫۱	۴۰٫۱	۳۹٫۳	۱۱۵٫۴۳	۱۶۵٫۸۸
۱۹۸۸ء۔۸۹	۳۹٫۲	۳۸٫۴	۳۹٫۱	۱۲۸٫۶۳	۱۷۸٫۶۵
۱۹۸۹ء۔۹۰	۳۳٫۷	۳۶٫۰	۳۴٫۳	۱۳۳٫۵۷	۱۸۹٫۹۵
۱۹۹۰ء۔۹۱	۳۵٫	۳۷٫۰	۳۵٫۶	۱۴۸٫۳۷	۲۱۵٫۳۲
۱۹۹۱ء	۴ ٫	۳۷٫۶	۳۹٫۴	۱۷۹٫۲۶	۲۴۴٫۰۰
جولائی۔دسمبر ۱۹۹۲ء	۴۱٫۷	۳۰٫۱۸	۴ ٫۱۷	۱۸۷٫۰۵	۲۵۵٫۲۰
۱۹۹۳ء۔۹۴	-	-	۳۷٫۱۰	-	-

غریبی ختم کرنے کا چیلنج

غریبی کا خاتمہ آخری نصب العین ہے جب کہ غریبی میں کمی کرنا اس نصب العین کی طرف بڑھنے کا عمل ہے۔ اگر یہ نصب العین ایک مقررہ وقت کے اندر حاصل کیا جانا ہے تو غریبی میں کمی لانے کے عمل کو تیز کرنا ہوگا۔

تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ غریبی کم کرنے میں عام اقتصادی ماحول کے بعض عناصر بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ شرح ترقی ایک اہم عنصر ہے۔ اگرچہ قطرہ قطرہ ٹپکنے کا عمل غریبی کے مسئلے کو حل کرنے میں اس عمل کی کامیابی کے بارے میں زیادہ اعتماد پیدا نہیں کرتا یہ دیکھا گیا ہے، خصوصاً ہمارے سیاق و سباق میں، کہ اگر ترقی کی رفتار تیز ہے تو اس کا اثر غربت پر پڑتا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کی تین دہائیوں میں ہندوستانی معیشت کی اوسط شرح ترقی قریباً ۳٫۵ فی صد سالانہ تھی۔ اس سے فی کس آمدنی میں ایک فی صد سالانہ سے کچھ زیادہ کا اضافہ ہوا۔ قطرہ قطرہ ٹپکنے کا عنصر رہ ہونے کے برابر تھا۔ ۸۰ کی دہائی میں ہندوستان نے اوسطاً ۵٫۷ فی صد کی شرح ترقی حاصل کی۔ اضافۂ آبادی کی شرح بھی دو فی صد گھٹی۔ اس سے فی کس سالانہ آمدنی میں ۳٫۷ فی صد کی شرح اضافہ حاصل ہوئی۔ فی کس سالانہ آمدنی میں ایک فی صد سے بڑھ کر ۳٫۷ فی صد اضافہ ہونے سے غریبی رفتہ رفتہ کم کرنے میں کافی زیادہ مدد ملی۔ یہی وہ مدت تھی جس میں غریبی کی سطح میں تیزی سے کمی آئی۔ لیکن ۱۹۹۱ء۔۹۲ میں ترقی کی اس رفتار میں خلل واقع ہوا اگرچہ لگتا یہ تھا کہ یہ پھر بڑھی ہے۔

عام اقتصادی ماحول کا ایک اور اہم عنصر زرعی پیداواریت میں اضافہ ہے جس کا اثر غریبی پر براہ راست اور تیزی سے پڑتا ہے۔ غریبوں کی تقریباً ۸۰ فی صد تعداد دیہی علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ دیہات کی اقتصادی سرگرمیوں کی جڑیں زراعت میں گہری ہوتی ہیں۔ زرعی پیداواریت اور پیداوار میں اضافے سے نہ صرف زمین پر براہ راست روزگار بڑھتا ہے بلکہ بالواسطہ روزگار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ زرعی ترقی کا آمدنی کی تقسیم کا سلسلہ غریبوں کے لیے بہت اچھا اور موافق ہے۔ زرعی ترقی کا لوگوں کی بہت بڑی تعداد پر ظاہرہ اثر پڑتا ہے۔ جہاں جہاں ریاستوں اور خطوں میں زرعی انقلاب آیا ہے ان میں غریبی میں تیزی سے کمی ہوئی ہے۔ یہ بات گوشوارہ ۔۴ میں دیکھی جا سکتی ہے کہ جب کہ ۱۹۸۷ء۔۸۸ میں غریبی کی کل ہند سطح ۳۹٫۳ فی صد تھی، پنجاب میں یہ ۱۲٫۷ فی صد، ہریانہ میں ۱۶٫۶ فی صد اور ہماچل پردیش میں ۱۵٫۴ فی صد تھی۔

خوراک کی دستیابی ایک اور عنصر ہے جو غریبی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک بڑی حد تک خوراک کی دستیابی کا انحصار خوراک کی پیداوار پر ہے لیکن اس کا انحصار خوراک کی قیمتوں اور سرکاری نظامِ تقسیم پر بھی ہے جیسا کہ گوشوارہ ۔۳ میں دکھایا گیا ہے۔

شہری علاقوں میں غربت کی صورت حال کا انحصار بڑی حد تک اس ماحول پر ہوگا جس میں غیر رسمی سیکٹر کام کرتا ہے۔ تربیت، قرض جات، بہتر ٹیکنالوجی تک غیر رسمی سیکٹر کی رسائی آسان بنانے اور اس سیکٹر کے لیے قانونی اور انتظامیہ طور پر ایک مددگار ماحول پیدا کرنے سے شہری غربت پر بڑا اثر پڑے گا۔ شہری علاقوں میں غیر رسمی سیکٹر کو کام کرنے کے لیے جگہ تک میسر نہیں ہوتی۔ شہری پلاننگ کی روایتی مشقوں میں صرف باقاعدہ سرگرمیوں کے لیے جگہ مہیا کی جاتی ہے اور غیر رسمی یا بے قاعدہ سیکٹر کو ایسی جگہوں پر دھکیل دیا جاتا ہے جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے اس طرح وہ ایک غیر قانونی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں۔

دیکھا جائے تو انسانی ترقی کی کوششوں کا غریبی کم کرنے کی تمام کوششوں کے ساتھ ایک غیر ظاہر تعلق ہوتا ہے۔ تعلیم اور صحت غریب افراد کو ترقی کے فائدوں سے مستفید ہونے کے قابل بناتی ہے اور انھیں اقتصادی سرگرمی کے بڑے دھارے سے جوڑتی ہے۔ عام تعلیم اور صحت کی خدمات تک غریبوں کی رسائی کم رہی ہے۔ اس کی پہلی وجہ ان خدمات کا ناکافی ہونا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے جو خدمات دستیاب ہیں ان تک سماج کا بہتر حال والا طبقہ بہتر رسائی رکھتا ہے۔

غریبی کم کرنے کے لیے سرکار کے بہت

سے پروگرام ہیں۔ ان پروگراموں کو تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) روزگار پیدا کرنے کے پروگرام۔

(ب) غریبوں کو رعایتی شرحوں پر قرضے فراہم کرکے پیداواری اثاثے حاصل کرنے میں ان کی مدد کرنے کے پروگرام اور

(ج) انسانی ترقی کی نوعیت رکھنے والے پروگرام جس میں تربیت، بچوں کی مربوط ترقی کے پروگرام اور عورتوں، بچوں اور سماج کے پسماندہ طبقات کے لیے خصوصی پروگرام شامل ہیں۔

ان میں سب سے بڑا پہلا پروگرام یعنی روزگار پیدا کرنے کا پروگرام ہے جس میں ضمانت روزگار کی اسکیمیں بھی شامل ہیں۔ ان سے خصوصاً مہاراشٹر جیسی ریاستوں میں اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں جہاں اس قسم کے پروگراموں کی ایک زیادہ پرانی تاریخ ہے۔ لیکن روزگار پیدا کرنے کے پروگراموں کی اتنی لمبی تاریخ رکھنے اور صنعتی ترقی میں پیش پیش ہونے کے باوجود مہاراشٹر میں ۱۹۸۷ء میں غریبی کی سطح ۴۰ فی صد یا یوں کہیے کہ کم و بیش کل ہند سطح جتنی ہی تھی۔ اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور مغربی بنگال میں یہ شرح کچھ ہی زیادہ تھی مگر اعداد و شمار کے حساب سے ان ریاستوں میں غریبی کی سطح مہاراشٹر سے بہت مختلف نہیں تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان پروگراموں تاثیر و افادیت کو کیا ہوا۔ لیکن اگر یہ پروگرام چھوڑ دیے جائیں تو غریبی اور بڑھ سکتی ہے۔

برسوں تک روزگار ایک مقررہ شرح پر برقرار رکھنے کے لیے ان پروگراموں پر سال بہ سال روپیہ خرچ کرنا ہوگا۔ روزگار پیدا کرنے کے لیے اس کے علاوہ زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری طرف افرادی قوت کے بڑھنے کے ساتھ مزید روزگار کی مانگ بھی بڑھے گی۔

اثاثے بنانے کے پروگراموں کی رفتار سست رہی ہے کیوں کہ منظور شدہ رقوم کا کافی خورد برد ہوتی رہی ہے۔ انسانی ترقی کے زمرہ کے پروگرام ابھی اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کا غریبوں پر کوئی واضح اثر نہیں پڑ سکتا۔

بہرحال بیشتر سرکاری پروگراموں میں یہ نقص ہے کہ وہ اوپر سے نیچے کی جانب چلتے ہیں۔ یہ پروگرام بہت بلند معیار کے ہیں۔ ان میں مقامی ضرورتوں کا بہت کم خیال رکھا گیا ہے اور انھیں مقامی حالات کے مطابق نہیں ڈھالا گیا ہے۔ یہ ان لوگوں میں جن کی مدد کے لیے یہ بنائے گئے ہیں شرکت یا حصہ داری کا جذبہ پیدا نہیں کرتے۔ یہ پروگرام خاص کر افراد کو مدنظر رکھتے ہیں افراد کے گروپوں کو نہیں۔ مثال کے طور پر آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی پروگرام (مربوط دیہی ترقی کے پروگرام) کچھ اور زیادہ کامیاب ہو سکتے تھے اگر ان میں کسی ایک اقتصادی سرگرمی میں شامل لوگوں کے گروپوں کو مدنظر رکھا جاتا۔ ان کے حق میں بیرونی معاون حالات پیدا کرنا زیادہ آسان ہوتا بشرطیکہ وہ انفرادی سرگرمی کے بجائے گروپ سرگرمی کے لیے ہوتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غریبی کم کرنے کے پروگراموں کے لیے بہت سے سرکاری وسائل وقف کیے گئے ہیں۔ آٹھویں پنجسالہ منصوبے میں دیہی ترقی اور غریبی کم کرنے کے پروگراموں کے لیے ۳۵۰۰۰ کروڑ روپے خرچ کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے اور اس امر کا امکان ہے کہ یہ نشانہ پورا ہوجائے گا۔ اتنے وسائل کے دستیاب ہونے کے بعد ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کو حرکت میں لانے اور اس کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ غریبی کے خاتمے سے متعلق پالیسی کا مرکزی نقطہ غریبوں کو حرکت میں لانا ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی زندگی اور امکانات پر اثرانداز ہونے والی سرگرمیوں کا فیصلہ کرنے میں براہ راست اور موثر ڈھنگ سے شریک ہو سکیں۔ سماج کو حرکت میں لانے کے پروگراموں کا محور غریبوں کے قابل شناخت طبقے یعنی دیہی علاقوں کا غریب سماج، شہری علاقوں کی غریب بستیاں اور عورتوں اور دیگر محروم طبقوں کے خصوصی گروپ ہونے چاہئیں۔ ان پروگراموں کا مقصد غربا کو گروپوں میں منظم کرنا ہونا چاہیے تاکہ وہ گروپ سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں۔ غریبی کم کرنے کے لیے سماج کو حرکت میں لانے کی کوششیں ان شعبوں پر مرکوز ہونی چاہئیں جو غریبی کم کرنے، مسائل کو حل کرنے اور خود غریبوں کی شناخت کی ہوئی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ شعبے خوراک کی سیکیورٹی، خواندگی اور پرائمری تعلیم، صحت، مکان، قرضوں کی فراہمی، پیداوار کے لیے بنیادی ڈھانچہ اور روزگار ہو سکتے ہیں۔ اندر یا باہر کا آسانیاں بہم پہنچانے والا کوئی شخص جو اپنی شناخت اور عزم و خلوص کے ساتھ غریبوں میں کام کرے۔ غریب لوگوں کو خود اپنی تنظیمیں بنانے میں مدد کر سکتا ہے، مختلف مددگار شعبوں کے ساتھ رابطے سے غریبوں کو اطلاعات حاصل کرنے، اپنے مسائل کا تجزیہ کرنے اور اپنی ضرورتیں بہتر ڈھنگ سے سمجھنے اور بیان کرنے میں مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں غریبوں کو سایہ دینے والی چھتری کی طرح کے ایک نظام کی بھی ضرورت ہے جو انھیں دیگر ضروری خدمات فراہم کرے۔ پچھلا تجربہ بتاتا ہے کہ غیر سرکاری تنظیمیں، غریبوں کے بینک حتیٰ کہ کچھ حساس سرکاری ادارے یہ کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سماج کو حرکت میں لانے کی کوششوں کا انحصار سیاسی جگہ کی دستیابی پر ہو سکتا ہے۔ ایسی جگہ بنانے یا غریبوں کے واسطے ثقافتی جگہ، جیسی کہ جنوبی ایشیا کے ملکوں میں دستیاب ہے، میں توسیع کے لیے سیاسی لیڈرشپ کے عزم کی ضرورت ہے۔ ایسا عزم غریبوں کی سرگرمیوں کے لیے ایک حساس معاون نظام یا میکنزم کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

ہم پہلے ہی سے پنچایتی راج اداروں کو مضبوط بنانے کے اقدامات کر رہے ہیں۔ یہ ادارے کچھ عرصے بعد مضبوط لوکل گورنمنٹیں بن جائیں گے۔ بنیادی خدمات موثر طریقے سے بہم پہنچانے کے لیے ایک مضبوط لوکل گورنمنٹ کا ہونا ضروری ہے۔ مضبوطی کے معنی یہ ہیں کہ اسے مالی وسائل حاصل ہوں اور وہ ٹیکس حاصل کر سکتی ہو۔ وسائل کے بغیر ایک کمزور لوکل گورنمنٹ سے جمہوریت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

عطائے اختیار کے معنی ہیں ہر متعلقہ فرد پر اثرانداز ہونے والے سیاسی اور اقتصادی سوالوں کے بارے میں فیصلہ لینے میں شرکت کا موقع دیا جانا۔ غربا خصوصاً عورتوں کو اختیارات کا دیا جانا، تعلیم، اطلاعات،

ضمیر پرستی اور تنظیم اور اس کے بعد روزگار اور قرضہ جات سے شروع ہوتا ہے۔

مقامی سطح پر اختیارات کے مختلف پہلوؤں میں تمیز کرنا ضروری ہے۔ ایک طرف تو یہ ضروری ہے کہ لوکل گورنمنٹ اپنی حکومت آپ چلائے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی پنچایت نظام میں گاؤں والے اپنی فوری ضرورتوں سڑکوں، آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں اور پرائمری ہیلتھ یونٹوں اور پرائمری اسکولوں جیسی چھوٹی خدمات کے بارے میں فیصلہ کرسکتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں پروگراموں میں غربا کی شرکت ممکن ہوجاتی ہے اور سرکاری روپیہ خرچ کرنے کا عمل زیادہ کھلا ہوجاتا ہے۔

اختیارات کا سماجی اور اقتصادی مفادات کی بنیاد پر غریب لوگوں کی تنظیم کرنے سے بھی گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جسے آزاد و خود مختار معاون ادارے مثلاً قومی اور مقامی سطح کی غیر سرکاری تنظیمیں سب سے اچھی طرح انجام دے سکتی ہیں۔ اقتصادی مفادات کو آپریٹو اداروں اور پروڈیوسروں کے گروپوں کی تخلیق ہوسکتے ہیں۔ سماجی اور اقتصادی مفادات کے لیے عورتوں کو منظم کرنے سے انھیں فیصلے لینے کے عمل میں سرگرم حصہ لینے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ترقیاتی پروگراموں کا تجربہ بتاتا ہے کہ عورتوں کو اقتصادی نصب العینوں کے لیے منظم کرنا سیاسی معاملات میں شرکت کا اختیار حاصل کرنے کی طرف بھی ایک قدم ہے۔

حکومت کو مالی وسائل کی فراہمی اور معاون ایجنسیوں کی ترقی کے لیے مددگار حالات پیدا کرنے میں رہنما یا نہ رول ادا کرنا ہوگا۔

بقیہ: چھاتی کا سرطان ۔ مسئلہ اور مداوا

میں ان خلیات کی موجودگی کی اچھی طرح کھوج لگا لی جائے۔ اس کے بعد مذکورہ علاجی تدابیر اختیار کی جائیں اور خلیات کے مکمل خاتمے تک علاج جاری رکھا جائے۔ ●

گوشوارہ نمبر ۳
غلہ کی پیداوار اور دستیابی

سال	پیداوار (ایم۔ ٹی)	حصولی (ایم۔ ٹی)	سرکاری تقسیم (ایم۔ ٹی)	خالص دستیابی (غلہ اور دالیں) گراموں میں
۱۹۸۹ء	۱۷۱	۱۸٫۹	۱۶٫۴	۴۹۴٫۵
۱۹۹۰ء	۱۷۸	۲۴٫۰	۱۶٫۰	۴۷۶٫۴
۱۹۹۱ء	۱۶۸	۱۹٫۶	۲۰٫۸	۵۱۰٫۰
۱۹۹۲ء	۱۷۹	۱۷٫۹	۱۸٫۸	۴۶۸٫۸
۱۹۹۳ء	۱۸۴	۲۸٫۱	۱۶٫۴	۴۶۲٫۷
۱۹۹۴ء	۱۹۱	۲۶٫۰	۱۴٫۰	۴۶۹٫۵
۱۹۹۵ء	–	۲۵٫۵	۱۵٫۳	۵۰۱٫۹

ذریعہ اقتصادی سروے ۹۶-۱۹۹۵ء

● پیداوار زرعی سال کے لیے ہے۔ ۱۹۸۹ء سال ۹۰-۱۹۸۹ء کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح باقی سال بھی مالی سال کو ظاہر کرتے ہیں۔ ۹۵-۱۹۹۴ء کے پیداوار کے اعداد و شمار عارضی ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۴
۸۸-۱۹۸۷ء میں غریبوں کی ریاست وار تعداد اور فی صد تناسب
(ایکسپرٹ گروپ کے اعداد و شمار پر مبنی)

نمبر شمار	ریاست/مرکزی انتظام کا علاقہ (۱)	دیہی: افراد کی تعداد (لاکھ میں) (۲)	دیہی: افراد کا فی صد تناسب (۳)	شہری: افراد کی تعداد (لاکھ میں) (۴)	شہری: افراد کا فی صد (۵)	مشترکہ: افراد کی تعداد (لاکھ میں) (۶)	مشترکہ: افراد کا فی صد تناسب (۷)
۱۔	آندھرا پردیش	۹۴٫۸۹	۲ ٫۹۲	۷۲٫۸۸	۴۴٫۶۳	۱۶۷٫۷۷	۲۷٫۲
۲۔	اروناچل پردیش	۲٫۷۳	۳۹٫۳۵	۰٫۱۱	۱۷٫۳۴	۲٫۸۴	۳۷٫۴۷
۳۔	آسام	۸٫۸۶	۳۹٫۳۵	۴٫۵۸	۱۷٫۳۴	۸۵٫۴۴	۳۶٫۸۴
۴۔	بہار	۳۷۰٫۳۶	۵۲٫۶۳	۶۹٫۴۸	۵۷٫۷۱	۴۳۹٫۸۴	۵۳٫۳۷
۵۔	گوا	۱٫۳۲	۱۷٫۶۴	۱٫۴۲	۳۳٫۷۱	۲٫۷۴	۲۳٫۴۲
۶۔	گجرات	۷۵٫۹۵	۲۸٫۶۷	۵۲٫۶۳	۳۹٫۶۳	۱۲۸٫۵۸	۳۲٫۳۲
۷۔	ہریانہ	۱۸٫۷۵	۱۶٫۲۲	۷٫۱۵	۱۷٫۷۹	۲۵٫۹	۱۶٫۶۳
۸۔	ہماچل پردیش	۷٫۳۷	۱۶٫۲۸	۰٫۲۵	۶٫۱۸	۷٫۶۲	۱۵٫۴۶
۹۔	جموں اور کشمیر	۱۳٫۹۶	۲۵٫۷۰	۲٫۴۰	۱۴٫۸۲	۱۶٫۳۶	۲۲٫۲
۱۔	کرناٹک	۹۳٫۹۶	۳۲٫۸۲	۶۸٫۳۹	۴۹٫۰۶	۱۶۲٫۳۵	۳۸٫۱۴

۱۱۔	کیرالہ	۶۶٫۲۰	۲۹٫۱۰	۲۶٫۰۲	۴۳٫۳۶	۹۲٫۲۲	۳۲٫۰۸
۱۲	مدھیہ پردیش	۱۹۵٫۸۵	۴۱٫۹۲	۷۰٫۰۴	۴۸٫۱۷	۲۶۵٫۸۹	۴۳٫۴۰
۱۳۔	مہاراشٹر	۱۸۵٫۵۹	۴۰٫۷۸	۱۰۸٫۵۹	۳۸٫۹۹	۲۹۴٫۱۸	۴۰٫۱۰
۱۴۔	منی پور	۴٫۶۸	۳۹٫۳۵	۰٫۸۵	۱۷٫۳۴	۵٫۵۳	۳۲٫۹۳
۱۵۔	میگھالیہ	۴٫۸۹	۳۹٫۳۵	۰٫۵۹	۱۷٫۳۴	۵٫۴۸	۳۴٫۶۰
۱۶۔	میزورم	۱٫۶۸	۳۹٫۳۵	۰٫۳۳	۱۷٫۳۴	۲٫۰۱	۳۲٫۵۲
۱۷۔	ناگالینڈ	۳٫۰۵	۳۹٫۳۵	۰٫۳۵	۱۷٫۳۴	۳٫۴۰	۳۴٫۸۵
۱۸۔	اڑیسہ	۱۴۸٫۰۲	۵۷٫۶۴	۱۹٫۹۴	۴۴٫۱۱	۱۶۷٫۹۶	۵۵٫۴۱
۱۹۔	پنجاب	۱۶٫۷۸	۱۲٫۶	۷٫۷۷	۱۲٫۹۱	۲۴٫۵۶	۱۲٫۷
۲۰۔	راجستھان	۱۰۳٫۰۲	۳۳٫۲۱	۳۸٫۱۷	۳۸٫۹۹	۱۴۱٫۱۹	۳۴٫۶۰
۲۱۔	سکم	۱٫۲۵	۳۹٫۳۵	۰٫۱۵	۱۷٫۳۴	۱٫۴۰	۳۴٫۶۷
۲۲۔	تمل ناڈو	۱۶ ٫۶۷	۴۵٫۸۰	۸۲٫۵۴	۴۳٫۸۸	۲۴۳٫۲۰	۴۵٫۱۳
۲۳	تریپورہ	۸٫۴۹	۳۹٫۳۵	۰٫۴۸	۱۷٫۳۴	۸٫۹۷	۳۶٫۸۴
۲۴۔	اترپردیش	۴۱۲٫ ۳	۴۱٫۱۰	۱۲۵٫۰۲	۴۵٫۲۲	۵۳۷٫۰۵	۴۱٫۹۹
۲۵۔	مغربی بنگال	۲۱۹٫۰۹	۴۸٫۳۰	۵۷٫۶۳	۳۲٫۸۴	۲۷۶٫۷۲	۴۳٫۹۹

ان ریاستوں میں سیمپل سروے کا سائز چھوٹا ہونے کے سبب یہ صرف اندازے ہی ہیں۔

بقیہ: ڈاکٹر اینی بیسنٹ ۔۔ سوراج کی معمار

سامنے ایک اور بڑا نظریہ پیش کیا، جو یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو اپنا آئین خود بنانے کا حق ہونا چاہیے۔

چنانچہ ایک قومی کنونشن نے، جس کی روحِ رواں ڈاکٹر بیسنٹ اور سر تیج بہادر سپرو تھے، ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء تک تین سال کامن ویلتھ آف انڈیا بِل کا مسودہ تیار کرنے میں صرف کیے۔ یہ بل، جو ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں پارلیمانی اقدام کی پہلی مثال تھا، ۱۹۲۶ء میں ہاؤس آف کامنز میں پیش کیا گیا۔

گاندھی جی کی حکمتِ عملی کی مخالفت

لیکن جلد ہی ڈاکٹر بیسنٹ کی مقبولیت گھٹنی شروع ہو گئی کیوں کہ وہ آزادی حاصل کرنے کے گاندھیائی طریقۂ عمل کے خلاف تھیں اور گاندھی جی کا طریقہ ۱۹۲۰ء سے کانگریس میں قبولیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر بیسنٹ ساری زندگی قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اور آئینی طریقوں سے جد و جہد کرتی رہی تھیں۔ اس لیے وہ وسیع پیمانے پر قانون توڑنے کے طریقے کی قائل نہ ہو سکیں، خواہ وہ کسی بھی کاز کے لیے کیوں نہ ہو۔

گو ڈاکٹر بیسنٹ نے اس بات کو تسلیم کیا کہ جس طریقے کو وہ درست سمجھتی تھیں وہ عوام میں مقبولیت کھو چکا تھا، پھر بھی انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ ان کے اپنی جد و جہد ترک کرنے کا سبب نہیں بن سکتا اور وہ محض برا بھلا کہنے یا تنقید کرنے پر قناعت نہیں کر سکتیں۔ اس لیے انھوں نے ۷۰ برس سے زیادہ عمر میں ایک دو پہلوئی مہم شروع کی۔ یہ مہم ایک طرف تنقیدی نوعیت کی تھی اور دوسری طرف تعمیری نوعیت کی تھی۔ آئندہ دس برسوں کے دوران وہ ان تمام جرائد میں، جن سے وہ وابستہ تھیں، اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں مضامین لکھتی رہیں۔ انھوں نے اصرار کیا کہ جو ستیہ گرہ کیا جا رہا ہے اور جس کی تشہیر کی جا رہی ہے، وہ کوئی روحانی ہتھیار نہیں ہے "سٹیزن" کے اپریل ۱۹۲۱ء کے شمارے میں انھوں نے لکھا "تشدد کے ذریعے انقلاب غیر مصلحت آمیز اور ناممکن ہے۔ عدم تشدد یا عدم تعاون سے انقلاب یا تو نراج اور افراتفری کی طرف لے جاتا ہے یا ناکامی کی طرف۔"

انھوں نے بار بار بڑے پیمانے پر سول نافرمانی کے خطرات کے خلاف تنبیہہ کی جس کی وجہ سے وہ آخری عمر میں ہندوستان کی قومی زندگی کے دھارے سے الگ تھلگ ہو کر رہ گئیں۔ لیکن اب آزاد ہندوستان میں یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ان کی ان تنبیہوں میں ہندوستان کے لیے ان کا گہرا پیار مضمر تھا۔

ڈاکٹر بیسنٹ کا وہ خواب ان کی زندگی میں پورا نہیں ہوا جس کے بارے میں انھوں نے ۱۹۱۴ء میں ہندوستان میں اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں کہا تھا کہ وہ اپنی موت سے پہلے ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتی ہیں تاہم ستمبر ۱۹۳۳ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو برطانیہ کے اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر میکڈونالڈ یہ وعدہ کر چکے تھے کہ ہماری مشترکہ محنت سے ہندوستان کو وہ چیز بھی حاصل ہو جائے گی، جو برطانوی دولتِ مشترکہ میں اسے ایک ڈومنین کا درجہ دلانے کے لیے اس کے پاس نہیں ہے۔

ہندوستان کی جد و جہد آزادی کے لیے ڈاکٹر بیسنٹ کی رہنمایانہ خدمات ہمیشہ ہی ہندوستان کی تاریخ کا ایک شاندار باب رہیں گی۔ ●

بقیہ: دیہی اور شہری غریبوں کے مسائل اور روزگار

وغیرہ گاؤں کی ترقی کے لیے اٹھائے جا رہے اقدامات میں شامل ہیں۔

دیہی علاقوں میں غریبی دور کرنا اور ان کی ترقی کا کام کافی دشوار اور پیچیدہ ہے۔ اس کے لیے غیر سرکاری تنظیموں اور کارپوریٹ سیکٹر کی بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

پیش کش: راجندر اپادھیایہ

●

اعلا تعلیم کا فروغ: ایک جائزہ

انسانی وسائل کی ترقی کا اہم فرض تعلیم کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔ تعلیم ہی انسان کی استعداد، صلاحیت اور مہارت میں نکھار پیدا کرتی ہے۔ اگر کوئی ملک انسانی وسائل کی ترقی میں پیچھے رہ جاتا ہے تو وہ ترقی کے دوسرے میدان میں بھی نا اہل ثابت ہوتا ہے خواہ سیاسی وسماجی ڈھانچہ ہو یا معاشی ترقی کا میدان۔ اگر تعلیم، معلومات اور ٹکنالوجی کو وسعت نہ دی گئی تو سرمایہ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا تعلیم انسانی وسائل کی ترقی کی اہم بنیاد ہے اور معاشی ترقی میں اعلا تعلیم (ہائر ایجوکیشن) خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلی کا موثر ذریعہ ہے۔ ریسرچ، ایجاد اور تکنیکی معلومات کا فروغ تعلیم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

ہمارے ملک میں معاشی ترقی کو تیز کرنے کے واسطے پنج سالہ منصوبوں میں انسانی سرمایہ کی ترقی کو اصول کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی کوششوں سے اعلا تعلیم کی ترقی میں تیزی آئی۔ منصوبے کے اوقات میں اعلا تعلیم کے فروغ کو گوشوارہ نمبر ایک میں پیش کیا گیا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

یونیورسٹی، کالج اور رجسٹرڈ طلبا کی تعداد

سال	یونیورسٹی	کالج	رجسٹرڈ طالب علم
۱۹۵۰-۵۱ء	۳۰	۷۰۰	۲۶۳۰۰۰
۱۹۶۰-۶۱ء	۴۹	۱۵۳۷	۶۴۵۰۰
۱۹۷۰-۷۱ء	۹۳	۳۶۰۴	۱۹۵۳۶۴۰
۱۹۸۰-۸۱ء	۱۲۵	۴۷۲۲	۲۷۵۲۴۳۷
۱۹۹۰-۹۱ء	۱۸۷	۷۱۲۱	۴۴۲۵۲۴۷
۱۹۹۲-۹۳ء	۱۸۷	۷۹۵۸	۴۸۰۵۰۰۰
۱۹۹۳-۹۴ء	۱۹۷	۸۲۱	۵۰۷۰۰

اس گوشوارہ سے ظاہر ہے کہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں صرف ۳۰ یونیورسٹیاں اور ۷۰۰ کالج تھے جن میں لگ بھگ ۲٫۵۰ لاکھ طلبا تعلیم حاصل کر رہے تھے جب کہ اس وقت ۱۹۷ یونیورسٹیوں میں لگ بھگ ۵ لاکھ طلبا رجسٹرڈ ہیں۔ پچھلے ۴۳ برسوں میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعداد میں علی الترتیب چھ گنا اور ۱۱ گنا اضافہ ہوا ہے جب کہ رجسٹرڈ طلبا کی تعداد میں ۱۹ گنا اضافہ ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طلبا کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد کے تناسب میں تعلیمی اداروں کی ترقی دھیمی رفتار سے ہوئی ہے جو براہ راست طلبا کے تناسب میں اضافہ کرتا ہے۔

پنج سالہ منصوبوں میں انسانی وسائل کی ترقی کی غرض سے تعلیم، تندرستی، مکان، سماجی حفاظت اور بھلائی پر کل آمدنی کا ایک فی صد خرچ کیا جاتا ہے۔ معاشی ترقی کے نظریے سے یہ ضروری ہے کہ قومی آمدنی کا ۳۰ فی صد سے ۴۰ فی صد حصہ انسانی وسائل کی ترقی پر خرچ کیا جائے۔ منصوبے کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہائر ایجوکیشن پر ہونے والے خرچ میں مزید اضافے کی جگہ تخفیف ہوئی ہے۔ ملک میں اہل اور تربیت یافتہ اشخاص کی تعداد محدود ہے۔ تندرست شخص، اہل کارکن اور تربیت دہندوں نیز سائنس دانوں کی تعداد میں اضافے کے لیے ضروری ہے کہ اعلا تعلیم پر زیادہ رقم خرچ کی جائے۔ مختلف پنج سالہ منصوبوں میں ہائر ایجوکیشن پر ہوئے خرچ کا ریکارڈ گوشوارہ نمبر ۲ سے ظاہر ہوتا ہے۔

پہلے پنج سالہ منصوبے کے مقابلے ۸ ویں منصوبے کے خرچ میں لگ بھگ ۲۲۰۰ گنا اور کل تعلیمی اخراجات میں ۲۵ گنا اضافہ ہوا۔ گوشوارے سے یہ بھی ظاہر ہے کہ منصوبے میں تعلیم پر کل خرچ ۸٫۶۲ فی صد تھا جو ۸ ویں منصوبے میں کم ہو کر ۴٫۸۹ فی صد رہ گیا۔ اسی طرح پہلے پنج سالہ منصوبے میں کل تعلیم اور اعلا تعلیم ایجوکیشن کے خرچ کا تناسب ۸٫۲۸ فی صد تھا، جب کہ ۷ ویں منصوبے میں یہ خرچ صرف ۱۸٫۶۴ فی صد تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۴۰ برسوں میں اعلا تعلیم خرچ میں صرف دو گنا اضافہ ہوا ہے۔

عام خیال ہے کہ ہمارے ملک میں اعلا تعلیم پر سب سے زیادہ خرچ ہوتا ہے لیکن بین اقوامی بینک کی رپورٹ کے مطابق ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے ہمارے ملک میں ہائر ایجوکیشن پر بہت کم خرچ کیا جاتا ہے جیسے گوشوارہ نمبر ۳ میں پیش کیا گیا ہے۔

ملک میں ہائر ایجوکیشن کے جائزے اور اصلاح کی غرض سے وقتاً فوقتاً کمیشن اور کمیٹیاں قائم گئیں، جن کی ہدایتوں پر ہائر ایجوکیشن کو مضبوط بنانے کا عمل جاری ہے۔ اسی کے مد نظر ۱۹۸۶ء میں نئی تعلیمی پالیسی نافذ کی گئی جس سے ملک کی کئی ریاستوں میں

دس جمع دو جمع تین طریقۂ کار عمل میں لایا جاسکا۔ نصاب اور امتحان کے طریقۂ کار میں اصلاح کی گئی۔ پیشہ ورانہ تعلیم کو ترجیح حاصل ہوئی۔ کچھ کالجوں کو خود مختاری بخشی گئی۔ لیکن اس کے باوجود ہائر ایجوکیشن سے متعلق کچھ مسائل ابھی بھی در پیش ہیں۔

کرتے تھے اب بدنظمی کے اڈّے بنتے جارہے ہیں۔ لا محدود بد نظمیاں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور حکومت کے اختیارات سے باہر ہوتی جارہی ہیں۔ سست انتظامیہ اور سیاسی دخل اندازی کے باعث قائم شدہ یونیورسٹیاں تعلیمی کام سے دور ہوتی جارہی

گوشوارہ نمبر۲

پنج سالہ منصوبوں میں تعلیم اور اعلا تعلیم پر خرچ

پنج سالہ منصوبے	منصوبوں پر کل خرچ (کروڑ روپے)	تعلیم پر کل خرچ (کروڑ روپے)	تعلیم پر کل خرچ (فی صد)	اعلا تعلیم پر خرچ (کروڑ روپے)	اعلا تعلیم پر خرچ (فی صد)
پہلا منصوبہ	۱۹۶۰	۱۴۹	۸٫۶۲	۱۴	۸٫۲۸
دوسرا منصوبہ	۴۷۲۶	۲۷۷	۵٫۸۲	۴۸	۱۷٫۳۳
تیسرا منصوبہ	۸۵۷۷	۵۶۰	۶٫۵۴	۸۷	۱۵٫۵۴
چوتھا منصوبہ	۱۵۷۷۹	۸۲۲	۵٫۲۱	۱۹۵	۲۳٫۷۲
پانچواں منصوبہ	۴۰۰۹۷	۱۲۸۵	۳٫۲۱	۲۰۵	۱۵٫۹۵
چھٹا منصوبہ	۹۷۵۰۰	۲۵۲۴	۲٫۵۹	۵۳۷	۲۱٫۲۸
ساتواں منصوبہ	۱۸۰۰۰۰	۶۳۸۳	۳٫۵۵	۱۱۹۰	۱۸٫۶۴
آٹھواں منصوبہ	۴۳۴۱۰۰	۲۱۲۱۷	۴٫۸۹	—	—

گوشوارہ نمبر۳

کل قومی آمدنی میں تعلیم اور اعلا تعلیم پر خرچ

ملک	سال	تعلیم پر خرچ (فی صد)	اعلا تعلیم پر خرچ (فی صد)
کناڈا	۱۹۸۸ء	۷٫۱	۱٫۹
امریکہ	۱۹۸۶ء	۶٫۸	۲٫۷
کینیا	۱۹۸۷ء	۷٫۱	۰٫۸
آسٹریلیا	۱۹۸۷ء	۵٫۵	۱٫۶
جاپان	۱۹۸۷ء	۴٫۹	۱٫۱
برٹین	۱۹۸۷ء	۵٫۰	۰٫۹
چین	۱۹۸۸ء	۲٫۴	۰٫۴
ہندوستان	۱۹۸۷ء	۳٫۳	۰٫۶
پاکستان	۱۹۸۷ء	۳٫۱	۰٫۴

یونیورسٹی کیمپس جو کبھی تعلیم کے مرکز ہوا

ہیں۔ زیادہ تر یونیورسٹیاں سیاسی اڈّے بن کر رہ گئی ہیں یا صرف ڈگری تقسیم کرنے والی تنظیم کی شکل میں عمل پیرا ہیں۔ رسمی نصاب، نا اہل انتظامیہ، غیر اہم ڈگریاں، ریاستی حکومتوں کی دخل اندازی میقاتی تاخیر اور عاملہ و امتحاناتی کمیٹیوں کی نا اہلی کے باعث اعلا تعلیم کے معیار میں گراوٹ آگئی ہے۔ غیر ضروری دخل اندازی کی وجہ سے یونیورسٹیوں میں آزادانہ طریق کار اور اصول نافذ نہیں کیے جاسکے ہیں۔ طلبا کی یونین کا انتخاب اور بے قابو طالب علم تعلیم اور امتحان کی راہ میں رکاوٹ بنے رہتے ہیں۔

اعلا تعلیم کے مسائل کا حل تبھی ممکن ہے جب مرکز اور ریاستی حکومتوں کے ذریعہ یونیورسٹی اور کالج سطح پر تعلیم میں یکسانیت لانے کی کوشش کی جائے اور ساتھ ہی سیمینار بھی منعقد کرائے جائیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ماہرین کی رائے قومی سطح پر نافذ کی جائے۔ ●

بقیہ: کمہار۔۔ درگا پوجا کے گمنام ہیرو

تک اونچی بنائی جارہی ہے۔

مقدس کتابوں کے مطابق درگا کی صحیح نشست یہ ہوتی ہے کہ اس کا دایاں پاؤں شیر پر ہو اور بایاں پاؤں کچھ اونچائی پر "اسور" (دیو) کے کاندھوں پر ہو۔ اس کے دس ہاتھوں میں دس مختلف قسم کے ہتھیار ہوں اور ایسا لگے کہ وہ جنگ لڑ رہی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ "مہی سا سر مردنی" (بدی کی علامت اسور کو قتل کرنے والی دیوی ہے) لیکن اس پر سختی سے عمل نہیں کیا جاتا کیونکہ مورتیاں بنانے والے دست کاروں کو خریداروں کی پسند سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔

دیوی کی آرائش

دیوی کی ساڑیوں کا بھی نہایت احتیاط سے انتخاب کیا جاتا ہے اور انھیں احمد آباد سے لایا جاتا ہے۔ اسی احتیاط سے دیگر سامان زیبائش کے انتخاب میں بھی کام لیا جاتا ہے۔ کمہاروں ہی کی طرح یہ سامان مثلاً مکٹ (تاج)، زیورات اور پس منظر کا ہالہ تیار کرنے والے بھی پوجا سے قبل کے مہینوں میں دن رات محنت کرتے ہیں۔ یہ دست کار، "شولا" کے نازک کام میں زمانۂ ماضی کے ماہر ہیں، اپنے صدیوں پرانے فن کے لیے سستے متبادل کا استعمال بھی کرتے ہیں۔

جدید کاری کے حملہ اور غیر یقینی مستقبل کے نتیجہ میں کمہار ٹولی کے یہ دست کار کسی ایسے پیشہ کی جانب مائل ہونے پر مجبور ہیں، جس کے ذریعہ وہ خالی دنوں میں روزی روٹی حاصل کرسکیں۔ یہ لوگ مٹی کی اشیاء کی صنعت قائم کرنے پر غور کر رہے ہیں جس میں وہ نئی نئی طرزوں کی خوشنما اور دلکش چیزیں بنا سکیں مثلاً گملے کی شکل میں واش بیسن۔ یہ بہت ضروری ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیاں آگے بڑھ کر ان کی مدد کریں۔ اس طرح دست کاروں کو گزر بسر کا ایک محفوظ ذریعہ حاصل ہوجائے گا نیز انھیں دیوی درگا کے ازلی حسن کو مورتیوں میں ڈھالنے کا صدیوں پرانے فن پر زیادہ توجہ دینے کا موقع ملے گا۔ ●

تسنیم فاطمہ

ہندوستان کے تعلیمی نظام پر ایک طائرانہ نظر

انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت ۱۹۸۵ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم کے شعبوں میں انسانی وسائل کو بھرپور طریقے پر کام میں لایا جائے، اس کا تعلق عورتوں اور بچوں کی بہبود سے تھا۔ اس کے علاوہ فنون لطیفہ اور ثقافت، نوجوانوں کے امور اور کھیل بھی اس وزارت کے دائرہ کار میں داخل ہیں۔ اس وزارت کے چار اہم شعبے ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) محکمہ تعلیم (۲) محکمہ ثقافت (۳) نوجوانوں کے امور اور کھیل کا محکمہ (۴) عورتوں بچوں کے فروغ کا محکمہ۔

اس وزارت نے "سب کے لیے تعلیم" کا جو نعرہ دیا ہے، اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس مقصد کے تحت تعلیم بالغاں اور پرائمری تعلیم سب کے لیے عام کرنے کے پروگرام پر خاص زور دیا گیا ہے۔

پرائمری تعلیم

ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کا نظام دنیا میں دوسرے نمبر پر سب سے بڑا نظام ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۱۴ کروڑ ۹ لاکھ بچوں کو اسکولوں میں داخل کرایا گیا۔ یہ چھ سال سے لے کر ۱۴ سال تک کی عمر کے بچے بچیاں تھیں۔ ملک میں عمر کے اس حصے کے بچوں کی تعداد کا یہ ۸۲ فی صد تھا۔ ان میں سے ۱۰ کروڑ ۹ لاکھ بچوں کو ۵۸۱۳۰۵ پرائمری اسکولوں میں داخل کرایا گیا مزید ۴ کروڑ بچوں کو اپر پرائمری اسکولوں میں داخل کرایا گیا۔ ملک میں ۲۸ لاکھ استاد ہیں اور ان میں ۱۷ لاکھ استاد پرائمری اسکولوں میں اور ۱۱ لاکھ استاد اپر پرائمری اسکولوں میں پڑھا رہے ہیں۔ پرائمری اسکولوں میں زیر تعلیم لڑکیوں کا تناسب ۴۲٫۸ فی صد ہے۔ عملی اقتصادی تحقیق کی قومی کونسل نے جو مطالعہ کیا، اس کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی کہ ملک کی سبھی ریاستوں میں اب ایسے بچے بچیوں کی تعداد بہت کم ہے جو اسکولوں میں جانے سے محروم ہیں۔ اب درمیان میں تعلیم چھوڑنے والوں کا تناسب بھی بہت کم ہے۔ پرائمری سطح پر ۷۶ فی صد طلبا اور طالبات اپنی تعلیم درمیان میں نہ چھوڑ کر اسے جاری رکھتے ہیں اور ۷۴ فی صد طلبا اور طالبات اپر پرائمری سطح پر اپنی تعلیم جاری رکھتے ہیں۔

پرائمری سطح کی تعلیم سب کے لیے عام کرنے کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ سہولت سبھی بچوں اور بچیوں کو ملے اور پھر وہ اپنی تعلیم درمیان میں نہ چھوڑیں۔ اس سلسلے میں شیڈولڈ کاسٹ / شیڈولڈ ٹرائب زمروں کے بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے اور یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ درمیان میں اپنی تعلیم ترک نہ کریں۔

تعلیمی مواقع کی دسترس کے لیے تین پروگراموں پر خصوصی زور ہے۔ آپریشن بلیک بورڈ اسکیم، غیر رسمی تعلیم کا پروگرام اور استادوں کی تربیت کے پروگرام۔ اس کے لیے تعلیم و تربیت کے ضلعی اداروں کی توسیع پر خاص زور رہا ہے۔

پرائمری تعلیم کے لیے ضلع کی سطح پر خصوصی پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔ اس پروگرام میں پرائمری تعلیم کا بہ حیثیت مجموعی جائزہ لیا جاتا ہے اور اس سلسلے کے انتظامیہ میں لامرکزی نظام کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ عوامی تعاون کے ذریعے اسے آگے بڑھایا جاتا ہے۔ اس میں ایسے نصاب تعلیم کو شامل کیا گیا ہے جس سے مقامی نوعیت کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مدد ملے، آٹھویں منصوبے کے آخر تک اسے ۱۱۰ اضلاع میں لاگو کر دیا جائے گا۔ اب تک یہ ۴۲ ایسے اضلاع میں چل رہا ہے جہاں خواتین کی شرح خواندگی کم ہے۔

کچھ ایسے تعلیمی پروجیکٹ بھی زیر عمل ہیں جنھیں بیرونی امداد سے چلایا جا رہا ہے۔ مثلاً اتر پردیش میں بیسک ایجوکیشن کا پروگرام، بہار ایجوکیشن پروجیکٹ، راجستھان میں شکشا کرمی اور لوک جمبش پروجیکٹ بھی اس سلسلے کی کڑی ہے۔ آندھرا پردیش میں پرائمری ایجوکیشن پروجیکٹ بھی زیر تکمیل ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۹۵ء سے پورے ملک میں اسکولی بچوں کے لیے دوپہر کے کھانے کی اسکیم شروع کر دی گئی ہے۔ اس کے ذریعے سے سب کے لیے پرائمری تعلیم عام کرنے کے پروجیکٹ کی مقبولیت کو بڑھایا جا رہا ہے۔ اس طرح اسکولی بچے باقاعدگی سے اسکولوں میں حاضر رہتے ہیں۔ تین سال کے اندر اندر سرکاری اور سرکاری امداد سے چلنے والے تمام اسکولوں میں دوپہر کے کھانے کی اسکیم لاگو ہو چکی ہوگی اور ۱۲ کروڑ بچے اس اسکیم سے مستفید ہو رہے ہوں گے۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے بچوں کی تعداد ۳ کروڑ ۳۵ لاکھ رہی۔

معرفت ڈاکٹر سردار احمد، محلہ ہرناتھ پورہ۔ سہارنپور

اس پروگرام کے لیے مرکزی امداد کے اہم اجزا یہ ہیں:-

(۱) جو ادارے اسکولی بچوں کے لیے دوپہر کا مفت کھانا فراہم کرتے ہیں، ان کو مرکزی سرکار مفت غلّہ فراہم کرتی ہے۔

(۲) فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے گوداموں سے اسکولوں اور دیہات تک غلّہ کی باربرداری کے اخراجات بھی مرکزی سرکار ادا کرتی ہے۔

(۳) دیہی ترقی کی وزارت نے غریبی دور کرنے کی جو اسکیمیں شروع کر رکھی ہیں ان کے تحت غلّہ سے کھانا تیار کرنے کے اخراجات اور باورچی خانوں کے شیڈوں کی تعمیر کے اخراجات ادا کیے جاتے ہیں اور ان اخراجات کا بار انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت کا شعبۂ تعلیم اٹھاتا ہے۔

یہ پروگرام تمام ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں رائج ہے۔ سات ریاستیں یعنی گجرات، ہریانہ، جموں و کشمیر، کیرالہ، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، تمل ناڈو اور مرکز کے زیرِ انتظام پانڈیچری میں پکا ہوا کھانا اسکولی بچوں کو فراہم کرایا جاتا ہے۔

دہلی میں کھانے کے ڈبّے دیے جاتے ہیں۔ باقی ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں خوراکی اجناس فراہم کرائی جاتی ہیں۔ اس اسکیم سے تقریباً ساڑھے تین کروڑ بچے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

تعلیم بالغان

ہندوستان میں خواندگی کے قومی پروگرام کے تحت تمام سماجی قوتوں کے ذریعے عوام کے معیارِ زندگی میں نمایاں تبدیلی لانا مقصود ہے، یہ ایک ایسا پروگرام ہے جسے پورا کرنے کے لیے سیاسی اور قومی سطح پر عہد کر لیا گیا ہے۔

اس وقت بالغوں کی شرحِ خواندگی ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کی روشنی میں ۵۲،۲۱ فی صد ہے۔ ان میں خواتین کی شرحِ خواندگی ۳۹،۲۹ فی صد ہے جب کہ مردوں کی ۶۴،۱۳ فی صد ہے۔

ملک کے ۳۷۹۔ اضلاع میں مکمل خواندگی کی تحریک شروع کی جا چکی ہے۔ یہ مہم جن ریاستوں میں چلائی جا رہی ہے، ان کے نام یہ ہیں۔

آندھرا پردیش، بہار، دہلی، گوا، گجرات، ہریانہ، ہماچل پردیش، جموں و کشمیر، کرناٹک، کیرالہ، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، منی پور، میگھالیہ، اڑیسہ، پنجاب، راجستھان، تمل ناڈو، تری پورہ، اتر پردیش، مغربی بنگال، چنڈی گڑھ، دادرا اور نگر حویلی، دمن دیو اور پانڈیچری۔ اس وقت ۹ سال سے لے کر ۳۵ سال تک کے تقریباً ساڑھے چھ کروڑ افراد ۶۰ لاکھ رضاکاروں کی مدد سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ساڑھے تین کروڑ افراد کو خواندہ بنایا جا چکا ہے۔ چار ریاستیں ایسی ہیں جن کی آبادی زیادہ ہے اور وہاں خواندگی کی شرح کمتر ہے، ان کے نام ہیں بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور اتر پردیش۔ ان ریاستوں میں لوگوں کو خواندہ بنانے پر خصوصی زور ہے۔ ان چار ریاستوں میں ملک کی کل ناخواندہ آبادی کا تقریباً ۴۸ فی صد حصّہ آباد ہے۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں مکمل خواندہ بنانے کی مہم کے لیے ۴۰ اضلاع کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ لیکن اب تک اس مہم کے تحت ۲۷۴ اضلاع میں یہ پروگرام شروع کیا جا چکا ہے جو مقررہ نشانے سے زیادہ ہے۔ نوخواندہ افراد کے لیے تعلیمی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ایک نظرثانی شدہ اسکیم تشکیل دی گئی ہے۔

ثانوی تعلیم

ثانوی تعلیم کو مستحکم بنانے کے لیے متعدد اسکیمیں شروع کی گئی ہیں مثلاً سائنسی تعلیم کو بہتر بنانے کی اسکیم، ماحولیات کی تعلیم کی اسکیم، آبادی سے متعلق تعلیم، کمپیوٹر کی تعلیم، جسمانی صحت کی تعلیم اور کھیلوں وغیرہ کی تعلیم کی اسکیمیں وغیرہ۔ ان کے علاوہ تعلیمی تحقیق و تربیت کی قومی کونسل جسے مختصراً این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کہتے ہیں، اسکول کی سطح پر تعلیمی تحقیق و تربیت کے لیے وسائل کی شکل میں امداد دے رہی ہے۔

ملک میں قومی شناخت بنانے میں کیندریہ ودیالیوں اور نو ودے اسکولوں نے بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ سرکار نے عمارتوں کی تعمیر، لیبارٹریز، لائبریریاں اور استادوں کی تربیت کی سہولتیں پیدا کرنے کے عمل کو تیز کر دیا ہے۔

ملک میں اوپن اسکولوں کا رواج بھی بڑھا ہے۔ اس طریقِ تعلیم سے، تعلیم سے محروم افراد گھر بیٹھے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ سماج کے کمزور طبقوں کے لیے یہ طریقہ باکفایت اور مفید ثابت ہوا ہے۔

اسکولی بچوں پر کتابوں کے بوجھ کا مسئلہ زیرِ غور رہا ہے، اس سلسلے میں پروفیسر یشپال کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں بہت سے اقدامات کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کے ڈائرکٹر کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ذمے یشپال کمیٹی کی متعدد سفارشات پر عمل درآمد کے سلسلے میں ہر چھٹے مہینے ایک رپورٹ پیش کرنا ہے۔

۵۹-۱۹۵۸ء میں استادوں کو قومی ایوارڈ سے نوازنے کی ایک اسکیم شروع کی گئی تاکہ پرائمری، مڈل اور ہایر سکنڈری اسکولوں کے ایسے استادوں کی عزت افزائی کی جا سکے جو نمایاں طور پر عوامی خدمات انجام دیتے ہیں۔

یونیورسٹی اور اعلا تعلیم

تعلیمی نظام میں یونیورسٹی یا کالج کی سطح کی تعلیم بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ ہندوستان میں اعلا تعلیم کے نظام نے بڑا فروغ پایا یا جصول آزادی کے بعد اس میں خاصی ترقی دیکھنے کو ملی۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعداد پہلے کے مقابلے کہیں زیادہ ہے۔ قومی اہمیت کے حامل اداروں کی تعداد بھی پہلے کے مقابلے زیادہ ہے۔ ہایر ایجوکیشن کی ہر سطح پر طلبا کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ داخل شدہ طلبا میں طالبات کی معتد بہ تعداد ہے۔ ان کے علاوہ ستیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب امیدواروں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔

۹۵-۱۹۹۴ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانے کا عمل شروع کیا۔ اس سلسلے میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔

مراسلاتی نصابات کے ذریعے تعلیم کا رواج بھی بڑھا ہے، اس میں لاگت کم آتی ہے اور دور دراز کے لوگ اس سے خاص طور پر مستفید ہوتے ہیں، اس سلسلے میں الیکٹرانک میڈیا نے کلیدی رول ادا کیا ہے، امید ہے کہ آٹھویں منصوبے کے آخر تک اس پروگرام کے تحت

تعلیم پانے والے طلبا اور طالبات کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہوگی۔

اتر پردیش میں بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی قائم کی گئی ہے اس سلسلے میں ۱۳ جنوری ۱۹۹۶ء کو ریاست اتر پردیش کے ساتھ ایک مفاہمتی دستاویز پر دستخط کیے گئے ہیں جس سے نام کی منتقلی پر جلد سے جلد کارروائی کی جا سکے اور یونیورسٹی سے آراضی پر قبضہ حاصل کیا جا سکے۔

تکنیکی تعلیم

تعلیم سے متعلق قومی پالیسی کی دستاویز میں انجینئرنگ کالجوں اور پولی ٹکنیک اداروں کی لیباریٹریوں اور ورکشاپوں کو جدید بنانے پر زور دیا گیا ہے اور صنعتی تجارتی نظام کو ترجیحی بنیادوں پر لاگو کرنے کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ تکنیکی تعلیم کا معیار بڑھانے کی خاص ضرورت بتائی گئی ہے۔

عورتوں کی تعلیم

حصول آزادی کے بعد ملک میں عورتوں کے لیے تعلیمی مواقع بڑھانے پر زور ہے لیکن اس کے باوجود ملک میں تعلیم کے معاملے میں عورتوں اور مردوں کے درمیان ایک طرح کا امتیاز برتا جاتا ہے۔ تعلیم سے متعلق قومی پالیسی میں تعلیم کے ذریعے عورتوں کے سماجی مرتبے کو اوپر اٹھانے کی بات کہی جا رہی ہے اور اب جب کہ ہر جگہ اور ہر شعبہ میں عورتوں کی نمائندگی پر زور ہے، اس پس منظر میں عورتوں کی تعلیم کی سہولتوں میں اضافہ وقت کی ضرورت ہے، چنانچہ مردوں اور عورتوں کو ایک ہی سطح پر لانے کے لیے ایک پروگرام بنایا گیا ہے تاکہ ایسا ماحول تیار کیا جا سکے جہاں عورتوں کے علم اور ان کے سماجی مرتبہ کو بڑھایا جا سکے۔

درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل نیز اقلیتی فرقوں کی تعلیم

تعلیم کے مواقع عام کرنے اور سماج کے مختلف طبقات خاص کر پسماندہ ذاتوں، مندرج فہرست ذاتوں اور قبائل نیز اقلیتوں کی تعلیم کے لیے خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقوام کی سماجی حالت بہتر بنانے کے لیے تعلیم کو ایک اہم ذریعہ تصور کیا گیا ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں پسماندہ طبقات بستے ہیں وہاں تعلیمی مواقع بڑھانے پر تعلیمی شعبے نے خصوصی توجہ دی ہے۔ مدرسوں کی تعلیم کو جدید بنانے اور ان میں بنیادی سہولتوں کی فراہمی پر خاص زور دیا گیا ہے۔ مدرسوں اور مکتب میں سائنس اور کمپیوٹر کی تعلیم کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔ ان کے نصابات میں انگریزی، ہندی، ریاضی اور سماجی مطالعوں کو شامل کرنے کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ معذور بچوں کی تعلیم سے متعلق مختلف اسکیمیں رائج ہیں تاکہ وہ ہر حالت میں تعلیم حاصل کر سکیں۔

مرکز کا تعلیمی بجٹ ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۲۴۲۶٫۹۹ کروڑ روپے تھا جس میں مرکز کے زیر انتظام علاقوں اور ریاستوں کا تعلیمی بجٹ بھی شامل تھا۔

۹۵-۱۹۹۴ء میں ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کا بجٹ ۲۷۱۷۷٫۲۵ کروڑ روپے تھا۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں مرکزی سیکٹر میں تعلیم کے لیے ۲۷۰۴٫۰۷ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی۔ اس میں سے ۱۲۳٫۸۸ کروڑ روپے غیر منصوبہ جاتی مصارف اور ۱۸۲۳٫۸۴ کروڑ روپے منصوبہ جاتی مصارف کے لیے ہیں۔

مختصراً یہ کہ حصول آزادی کے بعد ہندوستان میں تعلیمی محاذ کو اولیت حاصل رہی اور تعلیمی شعبوں خصوصاً تکنیکی تعلیم کے شعبوں میں نمایاں ترقی دیکھنے کو ملی، آج ہمارے تکنیکی افراد پوری دنیا میں تعلیم و ترقی کے پروگراموں میں عملی شرکت کر رہے ہیں اور ان سے ترقی پذیر ممالک خاص طور پر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ●

بقیہ۔ جواہر لال نہرو — ایک حساس شخصیت

۱۴ نومبر کو "یوم اطفال" کی شکل میں ملک کو سپرد کر دیا۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ملک کے عوام انھیں بے حد پیار کرتے ہیں، لیکن اس کے مقابلہ میں وہ ان کی امیدوں اور خواہشات کو پورا نہیں کر پاتے۔ اگرچہ اس کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں اور سرگرم رہے۔ غالباً اسی لیے وہ رابرٹ فراسٹ کی یہ عبارت اپنی ٹیبل پر ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے تھے

"جنگل خوب گنجان اور خوبصورت
ہیں مگر کئی وعدے ہیں جو پورے
کرنے ہیں اور سونے سے پہلے طویل
مسافت طے کرنا ہے۔"

اس عبارت سے ترغیب حاصل کر کے زندگی کی آخری سانسوں تک عوام کی خدمت کرتے رہنے کا عزم بھی غالباً نہرو جی کو اپنے محبوب ملک اور اس کی سرزمین کے تئیں محبت نمایاں کرنے کے لیے کافی نہیں محسوس ہوا۔ اسی لیے تو اپنی وصیت میں یہ لکھ کر کہ میری راکھ کا زیادہ تر حصہ آسمان کی بلندی سے ملک کے کھیت کھلیانوں میں بکھیر دیا جائے تاکہ اس کی مٹی میں مل کر وہ اس ملک کا غیر منقطع حصہ بن جائے۔ اس ملک ہندوستان کا حصہ جس سے نہرو جی کو بہت پیار تھا اور جس نے نہرو کو اپنا بے پناہ پیار دیا تھا۔

ایسے تھے ہمارے حساس جواہر لال نہرو۔ ●

قلم کار حضرات سے

گزارش ہے کہ

(۱) مضامین/دیگر تصانیف جو یوجنا کو ارسال کریں انھیں کہیں اور چھپنے کے لیے قطعاً نہ بھیجیں۔

(۲) ہر مضمون کے آخر میں طبع زاد / غیر مطبوعہ لکھ کر اپنا دستخط، نام اور پتا ضرور درج کریں۔

(۳) مضمون کی اصل ہی ارسال کریں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۴) مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کریں۔

(ادارہ)

محمد رضی الدین معظم

تعلیم کے ذریعہ قومی یک جہتی کا فروغ

"ہم" ایک ہیں ہمارا اتحاد، رواداری کے قابل فخر ثقافتی سرمایہ، ہمارے مذاہب عالمگیر بھائی چارے کے فروغ کا ذریعہ ہیں لیکن ہندوستان میں قومی یکجہتی و قومی ہم آہنگی کا مسئلہ جتنی سنگین شکل میں آج ہمارے سامنے ہے پہلے نہ تھا۔ اس لیے کہ آج ہمارے پاس اخلاقی اعتبار سے مضبوط قد آور قیادت نہیں جو آزادی کے بعد ابتدائی برسوں میں تھی۔ آج ہم میں نہ کوئی گاندھی جیسا مہاتما ہے جو قومی آہنگی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کے لیے اپنی جان قربان کردے، نہ نہرو جیسا کوئی تاریخ ساز مدبر اور بے خوف قائد ہے جو فسادیوں کی کسی بھیڑ کا مقابلہ اپنی کار کے بونٹ پر کھڑے ہوکر اور چھڑی چلا کر کرسکے اور ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرسکے، نہ ہی مولانا آزاد جیسے صبر و تحمل کا کوئی پیکر ہے جو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر مایوسوں کو ڈھارس و ہمت بندھائے اور غفلت کے پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی آنکھوں کو حقائق سے روشناس کرائے جب کہ اس کے برعکس عدم تحفظ کی جو فضا اس وقت ایک آدھ مخصوص سماجی گروہ تک ہی محدود تھی، آج بلا تخصیص ہندوستانی قومیت کی تشکیل کرنے والے تمام مذہبی تہذیبی اور لسانی گروہ اس کی لپیٹ میں ہیں۔ لہٰذا اس سنگین مسئلہ کو ہم تعلیم کے ذریعہ قومی یکجہتی کے فروغ کے آئینہ میں غور کرنے کی کوشش کریں گے۔

تعلیم علم سے ہے، علم کے معنی کسی بات کو جاننا اور پرکھنا ہے تعلیم کی افادیت و اہمیت سے ہر ایک واقف ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ قوم و ملت کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں۔ تعلیم انسان کو اچھے برے کی تمیز سکھلاتی ہے غلط عقائد توہمات سے نجات دلاتی ہے۔ انسان کی معاشی ضروریات کی تکمیل میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے، تعلیم انسان میں پیش قدمی کا جذبہ ابھارتی، دل میں ترقی کی خواہش و امنگ پیدا کرتی ہے، تعلیم جمود کا خاتمہ کرتی ہے، تعلیم ایک ایسا چشمہ ہے جو بہہ بہہ کر اتنا وسیع تر ہو جاتا ہے کہ تمام روئے زمین کے دانشوروں کے ذہنوں کی آبیاری کرتا ہے۔ تعلیم ہی سے کسی بھی قانون کے اصول و ضوابط بآسانی حل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ خوشبو کا قافلہ جہاں جہاں سے گزرتا ہے وہاں کا فضائی ماحول معطر ہو جاتا ہے اسی طرح تعلیم کی کرنیں ضیا پاش ہوتی ہیں تو ظلمت اور تاریکیوں کی چادر تار تار ہوکر ہر سو بکھر جاتی ہے اور سوچ بچار غور و فکر جب کسی نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے تو ادراک کا اجالا پھوٹتا ہے اور علم کا پرچم جہاں جہاں بھی لہراتا ہے وہاں کا ماحول حسن فکر و نظر سے مزین ہوکر مرجع خلائق بن جاتا ہے۔ علم ایک مدھر لے ہے، ایک مسحور کن نغمہ، حسین فطرت کا آئینہ، اور قوت لایموت کا استعارہ ہے جس کی سوجھ بوجھ رکھنے والے ہر کس و ناکس کے مرکز نگاہ بنتے ہیں بلکہ اوروں کے لیے مشعل راہ اور منارۂ نور بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علم کی قوت لایموت ۔ ۔ ۔ ۔ کو سمجھنے کے لیے دنیا میں انبیاء و اولیاء کرام، صوفی سنت، مہنت گرو جیسی ممتاز ہستیاں آتی رہی ہیں۔

تعلیم کو سمجھنے کے بعد جب ہم قومی یک جہتی کے بارے میں غور کرتے ہیں تو اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ قومی یک جہتی قوم اور قومیت سے ہے انسان اپنی افتاد طبع کی بدولت فطرتاً مل جل کر رہنے پر مجبور ہے اور پسند بھی کرتا ہے اسے یہ توقع پہلے پہل اپنے اہل و عیال، خاندان، قبیلے نے فراہم کی۔ خاندان قبیلے کی منزل سے آگے بڑھ کر جیسے جیسے انسانی زندگی سماجی خوبیوں سے روشناس ہوتی ویسے ویسے اقتصادی مسائل بقائے باہم نسل تحفظ جان و مال کی خاطر اتحاد، یک جہتی و اشتراک کی ضرورت کو محسوس کرنے پر مجبور ہوئی بستیاں بسا کر بود و باش اختیار کرنے پر اس کے دل میں اپنی بستیوں سے والہانہ وابستگی و رواداری پروان چڑھتی گئی۔ ابتدائی ادوار میں یہ جذبہ چوں کہ بہت ہی محدود اور مقامی حد تک متعین تھا۔ قوم کا تصور بھی سادہ اور محدود تھا لوگ قبیلوں، فرقوں، گروہوں کو عموماً قوم کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ قوم کا جدید تصور مغرب کی دین ہے جس کے مطابق ایک قوم کی تشکیل کے لیے مشترکہ تہذیب، نسل، زبان، رسم و رواج کے ساتھ ساتھ مشترکہ علاقے بھی ریاست، ملک میں بٹ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج انسانی جماعت ایک ریاست، علاقہ یا ملک میں کسی مخصوص تہذیبی، تمدنی، لسانی، مذہبی، سیاسی یا سماجی نظام کے تحت زندگی گزارتی نظر آتی ہے اسی لیے دور جدید میں ہر ایک کو قوم کہا گیا اس لیے کہ ان کے رہن سہن کے طور طریق، رسم و رواج، فنون لطیفہ میں ہم آہنگی کے باعث مل جل کر

رحیم منزل، شاہ گنج، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۲

رہا ایک جہتی بن گیا۔ نفسیاتی اعتبار سے بالخصوص ہندوستانی باشندے کسی بھی واحد نسل سے تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی اپنی جگہ قوم کا درجہ رکھتے ہیں، کئی زبانیں بولتے ہیں کئی مذاہب رکھتے ہیں، یہی نہیں بلکہ ان کے رہن سہن، عیدیں، تہوار و تقاریب، فنون لطیفہ، کھانا پینا، پکوان، لباس، بات چیت، زبان، مذہب کا اختلاف بھی قدم قدم پر ملتا ہے لیکن ان اختلافات کے باوجود "ہندوستانی شہری" ہونے کا جذبہ و احساس قابل قدر ہے جو ہندوستانی تہذیب میں رنگا رنگی کثرت میں وحدت کا جلوہ پیدا کرتا ہے لیکن افسوس کہ آج کثرت میں وحدت کے تصور میں رخنہ اندازی ممکن ہو گئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نت نئے ڈھنگ سے محض کرسی صدارت و اقتدار، مال و دولت، جاہ و حشم کی خاطر۔

محض آئین میں شامل کر دینے سے قومی یک جہتی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جسے ہم میں سے ہر ایک کے لیے ملک کے تعلیمی و سماجی نظام میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیم کے فروغ کے بارے میں ہر دور میں کمیٹیاں کمیشن تشکیل پاتے رہے ان کے ذریعہ قومی یک جہتی کے تصور اور جذبہ کو تقویت دینے پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ تعلیم درحقیقت ایک بنیادی بدل ہے جس کے تحت پرانی ثقافت و تمدن میں تبدیلیاں لا کر سماج کی تشکیل نو ہوتی ہے۔ تعلیم ہی ان احساسات و تصورات کو جلا بخشتی ہے جو قومی ایکتا و بقائے باہم کو فروغ دے سکے اور سائنسی سماج کی پختگی اور آزادی قلب و روح کے حصول کو یقینی بنا کر ہمارے قومی آئین کے تین بنیادی اصولوں سوشلزم، سیکولرازم اور جمہوریت کی آبیاری کر سکے۔ قومی اتحاد کے جذبے کو تقویت دینے کے لیے ملک کی جدید تر قومی تعلیمی پالیسی سارے ملک کے لیے واحد نظام تعلیم کی ضرورت کو اجاگر کرنے کے لیے سنگ میل ہے۔ جدید قومی تعلیمی پالیسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے قومی یک جہتی کے آئینہ میں جب ہم غور کرتے ہیں تو موزوں و مناسب موجودہ تعلیمی نصاب میں حسب ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) قومی یک جہتی کی بنیاد پر جو نصاب مرتب کیا جائے اس میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کا درس بھی شامل رہے۔

(۲) ملک کے تمام جامعات کالجوں اور مدارس کے طلبا و طالبات اور اساتذہ کرام قومی یک جہتی کے فروغ میں حصہ لیں۔

(۳) تمام تعلیمی اداروں کے تعلیمی نصاب اور متعلقہ نصاب میں قومی یک جہتی کے رجحانات کو بہ ہمہ وجود سرایت کرنا چاہیے۔

(۴) ملک کے تمام جامعات اور کالجوں میں رائج و مروجہ تمام زبانوں کو قومی یک جہتی سے ہم آہنگ کیا جائے۔

(۵) صرف کالجوں اور جامعات کے تعلیمی نصاب ہی میں نہیں بلکہ جامعات اور کالجوں کے باہر بھی تعلیم کے ذریعہ قومی یک جہتی کے عناصر کو فروغ دیا جائے۔

(۶) ہمارے سماج کے مختلف گروہوں، طبقات اور مذاہب کے درمیان منافرت و عناد کے اسباب میں اساتذہ کرام کو چاہیے کہ ان کی تحقیق و تشخیص میں طلبا و طالبات کی رہنمائی کریں تاکہ وہ سماج دشمن عناصر کے اختتام کے لیے کمر بستہ ہو کر کام کر سکیں۔

(۷) طلبا و طالبات کی اس سلسلہ میں بھی رہنمائی کی جائے کہ وہ اپنے اعلا علمی اخلاقی تہذیبی ورثوں اور اپنے گرد و پیش کے ماحول کو حق و انصاف کی روشنی میں سمجھیں اور ہمارے ملک میں جو ممتاز و معظم شخصیتیں جنم لیتی ہیں ان کے افکار و خیالات کو مشعل راہ بنائیں۔

(۸) ہر طالب علم کے لیے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ وہ صرف اپنے ہی تہذیبی و تمدنی مخزن پر نظر نہ رکھے بلکہ مختلف صوبوں کی تہذیبی و تمدنی رنگا رنگی کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے اور جس طرح وہ اپنے مذہب اپنی تہذیب و تمدن کا ادب و احترام کرتا ہے اسی طرح دوسروں کے مذاہب و تہذیب و تمدن کو بھی سیکھے۔

(۹) ہر طالب علم میں سماجی ذمہ داریوں کا احساس اجاگر کیا جائے۔

(۱۰) اس بات کی ضرورت محسوس کی جائے کہ تمام کالجوں اور مدارس کے تعلیمی نظام جمہوریت اور قومی یک جہتی کی ضرورت کی تکمیل کریں۔

(۱۱) اس امر کا بھی اہتمام کیا جائے کہ ملک کے ایک حصہ میں جامعات کے اساتذہ کرام کے تبادلے دوسرے حصوں کی جامعات میں ہوں تاکہ ایک صوبے کے افراد کے تعلقات دوسرے صوبوں کے افراد سے ہوں اس طرح کے تبادلے کے عمل سے تہذیبی لین دین اور حصے کی تاریخی تہذیبی اخلاقی خوبیوں کی برکات اور اس کے محاسن کے لوگ از خود قائل ہوں گے۔

(۱۲) تعلیم کا مقصد یہ ہو کہ اس کے ذریعہ طالب علم کے کردار کی تعمیر و تربیت کی جائے اور اس کے اندر مصالحتی شعور، وسیع النظری، حب الوطنی، بھائی چارے، محبت اور خلوص کے رجحانات زور پکڑ سکیں تاکہ وہ سماجی خدمات کو مخلصانہ طور پر ادا کر سکے۔ ●

بقیہ کور ۲: خلائی میدان میں ہندوستان کی کامیابی

طوفان، نباتات، زراعت، زمین کے اندرونی سطح کے پانی، جنگلات، سیلاب، قحط وغیرہ کی جانکاری فراہم کرائے گا۔

"پی۔ ایس۔ ایل۔ وی۔ ڈی۔ تھری" راکٹ کے کامیاب تجربہ سے جی۔ ایس۔ ایل۔ وی کے راکٹ کے تجربہ کی بھی راہ ہموار ہوئی ہے کیوں کہ اس میں استعمال ہونے والے بہت سے آلات کی اس راکٹ سے جانچ ہو گئی ہے۔ یہ کامیاب تجربہ واقعی ہندوستانی سائنس دانوں کی ایک قابل تعریف حصولیابی ہے جس کے لیے وہ ہندوستانیوں کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

پروفیسر حاجی شمس الدین

جواہر لال نہرو۔ ایک حسّاس شخصیت

پنڈت جواہر لال نہرو کے بارے میں کچھ لوگوں کا ایسا خیال ہے کہ وہ بڑے گرم مزاج تھے۔ اور انھیں بہت جلد غصہ آجاتا تھا ساتھ ہی نظم و نسق کے بارے میں وہ بڑے سخت تھے۔ لیکن جو ان کی قربت میں رہے ہیں نیز ہم نے بھی ان کے متعلق جو کچھ دیکھا پڑھا اور سنا ہے اس سے ان کے مزاج کی ایک علاحدہ تصویر سامنے آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں غصہ آتا تھا لیکن جب کوئی غلط بات ہو جائے، کوئی نظم و نسق کے خلاف بات کرے، کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی ہو یا حسب ان کے حسب منشا کام نہ ہو۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کا غصّہ بہت جلدی ہی رفع ہو جاتا تھا۔ اسی طرح وہ اپنی عادات اور کاموں میں بھی بااصول تھے اور خود بڑے منضبط تھے۔ اس لیے فطری بات ہے کہ دوسروں سے بھی اس کی امید رکھتے تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود نہرو جی بڑے سیدھے، سادہ مزاج، رحم دل اور حسّاس تھے۔ اوپر سے سخت دکھائی دیتے تھے مگر اندر سے بڑے نرم دل اور مہربان تھے۔ اس سیاق و سباق میں ان کا مقابلہ ناریل سے کیا جا سکتا ہے جو اوپر سے تو بڑا سخت ہوتا ہے لیکن اندر سے بڑا نرم اور میٹھا ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کے کئی واقعات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

جواہر لال نہرو قدرت اور خوب صورتی کے تئیں بھی بڑے حسّاس تھے۔ اپنی مصروف ترین زندگی میں جب بھی فرصت کے کچھ لمحے ملتے تھے تو انھیں وہ قدرتی حسن کے درمیان گزارتے۔ اونچے نیچے برف سے ڈھکے پہاڑ شور شرابہ کرتی ہوئی بہتی ندیاں اونچی چٹانوں سے گرتے ہوئے آبشار اور پہاڑی جھرنے انھیں بہت راغب کرتے تھے۔ انھیں قدرت کی گود میں بڑا سکون، بڑا آرام ملتا تھا۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں خود لکھا ہے کہ جیل کی سونی راتوں میں چاند ان کا غیر منقطع دوست اور ساتھی رہا ہے۔ اس میں وہ دنیا کی خوب صورتی اور زندگی کا اتار چڑھاؤ دیکھتے تھے۔

یہی نہیں کوئی بھی فن، چاہے وہ ڈرائنگ، پینٹنگ، موسیقی ہو یا رقص، ڈرامہ، یا تصویر کشی ہو، ان کے دل کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی نمائش میں جانے پر وہ ایک ایک تصویر ماڈل یا مورتی کو بڑے غور سے دیکھتے تھے اور ان کی خوب صورتی پر فریفتہ ہو جاتے تھے۔ مغربی ماحول میں پڑھنے اور پرورش پانے کے باوجود بھی نہرو جی کو اپنے قدیم فن و ثقافت سے بڑا لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آدی باسی قبائلی ذاتوں کے عوامی نغمے اور رقص انھیں جذباتی کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی آدی باسی فنکاروں کے اصرار پر نہرو جی ان کے روایتی ملبوس میں ان کے رقص میں شریک ہو جاتے تھے۔

۱۹۲۹ء میں پوری آزادی کی مانگ کے ساتھ نہرو جی مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں پورے جوش و خروش کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں شامل ہو گئے۔ کئی اتار چڑھاؤ کے بعد آخرکار ۱۹۴۷ء کا سال آیا جب ہندوستان کو آزادی ملی لیکن بہت بڑی قیمت پر، ہندوستان کو تقسیم کر کے۔ شروع میں کانگریس کا کوئی بھی رہنما اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن انگریزوں کی چال اور مسلم لیگ کی اڑیل پالیسی کے سبب آخر میں کانگریس کمیٹی کو مجبوری میں تقسیم کو قبول کرنا پڑا۔ گاندھی جی تقسیم کے حق میں نہیں تھے۔

ہندوستان کی تقسیم کے فوراً بعد جس طرح سے فرقہ وارانہ فسادات بھڑکے اور لوٹ کھسوٹ سے قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا ان سے پنڈت نہرو کا حسّاس دل رو پڑا۔ اس وقت نہایت دکھی دل سے انھوں نے کہا تھا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے خیر خواہ جانور تھے۔ میرا دل درد سے بھر گیا ہے نیز ان خوفناک فسادات نے میرے ملک کا سر جھکا دیا ہے۔ میں باپو سے ملنے گیا لیکن ان کا سامنا نہ کر سکا۔ میں بہت شرمندہ تھا۔"

روپے پیسے کی فراوانی اور عیش و عشرت کے ماحول میں پیدا ہونے کے باوجود نہرو جی نے دور نوجوانی سے ہی ایثار کی زندگی اپنائی۔ آزادی کی لڑائی میں طرح طرح کے ظلم و زیادتیاں برداشت کر کے اور برسوں جیل میں زندگی گزار کر وہ دل و جان دونوں سے مضبوط ہو گئے تھے۔ لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی میں کچھ مواقع ایسے بھی آئے جب ان کا حساس دل جذباتی ہوا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے نم ہو گئیں۔ اپنے والد کی موت کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے "مجھے یہ محسوس کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ تین ماہ بعد میں اپنی اہلیہ اور بیٹی کے ساتھ سیلون (سری لنکا میں تھا)۔ وہاں

۱۷/۵۰۔ بیج ناتھ پارہ۔ رائے پور۔ ۴ ۲ ۰۱

فوارہ اٹلیا میں ہم آرام وسکون سے کچھ دن گزار رہے تھے۔ مجھے مقام بڑا اچھا لگا اور اچانک میرے دل میں آیا کہ یہ والد محترم کے لیے مناسب ہوگا کیوں نہ انھیں یہاں بلا لیا جائے؟ وہ بہت تھک گئے ہوں گے اور آرام سے یہاں انھیں فائدہ ہوگا۔ میں الٰہ آباد تار بھیج کر انھیں بلانے ہی والا تھا کہ۔۔۔"
پنڈت جی کو یاد آیا کہ وہ تو اس دنیا میں نہیں ہیں وران کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

۲۰ سال کی ازدواجی زندگی میں ان کا زیادہ تر وقت جیل میں گزرا۔ اس درمیان کملا نہرو اپنے شوہر کے نقش قدم پر چلتی ہوئی ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں اپنا تعاون دیتی رہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی اہلیہ کملا نہرو کا انتقال ہوگیا۔ ان کی موت پر نہرو جی نے محسوس کیا کہ کملا کا ان کی زندگی پر کتنا گہرا اثر تھا۔ اپنی شریک حیات کی موت پر نہرو جی کے حساس دل سے نکلے۔ ان دلی خیالات پر غور کیجیے "میں نے خلا اور بے مقصدی کا احساس کیا۔ میں اکیلا گھر جا رہا تھا جواب میرے لیے گھر نہیں رہ گیا تھا اور میرے بازو میں ایک ڈلیا تھی جس میں ہڈیوں کی خاک کا برتن تھا۔" کملا اب نہیں رہیں" میرا دل یہی دہراتا جا رہا تھا۔"

والد کی موت اور اہلیہ کی جدائی کے صدمے کے بعد جواہر لال کے لیے صلاح ومشورے، ترغیب اور جوش کا ایک ہی مرکز تھا اور وہ تھا" باپو" مہاتما گاندھی۔ لیکن ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو جب ان کا بھی انتقال ہوگیا تو نہرو جی کی زندگی کو سب سے بڑی ضرب پہنچی۔ قوم پر آئی مصیبت سے وہ لمحے بھر کے لیے مضطرب ہوگئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے انھوں نے بہت ہمت سے کام لیا اور لوگوں کو مخاطب کرکے کہا کہ اگرچہ چراغ بجھ گیا ہے لیکن اس کی روشنی ہماری راہ ہموار کرتی رہے گی اور اس طرح وہ ملک کی آزادی اور اس کے بعد اپنے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر میں مصروف ہوگئے۔

جواہر لال نہرو کے دل کی حساسیت کا ہی نتیجہ ہے کہ انھوں نے تین خاص تصانیف تحریر کیں۔ یہ ہیں" وشو اتہاس کی ایک جھلک" (عالمی تاریخ کی ایک جھلک)" آتم کتھا" (آپ بیتی) اور" ہندوستان ایک کھوج" (تلاش ہند)۔ اس میں سے پہلی تصنیف "وشو اتہاس کی ایک جھلک" میں ان ۱۹۶ خطوں کا مجموعہ ہے جو نہرو جی نے نینی سینٹرل جیل سے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کو لکھے تھے۔ ان خطوط سے نہرو جی کے اندرونی جذبات اور ہمدردیوں کا پتا چلتا ہے۔

۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو اندرا گاندھی کی ۱۳ویں سالگرہ تھی۔ اس دن کے لیے ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو لکھے اپنے خط میں انھوں نے بڑی خوش اخلاقی سے لکھا تھا" اپنے یوم پیدائش پر تحفہ اور مبارکباد پانے کی تمھیں عادت ہے۔ مبارکباد تو تمھیں ابھی بھی پوری طرح سے ملے گی لیکن نینی جیل سے میں تمھیں کیا تحفہ دے سکتا ہوں۔"

نہرو جی کے دل میں اپنے ملک کے عام لوگوں کے لیے بڑا پیار تھا، بڑا رحم اور ہمدردی کا جذبہ تھا۔ جب بھی وہ دورے پر جاتے تو ایک جم غفیر ان کو دیکھنے کے لیے امڈ پڑتا۔ کبھی کبھی کوئی ضعیف یا ضرورت مند شخص ان سے کوئی فریاد کرنا چاہتا یا کوئی درخواست دیتا تو اپنی حفاظت کے سارے دائرے کو توڑ کر وہ خود اس کے پاس پہنچ جاتے۔

نہرو جی بیمار لوگوں کے تئیں بھی بڑے حساس اور ہمدرد تھے۔ جیل میں رہتے ہوئے کانگریسی کارکنان کے بیمار پڑنے پر نہرو جی ان کی تیمارداری بڑی دلچسپی اور مستعدی کے ساتھ کرتے تھے۔ وہ رات میں جاگ کر مریض کی دیکھ بھال کرتے اور صبح سے پھر روزمرہ کے کام میں مصروف ہو جاتے اور حفاظتی افسر دیکھتے رہ جاتے۔ وہ عوام میں اعتماد رکھتے تھے۔ ایک بار ایک اینگلو انڈین پولیس آفیسر نہرو کے استقبال میں جمع بھیڑ کو بڑے وحشیانہ طور پر قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نہرو جی یہ دیکھ کر تقریباً اپنی جیپ سے کود پڑے اور اس آفیسر پر بگڑتے ہوئے بولے" یہ تمہاری حکومت نہیں ہے۔ حکومت عوام کی، ان لوگوں کی ہے۔ یہ بے چارے مجھ سے ملنے دور دور سے آئے ہیں اور تم انھیں مجھ سے ملنے بھی نہیں دیتے۔ تمھیں ان کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔ ہم اور تم ان کے خدمت گار ہیں۔"

جواہر لال نہرو کا دل بڑا فراخ تھا۔ خاص طور پر غریب اور چھوٹے ملازمین کا وہ بڑا خیال رکھتے تھے۔ جیل میں رہتے ہوئے بھی وہ آنند بھون کے اپنے نوکروں کے آرام وسہولیات کا خیال رکھتے تھے۔ نیز اپنی بہن وجے لکشمی پنڈت کو خط لکھ کر کبھی ان کی تنخواہ تو کبھی ان کے کپڑے، مکان وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے اور ضروری مدد کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ایک بار کچھ سبکدوش وضعیف ملازمین نہرو جی کے پاس پہنچے اور گلوگیر آواز میں بولے" حضور چار سال سے پنشن نہیں ملی بھوکوں مر رہے ہیں۔"

نہرو جی حیرت سے بولے" کیا؟ چار سال سے آپ لوگوں کو پنشن نہیں ملی؟"

اور پھر فوراً افسران کو بلایا اور خوب پھٹکارتے ہوئے بولے۔ جلد کارروائی کر کے سبکدوش ملازمین کو پنشن دلانے کا بندوبست کیا جائے۔ انتظامیہ کے تئیں بھی نہرو جی اتنے ہی حساس تھے۔ نہرو جی کے ساتھی ان کی قربت میں رہنے پر بڑے مطمئن اور خوش رہتے تھے بسبب وہ جانتے تھے کہ نہرو جی نہ صرف ان کے مددگار تھے بلکہ محافظ بھی۔

نہرو جی جیل میں صبح جلدی اٹھتے اور کبھی باغبانی تو کبھی صفائی کے کاموں میں لگے رہتے۔ کبھی ناشتہ بنانے میں تو کبھی سبزی کاٹنے میں وہ باورچی کی بھی مدد کیا کرتے تھے۔ اس طرح ہمیشہ سرگرم رہتے تھے اور محنت کرتے رہنے کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ خود کبھی بیمار نہیں پڑتے تھے۔ نہرو جی کے طعام کی عادت بھی بڑی سادہ تھی۔ ان کا طعام بڑا محدود اور باضابطہ ہوتا تھا۔ کوئی ان سے بار بار اور زیادہ کھانے کے لیے اصرار کرتا تو وہ ناراض ہو جاتے تھے۔ اسی طرح کئی قسم کی چیزیں ایک ساتھ کھانا بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ انھیں روپے پیسے اور سرمائے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ کچھ ہی چیزوں کے علاوہ مجھے کسی طرح کے سرمائے سے لگاؤ نہیں تھا۔ سرمایہ رکھنا میرے لیے بوجھ کے مانند ہے۔ زندگی کے سفر میں انسان کو ہلکا چلنا چاہیے۔

نہرو جی کو گلاب کا پھول بہت پسند تھا اور اسے وہ ہمیشہ جیکٹ کے بٹن کے ساتھ لگائے رکھتے تھے۔

پنڈت جی کو ننھے ننھے بچے بھی بڑے پیارے لگتے تھے کیوں کہ بچے بھی گلاب کی مانند ہوتے ہیں۔ بچوں کے تئیں ان کی دلچسپی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے یوم پیدائش

باقی ص ۱۴۰ پر

نہرو کی کہانی بہن کرشنا کی زبانی

آج ہمارے محبوب رہنما جواہر لال نہرو اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن ان کی شخصیت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ کرشنا ہتھی سنگھ جو ان کی سگی بہن تھیں انھوں نے بڑی خوب صورتی سے اپنے بھائی کا عکس کھینچا ہے جو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

"میں جب پیدا ہوئی تو نہرو انگلستان میں تھے، اس کے بعد وہ چھٹیاں گزارنے گھر آئے بھی، لیکن ان دنوں میں بہت چھوٹی تھی، اتنی چھوٹی کہ اس زمانے کا کوئی نقش میرے ذہن میں محفوظ نہیں۔ البتہ ۱۹۱۲ء میں جب وہ انگلستان سے واپس آئے تو میں کافی بڑی ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں ہم مسوری میں تھے۔ جوں جوں ان کی آمد کے دن قریب آ رہے تھے ان کے استقبال کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ اس زمانے میں یوں بھی انگلستان دنیا کا آخری سرا سمجھا جاتا تھا۔ آخر نہرو کی آمد کا دن آ ہی پہنچا۔ میری ماں خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں۔ اپنے پیارے بیٹے کے استقبال کی تیاریوں کو دیکھنے کے لیے وہ کبھی زینے سے اترتیں اور کبھی اوپر جاتیں۔

مجھے یاد ہے کہ اس دن میں کتنی تنہا تھی، ہر آدمی مصروف تھا۔ میری دیدی بھی میری طرف توجہ نہیں دے رہی تھی، سب نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا تھا اور میں باغ میں اِدھر سے اُدھر گھوم رہی تھی۔ پھر میں نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی، ایک نوجوان میرے پتا جی اور دوسرے دوستوں کے ساتھ گھر کی طرف آ رہا تھا، سب آدمی آپس میں باتیں اور سرگوشیاں کرتے ہوئے ادھر متوجہ ہوگئے، وہ لوگ ہنس رہے تھے اور خوش تھے۔ ہمارے گھر میں ایک عجیب سی چہل پہل اور رونق پیدا ہوگئی۔ میں رنجیدہ اور ملول گھر میں داخل ہوئی اور اس سے پہلے کہ میں کوئی بات سمجھتی، مجھے اس نوجوان نے گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ مجھے یہ بے تکلفی پسند نہ آئی، میں نے اپنے گال کو ہاتھ سے رگڑ کر صاف کر دیا۔ اپنے بھائی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

چند مہینوں کی یہ ملاقات میرے لیے بہت زیادہ پُر مسرت نہ نکلی۔ نہرو مجھے خوش کرنے اور غصہ دلانے کی بہت سی ترکیبیں کیا کرتے، وہ مجھے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بٹھاتے اور اسے بھگاتے مجھے غصہ آتا۔ لیکن ان پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں ڈرتی بالکل نہیں۔ میں وہی کرتی جو وہ چاہتے میں ان سے خفا بھی تھی اور جلتی بھی تھی، اس کے باوجود کہ وہ میرے لیے بڑی اچھی اچھی گڑیاں اور دوسرے تحفے لاتے تھے۔ میں اس اجنبی بھائی کو ناپسند کرتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ انگلستان واپس چلے جائیں۔ کیوں کہ جب سے وہ آئے تھے مجھے گھر میں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ سب کی توجہ میرے بھائی کی طرف ہی رہتی تھی۔

دن یوں ہی گزرتے رہے۔ ایک دن جواہر نے مجھے حساب پڑھانے کی پیش کش کی۔ میری عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ میں نے اس تجویز کو پسند نہ کیا۔ لیکن پھر بھی اسے منظور کر لیا۔ میرا پہلا سبق بہت کامیاب رہا اور میں نے اس میں دلچسپی بھی لی۔ کیوں کہ انھوں نے بڑی خوش اخلاقی اور اچھے طریقے سے پڑھایا تھا۔ لیکن ایک دن مجھ سے کچھ غلطی ہوگئی۔ نہرو ناراض ہوگئے اور انھوں نے میری کتابوں کو اٹھا کر پھینک دیا۔ میں خوفزدہ ہوگئی۔ میرے منھ سے آواز تک نہ نکلی۔ نہرو نے مجھے فوراً منانے کی کوشش کی، لیکن لاحاصل۔ میں نے پڑھنے سے انکار کر دیا اور یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

پھر ۱۹۲۱ء آیا۔ میں نے اپنا اسکول چھوڑ دیا تھا اور گھر میں تعلیم حاصل کرنے لگی تھی، ہماری گھریلو زندگی بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ لیکن یہ زندگی بہت جلد ہی حالات کا شکار ہوگئی، میرے بھائی اور باپ مادرِ وطن کی آزادی کے لیے جیل چلے گئے تھے، میں اپنی ماں کے ساتھ اپنے بھائی اور باپ سے ملنے جیل جایا کرتی۔ دونوں اپنی مرضی ہی سے جیل گئے تھے لیکن انھیں دیکھ کر میں سنجیدہ اور ملول ہو جاتی، ہر ملاقات کے بعد میرا غم اور بڑھ جاتا۔ میرے والد اور جواہر ہمیشہ مسکرا کر ہمارا استقبال کرتے۔ یہ

ہماری زندگی کے یادگار دن تھے۔ میں جواہر کی معتقد اسی زمانے میں ہوئی تھی۔ جواہر سے ہر ملاقات کے بعد ان کے لیے میرے دل میں عقیدت اور بڑھ جاتی۔ میں سوچتی کہ وہ ایک پُراسرار شخصیت ہیں۔ ان جیسا شاید ہی کوئی اور شخص دنیا میں ہو۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے دل میں نہرو کی عقیدت اور محبت بڑھتی رہی۔ ۱۹۲۶ء میں، میں واقعی نہرو سے پوری طرح واقف ہوئی۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ ان دنوں جنیوا میں تھے، میں ان کے ساتھ رہنے کے لیے وہاں گئی تھی، ایک چھوٹی سی جگہ ایک ساتھ رہ کر ہم بہت جلد ایک دوسرے کے دوست اور ساتھی بن گئے، جواہر ایک خوش مزاج دوست ثابت ہوئے۔ میں نے ان کے ساتھ پیرس، برسیلز، روم اور برلن وغیرہ کا دورہ کیا۔ ہم عام طور پر کسی نہ کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے جاتے تھے۔ جہاں عالمی شہرت کی شخصیتوں سے ہماری ملاقات ہوتی۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا سب سے زیادہ خوشی اور فخر مجھے اس وقت محسوس ہوا جب میں نے دیکھا کہ ہر شخص نہرو کی تعریف کرتا ہے اور انھیں پسند کرتا ہے۔

میں نے نہرو کو ہمیشہ ہی خوش و خرم نہیں دیکھا۔ انھیں یورپ کے سفر کے دوران رنجیدہ اور پریشان بھی محسوس کیا۔ ان دنوں ان کی بیوی بیمار تھیں۔ ان کا زیادہ تر وقت سینی ٹوریم میں گزرتا۔ ہماری بھابھی کی صحت میں کبھی برائے نام ہی افاقہ ہوتا، وہ جب اپنی اہلیہ کو اس حال میں دیکھتے تو ان کی آنکھوں سے ناقابل بیان غم جھلکتا۔ وہ رنجیدہ خاطر رہتے۔ اس کی وجہ سے ان کی صحت پر بھی اثر پڑا اور وہ وقت سے پہلے بوڑھے نظر آنے لگے۔

تیماردار کی حیثیت سے جواہر بہت کامیاب ہیں۔ ان میں غیر معمولی صبر و استقلال کا مادہ ہے۔ نہرو نے ایک دو دن نہیں، بلکہ برسوں اپنی بیمار ماں اور بیوی کی تیمارداری کی ہے۔ کسی قسم کے غصے اور تھکن کا اظہار کیے بغیر وہ بستر علالت پر حاضری دیتے رہے ہیں۔

نہرو کو کھیلوں سے بڑی دلچسپی ہے۔ سیر و سیاحت پر وہ جان دیتے ہیں۔ وہ سردیوں کے کھیلوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سوئزرلینڈ میں وہ گھنٹوں "اسکینگ اور اسکیٹنگ" کھیلتے تھے۔ ان میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ جو کچھ خود کرتے ہیں۔ اس کی توقع وہ دوسرے لوگوں سے بھی کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی یہ سب چیزیں سیکھ لیں اور اسی سلیقے اور مہارت سے انھیں انجام دیں جو انھوں نے حاصل کی ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں مجھے بھی ایسا ہی تجربہ ہوا وہ مجھے اسکیٹنگ سکھانا چاہتے تھے لیکن جس دن ہم نے پہلا قدم اٹھایا اتفاق سے کئی دن سے برف باری نہیں ہوئی تھی۔ فرش پر جو برف تھی وہ سخت اور کھردری تھی جس سے پھسلن پیدا ہو گئی تھی۔ میں جب بھی قدم بڑھانے کی کوشش کرتی پھسل کر گر جاتی۔ اس بات سے جواہر ناراض ہو گئے اور انھوں نے مجھے اسکیٹنگ سکھانے سے انکار کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے پیش گوئی کی ایک صدی تک میں اسکیٹنگ نہیں سیکھ سکتی۔ لیکن باوجود اس پیش گوئی کے میں نے اپنے ایک سوئس دوست سے اسے تین دن میں سیکھ لیا۔

نہرو کو سب سے زیادہ خوش اس وقت دیکھا جا سکتا تھا جب وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ ہوں، وہ بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں اور بچے ان کو پسند کرتے ہیں وہ کتنے بھی مصروف ہوں لیکن بچوں سے کھیلنے کا وقت وہ ہمیشہ نکال ہی لیتے ہیں۔

نہرو خواہ قید میں ہوں یا ملک سے باہر ہوں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی سالگرہ اور دوسری تقریبوں کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں، ایسے موقعوں پر ان کی طرف سے تحفہ "تار" یا کم سے کم خط کی ضرور امید رکھنی چاہیے۔ نہرو کی ان ہی خوبیوں نے ہمارے دل میں ان کی قدر پیدا کی ہے۔

ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے انھوں نے کبھی بھی میری بہن یا مجھ پر کسی قسم کا کوئی رعب نہیں جمایا۔ اسی وجہ سے وہ نہ صرف ہمارے پیارے بھائی ہیں بلکہ ایک ہمدرد دوست اور ساتھی بھی ہیں۔ ان سے کبھی بھی کوئی مدد طلب کی جائے وہ بڑی خوشی سے اس کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہ کبھی اپنے مشوروں اور تجویزوں کو گھر کے کسی فرد پر نہیں ٹھونستے۔ ہاں اگر ان سے مشورہ طلب کیا جائے تو وہ بہ خوشی مشورہ اور مدد کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ اگر اس نے نہرو سے کوئی مشورہ لیا تو نہرو نہ اس کا مذاق اڑائیں گے نہ اس پر جھنجلائیں گے۔ وہ تو سرے سے مشورہ کی بات ہی کو راز میں رکھیں گے۔ کیوں کہ وہ ایک مکمل انسان ہیں اور ہر شخص کو یقین ہے کہ اگر کسی سے کوئی غلطی ہوئی تو نہرو اسے فوراً معاف کر دیں گے۔" ●

بقیہ: تہذیب کے فروغ میں تراجم کا رول

دانش جدید سے مالا مال کرنے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کی مثال ہندوستانی زبانوں میں شاید ہی مل سکے۔

ان اداروں کے علاوہ آزادی کے قبل دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد اور اردو اکیڈمی جامعہ ملیہ نے بھی مغربی علوم اور ادب کے مستند اور معیاری ترجمے شائع کیے اور آزادی کے بعد نیشنل بک ٹرسٹ ساہتیہ اکیڈمی اور حال ہی میں ترقی اردو بورڈ نے ادبی اور علمی کتابوں کے تراجم شائع کیے ہیں۔ ان کے علاوہ مدارس کے خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جن میں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ سلفیہ بنارس، جامعۃ الفلاح اور جامعۃ الاصلاح قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً ان مدارس میں عربی اور فارسی سے مذہبی اور ادبی کتابوں کے ترجمے کیے ہیں۔ لہٰذا ان کتابوں کے پڑھنے سے ادبی تراجم کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے کہ اگر ترجمہ کی روایت نہ چلی ہوتی تو آج ہم دوسری تہذیبوں سے کیسے آشنا ہوتے اور اپنی تہذیبوں سے کیسے تقابل کر پاتے۔ بہر حال یہ حقیقت ترجمہ ہی کی مرہون منت ہے کہ آج ہم اس قدر پوری دنیا کی تہذیب سے باخبر ہیں اور ہماری ترقی کرنے کی سب سے بڑی وجہ ترجمہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی

ابوالکلام آزاد کا اُسلوبِ نگارش

اردو ادب کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اردو انشائیہ نگاری میں ان کا ایک اہم مقام ہے اور سیاسی اعتبار سے انھوں نے ملک و قوم کو ایک نئی راہ پر گامزن کیا ہے۔ اردو انشار پردازوں میں ان کا اسلوب ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی بعض خصوصیات کی جانب توجہ مبذول کرانا ہمارا مقصد ہے کیوں کہ ان کا نثری اسلوب سب سے الگ اور سب سے نرالا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے مولانا آزاد کا اسلوب بدلتا رہتا ہے۔ عام دینی موضوع اور مطالب کو وہ ایک خاص طرح کے اسلوب میں لکھتے ہیں۔ صحافت کے لیے انھوں نے دوسرا اسلوب اختیار کیا اور خالص ادبی انشار پردازی کے لیے ان دونوں سے منفرد اسلوب اختیار کیا۔ زبان و بیان کے لحاظ سے ان کا طرزِ نگارش نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا ہے۔ جس کی بہترین مثال "غبار خاطر" ہے۔ نثر ایسی نپی تلی اور الفاظ کا استعمال اس حد تک افراط و تفریط سے بری ہے کہ اس سے زیادہ خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ ابتدائی تحریروں "الہلال" و "البلاغ" میں ناہمواری تھی۔ اس کے مقابلے "غبار خاطر" میں وہ چیز نہیں ہے بلکہ ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ عربی و فارسی کی مشکل ترکیبوں کا کم استعمال کیا گیا ہے۔

مولانا آزاد کے اسلوب کی سب سے اہم خصوصیت نثر کی شگفتگی اور دل نشینی ہے۔ جسے باسانی سمجھ سکتے ہیں اور لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ایک ایک لفظ کو بڑی احتیاط سے ترازو کی تول کے مانند استعمال کیا ہے۔ اسلوب میں تکرار اور الجھاؤ نہیں ہے۔ زبان آسان اور عام فہم ہے۔ نہایت مشکل اور پیچیدہ مسئلوں اور موضوعات سے متعلق بھی ایسے انداز میں گفتگو کی ہے کہ یہ نہ صرف علمی پہلو سے وقیع معلوم ہوتی ہے بلکہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ ایسی دلکشی کی حامل ہے جس سے کہ ہماری تاریخِ ادب کا حصہ بن سکے۔

مولانا آزاد نے دقتِ نگاہ سے نام لیا ہے۔ جزئیات کا احاطہ کیا ہے اور غیر مادی اور غیر معمولی چیزوں سے متعلق دلچسپی اور ان کی تفصیلات کے علم کا اظہار کیا ہے۔ یہ ان کے اسلوب کی نمایاں خوبی ہے۔ کسی چیز کی باطنی اور ظاہری بناوٹ مثلاً چائے کی تاریخ اور اس کے دوسرے لوازم کا ذکر ایسے چٹخارے لے لے کر کرتے ہیں کہ خیال ہوتا ہے کہ چائے نہیں بلکہ شراب طہور یا آبِ کوثر و تسنیم کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ ان کے حسنِ انشار، قوت بیان اور اسلوب کا معجزہ ہے۔

ان کے اسلوب کی ایک نمایاں خوبی وہ مزاح بھی ہے جسے ہم تبسم زیرلب کا نام دے سکتے ہیں۔ "غبار خاطر" میں ان کا اسلوب شگفتہ اور دلکش ہے۔ یہی دل چاہتا ہے کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"۔ خیال کی پیکر تراشی ان کے اسلوب میں جا بجا ملتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے مولانا آزاد کے اسلوب کے بارے میں درست ہی کہا ہے۔

"جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا"

مولانا آزاد صاحبِ طرز انشار پرداز و نثر نگار تھے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان کی نثر صاف پہچانی جاتی ہے۔ عبارت پڑھتے ہی ذہن اور ذوق دونوں اس خیال کی روشنی سے چمک اٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین نے مولانا آزاد کے ادبی اسلوب کے تین دور قائم کیے ہیں۔ زعیمانہ، حکیمانہ اور ادیبانہ۔ سجاد انصاری نے مولانا آزاد کے اسلوب سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ :۔

"اگر قرآن اردو میں نازل ہوتا تو اس کے لیے ابوالکلام کی نثر یا علامہ اقبال کی نظم منتخب کی جاتی۔"

مولانا آزاد کے نثری اسلوب میں شروع سے ہی کچھ انگریزی الفاظ ملنے لگتے ہیں۔ مثلاً تصویر کے بجائے (PHOTO)، اور تبصرے کے بجائے (REVIEW) وغیرہ۔ ان کے اسلوب کی خصوصیات میں علمیت کے ساتھ خطابت اور عربی فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ قرآنی آیات کے حوالے سے اسلوب میں ایک رفعت، جلال، برگزیدگی اور عظمت پائی جاتی ہے۔ ان کے اسلوب میں "محمد علی" اور "ظفر علی خاں" سے

معرفت جے۔ ایم۔ موہنی، ۲۲۰۔ کاویری ہوسٹل
جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۷

زیادہ علمیت ہے۔ اس میں ملائیت یا یبوست کی جگہ ایک گرمی، روانی، جزالت اور مردانگی ہے۔ یہ ایک منفرد اسلوب ہے۔ اس میں جوئے کہستاں کی تندی اور بلند آہنگ موسیقی ہے۔ اس میں عام رائے سے انحراف اور انفرادی مزاج اور ظرافت کی ایک ہلکی سی چاشنی بھی ہے۔

"الہلال" کے مضامین کا اسلوب کنایہ آمیز مخفی، استہزا یا پوشیدہ تمسخر اور اشاروں سے لبریز ہوتا ہے۔ خطابت کی طلسم بندی میں گنجینۂ معانی بھی ہے اور ایک وسیع مطالعہ اور عربی، فارسی، اردو، فرانسیسی اور ترکی زبانوں کے برگزیدہ اسالیب کا عطر بھی۔ اس میں اشعار کے برمحل حوالوں سے ایک لطف وکیف بھی ہے۔ تذکرہ میں موضوع کی رعایت سے قدرتی طور پر عربی، فارسی کے الفاظ اور تراکیب نمایاں ہوگئے ہیں۔ اس میں اسلوب عالمانہ، خطیبانہ، ادیبانہ اور شاعرانہ بھی ہے۔

'ترجمان القرآن' میں اسلوب زیادہ سادہ اور پُرکار ہے۔ یہ حکیمانہ اسلوب ہے۔ خطیبانہ نہیں۔ عالمانہ ہوتے ہوئے روشنی کے ساتھ حرارت بھی رکھتا ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے متوسط حجم کے ہیں۔ عربی فارسی الفاظ کا استعمال ہے۔ مولانا آزاد کسی تحریر کو لکھنے سے پہلے بہت سے الفاظ مستحضر کر لیتے تھے اور انھیں مضموں میں اس طرح سموتے تھے کہ شاعر سنتا تو خود حیران رہ جاتا کہ شعر کس قدر بلند، لطیف اور سلیس ہوگیا ہے۔ ان کی عادت تھی کہ عبارت میں ایجاز پیدا کرنے کے لیے لکھتے تھے اور طولِ ثانی سے پہلے ہی کاٹتے چلے جاتے تھے۔ لفظوں اور خیالوں کو تولتے تھے اور ایک عدیم النظیر صناع کی طرح انھیں موزوں ترین مقامات پر جڑ دیتے تھے۔ اب کس کی مجال ہے کہ ان کو اپنی جگہ سے ہلا سکے یا ہٹا سکے۔

"غبارِ خاطر" کا اسلوب "الہلال" کا سا ہے مگر اس سے خاصا مختلف۔ اس میں معمولی واقعات سے زندگی کے قوانین اخذ کرنے، فطرت کے مظاہر میں زندگی کے ارتقا کے رموز دریافت کرنے، موسم کی تبدیلیوں، پھولوں کے رنگوں، پرندوں کی پرواز کائنات کے حقائق دیکھنے اور دکھانے کا ایسا دفتر ہے، جس کے ہر ورق سے ہمیں معرفت اور بصیرت کے کتنے نکتے ہاتھ آتے ہیں۔
ایک اقتباس ملاحظہ ہو :۔

"اس کارخانۂ ہزار شیوہ رنگ میں
کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں
تاکہ بند ہوں اور کتنے بند کیے جاتے
ہیں تاکہ کھل سکیں" [1]

ایک اور مثال دیکھیے :۔

"فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے
گا مگر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس
ثبوت دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکتا
لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے
دیتا ہے" [2]

آزاد کی نثر میں صنعتوں کا استعمال بکثرت ملتا ہے اور اس انداز کی صنعت گری یعنی عبارت میں متضاد و متقابل لفظوں اور ٹکڑوں کو کھپانا ان کے اسلوب کا خاص جزو ہے مگر یہاں بھی وہی بات ہے کہ کثرت نے ان لفظی صنعتوں کو اکثر مقامات پر دھندلا دیا ہے۔ شروع سے ہی مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہن پر محمد حسین آزاد کا رنگِ انشا پردازی چھا کر رہ گیا تھا جس میں استعاراتی طرزِ ادا کو بنیادی حیثیت حاصل تھی اور یہ آخر تک برقرار رہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں محمد حسین آزاد جیسا استعاراتی طرزِ ادا تو ہے مگر اس کی وہ خوبی برقرار نہیں رہ سکی جس کی وجہ غیر ضروری پھیلاؤ کا جذبہ بے اختیار کارفرما رہتا تھا۔ عربی فارسی کی عمدہ ترکیبیں ان کی عبارت کا حصہ ہوتی ہیں اور ان کے اندازِ تحریر کا خاص جزو یعنی ان کے منفرد طرزِ نگارش کی تشکیل اور فروغ میں ترکیبوں کا حصہ بھی ہے۔ جیسے عہدِ شباب خارستانِ ہستی، صبحِ فریب اور شہرستانِ امید، نگارخانہ، نظر فریب، جنونِ شباب، صنم آباد، الفت و پرستش وغیرہ۔

ترکیبوں کی کثرت نے عبارتوں کو عمومی طور سے بوجھل بنا دیا ہے۔ کتنی ہی عمدہ چیز ہو۔ تناسب اور ضرورت کے دائرے سے جب بھی باہر نکل جائے گی اپنا حسن کھو بیٹھے گی۔ مرکبات بہت عمدہ ہیں مگر ان کی کثرت نے عبارت کے حسن کو ماند کر دیا ہے لیکن خطابت کے انداز کو چمکا دیا ہے۔ ایک اور خوبی جو ان کے اندازِ تحریر کی پہچان سی بن گئی ہے وہ عبارت میں اشعار کی بھرمار ہے۔ کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مفہوم کی شدت اور وسعت کو اور زیادہ نمایاں کرنے کے لیے انھیں لایا گیا ہے اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شعر یا مصرعہ اچانک ذہن میں آگیا اور چوں کہ وہ شعر یا مصرعہ اپنے مفہوم و بیان کے لحاظ سے عمدگی سے معمور ہے اس لیے اس کی نسبت سے عبارت لکھی گئی ہے۔ اشعار کی کثرت نے نثر کے حسن پر برا اثر ڈال کر ان کے اسلوب کو بالواسطہ طور پر بوجھل بنا دیا ہے۔ دورِ اول (یعنی الہلال سے تذکرے تک کے دور) کی نثر میں عربی فارسی کے بھاری بھرکم لفظوں کو بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ اس ترتیب کے ساتھ کہ یہ چیزیں ان کے طرزِ نگارش کی ایک خاص صفت اور نمایاں پہچان بن گئی ہے۔

سب سے اہم خوبی جس نے ان کے اسلوب کو متعین کیا اور طاقت بخشی وہ ایک داخلی کیفیت ہے جسے زورِ بیان اور جوشِ بیان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ خالص وجدانی صفت ہے۔ الفاظ میں اسے شاید اچھی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تاروں میں جو بجلی دوڑتی ہے، رگوں میں جو خون گردش کرتا ہے اور بدن میں جو روح کارفرما رہتی ہے اس کا بیان الفاظ میں کون کر پائے گا؟ ان کی نثر کے طرز کی ایک خوبی طویل کلامی بھی ہے۔

"غبارِ خاطر" میں ان کے نثری اسلوب کا جو انداز ہے وہ متاثر کرنے سے زیادہ مرعوب کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔ اکثر مقامات پر صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا دل کی بات دلنشیں انداز میں لکھنے کے بجائے دوسروں پر رعب ڈالنے اور اوپری سطح پر ہر انداز سے اپنی فضیلت جتانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ خطیبانہ انداز یہاں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور علمی خود نمائی کا طاقتور جذبہ حسب

باقی صفحہ ۲۸ پر

[1] غبارِ خاطر۔ مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ ۔ ۳۷
[2] 〃 〃 〃 ۳۷

ڈاکٹر اینی بیسنٹ ـ سوراج کی معمار

ڈاکٹر اینی بیسنٹ صرف ایک سماجی کارکن اور ماہر تعلیم ہی نہیں تھیں بلکہ انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی انگلینڈ میں اندھے تعصب، کرپشن اور سماجی ناانصافی کے خلاف ایک مجاہدہ کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ لہٰذا یہ بات قدرتی تھی کہ وہ ایک ایسے ملک کی جسے ان کے مطابق دنیا میں ایک خاص مشن پورا کرنا تھا، آزادی کی جدوجہد میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیں۔

ہوم رول

پہلی جنگِ عظیم شروع ہونے کے فوراً بعد انھوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو مکمل برابری کا درجہ دیا جائے اور جنگ ختم ہونے کے بعد برطانوی حکومت کی تشکیل نو میں اسے خود اپنی حکومت چلانے والی ڈومینین بنایا جائے۔ ۱۹۱۵ء میں انھوں نے ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کے لیے عوام کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے ہوم رول لیگ شروع کی۔ انھوں نے برطانوی حکمرانوں کے دشمنانہ رویے اور ان کی مہم کے سلسلے میں اعتدال پسند رہنماؤں کی بے توجہی کے باوجود اپنی مہم جاری رکھی۔ اخبار "نیو انڈیا" ہندوستان کی آزادی کے حق میں ان کے طوفانی پروپیگنڈے کا ذریعہ تھا۔ ڈاکٹر بیسنٹ خود اس اخبار کی ایڈیٹر تھیں۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے لکھا تھا۔ "ہم آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں اور رعایت کا نہیں۔ ہم خود مختاری کی مانگ کرتے ہیں، حکومت کی خیرسگالی کی نہیں۔ آزادی ہر انسان کا حق ہے اور قانونی عمل کے بغیر کسی کو اسے غصب کرنے کا حق نہیں ہے۔

انھوں نے اپنے اخبار میں اسی طرح کے بہت سے مضامین لکھے۔ تحریک کی پیش رفت جاننے اور ڈاکٹر بیسنٹ کے چھپتے ہوئے اداریوں کو پڑھنے کے لیے لوگ ذوق و شوق سے "نیو انڈیا" کا مطالعہ کرتے تھے۔

ہوم رول لیگ نے ملک کے مختلف حصوں میں تیز رفتاری سے ترقی کی۔ قریب قریب تمام بڑے شہروں نیز ضلعوں اور تعلقوں کے بعض علاقوں میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ حکام نے ڈاکٹر اینی بیسنٹ کی روز افزوں مقبولیت دبانے کے لیے جون ۱۹۱۷ء میں انھیں اور ان کے دو قریب ترین رفقا کو اوٹاکمنڈ میں نظر بند کرنے کا فیصلہ کیا۔

بڑھتا ہوا مرتبہ

عوام نے اس اقدام کے خلاف وسیع پیمانے پر احتجاج کیا اور وہ لوگ بھی جو سیاسی مسائل میں دلچسپی نہیں لیتے تھے، بہت بڑی تعداد میں تحریک میں شامل ہوئے۔ اس طرح ڈاکٹر بیسنٹ تحریکِ آزادی کی صف اول میں آگئیں اور انھیں ۱۹۱۷ء کے کلکتہ کے کانگریس اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا۔

قبل ازیں ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ کے کانگریس اجلاس میں انھیں کی کوششوں سے اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان تقریباً دس برس کے شدید اختلاف کے بعد ملاپ ہوا۔ زیادہ تر ڈاکٹر بیسنٹ ہی کے صبر و استقلال اور ماہرانہ ڈپلومیسی کی بدولت مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل پر آمادہ ہوئی۔ ان دونوں تنظیموں نے ایک متحدہ مطالبہ پیش کیا، جو لکھنؤ معاہدے کی شکل میں آیا۔ یہ معاہدہ بھی زیادہ تر انھیں کی کوششوں سے طے پایا۔

اس دوران ہندوستان کی آزادی کے لیے ان کی رہنمایانہ کوششوں کو ایسے حلقوں سے حمایت حاصل ہوئی، جہاں سے اس کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان کی مستحکم رائے عامہ کو دیکھتے ہوئے مانٹیگو۔ چیمسفورڈ تجاویز تیار اور نافذ کیں۔

ڈاکٹر بیسنٹ نے صدر کانگریس کے عہدے پر فائز رہنے کے دوران پارٹی میں تنظیم کا وہی انداز لاگو کیا جو انھوں نے ہوم رول لیگ کے لیے تیار کیا تھا۔ اس کے تحت ملک بھر میں صوبائی، ضلعی اور مقامی شاخیں قائم کی جاتی تھیں۔ کانگریس کی اس نئی راہیں کھولنے والی تنظیم نے تحریک آزادی میں ایک نئی طاقت، ایک نیا زور پیدا کیا۔

آئین مرتب کرنے کی جانب

پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر جب ہوم رول یا ڈومینین اسٹیٹس کو سبھی اطراف میں تسلیم کر لیا گیا تو ڈاکٹر بیسنٹ نے ملک کے

باقی صفحہ ۹ پر

پروفیسر شکیل الرحمٰن

مغل اور جلوۂ صد چمن

ہند۔عجمی روایات

برصغیر کے مختلف باغوں سے آج بھی مغلوں کے ذوقِ چمن بندی کے اعلا معیار کی پہچان ہوتی ہے، حسنِ تعمیر اور باغوں کی تشکیل سے مغل بادشاہوں، معماروں اور اعلا عہدوں پر فائز امیروں کے ذوقِ جمال کے کئی رنگ اور پہلو متاثر کرتے ہیں۔ ان تعمیری کارناموں اور باغوں سے اس پورے عہد کی تمدنی اور تہذیبی قدروں کے اعلا معیار کا پتا چلتا ہے۔ بادشاہوں کی طرح منصب داروں اور وزیروں کی حویلیاں، خانے، امارات اور منازل وغیرہ بھی دلکش باغوں سے آراستہ رہے ہیں۔ اکبری عہد میں ابو الفضل، فرید بخاری، زین خاں کوکا وغیرہ کے دولت کدے 'منازل دلکشا' اور جانے کیسے کیسے نام سے معروف تھے، ان کے منازل کی زینت خوب صورت باغوں سے بڑھی، محققین کہتے ہیں زین خاں کوکا نے اکبر کے استقبال کے لیے اپنے دلکش گھر کے سامنے باغ میں ایک بہت بڑا چبوترہ بنوایا، اس کے سامنے تین تالاب تھے کہ جس میں ایک ہزار رقاصاؤں نے رقص کیا تھا، نغمے سنائے تھے، ایک تالاب میں گلاب کا پانی تھا دوسرے میں انتہائی دلکش زعفرانی رنگ اور تیسرے میں دودھ اور عرقِ گلاب سے باغ کو معطر کر دیا گیا تھا۔ اکبر کے عہد سے اورنگ زیب کے عہد تک خوب صورت اور دلکش باغوں کی تعمیر و تشکیل کا ایک بڑا سلسلہ قائم رہا ہے۔ حویلیوں، خانوں، امارتوں اور منازل کے ساتھ مقبروں کے گرد بھی باغ بنائے اور سجائے گئے، عہد جہانگیری میں عبدالرحیم خان خاناں نے فنِ تعمیر اور باغوں کی تشکیل سے گہری دلچسپی لی، دہلی، آگرہ، لاہور، برہان پور اور احمد آباد میں انھوں نے چمن سازی اور چمن بندی کا ایک نیا معیار قائم کر دیا، ایران سے فنکار معمار اور ماہرینِ تعمیرات بلائے، استاد بردالی معمار اور محمد علی بیگ خراسانی کے نام ملتے ہیں کہ جن کی نگرانی میں برہان پور میں جہانگیر پورہ کے نام سے ایک شہر بنا اور عمارتیں بنیں اور باغ سجے۔ صرف دہلی، آگرہ اور لاہور کی مغل عمارتوں پر نظر ڈالیے اور ان علاقوں کے مقبروں، حماموں اور مسافر خانوں کا جائزہ لیجیے تو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ مغل باغوں کی تشکیل کو کس قدر ضروری جانتے تھے۔ نسیم، شالمار، نشاط، چار چنار، چشمہ شاہی' پری محل، اچھہ بل، ویری ناگ (کشمیر) ہمایوں کا مقبرہ، لال قلعہ (دہلی) اعتماد الدولہ کا مقبرہ، رام باغ' اکبر کا مقبرہ، (آگرہ، سکندرا) خسرو باغ (الٰہ آباد) شالمار اور قلعے کا باغ (لاہور) باغ شاہجہاں (اودے پور) وغیرہ جلوۂ صد چمن کے خوب صورت ترین نمونے رہے ہیں، ہند مغل جمالیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان باغوں کی تکنیک اور تشکیلی عمل کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

مغلوں کے ذوقِ چمن بندی میں ہند عجمی روایات نے بڑی شدت پیدا کی ہے، ہند عجمی روایات نے موضوع اور تکنیک کے تعلق سے گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ عجمی روایات کا بنیادی موضوع رہا ہے "باغِ بہشت!" موضوع کے تعلق سے جو تکنیک استعمال ہوئی وہ علامتی اور استعاراتی رہی، موضوع نے جو علامتی اشارے کیے تکنیک نے انھیں استعاروں اور علامتوں میں سنبھال لیا، مغلوں نے اس موضوع کو عزیز رکھا اور عجم کے تکنیکی تجربوں کو بھی پسند کیا۔ قدیم ہندوستان میں چمن آرائی اور چمن بندی کی خبر ملتی ہے، مندروں کے گرد وہ پھول لگائے جاتے کہ جنھیں دیوتاؤں کو مختلف اوقات میں پیش کیا جاتا تھا (مندروں کے پاس تالاب کے پھولوں اور خصوصاً کنول کی اہمیت زیادہ ہے) مسلمانوں کی آمد کے بعد ہند اسلامی تجربوں کی آمیزشیں ہوئیں، ہندو اور بدھ تجربوں اور مسلمانوں کے تجربوں نے جہاں مختلف فنون کے نئے جمالیاتی معیار بنائے وہاں چمن بندی اور چمن آرائی کے ذوق کو بھی نکھارا۔ مغلوں کے آنے سے قبل تغلق دور میں جو قلعے تعمیر ہوئے' جو مسجدیں بنیں اور جو شہر بنائے گئے باغوں کی تشکیل کی وجہ سے اور پرکشش بنے، مسلمانوں نے پھولوں، پودوں اور درختوں سے اپنی محبت کا ثبوت دیا، سلطان فیروز شاہ (۱۲۵۱ء۔۱۳۸۸ء) کا ذوقِ جمال زیادہ نکھرا ہوا تھا لہٰذا اس نے قلعوں کے اندر بڑے باغ بنوائے، مسجدوں اور مقبروں کے ساتھ پھولوں اور درختوں کی موجودگی کو ضروری جانا، چمن بندی کا جو معیار سامنے رکھا گیا اس کے بنانے میں ہند اسلامی تجربوں ہی نے حصہ لیا، راجپوتوں نے بھی چمن آرائی کا ایک عمدہ معیار قائم کر رکھا تھا۔ ان کی اپنی پرانی روایات تھیں، جے پور اور امبر وغیرہ میں ان کی خبر ملتی ہے۔

8۔ ۲۶۷۔ ساؤتھ سٹی گڑگاؤں۔ ۱۲۲۰۰۱۔ (ہریانہ)

مغلوں کے دور میں اور خصوصاً اکبر کے عہد میں راجپوتوں نے اپنے علاقوں میں گہری دلچسپی لی اور خوب صورت باغ بنائے۔ مغل اپنے ساتھ وسط ایشیائی اور خصوصاً ایرانی روایات لے کر آئے، چمن آرائی اور چمن بندی عجم کے تمدن کے قدیم واضح نشان ہیں، ایرانیوں کے ذوقِ جمال کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے اس فن کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جب مغل آئے تو ان کے ساتھ "باغ بہشت" کا وہ تصور بھی آیا جو وسط ایشیا کے باغوں کی تشکیل کا سب سے پرکشش تصور تھا، تحقیق کی جائے تو باغِ بہشت کے نام سے جانے کتنے باغوں کا پتا چلے جو ایران اور وسط ایشیا کے مختلف علاقوں میں معروف تھے، ہندوستان میں بھی باغِ بہشت کے نام سے کئی باغوں کے نام ملتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۵۹۰ء میں خسرو دوم نے تین سو ایکڑ زمین پر ایک خوبصورت باغ بنایا تھا اور اس کا نام "باغِ بہشت" رکھا تھا۔ ایران میں باغِ بہشت کے تصور کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ زرتشتیوں نے بھی بہشت کے باغ کا ایک تصور پیش کیا تھا، بنو امیہ کے عہد میں باغوں کی تشکیل و آرائش کے تعلق سے کئی تجربے ہوئے۔ ۷۵۰ء تک جانے کتنے باغ بن چکے تھے۔ درختوں، پودوں اور پھولوں کے لیے زمین کی مناسب پیمائش اور کیاریوں کو واضح کرنے کا عمل، چھوٹے بڑے درختوں اور پودوں کی ترتیب، تالاب اور جھرنوں کے لیے مناسب مقامات، غرض ہر بات پر گہری نظر رہی ہے۔ آدم اور حوا کی بہشت کی جو تصویریں بنائی گئیں اور جو خاکے ابھارے گئے ان میں بہتی خوب صورت ندی کو بڑی اہمیت حاصل رہی، یہ ندی آگے بڑھ کر چار حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے یا اس کی چار شاخیں پھوٹتی ہیں۔ یہ وحدت اور وحدت میں کثرت کا تصور ہے، روح اور مادہ کی وحدت کا حسی تصور باغوں کی تشکیل کا ایک بنیادی تصور رہا ہے۔ ندی، تالاب، فوارے یا کسی طرح کا پانی کا بہاؤ دراصل زندگی کی علامت ہیں۔ باغوں میں جنگل، ندی اور پرندوں وغیرہ کے ساتھ انسان کی محنت اور اس کے ذوقِ جمال کی پاکیزگی اور صفائی کے تصورات واضح رہے ہیں۔ مغلوں نے باغوں کو عموماً چار حصوں میں تقسیم کر کے انھیں زیادہ جاذب نظر بنایا ہے، لذیذ پھلوں کے درختوں کی بھی بڑی اہمیت رہی ہے اور چنار جیسے مضبوط، پھیلے ہوئے اور خوب صورت درختوں کو بھی باغوں کے لیے پسند کیا ہے۔ مغلوں کے بنائے ہوئے باغوں کے تعلق سے ذرا دور جائیے تو تیمور کی روایت توجہ چاہے گی۔ تیمور کا ذوقِ جمال بہت نکھرا ہوا تھا۔ چمن آرائی اور چمن بندی سے اس کی دلچسپی کم نہ تھی، جب سمرقند گیا تو شیراز اور بغداد کے جانے کتنے معمار اور فنکار سمرقند آئے کہ جنھوں نے خوبصورت عمارتیں بنائیں نیز سمرقند کو ایک چمن زار بنا دیا۔ ان کی تفصیل ایک سفیر نے بیان کی ہے کہ جو ۱۴۰۳ء سے ۱۴۰۶ء تک دربارِ تیموریہ میں موجود رہا ہے۔

شہنشاہ بابر حسن پسند تھا، فطرت کے جلال و جمال کا عاشق! بابر نامہ میں اس کی حسن پسندی کی مثالیں بکھری ہوئی ہیں، سمرقند میں زیادہ عرصہ نہ رہا اس کے باوجود وہاں کی عمارتوں خصوصاً مسجدوں، مدرسوں اور مقبروں سے بے حد متاثر ہوا۔ باغوں کی تشکیل میں "لینڈ اسکیپ" کی اہمیت پر غالباً پہلی بار نظر گئی، چوں کہ پندرہویں صدی کے سمرقند کی جمالیات اعلا ترین معیار پر تھی اور حسن کے شدید تر احساس کے ساتھ شعور کو متاثر کرتی تھی اس لیے بابر کا جمالیاتی شعور بھی شدت سے متاثر ہوا۔ ۱۵۰۷ء میں ہرات گیا جو خوبصورت باغوں کا شہر تھا۔ "تزک بابری" میں ہرات کے جلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے احساس جمال کو شدت سے نمایاں کیا ہے۔ سمرقند اور ہرات کے باغوں کے حسن سے متاثر ہو کر بابر نے ایک نئی روایت کی تشکیل کی کہ جس کی پہچان مصوری کے بعض نمونوں کے ذریعہ اس کے بنوائے ہوئے باغوں سے ہوتی ہے، ہندوستان میں کئی باغ بنوائے جن کے خاکے اور نقشے اس نے خود تیار کیے۔ آگرہ کے تین باغ، زہرہ باغ، رام باغ اور دہرہ باغ، بابر سے منسوب ہیں۔ باغِ وفا وہ باغ ہے جس کی خوب صورت تشکیل کا منظر ایک تصویر میں ملتا ہے۔ مصوری کا یہ نمونہ (اکبری عہد) موجود ہے، اس کے باغ کے خدوخال کی عمدہ پہچان ہو سکتی ہے، "باغِ وفا" کہاں تھا یہ بتانا مشکل ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ یہ جلال آباد (افغانستان) میں ندی کے کنارے تھا، شہنشاہ بابر نے آگرہ میں جو باغ بنوائے ان میں عمارتیں بھی تھیں، کنویں بھی تھے، حوض بھی بنے ہوئے تھے، گرم پانی کے حمام بھی تھے۔ آگرہ کے قریب اس دور کے کئی باغوں کے نشانات آج بھی موجود ہیں، پھولوں، پودوں اور درختوں کا یہ عاشق غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا، بابر نامہ سے پتا چلتا ہے کہ باغوں کی تشکیل میں بڑی محنت اور مشقت کی ضرورت پڑی۔ یہاں کی زمین کے متعلق بابر نے لکھا ہے کہ یہاں بہتے ہوئے پانی کی کمی ہے لہٰذا میں نے پانی کے بہاؤ کے لیے چکتوں اور رہٹوں کا استعمال کیا اور کھردری، سپاٹ اور نشیب و فراز والی زمین کو نرم اور ہموار کیا، چار باغ کی تکنیک نمٹ سے تکنیک تھی، پانی کے لیے کنویں تیار ہوئے، نہانے کے لیے گرم پانی کا انتظام کیا گیا، کئی چھوٹے چھوٹے حوض بنے اور پھر ایک بڑا حوض تیار ہوا، خلوت خانے کو پھولوں اور درختوں سے سجایا گیا، تمر ہندی (املی) کے درخت لگے، باغوں کی چہار دیواریں تیار ہوئیں، چھوٹے حوض ہشت پہلو (OCTANGONAL) تھے۔ بابر، انار، سنگترے اور چکوترے (CITRONS) کے پیڑوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے ایک بار گنّے بھی لگائے اور کامیابی حاصل ہوئی، بابر کے بنوائے ہوئے "گل افشاں باغ" (آرام باغ) کا ذکر جہانگیر نے بھی تزک میں کیا ہے۔ یہ باغ ہرات اور سمرقند کے باغوں کی تکنیک لیے ہوئے تھا، کنویں سے فواروں کا انتظام کیا گیا تھا، ہندوستانی معماروں اور کاریگروں کے ساتھ وسط ایشیا کے دو فنکاروں نے بھی آرام باغ کی تشکیل میں حصہ لیا تھا۔ ایک تھے میر میرک غیاث اور دوسرے تھے میرک سید غیاث (سید غیاث نے ہمایوں کے مقبرے کا نقشہ تیار کیا تھا) استاد شاہ محمد معروف سنگ تراش تھے جو بابر کے ساتھ قندھار میں رہ چکے تھے، ہندوستان آئے اور ۱۵۲۹ء تک بابر کے ساتھ رہے یعنی شہنشاہ کے انتقال سے ایک سال پہلے تک باغوں کی تشکیل و آرائش میں ان تینوں فنکار معماروں اور سنگ تراشوں نے بھی نمایاں حصہ لیا۔

ہمایوں کے عہد میں بابر کے دور کے بنے

اتنے باغ موجود تھے کہ نئے باغوں کی تشکیل کی ضرورت ہی نہ تھی، ہمایوں، بابر کے ایک ایسے قلعے میں رہا کہ جس کے ساتھ ایک انتہائی خوشنما باغ تھا، کشتیوں پر چھوٹے چھوٹے باغ بنانے کا رواج اسی دور میں شروع ہوا۔ ندی میں تیرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے باغ ہمایوں کو پسند آتے، ہمایوں کی بیوہ حاجی بیگم نے ہمایوں کے مقبرے کے ساتھ جو باغ بنایا وہ مغل چمن بندی اور چمن آرائی کا ایک انتہائی خوب صورت نمونہ بن گیا۔ تاج محل کی تعمیر اور اس کے باغ کی تشکیل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ہمایوں کے مقبرے کی عمدہ روایت ہے۔

اکبر نے عمارت سازی کے ساتھ چمن بندی اور آرائش چمن سے بھی گہری دلچسپی لی، فتحپور سیکری اور آگرہ کے قلعے میں چھوٹے چھوٹے باغ لگوائے، سیکری کے شمال مغرب میں مصنوعی جھیل بنائی گئی۔ پانی کی کمی کی وجہ سے فتحپور سیکری ویران ہو گیا تو یہ سب باغ ختم ہو گئے۔ شاہجہاں نے فتحپور سیکری کی بعض دیواروں کو سنگِ سفید میں تبدیل کیا، قلعے کے اندر پتھر لگوائے، لہٰذا باغوں کا ختم ہو جانا لازمی تھا، اکبر نے آگرہ اور سیکری میں بہت سے درخت لگوائے اور ماحول کو فطری حسن دینے کی کوشش کی، سری نگر (کشمیر) میں ہری پربت کے قلعے کے اندر ایک باغ کا نشان آج بھی موجود ہے۔

جہانگیر، شاہجہاں اور داراشکوہ نے بھی چمن بندی اور چمن آرائی سے گہری دلچسپی لی، ان کے دور میں امراء اور معزز عہدوں پر فائز افراد نے کئی خوبصورت باغ بنوائے۔ سکندرا میں اکبر کے مقبرے کے ساتھ جو چمن تیار ہوا وہ مغل احساسِ جمال کا ایک انتہائی عمدہ نمونہ ہے، کشمیر میں مغل باغوں کا اعلا جمالیاتی معیار ملتا ہے، راجہ مان سنگھ کی بہن، جہانگیر کی پہلی بیوی اور خسرو کی والدہ شاہ بیگم کہ جنھوں نے ۱۶۰۴ء میں زہر کھا لیا تھا، خسرو باغ الہ آباد میں مدفون ہیں۔ خسرو بھی یہاں دفن ہوئے یعنی ۱۶۲۲ء کے بعد یہ خسرو باغ کے نام سے مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے دور کا ایک انتہائی خوبصورت باغ تھا، اسی طرح لاہور میں مریم الزمانی کی مسجد کے ساتھ ایک خوب صورت باغ کا ذکر ملتا ہے۔ نور جہاں نے باغوں کی تشکیل و آرائش سے گہری دلچسپی لی، "گل افشاں باغ" کو ایک نئی صورت دی اور اسے "نور افشاں باغ" کا نام دیا، جہانگیر نے تزک جہانگیری میں ان کا ذکر کیا ہے اور اس کے خالق راج جہاں کی تعریف کی ہے۔ ہری پربت (کوہِ یاراں) سری نگر کے قلعے کے اندر جو باغ تھا جہانگیر کے حکم سے اس کی بھی نئی تشکیل ہوئی، اس دور میں اجمیر شریف، آگرہ، کشمیر اور لاہور میں بھی نئے باغ تیار ہوئے، جہانگیر کشمیر کے فطری حسن سے بے حد متاثر تھا لہٰذا اس نے باغوں سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ "اچھہ بل باغ" کا ذکر تزک میں ملتا ہے جو شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آراء سے منسوب ہے۔ "ویری ناگ" کو ایک دلکش باغ کی صورت دینے میں جہانگیر پیش پیش رہا۔ تزک سے علم ہوتا ہے کہ جہانگیر وہاں دوبار گیا ہے۔ نور جہاں نے جہاں عمارتیں بنوائیں وہاں باغ بھی بنوائے۔ سرائے ہو یا مقبرہ اس کے ساتھ باغ کا ہونا جیسے ضروری سمجھا گیا۔ پٹنہ، آگرہ راستے پر اس نے ایک انتہائی جاذبِ نظر سرائے اور مہمان خانہ بنوایا کہ جس کے ساتھ ایک خوبصورت باغ بھی وجود میں آیا۔ اعتماد الدولہ کا مقبرہ مغل آرٹ کا ایک انتہائی دلفریب جلوہ ہے۔ نور جہاں نے اس کے ساتھ ایک خوب صورت باغ بنوایا۔ شہزادہ شاہ جہاں نے احمد آباد میں جو شاہی باغ بنوایا تھا کہا جاتا ہے کہ جہانگیر نے اسے بے حد پسند کیا تھا، جہاں آرا بیگم کا "صاحب آباد باغ"، اپنے وقت کا ایک انتہائی جاذبِ نظر باغ تھا کہ جس کی تعریف برنیر (BERNIER) نے بھی کی اور پھر تاج محل کا باغ، مغل طرزِ فکر اور احساسِ جمال کا نادر نمونہ بن کر سامنے آیا! شالامار، نشاط، چشمۂ شاہی، ویری ناگ —، اچھہ بل وغیرہ مغل چمن بندی اور چمن آرائی کا اعلاترین معیار ہیں۔ فطرت کے حسن نے ایسے باغوں کی تشکیل کے لیے اکسایا اور یہ بے نظیر چمن وجود میں آئے، فطری ماحول کے پیشِ نظر ان باغوں کی تکنیک مختلف ہے، ہر باغ ایسا منفرد کردار رکھتا ہے، ڈیزائن کا فرق توجہ طلب ہے۔

جہانگیر اور شاہ جہاں دونوں نے شالامار کے ڈیزائن میں دلچسپی لی تھی، ۱۶۲۰ء میں مغل حاکم ظفر خان نے اس کی تشکیل میں نمایاں حصّہ لے کر مکمل کیا۔ جہانگیر نے تزک میں شالامار اور اچھہ بل دونوں کی تعریف کی ہے۔ اکبر نامہ سے علم ہوتا ہے کہ اکبر نے بھی اچھہ بل کو دیکھا تھا اور اس باغ سے متاثر ہوا تھا، دراصل نور جہاں نے اچھہ بل، کو سنوارا اور اسے ایک دلکش نمونہ بنایا، اسے ایک کردار دیا، اس کا نام "بیگم آباد" رکھا گیا۔

کشمیر کے باغ پہاڑوں کے انتہائی خوبصورت پس منظر میں ابھرتے ہیں، آفتاب کی رفتار کے ساتھ پہاڑوں کے رنگ بدلتے رہتے ہیں اور ماحول پر بھی اس کا اثر ہوتا رہتا ہے۔ چبوترے، تخت، جھروکے، محرابیں، چشمے مثمن تالاب، گنبد، طاق، جھرنے، چراغوں کو روشن رکھنے کے مقامات اور مینار اور سرو کے خوب صورت پرکشش درخت، پھولوں کے پودوں کے لیے زمین پر کیاریوں کی تقسیم، سیب، ناشپاتی، انگور، اخروٹ وغیرہ کے پودے اور درخت، گلاب، نرگس، کارنیشن، ہولی ہاک، ساکن وغیرہ کے خوشنما پھول — ان سے مغل باغوں کے کردار کی ایک واضح تصویر ابھرتی ہے۔

شاہ جہاں کی ہدایت پر علی مردان خان نے لاہور میں بھی ایک شالامار باغ بنایا جو ۱۶۴۲ء میں مکمل ہوا۔ برصغیر کے خوبصورت چمن زاروں میں شمار ہوتا ہے۔ لال قلعہ کے اندر چھوٹے چھوٹے کئی باغ تھے جن کا ذکر برنیر نے کیا ہے۔ "حیات بخش" اور "ماہتاب باغ"، دو بڑے دلکش باغ تھے، ماہتاب باغ کا نشان تو نہیں ملتا البتہ حیات باغ کا نشان موجود ہے۔ یہ دونوں منفرد ڈیزائن رکھتے تھے۔ اورنگ زیب نے بی بی کا مقبرہ (رابعہ درانی) تعمیر کیا تو اس کے ساتھ ایک باغ بھی لگوایا۔ اسی طرح لاہور میں شاہی مسجد کے ساتھ ایک خوب صورت باغ بنا، اورنگ زیب کی لڑکی زیب النساء بیگم نے دو باغ بنوائے جو لاہور کے دلکش باغوں میں شمار ہوئے۔ دلی کے روشن آرا باغ (شاہجہاں کی لڑکی روشن آرا)

باقی صفحہ ۳۳ پر

ڈاکٹر سورج سنگھ و پریم پاون اپادھیایہ

دیہی ترقی میں زراعت پر مبنی صنعتوں کی اہمیت

ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں زراعت کو معیشت کی روح تصور کیا جاتا ہے۔ راشٹر پتا مہاتما گاندھی نے زراعت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے "زندگی کا انحصار زراعت پر ہے۔ جہاں زراعت سود مند نہیں ہے وہاں زندگی بھی سود مند نہیں ہو سکتی"۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "زراعت کو سب سے زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ زراعت ناکامیاب رہتی ہے تو حکومت اور قوم دونوں ہی ناکامیاب رہتے ہیں"۔ زراعت، معیشت کے سبھی پہلوؤں کو براہ راست اور بالواسطہ طور پر متاثر کرتی ہے۔ ملک کی سب سے بڑی صنعت ہونے کی وجہ سے زراعت ہی ۷۰ فی صد سے بھی زیادہ آبادی کے روزگار کا وسیلہ ہے۔ ہندوستانی معیشت میں زراعت کی اہمیت کو مندرجہ ذیل نظریے سے دیکھا جا سکتا ہے:-

- قومی آمدنی میں زراعت کی اہمیت تقریباً ۳۹٫۹ فی صد ہے جو انگلینڈ کے ۲ فی صد، کناڈا کے ۴ فی صد اور امریکہ کے ۳ فی صد کے مقابلے کئی گنا زیادہ ہے۔
- ملک میں جاری مختلف صنعتوں کے کچے مال کی فراہمی زراعت سے ہی ہوتی ہے۔
- برآمداتی تجارت میں زراعت اور اس سے متعلقہ اشیاء کا کل حصہ ۷۰ فی ہے۔
- غلے کی فراہمی میں زراعت کی خاص اہمیت ہے۔ ملک میں کل پیداوار کا لگ بھگ ۸۰ فی صد غلہ ہے۔

زرعی مسائل

زراعت کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے منصوبہ بندی کی دوران مدت اسے ہمیشہ ترجیح دی۔ پنج سالہ منصوبے میں زراعت اور اس سے متعلقہ پہلوؤں پر کل خرچ جہاں ۲۹۰ کروڑ روپے تھا وہیں ساتویں منصوبے میں یہ بڑھ کر ۱۹۴۳۰ کروڑ روپے ہو گیا۔ آٹھویں منصوبے کے تحت ۲۲۴۶۲ کروڑ روپے متعین کیا گیا ہے۔ اسی طرح حکومت کے ذریعہ وقتاً فوقتاً زراعت کو مختلف سہولیات فراہم کی جاتی رہیں۔ حالاں کہ ان مشترکہ کوششوں کا نتیجہ مثبت اور مفید ثابت ہوا ہے مگر اس کے باوجود آج بھی زراعت کو متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے علاوہ زرعی آبادی کی مالی حالت بہت بہتر نہیں کہی جا سکتی۔ ہندوستان میں زراعت سے متعلق مسائل کچھ اس طرح ہیں:-

- زرعی پیداوار کی پست سطح جاری۔
- زراعت میں ضرورت سے زیادہ آبادی کا شامل ہونا مگر پیداوار کا کم ہونا اور
- زراعت کے میدان میں بالواسطہ بے روزگاری کی زیادتی۔

زراعت کی بنیاد پر قائم صنعتوں پر ایک نظر

۲۰ویں صدی کی ایک اہم خصوصیت رہی ہے صنعتی انقلاب کی آمد۔ اس زمانے میں معاشی مفکرین اور ماہرین نے اس بات پر زور دیا کہ ملک کی ترقی کو سب سے بلند چوٹی پر پہنچانے کے لیے تیز صنعت کاری پہلی شرط ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں زرعی ترقی کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی پر بھی دھیان دیا گیا۔ "مہالا نوبس" ماڈل سے اسے اور بھی تقویت حاصل ہوئی، مگر ہندوستان مکمل صنعتی ملک نہیں بن سکا۔ آج ہندوستان میں زراعت اور صنعت کاری کی درمیانی حالت ہی ہوئی ہے۔

معاشیات کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ہی دیہی ترقی براہ راست و بالواسطہ طور پر جڑی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں آج بھی ترقی کی رفتار کافی دھیمی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ اس کی رفتار میں تیزی لانے کے واسطے مرکز اور ریاستی حکومتوں نے معاشی کھلے پن کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس کے تحت ملکی اور غیر ملکی تاجروں کو سرمایہ کاری کے لیے مدعو کیا گیا ہے۔ دیہی ترقی میں رکاوٹ کی اہم وجہ ہے بنیادی وسائل کا پورے طور پر فروغ نہ ہو پانا۔ لہٰذا اس کے واسطے بجلی، پانی، سڑک، تار جیسی بنیادی سہولیات کو فروغ دینا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ آج کے صنعتی دور میں دیہی ترقی میں زراعت پر مبنی صنعتوں کی اپنی خاص اہمیت ہے۔ ان صنعتوں میں جہاں کم رقم کی ضرورت پڑتی ہے وہیں انھیں ڈھنگ سے چلایا جا سکتا ہے۔

زراعت پر مبنی اہم صنعتیں

حالاں کہ مختلف صنعتوں کی بنیاد زراعت ہی رہی ہے۔ زیادہ تر صنعتوں کو چلانے کے واسطے کچے مال کی فراہمی زراعت سے ہی ممکن ہے۔ زراعت پر مبنی اہم صنعتیں مندرجہ ذیل ہیں:-

وناسپتی گھی، تیل صنعت:

اس صنعت میں سورج مکھی، مونگ پھلی، ریپ سیڈ وغیرہ کا استعمال کر کے وناسپتی گھی یا ریفائنڈ آئل حاصل کیا جا سکتا ہے۔

چینی، گڑ اور کھانڈساری صنعت:

یہ صنعت اس جگہ قائم کی جا سکتی ہے جہاں گنّے پیداوار کافی مقدار میں موجود ہو۔

فروزن پھل اور سبزی کی صنعت:
یہ صنعت مغربی ملکوں میں نہایت مشہور ہے۔ ڈبہ بند صنعت کا استعمال اب تک غذائی اشیاء کی حفاظت کے لیے ہی ہوتا ہے مگر اب اس کا استعمال سبھی اشیاء کی حفاظت میں بھی ہونے لگا ہے۔ اس صنعت کے ذریعہ پھلوں اور دیگر اشیاء کو بہت کم گرمی پر ڈبوں میں پیک کر دیا جاتا ہے۔ ڈبوں میں ہوا داخل نہ ہونے کی وجہ سے اس میں پیک اشیاء زیادہ دنوں تک محفوظ رہ سکتی ہیں۔

معدنیاتی صنعت

ان صنعتوں میں بیکری، سوجی، میدا، آٹا، دال، اچار وغیرہ صنعتیں شامل ہیں۔

زراعت پر مبنی صنعت اور دیہی ترقی

زراعت پر مبنی صنعت کے ساتھ دیہی ترقی کا براہ راست تعلق ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کی زیادہ تر آبادی گاؤں میں بستی ہے اور مکمل طور پر زراعت پر منحصر ہے خط غریبی سے نیچے رہ کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ دوسری طرف ملک کے اہم مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ اس کی بڑھتی ہوئی بے روزگاری ہے۔ ایسی حالت میں زراعت پر مبنی صنعتوں کو قائم کر کے مختلف مسائل سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ دیہی ترقی میں ان صنعتوں کی اہمیت کو مندرجہ ذیل طریقے سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

● زراعت پر مبنی صنعتیں خاص کر دیہی علاقوں میں، ان کے قیام سے گاؤں کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل ہوگی۔ مثال کے طور پر گاؤں میں سڑکوں کی تعمیر، ذرائع ترسیل میں اصلاح، پینے والے پانی کی فراہمی اور طبی سہولیات میں مدد ملے گی۔

● گاؤں میں روزگار کے مواقع میں اضافہ ہوگا۔ ایسی صنعتوں میں مقامی باشندوں کو روزگار ملنے سے جہاں ایک طرف گاؤں کی ہجرت پر روک لگے گی وہیں دوسری طرف شہروں میں بڑھتی ہوئی آبادی کو بھی کم کرنے میں مدد حاصل ہوگی۔

● دیہی اور شہری معیشت میں موجود ناہمواری میں کمی آئے گی۔

● گاؤں میں صنعت کاری کی وجہ سے سماجی اور معاشی ترقی کے راستے ہموار ہو سکیں گے۔ دیہی عوام کی زندگی کے طور طریقے میں سدھار ہوگا۔ گاؤں کا پچھڑے پن دور ہونے کے ساتھ ہی وہاں موجود برائیوں اور توہم پرستیوں کا خاتمہ ہوگا۔

● دیہی علاقوں میں صنعت کاری کی وجہ سے زرعی ترقی میں بھی مدد ملے گی۔ زراعت کی نئی تکنیکوں اور بہتر بیج کے بارے میں جانکاری حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ پیداوار میں بھی اضافہ ہوگا۔

● کسانوں کے خالی اوقات میں روزگار ملنے کی وجہ سے افرادی طاقت کا استعمال ممکن ہو سکے گا جس سے قومی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔

مندرجہ بالا جائزے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان جیسے زراعت پسند ملک میں آج زراعت کی بنیاد پر قائم صنعت سب سے زیادہ اہم ہے۔ ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کی بڑھتی ہوئی مانگوں کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ چھوٹی چھوٹی صنعتیں قائم کی جائیں۔ اس نظریے سے زراعت کی بنیاد پر قائم صنعتوں کا کوئی دوسرا متبادل نہیں ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ ان صنعتوں کی ابھی کچھ حدیں ہیں، مگر اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ اس طرح کی صنعتیں قائم ہی نہ کی جائیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی خامیوں کا پتا لگا کر انھیں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ ●

بقیہ: ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش

معمول ہر جگہ چھایا نظر آتا ہے۔ ان عناصر نے ان کے خطوط کی تحریروں میں نہ خطوں والی بے تکلفی پیدا ہونے دی ہے اور نہ مکتوبی نثر کو سرسبز و شاداب ہونے دیا ہے۔ ہمارے نقطہ نظر سے موضوع کی مناسبت سے انداز بیان نہیں اختیار کیا گیا ہے۔ اگر موضوع کی مناسبت پیش نظر ہوتی تو ان خطوط کی زبان اس قدر صناعانہ نہ ہوتی۔

"غبار خاطر" میں نثر کے ٹکڑے بڑے حسین معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ ان میں استعاراتی طرز ادا اور تشبیہی اظہار درجہ کمال پر نظر آتا ہے لیکن مصنوعی پن کا احساس بھی اسی تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ "تذکرے" کے مقابلے زبان آسان ہے مگر ان کا خاص انداز لفظی کفایت شعاری اور سادگی کو اپنے قریب آنے نہیں دیتا۔ زور بیان کی شدت تحریر کے مقابلے تقریر کے رنگ کو نمایاں کرتی ہے اور نثر کے حسن کو دھندلا کرتی ہے۔

مولانا آزاد بلاشبہ صاحب طرز نثر نگار تھے۔ ان کا طرز تحریر منفرد، وقیع اور شستہ و شگفتہ ہے۔ اس طرز میں اوپری سطح پر فارسی کی تراشی ہوئی ترکیبوں کی پچی کاری ہوتی ہے۔ اکثر ضرورت اور تناسب دونوں سے زیادہ فارسی اور اردو کے شعر اور مصرعے عبارت میں اس طرح پیوست ہوتے ہیں جیسے مرقع سازی کا حق ادا کیا گیا ہو۔ مگر یہ مرقع سازی کے اکثر تناسب کے دائرے سے باہر نکل جاتی ہے اور عبارت میں بوجھل اور مصنوعی پن پیدا کرتی ہے۔ یہی حال دور اول کی تحریروں میں قرآنی آیات اور عربی و فارسی اشعار کی پیوند کاری کا ہے۔ مترادف لفظوں کی کثرت اور ہم مفہوم جملوں کی بہتات ہے۔ جس نے لفظی کفایت شعاری اور مفہوم و الفاظ کے درمیان سخت گیر مطابقت کے تصور کو کسی جگہ کارفرما نہیں ہونے دیا ہے۔ اندرونی سطح پر ان کی نثر میں ایسا جوش اور زور ہے جسے بے کراں کہنا چاہیے۔ دراصل ان کے اسلوب کی یہی خاص پہچان ہے کہ اوپری سطح کتنی ہی بدل جائے مگر اس کی اندرونی لہر اور کیفیت میں کمی نہیں آنے پاتی۔

زندگی کے مختلف مراحل کے ساتھ ان کا انداز فکر بدلتا رہا ہے اور اسی اعتبار سے ان کی نثر کا رنگ اور ڈھنگ بدلتا رہا۔ یعنی انداز فکر کی تبدیلی کے زیر اثر اور اس کے تقاضوں کے مطابق بیان کا طرز ادا اور اظہار کا پیرایہ سوچ سمجھ کر اختیار کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے انداز بیان کا اختلاف موضوعات کے اختلاف سے حقیقی طور پر بہت کم تعلق رکھتا ہے۔

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مولانا آزاد کے اسلوب کی یہی خصوصیات ہیں جنھوں نے ان کی انشائیہ نگاری کو چار چاند لگائے اور اردو ادب میں ان کی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ ●

دیہی اور شہری غریبوں کے مسائل اور روزگار

ہمارے ملک کی زیادہ تر آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے۔ ان علاقوں میں غریبی کا مسئلہ سب سے پیچیدہ ہے۔ لیکن بڑی تعداد میں لوگوں کی گاؤں سے شہری علاقوں میں منتقلی کی وجہ سے شہری علاقوں میں بھی غریبی کا مسئلہ تشویشناک شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ کام دھندے اور روزگار کی تلاش میں گاؤں کے لوگ شہروں میں تو آجاتے ہیں، مگر یہاں انھیں اور بھی مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی لہٰذا وہ جھگی جھونپڑیوں میں بہت ہی ناگفتہ بہ حالت میں رہنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں ان میں پانی، بجلی، صفائی، صحت جیسی بنیادی سہولتوں کی کمی رہتی ہے۔ شہروں میں جھگی جھونپڑی اور بستیوں کا مسئلہ روز بہ روز پیچیدہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ گاؤں سے روزگار کی تلاش میں شہروں میں آنے والے لوگوں کی تعداد میں اس قدر تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ شہروں کے ترقیاتی پروگرام میں رکاوٹ سی محسوس ہونے لگی ہے۔ ایسے میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دیہی علاقوں میں غریبی اور بے روزگاری دور کرنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھائے جائیں۔

گاؤں کے لوگوں کی روزی روٹی کا اہم ذریعہ کھیتی اور دیہی صنعت ہیں۔ لیکن انھیں روزگار کے مناسب مواقع نہیں مل پاتے۔ ضرورت سے زائد لوگوں کے کھیتی پر منحصر رہنے کی وجہ سے زراعت سود مند پیشہ نہیں رہ گئی اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کھیتی کرنے والوں کی آمدنی کم ہے اور زیادہ تر لوگ غربت میں دن گزارتے ہیں۔ جن ریاستوں نے کھیتی کے میدان میں ترقی کی ہے وہاں نئی تکنیک کے استعمال سے کھیتی میں روزگار کے مواقع کم ہوئے ہیں۔ اس سے گاؤں میں غریبی اور بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ لوگوں کا گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت ایک فطری اور تاریخی عمل ہو سکتا ہے، لیکن اس کی روک تھام ضروری ہے۔

دیہی ترقی کا بنیادی مسئلہ غریبی دور کرنا ہے۔ سرکاری اندازے کے مطابق ۳ فی صد اور غیر سرکاری مفروضات کے مطابق ۳۸ فی صد لوگ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گاؤں میں غریبی کی اہم وجہ زرعی مزدوروں کے پاس اپنی زمین نہ ہونا، زمین کی زرخیزی میں کمی اور ہریالی کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ سماجی ناہمواری، بے روزگاری اور ناکافی روزگار بھی غریبی کی اہم وجہ ہیں۔

وزارت برائے دیہی فلاح و بہبود اور روزگار کے ذریعہ ملک میں غریبی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مختلف پروگرام چلائے جا رہے ہیں۔ ایسے پروگرام یوں تو کافی عرصے سے ہی چلائے جا رہے ہیں مگر غریبی دور کرنے میں ان سے متوقع کامیابی حاصل نہیں ہو پائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غریبی سے چھٹکارا حاصل کرنے اور دیہی ترقی کے منصوبے سازی میں گاؤں کے لوگوں کی حصہ داری نہیں کے برابر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ترقیاتی پروگرام میں علاقائی لوگوں کے علم، تجربے، ذرائع اور صلاحیت کا صحیح استعمال نہیں ہو پا رہا ہے۔ لیکن آئین کی ۷۳ویں ترمیم کے ذریعہ پنچایتی راج تنظیموں کو اختیارات سونپ کر جمہوری لامرکزیت کی طرف جو اقدامات اٹھائے گئے ہیں ان سے نئی امیدیں پیدا ہوئی ہیں۔ ملک میں تین سطحی پنچایتی راج قائم کرنے کے لیے قانون بنایا گیا ہے۔ اس سے پنچایتی راج تنظیموں کو معاشی ترقی اور سماجی انصاف کا کارگر ذریعہ بنایا جا سکے گا۔

نئی معاشی پالیسیوں کے باوجود دیہی ترقیات کے حکومت کے فیصلے میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ گزشتہ برسوں میں دیہی ترقی کے اخراجات میں لگاتار اضافہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۹۲-۹۳ء میں دیہی ترقی کے لیے ۵۔ ارب روپے مقرر کیے گئے تھے۔ ۱۹۹۳-۹۴ء میں یہ رقم بڑھ کر ۶۵۔ ارب روپے ہو گئی۔ حالیہ مالیاتی عرصے میں دیہی ترقی کے لیے ۸۵۔ ارب روپے مقرر کیے گئے ہیں۔ آٹھویں پنج سالہ منصوبے میں دیہی ترقیاتی منصوبوں پر کل ۳۰ کھرب روپے خرچ کرنے کا پروگرام ہے۔

غریبی دور کرنے اور دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے متعدد سرکاری پروگرام چلائے جا رہے ہیں۔ جواہر روزگار یوجنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیہی ترقیاتی منصوبہ، دیہی خواتین اور بچوں کا ترقیاتی پروگرام (ڈواکرا) اور دیہی نوجوان، تربیتی پروگرام (ٹرائی سیم) جیسے مختلف منصوبے۔ ان سبھی منصوبوں کے ذریعہ روزگار کے مواقع بڑھانے کے لیے کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ اندرا آواس یوجنا، دیہی صاف پینے کا پانی پروگرام، واٹر شیڈ ترقیاتی پروگرام

باقی صفحہ ۹ پر

پروین اروڑہ، ایس۔ کے۔ چودھری، اے۔ آر۔ راجیشوری

ہندوستان میں سائنس و تکنالوجی کے ادارے

کسی بھی ملک کا تکنالوجی کے شعبہ میں خودکفالت نیز اس کے فوائد اور دوررس نتائج کی خاطر سائنس و تکنالوجی کے ادارے قائم کرنا نہایت اہم تصور کیا جاتا ہے۔ غلامی کے دور میں حفظان صحت، زراعت، بنیادی ضرورتیں نیز صنعتی تحقیق کے ساتھ ساتھ سائنس کے شعبوں میں یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کی صورت میں کام ہونا شروع ہو گیا تھا۔

آزادی کے بعد دوراندیش پالیسیوں اور سود مند منصوبہ بندی کے تحت پنجسالہ منصوبوں میں سائنس و تکنالوجی کے لیے مختص کی گئی رقم میں متواتر اضافہ کیا گیا کیوں کہ منصوبہ بندی کے ماہرین کی رائے تھی کہ ملک و قوم کی ترقی کا دارومدار سائنس و تکنالوجی کی ترقی میں ہی مضمر ہے۔ لہٰذا ماہرین کی کاوشوں کے نتیجہ میں اٹامک انرجی، سائنس و تکنالوجی الیکٹرانکس، دفاع و خلائی تحقیق کے محکموں کے ساتھ ہی ملک کے دیگر حصوں میں ان زمروں سے متعلق ادارے و تجربہ گاہیں قائم کی گئیں۔ ماسوائے ان اداروں کے صنعتی، تعلیمی اور سائنس و تکنالوجی کے خودمختار اداروں کی کافی تعداد میں بنیاد ڈالی گئی۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ آزادی کے وقت ہماری معاشی ترقی اس قابل نہیں تھی کہ سائنس و تکنالوجی کے شعبوں کی ترقی میں نجی زمرہ کوئی قابل قدر خدمت انجام دے پاتا۔ ایسے دور میں عوامی زمرہ نے ہی مقررہ میعاد کے اندر مناسب تعداد میں تربیت یافتہ افراد اور بنیادی ڈھانچہ تیار کرنے میں اہم ذمہ داری نبھائی۔ اس سمت میں نجی زمرہ نے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخری سالوں میں سرمایہ کاری کرنا شروع کی۔ جب کہ سرکار نے صنعتوں میں داخلی سطح پر تحقیق و ترقی سے متعلق اکائیوں کے نظام کی حوصلہ افزائی کی غرض سے ٹیکسوں میں چھوٹ اور دیگر مراعات و برآمدات کرنے والوں کو سہولت فراہم کرنے سے متعلق پالیسی رائج کی۔

سائنس و تکنالوجی کے میدان میں نئے نئے شعبوں میں اضافہ اور بائیو تکنالوجی، سپرکنڈکٹیوٹی، سپر کمپیوٹرس، ابلاغ تکنالوجی، آپٹیک فائبر جیسے شعبوں کے تحقیق کے اہم و جدید ترین شعبوں میں شامل ہو جانے کے سبب سائنس و تکنالوجی کے میدان میں نئی نئی ایجادات کا مناسب اور وسیع تر اضافہ ہوا۔ اس وقت ہمارے ملک میں عوامی و نجی کمپنیوں کے باہمی اشتراک کے باعث تقریباً ۱۳۰۰ اداروں میں بنیادی اہمیت کا نیز عملی تحقیق و ترقی کے سمت میں کام ہو رہا ہے۔

کسی بھی ادارے کا انتظامی امور اور مالی مسائل کی بنیاد پر قانونی درجہ تعین ہونا ایک بہت اہمیت کی بات ہے کیونکہ کسی بھی ادارے میں سائنس و تکنالوجی کے شعبوں میں کی جانے والی سرگرمیوں کی جانب، مدارج کے تعین میں اس ادارے کے قانونی درجہ و تحقیق کے دائرۂ عمل کو ایک کلیدی مقام حاصل ہوتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر سائنس دانوں، محققین، ماہرین تکنالوجی، سرمایہ داروں اور پالیسی وضع کرنے والے ماہرین نے محسوس کیا کہ ایک ایسی معلوماتی ڈائرکٹری مرتب کی جانی چاہیے جس میں ملک کے مختلف حصوں میں قائم شدہ سائنس و تکنالوجی کے اداروں کے قانونی درجے اور تحقیقی شعبوں سے متعلق معلومات شامل ہوں۔ لہٰذا اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے محکمۂ سائنس و تکنالوجی نے اس سلسلے میں سرگرم تحقیقی اداروں کے سروے کا کام شروع کیا۔ اس سروے سے حاصل شدہ نتائج کی بنیاد پر سائنس و تکنالوجی کے شعبوں میں درپیش دشواریوں و اہم مسائل کے تدارک کی غرض سے اس میدان کے ماہرین اور اداروں سے رابطہ قائم کرنا نہایت آسان ہو گیا۔ اس مقالہ میں پیش کردہ گوشوارہ مذکورہ ڈائرکٹری میں درج اعداد و شمار ہی پر مبنی ہیں۔

اس مقالہ میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۹۲ء تک کے عرصہ میں قائم ہوئے ۱۲۲۸ اداروں کا قانونی درجہ نیز دیگر پہلوؤں مثلاً تحقیق کا مخصوص موضوع۔ اداروں کے قائم ہونے کا سال، عملہ کی تعداد (سائنٹیفک، انتظامی و دیگر امور) وغیرہ سے متعلق کیے گئے سروے کو شامل کیا گیا ہے۔

سائنس و تکنالوجی کے اداروں کو ان کے قانونی معیار کے مطابق ذیل میں منقسم کیا گیا ہے۔

مرکزی سرکار، صوبائی سرکار، خودمختار ادارے، رجسٹرڈ ادارے، صنعتی و تعلیمی ادارے و بین اقوامی ادارے۔

مذکورہ بالا زمروں کا مختصر ذکر حسب ذیل ہے۔

مرکزی سرکار کے تحت وزارت دفاع، زراعت، ماحولیات و جنگل، صحت و خاندانی

بہبود وغیرہ کے محکمہ اوران سے متعلق تحقیقی ادارے آتے ہیں۔ جو براہ راست مالی وانتظامی امور میں مرکزی سرکار کے زیر نگرانی کام انجام دیتے ہیں۔ صوبائی سرکار کے دائرہ اختیار میں ایسے ادارے شامل ہیں جو براہ راست صوبائی سرکاروں کے مختلف محکموں کے زیر اثر ہوں۔ سائنسی وصنعتی تحقیق کی کونسل (CSIR) نیشنل زراعتی تحقیق کی کونسل (ICAR) نیشنل طبی تحقیق کی کونسل (ICMR) جیسے ادارے وان سے ملحقہ تحقیقی ادارے / لیبارٹریز وغیرہ خودمختار اداروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ سہولتوں اور بنیادی ڈھانچہ کے اعتبار سے یہ ادارے بہت وسیع ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر ادارے مکمل طور پر مرکزی سرکار کی امداد سے چلائے جاتے ہیں۔ منافع نہ کمانے والی تنظیمیں / ادارے جو سرکار یا صنعت یا پھر دونوں کی امداد سے سائنس وتکنالوجی کی تحقیقاتی سرگرمیوں میں تعاون کرتے ہوں وہ رجسٹرڈ ادارے کی فہرست میں آتے ہیں۔ یہ خصوصی طور سے مصنوعی ریشے کے ذریعہ بنائے گئے کپڑے، سیمنٹ، ربڑ، رنگ وروغن۔ چائے بجلی وموٹر گاڑیوں جیسی صنعتوں میں کام کرتے ہیں۔ صنعتی شعبوں میں عوامی ونجی زمروں کی جماعتوں میں اندرونی سطح پر قائم کردہ تحقیق وترقی یافتہ اکائیوں کو شمار کیا جاتا ہے۔ تعلیمی زمرہ کے تحت یونیورسٹیاں، منظور شدہ یونیورسٹیاں وقومی اعتبار سے اہمیت یافتہ ادارے آتے ہیں۔ بین اقوامی سطح پر ہندوستان میں صرف ایک ہی بین اقوامی ادارہ ہے جس کا نام ہے "انٹرنیشنل کراپس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ فار سیمی ایرڈ ٹراپکس" چھ ادارے ایسے بھی ہیں جن کا قانونی درجہ دوہرا ہے لیکن اس مقالہ میں اصناف بندی کے نقطہ نگاہ سے ان کا ایک ہی درجہ تعین کیا گیا ہے۔

اداروں کے ذریعہ مخصوص شعبوں میں کی جانے والی سرگرمیوں سے متعلق ارسال کردہ معلومات کی بنیاد پر ان اداروں کو مندرجہ ذیل زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ علم طبعی۔ ۲۔ علم زراعت۔ ۳۔ علم طب ۴۔ شعبہ انجینئرنگ وتکنالوجی۔

آزادی کے بعد سائنس وتکنالوجی کے اداروں میں مثالی طور پر اضافہ ہوا ہے۔ ان اداروں کے قائم ہونے کے سال سے متعلق اطلاعات کی بنیاد پر کافی اہم ودلچسپ معلومات منظر عام پر آئیں۔ ذیل کے گوشوارہ میں آزادی کے بعد کے ہر ۵ سال کے دوران قائم شدہ اداروں کی تعداد جہاں بتائی گئی ہے وہیں آزادی سے قبل کے اداروں کی تعداد کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔

کے درمیان قائم ہوئے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان سب سے زیادہ سائنس وتکنالوجی کے اداروں کی بنیاد پڑی۔ ان اداروں میں پہلا مقام صنعت کاری کو حاصل ہے۔ قائم ہونے والے اداروں کی کل تعداد کے ۴۸ فیصد ادارے صنعت کے تحت ہی قائم ہوئے لیکن یہ ادارے زیادہ تر چھوٹے درمیانی درجے کے ہیں۔ جب کہ مرکزی سرکار اور خودمختار تنظیموں کے قائم کردہ ادارے سائنس وبنیادی ڈھانچہ کے معیار کے مطابق بہت وسیع ہیں۔ یہ بھی قابل ذکر

سائنس وتکنالوجی کے اداروں کے قائم ہونے کا سال / قانونی درجہ پر منحصر گوشوارہ

قانونی درجہ

بنیاد کا سال	مرکزی سرکار	صوبائی سرکار	خودمختار ادارے	رجسٹرڈ ادارے	صنعت	تعلیمی ادارے	بین اقوامی	کل
۱۷۵۰-۱۹۴۵ء	۲۳	۱۸	۲۷	۴	۵۷	۲۴	-	۱۵۳
۱۹۴۶-۱۹۵۰ء	۸	۶	۱۸	۲	۲۷	۱۰	-	۷۱
۱۹۵۱-۱۹۵۵ء	۱۴	۵	۱۵	۲	۳۲	۳	-	۷۱
۱۹۵۶-۱۹۶۰ء	۲۵	۱۳	۲۰	۳	۴۷	۱۴	-	۱۲۲
۱۹۶۱-۱۹۶۵ء	۲۴	۱۴	۲۸	۱	۸۲	۱۶	-	۱۶۵
۱۹۶۶-۱۹۷۰ء	۱۵	۱۱	۱۵	۲	۷۱	۱۹	-	۱۳۳
۱۹۷۱-۱۹۷۵ء	۲۱	۸	۲۱	۲	۱۰۳	۱۷	۱	۱۷۳
۱۹۷۶-۱۹۸۰ء	۷	۸	۲۷	۲	۶۸	۸	-	۱۲
۱۹۸۱-۱۹۸۵ء	۴	۲	۳۵	۱	۶۶	۱۶	-	۱۲۴
۱۹۸۶-۱۹۹۰ء	۹	۴	۲۶	۳	۲۶	۱۵	-	۸۳
۱۹۹۱-۱۹۹۲ء	۱	۱	-	-	۰	۰	-	۲
دیگر	-	-	-	-	۶	۴	-	۱۱
میزان	۱۵۱	۹۰	۲۳۳	۲۲	۵۸۵	۱۴۶	۱	۱۲۲۸

ماخوذ: محکمہ سائنس وتکنالوجی کے ذریعہ بھارت میں سائنس وتکنالوجی کے اداروں کا قانونی درجہ اور خصوصی شعبوں کا جائزہ ۱۹۹۰ء کے عنوان سے منصوبہ بند رپورٹ کی بنیاد پر جمع کردہ اطلاعات۔

نوٹ: قائم شدہ سال سے مراد ادارے کی بنیاد کا سال ہے جو ہر پانچ پانچ سال کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔

سال ۱۹۴۶ء سے ۱۹۹۰ء تک ہر سال اوسطاً ۵ نئے ادارے قائم ہوئے جن میں سے زیادہ ادارے تیسرے وچوتھے پنج سالہ منصوبہ

بات ہے کہ سال ۱۷۵۰ء اور ۱۹۱۰ء کے بیچ سائنس وتکنالوجی کے ۱۵۳ ادارے منظر عام پر آچکے تھے۔

۱۹۵۰ء کے بعد ملک کے تمام صوبوں/ علاقوں میں اس طرح کے ادارے قائم ہوئے لیکن آٹھ صوبوں میں ان کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ان صوبوں میں پہلا مقام مہاراشٹر کا آتا ہے کیوں کہ یہاں (۲۱ فی صد) ادارے قائم ہوئے۔ بعد ازاں تامل ناڈو (۱۰ فی صد)، اتر پردیش (۹ فی صد)، مغربی بنگال۔ دہلی۔ کرناٹک (۸ فی صد) آندھرا پردیش و گجرات (۶ فی صد) کا نمبر آتا ہے۔ ابھی تک کچھ صوبے ایسے بھی ہیں جو مذکورہ اداروں کی تعداد میں دوسرے صوبوں کے مقابلہ پچھڑے ہوئے ہیں۔

صنعت و خود مختار اداروں کے قانونی درجہ کے ذیل میں آنے والے زیادہ تر ادارے مہاراشٹر، تامل ناڈو، اتر پردیش، دلی، مغربی بنگال، کرناٹک اور گجرات میں کھولے گئے۔ رجسٹرڈ اداروں کے طور پر زیادہ تر ادارے آندھرا پردیش میں اور مرکزی سرکار کے قانون کے درجہ والے زیادہ تر ادارے دلی میں پائے جاتے ہیں۔

سائنس و تکنالوجی کے نئے نئے شعبوں میں مہارت، ترقی یافتہ اداروں کا قائم ہونا کسی خاص شعبہ/ مضمون کو ملنے والی افضلیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اداروں کی تقسیم ان کے مخصوص تحقیقی شعبہ پر مبنی ہے۔ سب سے زیادہ (۳۲ فی صد) ادارے انجینئرنگ و تکنالوجی کے شعبہ سے متعلق ہیں جن میں سے (۲۰ فی صد) صنعت اور بقایا دیگر شعبوں کے تحت آتے ہیں۔ اس کے بعد علم طبیعات میں (۳ فی صد)، علم زراعت (۱۷ فی صد) اور علم طب (۱۲ فی صد) کا نمبر آتا ہے۔ علم طبیعات کے کل ۳۶۴۔ اداروں میں سے ۱۵۰ میں علم کیمیائی شعبوں میں تحقیق پر کام کیا جا رہا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ریاضی اور شعبہ ابلاغ سے متعلق تحقیق کے اداروں کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے۔ باریک بینی سے تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ صنعت میں اندرونی سطح پر تحقیق و ترقی سے متعلق منظم کی گئیں تحقیق و ترقی کی اکائیوں کے طور پر کام کرنے والے ادارے خصوصی طور پر انجینئرنگ اور علم کیمیا کے شعبوں میں سرگرم ہیں۔ مرکزی سرکار، صوبائی سرکار و خود مختار اداروں کے تحت کام کرنے والے ادارے باوجود دیگر دو ایک شعبوں میں خاص توجہ مرکوز کرتے ہیں لیکن پھر بھی وہ سب ہی شعبہ جات پر تحقیق و ترقی کا کام انجام دیتے ہیں۔ تعلیمی درسگاہیں جن میں خصوصی طور پر روایتی یونیورسٹیاں شامل ہیں، ان میں عام سائنس پر ہی کام کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ ان یونیورسٹیوں کے سائنس و تکنالوجی کی فیکلٹیوں میں سب ہی شعبہ جات میں درس و تدریس کے ساتھ تحقیق پر بھی کام کیا جاتا ہے۔

شعبۂ انجینئرنگ و تکنالوجی نیز علم کیمیا میں خدمت انجام دینے والے اداروں میں سب سے زیادہ تعداد صوبہ مہاراشٹر میں ہے۔ ان کے علاوہ جن دو صوبوں میں انجینئرنگ و تکنالوجی کے اداروں کی تعداد خاصی ہے وہ ہیں تامل ناڈو اور کرناٹک۔

سائنس و تکنالوجی کے میدان میں کام کر رہے ٹرینڈ افراد کے عملے کی خدمات قابل قدر ہیں۔ ان اداروں میں کام کرنے والے ۵،۷۵،۸۶ افراد پر مشتمل عملے میں سے تقریباً ۲،۵۷،۹۳۸ افراد (۴۴٫۸ فی صد) صنعت میں ۱،۱۴،۲۶۹ (۱۹٫۸ فی صد) خود مختار اداروں میں ۱،۰۸،۰۴۷ (۱۸٫۸ فی صد) مرکزی سرکار میں اور بقایا عملہ دوسری طرح کے اداروں میں مصروف ہے۔ سب سے زیادہ عملہ انجینئرنگ و تکنالوجی کے شعبہ میں کام کر رہا ہے اس کے بعد زراعت، طب و علم کیمیا کا مقام ہے۔ صوبوں کے اعتبار سے سب سے زیادہ تعداد یعنی ۱۱۰۰۰ افراد صوبہ مہاراشٹر میں ہے۔ پھر مغربی بنگال، کرناٹک یو پی، دہلی و تامل ناڈو کا نمبر آتا ہے۔ جہاں عملہ کی تعداد تقریباً ۵۵۰۰ سے ۷۴۰۰ کے بیچ ہے۔

ان اداروں میں سائنٹیفک، انتظامی امور اور دیگر زمروں کے عملے کے تناسب میں کوئی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ ویسے خود مختار شعبوں میں علم طب کے میدان میں انتظامیہ عملہ کی تعداد کافی زیادہ پائی گئی۔ صنعتی میدان میں تحقیق کے تمام شعبوں کی جملہ تعداد کے مقابلہ دیگر کاموں میں تعینات عملہ کی تعداد کافی زیادہ ہے۔

آزادی کے بعد ملک میں سائنس و تکنالوجی سے متعلق سرگرمیوں کو بروئے کار لانے کے لیے وسیع پیمانے پر پرائیویٹ ڈھانچہ کو تقویت دی گئی۔ قانونی و انتظامی ڈھانچہ کے اعتبار سے یہ الگ الگ قسم کے ادارے مختلف شعبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور الگ الگ ٹائپ کے ہیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ ادارے سہولیات و مالی مسائل کی فراہمی کے معاملے میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں کافی فرق رکھتے ہیں۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ زیادہ تر ادارے کچھ ہی صوبوں بالخصوص ترقی یافتہ صوبوں تک ہی محدود رہیں۔ ۱۲۲۸ اداروں میں کام کر رہے کل ۵،۷۶،۰۰۰ افراد پر مشتمل عملہ میں سے ۴۱ فی صد سائنٹیفک سرگرمیوں میں ۴۹ فی صد دیگر امدادی سروسز میں اور باقی ماندہ ۱۰ فی صد انتظامی امور کی سرگرمیوں میں عمل پیرا ہیں۔ ●

بقیہ: صحت اور کیلا

معدنیات/ ۹ ر

کیلشیم ۔ فی سو گرام میں ۸۰ ملی گرام
فاسفورس ۔ فی سو گرام میں ۲۹ ملی گرام
لوہا (آئرن) ۔ فی سو گرام میں ۶ ملی گرام
توانائی ۔ فی سو گرام میں ۱۰۰ کیلوری

مذکورہ بالا تغذیہ بخش اجزاء سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیلا ایک صحت مند توانائی بخش غذا ہے۔ پکا ہوا کیلا کیوں کہ نرم و ملائم ہوتا ہے اس لیے اس کے کھانے میں بچے و بوڑھوں کو کسی قسم کی پریشانی لاحق نہیں ہوتی اتنا ہی نہیں میٹھا ہونے کے سبب نونہال اس میں کچھ زیادہ ہی لذت محسوس کرتے ہیں۔ دودھ اور کیلے کا استعمال تندرستی کے لیے ایک انمول غذا ہے۔ بسا اوقات اگر کیلا مقدار سے زیادہ کھا لیا جائے تو اس کو ہضم کرنے میں چھوٹی الائچی اکسیر کا کام کرتی ہے۔

مذکورہ بیان کردہ خصوصیات کی روشنی سے معلوم ہوتا ہے کہ کیلا انسان کو تندرستی، توانائی و طاقت بخشتا ہے نیز بیماریوں میں دوائی کے طور پر استعمال ہونے والا ایک مثالی پھل ہے۔ یہ پسندیدہ پھل ہر خاص و عام کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ ●

ڈاکٹر مظفر حسین غزالی

مدارس کے لیے سرکار کی یوجنا

ہندوستان میں دینی مدارس کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ان کے ہندوستانی تہذیب اور ثقافت پر گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ مدارس ہماری تہذیب وثقافت کے نشان ہیں۔ انھوں نے جنگ آزادی میں اہم رول ادا کیا ہے اور لگ بھگ تین صدیوں تک یہ ہماری تعلیمی اور علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کا واحد ذریعہ رہے ہیں۔

آج زمانہ تبدیل ہو چکا ہے۔ قدریں بدل چکی ہیں اور تعلیمی ضرورتیں اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ وہ اب ان روایتی تعلیمی اداروں سے پوری نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ان تہذیبی اور ثقافتی اداروں کو کسی بھی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ترقی یافتہ دور میں بھی یہ ادارے دیہاتوں میں تعلیم کو عام کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ ہمارا ملک ایک غریب ملک ہے یہ ادارے ان غریب لوگوں کے بچوں میں تعلیم کا نور پیدا کر رہے ہیں جو جدید اسکولوں میں اپنے نونہالوں کو نہیں پڑھا سکتے۔ اکثر مدارس میں کھانے اور رہنے کے علاوہ لباس بھی مفت فراہم کیا جاتا ہے۔ گو کہ لباس کا چلن اب کم ہو گیا ہے اور ایسے مدارس بھی قائم ہو چکے ہیں جو طلبہ سے فیس وصول کرتے ہیں اور طلبا کو کھانا بھی اپنے خرچ سے کھانا پڑتا ہے۔ لیکن اس طرح کے مدارس کی تعداد بہت کم ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان اداروں کو جو ہماری تہذیب وثقافت کے آئینہ دار ہیں اور جن کا جنگ آزادی میں اہم رول رہا ہے انھیں یوں ہی روایتی انداز میں تعلیم کا کام کرنے دیا جائے یا آج کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کیا جائے اور کیا ان میں زیر تعلیم طلبا کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ مدرسہ سے فراغت کے بعد جدید تعلیمی اداروں میں داخلہ لے سکیں یا روایتی تعلیم کے بعد انھیں زمانہ کے حوالے کر دیا جائے اور اس ترقی یافتہ دور میں وہ پچھڑ کر رہ جائیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر کشادہ ذہن شخص اس بات کی حمایت کرے گا کہ ان اداروں کو آج کی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے تاکہ یہ مدارس پھر اپنی تاریخ کو دوہرا سکیں اور ان کی افادیت کسی طرح کم نہ ہو لیکن یہ ہم آہنگی اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان کے نصاب تعلیم میں ان مضامین کو (سائنس، سماجی علوم، ریاضی، انگریزی وغیرہ) یا ان کی مبادیات کو شامل نہ کیا جائے جن کی مدد سے موجودہ زمانہ کی ترقیوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں دینی مدارس کی جدید کاری کے سلسلے میں حکومت ہند کی اسکیم کو متعارف کرانے سے قبل یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ انفرادی سطح پر جو کوششیں اس سلسلے میں ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں۔ ان کا مختصر ذکر کیا جائے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس اسکیم سے اہل مدارس کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ان کی توقعات کیا ہیں، وہ چاہتے کیا ہیں۔ ان کے لیے جو کام ہوئے ہیں کیا وہ ان کی خواہش کے عین مطابق ہوئے ہیں یا کچھ مختلف۔ پہلا کام کلکتہ کی ایک فرم نے کیا تھا۔ انھوں نے ان مدارس کی ایک فہرست مرتب کر دی تھی، جن مدارس نے ان سے تعاون کے سلسلے میں رابطہ قائم کیا تھا۔ اسی طرح کا کام جے پور راجستھان سے ہوا۔ اسی زمانہ میں حکیم عبدالحمید صاحب نے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے تحت سروے کرایا۔ اس سروے کی رپورٹ شائع نہیں ہو سکی۔ البتہ انھوں نے ایک فہرست مدارس مرتب کروا کر شائع کرا دی۔ یہ فہرست کسی حد تک تحقیق پر مبنی تھی۔ حکومت ہند نے دہلی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے تحت مدارس کا ایک سروے کرایا۔ اس سروے کے کیا نتائج حکومت نے نکالے اور ان کی بہبود کے لیے کیا پروگرام تجویز ہوئے اس کا علم کسی کو نہیں ہو سکا۔ ۹۱-۱۹۸۹ء میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نے دینی مدارس کا سروے کرایا۔ اس سروے کی رپورٹ بھی شائع نہ ہو سکی اور نہ کوئی عملی کام ہی شروع ہوا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ طبیعات کے تحت سینٹر برائے فروغ سائنس نے دینی مدارس کے طلبہ کو سائنس پڑھانے کے لیے کتابیں تیار کرائیں اور اسی کے ساتھ دینی مدارس کے اساتذہ کی سائنس پڑھانے کے لیے تربیت کا انتظام کیا۔ اس طرح کچھ عملی کام کی ابتدا ہوئی یا پھر ہاؤ مڈلیش فار ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ کے تحت دینی مدارس کی ا... جماعتوں ،م... سائنس، سماجی علوم، تاریخ وغیرہ کی مبادیات پر کتابیں تیار کرانے کا منصوبہ

۱۲۔ جے ٹیلا ہاؤس خلیل اللہ مسجد نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

بنایا گیا تھا۔ اس منصوبے کے تحت کچھ کتابیں تیار بھی ہوئیں لیکن یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ جب کہ اہل مدارس سماجی علوم اور سائنس کی مبادیات پڑھانے میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔

۱۹۸۶ء میں حکومت نے نئی تعلیمی پالیسی تیار کی۔ اس میں عملی پروگرام کے ذیل میں روایتی تدریس کے مدارس میں رضاکارانہ طور پر سائنس ریاضی اور انگریزی کی تعلیم جاری کرنے کی بات کہی گئی۔ ۱۹۹۰ء میں حکومت ہند نے اقلیتی تعلیم کے بارے میں ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کا کام تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں کی ترقی کی تجاویز پیش کرنا تھا۔ اس کمیٹی نے اس بات کی پر زور سفارش کی ہے کہ "مدارس جیسے روایتی اداروں کی ہمت افزائی کی جانی چاہیے اور ان کے نصاب تعلیم میں سائنس، انگریزی اور ریاضی کو شامل کیا جانا چاہیے" اس کمیٹی کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک خود مختار کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس نے انہی سفارشات کو منظوری دے دی۔ ۱۹۹۱ء میں مدارس کی تعلیم سے متعلق فاضل نمائندوں اور ریاستی تعلیم کے بااختیار افراد کی میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ نے مدارس کی جدید کاری کے لیے رضاکارانہ اسکیم بنائے جانے کا فیصلہ کیا۔

محکمۂ تعلیم نے مدارس کی جدید کاری کے لیے جو اسکیم مرتب کی اس کا مقصد مالی امداد کے ذریعہ روایتی اداروں کی حوصلہ افزائی کیا جانا بتایا گیا تاکہ مدارس اپنے نصاب تعلیم میں سائنس، ریاضی، سماجی علوم، ہندی اور انگریزی کو شامل کرلیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اس طرح مدارس سے فارغ ہونے والے طلبا کے لیے جدید تعلیم کے راستے ہموار ہوسکیں گے۔ پہلے مرحلے میں مڈل اور ثانوی اسکولوں کی ابتدائی کلاسوں کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے مرحلے میں نویں پنجسالہ منصوبہ کی مدت میں ثانوی تعلیم کے معیار کی تعلیم دینے والے اداروں کو شامل کیا جائے گا۔

مدارس کی جدید کاری کی اس اسکیم کے تحت سائنس، ریاضی، سماجی علوم اور زبانیں پڑھانے والے باصلاحیت اساتذہ کی تقرری کے لیے سو فی صد مالی امداد مرکزی حکومت دے گی۔ اس قسم کے اساتذہ کی تنخواہ متعلقہ ریاستی حکومت کے ذریعہ تقرر شدہ اساتذہ کی تنخواہ کے برابر ہوگی۔ اگر جز وقتی اساتذہ کے ذریعہ کام چلانا ضروری ہوا تو ان کی تنخواہ اتنی ہی ہوگی جتنی کہ عربی، فارسی اور دوسری کلاسیکی زبانوں کی تعلیم دینے والے اساتذہ کو ملتی ہے (سرکار کی اسکیم میں ۷۵ فی صد سرکار دیتی ہے اور ۲۵ فی صد رضاکار تنظیم لیکن اس اسکیم میں رضاکارانہ تنظیموں کی ہمت افزائی کے لیے سو فی صد امداد دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔) اس اسکیم کے تحت مدارس کو ان مضامین کی کتابوں کے بینک اور لائبریریوں میں کتاب کی تعداد بڑھانے کے لیے امداد دی جائے گی۔ ریاضی اور سائنس پڑھانے کے لیے ضروری سامان اور آلات کی فراہمی بھی حکومت کرائے گی۔ ایڈ کمیٹی کی سفارش پر دوسری مدوں کے لیے بھی امداد دی جائے گی۔

اس اسکیم سے استفادے کے لیے ایک فارم بھرنا ہوگا۔ یہ فارم شعبہ تعلیم حکومت ہند، وزارت انسانی فلاح و ترقی۔ سی۔ ونگ [illegible] بھون نئی دہلی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت رجسٹرڈ سوسائٹی یا ٹرسٹ کی درخواست کے علاوہ ان اداروں کی درخواستوں کو بھی زیر غور لایا جائے گا جو تین سال سے برابر کام کر رہے ہوں۔ ادارے یا سوسائٹی کا مناسب دستور اور ضابطے ہونے چاہئیں۔ وہ کسی سیاسی پارٹی کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کام نہ کرتے ہوں اور کسی شکل میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو مجروح نہ کرتے ہوں۔ مالی امداد کرنے والے مدارس یا سوسائٹی کو اپنی سالانہ رپورٹ سرکار کو پیش کرنی ہوگی۔ اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے لیے فارم کو ریاستی حکومت کے سکریٹری تعلیم کو بھیجنا ہوگا۔ کیوں کہ سکریٹری ہی اس اسکیم کے تحت گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کا چیئرمین ہوتا ہے۔

جدید رپورٹ کے مطابق اس اسکیم سے دہلی کے لگ بھگ ۱۰ سے زیادہ مدارس مستفیض ہو رہے ہیں۔ البتہ اہل مدارس کا یہ احساس ہے کہ ان کے اساتذہ سے زیادہ تنخواہ اسکیم کے تحت آنے والے اساتذہ کو ملتی ہے۔ اس کی وجہ سے مدارس کے اساتذہ کو نابرابری کا احساس ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نابرابری کے احساس کو کم کرنے کے لیے حکومت کو کچھ کرنا چاہیے۔ کئی مدارس ابھی بھی اسکیم کی طرف سے شک و شبہ میں مبتلا ہیں۔ اس شک و شبہ کو بھی دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کام میں ان اداروں، تنظیموں اور افراد سے کام لیا جانا چاہیے جو اس میدان میں کام کر رہے ہیں یا کرتے رہے ہیں۔

یہ اسکیم اپنی جگہ مفید اور قابل عمل ہے لیکن اہل مدارس شاید سالانہ رپورٹ اور آمد و خرچ کے حسابات دینے سے بچتے ہیں۔ اسی طرح ان کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اگر سرکار سے مدد لی جائے تو اس کا عمل دخل ان اداروں میں بڑھ جائے گا۔ شاید اس وجہ سے یا پھر عدم واقفیت کی وجہ سے اہل مدارس ابھی اس اسکیم سے پوری طرح استفادہ نہیں کر رہے ہیں۔ کوشش کی جانی چاہیے کہ ان کی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے تاکہ وہ اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ ●

بقیہ: مغل اور جلوۂ صد چمن

کا بھی ایسا کردار تھا۔ ۱۹۱۲ء میں اس میں تبدیلیاں کی گئیں اور باغ کا وہ کردار ہی ختم ہو گیا کہ جس کا ذکر بربر نے کیا ہے، مغلوں نے انگنت پھولوں اور درختوں کے تعلق سے اپنے خیالات اور تجربات کا اظہار کیا، مغل دربار سے وابستہ مصوروں نے باغوں کی تصویریں بنائیں، اس طرح جلوہ صد چمن نے ایک انتہائی خوب صورت روایت کی بنیاد ڈالی، مغل جو ہندوستان میں رچ بس گئے باغوں کی تشکیل ایک درخشاں عنوان بن گئے، اپنے ملک کو اپنے احساس جمال سے سنوارا نکھارا اور اسے اپنے جمالیاتی شعور کا ایک آئینہ بنا دیا۔

●

عبدالمتین

تہذیب کے فروغ میں تراجم کا رول

تہذیبوں کے درمیان جو بنیادی رکاوٹیں رہی ہیں وہ زبانوں کا مسئلہ ہے اس مسئلے کو حل کرنے میں ادبی تراجم نے جو کلیدی اور نتیجہ خیز رول ادا کیا ہے اس سے ہم انکار نہیں کر سکتے ۔ ترجمہ نے ہی ایک قوم کی تہذیب کو دوسری قوموں تک پہنچایا ہے ۔ ترجمہ نے ہی ایک قوم کے ذخیرہ علم و ادب سے دوسری قوموں کو روشناس کرایا ہے ۔ ترجمے نے ہی ایک انسانی گروہ کے تجربات سے دوسری جماعتوں کو فیض اٹھانے کا موقع دیا ہے ۔ انسانی تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کو فروغ دینے میں جہاں اور بہت سے اسباب و عوامل رہے ہیں وہاں ادبی تراجم بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے ۔

ادبی تراجم نے انسانی تہذیبوں اور قوموں کے درمیان حائل بہت سی دراڑوں کو توڑا ہے ۔ اس نے ہر دور اور عصر میں نئے سے نئے اور جدید سے جدید تر افکار و نظریات کو ایک قوم سے دوسری قوموں تک پہنچایا ہے ۔ ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے واقف کرایا ہے ۔ تراجم کے ذریعے ہی ایک زبان دوسری زبان کے تخیلات، تصورات، میلانات، رجحانات اور اس کی طبیعت و مزاج اور اس کی صرفی و نحوی ساخت سے متعارف ہو کر اس کے رنگ و روپ کو اختیار کرتی ہے اور اپنی کمی و تنگی کو دور کرتے ہوئے اپنے میں وسعت پیدا کرتی ہے ۔ یہ بات اپنی جگہ سو فی صد سچ ہے کہ اکثر دوسری زبانوں کی شاہکار تخلیقوں کا ترجمہ ہی ادیبوں کو نئے "ادبی میلانوں" تہذیبوں اور فنی معیاروں کا احساس دلا کر نئے تجربات پر اکساتا ہے اور نئے ادبی رجحانات کا محرک ثابت ہوتا ہے ۔

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اردو کو ایک جدید زبان بنانے، ملک گیر سطح پر اسے مقبولیت بخشنے اور ہندوستانی زبانوں میں اسے ایک امتیازی شان عطا کرنے میں جہاں چند دوسرے عوامل شامل رہے ہیں وہاں یورپی تہذیب اور ان کے علوم و فنون کے ادبی تراجم نے ایک اہم رول ادا کیا ہے ۔ انہی تراجم کے ذریعے اردو زبان کے لیے ترقی کے نئے دروازے کھلے ۔ ان دروازوں سے عقلیت، افادیت آزادی، انسان دوستی، روشن خیالی، ذوق تحقیق اور سائنسی طرز فکر کے جو خوشگوار جھونکے آئے ان سے اس زبان میں تازگی اور توانائی آئی ۔

ادب کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ادب کا شوق رکھنے والوں نے بے انتہا دولت خرچ کر کے غیر ملکی تہذیبوں کی معیاری اور اہم کتابوں کو ترجمہ کرایا ہے تاکہ وہ ایسے ادب اور تہذیب سے نابلد نہ رہ جائیں جو ان کے یہاں نایاب ہیں ۔ ایران کے بادشاہوں، بغداد کے عباسی دور کے خلفا اور مصر کے فاطمی خلفا نے بے انتہا دولت خرچ کر کے نہ صرف نامور شہ پاروں کو عربی میں ترجمہ کرایا بلکہ انھوں نے دارالترجمہ قائم کر کے ایک قابل تقلید مثال قائم کر دی ۔ اسلامی تاریخ میں بغداد میں "بیت الحکمت" اور مصر میں "دارالحکمت" ایسی لائبریریاں تھیں جو اپنی مثال آپ تھیں نہ صرف یہ، بلکہ برصغیر میں اسلامی حکومت کے اوائلی دور میں سنسکرت اور مقامی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابیں مثلاً پنچ تنتر، کلیلہ و دمنہ اور نل دمینتی اور اس جیسی دیگر کتابوں کا فارسی اور عربی میں ترجمہ کرایا گیا جس سے ادبی تراجم کی اہمیت کا پتا چلتا ہے ۔

اسی طرح عباسی دور میں جو کتابیں ترجمہ کرائی گئیں ان میں بالخصوص یونانی ماہروں کی فلسفہ اور سیاست پر ماہرانہ تصنیفات قابل توجہ ہیں ۔ ان کتابوں کو عربی میں ترجمہ کر کے تحقیق و تفتیش کی راہ ہمیشہ کے لیے ہموار کر دی گئی جس کے نتیجے میں اسلامی دنیا میں امام غزالی، ابن رشد، رومی بو علی سینا جیسی شخصیتوں نے جنم لیا ۔ خصوصاً انگلینڈ اور امریکہ اور عموماً پورے یورپ میں آج بھی مسلم اور عرب مفکرین خیام اور خلیل جبران کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ سب ترجمے کی برکت سے ہے ۔

تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ ہر زبان کے نثری ادب میں تخلیقی ادب سے قبل تراجم کا کام شروع ہوتا ہے ۔ ہماری زبان اردو میں خصوصاً ایسا ہی ہوا ہے ۔ نثری ادب کا دور اکثر و بیشتر تراجم سے شروع ہوتا رہا ہے ۔

ریسرچ اسکالر ۔ ۱۳۶ ستلج ہاسٹل جے ۔ این ۔ یو ۔ نئی دہلی ۶۷

• ہمارے ادیبوں نے ترجمہ شدہ شہ پاروں سے متاثر ہو کر تخلیقی کام شروع کیے ہیں گویا تراجم کے دور کے بعد ادب کا تخلیقی دور شروع ہوتا ہے۔ یعنی تخلیقی ادب کا انحصار بڑی حد تک ترجمہ شدہ شہ پاروں پر ہے اس لیے ادبی شہ پاروں کے تراجم کسی بھی زبان کے ادب کی توسیع یا ارتقار کے لیے سود مند ثابت ہوتے ہیں۔ وجہ یہ کہ اس سے تخلیقی جوہر کو تقویت ملتی ہے۔ تراجم کو پڑھنے سے تخلیق کاروں میں تخلیق کرنے کا جذبہ اجاگر ہوتا ہے۔ نثر اور نظم کے اسالیب میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ رجحانات میں تغیر و تبدل کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ تراجم کے قارئین اپنی تنگ دنیا اور محدود ماحول سے نکل کر وسیع تر فضا میں پہنچ جاتے ہیں اور ایک نئی دنیا کا تجربہ حاصل کرتے ہیں یہ سب تراجم ہی کی دین ہے۔

نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی تھام کر چلنا سیکھتی ہیں اور اپنی ہم عصر دولت مند زبانوں کا سہارا لیتی ہیں۔ یہ عمل تہذیب و تمدن کے باب میں ہمیشہ سے جاری ہے اور ترجمہ ہمارا ایک اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت ہم تہذیبوں کا مطالعہ کرتے ہیں گویا ترجمہ کی حیثیت ایک قاصد کی سی ہے جو انسانوں کی خبر کو ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے ترجمہ کے لیے اگر یہ کہا جائے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے تو غلط نہ ہوگا کیوں کہ ترجمہ ہی کے ذریعہ ایک مخصوص ملک، ایک جغرافیائی علاقے اور ایک خاص قوم کی تہذیب اور اس کے علوم و فنون تمام انسانیت کی ملکیت بنتے ہیں اس لحاظ سے ترجمے کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیوں کہ ترجمہ ہی ہے جس نے نوع انسان کو ایک دوسرے سے جوڑا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں از حد مدد کی ہے۔

ترجمے کی اہمیت کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سقراط، ذی مقراطیس اور افلاطون کی دو ہزار سال سے زیادہ پرانی کاوشیں روما اور یونان کے

• قدیم کھنڈروں میں دب دبا کر رہ گئی تھیں اگر عربی زبان کے ذی علم مترجم انھیں وہاں سے نکال کر یوروپ اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک کھلی ہوا میں نہ لے گئے ہوتے تو آج انھیں کون جانتا۔ اسی طرح سے بو علی سینا، ابن رشد، ابو نصیر فارابی کے کارنامے یروشلم، غرناطہ اور بغداد کے محاصرے میں دم توڑ چکے ہوتے اگر بعد کی لاطینی زبانوں نے انھیں اپنے یہاں منتقل کر کے تاریخ و فلسفے کے لیے محفوظ نہ کر لیا ہوتا۔

عرب و عجم کے علما نے یونانی ہندوستانی فلسفہ، طب، ہیئت و نجوم اور داستانوں کا عربی میں ترجمہ کر کے ان پرانی معلومات کے حاشیے بڑھا کر علمی دنیا سے خراج پایا، لاطینی و رومی کے ذریعے مشرق اور سنسکرت کے تراجم کے ذریعے مغرب کو اپنے زمانے تک کی تحقیقات سے باخبر کر دیا۔ والٹیر نے شیکسپیئر کا ترجمہ کر کے فرانسیسی زبان کے ذخیرے میں اور پیسترناک نے روسی زبان کے ادب میں بیش بہا اضافے کیے۔ علمائے مستشرقین نے مشرق کے کلاسیکی ادب اور علمی کتابوں کو مغرب سے روشناس کرایا اس دو طرفہ عمل نے مشرق و مغرب کی تہذیبوں کو آپس میں ملا دیا اور باہمی خیر و خبر کی گنگا دونوں سمتوں میں بہنے لگی۔

ترجمے کی اس اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے کیوں کہ جن زبانوں میں ترجمے کیے گئے ان کا اثر خود ان زبانوں کی ساخت پر پڑا۔ نہایت قریبی مثال کے لیے یہ کہنا کافی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ترجموں کے ذریعے نہ صرف اردو کی ساخت مضبوط ہوئی بلکہ دور دراز کی دوسری زبانوں نے بھی ایک دوسرے سے مل کر سنگم بنائے ہیں۔

اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت ورنہ جب تک وہ کھڑی بولی کے روپ میں تھی اسے کسی بڑے قلم کار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا۔ بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طے ہوا جس میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے

کہیں یہ ترجمے صرف کتابی صورت میں ہوئے اور کہیں محض خیال، استعارے اور اصطلاحوں کی صورت میں تاریخ دہرانے کی یہاں گنجائش نہیں بہر حال یہ حقیقت مسلم ہے کہ عربی فارسی سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ بھاشاؤں کے ترجمے کو اردو زبان کی تعمیر اور تربیت میں بڑا دخل ہے۔

جہاں تک اردو زبان میں تہذیبوں کے تراجم کا سوال ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا آغاز اٹھارویں صدی کے وسط میں ہو گیا تھا جہاں فورٹ ولیم کالج کا کارنامہ صرف چند لغات تک محدود نہیں ہے بلکہ مختلف زبانوں کے مذہبی، تہذیبی اور ادبی کہانیوں اور ڈراموں کے بھی تراجم کرائے گئے 'باغ و بہار'، 'گنج خوبی' اور 'آرائش محفل' اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں اس سے قبل قدیم کلاسیکی عہد میں اردو شاعری کے سرمایہ سے قطع نظر نثر کی بیشتر کتابیں فارسی ادب کے تراجم ہیں جیسے 'سب رس'، 'کربل کتھا' اور 'نو طرز مرصع' وغیرہ۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد دہلی کالج میں پرنسپل بوترو کی رہنمائی میں ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام ۱۸۴۱ء میں عمل میں آیا جہاں ماسٹر رام چندر وغیرہ نے اپنے کالج کے لیے بہت سارے تہذیبی علوم و فنون کو ترجمہ کر کے داخل نصاب کیا۔ دہلی کالج کے بعد اہم ادارہ جس نے اس کام کو منظم طور پر آگے بڑھایا وہ سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی تھی اسی عہد میں مہاراجہ کشمیر کے دارالترجمہ میں کچھ اہم علمی اور تہذیبی کتابوں کا ترجمہ ہوا اس کے بعد انجمن ترقی اردو نے جس کی بنیاد ۱۹۰۳ء میں پڑ چکی تھی۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے ترجمہ کے کام کو نمایاں اہمیت دی۔ اس ضمن میں جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے، جس کا آغاز حیدرآباد میں ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ اس جامعہ نے مغرب کے جملہ علوم و فنون کے لیے اردو کو ذریعہ تحریر بنایا۔ بہر کیف دارالترجمہ حیدرآباد نے اردو کو

باقی صفحہ ۲ پر

دیپانتا دھر

کمہار۔ درگا پوجا کے گمنام ہیرو

"درگا پوجا" کا نام زبان سے نکلتے ہی دیوی درگا کی سجی اور سنوری ہوئی مورتی اپنے تمام جاہ و جلال کے ساتھ ذہن کے پردے پر ابھرتی ہے جس کی پوجا لوگ پوری شردھا اور عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ ہر سال خزاں کے موسم میں دیوی درگا یقینی طور پر اپنے والدین سے ملاقات کے لیے آتی ہے اور اپنے ساتھ اپنے چاروں بچوں کو بھی لاتی ہے۔

دیوی درگا کے گھر آنے کو بنگال کے لوگ نہایت مبارک شگون سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کا غیر متزلزل عقیدہ یہ ہے کہ درگا "درگاتی ناشنی" یعنی تمام دکھوں کا ازالہ کرنے والی ہے اور یہ کہ اس کی آمد ملک کے تقدس کو دوچند کر دیتی ہے۔ ہر گھر میں اس کا سواگت اتنی خوشی سے ہوتا ہے کہ جتنی خوشی سے اس شادی شدہ بیٹی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، جس کا عرصہ سے انتظار ہو۔ دھوم دھڑاکے، جوش و خروش کے اظہار اور بھائی چارہ کے مظاہر کا نام درگا پوجا ہے، جو بنگالیوں کا سب سے بڑا تہوار ہے۔

مختلف علاقوں میں پنڈالوں میں لوگ درگا، لکشمی، سرسوتی، کارتک اور گنیش کی دلکش مورتیاں رکھتے ہیں، جو لوگ دیوی درگا کی خوب صورت مورتیوں کو جیتا جاگتا بناتے ہیں وہ کمہار کہلاتے ہیں جو مہینوں پھٹے پرانے سائبانوں میں دھوپ اور بارش سے بے نیاز ہو کر مٹی کے سیکڑوں ڈلوں کو اپنے ہاتھوں سے جنبش دے مورتیوں کی شکل میں ڈھالتے ہیں۔

کمہار ٹولی میں زندگی

اب صرف مغربی بنگال ہی تک درگا پوجا محدود نہیں ہے۔ کلکتہ کے کمہار دہلی، یوپی، بہار اور ملک کے دوسرے حصوں میں بھی مورتیاں بنانے کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ یہ مورتیاں ہوائی جہازوں سے امریکہ، کناڈا، برطانیہ اور یورپ کے بہت سے حصوں کو کریٹوں میں بحفاظت رکھ کر بھیجی جاتی ہیں۔ کلکتہ میں کمہاروں کی بستی "کمہار ٹولی" میں لگ بھگ ایسے دو سو اسٹوڈیو یونٹ ہیں جن میں تقریباً دس ہزار دست کار اور باہنر مزدور مورتیاں بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ مزید دو ہزار دست کار ان مورتیوں کا دوسرا سامان تیار کرتے ہیں۔ مگر ان فنکاروں کو سال میں محض ۵ ماہ کے لیے موسمی روزگار ملتا ہے اور سال کے باقی دنوں میں یہ لوگ بے روزگار ہی رہتے ہیں۔

ہر یونٹ کے ذریعہ اوسطاً ۷۰ ہزار روپے کی سرمایہ کاری پر ۲۰ فی صد منافع حاصل ہوتا ہے یعنی اسے پوجا کے زمانہ میں صرف ۱۴۰۰۰ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ پورے سال انھیں اسی معمولی رقم سے اپنی ضروریات پوری کرنی ہوتی ہیں۔ مورتیاں بنانے والے کمہار اس ابتدائی سرمایہ کے حصول کے لیے بھی در در کی خاک چھانتے ہیں۔ ان مالی دشواریوں نے دست کاروں کی نوجوان نسل کو روزگار کے دوسرے ذرائع تلاش کرنے پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا ہے، جس کی وجہ سے ۳۰۰ سال پرانی یہ روایت رو بہ زوال ہے۔

دقت طلب عمل

مئی اور جون کے آس پاس یہ لوگ مورتیوں پر کام شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلے سال کی لکڑی کا ایک بنیادی سانچہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بانس کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے (جس کو یہ لوگ کھیلان کہتے ہیں)۔ اس کے بعد ہلکے ہاتھوں سے جسم کی شکل بنانے کے لیے اس میں سوکھی گھاس کی بھرائی کا کام ہوتا ہے۔ پھر مٹی اور دھان کے بھوسے کا مرکب تیار کیا جاتا ہے، جس کو سوکھی گھاس کے ڈھانچے کے اوپر لگا دیا جاتا ہے۔ اس مرحلہ کو "ایک ماٹی" کہا جاتا ہے، جس کے بعد اسے دس دن تک سوکھنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک خاص لیپ "گنگا ماٹی" اس ڈھانچہ پر لگایا جاتا ہے اور پھر مٹی کے ایک اور لیپ کا عمل کیا جاتا ہے جس کو "دو ماٹی" کہتے ہیں۔

سوتی کپڑا چپکانے سے مورتیوں کی مضبوطی اور دیرپائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ "دو ماٹی" کے بعد انگلیاں بنائی جاتی ہیں۔ ان کو دھوپ میں سوکھنے میں لگ بھگ دو دن لگتے ہیں۔ اگر بارش ہو جائے تو آگ جلانی پڑتی ہے۔ حال ہی میں کچھ دست کاروں نے اس عمل میں تیزی لانے کے لیے بلو لیمپ کے استعمال کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اس کے بعد آخری مرحلہ میں رنگ بھرائی ہوتی ہے، وارنش کی جاتی ہے اور دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کو کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ صرف آنکھوں کو بنانے کے لیے ایک ماہر کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ اس سال درگا کی کچھ مورتیاں دس فٹ اور ۲۰ فٹ

باقی صفحہ ۱۱۱ پر

ڈاکٹر عرفان علیمی

چھاتی کا سرطان مسئلہ اور مداوا

سرطان یا کینسر خواہ جسم کے کسی عضو کا کیوں نہ ہو، انتہائی اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آج یہ مرض ساری دنیا کے لیے ایک سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے اور کوئی بھی ملک اس بھیانک مرض کی گرفت سے محفوظ نہیں۔ اس مرض کے سبب سے ہونے والی تباہی اور ہلاکت خیزی سے آج ساری دنیا دہشت زدہ ہے۔ اس مرض میں مبتلا ہونے پر مریض اندر ہی اندر گھلتا اور پگھلتا رہتا ہے اور تھوڑے ہی دنوں میں بڑی بے بسی و کرب و بے چینی کی زندگی گزار کر لقمۂ اجل بن جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ مرض انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے اور مریض کو بڑے صبر آزما دور سے گزرنا پڑتا ہے تاہم دیگر مہلک امراض کی طرح اگر اس مرض کی تشخیص ابتدائی ایام میں ہو جائے تو شفایابی کی امید نہ بھی سہی تو مریض کی تکلیف تو کم کی ہی جا سکتی ہے۔ کچھ اعضا کے کینسر تو ایسے ہیں کہ اگر ان کی تشخیص شروعاتی دور میں ہو جائے تو مریض کی زندگی کو یقیناً بچایا جا سکتا ہے۔

اس مرض کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اگرچہ عام طور پر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ یہ مرض دورِ جدید کی دین ہے اور زمانہ قدیم میں نہ تو یہ مرض ہوتا تھا اور نہ ہی اس وقت کے اطبا اس مرض سے واقف تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ قدیم طبی کتب میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ قدیم ترین اطبا میں بقراط اور متاخرین نے بھی اس مرض کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چار ہزار سال قبل مصر کے حکمراں فرعون کو بھی یہی مرض لاحق ہوا تھا۔ اس طرح یہ کوئی نیا مرض نہیں ہے بلکہ زمانہ قدیم کے اطبا کے لیے بھی یہ مرض ایک چیلنج تھا۔ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ آج کے مقابلے میں زمانہ قدیم کے لوگوں کو یہ مرض کم ہوتا رہا ہو اور آج کے زمانہ میں یہ مرض تیزی سے پھیل رہا ہو۔ زمانہ قدیم میں اس مرض کے کم ہونے کا سبب ہو سکتا ہے کہ اس وقت کے لوگوں کا سادہ رہن سہن اور آمیزش سے پاک غذاؤں کا استعمال رہا ہو کیوں کہ دورِ جدید میں یہ مرض مغربی ممالک میں تیزی سے پھیل رہا ہے اور پسماندہ اقوام کے مقابلے ترقی یافتہ لوگوں کو اپنا شکار بنا رہا ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مرض کا تہذیب کی ترقی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ماحولیاتی آلودگی، مصنوعی غذاؤں کی کثرت استعمال، غذا میں رنگوں کی آمیزش، تمباکو نوشی اور منشیات کی کثرت استعمال اس مرض کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

یہ مرض بچے، جوان اور بوڑھے سبھی کو لاحق ہو سکتا ہے۔ لیکن نہ تو یہ متعدی مرض ہے اور نہ ہی اس مرض کو موروثی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ مرض ایک ہی خاندان کے کئی لوگوں کو لاحق ہو سکتا ہے۔

آج سے تقریباً ۵۰ سال قبل تک یہ مرض لاعلاج امراض کے زمرے میں آتا تھا اور مریض کو یہ معلوم ہو جانے پر کہ اسے یہ مرض ہو گیا ہے، وہ زندگی سے مایوس ہو کر پل پل موت کے قریب ہوتا جاتا تھا لیکن طب کے میدان میں ہونے والی مسلسل تحقیق اور متواتر تجربات کے سبب نت نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ طویل مدت کی بے پناہ کوشش اور ہر ممکن جد و جہد کے بعد بھی آج تک اس مرض کا شافی علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے۔

سرطان ہے کیا؟

ہمارے جسم کے مختلف اعضا خلیوں سے مل کر بنے ہوتے ہیں اور خلیوں کے بننے اور بکھرنے کا عمل تا حیات جاری رہتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پرانے خلیے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور نئے خلیے بن جاتے ہیں۔ جسم کا ہر عضو اتنے ہی نئے خلیے تیار کرتا ہے جتنے اس کے لیے ضروری ہوتے ہیں لیکن جب نامعلوم وجوہات سے کسی کسی میں یہ سلسلہ بے قابو ہو جاتا ہے تو خلیے آزادانہ طور پر بڑھنے لگتے ہیں اور جسم کا وہ حصہ غیر معمولی طور پر بڑھنے لگتا ہے۔ اس طرح جسم کے کسی عضو کے خلیوں کے بے قاعدہ تقسیم کے عمل سے سرطان ہوتا ہے۔ جسم میں جو غیر معمولی بڑھوتری ہوتی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ سرطانی رسولی
۲۔ غیر سرطانی رسولی

سرطانی رسولی وقفے وقفے سے غیر محسوس طور پر بڑھتی ہے اور ان کے خلیے خون کی دریدوں کے ساتھ دوسرے اعضا تک پہنچتے ہیں اور انھیں بھی کینسر زدہ کر دیتے ہیں۔ غیر سرطانی رسولی جسم کے کسی مخصوص عضو تک محدود ہوتی ہے اور پھیلتی نہیں ہے۔ اسے بذریعہ عمل جراحی پورا کا

نوائے طب و صحت، پوسٹ آفس بیگم سرائے، الٰہ آباد ۱۰۰۲۱

پورا نکال دیا جاتا ہے۔ رسولی نکالے جانے کے بعد دوبارہ نہیں بنتی ہے اور جسم کا وہ حصہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جاتا ہے۔

یوں تو خواتین بھی ہر قسم کے سرطان کا شکار ہو سکتی ہیں تاہم کچھ کینسر ایسے ہیں جو خواتین میں نسبتاً زیادہ پائے جاتے ہیں یا خواتین کے مخصوص جسمانی حصوں میں ظاہر ہوتے ہیں جیسے چھاتی، رحم، بچہ دانی اور بیضہ دانی کا سرطان۔ دیگر ممالک میں تو خواتین سب سے زیادہ چھاتی کے کینسر میں مبتلا ہوتی ہیں جب کہ ہمارے ملک میں چھاتی کے کینسر میں مبتلا ہونے والی خواتین دوسرے نمبر پر ہیں۔ چھاتی کا کینسر ۴۵ سے ۵۵ سال کی عمر والی خواتین کو زیادہ ہوتا ہے۔

چھاتی کے سرطان کے اسباب

یہ کوئی اس طرح کا مرض نہیں ہے جس کے مقررہ اسباب ہوں۔ تمام تر کوشش اور طب کے میدان میں بے پناہ ترقی کے باوجود اب تک اس مرض کے حقیقی اسباب کا پتا نہیں لگ سکا ہے۔ آج بھی دنیا کے مختلف ممالک میں مستند، معتبر اور شہرت یافتہ تجربہ گاہوں میں تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے مگر ابھی تک اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی ہے۔ البتہ بعض ایسے عوامل ضرور دریافت ہوئے ہیں جو چھاتی کے کینسر کا سبب ہو سکتے ہیں۔ چھاتی کے کینسر ہونے کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو اپنی چھاتی سے دودھ پلانے کی طرف سے مجرمانہ غفلت اور بے توجہی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ کیوں کہ آج کے عیش پرست دور میں مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کرنے والی خواتین اپنی چھاتی سے دودھ پلانا فیشن کے خلاف اور قدامت پرستی کی علامت سمجھتی ہیں۔ انھیں اپنے بچوں سے زیادہ اپنا جسمانی حسن عزیز ہوتا ہے کیوں کہ یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ ان ممالک میں جہاں بچوں کو چھاتی سے دودھ پلانے کا رواج ہے، وہاں یہ مرض نہ کے برابر ہے جیسے جاپان کیوں کہ وہاں کی خواتین بچوں کو دودھ پلانا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتی ہیں جب کہ اس کے برعکس امریکہ کی خواتین اپنے حسن کے ضائع ہونے اور پستانوں کی شکل بگڑ جانے کے خوف سے اپنی چھاتی سے دودھ پلانے سے احتراز کرتی ہیں، وہاں یہ مرض زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں چست کپڑا پہننے سے بھی اس مرض کے ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ مرض ان خواتین میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے جن کے خاندان میں یہ مرض کسی دوسرے کو ہو چکا ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر ماں یا بہنوں کو یہ مرض ہو چکا ہو تو ان کی بیٹی یا بہن کو اس مرض میں مبتلا ہونے کا اندیشہ زیادہ رہتا ہے۔ وہ خواتین بھی اس مرض کا شکار ہو جاتی ہیں جنھیں کم عمری میں حیض آنا شروع ہو جائے اور جلد ہی بند بھی ہو جائے۔ غیر شادی شدہ عمر رسیدہ خواتین اور وہ خواتین جن کی پہلی اولاد ۳۰ سال کی عمر کے بعد ہوتی ہے، وہ اس مرض کا شکار ہوتی ہیں۔ بانجھ عورتوں کو بھی اس مرض میں مبتلا ہونے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔

علامات

چھاتی میں سخت اور سادہ درد کی گانٹھوں کا ہونا اس مرض کی سب سے اہم علامت ہے۔ زیادہ تر یہ گانٹھیں چھاتی کے اوپری حصے میں ہوتی ہیں۔ اس طرح کی گانٹھیں دوسری وجوہات اور دوسرے امراض میں بھی ہوتی ہیں لہٰذا گانٹھیں محسوس ہونے پر کسی ماہر سرجن سے رجوع کرنا چاہیے کیوں کہ کینسر کی گانٹھ ہونے پر وقت رہتے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن اگر ان گانٹھوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا اور کوئی اہمیت نہ دی گئی اور بعد میں تشخیص ہو بھی گئی تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں پستان کے نپل سے خون یا مواد آنا، پستان کا اوپر کی طرف کھنچ جانا، پستان کے حجم میں تبدیلی آنا، اس کا چپٹا ہو جانا، بغل میں گانٹھوں کا ہونا اور پستان کے اوپری حصے میں جھریاں پڑ جانا اس مرض کی مخصوص علامات ہیں۔

تشخیص

اس مرض کی تشخیص کے لیے درج ذیل جانچ کرانا ضروری ہوتا ہے۔

۱۔ پستان کا ایکسرے (میموگرافی)
۲۔ زیرو ریڈیوگرافی
۳۔ تھرموگرافی
۴۔ نپل سے نکلنے والے مادے کی جانچ
۵۔ بایوپسی
۶۔ الٹرا ساؤنڈ
۷۔ ایف۔ این۔ اے۔ سی
۸۔ آئی سو ٹوپ۔ اسکیننگ

لیکن تشخیص کرنے کا سب سے معتبر طریقہ بایوپسی ہے جس میں مریضہ کو بے ہوش کر کے کینسر زدہ حصے کو یا ضرورت پڑنے پر پوری گانٹھ کو نکال کر پیتھالوجسٹ کے پاس بھیج کر جانچ کرائی جاتی ہے۔ جانچ کے بعد یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ گانٹھ سرطانی ہے یا غیر سرطانی۔ ویسے زیادہ تر گانٹھیں غیر سرطانی ہوتی ہیں جنھیں پورا کا پورا کاٹ کر نکال دیا جاتا ہے اور مریضہ صحت یاب ہو جاتی ہے۔

علاج

چھاتی کے کینسر کے علاج کا انحصار اس بات پر ہے کہ مرض کس مرحلے میں ہے۔ اگر مرض صرف چھاتی تک محدود ہوتا ہے تو بذریعہ سرجری اس کا علاج آسان ہوتا ہے۔ متاثرہ حصے کو یا پورے حصے کو نکال دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ پر مصنوعی چھاتی لگا دی جاتی ہے لیکن یہ علاج بھی صد فی صد کامیاب نہیں ہوتا ہے۔ پوری احتیاط سے کینسر کی جڑیں نکال دینے کے باوجود اس مرض کے دوبارہ ہو جانے کا خطرہ سا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں ہارمونی علاج اشعاع اور کیموتھیراپی کا سہارا ناگزیر ہوتا ہے۔

تازہ تحقیق کے مطابق دراصل کینسر کے خلیات گوشت اور جلد وغیرہ سے تو نکال دیے جاتے ہیں لیکن ہڈیوں کے گودے میں وہ باقی رہتے ہیں اور بعد میں یہی بچے خلیات مزید مستحکم ہو کر دوبارہ سر اٹھاتے ہیں۔ جن خواتین میں کینسر کے خلیات صرف چھاتی کی گانٹھوں تک محدود ہوتے ہیں، انھیں عمل جراحی کے ذریعے نکال دیا جاتا ہے اور مریضہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جاتی ہے۔ لیکن جن خواتین میں یہ خلیات عمل جراحی سے قبل ہڈیوں تک اثر انداز ہو جاتے ہیں، ان کے مکمل طور پر صحت یاب ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں امریکہ کے کینسر انسٹی ٹیوٹ کے معالجین نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ عمل جراحی کے بعد بھی مریضوں کو ہارمون اور مہلک سرطان ادویات استعمال کراتے رہیں تاہم یہ ضروری ہے کہ گودے

باقی صفحہ ۸ پر

ڈاکٹر اے۔ کے چترویدی

صحت اور کیلا

ہندوستان میں کیلے کا شمار ایک اہم پھل کے طور پر کیا جاتا ہے اس کی پیداوار نہایت سہولت و آسانی کے ساتھ کی جا سکتی ہے اسے کسی بھی جگہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ برصغیر ایشیا میں کیلے کی پیداوار کرنے والے دیگر ممالک کے مقابلے ہندوستان کا نام سرفہرست آتا ہے، ہمارے ملک میں اس کی کھیتی ۳ لاکھ ۲ ہزار ہیکٹیر رقبہ میں کی جاتی ہے۔ یہ پھل بازار میں ۱۲ ماہ مہیا رہتا ہے۔

مختلف زبانوں میں کیلے کو الگ الگ نام سے پکارا جاتا ہے مثلاً سنسکرت میں کرلی۔ اردو۔ ہندی میں کیلا۔ بنگالی میں کیرہ۔ مراٹھی میں سوں کیل۔ تیلگو میں ارتی۔ ملیالم میں نا ھا۔ اڑیہ کول۔ انگریزی میں بنانا (BANANA) کہتے ہیں۔

کیلا ایک صحت بخش و خوش ذائقہ پھل ہے۔ یہ امیر غریب، بوڑھوں، بچوں سب ہی کو مرغوب ہے۔ ہندو عقیدہ کے مطابق اسے بھگوان بھی پسند کرتے ہیں۔ اس لیے کتھا میں کیلا تبرک کے طور پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ لوگ پوجا پاٹھ و متبرک کاموں کی شروعات اس کے پھل، تنے و پتیوں کے استعمال سے کرتے ہیں۔

عموماً سب ہی موسموں میں دستیاب ہونے کے سبب اس کو بہ آسانی و مناسب قیمت میں خریدا جا سکتا ہے۔ یہ کافی دنوں تک رکھا جا سکتا ہے اس میں دوا کی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان خوبیوں کی وجہ سے کیلے کا شمار مقبول پھلوں میں ہوتا ہے۔

آیورویدک طریقہ کے مطابق پکے ہوئے کیلے میں درج ذیل خصوصیات ملتی ہیں۔

یہ فطرتاً ٹھنڈا اور ذائقہ دار پھل ہے۔ توانائی کو تقویت بخشتا ہے۔ خون میں پیدا ہونے والے نقصان دہ جراثیم مارنے میں مددگار ہے۔ پتھری کے علاوہ پیٹ کے پوشیدہ و آنکھوں کے امراض میں فائدہ مند ہے۔ آئرن کی مقدار پائے جانے کے سبب یہ خون کی روانی میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

کیلا کھانے کے بعد اگر اس کے اوپر روزمرہ دودھ پیا جائے تو یہ جسم میں توانائی و خون کی افزائش کرتا ہے۔ نونہالوں کے واسطے یہ ایک اچھی غذا ہے کیوں کہ کیلے میں بچوں کی نشو و نما سے متعلق تمام ضروری وٹامن پائے جاتے ہیں۔ منھ میں اگر چھالوں کی تکلیف ہو جائے اور کیلے کو گائے کے دودھ کے بنے دہی کے ساتھ ملا کر استعمال کرنے پر چھالوں میں راحت ملتی ہے اس کے علاوہ پکے ہوئے کیلے کو دہی اور چینی میں ملا کر کھایا جائے تو اس سے گیس کی بیماری اور حدت میں کمی ہوتی ہے۔

جسم کے جلے ہوئے حصے پر اگر اس کا لیپ لگایا جائے تو تکلیف میں راحت محسوس ہوتی ہے۔ پکے ہوئے کیلے کے اوپر گھی لگانے کے بعد کھانے سے پیٹ کی بیماری میں کمی آتی ہے۔ گیہوں کے آٹے میں پکے ہوئے کیلے کو ملا کر پلٹس بنا کر جسم کے کسی حصہ میں سوجن کے مقام پر پلٹس لگائے تو مریض کو راحت نصیب ہوتی ہے۔ ایسے بچے جو مٹی کھانے کے عادی ہوں ان کو شہد میں پکا ہوا کیلا ملا کر دیا جائے تو بچہ مٹی کھانا چھوڑ دیتا ہے۔

ایسٹن یونیورسٹی (برطانیہ) کے سائنس دانوں کے مطابق پیٹ میں "السر" ہو جانے پر کچا کیلا کا استعمال کرنا دوا کا کام کرتا ہے۔ گولیر جنرل یونیورسٹی (جرمن) کے پروفیسر وینڈیل کا کہنا ہے کہ کیلے میں ایسی اشیا موجود ہیں جس سے دماغ کو "سروٹونین" ملتے ہیں جو دماغی مریضوں کے لیے شفا کا ضامن بنتے ہیں۔

کیمیاوی تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کیلے میں مختلف ضروری تغذیہ بخش اجزا شامل ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ مقدار کاربوہائیڈریٹ کی ہے اس کے علاوہ پروٹین و چربی (چکنائی) ملتی ہے۔ اس پھل میں وٹامن اے۔ وٹامن بی ۱۔ وٹامن بی ۲۔ اور وٹامن سی۔ وافر مقدار میں اور وٹامن ڈی و وٹامن ای معمولی مقدار میں پائے جاتے ہیں کیلے کے غذائی اجزا مندرجہ ذیل ہیں۔

نمی / ۷ = فی سوگرام میں ۴۴ ملی گرام، کیروٹین۔

کاربوہائیڈریٹ / ۲۷ = فی سوگرام میں ۵ فی صد ملی گرام، تھائی من۔

ریشہ / ۵۵ = فی سوگرام میں ۵ فی صد ملی گرام، رائی بوفلوس۔

چکنائی (چربی) / ۵۳ = فی سوگرام میں ۷ ملی گرام نائیسن

پروٹین / ۱۰۲ = فی سوگرام میں ۱۲ ملی گرام وٹامن سی۔

باقی صفحہ ۳۲ پر

ضبطِ تولید

بیدل سرحدی

یہ تو ممکن نظر آتا نہیں صدیوں مجھ کو
آدمی اُڑ کے ستاروں پہ چلے جائیں گے
کہنہ تہذیب کے تمغوں کو گلے میں ڈالے
بستیاں چھوڑ کے غاروں میں چلے جائیں گے

○

اسی رفتار سے بڑھتی ہے اگر آبادی
جانے پہنچیں گے کہاں سے کہاں اعداد و شمار
سر چھپانے کے لیے چھت نہ میسّر ہو گی
کاشت ہوتی ہے جہاں ہوں گے وہاں پر بازار

○

میرے نزدیک بغاوت یہ مبارک ہے اگر
رسمِ دیرینۂ اجداد کو روکا جائے
آج کے دور میں قدرت کا بھی منشا ہے یہی
جیسے ہو کثرتِ اولاد کو روکا جائے

○

اپنی قوت پہ بھروسا ہے تدبّر پہ ہے ناز
اپنی قسمت کو بھی انسان بدل سکتا ہے
گئے وہ دن کہ یہ ناچیز تھا یکمشت خاک
اب ستاروں کو بھی پیروں سے کچل سکتا ہے

نگہبان شعبۂ اشاعت
سنت نرنکاری منڈل، سنت نرنکاری۔ دہلی ۹

غـــــــــــزلیں

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی

جو اختلاف کا رستہ پسند کرتے ہیں
ہم ان سے دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں

غمِ حیات کی لذت انھیں نصیب کہاں
جو لوگ عشرتِ دنیا پسند کرتے ہیں

غضب خدا کا سمندر کھنگالنے والے
سراب زارِ زمانہ پسند کرتے ہیں

وہ کیسے کفر کی تاریکیوں میں کھو جائیں
جو شمعِ حق کا اجالا پسند کرتے ہیں

گناہ گار کبھی سامنے نہیں آتے
سزا کے خوف سے پردا پسند کرتے ہیں

کبھی سکوں سے کنارے پہ رہ نہیں سکتے
جو انتشار کا دریا پسند کرتے ہیں

یہ رازؔ ان کی نگاہیں بتا رہی ہیں مجھے
وہ مجھ سے دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں

کٹرہ پیر دل خان اردو روڈ اٹاوہ۔ ۲۰۶۰۰۱

شہناز حیا سندھی

یہ اور بات ہے کہ ابھی ہونٹ نم نہیں
ویسے میرا وجود سمندر سے کم نہیں

ہم کو ہمارے حال پہ رہنے دے چارہ گر
مرہم نواز ہوں گے کوئی اور ہم نہیں

ان حادثوں نے وقت سے لڑنا سکھا دیا
اب زندگی کے غم کا مجھے کوئی غم نہیں

پھولوں میں رنگ و بو نہ بہاروں میں دلکشی
کیا اہلِ گلستاں پہ یہ ظلم و ستم نہیں

جس کو بھی اپنی قوت بازو پہ ناز ہے
وہ اس جہاں کے طالب چشم کرم نہیں

دشواریٔ سفر سے کہاں بچ کے جاؤ گے
وہ راہ کون سی ہے جہاں زیر و بم نہیں

سچائی کے لیے ہے میری فکر چاندنی
جھوٹے قصیدے لکھنے کو میرا قلم نہیں

معرفت عمگیں قریشی ڈھولی کھال سہارنپور ۲۴۷۰۰۱

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

درج فہرست ذاتوں کے لیے اسکیمیں

درج فہرست ذاتوں کی بہبود اور ترقی کے لیے ۱۴۔ اسکیمیں تشکیل دی گئی ہیں جن میں سے دس اسکیموں کو مرکز اسپونسر کرے گا اور باقی چار مرکزی شعبہ کی اسکیمیں ہیں۔ مرکز سے اسپونسر کردہ اسکیم میں (۱) درج فہرست ذاتوں کی ترقیاتی کارپوریشن کو امداد فراہم کرنا (۲) خاکروبوں کی بازآبادکاری اور آزادی (۳) دسویں کلاس کے بعد وظیفہ کا اجراء (۴) دسویں کلاس سے پہلے کا وظیفہ (۵) کتابوں کا بینک (۶) لڑکیوں کا ہوسٹل (۷) لڑکوں کا ہوسٹل (۸) کوچنگ اور متعلقہ اسکیم (۹) درجہ بندی میں سرفہرست رکھنا (۱۰) پی سی۔ آر۔ زیادتیاں شامل ہیں۔ مرکزی سیکٹر کی اسکیموں میں ایس۔ سی۔ پی۔ کو خصوصی امداد (۱۱) درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں سے متعلق قومی مالیاتی کمیشن (۱۲) غیر سرکاری اداروں اور تحقیق و تربیتی اداروں کو امداد جیسی اسکیمیں شامل ہیں۔

مرکزی اسپونسر کردہ اسکیموں کے تحت ریاستیں مساوی امداد یعنی مرکز کے برابر امداد فراہم کرتی ہیں جبکہ مرکزی اسکیموں کو مرکزی بجٹ سے پورا پورا فنڈ ملتا ہے۔ درج فہرست اور قبیلوں سے متعلق قومی کارپوریشنوں کو مرحلے والی مرکزی امداد کے ضمن میں ریاستوں کے لیے فنڈز کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ ادارہ ریاستی ایجنسیوں کے ذریعہ موصول ہونے والی تجاویز کی بنیاد پر رقومات جاری کرتا ہے اسی طرح رضاکار اداروں کو دی جانے والی امداد ریاستوں کو نہ دے کر براہ راست غیر سرکاری اداروں کو دی جاتی ہے۔ تحقیق و ترقی و تربیت سے متعلق اسکیموں کی امداد ریاستوں کو براہ راست نہیں دی جاتی۔ یہ امداد تحقیقی اداروں اور یونیورسٹیوں کو یک مشت امداد کی شکل میں براہ راست دی جاتی ہے۔ ●

قبائلی ترقیات کی اسکیمیں

درج فہرست قبیلوں کی ترقی و بہبود کے لیے دس اسکیمیں ہیں۔ جن میں سے چار اسکیمیں مرکز سے اسپانسر شدہ ہیں اور چھ اسکیمیں مرکزی شعبے کے تحت ہیں۔

مرکز اسپانسر کردہ اسکیموں میں :

۱۔ گرلز ہوسٹل (لڑکیوں کے لیے اقامت گاہیں)

۲۔ لڑکوں کے لیے ہوسٹل۔

۳۔ آشرم اسکول۔

۴۔ تحقیق و ترقی جیسی اسکیمیں شامل ہیں۔

اس ضمن میں ریاستوں کو جاری کیا جانے والا فنڈ ۵۰:۵۰ کے تناسب سے جاری کیا جاتا ہے۔ مرکزی شعبے کی اسکیموں کے تحت درج ذیل اسکیمیں شامل ہیں :

۱۔ قبائلی علاقوں میں پیشہ ورانہ تربیت۔

۲۔ ریاستی، قبائلی ترقیات امداد باہمی کارپوریشنوں کو یک مشت امداد۔

۳۔ ایس سی اے برائے قبائلی ذیلی منصوبہ۔

۴۔ آئین کے آرٹیکل ۲۷۵ (۱) کے بجٹ جاری فنڈ۔

۵۔ درج فہرست قبائل کی لڑکیوں کے لیے تعلیمی کمپلیکس ان علاقوں میں جہاں خواندگی کی شرح کم ہے۔

قبائلی علاقوں میں پیشہ ورانہ تربیت کے لیے چلائی جانے والی مرکزی شعبے کی اسکیمیں اور ایس ٹی ڈی سی سی ایس کے لیے یک مشت امداد کے لیے فنڈز ریاستوں سے ملنے والی تجاویز کی بنیاد پر جاری کیے جاتے ہیں۔ ●

کول انڈیا کے ماحولیات و سماجی پروجیکٹوں کے لیے عالمی بینک کی امداد

عالمی بینک نے کول انڈیا لیمیٹڈ کے کوئلہ شعبے کے ماحولیاتی و سماجی پروجیکٹوں کے لیے ۴ کروڑ ۳۳ لاکھ ایس ڈی آر (یعنی چھ کروڑ ۳۰ لاکھ امریکی ڈالر) کا آئی ڈی اے قرض منظور کیا ہے۔

مذکورہ پروجیکٹ منجملہ دیگر باتوں کے ماحولیاتی منصوبوں، بازآبادکاری کے منصوبہ ہائے عمل وغیرہ سے بھی متعلق ہے۔ ان پروجیکٹوں میں کے ڈی ہیسالونگ، پارتیج مترقی اور راج رپا پروجیکٹ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

●

بھارت اور سوڈان کے مابین صحت کے باہمی تعاون پر سمجھوتہ

جذام کے خاتمہ پر دوسری عالمی کانفرنس کے دوران بھارت اور جمہوریہ سوڈان کے مابین صحت کے شعبہ میں باہمی تعاون کے ایک سمجھوتہ پر یہاں دستخط ہوئے ہیں۔

دونوں ممالک نے باہمی گہری دوستی کا اعادہ کیا اور صحت سے متعلق اطلاعات کا تبادلہ، صحت عامہ سے متعلق کا تبادلہ اور طبی سائنس اور فارماسیوٹیکل تبادلہ کی ضرورت پر زور دیا۔ نیز اس بات پر بھی اتفاق ہوا کہ ہر دو ملک کے درمیان طبی شعبہ میں طلبا اور ماہرین کی تربیت کا بھی تبادلہ کیا جائے گا اور صحت عامہ/میڈیکل سائنس کے ادارے باہمی تعاون کے ذریعہ قائم کیے جائیں گے۔ اس سمجھوتہ کو دوطرفہ طور پر معاہدہ کے ذریعہ آخری شکل دی جائے گی۔ ●

اسرو کے سری ہری کوٹا مرکز کی سلور جوبلی

۲۵ سال قبل آج کے دن آندھرا پردیش کے ضلع نیلور میں سری ہری کوٹا سے ایک ۱۲۵۔ ایم ایم کا روہنی ساؤنڈنگ راکٹ داغا گیا تھا۔ تب سے اب تک اسرو کے سری ہری کوٹا مرکز نے طویل فاصلہ طے کر لیا ہے۔ اب یہ مرکز ملک میں مصنوعی سیارے داغنے کا ایک اہم خطہ بن گیا ہے جہاں سے اسرو کی تمام لانچ گاڑیاں موسومہ ایس ایل وی ۳، اے ایس ایل وی اور پی ایس ایل وی کو لانچ کیا جا چکا ہے۔ اس مرکز نے بڑے ٹھوس پیکھے دار موٹروں کی تیاری اور ان کے زمین پر جانچ کی سہولیات بھی فراہم کر دی ہیں تاکہ ہندوستان کی لانچ گاڑیوں کو جوڑ کر تیار کیا جا سکے اور لانچ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے متعلقہ زمینی نظام مثلاً مشن کنٹرول سسٹم، ٹیلی میٹری ٹریکنگ اور کمانڈ سسٹم اور موسم کا حال معلوم کرنے والا مرکز بھی سری ہری کوٹا میں موجود ہے۔ اس مرکز نے اب تک ایس ایل وی۔ ۳ کی چار، اے ایس ایل وی کی چار اور پی ایس ایل وی کی تین اڑانوں میں حصہ لیا ہے اس کے علاوہ بہت سے ساؤنڈنگ راکٹوں کے داغے جانے میں بھی معاونت کی ہے۔

اس مرکز میں پی۔ ایچ۔ ۲ ساؤنڈنگ راکٹوں کو بھی داغا جائے گا۔ مرکز کے ان تمام لوگوں کو اعزازات سے بھی نوازا جائے گا جنھوں نے ۲۵ سال پورے کر لیے ہیں۔ ●

آئی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی۔ ثقافتی سیاحت کو بڑے پیمانہ پر فروغ دے گی

سرکار ثقافتی دائرہ کو سیاحتی مقامات کے گرد فروغ دینے کے لیے ایک پیکج پر کام کر رہی ہے۔ سیاحت کے فروغ سے متعلق کارپوریشن آئی ٹی ڈی سی کو ریاستوں کے مشورہ کے ساتھ ایک منصوبہ تشکیل دینے کے لیے کہا گیا ہے۔ غیر ملکی نیز مقامی سیاحوں کی تفریح کے لیے بہت جلد شام کے وقت انڈیا گیٹ کے آس پاس مستقل پروگرام شروع کیا جائے گا اس کی ابتدا ثقافتی میلوں سے ہوگی۔ دوسرے تفریحی مقامات پر بھی اس قسم کے ثقافتی میلے شروع کیے جائیں گے۔ ●

ملک میں سڑک ترقیات کے لیے سفارشات

یہاں حال ہی میں منعقدہ قومی سیمینار نے سفارش کی ہے کہ قومی شاہراہ تعمیر کے لیے زمین کا انتظام کرنے کی غرض سے ایک علاحدہ اتھارٹی قائم کی جائے گی۔ یہ اتھارٹی ناجائز قبضوں اور عدم توازن پیدا کرنے والے تعمیراتی کاموں پر بھی نگاہ رکھے گی۔ مذکورہ سیمینار کا اہتمام انڈین روڈز کانگریس نے کیا تھا اور اس میں مختلف مرکزی محکموں ریاستی حکومتوں، سرکاری دائرۂ کار کے اداروں نیز ٹھیکے داری سے متعلق ایجنسیوں کے مندوبین نے شرکت کی تھی۔

سڑک کی ترقی کو نقل وحمل کے دیگر ذرائع سے مربوط کیا جانا چاہیے اور دیہی اور شہری دونوں ہی علاقوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔ مندوبین نے اپنی سفارشات میں کہا تھا کہ موجودہ قومی شاہراہوں کی ترقی واصلاح کے ساتھ ساتھ ان شاہراہوں کی توسیع بھی ضروری ہے۔ حکومت نے جو پیمانہ شاہراہوں میں اضافے کا وضع کیا ہے اس پر سختی سے عمل کیا جائے۔ سیمینار کے تمام تمام متعلقہ افراد سے کہا گیا ہے کہ وہ ملک کی دیہاتی آبادی کی سماجی واقتصادی مشکلات کا حل نکالیں اور گاؤوں کو ہر موسم میں قابل استعمال سڑکوں کے ذریعہ سڑکوں سے جوڑا جانا چاہیے۔ تعمیراتی لاگت میں کفایت شعاری لانے کے لیے مقامی ساز وسامان کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ مندوبین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ توانائی کے تحفظ کے لیے اور آلودگی کی روک تھام کے لیے اقدامات کیے جائیں اور ذاتی نقل وحمل کے بجائے پبلک ٹرانسپورٹ کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ ●

دودھ کی پیداوار میں اضافہ

۹۶۔۱۹۹۵ء کے دوران اوسط روزانہ دودھ کی پیداوار ۱۰۹،۷ لاکھ لیٹر ہے جو ۹۵۔۱۹۹۴ء کے مقابلے میں سات فی صد زائد ہے۔ ۹۶۔۱۹۹۵ء کے دوران تقریباً سوا لاکھ لیٹر دودھ پیداوار کی روزانہ نشاندہی کی گئی۔ اس سے بھی چھ فی صد کا اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔

امداد باہمی کے ادارے ۷ شہری مراکز میں رقیق دودھ فراہم کر رہے ہیں۔ پروگرام کے تحت دودھ پروسیسنگ کی مجموعی صلاحیت ۱۹۲ لاکھ لیٹر روزانہ ہے۔ ﹏ پاؤڈر پیداوار کی صلاحیت ۹۹۰ میٹرک ٹن روزانہ ہے۔ علاقائی موسمیاتی عدم توازن کو کم کرنے کے لیے ۱۱۳۳ روڈ ملک ٹینکرس اور ۱۶۹ ریل ملک ٹینکر فراہم کرائے گئے ہیں تاکہ دور دراز تک دودھ کی سپلائی ہو سکے۔

دودھ کی پیداوار بڑھانے کے لیے مویشیوں کی صحت اور افزائش نسل کا پروگرام جاری ہے۔ مارچ ۱۹۹۶ء تک ۴۲۴۶۲ سوسائٹیاں مویشی صحت پروگرام کے تحت لائی جا چکی تھیں۔ ۲۷۴۸۴ سوسائٹیوں میں مویشیوں کی ابتدائی طبی امداد سہولت دستیاب تھی۔ ۱۶۷۹۷ گاؤوں کی سوسائٹیوں میں مصنوعی تخم ریزی سہولت دستیاب ہو گئی تھی۔ ●

قومی ریل میوزیم میں نئے اضافے

قومی ریل میوزیم میں کل تین نئے اضافے عمل میں آئے ہیں۔ ان میں ملٹی میڈیا، کھوکھا اودھ سے لائی گئی ایک سو سال پرانی ترازو جس کا استعمال پیج اور پارسل سامانوں کا وزن کرنے کے لیے کیا جاتا تھا اور ڈبلیو اے پی مرتی ریل انجن

کا ایک ماڈل جیسی اشیاء شامل ہیں۔

یہ اشیاء قومی ریل میوزیم کی سلور جوبلی تقریبات کے موقع پر منعقدہ خصوصی تقریب میں ریل میوزیم میں شامل کی گئی ہیں۔ ●

عوامی تقسیم کے نظام کے ذریعہ نومبر ۹۶ء میں ۲۰ لاکھ ۷ ہزار ٹن اناج کی فراہمی

حکومت نے ماہ نومبر ۱۹۹۶ء کے دوران "عوامی تقسیم کے نظام" (پی ڈی ایس) کے ذریعہ ۲۰ لاکھ ۷ ہزار ٹن اناج ریاستوں/مرکز کے زیرانتظام علاقوں کو تقسیم کرنے کے لیے مختص کیا ہے اس میں مرکزی پول کا ۱۲ لاکھ ۳۵ ہزار ٹن چاول اور ۸ لاکھ ۳۷ ہزار ٹن گیہوں شامل ہے۔ ان الاٹمنٹ میں نظرثانی شدہ عوامی تقسیم کے نظام (آر پی ڈی ایس) کے تحت آنے والے علاقوں میں سات لاکھ ۷۱ ہزار ٹن اناج کی متوقع ضرورت شامل ہے۔

ماہ اکتوبر ۱۹۹۶ء کے لیے ریاستوں/مرکز کے زیرانتظام علاقوں کے لیے چاول اور گیہوں کی بالترتیب فراہمی ۱۳ لاکھ ۱۶ ہزار ٹن اور ۸ لاکھ ۷۶ ہزار ٹن تھی۔ فراہمی کی اونچی سطح کو تہوار کا موسم ہونے کی وجہ سے برقرار رکھا گیا ہے حالاں کہ اس سے پہلے کے مہینہ میں چاول اور گیہوں کی مجموعی وصولیابی لگ بھگ ۱۶ ہزار ٹن ہی تھی۔ ●

بائیو پیٹینٹ کے مسائل پر سیمنار

حکومت ملک میں پیٹینٹ کے مسائل کے مزید حل تلاش کرنے پر توجہ مبذول کرے گی اور ٹریننگ پروگرام بھی شروع کرے گی۔ یہ فیصلہ بائیو ٹکنالوجی میں انٹیلیکچول پراپرٹی پر مشتمل روڈ شو سیمناروں کے بعد حال ہی میں کیا گیا ہے یہ سیمنار ہندوستانی سائنس دانوں اور ریسرچ کرنے والوں میں بائیو ٹکنالوجی کے شعبہ میں پیٹینٹنگ کا قانونی انتظام کرنے کے ... میں زیادہ بیداری پیدا کرنے کے لیے کیے گئے تاکہ ایجاد کنندگان اور قوم کو فائدہ پہنچ سکے۔ یہ بیداری اس حقیقت کے پیش نظر خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے کہ ہندوستان وسیع تولیدی حیاتیاتی تفریق کا ملک ہے جو بائیو ٹکنالوجی میں نئی راہیں نکالنے کا بنیادی وسیلہ ہے۔ اس سیمنار کو تجارت میں اس عالمی

مقابلہ آرائی کے نظام کے بعد مناسب سمجھا گیا جو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) کے قوانین کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے اور جنوری ۱۹۹۵ء سے مختلف ممالک نے نافذ کیا ہے۔

ہندوستان نے ڈبلیو ٹی او کے ذریعہ بنائے گئے قانون پر اپریل ۱۹۹۴ء ہی میں دستخط کر دیئے تھے جس سے ڈبلیو ٹی او کا حصہ بننے کی اس کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ اس قانون کے مطابق ٹکنالوجی کے کسی بھی شعبہ کی تمام ایجادات کو پیٹینٹ کرایا جا سکتا ہے اور حیاتیاتی اشکال کو بھی پیٹینٹ کرایا جا سکتا ہے۔ لیکن ڈبلیو ٹی او نے ملکوں کو اس امر کی رعایت دی ہے کہ وہ جانوروں کو پیٹینٹ کرانے کے دائرہ سے الگ رکھیں حالاں کہ انھیں یہ ہدایت کی ہے کہ مائیکرو آرگنزم کو پیٹینٹ کرانے کی ضرورت ہے اور مختلف گل بوٹوں کو بھی پیٹینٹ کرا کے یا سوئی جنرس طریقہ کے ذریعہ محفوظ کیا جائے۔ ہندوستان کی طرح کے ترقی پذیر ملکوں کے پاس یکم جنوری ۱۹۹۵ء سے مختلف اقسام کے پودوں کو پیٹینٹ کرانے کا قانون بنانے کے لیے ۵ سال کا عرصہ ہے اور دس سال کا عرصہ ہندوستان کے موجودہ پیٹینٹ ایکٹ مجریہ ۱۹۷۰ء میں ترمیم کرنے کے لیے ہے۔ ●

ہاسپٹل سروسز کنسل ٹینسی کارپوریشن نے منافع ادا کیا

ہاسپٹل سروسز کنسل ٹینسی کارپوریشن (انڈیا) لمٹیڈ (ایچ۔ ایس۔ سی۔ سی) نے ۹۶-۱۹۹۵ء کے لیے محکمۂ صحت . . . .

. . . .

. . . . . . کو ۲۰ فی صد منافع کا چیک پیش کیا۔ یہ منافع سال ۹۵-۱۹۹۴ء کے لیے ۷ا فی صد ادا کیا گیا تھا۔ ایچ۔ ایس۔ سی۔ سی میڈیکل اداروں کے لیے تعمیری ڈیزائن کی خدمات فراہم کرتا ہے۔ یہ کارپوریشن سرکاری اور پرائیویٹ شعبوں کے معاملات بھی دیکھتا ہے۔ سرکار کے دائرۂ کار کی صنعتوں میں سے ایک کامیاب صنعت ایچ۔ ایس۔ سی۔ سی ہے جو ۱۰ سال سے منافع ادا کر رہی ہے۔ ●

لگاتار نواں بھرپور مون سون

لگاتار نویں برس ملک میں نارمل مون سون رہا ہے۔ ۱۹۹۶ء کے سیزن یعنی جون تا ستمبر ۱۹۹۶ء کے دوران بارش ۱۰۲ فی صد طویل مدت اوسط ویلو رہی ہے۔ یہ بات بھارتی محکمۂ موسمیات نے اپنی طویل المدت پیش گوئی میں کہی ہے۔

جنوب مغربی مون سون ۳ جون ۱۹۹۶ء کو کیرالا پہنچا۔ یہ مون سون عام طور سے آنے والی مون سون کے مقابلے میں دو دن تاخیر سے پہنچا۔

تاہم گزشتہ برس کی طرح یہ مون سون شمال مشرقی ریاستوں میں ۳۱ مئی ۱۹۹۶ء کو ہی پہنچ گیا تھا۔ ۱۹۹۶ء کی مون سون کا ابتدائی دور دو منطقہ حاراتی طوفانوں سے مملو رہا۔ ایک سمندری طوفان خلیج بنگال میں آیا اور دوسرا بحر عرب میں آیا۔ مون سون نے ۳۰ جون ۱۹۹۶ء تک تمام ملک پر احاطہ کرلیا۔ یہ عام حالات کے مقابلے میں دو ہفتے قبل رہا۔ بہار اور اتر پردیش میں مون سون دو ہفتے تاخیر سے پہنچا۔ مون سون سیزن کے اختتام پر ۳۵ موسمیاتی سب ڈویژنوں میں سے ۳۲ سب ڈویژنوں میں نارمل سے لے کر زیادہ بارش ہوئی۔ تین سب ڈویژنوں میں بارش نسبتاً کم ہوئی۔ ●

ریلوے کے ذریعے حوالدار عبدالحمید کی بیوہ کی عزت افزائی

۱۹۶۵ء کی ہند۔ پاک جنگ میں بعد از مرگ بہادری کا سب سے بڑا ایوارڈ پرم ویر چکر حاصل کرنے والے حوالدار عبدالحمید کی بیوہ رسولن بی بی کو محکمۂ ریلوے نے ایک ساتھی کے ساتھ فرسٹ کلاس ایئرکنڈیشنڈ کمپلیمنٹری کارڈ پاس دے کر ان کی عزت افزائی کی ہے۔

ریلوے نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے اس ہیرو کے بیٹے جناب جنید عالم کو اتر ریلوے میں گروپ "سی" کی ملازمت دینے کا بھی حکم جاری کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس سلسلہ میں اتر ریلوے کے جنرل منیجر کو احکامات جاری کیے جا چکے ہیں۔ ●

خصوصی شمارہ یوم جمہوریہ ۹۷ء

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

فون : 6177591

معاون : رفیہ ریدی

تزئین وکتابت : افتخار احمد خان

سرورق : کے۔ کے۔ ورما

جلد : ۱۶ شمارہ : ۱۰

جنوری ۱۹۹۷ء (۱۱ پوش تا ۱۱ ماگھ شک ۱۹۱۷)

قیمت خصوصی شمارہ : ۱۰ روپے

زر سالانہ : ۵ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زر سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) ڈی۔ این۔ گاندھی

مضامین سے متعلق خط۔ کتابت کا پتا:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴ لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی۔۶۶

"یوجنا" منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

اس شمارے کے مختلف مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مصنفین کے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ خیالات ان اداروں، وزارتوں اور حکومت کے بھی ہوں جن سے وہ وابستہ ہیں۔



جلد ہی ہم اپنی آزادی کی پچاسویں سالگرہ منائیں گے۔ ہم ہندوستانیوں کے لیے یہ مسرت اور فخر سے بھرپور ایک مقدس تیار کرنے موقع ہے۔ یہ موقع اس کا بھی ہے کہ ہم ان لوگوں کو یاد کریں جنھوں نے ہماری آزادی کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے عمل میں اپنی جانیں قربان کر دیں اور بے شمار دیگر لوگ جنھوں نے اپنے اپنے انداز میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بے رحم جنگ چھیڑ کر تحریک آزادی میں حصہ لیا اور پھر ان سب کے علاوہ ایسے ان گنت لوگ بھی تھے جو خاموشی سے سب کچھ جھیلتے رہے، بطور خاص، مجاہدین آزادی کے خاندان جنھوں نے آزادی کی طویل جدوجہد کے دوران مصیبتیں اور دشواریاں جھیلیں۔ ممنون قوم کو لازم ہے کہ ان سب کو خراج عقیدت پیش کرے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی حاصل کرنا ایک زبردست کامیابی تھی، لیکن کامیابی کے ساتھ اس کی حفاظت کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے اور ہندوستان پچھلے پچاس برسوں کے دوران یہی کرتا بھی رہا ہے۔ ہمارے قومی رہنماؤں نے آزاد ہندوستان کے لیے ایجنڈا تیار کرتے وقت عام آدمی کی ضروریات پر زور دے کر زبردست دانائی اور دور اندیشی کا ثبوت دیا تھا۔ گاندھی جی نے "گرام سوراج" کے ذریعے بھوک اور غریبی کے خاتمے کو اولین ترجیح دی تھی۔ جواہر لال نہرو نے ایک مضبوط اور خوشحال بھارت کا تصور کیا تھا جسے سائنس اور تکنالوجی کی مدد سے آگے قدم بڑھانا تھا۔ ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر پسماندہ طبقوں کو اونچا اٹھائے جانے کو یقینی بنانے کے خواہاں تھے۔ تمام طرح کی آرا رکھنے والے ان قومی رہنماؤں نے ملک و قوم کی تعمیر کے اس کار عظیم میں اہم خدمات انجام دیں۔

سب سے، تمام میدانوں میں زبردست ترقی ہوئی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جسے پورے ملک میں چلنے والی ترقی و فروغ کی زبردست ہوائیں چھوئے بغیر گزر گئی ہوں۔ زراعت، آزاد ہندوستان کی معیشت میں شروع ہی سے خصوصی مقام رکھتی تھی اور اسے یہ مقام حاصل رہا۔ قحط کا بھوت جو قبل از آزادی ہندوستان کا بار بار تعاقب کرتا رہا، اُس وقت ماضی کا ایک برا سا خواب بن کر رہ گیا، جب سبز انقلاب کی کامیابی نے زرعی منظر نامے میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کی۔ آج ہم اناج کی پیداوار کے معاملے میں خود کفیل ہیں۔ عوامی تقسیم کے نظام (پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم) کے ایک مضبوط نیٹ ورک نے اس بات کو یقینی بنایا کہ اناج سب کو دستیاب رہے گا، خاص طور پر سماج کے کمزور طبقوں کو۔

آج ہماری مسلح افواج مادرِ وطن کے دفاع اور اس کے خلاف کسی بھی جارحیت کو کچل کر رکھ دینے کے لیے پوری طرح مضبوط ہیں۔ ہندوستانی فوجی کی ہمیشہ اس کی شجاعت اور دم خم کے لیے تعریف ہوئی ہے اور جدید ترین اسلحوں کی حصولیابی کے بعد، مسلح افواج کے تینوں حصے سخت مضبوط ہو چکے ہیں۔

گو کہ قابلِ فہم طور پر ہم نے بنیادی تعلیم کو عام کرنے پر خصوصی توجہ دی، لیکن اعلا تعلیم کے میدان میں بھی زبردست توسیع ہوئی ہے جس میں تکنیکی اور طبّی تعلیم شامل ہے۔ ہم نے سائنس اور تکنالوجی کے لیے بھی ایک بے حد مضبوط بنیاد فراہم کی ہے اور اس میدان میں ہونے والی جدید ترین ترقی اور تبدیلیوں سے ملک کو باخبر رکھنے کی پائدار کوششیں متواتر کی جا رہی ہیں۔ بہتر طبّی دیکھ ریکھ کے باعث، ہم آزادی کے بعد سے، متوقع انسانی عمر کے اوسط کو دوگنا کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔ بہرکیف، ہم اب بھی خراب صحت اور بیماریوں کے خلاف ایک بے رحم جنگ لڑنے میں مصروف ہیں۔

اپنی صنعتی بنیاد کو قابلِ قدر حد تک متنوع بنانے کے علاوہ ہم نے بنیادی اور سرمایہ کاری والی اشیا کی صنعتوں (کیپٹل گڈس انڈسٹریز) میں خاصی خودکفالت حاصل کی ہے۔ حال میں شروع کیے گئے اقتصادی کھلے پن کے پروگرام کا مقصد نہ صرف اپنی معیشت کو ڈھانچے والی اصلاحات کے ذریعے مہمیز دینا ہے بلکہ ہندوستان کو ایک عالمی کھلاڑی بنانے کے لیے بھی۔ نقل و حمل کے میدان میں بھی ہم نے اچھی خاصی کارکردگی دکھائی ہے۔ ہمارا ریلوے نظام دنیا کا سب سے بڑا اور خاصا مستعد نظام ہے۔

ہمارا شمار فلمیں بنانے والے چند بڑے ملکوں میں ہوتا ہے اور متعدد ملکوں میں ہماری فلموں کی زبردست مانگ ہے، خاص طور پر مغربی ایشیا اور افریقہ میں۔ اتنی زیادہ زبانوں اور بولیوں میں فلمیں اور کہیں نہیں بنتیں۔ کھیلوں کے میدان میں آزادی کے بعد کے دور میں ہم نے متعدد سرکردہ کھلاڑی پیدا کیے ہیں۔

ہم اپنی جمہوریت کی خلقی . . . طاقت پر بھی فخر کر سکتے ہیں۔ جب کہ لگ بھگ ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوئے کئی پڑوسی اور متعدد دیگر ترقی پذیر ممالک یا تو ڈکٹیٹر شپ یا فوجی حکومت کے تحت رہے ہیں، ہماری جمہوریت نہایت عمدہ اور موثر انداز سے چلتی رہی۔ عالمی امن کے تئیں ہماری خدمات کسی بھی طرح غیر اہم نہیں۔ اپنی ناوابستگی کی پالیسی کے ذریعے ہم سرد جنگ کے پیدا کردہ تناؤ کو کم کرنے میں اہم رول ادا کر سکے۔

لیکن ہمیں اب بھی میلوں کا سفر طے کرنا ہے۔ ابھی بہت سے مسائل سے نمٹنا ہے۔ ابھی ہمیں اپنی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کو مزید قابو میں لانا ہے جس کے باعث ہماری بہت سی کامیابیاں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ تخفیفِ غریبی اب بھی ہمارے سامنے ایک بڑے چیلنج کے روپ میں کھڑی ہے۔ صبحِ آزادی کو ہمارے قومی رہنماؤں نے جو خواب ہمارے ملک کے بارے میں دیکھے تھے، ہمیں ملک کو مضبوط اور خوشحال بنا کر ان خوابوں کو حقیقت میں بدلنا ہے ——— اور یہی ان بہادر مجاہدینِ آزادی کو ایک سچا خراجِ عقیدت ہوگا جنھوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے اپنا خون بہا دیا تھا۔

ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ سوامی ناتھن

ہندوستانی زراعت، گزشتہ اور آئندہ

صورتِ حال پر ایک نظر

آزاد ہندوستان کے لیے مہاتما گاندھی کی اولین ترجیح یہ تھی کہ عوام کو بھوک سے نجات دلائی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم زراعت کے شعبے میں ماحولیاتی سطح پر پائدار اور سماجی سطح پر منصفانہ سبز انقلاب کو فروغ دیں کیونکہ یہی وہ شعبہ ہے جو ملک کی ۷۰ فی صد آبادی کو روزی مہیا کرتا ہے۔

آزادی سے کچھ ہی دن قبل غیر منقسم ہندوستان نے اس صدی کے انتہائی سنگین قسم کے ایک قحط کو جھیلا تھا اور وہ تھا قحطِ بنگال۔ گاندھی جی نے نواکھالی میں تقریر کرتے ہوئے ۱۹۴۶ء میں کہا تھا "بھوکے شخص کے نزدیک روٹی ہی خدا ہوتی ہے"۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا "آزاد ہندوستان کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ ہر مرد اور ہر عورت اس لائق ہو جائے کہ وہ اپنی روزی خود حاصل کر سکے"۔ مہاتما گاندھی اس بات پر خاص زور دیتے تھے کہ "ہر شخص کو پورے انسانی وقار کے ساتھ خوراک مہیا کی جانی چاہیے"۔ وہ ایسی قوم کے قائل نہ تھے جو بھکاری بن کر رہ جائے یا جہاں خوراک مہیا کرنا خیرات یا فلاحی کام تصور کیا جائے۔ گویا انھوں نے ہمیں یہ درس دیا کہ ہم ایسا رویہ اختیار نہ کریں جس سے اندازہ ہو کہ ہم غریب یا بھوکے انسانوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ ہمارے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کے اس خیال پر بھرپور توجہ دی اور ۱۹۴۸ء میں یہ اعلان کیا کہ "کسی بھی شعبے میں کسی پیش رفت کا انتظار کیا جاسکتا ہے لیکن زراعت کے شعبے میں قطعی انتظار نہیں کیا جاسکتا"۔

> گاندھی جی نے کہا تھا "آزاد ہندوستان کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ ہر مرد اور ہر عورت اس لائق ہو جائے کہ وہ اپنی روزی۔۔۔ خود حاصل کر سکے"۔ مہاتما گاندھی اس بات پر خاص زور دیتے تھے کہ ہر شخص کو پورے انسانی وقار کے ساتھ خوراک مہیا کی جانی چاہیے"۔

ہم اب آزادی کے پچاسویں سال میں داخل ہو چکے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تقریباً ۲ کروڑ بچے، عورتیں اور مرد، معقول تغذیہ کے بغیر ہی رات بسر کریں گے۔

ہم نے بہرحال گزشتہ ۵۰ برسوں میں اتنی کامیابی ضرور حاصل کی ہے کہ قحط کی صورتِ حال نہیں پیدا ہوئی اور اس کے لیے ہم نے کثیر رخی حکمتِ عملی اپنائی جو ان عوامل پر مبنی تھی۔

(الف) غذائی پیداوار میں اضافہ کیا گیا۔
(ب) اناج کے ذخیرے قائم کیے گئے (ج) عوامی نظامِ تقسیم کی توسیع کی گئی (د) سماجی سطح پر تحفظ کے اقدامات کیے گئے۔ مثلاً دن میں غذائیت بخش کھانا مہیا کیا گیا اور روزگار کی ضمانت دی گئی اور (ہ) اصلاحاتِ اراضی اور دیہی آبادی کے لیے املاک مہیا کرنے کے انتظامات کیے گئے۔ مخصوص علاقوں یا حلقوں میں اب بھی جو بھوک کا ماحول باقی ہے وہ بطور خاص اس صورتِ حال کا نتیجہ ہے کہ مہارت پر مبنی روزگار کے شعبے میں مواقع ناکافی تھے جس کے باعث قوتِ خرید بھی ناکافی رہی۔

انیسویں صدی کے آخری حصے میں، جب کہ ہندوستان، بنگلہ دیش اور پاکستان کی مجموعی آبادی صرف ۲۹ کروڑ تھی، قحط سالی عام تھی۔ اس وقت صرف ہندوستان کی آبادی اس سے تین گنا زیادہ ہے۔ لہٰذا ہمیں حکومتِ ہند کی اس حکمتِ عملی کی ستائش

کرنا ہی پڑے گی جس کے تحت اس نے کامیابی سے قحط کی صورت حال سے محفوظ رکھا۔ اب وہ آگیا ہے کہ ایسے قطعی نوعیت کے اقدام کریں جو بھوک کے پورے طور پر خاتمے کے لیے لازمی ہیں۔ بھوک کو ختم کرنا، غریبی ختم کرنے کے مقابلے آسان ہے۔ غریب افراد اپنی یومیہ آمدنی کا بڑا حصہ خوراک پر صرف کرتا ہے لہٰذا بھوک کا خاتمہ، غریبی کے خاتمے کی جانب پہلا قدم ہے۔ ہر شخص کو کارآمد اور صحت مند زندگی کے لیے موقع مہیّا کرنے کا دارو مدار صحیح معنوں میں بھوک کے خاتمے سے متعلق ہماری کامیاب حکمت عملی پر ہے۔

خوراک سے متعلق ضمانت مہیّا کرنے کے لیے عالمی پیمانے پر اقدام

روئے زمین پر بچے، عورت اور مرد کو خوراک اور تغذیہ مہیا کرنے کے لیے عالمی برادری کے عہد کا اعادہ اس دہائی میں متعدد بین اقوامی کانفرنسوں میں کیا گیا۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

۱۹۹۰ء — نیویارک میں بچوں سے متعلق عالمی چوٹی کانفرنس۔

۱۹۹۲ء — تغذیہ سے متعلق بین اقوامی کانفرنس، روم۔

۱۹۹۲ء — ماحولیات اور ترقیات سے متعلق اقوام متحدہ کی کانفرنس ریوڈی جیرو

۱۹۹۳ء — انسانی حقوق سے متعلقہ عالمی کانفرنس ویانا۔

۱۹۹۴ء — آبادی اور ترقیات سے متعلق بین اقوامی کانفرنس۔ قاہرہ

۱۹۹۵ء — سماجی ترقی سے متعلق اقوام متحدہ کانفرنس۔ کوپن ہیگن۔

۱۹۹۵ء — خواتین کی چوتھی عالمی کانفرنس۔ بیجنگ

۱۹۹۶ء — چوٹی کانفرنس برائے خوراک۔ روم

لیکن "ہر ایک کو خوراک" مہیّا کرنے کے مقصد میں جلد از جلد کامیابی حاصل کرنے کے لیے اس اعلا سیاسی عزم کے باوجود اب بھی ۸۰ کروڑ انسان بھوک اور ناقص غذائیت کا شکار ہیں۔ صحت کے لیے مطلوبہ لازمی غذائیت کا فقدان بڑے پیمانے پر ایک درپردہ بھوک کا باعث بنتا ہے۔ مخصوص علاقوں یا طبقوں میں اس وقت بھوک کا باعث، مارکیٹ میں غذائی اشیاء کا فقدان نہیں بلکہ انفرادی اور گھریلو سطح پر ناکافی آمدنی بنتی ہے۔ غریبی اور غیر غذائی عوامل مثلاً ماحولیاتی خرابی، صفائی کے ناقص انتظامات اور پینے کے صاف پانی کی عدم دستیابی وغیرہ سماجی اور انفرادی سطح پر خوراک کے معاملے میں پیچیدگی کا باعث بنتے ہیں۔ اس طرح کی صورتِ حال میں مبتلا لوگوں کی اکثریت ایشیا میں بستی ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی کو مناسب مقدار میں غذائی اجناس پیدا کرنے کی، زمین کی کم ہوتی ہوئی صلاحیت بھی زبردست تشویش کا باعث بن رہی ہے۔ آنے والے وقتوں میں

زمین کے قدرتی نظام کے دباؤ، ماحولیاتی سطح پر زمین اور آبی وسائل کی بدتر ہوتی ہوئی صورت حال اور اچھے نتائج کی حامل زرعی تکنالوجی کو بنیاد فراہم کرنے کے گھٹتے ہوئے ذرائع پوری دنیا کی غذائی پیداوار میں سست روی لانے کا باعث ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے کرۂ ارض کی آبادی کا بوجھ برداشت کرنے کی صلاحیت پر سوالیہ نشان لگتا جارہا ہے۔

انسانی آبادی میں ہونے والا اضافہ (جو ترقی پذیر ممالک تک محدود ہے) نیز غذائی اشیا کے سلسلے میں بڑھتی ہوئی قوت خرید اور شہرکاری کا تیز رفتار عمل اس بات کا متقاضی ہوگا کہ شرح نمو میں اضافہ کیا جائے اور غذائی اشیاء کی پیداوار میں تنوع پیدا کیا جائے۔ اس طرح ایک طرف جہاں زراعت کے شعبے میں تنوع اور توسیع کی ضرورت پیش آئے گی وہیں دوسری طرف ماحولیاتی توازن، جو فصلوں اور جانوروں میں پیداواری صلاحیت بڑھانے کے لیے ضروری ہے، بربادی کا شکار ہے۔ یہ صورتِ حال ترقی پذیر ملکوں میں بطور خاص نمایاں ہے۔ اس صورت حال نے ان ماہرین کو خطرے کی گھنٹی بجانے پر مجبور کیا جنھیں زمین کی پیداواری صلاحیت کے تعلق سے فکر لاحق ہے۔ لیسٹر براؤن نے اس جملے پر اپنی بات ختم کی ہے کہ "زمین کے قدرتی نظام کے دباؤ، ماحولیاتی سطح پر زمین اور آبی وسائل کی بدتر ہوتی ہوئی صورتِ حال اور اچھے نتائج کی حامل زرعی تکنالوجی کو بنیاد فراہم کرنے کے گھٹتے ہوئے ذرائع پوری دنیا کی غذائی پیداوار میں سست روی لانے کا باعث بن رہے ہیں جس کی وجہ سے کرۂ ارض کی آبادی کا بوجھ برداشت کرنے کی صلاحیت پر سوالیہ نشان لگتا جارہا ہے۔ دنیا اکیسویں صدی کی جانب بڑھ رہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل کے لیے، زمین کی، معقول مقدار میں غذائی اشیار پیدا کرنے کی صلاحیت، حد سے زیادہ بڑھتے ہوئے ماحولیاتی مسائل کے باعث سنگین قسم کے خطرات سے دوچار ہو رہی ہے۔"

۱۹۹۸ء کا سال آبادی سے متعلق میلتھوز کے مقالے کے دوسو سالہ جشن کا سال ہوگا۔ آبادی کو خوراک مہیّا کرنے کے تعلق سے میلتھوز نے جن اندیشوں کا ذکر کیا تھا، ان سے تو ابھی تک انسانی آبادی کو سائنس اور تکنالوجی کے فروغ اور مناسب عوامی حکمت عملی کو بروئے کار لاکر بچایا جاسکا ہے۔ لیکن یہ بات اب بہرحال زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی جارہی ہے کہ اگر قومی اور عالمی پیمانے پر خصوصی کوششوں کے ذریعہ ماحولیاتی توازن کو نہ بچایا گیا، معیشت کو فروغ نہ دیا گیا، جنسی امتیاز کو ترک کرکے مساوات کو فروغ نہ دیا گیا اور اضافۂ آبادی پر قابو نہ

پایا گیا تو مبلتھوز کے اندیشے اگلی صدی میں بھی درست ثابت ہو سکتے ہیں۔ جہاں پر اقوام متحدہ کی تنظیم برائے خوراک اور زراعت (الیف۔ اے۔ او) نے ۱۹۹۶ء میں روم میں ۱۳ سے ۱۷ نومبر تک عالمی خوراک کے مسئلہ پر ایک چوٹی کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔

اس کانفرنس کے موقع پر عالمی پیمانے پر خوراک مہیا کرنے سے متعلق ایک اعلامیہ جاری کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ عالمی خوراک چوٹی کانفرنس کا لائحہ عمل بھی ترتیب دیا گیا تھا۔

اعلامیہ میں اس بات کا عہد کیا گیا ہے کہ ۲۰۱۵ء تک ہر حال میں ناقص تغذیہ کا شکار ہونے والے لوگوں کی موجودہ تعداد کو گھٹا کر نصف کی سطح پر لایا جائے گا۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

"ہم اعلیٰ اور نچلی سطح کے امکانات والے علاقوں میں خوراک، زراعت، ماہی گیری، شجر کاری اور دیہی ترقیات کے شعبوں میں شراکت داری پر مبنی اور پائیدار نوعیت کی پالیسیاں اور طریقۂ کار اختیار کریں گے کہ خوراک مہیا کرنے کے یہی لازمی اور معتبر شعبے ہیں"۔

"ہم اس بات کے لیے جدوجہد کریں گے کہ خوراک، زرعی تجارت اور مجموعی تجارت سے متعلق ایسی پالیسیاں وضع کرنے کو یقینی بنایا جا سکے جو صاف ستھرے اور مارکیٹ پر مبنی عالمی تجارتی نظام کے تحت ہر ایک کو خوراک مہیا کرنے کے لیے سازگار حالات پیدا کر سکیں"۔

لائحہ عمل میں مندرجہ ذیل سات باتوں کا عہد کیا گیا۔

(۱) ایسا سیاسی، سماجی اور معاشی ماحول پیدا کیا جائے جو ایسے بہترین حالات پیدا کر سکے جن کے تحت غریبی دور کرنے اور پائیدار نوعیت کا امن قائم کرنے میں مدد مل سکے۔

(۲) ایسی پالیسیاں نافذ کی جائیں جن کا مقصد غریبی اور نابرابری کو ختم کرنا اور طبعی اور اقتصادی سطح پر حالات کو سازگار بنانا ہو تاکہ معقول مقدار میں غذائیت سے پُر اور صاف ستھری غذا حاصل کی جا سکے اور اسے موثر طور پر استعمال بھی کیا جا سکے۔

(۳) اعلا اور نچلی سطح کے پیداواری علاقوں میں خوراک، زراعت، ماہی گیری، شجر کاری اور دیہی ترقیات کے شعبوں میں شراکت داری اور پائیداری پر مبنی پالیسیوں اور طریقۂ کار کو اپنایا جائے۔

(۴) اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ خوراک، زرعی تجارت نیز مجموعی تجارت سے متعلق ایسی پالیسیوں کو نافذ کیا جائے جو ہر ایک کو لازمی طور پر خوراک مہیا کرنے میں سازگار ثابت ہوں۔

(۵) قومی تباہی اور انسان کے پیدا کردہ ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہا جائے اور ان سے بچاؤ کے اقدام کیے جائیں۔

(۶) اعلا اور نچلے علاقوں میں انسانی وسائل، معقول غذائی اشیاء، زراعت، ماہی گیری، شجر کاری کے نظام اور دیہی ترقیات کے عمل کو فروغ دینے کے لیے مناسب سرمایہ مختص کیا جائے اور پرائیویٹ اور سرکاری سرمایہ کاری کو بروئے کار لایا جائے۔

(۷) عالمی برادری کے تعاون سے روم کے لائحہ عمل کو ہر سطح پر نافذ کیا جائے، اس کا جائزہ لیا جائے نیز کام کو لگاتار آگے بڑھایا جائے۔

مندرجہ بالا لائحہ عمل (الف) زرعی پیداواریت اور پیداوار کے شعبے میں پائیدار ترقی کے لیے مطلوبہ زمینی ساخت کے تحفظ

[illegible]

(ب) متعلقہ ٹکنالوجی کے ذریعہ پائیدار نوعیت کی پیداوار اور (ج) حق داری اور روزگار کے شعبے میں مناسب قومی اور بین اقوامی اقدام کے ذریعہ مساویانہ طور پر خوراک تک رسائی کے اصولوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے۔ جولائی ۱۹۹۶ء میں مدراس میں منعقدہ سائنس اکادمی کی چوٹی کانفرنس نے اس بات کی سفارش کی تھی کہ تمام ممالک ان تینوں سطح پر "قومی خوراک اور روزی کی ضمانت سے متعلق ایکٹ" کے ذریعہ اس سلسلے میں سرکاری پالیسی کا سہارا مہیا کریں تاکہ مندرجہ ذیل مقاصد میں کامیابی حاصل کی جا سکے۔

- ہر فرد کی طبعی، معاشی، سماجی اور ماحولیاتی سطح پر متوازن غذا تک رسائی ہو سکے۔ اس میں ضروری تغذیہ، پینے کا صاف پانی، صفائی کا انتظام، بہتر ماحولیاتی صورتِ حال، حفظانِ صحت کا بنیادی انتظام اور تعلیم وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح بہتر صحت اور کارآمد زندگی کے لیے بنیاد فراہم ہو سکتی ہے۔
- خوراک صحیح معنوں میں ایسی معقول اور ماحولیاتی اعتبار سے بہتر پیداوار کی ٹکنالوجی سے حاصل ہوتی ہے جو نہ صرف فصلوں، مویشی پالن، شجر کاری اور ہر طرح کے ماہی گیری کے قدرتی وسائل کی بنیادوں کا تحفظ کرتی ہے بلکہ اضافے کے امکانات بھی روشن کرتی ہے۔

غذائی اشیا کا استعمال اور تغذیہ کی اہمیت

مجموعی طور پر دستیاب فی کس ۵۰۱.۹ گرام اناج میں سے تخمیناً ۴۹۳ گرام اناج فی کس استعمال ہوا جو دستیاب اناج کا ۷۴.۶ فی صد

حصہ تھا۔ کچھ یہی صورت حال دالوں کے استعمال کی بھی رہی یعنی مجموعی مقدار میں دستیاب دالوں میں سے ۱۴٫۰۵ گرام دالیں فی کس استعمال ہوئیں جو ۸۷٫۵ فی صد حصے کے بقدر تھیں۔ مختلف آمدنی والے گروپوں میں ان اشیاء کا جو غیر مساویانہ استعمال ہوتا ہے وہ مجموعی استعمال کے تخمینہ میں دب کر رہ جاتا ہے۔ بہرحال غریبوں کے اخراجات کا ۸۰ فی صد حصہ غذائی اشیا کی نذر ہو جاتا ہے جیسا کہ حالیہ سروے سے اندازہ ہوا:۔

(۱) اناج کا فی کس صرفہ ان برسوں میں کم ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ توانائی کا فی کس استعمال ۲۲۰۰ کے۔کیل کیلوریز کی جگہ فی کس ۱۸۵۹ کے۔کیل ہو گیا ہے۔

(۲) ۴۷٫۷ فی صد گھرانوں میں کیلوری کی کمی ہے اس طرح ۱۹٫۸ فی صد گھرانے ایسے ہیں جن میں لوگوں کے جسم میں پروٹین کی کمی پائی جاتی ہے۔ ایسے گھرانوں کی تعداد ۱۹٫۵ فی صد ہے جہاں کیلوری اور پروٹین دونوں چیزوں کی کمی ہے۔

(۳) ایسے بچوں کی تعداد کیرالہ میں ۳۴ فی صد اور گجرات میں ۷٫۲ فی صد ہے جو ابھی اسکول جانے کی عمر کو بھی نہیں پہنچے مگر ان میں سے کچھ کی نمو کی رفتار تھوڑی سست اور کچھ کی بہت سست ہے۔

(۴) ۴۹٫۷ فی صد بالغ لوگوں کے باڈی ماس کی سطح ۱۸٫۵ سے کم ہے جس کا مطلب ہے کہ معاشرے میں توانائی کی سخت کمی پائی جا رہی ہے۔

(۵) حاملہ خواتین میں، ہیموگلوبن کی سطح سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ۸۷٫۵ حاملہ خواتین یا ماؤں کے جسم میں خون کی بہت کمی ہے۔

> اب جب کہ سبز انقلاب کی ... [illegible]

(۶) جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے کم و بیش ۳۰ فی صد ایسے ہیں جن کا وزن اتنا نہیں ہوتا جتنا کم سے کم پیدائش کے وقت ہونا چاہیے۔

(۷) ۱۶ کروڑ ۷۰ لاکھ افراد کے بارے میں یقین ہے کہ وہ آیوڈین کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کے خطرے سے دوچار ہیں اور ۵ کروڑ ۴۰ لاکھ افراد کو GOITRE ہے۔

(۸) وٹامن "اے" کی کمی کی وجہ سے اندھا پن بھی بہت بڑے پیمانے پر ہے۔

بھوک کے خاتمے کی طرف لمبا مارچ

غذائی سلامتی کے سلسلے میں اب تک جو کامیابیاں ملی ہیں اور سنگ میل طے کیے گئے ہیں ان کو دیکھ کر ملک کو اپنے بعض کارناموں پر فخر ہونا چاہیے مگر اب بھی لگتا ہے کہ میل کا آخری پتھر بہت دور ہے۔ اس کے لیے اب بھی ایک لانگ مارچ کی ضرورت ہے۔

> ہند کی آبادی میں ہر سال ۱٫۸ فی صد کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر یہی شرح اضافہ جاری رہی تو ۳۸ برس سے کم میں ہند کی آبادی اب سے دگنی ہو جائے گی۔

قوم کو بھوک سے نجات دلانے کی طرف جو لمبا راستہ طے کرنا ہے اس میں کئی رکاوٹیں کھڑی ہیں جن کو ایک ایک کر کے ہٹانا اور ان سے پار گزرنا ہوگا۔ ان رکاوٹوں میں اراضی و وسائل کا سمٹتے چلے جانا، مٹی کا کمزور ہوتے جانا۔ مٹی سے تغذیہ بخش عناصر کا دن بہ دن کم ہوتے جانا، پانی کا ناقص انتظام، زمینی پانی کا ناقابل برداشت استعمال، اناج کی پیداوار میں تسلسل کا فقدان، ناقص ماحولیات کے سبب کھانے پینے میں استعمال ہونے والی تغذیہ بخش چیزوں کا غیر موثر حیاتیاتی استعمال اور بڑھتی ہوئی آبادی شامل ہیں۔

AQUIFER کے ضرورت سے زیادہ استعمال یا استحصال کی وجہ سے مغربی بنگال کے دیہات میں ہزاروں کنوؤں کے اندر پانی، پانی کے اندر آرسینک نکلنے لگا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق وہاں ۲۰۰۰۰۰-۱ افراد آرسینک کے سبب پیدا ہونے والے جلدی امراض سے متاثر ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق دنیا میں پودوں کی دو کروڑ قسمیں ہیں جن میں سے ۵۰ ہزار ایسے پودے ہیں جن کو کھانے پینے کے تصرف میں لایا جا سکتا ہے مگر ہم لوگ ۲۰۰ سے زائد پودوں کو غذا کے طور پر استعمال نہیں کرتے مگر ہماری اشیائے خورد و نوش میں ۸۰ فی صد ایسی ہیں جو صرف آٹھ قسم کے پودوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ ہم لوگ آج اس پر بہت زیادہ زور دے رہے ہیں کہ انھیں چند پودوں کی نئی نئی قسمیں پیدا کریں جب کہ ہمیں چاہیے کہ استعمال سے باہر پودوں کو قابل استعمال بنا کر اپنی غذاؤں کی ٹوکری میں وسعت لائیں۔

بہت سے ایسے تغذیہ بخش غلے ہیں جن کو ردی سوکھے اناج کے خانے میں رکھا جاتا ہے جب کہ اب ہمیں چاہیے کہ انھیں تغذیہ بخش اناج کہنا شروع کر دیں کیوں کہ ان میں A، اور FF جیسے تغذیہ بخش عناصر پائے جاتے ہیں۔

خاموش بھوک کے چیلنج کا مقابلہ

انسانوں کی زندگی اور طاقت کا دار و مدار بعض خاص قسم کے وٹامن اور

امنرلز پر ہوتا ہے جو دماغ، امیون سسٹم، تولید اور توانائی بخشنے والے نظام کی موثر کارکردگی میں معاون ہوتے ہیں۔ جسم کو ان تغذیہ بخش اشیار کی ضرورت بہت کم مقدار میں ہوتی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ ان کو جسم یکجا نہیں کرسکتا۔ ان کو خوراک کے ذریعہ مہیا کیا جانا چاہیے۔ جسم کو جو اشیار بہت کم مقدار میں درکار ہیں اگر مطلوبہ مقدار سے بھی کم ملیں تو ان سے کسی چیز کو جاننے یا علم حاصل کرنے میں معذوری پیدا ہوتی ہے، کام کرنے کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے اور انسان پہلے بیمار پڑتا ہے اور پھر مرجاتا ہے۔۔۔۔۔ کم مقدار میں تغذیہ بخش اشیار کے عدم فراہمی کو ہی "خاموش بھوک" کہتے ہیں۔ یہ اسکول جانے سے پہلے کی عمر میں بچوں کے لیے اور حاملہ خواتین کے لیے تو خیر سے نقصاں دہ ہے ہی، بلکہ ہر عمر کے لوگوں کو معذور بنا سکتی ہے، جس سے قومی معیشت بھی کمزور ہوتی ہے۔ کم مقدار میں جو تغذیہ بخش بہت ضروری ہیں ان میں وٹامن "اے" آیوڈین اور آئرن (لوہا) ہیں۔ حقیقی معنوں میں ان کم مقدار میں مگر لازمی تغذیہ بخش اشیار کی کمی ہر ترقی پذیر ملک کا مسئلہ ہے اور اتنا بڑا کہ اسے صحت عامہ کا مسئلہ سمجھا جانا چاہیے۔ بعض ترقی پذیر ملکوں میں ایک سے زیادہ کمیاں ہیں (گوشوارہ نمبر ۳)۔

ان تمام کم مقدار میں درکار تغذیہ بخش اشیار کی کمی کو ایک ساتھ رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پروٹین یعنی توانائی والی تغذیہ کی کمی سے جتنے لوگ متاثر ہیں اس سے زیادہ تعداد ان کی ہے۔ پوری دنیا میں ایک ارب ۶۰ کروڑ افراد ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں کی زمین میں آیوڈین خاطر خواہ مقدار میں نہیں پایا جاتا۔ ۶۵ کروڑ ۵۰ لاکھ افراد GOITRE سے متاثر ہیں۔ ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ افراد کا دماغ خراب ہے اور ۵۷ لاکھ افراد CRETINISM سے متاثر ہیں۔ اسکول جانے سے پہلے کی عمر میں دو ملین ایسے بچے ہیں جو آئرن کی کمی کے سبب خون کی کمی میں مبتلا ہیں۔ اسکول سے پہلے کی عمر میں ۲۵ کروڑ ۴۰ لاکھ بچے کہیں کم کہیں زیادہ وٹامن "اے" کی کمی کے شکار ہیں۔

ہندوستان میں ۱۶۷ ملین افراد آیوڈین کی کمی سے متاثر ہیں جن میں ۵ کروڑ ۴۰ لاکھ افراد کو گھینگھا یا غوطر (GOITRE) ہے۔

ڈائرکٹوریٹ جنرل ہیلتھ سروسز کے جائزوں سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۶۔ اضلاع آیوڈین کی کمی (آئی۔ ڈی۔ ڈی) سے متاثر اضلاع ہیں جہاں غوطر کی شرح دس فی صد ہے۔ خون کی کمی سے متعلق کئی مراکز پر آئی۔ سی۔ ایم۔ آر نے جو مطالعہ کروایا ہے اس سے انکشاف ہوا ہے کہ ۸۷/۵ فی صد لوگ خون کی کمی کے شکار ہیں۔ یہ بہت دنوں سے سب کو معلوم ہے کہ وٹامن "اے" کی کمی اندھے پن کے قابل تدارک اسباب میں سے ایک ہے۔

مختصر مقدار میں درکار تغذیہ بخش اشیا کی کمی دور کرنے کے لیے جو طریقے اپنائے جاسکتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

- مخدوش آبادی کے لیے خوراک کی فراہمی میں مدد۔
- خوراک میں بہتری
- عام غذائی اجناس کا زیادہ استعمال کم مقدار میں درکار تغذیہ بخش اشیا کا سب سے مالا مال وسیلہ سبز پتے دار سبزیاں اور پھل ہیں۔

ہندوستان میں سبزیوں کی فصل خوب خوب ہوتی ہے جن میں سے کچھ میں کیروٹین خاصے اچھی مقدار میں ہوتی ہے۔ زرعی پیداوار کے سلسلہ میں آئندہ جو بھی پروگرام بنائے جائیں ان میں اس کا خاص دھیان رکھا جائے کہ ایسے پودوں اور ان کی قسموں کو زیادہ بڑھاوا دیا جائے گا جن میں کم مقدار میں درکار تغذیہ بخش عناصر زیادہ ہوں۔ عام آدمی یہ تو جان سکتا ہے کہ اسے بھوک لگی ہے مگر اس کا اسے پتا نہیں چلتا کہ یہ بھوک کس چیز کی ہے۔ وٹامن "اے"، کی آئرن کی، آیوڈین کی یا کسی اور ایسے تغذیہ بخش عنصر کی جو کم مقدار ہی میں جسم کو درکار ہے۔

اول تو عام آدمی کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسے ان چیزوں کی ضرورت ہے اور اگر معلوم ہو بھی جائے تو وہ یہ نہیں جانتا کہ کن غذاؤں سے یہ کمی پوری ہوگی۔

مٹی کے اندر سے جو تغذیہ بخش عناصر حاصل ہوتے ہیں ان کی کمی کا اندازہ کسی زمین میں اُگی ہوئی فصل کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ تمام ترقی پذیر ملکوں میں تمام زمینوں کا آدھا حصہ ایسا ہے جس میں دستیاب کم مقدار میں درکار تغذیہ بخش اشیا کم ملتی ہیں۔ بہت شدید اور اندھا دھند آبپاشی کی وجہ سے اور زیادہ تیز کیمیائی کھادوں کے بہت زیادہ استعمال کی وجہ سے زمین میں تغذیہ کی خاصیت کم ہوجاتی ہے۔ ان زمینوں پر اُگی ہوئی فصل میں اس کمی کی جھلکیاں صاف دیکھی جاسکتی ہیں۔

اس لیے قومی سطح پر زمین کی دیکھ بھال سے متعلق پروگرام میں ہمیں اس پر بھی توجہ دینی ہوگی کہ زمین کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تغذیہ کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔

زراعت بھی سدا بہار انقلاب کی طرف

۱۹۶۸ء میں امریکہ کے ڈاکٹر ولیم گیڈ نے "سبز انقلاب" کی اصطلاح وضع کی تھی اس وقت ہمارے کسانوں نے گیہوں کی نئی قسمیں بڑے جوش و خروش سے اُگا کر گیہوں کی پیداوار میں لمبی جست لگائی تھی اور دھان کی کاشت میں بھی ایسا ہی تجربہ کامیاب ہوتا نظر آیا تھا۔ پنجاب میں ایک طرف تو پنجاب زرعی یونیورسٹی سے سائنسی اور تعلیمی سہارے کی وجہ سے اور دوسرے طرف دیہی برق کاری، دیہی مواصلات، زمین

عالمی سطح پر ماحولیات کے بیشتر مسائل کے لیے صنعتی ترقی یافتہ ممالک ذمہ دار ہیں۔ ماحولیات میں جو تبدیلیاں آرہی ہیں ان میں درجۂ حرارت میں امکانی تبدیلیاں، بخارات کی گیسیں، سمندر کی سطح میں تبدیلی اور الٹرا وایولٹ "بی" تابکاری شامل ہیں۔

کی بھوا اور ان سے زیادہ کھیتوں پر مالک کی اپنی موجودگی کے ذریعہ کاشت کی وجہ سے ترقی کے لیے درکار بیشتر ضروری اشیا کی موجودگی کے سبب سبز انقلاب میں اس ریاست کو سب پر سبقت لے جانے کا موقع مل گیا۔ اب جب کہ "سبز انقلاب" کی اصطلاح وضع ہوئے ۲۸ سال گزر چکے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم لوگ اب تک کا گوشوارہ تیار کریں اور آئندہ کے لیے اپنی حکمت عملی وضع کریں۔

سبز انقلاب کے فوائد دیکھے جائیں تو پتا چلے گا کہ ہندوستان کو ایسے ملک کی حیثیت سے نہیں پہچانا جاتا جو کاسۂ گدائی لیے پھرتا ہو۔ اس کے علاوہ زیادہ فصل دینے والی قسم کے پودوں کی وجہ سے پیداوار میں جو اضافہ ہے اس نے جنگلوں اور زمین کو بھی محفوظ کر لیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہمارا ملک آزاد ہوا تھا اس وقت ہمارے کسانوں نے ۵۰ لاکھ ٹن گیہوں پیدا کیا تھا جب کہ اس سال یعنی ۱۹۹۶ء میں ہمارے کسانوں نے ۶ کروڑ ٹن گیہوں پیدا کیا ہے۔ پنجاب کے کسانوں نے فی ہیکٹیر اوسطاً ۳۸ کوئنٹل سے زائد گیہوں کی کاشت کی ہے۔ اس طرح تمل ناڈو میں چاول کی فی ہیکٹیر اوسط پیداوار ۵۰ کوئنٹل سے زائد ہوئی ہے۔ اگر گیہوں اور دھان کی کاشت میں سبز انقلاب کی وجہ سے فصل نہیں بڑھتی تو آج ہم جتنی فصل کاٹتے ہیں اتنی فصل کے لیے ہمیں مزید ۶ کروڑ ہیکٹیر زمین فصل اُگانے کے لیے درکار ہوتی۔ اس طرح سبز انقلاب سے وابستہ پیداواریت میں اضافے کو بہترین لفظوں میں جنگلات و زمین بچانے والی زراعت کہہ سکتے ہیں۔ پیداواریت میں اضافہ صرف گیہوں اور دھان کی فصلوں تک محدود نہیں رہا بلکہ دودھ اور انڈوں کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا۔ ہم اب صرف دالوں کی پیداوار میں دوسروں سے پیچھے ہیں۔ (گوشوارہ نمبر ۱۔ اور ۲)

ہند کی آبادی میں ہر سال ۱.۸ فی صد کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر یہی شرح اضافہ جاری رہی تو ۴۰ برس سے کم میں ہند کی آبادی اب سے دوگنی ہو جائے گی۔ صرف کیرالا، تمل ناڈو گوا اور میزورم ایسی ریاستیں ہیں جہاں پیدائش اور موت کی شرحیں کم کرنے میں کامیابی ملی ہے۔ ایک طرف تو آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے دوسری طرف غریبوں کی قوت خرید بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے غذا کی مانگ بڑھے گی کیونکہ کم تغذیہ اور غریبی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کے برعکس قابل کاشت زمین کی فی کس دستیابی کم ہو رہی ہے۔ مجموعی طور پر پانی کا موثر استعمال اب بھی پوری طرح نہیں ہوتا جس کی وجہ سے آبی تنازعات بڑھ رہے ہیں اور اس کے ساتھ پانی اور زمین کی فی کس دستیابی دھیرے دھیرے کم ہو رہی ہے۔ پیداوار اور کٹائی کے بعد کی تکنالوجی میں آج بھی مطابقت نہیں ہے۔ خراب ہو جانے والی اشیا جیسے کہ پھلوں، سبزیوں، گوشت اور دیگر مصنوعات کے سلسلے میں یہ عدم مطابقت اور بھی سنگین ہے جس کی وجہ سے کاشتکاروں اور صارفین دونوں کے مفادات کو نقصان پہنچتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ملکی ماہرین اکثر یہ کہتے رہتے ہیں کہ ہندوستان میں "سبز انقلاب" پر تھکان طاری ہو جائے گی۔ گزشتہ سال لیسٹر براؤن اور ہال کانے کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ان کی ایک کتاب "فل ہاؤس" کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے جس میں مولفوں نے قیاس آرائی کی ہے کہ اگر آبادی میں اضافے کی یہی شرح رہی اور ایک طرف ماحولیات کمزور ہوتی رہی اور اس کے برعکس دوسری طرف غریبوں کی قوت خرید میں اضافہ ہوتا رہا تو ۲۰۳۰ء تک ہندوستان کو بیرونی ملکوں سے ہر سال ۴۵ کروڑ ٹن غلہ درآمد کرنا ہوگا۔ خیال رہے کہ ۱۹۶۶ء میں یعنی سبز انقلاب سے قبل ہم غیر ممالک سے جتنا غلہ درآمد کرتے تھے ۴۵ کروڑ ٹن اس کا چار گنا ہوگا۔ ہمیں چاہیے کہ اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کریں اور زرعی سیکٹر میں کسی طرح کی کوتاہی سے کام نہ لیں اور یہ سوچ کر مطمئن نہ بیٹھ جائیں کہ حکومت کے پاس ۳ کروڑ ٹن اناج کا لیفٹ اسٹاک موجود ہے۔

> [illegible] تشویشناک اعداد و شمار جاری کر کے بتایا ہے کہ [illegible] کا زیادہ تر شکار [illegible] ہو رہے ہیں۔

عالمی سطح پر ماحولیات کے بیشتر مسائل کے لیے صنعتی ترقی یافتہ ممالک ذمہ دار ہیں۔ ماحولیات میں جو ابتری آ رہی ہے ان میں درجۂ حرارت میں امکانی تبدیلیاں، بخارات کی کثافت، سمندر کی سطح میں تبدیلی اور الٹرا وائلٹ "بی" تابکاری شامل ہیں۔ صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ دیگر ملکوں میں زراعت اور بڑھانے سے ماحولیات میں تباہی آئے گی اور اس کے برعکس اگر ترقی پذیر ملکوں میں زراعت بڑھائی نہ گئی اس میں مزید تنوع نہ پیدا کیا گیا تو یہ عمل سماجی اعتبار سے تباہی خیز ہوگا کیوں کہ ان تمام ملکوں میں روزگار کے بیشتر مواقع کھیتی باڑی سے ہی نکلتے ہیں۔ کاشت کاری اور مویشی پالنا، جنگل بانی اور زرعی جنگل بانی، ماہی پروری اور زرعی صنعتوں سے ہمارے ملک کی آبادی کے ۷۰ فی صد حصے کو روزی روٹی ملتی ہے۔

فارم جتنا چھوٹا ہوگا اس کی آمدنی بڑھانے کے لیے قابل فروخت پیداوار بڑھانے کی ضرورت اتنی ہی شدید ہوگی۔ ہندوستان میں ہر سال روزگار کے ایک کروڑ دس لاکھ نئے مواقع نکالنے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ یہ مواقع زیادہ تر زراعت یا دیہی صنعت کے زمروں میں ہی نکلیں گے۔

اناج اور دیگر زرعی اشیا درآمد کرنے کا مقصد ہوگا بے روزگاری درآمد کرنا۔

اس لیے ہمیں آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ماحولیاتی اعتبار سے لائق برداشت اور سماجی اعتبار سے مساویانہ سبز انقلاب یا جسے ہم زیادہ بہتر لفظوں میں سدا بہار انقلاب کہہ سکتے ہیں۔

جو لوگ کاشت کاری کے پرانے طریقوں کو رائج کرنے کی وکالت کرتے ہیں وہ اس بات کو بھول رہے ہیں کہ اب سے صرف ایک صدی قبل جب غیر منقسم ہندوستان کی مجموعی آبادی ۲۸ کروڑ دس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۰۰ء کے درمیان ۳۰ برسوں میں قحطوں سے جو تین کروڑ افراد لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ درج ذیل اقدام پر مشتمل انسداد قحط حکمت عملی آزاد ہندوستان کا شاید سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

(الف) پیداوار اور پیداواریت میں اضافہ۔

(ب) عوامی نظام تقسیم کے ذریعہ بہتر تقسیم۔

(ج) اناج کے خاطر خواہ ذخائر۔

(د) روزگار کے نئے مواقع نکالنے اور گارنٹی اسکیموں کے ذریعہ قوت خرید میں اضافہ اور

(ہ) بچوں، حاملہ خواتین، زچوں اور بوڑھوں اور جسمانی لحاظ سے معذور افراد کو بہتر خوراک مہیا کرنے کے پروگرام۔

قحط کی روک تھام تو کر لی گئی مگر معاشی لحاظ سے کمزور اور کم مراعات یافتہ طبقوں میں تغذیہ کی کمی عام ہے چوں کہ کسی فرد کی سطح پر لائق برداشت غذائی سلامتی میں غذا کے علاوہ بھی لعض چیزیں جیسے کہ صحت کی دیکھ بھال، ماحولیاتی حفظان صحت اور خواندگی بہت اہم رول ادا کرتے ہیں اس لیے غذائی سلامتی کی از سر نو تعریف کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

لائق برداشت غذائی سلامتی کے حصول کے اقدامات

اول تو غذا تک مسلسل رسائی یقینی بنانے کے لیے ضروری ہوگا کہ اس وقت کیمیکل اور مشینوں کے ذریعہ کاشت کا جو طریقہ اپنایا گیا ہے اسے ترک کر کے ماحولیاتی تکنالوجی اپنائی جائے۔

دوئم معاشی رسائی پر زور سے اس ضرورت پر بھی اصرار ہوتا ہے کہ ایک سے زائد طریقوں سے آمدنی کے موقعوں کے ذریعہ لائق برداشت روزگار کے وسائل کو فروغ دیا جائے۔

سوم ماحولیاتی رسائی کے لیے ایک طرف مٹی کی صحت کی طرف توجہ دی جائے، پانی کو بے مصرف ضائع ہونے سے بچایا جائے، جنگلات اور حیاتیاتی تنوع کی حفاظت کی جائے اور دوسری طرف صفائی، ماحولیاتی حفظان صحت، بنیادی صحت، دیکھ بھال اور ابتدائی تعلیم پر توجہ دی جائے۔

اگر اس مشن کو تکمیل تک پہنچانے کی سیاسی بصیرت اور سیاسی عزم کو پختگی مل رہی ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آبادی میں اندھا دھند اضافہ ختم جائے۔

۱۷۹۵ء میں مارگنس ڈے کندورس (MARGINS DE CONDORCET) نے پیش گوئی کی تھی کہ آبادی میں اضافہ اسی وقت قابو میں آئے گا جب بچے صرف وجود کے لیے نہیں بلکہ خوشی کے لیے پیدا کیے جائیں گے اور ایسی صورت میں یہ پیش قیاسی درست ثابت ہوگی۔

چوں کہ کسی گھرانے میں سارے لوگ ایک طرح کے نہیں ہوتے اس لیے افراد پر توجہ دینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر مردوں اور لڑکوں کے مقابلہ میں خواتین اور بچیاں نقص تغذیہ کا زیادہ شکار ہوتی ہیں۔ ۱۹۹۵ء کی ترقی انسانی رپورٹ میں اقوام متحدہ ترقیاتی پروگرام (یو۔ این۔ ڈی۔ پی) نے بڑے تشویشناک اعداد و شمار جاری کر کے بتایا ہے کہ غریبی کی مشکلوں کا زیادہ تر شکار عورتیں اور لڑکیاں ہوتی ہیں۔

غذائی سلامتی کے ایسے کسی تصور کو زیر عمل لانے کے لیے ہمیں چاہیے کہ "بھوک سے پاک علاقہ پروگرام" شروع کریں جو درج ذیل تجویزوں پر مشتمل ہو۔

(الف) خدمات اور عوامی پالیسیوں کے مناسب مجموعہ اقدامات کے سہارے ماحولیاتی تکنالوجی کے فروغ اور توسیع کے ذریعہ غذائی پیداوار کو آبادی میں اضافہ پر ہمیشہ غالب رکھ کے اسے یقین بنایا جائے کہ اناج ہر حال میں ہر کسی کو مسلسل ملتا رہے گا۔ ماحولیاتی تکنالوجی میں ماضی کی ماحولیاتی روایت اور تکنالوجیوں کو بہترین اور جدید ترین تکنالوجیوں خاص کر حیاتیاتی تکنالوجی، اطلاعاتی تکنالوجی، خلائی تکنالوجی، قابل تجدید

بھوک کے خلاف جنگ میں لگے ہوئے نوجوانوں میں سے بیشتر کا تعلق ایسے کھیت مزدوروں کے خاندانوں سے ہوگا جن کے پاس اپنی زمین نہیں ہیں۔ اس گروپ میں پنچایتوں اور نگر پالیکاؤں کے منتخب اراکین بھی شامل ہوں گے اور وہ منتخب باڈیوں اور عوام کے درمیان رابطہ کا فریضہ نبھائیں گے۔

توانائی تکنالوجی اور انتظامی تکنالوجی میں ملا لیا جائے۔ جب تک ماحولیاتی تکنالوجی کو طاقتور نہیں بنایا جائے گا تب تک کھیتوں پر کام کرنے والی عورتیں اور مرد کم زمین پر پانی اور توانائی کے کم استعمال سے ماحولیاتی اعتبار سے لائق برداشت بنیاد پر زیادہ اناج اور دیگر زرعی پیداوار اگانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

(ب) فصل اور جانوروں کی پیداوار بڑھانے میں مسلسل پیش قدمی کے لیے جو ماحولیاتی بنیادیں ضروری ہیں ان کو محفوظ رکھنے کے ساتھ بڑھاتے رہنے کے لیے قدرتی وسائل کی پیداواریت برقرار رکھی جائے۔

(ج) اثاثہ جات اور روزگار کا اندازہ

قائم کرنے اور تنظیمی صلاحیت و قوت فروخت بڑھانے جیسی ترقی اور سماجی سلامتی کی تدبیروں کے ذریعہ اسے یقین بنایا جائے کہ کسی بھی گھرانے کی آمدنی خاطر خواہ ہو۔ زرعی پروگرام اس طرح وضع کیے جائیں کہ ان میں بیک وقت تینوں طرف یعنی زیادہ غذا، زیادہ روزگار اور زیادہ آمدنی پر توجہ مرکوز رہے۔ زرعی اور غیر زرعی روزگار اور بنیادی زرعی پیداواروں پر افزونی قیمت کی طرف مربوط توجہ آمدنی بڑھانے اور دیہی روزی روٹی کی سلامتی یقینی بنانے کے لیے ضروری ہوگی۔

(د) مخدوش گروپوں کو تحفظاتی سماجی سلامتی تدبیروں جیسے کہ ضمانت روزگار اور تغذیہ کے لیے غذائی پروگرام کے ذریعہ غذا فراہم کرنا یقینی بنایا جائے۔

(ہ) قومی غذا اور روزگار سلامتی قانون بنا کر درج ذیل امور پر مربوط توجہ دی جائے۔

(۱) زمین، پانی، جنگلات اور حیاتیاتی تنوع کا تحفظ اور اس کے ساتھ فضائی حفاظت۔

(۲) ماحولیاتی تکنالوجی کے ذریعہ پیداوار میں اضافہ۔

(۳) فصل ناکام ہونے کی صورت میں فاقہ کشی کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے نظام تقسیم میں بہتری۔

(۴) غذا کے خاطر خواہ ذخیرہ کی دیکھ بھال۔

(۵) فصل کٹائی کے بعد بہتر تکنالوجی کے استعمال کے لیے تکنیکی بنیادی ڈھانچے کا استحکام اور صفائی تدبیروں کی توسیع۔

(۶) ایک طرف اسے یقینی بنانے کے لیے بین اقوامی تجارت میں جو نئے مواقع سامنے آرہے ہیں ان کا بھرپور استعمال کیا جائے اور دوسری طرف اسے یقینی بنایا جائے کہ عوامی اشیا کو خاطر خواہ سہارا دینے کے لیے تحقیق و توسیع کا دائرہ بڑھایا جائے اور ان دونوں کاموں کے لیے موثر تحقیق، تعلیم، توسیع اور مارکیٹنگ نظام۔

ہندستان کو بھوک سے پاک کرنے کی کوشش

۱۷ جولائی ۱۹۹۶ء کو تمل ناڈو کے وزیر اعلیٰ نے اپنی بجٹ تقریر میں کہا ہے کہ

"ان لوگوں کو غذا مہیا کرو جو بھوکے ہیں اور عوام کو تعلیم دو تاکہ دنیا ترقی کر سکے۔"

مہاکوی بھارتیار کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے یہ حکومت ایک نیا بھوک سے پاک علاقہ پروگرام شروع کرنے جا رہی ہے جس کا مقصد غریبی کی وجہ سے فاقہ کشی کو ختم کرنا ہے۔ غریبی کو ختم کرنے اور آبادی کے مختلف گروپوں کو غذائی ضرورت پوری کرنے کے لیے متعدد اسکیمیں پہلے ہی سے چل رہی ہیں مگر ان اسکیموں میں جن لوگوں اور طبقات کا احاطہ کیا گیا ہے ان میں کہیں کوئی چھوٹ گیا ہو تو اس کو بھی فیض پہنچانے کے لیے یہ "بھوک سے پاک علاقہ پروگرام" شروع کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ سوامی ناتھن کے اشتراک و تعاون سے اس پروگرام کو نافذ کرنے کی تفصیلی حکمت عملی تیار کرنے کے لیے بجٹ میں گنجائش رکھی گئی ہے۔

ایم۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ ایف۔ میں مطالعوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ متعدد افقی ساخت کے پروگراموں میں عمودی جہت شامل کرکے اور فاقہ و محرومی ختم کرنے کی کوششوں سے وابستہ تمام متعلقہ افراد کے اتحاد کو فروغ دے کر اب یہ ممکن ہے کہ ہر کسی کے لیے صحت مند اور تعمیری زندگی کے مواقع فراہم کیے جا سکیں۔

بھوک سے پاک علاقہ پروگرام (HFAP) کیسے بنایا جائے

کسی بھی فرد کی غذا اور غذائیت کے مسئلہ کو تین جہتوں میں دیکھا ہوگا۔ اوّل تو یہ کہ قوت خرید اگر خاطر خواہ نہیں ہو تو جسم کو ضرورت بھر کیلوری اور پروٹین نہیں ملتا۔ دوم مختصر مقدار میں جسم کو درکار تغذیہ بخش اشیا خاطر خواہ مقدار میں نہ ملنے سے متعدد تغذیائی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر وٹامن "اے" کی کمی سے آنکھوں کی روشنی جاتی رہتی ہے۔ اس طرح کے مسئلے کو "مخفی بھوک" کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس سے آج دنیا کے دو بلین افراد متاثر ہیں۔

سوم ماحولیاتی حفظان صحت اور صفائی کے فقدان سے آنتوں کی بیماری اور اسہال جیسی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں جن کے سبب جو غذا پیٹ میں جائے وہ جسم کو نہیں لگتی۔ اس لیے کسی فرد کی تغذیہ سلامتی کا تعین کرنے میں غذائی اور غیر غذائی دونوں قسم کے عناصر اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ بھوک سے پاک علاقہ پروگرام میں ان تینوں سطحوں پر ایک ساتھ کارروائی ضروری ہے۔ اس عمل میں جو متعدد اقدامات کیے جا سکتے ہیں ان کا بیان نیچے درج ہے۔

پہلا قدم

کم غذائیت یا نقص تغذیہ کے بنیادی اسباب کی نشاندہی۔

دوسرا قدم

بھوک کے مسلسل خاتمے کے لیے دستیاب پروگراموں اور مواقع کے بارے میں اطلاعات کا حصول۔

تیسرا قدم

بھوک کا خاتمہ کرنے کی کوشش میں "گم شدہ عنصر" فراہم کرنے کے اقدامات کا تعین۔

چوتھا قدم

نویں پنج سالہ منصوبے کے خاتمہ تک کسی بھی سال فصل ناکام ہونے کی وجہ سے فاقہ کشی کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے مقامی سطح پر احتیاطی کارروائی اور قول و قرار کی تحریک کے ساتھ اس مقصد کے لیے عوامی ذرائع ابلاغ کی حمایت کا حصول۔

پانچواں قدم

اس کا اندازہ کہ

(۱) کتنے مالی وسائل درکار ہیں۔

(۲) تکنالوجی کی طاقت حاصل کرنے کے لیے کون کون سے تکنیکی وسائل ضروری ہیں۔

(۳) اور کن کن انتظامی و تنظیمی وسائل کی ضرورت ہے۔

چھٹا قدم

"بھوک سے پاک علاقہ پروگرام" میں جس علاقے کا احاطہ کیا جائے اس میں

فاقہ اور بھوک کو جڑ سے مٹانے کے لیے بالکل نچلی سطح پر لوگوں کو منظم کیا جائے جن میں درج ذیل افراد/ادارے شامل ہوں۔

(۱) عوام کے منتخب نمائندے
(۲) حکومتی ایجنسیاں
(۳) سول سوسائٹی غیر حکومتی تنظیمیں، رضاکار ایجنسیاں، وائی کلب، لائنز کلب جیسی خدمت گار تنظیمیں۔
(۴) ماہرین تعلیم:۔ تحقیقی، تربیتی ادارے اور یونیورسٹیاں۔
(۵) صنعتیں
(۶) مالی ادارے اور
(۷) ذرائع ابلاغ

بھوک کا خاتمہ کرنے کی غرض سے تشکیل شدہ ایسی کوئی تنظیم بھوک سے پاک علاقہ پروگرام وضع کرنے، اس پر عمل اور اس کی نگرانی کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔

تصور سے عمل تک

اصل چیلنج یہی ہے کہ بھوک سے پاک علاقہ پروگرام شروع کرنے کے تصور کو عمل میں ڈھالا جائے۔ اس پروگرام کے تحت موجودہ صدی کے باقی ماندہ برسوں میں سارا زور اس پر دینا ہوگا کہ دیہات اور قصبات میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کے لیے روزی روٹی کے فاضل مواقع نکالے جائیں، چونکہ غریبی کا زیادہ اثر خواتین اور بچیوں پر پڑتا ہے اس لیے غریبی کی اس تانیثیت کا تقاضا ہے کہ اس پروگرام میں زیادہ توجہ عورتوں اور بچیوں پر دی جائے۔ ان معاملات کو سامنے رکھ کے قومی سطح پر بھوک سے پاک علاقہ پروگرام شروع کرنے کے لیے درج ذیل تعمیلی ڈھانچہ بنایا جاسکتا ہے۔

پہلا مرحلہ۔ گیپ ((GAP)) اور رکاوٹوں کا تجزیہ

اس مرحلے میں اس کا تجزیہ کیا جائے کہ غریبی اور بھوک دور کرنے کے پروگرام کے فیوض کہاں کہاں نہیں پہنچ رہے ہیں اور اس پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں حائل ہیں۔ اس کا تجزیہ کرتے وقت کہ پروگرام میں کہاں کہاں فرق ہے اور کون کون سے لوگ فیض حاصل کرنے سے محروم رہ گئے ہیں۔ سب سے پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت کے پروگراموں کے تحت فی الحال کیا کیا سہولتیں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کو مل رہی ہیں۔ فہرست بناتے وقت مناسب خانے بنائے جائیں تاکہ سماجی سلامتی اور تغذیہ فراہمی پروگرام مرتب رہ سکیں اور روزگار کے مواقع نکالنے کے پروگرام الگ سے بن سکیں۔

اضلاعی اعداد و شمار تیار ہو جانے کے بعد جہاں تہاں سے نمونہ لینے کی تکنیک کے ذریعہ کسی بھی ضلع کے کم و بیش سو دیہات میں تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور اس کے ذریعہ معلوم کیا جائے کہ مطلوبہ خاندانوں تک سرکاری امداد کس حد تک پہنچی ہے یا پہنچ رہی ہے۔ خاندانوں کے اندر اس کا پتا لگایا جائے کہ جو سہولتیں حاصل ہو رہی ہیں ان کا کتنا حصہ مردوں پر صرف ہوتا ہے اور کتنا عورتوں / بچیوں کے حصے میں آتا ہے۔ غریب لوگ جن چیزوں کے اہل ہیں اور کیا کچھ انھیں مل رہا ہے۔ اس میں جو تفریق ہوا سے جنس اور معاشی حالات کے مطابق پھر سے ترتیب دیا جائے۔ معاشی حالات میں یہ دیکھا جائے کہ کن کے پاس زمین یا مویشی یا مچھلیوں کے تالاب یا درخت ہیں اور کون لوگ ایسے ہیں جن کے پاس کوئی پیداواری جائداد نہیں ہے۔

فرق کا یہ تجزیہ مکمل کر لینے کے بعد اس کی نشاندہی کی جائے گی کہ اس فرق کے اسباب کیا ہیں اور سہولتیں حاصل کرنے میں غریبوں کو کس طرح کی دشواریوں کا سامنا ہے۔ اس قسم کے ایک فرق اور دشواریوں کے تجزیہ سے آگے یہ سمجھنے کا کام شروع کیا جاسکتا ہے کہ محروم لوگوں تک غریبی خاتمہ کے راست و بالواسطہ پروگرام کے فیوض کیسے پہنچائے جاسکتے ہیں۔ فرق تجزیہ کے کام میں شریک رضاکار تنظیموں کی بھی فہرست بنائی جائے اور اس میں یہ بھی اندراج ہو کہ حکومتی تنظیموں اور غریبوں کے درمیان پل کے طور پر کس حد تک موثر خدمت انجام دے رہی ہیں۔ اس کے بعد رضاکار تنظیموں کے کارکنوں اور منتخب پنچایتوں اور میونسپلٹیوں کے مرد و خاتون اراکین کے ساتھ میٹنگ کر کے یہ طے کیا جائے گا کہ اس فرق کو کیسے ختم کیا جائے اور غریبی کے خاتمہ سے متعلق پروگراموں کو مطلوب غریب عوام تک پہنچانے کا کام اہلیت اور تاثیر کے اعتبار سے کیسے بہتر بنایا جائے۔

دوسرا مرحلہ۔ پیغام کی تبلیغ اور حکمت عملی کی منصوبہ بندی

یہ مرحلہ حکمت عملی کا منصوبہ بنانے کا مرحلہ ہوگا جس میں درج ذیل امور پر توجہ دی جائے گی۔

(الف) جو ملنا چاہیے اور جو مل رہا ہے اس کے درمیان فرق دور کرنے کے لیے ضروری اقدامات۔
(ب) جاری پروگراموں کے فیوض کی اثر انگیزی بہتر بنانے اور آبادی کی تکمیل طلب کم از کم ضرورتوں کی تکمیل کے لیے نئے پروگرام وضع کرنے کی غرض سے متعلقہ علاقوں میں انسانی، مالی اور تکنیکی وسائل متحرک کرنے کے امکانات۔
(ج) حکومتی یا غیر حکومتی تمام پروگراموں میں مرکوزیت لانے کے طریقوں کی نشاندہی۔
(د) زرعی اور غیر زرعی دونوں قسم کے پیشوں میں روزی روٹی کے نئے وسائل نکالنے پر غور۔
(ھ) غریبوں کی روزی روٹی کا بندوبست کرنے اور اسے استحکام دینے سے متعلق پروگراموں پر عمل درآمد میں ان لوگوں کی جن کے لیے یہ پروگرام وضع کیے گئے ہیں موثر شمولیت

رنگرانی کو یقینی بنانے کی غرض سے
یبی اور اشتکاری طریقوں کا تعین
ر

بھوک کے خلاف جنگ لڑنے
وں کا دستہ بنانے کے لیے
ملقہ مواضعات میں نوجوانوں
دوں اور عورتوں کی شناخت۔
وک کے خلاف لڑائی چھیڑنے
لے ان نوجوانوں کو کئی طرح کی
داریاں سنبھالنی ہوں گی۔ مثلاً
دں کو آگاہ کرنا پڑے گا کہ ان
ے لیے جو پروگرام بنائے گئے ہیں
کے تحت ان کو کیا کیا آسانیاں
کتی ہیں، ان تک یہ آسانیاں
ہنچانے کا نظام بھی بہتر بنانا انھیں
جوانوں کی ذمہ داری ہوگی۔
حولیاتی حفظان صحت بہتر بنانا
گا اور کوڑا کرکٹ اور گندگی
پھر سے کار آمد توانائی میں بدلنے
ذمہ داری بھی سنبھالنی ہوگی۔
لوگوں کو ان کے سفری اور دیگر
کے لیے اور ان کے وقت کی تلافی
زاری طور سے ایک رقم بھی دی
اس گروپ میں ایسے ہی نوجوانوں
دں کو شامل کیا جائے گا جو اپنے
جی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے
سے سرشار ہوں۔ اس طرح کے گروپ
دوں اور عورتوں کی تعداد برابر ہوگی۔

یکشن پروگرام کی حتمی تشکیل

، اور دوسرے مرحلوں میں جو کام
اس سے بھوک اور محرومی ختم کرنے
ت سے واقفیت بھی ہو جائے گی۔
مد کے حصول کے طریقوں کا تجزیہ
ے گا اور ایک قابل عمل منصوبہ
ل بھی ہو چکی ہوگی۔ لیکن اس کا
نا ضروری ہے کہ جو بھی منصوبہ عمل
کو موثر بنانے کے لیے پہلے ہمے
انوں سے صلاح مشورہ کر لیا جائے
اور ان کے مشوروں کی بنیاد پر منصوبہ تیار ہو۔
اس طرح یہ مرحلہ بھوک اور محرومی کے خاتمے
کے لیے مقامی سطح پر مگر وسیع البنیاد اتحاد
قائم کرنے کا موقع فراہم کر سکے گا۔ اس طرح
کے کسی اتحاد یا گروپ میں مقامی بلدیاتی
اداروں کے بھوک اور افلاس کے خلاف سرگرم
سرکاری ایجنسیوں، تعلیمی برادری، سول سوسائٹی
کارپوریٹ سیکٹر، نوجوانوں اور خواتین کی
تنظیموں، مالیاتی اداروں اور عوامی ذرائع
ابلاغ کے نمائندے ضرور شامل ہونے چاہئیں۔
پھر اس گروپ میں شامل ہر فرد کے ذمہ کام
تقسیم کر دیا جائے یعنی کوئی لوگوں میں بیداری
لانے پر کوئی وسائل متحرک کرنے پر، کوئی کسی
کام کو تکمیل تک پہنچانے پر، کوئی نگرانی
کرنے اور اندازہ قائم کرنے پر مامور کر دیا
جائے۔ یہ گروپ افقی ساخت کے سرکاری
پروگراموں میں عمودی جہت شامل کرنے
کا فریضہ بھی نبھائے گا۔ اس گروپ کے اراکین
جنسی مساوات کے حصول اور جہیز و شراب نوشی
جیسی سماجی لعنتوں کے خاتمے کے لیے بھی
کوششیں کرتے رہیں گے۔

چوتھا مرحلہ: پائدار غذائی و تغذیاتی سلامتی کی طرف

اس مرحلے میں بھوک سے پاک علاقہ
پروگرام کو ایک پسندیدہ تصور سے مقامی
سطح کے قابلِ عمل ایکشن پلان میں ڈھال دیا
جائے گا۔ اس وقت اس پر زیادہ توجہ دی
جائے گی کہ آبادی کے تمام طبقات کو اس
سے واقف کرایا جائے کہ بھوک کو ختم کرنے
کے لیے اب غیر معمولی مواقع حاصل ہیں۔
غریب لوگ خود بھی منصوبہ سازی و عمل درآمد
کے مرحلے میں سرگرم حصہ لے سکتے ہیں۔
بھوک کے خلاف جنگ میں لگے ہوئے
نوجوانوں میں سے بیشتر کا تعلق ایسے کھیت
مزدوروں کے خاندان سے ہوگا جن کے
پاس اپنی زمینیں نہیں ہیں۔ اس گروپ
میں پنچایتوں اور نگر پالیکاؤں کے منتخب
اراکین بھی شامل ہوں گے اور منتخب پارٹیوں
اور عوام کے درمیان رابطہ کا فریضہ نبھائیں
گے۔ ہر گاؤں/قصبہ سے کم از کم دو افراد
اس گروپ میں ضرور شامل کیے جائیں گے تاکہ
اپنے گاؤں/قصبہ میں رہنے والے لوگوں کے
لیے صفائی اور حفظان صحت کا ماحول بہتر
بنانے کے ساتھ ساتھ ان کی صحت اور تغذیہ
کی سلامتی میں بھرپور حصہ لے سکیں۔

ہندوستان نوجوانوں کی سرزمین ہے۔
ہماری آبادی میں ایسے مردوں اور عورتوں کی
تعداد تقریباً ۴۰ کروڑ ہے جن کی عمریں
۲۱ سال سے کم ہیں۔ قوم کے مستقبل کا دارو
مدار اسی پر ہے کہ انھیں تعمیری اور صحت مند
زندگی گزارنے کے لیے کیا کیا مواقع مل
سکتے ہیں۔ نوجوانوں کو صرف اس صورت
میں کاشت کاری کی طرف متوجہ کیا اور اس
پیشہ میں لگائے رکھا جا سکتا ہے کہ کاشت
کاری ان کی عقل و فہم کو بھی اور معاشی
لحاظ سے ان کی کفالت بھی کرے اور ایسے
میں علم کی شدت سے ماحولیاتی زراعت
سے دوہرا فائدہ حاصل ہو سکے گا۔

ہمارا معاشرہ مختلف ثقافتوں،
مختلف مذہبوں، مختلف بولیوں/زبانوں
اور سیاسی عقائد سے تعلق رکھنے والوں
کا گلدستہ ہے۔ مرکزی حکومت میں مختلف
سیاسی پارٹیوں کا اتحاد ہے جس کی وجہ
سے غریبی کے خاتمہ اور بھوک کے صفایا
کا پروگرام انتہائی ترجیحی بنیادوں پر چلایا
جا سکتا ہے اور اسے سیاسی ایجنڈے
میں سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔ حکومت
تمل ناڈو نے غریبی کی پیدا کردہ بھوک
کو ختم کرنے کے لیے ٹھوس کوشش شروع
کرنے کا فیصلہ کر کے پہلا جرأت مندانہ
قدم اٹھا دیا ہے اور اب ہمیں چاہیے کہ
آئندہ صدی میں قدم رکھنے سے قبل پورے
ملک میں بھوک سے آزاد علاقہ پروگرام
کو پھیلانے کا کام شروع کر دیں۔

(گوشوارہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

گوشوارہ نمبر ۱

۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران مختلف اجناس کی پیداوار

نمبر شمار	اشیاء	پیداوار ملین ٹن میں	فی کس پیداوار گرام / یومیہ
۱-	چاول (دھان)	۸۱٫۱۰	۲۴۳٫۹۲
۲-	گیہوں	۶۵٫۵۰	۱۹۷٫۰۴
۳-	روکھے سوکھے اناج	۳۰٫۴۰	۹۱٫۴۵
۴-	دلہن (دالیں)	۱۴٫۱۰	۴۲٫۴۲
	مجموعی اناج	۱۹۱٫۱۰	۵۷۴٫۸۸
۵-	تلہن	۲۱٫۴۰	۶۴٫۳۰
۶-	دودھ	۶۵٫۸۰	۱۹۷٫۲۴
۷-	پھل	۳۳٫۰۰	۹۹٫۱۸
۸-	سبزیاں	۷۱٫۰۰	۲۱۳٫۵۰
۹-	انڈے (ملین میں)	۲۴۷٫۵۲	۰٫۰۷
۱۰-	گوشت	۴٫۲۰	۱۲٫۶۳
۱۱-	مچھلی	۴٫۸۰	۱۴٫۴۴
۱۲-	بناسپتی تیل	۴٫۸۳	۲۰٫۱۵۵
۱۳-	چینی	۱۴٫۶۰	۴۳٫۹۲

ذریعہ: اقتصادی جائزہ ۹۶-۱۹۹۵ء اور زرعی اعداد و شمار ۱۹۹۶ء جلد ۱

گوشوارہ نمبر ۲

فی کس خالص دستیابی

سال	اناج	دالیں	کل
۱۹۹۱ء	۴۶۸٫۵	۴۱٫۶	۵۱۰٫۱
۱۹۹۲ء	۴۳۴٫۵	۳۴٫۳	۴۶۸٫۸
۱۹۹۳ء	۴۲۷٫۹	۳۴٫۸	۴۶۲٫۷
۱۹۹۴ء	۴۳۴٫۰	۳۵٫۵	۴۸۹٫۵
۱۹۹۵ء	۴۶۴٫۹	۳۷٫۰	۵۰۱٫۹

ذریعہ: اکنامک سروے ۹۶-۱۹۹۵ء

گوشوارہ نمبر ۳

مختصر مقدار میں درکار تغذیہ کے فقدان سے متاثر اور خطرے سے دوچار آبادی

خطہ	آیوڈین کی کمی		اسکولی عمر سے کم بچوں میں وٹامن اے کی کمی		اسکولی عمر سے کم بچوں میں آئرن کی کمی
	خطرہ	متاثر	خطرہ	متاثر	
افریقہ	۱۸۱	۸۶	۵۳	۴۹	۲۰۶
امریکہ	۱۶۸	۶۳	۱۶	۲۰	۹۴
جنوبی و جنوب مشرقی ایشیا	۴۲۷	۲۷۲	۱۲۷	۶۹	۶۴۳
یوروپ	۸۲	۱۴	-	-	۲۷
مشرق بحر روم	۱۷۳	۱۹۳	۱۶	۲۲	۱۴۹
مغربی بحرالکاہل اور چین	۴۲۳	۱۲۱	۴۲	۲۷	۱۰۵۸
میزان	۱۶۵۴	۶۶۹	۲۵۴		۲۱۷۷

ذریعہ: عالمی تنظیم صحت ۱۹۹۵ء نیم طبی، سنگین اور معتدل کمیوں سے دوچار آبادی

گوشوارہ نمبر ۴

دنیا کے ۲۵ ملکوں میں سروے کے دوران ۱۹۰ کھیتوں کی مٹی میں تغذیہ بخش عناصر کی کمی کا فی صد

	کمی کی سطح کا اندازہ		
	واضح	مخفی	میزان
نائٹروجن	۷۱	۱۴	۸۵
فاسفورس	۵۵	۱۸	۷۳
پوٹاشیم	۳۶	۱۹	۵۵
بورون	۱۰	۲۱	۳۱
تانبا	۴	۱۰	۱۴
لوہا	۰	۳	۳
مینگنیز	۱	۹	۱۰
مولبڈینم	۳	۱۲	۱۵
جستہ	۲۵	۲۴	۴۹

ذریعہ: سلمیا ۱۹۹۰ء بین الاقوامی غذائی پالیسی، تحقیق انسٹی ٹیوٹ، واشنگٹن ڈی سی

ڈاکٹر ایم۔ آر۔ سری نواسن

آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی

مصنف کا کہنا ہے کہ اگرچہ آزادی کے بعد ملک نے سائنس اور ٹکنالوجی کی ایک مضبوط بنیاد تیار کر لی ہے تاہم گزشتہ برسوں میں ہمارے تحقیق و ترقی کے ادارے سرکاری نوعیت کے ادارے بن گئے ہیں۔ اس صورت حال کو جلد ہی بدلنے کی ضرورت ہے۔

آزادی کے پہلے ہی سے ہندوستان میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ایک مضبوط روایت موجود تھی۔ میں اس مضمون میں ملک کی ماضی بعید کی سائنس اور ٹکنالوجی کی روایت پر جو بہت شاندار رہی ہے، بحث نہیں کروں گا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہمارے یہاں جے۔ سی۔ بوس، پی۔ سی۔ رائے، سری نواسا رامانجم اور دوسری ہستیاں جو اس وقت دنیا کے سرکردہ سائنس دانوں میں شمار کی جاتی تھیں، موجود تھیں۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کی مدت میں ہندوستان نے سائنس کے میدان میں کافی پیش رفت کی۔ ہمارے یہاں کئی سرکردہ سائنس داں موجود تھے جن میں نوبل انعام یافتہ سی۔ وی۔ رمن کا نام سر فہرست ہے۔ ان کے ساتھ میگھ ناتھ ساہا، ایس۔ این۔ بوس، بیربل ساہنی جیسے سائنس داں بھی اہم خدمات انجام دے رہے تھے۔ یہ سائنس داں یونیورسٹی نظام کے تحت کام کرتے تھے۔ انھوں نے فزکس، کیمسٹری اور حیاتیاتی سائنسوں وغیرہ بہت سے شعبوں میں نمایاں کام کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب تجرباتی سہولیات پر معمولی خرچ سے عمدہ کوالٹی کا سائنسی کام کیا جا سکتا تھا۔ رمن بڑے فخر سے کہتے تھے کہ انھوں نے جس ساز و سامان پر وہ کام کیا جس پر انھیں نوبل انعام ملا، اس کی قیمت صرف چند ہزار روپے تھی۔

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد ہمارے اولین وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ میں گہری دلچسپی لی۔ اگرچہ قدیم ہندوستان میں نجوم، علم الادویہ اور ریاضی جیسے شعبوں میں ہمارے اس وقت کے سائنس دانوں نے شاندار کام کیا۔ تاہم توہم پرستی نے صدیوں تک ہمارے سماج کے بڑے طبقوں کو اپنے شکنجے میں جکڑے رکھا۔ اس لیے پنڈت نہرو ہمیشہ لوگوں کو "سائنسی مزاج" پیدا کرنے کی اہمیت بتاتے رہتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی ملک کا غربت اور محرومی کا صدیوں پرانا مسئلہ حل کرنے اور لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

آزادی کے بعد کے ابتدائی سالوں میں حکومت نے سائنسی اور صنعتی تحقیق کا ادارہ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر قائم کیا۔ برطانیہ کے ڈیپارٹمنٹ آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی مثال سامنے رکھتے ہوئے مختلف شعبوں میں تجربات کے لیے متعدد لیباریٹریاں قائم کی گئی ہیں۔ پہلی تین لیباریٹریاں جن کا قیام ۱۹۵۰ء میں عمل میں آیا یہ تھیں۔ نیشنل فزیکل لیباریٹری (این۔ پی۔ ایل)، نیشنل کیمیکل لیباریٹری (این۔ سی۔ ایل) اور سینٹرل فیول ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (سی۔ ایف۔ آر۔ آئی)۔ اسی سال بعد میں چار نئے ادارے قائم کیے گئے جن کے نام ہیں: سینٹرل گلاس اینڈ سیرامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، سینٹرل فوڈ ٹکنالوجیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، سینٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور

> پنڈت نہرو ہمیشہ لوگوں کو "سائنسی مزاج" پیدا کرنے کی اہمیت بتاتے رہتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی ملک کا غربت اور محرومی کا صدیوں پرانا مسئلہ حل کرنے اور لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

نیشنل میٹلرجیکل لیباریٹری۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں سینٹرل فیول ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے افتتاح کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے رمن نے "نہرو۔ بھٹناگر اثر" کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا:

"مثال کے طور پر ایک وہ وقت تھا جب سائنس کے خرچ کے نام پر سرکاری خزانے کی پیٹیاں بند رہتی تھیں۔ لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ

سی۔ ایس۔ آئی۔ آر [illegible] سے بڑی تنظیم ہے۔ [illegible] تربیت یافتہ سائنس [illegible] کام کر رہا ہے [illegible] صنعتی مقاصد اور انسانی [illegible] کی ترقی کے [illegible] انجام دیتے رہتے ہے۔

لیباریٹری کے بعد لیباریٹری قائم ہورہی ہے۔۔۔۔ یقیناً یہ بھٹناگر کا اثر ہے۔"

وسیع نیٹ ورک

اس وقت سی۔ ایس۔ آئی آر کی مختلف کاموں کے لیے وقف ۴۰ لیباریٹریاں اور مختلف سائنس شعبوں کے ۸۰ فیلڈ ایکسٹنشن سینٹر ملک میں کام کر رہے ہیں اور اس کے پاس بڑی تعداد میں قسم قسم کی تکنالوجیاں ہیں۔

سی۔ ایس۔ آئی۔ آر۔ دنیا میں سائنسی تحقیق و ترقی کی سب سے بڑی تنظیم ہے۔ فی الوقت اس کے تحت ۱۰۰۰ سے زائد اعلا تربیت یافتہ سائنسی اور صنعتی عملہ کام کر رہا ہے۔ یہ تنظیم سائنسی و صنعتی مقاصد اور انسانی وسائل کی ترقی کے لیے اہم خدمات انجام دیتی رہی ہے۔ سال ۹۶۔۱۹۹۵ء میں سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کی حاصل کی ہوئی جانکاری کی بنیاد پر تقریباً تین ہزار کروڑ روپے کا صنعتی مال تیار کیا گیا۔ کچھ برسوں سے یہ تنظیم کنٹریکٹ پر تحقیق و ترقی کا کام بھی کررہی ہے اور اس کام اور اپنی مشاورتی خدمات سے کافی آمدنی حاصل کررہی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ آمدنی اس کی ٹرن اوور کے ۳۰ فی صد کے لگ بھگ ہے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کے پاس کسی اور ہندوستانی تنظیم کے مقابلے میں زیادہ پیٹنٹس ہیں اور وہ نئے پیٹنٹ فائل کرتی رہتی ہے۔ تاہم مستقبل کے لیے سی۔ ایس۔ آئی۔ آر اور اس کی لیباریٹریوں کو بڑی چنوتیوں کا سامنا ہے۔ اسے صنعت کے ساتھ زیادہ مضبوط انداز میں جڑنا ہوگا اور بالآخر اپنے اخراجات ایک بڑی حد تک خود پورے کرنے کے لائق بننا ہوگا۔ کچھ برسوں سے اس تنظیم میں نظام مراتب کو لحاظ داری اور انفرادی پہل اور انفرادی جوش عمل کی حوصلہ افزائی نہ کرنے کا رجحان پایا جارہا ہے۔ اس لیے اسے اپنا کام کرنے

جب ہندوستان نے اپنا پہلا [illegible] میں "کمیشن" کیا تو وہ [illegible] کر کے ایٹمی عہد کا آغاز کر [illegible]

کے لیے خود مختاری دینے کی فوری ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا موزوں سسٹم بھی بنانا ضروری ہے جس میں یہ اپنے کاموں کے لیے جواب دہ ہو اور اچھی پہل اور اچھے کام کے لیے انعامات بھی دیے جائیں۔ کارپوریٹ خطوط پر اس کا ڈھانچہ از سر نو منظم کرتے وقت اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ سائنس کی خدمت کا مطلب ہے عمدگی کی تلاش اور اگر مینجمنٹ کے اصولوں پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا تو یہ تنظیمیں اپنے خول کے اندر بہت گھس جائیں گی۔ لہٰذا مینجمنٹ کے اصول وضع کرتے وقت ان دونوں متضاد ضرورتوں کے درمیان توازن قائم رکھنا ہوگا۔ ایک بڑا چیلنج جو سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کے اداروں کو درپیش ہے کہ وہ اپنے ساز و سامان اور بنیادی ڈھانچے کی جدید کاری نہیں کر پاتی ہیں۔ اس کمزوری کو دور کرنا ہوگا۔ جدید کاری کو مسلسل جاری رہنے والا عمل سمجھنا چاہیے اور اس کے لیے مناسب رقومات فراہم کی جانی چاہئیں۔

ہندوستانی سائنس دانوں کی برادری میں ذہنی ملکیتوں کے حقوق کے بارے میں بیداری پیدا کرنے کا سوال بھی فوری توجہ کا محتاج ہے۔ چوں کہ سی۔ ایس۔ آئی آر اشیا یا فارمولوں کو پیٹنٹ کرانے کے عمل سے بہ خوبی واقف ہے اس لیے اسے ہمارے بہت سے اداروں میں کام کرنے والے سائنس دانوں کو پیٹنٹنگ کے عمل کے بارے میں مفصل جانکاری فراہم کرنی چاہیے۔ صنعت کے ساتھ رابطے پر غور کرنے اور صنعتی اداروں کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ قائم کرنے کے ساتھ ساتھ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کی لیباریٹریوں کو بنیادی تحقیق کی مدد و حمایت کے لیے مناسب رول ادا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کے متعلقہ شعبوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا سلسلہ مضبوط بنانا چاہیے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کی لیباریٹریوں کو ہمارے بڑھتی ہوئی صنعتی سرگرمیوں میں مدد دینے کے لیے مختلف شعبوں میں نئی تکنالوجی کے استعمال کے بارے میں مشاورتی

خدمات بھی فراہم کرنی چاہئیں۔

ایٹمی عہد

آزادی کے بعد سائنس کے میدان میں ایک بڑا سائنسی قدم محکمۂ ایٹامک انرجی کا قیام تھا۔ ایٹمی توانائی کے بارے میں تحقیق و ترقی ابتداً امریکہ تک ہی محدود تھی جہاں زمانۂ جنگ میں ایٹم بم بنا تھا۔ جنگ کے بعد کے سالوں میں امریکہ کے علاوہ دوسری مغربی طاقتوں برطانیہ، فرانس اور کناڈا میں نیوکلیائی تحقیق و ترقی کا کام سرگرمی سے

[illegible]

شروع کیا گیا۔ دوسری طرف سابق سوویت یونین میں بھی نیوکلیائی ہتھیار بنانے کی غرض سے نیوکلیائی ٹکنالوجی کو فروغ دیا جا رہا تھا۔ ہومی بھابا — ہندوستان میں ایٹمی توانائی پروگرام کے بانی — نے چالیس کی دہائی کے وسط میں ہی یہ محسوس کر لیا تھا ہندوستان کے لیے بھی نیوکلیائی سائنس اور ٹکنالوجی کو فروغ دینا ضروری ہے۔ چناں چہ انھوں نے کاسمک رے فزکس، پارٹیکل فزکس، میتھمیٹکس اور دیگر متعلقہ شعبوں کے بارے میں تحقیق کے واسطے ۱۹۴۶ء میں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامینٹل ریسرچ قائم کرنے کے لیے ٹاٹا گھرانے کی حمایت حاصل کر لی۔ جب ہندوستان نے اپنا پہلا ریسرچ ری ایکٹر "اپسرا" اگست ۱۹۵۶ء میں "کمیشن" کیا تو وہ ایشیا میں (سابق سوویت یونین کو چھوڑ کر) ایٹمی عہد کا آغاز کرنے والا پہلا ملک تھا۔ پچاسویں دہائی کے وسط تک ایٹمی توانائی کے بارے میں بہت ہی کم معلومات دستیاب تھی۔ امریکہ اور دوسری نیوکلیائی طاقتوں نے ایٹمی توانائی سے متعلق سرگرمیوں کے بارے میں تمام مطبوعات پر سخت سینسر شپ عائد کر رکھی تھی۔ چناں چہ ہندوستان کو ایٹمی توانائی سے متعلق سرگرمیوں کے بارے میں اپنا ذخیرہ معلومات خود بنانا پڑا۔ ایٹمی توانائی کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ فزکس، کیمسٹری، بائلوجی وغیرہ تمام شعبوں میں مکمل تال میل ہو اور الیکٹرونکس، کیمیاوی انجینئرنگ، مکینیکل انجینئرنگ وغیرہ کی ٹکنالوجیوں میں مہارت حاصل ہو۔ ہند۔کناڈا پروجیکٹ کے طور پر ایک زیادہ طاقتور ری ایکٹر سائرس کے نصب کیے جانے پر ٹرامبے میں تحقیقی سرگرمیوں کو مزید استحکام حاصل ہوا۔

ایٹم برائے امن

۱۹۵۵ء میں صدر آئزن ہاور نے "ایٹم برائے امن" پروگرام کے تحت دنیا میں پرامن مقاصد کے لیے ایٹمی توانائی کے استعمال کو فروغ دینے کے لیے ایک اہم پہل کی۔ ۱۹۵۵ء ہی میں جنیوا میں ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال کے بارے میں پہلی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کی صدارت ہومی بھابا نے کی۔ نیوکلیائی سائنس کے بارے میں بہت سی بنیادی معلومات امریکہ، برطانیہ، فرانس، کناڈا اور سوویت یونین نے غیر درجہ بند قرار

[illegible]

دے دی۔ تاہم ہندوستانی ایٹمی توانائی پروگرام کے ابتدائی رہنماؤں نے محسوس کیا کہ نیوکلیائی ٹکنالوجیاں بین الاقوامی ڈپلومیٹک ایجنڈا پر سودے بازی کا موضوع بنی رہیں گی۔ اس لیے بہت سی ٹکنالوجیوں پر خود انحصاری کی بنیاد پر مہارت حاصل کرنے پر زور دیا گیا۔ چناں چہ محکمۂ ایٹمی توانائی نے ملک میں دستیاب خام یورینیم سے اونچی کوالٹی کا خالص یورینیم بنانے کے طریقے نکالنے کی کوشش شروع کی تا کہ نیوکلیئر ایندھن، بھاری پانی اور نیوکلیائی آلات ملک کے اندر ہی بنائے جا سکیں۔

ہندوستان کے ایٹمی توانائی پروگرام کا مقصد ایٹمی توانائی کو پرامن مقاصد کے لیے استعمال کرنا ہے۔ لہٰذا طبی استعمال کے لیے ریڈیو آئسوٹوپس بنانے کا کام پوری سرگرمی سے شروع کیا گیا۔ ہندوستانی صنعت کو بھی ویلڈنگ اور ڈھلی ہوئی چیزوں کی غیر تباہ کن جانچ کے لیے ریڈیو آئسوٹوپس مہیا کیے گئے۔ زراعت کے لیے شعاع زنی کی ٹکنالوجیوں کا استعمال ابتدائی ایام سے ہی کیا جا رہا تھا۔ مہاراشٹر، گجرات، کرناٹک وغیرہ کے کاشت کار وسیع پیمانے پر ان ٹکنالوجیوں کا استعمال کرتے رہے ہیں جس سے پیداوار میں بہت اضافہ ہوا ہے اور کاشت کاروں کو دوسرے فائدے بھی حاصل ہوئے ہیں۔ شعاع زنی کی ٹکنالوجی کا استعمال میڈیکل پروڈکٹس (طبی ساز و سامان) کو جراثیم سے پاک کرنے کے لیے بھی کیا جا رہا ہے۔ بھابا ایٹامک ریسرچ سنٹر میں ایک بار کے استعمال کے بعد پھینک دی جانے والی انجکشن کی سوئیوں، سرجیکل دستانوں، زخم پر باندھی جانے والی پٹیوں وغیرہ کو جراثیم سے پاک کرنے کا ایک پلانٹ کئی سال پہلے لگایا جا چکا ہے۔ اس قسم کا دوسرا پلانٹ بنگلور میں لگایا گیا ہے۔ خوراکی اشیا کو جراثیم وغیرہ سے پاک کرنے کے لیے شعاع زنی کے استعمال کے بارے میں کافی عرصے سے مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ مصالحہ جات اور سمندری پیداوار کو محفوظ رکھنے کے لیے شعاع زنی کی تکنیک استعمال کرنے کے واسطے ایک پلانٹ قریب مستقبل میں لگایا جائے گا۔

ایٹمی بجلی

سب سے اہم و واحد شعبہ جس میں

ایٹمی توانائی کا پرامن استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بجلی پیدا کرنے کا شعبہ ہے۔ ہندوستان کے پہلے ایٹمی بجلی گھر نے ۱۹۶۹ء میں تارا پور میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ اس بجلی گھر میں جو امریکی نیوکلیئر انڈسٹری نے قائم کیا تھا، طاقتور بنائی گئی یورینیم کو بطور ایندھن استعمال کیا جاتا ہے۔ اس نے کامیاب کارگزاری کے ۲۷ برس مکمل کر لیے ہیں اور سب سے کم لاگت پر بانی کے بغیر بجلی پیدا کر رہا ہے۔ ہندوستان کا دوسرا ایٹمی بجلی گھر راجستھان میں ہند۔کناڈا تعاون سے قائم کیا گیا۔ اس میں ہیوی واٹر ری ایکٹر تکنالوجی استعمال کی گئی جو قدرتی یورینیم کو بطور ایندھن استعمال کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ ہمارے نیوکلیئر بجلی کے پروگرام کا خاص زور پہلے مرحلے میں قدرتی یورینیم کو بطور ایندھن استعمال کرنے والے ری ایکٹر بنانے پر ہے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے کا پروگرام شروع ہوگا جس میں پلوٹونیم کو بطور ایندھن استعمال کرنے والے فاسٹ بریڈر ری ایکٹر استعمال کیے جائیں گے۔ یہ پلوٹونیم پہلے مرحلے کے ری ایکٹروں میں استعمال شدہ ایندھن میں سے نکالی جائے گی۔ تیسرے مرحلے میں ہم ایسے ری ایکٹر بنائیں گے جن میں ایندھن کے طور پر تھوریم استعمال کی جائے گی۔ ہندوستان میں تھوریم کے بڑے ذخائر ہیں جب کہ یورینیم کے ذخائر محدود ہیں۔ ۸۰ کی دہائی میں نیوکلیائی بجلی گھروں میں بھاری پانی تیار کرنے والے پلانٹوں، نیوکلیائی ایندھن بنانے والے پلانٹوں وغیرہ کے لیے درکار ساز و سامان اور اجزار تیار کرنے کے لیے ہندوستانی صنعت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ یہ بہت ہی چنوتی بھرا کام تھا کیوں کہ اس کے لیے صنعت کو کوالٹی کی سطحیں کافی بلند کرنی پڑیں اور ایسے ساز و سامان کا استعمال کرنا پڑا جو عموماً روایتی صنعتوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ ہندوستانی صنعت کی ہمہ پہلو صنعتی صلاحیت کے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ ان تمام پلانٹوں کا سارا ساز و سامان اور مشینی اجزا اسی نے فراہم کیے۔

سلامتی کا پہلو

نیوکلیئر سائنس اور تکنالوجی کے استعمال کے بارے میں بحث سلامتی کے پہلوؤں کا ذکر کیے بغیر نامکمل ہوگی۔ جاندار مادّوں، انسان، جانور اور پودوں پر شعاع زنی کے اثرات کا مطالعہ ابتدا سے ہی کیا جاتا رہا ہے۔ ان مطالعات نے صحت اور سلامتی کی سرگرمیوں کو ایک سائنٹفک بنیاد فراہم کی ہے۔ ایٹمی توانائی تنظیم ملک بھر کے اسپتالوں، صنعتوں اور تمام نیوکلیائی مراکز پر جہاں شعاع زنی کے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، شعاع زنی کی مانیٹرنگ کا اہتمام کرتی ہے۔ نیوکلیئر مراکز جہاں شعاع زنی کے بڑے وسائل موجود ہوتے ہیں تربیت یافتہ ماہرین یہ دیکھنے کے لیے ۲۴ گھنٹے ڈیوٹی پر رہتے ہیں کہ پلانٹ پر کام کرنے والے عملے کو کوئی جوکھم پیش نہ آئے۔ ہر قسم کے سیال، ٹھوس اور گیس والے اخراج پر نگاہ رکھی جاتی ہے تاکہ اس سے آس پاس کی پبلک کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ماحولیاتی سروے کرنے والی لیبارٹریاں ماحول میں شعاع زنی کی سطحوں پر نگاہ رکھتی ہیں۔ ایٹمی توانائی کا ریگولیٹری بورڈ پلانٹوں سے ہونے والی شعاع زنی، پلانٹوں کے عملے اور پلانٹوں سے ہونے والے اخراجوں کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے۔ یہ بورڈ پلانٹوں میں سلامتی کے انتظامات کا باقاعدگی سے سروے بھی کرتا ہے اور نئے پلانٹوں کے ڈیزائن اور تعمیر کے لیے لائسنس بھی جاری کرتا ہے۔ محکمۂ ایٹمی توانائی اور دیگر علمی اداروں کی لیبارٹریاں تحفظ و سلامتی کے بارے میں تحقیق کا اہم کام کرتی ہیں۔ پہلے ریسرچ ری ایکٹر کو چالو ہوئے ۴۰ سال ہو گئے ہیں۔ ان چالیس برسوں میں ایٹمی توانائی تنظیم نے ملک کی سب سے بڑی سائنٹفک اور تکنالوجیکل انسٹی ٹیوشنوں میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ لیبارٹریوں کا ایک سلسلہ اس تنظیم کے تحت مختلف شعبوں میں تحقیق و تجربے کا کام کر رہا ہے اس کے علاوہ یہ تنظیم صنعتی پیمانے پر بہت سے کام کرتی ہے مثلاً یورینیم کے لیے کان کنی، بھاری پانی تیار کرنے کے پلانٹ اور نیوکلیئر ایندھن، بجلی گھر، استعمال شدہ نیوکلیئر ایندھن کی دوبارہ پراسیسنگ وغیرہ۔ ایٹمی توانائی کی تنظیم علمی اداروں کے ساتھ قریبی رابطہ اور تال میل برقرار رکھتی ہے تاکہ انھیں محکمۂ ایٹمی توانائی کے مراکز پر اپنی تحقیقی سرگرمیاں جاری رکھنے کے مواقع فراہم کیے جا سکیں۔ ایٹمی توانائی تنظیم کے اندر دستیاب تکنالوجیوں کو صنعت میں وسیع تر پیمانے پر استعمال کرنے کے لیے اب کافی گنجائش موجود ہے۔ اس سے صنعت کی صلاحیت کارکردگی بڑھے گی اور نئے پروڈکٹس اور پیکیجز نکالے جا سکیں گے۔ یہ اگلی دہائی کے لیے ایک چیلنج ہے۔ محکمۂ ایٹمی توانائی بنیادی ریسرچ کا کام کرنے والے متعدد اداروں کی مدد بھی کر رہا ہے۔ ان میں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ کا نام قابل ذکر ہے جو فزکس، میتھمیٹکس، ریڈیو ایسٹرونومی اور مولی کیولر بائیلوجی میں ریسرچ کر رہا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف میتھمیٹکل سائنسز

انسٹی ٹیوٹ [illegible] جا چکے ہیں جواب [illegible] اور [illegible] کے لیے ضروری [illegible] سینگ [illegible] (آئی آر ای ایل) [illegible] سے استعمال [illegible] پیداوار [illegible] والے وغیرہ کے لیے بیش قیمت خدمات مہیا کر رہے ہیں۔

اور دیگر مراکز پر علم ریاضی سے سائنسوں کے بارے میں تحقیق کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔

خلائی پروگرام

خلائی (اسپیس) سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق سرگرمیاں ابتداً محکمۂ ایٹمی توانائی کے اندر شروع کی گئی تھیں۔ جب ہومی بھابا کے بعد وکرم سارابھائی نے ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین اور محکمۂ ایٹمی توانائی کے سکریٹری کے عہدے سنبھالے تو انھوں نے اپنا بیشتر وقت اور توانائی خلائی سائنس اور ٹکنالوجی کے پروگرام پر عمل درآمد اور پلاننگ پر صرف کی۔ خلا کا ایک علاحدہ محکمہ اور ایک خلائی کمیشن ۱۹۷۲ء میں قائم کیا گیا۔ خلائی پروگرام کی معاونت کے لیے ایک سائنس اینڈ ٹکنالوجی سینٹر ترویندرم کے نزدیک قائم کیا گیا جسے بعد میں وکرم سارابھائی اسپیس سینٹر کا نام دیا گیا۔ راکٹ چھوڑنے کا ایک سینٹر سری ہری کوٹا (SHAR) میں قائم کیا گیا۔ مختلف مقاصد کے لیے مصنوعی سیاروں ڈیزائن سازی اور ساخت کا کام شروع کیا گیا۔ کچھ مصنوعی سیارے بیاکالوزا اسپیس سینٹر قازقستان (سابقہ سوویت یونین) سے چھوڑے گئے اور کچھ فرانسیسی گویانا سے اور ان کے لیے روسی اور فرانسیسی راکٹ لانچر استعمال کیے گئے۔ انسیٹ سیریز کے کل ملاکر سات مصنوعی سیارے چھوڑے جاچکے ہیں جو اب ٹیلی ویژن نشریات، ٹیلی کمیونی کیشنز اور موسمی پیش گوئیوں کے لیے ضروری خدمات فراہم کررہے ہیں۔ انڈین ریموٹ سینسنگ سٹیلائٹس (آئی۔آر۔ایس) کی ایک اور سیریز کے مصنوعی سیارے استعمال اراضی، زرعی پیداوار، جنگلات کی صورت حال وغیرہ کے لیے بیش قیمت خدمات مہیا کررہے ہیں۔ ہمارے مصنوعی سیاروں نے ہمارے سائنس دانوں کو ستاروں وغیرہ سے ہونے والے اخراجوں کا مطالعہ کرنے کے لیے پلیٹ فارم مہیا کیا ہے اور اس طرح کائنات کو سمجھنے میں ان کی مدد کی ہے۔ مصنوعی سیارے چھوڑنے، ان کا تیار رکھنے، ان پر کنٹرول کرنے اور ان سے معلومات و تفصیلات حاصل کرنے کے لیے ہاسن، بنگلور اور سری ہری کوٹا میں مراکز قائم کیے ہیں۔

راکٹ انجنوں کی ڈیزائن سازی اور ترقی کا کام خلائی پروگرام کے ابتدائی برسوں ہی سے کیا جارہا ہے۔ شروع میں سالڈ پروپیلینٹ انجنوں کی ترقی پر زور دیا گیا۔ ہندوستانی صنعت یہ انجن تیار کرتی رہی ہے۔ زیادہ طاقت کے انجن بھی بنائے گئے اور ان کی آزمائش بھی کی گئی ہے۔ اے۔ ایس۔ ایل۔ وی ۱۵۰ کلوگرام وزن کے مصنوعی سیارے دائرہ نما مدار میں چھوڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پولر سٹیلائٹ لانچ وہیکل (پی۔ایس۔ ایل۔وی) تیار کرنے میں کامیابی حاصل کرلی گئی ہے۔

> اسپیس کا محکمہ اب جی۔ ایس۔ ایل۔ وی (یعنی جیو اسٹیشنری سٹیلائٹ لانچ وہیکل) تیار کرنے میں مصروف ہے اور اس کی پہلی ترقیاتی پرواز ۹۸-۱۹۹۷ء میں کرنے کا پروگرام ہے۔

یہ وہیکل ۱۰۰۰ کلوگرام وزن کے آئی۔آر۔ایس سیارے سورج کے سامنے قطبی مدار میں پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسپیس کا محکمہ اب جی۔ ایس۔ ایل۔ وی (یعنی جیو اسٹیشنری سٹیلائٹ لانچ وہیکل تیار کرنے میں مصروف ہے اور اس کی پہلی ترقیاتی پرواز ۹۸-۱۹۹۷ء میں کرنے کا پروگرام ہے۔

اگرچہ روس نے کچھ کرایوجینک انجن مہیا کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے تاہم اندرون ملک ہی ان انجنوں کا ڈیزائن تیار کرنے اور انھیں بنانے کے لیے زوردار کوششیں شروع کردی گئی ہیں۔ خلائی پروگرام کے لیے خصوصی نوعیت کے بہت سے آلات کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً دباؤ، درجۂ حرارت اور محل وقوع کا پتا لگانے والے اسپیس گریڈ کے سینسر، آپٹیکل سسٹمز (یعنی کیمرے) اور بڑے سائز کے آئینے وغیرہ۔ ان آلات کی ویسے ہی حالات میں جیسے کہ بیرونی خلا میں پائے جاتے ہیں کڑی آزمائش کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا تجربہ شاہد ہے کہ ان میں سے بہت سے کام ترقی یافتہ ممالک کی بہ نسبت کافی کم لاگت پر انجام دیے گئے ہیں۔ ہندوستان سسٹموں، ذیلی سسٹموں اور اجزا کی فروخت کے لیے نفع بخش ایکسپورٹ آرڈر حاصل کرسکتا ہے۔ اسرو نے ایسی بہت سی ٹکنالوجیاں تیار کی ہیں جو صنعت میں سودمند طریقے سے استعمال کی جاسکتی ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اسرو ٹکنالوجی کی ایسی منتقلی کے طریقے تلاش کرے گی۔

زرعی تحقیق

آئیے اب ہندوستان میں زرعی تحقیق کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے۔ ملک میں زرعی تحقیق کے فروغ، رہنمائی اور تال میل کے لیے ۱۹۲۹ء میں امپیریل کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اس کا نام انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ (آئی۔سی۔اے۔آر) رکھا گیا۔ کچھ عرصہ بعد زرعی تحقیق و تعلیم کا محکمہ قائم کیا گیا اور آئی۔سی۔اے۔آر۔ کے ڈائرکٹر جنرل کو ہی اس کا سکریٹری بھی بنایا گیا۔ اس وقت آئی۔سی۔اے۔آر ۴۶ سینٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (جن میں سے چار قومی انسٹی ٹیوٹ ہیں) اور ۲۶ قومی ریسرچ سینٹر چلارہی ہے۔ آئی۔سی۔اے۔آر نے ۲۹ زرعی یونیورسٹیاں قائم کرنے میں بھی مدد دی (ان میں وہ مرکزی زرعی یونیورسٹی بھی شامل ہے جو شمال مشرقی خطے کے لیے امپھال میں قائم کی گئی ہے) اس وسیع سائنٹفک بنیادی

ڈھانچے کی بدولت ہی ملک میں سبز انقلاب آیا اور گزشتہ تین دہائیوں میں اناج، دودھ، گنے، پھلوں، سبزیوں، پیاز، آلو، انڈوں، روئی اور تلہن وغیرہ کی پیداوار بڑھ گئی۔ ماضی میں بلکہ یوں کہیے کہ چالیس پچاس سال پہلے تک ملک کے بعض علاقوں میں وقتاً فوقتاً قحط بھی پڑا کرتا تھا اور تیس سال پہلے ہمیں بیرون ملک سے اناج درآمد کرنا پڑتا تھا۔ اب ہندوستان اناج سمیت مختلف اجناس غیر ممالک کو برآمد کرنے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہے۔ کھیتوں میں سائنٹفک طریقوں اور نئی قسموں کے بہتر بیجوں کے استعمال اور کاشت کاروں کی محنتِ شاقہ کی بدولت ملک نے تقریباً ۲۰ برس پہلے ہی اپنی اناج کی ضرورتوں میں خود کفالت حاصل کر لی تھی۔ یہ انقلاب بڑی حد تک کاشت کاروں کی محنت اور

اگرچہ روس نے کچھ کرایوجینک انجن مہیا کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے تاہم اندرون ملک بھی ان انجنوں کا ڈیزائن تیار کرنے اور انھیں بنانے کے لیے زوردار کوششیں شروع کر دی گئی ہیں۔

آئی۔سی۔اے۔آر کی سرگرم کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں سیاسی اور انتظامی قیادت نے بھی اس کامیابی میں یقیناً ایک اہم رول ادا کیا۔

طبی تحقیق

انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ (آئی۔سی۔ایم۔آر) ۱۹۴۹ء میں قائم کی گئی لیکن اس کی جڑیں انڈین ریسرچ فنڈ ایسوسی ایشن (آئی۔آر۔ایف۔اے) میں تھیں جو ۱۹۱۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ آئی۔آر۔ایف۔اے کا خاص مقصد ملک میں میڈیکل ریسرچ کو فروغ دینا اور اس میں تال میل برقرار رکھنا تھا۔ اس وقت انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ کے تحت ملک کے مختلف حصوں میں ۲۱ قومی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ / مراکز کام کر رہے ہیں۔ ہر انسٹی ٹیوٹ / مرکز ایک خاص مشن کے لیے کام کرتا ہے۔ جیسے تپ دق، کوڑھ، ہیضہ، اسہال اور وائرس سے پھیلنے والی بیماریاں ایڈس، ملیریا، کالا آزار، غذائیت، وغیرہ۔ ملک میں چھ علاقائی میڈیکل سینٹر بھی کام کر رہے ہیں جو اپنے علاقے یا خطے کے مسائل صحت پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ طبی تحقیق میں چھوت سے پیدا ہونے والی بیماریوں، ناقص تغذیہ اور ضخامتِ آبادی جیسے مسائل کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ریسرچ گروپ امراض قلب، استحالی خرابیوں (بشمول ذیابیطس)، اعصابی بیماریوں، کینسر، دماغی خرابیوں، اندھے پن وغیرہ کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں۔ جڑی بوٹیوں سے بننے والی روایتی ادویہ کے بارے میں بھی تحقیق شروع کی گئی ہے۔ انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ ایک طرف تو صحت اور بیماریوں کی روک تھام سے متعلق گوناگوں مسائل کو دستیاب معلومات کی مدد سے حل کرتی ہے اور دوسری طرف بیماریوں کے وجوہات کے مطالعہ اور بیماریوں کی جلد تشخیص کے لیے ماڈرن بائیولاجی کے آلات کا استعمال کرتے ہوئے نئی ادویہ اور نئے طریقوں سے بیماریوں کی روک تھام کرتی ہے۔

دوسرے محکموں کا قیام

۷۰ کی دہائی کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں نئے محکمے قائم کیے گئے جن میں محکمۂ الیکٹرونکس اور محکمۂ سائنس اور ٹکنالوجی بھی شامل تھے۔ بعد میں جنگلات اور ماحولیات کا محکمہ، سمندری ترقی کا محکمہ، بایو ٹکنالوجی کا محکمہ اور غیر روایتی توانائی کی وزارت قائم کی گئی اور ان کی سرگرمیوں کو محکمۂ سائنس اور ٹکنالوجی سے الگ کر دیا گیا۔ محکمۂ سائنس اور ٹکنالوجی کا خاص کام ہے، ملک کے موجودہ اداروں میں بنیادی سائنسی تحقیق کے لیے فنڈ مہیا کرنا، تحقیق کے لیے وظائف دینا، تکنیکی صنعت کاروں کی معاونت کرنا اور ریاستی حکومتوں کے تعاون سے سائنس اور ٹکنالوجی کلچر کو فروغ دینا۔ متذکرہ بالا دوسرے محکموں کا زیادہ واضح مشن ہے۔ یہ محکمے بذاتِ خود تحقیقی ادارے نہیں چلاتے بلکہ موجودہ انسٹی ٹیوٹوں اور یونیورسٹیوں سے اپنی دلچسپی کے موضوعات پر ریسرچ کرواتے ہیں۔ اس طرح یہ محکمے علمی اداروں میں تحقیق و ترقی کی حوصلہ افزائی کر کے ایک اہم کام کر رہے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دفاعی تحقیق و ترقی کی تنظیم بھی بری، بحری اور فضائی افواج کی خاص دلچسپی کے شعبوں میں تحقیق کے لیے لیباریٹریاں چلا رہی ہے۔ ان میں ڈیفنس میٹالرجیکل لیباریٹری، گیس ٹربائن ریسرچ اسٹیبلشمنٹ، وہیکل ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ اسٹیبلشمنٹ جیسے ادارے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ لیباریٹریوں کا ایک اور سلسلہ وہ ہے جو حکومت اور صنعت کے باہمی تعاون سے قائم کیا گیا ہے۔ یہ لیباریٹریاں ٹیکسٹائلز، سلک، قہوہ، آٹوموبائلز وغیرہ کے شعبوں میں تحقیق و ترقی کا کام کرتی ہیں۔ صنعتی ایسوسی ایشنوں نے خود بھی تین ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ الگ الگ صنعتوں میں بھی تحقیق و ترقی کے شعبے کام کر رہے ہیں۔

اختتامیہ

چناں چہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں سائنس اور ٹکنالوجی کے لیے ایک مضبوط بنیاد اور تربیت یافتہ افرادی قوت موجود ہے۔ اس وقت تحقیق و ترقی کے تمام کاموں کے لیے تقریباً ۸۰ فی صد فنڈ سرکاری سیکٹر مہیا کرتا ہے اور صرف ۲۰ فی صد صنعت مہیا کرتی ہے۔ بالغ صنعتی معاشروں میں یہ تناسب اس کے برعکس ہے وہاں بڑا حصہ صنعت کا ہے۔

ہمیں تحقیق و ترقی کے مصارف میں کافی اضافہ کرنا ہوگا اور پرائیویٹ سیکٹر کو وسیع تر پیمانے پر اپنی دلچسپی کے موضوعات پر تحقیق کروانے پر آمادہ کرنا ہوگا تاکہ ان کی مقابلے

باقی صفحہ ۵۵ پر

بقیہ کور ۲: ہندوستان کا خلائی پروگرام

اور موسمیات کے شعبوں کے لیے عملی خدمات فراہم کرنے کا ایک جامع پروگرام شروع کیا۔

انسیٹ سسٹم کے تحت مجموعی طور پر ۱۵۰۰۰۰ روٹ کلومیٹر کا احاطہ کرنے والے ۱۷۰ روٹوں پر دوطرفہ اسپیچ سرکٹ فراہم کیے گئے جن کی بدولت ملک میں مواصلاتی انقلاب آگیا اور پہلی مرتبہ ملک کے دور دراز علاقے اور ساحل سمندر کے نزدیک واقع جزائر ملک کے خاص دھارے سے جڑ گئے۔

انسیٹ سیارچوں کی ملک گیر پہنچ کا فائدہ کئی مقاصد مثلاً انتظامیہ، کاروباری اور کمپیوٹر کمیونیکیشنز کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ خصوصی سروسیں مثلاً پی ٹی آئی نیوز سروس، تصاویر کی ترسیل اور قدرتی آفات کے نازل ہونے پر راحتی سرگرمیوں کے لیے ایمرجنسی مواصلات کی خدمات شروع ہو چکی ہیں۔ انسیٹ کا جدت پسندانہ استعمال کرتے ہوئے قدرتی آفات کی وارننگ دینے کا ایک ایسا نظام قائم کیا گیا ہے جس کے تحت ملک کے مشرقی ساحلی علاقوں میں جہاں سمندری طوفان آتے رہتے ہیں، منتخب مقامات پر ۲۵۰ وارننگ ریسیور لگائے گئے ہیں جن کی بدولت ہر سال ہزاروں انسانوں اور مویشیوں کی جانیں بچائی جا رہی ہیں۔ ایک ریموٹ ایریا بزنس اور میسیج نیٹ ورک (آر اے بی ایم این) بھی کام کر رہا ہے جو بڑے میٹروپالیٹن شہروں میں واقع صنعتوں اور ملک بھر میں پھیلی ہوئی ان کی شاخوں کے درمیان ڈاٹا کمیونیکیشن کی خدمات فراہم کر رہا ہے۔ نیشنل انفارمیشن سینٹر (NICNET) ضلع ہیڈکوارٹروں، ریاستی راجدھانیوں اور مرکزی حکومت کے درمیان مواصلاتی رابطہ قائم کر کے مستند ڈاٹا کمیونیکیشن فراہم کر رہا ہے۔

انسیٹ کا انتہائی ڈرامائی فائدہ ملک میں ٹیلی ویژن کی وسعتوں میں تیز رفتار توسیع کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔ اس کے لیے ملک میں ۳۵۰۰۰ ڈائرکٹ ریسپشن سیٹوں کے علاوہ ۷۵۰ ٹی وی ٹرانسمیٹر نصب کیے گئے ہیں، جن کی بدولت ٹیلی ویژن نشریات ہندوستان کی ۸۵ فی صد آبادی تک پہنچنے لگی ہیں۔ ملک کی کئی ریاستوں میں علاقائی نیٹ ورک سروسیں

> **مکمل خود انحصاری کی بنیاد پر خلائی تکنالوجی کو عملی جامہ پہنانے کا کام ۱۹۸۰ء میں شروع ہوا۔ خلائی تکنالوجی کے استعمال سے صحیح معنوں میں ہندوستانی سماج میں ایک انقلاب سا آگیا ہے اور اس سے نچلی سطح کے لوگوں کو بھی کافی فائدہ پہنچا ہے۔**

پہلے ہی سے شروع ہو چکی ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جا سکنے والے ارتھ اسٹیشنز قائم کیے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر سٹیلائٹ کے ذریعے خبریں اکٹھا کرنے والی ایس۔ این۔ جی وہیکلز کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان وہیکلز کے ذریعے ملک بھر میں کسی بھی جگہ پر رونما ہونے والے اہم واقعات ٹی وی پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ انسیٹ کا استعمال تعلیمی ٹی وی پروگراموں کے لیے بھی کیا جا رہا ہے۔ تقریباً ۴۰ اسکولوں اور کالجوں کے لیے ہر مہینے سو گھنٹے تعلیمی پروگرام نشر کیے جا رہے ہیں۔ ایک پورا ٹرانسپانڈر تربیت، ترقیاتی مواصلات اور اوپن یونیورسٹی کے طلبا کے لیے دور سے تعلیم دینے کے واسطے وقف کر دیا گیا ہے۔

ایک کارگر طریقۂ تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ طلبا اور معلمین کے درمیان دوطرفہ مواصلات کی سہولیات دستیاب ہوں جس سے کہ تعلیم پانے والے طلبا سوالات پوچھ سکیں اور ماہرین سے ان کے جوابات اور وضاحتیں حاصل کر سکیں۔ لہٰذا سماجی کارکنان، دیہی اساتذہ، زراعت پیشہ لوگوں، پنچایت افسروں اور اوپن یونیورسٹی کے طلبا کو یہ تعلیمی سہولت فراہم کرنے کے لیے بڑے پیمانے اور منتخب بنیاد پر تجربے کیے گئے ہیں جن سے دوطرفہ رابطے والی تعلیم کے لیے سٹیلائٹ میڈیا کی افادیت ثابت ہو چکی ہے۔ ان تجربات سے یہ بھی ظاہر ہو گیا ہے کہ تیزی سے تعلیم کی اشاعت اور ناخواندگی کے خاتمے کے لیے دوطرفہ رابطے والا طریقۂ تعلیم کس قدر ضروری ہے۔

سٹیلائٹ تکنالوجی اور آپٹیکل فائبرس میں ہونے والی پیش رفتوں کی غیر معمولی رفتار اور اس کے ساتھ طاقتور مِنی کمپیوٹروں نے، کمپریشن کی اعلا تکنیکوں اور ذاتی خدمات کی دستیابی نے اطلاعات و تفصیلات کے وسیع ذخیروں تک رسائی ممکن بنا دی ہے۔ اس اطلاعاتی عہد میں مانگ پر اطلاعات، مانگ پر ویڈیو اور ''ڈائرکٹ ٹو ہوم ٹیلی ویژن'' جیسی اصطلاحات اکثر سننے میں آتی ہیں۔ اب کہ انسیٹ-۲سی میں متحرک مواصلات کا اہتمام کیا جا چکا ہے۔ دور دراز علاقوں کے لیے وہاں کی مقامی زبان میں اور مقامی حالات کے مطابق پروگرام پیش کرنے کے لیے ''گرام سیٹس'' کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور ''ڈائرکٹ ٹو ہوم ٹیلی ویژن'' شروع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ بخوبی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان عالمی اطلاعاتی شاہراہ کا ایک اٹوٹ حصہ بننے کے لیے تیار ہو چکا ہے۔

> **خلائی عہد کا ایک نتیجہ اطلاعاتی انقلاب ہے جس نے جغرافیائی، ثقافتی اور سماجی سرحدیں توڑ دی ہیں، وقت اور فاصلے کم ہو گئے ہیں اور دنیا ایک عالمی گاؤں بن گئی ہے۔**

انڈین ریموٹ سینسنگ سٹیلائٹ کے ذریعے ایک نیا سبز انقلاب

ہندوستان میں سبز انقلاب کے نتیجے میں غلّہ کی سالانہ پیداوار ۱۹۵۰ء میں فقط ۵۵ ملین ٹن سے بڑھ کر ۱۹۰ ملین ٹن سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے ملک کی اوسط پیداوار صرف ۱ء۲ ٹن فی ہیکٹیر ہے جب کہ

دنیا کی اوسط پیداوار ۲ء۶ ٹن فی ہیکٹر اور دنیا کی زیادہ سے زیادہ پیداوار ۳ ٹن فی ہیکٹر ہے۔ اس سبز انقلاب کے منفی اثرات بھی برآمد ہوئے ہیں۔ ہمارے زمینی وسائل میں بعض مقامات پر بڑے پیمانے پر پانی کے جمع رہنے، کیمیاوی کھاد کے اندھادھند استعمال اور پانی کی نکاسی کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کے سبب سخت گراوٹ آگئی ہے۔ اگرچہ ملک میں آب پاشی

انسیٹ کا انتہائی ڈرامائی فائدہ ملک میں ٹیلی ویژن کی توسیع میں تیز رفتار توسیع کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔ اس کے لیے ملک میں ۳۵۰۰۰ ڈائرکٹ ریسپشن سیٹوں کے علاوہ ۷۵۰ ٹی وی ٹرانسمیٹر نصب کیے گئے ہیں جن کی بدولت ٹیلی ویژن نشریات ہندوستان کی ۸۵ فی صد آبادی تک پہنچنے لگی ہیں۔

والا رقبہ دوگنا ہو گیا ہے اور تقریباً ۲۵ ملین بے کار پڑی ہوئی زمین کو، جس کا پتا مصنوعی سیارے کی کھینچی ہوئی تصاویر سے لگایا گیا تھا، دوبارہ قابلِ کاشت بنایا جا چکا ہے پھر بھی ۲۰۲۵ء تک ۸ ارب کی بڑھی ہوئی متوقع آبادی کی خوراک کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے غلہ کی پیداوار دوگنی کرنے کے واسطے ایک نیا سبز انقلاب لانا از حد ضروری ہے۔

بھاسکر تجرباتی سیاروں سے حاصل ہونے والے تجربے کے بعد ۱۹۸۸ء میں اسٹیٹ آف دی آرٹ آئی آر ایس سیریز کے مصنوعی سیارے چھوڑنے کا کامیاب سلسلہ شروع کیا گیا جس کی بدولت ملک کے لیے اپنے قدرتی وسائل پر مسلسل نگاہ رکھنا ممکن ہو گیا ہے۔ آئی آر ایس مصنوعی سیاروں سے حاصل ہوئی تصاویر مٹی کی خصوصیات میں ہونے والی تبدیلیوں اور استعمال اراضی کے ایسے نقشے بنانے میں بہت مددگار ثابت ہوئی ہیں جن سے جنگلات، باغات، چراگاہوں، ایک اور دو دو فصلیں اگانے والی زمینوں، بے کار پڑی ہوئی زمینوں جنھیں قابلِ کاشت بنایا جا سکتا ہے اور بنجر زمینوں کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ مصنوعی سیاروں سے حاصل ہونے والی تصویروں سے زیر زمین پانی والے علاقوں کی بھی ۹۲ فی صد درستی کے ساتھ پہچان کی جا سکتی ہے اور آب پاشی کی اسکیموں پر بہتر عمل درآمد کے لیے سطح زمین پر واقع پانی کے ذخائر کے نقشے تیار کیے جا سکتے ہیں۔ موسمی برفباری اور گلیشیروں کی فضائی مانیٹرنگ کی بدولت برف کے پگھلنے اور پانی بن کر دریاؤں اور آبی ذخائر میں جانے کے بارے میں پیش گوئی کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ آب پاشی والے علاقوں میں ایسی جگہوں کی شناخت سے جہاں پانی جمع رہتا ہے اور فصل اگانے والی زمینوں اور فصل اگانے کے طریقوں کے بارے میں تفصیلات مہیا ہو جانے سے پانی کے واجب استعمال میں آسانی پیدا ہو گئی ہے اور نتیجتاً زیادہ گھنی فصلیں اگائی جا سکتی ہیں۔ ریموٹ سینسنگ کے ذریعے لی گئی تصاویر کی بنا پر تمام بڑی فصلوں کے رقبۂ زیر کاشت اور پیداوار کے بارے میں کافی پہلے سے پیش گوئی کی جا سکتی ہے جو غلہ کی ذخیرہ سازی اور تقسیم کے منصوبے

آئی۔ آر۔ ایس۔ ایک۔ سی، جو ۵ء۸ میٹر ریزولیوشن کی تصاویر مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، دنیا میں اس وقت دستیاب ریموٹ سینسنگ مصنوعی سیاروں میں سب سے طاقتور مصنوعی سیارہ سمجھا جاتا ہے۔ اب اس کی تصاویر امریکہ سمیت متعدد ملک حاصل کر رہے ہیں جس سے حکومت کو کافی آمدنی ہوتی ہے۔

بنانے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ساحلی علاقوں میں ماہی گیروں کو ہفتے میں دو بار باقاعدگی سے ایسے بلیٹن تقسیم کیے جاتے ہیں جن میں سمندر میں مچھلیاں پکڑنے کے مقامات کی شناخت کی جاتی ہے جس سے زیادہ مچھلیاں پکڑنا ممکن ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ریموٹ سینسنگ اب شہری پلاننگ، ماحولیاتی مانیٹرنگ اور صنعتیں قائم کرنے کے لیے موزوں مقامات کی شناخت کا سب سے اہم ذریعہ بن گئی ہے۔

خشک سالی اور سیلاب کی مانیٹرنگ اور پیش گوئی کرنے کی ٹکنالوجی اور ریموٹ سینسنگ کے ذریعے لی گئی تصاویر سے ایسی آفات کا مقابلہ اور بروقت تحفظی اقدامات کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔ برسوں میں حاصل کی گئی تفصیلات خوراک کی ممکنہ کمی والے علاقوں، پانی کے بہاؤ میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور پانی جمع رہنے والے مقامات کی شناخت اور سیلاب سے بڑے پیمانے پر ہونے والے نقصانات کو روکنے کے لیے ڈھانچہ جاتی انتظامات کرنے میں بہت معاون ثابت ہوئی ہیں۔ سبزہ اگنے کی لگاتار مانیٹرنگ اور ہفتے میں دو بار فصلوں کی صحت کے بارے میں مہیا کی جانے والی اطلاعات اور موسمی پیش گوئیاں سوکھا پڑنے کے متعلق پہلے سے پیش گوئی کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن گئی ہیں۔ ماحولیاتی تنزلی کے بارے میں اسپیس ریموٹ سینسنگ سے حاصل ہونے والی درست اور وافر اطلاعات نے ہمیں یہ صلاحیت بخشی ہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم اس بات کو یقینی بنانے کے لیے موزوں اقدامات کر سکتے ہیں کہ زرعی پیداوار بڑھانے کے ترقیاتی عمل سے ماحولیات کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

مختلف شناخت شدہ انفرادی استعمال کے لیے ریموٹ سینسنگ کی تصاویر کے استعمال سے ہم مائکرو سطح پر ایسی مربوط حکمت عملیاں تیار کر سکتے ہیں جو ملک میں ایک سبز انقلاب لا سکتی ہیں۔ مٹی کی خصوصیات

زراعت کے طریقوں، زیر زمین پانی اور سطح زمین پر واقع آبی ذخائر، جنگلات کے احاطے، ماحولیاتی کیفیت اور موسمیاتی اطلاعات کے بارے میں خلائی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کی بنا پر ہر واٹرشیڈ کی سطح پر پانی اور مٹی کے تحفظ کے لیے موزوں اقدامات کیے جاسکتے ہیں اور ان اقدامات کے ساتھ ساتھ بہتر قسم کے بیجوں کے استعمال، فصلی کیڑوں کے انسداد کی حکمت عملی اور مناسب طریق کاشت کے ذریعے ماحولیات کو نقصان پہنچائے بغیر زرعی پیداوار میں دیرپا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ خشک سالی کے امکان والے چند منتخب علاقوں میں مربوط ترقیاتی حکمت عملیوں پر کامیاب عمل درآمد کے نتیجے میں ایسے اضلاع میں بھی جہاں ابھی حال تک پینے کے پانی تک کی سخت قلت تھی دو فصلیں اُگانا ممکن ہوگیا ہے۔ ان تجربات کی کامیابی سے ہمارے خلائی سائنس دانوں کا حوصلہ دوچند ہوگیا ہے اور اب انھوں نے تمام متعلقہ وزارتوں کے اشتراک عمل سے ملک کے ۱۷۲ اضلاع میں دیرپا ترقی کا مربوط بندوبست شروع کیا ہے۔

آئی۔آر۔ایس۔ایک۔سی، جو ۵/۸ میٹر ریزولیوشن کی تصاویر مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دنیا میں اس وقت دستیاب ریموٹ سینسنگ مصنوعی سیاروں میں سب سے طاقتور مصنوعی سیارہ سمجھا جاتا ہے۔ آر۔آئی۔ایس کی تصاویر امریکہ سمیت متعدد ملک حاصل کررہے ہیں جس سے حکومت کو کافی آمدنی ہوتی ہے۔ مستقبل میں آر۔آئی۔ایس سیریز کے ۲۔ا میٹر ریزولیوشن والے سیارے چھوڑنے کا منصوبہ ہے اس کے علاوہ سمندر کی مانیٹرنگ کے لیے وقف سیارے بھی چھوڑے جائیں گے اور سبھی موسموں میں کام کرنے والے ریموٹ سینسروں کا استعمال کیا جائے گا۔ اس سب کو دیکھتے ہوئے بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریموٹ سینسنگ شعبے میں ہندوستان کا مقام بہ حیثیت ایک لیڈر برقرار رہے گا۔

راکٹ تکنالوجی میں مہارت کے حصول، راکٹ موٹریں بنانے اور ان کی آزمائش کے لیے ایک وسیع بنیادی ڈھانچے کے قیام، ایک اعلا اور جدید قسم کے لانچ پیڈ کی تعمیر اور درستی کے ساتھ کام کرنے والے راڈار تیار کرنے کی صلاحیت حاصل کرکے ہندوستان دنیا کے راکٹ چھوڑنے والے بڑے ملکوں کے منتخب گروپ میں شامل ہوگیا ہے۔

لانچ وہیکل تکنالوجی میں خودانحصاری

اے۔ایس۔ایل۔وی جس نے مئی ۱۹۹۲ء میں کرۂ ارض کے قریب مدار میں ۱۰۶ کلوگرام کا ایس۔آر۔او۔ایس سٹیلائٹ چھوڑا تھا، کی کامیاب کارکردگی سے ثابت ہوگیا ہے کہ اسرو لانچ وہیکل تکنالوجی میں بالغ ہوچکی ہے۔ اے۔ایس۔ایل۔وی، ایس۔ایل۔وی۔۳ کی اصلاح شدہ شکل ہے جس میں مزید دو 'اسٹریپ آن بوسٹر' لگائے گئے ہیں۔ اسے ۱۵۰ کلوگرام کے لوڈ کو لے جانے کے لیے ایک کم خرچ وہیکل کے طور پر بنایا گیا اور پی۔ایس۔ایل۔وی اور جی۔ایس۔ایل۔وی جیسی آپریشنل لانچ وہیکلز کے لیے درکار نئی تکنالوجیوں کی آزمائش کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔

ملک میں ایک جاندار قومی اسپیس انڈسٹری قائم ہوچکی ہے اسرو کی منتقل کی ہوئی بہت سی تکنالوجیوں کا استعمال جو خلائی پروگرام میں استعمال کے لیے تیار کی گئی تھیں، صنعتی دھارے میں نئے نئے مقاصد کے لیے ہونے لگا ہے۔

۱۹۹۴ء میں ہندوستان نے ۴۴ میٹر اونچا، چار اسٹیج والا عالمی زمرہ کا پی۔ایس۔ایل۔وی راکٹ تیار کیا اور کامیابی کے ساتھ داغا۔ اس کا وزن ۲۷۵ ٹن ہے۔ اس کی بدولت اب ہمارے ملک میں ایک ایسی آپریشنل لانچ وہیکل موجود ہے جس سے آئی۔آر۔ایس سیریز کے ریموٹ سینسنگ مصنوعی سیارے سورج کے سامنے قطبی مدار پر پہنچائے جاسکتے ہیں۔ راکٹ تکنالوجی میں مہارت کے حصول، راکٹ موٹریں بنانے اور ان کی آزمائش کے لیے ایک وسیع بنیادی ڈھانچے کے قیام، ایک اعلا اور جدید قسم کے لانچ پیڈ کی تعمیر اور درستی کے ساتھ کام کرنے والے راڈار تیار کرنے کی صلاحیت حاصل کرکے ہندوستان دنیا کے راکٹ چھوڑنے والے بڑے ملکوں کے منتخب گروپ میں شامل ہوگیا ہے۔

۲/۵ ٹن کے انسیٹ مصنوعی سیارے زمین کے اوپر ساکن مدار میں چھوڑنے میں مکمل خودانحصاری حاصل کرنے کی غرض سے جی۔ایس۔ایل۔وی تیار کرنے کا کام ۱۹۹۰ء میں شروع کیا گیا تھا اسے تیار کرنے میں پی۔ایس۔ایل۔وی کے آزمودہ ماڈیول اور ۱۲ ٹن کی راکٹ موٹر استعمال کی گئی۔ پہلی جی۔ایس۔ایل۔وی لانچر کے آئندہ دو برسوں میں شروع ہونے کی توقع ہے۔ اگرچہ ان میں روس کے مہیا کیے ہوئے کرایوجینک انجن استعمال کیے جائیں گے تاہم امید کی جاتی ہے کہ چار سال قبل شروع کی گئی کوششوں کے نتیجے میں ۱۹۹۹ء کے بعد ہمیں مکمل طور پر ملک کے اندر تیار کیے گئے کرایوجینک انجن دستیاب ہوسکیں گے۔ مستقبل کی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے ۲۰ ٹن کے کرایوجینک انجن اور زیادہ طاقتور ٹھوس اور سیال راکٹ بوسٹر تیار کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں جن

کے ذریعے ۴۵۰۰ ٹن کے سٹیلائٹ چھوڑے جاسکیں گے۔ اس کے علاوہ دوسری ترقی یافتہ تکنالوجیاں تیار کرنے کی کوششیں بھی کی جارہی ہیں تاکہ مستقبل میں کم خرچ خلائی ٹرانسپورٹیشن سسٹم تیار کرنے میں اِسرو دوسری اقوام سے پیچھے نہ رہے۔

صنعت کے ساتھ تعاون

ہمارے خلائی تجربات میں ہندوستانی صنعتوں کی زیادہ سے زیادہ مدد اور تعاون حاصل کرنے کی منظم پالیسی سے نہایت حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں جس سے یہ امید پیدا ہوگئی ہے کہ آئندہ برسوں میں یہ تعاون اور بڑھے گا۔ ۷۰ کی دھائی میں اسرو نے ہندوستانی صنعتوں کو سو ملین روپے کی مالیت کے آرڈر دیے تھے لیکن اسرو کے آرڈروں کی مالیت بڑھتے بڑھتے ۸۵-۱۹۸۰ء میں ایک بلین روپے اور ۹۰-۱۹۸۵ء کی مدت میں ۷ بلین روپے سے بھی زیادہ ہوگئی۔ حالیہ برسوں میں اس باہمی انحصار میں مزید اضافہ ہوا ہے اور اعلا درجے کی ہندوستانی صنعتوں کو پیچیدہ سسٹموں اور پروجیکٹوں کی تکمیل کے آرڈر دیے گئے ہیں۔ اِسرو کی تیار کردہ تقریباً ۲۵ تکنالوجیاں صنعتوں کو منتقل کردی گئی ہیں اور ان میں سے قریب قریب سبھی کی بنیاد پر منفعت بخش پروڈکشن شروع ہوچکی ہے۔ دوسری طرف ہندوستانی صنعتوں نے بھی ذیلی سسٹموں سے لے کر انجینئرنگ اور مکمل سسٹم سازی، آزمائشی سہولیات اور لانچ پیڈس وغیرہ کی فراہمی کی مکمل صلاحیت حاصل کرلی ہے۔

مختلف کاموں، مہارتوں اور تکنالوجیوں کی تقسیم و تفویض کے مجموعی نتائج خوش آئند رہے ہیں۔ ملک میں ایک جاندار قومی اسپیس انڈسٹری قائم ہوچکی ہے۔ اِسرو کی منتقل کی ہوئی بہت سی تکنالوجیوں کا استعمال جو خلائی پروگرام میں استعمال کے لیے تیار کی گئی تھیں، صنعتی دھارے میں نئے نئے مقاصد کے لیے ہونے لگا ہے۔ یہ ہمارے سماج اور قوم کے لیے اسی طرح فائدہ مند ثابت ہوگا جس طرح اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں ہوا ہے۔

جب یہ محسوس کیا گیا کہ اِسرو اسپیس پروڈکٹس اور سروسز مہیا کرنے کے معاملے میں بین اقوامی مارکیٹ میں دوسروں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت حاصل کرچکی ہے تو حکومت نے ۱۹۹۲ء میں ایک خود مختار انٹرکس کارپوریشن قائم کی۔ یہ ہماری خلائی صلاحیتوں اور مہارت کی بین اقوامی مارکیٹ میں فروخت کو آسان بنانے کے لیے ایک بڑا اقدام تھا۔ امید ہے کہ اس فروخت سے موجودہ پلان کی مدت ہی میں ۵۰۰ ملین سے بھی زیادہ کی آمدنی ہوگی جس میں منافع ۱۰۰ ملین روپے کا ہوگا۔ اگر آئندہ برسوں میں سرگرم کوشش کی جائے تو ہندوستان بین اقوامی اسپیس مارکیٹ سے ایک کافی بڑا حصہ حاصل کرسکتا ہے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ حصہ ۲۰۰ ملین ڈالر سالانہ کے بقدر ہوسکتا ہے۔

اختتامیہ

قطعی واضح نصب العین رکھنے والا ہندوستان کا خلائی پروگرام بلاشبہ آزادی کے بعد ہندوستان کی سائنس اور تکنالوجی کی اہم ترین کامیابی ہے۔ ملک نے گزشتہ تین دہائیوں میں صرف ۷ کروڑ روپے سے بھی کم مجموعی اخراجات سے ۲۲ سٹیلائٹ (مصنوعی سیارے) چھوڑنے میں کامیابی حاصل کی ہے جن میں سے ۵ آپریشنل جیو اسٹیشنری سیارے اور تین عالمی زمرے کے آپریشنل ریموٹ سینسنگ سیارے ہیں۔ ان میں دس سے زیادہ مصنوعی سیارے خود اپنے اسپیس پورٹ سری ہری کوٹا سے چھوڑے ہیں، جن میں سے تین مصنوعی سیارے پی ایس ایل وی سے چھوڑے گئے۔ اِسرو نے اسپیس ہارڈویئر کے ڈیزائن، ساخت اور آزمائش کے لیے ایک وسیع بنیادی ڈھانچہ قائم کرلیا ہے اور ایک اہل سٹیلائٹ ٹریکنگ نیٹ ورک اور ملٹی سٹیلائٹ کنٹرول اسٹیشن قائم کرکے لانچ وہیکل اور سٹیلائٹ تکنالوجی میں مکمل خود انحصاری حاصل کرلی ہے۔ اسپیس ہارڈویئر سازی کے لیے ایک جاندار ہندوستانی صنعت وجود میں آچکی ہے۔

ملک میں مخصوص کاموں کو انجام دینے کے لیے اسپیس تکنالوجی استعمال کرنے پر زور دیا جارہا ہے۔ ہماری قومی خلائی کوشش کی بدولت مواصلاتی نظام میں مکمل انقلاب آچکا ہے اور قومی قدرتی وسائل کے بندوبست کے لیے ایک موثر میکنزم قائم ہوگیا ہے۔ ملک بھر میں دیرپا ترقی کے لیے مربوط بندوبست کے شروع ہو جانے سے پہلی مرتبہ جارحانہ بنیاد پر ملک کی موجودہ اور متوقع آبادی کے لیے خوراکی، اقتصادی اور صحتی سیکورٹی کی امید پیدا ہوگئی ہے۔ خلائی تکنالوجی کے استعمال سے ہونے والے راست فائدوں سے جو ریونیو حاصل ہو رہا ہے وہ محکمے کے اخراجات سے بہت زیادہ ہے۔

ہمارے خلائی پروگرام کی وجہ سے انتہائی مخلص اور مہارت یافتہ افرادی قوت کی شکل میں ایسی تکنالوجیکل دولت پیدا ہوگئی ہے جس پر ملک ناز کرسکتا ہے۔ ●

بقیہ: آزاد ہندوستان میں اعلا تعلیم

۱۴۔ کس طرح معلومات اور رسل و رسائل کے تفاعلی اور کمپیوٹری نظامات کو محولہ بالا سوالات سے متعلقہ تمام مسائل کے حل تلاش کرنے میں کام میں لایا جاسکتا ہے۔

۱۵۔ کیا یونیورسٹیوں کے مختلف اجزائے ترکیبی کی تشکیل نو کی ضرورت ہے تاکہ وہ زیادہ کس جائیں اور ان میں اکیڈمک افراد کا تناسب بڑھا دیا جائے۔

ان سوالات کے جوابات موجود تعلیمی سہولیات کے بھرپور استعمال کے لیے راہ ہموار کردیں گے اور ملک کی ترقی کے لیے زیادہ موثر اور نئی سہولیات کے قیام میں معاون ہوں گے۔

نتیجہ

ہندوستانی اعلا تعلیم میں مقداری اعتبار سے اضافہ ہوا ہے اور حقیقت میں زبردست اضافہ ہوا ہے لیکن یہ اضافہ نہ صرف یہ کہ ناکافی ہے بلکہ یقینی طور پر خطرناک ہے۔ اس کی جگہ پر ایسا تعلیمی فروغ درکار ہے جس کی اساس ملکی ترجیحات، قومی خصوصیات اور بین اقوامی نقطۂ نظر پر ہو۔ ہم اس منزل مقصود کو تب ہی پاسکتے ہیں کہ جب سماج کے غربا اور نقصان رسیدہ طبقہ کا حقیقی درد سامنے رہے۔ ●

ڈاکٹر جے. وی. ولانیلم

آزاد ہندوستان میں اعلا تعلیم

تعلیم کو انسانی وسائل کے فروغ میں روپیہ لگانے کا عمل سمجھنا چاہیے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ تعلیمی فروغ کا دارومدار بہر حال اپنی قومی خصوصیات اور بین الاقوامی نقطہ نظر پر ہونا چاہیے۔

شاید چین کو چھوڑ کر دنیا کے کسی دوسرے ملک میں اعلا تعلیم کا اتنا زبردست تانا بانا نہیں ہے جتنا کہ ہندوستان میں ہے۔ ہندوستان میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور سماجی اقتصادی ترقی کے عظیم منصوبوں کی بنا پر تعلیم کی مانگ بھی بڑی سرعت سے بڑھ رہی ہے۔ ترقی کے یہ منصوبے یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں نے مساوات اور سماجی انصاف کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تشکیل دیے ہیں۔

آزاد ہندوستان میں اعلا تعلیم کے بڑھت کی مقدار کو بہتر طور پر تب ہی آنکا جاسکتا ہے کہ جب ہم برطانوی دور میں تعلیم کی حیثیت پر نگاہ کریں۔ ۱۹۴۷ء کے سال تک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلبا کی تعداد محض ہزاروں میں تھی جب کہ آج اعلا تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم طلبا لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ آج ان کی تعداد کم و بیش ساٹھ لاکھ کے قریب ہے اور یہ تعداد ۲۰۱۰ء تک ایک کروڑ تک پہنچ جانے کا امکان ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں ۲۰ یونیورسٹیاں تھیں اور آج یہ تعداد ۲۲۰ (ڈیمڈ یونیورسٹیاں شامل کرکے) تک پہنچ کر گویا ۵۰ برس میں بڑھ کر گیارہ گنا ہوگئی ہے۔ کسی بھی دوسرے ملک میں اتنی زبردست بڑھت نہیں ہوئی ہے۔

لیکن آبادی اور مروج نظام تعلیم کے پیش نظر ہندوستان کو کم از کم ایک ہزار یونیورسٹیوں اور ایک لاکھ کالجوں (آج کے چھوٹے بڑے ۸۰۰۰ کالجوں کے مقابلہ میں) کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں محض اعلا تعلیم کے دائرہ میں طلبا کی تعداد سویڈن یا سوئٹزرلینڈ یا نیدرلینڈ کی کل آبادی سے زیادہ ہے۔

افزائش اور جواب دہی

ہمارے ماہرین تعلیم اور منصوبہ سازوں

> [illegible]

کو تعداد کی کثرت کے مسئلہ پر غور و خوض کرنا چاہیے اور اس طور عمل پیرا ہونا چاہیے کہ جو چھوٹی چھوٹی آبادیوں اور بڑے وسائل والے ممالک سے مختلف ہو۔

تعلیم کو ترقی انسانی وسائل میں قومی سرمایہ کاری کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ ہندوستان میں منصوبہ سازوں اور سرمایہ فراہم کرنے والے اداروں کو جواب دہی اور ذمہ داری کے سوال پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ کثیر لاگت سے قلیل نتیجہ برآمد ہو رہا ہے۔ ریاست اور مرکزی حکومت کے ذرائع، پلاننگ بورڈوں، پرائیویٹ اور سرکاری انتظامیوں، فیاض افراد، طلبا، اساتذہ، انتظامی کارکنان اور عام جنتا کو لاگت کے محاصل کی فکر کرنی چاہیے۔ یہ محض روپیہ کا معاملہ نہیں ہے ترقی انسانی وسائل کا مسئلہ بھی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو جو کچھ لاگت لگ رہی ہے بےکار چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ لاگت سے نہ صرف یہ کہ نمایاں قابلیت پیدا نہیں ہوگی بلکہ اوسط درجگی وجود میں آئے گی یہاں تک کہ بحثیت اور خطرناک قسم کی دانشورانہ غلطی کا سامنا ہوگا۔

معاصر ہندوستان میں کمیت مقابل کیفیت کا سوال قومی سطح کی اہمیت اختیار کرتا جاتا ہے کیوں کہ آزادی سے پہلے کے ہندوستان میں تعلیم کے مقاصد کچھ اور تھے۔

برطانوی حکمرانوں نے اعلا تعلیم میں کوئی بڑے پیمانے پر سرمایہ نہیں لگایا لیکن سرکار کی طرف سے افراد اور اوقاف، مذہبی اور سماجی گروپوں کو کالج بنانے، بڑھانے اور قائم رکھنے کے لیے مدد دینے کی پالیسی تھی۔ برطانوی دور میں اعلا تعلیم کے مقاصد بہت محدود تھے۔ میکالے نے کہا تھا کہ "ایسا طبقہ پیدا کیا جائے کہ جو خون اور رنگ سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق، آداب اور سوچ میں برطانوی ہو" اور اعلا تعلیم اسی منزلِ مقصود کو پانے کے لیے تھی۔ دوسرے لفظوں میں تعلیم یافتہ طبقہ کی سوچ ہندوستانی کی بجائے برطانوی تھی۔ اس کو ایک ایسے ملک میں حکومت کی اقتصادی اور سیاسی ضرورتوں کو پورا کرنا تھا کہ جہاں محکوم لوگوں کی بہت بڑی اکثریت حاکموں سے تمدنی اعتبار سے بہت مختلف تھی۔

اعلا تعلیم کے لیے برطانیہ نے کلکتہ، ممبئی اور چینئی کے بڑے شہروں میں تین یونیورسٹیاں قائم کیں۔ یہ تینوں شہر برطانوی ہندوستان کے تین صوبوں کی راجدھانیاں تھے اور یہ تینوں صوبے اولاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت تھے اور بعد میں تاجِ برطانیہ کے۔ تینوں یونیورسٹیاں لندن یونیورسٹی کے نمونہ پر ۱۸۵۷ء میں قائم کی گئی تھیں۔ اعلا تعلیم کو پھیلانے کی ذمہ داری ان یونیورسٹیوں سے مربوط کالجوں پر چھوڑ دی گئی۔ لیکن ہر ایک یونیورسٹی سے مربوط معدودے چند کالج ہی تھے اور یہ ذاتی نوعیت کے تھے۔

قبلِ آزادی ہندوستان کے اعلا طبقے کا سامنا آزاد خیال روایتوں، قانونی اصولوں اور مغرب میں رونما ہوئی جمہوریت اور مساوات کی تحریکوں کی تاریخ سے ہوا۔ خاص طور سے یورپ کی یہ تمام چیزیں اعلا تعلیم کے منظور شدہ نصاب کے ذریعے سامنے آئیں۔ اس نصاب میں ہندوستان کے اقتصادی پہلو اور اس سیاسی جبر پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی کہ جس کے باعث عوام کی جمہوری آرزوؤں کو کچلا گیا تھا اور ملکی دولت بڑے پیمانے پر ملک سے باہر جا رہی تھی۔ اس کے نتیجہ میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد وجود میں آگئی۔ جس کا رابطہ ہندوستان کی خاص طور سے ہندوستان کے دیہاتوں کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی زندگی سے ٹوٹ گیا۔

تعلیم کا گاندھیائی نظریہ

تحریکِ آزادی کے اولیں دور میں گوکھلے راناڈے، نوروجی اور دوسرے ان جیسے لیڈروں نے یہ دکھلانے کی کوشش کی کہ ملک کے اندر ہندوستانی شرفا کو پیش کی جانے والی یہ نام نہاد آزاد خیال تعلیم آزاد خیالی سے کس درجہ خالی ہے۔ وہ لوگ بہر کیف دیہاتی علاقوں کے عوام، دبے کچلے اور جبر کے شکار لوگوں تک نہیں پہنچے۔ اس کا نتیجہ نکلا عام ناخواندگی، جہالت، تمدنی پسماندگی اور وہ تمام مصائب کہ جو خواندگی اور تعلیم کی کمی سے تعلق رکھتے ہیں۔

> مہاتما گاندھی [illegible]
> ترقی کو لازم [illegible]
> گاندھی جی پہلے آدمی تھے جنھوں نے اس مسئلہ کی سنگینی پر اخلاقی
> پر مربیانہ انداز میں غور و خوض کیا اور جہالت، ناخواندگی اور تمدنی
> پسماندگی کو دور کرنے کے لیے قومی پیمانے کے حل پیش کیے

اصل یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کے علاوہ کسی نے بھی عوام الناس کی تعلیم اور ملکی ترقی کو لازم و ملزوم نہیں قرار دیا۔ شاید جدید ہندوستان میں گاندھی جی پہلے آدمی تھے جنھوں نے اس مسئلہ کی سنگینی پر اخلاقی پر مربیانہ انداز میں غور و خوض کیا اور جہالت، ناخواندگی اور تمدنی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے قومی پیمانے کے حل پیش کیے۔ آج تک بھی جو ناخواندگی، جہالت اور تمدنی پسماندگی چلی آرہی ہے اس کی ایک بڑی وجہ آزادی سے پہلے اور بعد کے ہندوستان کے تعلیم یافتہ اشرافیہ میں (تعلیم کے پیدا کردہ) ان امور سے لاتعلقی ہے۔

گاندھی جی کا جدید ہندوستان کا وژن ان کے تعلیم سے متعلق خیالات سے ہم رشتہ تھا۔ گاندھی جی نے جو کچھ کہا اور کیا وہ سب ان کے خوابوں کے ہندوستان سے ہم رشتہ تھا کیوں کہ ان کا وژن سالم اور گٹھا ہوا تھا۔ الوان الیچ اور پاؤلو فریر کے مانند جن کی انھوں نے بیسیوں برس پہلے پیش بینی کی تھی، گاندھی جی نے آزاد ہندوستان کے ساتھ نوآبادیاتی تعلیم کے رشتہ پر سوالیہ نشان لگایا تھا۔ "میں کالج کی تعلیم میں انقلاب برپا کردوں گا اور اس کا رشتہ ملکی ضروریات کے ساتھ استوار کروں گا۔"

یہاں تک کہ صنعت اور یونیورسٹی کے تال میل، ڈگری اور نوکری کی لاتعلقی، تعلیم کا پرائیویٹ بنایا جانا اور ایسے دوسرے اہم موضوعات کے بارے میں جو جدید ماہرینِ تعلیم کے دماغوں کو پریشان کرتے ہیں۔ گاندھی جی کے خیالات صاف اور دو ٹوک ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے خود کفیل اسکولوں اور صنعت و اداروں کی امداد پر کھڑے کالجوں کی وکالت کی تھی۔

نئے ہندوستان کے لیے تعلیم کے گاندھیائی وژن کے انقلابی پہلوؤں کو انھوں نے خود ہی درج ذیل طریقہ پر اختصار سے بیان کیا تھا:

(۱) سات برسوں پر پھیلی ہوئی پرائمری تعلیم کل ملا کر ایک پیشہ یا پیشوں پر مشتمل رہے تو یہی بہترین وسیلہ ہو گا۔ ایک لڑکے یا لڑکی کی ہمہ جہت نشو و نما کا۔ اس لیے تمام نصاب کو تربیتِ پیشہ کے گرد گوندھا جانا چاہیے۔

(۲) اعلا تعلیم کو پرائیویٹ تجارت و صنعت کے ذمہ چھوڑ دینا چاہیے اور یہ تمام ملکی ضروریات کو پوری کرے، چاہے وہ مختلف صنعتوں کی ہوں، تکنیکی فنون کی ہوں یا فنونِ لطیفہ کے تحت۔

(۳) یونیورسٹی کے پروانے چارٹرز فیاضی کے ساتھ افراد کے کسی بھی گروہ کو دے دیے جائیں جس کی لیاقت اور ایمانداری ثابت ہو۔ اس کو ہمیشہ سمجھ لیا جائے کہ یونیورسٹیوں کے خرچ کا کچھ بھی بار ریاست پر نہیں پڑے گا سوائے اس کے کہ وہ ایک مرکزی شعبہ تعلیم کا خرچ اٹھائے گی۔

(۴) تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو ہمیشہ دماغ کو بلند ترین نشو ونما کی جانب لے جائے لیکن یہ نشو ونما مختلف سطحوں پر دماغ اور جسم کے خلیوں کو سائنسی تربیت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

(۵) تعلیم کو چاہیے کہ تعلیم یافتہ کو اپنے ارد گرد سے باخبر بنائے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور اس قابل کرے کہ وہ اپنے فوری ماحول کی ہر شئے کے کیوں اور کیسے کا تجزیہ کر سکے۔

گاندھی جی ادبی تربیت جسمانی ورزشوں یا مذہبی رشد و ہدایت کے خلاف نہیں تھے۔ لیکن وہ پیشہ کی تربیت سے خالی ادبی تربیت، جسمانی خوب صورتی بڑھانے کے لیے جسمانی ورزش اور تنگ نظر نوعیت کی مذہبی تعلیم کے خلاف تھے۔ ان کا زور اس پر تھا کہ اسکول اور کالج کی سطحوں کی تعلیم میں پیشہ کی تربیت گھل مل جائے کیوں کہ ان کا ایقان تھا کہ کرنے سے ہی سیکھا جاتا ہے۔ خود کی ترقی کے لیے حاصل کی گئی تعلیم سماج دشمن تعلیم ہے۔ سچی تعلیم اس کو ہی کہا جا سکتا ہے کہ جو سماج کے کام آئے خاص طور سے سب سے غریب آدمی کے۔

لیکن پیشہ کی تربیت کی وکالت کرتے ہوئے گاندھی جی نے میکانکی بننے اور بار بار دہرائے جانے اور یک رنگ کام کی مخالفت کی۔

"مشینوں پر کام کرتے کرتے ہم خود مشین بن گئے ہیں اور ہم نے آرٹ اور ہاتھ کے کام کی تمام حس گنوا دی ہے۔" گاندھی جی نے کہا تھا۔ انھوں نے بہرکیف کہا تھا کہ "طلبا کی پوری شخصیت کی نشو ونما کے لیے لازمی ہے کہ محنت کا کام تعلیم کا ذریعہ بنے۔

ذہن و دل کی صحیح معنوں میں نشو ونما صرف جسمانی مشقت کے ذریعہ سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس طور پر گاندھی جی نے ایک ایسے ملک میں آرٹس کے مضامین کی تعلیم کی افادیت پر سوالیہ نشان لگایا کہ جہاں نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد بے روزگار رہ جاتی ہے۔ ہندوستان میں مروج اس دور کے نظام تعلیم کے ایک ناقد کے طور پر انھوں نے نشاندہی کی کہ اس کو بدل دیا جائے اور اس کی بجائے آئے

"ایک زیادہ تعمیری اور انسانی نظام، کہ جو قومی زندگی کی ضرورتوں اور آدرشوں کے ساتھ جڑا ہو اور جو سرپر پڑی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کی زیادہ لیاقت رکھتا ہو۔"

آزاد ہندوستان کی سرکار نے چند برسوں تک گاندھی جی کے تعلیمی خیالات کو آزمایا۔ بیسک تعلیم (نئی تعلیم) کے تصور کو چھٹی دہائی کے دوران دیہی علاقوں میں کچھ مدت کے لیے آزمایا گیا لیکن تعلیمی معاملات کی پالیسی تشکیل دینے والے ذمہ دار لوگوں نے جلد ہی اس کو تیاگ بھی دیا۔ لبرل آرٹس کے مضامین کے پرانے تعلیمی نظام کو تمام تر حوصلہ افزائی حاصل ہوئی اور کرافٹ کا سلسلہ اسکول کی سطح پر ختم کر دیا گیا۔ اعلا سطحوں پر پیشہ ورانہ مہارت سے دامن کشی اختیار کی گئی۔ اس طور پر ہم نے بے روزگار، کم روزگار شدہ اور ناقابل روزگار گریجویٹ نوجوانوں کی ایک زبردست فوج تیار کر لی۔ ڈگری کا حاصل کرنا کلرکی یا دیگر ایسے کاموں کے حصول کا پاسپورٹ بن گیا ہے کہ جو اسکول/کالج میں حاصل کی گئی تعلیم و تربیت سے کچھ بھی علاقہ نہیں رکھتے۔ بعض اوقات ایم۔اے پاس تک بس کنڈکٹر، آفس کے کلرک یا اور ایسے ہی پست کاموں میں جا کر لگتے ہیں۔ گریجویٹ نوجوانوں کی اچھی خاصی تعداد ایسی ہے کہ جو نہ تو کسی جسمانی مشقت کے کام میں لگنا چاہتی ہے اور نہ کاریگری یا خود روزگار پیشوں میں۔

یو۔جی۔سی نے جو تعلیم کو پیشہ ورانہ رنگ دینے کی کوششیں کی ہیں۔ ان کا ماحصل محض اتنا ہے کہ انڈر گریجویٹ سطح پر پروگرام میں ایک پیشہ ورانہ مضمون کا اضافہ ہو گیا ہے۔ بی۔اے، بی۔ایس۔سی اور بی۔کام کی سطحوں پر جو فی الحال مضامین پڑھائے جا رہے ہیں ان میں صرف ایک پیشہ ورانہ مضمون بڑھ جانے سے آج کے نوجوانوں کے ناقابل روزگار ہی کا مسئلہ کسی قابل لحاظ حد تک حل نہیں ہو سکتا۔ پیشہ ورانہ تعلیم کا آغاز اسکول سے ہونا چاہیے اس سے آزاد خیال روایت کی کالج کی تعلیم کے لیے جو اندھی دوڑ لگی ہوئی ہے اس کو کم کرنے میں مدد ملے گی اور لڑکے لڑکیاں کم عمری میں ہی کیریئر پسندی کا رجحان اور شعور حاصل کریں گے۔ اس کے علاوہ یو۔جی۔سی کو کچھ اقدامات کرنے پڑیں گے۔ کریڈٹ اور سمیسٹر نظام کو متعارف کرانے کے لیے اس کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:۔

آج کل جو طلبا سائنس سے گریجویشن کرتے ہیں۔ ان کا سابقہ سماجی علوم یا زبانوں کے کسی مضمون سے نہیں پڑتا۔ ہمارے موجودہ نظام کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ بیشتر کالج گریجویٹ اپنے ملک اور دنیا کے سماجی اقتصادی حقائق سے لاتعلق اور بے بہرہ ہیں۔ وہ اپنے گلی محلے کے مسائل سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔

کریڈٹ اور سمیسٹر نظام (سی ایس ایس)

ہم کو ہندوستان میں تمام سطحوں کی تعلیم کی از سر نو تشکیل کرنی پڑے گی۔ اس کے لیے کریڈٹ اور سمیسٹر نظام متعارف کرانا پڑے گا جو طلبا کو مخصوص مضامین کے انتخاب میں ایک قسم کی لچک فراہم کر سکے۔ پیش کردہ کورس کی فہرست سے انتخاب کی آزادی طلبا کو بہت سے اختیاری

مضامین پڑھنے کا موقع فراہم کرے گی اور اس طرح وہ ہمہ جہت معلومات و علم حاصل کریں گے کہ جو بھرپور زندگی جینے کے لیے ضروری ہے۔

سی۔ ایس۔ ایس کے تحت کسی کالج میں آفر کیے جانے والے بہت سارے کورس طلبا کو اپنی واقعی پسند کا کورس لینے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور آج کل جو طلبا سائنس سے گریجویشن کرتے ہیں ان کا سابقہ سماجی علوم یا زبانوں کے کسی مضمون سے نہیں پڑتا۔ ہمارے موجودہ نظام کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ بیشتر کالج گریجویٹ اپنے ملک اور دنیا کے سماجی اقتصادی حقائق سے لاتعلق اور بے بہرہ ہیں۔ وہ اپنے گلی محلہ کے مسائل سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔ وہ اپنی کتابوں اور سالانہ امتحانات کی بے دلی اور میکانکی طور پر پیروی کرتے ہیں۔ سی۔ ایس۔ ایس۔ ان کو اعلا تعلیم میں درکار ناگزیر لچک فراہم کرے گا اور اعلا تعلیم کو آج کے مطابق اور آج سے مربوط بنا دے گا۔ تعلیم حاصل کرنے والوں میں جو امتحان کے زاویہ سے منتخب پڑھائی کرنے کا رجحان ہے وہ اس کو کم کرے گا۔

ہندوستان میں آج کی اعلا تعلیم پورے طور پر امتحان یا سالانہ امتحانات کے تابع ہے حالاں کہ اس کو ایسے ٹکڑوں میں منقسم ہونا چاہیے جو الگ الگ آنکے جائیں مگر ان میں تسلسل ہو اور پھر اس میں بہ آسانی تحلیل ہو سکیں۔ سالانہ نظام کے بجائے ہم سمیسٹر (ششماہی) طریقہ اختیار کریں۔ علوم کے ایک بڑے رقبہ کو لینے کے بجائے اس کے منطقی حصے کیے جائیں اور کورس کی اکائیوں کے طور پر آفر کیے جائیں۔

کسی ایک کورس کی اکائی میں تدریس اور اس کی جانچ پرکھ ۱۴ یا ۱۵ ہفتوں میں پوری کی جانی چاہیے۔

ہر ایک کورس کو اتنے ہی کریڈٹ دیے جاتے ہیں جتنے گھنٹے وہ پڑھایا جائے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی کورس ۱۴ یا ۱۵ ہفتے کے سمیسٹر کے دوران محض ایک گھنٹہ فی ہفتہ پڑھایا جاتا ہے تو اس کو ایک کریڈٹ دیا جائے۔ جو طالب علم ۱۴ یا ۱۵ ہفتہ کے ایک سمیسٹر میں اپنے اختیار کردہ کورس کی ہر ہفتہ ایک گھنٹہ کی کلاس پڑھنے کی شرط پوری کرے گا وہ ایک کریڈٹ پائے گا۔ بیشتر کورس ۳ کریڈٹ والے کورس ہیں۔

نصاب پڑھانے والا اور پڑھنے والا طالب علم دونوں ہی سمیسٹر کے دوران ہوشیار رہیں گے کیوں کہ یہاں پڑھانے کا طریقہ سالانہ/روایتی طریقہ سے مختلف ہے۔ اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ طلبا کو اپنے مضمون کی تازہ ترین معلومات فراہم کریں اور ان کی رہنمائی کریں۔ طلبا محض نصابی کتابوں، لکچر نوٹس یا اوٹ پٹانگ گائڈوں یا بازاری نوٹس پر دارومدار نہیں رکھ سکتے۔ سی۔ ایس میں اساتذہ صحیح معنوں میں طالب علم کے رہبر ہیں نوٹس لکھوانے کی مشین نہیں۔ کیوں کہ ہر ایک علم لگاتار پھیل رہا ہے اس لیے بازار کے چھپے چھپائے نوٹس طلبا کے لیے زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔ طلبا کو لائبریری کی اپنی تلاش و جستجو کلاس کے اندر اور باہر اور سیمیناروں میں اساتذہ اور اپنے ساتھی طلبا کے ساتھ رابطہ پر زیادہ دارومدار رکھنا پڑے گا۔ بدقسمتی سے موجودہ نظام کے اساتذہ اس نئے نظام کے حق میں زیادہ نہیں ہیں۔

طلبا کو حوصلہ مندی کے ساتھ اس چیلنج کے سامنے اپنی لیاقت ثابت کرنے کا موقع ملتا ہے جس کو جواہر لال نہرو نے "تصورات کا ایڈونچر" کہا تھا۔ گاندھی جی نے جو توقع وابستہ کی تھی کہ اعلا تعلیم کے وسیلہ سے طلبا سب کچھ لپیٹ لینے والی شخصیت سے آشنا ہوں گے شرمندۂ تعبیر ہو سکتی ہے اگر کالج اور اعلا تعلیم کے تمام ادارے سی۔ ایس۔ ایس نظام اختیار کر لیں گے۔

سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اساتذہ کو اپنے نئے نئے طریقوں سے طلبا کی اعانت کرنے کی آزادی حاصل ہوگی۔ اساتذہ اور طلبا جس موجودہ نظام کی پیروی کر رہے ہیں وہ تین مضامین اور دو زبانوں پر مشتمل ایک سخت اور بے لوچ سانچہ ہے جہاں تدریس اور جانچ پرکھ ساتھ ساتھ نہیں ہیں۔ اعلا تعلیم کا یہ ایک پھیکا بے ذائقہ نظام ہے۔ اساتذہ دقیانوسی نصاب کے بھروسے رہتے ہیں جو شاید ان کے اپنے کالج کے دنوں کا ہوتا ہے۔ اس میں طلبا کو گھر یا لائبریری میں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے وہ بہ آسانی کلاسوں سے غائب رہتے ہیں۔ (کلاس نہ بھی چھوڑیں تو کام کے اوسط دنوں کی تعداد سو سے زیادہ نہیں ہوتی کم از کم کیرالہ کے متعلق تو یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے جو ۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستان کی سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ریاست کہی جا سکتی ہے۔ جب کہ یو۔ جی۔ سی کے مقرر کردہ اصول کے مطابق عام طور پر طلبا کو ۱۸۰ سے لے کر ۲۰۰ دنوں کی پڑھائی کے بعد ہی سالانہ امتحان میں شرکت کرنی چاہیے) اگر حال یہ ہے تو کالج میں حاضری کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں نہ وہی از کار رفتہ امتحانی نظام اختیار کر لیا جائے جہاں یونیورسٹی کا کام صرف یہی ہو کہ امتحان لے اور یونیورسٹی امتحان لینے والا ادارہ بن جائے اور بس اس سے زیادہ

جدید مغربی تعلیم کے لازمی پہلو از منہ قدیم میں بھی پائے جاتے تھے۔ نالندہ، تکشلا اور وکرم شلا جیسے بدھ اداروں میں پائے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر نالندہ میں کیمپس تھا جس میں معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ تھا اور یہ مقامی اور غیر ملکی اسکالروں کے لیے کھلا تھا۔

نہیں؟

ہڑتالوں، بندوں، احتجاجوں، دھرنوں اور پتا نہیں کس کس چکر میں کلاس کے دنوں کو ضائع کیا جاتا ہے لیکن کلاس کے دن بھی ایمانداری کی بات یہ ہے کہ بے کلاس کے دن ہیں۔ دراصل وہ بھی ہر ریاست کی پہلے سے اعلان شدہ لمبی چوڑی چھٹیوں کے ساتھ بے اعلان شدہ چھٹیاں ہی ہیں۔ ہمارے ملک میں دنیا میں سب سے زیادہ چھٹیاں منائی جاتی ہیں۔ ہم اپنے لڑکے لڑکیوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ کوشش اور محنت کے بغیر آدمی تعلیم یافتہ بن سکتا ہے۔ ہمارے اساتذہ اپنے شاگردوں کے سامنے عمل کا یہ نمونہ پیش کرتے ہیں کہ کلاس میں دیر سے آتے ہیں اور جلدی چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کو یہ فرصت کہاں کہ گھنٹہ بھر روز انہ لائبریری میں جاکر بیٹھیں اور اپنے علم و معلومات کا ذخیرہ بڑھائیں جس سے ان کے شاگردوں کے علم میں اضافہ کی سبیل پیدا ہو۔ مگر کیا وہ واقعی اپنے طلبا کو اپنا علم منتقل کرنا چاہتے ہیں؟

یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ ہندوستان میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعداد بے تحاشہ بڑھنے کے باوجود جیسا کہ چاہیے تھا تعلیم نے تعلیم یافتہ لوگوں میں ملک کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالات کا شعور نہیں پیدا کیا جو ملک کو پرانے نظاموں اور طریقوں کی زنجیروں سے آزاد کراتا۔ یہ خواب ابھی تک محض خواب ہی ہے۔ ابھی تک نہ تو پرائمری تعلیم سب تک پہنچ پائی ہے، نہ ہی پرائمری تعلیم میں پیشہ ورانہ تعلیم کا رنگ آیا ہے اور نہ ہی اعلا تعلیم پیشہ ورانہ رنگ میں رنگی گئی ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بڑی مقداروں میں روپیہ کا خرچ (چاہیے تھا جی۔ این۔ پی کا ۳ فی صد ہو ۶ فی صد) تعلیم یافتہ طبقہ کے بہترین عنصر کو بروئے عمل لانے میں ناکام ہو رہا ہے۔ (تعلیم کے معنی ہی اس عنصر کا عمل میں آنا ہیں)۔

گاندھی جی کے تعلیمی وژن کی اساس

ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جسمانی مشقت دماغی کام کے مساوی ہے۔ ان کی اسکیم میں مشقت کا بول بالا اعلا مقام رکھتا تھا۔ لیکن آج ہم کیا دیکھتے ہیں؟ تعلیم یافتہ ہاتھ سے کام کرنے سے انکاری ہیں۔ اعلا ڈگری یافتہ نچلی سطح کے کام کے امیدوار بنتے ہیں اور پھر اس کام کو کرنے سے انکار کرتے ہیں یا غیر اطمینان بخش کام سر انجام دیتے ہیں۔

نو آبادیاتی دور میں جس تعلیم کو رائج کیا گیا تھا آزاد ہندوستان میں تعلیمی کمیشنوں اور ان کی سفارشات کے باوجود وہی تعلیم چل رہی ہے۔ رادھا کرشنن کمیشن، کوٹھاری کمیشن، آدی سیشیہ کمیشن، پوترا کمیشن اور ڈھیر ساری یو جی سی کمیشنوں اور ٹاسک فورسوں نے بہت سی سفارشات پیش کی ہیں۔ ان کو اگر لاگو کیا جاتا تو اعلا تعلیم کا معیار بلند ہو جاتا۔ بدقسمتی سے ان سفارشات کو لاگو نہیں کیا گیا البتہ نئی کمیٹیاں اور کمیشن وجود میں آگئیں۔ کوئی حقیقی تبدیلی نہیں کی گئی اس وجہ سے پرانے نظامات آج بھی چل رہے ہیں۔ بنیادی تبدیلی 'نا' کے برابر ہوتی ہے۔

بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت

کیا بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟ بعض لوگ بشمول ماہرین تعلیم سمجھتے ہیں کہ بنیادی تبدیلیاں ضروری نہیں ہیں۔ وہ موجودہ نظام سے مطمئن ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اعلا تعلیم کا جو نظام برطانیہ نے یہاں قائم کیا تھا اس نے انسانی عمل کے تمام دائروں میں

بڑے ممتاز مرد و زن پیدا کیے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس نظام میں زبردست تبدیلیاں لائی جا چکی ہیں اور اس ملک میں کہ جس نے جدید نظام تعلیم ہندوستان میں شروع کیا تھا اس نظام کے بعض پہلوؤں کو بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ تبدیلی قانونِ حیات ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ تعلیم کی دنیا میں اہم اور بڑے زینے چڑھیں تو بدلنا تو ہم کو پڑے گا۔

علم ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے اور جب تک ہم اپنے بہت دنوں پہلے کے بے لوچ اور کڑے نظاموں کو بدلیں گے نہیں ہم اس ملک کا کچھ بھلا نہیں کر پائیں گے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستانی تعلیم سے متعلق ہر چیز کہ جو زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے رد کر دی جائے۔ جدید مغربی تعلیم کے لازمی پہلو ازمنہ قدیم میں پھلنے پھولنے والے نالندہ، ٹکسلا اور وکرم شلا جیسے بدھ اداروں میں پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر نالندہ میں کیمپس تھا جس میں معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ تھا اور یہ مقامی اور غیر ملکی اسکالروں کے لیے کھلا تھا۔ اس میں لائبریری کی تین عمارتیں تھیں کہ جو ہندوستان اور پڑوسی ممالک کے ۸۵۰۰ ریزیڈنٹ طلبا اور ۱۵۰۰ ہندوستانی طلبا کی ضرورت کو پورا کرتی تھیں۔ مختصر مدتوں کے لیے آئے ہوئے کئی درجن غیر ملکی اسکالر موجود رہتے تھے جو ان لائبریریوں سے استفادہ کرتے تھے۔ اس کیمپس میں سات بڑے آڈیٹوریم اور درجنوں چھوٹے ہال تھے جہاں ممتاز اساتذہ کے روزانہ کم و بیش سو لکچر ہوا کرتے تھے۔ نالندہ پورے ایشیا میں نہ سہی تو جنوبی ایشیا قدیم میں اعلا تعلیم کا بہترین ادارہ تھا۔ باہر

آزادی کے وقت ہندوستان میں ۲۰ یونیورسٹیاں، ۴۹۶ کالج اور انجینئرنگ [illegible] تعلیم و تربیت کے [illegible] کالج اور میڈیکل کے [illegible] ادارے تھے [illegible] ۸۰۰۰ کالج ہیں۔ اعلا تعلیم میں [illegible] سے آزادی [illegible] کا شاخسانہ ہے

کی دنیا سے ہندوستان آنے والے مشہور مسافروں (جیسے ہوان سانگ) مثال کے طور پر نالندہ کی عظمت کی تصدیق کی ہے۔ یہاں تک کہ اکیڈمک خود مختاری کا جدید تصور بھی قدیم ہندوستانی یونیورسٹیوں میں رائج تھا۔

بہرکیف سماجی اقتصادی اور سیاسی وجوہات کی بنا پر ہندوستان میں اسکالرشپ کی روایت زوال پذیر ہوگئی۔ یہ حیثیت تعلیم کی اجارہ داری اونچی ذاتوں میں بھی ہوگئی۔ (چھوٹی ذاتوں اور اچھوتوں کی رسائی تعلیم تک ہی نہیں، اعلا تعلیم کا تو ذکر کیا) اسی لیے جب مشہور زمانہ (یا بدنام زمانہ؟) منٹ آف میکالے (۱۸۳۵) نے یونیورسٹی سطح کی انگریزی تعلیم کو لاگو کیا تو یہاں کی اونچی ذاتوں نے اس کا خوب فائدہ اٹھایا۔ انگریزی تعلیم کو حاصل کیا اور اس کی بنیاد پر برطانوی حکومت کے مال، قانون اور دیگر محکمہ جات میں اچھی نوکریاں حاصل کیں۔ ہندوستانی تعلیم یافتہ میں جو شعور ابھرا تھا وہ انگریزوں کے مساوی حقوق حاصل کرنے کا تھا۔

جب ۱۸۵۷ء میں ایکٹ آف ۱۸۵۷ء کے ذریعہ کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں تین یونیورسٹیاں قائم کی گئیں تو ۲۷ کالج پہلے سے ہی چل رہے تھے جو ان تین یونیورسٹیوں سے جوڑ دیے گئے۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصہ میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعداد میں اضافہ جو کچھ ہوا وہ بڑی دھیمی رفتار سے ہوا۔ آزادی کے وقت جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ہندوستان میں ۲۰ یونیورسٹیاں، ۶۳۴ کالج اور انجینئرنگ کی پوسٹ گریجویٹ تعلیم و تربیت کے پانچ اور میڈیسن کے ۲۲ ادارے تھے۔ آج ۲۲۰ یونیورسٹیاں اور ۸۰۰۰ کالج ہیں۔ اعلا تعلیم میں غیر معمولی اضافہ دراصل غیر ملکی راج سے آزادی ملنے پر لوگوں کی بڑھی ہوئی توقعات کا شاخسانہ ہے۔

بات بہرکیف وہیں کی وہیں ہے کہ اعلا تعلیم کے اداروں میں اس زبردست اضافہ کے باوجود اعلا تعلیم کے متمنی تمام افراد اس کو حاصل نہیں کر سکتے۔ ڈھا پچنے کے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سہولیات کافی نہیں ہیں اور جو سہولیات حاصل ہیں ان کا سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تمدنی اسباب کی بنا پر پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ بہت اہم سوالات جن کے موزوں جوابات ڈھونڈ کر نکالنے ہوں گے ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

۱۔ اعلا تعلیم جس قسم کی یہاں پیش کی جا رہی ہے کیا وہ ملک کے لیے موزوں ہے؟

۲۔ کیا ہائی اسکول پاس کرنے والے لوگوں کو اعلا تعلیم میں جانا چاہیے؟

۳۔ کیا روزگار کے ہر ایک متلاشی کو یونیورسٹی ڈگری کی ضرورت ہے؟ کیا روزگار اور ڈگری کا ناطہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ کیا وہ سب جو اعلا تعلیم حاصل کرتے ہیں ٹھیک طرح کی نوکری پا جاتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہم اعلا تعلیم کی منزل اور ما فیا کو بدل سکتے ہیں؟

۵۔ کیا کورسوں کی ساخت، کورس بنانے کا طریقہ اور کورس منتخب کرنے کی طرز ان سب کو بالکل بدل دینا چاہیے؟ کیا نوجوانوں کی انفرادی صلاحیتوں اور منازل مقصود کی سربراہی کے لیے کورس کی پیش کش میں لچک لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا اس کی ضرورت نہیں ہے کہ نوجوانوں اور بزرگوں کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کا موقع اپنی اپنی رفتار کے مطابق حاصل ہو تاکہ وہ پہلے اپنے فوری معاشی تقاضے پورے کریں اور پھر کالج پلٹ کر آ سکیں۔

۶۔ کیا تکنیکی اور پیشہ ورانہ کورسوں کے مزید مواقع فراہم کیے جا سکتے ہیں جس سے نہ صرف اسکالروں کو ملازمت حاصل ہو بلکہ وہ اپنی خود کی تجارت و صنعت بھی قائم کر سکیں۔

۷۔ کیا اعلا تعلیم کی نئی خاکہ بندی کی ضرورت نہیں ہے اس طور پر کہ وہ قومی یکجہتی اور قومی نشوونما میں معاون ہو۔

۸۔ کیا ہر کالج اور یونیورسٹی میں لائبریری، ریڈنگ روم، لیباریٹری، کمپیوٹر اور ورزش والے کھیل کی کما حقہ سہولیات مہیا ہیں۔ (ورزش والے کھیل ہر ایک کے لیے لازمی ہونے چاہئیں ماسوا ان کے جن کو ڈاکٹر نے منع کیا ہے)۔

۹۔ کیا یونیورسٹی کالج کے موجودہ الحاقی نظام پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اس طور پر کہ کالج کا انتظامیہ، تدریس، کورسوں کی تشکیل اور جانچ پرکھ تمام امور میں زیادہ خود مختاری آئے۔ کیا یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بندوبست میں حقیقی اکیڈمک، انتظامی اور اقتصادی لامرکزیت آ سکتی ہے۔

۱۰۔ ہم یونیورسٹیوں اور کالجوں کو کس طرح سماج کے ساتھ ملک کے سماجی، اقتصادی اور ترقی کے مسائل کے حل کے ساتھ اور زیادہ ہم رشتہ کر سکتے ہیں۔ کس طرح یونیورسٹی کے صنعت، مقامی انتظامیہ اور مقامی لوگوں کے ساتھ تفاعلات کو تقویت پہنچائی جا سکتی ہے اور ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کے مواقع زیادہ اور موثر بنائے جا سکتے ہیں۔

۱۱۔ کیا ہم تدریس و تعلیم کے زیادہ غیر رسمی اور کھلے نظامات قائم کر سکتے ہیں تاکہ نئی یونیورسٹیاں اور نئے کالجوں کے قیام کا اقتصادی بار ممکنہ حد تک کم کیا جا سکے۔

۱۲۔ کیا یونیورسٹیاں تعلیم اور لیڈرشپ کے حقیقی مراکز بن سکتی ہیں تاکہ ملک کو صحیح طرح سے ان کا فائدہ پہنچے خاص طور سے عورتوں اور آبادی کے نقصان رسیدہ طبقات کو طاقت دلانے میں۔ ان طبقات کی ترقی کے بغیر ملکی حالات میں حقیقی بہتری نہیں حاصل کی جا سکتی۔

۱۳۔ دیہاتی علاقوں میں بودوباش کے حالات بہتر بنانے میں تعلیم کیا کردار ادا کر سکتی ہے۔ صحت، حفظان صحت، ماحول، تحفظ غذا، خواندگی، روزگار، سڑک راستہ، ہنرمندی، کھیل کود اور ثقافتی تفریحی سہولیات، آب رسانی نظامات، نقل و حمل اور رسل و رسائل؟ کیا اعلا تعلیم دیہاتی زندگی سے کوئی علاقہ رکھتی ہے؟

باقی صفحہ ۴۲ پر

کے۔ جی۔ جوگلیکر

ہندوستانی جمہوریت: ابتدائی ۵۰ برس

ہندوستانی آئین ان معنی میں ایک قابل ذکر دستاویز ہے کہ اس نے روایت اور جدیدیت، وفاقی ڈھانچے اور مضبوط مرکز نیز سماجی انصاف کے تقاضوں اور فرد کے حقوق کے درمیان توازن پیدا کیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ اب جب کہ ہم اپنی آزادی کے پچاس ویں برس میں داخل ہو رہے ہیں یہ مناسب ہوگا کہ آئین پر نظر ثانی کی جائے اور اس کے عمل درآمد کو بہتر بنانے کے لیے ممکنہ خامیوں کو درست کیا جائے۔

جمہوریت کو اکثر عوام کی، عوام کے ذریعہ منتخب اور عوامی مفاد میں کام کرنے والی حکومت کہا جاتا ہے۔ امریکہ اور دیگر ممالک کے آئین جو تحریری شکل میں ہیں یا برطانیہ کا آئین جو تحریری شکل میں نہیں ہے بلکہ روایات پر مبنی ہے، دونوں ہی میں ایسی ہی طرز حکومت کے قیام کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں اقسام کے آئین میں قابل غور یکسانیت بھی ہے۔ برطانیہ میں اقتدار کا مرکز شہنشاہ تھا، پھر امراء ہوئے اور اب عوام کا منتخب کردہ "ہاؤس آف کامنس" ہے۔ امریکہ میں عدالتی فیصلوں نے حکومت کی نوعیت میں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ آج وہاں کی وفاقی حکومت کے پاس ابتدائی آئینی منصوبے کے مقابلہ کہیں زیادہ اختیارات ہیں۔ یہ سب کچھ ارتقا کے عمل کے تحت انجام پذیر ہو سکا۔ آئینی ارتقا کا عمل برطانیہ میں اتفاق رائے سے اور امریکہ میں عدالتی فیصلوں کے ذریعہ ممکن ہو سکا۔ اس سلسلے میں جو بھی چیلنج سامنے آیا اس کا مقابلہ کیا گیا اور مسئلہ کا حل تلاش کیا گیا۔

ہندوستان ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوا۔ ہمارے آئین سازوں نے ملک کو نیا آئین دینے کے کام کو جلدی ہی نمٹا لیا۔ آئین ساز اسمبلی نے ۲۶ رنومبر ۱۹۴۹ء کو آئین کو منظوری دی اور ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو اس کا نفاذ عمل میں آیا۔

ہندوستان ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوا۔ ہمارے آئین سازوں نے ملک کو نیا آئین دینے کے کام کو جلدی ہی نمٹا لیا۔ آئین ساز اسمبلی نے ۲۶ رنومبر ۱۹۴۹ء کو آئین کو منظوری دی اور ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو اس کا نفاذ عمل میں آیا۔

یہ ایک قابل قدر کارنامہ تھا کیوں کہ بہت سے ممالک جو ہندوستان کے ساتھ آزاد ہوئے تھے وہ ابھی اپنا آئین مرتب نہ کر سکے تھے۔ ہندوستان کے بعد آزادی حاصل کرنے والے ممالک نے ہندوستان میں ہوئی آئین سازی کی کوششوں سے فائدہ اٹھایا۔ ہندوستانی آئین ان معنی میں ایک قابل ذکر دستاویز ہے کہ اس نے روایت اور جدیدیت، وفاقی ڈھانچے اور مضبوط مرکز، سماجی انصاف کے تقاضوں اور فرد کے حقوق نیز دیگر میدانوں میں متضاد مطالبات کے درمیان توازن پیدا کیا ہے۔

گو آئین سازوں کو اس آئین پر فخر تھا جسے انھوں نے تیار کیا تھا لیکن انھیں اپنی حد بندیوں کا اندازہ تھا۔ جب کسی نو تعمیر شدہ مکان کے مکین مکان میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ عمارت ساز نے کون کون سی خامیاں چھوڑ دی ہیں۔ تبدیلیاں اس لیے بھی ضروری ہوتی ہیں کیوں کہ حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ضروریات بڑھتی رہتی ہیں۔ اسی طرح جب کسی

آبادی سو کروڑ تک پہنچ جائے گی اور لوک سبھا کے اراکین کی تعداد بڑھ کر ۲۰۰۰ کرنی ہو گی۔ اسی طرح اتر پردیش اسمبلی کے اراکین کی تعداد ۸۰۰ ہونی چاہیے۔ اتنے بڑے ایوان کو چلانا ناممکن ہوگا۔

لیکن اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو لوک سبھا کے حلقے آبادی کے اعتبار سے اتنے بڑے ہو جائیں گے کہ امیدواروں کے لیے ووٹرس سے رابطہ قائم کرنا دشوار ہوگا اور کوئی بھی ممبر پارلیمنٹ اپنے حلقے سے رابطہ نہیں رکھ پائے گا۔ باہری دہلی حلقے میں تقریباً ۳۰ لاکھ رائے دہندگان ہیں۔ مہاراشٹر میں

[illegible]

تھانے کا دوسرا نمبر ہے جہاں ۲۶ لاکھ ووٹر ہیں۔ کسی کے لیے بھی یہ دعوی کرنا ناممکن ہے کہ وہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کے مفادات کا تحفظ کر سکتا ہے یا اپنے حلقے کے دور دراز علاقوں کا دورہ کر سکتا ہے۔ اس وقت یو پی اسمبلی کے بہت سے حلقوں میں رائے دہندگان کی تعداد ۱۹۵۲ء میں لوک سبھا حلقے کے رائے دہندگان کی تعداد کے برابر ہے۔ ان حلقوں کی از سر نو حد بندی سے مسئلہ جزوی طور پر ہی حل ہو سکتا ہے، جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے از سر نو غور اور نئی پہل۔

موجودہ نظام کے تحت جس امیدوار کو سب سے زیادہ ووٹ ملتے ہیں وہ منتخب قرار دیا جاتا ہے۔ اکثر ایک امیدوار کے خلاف بہ حیثیت مجموعی پڑنے والے کل ووٹ اس کو ملنے والے ووٹوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر کسی سیاسی جماعت کو ووٹوں کی اکثریت تو حاصل ہو جاتی ہے لیکن سیٹوں کی اکثریت حاصل نہیں ہوتی۔ ۵ فی صد ووٹوں کے ادھر ادھر ہونے سے بہت بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔

آئین پر نظر ثانی کرتے ہوئے ان خامیوں کو مد نظر رکھا جانا چاہیے اور ان کو دور کرنے کے طریقے وضع کیے جانے چاہئیں۔

صدارتی طرز حکومت اختیار کرنا ایک بہت بڑی تبدیلی ہوگی جو ملک گیر بحث کے بعد ہی عمل میں آسکتی ہے۔ لیکن انتخابی نظام کی فوری خامیوں کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ اگر لوک سبھا یا ریاستی اسمبلی میں کسی جماعت کو اکثریت حاصل نہ ہو تو ایک سیاسی جماعت چھوڑ کر دوسری سیاسی جماعت میں چلے جانے سے مفاد پرستانہ سیاست کو فروغ ملتا ہے۔ ہمیں اس مسئلہ کا حل ڈھونڈنا ہوگا۔

بہ اعتبار تناسب نمائندگی کے اصول کا اطلاق ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں نہیں ہو سکتا۔ تب کیا ہمیں یہ طریقہ اپنانا چاہیے کہ نصف نشستوں کے لیے انتخاب براہ راست ہو اور نصف کے لیے متناسب نمائندگی کے اصول کی بنیاد پر۔ اس سلسلے میں جاپان میں کامیاب تجربہ کیا گیا ہے۔

توجہ کا طالب دوسرا معاملہ راجیہ سبھا کا اور ریاستی قانون ساز کونسلوں کے وجود کا ہے۔ یہ ایوان نظر ثانی کے لیے تھے لیکن حالیہ برسوں میں ان ایوانوں میں وہی کام دہرایا جاتا ہے جو ایوان زیریں انجام دیتا ہے۔ ہماری راجیہ سبھا نے تو

[illegible]

امریکی سینٹ کی طرح کے اختیارات رکھی ہے نہ ہی یہ برطانیہ کے ہاؤس آف لارڈس کی طرح بے اثر ہے۔ اس کی کارکردگی پر از سر نو نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ لوک سبھا کے برخلاف راجیہ سبھا ریاستوں کی نمائندہ کرنے والا ایوان تصور کی جاتی ہے۔ اس کے اراکین کا تعلق اسی ریاست سے ہونا چاہیے جس کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں۔ لیکن اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اراکین جن ریاستوں سے منتخب ہو کر آئے ہیں وہ وہاں کے باشندے نہیں ہوتے۔ اسے محض آئین کی تکنیکی خلاف ورزی کہا جا سکتا ہے۔

لیکن ایک اور پہلو کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ پنجاب اور جموں و کشمیر جیسی ریاستیں طویل عرصہ تک صدر راج کے تحت رہی ہیں اور وہاں کی ریاستی اسمبلیاں تحلیل ہونے کے سبب وہاں سے راجیہ سبھا کا انتخاب نہ ہو سکا۔ کیا ایسی ریاستوں کے عوام کو مرکز اور ریاستوں میں ان کی نمائندگی کے حق سے محروم رکھا جانا چاہیے جب کہ اس میں ان کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ کسی اور ریاست سے راجیہ سبھا کے لیے منتخب ہونا باریکی سے دیکھا جائے تو آئین کے اصولوں سے ہم آہنگ نہیں ہے لیکن اس سے کم از کم ایسی ریاست کے سیاست داں کو عوام کی شکایات رکھنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

سب ہی جانتے ہیں کہ پنجاب میں دہشت گردی چند اضلاع تک محدود تھی اور جموں و کشمیر میں یہ صرف وادی کشمیر تک محدود ہے لیکن کیوں کہ اسمبلی تحلیل تھی اور ریاست مرکزی انتظام کے تحت تھی تو ریاست کے ان علاقوں میں بھی جہاں نسبتاً امن تھا۔ لوک سبھا تک کا الیکشن نہ ہو سکا۔ اس طرح ان علاقوں کے لوگوں کو ناکردہ گناہوں کی سزا ملی۔ آئین پر کی جانے والی کسی بھی نظر ثانی میں اس سوال پر غور کر کے اس کا حل تلاش کیا جانا چاہیے۔

اس بات کا سہرا ہندوستان کے سر ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ آزاد ہونے والے دیگر ممالک میں آمریت اور فوجی حکومت کے دور بھی آئے لیکن ہندوستان میں جمہوریت مسلسل فروغ حاصل کرتی رہی۔ ہندوستانی ووٹر نے ناپسندیدہ کارکردگی کی بنیاد پر بڑے بڑے طاقتور رہنماؤں کو اکھاڑ پھینکا۔ بلدیاتی اداروں کو اختیارات کی منتقلی سے جمہوریت کی بنیادیں مضبوط ہوئی ہیں۔

قانون ساز اداروں میں خواتین کے لیے نشستیں محفوظ رکھنے کی تجویز اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ سیاسی جماعتیں سماج کے نظر انداز کیے

باقی صفحہ ۵۲ پر

اے۔ کے۔ چکربرتی

ہماری دفاعی تیاری

ہندوستان کی مسلح افواج نے بہت سی قابل ذکر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ لیکن مضمون نگار کا کہنا ہے کہ چونکہ جمہوری نظام میں جنگ یا کوئی بھی بیرونی خطرہ مکمل اجتماعی تیاری کا مقتضی ہوتا ہے۔ لہٰذا تمام پہلوؤں سے عوام کا تعاون نہ صرف زیادہ سے زیادہ کھلا پن لاکر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

جموں وکشمیر میں جنگ وجدال کے دوران آزاد ہندوستان کا جنم ہوا۔ ملک کے بٹوارے، لوگوں کی مہاجرت اور اکتوبر ۱۹۴۷ء میں وادی کشمیر میں پاکستان کے حملہ کے نتیجہ میں جو قتل عام ہوا اس نے عوام میں عدم سلامتی کا احساس پیدا کیا۔ لیکن انگریزوں نے اپنے پیچھے جن مسلح افواج کو چھوڑا تھا اور اس وقت جو ڈھانچہ دستیاب تھا وہ پاکستان کی شرارت کو کچلنے کے لیے کافی ثابت ہوا۔

بعد میں جس آسانی سے ہمیں جوناگڑھ (۱۹۴۷ء) حیدرآباد (۱۹۴۸ء) اور گوا (۱۹۶۱ء) کو ہندوستان میں یک جہت کرنے میں کامیابی ہوئی اس نے ضرورت سے زیادہ اعتماد پیدا کردیا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم اپنے پڑوسیوں کے بالخصوص چین کے نیک ارادوں پر یقین کرکے آسودہ خاطری کا شکار ہوگئے۔

جب اکتوبر ۱۹۶۲ء میں چین نے ایک زوردار جھٹکا دیا تو اہل حکم کو ہر موسم میں متحرک ہوسکنے والی برّی، بحری اور فضائی فوج کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس وقت خوف اور عدم تحفظ کے احساس نے لوگوں کو جکڑ رکھا تھا اور کچھ لوگوں کو تو ملک کی علاقائی سالمیت کے تحفظ کے تعلق سے ہماری صلاحیت کار اور قوت عمل پر بھی شبہ تھا۔ شمال مشرق کے عوام نے ایک لمحہ کے لیے محسوس کیا کہ انھیں خود ان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان واقعات کے پس منظر میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شمال مشرق میں چین کے رسوا کن حملہ کے بعد ہی دفاعی تیاری کی منصوبہ بندی کا آغاز ہوا۔

ہمارے فضائی، بحری اور برّی فوجی بیڑوں کی ترقی کے لیے اس وقت کے سوویت یونین کے تعاون اور ساتھ ہی فرانس اور برطانیہ کے ذریعہ بحری اور فضائی بیڑوں کی توسیع اور جدید کاری کے لیے فراہم کی گئی امداد کے نتیجہ میں ہم ۱۹۶۵ء میں جموں وکشمیر اور گجرات میں "کچھ کے رن" میں پاکستان کی نئی جارحیت کا سدباب کرنے کے قابل بنے۔ پاکستان کو اچھی طرح سے اور حقیقی معنوں میں پسپا کردیا گیا اور تاشقند کے معاہدہ امن کا جواز ۱۹۷۱ء تک باقی رہا۔

مرحلہ وار تیاری

دریں اثنا فوج کے تینوں بازو مرحلہ وار ہتھیاروں، طیارہ بردار جہازوں، آبدوزوں اور فضائی دفاع کے لڑاکا طیاروں کے ذریعہ اپنی طاقت میں مرحلہ وار اضافہ کرتے رہے۔ اس طرح جب ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمٰن کے ذریعہ آزادی کی عوامی جدوجہد کی آواز بلند کی گئی اس وقت ہندوستان کی مسلح افواج یقینی طور پر لاکھوں پناہ گزینوں اور سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری ادا کرنے کے سلسلہ میں بالادستی رکھتی تھیں۔

گزشتہ ۲۵ برسوں سے دفاعی تیاری جو پالیسی پلاننگ سے جڑی ہوئی تھی، لاپروائی کا شکار نہ سہی لیکن عارضی بنیادوں ہی پر چل رہی تھی۔ بلا شبہ ٹی ۷۲۔ ایم ٹینک، انفینٹری کمبیٹ وہیکلوں کے لیے بی۔ ایم۔ پی سیریز اور بوفورس ۱۵۵۔ ایم۔ ایم فیلڈ توپیں حاصل کی جاچکی تھیں۔ نیوی نے 'کیلو' کلاس آبدوزیں، طیارہ بردار 'وراٹ' اور مغربی جرمنی کی ہنٹر کلکر کلاس آبدوزیں حاصل کرلی تھیں۔ فضائی بیڑہ جاگوار، مگ ۲۱، مگ ۲۵، مگ ۲۳، ۲۷۔ اور ۲۹ کا اضافہ کرکے خود کو مسلسل مضبوط بنا رہا تھا۔ میراج ۲۰۰۰۔ اے۔ این۔ ۳۲، اور آئی۔ ایل ۷۶ جیسے لمبے فاصلوں کی اڑانیں بھرنے والے ٹرانسپورٹ طیاروں نے بھی

فضائی بیڑے کی توانائی میں اضافہ کیا تھا مگر اس سے کسی طرح بھی طویل المیعاد دفاعی پالیسی کی منصوبہ بندی کا اظہار نہ ہوتا تھا کیوں کہ یہ تمام سامان جنگ ، ضروریات کے اظہار کے بہت بعد حاصل کیا گیا جس کے نتیجہ میں خرچ میں بھاری اضافہ ہوا اور ان میں سے کچھ ہتھیاروں کے تعلق سے تنازعات بھی تھے لہٰذا مسلح افواج کی جانب سے بار بار فوری ضرورتوں کا اظہار کیے جانے کے باوجود لگ بھگ دس برس تک ہر طرح کے ہتھیاروں کے حصول کا عمل رُکا رہا۔

بری فوج

جہاں تک بری فوج کا تعلق ہے اس کے لیے ۱۵۵۔ایم۔ایم بوفورس توپوں کے دستیابی کے منصوبے مکمل طور پر کھٹائی میں پڑ گئے جس کی وجہ سب کو اچھی طرح معلوم ہے۔ اس کے نتیجہ میں دور تک مار کرنے والی امدادی توپوں کی تیاری کا عظیم الشان منصوبہ اور گولہ بارود کی تیاری کے لیے ٹیکنالوجی کے حصول کا پروگرام رُک گیا۔ اس سے بھی زیادہ خراب بات یہ ہوئی کہ بری فوج کے لیے اعلیٰ معیار کی سیلف پروپیلڈ توپوں کی فوری ضرورت کی تکمیل کا راستہ بھی رُک گیا۔ ان کے حاصل کرنے میں شور شرابہ کے باوجود سویڈن کی لگ بھگ ۴۰۰ دور مار توپوں نے شمال مغرب اور شمال مشرق، دونوں ہی سرحدوں پر فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ سیاچن گلیشیر میں قدم جمانے کے لیے پاکستان کی بار بار کی کوششوں کو فوج کی بروقت تعیناتی اور بوفورس توپوں کے موثر استعمال کے ذریعہ ناکام بنا دیا گیا۔ اسی طرح مشرقی سیکٹر میں ۱۵۵۔ایم۔ایم کی توپوں اور ہمالیہ کی بلندیوں پر لمبے فاصلے تک بمباری کرنے کی ان کی صلاحیتوں نے چین کو قابو میں رکھا۔ اور وہاں ۸ کے دہے کے اواخر میں ارونا چل پردیش میں کی گئی گھس پیٹھ کی طرح کی کوئی اور گھس پیٹھ نہیں ہوئی۔
اس جگہ یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستانی فوج گزشتہ پچاس برس کے دوران پورے شمال مشرق میں بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف رہی ہے۔ چین، برما اور سابق مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) نے مختلف باغی اور نسلی گروپوں کو ہندوستان میں عدم استحکام پیدا کرنے اور ہماری مسلح افواج کا خون بہانے کے لیے اُکسانے میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی۔
ہندوستانی فوج نے کم سے کم مطلوبہ فورس رکھتے ہوئے صورت حال کا مقابلہ کیا اور بڑی حد تک مستعد امدادی اقدامات کے ذریعہ شہری آبادی کی حمایت اور ہمدردی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ دشمن ملکوں کی شہ پر اور ان کی مدد سے ہونے والی خفیہ بغاوتوں کو ناکام بنانے کے لیے فوج کے دو سے زیادہ ڈویژنوں کو تعینات کیا گیا اور چوکسی کی حالت میں رکھا گیا۔ درحقیقت یہ ہماری فوجی تیاری کے منصوبوں کا حصہ بن گیا اور خصوصی یونٹیں اور تربیتی مراکز قائم کیے گئے۔ اس طرح کی بغاوتوں اور حفاظتی ذمہ داریوں کے تعلق سے فوج کی مصروفیت کو ختم کرنے کے لیے راشٹریہ رائفلز تشکیل کی گئی ہے۔ اس طرح کی باغیانہ سرگرمیوں کو دبانے کے لیے اب ہم ٹبالینوں نے مورچے سنبھال رکھے ہیں۔ فوج اپنے بنیادی کردار یعنی سرحد پار سے پیدا کی جانے والی کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری تیاری اور تربیت سے لیس رہنے پر توجہ مرکوز رکھے گی۔ اس کے علاوہ مسلح افواج کو تعاون دینے کے لیے بی۔ایس۔ایف اور آسام رائفلز بھی موجود ہیں۔

> جب اکتوبر ۱۹۶۲ء میں چین نے ایک زوردار جھٹکا دیا تو اہلِ حکم کو ہر موسم میں متحرک ہو سکنے والی بری، بحری اور فضائی فوج کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس وقت خوف اور عدم تحفظ کے احساس نے لوگوں کو جکڑ رکھا تھا اور کچھ لوگوں کو تو ملک کی علاقائی سالمیت کے تحفظ کے تعلق سے ہماری صلاحیت کار اور قوتِ عمل پر بھی شبہ تھا۔

بحری بیڑا

گرچہ اب نیوی اپنے ذاتی "نیول ڈیزائن بیورو" اور گھریلو جہازوں کی صنعت کی وجہ سے قدرے بہتر حالت میں ہے مگر نئے جنگی جہازوں کی تیاری کی رفتار سرمایہ کی کمی کی وجہ سے سست پڑ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں نیوی پر منصوبہ بندی کے فقدان کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کا زیادہ تعلق نفاذ کے پہلو سے ہے۔ پھر بھی حکومت اور جہاز بنانے والے کارخانے، دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے کئی اضافے کیے بالخصوص کورویٹس میزائل، بوٹس (کشتیوں) اور آبدوزوں کے شعبے میں جن میں سے دو کی تعمیر مزگاؤں ڈاکس ممبئی میں ہوئی۔ "دہلی، ممبئی، میسور" سے شروعات کرکے... ۶ ٹن فی کے تین تباہ کن جہازوں کی تیاری کے ایک پروجیکٹ پر عمل جاری ہے۔ "گوداوری" کی طرح کے تین ترقی یافتہ اور ترمیم شدہ تباہ کن جہاز گارڈن ریچ ورکشاپ کلکتہ میں بھی بن رہے ہیں اور پہلے جہاز "برہم پتر" کو پانی میں اتارا بھی جا چکا ہے۔
"شیلو" اور جرمن "ہنرڈ" دونوں کلاس کی مزید آبدوزوں کی مانگ بھی ہے مگر حکومت کو ابھی اس سلسلہ میں فیصلہ کرنا ہے۔ خوش قسمتی سے نیوی میں سی ہیریئرز کا اضافہ کرنے میں سرمایہ کی کمی حائل نہیں ہوئی مگر ان کے لیے بروقت ایک اضافی پلیٹ فارم کی ضرورت ہے کیوں کہ "وکرانت" عملی طور پر غیر متحرک ہو چکا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہی طیارہ بردار

جہاز "وراٹ" کی زندگی بھی گھٹ رہی ہے۔ خوش قسمتی سے متعلقہ وزارت اور نیوی دونوں ہی غالباً روس سے ایک "سی کنٹرول شپ" حاصل کرنے کے عمل میں مصروف ہیں۔ طویل المیعاد متبادل کے طور پر ہندوستان خود اپنے طیارہ بردار جہاز کوچن شپ یارڈ میں تیار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

دور دور تک پھیلے ہوئے نیلے پانیوں (سمندر) میں پھیلتی ہوئی نیوی کی صلاحیت نے بلاشبہ پڑوسی ملکوں پر اثر ڈالا ہے بالخصوص مشرق میں اور دور دراز کے ملک آسٹریلیا میں ہوشیار رہنے کا احساس بھی پیدا کیا ہے، جن کو وقت گزرنے کے ساتھ بہرحال یقین ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے ارادے توسیع پسندی کے نہیں ہیں وہ بس اپنے ساحلی علاقوں بالخصوص اپنے

> ہندوستانی افواج گزشتہ پچاس برس کے دوران پورے شمالی مشرقی علاقے میں بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف رہی ہے جیسے برما اور علاقے مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) نے مختلف باغی گروہوں کو ہندوستان میں عدم استحکام پیدا کرنے اور ہماری مسلح افواج کو الجھائے رکھنے کے لیے ان میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی۔

خصوصی اقتصادی خطے (ایکسکلوسیو اکانومک زون) اور تیل کی ان تنصیبات کی حفاظت کرنا چاہتا ہے جو بیچ سمندر میں واقع ہیں۔

ہندوستانی بحریہ (نیوی) نے ایک "میرین کمانڈو فورس" بھی تیار کی ہے جو زیر آب اور ساحلی سمندر میں متحرک رہ سکنے والی ایک خصوصی یونٹ ہے۔ سری لنکا میں آپریشن کے دوران میرین کمانڈو فورس نے کافی تعریف حاصل کی اور اس نے دشمن کا راستہ روکنے کی اپنی طاقت کا ثبوت فراہم کیا۔

فضائیہ

فضائی بیڑے کا خاص سہارا مگ۔۲۱ سے مگ۔۲۹ تک کے طیاروں کے ساتھ ہی جاگوار اور میراج ۲۰۰۰ کی ٹکڑی رہی ہے۔ اس بات کا سہرا فضائی بیڑے کے سر بندھتا ہے کہ اس نے پہلے ۱۹۷۱ء میں مشترکہ مہمات میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا پھر تقریباً ۲۰ سال بعد مالدیپ میں کیا۔ ۱۹۷۱ء میں فضائی بیڑا تنگیل میں ایک پیرا بٹالین اتارنے کی خدمت انجام دینے کے لیے پوری طرح تیار تھا کہ وہ مہلک نفسیاتی چوٹ لگائی جا سکے جس کے نتیجہ میں بنگلہ دیش میں پاکستانی افواج کی سپر اندازی میں عجلت پیدا ہوئی۔ اس قسم کی فضائی کارروائیاں ایک امریکن کیریئر گروپ کی چٹاگام کی جانب پیش قدمی کی وجہ سے ضروری ہو گئی تھیں۔ اس بات کا ذکر کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ پریس نے بھی طاقت کو دوچند کرنے کا کردار ادا کیا۔ ایک غیر ملکی خبر رساں ایجنسی نے یہ خبر دی کہ ڈھاکہ کے مضافات میں ایک پیرا بریگیڈ اتار دی گئی ہے اور اس خبر نے بڑا کام کیا۔ لیکن فضائی بیڑے کا زیادہ قابل ذکر اقدام مالدیپ کے صدر عبدالقیوم کی درخواست پر ان کی جمہوری طور پر منتخبہ حکومت کے خلاف غیر ملکی کرایہ کے فوجیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے کیا گیا برق رفتار ایکشن تھا۔ چھ گھنٹوں سے بھی کم عرصہ میں فضائی بیڑے نے اپنے قومی ہیکل آئی۔ ایل۔۷۶ کی مدد سے مالدیپ کی راجدھانی مالے اور اس کے گرد و نواح میں ہندوستانی فوجیوں کو اتار دیا تھا اور بغاوت کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس کارروائی میں فضائی بیڑے نے بحیرۂ ہند میں اپنی جنگی اور مواصلاتی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا جس نے مغربی طاقتوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ اقدام پاکستان کے لیے بھی ایک تازیانہ تھا کیوں کہ مالدیپ کے صدر نے اس کی امداد کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔

یہ فضائی بیڑے کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے پاس ایک بڑا مینوفیکچرنگ اور اوور ہالنگ کا اڈہ ہے جو پوری مگ فلیٹ اور جاگوار طیاروں کی تیاری اور مرمت کا خاصا تجربہ رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں نہ صرف یہ کہ ان سہولیات کا معیار ہی بلند کیا جائے گا بلکہ ۱۲۵ لڑاکا طیاروں کی مگ۔۲۱ بی۔ آئی۔ ایس۔ فلیٹ کو جدید کاری کے ذریعہ کافی بہتر بھی بنایا جائے گا۔ جلد ہی دو پروٹوٹائپ بہتر درجہ کے مگ۔۲۱ بی۔ آئی۔ ایس کی فراہمی کی توقع ہے اور ہندوستان ایروناٹکس لمیٹڈ ان بہتر درجہ کے طیاروں کی تیاری کا کام بھی شروع کر دے گا۔ یہ پروگرام دو سال سے کم عرصہ میں پورا ہونے کی توقع ہے جو ایل۔ سی۔ اے پروجیکٹ میں بار بار کی تاخیر سے ہونے والے نقصان کو بڑی حد تک پورا کر دے گا۔ نئے مگ۔۲۱ بی۔ آئی۔ ایس طیاروں کی فلیٹ سے ملک کے فضائی دفاع کا بخوبی انتظام ہو جائے گا جو زمینی نشانوں کے خلاف چار گنا زیادہ فائر پاور سے لیس ہوگی اور پاکستانی فضائی بیڑے کے ایف۔۱۶ طیاروں کے مقابلہ کی بھی ہوگی۔

سوخوئی ۳۰ طیاروں کے حصول کے ساتھ ہی ان کے لیے فضائی بیڑے کے طویل انتظار کا سلسلہ ختم ہو جائے گا جس نے ۱۹۹۰ء میں اس کثیر اقدامی اعلا درجہ کے لڑاکا طیاروں کی ضرورت کا اظہار کیا تھا۔ غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ ہندوستان نے ہتھیاروں کے ایک ایسے نئے نظام کی جانب توجہ دی ہے جو کہ نہ صرف یہ کہ پاکستان کی جانب سے پیدا ہونے والے خطرات کا ازالہ

کے لیے کمیٹی نے وزارت دفاع میں فیصلہ کرنے کے عمل کو تیز کرنے پر زور دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے کمیٹی نے تینوں چیف آف اسٹاف کو زیادہ اختیارات دینے کی سفارش کی تھی۔

تخمینہ جات کمیٹی کی پر زور سفارشات کے باوجود حکومت نے ان پر فیصلوں میں عمل کیا تھا جس کے نتیجہ میں یہ برآمد ہوا کہ ابھی تک دفاعی افواج کو بہت سی ضروری چیزوں کے حصول کے لیے منظوری نہیں ملی ہے۔ متعلقہ وزارت میں واضح منصوبہ بندی کے تصور کے فقدان کی وجہ سے دفاعی تیاریوں پر کئی طرح کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ بلاشبہ تینوں سیٹروں کا ایک ڈائرکٹر جنرل برائے دفاعی منصوبہ بندی ہے لیکن طویل المیعاد نوعیت کی اس کی سفارشات کا فیصلہ کرنے والوں پر برائے نام ہی اثر ہوا ہے۔

اس لیے اسی طرح بیڑی بدلنے کی ضرورت ہے جس طرح حکومت نے اقتصادی سیکٹر میں بیڑی بدلی ہے۔ ایک اور لازمی ضرورت دفاعی بجٹ کو سالانہ پلان زمرے سے الگ کر کے اسے مجموعی منصوبہ بندی کے عمل کا حصہ بنانے کا ہے۔ ڈیفنس سیکٹر کے اداروں کو بھی کثیر پہلو سامان سازی کے میدان میں داخل کرنے کے لیے یہ ایک ابتدائی مناسب اقدام ہوگا۔

سال رواں کا دفاعی بجٹ ۲۷۷۹۸ کروڑ روپے کا ہے جب کہ گزشتہ سال کا دفاعی بجٹ ۲۶۸۷۹ کروڑ روپے کا تھا۔ سال رواں کے مقررہ تخمینہ میں تینوں سیٹروں کے لیے ۸۹۷۹ کروڑ روپے کے بنیادی سرمایہ کا تخمینہ شامل ہے۔ اکثر اس بنیادی سرمایہ کے تعلق سے بحث ہوتی رہتی ہے لیکن اخراجات کے بجٹ کے دستاویزات کی عدم موجودگی میں اس طرح کی بحث ایک فضول کی کثرت بن کر رہ جاتی ہے۔ اس تخمینہ کا ایک بڑا حصہ چالو پروجیکٹوں بشمول پیداوار اور تعمیرات کے اخراجات سے تعلق رکھتا ہے اور فوج کے تینوں بیڑوں میں سے کسی ایک کے ذریعہ مطلوبہ نئی حصولیابیوں کے لیے کچھ بھی نہیں فراہم کرتا۔ یہ ایک خلا ہے جس کو دفاعی افواج کے ذخیرہ حرب میں مطلوبہ اضافوں کے پروجیکٹوں کے لیے مخصوص تخمینہ جات کے ذریعہ پاٹنا چاہیے۔ ورنہ مسلح افواج کی عام حوصلہ شکنی ہوگی جو یہ محسوس کریں گے کہ وہ اپنی واجب ترجیح کے حصول میں ناکام ہیں، چاہے حقیقت میں یہ بات نہ ہو بلکہ اس کے برخلاف ہو۔

ذرائع ابلاغ سے اختلاط

ہندوستان کے پاس ایک بڑی فوج ہے جو دنیا کی پانچویں سب سے بڑی فوج بھی ہے۔ بحری بیڑے اور فضائی بیڑے کا بھی پانچویں یا چھٹے بڑے بیڑوں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مسلح افواج اور عوام میں بہت بڑا ترسیلی خلا ہے اور آنکھوں کو سب سے زیادہ کھٹکنے والی بات ذرائع ابلاغ کو دفاعی تیاریوں کی حالت تک رسائی حاصل کرنے کے حق سے محروم رکھنے کی بات ہے۔

> "ہماری فوج کے سربراہ جنرل شنکر رائے چودھری قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنے جوانوں اور افسروں کو یہ دو ٹوک اور بے تکلفانہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ذرائع ابلاغ سے ربط بڑھانے کے طریقے تلاش کریں اور ذرائع ابلاغ کو اپنی توانائیوں میں اضافہ کے وسیلے کے طور پر استعمال کریں نہ کہ ان میں ضعف پیدا کرنے کے لیے۔

پریس کونسل آف انڈیا نے دفاعی امور کے تعلق سے ذرائع ابلاغ کی رپورٹنگ کی تعریف اپنی ۱۹۹۴ء کی رپورٹ میں کی ہے اور اس سلسلہ میں مزید کھلے پن کا مشورہ دیا ہے۔ کونسل نے کہا ہے کہ ذرائع ابلاغ کا کردار اس حد تک "محاسبانہ" رہا ہے کہ وہ اہل حکم، تمام اقتداری کو کچو کے لگاتے ہیں کہ وہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھیں۔ اس بات کو سمجھنے اور تعمیری تناؤ پر مبنی تعلقات کو جمہوری ضرورت کے طور پر تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ باقی تمام معاملات میں وہ بہتر سماج کی تعمیر کی کوششوں میں ہمارے شریک کار ہیں۔

ہماری فوج کے سربراہ جنرل شنکر رائے چودھری قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنے جوانوں اور افسروں کو یہ دو ٹوک اور بے تکلفانہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ذرائع ابلاغ سے ربط بڑھانے کے طریقے تلاش کریں اور ذرائع ابلاغ کو اپنی توانائیوں میں اضافہ کے وسیلہ کے طور پر استعمال کریں نہ کہ ان میں ضعف پیدا کرنے کے لیے۔ درحقیقت اس مقصد کو آرمی ہیڈکوارٹر نے اپنے ان دس اصولوں میں بھی شامل کیا ہے جو اس نے کم درجہ کی شدید جنگ کی صورت حال میں اپنے جوانوں کے ذریعہ زیر عمل لانے کے لیے تیار کیے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ ہر طرح کی دفاعی تیاری کو توانائی بخشنے میں ذرائع ابلاغ کے کردار سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت کو پوری طرح محسوس کیا جاتا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس پر پوری طرح عمل نہیں ہو پایا ہے۔

بلاشبہ فوجی تربیتی کمان (اے۔ آر۔ آئی۔ آر۔ اے۔ سی) نے حال ہی میں ایک اچھی شروعات کی ہے جس نے بہت سے، کئی مقامات پر "انٹر میڈیا سیمینار" کیے ہیں لیکن اس کے بعد کی کارروائی حسب ضرورت نہیں ہو پاتی ہے۔ مگر تسکین قلب کی بات یہ ہے کہ تینوں بیڑوں میں ایک طویل عرصہ کے بعد یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ اخباری اور الیکٹرانک ذرائع ابلاغ بھی دفاعی تیاریوں اور پالیسی سازی میں ایک باوزن شریک کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے اس بات کو یاد رکھنے کی ضرورت کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ جدید جنگ کی نوعیت ایسی ہے کہ اس میں پوری قوم ملوث ہوتی ہے۔ بلاشبہ دفاعی فورسز اس میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں مگر چوں کہ جنگ یا کسی بیرونی خطرہ کے تعلق سے جمہوریت میں مجموعی تیاریوں کی

باقی صفحہ ۵۲ پر

پی۔ ایس۔ پدمانابھن

دیہی ترقی

مختلف دیہی ترقیاتی پروگراموں کا مقصد غریبی کا کم کیا جانا ہے۔ اس کے لیے صرف مزید روپے کی فراہمی ہی کافی نہیں ہے۔ بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے ڈھانچہ میں کچھ بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ ان لوگوں کی نشاندہی کا کام، جو مستفید ہونے کے مستحق ہیں، اس تمام عمل میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

ہندوستان اپنے دیہاتوں میں بستا ہے اور دیہی علاقوں کی ترقی کے بغیر کوئی قومی ترقی نہیں ہوسکتی۔ ملک کی آزادی سے قبل بھی سیاسی، سماجی اور اقتصادی رہنماؤں کا اسی بات پر زور تھا حقیقت میں آزادی کی لڑائی جن نکتوں پر لڑی گئی ان میں ایک نکتہ انگریزی حکومت کے ذریعے ہندوستانی دیہاتوں کو نظر انداز کرنا بھی تھا اور مہاتما گاندھی نے دیہی خود کفالت 'گرام سوراج' کو آزاد ہندوستان میں اقتصادی ترقی کے اپنے تصور کا مرکزی نقطہ بنایا تھا۔

ملک کو آزاد ہوئے پچاس سال گزر گئے ہیں اور دیہی ترقی پر گاندھی جی کے زور کی اہمیت آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ شہروں کی طرف جانے کے تیزی سے بڑھتے رجحان کے باوجود ہندوستان کی آبادی کی اکثریت اب بھی دیہاتوں میں ہی رہ رہی ہے۔ فی صد کے اعتبار سے گاؤں کی آبادی کا حصہ قدرے کچھ کم ہوا ہوگا لیکن گنتی کے حساب سے تعداد اتنی زیادہ ہے کہ جس کی بنا پر اقتصادی ترقی کی مجموعی کوششوں میں اس پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔

ایسا نہیں ہے کہ ترقی نہ ہوئی ہو، لیکن اس کی رفتار اور حصولیابی کی وسعت توقعات یا مطلوبہ سطحوں کے مطابق نہیں ہے۔ دیہی ترقی تمام تر زرعی ترقی سے جڑی ہوئی تھی اور یہ سوچا گیا تھا کہ زرعی پیداوار میں اضافے کے نتیجے میں دیہی خوشحالی خود بہ خود آجائے گی۔ بہرحال ۱۹۵۰ء کے دہے میں، یعنی آزادی کے بعد کے پہلے دہے میں ایک نظریاتی تبدیلی آئی "زیادہ اناج اُگاؤ" تحقیقاتی کمیٹی جس نے ایک مربوط نظریہ پیش کیا، جو نہ صرف زراعت اور متعلقہ سرگرمیوں جیسے مویشی پالن کا خیال رکھے گا بلکہ دیہی آبادی کی تعلیم، صحت اور دیگر سماجی و معاشی ضروریات پر بھی دھیان دے گا۔

معاشرتی ترقی

معاشرتی ترقی کا پروگرام (کمیونٹی ڈیولپمنٹ) اور قومی توسیعی اسکیم کی شروعات اس سفارش کا نتیجہ تھے۔ اس پروگرام کے تحت سو سے کر ۱۲۰ دیہاتوں کے بلاک کو منصوبہ بندی اور مربوط دیہی ترقی کا بنیادی یونٹ بنا دیا گیا، جو زراعت اور متعلقہ سرگرمیوں تعلیم، صحت، سماجی بہبود، مواصلات، اضافی روزگار وغیرہ پر مشتمل تھا۔ اس میں خاص زور اپنی مدد آپ اور عوامی شرکت پر تھا۔ پروگرام پر عمل درآمد کی ذمہ داری بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر کو دی گئی جسے پروگرام سے متعلق موضوعات کے تکنیکی افسران کے علاوہ ہر بلاک کے لیے دیہی سطح کے کارکنان (گرام سیوکوں اور سیویکاؤں) کی مدد حاصل تھی۔ اس پروگرام میں ضلعی اور ریاستی سطح پر ایک امدادی تنظیمی ڈھانچہ بھی بنایا گیا تھا۔

سماجی ترقی (سی۔ ڈی) پروگرام کا بنیادی مقصد علاقائی بنیاد پر دیہی علاقوں میں مادی اور انسانی وسائل کی مکمل ترقی حاصل کرنا اور مقامی لیڈرشپ اور خود انتظامی ادارے قائم کرنا اور اس طرح لوگوں کی خود کی فعال شمولیت کے ذریعے دیہی معاشرے کو زندگی کی اونچی سطح پر اٹھانا تھا۔

پروگرام کا آغاز اچھا رہا۔ اس کے نتیجے کے طور پر ملک کے تمام دیہی علاقوں کا احاطہ کرتے ہوئے ایک بنیادی ڈھانچے کی بنیاد وجود میں آگئی جیسا کہ کسی بھی دیگر پروگرام کے ساتھ ہوا۔ اس پروگرام کی کامیابی کے درجات بھی ایک ریاست سے دوسری ریاست میں مختلف رہے ہیں۔ اس کی ابتدا کے ۱۷ سال بعد ۱۹۶۹ء میں مرکزی حکومت نے اس کو، ریاستوں کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا زوال اور اختتام شروع ہو گیا۔

اس (زوال) کے ذمہ دار اسباب میں سے ایک سبب دیہی ترقی پروگرام کی مربوط سوچ میں بتدریج تخفیف کا ہونا تھا۔ دیہی صنعتوں سے متعلق تمام کام کھادی اور گرام ادیوگ کمیشن (KVIC) کو دے دیا گیا اور غذائی خود کفالت کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے نتیجے میں روز بڑھتی ہوئی زرعی پیداوار کی طرف ہو گیا اور دوسری سرگرمیوں کا اس سے اخراج ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں جدید اضلاع میں کامل زرعی فروغ پروگرام (IADP) ۱۹۶۰ء میں شروع کیا گیا، اس کے بعد کامل زرعی علاقوں کا پروگرام (IAAP) اور زیادہ پیداوار دینے والی اجناس (HYVP) شروع کیے گئے۔

جیسا کہ جی۔ وی۔ کے راؤ کمیٹی رپورٹ نے ۱۹۸۵ء میں بتایا کہ ابتدائی پروگراموں کے سبب سماجی فروغ پروگرام نے اپنے پہلے والی متصل طاقت بہت کچھ کھو دی ہے اور اس نے تھوڑی بکھراؤ، جس کے ساتھ کم ہوتا ہوا بجٹ بھی تھا، کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ دوئم ہرے انقلاب نے صرف بڑے کسانوں اور ان علاقوں کو، جو زیادہ پیداوار دینے والی اجناس کی تکنالوجی پیکج حاصل کرنے کے لیے بہتر مقام پر تھے، فائدہ پہنچایا۔ دیہی آبادی کی اکثریت کو جو غریب تھی، زیادہ فائدہ نہیں پہنچا اور دیہی فروغ کا بنیادی مقصد پورا ہونے سے رہ گیا۔

نئی اسکیمیں

۱۹۶۰ء کے شروع دہے میں حکومتی سطح پر یہ بات کافی محسوس کی گئی۔ دیہی ترقیاتی پروگرام کا نشانہ صرف زرعی پیداوار کو بڑھانا ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ دیہی آبادی کے بڑے حصے کی دیگر سماجی واقتصادی ضروریات کو بھی پورا کرنا ہونا چاہیے۔ بہرحال کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام (CD) کے احیا کی بجائے کئی اسکیمیں شروع کی گئیں جن میں یونیسیف کے ذریعے امداد پہنچایا گیا 'ایلائیڈ غذائی پروگرام جس کا مقصد چند لاکھوں میں دیہی آبادی کی غذائی حالت کو سدھارنا اور صحتی دیکھ بھال، ماحولیاتی (ٹیکہ لگانا) صاف پینے کے لائق پانی اور ماحولیاتی صفائی تھا، دیہی روزگار کے لیے کریش اسکیم (CSRE) پائلٹ انٹنسو روزگار اسکیم (PIREP) اور کام کے بدلے کھانا، پروگرام جس کا مقصد روزگار کے بہتر مواقع فراہم کرنا تھا، خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کا ترقیاتی پروگرام (DPAP) اور ریگستانی ترقی پروگرام (DDP) ماحولیاتی لحاظ سے بگڑے علاقوں کی دیکھ بھال شامل ہیں۔

ان کے علاوہ قبائلی اور پہاڑی علاقوں کے لیے خاص پروگرام تھے۔ ان سب سے اوپر ایک "پورے گاؤں کی ترقیاتی اسکیم" قومی زرعی کمیشن کی سفارش پر شروع کی گئی جس کا تصور دیہات کی ترقیاتی کوششوں پر مرکوز تھا تاکہ دیہی آمدنی کی نابرابری کو کم کرنے اور زیادہ روزگار مواقع فراہم کرانے کے سماجی مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔ اس طرح ۱۹۵۲ء کے سماجی فروغ پروگرام سے لے کر ۱۹۷۵ء کے [illegible] پروگرام تک ایک چکر پورا ہو گیا اور اس بات کو ایک مرتبہ پھر محسوس کیا گیا کہ دیہی ترقی کے لیے صرف مربوط طریقہ کار سے ہی مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام (IRDP)

اس سوچ نے انٹیگریٹڈ رورل ڈیولپمنٹ پروگرام کے آغاز میں رہنمائی کی۔ اس بات کا دعویٰ کیا گیا کہ یہ ایک نیا پروگرام ہے لیکن دیہی ترقیاتی منظر کے گہرے مشاہدین نے محسوس کیا کہ یہ نظریاتی طور پر ۱۹۵۰ء کے دہے کے زیادہ نکتہ چینی کیے گئے کمیونٹی ترقیاتی پروگرام سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ تاہم اس آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی نے [illegible] سے موجودہ اسکیموں کی بہتات کو ختم نہیں کیا۔ یہ تمام جاری رہیں اور چند مزید شامل کر دی گئیں۔ کام کے بدلے غذا، پروگرام کی دوبارہ سے توضیع کی گئی اور اس کو قومی دیہی روزگار اسکیم (NREP) کی شکل میں از سر نو تشکیل دیا گیا اور ہر بے زمین خاندان کے کم از کم ایک فرد کو سو دن کے لیے روزگار مہیا کرانے کے لیے" دیہی بے زمین روزگار گارنٹی پروگرام" شروع کیا گیا اس کے ساتھ ساتھ دیہاتی نوجوانوں کو پیداواری مہارتیں حاصل کرانے کی غرض سے ٹرائیسم (TRYSEM) شروع کیا گیا۔

ان سب سے بڑھ کر دیہی فروغ، کو وزارت زراعت سے لے لیا گیا اور ۱۹۷۹ء میں ایک آزاد وزارت 'دیہی تعمیر نو، کی تخلیق کی گئی، جو اس ترجیح کو جو اس وقت کی حکومت دیہی شعبے کو دینا چاہتی تھی سامنے لے آئی۔ وزارت کے نام اور اس کے وسیع کاموں کی تشریح نے اس بات کو پھر سے واضح کر دیا کہ دیہی اقتصادیات میں پسندیدہ ترقی کو یقینی بنانے کے لیے صرف زرعی بنیاد کی سوچ کافی نہیں ہے۔

نیشنل کاؤنسل آف اپلائیڈ اکانومک ریسرچ (NCAER) کے ذریعے ۷۶۔۱۹۷۵ء میں کیے گئے گھریلو آمدنی کے مطالعے سے اس نظریہ کو اور تقویت ملی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ

ہندوستان اپنے دیہاتوں میں بستا ہے اور دیہی علاقوں کی ترقی کے بغیر کوئی قومی ترقی نہیں ہو سکتی۔

باوجود سبز انقلاب کے دیہی طبقہ شہری طبقے کے مقابلہ میں غریب ہی رہا ہے۔ اس مطالعہ نے اس خام خیالی کو بھی ختم کر دیا کہ سبز انقلاب کے نتیجے میں دیہی امیروں کا طبقہ پیدا ہو گیا ہے کیوں کہ صرف ۹۵ء۴ فی صد دیہی گھروں کی سالانہ آمدنی دس ہزار روپیہ یا اس سے اوپر تھی اور صرف ۲ء۰ فی صد کی آمدنی ۳۰ ہزار روپے یا اس سے زیادہ تھی۔ اس کے مقابلے میں شہری طبقہ کی آمدنی بہت زیادہ تھی یعنی علی الترتیب ۷ء۱۶ فی صد اور ۵ء۱ فی صد۔

اس پس منظر میں نئی تخلیق شدہ 'دیہی تعمیر نو' کی وزارت (منسٹری آف رورل ری کنسٹرکشن) نے اپنی سرگرمیوں کو بڑھا کر ان میں دیہی صنعتوں' دیہی برق کاری، دیہی سڑکوں' دیہی قرضہ کو بھی شامل کر لیا۔ لیکن آخرکار اس کو دیہاتوں میں پانی کی سپلائی، دیہی سڑکیں، دیہاتی اور کاٹیج صنعتیں اور قصبات اور دیہی تعمیرات، منصوبہ بندی جہاں تک کہ دیہی علاقوں کا تعلق ہے، کی ذمہ داریں دے دی گئی۔ دیہی صحت، دیہی برق کاری وغیرہ میں اس کو نوڈل کے طور پر ذمہ داری دی گئی۔

چھ سال بعد ۱۹۸۵ء میں جی۔وی۔کے۔راؤ کمیٹی جو دیہی ترقی اور غریبی میں تخفیف کے انتظامی امور کے جائزے کے لیے بنائی گئی تھی، نے اس بات کا ذکر کیا کہ ضلع دیہی ترقیاتی ایجنسیوں کے قیام اور آئی۔آر۔ڈی۔پی میں بلاکوں کو مزید استحکام پہنچانے سے ضلعی اور بلاکوں کی سطح پر مطلوبہ مجموعے تعاون اور ربط حاصل نہ ہو سکا اور اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جہاں بے شمار اسکیمیں ایک ہی گروپ کے لیے اور ایک جغرافیائی علاقے کے لیے، ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے بنائی گئیں اور بجا ایجنسیوں کے ذریعے بالکل بے ربط انداز میں عمل میں لائی گئیں۔ بہت سے دوسرے ایشیائی ممالک نے، جو ترقی کی کم صلاحیتوں اور سائنسی مہارت سے نوازے گئے ہیں اور اپنے سماجی اور سیاسی فلسفے میں بہت کم شدت پسند ہیں، دیہی عوام کی بھوک اور افلاس کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ لیکن یہ باتیں ہندوستان کے بڑے حصے میں پرانے مرض کی طرح موجود ہیں۔

اس کے لیے ماہرین نے متعدد اسباب کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ان میں سے ایک کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے تصور کو بہت سے پروگراموں میں ٹکڑے ٹکڑے کرنا جو کہ مربوط دیہی ترقی کے ڈھانچے میں از خود فٹ نہیں ہوتا۔ دوسرا سبب تھا کہ آئی۔آر۔ڈی۔پی کو عمل میں لانے کے لیے ریاستوں میں ایک مضبوط انتظامی ڈھانچہ نہ تھا۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ غریب دیہاتیوں کو صرف اثاثہ دینے سے ہی دیہی غریبی دور نہیں ہو سکتی۔ ایک دوسرا نظریہ یہ تھا کہ کمزور منصوبہ بندی اس کی ایک سنگین خامی تھی۔

> **ایسا نہیں ہے کہ ترقی نہ ہوئی ہو، لیکن اس کی رفتار اور حصولیابی کی وسعت توقعات یا مطلوبہ سطحوں کے مطابق نہیں ہے۔**

ساتویں پنج سالہ منصوبہ میں خاص طور پر پروگراموں کی بہتات اور تنظیمی ڈھانچے کے انتشار کا ذکر کیا گیا اور اس کو آسان بنانے، عقلی طور پر صحیح کرنے، دوہرے پن سے بچانے اور تمام سطحوں پر عمودی تعاون پیدا کرنے کے لیے تمام ڈھانچے کی دوبارہ سے جانچ کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

مکمل جائزے کی ضرورت

جی۔وی۔کے۔راؤ کمیٹی نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ وقت آ گیا ہے کہ دیہی ترقی کا بھرپور جائزہ لیا جائے جس میں زمینی سطح پر کام کر رہی مختلف ایجنسیوں کے ذریعے کی جا رہی اقتصادی اور سماجی ترقی کی سرگرمیوں کا احاطہ کیا جائے۔ اس کے خیال میں اکیلے سرکار ہی نتائج حاصل نہیں کر سکتی اور مقامی تحریک کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ اس سلسلے میں اس نے پنچایتی راج اداروں کو سرگرم کیے جانے کی سفارش کی۔ اس کے علاوہ اس نے تجویز رکھی کہ پالیسی پلاننگ اور پروگرام پر عمل درآمد کے لیے ضلع کو بنیادی اکائی بنایا جانا چاہیے۔ اس نے ضلع بجٹ اور ضلعی پلاننگ کے تصور کے علاوہ دیہی ترقیات کی مجموعی دیکھ بھال کے لیے ضلعی سطح پر ڈیولپمنٹ کمشنر کے طور پر چیف سکریٹری کے عہدے کا نظریہ پیش کیا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ پر وہ توجہ نہ دی گئی جس کی کہ وہ مستحق تھی۔

بہرکیف، دیہی ترقیاتی پروگراموں کی منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد میں عوام کی عملی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے پنچایتی راج اداروں (PRIS) کی تقویت کا کام ۱۹۹۰ء کی دہائی کے شروع میں عمل میں آیا جس کو آئین میں کی گئی ایک ترمیم سے تقویت پہنچائی گئی جس کے ذریعے باقاعدگی سے الیکشن، فنڈز کی تفویض اور عورتوں کی زیادہ نمائندگی وغیرہ کو یقینی بنایا گیا اور ڈی۔آر۔ڈی۔اے۔ کے ذریعے عمل میں لائی جانے والی سرگرمیوں کی ایک تفصیلی فہرست پی۔آر۔آئیز (PRIs) کو دی گئی۔

ان تمام کوششوں، جن کو بڑھتی ہوئی مالی مدد سے تقویت ملی، کا دیہی علاقوں میں روزگار مہیا کرانے، سڑکوں کی شکل میں بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنانے، مواصلات' بجلی وغیرہ کے علاوہ دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کا اہتمام کی صورت میں پڑا۔ تاہم حصولیابی کی سطح ایک ریاست سے دوسری ریاست میں مختلف رہی۔ نئی اقتصادی پالیسی جس کا زور لبرلائزیشن پر تھا، کے نتیجے میں ڈھانچے میں جو ہم آہنگی پیدا کی گئی اس سے یہ خدشہ ظاہر ہوا کہ حکومت سماجی سیکٹر میں اپنا رول کم کر دے گی۔ حکومت

ہند کی جانب سے صاف الفاظ میں دیہی اقتصادیات کی ترقی کے لیے اپنے وعدے کو دہرائے جانے سے اس کے لیے مزید روپیوں کی فراہمی نے اس خدشہ کو دور کر دیا۔

دیہی تعمیر نو (رورل ری کنسٹرکشن) کی وزارت کو وزارتِ دیہی علاقے اور روزگار (رورل ایریاز اینڈ ایمپلائمنٹ) کی وزارت کا نیا نام دیا گیا، جس میں تین شعبے یعنی ...... "ڈیپارٹمنٹ آف رورل ...... ڈیولپمنٹ اینڈ پاورٹی ایلی وی ایشن" رورل ڈیولپمنٹ کا ڈیپارٹمنٹ، "ڈیپارٹمنٹ آف ویسٹ لینڈ ڈیولپمنٹ" رکھے گئے۔ پہلے شعبے کو اجرت روزگار کو بڑھانے، بنیادی ڈھانچے کے فروغ، خود روزگاری اور کاروبار ترقی کی ذمہ داری مختلف پروگراموں کے ذریعے دی گئی۔ اس کے علاوہ خصوصی علاقہ پروگراموں پر عمل درآمد جیسے کہ خشک سالی کا رحجان رکھنے والے علاقوں کا پروگرام (ڈراؤٹ پرون ایریاز پروگرام) اور ریگستان ترقیاتی (ڈزرٹ ڈیولپمنٹ) پروگرام بھی اس شعبے کو دیے گئے۔

دیہی ترقی کے شعبے کو "نیشنل سوشل اسسٹنس پروگرام" پر عمل درآمد کی ذمہ داری دی گئی جس میں بوڑھوں کی قومی پنشن اسکیم، قومی خاندانی منفعت اسکیم (نیشنل فیملی بینی فٹ اسکیم) اور قومی زچہ منفعت اسکیم (نیشنل میٹرنیٹی بینی فٹ اسکیم)، دیہی پانی کی سپلائی اور صفائی، زمینی اصلاحات، پنچایتی راج، زرعی منڈی، دیہی تکنالوجی کا فروغ شامل ہیں، تیسرے ڈیپارٹمنٹ کو بنجر میں کے فروغ کی ذمہ داری سونپی گئی۔

وزارت کی درج بالا تنظیم نو سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ دیہی ترقی کو اگر آئندہ اثر انداز ہونا ہے تو اس کے لیے آفاقی نظریہ ہونا چاہیے اسے صرف زراعت پر ہی مرکوز نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ اسکیمیں بہت سی ہو سکتی ہیں لیکن ان سب کا اجتماع دستیاب انسانی اور اقتصادی ذرائع کا زیادہ سے زیادہ استعمال یقینی بنا کر سب سے نچلی سطح تک ان کو پہنچانا چاہیے۔

ایک مفید ورکشاپ

اگست ۱۹۹۶ء میں منعقد پروجیکٹ ڈائرکٹرز کی ورکشاپ میں مختلف پروگراموں کا گہرائی سے تجزیہ کیا گیا اس میں عمل درآمد کے سلسلے میں کمزور روابط کو پیش کیا گیا جیسا کہ دیہی علاقے اور روزگار کے وزیر مملکت شری کے۔ ییرا نائیڈو نے بتایا کہ صرف فنڈز کی فراہمی ہی دیہی علاقوں کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے کافی نہیں ہے اور بہتر نتائج برآمد کرنے کے لیے ڈھانچے میں چند بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اصل حق داروں کی نشاندہی تمام پروگراموں میں سب سے زیادہ اہم سرگرمی ہے اگرچہ گرام سبھا کو یہ کام تفویض کیا گیا ہے، یہ معلوم ہوا ہے کہ غیر مستحق افراد فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔ مقامی افسران کو چوکس رہنے اور کسی دباؤ میں نہ آنے کے لیے کہا گیا ہے۔

دوئم یہ محسوس کیا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اسکیم کا انتخاب مستفیدین پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اسکیم کی منظوری سے پہلے مارکیٹنگ سہولت کو مربوط کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے اور اسکیم کی منظوری اور اس پر عمل درآمد کی درمیانی مدت کو بہت حد تک کم کر دینا چاہیے۔ بینکرز کے ساتھ ہر سطح پر زیادہ رابطے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

پھر بھی ایک نکتہ جو ورکشاپ میں ابھر کر سامنے آیا وہ تھا کہ عوام کی شرکت مطلوبہ حد تک نہیں ہو رہی ہے اور ٹرائیسم (TRYSEM) اور دوسرے پروگراموں میں تعلق کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں یہ بات کہی گئی کہ صرف آر۔ ڈی۔ پی۔ کے مستفیدین میں صرف ۸٫۳ فی صد نے ہی ٹرائیسم کی تربیت حاصل کی ہے اور ان میں سے صرف ۲٫۷۴ فی صد کامیاب ہوتے۔ اس کا مطلب ہوا کہ جہاں تک آر۔ ڈی۔ پی میں ٹرائیسم کے تعاون کا سوال ہے یہ دو فی صد سے بھی کم ہے۔ غریبوں کو مختلف فنون میں مہارت مہیا کرانے کے لیے ہر بلاک میں ایک منی آئی۔ ٹی۔ آئی (I.T.I) کے قیام کی تحریک قابلِ تحسین ہے۔

اس تجزیے نے بلاک اور گاؤں کی سطح پر موجود انتظامی خامیوں کو اُجاگر کیا۔ ڈی۔ آئی۔ آر کی دوسری پرت یعنی بلاک سطح کے ادارے زیادہ تر ریاستوں میں کام کرتے نہیں پائے گئے۔ حتیٰ کہ ضلع پنچایتیں بھی تمام ریاستوں میں پوری طرح کام نہیں کر رہی تھیں۔ یہ محسوس کیا گیا کہ چوں کہ زیادہ تر ڈیپارٹمنٹ میں گاؤں کی سطح پر خود اپنے کام کرنے والے موجود تھے۔ اس لیے ان سب کو ایک مشترکہ پول میں یکجا کر دیا جائے، جنہیں ڈی۔ آئی۔ آر میں خاص طور سے ٹریننگ دی گئی ہو۔

ان سب کا آخری مقصد غریبی، جو غریبی سے نیچے زندگی گزار رہے لوگوں کی تعداد (BPL) سے ناپی جاتی ہے، کو کم کرنا ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء کے نیشنل سیمپل سروے تنظیم کے پنج سالہ صارفین صرفہ جائزے کے مطابق ۲۰۱٫۴ ملین افراد جو ملک کی کل آبادی کا ۲۵٫۴۹ فی صد ہیں، غریبی کی سطح (BPL) سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ بی۔ پی۔ ایل کی موجودہ مد گیارہ ہزار روپئے ہے اور ایک مانگ یہ ہے کہ افراطِ زر کو مدنظر رکھ کر اس پر نظر ثانی کی جائے۔ اگر یہ کیا گیا تب بھی غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے لوگوں کی شرح زیادہ ہوگی۔

حقیقتاً مختلف ایجنسیوں کے ذریعے بی۔ پی۔ ایل کی تعداد مختلف دی جا رہی ہے اور یہ وقت ہے جیسا کہ پروجیکٹ ڈائرکٹرز کی ورکشاپ میں کہا گیا کہ نویں پنج سالہ منصوبے کے شروع ہونے سے پہلے غریبی سے نیچے زندگی گزارنے والوں کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے۔ یہ غریبی کے مسئلہ کی

باقی صفحہ ۶۴ پر

بی۔ بی۔ بڑٹھاکر

شمال مشرق ترقی کی راہ پر گامزن

ہندوستان کے شمال مشرقی حصے میں باضابطہ طور پر قائم شدہ سات ریاستی حکومتیں مختلف نسلوں کے ۲،۷۷ کروڑ عوام کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے کام میں مصروف ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ ساتوں ریاستیں ایک دوسرے پر انحصار رکھتی ہیں اس لیے اس خطے کے ترقیاتی منصوبے ایک مربوط انداز میں تیار کیے جانے چاہئیں۔

شمال مشرق کا ذکر آتے ہی ہمارے بیشتر ہم وطنوں کے ذہن میں شورش، دہشت گردی، بندوں، ہڑتالوں اور سیلاب کی تباہ کاریوں کی تصویر ابھرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بیشتر اخبارات ابھی تک یہی سمجھتے ہیں کہ "بری خبر ہی اچھی خبر ہے"۔

ہمیں شمال مشرق کے واقعات کو شورش اور دہشت گردی وغیرہ کے عارضی نوعیت کے واقعات کی روشنی میں دیکھنے کی بجائے ایک وسیع تر تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ شمال مشرق کا علاقہ ایک وسیع اور مختلف النوع علاقہ ہے۔ یہاں ایسے گوشے بھی ہیں جہاں کے عوام تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ہزاروں سال پیچھے ہیں۔ ان وسیع جنگلی علاقوں کو انگریزوں نے کئی زمروں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ مثلاً "نظم و نسق والے علاقے" "جزوی نظم و نسق والے علاقے" "بے نظم و نسق علاقے"، "خارج شدہ علاقے"، "جزوی طور پر خارج شدہ علاقے" اور "آزاد علاقے" وغیرہ۔

ان علاقوں میں جدید طرز کا نظم و نسق قائم کرنا اور وہاں کے مختلف النسل لوگوں میں سماجی اتحاد و ہم آہنگی برقرار رکھتے ہوئے باقاعدہ ترقیاتی عمل شروع کرنا ایک بہت بڑا کام ہے۔

اس وسیع خطے میں سات باقاعدہ طور پر قائم شدہ حکومتیں تقریباً ۸۰ مختلف نسلی گروہوں کے ۲،۷۷ کروڑ عوام کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے کام میں مصروف ہیں۔

آج بھی ترقی میں عدم توازن موجود ہے جب کہ لوگوں کی خواہشات بلند ہو چکی ہیں۔ اس کے نتیجے میں کچھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں مایوسی اور دل برداشتگی پائی جاتی ہے جس نے مسلح شورش اور گاہ بگاہ دہشت گردی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس عارضی مگر اہم دور پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

آج جب کہ ہم اگلی صدی کی دہلیز پر کھڑے ہیں یہ مناسب ہوگا کہ یہ دیکھا جائے کہ اقتصادی اور سیاسی طور پر شمال مشرقی ریاستوں کا ہندوستان کے منصوبوں میں کیا مقام ہے۔

شمال مشرقی خطے میں سات ریاستیں ہیں۔ لیکن یہ ایک ممیز اقتصادی خطہ ہے جغرافیائی محل وقوع کے علاوہ اس کی کچھ اور خصوصیات بھی ہیں جو اسے ملک کے باقی حصوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ زیادہ تر ایک پہاڑی خطہ ہے اور اس کی آبادی میں درج فہرست قبائل اور درج فہرست ذاتوں کی اکثریت ہے۔

> ہمیں شمال مشرق کے واقعات کو شورش اور دہشت گردی [illegible] چاہیے۔

منی پور میں ان لوگوں کی تعداد ۲۹ فی صد اور میزورم میں ۹۳ فی صد ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ان تمام ریاستوں میں افزائش آبادی کی شرح زیادہ ہے۔ خطے کی سات میں سے ۵ ریاستوں میں خواندگی کی شرح خواندگی کے کل ہند فی صد سے زیادہ ہے۔

ناگالینڈ، میزورم اور اروناچل پردیش میں فی کس آمدنی کی شرح اونچی ہے۔ تاہم یہ

ریاستیں انتظامیہ، سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کے اعتبار سے باقی ملک سے پیچھے ہیں۔

لیکن اس سب کے باوجود شمال مشرقی ریاستوں نے کافی لمبا سفر طے کیا ہے اور وہ تبادلہ کی قدیم معیشت سے نکل کر معیشت زر میں داخل ہو گئی ہیں۔ اگرچہ بہت سے پہاڑی علاقوں کے لیے اشیاء کے تبادلہ کے قدیم طریقے سے نکل کر بینک معیشت میں داخل ہونا دور کی بات ہو سکتی ہے تاہم شمال مشرقی پہاڑیوں کے کافی حصوں میں قدیم معیشت داستان پارینہ بن چکی ہے اور لوگ اسے بھول بھی چکے ہیں۔

۱۹۷۱ء تک یہ علاقہ آسام کی ایک واحد ریاست تھا۔ پھر اسے مقامی آبادی وغیرہ کی بنا پر سات الگ الگ ریاستوں کی شکل میں منظم کیا گیا۔ اس سے شمال مشرقی خطے میں ترقیاتی عمل کی رفتار تیز ہوئی۔ اگرچہ کئی نسلی ریاستوں کی طرف سے سرحدوں کے ازسرنو تعین کا مطالبہ بھی کیا گیا۔

اگرچہ یہ خطہ ایک واحد اقتصادی خطہ ہے تاہم اس کے مختلف علاقوں میں بہت سی باتوں میں فرق ہے مثلاً آبادی کی نوعیت میں، آبادی کے حجم میں، نسلوں میں، شرح ترقی میں، شہر کاری کی سطح میں اور شرح خواندگی میں۔

ان ریاستوں میں اقتصادی ترقی کی سطح باقی ملک کی شرح ترقی سے مختلف ہے۔

آسام ان ریاستوں کے وسط میں واقع ہے۔ لہٰذا آسام میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی گونج دوسری ریاستوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ آسام کافی ترقی یافتہ ریاست ہے اور اس کے وسیع وسائل استعمال کے منتظر ہیں۔ تیل اور چائے آسام کی خاص صنعتیں ہیں اور چند سال پہلے تک ملک کی غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی میں ان دونوں اشیاء کا قریب قریب آدھا

> [illegible]

حصہ ہوتا تھا۔ پھلوں کی پیداوار لکڑی، گیس اور پٹرولیم مصنوعات پر مبنی صنعتوں کی ترقی کے کافی گنجائش ہے۔ ریاست میں تیل صاف کرنے کی چار بڑی ریفائنریاں کام کر رہی ہیں۔ ربڑ، کوئلے اور غیر دھاتی معدنی پیداوار پر مبنی صنعتوں کے لیے کافی امکانات ہیں۔

۱۹۵۰-۵۱ء میں جب آسام میں منصوبہ بندی کا دور شروع ہوا تو اس وقت ریاست میں فی کس آمدنی کل ہند اوسط سے ۴ء۰۵ روپے زیادہ تھی۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ گزشتہ ساڑھے چار دہائیوں کی منصوبہ بندی کے دوران اس کی یہ بہتر پوزیشن ختم ہو گئی اور وہ پیچھے رہ گیا۔ ۱۹۸۴-۸۵ء تک اس کی فی کس آمدنی کل ہند اوسط سے ۹ء۲۱۲ روپے کم ہو گئی تھی۔

منی پور کا صنعتی ڈھانچہ ۱۹۸۰-۸۱ء میں خوراک کی پروڈکشن، لکڑی اور لکڑی کی مصنوعات کاغذ اور کاغذ سے بننے والی اشیا اور مرمت وغیرہ کی خدمات پر مشتمل تھا۔ ۱۹۸۷ء میں

> شمالی مشرقی ریاستوں نے کافی لمبا سفر طے کیا ہے اور وہ تبادلہ کی قدیم معیشت سے نکل کر معیشت زر میں داخل ہو گئی ہیں۔

وہاں خوراک کی پروڈکشن کی ایک صنعت لگائی گئی مگر نتیجہ حوصلہ افزا نہیں رہا۔

میگھالیہ کی خاص صنعت لکڑی اور لکڑی کی مصنوعات ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں سیمنٹ بنانے کا ایک چھوٹا سا پلانٹ بھی ہے۔

تریپورہ میں فیکٹری کی سطح کی جو صنعتیں ہیں۔ ان میں مشروبات، تمباکو، لکڑی اور لکڑی سے بنی ہوئی چیزوں اور غیر دھاتی معدنی پیداوار پر مبنی صنعتیں نیز مرمت اور سپلائی کی خدمات شامل ہیں۔ سال ۱۹۸۷-۸۸ء تک وہاں جوٹ کا کپڑا اور دیگر مصنوعات کا بننا بھی شروع ہو گیا۔

ان حقیقتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ شمال مشرقی خطے کی صنعتی بنیاد واقعی کمزور ہے۔ وہاں کا صنعتی سیکٹر پراسیسنگ کے پہلے مرحلے کی صنعتوں مثلاً اناج ملوں اور لکڑی ملوں وغیرہ تک ہی محدود ہے۔

آسام میں بھی بڑی صنعتی سرگرمیاں تیل اور باغات کی پیداوار پر مبنی ہیں، ان صنعتوں کی عقبی کڑیاں قدرے محدود ہیں جب کہ اگلے کڑیاں دوسرے میٹرو پالیٹن شہروں میں واقع صنعتوں سے جا ملتی ہیں۔ ریاست کے ایک سرکردہ ماہر معاشیات کے الفاظ میں "یہ ایک انکلیو کی جیسی معیشت ہے یعنی یہ کہ روایتی صنعتوں کے درمیان چند جدید صنعتیں ہیں اور ان دونوں کے درمیان کوئی رابطہ یا تال میل نہیں ہے۔"

اگر ہم آسام میں فی کس آمدنی میں گراوٹ کی وجوہات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ سوائے دوسرے اور تیسرے منصوبے کے باقی پنجسالہ منصوبوں میں یکے بعد دیگرے آسام کے لیے تخصیص زر کی کل ہند اوسط سے کمتر فی کس مصارف مختص کیے جاتے رہے ہیں۔

پھر بھی اگر ہم گزشتہ دہائیوں میں شمال مشرقی ریاستوں کی ترقی پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ یہ ترقی کافی نمایاں رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کے تقسیم ہونے کے بعد شمال مشرقی خطے کا باقی ملک کے ساتھ ریل اور سڑک کا رابطہ برقرار نہیں رہا تھا اور وہ بالکل الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ مگر قوم نے فوراً مدد کی اور بہار اور مغربی بنگال کے نیم پہاڑی علاقوں کے اوپر سے باقی ملک کے ساتھ براہ راست مواصلات کا سلسلہ بحال کیا گیا۔

۱۹۴۸ء میں اعلاتعلیم کا صرف ایک ہی

ادارہ تھا۔ کاٹن کالج گوہاٹی جہاں کلکتہ یونیورسٹی کے ماتحت ڈگری کی سطح کی تعلیم دی جاتی تھی۔ آج خطے میں ایک آئی آئی ٹی سمیت سات یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں۔ چار انجینئرنگ کالج اور پانچ میڈیکل کالج ہیں۔ ان کے علاوہ سیکڑوں ڈگری کالج ہیں۔ چار تیل صاف کرنے والی ریفائنریاں ہیں۔ دوسری بڑی صنعتیں اور زرعی پیداوار پر مبنی صنعتیں بھی کام کر رہی ہیں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تعلیمی وصنعتی میدانوں میں مزید اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے کیوں کہ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور ان میں مایوسی اور دل شکستگی کا احساس پیدا ہو رہا ہے یہی وہ احساس ہے جس کی وجہ سے کچھ نوجوانوں نے بندوق کا راستہ اختیار کیا ہے۔

ترقی کے لیے حکمت عملی

شمال مشرقی خطے کی ترقی کے منصوبے بناتے وقت علاقے کے مخصوص حالات اور مقامی لوگوں کی نفسیات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ خطے کی ساتوں ریاستیں اپنے نسلی وقار کو برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے پر انحصار رکھتی ہیں۔ اس لیے ترقیاتی منصوبے ایک مربوط انداز میں تیار کیے جانے چاہئیں۔

خطے کی ایک انوکھی خصوصیت اس کا جغرافیائی محل وقوع ہے۔ یہ ایک غیر معاون پہلو ہے۔ خطے میں مخصوص قسم کی پہاڑی معیشتیں کام کر رہی ہیں لیکن یہ سبھی اکائیاں تیار شدہ سامان کی اپنی روزمرہ ضروریات کے لیے باقی ملک پر بہت زیادہ انحصار رکھتی ہیں۔

شمال مشرقی خطے کی ترقی کے منصوبے بنانے میں باقی ملک کے تجربات منصوبہ سازوں کے زیادہ کام نہیں آسکتے۔ ترقیاتی منصوبے بناتے وقت خطے کے عوام کے سماجی وثقافتی پس منظر کو ملحوظ رکھنا اور ان کا احترام کرنا ضروری ہے۔

خطے کی خوب صورت پہاڑی تفریح گاہیں، خوب صورت جنگلی جانور اور وہاں کا آلودگی و کثافت سے پاک ماحول سیاحوں کے لیے باعث کشش ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہاں ایک پھلتی پھولتی سیاحت کے لیے کافی روشن امکانات موجود ہیں۔ سیاحت کی ترقی سے نہ صرف مقامی صنعت کاروں کو فائدہ پہنچے گا بلکہ نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع میں بھی اضافہ ہوگا۔ فی الوقت خطے میں ٹرانسپورٹ کا بنیادی ڈھانچہ بہت کمزور ہے۔ کسی بھی ترقیاتی منصوبے کے بہ خوبی جڑ پکڑنے کے لیے اسے بہتر بنانا ضروری ہے۔ خطے میں پن بجلی کی ترقی کے بھی وسیع امکانات ہیں کیوں کہ وہاں تیز رو دریاؤں اور آبشاروں کی بہتات ہے۔

خطے میں غیر ملکی سرمایہ کاری کی پلاننگ میں ہمیں اقتصادی نرم روی کے عمل کی رفتار قدرے سست رکھنی چاہیے کیوں کہ خطے کے عوام ابھی صنعتی شعبے میں اتنی زبردست غیر ملکی سرمایہ کاری کو انگیز کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس سے مقامی لوگوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ اتنے بڑے پروجیکٹوں سے ان کے دلوں میں دوری کا احساس بڑھے گا۔ شمال مشرقی خطے کی معیشت اور سماجی ڈھانچے کو دیکھتے ہوئے پبلک سیکٹر کو خطے کی اقتصادی ترقی کے لیے ایک اہم رول ادا کرتے رہنا چاہیے۔

> خطے میں غیر ملکی سرمایہ کاری کی پلاننگ میں ہمیں اقتصادی نرم روی کے عمل کی رفتار قدرے سست رکھنی چاہیے۔ کیوں کہ خطے کے عوام ابھی صنعتی شعبے میں اتنی زبردست غیر ملکی سرمایہ کاری کو انگیز کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۱
شمال مشرقی علاقوں اور ہندوستان کی آبادی

نمبر شمار	نام ریاست	آبادی میں اضافہ		کل آبادی (ملین)	آبادی کا گھنا پن فی مربع کلومیٹر	
		۱۹۷۱-۸۱ء	۱۹۸۱-۹۱ء	۱۹۹۱ء	۱۹۸۱ء	۱۹۹۱ء
۱۔	ہندوستان	۲۴٫۷	۲۳٫۵	۸۴۶٫۲	۲۱۶	۲۶۷
۲۔	اروناچل پردیش	۳۵٫۲	۳۵٫۹	۰٫۹	۸	۱۰
۳۔	آسام x	۲۳٫۴	۲۳٫۶	۲۴٫۶	۲۳۰	۲۸۴
۴۔	منی پور	۳۲٫۵	۲۸٫۶	۱٫۸	۶۴	۸۲
۵۔	میگھالیہ	۳۲٫۰	۳۱٫۸	۱٫۸	۶	۷۸
۶۔	میزورم	۴۸٫۶	۳۹٫	۰٫۷	۲۳	۳۳
۷۔	ناگالینڈ	۵۰٫۱۱	۵۶٫۹	۱٫۲	۴۷	۷۳
۸	تریپورہ	۳۱٫۹	۳۳٫۷	۲٫۷	۱۹۶	۲۶۲

x ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے اعداد وشمار اور ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے کچھ اعداد وشمار کی بنیاد پر آسام کی ۱۹۸۱ء کی آبادی کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۲

حقیقی فی کس خالص ریاستی گھریلو پروڈکٹ (این ایس ڈی پی) ۸۱-۱۹۸۰ء کی قیمتوں کی بنیاد پر

(روپیوں میں)

نمبر شمار	سال	کل ہند فی کس این ڈی پی	اروناچل پردیش	آسام	منی پور	میگھالیہ	میزورم (*)	ناگالینڈ (*)	تریپورہ
۱-	۱۹۸۰-۸۱ء	۱۶۲۵	۱۵۵۷	۱۲۰۰	۱۴۴۹	۱۳۹۱	۱۲۸۹	۱۳۸۳	۲۳
۲-	۱۹۸۱-۸۲ء	۱۶۸۷	۱۷۴۴	۱۳۰۷	۱۵۰۸	۱۳۷۹	۱۳۸۳	۱۶۶۶	۱۲
۳-	۱۹۸۲-۸۳ء	۱۶۹۷	۱۷۳۵	۱۳۶۷	۱۵۰۵	۱۳۹۱	۱۴۷۱	۱۹۴۱	۴۳
۴-	۱۹۸۳-۸۴ء	۱۸۰۱	۱۸۰۸	۱۳۷۵	۱۶۰۰	۱۳۵۴	۱۷۲۴	۲۲۵۱	۶۱
۵-	۱۹۸۴-۸۵ء	۱۸۲۷	۱۹۱۳	۱۴۵۷	۱۶۲۹	۱۳۸۵	۲۱۳۹	۲۵۷۹	۶۳
۶-	۱۹۸۵-۸۶ء	۱۸۵۸	۲۲۱۸	۱۴۸۳	۱۹۸۴	۱۴۲۷	۲۳۸۶	۲۸۰۰	۵۶
۷-	۱۹۸۶-۸۷ء	۱۸۸۹	۲۳۶۵	۱۳۷۴	۱۶۸۴	۱۴۱۵	۳۱۶۵	۳۰۳۴	۸۵
۸-	۱۹۸۷-۸۸ء	۱۹۲۳	۲۲۱۷	۱۵۲۱	۱۷۶۶	۱۴۸۳	-	۲۲۶۳	- *
۹-	۱۹۸۸-۸۹ء	۲۱۰۵	۲۳۲۹	۱۵۵۸	۱۷۷۵	-	-	۳۳۶۳	-

(*) چونکہ میزورم اور ناگالینڈ کے ضمن میں مستحکم قیمتوں کی بنیاد پر این. ایس. ڈی. پی کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں اس لیے این. ایس. ڈی. پی کا اندازہ موجودہ قیمتوں کی بنیاد پر لگایا گیا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۳

اقتصادی بنیادی ڈھانچے کی سطح پر اشاریے

ریاستیں	شاہراہوں کی لمبائی فی کلو میٹر (کل)		(مسطح)		شاہراہوں کی اوسط کل ہند لمبائی سے فاصلہ فی مربع کلو میٹر (فی صد) (کل)		(مسطح)		کمرشیل بینکوں کی کریڈٹ ڈیپازٹ ایشو بشمول آر. آر. بی. ایس ماہ جون کا آخری جمعہ (فی صد)	
	۱۹۸۰-۸۱	۱۹۸۳-۸۴	۱۹۸۰-۸۱	۱۹۸۳-۹۴	۱۹۸۰-۸۱	۱۹۸۳-۸۴	۱۹۸۰-۸۱	۱۹۸۳-۸۴	۱۹۸۱	۱۹۸۹
ہندوستان	۰٫۴	۰٫۴	۱۲	۱۲	۰٫۰	۰٫۰	۰٫۰	۰٫۰	۶۶٫۶	۶۵٫۵
اروناچل پردیش	۰٫۱	۰٫۱	٫۰	۱۰	۶۰٫۳	۶۷٫۱	۸۶٫۴	۸۸٫۸	۱۲٫۷	۱۹٫۸
آسام	۰٫۷	۰٫۷	٫۱	۰٫۱	-۸۲٫۹	-۵۴٫۶	۵۰٫۹	۶۹٫۳	۳۵٫۴	۵۸٫۶
منی پور	۰٫۲	۰٫۲	۰٫۱	۰٫۱	۳۴٫۲	۴۳٫۱	۵۳٫۱	۵۴٫۶	۳۷٫۹	۶۱٫۷
میگھالیہ	۰٫۲	۰٫۲	۰٫۱	۰٫۱	۴۵٫۵	۴۸٫۳	۳۵٫۹	۶۴٫۸	۱۷٫۸	۲۴٫۱
میزورم	۰٫۱	۰٫۱	٫۰	۰٫۱	۸۵٫۴	۷۰٫۶	۹۳٫۴	۷۴٫۶	۵٫۴	۲۶٫۶
ناگالینڈ	۰٫۳	۰٫۴	۰٫۰	۰٫۱	۱۱٫۰	۷٫۰	۷۶٫۹	۶۶٫۸	۲۷٫۹	۴۲٫۶
تریپورہ	۰٫۶	۰٫۸	۰٫۱	۰٫۱	-۷۸٫۱	-۹۰٫۷	۴۰٫۱	۵۰٫۹	۵۳٫۴	۶۶٫۹

بقیہ کور ۳: مردوں اور عورتوں کی برابری۔ بلا تفریق

سائنس دانوں، منصوبہ سازوں، ایڈمنسٹریٹروں، توسیع کارکنوں اور کاشت کاروں کو، جن میں کھیتوں پر کام کرنے والی عورتیں بھی شامل ہیں، اس معاملے میں زیادہ حساس بنانے میں مدد ملی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے عورتوں کی حالت بہتر بنا کر ہی انھیں اور دیہی سماج کو خوش حال بنایا جا سکتا ہے۔ ماضی میں تحقیق و ترقی کا کام کرنے والے ادارے نادانستہ طور



پر اس بات کو نظرانداز کرتے رہے ہیں کہ کھیت پر دیہی عورتیں کتنا کام کرتی ہیں اس کا کبھی کوئی اندازہ نہیں لگایا گیا نہ ہی اسے کسی ریکارڈ میں درج کیا گیا لہٰذا اسے تسلیم کیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ (عدم تعلیم) کاشتکار رہیں اور انھیں ترقی کے خاص دھارے میں شامل نہیں کیا گیا خواہ یہ تحقیق ہو، تعلیم ہو یا توسیعی سرگرمیاں"۔

ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سوامی ناتھن نے ۱۹۹۰ء میں شائع شدہ کتاب ..... IN AGRICULTURE-TECHNOLOGICAL PERSPECTIVE) کے دیباچہ میں کیا تھا۔

زراعت میں عورتوں کے رول کو اہمیت دینے کے لیے چند سال قبل خواتین کی ایک بین الاقوامی فیڈریشن قائم کی گئی۔ اس کے بعد عورتوں کے زرعی کاموں میں مدد دینے والی نئی ٹکنالوجیاں دریافت کی گئیں۔ لیکن غالباً یہ ٹکنالوجیاں ابھی بڑے پیمانے پر کاشت کار عورتوں تک پہنچ نہیں پائی ہیں۔ ڈاکٹر سوامی ناتھن مزید لکھتے ہیں: "ترقی پذیر ممالک کے بہت سے پہاڑی اور دور افتادہ علاقوں مثلاً ہمالیائی خطے میں کھیتی باڑی زیادہ تر عورتیں ہی کرتی ہیں کیوں کہ مرد گھر کی آمدنی بڑھانے کی غرض سے یا تنخواہ نوکری کی تلاش میں قصبات اور شہروں میں چلے جاتے ہیں۔ اس لیے عورتوں کی مکمل ذہنی اور جسمانی شمولیت کے بغیر ہندوستانی اراضی کے متبادل سسٹموں اور جگہ بدل بدل کر کھیتی کرنے کے طریقے کو مقبول بنانا، جینز (GENES) کی بربادی، زمین کے کٹاؤ کو روکنا، مٹی کی حفاظت کرنا اور تجارتی پودوں اور کھیت پر کام کرنے والے جانوروں کی نگہداشت کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا ممکن نہ ہوگا"۔

آج ہندوستان میں ۳۰ ملین سے زیادہ عورتیں دیہی سیکٹر میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ان میں سے ۲۰ ملین عورتیں کھیتوں پر مزدوری کرتی ہیں اور اندازاً دس ملین مویشی پروری اور دست کاریوں وغیرہ میں کام کرتی ہیں۔ شمال مشرقی ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں مزدور عورتوں کی تعداد مزدور مردوں سے زیادہ ہے۔ تمل ناڈو اور آندھرا پردیش کے بہت سے علاقوں میں بھی یہی صورت حال ہے۔

حقوق نسواں

کیا عورتوں کو خصوصاً دیہی علاقوں اور چھوٹے قصبوں اور شہروں کی عورتوں کو اپنے حقوق کے بارے میں معلوم ہے؟ یہ امر بہت مشکوک ہے۔ تاہم آزادی کے بعد سے عورتوں کے حقوق مستحکم بنائے جاتے رہے ہیں۔ یہ کام مختلف قوانین بنا کر کیا گیا ہے۔ پچاس کی دہائی میں مندرجہ ذیل قوانین بنائے گئے: اسپیشل میرج ایکٹ (۱۹۵۴ء)، ہندو میرج ایکٹ (۱۹۵۵ء)، ہندو وراثت (سکیشن) ایکٹ (۱۹۵۶ء)، ہندو اڈاپشنز مینٹی نینس ایکٹ (۱۹۵۶ء)۔

عورتوں کے ساتھ انصاف اور میڈیا

مختلف حالات میں عورتوں کو انصاف دلانے کی ضرورت ہے اس سوال پر مزید بحث اور غور و خوض ضروری ہے۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان انصاف زیادہ تر کاغذ پر ہی محدود ہے۔ زندگی کی ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ عزبت کی تکالیف بھی عورتوں ہی کو زیادہ اٹھانا پڑتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا میں ۵ء۲ بلین افراد خوراک، پینے کے محفوظ پانی، صحت کی دیکھ بھال اور تعلیم کے معاملے میں انتہائی عزبت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان میں ہر ۵ افراد میں سے ایک عورت ہے۔ دنیا کے ایک ہی سرپرست والے کنبوں میں بیشتر کنبوں کی سربراہ عورتیں ہی ہیں۔ غیر معاون رسم و رواج جو ہندوستان میں زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں اور جن میں سے ایک ستی کی رسم ہے ان کے خلاف جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ذرائع ابلاغ (میڈیا) ان مذموم رسومات کو روشنی میں لا سکتے ہیں اور لوگوں میں ان کے خلاف قومی جذبہ پیدا کر سکتے ہیں۔ خاص کر جرنلسٹ خواتین اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہیں۔ لیکن انھیں یہ کام بہت احتیاط اور ہوشیاری سے کرنا ہوگا تاکہ ان کی تحریروں کو پروپیگنڈہ قرار دے کر ناکام نہ بنا دیا جائے۔ ہندوستانی آئین ہر شہری کو برابر کا تحفظ دیتا ہے۔ لیکن صرف قانون ہی کافی نہیں ہے، اس پر موثر عمل درآمد بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے ایک اصلاحی تحریک بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ ایک ہمدرد میڈیا اور عدلیہ سب

ایک اندازے کے مطابق دنیا میں ۵ء۲ بلین افراد خوراک، پینے کے محفوظ پانی، صحت کی دیکھ بھال اور تعلیم کے معاملے میں انتہائی عزبت کی زندگی بسر کر رہے ہیں [illegible]

سے پہلے تو عورتوں کے خلاف تشدد اور جنس کی بنا پر تفریق و امتیاز کے واقعات کو روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔ ابھی حال تک عورتیں اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں کو روشنی میں لانے کی بجائے خاموشی سے نوکری چھوڑ دینا پسند کرتی تھیں اور شادی کا خیال بھی چھوڑ دیتی تھیں۔ میڈیا ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

مختلف وجوہات کی بنا اپنے شوہروں سے علاحدگی اختیار کرنے والی عورتوں کے لیے اپنے بچوں کی نگرانی ایک اور قابل غور معاملہ ہے۔ بعض اوقات عدالتیں کام کرنے والی عورتوں کے مقابلے میں مضبوط مالی حالت رکھنے والے شوہروں کو بچوں کی پرورش و دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپنا پسند کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں ان عورتوں اور ان کے بچوں کے جذبات کی ان دیکھی ہوتی ہے۔ لیکن ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جب عورتوں کو بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے تو یہ کام تسلی بخش طریقے سے نہیں ہو پاتا۔ گزارہ بھتے کی وصولی اکثر ایک مشکل کام ہوتی ہے۔ ایک طلاق شدہ عورت کی ایک اہم ضرورت مکان کی ہوتی ہے جو اسے گزارہ الاؤنس کے طور پر ملنے والی رقم سے پوری نہیں کی جا سکتی۔ مردوں اور عورتوں کی برابری ایک ایسا موضوع ہے جس پر ذرائع ابلاغ زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ لہٰذا عورتوں کی فلاح و بہبود کی تنظیموں کو اس نکتے پر زور دینا چاہیے تاکہ سب لوگ اسے جان جائیں۔ موجودہ حالات میں عورتوں کے لیے صحیح ملازمت حاصل کرنا اور مناسب ترقی پانا مشکل ہے۔ چند ریاستوں کے سوا

باقی مقامات پر ابھی تک مشترکہ خاندان کی جائداد میں سے عورتوں کو حصہ نہیں ملتا۔ عورتوں کے خلاف تشدد کے بھی کافی واقعات ہوتے ہیں۔ عورتوں کے مسائل پر پولیس کو زیادہ حساس بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ کام امیدواروں کے ملازمت میں داخل ہونے پر خصوصی تعلیمی نصابات کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ عدلیہ داد و تحسین کی مستحق ہے اس لیے کہ سپریم کورٹ نے

[illegible]

عورتوں کے معاملے میں کچھ مددگار فیصلے صادر کیے ہیں۔

خواتین کے کمیشن کا رول

گھریلو جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے خواتین کمیشن لوک عدالتوں کی طرز پر مہیلا عدالتیں منعقد کرتا ہے جو جلد انصاف کرتی ہیں۔ کمیشن نے عورتوں کے تحفظ کے لیے قوانین کو مضبوط بنانے

تعلیم نسواں کی اشاعت اور جدید طرز زندگی کی بدولت عمر
میں تبدیلی آئی اور خواتین کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ اس
طبقے کی عورتوں نے اپنی شناخت بنانے کی [illegible]
ایسی شناخت جو ان کے [illegible]

کی سفارش کی ہے۔ مثال کے طور پر وہ اس بات پر زور دے رہا ہے کہ عصمت دری کو ایک ناقابل ضمانت جرم قرار دینے کے لیے ایک قانون پاس کیا جانا چاہیے۔ اس قانون کا مسودہ دو سالوں سے التوا میں پڑا ہے۔ آٹھ سے سولہ برس تک کی طوائف پیشہ بچیوں کا مسئلہ بھی فوری توجہ کا محتاج ہے۔ خواتین کمیشن کی چیرمین شریمتی موہنی گیری کے مطابق صرف ممبئی ہی میں ۲۰۰۰۰ طوائف پیشہ بچیاں ہیں۔ ملک کے ہر ضلع میں ایسی ۲۵۰۰ بچیاں ہیں۔ ان میں سے

کچھ نیپال کی، کچھ بنگلہ دیش کی اور کچھ سری لنکا کی ہیں۔ دلالوں کے ذریعے ان کے بھارت میں لائے اور مجبور خانوں کو فروخت کیے جانے کا سلسلہ بند ہونا چاہیے۔ کچھ زیادہ بڑے شہروں میں قیدی عورتوں کی حالت افسوسناک ہے۔ خواتین کمیشن اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کی حاصل کی ہوئی معلومات پر، جو مردوں اور عورتوں کی برابری کے سوال پر سال ۱۹۹۵ء کے انسانی ترقی کی رپورٹ میں شائع کی گئی تھیں، زور دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "اقتصادی اصطلاحات میں عورتوں کے کام کی بہت کم قیمت آنکی جاتی ہے۔ ان کے گھریلو اور سماجی کاموں کی قیمت بازار کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔" عورتوں کے بارے میں دیگر مطالعاتی جائزوں سے دلچسپ حقائق روشنی میں آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا تناسب گھٹ رہا ہے۔ ایک جائزے میں بتایا گیا ہے کہ "تناسب میں یہ کمی پچھڑی ہوئی ذاتوں میں زیادہ نمایاں ہے۔" ۱۹۹۱ء میں کچھ درج فہرست ذاتوں میں ایک ہزار مردوں پر عورتوں کا تناسب ۹۲۲ تھا جب کہ مجموعی آبادی میں یہ تناسب ایک ہزار مردوں پر ۹۲۷ تھا۔" خواتین کمیشن اس بات پر زور دے رہا ہے کہ عورتوں کو تمام سطحوں پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہیے تاکہ انھیں تعلیم، صحت کی دیکھ بھال، روزگار کے مواقع تک بہتر رسائی حاصل ہو سکے اور ان کے اندر اپنے قانونی حقوق کے بارے میں بیداری پیدا ہو۔ جہاں تک ذرائع ابلاغ کا تعلق ہے کمیشن کو افسوس ہے کہ "بڑھتی ہوئی تجارتی کاری اور بڑھتا ہوا تجارتی انداز نظر — خصوصاً ٹیلی ویژن میں — سخت تشویش کا باعث ہے۔" عورتوں کو اکثر گھٹیا اور ناشائستہ انداز سے

دکھایا جاتا ہے۔ مصیبت زدہ عورتوں کا مسئلہ مسلسل برقرار ہے جس کی کئی وجوہات ہیں۔ میڈیا ایسے معاملات پر روشنی تو ڈالتا ہے مگر میرے خیال میں وہ کافی نہیں ہے۔

ایک نیا طبقہ

چند دہائیوں سے بھارت میں اخبارات و جرائد پر مردوں کا تسلط تھا۔ محض معدودے چند خواتین اخبارات کے دفاتر میں جو بیشتر عہدوں پر دکھائی دیتی تھیں جو خواتین کی دلچسپی والے موضوعات مثلاً فیشن، خانہ داری اور پرورش بچگان کے سیکشنوں میں کام کرتی تھیں۔ خاتون صحافی بھی زیادہ تر انھی موضوعات پر طبع آزمائی کیا کرتی تھیں۔ دفاتر میں عورتوں کو برائے آرائش رکھا جاتا تھا اس لیے جسمانی خوب صورتی ان کی سب سے بڑی قابلیت تصور کی جاتی تھی ورنہ بیشتر عورتوں کی طاقت و توانائی گھریلو معاملات پر ہی صرف ہوتی تھی۔ اخبارات و رسائل کے اشتہارات میں انھی پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ تعلیم نسواں کی اشاعت اور جدید طرز زندگی کی بدولت منظر میں تبدیلی آئی اور خواتین کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ اس طبقے کی عورتوں نے اپنی شناخت بنانے کے حق پر زور دیا۔ ایسی شناخت جو ان کی ماؤں سے مختلف تھی جو مردوں پر (خواہ وہ باپ ہوں یا شوہر) انحصار رکھنے والی مطیع و فرمانبردار لڑکیوں یا بیویوں کی حیثیت سے پلی بڑھی تھیں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے ضروری ہوگیا کہ خوش اسلوبی سے گھر چلانے کے لیے میاں بیوی دونوں گھر سے باہر کام پر جائیں۔ اس کا اثر اخبارات پر بھی پڑنا لازمی تھا۔ جہاں جو اخبارات و جرائد کے دفاتر میں خواتین بڑی تعداد میں روزگار کی تلاش میں آنے لگیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک، کام کے اوقات، رات کی ڈیوٹی اور اس لیے بھی کہ رپورٹر کو کسی بھی وقت کہیں بھی جانا پڑ سکتا ہے، اخبارات کی ملازمت عورتوں کے لیے مناسب خیال نہیں کی جاتی تھیں۔

جب گھر سے باہر کام کرنے والی خواتین نے اپنی صلاحیتوں کو پہچانا تو وہ ان شعبوں میں بھی داخل ہوئیں جو مردوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ کوئی بھی کام جو مرد کرتا ہے برابر کی صلاحیت اور زیادہ سنجیدگی سے کرسکتی ہیں۔ پھر کیا تھا اخبارات کے دروازے ان کے لیے کھل گئے اور وہ ان میں کام کرنے لگیں۔ چوں کہ ہمارے ملک میں زراعتی کام کرنے والوں میں بہت بڑی تعداد عورتوں کی ہے اور شہروں میں بھی بڑی بڑی عمارتیں مزدور عورتوں کی مدد سے تعمیر کی جاتی ہیں۔ اس لیے خاتون جرنلسٹوں کو عورتوں کا مرتبہ بلند کرنے اور ان کے تئیں سماج کا رویہ بدلنے کے لیے اپنی ذمہ داری سنبھالنی چاہیے۔

اصلیت کیا ہے؟

اگرچہ ہندوستان کا آئین مردوں اور عورتوں کو برابر کے حقوق دیتا ہے مگر ہندوستانی عورت فی الحقیقت پوری برابری حاصل نہیں کرپائی ہے۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ برابر کے کام کے لیے برابری تنخواہ دی جائے لیکن مختلف مزدوروں وغیرہ کے کاموں میں اکثر ایسا نہیں کیا جاتا۔ عورتوں کے لیے اونچی نوکریوں پر جہاں مرد بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں، پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ عورتوں کے خلاف امتیاز کی یہ ایک صورت ہے۔ تاہم سرکاری ملازمت کرنے والی عورتوں کی حالت بہتر ہے۔ مختلف سرکاری محکموں میں خواتین ذمہ دار عہدوں پر دیکھی جاسکتی جہاں انھیں اہم فیصلے بھی لینے پڑتے ہیں۔ خواتین آئی۔ اے۔ ایس آئی۔ پی۔ ایس اور فارن سروس میں بھی قابل تعریف کام کررہی ہیں۔ خواتین کا ذریعۂ آمدنی اب صرف درس و تدریس، نرسنگ اور علم الادویہ تک محدود نہیں رہا ہے۔ خواہ ایڈورٹائزنگ کا شعبہ ہو یا آرٹس کا، فن تعمیر ہو یا قانون خواتین سبھی میدانوں میں اپنا لوہا منوا رہی ہیں۔

غیر منظم سیکٹر میں خواتین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ماضی میں انھیں مزدور یونینوں کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے تکالیف و مصائب کا شکار بننا پڑتا تھا۔ لیکن شاید اب وہ مزدوروں کے ساتھ برابری کی راہ پر چل پڑی ہیں۔ سیاست میں خواتین پیچھے ہیں۔ بہت سے دوسرے ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی پارلیمنٹ میں مردوں ہی کا غلبہ ہے۔ اس وقت تک چناؤ لڑنے پر بڑا خرچ آتا تھا۔ لیکن حالیہ انتخابی اصلاحات اور خواتین کے لیے ریزرویشن کے اہتمام کے بعد توقع کی جاسکتی ہے کہ قریب مستقبل میں خاتون امیدواروں کے لیے حالات میں بہتری آئے گی۔ پبلک ورک ___ خواہ یہ پنچایتوں سے متعلق ہو یا پارلیمنٹ سے یا ریاستی اسمبلیوں سے ___ کے لیے تھوڑی بہت ٹریننگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے رضامند امیدواروں کے لیے مختصر تربیتی نصابات کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک طرح سے ہندوستانی عورتوں کی کیفیت مغربی ملکوں کی عورتوں سے بہتر ہے۔ وہ اس لیے کہ انھیں مغربی عورتوں کے مقابلے میں حق رائے دہی جلد حاصل ہوگیا ہے۔ جدوجہد آزادی میں بھی عورتوں نے سرگرم حصہ لیا تھا۔ وہ جیل گئیں اور طرح طرح کی مصیبتیں اٹھائیں۔ اس طرح وہ واقعی مردوں کے ساتھ برابری کی حق دار بنیں۔ قانون ہندوستانی عورتوں کے لیے پوری طرح مہربان نہیں رہا ہے۔ اگرچہ تحفظی قوانین نے کچھ پیش رفت کی ہے۔ تاہم خود قوانین ہی میں اب بھی کچھ خامیاں موجود ہیں۔ لیکن زیادہ خامیاں آزادی کے بعد حکومت

> سرکاری ملازمت کرنے والی عورتوں کی حالت بہتر ہے۔ مختلف سرکاری محکموں میں خواتین ذمہ دار عہدوں پر دیکھی جاسکتی جہاں انھیں اہم فیصلے بھی لینے پڑتے ہیں۔

کے پاس کیے تحفظی قوانین پر عمل درآمد میں ہیں کیوں کہ ان قوانین پر صدق دل سے عمل نہیں کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر آبائی جائداد کے معاملے میں عورتوں کو ان کا حق دلانے کے لیے کارروائی کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ترمیم شدہ ہندو قانون میں ہندوستانی عورت کو بہت سے نئے حقوق دیے گئے ہیں تاہم وہ بٹوارے کے لیے نہیں کہہ سکتی۔ لیکن اسے اور اس کے شوہر کو شادی میں جو کچھ ملتا ہے بشمول ایک مکان کے اگر وہ اس کے شوہر کے نام پر ہو، وہ قانونی طور پر اس کی دعویدار نہیں بن سکتی۔ لیکن عدالتی کارروائی خصوصاً بلند تر سطحوں پر اس کے لیے مددگار رہی ہے۔ کچھ فیصلوں میں شوہر سے علاحدہ ہو گئی بیوی کے لیے مکان کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔ عورتوں کے خلاف تشدد خواہ وہ عصمت دری ہو یا جہیز کے لیے اذیت رسانی، ایک سنگین معاملہ ہے، جہیز کی ممانعت کے قانون ۱۹۶۱ء میں ۱۹۸۶ء میں ترمیم کی گئی تھی تاکہ اسے زیادہ موثر بنایا جا سکے۔ شکایت درج کرانے کے لیے مقررہ میعاد ختم کر دی گئی۔ اب عدالت کو خود اپنی معلومات کی بنا پر یا کسی تسلیم شدہ فلاحی تنظیم کی دائر کی ہوئی شکایت کی بنیاد پر کارروائی کرنے کا اختیار ہے۔ تعزیرات ہند میں جہیز کے لالچ میں قتل کے بارے میں ایک نئے سیکشن کا اضافہ کیا گیا ہے۔

کل آبادی میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا تناسب (۱۰۰۰ مردوں پر ۹۲۷ عورتیں) بھی باعث تشویش ہے کیوں کہ بچوں کی اموات کی شرح لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں میں زیادہ ہے۔ ایک اور توجہ طلب مسئلہ یہ ہے کہ بیچ میں پڑھائی چھوڑ دینے والوں میں لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں کی تعداد کافی زیادہ ہے اور اسکولوں کے داخلوں میں بھی لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے کم ہوتی ہے۔ بہر حال اب عورتوں کی اس صورت حال میں بہتری کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ دفاتر روزگار میں درج بے روزگاروں میں بھی عورتوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ شادی کے لیے عورتوں کی عمر بھی بڑھ گئی ہے اور پیدائش کے وقت متوقع عمر میں اضافہ ہوا ہے۔

ہمارے پنج سالہ منصوبوں میں عورتوں کی فلاح و بہبود پر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ فلاحی اقدامات کے لیے سماجی بہبود کا ایک مرکزی بورڈ ۱۹۵۳ء میں قائم کیا گیا۔ ترقیاتی منصوبوں میں سماجی بہبود کے لیے تعلیم نسواں کی اہمیت پر زور دیا گیا اور تسلیم کیا گیا کہ مختلف وسائل تک عورتوں کی رسائی کم ہونے کی وجہ سے عورتوں کی ترقی میں رکاوٹ پیش آ رہی ہے لیکن آج کل عورتوں کی بہبود کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ترقی پر زور دیا جا رہا ہے تاکہ عورتیں قومی نصب العینوں کے حصول میں مددگار ثابت ہو سکیں۔ ●

بقیہ: آزادی کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی

کی طاقت بڑھ سکے۔ ہماری سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ کی کوششوں میں، جو زیادہ تر سرکاری لیباریٹریوں میں کی جاتی ہیں اور جن کے نتائج کا استعمال صنعتوں اور کاروبار میں بھی کیا جاتا ہے، تال میل کی کمی دیکھنے میں آئی ہے۔ ہم نے زراعت، ایٹمی توانائی اور خلائی کوششوں کے شعبوں میں دیکھا ہے کہ تال میل کتنا فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔

تاہم صنعتی میدان میں ٹکنالوجی اکثر سمندر پار کے شراکت داروں سے آ رہی ہے۔ اور وہ خود اپنی تحقیق و ترقی کے نتائج پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ہماری تحقیق و ترقی کی تنظیموں کا نشانہ خود اپنی ٹکنالوجی استعمال کرنے والے ہندوستانی کمپنیاں اور سمندر پار کمپنیاں دونوں ہونی چاہئیں اور انھیں پروڈکٹ کو بہتر بنانے اور نئے پروڈکٹ/طریقے نکالنے کے لیے ڈیولپمنٹ کنٹریکٹس حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارے تحقیق و ترقی کے اداروں نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ "سرکاری اداروں" کی سی نوعیت اختیار کر لی ہے۔ اس رجحان کو جلد ہی بدلنے کی ضرورت ہے۔ ایک غیر مراتب پرستانہ ماحول میں انفرادی پہل اور پیش قدمیوں کی حوصلہ افزائی کرنا بہت ضروری ہے۔ ہماری لیباریٹریوں کے تحقیق و ترقی کی سہولیات کے بنیادی ڈھانچے کو بہتر اور جدید تر بنانے کے لیے کافی رقومات مختص کرنے کی ضرورت ہے۔ بنیادی سائنس ریسرچ کی مدد و حمایت میں اضافہ کیا جانا چاہیے۔ ہمیں علمی اداروں میں مختلف شعبوں اور خصوصی نوعیت کے کاموں کے لیے عمدہ کارگزاری کے مراکز قائم کرنے چاہئیں۔ ہمیں قابل اور ہونہار نوجوانوں کو واپس سائنس کی طرف راغب کرنے کے سوال پر بھی دھیان دینا چاہیے خاص کر اس لیے کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں اور مینجمنٹ اداروں میں دی جانے والی تنخواہیں ایسی ہیں کہ بہتوں کے لیے ان کی کشش سے بچنا محال ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ ہماری مختلف لیباریٹریوں اور ان کے سائنس دانوں کے درمیان تعاون اور اشتراک عمل کا ایک نیا دور شروع کیا جانا چاہیے تاکہ ہماری سائنس اور ٹکنالوجی کی مضبوط بنیادوں سے ہماری ہمہ گیر ترقی کی رفتار اور تیز ہو سکے۔ ●

بقیہ: ہندوستانی جمہوریت: ابتدائی ۵۰ برس

گئے طبقات کو نمائندگی دینے کے لیے اپنے آپسی اختلافات بھلا دیتی ہیں۔ اکثر وقت کے ساتھ ساتھ ہونے والی تبدیلیوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے آئین میں ترامیم کی گئی ہیں۔

اب جب کہ ہندوستان آزادی کے پچاسویں برس میں داخل ہو رہا ہے یہ ہمارے لیے خود احتسابی کا وقت ہے۔ ہمیں اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ کیا آئین پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہے تاکہ اس کی خامیوں کو دور کیا جا سکے۔ ●

بقیہ: ہماری دفاعی تیاری

ضرورت ہوتی ہے اس لیے ہر پہلو سے عوام کے تعاون کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ کھلا پن لانا ضروری ہے۔ ●

اُتل کمور شش

ہندوستانی ریلوے

ہندوستانی ریلیں ہر روز ۱۲ ملین مسافروں اور ایک ملین ٹن سے زیادہ مال کا نقل و حمل کرتی ہیں اور انھوں نے ملک کی سماجی و اقتصادی ترقی میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ تاہم مصنف کا کہنا ہے کہ ریلوں کی کارکردگی بہتر بنانے کی ہر کوشش کامیاب نہیں رہی ہے۔

ہندوستانی ریلیں ہر روز کرۂ ارض سے چاند تک کے فاصلے کی ساڑھے تین گنی مسافت طے کرتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستانی ریلیں سات گھنٹے سے بھی کم وقت میں اتنا فاصلہ طے کرتی ہیں جو ایک مصنوعی سیارہ چھ دنوں میں طے کرتا ہے۔ وہ ہر روز ۱۲ ملین مسافروں اور ایک ملین ٹن سے زیادہ مال کا نقل و حمل کرتی ہیں۔ لیکن یہ اعداد و شمار حیرت انگیز نہیں ہیں کیوں کہ ہندوستانی ریلوے ایک ہی انتظام کے تحت کام کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ریلوے نظام ہے۔

مسافروں کے لیے سہولیات کو بہتر بنانے کی کوشش

ملک کی آزادی کے بعد پہلا کام راجاؤں مہاراجاؤں کی ملکیت میں چلنے والی مختلف ریلوے لائنوں اور برطانوی کمپنیوں کے زیر انتظام ریلوے نظاموں کو ایک ہی نظام کے تحت منظم کر کے ہندوستانی ریلوے کو معرض وجود میں لانا تھا۔ اس سے بھی اہم کام یہ تھا کہ تقسیم وطن کے سبب ہونے والے نقصانات اور عملے کی کمی کو جلد از جلد پورا کیا جائے۔

تقسیم وطن کا ایک اور نتیجہ یہ تھا کہ آسام اور شمال مشرق کے ساتھ ریل رابطہ قریب قریب منقطع ہو گیا تھا۔ اسے انتہائی عجلت کے ساتھ بحال کیا جانا تھا۔ جب یہ کام ہو گیا تو مسافروں کے لیے سہولیات بڑھانے، ریلوں کے لیے بنیادی ڈھانچے کا سامان ملک کے اندر ہی تیار کرنے اور ریلوے نظام کی جدید کاری پر توجہ دی گئی۔

اس سمت میں پہلا قدم یہ تھا کہ لکڑی سے بنے ہوئے ڈبوں کو لوہے اور المونیم سے بنے ہوئے کوچوں سے بدلا گیا جو زیادہ مضبوط تھے اور جنھیں زیادہ تیز رفتار سے چلایا جا سکتا تھا اس کے علاوہ ان ڈبوں میں آگ لگنے کا امکان بھی کم ہوتا تھا۔ اس سے بھی اہم فیصلہ ڈیزل انجن چلانے کا تھا جو بھاپ سے چلنے والے انجنوں کی بہ نسبت زیادہ تیز رفتار سے چل سکتے تھے۔ جب کناڈا سے پہلا تیز رفتار ڈیزل انجن درآمد کیا گیا تو اس سے سبھی کو خوشی نہیں ہوئی لیکن آج بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہندوستانی ریلوے کی رفتار بڑھانے والا ایک اہم قدم اور ریلوے کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل تھا۔

خود انحصاری

جب ملک میں خود انحصاری پر مبنی معیشت کی تعمیر کے لیے منصوبہ بندی کا دور شروع ہوا تو ہندوستانی ریلوے نے غیر ممالک سے درآمدات کے جو معاہدے کیے ان میں ٹکنالوجی کی منتقلی کی شق بھی شامل کی گئی۔ اس کے نتیجے میں ریلوے کا کچھ سامان ملک کے اندر ہی تیار کیا جانے لگا۔ اس کے لیے پیرامبور (چینئی) میں انٹیگرل کوچ فیکٹری، وارانسی میں ڈیزل لوکوموٹیو ورکشاپ اور کلکتہ میں چترنجن لوکوموٹیو ورکس کا قیام عمل میں لایا گیا اور ہندوستانی ریلوے خود انحصاری کی راہ پر چل پڑی۔

ڈیزل اور برقی ریلوے انجنوں کی اندرون ملک تیاری اس بات کی علامت تھی کہ اب بھا

آزادی کے بعد پہلا کام راجاؤں مہاراجاؤں کی ملکیت میں چلنے والی مختلف ریلوے لائنوں اور برطانوی کمپنیوں کے زیر انتظام ریلوے نظاموں کو ایک ہی نظام کے تحت منظم کر کے ہندوستانی ریلوے کو معرض وجود میں لانا تھا۔

سے چلنے والے انجنوں کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ چناں چہ ۱۹۷۰ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب ملک میں بھاپ سے چلنے والے انجن نہیں بنائے جائیں گے۔ اس طرح بھاپ انجنوں کا ایک شاندار دور ختم ہوا۔ یہ خبر "سیاہ حسن" کے شیدائیوں کے لیے افسوسناک ثابت ہوئی لیکن کیا کیا جاسکتا تھا کیوں کہ بھاپ سے چلنے والے انجن رفتار، صلاحیت اور کارکردگی میں ڈیزل اور برقی انجنوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ اس وقت ماحولیات کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی لیکن اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی بھاپ انجنوں کو خیرباد کہنے کی ایک وجہ قرار دی جاسکتی ہے۔

لیکن بھاپ سے چلنے والے انجن ہندوستانی ریلوے کے نقشے سے بالکل ناپید نہیں ہو جائیں گے۔ دارجیلنگ اور اوٹی میں چلنے والی "کھلونا" ٹرینیں اگلی صدی میں بھی چلتی رہیں گی۔

صرف دو درجے

ملک کی پہلی جنتا سرکار نے فلاحی وجوہات کی بنا پر فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان کی ریلوں میں صرف دو درجے ہوا کریں گے۔ فرسٹ اور سیکنڈ۔ لمبے فاصلے کے مسافروں کی سہولت کے لیے دوسرے درجے میں گدے دار سیٹوں کا اہتمام کیا گیا۔

اس کے بعد غیرایئرکنڈیشنڈ فرسٹ کلاس کوچ ختم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا اور اس قسم کے ڈبے تیار ہونے بند ہوگئے۔ غیرایئرکنڈیشنڈ فرسٹ کلاس کی جگہ پر نئی سیکنڈ ایئرکنڈیشنڈ کلاس شروع کی گئی۔ فرسٹ کلاس کے پرانے کوچوں میں ایک کمپارٹمنٹ میں زیادہ سے زیادہ ۱۶ مسافر سفر کرسکتے تھے اور کمپارٹمنٹ ایک ڈرائنگ روم (دیوان خانہ) کی طرح نظر آتا تھا جس میں دیوار کے ساتھ صوفے لگے ہوئے تھے۔ یہ سفر کا ایک شاندار طریقہ تھا بشرطیکہ موسم گرما کی گرمی اور گرد و غبار کی پروا نہ کی جائے۔

نئے اے۔سی۔ سیکنڈ کلاس میں عموماً ۴۶ مسافر سفر کرسکتے ہیں۔ مسافری ٹریفک میں اضافہ اس کی صلاحیت بڑھانے کا متقاضی تھا۔ ڈبل ڈیکر کوچوں کو مقبول بنانے کی کوشش کی گئی مگر ناکامی ہاتھ لگی۔ وجہ یہ کہ ہندوستانی حالات میں ڈبل ڈیکر کوچوں کو محفوظ نہیں سمجھا گیا۔

بہرحال ہندوستانی ریلوے کو تیز رفتار ٹرینیں چلانے میں کامیابی حاصل ہوئی جو سو کلو میٹر فی گھنٹہ سے زیادہ رفتار سے چلتی ہیں۔ اس سمت میں پہلی کوشش راجدھانی ایکسپریس کا آغاز تھی۔ یہ ٹرینیں جو دہلی سے ہاوڑہ تک چلائی گئی تھی۔ ۱۳۰ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکتی تھی۔ یہ بہت مقبول ہوئی اور پھر دوسرے ٹرنک روٹوں پر بھی ایسی ہی ٹرینیں چلانے کی مانگ کی جانے لگی۔

کلکتہ میٹرو

ہندوستانی ریلوے کی آزادی کے بعد کی تاریخ میں ایک اور اہم سنگ میل کلکتہ میٹرو شروع کرنے کا ... تھا۔ اگرچہ اس فیصلے کو زیر عمل لانے ... کافی زیادہ دیر لگی تاہم اس کی بدولت ہندوستانی ریلوے نے ملک یا بیرون ملک کہیں بھی اس طرح کا پروجیکٹ کامیابی کے ساتھ مکمل کرنے کی صلاحیت حاصل کرتی ہے۔

راجدھانی ایکسپریس

پہلی راجدھانی ایکسپریس جیسی لمبے فاصلے کی مزید تیز رفتار ٹرینیں چلانے کے لیے ہندوستانی ریلوے کی ترجیحات بدستور قائم ہیں۔ چناں چہ اگلی راجدھانی ایکسپریس نئی دہلی ممبئی روٹ پر چلائی گئی۔ یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ آج راجدھانی ٹرینیں شمال مشرقی راجدھانیوں کو چھوڑ کر قریب قریب باقی تمام ریاستوں کی راجدھانیوں کو دہلی سے جوڑتی ہیں۔ جے پور اور احمد آباد راجدھانی ٹرینوں کے نقشے پر نہیں ہیں لیکن وہ دہلی۔ احمد آباد روٹ کے چوڑی لائن میں تبدیل کیے جانے کے بعد عنقریب اس نقشے پر آجائیں گے۔ یہاں یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ سلامتی اور حفاظت کے خیال سے راجدھانی ٹرینیں ابھی زیادہ سے زیادہ رفتار سے نہیں چلائی جارہی ہیں۔

شتابدی ایکسپریس

حال ہی کے برسوں میں دہلی سے تیز رفتار شتابدی ایکسپریس ٹرینیں بھی چلائی گئی ہیں جو سیاحوں اور کاروبار کی غرض سے ایک شہر سے دوسرے شہر جانے والوں میں بہت مقبول ثابت ہوئی ہیں۔ راجدھانی ٹرینوں کا شیڈول ایسا ہے کہ مسافر رات ٹرین پر گزار کر اگلی صبح پورے دن کے کام کاج کے لیے اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔ دوسری طرف شتابدی سے سفر کرنے والے مسافر اپنا کام نمٹا کر شام کو دہلی واپس پہنچ سکتے ہیں کیوں کہ یہ ٹرینیں ۱۶۰ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی سے آگرہ، جے پور، چنڈی گڑھ اور بھوپال جیسے شہروں تک فضائی سروسیں چلانے والی ایئرلائنوں کو شتابدی ٹرینوں کی وجہ سے سخت مقابلے کا سامنا کرنا

> آج راجدھانی ٹرینیں شمال مشرقی راجدھانیوں کو چھوڑ کر قریب قریب باقی تمام ریاستوں کی راجدھانیوں کو دہلی سے جوڑتی ہیں۔ جے پور اور احمد آباد راجدھانی ٹرینوں کے نقشے پر نہیں ہیں لیکن وہ دہلی۔ احمد آباد روٹ کے چوڑی لائن میں تبدیل کیے جانے کے بعد عنقریب اس نقشے پر آجائیں گے۔ دہلی سے آگرہ، جے پور، چنڈی گڑھ اور بھوپال جیسے شہروں تک فضائی سروسیں چلانے والی ایئرلائنوں کو شتابدی ٹرینوں کی وجہ سے سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

پڑرہا ہے۔ بہرحال راجدھانی ٹرینوں کی طرح شتابدی ٹرینیں بھی سلامتی اور حفاظت کے خاطر اپنی زیادہ سے زیادہ رفتار سے نہیں چلائی جارہی ہیں۔

سوئٹزرلینڈ سے درآمد کردہ نہایت ترقی یافتہ ۶۰۰۰ ہارس پاور اور تین فیز والے اے۔ سی الیکٹرک انجنوں کا استعمال کرکے اور بھی تیز رفتار گاڑیاں چلائی جاسکتی ہیں اور موجودہ گاڑیوں کی رفتار بڑھائی جاسکتی ہے مگر موجودہ پٹریاں، سگنلنگ اور دوسرے حالات زیادہ تیز رفتار

> تکنالوجی کو بہتر بنانے اور اس کی مدد سے مال گاڑیوں میں لگائے جانے والے انجنوں کی [illegible] طاقت بڑھانے میں بھی یکساں دلچسپی لی جارہی ہے۔

گاڑیاں چلانے کی اجازت نہیں دیتے۔ فی الحال ان نئے ریلوے انجنوں کے ذریعے مسافر اور مال گاڑیوں دونوں کی صلاحیت نقل و حمل بڑھائی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ درآمد شدہ انجن ۲۶ یا اور بھی زیادہ کوچ کھینچ لے جاسکتا ہے جب کہ موجودہ ٹرینوں میں صرف ۱۸ یا ۱۹ کوچ لگائے جاتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ صرف تیز رفتار مسافر گاڑیاں چلانے ہی کی بات سوچی جارہی ہے۔ تکنالوجی کو بہتر بنانے اور اس کی مدد سے مال گاڑیوں میں لگائے جانے والے انجنوں کے کھینچنے کی طاقت بڑھانے میں بھی یکساں دلچسپی لی جارہی ہے۔ مال گاڑیوں کی صلاحیت نقل و حمل بڑھانے کے لیے نئی اور بہتر قسم کے ویگن بھی لگائے جارہے ہیں۔ کیوں کہ مال گاڑیاں ہی ہندوستانی ریلوے کی اصلی ان داتا ہیں۔

اگرچہ ملک میں ۱۶۰ کلو میٹر فی گھنٹہ سے بھی زیادہ تیز رفتار گاڑیاں چلانے کی جلدی نہیں ہے تاہم لگتا ہے کہ تیز رفتار گاڑیوں کے دور میں داخل ہونے کی تیاری ضرور کی جارہی ہے اس لیے کہ حال ہی میں جرمنی سے ۲۱ ہائی اسپیڈ پسنجر کوچ درآمد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو ۳۰۰ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ٹرینوں میں استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ اس معاہدے میں

تکنالوجی کی منتقلی کی شق بھی شامل ہے۔ پٹریوں کی برق کاری سے بھی، ۲۰٫۸ فی صد روٹ کلو میٹروں پر کی جاچکی ہے، مسافروں اور مال کے نقل و حمل کے لیے زیادہ تیز رفتار گاڑیاں چلانے میں مدد ملے گی۔

لیکن پٹریوں اور سگنلنگ کے انتظامات کو بہتر اور معیاری بنائے بغیر حقیقی معنوں میں تیز رفتار گاڑیاں چلانا ممکن نہیں ہے۔ گولی کی رفتار سے تیز چلنے والی گاڑی کے لیے نہایت عمدہ پٹریوں کی بھی ضرورت ہوگی جو خاص طور پر تیز رفتار گاڑیوں کے لیے بنائی گئی ہوں۔ یہ امر مشکوک ہے کہ ہندوستانی معیشت کی موجودہ حالت اس "عیاشی" کی اجازت دے گی۔ اس لیے فی الحال پٹریوں کو بہتر بنانے اور ان کی معقول نگہداشت کا انتظام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ انھیں موجودہ تیز رفتار ٹرینوں کے لیے محفوظ بنایا جاسکے۔ پٹریوں کی ویلڈنگ سے اس خطرے سے بچا جاسکے گا جو تخریب کاروں کے ہاتھوں فش پلیٹیں اکھاڑ دیے جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت تک پٹریوں کی ویلڈنگ کا ۸۰ فی صد کام پورا ہوچکا ہے۔

کنکریٹ سلیپر

ماہرین ماحولیات کو یہ دیکھ کر خوشی ہوگی کہ لکڑی کے سلیپروں کی جگہ پر اب کنکریٹ کے سلیپر بنائے جارہے ہیں جس سے لکڑی کی ضرورت بہت کم ہوجائے گی۔ لکڑی کی بچت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ گزشتہ دس برسوں میں تقریباً ۶۵ ملین کنکریٹ سلیپر بنائے جاچکے ہیں اور ابھی بہت سے چوبی سلیپروں کو کنکریٹ سلیپروں میں بدلنا باقی ہے۔ خیال ہے کہ یہ کام موجودہ صدی کے اختتام تک ہی پورا کیا جاسکے گا۔

کمپیوٹر سے ریزرویشن

ریل سے سفر کرنے کے لیے لوگوں کو ٹکٹ ریزرو کرانے میں کافی مشکل پیش آتی تھی لیکن کمپیوٹر سے ریزرویشن شروع ہوجانے سے یہ مشکل کافی کم ہوگئی ہے۔ کمپیوٹر سے ریزرویشن کا سلسلہ ۱۹۸۰ء میں دہلی سے شروع ہوا تھا۔ اب کئی بڑے شہروں میں ریزرویشن کمپیوٹر سے ہونے لگا ہے۔ کمپیوٹروں کا استعمال مال کی بکنگ وغیرہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ مثلاً اب آپ دہلی میں بیٹھے ہوئے چشم زدن میں اس بات کا پتا لگا سکتے ہیں کہ آپ کا ویگن کہاں تک پہنچا ہے۔ پہلے اس کام میں کئی دن لگ جاتے تھے۔

ریلوں کی جدید کاری اور ان کی رفتار بڑھانے کا کام اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ پورے ملک میں ایک ہی قسم کی پٹریاں رائج نہ کردی جائیں۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا کام ہے جس پر خرچ بھی بہت آئے گا۔ ہندوستانی ریلوے کے روٹوں کی ۶۷۰۰۰ کلو میٹر لمبائی میں سے ۲۴۰۰۰ کلو میٹر

> ماہرین ماحولیات کو یہ دیکھ کر خوشی ہوگی کہ لکڑی کے سلیپروں کی جگہ پر اب کنکریٹ کے سلیپر بنائے جا رہے ہیں [illegible] لکڑی کی ضرورت [illegible]

لمبائی میٹر گیج کی اور ۴۰۰۰ کلو میٹر لمبائی تنگ پٹریوں (NARROW GAUGE) کی ہے۔

جن علاقوں میں براڈ گیج یا چوڑی لائن نہیں ہے وہاں کے لوگ اکثر یہ شکایت کرتے ہیں کہ چوڑی لائن نہ ہونے کی وجہ سے ان کا علاقہ اقتصادی ترقی میں پچھڑ گیا ہے۔ پورے ملک میں ایک ہی گیج کی لائن نہ ہونے کی وجہ سے لمبی مسافت کے مال اور مسافروں کو گاڑی بدلنی پڑتی ہے۔ اس لیے حکومت نے ۱۹۹۰ء کے

شروع میں ملک بھر میں ایک ہی گیج کی لائنیں رائج کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی کیا گیا کہ بہت سال ٹریفک روڈ ٹرانسپورٹ کے پاس چلے جانے سے ریلوے کو بہت نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔

کر رہی ہے جو تیسرے منصوبے کے ۵.۷ فی صد سے گھٹ کر ۵.۱ فی صد رہ گئی ہے جب کہ کچھ ماہرین معاشیات نے ریلوے کے کچھ اقدامات کو لاپروائی سے تعبیر کیا ہے۔

بہرحال ہندوستانی ریلوے کو یقین

[illegible] ہر کوشش [illegible] مثال کے طور پر اس کے [illegible] واپس اپنی طرف [illegible]

ہے کہ وہ ۲۱ ویں صدی کی ضرورتوں کو بطریقہ احسن پورا کر سکے گی۔ ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۰ء تک کے لیے اس کے کارپوریٹ پلان میں موٹے طور پر سات حکمت عملیوں کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ہیں — زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری اور اثاثوں کی پیداواریت میں بہتری، ٹکنالوجی کو بہتر بنانا، ایندھن کی کھپت میں کمی کر کے لاگتوں کو کم کرنا، لاگت پر مبنی مال بھاڑے کی پالیسی اختیار کرنا، اثاثہ جات خصوصاً ریلوے انجنوں کی بہتر دیکھ بھال اور رکھ رکھاؤ اور انسانی وسائل کو بڑھانا۔ امید کرنی چاہیے کہ ریلوے ان حکمت عملیوں کو عمل میں لاکر اگلی صدی میں اپنی کارگزاری مزید بہتر بنا سکے گی۔

فروغ سیاحت

حال ہی کے برسوں میں ہندوستانی ریلوے نے ملک کی ٹورازم انڈسٹری کے فروغ میں مدد دینے میں دلچسپی دکھائی ہے۔ اس کی شروعات راجستھان سیکٹر میں "پیلس آن وہیلز" ٹرینیں چلا کر کی گئی۔ اب سیاحت اور زیارت دونوں ہی کے اہم مقامات تک اسپیشل ٹرینیں چلائی جا رہی ہیں۔ حال ہی میں نجی سیکٹر کو بھی ہندوستانی ریلوے کی فروغ سیاحت میں مدد دینے کی کوششوں میں ہاتھ بٹانے کی دعوت دی گئی ہے۔ دو بڑی اسکیمیں ہیں "اون یور ویگن" (اپنے ڈبوں کے مالک بنیے) اسکیم اور "بناؤ، چلاؤ، پٹہ پر دو اور منتقل کرو"، یعنی بولٹ (BOLT) اسکیم۔

اپنی کارکردگی بڑھانے کے لیے ہندوستانی ریلوے کی ہر کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر اس کی روڈ ٹرانسپورٹ سے کافی گڈس ٹریفک واپس اپنی طرف لانے میں ناکامی وجہ تشویش ہی ہوئی ہے۔ تمام اقدامات کے باوجود ہندوستانی ریلوے کا حفاظت وسلامتی کا ریکارڈ مثالی ریکارڈ نہیں بن سکا ہے۔ عام مسافروں کی تکالیف میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ ریلوے میں تحقیق و ترقی کے شعبے میں اچھا کام کیا ہے تاہم نئے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے اسے مزید بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ وزارت ریلوے اپنی طرف سے نجی امداد بڑھوانے کی کوشش

انجنوں کا ذخیرہ

سال	انجنوں کی تعداد				کھینچنے کی صلاحیت (فی انجن) (کلوگرام میں)	
	بھاپ انجن	ڈیزل انجن	برقی انجن	کل	براڈ گیج	میٹر گیج
۱۹۵۰-۵۱ء	۸۱۲	۱۷	۷۲	۸۲۰۹	۱۲۸ ۱	۷۴۹۷
۱۹۶۰-۶۱ء	۱ ۳۱۲	۱۸۱	۱۳۱	۱ ۶۲۴	۱۴۷۳۳	۸ ۲ ۱
۱۹۷۰-۷۱ء	۹۳۸۷	۱۱۶۹	۶۰۲	۱۱۱۵۸	۱۷۳۰۳	۹ ۶ ۷
۱۹۸۰-۸۱ء	۷۴۶۹	۲۴ ۳	۱۰۳۶	۱ ۹۰۸	۱۹۸۴۸	۱ ۴۲۹
۱۹۹۰-۹۱ء	۲۹۱۵	۳۷۵۹	۱۷۴۳	۸۴۱۷	۲۴ ۸۸	۱۲۴۳۸
۱۹۹۱-۹۲ء	۲۴۹۲	۳۹ ۵	۱۸۷۱	۸۲۶۸	۲۴۷۷۸	۱۲۵۹۳
۱۹۹۲-۹۳ء	۱۷۲۵	۴۰۶۹	۲۰۱۲	۷۸۰۶	۲۶۰۹۰	۱۳۳۹۲
۱۹۹۳-۹۴ء	۹۱۱	۴۱۹۲	۲۱۱۷	۷۲۲	۲۶۳۶۶	۱۴ ۵
۱۹۹۴-۹۵ء	۱۴۷	۴۲۵۹	۲۳ ۲	۶۹۰۸	۲۶۹۶۰	۲۲۶۲۷

مسافر کوچ

سال	ای۔ ایم۔ یو۔ کوچ		روایتی کوچ		دوسرے کوچ
	تعداد	صلاحیت	تعداد	صلاحیت	تعداد
۱۹۵۰-۵۱ء	۴۶	۸۷۹۸۶	۱۳۱ ۹	۸۵۴۶۷۸	۶ ۵۹
۱۹۶۰-۶۱ء	۸ ۴۶	۱۵ ۸۵۴	۲۰۱۷۸	۱۲۸۰۷۹۷	۷۴۱۵
۱۹۷۰-۷۱ء	۱۷۵	۲۴ ۵۴۱	۲۴۶۷۶	۱۵۰۵۰۴۷	۸۷۱۹
۱۹۸۰-۸۱ء	۲۶۲۵	۵۰ ۶۰۷	۲۷۴۷۸	۱۶۹۵۱۲۷	۸۲۳۰
۱۹۹۰-۹۱ء	۳۱۴۲	۶۰۹۰۴۲	۳۸۷۰۱	۱۸۶۴۱۳۶	۶۶۶۸
۱۹۹۱-۹۲ء	۳۳۶۶	۶۵۱۹۴۳	۲۹۴۹۳	۱۹۱۰۳۸۱	۶۴۹۱
۱۹۹۲-۹۳ء	۳۳۴۴	۶۶۷۵۸۳	۳۰۳۲۲	۱۹۸۹۳۳۹	۶۱۵۸

۱۹۹۳-۹۴ء	۳۵۳۷	۶۸۴۹۲۷	۳۰۵۶۱	۲۲۸۶۵۷	*۵۹۵۵
۱۹۹۴-۹۵ء	۳۶۱۸	۶۹۹۸۵۵	۳۰۰۶۰	۱۹۷۲۴۹۹	۵۵۳۶

اہم اعداد و شمار

پلانٹ اور ساز و سامان	یونٹ	۱۹۹۴-۹۵ء
زیر استعمال سرمایہ	کروڑ روپیوں میں	*۲۴۹۲۴٫۸۰
کل سرمایہ کاری	〃 〃 〃	۳۵۶۱۸٫۱۵
روٹوں کی لمبائی	کلومیٹر	۶۲۶۶۰
انجن	تعداد	۶۹ ۸
پسنجر سروس وہیکلز	〃	۳۳۶۷۸
دیگر کوچنگ وہیکلز	〃	۵۵۳۶
ویگن	〃	۲۹۱۳۶
ریلوے اسٹیشن	〃	۷۰۵۶
آپریشنز		
پسنجر۔ ٹرین کے ایم	ملین	۳۹۴٫۸
وہیکل کے ایم	〃	۹۶۶۶
فریٹ: ٹرین کے ایم	〃	۲۴۱
ویگن کے ایم	〃	۲۲۰۰۱
ٹریفک کا حجم		
پسنجرز اوریجنیٹنگ	ملین	۳۹۱۵
پسنجر کے ایم	〃	۳۱۹۳۶۵
ٹن اوریجنیٹنگ	〃	۳۸۱٫۵۵
ٹن کے ایم	〃	۲۵۲۹۶۷
ملازمین اور اجرتیں		
ریگولر ملازمین	ہزار	۱۶ ۲٫۰
ریگولر ملازمین کی تنخواہوں کا بل	کروڑ روپیوں میں	۸۰۷۶٫۹
اوسط سالانہ تنخواہ فی ریگولر ملازم	روپیوں میں	۵۰۷۷۷

● کیپٹل فنڈ میں سے سرمایہ کاری سمیت (۳۱۶۱٫۸۸ کروڑ روپے)

مالی نتائج

ریونیو (آمدنی)	کروڑ روپیوں میں	۲۰۱۰۰٫۹۹
اخراجات	〃 〃 〃	۱۶۵۹۰٫۱۲
متفرق ٹرانزیکشنز	〃 〃 〃	۲۹۷٫۲۴
خالص ریونیو (ڈویڈنڈ سے قبل)	〃 〃 〃	۳۸۰۸٫۱۱
سرمائے پر ریٹرن کی شرح	فی صد	۱۵٫۲۸
سرمائے پر ڈویڈنڈ	کروڑ روپیوں میں	۱۳۶۱٫۷۱
کمی / بیشی (×)	〃 〃 〃	×۲۴۴۶٫۴۰

پلان مصارف کا تجزیہ
(فی صد)

سال	انجن	نئی لائن اور صلاحیتی ورکس	دوسرے ورکس اور سٹی سمیت	پٹریاں اور پل	برق کاری
۱۹۵ -۸ء	۴۱٫۶۱	۲۲٫۹۹	۱۷٫ ۲	۱۳٫۹۷	۴٫۴۱
۱۹۸۰-۸۵ء	۳۶٫۸۰	۱۷٫۴۳	۱۹٫۹۶	۱۹٫ ۹	۶٫۷۱
۱۹۸۵-۹ء	۲ ٫۳۶	۱۹٫۷۳	۲۴٫۳۵	۲۸٫۲۷	۷٫۰۹
۱۹۹ -۹۲ء	۱۹٫۶۹	۲۲٫۹۶	۲۱٫۸۱	۲۹٫۱۹	۶٫۳۵
۱۹۹۲-۹۵ء	۲۸٫۳۲	۳۱٫۷۴	۱۰٫۱۵	۲۳٫۰۳	۶٫۴۰

ٹریفک آؤٹ پٹ اور ان پٹ میں اضافے کے اشاریے

(۱۹۵۰-۵۱ء = ۱۰)

سال	ٹریفک آؤٹ پٹ کے اشاریے: فریٹ ٹریفک (این ٹی کے ایم)	ٹریفک آؤٹ پٹ کے اشاریے: پسنجر ٹریفک (غیر مضافاتی پسنجر کے ایم)	ویگن صلاحیت	انوسٹمنٹ ان پٹ کے اشاریے: پسنجر کوچ	انوسٹمنٹ ان پٹ کے اشاریے: روٹ کلومیٹر	انوسٹمنٹ ان پٹ کے اشاریے: اسٹریکس ٹریکس کلومیٹر	گاڑی کھینچنے کی کوشش اور انجن
۱۹۵۰-۵۱ء	۱	۱	۱۰۰	۱۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰
۱۹۶۰-۶۱ء	۱۹۹	۱۱	۱۵۲	۱۵۴	۱ ۵	۱۰۷	۱۴۴
۱۹۷۰-۷۱ء	۲۸۹	۱۵۹	۲۲۶	۱۸۸	۱۱۲	۱۲۱	۱۷۸
۱۹۸۰-۸۱ء	۳۵۹	۲۷۹	۲۴۹	۲۱۰	۱۱۴	۱۲۸	۲ ۱
۱۹۹ -۹۱ء	۵۵۰	۳۹۴	۲۷۸	۲۱۹	۱۱۶	۱۳۳	۱۹۲
۱۹۹۱-۹۲ء	۵۸۲	۴۱۹	۲۸۶	۲۲۵	۱۱۷	۱۳۳	۱۹۴
۱۹۹۲-۹۳ء	۵۸۵	۴۰۰	۲۸۵	۲۳۱	۱۱۷	۱۳۴	۱۹۴
۱۹۹۳-۹۴ء	۵۸۳	۳۸۹	۲۷۳	۲۳۳	۱۱۷	۱۳۴	۱۸۸
۱۹۹۴-۹۵ء	۵۷۵	۴۱۹	۲۶۰	۲۲۹	۱۱۷	۱۳۴	۱۹۸

بقیہ: تیل اور قدرتی گیس کا زمرہ

کے لیے جو عظیم صنعتی بنیاد تیار کی گئی ہے اسے دوسرے نئے سیکٹروں کی طرح مزید مضبوط بنایا جانا چاہیے۔ آٹو موبائلز جیسے شعبوں میں خطیر سرمایہ کاریاں کی جا رہی ہیں لیکن اگر صنعتی اور زرعی دونوں ہی ترقیوں کے انجن یعنی تیل اور گیس کے شعبے پر مناسب توجہ نہ دی گئی تو وہ بے سود ثابت ہو سکتی ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس شعبے میں ترقی کی رفتار تیز کریں۔ ●

ایس۔سی۔انتشار امن

تیل اور قدرتی گیس کا زمرہ

زیر نظر مضمون میں مصنف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چوں کہ ہندوستان دنیا کے ایسے ملکوں میں سے ایک ہے جہاں تیل صاف کرنے پر سب سے کم لاگت آتی ہے اس لیے وہ آنے والی صدی میں تیل کا خالص ایکسپورٹر بن سکتا ہے اور عالمی منڈیوں میں اپنا مقام بنا سکتا ہے۔

اگرچہ ہندوستان میں پہلا تیل کنواں گزشتہ صدی کے آخر میں کھودا گیا تھا تاہم ایک بڑے پیمانے پر تیل کی تلاش کا کام ملک کے آزادی حاصل کرنے کے بعد ہی شروع ہوا۔ ڈگبوئی واقع آسام میں اس تیل کنویں کی کھدائی ستمبر ۱۸۸۹ء میں شروع ہوئی تھی اور کھدائی کا کام نومبر ۱۸۹۰ء میں پورا ہوا۔ ڈگبوئی کا یہ تیل کنواں آسام ریلوے اینڈ ٹریڈنگ کمپنی کے زیر اہتمام کھودا گیا۔ بعد میں آسام آئل کمپنی (اے۔او۔سی) وجود میں آئی جس نے اپنے حقوق برما آئل کمپنی کو بیچے۔

یہ آئل انڈیا لمیٹڈ کی شروعات تھی جو ۶۰ کی دہائی کے اوائل میں مکمل سرکاری ملکیت والی کمپنی بن گئی۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ حصول آزادی کے وقت ہندوستان میں تیل کی پیداوار صرف آسام ہی تک محدود تھی۔

چوں کہ یہ پیداوار ملک کی پٹرولیم مصنوعات کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں تھی۔ اس لیے حکومت ہند نے ساحلی علاقے اور ساحل سے دور تیل کے وسائل کی تلاش اور پیداوار کو بڑھانے کا فیصلہ کیا۔

اس سلسلے کا پہلا قدم یہ تھا کہ ملک بھر میں تیل کی تلاش کے لیے اکتوبر ۱۹۵۵ء میں جیولاجیکل سروے آف انڈیا میں ایک پٹرولیم ڈویژن قائم کی گئی لیکن اس ڈویژن کو ڈائرکٹوریٹ آف آئل اینڈ نیچرل گیس کی شکل اختیار کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

حصول آزادی کے وقت ہندوستان میں خام تیل کی پیداوار صرف آسام ہی تک محدود تھی۔ چوں کہ یہ پیداوار ملک کی پٹرولیم مصنوعات کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں تھی اس لیے حکومت ہند نے ساحلی علاقے اور ساحل سے دور تیل کے وسائل کی تلاش اور پیداوار کو بڑھانے کا فیصلہ کیا۔

بعد میں اکتوبر ۱۹۵۹ء میں پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعے اس ڈائرکٹوریٹ کو تیل اور قدرتی گیس کا خود مختار کمیشن بنا دیا گیا۔ اب یہ کمیشن آئل اینڈ نیچرل گیس کارپوریشن لمیٹڈ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اصلی پیش رفت

ملک کی اپنی پٹرولیم انڈسٹری کی ترقی میں صحیح معنی میں تیزی لانے کا سہرا آنجہانی کیشو دیو مالویہ کے سر ہے۔ انھوں نے تیل اور قدرتی گیس کمیشن کی حوصلہ افزائی کی اور انہی کی بدولت انڈین آئل کارپوریشن ہندوستان کی پہلی قومی ریفائنری اور مارکیٹنگ کارپوریشن قائم ہوئی۔

بعد میں برما شیل ایسو (ASSO) اور کالٹیکس کی مارکیٹنگ کمپنیاں (برما آئل کمپنی کی ملکیت والی ڈگبوئی ریفائنری کا تو ذکر ہی کیا) قومی ملکیت میں لے آئی گئیں اور مزید دو قومی کمپنیوں — بھارت پٹرولیم اور ہندوستان پٹرولیم کا قیام عمل میں آیا۔ آج ملک میں ان دو کمپنیوں سمیت ۱۲ ریفائنریاں کام کر رہی ہیں جن میں

سے ۱۲ سرکاری سیکٹر میں ہیں اور ایک مشترکہ سیکٹر میں ہے۔ ملک کے گیس کے ذخیروں کو منصوبہ بند طریقے سے کام میں لانے کے لیے ۱۹۸۴ء میں گیس اتھارٹی آف انڈیا لمیٹڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اسے ایچ۔ بی۔ جے پائپ لائن لگانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

مختصراً یہی کمپنیاں تیل اور قدرتی گیس کے شعبے میں، جو اب سرکاری سیکٹر کی اجارہ داری ہے۔ کام کرنے والی خاص کمپنیاں ہیں۔ جب

راقم الحروف ان نامہ نگاروں میں شامل تھا جو ۱۹۷۴ء کے شروع میں پہلے کنوئیں کی بورائی دیکھنے کے لیے "ساگر سمراٹ" کے عرشے پر موجود تھے۔ جب ہم ساحل پر واپس آئے اور ساحل سے دور سمندر میں اس اولین تجربے کی خبر بھیجنے ہی والے تھے کہ اس کنوئیں میں تیل ملنے کی اطلاع آئی۔ فروری ۱۹۷۴ء کو ہندوستان میں ساحل سے دور تیل کی پیداوار میں ایک سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔

میں یہ کھپت ۳۰ ملین ٹن تھی لیکن بڑھتے بڑھتے ۹۶-۱۹۹۵ء میں لگ بھگ ۷۵ ملین ٹن ہو گئی۔ موجودہ اندازوں کے مطابق اس کے ۲۰۰۲-۲۰۰۱ء تک تقریباً ۱۱۳ ملین ہو جانے کی توقع ہے۔

دوسرے الفاظ میں گھریلو پیداوار اور کھپت کے اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ پٹرولیم مصنوعات میں ملک کی خود کفالت کا فی صد تناسب ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۵۵٫۶ فی صد سے کم ہو کر ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۴۳٫۷ فی صد ہو گیا ہے اور ۷-۲۰۰۶ء تک اس کے مزید کم ہو کر ۲۳٫۵ فی صد ہو جانے کی توقع ہے۔ مختصراً اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگلے دس برسوں میں فی صد تناسب ۹۱-۱۹۹۰ء کی بہ نسبت آدھا رہ جائے گا۔

> آج ملک میں ۱۴ ریفائنریاں کام کر رہی ہیں جن میں سے ۱۳ سرکاری سیکٹر میں ہیں اور ایک مشترکہ سیکٹر میں ہے۔

کہ آئل انڈیا کارپوریشن کی سرگرمیاں ابتدائی مرحلوں میں شمال مشرقی خطے تک محدود تھیں، تیل اور قدرتی گیس کمیشن (او۔ این۔ جی۔ سی) نے اپنی ابتدائی کامیابیاں مغربی خطے میں حاصل کیں۔ کمیشن نے تیل کی پہلی دریافت ۱۹۵۸ء میں گجرات میں کھمبے کے ساحلی طاس میں کی۔ ۱۹۶۰ء میں گجرات ہی میں انکلیشور کے مقام پر پہلے تیل علاقے کا پتا لگایا گیا۔

تیل اور قدرتی گیس کمیشن نے ساحل سے دور تیل کی تلاش کی کوشش تیز کرنے کا فیصلہ کیا جنھیں "ساگر منتھن" کا نام دیا گیا۔ زلزلہ سے متعلق جائزوں سے نرمدا کے دہانے پر علیابیٹ اسٹرکچر کا اور بعد از اں "بامبے ہائی" میں تیل کا پتا چلا۔ ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں اس سوال پر بڑا بحث مباحثہ ہوا کہ ہمیں "بامبے ہائی" کو خود ڈیولپ کرنا چاہیے یا یہ کام غیر ملکی کمپنیوں کو سونپنا چاہیے۔ فیصلہ اول الذکر طریق کار کے حق میں ہوا۔ او۔ این۔ جی۔ سی نے جیک اپ ٹائپ کا اپنا پہلا رِگ "ساگر سمراٹ" ۱۹۷۳ء میں حاصل کیا، جو اس کے لیے جاپان میں بنوایا گیا تھا۔ "ساگر سمراٹ" نے جنوری ۱۹۷۴ء میں "بامبے ہائی" پر ڈرلنگ شروع کی اور تقریباً ایک ماہ بعد اس علاقے میں کھودے گئے اپنے پہلے کنوئیں ہی میں تیل کا پتا لگایا۔ تیل کا یہی علاقہ گزشتہ ۱۵ برس سے ملک کی خام تیل کی ضرورت پوری کر رہا ہے۔

پیداوار کم۔ کھپت زیادہ

"بامبے ہائی" میں تیل کا پتا لگانے کے بعد کے ۲۲ برسوں میں او۔ این۔ جی۔ سی۔ راہ ترقی پر کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ ساحل سے دور واقع تیل کنووں سے تیل کی پیداوار ۸۱-۱۹۸۰ء میں پانچ ملین ٹن سے بڑھ کر ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۲۱٫۲ ملین ٹن ہو گئی ہے جو ساری کی ساری او۔ این۔ جی۔ سی کی مرہون منت ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں یہ پیداوار ۲۲٫۲ ملین ٹن تھی۔ ساحلی اور ساحل سے دور واقع وسائل سے (یا یوں کہیے کہ آئل انڈیا کارپوریشن اور این۔ جی۔ سی کی) خام تیل کی مجموعی پیداوار ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۳۵٫۲ ملین ٹن تھی۔

اس کے مقابلے میں ملک کی پٹرولیم مصنوعات کی کھپت میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ء

بہت بڑا کام

ظاہر ہے کہ ملک کی پٹرولیم پروڈکٹس کی ضرورت پوری کرنے والے تمام اداروں کے سامنے ایک بہت بڑا کام ہے۔ تیل کی صنعتوں (جنھیں آر گروپ کی صنعتیں کہا گیا ہے) کی تنظیم نو کے بارے میں خصوصی پلاننگ گروپ کی رپورٹ کے مطابق صرف تیل کی تلاش اور پیداوار کے شعبے میں ہی اگلے پانچ برسوں میں سرمایہ کاری کے لیے ۱۸۰۰۰ کروڑ کے خطیر سرمائے کی ضرورت ہے۔

ہمارے سامنے جو عظیم کام ہے اس کے لیے نئی پالیسی اقدامات کی ضرورت ہے۔ آئندہ صدی میں ملک کی تیل کی پالیسی کے موضوع پر ممتاز الوراج کمار میموریل لیکچر دیتے

> "بامبے ہائی" میں تیل کا پتا لگانے کے بعد کے ۲۲ برسوں میں او۔ این۔ جی۔ سی۔ راہ ترقی پر کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ ساحل سے دور واقع تیل کنووں سے تیل کی پیداوار ۸۱-۱۹۸۰ء میں پانچ ملین ٹن سے بڑھ کر ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۲۱٫۲ ملین ٹن ہو گئی ہے۔ ملک کی پٹرولیم مصنوعات کی کھپت میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ میں یہ کھپت ۳۰ ملین ٹن تھی لیکن بڑھتے بڑھتے ۹۶-۱۹۹۵ء میں لگ بھگ ۷۵ ملین ٹن ہو گئی۔

ہوئے پیٹرولیم اور قدرتی گیس کی وزارت کے سکریٹری ڈاکٹر وجے کیلکر نے کہا تھا کہ آنے والی صدی میں ہندوستان بڑی صنعتی طاقتوں کی صف میں آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں ایسی پالیسی وضع کرنے کی ضرورت ہے جو اس نصب العین کے حصول میں معاون ہو۔

طویل المدتی تناظر اور بین اقوامی پس منظر میں ملک کی تیل پالیسی کے بارے میں ڈاکٹر کیلکر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر بیسویں صدی تیل کی صدی ہے تو ۲۱ویں صدی قدرتی گیس کی صدی ہوگی۔

قدرتی گیس کے ذخائر نہ صرف ملک میں وافر موجود ہیں بلکہ جغرافیائی تقسیم کے لحاظ سے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس طرح ان کی سپلائی بھی زیادہ یقینی ہے۔ ڈاکٹر کیلکر کا کہنا ہے کہ تیل اور گیس کے ذخائر میں جس رفتار سے کمی آرہی ہے اسے دیکھتے ہوئے خام تیل کے عالمی ذخائر ۴۳ سال تک اور قدرتی گیس کے ذخائر ۶۷ برس تک ہی چلیں گے۔

ڈاکٹر کیلکر نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں پیٹرولیم مصنوعات کی کھپت ۸۰ ملین ٹن کے لگ بھگ ہے اور اگلے دہوں میں یہ تقریباً دس فی صد سالانہ کی شرح سے بڑھتی رہے گی۔ اگلی صدی کے ابتدائی حصے ہی میں ہندوستان پیٹرولیم پروڈکٹس کا زیادہ استعمال کرنے والے چوٹی کے پانچ ملکوں میں شامل ہو جائے گا اور او۔ای۔سی۔ڈی کے بڑے ممالک مثلاً فرانس اور برطانیہ سے آگے نکل جائے گا اور صرف چین اور روس سے ہی پیچھے رہے گا۔ دوسرے الفاظ میں مجموعی سپلائی کے مقابلے میں مجموعی مانگ زیادہ تیزی سے بڑھے گی اور ملک کو تیل اور قدرتی گیس کی درآمدات پر انحصار رکھنا ہوگا۔

قدرتی گیس کے شعبے کی ترقی (جو موجودہ حالات کے مطابق بڑی حد تک درآمد شدہ گیس پر مبنی ہوگی) کے لیے پائپ لائنوں، بندرگاہ اور اسٹوریج کی سہولیات وغیرہ پر بھاری سرمایہ کاری کرنی ہوگی۔

ہندوستان کے حالات کا ان ملکوں سے جن کے یہاں بہت کم ہائیڈروکاربن کے وسائل موجود ہیں، مقابلہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کیلکر کہتے ہیں کہ پالیسی میں سب سے زیادہ زور ملک کے اندر تیل کی تلاش کے پروگراموں پر ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں ہندوستان زیادہ خوش قسمت ہے کیوں کہ گزشتہ کئی دہوں میں اس نے تیل کی کھوج پیداوار اور تیل صاف کرنے کے لیے ایک بڑی ادارہ جاتی بنیاد قائم کر لی ہے۔ تاہم ہندوستانی اداروں کو اپنی صلاحیت بڑھا کر بین اقوامی مقابلے کی اہلیت حاصل کرنی ہوگی اور عالمی اکویٹی تیل میں ہندوستان کا حصہ زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرنی ہوگی (جس طرح کہ کچھ ایسے ملکوں نے کیا ہے جن کے یہاں ہائیڈروکاربن کے بہت کم وسائل موجود ہیں)

قیمتوں کا ڈھانچہ

پالیسی کا ایک اور عنصر منتظم قیمتوں کے طریق کار (اے۔پی۔ایم) پر نظر ثانی کرنا ہے، جس کے تحت کئی پیٹرولیم پروڈکٹس پر بھاری سبسڈی دی جاتی ہے۔ آر گروپ نے اس پہلو پر تفصیل سے غور کرنے کے بعد انتظامیہ کی طرف سے قیمتیں مقرر کرنے کے طریق کار کو دھیرے دھیرے مرحلہ وار انداز میں ختم کرنے کی تجویز پیش کی ہے کیوں کہ اس سے پیٹرولیم سیکٹر کے بڑے اداروں کو اپنی اہلیت بڑھانے کی ترغیب نہیں ملتی۔

ملک کی مستقبل کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے سازسرمایہ کاری کے واسطے زیادہ وسائل پیدا کرنے کے نقطۂ نگاہ سے بھی اے۔پی۔ایم پر نظر ثانی کرنا مستقبل کی تیل پالیسی کا ایک اہم جزو ہونا چاہیے۔

پیٹرولیم اور قدرتی گیس کے مرکزی وزیر شری ایم۔ٹی۔بالو نے دہلی میں اقتصادی ایڈیٹروں کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آئل پول اکاؤنٹ سے تیل کمپنیوں کے تصفیہ طلب کلیموں کی مجموعی رقم ۳۱ مارچ ۱۹۹۷ء تک ۱۵,۵۰۰ کروڑ روپے ہو جائے گی۔ ان کلیموں کے بڑھنے کی ایک وجہ پیٹرولیم مصنوعات کی فروخت کی قیمتوں میں درآمدات اور خام تیل کی بین اقوامی قیمتوں میں اضافے کے مطابق تطبیق نہ کیا جانا ہے۔

۹۶-۱۹۹۵ء میں ۴۸٫۶۷ ملین ٹن خام تیل اور پیٹرولیم مصنوعات ملک نے باہر سے درآمد کیں اور یہ مقدار گزشتہ سال سے ۴۴٫۱۵ فی صد زیادہ تھی۔ ان درآمدات کی مالیت اگر ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۷,۸۲۰ کروڑ روپے تھی تو وہ ۹۶-۱۹۹۵ء میں بڑھ کر ۲۴۴۳۰٫۹۵ کروڑ روپے ہوگئی۔

آر گروپ کی رپورٹ کے مطابق تیل اور گیس انڈسٹری نے ۹۵-۱۹۹۴ء میں مرکزی اور ریاستی سرکاروں کے خزانوں کو کل ملاکر ۲۴۴۹۳ کروڑ روپے خام تیل اور گیس کی رائلٹی، تیل کی ترقی کے محصول، ایکسائز اور کسٹمز ڈیوٹیوں، کارپوریٹ ٹیکسوں اور ڈیویڈینڈ کے طور پر ادا کیے۔ اگر ان میں سے کچھ محصولات میں سے ریاستوں کو ملنے والے حصے کو نکال دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ تیل اور گیس انڈسٹری سرکاری خزانے کو جو کچھ دے رہی ہے مرکز اس سے کہیں زیادہ روپیہ تیل اور پیٹرولیم پروڈکٹس کی درآمد پر خرچ کر رہا ہے۔

بہرحال یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ تیل اور گیس کی انڈسٹری مرکز کے لیے ریوینو حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں مرکزی حکومت کو تیل کمپنیوں کی تیل سے ہونے والی آمدنی میں ۷۴ فی صد حصہ ٹیکسوں اور رائلٹی وغیرہ کے طور پر ملا تھا۔

ہائیڈروکاربن شعبے میں اصلاح کی ضرورت

اگرچہ یہ سچ ہے کہ تیل اور گیس انڈسٹری کی ترقی کے لیے فنڈ مہیا کرنا مرکز کی ذمہ داری ہے تاہم مذکورہ بالا اعداد و شمار سے اس بات کی ضرورت آشکار ہوتی ہے کہ تیل اور گیس انڈسٹری کو اپنی مستقبل کی ترقی کے لیے زیادہ اندرونی وسائل پیدا کرنے چاہئیں۔ یہ ایک کھلا راز ہے کہ حکومت ہند کے محدود وسائل پر مختلف اقسام کے کلیموں کا بہت بڑا بوجھ ہے۔

اس لیے اور بھی ہائیڈروکاربن کے شعبے میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگرچہ اصلاحات کے فائدوں کو روپے پیسے کی صورت میں آنکنا مشکل ہے پھر بھی آر۔ گروپ نے اندازہ لگایا ہے کہ اصلاحات کی خالص موجودہ مالیت ۱۰،۰۰۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوگی اور یہ رقم بہت بڑی ہے۔

آج کل کچھ پٹرولیم پروڈکٹس جن پر بھاری سبسڈی دی جاتی ہے، کی قیمتیں بڑھانے کے بارے میں جو اختلافات پایا جاتا ہے وہ اُن مسئلوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جو ملک کے دوسرے شعبوں میں رونما ہو رہی تبدیلیوں کے خطوط پر تیل اور گیس کے شعبے کو (پرائیویٹ سیکٹر کے لیے) کھولنے سے پیدا ہوں گے۔

مثال کے طور پر یہ بات ایک بڑے پیمانے پر (حتیٰ کہ سرکاری پبلسٹی میٹریل میں بھی) تسلیم کی جاتی ہے کہ قومی تیل کمپنیوں کو "خاص کر تیل کی بین اقوامی مارکیٹ کی قیمتیں دلا کر کھیل کا ایک مسطح میدان فراہم کیا جانا چاہیے۔ اس سے انھیں مزید ریونیو حاصل کرنے میں مدد ملے گی لیکن یہ نیک ارادہ محض کاغذ پر ہی ہے۔

"اگر تیل کے دریافت شدہ علاقے معاشی لحاظ سے خود کفیل بنانے کی غرض سے مستقبل میں (پرائیویٹ سیکٹر کو) دیے جاتے ہیں تو قومی تیل کمپنیوں کو جنھوں نے ان کا پتا لگایا ہے ان کے اس کام پر ہوئے اخراجات ادا کیے جانے چاہئیں"۔ یہ بات ایک سرکاری نوٹ میں کہی گئی ہے جس میں تیل کے شعبے کی ترقی کے لیے مختصر مدتی اقدامات کی وضاحت کی گئی ہے۔

حکومت نے تیل صاف کرنے کے شعبے میں پرائیویٹ سیکٹر کو داخل ہونے کی اجازت دے دی ہے۔ (اس وقت تک جن تجاویز کو منظوری دی گئی ہے ان کے تحت ملک میں صاف کیے جانے والے تیل کی مقدار میں ۷۰ ملین ٹن سالانہ کا اضافہ ہوگا۔

اسی طرح گیس کی متوازی فروخت کی اجازت بھی دی گئی ہے اگرچہ اس نے ابھی زور نہیں پکڑا ہے۔ جنوبی گیس گرڈ کے لیے تجاویز کے اصولی طور پر منظور کر لیے جانے کے بعد قدرتی گیس سیکٹر کے بارے میں پالیسی کے کئی فیصلے بھی کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ قدرتی گیس کی قیمت کم ہے اور اسے بڑھانے کی سفارش کی گئی ہے۔

قدرتی گیس کے شعبے کی ترقی (جو موجودہ حالات کے مطابق بڑی حد تک درآمد شدہ گیس پر مبنی ہوگی) کے لیے پائپ لائنوں، بندرگاہ اور اسٹوریج کی سہولیات وغیرہ پر بھاری سرمایہ کاری کرنی ہوگی۔ ان کے قیام میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ یہاں بھی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لیے قیمتوں کی ایک معقولیت پسندانہ پالیسی اختیار کرنی ہوگی اور جتنی جلدی ایسا کر لیا جائے اتنا ہی اچھا۔

چوں کہ ملک نے ریفائنریاں قائم کرنے اور انھیں چلانے کے آرٹ اور سائنس میں مہارت حاصل کر لی ہے اس لیے ماہرین کو یقین ہے کہ آنے والی صدی میں ہندوستان پٹرولیم پروڈکٹس کا ایک خالص برآمد کار بن جائے گا۔

یہ توقع اس بنا پر کی جا رہی ہے کہ ہندوستان ان ملکوں میں سے ہے جہاں تیل صاف کرنے کی لاگت سب سے کم ہے۔

ڈاکٹر کیلکر ہی کے الفاظ میں "ہماری منتظمہ قیمتوں کا طریق کار ایک کھلا ہوا طریقہ نہیں ہے، نہ ہی وہ اہلیت کو بڑھانے والا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے موجودہ محصولات تیل صاف کرنے کے شعبے کو تحفظ کی منفی شرحیں فراہم کرتے ہیں لہٰذا وہ بھی سرمایہ کاروں کی نیا سرمایہ لگانے کے معاملے میں حوصلہ شکنی کرتے ہیں"۔ اس لیے قیمتوں اور محصولات کی پالیسی میں جامع اصلاحات بہت ضروری ہیں۔ ڈاکٹر کیلکر کے خیال میں صرف ایسا کر کے ہی کافی سرمایہ لگائے جانے کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے اور وسائل کو اہلیت کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اب یہ نسخہ فقط تیل صاف کرنے کے شعبے کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ تیل اور قدرتی گیس کے پورے سیکٹر کے لیے ہے۔ اس مضمون میں تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ایک دانشمندانہ انداز نظر اختیار کرنا ضروری ہے جیسا کہ ان لوگوں نے اختیار کیا تھا جنھوں نے تیل اور گیس انڈسٹری کی بنیاد رکھنے میں مدد کی۔

گزشتہ کئی دہائیوں میں تیل کی تلاش، پیداوار اور خام تیل صاف کرنے

باقی صفحہ ۵۷ پر

> چوں کہ ملک نے ریفائنریاں قائم کرنے اور انھیں چلانے کے آرٹ اور سائنس میں مہارت حاصل کر لی ہے اس لیے ماہرین کو یقین ہے کہ آنے والی صدی میں ہندوستان پٹرولیم پروڈکٹس کا ایک خالص برآمد کار بن جائے گا۔

گریش چندرا

تجارتی بلاک اور ہندوستان

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ بین اقوامی اقتصادی تعاون کی جگہ پر علاقائی اقتصادی تعاون کو فروغ دینے کی تحریک میں اضافہ نے یہ احساس بھی پیدا کر دیا ہے کہ بحیرۂ ہند کے خطہ میں ترجیحی تجارتی انتظامات کر کے پیداواری صلاحیت کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

تجارت کی عالمی پیکر تراشی کے نتیجہ میں اب بڑھتی ہوئی علاقائی یک جہتی نے عصری نظام کی شکل اختیار کر لی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس طرح کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقائی گروپوں کی رکنیت کو اب کسی ملک کی برآمدات اور بین اقوامی مقابلہ جاتی صلاحیت کے آغاز اور فروغ کا ذریعہ سمجھا جانے لگا ہے۔ اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملکوں کے پورے پندرہ تجارتی بلاک وجود میں آچکے ہیں ان میں نارتھ امریکہ فری ٹریڈ ایگریمنٹ نافٹا (NAFTA) جو امریکہ، کینیڈا اور میکسیکو کا احاطہ کرتا ہے، کیریبین کمیونٹی اینڈ کامن مارکیٹ کیریبین (CARICOM)، کیریبین بیسن انی شیٹیو (سی۔ بی۔ آئی) افریقہ کے پی۔ ٹی۔ اے ممالک، ساؤتھ ایسٹ ایشین نیشنز کے سات ملکوں کی ایسوسی ایشن آسیان (ASEAN)، یوروپین کمیونٹی اور امریکہ کے زیر اہتمام ۱۸ ممبر ملکوں کا ایشیا۔ پیسفک اکونامک کوآپریشن ایپک (APEC) شامل ہیں۔ یہ اٹھارہ ممالک ہیں امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، میکسیکو، چلی، ہانگ کانگ، جنوبی کوریا، چین، تائیوان، پاپوا نیو گنی، ملیشیا، سنگاپور، فلپینس، تھائی لینڈ، برونئی، انڈونیشیا اور جاپان۔ چین میں شامل ہونے کے بعد بھی ہانگ کانگ ایپک (APEC) میں، چینی ہانگ کانگ کے نام سے ایک آزاد وجود کی حیثیت سے شامل رہے گا۔

ہندوستان اپنے ابتدائی پس و پیش اور کچھ دوسری وجوہات سے ان میں سے کسی بھی تجارتی بلاک کا ممبر نہیں بنا۔ لیکن ہندوستان نے ساؤتھ ایشین پری فرینشل ٹریڈ ایگریمنٹ (ساپٹا) کی تشکیل میں قائدانہ کردار ادا کیا جسے ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن فار کوآپریشن سارک (SAARC) نے جنم دیا۔ جنوبی ایشیا کے چند ملکوں کے درمیان اس طرح کے اشتراک کی ضرورت آسیان (ASEAN) کی تشکیل کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس گروپ کی تشکیل کے بعد، جس میں ہندوستان، پاکستان، سری لنکا، نیپال، بنگلہ دیش، مالدیپ اور بھوٹان شامل ہیں، اس خدشہ کی وجہ سے کچھ ابتدائی مسائل پیدا ہو گئے ہیں کہ ہندوستان اپنے بہت چھوٹے ساتھی ملکوں پر بالادستی قائم کرلے گا لیکن حال ہی میں کاٹھمنڈو میں منعقدہ سارک کی بین حکومتی میٹنگ میں ہندوستان نے رعایتی محصولات کی فہرست میں مزید تین سو اشیاء کو شامل کرنے کی پیش کش کر کے اس غلط فہمی کو غلط ثابت کر دیا۔ نئی دہلی نے پاکستان، سری لنکا، نیپال، بنگلہ دیش، مالدیپ اور بھوٹان سے درآمد ہونے والی اشیاء پر رعایتی درآمدی محصول لگانے یا انھیں محصول سے پوری طرح مستثنیٰ قرار دینے کی پیش کش کی ہے تاکہ ساپٹا کو ۲۰۰۰ء تک ساؤتھ ایشیا فری ٹریڈ ایریا (سافٹا) میں تبدیل کیا جا سکے۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ سارک ملکوں کی مجموعی تجارت کے ایک بہت چھوٹے سے حصہ کا تعلق اس علاقہ سے ہے، توسیع کے امکانات کافی روشن ہیں۔ سارک کے سات ملکوں کی باہمی تجارت ان کی مجموعی تجارت کا صرف تین فی صد حصہ ہے اور جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس کی عالمی تجارت کا صرف ۲۳ر۲ فی صد حصہ ہی ساتھی سارک ملکوں سے تعلق رکھتا ہے، جس سے ان امکانات پر روشنی پڑتی ہے جو اس میدان میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بنگلہ دیش، بھوٹان، مالدیپ اور نیپال کی معیشت کے پاس ہندوستان کو پیش کرنے کے لیے زیادہ صلاحیت نہیں ہے۔ ان کی برآمدات کے پیش نظر اس بات کو آسانی کے ساتھ قبول بھی کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف

ہندوستانی برآمدات، ان ملکوں میں زیادہ وسیع کردار ادا کرسکتی ہیں۔

حالاں کہ اب ہندوستان آسیان اور ایپک کی طرح کے تجارتی بلاکوں میں شامل ہونے کا خواہاں ہے مگر اس نے شروع میں اسی طرح کی انجمنوں سے وابستہ ہونے میں پس و پیش سے کام لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان نے ۱۹۶۷ء ہی میں جب آسیان کا خیال ابتدائی مرحلوں میں تھا اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے جب ۱۹۷۱ء میں اس ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا تو ہندوستان اکیلا رہ گیا۔ ہندوستان نے شروع میں ہند اور جنوبی افریقہ کے قائدانہ کردار کے ساتھ بحیرۂ ہند کے ایک تجارتی بلاک یا بحیرۂ ہند کے خطے کے اقتصادی گروپ کی تشکیل کے تعلق سے بھی بیزاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس یونین کی تشکیل کی شروعات کے لیے دس ملکوں کی نشاندہی کی گئی تھی جن میں جزائر کومورو، ہندوستان، مالدیپ، ملاغاسے، ماریشس، موزمبیق، جزائر ری یونین سیچلز، سری لنکا اور جنوبی افریقہ شامل تھے۔ واضح رہے کہ اس طرح کا تجارتی بلاک بنانے کا خیال جنوبی افریقہ کے اس وقت کے وزیر خارجہ مسٹر پک بوتھا نے دو سال قبل اپنے دورہ نئی دہلی کے دوران ظاہر کیا تھا۔ گوناگوں بین اقوامیت سے علاقائی اقتصادی اشتراک کی جانب بڑھتے ہوئے رجحان نے یہ محسوس کرایا کہ پیداواری صلاحیت کو بحیرۂ ہند کے ملکوں کے درمیان ترجیحی تجارتی انتظامات کرکے بڑھایا جاسکتا ہے۔

آئی۔ او۔ آر۔ اقتصادی گروپ کا خاص مقصد دس ممبر ملکوں کے ساتھ ترجیحی تجارتی انتظام کا بندوبست کرنا، رفتہ رفتہ اس خطے میں محصولاتی اور غیر محصولاتی رکاوٹوں کو ایک خاص عرصہ میں ختم کرنا اور بین علاقائی تجارت کو فروغ دینا اور اسے کثیر پہلو بنانا بھی ہوگا۔ لیکن اس سلسلہ میں حصولیابی کی رفتار مقابلتاً بہت سست رہی ہے۔

آئی۔ او۔ آر۔ اقتصادی گروپ کا مقصدی ڈھانچہ ممبر ملکوں کے درمیان کسٹم محصولات اور مقدار کی پابندیوں کو ختم کرنے کے ساتھ ہی مال، خدمات اور سرمایہ کی آزادانہ ترسیل کے علاوہ یکساں زراعتی اور ٹرانسپورٹ پالیسی سے گریز کرنے سے بھی عبارت ہوگا۔ کام کرنے والوں کے لیے روزگار کے مواقع میں بہتری پیدا کرنے کے لیے ایک انڈین ایشین اسپیشل فنڈ (خصوصی فنڈ برائے بحیرۂ ہند) اور ان کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے بنیاد فراہم کرنے کی غرض سے انڈین اوشین انوسٹمنٹ بینک (بحیرہ ہند کے ملکوں میں سرمایہ کاری کا بینک) بنانے کی بھی تجویز ہے۔

یوروپین یونین، نافٹا، آسیان اور ایپک کی طرح کے طاقتور تجارتی بلاکوں کی توسیع کی وجہ سے یہ بات ہندوستان کے مجموعی مفاد میں نہ ہوگی کہ وہ الگ تھلگ ہوکر رہ جائے۔ فی الحال ہندوستان نہ تو ان میں سے کسی بھی تجارتی بلاک کا رکن ہے نہ ہی کسی بھی گروپنگ (انجمن) سے اس نے کوئی خصوصی انتظام کر رکھا ہے۔ آسیان یا ایپک میں شامل ہونے کی کوششیں کامیاب نہیں رہی ہیں۔ اب تک کے امکانات بھی ہیں کہ اپنے محل وقوع، منڈی کے حجم اور سیاسی و اقتصادی تأمل کی وجہ سے ان میں سے کسی بھی بلاک میں شامل ہونا ہندوستان کے لیے آسان نہ ہوگا۔

متبادل کے طور پر یہ تجویز آئی تھی کہ ہندوستان کو چاہیے کہ وہ ایران اور آزاد ملکوں کی دولت مشترکہ (سی۔ آئی۔ ایس) کو شامل کرکے ایک تجارتی بلاک کی تشکیل کرے۔ مگر تغیر پذیر معیشتوں کے موجودہ اقتصادی منظرنامہ، غیر ملکی تجارتی ضوابط اور بازاریت و نجکاری کے تئیں ان کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جنوبی افریقہ کھلے دروازہ کا کام کرے گا اور سمندری ساحلوں سے محروم افریقی ملکوں جیسے زمبابوے، زامبیا اور زائرے کے لیے انواع و اقسام کی ہندوستانی مصنوعات کو منڈیوں تک آسانی سے پہنچانے کا ذریعہ فراہم کرے گا مگر بحیرۂ ہند کے خطے میں ۳۵ ممالک ہیں۔

حالاں کہ آئی۔ او۔ آر اقتصادی گروپ (بحیرۂ ہند کے ... اقتصادی گروپ) کا آغاز لگ بھگ اٹھارہ ماہ قبل ماریشس میں کیا گیا تھا لیکن مارچ ۱۹۹۷ء کے ایک منشور پر ۱۷ ملکوں کے دستخط ہونے کی توقع ہے —— فی الحال اس خطے کے ملکوں کے مابین تجارت اور سرمایہ کاری کی شرح بہت کم ہے۔ اگر وہ چاہتے ہیں آئی۔ او۔ آر تجارت اور مجموعی سرمایہ کاری کو کافی فروغ حاصل ہو، اس خطے کے ممتاز ملکوں کو جن میں ہندوستان اور جنوبی افریقہ بھی شامل ہیں اپنی باہمی تجارت کو بہتر بنانا ہوگا۔

مجوزہ آئی او۔ آر گروپ کا ایک اور مقصد ممبر ملکوں کے درمیان زیادہ مربوط کسٹمز سروس اور معیاری ٹیلی مواصلات اور اطلاعات کی فراہمی کی تکنالوجی کو فروغ دینا بھی ہے۔ اس کی توجہ متعلقہ ملکوں کی کسٹم پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی

اس حقیقت کے پیش نظر کہ سارک ملکوں کی مجموعی تجارت کے ایک بہت چھوٹے سے حصے کا تعلق اس علاقے سے ہے اس توسیع کے امکانات کافی روشن ہیں۔ سارک کے سات ملکوں کی باہمی تجارت ان کی مجموعی تجارت کا صرف تین فی صد حصہ ہے اور جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس کی عالمی تجارت کا صرف ۲٫۴۳ فی صد حصہ ہی ساتھی سارک ملکوں سے تعلق رکھتا ہے جس سے ان امکانات پر روشنی پڑتی ہے جو اس میدان میں پائے جاتے ہیں۔

غیر ضروری تجارتی رکاوٹوں کو دور کرنا اور ممبر ملکوں کے ٹیلی مواصلات اور اطلاعات کی فراہمی کے ماہرین کے درمیان تعاون کو بھی فروغ دینے پر ہے۔

آسٹریلیا میں منعقدہ آئی۔او۔آر کی آخری میٹنگ کے دوران ایک رپورٹ تیار کی گئی تھی جس میں اُن بہت سے امتناعی طریقوں کی نشاندہی کی گئی تھی جن کی وجہ سے کسٹمز کی دستاویز سازی، ضوابط اور انتظامی امور میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ فرسودہ آلات، کاغذی کارروائیوں اور مناسب اطلاعاتی انتظامات کے فقدان اور اعداد و شمار کے الیکٹرونک ڈاٹا انٹرچینج (ای۔ڈی۔آئی) نے بھی نظام کو کافی سست رفتار بنا رکھا ہے اس کے ساتھ ہی قیمتوں کو بھی

> آئی۔او۔آر۔اقتصادی گروپ کا خاص مقصد رکن ممبر ملکوں کے ساتھ ترجیحی تجارتی انتظام کا بندوبست کرنا، رفتہ رفتہ اس خطے میں محصولات اور غیر محصولاتی رکاوٹوں کو ایک خاص عرصہ میں ختم کرنا اور بین علاقائی تجارت کو فروغ دینا اور اسے کثیر پہلو بنانا بھی ہوگا۔

بڑھا رکھا ہے۔ رپورٹ میں جن متبادل طریقوں کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے ان میں علاقائی اور عالمی اعداد و شمار کی بنیاد کی فراہمی شامل ہے تاکہ آئی۔او۔آر ملکوں کے مابین کمپیوٹر اور سٹیلائٹ نیٹ ورکس کے ذریعے تجارتی اعداد و شمار کا آزادانہ تبادلہ کیا جا سکے۔ ان سفارشات میں مختلف النوع کسٹمز پر عمل پیرا ملکوں کے درمیان ای۔ڈی۔آئی، کمپیوٹر نظام اور بین علاقائی انتظامی تربیت اور انسانی وسائل کی ترقی کے اقدامات بھی شامل ہیں۔ اس طرح کے اقدامات کے نتیجے میں مختلف النوع نقل و حمل کے ذرائع سے مال کی تیز رفتار ترسیل اور بندرگاہوں اور ایئر کارگو کمپلیکسوں میں جلد از جلد کلیرنس کا راستہ ہموار ہو سکے گا۔

ممبر ملکوں کے درمیان کسٹم محصولات کی وسیع اقسام کا بھی جائزہ لیا گیا۔ آئی۔او۔آر کے ذریعے کچھ ترقی پذیر ملکوں خصوصاً بنگلہ دیش اور کینیا کے کسٹم محصولات کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں ان محصولات کو معتدل بنا کر آسٹریلیا اور سنگاپور کے مساوی بنانے کے لیے زیادہ وقت دینے پر آمادگی کا اظہار کیا گیا۔ اس طرح کے ترقی یافتہ ملکوں کے تجربات سے ترقی پذیر ممبر ممالک اپنے ٹیلی مواصلات اور ترسیل اطلاعات کے نظام کی تکنالوجی کو ترقی دینے کے لیے استفادہ کر سکتے ہیں مگر انتظامی ماہرین نے ممبر ملکوں کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ ٹیلی مواصلات کی نجکاری اور از سر نو ڈھانچہ سازی پر عمل کرتے ہوئے جلد بازی میں یوروپی اور امریکی کمپنیوں کی جانب دوڑ نہ لگائیں۔

ممبر ملکوں کے لیے نہایت اہمیت کے حامل دوسرے معاملات کا تعلق نیوکلیر فری زون (ایٹم سے پاک خطہ) علاقہ کے دفاعی بجٹوں پر کنٹرول، غیر قانونی منشیات اور ترک وطن پر قابو حاصل کرنے، ناجائز طریقوں سے پیسے کے لین دین، کالے دھن اور دہشت گردی، علاحدگی پسندی کی تحریکوں، کچھ ملکوں میں دوسری سرکاروں کی حمایت یافتہ، جنگجوئیت اور جنوبی نسلی اقلیتوں کے ذریعے علاقہ کے دوسرے ملکوں میں اپنے بھائیوں سے رقوم حاصل کرنے سے ہے۔ لیکن ماہرین تجارت کا خیال ہے کہ محصولات اور دوسری تجارتی رکاوٹوں میں مرحلہ وار کمی آنے سے جو کہ آزاد تر تجارت کے لیے مختلف تجارتی بلاکوں کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے کسی ایک بلاک کا ممبر بننے کے فوائد بڑی حد تک معدوم ہو جائیں گے۔ ڈبلیو ٹی او کی شرائط کی رو سے بھی کم و بیش ۱۰ سال کے اندر مختلف اقسام کے محصولات ختم کر دیے جائیں گے۔ لہٰذا بالآخر دستیاب صنعتی صلاحیت اور برآمداتی صلاحیت ہی کسی ملک کی برآمدات کی رفتار کو بڑھا سکیں گے۔ اس

سلسلے میں ماہرین کا کہنا ہے کہ چین نے کسی تجارتی بلاک کی رکنیت حاصل کیے بغیر پہلے ہی سے ایک طاقتور برآمد کنندہ ملک کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ●

بقیہ: دیہی ترقی

وسعت کی حقیقی تصویر حاصل کرنے میں مددگار ہوگا اور تخفیف غریبی کے مختلف پروگراموں کو حقیقی معنیٰ میں از سر نو ترتیب دینے میں معاون ہوگا۔

اس بات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ نویں پنج سالہ منصوبے میں دیہی فروغ کے پروگراموں کے لیے تجویز آٹھویں منصوبے کے مقابلہ میں دگنی ہے یعنی ۳۰ ہزار کروڑ روپے سے بڑھا کر ۶۰ ہزار کروڑ روپے ہے اور موجودہ حکومت ۲۰۰۵ء تک غریبی ختم کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے غریبی مخالف پروگراموں کا از سر نو خاکہ بنانا ہوگا۔ اس میں انتظامی ڈھانچہ کو نئے سرے سے بنانے کی ضرورت کو کم نہیں آنکا جا سکتا اور جی۔وی۔کے راؤ کمیٹی کی سفارشات پر غور کیا جانا چاہیے۔ کمیٹی نے ضلع ترقیاتی کمشنر (ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ کمشنر) کے عہدے کے قیام کی سفارش کی جو ڈسٹرکٹ کلکٹر سے زیادہ مرتبے کا ہوگا، اس کے علاوہ ریاستی سطح پر ایک آفیسر چیف سکریٹری کے رتبے کا ڈیولپمنٹ کمشنر کے طور پر ہوگا، جس کے تحت وہ تمام محکمے ہوں گے جو کسی بھی طرح دیہی معاملات سے تعلق رکھتے ہوں گے۔

ان سب سے زیادہ اہم بات لوگوں میں ان کے مفاد کے لیے شروع کیے گئے مختلف پروگراموں کے بارے میں جانکاری پیدا کرنا ہے تاکہ وہ ان سے مستفید ہو سکیں۔ اس کام میں رضاکارانہ تنظیموں کو اہم رول ادا کرنا ہے۔ غیر سرکاری تنظیموں کی عملی شمولیت سے دیہی ترقی میں کامیابی کی بہت سی مثالیں ہیں، ان کو دُہرایا جانا چاہیے اور ان کو صرف چند جگہوں پر ہونے کی بجائے وسیع پیمانے پر ہونا چاہیے۔ ●

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

فون : 6177591

معاون : رقیہ زیدی

تزئین و کتابت : افتخار احمد خان

سرورق : نندیتا

جلد: ۱۶ شمارہ ۱۱۔۱۲

فروری۔ مارچ ۱۹۹۶ء (۱۲ ماگھ تا ۱۱ چیتر شک ۱۹۱۸)

قیمت فی شمارہ: ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) ڈی۔ این۔ گاندھی

مضامین سے متعلق

خط و کتابت کا پتا:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴ لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

پروفیسر ایس۔ سی گینگل

گاندھیائی نصب العین اور اقدار کی جانب

> گاندھی جی کے نصب العین و مقصودات آج بھی برمحل ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ان اصولوں کی پیہم تلاش ملک کی اخلاقی اور مادی ترقی میں یقیناً اضافہ کا باعث ہوگی۔

۱۴-۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی فیصلہ کن شب کو ہندوستان غلامی کی نیند سے جاگا اور (بقول پنڈت نہرو) "اُس کو اپنی تقدیر سے وصال نصیب ہوا۔" جب پوری قوم نے ترنگے کو سلامی دی تو اس نے بھی راشٹر پتا مہاتما گاندھی کے احترام میں گہرے تشکر کے جذبے سے اپنا سر جھکا لیا اور جب اس طرح آزادی کے لیے لڑی جانے والی عدم تشدد کی لڑائی کا خوشگوار اختتام ہوا تو اس کے ساتھ ہی دستور کے قبول و اختیار، ایک جمہوری سیکولر اور لامرکزی سیاسی نظام کا قیام، قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا استحکام، معاشی ترقی اور بالخصوص دیہی معیشت کا ارتقا، سائنسی و صنعتی ترقی، جنس، عقیدہ و ذات پات پر مبنی امتیازی رویوں کا خاتمہ وغیرہ جیسے نئے چیلنجوں اور ذمہ داریوں کی نشاندہی بھی ہوئی۔ یہ از سر نو تعمیری پروگراموں کا ایک وسیع ایجنڈا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کی قیادت میں ان کے تصورات کے مطابق فروغ پا رہا تھا۔

بعد ازاں دہلی کے تاریخی لال قلعہ پر پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں گاندھی جی اور ان کے عظیم مشن کا بڑے جذبات بھرے انداز میں حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

"۳۰ برس پہلے ہندوستان کے منظر نامہ پر ایک عظیم انسان (مہاتما گاندھی) کا ظہور ہوا جس نے ہماری راہ کی تاریکی کو روشن کر دیا۔ اس روشنی سے ہمارے دل و دماغ منور ہو گئے اور قوم کی معتدبہ تعداد نے اپنی تکالیف، خانگی پریشانیوں، خاندانی و جاگیری تنازعوں کو بھول کر اس ہستی کی آواز پر لبیک کہا۔ یہ سب کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں ہوا۔ اس نصب العین کے لیے آپس میں مسابقت کا جذبہ ابھرا کہ مادر وطن کی کون بہتر اور مؤثر خدمت کر سکتا ہے۔ ایسے وطن کو آزاد کرانے کا خیال لوگوں کو کھلائے دے رہا تھا۔ ہم سیاسی آزادی کے علاوہ اپنی غربت اور رنج و محن سے آزادی کا خواب بھی دیکھ رہے تھے۔"

یہ سب گاندھی جی کی متحرک قیادت پر اس قوم کا احسان مندانہ اقرار تھا لیکن اہم بات یہ تھی کہ گاندھی جی کے فکر و عمل کو یاد رکھتے ہوئے ان پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک لازمی فریضہ کی حیثیت سے اس ذمہ داری کو سنبھالا جائے۔ اس مقصد کے لیے ہندوستان کے دستور (جو نومبر ۱۹۴۹ء میں اختیار کرکے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ کیا گیا) میں گاندھی جی کے کچھ اصول مثلاً آزاد ہندوستان کا سماج اور نظام حکومت کی نوعیت، پارلیمانی حکومت، بنیادی حقوق، سیکولرزم، دیہی پنچایتیں، چھوت چھات کے مکروہ رواج کا خاتمہ، اقتدار کی لامرکزیت، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور طبقۂ نسواں کا سدھار وغیرہ شامل کر لیے گئے۔ اسی وجہ سے دستور ہند کی تمہید، ملکی پالیسی کے رہنما اصولوں اور بنیادی حقوق کے باب میں ان اصولوں اور معیارات (اور ان کو تکمیل تک پہنچانے کے قومی عزم و پیمان) کی صراحت کی گئی۔

بڑی تشویش

چھوت چھات کا خاتمہ گاندھی جی کی نظر میں سب سے زیادہ تشویشناک مسئلہ تھا۔ حقیقتاً ان کا کہنا تھا کہ اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ ایک اچھوت کی حیثیت سے پیدا ہونا پسند کرتے۔ وہ لکھتے ہیں "میں پھر سے پیدا نہیں ہونا چاہتا لیکن اگر پیدا ہونا پڑے تو میں اچھوت پیدا ہوں گا تاکہ میں ان کے غم، تکالیف اور ذلتوں کو بانٹ سکوں جو ان پر تھوپی گئی ہیں۔ اس لیے میں دعا کرتا ہوں کہ اگر مجھے دوبارہ پیدا ہونا ہو تو میں 'اتی شودر' کی

حیثیت میں پیدا ہوں اور پھر اپنی شریک زندگی سے شادی کرنے سے بہت پہلے چھوت چھات کا قلع قمع کرنے کے کام سے جڑ جاؤں چنانچہ اگر مجھے اپنی شریک زندگی کے ساتھ رہنے اور اچھوتوں کے لیے کام کرنے کے بارے میں اختیار دیا جائے تو میں اچھوتوں کے لیے کام کرنے کو ترجیح دوں گا

گاندھی جی نے اچھوتوں کے لیے دو بار اپنی زندگی داؤ پر لگادی۔ اگست ۱۹۹۳ء میں انھوں نے اس وقت برت رکھا اور کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا جب حکومت نے ان کو جیل میں ہریجنوں کو اوپر اٹھانے کا کام کرنے کی اجازت نہ دی۔ برت رکھنے سے ان کی صحت پر چوں کہ برا اثر پڑا تھا اس لیے حکومت نے ان کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ اس سے قبل اگست ۱۹۳۲ء میں گاندھی جی نے اچھوتوں اور پسماندہ طبقوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے حکومتی فیصلہ کی مخالفت میں ایسے مجاہدانہ مرن برت کا اعلان کیا۔ برطانوی حکومت کا یہ اقدام اچھوتوں کو ہندوستان کی عوامی زندگی کی دھارا سے الگ کر دینے کے لیے تھا، جس کے نتیجہ میں ان کی حالت مزید کمزور ہو جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی کے نزدیک چھوت چھات کے خاتمہ کی اہمیت سب سے بڑھ کر تھی۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ اس سیاق و سباق میں یہ امر قابل توجہ ہے کہ دستور کی دفعہ ۱۷ میں تحریر ہے "چھوت چھات کا خاتمہ ہو چکا ہے اس پر عمل ہر صورت میں ممنوع ہے اور قانون کے بموجب قابل سزا جرم ہے۔" اس وقت سے پارلیمنٹ کے ایکٹ "تحفظ شہری حقوق ایکٹ ۱۹۵۵ء" میں اور ریاستوں کے زائد قانونی گنجائشوں میں اس کو لاگو کر کے مزید تفصیلات فراہم کر دی گئیں۔ عملاً مندرجہ فہرست لوگوں (یا دور لعید کے اچھوتوں) نے ملک کے اعلا منصوبوں کو زینت بخشی اور بہت سے دوسروں نے دیگر میدانوں میں شرکت کی اور ہندوستان کے سماجی ڈھانچہ میں پورے طور پر شریک ہیں۔ بظاہر آزاد ہندوستان نے (گزشتہ ۵۰ سالوں میں) چھوت چھات کے مکروہ رواج کے خاتمہ اور پسماندہ طبقوں کی تقویت و نجات کے میدان میں گاندھی جی کے خواب کو حقیقت کا روپ دینے کی طرف کافی ترقی کی ہے لیکن "ماضی کا یہ سفر" ابھی جاری رہنا ہے چوں کہ قوانین اور اداروں کو بدل ڈالنا تو آسان ہے مگر ذاتی تعصبات اور احساسات مشکل سے دم توڑتے ہیں۔

گرام سوراج

پسماندہ طبقوں کی ترقی کے مسئلہ کی طرح گاندھی جی کو آزاد ہندوستان کے سیاسی اور سماجی، اقتصادی ڈھانچہ میں "گاؤں کے مرکزی جزو کی حیثیت" پر بھی گہری تشویش تھی۔ وہ ایسے پیش کاروں، منصوبہ سازوں اور مستقبل کے لیڈروں کو یہ یاد دلاتے نہ تھکتے تھے کہ "اصل ہندوستان تو گاؤں میں بستا ہے اور اگر گاؤں فنا ہو گیا تو ہندوستان بھی مٹ جائے گا۔" ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان دنیا کے سامنے نمایاں طور پر دیہات رخی سوسائٹی، خود ان کے الفاظ میں دیہی سوراج یا گرام سوراج کا نمونہ پیش کرے۔ لہٰذا یہ جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے کہ ۵۰ برس کی مدت میں آزاد ہندوستان نے سوراج یا جمہوری عمل اور دیہی سطح پر عوام کی تقویت سے متعلق گاندھی جی کے پیارے اصولوں کی منزل کے حصول خصوصاً دیہی علاقوں میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔

اس سوال کو بلا شبہ ۱۹۴۵ء کے اواخر میں بہت اہمیت حاصل ہو گئی جب کہ بقول ڈی۔ جی تیندولکر سوانح نگار گاندھی جی "سوراج نکڑ کے دوسری جانب تھا۔" گاندھی جی اور پنڈت نہرو دونوں اور دیگر سینئر کانگریس لیڈر بھی اس مسئلہ کی وضاحت چاہتے تھے۔ آزاد ہند کی ترجیحات کا مسئلہ اور خاص طور پر یہ سوال کہ مستقبل کا ہندوستان کس حد تک 'دیہات پر مبنی' ہو گا۔ گاندھی جی خو شبہات کے ازالہ کے خواہاں رہتے اور جیسا دیکھتے اور محسوس کرتے سچ کہہ دیتے تھے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں اس مسئلہ پر اپنے نظریات کی وضاحت کی اور نہرو جی کو لکھا: "میرا یقین ہے کہ اگر ہندوستان کو سچی آزادی حاصل کرنی ہے اور ہندوستان کے وسیلہ سے دنیا کو تو جلد یا بدیر اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا جائے گا کہ لوگوں کو دیہاتوں اور جھونپڑوں میں رہنا ہوگا نہ کہ شہروں میں اور محلات میں۔ کروڑوں لوگ ہرگز محلات میں نہیں رہ سکتے۔" تاہم انھوں نے یہ وضاحت کی کہ "میرے مثالی گاؤں میں ذہین انسان بستے ہوں گے وہ جانوروں کی طرح اندھیروں اور گندگی میں نہیں رہیں گے۔ مرد و زن آزاد ہوں گے اور دنیا میں کسی کے بھی خلاف ڈٹ جانے کی اہلیت رکھتے ہوں گے وہاں نہ پلیگ کا وجود ہوگا نہ ہیضہ و چیچک کا، وہاں کوئی بے کار نہ ہوگا اور نہ ہی محض تعیش میں بسر کرے گا۔" اس سے قبل ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے گرام سوراج کے تحت حکومت کے اداروں کی ساخت کو اس طرح بیان کیا تھا۔ "دیہی نگرانوں کی ایک لازمی سروس ہوگی جن کا انتخاب باری باری دیہی پنچایت کے بنائے ہوئے رجسٹر کی مدد سے ہوگا۔ دیہی حکومت کو گاؤں کے وہ بالغ مرد و زن چلائیں گے جو مقررہ تعلیمی معیار رکھتے ہوں۔ ان کو تمام مطلوبہ اختیارات و قوت حاصل ہوگی۔ پنچایت ہی وہاں کی مقننہ بھی ہوگی اور عدلیہ و عاملہ بھی اور اپنے عہدے کی مدت میں کام کرے گی۔ اسی میں مکمل جمہوریت کی روح ہے۔" گاندھی جی کا نظریہ تھا کہ آزادی کا واقعی آغاز بنیاد سے ہوتا ہے۔ اس طرح ہر گاؤں ایک جمہوریت یا ایک پنچایت مع الاختیار ہوگا اور گاؤں اصل قوت کا ذخیرہ ہوں گے۔

پنچایتی راج

اس گاندھیائی اصول کی جانب اقدام کرنے کے لیے آئین سازوں نے دفعہ ۴۰ کا دستور میں خاص طور پر اندراج کیا۔ ریاست دیہی پنچایتوں کی تنظیم کے اقدام کرے گی اور انھیں اہل بنانے کے لیے ایسی قوت و اختیار دے گی جو سوراج کے ایک یونٹ کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے ضروری ہوں گے۔ دستور ساز اسمبلی میں یہ تجویز رکھی گئی کہ دستور کی یہ دفعہ ایک نہ ایک دن پنچایتوں کے خود مختار جمہوریت بن جانے پر (بر حسب تصور) ایسے خود مختارانہ معاشی

وسائل کے ساتھ صحیح وفاقیت تک پہنچانے میں معاون ہوگی اور ایک ایسی بنیاد مہیا کردے گی جس پر ہندوستان کے مستقبل کا دستور (متصورہ گاندھی) بنایا جاسکے گا۔

اس مقصد کے لیے بلونت رائے مہتہ کمیٹی ۵۸-۱۹۵۷ء کی مجوزہ تین سطح والے (سہ تری ٹیر) پنچایتی راج کے ادارے (پی۔آر۔آئی) پہلے پہل وجود میں آئے۔ ان اداروں کے قیام کے لیے فوری تحریک کی ضرورت تھی تاکہ دیہی ترقی کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور قومی توسیعی سروس کی تعمیر نو اور دیہی ارتقا میں گاؤں کے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ شمولیت و تائید حاصل ہوسکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مہتہ کمیٹی نے یہ سفارش بھی کی تھی کہ دیہی ترقیاتی اسکیموں کا بڑا حصہ پنچایتوں ہی کو سونپ دیا جائے۔ اس مرکزی اقدام کے بعد کئی ریاستوں نے یکے بعد دیگرے پنچایت قانون کو قبول کرلیا۔ چناں چہ ہندوستان کے پی۔آر۔آئی کے ارتقا پر ایک حالیہ سروے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "پنچایتوں کو ہندوستان کی ترقیاتی انتظامیہ میں پہلی بار آئین کا مکمل جزو بنایا گیا"۔ پی۔آر۔آئی کی یہ پہلی پود دس سال (چھٹی دہائی کے آخر) تک پھولی پھلی لیکن پھر ساتویں دہائی کے شروع میں نوکرشاہی ذہنیت اور بنیادی ڈھانچہ کی کمیوں اور نقص کی وجہ سے اس میں زوال کی صورت در آئی اور پھر اس دہائی کے اختتام پر یہ دیہی ادارے بڑی حد تک ازکار رفتہ ہوگئے اور پنچایتی راج اداروں کے احیا کی متعدد کوششیں بار آور ثابت نہ ہوسکیں۔

پی۔آر۔آئی کے موثر ڈھانچہ کے قیام کے لیے ۱۹۹۲ء کے اواخر میں ایک بڑا اقدام اس وقت اٹھایا گیا جب حکومت نے ۷۳ویں آئینی ترمیم کا بل (سی۔ایس۔ٹی۔اے) پارلیمنٹ میں بحث کے لیے پیش کیا۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ یکم دسمبر ۱۹۹۲ء کو پارلیمنٹ میں یہ بل پیش کرتے ہوئے ریاستی وزیر برائے دیہی ترقی نے کہا کہ اس ترمیم کے پیچھے گاندھی جی کا گرام سوراج کا تصور کارفرما ہے اور صحیح جمہوری لامرکزیت کی طرف قوم کے سفر کا آغاز ہے

جو کہ گاندھی جی کے سیاسی فلسفہ میں بنیادی تصور کی حیثیت رکھتا ہے۔ گاندھی جی کے یوم پیدائش ۲ اکتوبر پر ان کے ۱۲۵ویں یوم پیدائش کی تقریبات کے موقع پر اس نئے پروگرام کا افتتاح ہوا۔ تاہم یہ دھیان میں رکھنا چاہیے کہ اپنی خاصیت کے اعتبار سے نیا پروگرام پنچایتی راج کے اولین تجربات سے مختلف ہے۔ سی۔ایس۔ٹی۔اے نے دستور میں ایک نیا شیڈول، گیارہواں شیڈول شامل کیا ہے جس میں ۲۹ موضوعات ہیں۔ جن پر پنچایت عمل کرے گی۔ اس میں زراعت، چھوٹی صنعتیں، پرائمری و ثانوی تعلیم، سماجی و خاندانی بہبود، صحت عامہ اور اسپتال سب ہی شامل ہیں۔ پنچایتی انتخابات کو یقینی بنانے کے لیے ریاستی کمیشن قائم کیا گیا ہے۔ اسی طرح مالیاتی کمیشن بھی قائم کیے گئے ہیں تاکہ مالیاتی اختیار کو یقینی بنایا جاسکے۔ آخری مگر اہم بات یہ ہے کہ منتخبہ نشستوں میں سے ۳۳ فی صد خواتین کے لیے مخصوص کردی گئیں۔ چناں چہ کہا جاسکتا ہے کہ پی۔آر۔آئی محض ماتحت یا ایڈہاک جماعتیں نہیں ہیں بلکہ ان کو پوری طرح کثیر پہلو وسیع وفاقی ڈھانچہ میں برابر کے حصہ دار کی حیثیت سے قومی دھارے میں شامل کرلیا گیا ہے اور گاندھی جی کے گرام سوراج کے تصور پر مبنی قومی قوت و اقتدار کے "اصل ذخیرہ" کی حیثیت سے دیہی ادارے کا تصور ابھر کر سامنے آگیا ہے۔ بہرحال یہ "محض ایک قدم" ہی ہے گو کہ دیہی جمہوریت کی طرف ایک بڑا قدم ہے مگر گاندھی جی کے پسندیدہ اصول (ایک وقت پر ایک قدم کافی ہے) کے مطابق ہے۔ دیہاتوں کو اختیارات کی فراہمی اور وہاں جمہوری عمل کا قیام گاندھی جی کے عزیز ترین تصورات اور مقصودات میں سے ایک کام ہے اور آج ہندوستان موجودہ حالات اور ثقافتی، تعلیمی اور مالی مجبوریوں کے تحت بڑی حد تک اس مقصد کی تکمیل کی راہ پر گامزن ہے۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی
چھوت چھات کی لعنت کا خاتمہ

اور پسماندہ طبقوں کو قومی دھارے میں شامل کرنے کے عزم کے علاوہ گرام سوراج کا تصور اور ہندوستان کے دیہاتوں کے احیا کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کے لیے دو اور امور بھی تشویشناک تھے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سماج و سیاست میں خواتین کا رتبہ و حقوق۔ آزادی سے کچھ قبل نواکھالی میں ان کا تاریخی امن مشن کلکتہ میں ۱۹۴۷ء اور دہلی میں جنوری ۱۹۴۸ء میں ان کے برت فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر ان کی شدید تشویش کے مظہر ہیں۔ اس مقصد کے لیے ان کا نظریہ تھا کہ "ریاست کو پوری طرح سیکولر ہونا چاہیے"۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سیکولرزم کے اصول کو دستور کی تمہید میں بھی شامل رکھا گیا ہے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مسئلہ کو آزادی سے لے کر آج تک قومی ایجنڈے میں نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ کبھی کبھار کے معمولی جھگڑے بھی وسیع کمٹمنٹ اور مستقل چوکسی کی مدد سے جلد ہی قصہ پارینہ ہوجائیں گے۔

خواتین کو قوت و اختیار کی تفویض

خواتین کی ترقی اور انھیں طاقتور بنائے جانے کے معاملے میں 'مرد۔عورت کی قانونی برابری' کی ہندوستانی سماج اور سیاسی نظام میں شروع ہی سے اہمیت رہی ہے۔ حال ہی میں مقامی سیلف گورنمنٹ میں ۳۳ فی صد نشستوں کا خواتین کے لیے مختص کیا جانا اس میدان میں ایک بڑا اقدام ہے۔ کئی ریاستوں میں تعلیم نسواں پر ترغیبات، حالیہ جہیز مخالف اقدامات، ملازمتوں میں فراخ دلانہ ریزرویشن اور مواقع میں خواتین کی برابری جیسی قابل دید مثالیں سامنے آئی ہیں جن سے خواتین سماجی، ثقافتی اور سیاسی میدانوں میں گاندھی جی کی توقعات کے مطابق معقول انداز میں اپنا رول ادا کرسکیں گی۔

گاندھی جی کے نصب العین و مقصودات ایک طرح سے حوالہ جاتی نکتے (ریفرنس پوائنٹ) ہیں جو ہندوستان ہی کے لیے نہیں پوری دنیا کے لیے موزوں ہیں۔ ان اصولوں کی پیہم سعی سے

باقی صفحہ ۱۶ پر

ہندوستان اور امن عالم

ہندوستان نے آزاد ہوتے ہی ایک آزاد ملک کی حیثیت سے عالمی امن کو یقینی بنانے کے لیے ناوابستگی کا راستہ چنا۔ اس نے دنیا کے سامنے "پنچ شیل" پر مبنی طرز حکومت کا ایک نیا نظریہ پیش کیا اور اقوام متحدہ کی سرپرستی میں امن برقرار رکھنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔

کسی ملک کی خارجہ پالیسی مرتب کرتے وقت اس بات کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کہ اس کا طویل مدتی نصب العین کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس میں کافی لچک موجود ہو اور وہ ممکن العمل ہو۔

اس تناظر میں ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا منتہائے مقصود عالمی امن ہے۔ لہٰذا یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ ہندوستان نے حصول آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء سے ہی ناوابستگی کا راستہ چنا۔

گزشتہ نصف صدی کے دوران امن عالم کے لیے ہندوستان کی خدمات کا تجزیہ پیش کرتے وقت میں اُن بڑے اصولوں پر توجہ مرکوز کروں گا جن پر ہماری خارجہ پالیسی کی عمارت کھڑی ہے اور جو ہندوستانی عوام کی کسوٹی پر کھرے اترے ہیں۔ جب کہ ہندوستان کی داخلہ پالیسی ملک کی مختلف الخیال سیاسی جماعتوں کے لیے تنقید اور بحث کا موضوع رہی ہے۔ خارجہ پالیسی پر بہت کم انگلیاں اٹھی ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ اتفاق رائے پر مبنی ہے۔

اہمیت کے لحاظ سے سب سے پہلے نیوکلیائی ہتھیاروں سے پاک دنیا اور نیوکلیائی ہتھیاروں کے خاتمہ کے بارے میں ہندوستان کی پالیسی کا ذکر کیا جاسکتا ہے جس کا مقصد ایک مقررہ میعاد میں ترک اسلحہ کا ایک جامع معاہدہ وجود میں لانا ہے۔ اس پالیسی کا دنیا بھر میں وسیع پیمانے پر خیر مقدم کیا گیا ہے۔

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ ایک غیر مساوی دنیا ہے جس میں اخلاقیات پر سیاسی مصلحتوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ پندرہویں صدی میں پیدا ہوئے اطالوی مدبر اور سیاسی فلاسفر میکیاولی کی موت ۱۵۲۷ء میں واقع ہوئی لیکن اس کی روح ابھی تک زندہ ہے اور نظام حکومت میں خارجہ تعلقات کے بارے میں اس کے وضع کردہ اصول بہت سے ممالک کے لیے مشعل راہ بنے ہوئے ہیں۔

ہندوستان نے تازہ ترین جنگ، نیوکلیائی تجربات پر پابندی کے جامع معاہدہ (سی ٹی بی ٹی) کے سوال پر حال ہی میں جنیوا اور نیویارک میں لڑی۔ اس نے چند ہم خیال ملکوں کو چھوڑ کر قریب قریب پوری دنیا کا تن تنہا مقابلہ کیا۔ اقوام متحدہ میں اور پھر جنیوا میں ترک اسلحہ کانفرنس میں نیوکلیائی ہتھیار رکھنے والی طاقتوں کی قیادت میں باقی ملکوں کے نمائندوں نے ہندوستان کے گرد جیسے سخت پتھروں کی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔

جب سبھی پر یہ آشکار ہو گیا کہ ہندوستان کسی بھی حالت میں سی ٹی بی ٹی کا مسودہ منظور نہیں کرے گا تو دوسرے ممالک کے مندوبین نے ہندوستان کا نقطۂ نگاہ بغور سنا۔ ہندوستان آخری لمحہ تک اپنے اس موقف پر قائم رہا کہ مکمل ترک اسلحہ کے سوا کوئی اور درمیانی راستہ نہیں ہے۔

ہندوستان کے نکتہ چینوں نے اس پر غیر لچکدار رویہ اختیار کرنے کا الزام لگایا۔ حکومت ہند کے خلاف خاص الزام یہی تھا کہ وہ ایک مقررہ میعاد میں ترک اسلحہ کے

ہندوستان کی داخلہ پالیسی ملک کی مختلف الخیال سیاسی جماعتوں کے لیے تنقید اور بحث کا موضوع رہی ہے۔ خارجہ پالیسی پر بہت کم انگلیاں اٹھی ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ اتفاق رائے پر مبنی ہے۔

وکالت کرتے ہوئے حقیقت پسندی سے کام نہیں لے رہی ہے۔ اس کے برعکس ماہرین نے یہ دلیل پیش کی کہ دس سال کی میعاد حقیقت پسندانہ ہے۔ ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے ساتھ سرد جنگ کے خاتمہ سے لے کر اب تک کے دوران دنیا میں نیوکلیائی اسلحہ جات کی تعداد آدھی رہ گئی ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ سابق سوویت صدر میخائل گورباچیف نے نیوکلیائی اسلحہ جات کے مکمل خاتمہ کے لیے اپنے آخری خطاب میں دس سے بارہ سال تک کی میعاد رکھی تھی۔ نوّے کی دہائی کے شروع میں نیوکلیائی وار ہیڈس کی تعداد ۵۷۰۰۰ بتائی گئی تھی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ۲۸۰۰۰ نیوکلیائی ہتھیار ہنوز نیوکلیائی ممالک کے پاس موجود ہیں۔

اگرچہ بہت سے ملکوں نے نیوکلیائی ہتھیاروں کے خاتمہ کی طرف قدم بہ قدم بڑھنے کی حمایت کی تاہم نیوکلیائی ہتھیار رکھنے والے کسی بھی ملک نے اس ضمن میں کوئی پہل نہیں کرنی چاہی اور نہ ہی ان ہتھیاروں کے خاتمہ کے لیے کوئی پختہ عہد کیا۔

سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ممبروں میں چین ایشیا کا نیوکلیائی ہتھیار رکھنے والا واحد ملک ہے۔ دفاعی مطالعات اور تجزیات کے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شری جسجیت سنگھ نے انسٹی ٹیوٹ کے جریدہ کے ستمبر ۱۹۹۶ء کے شمارہ میں اپنے تجزیہ میں کہا تھا "جنگی حکمت عملی کے مستقبل کے تناظر (بحوالہ چین۔ ہندوستان تعلقات) کے بارے میں بڑی غیر یقینیاں پائی جاتی ہیں"۔ جسجیت سنگھ کا کہنا ہے کہ "یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ چین نے (۱۹۹۵ء میں این۔ پی۔ ٹی ایکسٹنشن کانفرنس میں) نیوکلیائی دھماکے کرنے میں انتہائی ضبط و تحمل سے کام لینے کا عہد کرنے کے چند گھنٹے بعد ہی ایک نیوکلیائی تجربہ کیا۔ اس کے بعد بھی وہ ہندوستان سے ۱۰۰۰ کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر واقع مقامات پر تجربات کرتا رہا۔ بعض رپورٹوں کے مطابق امریکی وزیر دفاع نے کہا ہے کہ چین ماضی قریب میں پاکستان کو نیوکلیائی اسلحہ جات کی تکنالوجی فراہم کرتا رہا ہے۔"

دنیا جانتی ہے کہ نیوکلیائی توسیع و اشاعت کے بارے میں ہندوستان کی فکرمندی چین کے نیوکلیائی ہتھیار رکھنے کی وجہ سے ہے۔ چین کا واحد مقصد ایک نیوکلیائی طاقت بننا ہے اور یہ بات اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ چین اسّی کی دہائی کے اواخر تک نیوکلیائی توانائی کے پرامن استعمال کے بارے میں عدم توجہی برتتا رہا ہے۔ چین نے اپنا پہلا کامیاب نیوکلیائی تجربہ ۱۹۶۴ء میں کیا تھا۔ ہندوستان نے اس کے دس سال بعد ۱۹۷۴ء میں پہلی بار نیوکلیائی میدان میں قدم رکھا اور پھر بات وہیں پر ختم ہو گئی۔ اس کے علاوہ ایک اور قابل توجہ حقیقت یہ بھی ہے کہ پاکستان ایک خفیہ نیوکلیائی پروگرام رکھتا ہے جس میں اسے چینی تکنالوجی کی مکمل مدد و حمایت حاصل ہے۔ چین نے پہلی مرتبہ کھلے طور پر یہ کہا کہ ہندوستان کو سی ٹی بی ٹی معاہدے کی توثیق کرنی چاہیے۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جو ملک ہندوستان سے سی ٹی بی ٹی معاہدے کی توثیق کرانا چاہتے ہیں ان کا منشا یہی ہے کہ ہندوستان اپنے سیکورٹی مفادات دوسرے ممالک کے تابع کر دے۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے تک ہندوستانی خارجہ پالیسی کا بنیادی اصول یہی تھا کہ دونوں بڑی طاقتوں سے برابر فاصلے پر رہا جائے۔ امن عالم کو یقینی بنانے کے لیے ہندوستان کی خدمات میں ناوابستگی کی تحریک کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اگرچہ اس تحریک نے کسی کسی ملک کے نظریے سے کام نہیں کیا تاہم وہ ترقی پذیر دنیا کے چار بر اعظموں کے کثیر التعداد عوام کی آواز بن گئی۔

ناوابستگی کی تحریک کا آغاز ۱۹۶۱ء میں بلگریڈ سے ہوا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو، یوگوسلاویہ کے صدر ٹیٹو اور مصر کے صدر جمال عبدالناصر اس تحریک کے روح رواں تھے۔ شروع میں اس تحریک کے ممبر گنے چنے تھے لیکن بعد میں ان کی تعداد کافی زیادہ ہو گئی۔ آج کل اس تحریک کا صدر کولمبیا ہے جسے کبھی لاطینی امریکہ میں امریکہ کا حلیف سمجھا جاتا تھا۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ تحریک جنوبی امریکہ میں بھی پھیل گئی ہے جسے بالعموم امریکی دائرہ اثر کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔

سوویت یونین کے مفقود ہو جانے سے بڑی طاقتوں کے درمیان رقابت ختم ہو گئی۔ اس کا اثر ناوابستہ تحریک پر بھی پڑا۔ اقوام متحدہ میں ناوابستہ ممالک کے تال میل بیورو کے سوائے تحریک نے کہیں پر اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تاہم اس سے تحریک کی کارکردگی تال میل یا رابطہ کا کوئی فقدان پیدا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس افریقی اتحاد کی تنظیم (او۔ اے۔ یو) کا صدر دفتر عدلیس ابابا میں اور عرب لیگ کا ہیڈ کوارٹر قاہرہ میں ہے۔

اگرچہ چین نے بھی ناوابستہ تحریک میں شمولیت کی ہوتی تو بین اقوامی سطح پر یہ تحریک بطور ایک سیاسی قوت کے زیادہ طاقتور ثابت ہو سکتی تھی۔ ماؤزے تنگ نے اقتصادی ترقی کی سطح کے مطابق دنیا کو

ہندوستان نے تازہ ترین جنگ نیوکلیائی تجربات پر پابندی کے جامع معاہدہ (سی ٹی بی ٹی) کے سوال پر حال ہی میں جنیوا اور نیویارک میں ٹکر لی۔ انہوں نے چند ہم خیال ملکوں کو چھوڑ کر قریب قریب پوری دنیا کا تنہا مقابلہ کیا۔ دنیا جانتی ہے کہ نیوکلیائی توسیع و اشاعت کے بارے میں ہندوستان کی فکرمندی چین کے نیوکلیائی ہتھیار رکھنے کی وجہ سے ہے۔ چین کا واحد مقصد ایک نیوکلیائی طاقت بننا ہے۔

"تین دنیاؤں" میں تقسیم کیا تھا۔ چین کا شمار یقیناً "تیسری دنیا" میں ترقی پذیر ممالک کے ساتھ ہوتا تھا مگر ۱۹۶۱ء سے چین نے کبھی ناوابستہ تحریک میں شامل ہونے کی خواہش نہیں کی۔

امن عالم کے لیے ہندوستان کی تیسری اہم خدمت یہ ہے کہ اس نے جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کی ختم کر مخالفت کی اور نو آبادیات کو ختم کرنے کے حق میں آواز بلند کی۔ حکومت ہند نے جنوبی افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کی

> امن عالم کو یقینی بنانے کے لیے ہندوستان کی خدمات میں ناوابستگی کی تحریک کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اگرچہ اس تحریک نے کبھی کسی بلاک کے نظریے سے کام نہیں کیا تاہم وہ ترقی پذیر دنیا کے چار بر اعظموں کے کثیر التعداد عوام کی آواز بن گئی۔

حمایت کبھی ترک نہیں کی۔ اگرچہ اس کے لیے اس پر بہت دباؤ ڈالا گیا۔ فرانسیسی، پرتگیزی اور ولندیزی ایک ایک کر کے ان نو آبادیوں کو چھوڑ کر چلے گئے جن پر وہ حکمرانی کیا کرتے تھے مگر جنوبی افریقہ کے لوگوں کو ابھی روشنی دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا۔

امن، آزادی اور مساوی حقوق کی راہیں کانٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کی گئی تھیں۔ سفید فاموں کا تسلط دنیا کے ضمیر پر ایک داغ تھا۔ عزت کے ساتھ زندہ رہنے کے حق سے محروم رکھے جانے سے جنوبی افریقہ کے سیاہ فاموں میں آزادی کی زور دار تڑپ پیدا ہوگئی۔ اس جدوجہد میں انھیں ہندوستان اور جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستانیوں سے تحریک عمل حاصل ہوئی۔

ایسا صرف ------- مہاتما گاندھی کی سیاسی زندگی کے آغاز میں جنوبی افریقہ کے سیاہ فاموں کے ساتھ ان کے تعلق کے باعث نہیں ہوا تھا۔ جنوبی افریقہ کے سیاہ فاموں کے لیے ہندوستانیوں کی پرزور حمایت کی ایک اور وجہ شاید یہ تھی کہ انھوں نے جنوبی افریقہ کی تحریک آزادی اور مساوی حقوق کی جدوجہد میں بے عزتی، بے حرمتی، قید و بند اور جسمانی اذیتوں کی وہی صعوبتیں دیکھیں جن سے ہندوستانی عوام خود اپنی طویل جدوجہد آزادی کے دوران گزر چکے تھے۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں سیاہ فام جنوبی افریقیوں کے لیے واقعی گہری ہمدردی کا جذبہ تھا اور یہی حال ہندوستانیوں کی حکومت کا تھا۔

ایک آزاد ملک کی حیثیت سے ہندوستان کو دس سال بھی نہیں ہوئے تھے جب اس نے دنیا کے سامنے "پنچ شیل" کے اصولوں پر مبنی طرز حکومت کا نظریہ پیش کیا۔ رواداری کی طویل روایات رکھنے والے اس ملک کے لیے ایسا کرنا ایک قدرتی امر تھا۔ ہندوستان جہاں بہت سے مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں بذات خود لقائے باہم کا مرقع ہے۔ اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے لیے احترام ہندوستان کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

اسی سیاق و سباق میں اپریل ۱۹۵۵ء میں منعقدہ بانڈونگ کانفرنس نے تشدد اور افراتفری کی شکار دنیا کے سامنے

> حکومت ہند نے جنوبی افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کی حمایت کبھی ترک نہیں کی اگرچہ اس کے لیے اس پر بہت دباؤ ڈالا گیا۔

"پنچ شیل" کا نظریہ پیش کیا۔ بانڈونگ کانفرنس کے پانچ شارح تھے۔ ہندوستان، انڈونیشیا، برما، سری لنکا اور پاکستان۔ بانڈونگ کانفرنس سے قبل ایئر انڈیا کے اُس طیارے پر بمباری کا واقعہ ہوا جو مندوبین اور صحافیوں کو لے جا رہا تھا۔ یہ ان عناصر کی حرکت تھی جو تنازعات کا حل دہشت گردی سے چاہتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے طریقے کا مظاہرہ کیا تھا۔

ہندوستان نے ایک امن پسند ملک کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی سرپرستی میں دنیا کے کئی حصوں میں امن برقرار رکھنے کے لیے اہم خدمات انجام دیں۔ یہ ذمہ داری اسے اس لیے سونپی گئی کہ ہندوستان ایک انصاف پسند ملک ہے اور ہندوستانی افواج کا جنگ کے جیسے حالات میں کام کرنے کا ایک شاندار ریکارڈ ہے۔ ایک اور اہم بات پنڈت نہرو کا یہ نقطۂ نگاہ ہے کہ طاقت میں برتری حاصل کر کے امن کو فروغ نہیں دیا جا سکتا۔ الٹے طاقت میں برتری حاصل کرنے کی کوششوں سے امن کو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ ایسی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فریق اپنے حریف سے زیادہ طاقتور رہنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ کوشش جہاں اکثر لا حاصل ثابت ہوتی ہے وہاں کچھ صورتوں میں خودکشی کے مترادف بھی ہوتی ہے۔ نہرو کا اعتقاد تھا کہ کسی بھی اور چیز کی بہ نسبت دوسرے ممالک کے ساتھ دوستی کی پالیسی سے سلامتی بڑھتی ہے۔ لیکن خود ان کی زندگی میں چین نے ۱۹۶۲ء میں ہندوستان پر حملہ کر کے ان کے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے آزادی حاصل کرنے کے بعد جب کوریا کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش ہوا تو شری کے. پی. ایس. مینن کو اقوام متحدہ کے اولین عارضی کمیشن برائے کوریا کا چیئرمین نامزد کیا گیا۔ تب سے ہندوستان کوریائی جزیرہ نما سے متعلق کارروائیوں میں شریک رہا ہے اور اس ملک کے دونوں حصوں کو پھر سے ایک کرنے کی کوششوں کی حمایت کرتا رہا۔ لیکن بدقسمتی سے پچاس سال بعد آج بھی کوریا میں صورت حال وہی ہے جو پہلے

تھی۔ یہ ملک سرد جنگ کے حالات کا شکار رہا اور آج بھی جنوبی کوریا کی سرزمین پر غیر ملکی افواج موجود ہیں۔

۱۹۴۸ء میں ہندوستان کو کوریا سے متعلق اقوام متحدہ کے دوسرے کمیشن کا سربراہ منتخب کیا گیا۔ جب جون ۱۹۵۰ء میں کوریا میں جنگ شروع ہوگئی تو ہندوستان کی خدمات صرف اقوام متحدہ کے چار گوشوں کے اندر ہی محدود نہ رہیں۔ بعد میں ہندوستان کو غیر جانب دار اقوام کے اس کمیشن کا چیئرمین چنا گیا جو جنگی قیدیوں کی اپنے اپنے وطن کو واپسی کی نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ہندوستان نے وطن واپسی کے مسئلے کے حل کے لیے ایک فارمولا بھی تیار کیا۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہندوستان کی پیش کردہ قرارداد ہی کی بنیاد پر ۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو عارضی صلح کا معاہدہ ہوا۔ جب جنگ بندی نافذ ہوگئی تو ہندوستان کی نگراں افواج نے جنگی قیدیوں کو ان کے وطن واپس بھیجنے کا کام سنبھالا۔ میجر جنرل ایس۔ پی۔ پی۔ تھورات نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ جنگی قیدیوں کو جواب طلبی کے لیے بلاتے وقت جب یہ دیکھا گیا کہ ۹۰ فی صد سے زائد قیدی کمیونسٹ مخالف اور فقط ۴ فی صد کمیونسٹ نواز ہیں تو کسی کے بھی خلاف طاقت کا استعمال نہیں کیا گیا۔

گزشتہ ۳۵ برسوں میں اقوام متحدہ نے دنیا کے مختلف حصوں میں امن برقرار رکھنے کی ذمہ داری ہندوستان کو سونپی۔ ان میں سب سے اہم ذمہ داریاں تھیں: عرب اسرائیل جنگ کے بعد ۱۹۶۷ء میں غازہ میں اور پھر کانگو آپریشنز کے دوران کانگو میں امن قائم رکھنا۔ ۱۹۴۸ء سے ۳۰ جون ۱۹۹۴ء تک ۶۵،۰۰۰ ہندوستانی فوجی عملے نے اقوام متحدہ کی امن فوج کے ایک جزو کی حیثیت سے خدمات انجام دی ہیں۔ امن برقرار رکھنے کے اوسط اخراجات ۳۰۰ ملین ڈالر سے بڑھ کر ۱۹۸۹ء میں ۶۴۰ ملین ڈالر ہوگئے اور ۱۹۹۴ء میں اس کا بجٹ ۳/۸ بلین ڈالر ہوگیا۔

ہندوستانی افواج نے کمبوڈیا، موزمبیق اور صومالیہ میں امن بحال کرنے میں سرگرم خدمات انجام دیں۔ ان تمام آپریشنز کے دوران ہندوستانی افواج نے اپنے فرائض بطریق احسن ادا کیے اور داد و تحسین وصول کی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مستقبل میں بھی ہندوستان اقوام متحدہ کی امن قائم رکھنے کی کوششوں میں اہم رول ادا کرتا رہے گا۔ ضرورت ہے کہ اس کے لیے ایک ایسی تنظیم قائم کی جائے جو فوراً حرکت میں آسکے۔ کیوں کہ ابھرتے ہوئے نئے عالمی نظام میں آئندہ دہائیوں میں عدم استحکام یا تنازعات کا بار بار سامنا کرنا پڑے گا۔

ایک آزاد ملک کی حیثیت سے ہندوستان کو دس سال بھی نہیں ہوئے تھے جب اس نے دنیا کے سامنے "پنچ شیل" کے اصولوں پر مبنی طرز حکومت کا نظریہ پیش کیا۔ رواداری کی طویل روایات رکھنے والے اس ملک کے لیے ایسا کرنا ایک قدرتی امر تھا۔

●

بقیہ: تغذیہ بخش خوراک کی یقینی فراہمی

مرتب ہوں۔ اسکول جانے والے بچوں کے لیے دوپہر کے کھانے کی اسکیم، بچوں کی شرح اموات گھٹانے میں معاون پروگرام، زچہ بچہ کی حفاظت کے پروگرام، سب کے لیے ٹیکہ لگانے کا بندوبست۔ ان میں سے بہت سے پروگرام شروع بھی کیے جا چکے ہیں۔

نویں پنج سالہ منصوبے کے انداز نظر کی وضاحت کرنے والی دستاویز میں بھی خوراک کی یقینی فراہمی کو وسیع تر منظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں ایسی خوراک کی فراہمی پر زور ہے جو تغذیہ بخش ہو۔ اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ خوراک اور تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی نویں پنج سالہ منصوبے کا ایک بنیادی مقصد ہے۔ اس پنج سالہ منصوبے میں سب کے لیے متوازن خوراک کی یقینی فراہمی کے ذریعے سے ایسے طویل المدتی اقدامات پر زور دیا گیا ہے جن سے بھوک کا خاتمہ ہوسکے اور کوئی بھی شخص بھوک کی وجہ سے یا غذائی قلت سے نہ مرنے پائے۔

اس دستاویز میں کہا گیا ہے کہ اس مقصد کے لیے کچھ مزید اقدامات کی ضرورت ہے مثلاً خوراک کی پیداوار میں اضافہ اور لازمی خوراکی اشیا کی فراہمی، غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے لوگوں کی قوت خرید بڑھانا، اور ان کے لیے روزگار فراہم کرنا اور ایسے پروگرام شروع کرنا جن سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار مل سکے۔ اس کے ساتھ ہی پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم میں تبدیلیاں پیدا کرکے ہر شخص کو اس سے استفادہ کا موقع دینا۔ مزید برآں اس دستاویز میں صاف پانی کی فراہمی، پرائمری ہیلتھ سروس اور اضافی تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی، عوامی شعور کی بیداری، خاص کر عورتوں میں ان بنیادی خدمات کے تئیں بیداری اور ان سے استفادے کی خواہش جیسی بنیادی باتوں کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔

ان اقدامات کے ذریعے غریب عوام خاص کر عورتیں صحیح قسم کی خوراک حاصل کر سکیں گی اور کھانے پینے کی عادات کو درست بنانے میں مدد ملے گی۔

اس دستاویز میں اس بات پر بھی زور ہے کہ منصوبہ بندی اور جائزہ لینے کے ایک موثر پروگرام کے ذریعے اس سلسلے کے باقاعدہ اعداد و شمار اور دیگر ضروری اطلاعات حاصل ہوتی رہیں گی۔ یہ نظام تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی کے پروگراموں کے اثرات اور صحت کے نظام پر اس کے خوشگوار اثرات کا وقتاً فوقتاً جائزہ لینے میں مددگار ہوگا۔

●

سرویندر سود

تغذیہ بخش خوراک کی یقینی فراہمی

ہمیں لگا ہے کہ خوراک کی قلت کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم نے خوراک کے معاملے میں خودکفیلی بھی حاصل کی ہے اور خوراک کی وافر فراہمی کے ذریعے خودکفالت اور تحفظ کو اقتصادی اور سماجی منصوبہ بندی کے مقاصد کا جزولاینفک بنایا ہے۔ خیال ہے کہ مستقبل میں زور اس بات پر ہوگا کہ ہم مستقبل میں جو بھی خوراک مہیا کرائیں، وہ نہ صرف یہ کہ وافر مقدار میں ہو بلکہ تغذیہ بخش بھی ہو۔

ایک وقت تھا کہ ہمارا ملک خوراک کے محاذ پر قلت محسوس کر رہا تھا، پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ملک میں خوراک کی بہتات تھی اور یہ ایک ایسی مثال ہے جو دنیا کے کم ہی ملکوں میں دیکھنے کو ملے گی۔ اگرچہ بہت سے ممالک جہاں ہندوستان کے ساتھ ساتھ سبز انقلاب دیکھنے کو ملا، ابھی تک خوراکی سامان باہر ملکوں سے منگا رہے ہیں تاہم ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں سے غلّہ باہر ملکوں کو بھیجا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں خوراک کا ایک ایسا نظام وضع کر لیا گیا ہے جو دوسرے لوگوں کے لیے باعث تقلید بن گیا ہے۔

حصول آزادی کے فوراً بعد چونکہ خوراک کی یقینی فراہمی کو اقتصادی اور سماجی منصوبہ بندی کا جزو لازم بنا لیا گیا، اسی وجہ سے یہ کایا پلٹ دیکھنے کو مل سکی۔ یہ حکمت عملی بنیادی طور پر سہ رخی ہے یعنی کہ خوراک پیداوار میں اضافہ، خوراک کی فراہمی کے نظام کو مستحکم بنانا اور ان لوگوں کے لیے خوراک کی فراہمی کا یقینی نظام جو اس کی ضرورت رکھتے ہیں۔ خوراک کی سلامتی اور تحفظ کا نظام محض خوراک کی خودکفیلی تک ہی محدود نہیں، جو کہ یقینی طور پر ایک بنیادی مقصد ہے، بلکہ اس کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے اور جس کا تعلق اس کے ذخیرہ کی دیکھ بھال اور اس کی تقسیم عمل میں لانے سے ہے۔

ہندوستان میں کھیتی کا دار و مدار بارشوں پر ہے، پھر یہاں کی آبادی میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، اسی باعث اس ملک کو اکثر و بیشتر خوراک کی کمی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ماضی میں اس ملک میں بہت سے بھیانک قحط پڑے ہیں۔ اس سلسلے میں ۹۱۸ء میں کشمیر میں پہلا بھیانک ترین قحط پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر دریائے وتستا (جہلم) میں ایک قطرۂ آب بھی باقی نہ رہا تھا۔ کیوں کہ اس میں لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں۔ دوسرا بھیانک قحط ۱۷۷۰ء میں پڑا تھا جب کہ خیال ہے کہ تقریباً ایک کروڑ افراد بھوک کا شکار ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۳-۴۴ء میں بنگال کا قحط بھی ایک بڑا بھیانک قحط تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں ایسا بھیانک قحط دیکھنے کو نہیں ملا، البتہ کہیں کہیں خوراک کی قلت کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں عوام کو ناقص غذاؤں سے پیٹ بھرنا پڑا۔ اس طرح کے واقعات کا اکثر و بیشتر سامنا کرنا پڑا۔

خوراکی اجناس کی پالیسی سے متعلق کمیشن

اگرچہ ملک میں غلّہ کی تقسیم کا سرکاری نظام دوسری جنگ عظیم سے شروع ہوا کیوں کہ اسی زمانے میں راشننگ کے نظام کے ذریعے سے غلّہ کی تقسیم عمل میں لائی گئی تھی تاہم خوراک کی یقینی فراہمی کا موثر اور قابلِ بھروسہ نظام آزادی کے بعد ہی شروع ہو سکا۔ ۱۹۴۷ء میں غلّہ کی پالیسی سے متعلق کمیشن قائم کیا گیا۔ یہ کمیشن سر پرشوتم داس ٹھاکر کی صدارت میں قائم کیا گیا۔ اس کی رپورٹ ۱۹۴۸ء میں آئی، اس میں بتایا گیا کہ مرکزی ذخیرے کو قائم رکھنے کے لیے باہر سے غلّہ منگانا ضروری ہے اور اسی صورت میں ہم ان حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں جب کہ فصلیں نہ اُگائی جا سکی ہوں۔ اس وقت ہندوستان کی جس قدر آبادی تھی، اس کو سامنے رکھتے ہوئے کمیشن نے تقریباً ۲۰ لاکھ ٹن غلّہ کا ذخیرہ رکھنے کی سفارش کی تھی۔ کمیشن نے اگرچہ باہر سے

غلہ منگانے کا سلسلہ بدستور قائم رکھنے کا ضرور مشورہ دیا، مگر اس کے ساتھ ہی اس نے اس اہم شعبے میں خود کفیلی حاصل کرنے کی ضرورت سے بھی صرف نظر نہ کیا۔ اس نے سفارش کی کہ اندرونِ ملک غلہ کی پیداوار بڑھا کر ایک کروڑ ٹن سالانہ کر دی جائے تاوقتیکہ ملک کو اس محاذ پر خود کفیل نہ بنا لیا جائے۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں خوراک کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے جو پہلا قدم پالیسی کے تحت اٹھایا گیا، وہ تھا کہ عالمی جنگ اور بنگال قحط کے بعد خوراکی اجناس پر جو کنٹرول عائد کیا گیا تھا وہ ہٹا لیا جائے۔ البتہ ملک کو بڑے پیمانے پر سیلابوں کا سامنا کرنا پڑا جس سے فصلیں تباہ ہو گئیں۔ اس کی وجہ سے مسلسل خوراکی اجناس کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا رہا اور دوبارہ سے کنٹرول عائد کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ یہ حقیقت ہے کہ ملک میں آزاد منڈی کی اقتصادیات کا پہلا تجربہ خوراک کے معاملے میں ناکام رہا، ایک نعمت میں بدل گئی۔ اس سے ایک مفید سبق ملا جو آج تک ملک کی خوراکی پالیسی پر اثر انداز ہوتا رہا۔ یہ سبق یہ تھا کہ خوراک کی یقینی فراہمی میں ریاست کا موثر کردار رہے گا اور خوراک چوں کہ ایک اہم ترین شے ہے اس لیے اسے تمام تر منڈی کی قوتوں کے ہاتھوں میں نہیں سونپا جا سکتا۔ اس وجہ سے اشیائے ضروری کی تقسیم کا نظام سرکاری دوکانوں کے ذریعے شروع کیا گیا جنھیں فیئر پرائس شاپس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اب خوراکی اشیاء کی یقینی فراہمی انھیں دوکانوں کے ذریعے ممکن بنائی جا سکتی ہے۔

پرشوتم داس ٹھاکر داس کمیٹی کے بعد اور بھی بہت سی کمیٹیاں بنائی گئیں اور دیگر بہت سے کمیشن وجود میں آئے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً خوراک اور زراعت کی پالیسیوں کا جائزہ لیا۔ ۱۹۴۹ء میں غلہ کا تحقیقاتی کمیشن قائم ہوا جس نے خوراک کے محاذ پر خود کفیلی کی ضرورت کا اعادہ کیا، غلہ کی فراہمی کے کمیشن نے جو کہ ۱۹۵۰ء میں قائم کیا گیا تھا، ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ مشورہ دیا کہ غلہ کی تمام تر تجارت کی اجارہ داری سرکار کے ہاتھوں میں ہو اور منڈی سے ابتدا میں سرکار ہی غلہ اٹھائے اور غلہ پیدا کرنے والوں پر محصول لگانے کا بھی اس نے مشورہ دیا۔ ۱۹۵۷ء میں غلہ کی انکوائری کمیٹی قائم کی گئی جس کی سربراہی مشہور ماہر اقتصادیات اشوک مہتہ کو سونپی گئی، اس نے بھی کچھ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔

اس کمیٹی نے غلہ کا فاضل ذخیرہ قائم کرنے کا مشورہ دیا، اس کے علاوہ غلہ کی تجارت پر کنٹرول، کھپت پر کنٹرول، پیداوار میں اضافے اور ملک کو خود کفیل بننے کے وقت تک خوراکی اجناس کی درآمد اور قیمتوں میں استحکام وغیرہ کی سفارشات پیش کیں۔

اشوک مہتہ کمیٹی کی سب سے اہم سفارش یہ تھی کہ غلہ کے نظام میں استحکام لانے کے لیے ایک تنظیم تشکیل دی جائے جو کہ غلہ کی خرید اور فروخت کا نظام سنبھالے۔ غالباً اسی مشورے کے پیش نظر کچھ دنوں بعد ۱۹۶۵ء میں فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا۔ خوراک کی یقینی فراہمی میں اس کارپوریشن کا رول بہت اہم تھا۔ اس کے ساتھ ہی زرعی اشیاء کی قیمتوں کا کمیشن قائم کیا گیا جس کا نام بعد میں بدل کر زرعی اشیاء کی لاگت اور قیمت کا کمیشن کر دیا گیا۔ اس کے ذریعے سے غلہ اگانے والوں کے لیے نفع بخش قیمتوں کو یقینی بنایا جا سکا۔ یہ ایک اہم ترین قدم تھا کیوں کہ اس کی وجہ سے کسان ایسی جدید ٹکنالوجی اپنا سکے جو لاگت پر مبنی کیمیاوی کھادوں کے سہارے آگے بڑھی، اور جس کی وجہ سے سبز انقلاب آ سکا۔

خوراکی اجناس کی پیداوار میں اضافہ

نئی ٹکنالوجی کی فراہمی اور اس کو آگے بڑھانے میں معاون ضروری اور بنیادی ڈھانچہ تیار کر کے ملک میں زراعت کو تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا جا سکا۔ غلہ کی پیداوار بڑھی اور اس کی پیداوار میں اضافہ کی شرح آبادی میں اضافے کی شرح سے بھی آگے بڑھی جس کی وجہ سے ملک رفتہ رفتہ خوراک کے محاذ پر خود کفیل بن سکا اور سب کے لیے خوراک کی فراہمی کو یقینی بنایا جا سکا۔ ۱۹۵۰ء میں ملک میں خوراکی اجناس کی پیداوار صرف ساڑھے پانچ کروڑ ٹن تھی جو بڑھ کر ۱۹۶۵ء میں ۹ کروڑ ٹن تک پہنچ گئی اور اس کے بعد بھی اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور یہ پیداوار بڑھ کر ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۱۹ کروڑ دس لاکھ ٹن سے بھی تجاوز کر گئی اگرچہ ۹۶-۱۹۹۵ء میں اس میں قدرے کمی آئی اور یہ گر کر ۱۸ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن رہ گئی۔ اس سال اس میں پھر اضافے کا امکان ہے۔

فاضل ذخیرہ

فوڈ کارپوریشن آف انڈیا نے سرکاری دوکانوں کے ذریعے غلہ کی فراہمی کے لیے ہمیشہ پہلے کے مقابلے بڑھا کر ہی غلہ دیا۔ چاول کی سالانہ سرکاری خرید ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۵۶ لاکھ ٹن تھی جو بڑھ کر ۹۵-۱۹۹۴ء میں ایک کروڑ ۳۶ لاکھ ٹن ہو گئی۔ اسی طرح گندم کی سرکاری خرید جو کہ مرکزی پول کے لیے کی گئی، اس عرصے میں ۶۶ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ایک کروڑ ۲۳ لاکھ ٹن ہو گئی۔ اس طرح فوڈ کارپوریشن آف انڈیا میں غلہ کا ذخیرہ یکم جولائی ۱۹۸۲ء کے ایک کروڑ ۵۵ لاکھ ٹن سے بڑھ کر جولائی ۱۹۹۵ء میں ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن ہو گیا۔

ہندوستان کو ۱۹۸۷ء میں خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس ایک سب سے بڑی مصیبت کا سامنا بڑی پامردی سے کیا گیا۔ اس سے ہندوستانی زراعت کی مضبوطی اور خوراک کی یقینی فراہمی کے نظام کے استحکام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس میں اشیاء کی مناسب داموں پر فروخت کے لیے سرکاری دوکانوں کے ذریعے تقسیم کا نظام بھی شامل ہے۔ اس موقع پر نہ تو کوئی بہت زیادہ دشواری پیش آئی اور نہ ہی درآمدات کا خوف طاری رہا اور نہ ہی باہر ملکوں سے خوراکی امداد حاصل کی گئی۔ غلہ کے فاضل ذخیرے سے نہ صرف یہ کہ تغذیہ بخش خوراک فراہم کی گئی بلکہ کام کے بدلے خوراک کے پروگراموں سے ایسے خطے کے لوگوں کو فائدہ پہنچایا گیا جو کہ خشک سالی کی زد میں تھے تاکہ وہ خوراک کی قلت نہ محسوس کر سکیں اور اقتصادی دشواریاں ان کے راستے میں حائل نہ ہوں۔ ۱۹۸۷ء میں خوراک اور غذائی افادیت کے نقطۂ نگاہ سے جو رپورٹ مرتب کی گئی اس سے واضح صورت میں یہ بات سامنے آئی کہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء میں جس طرح کے

خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا، اس طرح کے بھیانک اثرات ۱۹۸۷ء میں دیکھنے کو نہیں ملے۔

اشیاء کی تقسیم کا سرکاری نظام

سرکار کے زیر اہتمام پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم کے تحت نہ صرف بنیادی نوعیت کی ضروری اشیاء کی خرید کا نظام مرتب کیا جاتا ہے مثلاً چاول، گندم، چینی، درآمد شدہ خوردنی تیل، مٹی کا تیل، کوئلہ وغیرہ بلکہ صارفین کو سرکاری نرخ پر فیئر پرائس شاپس کے ذریعے سے یہ سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ کام مرکزی اور ریاستی سرکار دونوں کی ملی جلی ذمہ داری سے انجام پاتا ہے۔ اگرچہ مرکزی سرکار ان دوکانوں کے ذریعے فروخت کی جانے والی اشیاء کو خریدتی ہے، ان کا ذخیرہ کرتی ہے اور پھر انھیں مرکزی گوداموں تک بھجواتی ہے اور ریاستی سرکاریں ان اشیاء کو صارفین تک پہنچانے کے لیے درکار دیگر انتظامی ذمہ داریاں سنبھالتی ہیں۔ ہر ریاست کے لیے اس مخصوص مقدار میں اشیا فراہم کردی جاتی ہیں جو کہ سابقہ ضرورتوں پر مبنی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں کئی اور باتوں کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ سابق میں کس قدر سامان ان ریاستوں میں فروخت کیا جاسکا، اس سے متعلقہ اور کیا کیا ضرورتیں پیش آئیں اور خوراک کی فراہمی کو یقینی بنانے کے خیال سے کم سے کم کتنا فاضل ذخیرہ رکھا جائے۔ ہر مہینے اناج وغیرہ کا ذخیرہ ریاستوں کو دے دیا جاتا ہے اور کچھ ذخیرہ اس لیے دیا جاتا ہے کہ وہ اشیاء کھلے بازار میں فروخت کی جاسکیں اور بازار میں اشیا کی قلت نہ ہونے پائے اور اس طرح قیمتوں میں استحکام بنا رہے۔

سرکاری دوکانوں کے ذریعے ضروری اشیاء کی فراہمی کے تین اہم مقاصد ہیں:- (۱) سماج کے کمزور طبقات کو خوراکی اجناس اور دیگر ضروری سامان مناسب داموں پر فراہم کرنا (۲) کھلے بازار میں ایسی اشیا کی قیمتوں پر اچھے اثرات مرتب کرانا جو بازار میں زیادہ تر لوگوں کے خرچ میں آتی ہیں اور جو مجموعی قابلِ فروخت فاضل ذخیرہ کا حصہ بنتی ہیں۔ (۳) ضروری اشیا کی تقسیم کے معاملے میں ایسا نظام اپنانا جس سے سماج کے سبھی طبقات کے ساتھ منصفانہ رویے کا احساس ہو تقسیم کے سرکاری نظام کا بنیادی حصہ فیئر پرائس شاپس ہیں۔ ہر دوکان پر دو ہزار یونٹوں کو ضروری غلہ اور سامان فراہم کرایا جاتا ہے۔ مارچ ۱۹۹۲ء میں ان دوکانوں کی تعداد چار لاکھ تھی جو بڑھ کر مارچ ۱۹۹۵ء میں ۴ لاکھ ۳۴ ہزار تک پہنچ گئی۔ قبائلی آبادی والے علاقوں، پہاڑی خطوں، ریگستانی علاقوں اور دور دراز مقامات پر جہاں کہ پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم بہت زیادہ موثر نہیں تھا، ایسی کوششیں کی گئیں جن سے یہ نظام بہت زیادہ مفید ثابت ہوسکے اور ان دوکانوں پر چائے، دالیں، آیوڈین والا نمک مہیا کرادی گئی ہیں، یہ سہولتیں ۱۷۷۵ بلاکوں میں دی گئی ہیں۔

پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم کا گزشتہ ۴۰ برسوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ اگرچہ خوراک کی تقسیم کا یہ نظام وقت کی کسوٹی پر پورا اترا ہے، تاہم ابھی اس میں اصلاح و بہتری کی اور گنجائش ہے تاکہ یہ ابھرتے ہوئے نئے رجحانات اور ضرورتوں سے ہم آہنگ ہوسکے۔ نئے اقتصادی نظام میں خوراک پر بہ حیثیت مجموعی سبسڈی کو کم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ یہ کام اس طرز پر انجام دیا جاتا ہے کہ غریبوں کے مفادات کو ضرر نہ پہنچے۔ اس کے علاوہ خوراکی اشیا کی یقینی فراہمی کا تصور بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدل رہا ہے۔ اب خوراک کی فراہمی کی ضمانت کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی خوراک فراہم ہو، وہ تغذیہ بخش ہو اور اس کے ساتھ ہی خوراک کی فراہمی کے بہت سے سماجی اور اقتصادی پہلو بھی ہیں۔ نیا تصور خوراک کی فراہمی کے قومی نظام اور گھریلو نظام کے درمیان بھی الگ الگ حد فاصل قائم کرتا ہے۔

موجودہ پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم پر کبھی کبھی نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ اس کے خلاف اعتراض یہ ہے کہ اس سے شہری آبادی کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے اور اس پر لاگت بہت آتی ہے۔ کچھ ماہرین اقتصادیات کا خیال ہے کہ جہاں تک غریب کنبوں کو آمدنی کی منتقلی کا سوال ہے اس حد تک اس کے اثرات جزوی انداز میں ہی پائے گئے ہیں۔ قومی نمونہ جاتی سروے کے ۴۲ ویں دور کے مطالعے پر مبنی حقائق سے پتا چلتا ہے کہ اگرچہ فی کنبہ مجموعی سبسڈی تقریباً ۱۲٫۵۰ روپے فی ماہ بنتی ہے مگر نچلی سطح پر یہ صرف دیہی آبادی کے پانچویں حصے کو صرف ۸ ۲٫۲۱ روپے کے بقدر ملتی ہے۔

ان خامیوں کا ایک سبب پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم کی وہ نوعیت ہے جس کے تحت سبھی لوگ اس سے یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک دوسرا سبب یہ ہے کہ آبادی کے کثیر طبقے کی قوت خرید کمزور ہے۔ اب اس ضرورت کو محسوس کرلیا گیا ہے کہ خوراک تک رسائی کے لیے روپیہ ہر ایک کے پاس ہونا اس طرح ضروری ہے جیسا کہ خود خوراک کا میسر ہونا۔ چنانچہ پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم سے کون لوگ فائدہ اٹھائیں، اس بارے میں ایک نیا نظام لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس سے اس صورت حال پر اچھے اثرات پڑ سکتے ہیں۔

چنانچہ خوراک کی یقینی فراہمی کے تصور کی تبدیلی کی وجہ سے مستقبل میں نہ صرف اس بات پر زور دیا جائے گا کہ محض خوراکی تحفظ کو یقینی بنایا جائے بلکہ اس بات کی بھی کوشش کی جائے گی کہ جو بھی کھانا ملے وہ غذائیت سے بھرپور ہو۔ ۱۹۹۳ء میں تغذیہ بخش خوراک کے سلسلے میں ایک قومی پالیسی اپنائی گئی۔ اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں ایک قومی عملی پلان شروع کیا گیا۔ اس پالیسی کے تحت مختصر مدتی اقدامات کی اہمیت پر زور ہے مثلاً یہ کہ سماج کے کمزور طبقات کو تغذیہ بخش خوراک ملے۔ کھانے پینے کے آئٹموں کی حفاظت اور مختلف دیگر پروگراموں کے ذریعے سے خوراک میں پروٹین کی کمی کے ازالہ کی کوششیں۔ اس سلسلے کا ایک پروگرام یہ ہے کہ اسکول جانے سے قبل کی عمر کے بچوں کو تغذیہ بخش خوراک، زچہ بچہ کے لیے پروٹین اور دیگر معدنی اجزا والی ایسی خوراک جن سے ان کی صحت پر اچھے اثرات

باقی صفحہ ۸ پر

ڈاکٹر پریما رام چندرن

صحتی خدمات کا جائزہ

ہندوستان میں حصولِ آزادی کے بعد صحتی خدمات کی بنیادی سہولتوں کا ایک بڑا نظام معرضِ وجود میں آیا ہے جس کے ذریعے سے اہم عوامی صحت کے مسائل کو حل کیا جا سکا ہے۔ البتہ ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی اور رہن سہن کے طریقوں میں تبدیلی آنے اور نئی بیماریوں کے وجود میں آنے سے صحتی خدمات ان بڑھتے ہوئے مسائل کو حل کرنے میں ناکافی رہی ہیں اور یہ کمیاں بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ ایک بڑا فرق اس لحاظ سے دیکھنے کو ملتا ہے کہ کیا کیا خدمات ہم پہنچا ناممکن ہے اور ہم اپنے وسائل کے اعتبار سے کس قدر خدمات بہم پہنچا سکتے ہیں۔ مصنف نے اس مضمون میں اس طرح کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔

صحت کی خدمات کی منصوبہ بندی کے لحاظ سے ہندوستان کا شمار سرکردہ ممالک میں کیا جاتا ہے۔ آزاد ہندوستان میں صحتی خدمات اور دیکھ بھال کے نظام کی بنیاد دو بہرہ کمیٹی کی رپورٹ کے ذریعے پڑی۔ اور الما۔آتا کا اعلان جس کی بنیاد پر صحت کے عالمی نظام کی ترویج و اشاعت ممکن ہو سکی، اس رپورٹ کے تیس سال بعد ہوا۔ جس وقت ملک آزاد ہوا، اس وقت ہندوستان میں صحت کی دیکھ بھال کا نظام زیادہ تر شہروں تک محدود تھا اور یہ صرف کلنکوں کے ذریعے ہوتا تھا۔ باہر سے روزانہ مریض اسپتال آتے اور دوا لے جاتے۔ دیہات تک ان خدمات کی رسائی ہی نہ تھی یا تھی تو بہت محدود۔ احتیاطی تدابیر کا نظام مفقود تھا اور سماجیاتی خدمات کی فراہمی بھی ممکن نہ تھی۔

پہلے پنج سالہ منصوبے کی کوششوں سے پرائمری، ثانوی اور درمیانی صحتی خدمات کے مراکز قائم کیے جا سکے۔ ان کے ساتھ کچھ ایسے نظام وابستہ کرائے گئے کہ پیچیدہ امراض کے معاملات کو یہ دوسرے مراکز کو منتقل کر سکیں۔ ایسے قومی پروگرام وضع کیے گئے جن سے عوامی صحت کے پیچیدہ مسائل کا حل نکالا جا سکے اور ان پروگراموں پر عمل درآمد کے ذریعے بیماریوں کے خلاف جنگ شروع کی جا سکی۔ ان سب پروگراموں کا اچھا اثر ہوا اور ان کے نتیجے میں شرحِ اموات جو ۱۹۵۱ء میں ۲۷ فی ہزار تھی، گھٹ کر ۱۹۹۵ء میں ۹ رہ گئی۔ البتہ متعدی امراض اور غذائی کمی کے باعث ہونے والی شرحِ اموات میں اسی تناسب سے کمی نہ آ سکی۔ مزید برآں غیر متعدی امراض کے باعث اب شرحِ اموات بڑھ رہی ہے اور کچھ ایسے انفیکشن دیکھنے کو ملے ہیں جیسا کہ ایچ آئی وی۔

دیہات میں صحت

اب تک ملک میں آٹھ پنج سالہ منصوبے مکمل ہو رہے ہیں اور یکم اپریل سے نواں پنج سالہ منصوبہ شروع ہونے والا ہے۔ اس تمام عرصے میں دیہات میں بنیادی صحتی خدمات کا نظام مستحکم کیا گیا ہے۔ یہ کام ملک گیر پیمانے پر انجام دیا گیا ہے۔ پرائمری ہیلتھ کی دیکھ بھال کے مراکز اور ذیلی مراکز کافی تعداد میں قائم ہو سکے ہیں۔ ایسی کوششیں بھی کی جا رہی ہیں کہ کمیونٹی ہیلتھ سینٹر بھی کافی تعداد میں قائم ہو سکیں۔ اس طرح دیہات میں موثر ایمرجنسی خدمات مہیا کرنے کے لیے کام ہو رہا ہے۔ البتہ اس طرح کے نظام میں عملے کی کمی اکثر محسوس کی گئی ہے۔ اہم قومی پروگراموں کو عملی شکل دینے اور صحتی خدمات نیز خاندانی بہبود کے پروگراموں کو آگے بڑھانے کی کوششوں کی راہ میں کلیدی عملے کی کمی کی اکثر شکایت رہی ہے۔ پھر خصوصی طبی عملے کی کمی بھی محسوس کی گئی ہے جنہیں خصوصی امراض میں مشورہ دینا ہوتا ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتوں کے مطابق درکار عملے کی تعداد کا اندازہ لگانا ضروری ہے کیونکہ یہ اندازہ لگاتے وقت آبادی کے ماسوا اس

بات کو بھی سامنے رکھنا ہے کہ ہر جگہ کام کا کتنا بوجھ ہے اور یہ طبی خدمات کتنے کتنے فاصلے پر مہیا ہیں اور آبادی ان دستیاب سہولتوں سے کس قدر فائدہ اٹھا رہی ہے۔

اس سلسلے میں عملے کی بھرتی معاہدہ یا ٹھیکہ کی بنیاد پر بھی کی جا سکتی ہے، اس طرح اس کمی کو پورا کرنے کے لیے طریق کار میں لچک پیدا کرنی ضروری ہے، تاکہ پروگراموں پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جا سکے اور انھیں عملے کی کمی کی دشواریوں سے نکالا جا سکے۔

شہری علاقوں میں صحت

۱۹۹۱ء میں ملک کی آبادی کا تقریباً ایک تہائی حصہ شہروں میں آباد تھا۔ گزشتہ بیس برسوں میں چوں کہ آبادی کا رجحان زیادہ تر شہروں کی طرف جانے کا رہا ہے۔ لہٰذا شہری علاقوں میں، گندی بستیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ ابتدا میں شہروں میں ہی زیادہ تر طبی سہولتیں تھیں مگر بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے یہ ناکافی ہو گئی ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر متعدد تنظیموں نے جن میں میونسپل ادارے، ریاستی سرکاریں، غیر سرکاری تنظیمیں اور بیرونی امداد سے شروع کیے گئے پروجیکٹ، ان سب کی یہ کوشش رہی کہ طبی بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں اور ان کے لیے افرادی قوت بہم پہنچائی جائے۔ دیہی صحتی خدمات کے برعکس پرائمری، ثانوی اور درمیانی نوعیت کی صحتی خدمات کو عام کرنے کے لیے بہت زیادہ منظم کوششیں نہیں ہو سکی ہیں۔ شہری علاقوں کی صحتی خدمات میں اس کی کمی محسوس کی گئی ہے، اس لیے بہت سی سہولتوں سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے اور تیسرے درجے کے صحتی مراکز پر بہت بھیڑ بھاڑ ہے۔ چناں چہ پرائمری ہیلتھ کے مراکز اور ثانوی نوعیت کی طبی خدمات فراہم کرنے والے اور تیسرے درجے کے صحتی مراکز کے درمیان تال میل قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ دستیاب صحتی خدمات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔

دواؤں پر کوالٹی کنٹرول

بیماریوں پر کنٹرول کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے معیاری دواؤں کی مناسب قیمتوں پر دستیابی بے حد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ غیر معقول دواؤں کے مرکبات کے استعمال پر پابندی لگا دی جائے اور ممکن ہو تو ان کا سرے سے استعمال ہی بند کرا دیا جائے۔ فکسڈ ڈوز ڈرگ کے مرکبات بھی بند کیے جانے چاہئیں۔ اس ضرورت کے پیش نظر ریاستوں میں خوراک اور دواؤں پر کنٹرول کرنے والی تنظیموں کو مستحکم کرنے کے لیے آٹھویں منصوبے میں کوششیں کی گئیں اور یہ کام ریاستی اور مرکز دونوں سطحوں پر ہوا۔ البتہ اسکیم پر جزوی عمل درآمد ہوا اور اس کی رفتار سست رہی۔ آئندہ چند برسوں میں یہ کام موثر ڈھنگ سے کیا جانا ہے۔

صحت کے لیے انسانی وسائل

صحت کے نظام کو تشکیل دینے والے عملے اور صحت سے متعلق پروگرام دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ مرکزی بجٹ ہو یا ریاستی بجٹ، ہر جگہ بجٹ کا تین چوتھائی حصہ ملازمین کی تنخواہوں پر خرچ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں صحتی خدمات کی منصوبہ بندی کے برعکس صحتی عملے کی منصوبہ بندی پر مناسب اور پوری توجہ نہیں دی گئی۔ نیم طبی عملے کی بے حد کمی ہے جب کہ ملک میں خصوصی امراض کے ماہر ڈاکٹروں کی تیاری پر زیادہ زور رہا ہے۔ طبی اور صحتی عملے کے معاملے میں علاقائی نابرابری بھی ہے، یہ عدم مساوات بہ لحاظ کوالٹی بھی ہے اور تعداد کے اعتبار سے بھی ہے، اسی وجہ سے صحتی پروگراموں پر موثر ڈھنگ سے عمل درآمد نہیں ہو سکا ہے۔ ملک کی آبادی کی صحتی خدمات کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں صحتی خدمات سے متعلق عملہ نہ صرف تعداد کے اعتبار سے کافی ہو بلکہ معیار کے اعتبار سے بھی کافی ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے کچھ تو ادارے اس وقت کام کر ہی رہے ہیں، تاہم اوپن یونیورسٹی نظام اور پیشہ ورانہ نصابات کا نظام ریاستوں کو پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والے طبی عملے کی کافی تعداد فراہم کر سکے گا۔ اس کے علاوہ مناسب زمروں کے نیم طبی عملے کی کافی تعداد مل سکے گی۔ اس نظام کے ذریعے سروس سے قبل کی مدت کی تربیت کا معیار بھی بڑھ سکے گا۔

ضلع، ریاست اور مرکز کی سطح پر صحتی افرادی قوت کی منصوبہ بندی کے لیے ادارہ جاتی نظام ضروری ہے۔ اس کے ذریعے افرادی قوت کی منصوبہ بندی کے نظام کو ایک ترتیب کے ساتھ آگے بڑھایا جا سکتا ہے، اس کے لیے درکار اعداد و شمار مہیا کرائے جا سکتے ہیں اور ضلع، ریاست اور قومی سطح کی ضرورتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے ایسے ملے جلے عملے کی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکتا ہے جو معیاری بھی ہوگا اور صحت کے مختلف شعبوں کی ضرورتوں کو پورا کر سکے گا۔ پھر بدلتی ہوئی صحتی خدمات کی ضرورتوں کو بھی اس عملے کے ذریعے پورا کیا جا سکتا ہے۔ پبلک سیکٹر، نجی سیکٹر اور رضاکارانہ سیکٹر ہر جگہ دستیاب صحتی خدمات اور بدلی ہوئی ضرورتوں کو اس عملے کی مدد سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

صحتی دیکھ بھال کا منظرنامہ بدل رہا ہے۔ تیزی سے بدلنے والے ان حالات میں ضروری ہے کہ پیشہ ورانہ ماہروں اور نیم طبی عملے کو وقتاً فوقتاً تربیت ملتی رہے تاکہ ان کی معلومات اور ہنرمندی تازہ ہوتی رہیں۔ تعلیم کا یہ مسلسل جاری رہنے والا عمل اور نیم طبی عملے کی تربیت کا یہ سلسلہ صحتی دیکھ بھال کے نظام کو موثر بنانے میں مفید ثابت ہوگا اور یہ کام ایک ٹیم کے طور پر انجام پا سکے گا۔ اس وقت مختلف اداروں میں زیر ملازمت طبی عملے کی تربیت کا نظام جاری ہے، اس کے ساتھ ہی اس کام میں اوپن یونیورسٹیوں کا نظام موثر ہوگا۔

بائیو میڈیکل اور ہیلتھ سروسز ریسرچ

طبی تحقیق کی بھارتی کونسل ملک میں بائیو میڈیکل ریسرچ کے سلسلے میں ایک کلیدی ادارہ ہے۔ امور تحقیق سے متعلق اداروں، یونیورسٹیوں، میڈیکل کالجوں اور غیر سرکاری تنظیموں میں بائیو میڈیکل اور صحتی نظاموں سے متعلق تحقیقی کوششیں جاری ہیں۔ متعدد ادارے ان کاموں کے لیے رقومات فراہم کرتے ہیں، ان میں انڈین کونسل آف میڈیکل

ریسرچ، کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (سائنسی وصنعتی تحقیق کے کاموں کی کونسل) اور ڈی۔ ایس۔ ٹی، ڈی۔ بی۔ ٹی وغیرہ بہت سے اداروں سے شامل ہیں۔ متعلقہ وزارتیں بھی ان کاموں کے لیے رقومات فراہم کرتی ہیں۔ ملک میں بنیادی، کلینک سے متعلق، اطلاقی اور عملی تحقیقی مطالعے کیے جا رہے ہیں، ان میں سے بہت سے مطالعے ایسے ہیں جو بڑے صحتی مسائل اور آبادی میں اضافے کے مسائل وغیرہ سے متعلق ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ صحت سے متعلق بہت سے قومی پروگرام وہ ہیں جو انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ کی طرف سے کیے گئے عملی اور اطلاقی تحقیقی مطالعوں پر مبنی ہیں۔

اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ تحقیقی سرگرمیوں اور عملی کاموں میں تال میل قائم کیا جائے اور اگر ضرورت ہو تو اس کے اہم پروجیکٹوں کے لیے مختلف اداروں کی طرف سے فنڈ دلایا جائے۔ میڈیسن کے جدید نظام میں ڈرگس پر کوالٹی کنٹرول، ان کی جانچ اور ان کی تیاری ایک ایسا شعبہ ہے جہاں تحقیق کا عمل ترقی کی طرف ہے، اسی طرح کے کچھ اور شعبے ہیں جہاں تحقیقی کوششیں جاری ہیں، مثلاً عام متعدی امراض کے لیے جانچ کے ایسے طریقے جن کے ذریعے یہ مرض ایک مریض سے دوسرے مریض میں منتقل نہ ہو سکے۔ اس طرح کے تجربات پرائمری ہیلتھ سے متعلق مراکز پر کیے جا سکتے ہیں۔ متعدی اور غیر متعدی امراض پر قابو پانے کے طریقے اور زچہ بچہ کی دیکھ بھال اور افزائش نسل کے سلسلے کے بہت سے علاج بھی تحقیق کے عمل سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اس کام میں پرائمری ہیلتھ سینٹر کی منصوبہ بندی سے مدد لی جا رہی ہے۔

دیسی طریق علاج اور ہومیوپیتھی

دیسی طریق علاج سے وابستہ ساڑھے چھ لاکھ سے زیادہ وید اور حکیم ہیں۔ یہ دور دراز دیہی علاقوں اور شہروں کی گندی بستیوں وغیرہ میں لوگوں کا علاج کرتے ہیں۔ ان سے صحتی خدمات کی کوالٹی بہتر بنانے میں مدد لی جا سکتی ہے اور ایسے علاقوں میں ان کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں جو دور دراز علاقے ہیں۔ آٹھویں منصوبے میں آئی۔ ایس۔ ایم۔ اینڈ ایچ نامی محکمہ کے ذریعے اس سلسلے کے پہلے سے شروع کیے گئے پروگراموں کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ انڈر گریجویٹ ٹریننگ کو معیاری بنانے اور حالات حاضرہ کے مطابق بنانے پر زیادہ زور ہے۔ اس کام میں میونسپل بورڈوں اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے دیگر اداروں کو بھی شریک کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ان معالجوں کے علم اور مہارت کو عصر حاضر کے مطابق بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ کام انھیں کچھ عرصے تک پیشہ ورانہ ماہروں کے ساتھ رکھ کر انجام دیا جاتا ہے۔ اس طرح باہمی ربط و ضبط سے یہ مقصد حاصل کیا جاتا ہے۔

صحتی پروگراموں پر موثر عمل درآمد کی راہ کی چند اور دشواریاں یہ ہیں: ۔ نگرانی کی کمی، عوامی شعور کی کمی اور ان کو اس کام میں شریک نہ کرنا۔ آئین میں ۷۳ ویں اور ۷۴ ویں ترامیم کے ذریعے سے نگر پالیکا اور پنچایت راج کے ادارے مقامی سطح پر ان پروگراموں کی منصوبہ بندی، عمل درآمد اور نگرانی کے لیے موثر کردار ادا کریں گے۔ مقامی سطح پر متعلقہ شعبوں کے کام میں تال میل قائم کرنا بھی انھیں کی ذمہ داری میں ہے۔ مثلاً صفائی، پینے کا صاف پانی، عورتوں اور بچوں کی بہبود وغیرہ پروگراموں میں تال میل قائم کرنا۔ اس طرح ان پروگراموں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور سماج کے کم ترقی یافتہ طبقات پر توجہ دی جا سکتی ہے۔ یہ وہ طبقات ہیں جو توجہ کے مستحق ہیں اور سماج کے کمزور طبقات ہیں، ان کو یہ خدمات فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔

متعدی امراض کی روک تھام

حصول آزادی کے وقت ملک میں زیادہ تر اموات متعدی امراض سے ہوتی تھیں۔ صحت کا محکمہ اگرچہ ریاستی سرکار کی ذمہ داری میں آتا ہے، پھر بھی گزشتہ چالیس برسوں میں متعدی امراض کی روک تھام کے لیے مرکز کے زیر اہتمام بہت سے پروگرام شروع کیے گئے۔ ان میں سب سے پرانا پروگرام انسداد ملیریا کا قومی پروگرام ہے۔ یہ ۱۹۵۳ء میں شروع کیا گیا۔ اس نے بڑی حد تک کامیابی حاصل کی اور ملیریا سے مرنے والوں کی تعداد گھٹی۔ حصول آزادی کے وقت ملیریا کے مریضوں کی تعداد ساڑھے سات کروڑ تھی اور ان میں سے ۸ لاکھ افراد کی موت واقع ہو جاتی تھی مگر ۱۹۶۵ء میں ملیریا کے صرف ایک لاکھ مریض رہ گئے مگر ان میں مرنے والا کوئی نہ تھا۔۔۔۔ ۔۔۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ملک کے چند حصوں میں ملیریا کا ایک بار پھر زور ہوا ہے۔ چناں چہ اس سلسلے میں کئی باتیں قابل تشویش ہیں، ایک یہ کہ مچھروں میں کیڑے مار دواؤں کی مدافعت کی قوت پیدا ہو رہی ہے۔ ملیریا کی ایک خاص قسم یعنی فیلسی پیرم (FALCIPARUM) ملیریا کے مریضوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور ملیریا کے علاج کے سلسلے کی دواؤں کی اثر پذیری کم ہو رہی ہے۔ ان سب امور کو تشویش کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ چناں چہ ایک ترمیم شدہ عملی پلان زیر عمل ہے۔ شمال مشرقی خطے میں اس کے اثرات زیادہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ چناں چہ اس خطے کی ریاستوں کو اس پروگرام کے لیے سو فی صد منصوبہ جاتی امداد دی جا رہی ہے۔ ایسے دیگر امراض کی روک تھام اور علاج پر بھی توجہ دی جا رہی ہے جو جراثیم کے سبب پھیلتے ہیں۔ "کالا آزار" بیماری کے دوبارہ اثر پکڑ لینے سے بھی تشویش ہو رہی ہے۔

ہندوستان میں کچھ اور بھی اسباب ہیں جن کی وجہ سے لوگ مرتے ہیں۔ مثلاً شہری اور دیہی علاقوں میں صفائی کی ناقص حالت، پانی کا صاف نہ ہونا اور کچرا اور فضلہ کے ٹھکانے لگانے کا ناقص انتظام اور پھر آبادی میں اضافہ۔ بیماریوں کی روک تھام کا عمل اس لیے بھی کمزور پڑا ہے چوں کہ بہت سے بیکٹیریا اب جراثیم کش دواؤں سے نہیں مرتے، ان میں قوت مدافعت پیدا ہو چکی ہے۔

آٹھویں منصوبے میں ٹی۔ بی، کوڑھ اور ایچ۔ آئی۔ وی۔ انفیکشن سے لڑنے کے لیے بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔ البتہ پرائمری ہیلتھ مراکز پر عملے کی کمی کے باعث ان کی روک تھام کے

پروگراموں کے موثر اثرات نہیں دیکھے جاسکے ہیں اور ان پروگراموں سے بھرپور استفادہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ اس سلسلے کی بنیادی سہولتوں اور افرادی قوت کی کمی کو دور کرنے کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔

جس وقت ملک میں بیماریوں پر قابو پانے کے لیے بہت سے پروگرام شروع کیے گئے اس وقت نہ تو وافر افرادی قوت تھی اور نہ ہی طبی سہولتوں کے سلسلے کی بنیادی اشیا میسر تھیں۔ اس لیے ان پروگراموں کو شروع کرنے کے لیے ایک عمودی پروگرام شروع کیا گیا جو کہ پرائمری ہیلتھ مراکز کی عدم موجودگی میں استفادے کے لیے سامنے رکھا گیا۔ آٹھویں منصوبے کے آخر میں پرائمری ہیلتھ کے مراکز کے ذریعے طبی بنیادی سہولتوں کا پروگرام مضبوط ہو چکا ہے، اس لیے کوشش کی جا رہی ہے کہ عمودی پروگراموں اور افقی پروگراموں میں تال میل قائم کیا جائے۔ یہ کام ضلع کی سطح پر ہونا ہے، اس طرح پرائمری ہیلتھ کی دیکھ بھال کے مراکز وہ کلیدی ادارے ثابت ہوں گے جن کے ذریعے جامع انداز کی صحتی خدمات عوام تک پہنچائی جاسکیں گی۔

صحت کی بنیادی خدمات سے متعلق مراکز کی امداد کے لیے اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ متوسط درجے کے صحت کے سرکاری پروگراموں کے تحت صحت کی مربوط خدمات کے پروگراموں کے ساتھ تال میل قائم کر کے اس کام کو زیادہ موثر ڈھنگ سے انجام دیا جاسکے۔ اس وقت متوسط درجے کے پبلک ہیلتھ پروگرام کے مینیجر ضلع کی سطح پر عمودی پروگرام کی سربراہی کر رہے ہیں اور بنیادی صحتی خدمات کے لیے بلاک بنا کر مربوط انداز کی صحتی خدمات فراہم کی جا رہی ہیں۔

بیماریوں پر نظر

آج ہمارے ملک میں بے حد خراب ماحول ہے۔ چناں چہ اس خرابی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور صحت کے سرکاری نظام کی کمزوریوں کے سبب مستقبل قریب میں متعدی امراض کی مکمل طور پر روک تھام ممکن نہیں۔ البتہ اگر مرض کا شروع میں ہی پتا لگ جائے اور اس کی طرف فوری توجہ دی جائے تو اس سے مرض کی روک تھام کا عمل تیزی سے انجام پا سکتا ہے اور متعدی امراض کو پھیلنے سے روکا جاسکتا ہے اور لوگوں کو بیمار ہونے اور مرنے سے بچایا جاسکتا ہے۔ چناں چہ آٹھویں منصوبے میں بیماریوں پر نظر رکھنے کے پروگرام پر کافی توجہ دی گئی۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ یہ کام ضلع کی سطح پر ترقی پا سکے گا اور اس سطح پر اس پر توجہ دی جاسکے گی۔ اس کے لیے لیبارٹری نظام کی ضرورت ہوگی اور اس کی مدد سے اسے مستحکم بنایا جاسکے گا۔ قابل بھروسہ اعداد و شمار کی مدد سے اس کی روک تھام ممکن ہو سکے گی۔ اس مقصد کے لیے دستیاب سہولتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانا ہوگا۔ قومی اداروں اور میڈیکل کالجوں میں اس سلسلے میں جو بھی سہولتیں حاصل ہیں، ان سے بھرپور فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

ہاسپٹل انفیکشن کنٹرول

بہت سے لوگوں کو اسپتالوں میں آنے جانے کے دوران انفیکشن ہو جاتا ہے اور جو لوگ صحتی خدمات فراہم کرتے ہیں، ان کو بھی اتفاقی طور پر جراثیم لگ جاتے ہیں، اس طرح جو لوگ گندگی کو اٹھاتے ہیں ان کو بھی انفیکشن کا خطرہ لاحق رہتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ایسی کوششیں کی جائیں جس سے انفیکشن سے لوگوں کو بچایا جاسکے۔ اس مقصد کے تحت صحتی نظام کی ہر سطح پر ایسی مناسب ٹکنالوجی اپنانے کی ضرورت ہے جسے ہم اپنا سکتے ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن اور صحت اور خاندانی بہبود کی وزارت نے اس طرح کے صراحت شدہ پروجیکٹ شروع کرنے کے واسطے ضروری اقدامات کیے ہیں جن کو تجربے کے طور پر انجام دیا جا رہا ہے۔

غیر متعدی امراض

آج ہمارا طرز زندگی بدل چکا ہے جس کے باعث بہت سے ایسے امراض نے جنم لیا ہے جیسا کہ دل کے امراض، دماغی امراض اور بہت سے دیگر امراض۔ اس کے مختلف اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ اوسط عمر زیادہ ہو گیا، رہن سہن کے طریقے بدل گئے ہیں اور بوڑھوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، شہروں کی زندگی نئے ڈھنگ سے چل رہی ہے، آلودگی بڑھ رہی ہے اور روایتی طرز زندگی سے کنارہ کشی کر کے دوسرے جدید ڈھنگ اپنائے گئے ہیں۔ خوراک کے سلسلے میں بھی بہت سی تبدیلیاں دیکھنے کو ملی ہیں۔ ضلع کی سطح پر ایسے پروگرام شروع کیے گئے ہیں جو غیر متعدی امراض پر کنٹرول سے متعلق ہیں۔ ان پروگراموں کو موجودہ بنیادی اور ثانوی سطح کی سہولتوں کے ذریعے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں مرض ذیابیطس کی مثال سامنے رکھی گئی ہے۔ آٹھویں منصوبے میں اس طرح کے پروگراموں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان مطالعات اور کوششوں سے جو نتائج حاصل ہوں گے، ان سے اس طرح کے مزید پروگراموں کو توسیع دینے میں مدد ملے گی۔

ماحولیات اور صحت

آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے، شہروں کی آبادکاری کا عمل بھی فروغ پا رہا ہے۔ زراعت کے طریقے بدل رہے ہیں، صنعتی اور آبی وسائل کا نظم و نسق بھی تبدیلی کے عمل سے دوچار ہے۔ جراثیم کش دواؤں کا استعمال بڑھ رہا ہے اور زمینی ایندھن کا استعمال ہو رہا ہے۔ ان تمام باتوں سے ماحول بگڑ رہا ہے اور اس کے نتیجے میں صحت پر مضر اثرات پڑ رہے ہیں۔ اس مسئلے کی جانچ اور تحقیق کے لیے رہنمایانہ پروجیکٹ شروع کیے گئے ہیں۔ آلودگی کے مضر اثرات اور اس سے صحت پر پڑنے والے غلط اثرات کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں روک تھام پر پوری توجہ دی جا رہی ہے۔

گزشتہ ۲۰ برسوں میں مختلف کاموں میں لگے لوگوں کی صحت کے معیار کو بہتر بنانے پر کافی توجہ دی گئی۔ اس بات کی کوشش کی گئی کہ جو لوگ مختلف کارخانوں وغیرہ میں کام کرتے ہیں، ان کے لیے مناسب ماحول رہے۔ منظم اور غیر منظم سیکٹر میں اس بات پر نگاہ رکھی جاتی ہے کہ کام کرنے والوں کا ماحول ایسا ہو جو محفوظ

جو اور اس سے ان کی صحت پر بُرا اثر نہ پڑے۔ اس سلسلے میں بہت سی احتیاطی تدابیر اور تدارک کے اقدامات کیے گئے ہیں۔

صحت کے اثرات کا جائزہ

ہر شعبے کی متعدد ترقیاتی سرگرمیوں کے سبب کام کرنے کا ماحول ہی بدل گیا ہے، زراعت، صنعت، شہری اور دیہی ترقی ان سب جگہ بدلا ہوا ماحول نظر آتا ہے اور ان کے پس پردہ صحت کے مسائل سے متعلق بہت سے امور کارفرما نظر آتے ہیں۔ ان خطرات پر قابو پانے کے لیے تمام بڑے ترقیاتی پروجیکٹوں کے لیے صحت سے متعلق جائزہ رپورٹ مرتب کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ ترقیاتی سرگرمیوں میں مصروف لوگوں کی صحت کی دیکھ بھال پر نظر رکھنی ضروری سمجھی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان پروجیکٹوں کے آس پاس آبادی کی صحت کی حفاظت بھی ضروری سمجھی گئی ہے اور اس کام کو اس پروجیکٹ کا حصہ سمجھا گیا ہے جیاں عمل درآمد کے ذمے دار ادارے ان باتوں اور مشوروں پر مناسب غور و خوض کر رہے ہیں۔

نتیجہ

گزشتہ پچاس برسوں میں صحتی نظام کو بڑے پیمانے پر ترقی دیکھنے کو ملی ہے۔ اس دوران ایسا عملہ فراہم کرنے پر زور دیا گیا جو عوام کی صحت کی دیکھ بھال سے دلچسپی لے سکے۔ بہت سے قومی سطح کے پروگرام شروع کیے گئے تاکہ بڑے بڑے امراض کو قابو میں کر کے عوام کی صحت کو ان سے محفوظ رکھا جا سکے۔ صحت کے سرکاری پروگراموں میں سرمایہ کاری میں کافی اضافہ ہوا ہے لیکن صحت کے شعبے میں منصوبہ جاتی مصارف اسی تناسب سے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ متعدی امراض اور غیر متعدی امراض کی وجہ سے صحت کے شعبے پر بوجھ بڑھا ہے، اضافۂ آبادی کی وجہ سے بھی صحتی مسائل کا بوجھ بڑھا ہے، نئی نئی بیماریوں نے جنم لیا ہے، طرز زندگی بدل رہا ہے۔ صحت کی دیکھ بھال سے متعلق تکنالوجیاں ترقی پا رہی ہیں۔ عوام کی امیدیں صحتی معیار میں اضافے کے لیے بڑھی ہیں مگر بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے سب لوگوں کے لیے صحتی خدمات خاطر خواہ فراہم نہیں کی جا سکی ہیں، اس لیے کیا کچھ دینا ممکن ہے اور کیا کچھ ہم دے سکتے ہیں، ہر دو لحاظ سے صحت کے شعبے میں کافی فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ امید قوی ہے کہ آنے والے برسوں میں اس کمی اور اس فرق کو دور کیا جا سکے گا اور اس کے ساتھ ہی صحتی خدمات کے تئیں منصفانہ رویہ اپنایا جا سکے گا اور بہتر صحتی خدمات فراہم کی جا سکیں گی۔

گوشوارہ نمبر ۱

صحت کی سہولتوں میں توسیع پر ایک نظر

نمبر شمار	آئٹم	۱۹۵۱ء	۱۹۷۱ء	۱۹۹۲ء
۱۔	میڈیکل کالج	۲۸	۹۸	۱۴۶
۲۔	اسپتال	۲۶۹۴	۳۸۶۲	۱۳۶۹۲
۳۔	ڈسپنسریاں	۶۵۱۵	۱۲۱۸۰	۲۷۴۰۳
۴۔	کمیونٹی ہیلتھ سنٹر	-	-	۲۱۹۳
۵۔	پرائمری ہیلتھ سنٹر	۷۲۵	۵۱۱۲	۲۰۷۱۹
۶۔	دیہی مراکز	-	۲۸۴۸۹	۱۳۱۴۵۴
۷	اسپتال بستر (ہر قسم کے)	۱۱۷۱۷۸	۳۴۸۶۵۵	۸۱۰۵۴۸

بقیہ: ہندوستان میں سیاحت

ہے، اس کے ایک حصے کے طور پر سیاحت سے متعلق پروجیکٹوں میں سے لے کر ۱۰۰ فی صد تک غیر ملکی سرمایہ کاری کی اجازت دی گئی ہے۔ تاہم اس طرح کی توسیع پذیر کثیر جہتی سرگرمی کے لیے، خاص طور سے مصنوعات کو بہتر اور جدید بنانے کے سلسلے میں نئی سمتوں اور نئے اقدامات کرنے پر مسلسل زور دیے جانے کی ضرورت ہے۔ سیاحت سے متعلق ایک ایسی مرکزی اتھارٹی قائم کرنے کی ضرورت ہے، جسے مرکز اور ریاستوں میں مختلف ایجنسیوں کے ذریعے پالیسی فیصلوں کے سلسلے میں تال میل کرنے کے اختیارات حاصل ہوں۔ ٹھوس سیاسی عزم اور عہد ہونا بھی سیاحت کے شعبے کے لیے ایک لازمی امر ہے تاکہ اس سے وابستہ توقعات پوری کی جا سکیں۔ ●

بقیہ: بڑھتے قدم

یہ ہند۔کروشیا کے درمیان جہاز رانی رابطے میں پیش رفت کی طرف ایک مثبت قدم ہے۔ یہ معاہدہ دو طرفہ تعلقات کو مستحکم کرے گا اور دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون اور تجارت کو فروغ دے گا۔

اس معاہدہ کے ساتھ بھارت نے مختلف ممالک کے ساتھ ۱۴ معاہدے طے کیے ہیں جن میں سنگاپور، روسی وفاق، ایران اور چین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ممالک کے ساتھ ۲ معاہدے گفت و شنید کے مراحل میں ہیں۔ ●

بقیہ: گاندھیائی نصب العین اور اقدار کی جانب

نہ صرف ہندوستان کی اخلاقی و مادی ترقی میں اضافہ ہوگا بلکہ قوموں کے وسیع تر احترام میں جمہوری اور انسانی حقوق کی نمائندگی کو بھی فروغ ہوگا۔ ●

ایس. سیتھورمن

آزادی کے بعد ہند کا تجارتی منظر نامہ

مصنف کا خیال ہے کہ ایک انتہائی منضبط معیشت کی جگہ، باہری رخ، پر مبنی معیشت اپنائی گئی ہے۔ اس بنیادی تبدیلی کی وجہ سے ہندوستان نے غیر ممالک میں اپنے لیے کافی دلچسپی پیدا کی ہے۔ تاہم ایک مضبوط 'عالمی کھلاڑی' کے طور پر ابھرنے سے پہلے، اس کو کافی لمبا سفر طے کرنا ہے۔

ہندوستان کی ترقیاتی حکمتِ عملی، آزادی کے فوراً بعد ۱۹۵۰ء کے دہے میں شروع کی گئی تھی، جس کا اہم مقصد خاص طور سے بنیادی سازوسامان اور بھاری مشینوں کی تیاری کے سلسلے میں ملک کی صنعتی بنیاد کو مستحکم بنانا تھا۔ اس حکمتِ عملی کے تحت خود اعتمادی اور خود کفالت حاصل کرنے کے لیے درآمدات کا متبادل طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ برآمدات کو مجموعی اقتصادی ترقی کا ایک لازمی جزو نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایسی درآمدات کے لیے جن سے بچنا مشکل تھا، غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر کو کم کر کے رقم فراہم کی جاتی تھی، جو آزادی کے وقت ہندوستان کو ملے تھے۔ یہ ذخائر دوسری جنگ عظیم کے دوران اس ملک کے فراہم کردہ سازوسامان اور خدمات کے عوض اس کے لیے رکھے گئے تھے۔

برآمدات کے سلسلے میں قنوطیت ابتدائی منصوبہ سازوں کی فکر پر غالب رہی کیوں کہ یہ بات اس وقت ٹھیک سمجھی گئی تھی کہ جب تک ہندوستان کی مصنوعات میں گوناگونی نہیں آتی شروع ہو جائے، اس وقت تک مصنوعات کی برآمدات کرنے کا بہت کم امکان ہے کیوں کہ عالمی منڈی میں بنیادی مصنوعات اور روایتی طور سے تیار کردہ سازوسامان کی بہت کم مانگ تھی۔ ۱۹۵۰ء کے دہے کے دوسرے نصف حصے میں، جب کہ زیادہ تر سرکاری شعبے میں بھاری صنعت پر زور دیتے ہوئے دوسرے پنج سالہ منصوبے پر عمل درآمد کیا جا رہا تھا، یہ بات سمجھ میں آنے لگی تھی کہ ہندوستان کو برآمدات کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ترقی اور رکھ رکھاؤ کے سلسلے میں کی جانے والی درآمدات کے کم سے کم کچھ حصے کے لیے رقم فراہم کر سکے۔

غیر ملکی زرمبادلہ کے بحران کی وجہ سے، جو ۱۹۵۷ء کے وسط میں چل رہا تھا، منصوبہ بند ترقی کے ایک حصے کے طور پر برآمدات میں اضافہ کیے جانے کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ برآمدات سے ہونے والی آمدنی کی اہمیت کے بارے میں قنوطی نظریے کی جگہ تیسرے منصوبے (۱۹۶۱-۶۶ء) میں زیادہ مثبت نظریے نے لے لی تھی۔ برآمدات کو فروغ دینے کے اقدامات کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ لیکن اس سلسلے میں درآمدات کے متبادل اور صنعت کاری پر زور دیے جانے سے انحراف نہیں کیا گیا۔ ساٹھویں دہے کے وسط تک یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ منصوبہ سازوں نے ہندوستان کی اختیار کردہ ترقی کی محدود نظریے کی حامل راہ میں درآمداتی جزو کی اہمیت کا کم اندازہ لگایا تھا۔ ادائیگیوں کے توازن پر بوجھ کی وجہ سے 'ایڈ۔ انڈیا کنسورشیم (ہندوستان کی امداد سے متعلق کنسورشیم) کا قیام پہلے ہی عمل میں آ چکا تھا۔ یہ کنسورشیم عالمی بینک اور ان ترقی یافتہ ممالک پر مشتمل تھا، جو ہندوستان کو امداد فراہم کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

چوتھے منصوبے (۱۹۶۹-۷۴ء) میں برآمدات پر از سر نو زور دیا گیا تھا، جس میں غیر ملکی امداد پر انحصار کا بتدریج ختم کرنے کا کام شامل تھا۔ پانچویں منصوبے (۱۹۷۴-۷۹ء) میں انجینئرنگ کے سازوسامان، ملبوسات، چمڑے کی مصنوعات اور سمندری پیداوار جیسے کچھ شعبوں کی نشاندہی کی گئی تھی تاکہ برآمدات میں اضافہ کیا جائے۔

اس طرح ۱۹۵۰ء کے دہے میں فی الواقع جمود کے برعکس، ۱۹۶۰ء کے دہے میں برآمداتی کارکردگی میں بہتری آئی اور اس میں ۳ سے ۴ فی صد کا اوسط اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۰ء کے دہے میں یہ کارکردگی اور زیادہ بہتر ہو گئی اور اس

میں مقدار کے لحاظ سے ۳/۶ فی صد اور مالیت کے لحاظ سے ۹/۱۵ فی صد کا اوسط اضافہ ہوا۔ لیکن تین دہوں میں، عالمی برآمدات میں ہندوستان کے حصے میں کمی واقع ہوئی اور ۱۹۵۰-۵۵ء میں تقریباً ۲ فی صد سے گھٹ کر ۱۹۷۰ء میں ۰/۶۵ فی صد رہ گیا۔ ۱۹۸۰ء میں اس میں مزید کمی واقع ہوئی اور وہ صرف ۰/۴۲ فی صد ہی رہ گیا۔ یہ وہ عرصہ تھا، جب عالمی تجارت میں موثر اضافہ ہوا تھا اور بہت سے چھوٹے ایشیائی ترقی پذیر ممالک نیز لاطینی امریکہ میں صنعتی طور سے ترقی پذیر معیشتوں نے مواقع کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا تھا۔

متناقض طور پر جب کہ ہندوستان کی برآمدات میں اضافے کو برقرار رکھا جا رہا تھا یا اسے مزید بہتر بنایا جا رہا تھا، عالمی برآمدات میں اس کے حصے میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے دہے میں ختم ہونے والے تین دہوں میں، مجموعی اندرونِ ملک پیداوار (جی۔ ڈی۔ پی) میں برآمدات کا حصہ ۴ سے ۶ فی صد تک رہا۔ ہندوستان کے سائز کی برا عظمی معیشت میں، ترقیاتی عمل میں بیرونی شعبے کے کردار کو اتنی کم اہمیت دی گئی تھی کہ ایک ہی سکے کے دو رخ کے طور پر درآمدات کے متبادل اور برآمدات کے فروغ پر ہندوستان کے غور کرنے سے پہلے منصوبہ بندی کے پہلے ڈھائی دہوں میں لگاتار خشک سالی، تیل کی قیمتوں میں کافی اضافے اور ادائیگیوں کے توازن میں پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن، درآمدات اور برآمدات پر کنٹرول کے ذریعے تجارت پر مقدار کے لحاظ سے پابندیوں پر بہت زیادہ انحصار نیز صنعتی لائسنس دیے جانے کی وجہ سے ہندوستان ایک بند معیشت بنا رہا۔

برآمدات کو فروغ دینے کے لیے اولین لازمی شرائط کے طور پر نقد معاوضہ جاتی امداد کی اسکیم، ڈیوٹی ڈرا بیک اور امپورٹ اینٹائٹلمینٹ کی اسکیمیں ۱۹۶۰ء کے دہے کے آخر میں شروع کی گئی تھیں۔ اس کے بعد پہلی بار برآمدات سے متعلق پالیسی کی ایک قرارداد (۱۹۷۰ء) کی تشکیل عمل میں آئی تھی، جس کا مقصد پیداواری کارکردگی میں اضافے اور اخراجات میں کمی کے ذریعے برآمدات میں پائیدار اضافہ حاصل کرنا تھا تاکہ بین اقوامی مقابلہ جاتی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اس دہے میں درآمدات کے سلسلے میں نرمی اور آسانی (ڈاکٹر پی۔ سی۔ الیگزینڈر کی سربراہی میں ۱۹۷۸ء) کنٹرول اور سبسڈیز (آنجہانی مسٹر واڈی لال ڈاگلی کی سربراہی میں ۱۹۷۹ء) اور برآمدات کے فروغ (مسٹر پرکاش ٹنڈن کی سربراہی میں ۱۹۸۰ء) سے متعلق متعدد کمیٹیوں کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ ان کمیٹیوں نے سبسڈی کے ڈھانچے کو معقول بنانے، خدمات کی برآمدات کو فروغ دینے اور بہت زیادہ مقابلہ جاتی فوائد کے ساتھ برآمدات کے شعبے میں سرمایہ کاری کرنے کی تجاویز پیش کی تھیں۔ نرمی اور آسانی کے آہستہ عمل کی وجہ سے، تیار مال کی برآمدات کا حصہ ۱۹۷۰-۷۱ء میں ۴۵ فی صد سے بڑھ کر ۱۹۸۰-۸۱ء میں تقریباً ۶۳ فی صد ہو گیا۔

۱۹۸۰ء کے دہے کی ابتدا میں جب کہ ہندوستان چھٹے پنج سالہ منصوبے (۱۹۸۰-۸۵ء) کی شروعات کر رہا تھا، جو تیل کی قیمتوں میں دوسرے اضافے کے موقع پر شروع ہوا تھا، ان خامیوں اور کمزوریوں کا بہت زیادہ اعتراف کیا گیا تھا، جو اس سے پہلے کے دہوں میں محدود طریقے پر مشتمل صنعت کاری کے عمل کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ گھریلو صنعت کے بہت زیادہ تحفظ سے زیادہ اخراجاتی ڈھانچے کو فروغ ملا، جو بڑے ساز و سامان اور ٹکنالوجی کی درآمدات پر سخت پابندیوں کے ساتھ فرسودہ ٹکنالوجی پر قائم تھا۔ ادائیگیوں کے توازن کے مسئلے سے نپٹنے کے لیے، ہندوستان کو تیل کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے ۱۹۸۱ء میں پانچ ارب ڈالر سے زیادہ کی آئی۔ ایم۔ ایف کی توسیع شدہ فنڈ کی سہولت لینی پڑی تھی۔

غیر ملکی تجارت سے متعلق پالیسی اور ۱۹۸۰ء کے دہے کے شروع میں سامنے آئے اور اس خیال کو تقویت حاصل ہوئی کہ ہندوستان کو محنت کی بین اقوامی تقسیم کے فوائد حاصل کرنے چاہئیں۔ یہ کام اسے درآمدات پر پابندیوں نیز بڑے ساز و سامان اور ٹکنالوجی کی درآمدات کو آسان بنانے کی بجائے محصولات پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کر کے انجام دینا چاہیے۔ کہیں زیادہ اندرونِ ملک وسائل کی قیمت پر درآمدات کے متبادل کی کوشش کی حوصلہ افزائی، جو برآمدات کے ذریعے مساوی غیر ملکی زرِ مبادلہ حاصل کرنے کے سلسلے میں کی گئی ہوتی، چھٹے اور ساتویں منصوبے کی دستاویزات میں نہیں کی گئی تھی۔ اگرچہ بہت زیادہ داخلی زرِ ترسیلہ اور دیگر غیر مرئی وصولیابیوں سے مدد ملی، لیکن ہندوستان کو اندرونِ ملک قرضوں میں بہت زیادہ اضافے کے ساتھ ساتھ اپنے غیر ملکی قرضوں میں بھی اضافہ کرنا پڑا تھا، تاکہ مجموعی اندرونِ ملک پیداوار میں ۵/۵ فی صد کی اوسط شرح اضافہ برقرار رکھی جائے اور ادائیگیوں کے توازن میں دباؤ پر قابو پایا جائے۔ ہندوستان کی تیز رفتار ترقی کے لیے بیرونی ماحول کے زیادہ سے زیادہ اہم بن جانے کی وجہ سے حکومت نے ۱۹۸۰ء کے دہے کے وسط میں یہ فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر عابد حسین کی سربراہی میں، جو اس وقت تجارت کے محکمے کے سکریٹری تھے اور جو بعد میں منصوبہ بندی کمیشن کے رکن بنے، تجارتی پالیسیوں کے بارے میں ایک کمیٹی قائم کی نیز مسٹر ایم۔ نرسمہم کی سربراہی میں ایک اور کمیٹی قائم کی تاکہ مالگزاری سے مالی کنٹرول میں ممکنہ تبدیلی سے متعلق امور کا جائزہ لیا جائے۔

عابد حسین کمیٹی کی رپورٹ ایک اہم رپورٹ تھی۔ اس رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ تجارت کو قومی معیشت سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ برآمدات اندرونِ ملک وسائل کو غیر ملکی وسائل میں تبدیل کرنے کا ایک ذریعہ ہے، جو ترقی کے عمل کے سلسلے میں رقم فراہم کرنے کے لیے ضروری ہے۔

رپورٹ میں برآمدات پر ترقی کے ایک ذریعے کے طور پر زور دیا گیا تھا، حالاں کہ

اس میں برآمدات پر مبنی ترقیاتی حکمت عملی کی سفارش نہیں کی گئی تھی۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ برآمداتی پیداوار کو ملکی معیشت میں پیداوار کا ایک لازمی جزو بننا چاہیے۔ یہ بات پسندیدہ ہوگی کہ قابلِ درآمدات اشیا کی اندرونِ ملک پیداوار میں اضافہ کرکے غیر ملکی زرمبادلہ کے قلیل وسائل کی بچت کی جائے ــــ کچھ شعبوں میں اندرونِ ملک پیداوار کے کافی بڑے حصے کی کھپت برآمدات کے شعبے میں ہوتی ہے برآمدات کا شعبہ دیگر شعبوں میں ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ کام وہ روزگار کے مواقع پیدا کرکے، ہنر کو فروغ دے کر اور مقابلہ جاتی صلاحیت کو بہتر بنا کر انجام دے سکتا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ مذکورہ کمیٹی نے تجارتی پالیسیوں کے ساتھ ساتھ صنعتی اور دیگر اقتصادی پالیسیوں میں بھی تبدیلیاں کرنے کی سفارش کی تھی۔ یہ کام نئی کمپنیوں کے ذریعے داخلے کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرکے اور اجارہ داری میں کسی حد تک کمی لا کر انجام دیا جانا تھا۔ برآمدات کے شعبے کے لیے ٹیکس عائد کرنے کے سلسلے میں ترغیبات دینا، کوٹے کی جگہ رفتہ رفتہ محصول عائد کرنا اور زیادہ محصول کے ڈھانچے میں کمی لانا کمیٹی کی متعدد سفارشات میں سے کچھ سفارشیں تھیں۔

۱۹۸۰ء کے دہے میں برآمدات کے فروغ سے متعلق حکمت عملی میں استحکام دیکھنے میں آیا، جو سی۔سی۔ایس، ڈی۔ڈی۔ایس وغیرہ جیسی براہِ راست ترغیبات اور ٹیکس کی رعایات نیز درآمداتی لائسنس دینے کی آسان اور نرم پالیسی کے ذریعے درآمد شدہ ساز و سامان کے اہتمام پر مشتمل تھی۔ ۱۹۸۵ء سے درآمدات اور برآمدات سے متعلق پالیسیوں کو سالانہ نظرثانی کی بجائے تین سال کے لیے پائدار بنا دیا گیا تاکہ تجارتی پالیسی میں استحکام کی جانب قدم اٹھایا جائے۔ ۱۹۸۰ء کے دہے میں یہ کوششیں کی گئی تھیں کہ متعدد ترغیبات کے ذریعے برآمدات پر از سرِ نو زور دیا جائے۔ ان ترغیبات میں برآمدات سے ہونے والے منافع پر ٹیکس سے چھوٹ دینا بھی شامل تھا، تاکہ ملک درآمدات کے ایک بڑے حصے کے لیے رقم فراہم کر سکے اور درآمداتی پالیسی کو کافی نرم اور آسان بنا سکے، جس سے کہ برآمداتی پیداوار کے لیے ضروری ساز و سامان فراہم کیا جائے اور صنعتوں کی جدید کاری اور ٹکنالوجی کی ترقی و بہتری کے کام میں مدد کی جائے۔

اس طرح منصوبہ بند ترقی کے جو تھے دہے (۱۹۸۰ء) میں ہندوستان زیادہ آزاد تجارت کے نظام کی سمت قدرے محتاط طور سے آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اگرچہ درآمدات کے متبادل سے گوناگوں مصنوعات کے سلسلے میں اندرونِ ملک صلاحیتیں پیدا کرنے کا مقصد حاصل ہوا ہے، تاہم ملک ٹکنالوجی میں ہونے والی تبدیلیوں اور نرم کاری کی ان ہواؤں سے کافی عرصے تک اپنے آپ کو الگ تھلگ نہیں رکھ سکا ہے، جو دنیا کے متعدد ترقی پذیر ملکوں میں چل رہی تھیں۔ خلیجی جنگ (۱۹۹۰ء) کی وجہ سے تیل کی قیمتوں میں تیزی سے اضافے کے نتیجے میں، ۱۹۹۱ء میں جو مالی اور ادائیگیوں کے توازن کا بحران چل رہا تھا، اس کے پیشِ نظر بڑے پیمانے پر ایسی اصلاحات اور تدابیر کرنے کی ضرورت تھی، جن کے بارے میں ایک کمال معیشت پر انحصار کرنے والی ترقی کے سوشلسٹ طریقے میں منصوبہ بندی کے ہندوستانی سیاق و سباق میں کبھی سوچا بھی نہیں گیا تھا۔

گوشوارہ نمبر ایک میں ۹۱۔۱۹۵۰ء کی مدت میں نیز ۹۶۔۱۹۹۱ء کی پانچ سالہ مدت میں، جسے عام طور سے "نرم کاری کے دور" کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے (جس کا ذکر مضمون کے اگلے حصے میں کیا گیا ہے)، ڈالر کے لحاظ سے برآمدات اور درآمدات نیز تجارت کے توازن کی وسیع تصویر پیش کی گئی ہے۔ اضافے کی شرحیں مالیت پر مبنی ہیں، جو پیمائشی نشان کے طور پر ڈالر کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ ان شرحوں کا تعلق ۹۱۔۱۹۹۰ء تک پانچ سالہ مدت سے ہے۔ گوشوارہ نمبر ۲ میں قومی معیشت (جی۔ڈی۔پی) کے فی صد کے طور پر عالمی برآمدات میں ہندوستان کے حصے نیز ہندوستان کی برآمدات اور درآمدات کے اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔

اصلاحات کا دور۔

سال ۱۹۹۱ء میں ہندوستان کی اقتصادی تاریخ میں ایک انقلابی تبدیلی دیکھنے میں آئی کیوں کہ ملک نے دنیا کی اندرونی عوامل پر مبنی انتہائی منضبط معیشتوں میں سے ایک معیشت سے باہر نکل کر منڈی پر مبنی نظام شروع کیا، جس سے اقتصادی فیصلے کرنے کے عمل میں حکومت کا رول کم ہو گیا۔ یہ نظام معیشت کی زیادہ شرح ترقی حاصل کرنے اور باقی دنیا کے ساتھ تیزی سے ہم آہنگ ہونے کے ذریعے کے طور پر اپنایا گیا تھا۔

اقتصادی استحکام کا پروگرام نیز تجارت، صنعت، محصولات، مالی شعبے اور سرمایہ جاتی منڈی پر مشتمل ڈھانچہ جاتی اصلاحات اس بدترین اقتصادی بحران کو پلٹتے ہوئے کی گئی تھیں، جو آزادی کے بعد سے ایک ایسا خاموش انقلاب لانے کے سلسلے میں ہندوستان کی راہ میں رکاوٹ سا ہوا تھا، جس کی بدولت ملک سماجی مساوات کے ساتھ ساتھ زیادہ ترقی کی سطح حاصل کر سکتا تھا۔

۱۹۹۰ء میں خلیجی علاقے میں جو واقعات رونما ہو رہے تھے، ان کی وجہ سے ہندوستان ادائیگیوں کے توازن پر اور دباؤ پڑا، بیرونی سرمایہ اور خاص طور سے غیر مقیم باشندوں کے ذخائر کے باہر جانے کی وجہ سے، غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر کم ہو کر جون ۱۹۹۱ء میں تقریباً ایک ارب ڈالر (محض دو ہفتے کی درآمدات) رہ گئے۔ ملک پہلی بار اپنا غیر ملکی قرضہ ادا نہ کر سکنے کی حالت میں پہنچ گیا۔ جہاں بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے ساتھ ڈھانچہ جاتی مطابقت کا پروگرام شروع کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا، جس کے تحت وسیع پیمانے پر اصلاحات کے ساتھ ساتھ استحکام کے پروگرام کے

لیے بروقت ضرورت قرض فراہم کیا گیا تھا۔

تجارتی پالیسی کے شعبے میں اولین اقدامات میں روپے کی قیمت میں ڈالر کے لحاظ سے ۲۲ فی صد کی کمی کرنا، برآمداتی سبسڈی ختم کرنا اور درآمداتی لائسنس دینے کے سلسلے میں پابندیاں کم کرنا شامل تھے۔ زرِ مبادلہ کی دوہری شرح کا نظام شروع کیا گیا تھا لیکن مارچ ۱۹۹۳ء تک اس کو یکساں کر دیا گیا تھا اور زرِ مبادلہ کی شرح کا مکمل طور سے تغیر پذیر نظام وجود میں آیا، جس میں زرِ مبادلہ کی شرح کا تعین منڈی میں مانگ اور سپلائی کی طاقتیں کرتی ہیں۔ غیر ملکی زرِ مبادلہ کی منڈی کو وسیع تر کیا گیا اور اگست ۱۹۹۴ء میں تجارتی اور غیر تجارتی، چالو کھاتے میں روپے کو مکمل طور سے قابلِ تبدیل بنا دیا گیا۔ روپے کی قیمت میں کمی کرنے کا مقصد ملک کی مقابلہ جاتی صلاحیت کو بہتر بنانا نیز تجارت اور چالو کھاتوں میں عدم توازن کو درست کرنا تھا۔

۹۲-۱۹۹۱ء کے بجٹ سے حکومت نے درآمداتی محصول میں مرحلہ وار کمی کا سلسلہ بھی شروع کیا اور اسے ۱۹۹۰ء میں ۳۰۰ فی صد سے، جو سب سے زیادہ تھا، مارچ ۱۹۹۵ء تک ۵۰ فی صد پر لایا گیا۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں درآمدات پر مبنی اوسط محصول ۱۹۹۱ء میں ۸۷ فی صد سے کم ہو کر مارچ ۱۹۹۵ء میں ۲۷ فی صد ہو گیا۔ محصول کے مختلف زمروں میں بھی کافی کمی کی گئی تھی اور مقدار کے لحاظ سے پابندیوں میں بھی کافی نرمی کر دی گئی تھی۔ ۱۹۹۱ء سے شروع کردہ تجارتی اصلاحات سے ہندوستانی صنعت کے برآمدات مخالف رجحان میں کمی لانے میں مدد ملی۔ ہندوستانی صنعت کو اندرونِ ملک اور بین اقوامی دونوں طرح کے مقابلے کے لیے پیش کیا جا رہا تھا۔

درآمداتی۔ برآمداتی پالیسی (۹۷-۱۹۹۲ء) میں، جو آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے ساتھ ساتھ اختتام پذیر ہوگی، برآمدات کو فروغ دینے پر زور دیا گیا ہے، جو کہ ادائیگیوں کے توازن کے انتظام کے سلسلے میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس پالیسی سے اس پیداوار کے ساز و سامان کی درآمدات میں بھی سہولت ملی ہے جو پائدار زیادہ صنعتی ترقی اور برآمدات کے سلسلے میں درکار ہے۔

پالیسی اصلاحات کے نتیجے میں برآمدات میں کافی بہتری آئی ہے اور بڑے استحکام کے اقدامات کے اثر کے تحت پہلے دو برسوں میں کمی آنے کے بعد، اس میں بعد کے ۳ برسوں (۹۴-۱۹۹۳ء تا ۹۶-۱۹۹۵ء) میں ڈالر کے لحاظ سے اوسطاً ۱۸ سے ۱۹ فی صد کا اضافہ ہوا۔ برآمدات میں اب اشیا کے اعتبار سے اور ملک کے اعتبار سے گوناگونی آئی ہے اور برآمدات کا زیادہ سے زیادہ حصہ باقی ماندہ ایشیا، خاص طور سے مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا میں جا رہا ہے، جس کے ساتھ ہندوستان ان معیشتوں کی تیز رفتار ترقی کے پیشِ نظر، تجارت اور سرمایہ کاری کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

عالمی تجارت میں توسیع کی وجہ سے ہندوستان کی برآمدات کو بلاشبہ فائدہ ہوا ہے۔ جیسا کہ اس حقیقت سے ظاہر ہوگا کہ ۱۹۹۶ء میں عالمی برآمدات میں کمی آنے سے موجودہ سال میں کچھ حد تک ہندوستان کی برآمدات بھی متاثر ہوئی ہے۔ لیکن حکومت کو پورا یقین ہے کہ ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۳۱٫۸ ارب کے مقابلے میں ۹۷-۱۹۹۶ء میں ۳۸ ارب ڈالر کا برآمداتی نشانہ حاصل کر لیا جائے گا۔

۲۰۰۰ء تک ۷۵ ارب ڈالر کی مالیت کی برآمدات کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آئندہ چار برسوں میں ڈالر کے لحاظ سے برآمدات میں تقریباً ۲۰ فی صد کا سالانہ اضافہ برقرار رکھا جائے۔ اس سے مجموعی اندرونِ ملک پیداوار میں برآمدات اور درآمدات کے فی صد میں تیزی سے اضافہ کرنے میں مدد ملے گی اور ۲۰۰۱ء تک عالمی تجارت میں ہندوستان کا حصہ بھی ایک فی صد کے قریب پہنچ جائے گا۔

گوشوارہ نمبر ۳ میں پالیسی کو نرم اور آسان بنانے کے بعد کی مدت میں اشیا کے اہم گروپوں کی برآمدات اور درآمدات میں اضافے کا رجحان دکھایا گیا ہے۔ ۶۱-۱۹۶۰ء سے ہندوستان کی تجارت کی سمت میں کی گئیں تبدیلیاں گوشوارہ نمبر ۴ میں پیش کی گئی ہیں۔

حالیہ برسوں میں، درآمدات کا ایک بڑا حصہ برآمدات سے پورا کیا گیا ہے، جو ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۸۸ فی صد رہا ہے۔ درآمدات میں بھی اضافہ ہوا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ صنعتی ترقی کی دو عددی شرح ریکارڈ کرنے کے لیے ۹۴-۱۹۹۳ء سے ٹھوس بحالی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ درآمدات کے زیادہ اخراجات سے دالوں اور خوردنی تیلوں جیسی بڑے پیمانے پر کھپت کی اشیا کی مانگ کا بھی پتا چلتا ہے۔ اس سے خام پٹرولیم اور پٹرولیم کی مصنوعات کی درآمدات پر بڑھتے ہوئے انحصار کا بھی اظہار ہوتا ہے، تاکہ ملک میں توانائی کے استعمال میں ہونے والے تیز اضافے کے ساتھ ساتھ چلا جا سکے۔

پائدار برآمداتی اضافے کی بنیادی ضروریات میں مصنوعات کی مقابلہ جاتی قیمتیں، کوالٹی، منزلِ مقصود پر یقینی ترسیل، افراطِ زر پر ٹھوس کنٹرول کے ساتھ زرِ مبادلہ کی شرح میں استحکام، برآمداتی سرگرمی کے لیے کم شرح سود پر قرض اور دیگر ترغیبات شامل ہیں کیوں کہ یہ سرگرمی گوناگوں ہو جاتی ہے، جس سے مزدوروں پر مبنی اشیا اور دیہی علاقوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ بندرگاہیں، بجلی، مواصلات اور نقل و حمل جیسی بنیادی ڈھانچے کی مناسب سہولیات بھی ان بنیادی ضروریات میں شامل ہیں: ان تمام شعبوں میں، مرکزی اور ریاستی دونوں حکومتوں کو برآمدات کو فروغ دینے اور اس سلسلے میں سہولت اور مدد بہم پہنچانے کے کام میں سرگرمی سے شامل ہونا پڑے گا۔ چونکہ ہندوستان کے برآمداتی فروغ اور عالمی تجارت کے فروغ کے درمیان آپسی تعلق ہے، اس لیے یوروگوئے دور کے معاہدوں میں

ترقی پذیر ممالک کے لیے مواقع میں اضافہ کیا جانا چاہیے تاکہ وہ اپنی برآمدات میں اضافہ کر سکیں، کیوں کہ ہندوستان کی برآمدات کی صورت حال پچھلے کئی برسوں سے کم و بیش ایک سی ہی رہی ہے۔ یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ برآمدات کے لیے انتہائی توجہ طلب مصنوعات کا انتخاب کرنے کے عمل میں استعمال کردہ ملکی وسائل کی فی یونٹ غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی پر زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔ اس سلسلے میں گزشتہ برسوں میں برآمدات کی شرح اضافہ پر زیادہ دھیان نہیں دینا چاہیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نئی مصنوعات کی نشاندہی کرنے اور نئی نئی منڈیوں کا پتا لگانے پر توجہ مرکوز کی جائے۔ جدید ترین ٹکنالوجی نیز پیداوار اور دیگر سہولیات کے موثر انتظام کے لیے ہندوستان کی برآمدات کی مقابلہ جاتی صلاحیت کو بہتر بنانے پر توجہ دینا بھی ضروری ہے۔

درآمدات کے معاملے میں، ۹۶-۱۹۹۵ء کے بجٹ تک محصولات میں لگاتار کمی کرنے کے باوجود، عالمی بینک اور بین اقوامی مالیاتی فنڈ کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں صنائع ملکی کو محفوظ رکھنے کی سطحیں اب بھی زیادہ ہیں، نیز یہ کہ تجارت کے معاملے میں نرمی اور آسانی بہم پہنچانے کا معاملہ مشرقی ایشیا اور دیگر بہت سے ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں کافی پیچھے چل رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ صارفین کی اشیا کی درآمدات پر پابندیوں نیز زرعی درآمدات پر مقدار کے لحاظ سے پابندیوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اشیائے صرف کی درآمدات پر پابندی کی جگہ مناسب محصولات کا سلسلہ شروع کرنے سے مقابلے کے عمل کو فروغ حاصل ہوگا اور مالیہ میں بھی اضافہ ہوگا، جب کہ زرعی اشیا پر پابندیاں ختم کرنے سے اس شعبے کو عالمی منڈی میں مقابلہ کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے گا۔ ان باقی ماندہ پابندیوں کو ایک ایسے امر سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس سے کہ ہندوستان میں غیر ملکی براہ راست سرمایہ کاری کی آمد پر اثر پڑتا ہے۔

ہندوستان کو ایسی بہت سی ذمہ داریاں اٹھانی ہیں، جو یوروگوئے دور کے معاہدوں میں شامل ہیں، مثلاً تجارت سے متعلق ذہنی کاوشوں کے حقوق اور سرمایہ کاری کے اقدامات کی توثیق۔ اگرچہ ہندوستان کے پیٹنٹس قانون پر نظر ثانی کے لیے دس سال کی مدت کا پروگرام موجود ہے، جس سے اس وقت، یوروگوئے دور کے معاہدوں کے تحت مصنوعات کے پیٹنٹس کے لیے فراہم نہیں ہوتا ہے، اس کو یکم جنوری ۱۹۹۵ء سے مصنوعات کے پیٹنٹس کے سلسلے میں ایک طریقۂ کار وضع کرنا ہے۔ امریکہ نے یہ معاملہ تجارت کی عالمی تنظیم کے تحت تنازعات کے تصفیے سے متعلق ادارے کے سپرد کیا ہے۔ درآمدات پر سے پابندیاں ہٹانے کے سلسلے میں بھارت پر بھی دباؤ ہے، جو ادائیگیوں کے توازن کی اس کی مقابلتاً بہتر صورت حال کے پیش نظر ادائیگیوں کے توازن کو قائم رکھنے کی وجہ سے برقرار رکھی جاتی ہیں۔ یہ معاملہ ادائیگیوں کے توازن پر پابندیوں کے سلسلے میں تجارت کی عالمی تنظیم کی کمیٹی میں زیر بحث ہے۔ توقع ہے کہ یہ کمیٹی جنوری ۱۹۹۷ء میں بات چیت شروع ہونے پر پابندیاں عائد کرنے والے اقدامات کے خاتمے کے سلسلے میں مقررہ مدتی پروگرام وضع کرے گی۔

آٹھویں پنج سالہ منصوبے میں غیر ملکی تجارت کے شعبے کی کارکردگی سے منصوبے کی اس بات کی توثیق ہو گئی ہے کہ برآمدات میں مقدار کے لحاظ سے ۱۳٫۶ فی صد سالانہ کا اضافہ ہوگا۔ پہلے چار برسوں میں، اوسط سالانہ شرح ۱۲٫۸ فی صد ہوتی ہے۔ عالمی برآمدات میں ہندوستان کا حصہ ۱۹۹۲ء میں ٫۵۲ فی صد سے بڑھ کر ۹۶-۱۹۹۵ء میں ٫۵۷ فی صد ہو گیا ہے۔ مجموعی اندرون ملک پیداوار کے لیے برآمدات ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۸٫۲ فی صد سے بہتر ہو کر ۹۶-۱۹۹۵ء میں تقریباً ۱۰ فی صد ہو گئی ہیں۔ لیکن درآمدات کے معاملے میں، منصوبے میں دعویٰ کردہ ۸٫۴ فی صد سالانہ کے مقابلے میں، درآمدات میں پہلے تین برسوں میں ۱ر۴۳ فی صد کا اوسط اضافہ ہوا ہے۔ تاہم تجارتی خسارہ اور چالو کھاتے کا خسارہ منصوبے میں تجویز کردہ تناسبوں کے اندر ہی رہے گا اور جو بالترتیب مجموعی اندرونِ ملک پیداوار کا ۱٫۷ فی صد اور ۱٫۵ فی صد ہوگا۔

تجارت کی وزارت نے ایک کمیٹی قائم کی ہے، جو ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۲ء تک کی مدت کے لیے طویل مدتی برآمداتی و درآمداتی پالیسی تشکیل دے گی، جو نویں منصوبے کی مدت کے ساتھ ساتھ ختم ہوگی۔ برانڈ قائم کرنے والی برآمدات کے فروغ سے متعلق حکمت عملی وضع کرنے کے لیے ایک انڈیا برانڈ ایکویٹی فنڈ قائم کیا گیا ہے تاکہ وزارتِ تجارت کے مطابق مقابلتاً مختصر مدت میں برآمدات میں زبردست اضافہ حاصل کیا جائے۔ مذکورہ فنڈ غیر ملکی منڈیوں میں ہندوستانی برانڈس اور مصنوعات کو فروغ دینے کے سلسلے میں کام کرے گا۔

ہندوستان نے ایک وسیع علاقے میں لائسنس کے کنٹرول کو توڑ دینے کے باوجود، اپنے درآمداتی نظام کو مزید آسان اور نرم بنانے کا عزم کر رکھا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں تشویش ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک یوروگوئے دور کے معاہدوں کے تحت اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں یا نہیں۔ بہت سے ممالک ماحولیاتی خطرات اور بچوں سے مزدوری کرانے وغیرہ جیسے مزدوروں کے استحصال کی آڑ میں صنائع ملکی کو محفوظ رکھنے کے طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ خاص طور سے کپڑے اور ملبوسات کے معاملے میں ترقی پذیر ممالک کی درآمدات تک رسائی فراہم کرنے کی ذمہ داریاں، عالمی تجارتی نظام میں کپڑے اور ملبوسات کی ہم آہنگی میں بھی، کسی نہ کسی بہانے سے پوری نہیں کی جا رہی ہیں۔ اس طرح کی پابندیوں کا مقصد کم قیمتی درآمدات کو باہر رکھنا ہے۔

ایک بہت زیادہ منضبط معیشت

سے غیر ممالک پر مبنی معیشت میں اہم تبدیلی کی بدولت، ہندوستان نے سرکاری اور نجی سرمایہ کاروں کی سطح پر، غیر ممالک میں اپنے لیے بہت زیادہ دلچسپی پیدا کی ہے۔ ہندوستان ابھرتی ہوئی سب سے بڑی منڈیوں میں سے ایک ہے۔ چین کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہے۔ ہندوستان غیر ملکی حکام اور براہِ راست سرمایہ کاری کی آمد کا سلسلہ دیکھتا رہا ہے، گو یہ اتنا زیادہ نہیں ہے، جتنا کہ چین اور چند دیگر ممالک میں ہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۸۰ء کے دہے کی دنیا میں بھی ناقابلِ تصور تھا۔ اقتصادی استحکام عالمی برادری میں ملک کے مقام کا اہم فیصلہ کن معاملہ بن گیا ہے اور سب سے زیادہ طاقتور ملک، امریکہ تک بھی، سلامتی اور تحفظ کی بہترین ڈھال کے طور پر، پوری دنیا میں اور خاص طور سے ایشیا بحرالکاہل علاقے میں منڈی کے مواقع تلاش کرتا ہے۔

سرد جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی، مشرق مغرب رکاوٹوں کو ختم کر دیا گیا ہے۔ پالیسی کو نرم اور آسان بنائے جانے اور اسے عالمی سطح کا بنائے جانے کا معاملہ تیزی سے پھیلنا ایک تاریخی تبدیلی ہے، جس کی وجہ سے مشرق مغرب اور شمال جنوب دونوں ڈویژن ختم ہو گئے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک عالمی سطح پر ایک دوسرے پر انحصار کی صورت حال خود سے اپنانے پر مجبور کر دیے گئے ہیں، اگرچہ اس عمل میں انھیں درمیانہ مدت میں شدید خطرات لاحق ہیں نیز انھیں بین اقوامی سلامتی نظام کے بارے میں یقین دہانی نہیں کرائی گئی ہے۔

تیزی سے بدلتے ہوئے عالمی ماحول میں، ہر ایک ترقی پذیر ملک کو اپنی طاقت بنانے اور مقابلہ جاتی فائدے کے شعبوں کو فروغ دینے نیز پڑوسی ممالک کے ساتھ معاہدے کرنے اور جہاں اچھے امکانات ہوں، ایسے علاقائی بلاکوں میں شامل ہونے پر یقینی طور سے توجہ مرکوز کرنی چاہیے، جو ملک کی ترقی کے عمل میں تیزی لانے کے لیے تجارت اور دیگر تبادلوں کے زیادہ سے زیادہ مواقع کی پیشکش کرتے ہیں۔ بین اقوامی محاذ پر، غیر مراعات یافتہ ملکوں کو مشترکہ کاز بنانا چاہیے اور اپنی اہم ضروریات اس کے مقابلے میں زیادہ موثر طور سے پیش کرنے کے لیے متحد ہو جانا چاہیے، جیسا کہ نوآبادیاتی نظام ختم ہونے کے بعد کے دور میں گزشتہ پچاس برسوں میں دیکھنے میں آیا ہے۔ سرد جنگ کے بعد کا نظام، جو کہ انصاف اور مساوات پر مبنی ہے، قائم کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔

ہندوستان کو ایک مضبوط عالمی کھلاڑی کے طور پر ابھرنے کے لیے ابھی ایک طویل سفر طے کرنا ہے، کیوں کہ اس وقت یہ تجارتی اشیا کے ایک سرکردہ برآمد کنندہ کی حیثیت سے ۳۲ ویں مقام کا حامل ہے، جو کہ مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا میں متعدد ممالک سے کافی کم ہے۔ (گوشوارہ نمبر ۵)۔

ہندوستان کو وقت کے اس نقصان کو پورا کرنا ہے، جو ترقی کے لیے اندرونی عوامل پر مبنی راہ اپنانے کے سلسلے میں ضائع ہوا ہے، جس کی وجہ سے وہ بین اقوامی لیگ میں کافی پیچھے رہ گیا ہے، باوجود اس کے کہ اس نے ایک مضبوط صنعتی بنیاد قائم کر لی ہے اور بہت زیادہ تکنیکی افرادی طاقت تیار کر لی ہے، جو کہ دنیا میں تیسری سب سے بڑی طاقت ہے۔ ہندوستانی منصوبہ بندی کے عمل میں تجارتی اشیا کی تجارت میں اس اضافے کی وجہ سے پیدا ہونے والی عالمی یک جہتی اور اتحاد کی بڑھتی ہوئی رفتار کا مناسب خیال نہیں رکھا گیا تھا، جو جنگ کے بعد کے عرصے میں فی الواقع ہر سال پیداوار میں ہونے والے اضافے سے بھی تجاوز کر رہا تھا۔

حالیہ برسوں میں ہندوستان نے مشرق پر توجہ دینی شروع کی ہے اور اب وہ آسیان (جنوب مشرقی ممالک کی سات رکنی انجمن) کی بات چیت میں مکمل طور سے شریک ہے۔ ہندوستان کو توقع ہے کہ ۱۹۹۹ء تک اسے ایشیا بحرالکاہل اقتصادی فورم (ایپک) میں ایک مقام حاصل ہو جائے گا۔ ان سے بین ایشیائی تجارت اور سرمایہ کاری کی آمد میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہونا چاہیے۔ ہندوستان بھی یوروپی یونین اور شمالی امریکہ جیسی مغرب کی ترقی یافتہ معیشتوں میں برآمدات کا زیادہ حصہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ روس اور مشرقی یوروپ نیز وسطی ایشیائی مملکتوں کے ساتھ تجارت میں موجودہ سطحوں کے مقابلے میں کافی توسیع ہونے کے امکانات ہیں۔ زیادہ امید افزا پیش رفت بحر ہند کے حلقے کی ۱۴ مملکتوں کا وہ اقدام ہے، جو انھوں نے اس منشور کے ساتھ اقتصادی تعاون کی گروپ بندی کے سلسلے میں اٹھایا ہے، جس پر مارچ ۱۹۹۷ء میں دستخط کیے جانے کی توقع ہے۔

دو طرفہ اور مختلف نظریات سے کسی بھی طرح سے ہندوستان کے اس عزم مصمم میں کمی نہیں آ سکتی اور نہ آنی چاہیے، جو اس نے کثیر جہتی نظام کے سلسلے میں کر رکھا ہے، جو کہ چند طاقتور ممالک کے ذریعے عالمی معیشت پر غلبے کے خلاف ایک بہترین تحفظ ہے۔ ہندوستان کی فوری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ساپٹا (ایس۔ اے۔ پی۔ ٹی۔ اے) کے ذریعے جنوب ایشیائی تعاون کو مستحکم بنائے اور سافٹا (جنوب ایشیا کا آزاد تجارتی علاقہ) بننے کے لیے اس کی تیزی سے پیش رفت کو یقینی بنائے تاکہ اسے اچھے پڑوسیوں کا ایک ایسا علاقہ بنایا جا سکے، جہاں اب کے مقابلے میں کم سے کم تنازعات سے دوچار ہونا پڑے۔ بین اقوامی معیشت میں ہندوستان کی اہمیت اور اثر برائے نام ہے۔ زیادہ سے زیادہ بچتوں اور سرمایہ کاریوں نیز وسائل کے استعمال میں زیادہ سے زیادہ احتیاط اور اثر انگیزی کے ذریعے عزم مصمم کے ساتھ اندرونی ملک طاقت اور استحکام پیدا کرنا عالمی منڈی میں اپنے صحیح حصے کا

دعویٰ کرنے کے سلسلے میں ملک کے لیے اولین شرط ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

(ملین امریکی ڈالر)

برآمدات، درآمدات اور تجارت کے توازن کا خاکہ

سال	برآمدات (از سرِ نو برآمدات سمیت)	درآمدات	تجارتی توازن	فی صد 'اے'، پنج سالہ اوسط اضافہ برآمدات	درآمدات
۱۹۵۰-۵۱ء	۱۲۶۹	۱۲۷۳	-۴	--	--
۱۹۵۵-۵۶ء	۱۲۷۵	۱۶۲۰	-۳۴۵	۵٫۲	۴٫۸
۱۹۶۰-۶۱ء	۱۳۴۶	۲۳۵۳	-۱۰۰۷	۱٫۹	۹٫۳
۱۹۶۵-۶۶ء	۱۶۹۳	۲۹۴۴	-۱۲۵۱	۵۱	۷٫۱
۱۹۷۰-۷۱ء	۲۰۳۱	۲۱۶۲	-۱۳۱	۲٫	-۵٫۷
۱۹۷۵-۷۶ء	۴۶۶۵	۶۰۸۴	-۱۴۲	۱۷٫۸	۲۴٫۶•
۱۹۸۰-۸۱ء	۸۴۸۶	۱۵۸۶۹	-۷۳۸۳	۱۳٫۸	۱۵٫۸
۱۹۸۵-۸۶ء	۸۹۰۴	۱۶۶۷	-۷۱۶۲	۴٫۵	۶٫۱
۱۹۹۰-۹۱ء	۱۸۱۴۳	۲۴۰۷۵	-۵۹۳۲	۱۱٫۶	۸٫۲
ایس۔اے۔پی کے بعد					
۱۹۹۱-۹۲ء	۱۷۸۶۵	۱۹۴۱۱	-۱۵۴۶	۱٫۵	۱۹٫۴
۱۹۹۲-۹۳ء	۱۸۵۳۷	۲۱۸۸۲	-۳۳۴۵	۳٫۸	۱۲٫۷
۱۹۹۳-۹۴ء	۲۲۲۳۸	۲۳۳۰۶	-۱۰۶۸	۲۰	۶٫۵
۱۹۹۴-۹۵ء	۲۶۳۳۱	۲۸۶۵۴	-۲۳۲۴	۱۸٫۴	۲۲٫۹
۱۹۹۵-۹۶ء	۳۱۸۳۱	۳۶۳۷۰	-۴۵۳۹	۲٫۹	۲۶٫۹
۱۹۹۵-۹۶ء	۱۲۳۲	۱۴۲۷۸	-۱۹۷۶	۲۶٫۳۷	۳۲٫۷۹
(اپریل تا ستمبر)					
۱۹۹۶-۹۷ء	۱۶۱۴۰	۱۷۹۵۳	۱۸۱۳	۹٫۹۱	۵٫۲
(اپریل تا ستمبر)					

نوٹ: 'اے'۔ گزشتہ پانچ برسوں کا اوسط۔

• ۱۹۷۰ء کے دہے کے وسط میں تیل کی قیمتوں میں اضافے کے اثر کو ظاہر کرتے ہوئے۔

مآخذ: اقتصادی جائزہ' ۹۶-۱۹۹۵ء۔ وزارتِ خزانہ اور ریزرو بینک آف انڈیا کی سالانہ رپورٹ ۹۶-۱۹۹۵ء کے لیے تدوین کردہ۔

گوشوارہ نمبر ۲

۱۔ عالمی برآمدات میں ہندوستان کا حصہ (فی صد)

۱۹۵۰ء		۱٫۹۱
۱۹۶۰ء		۱٫۰۴
۱۹۶۵ء		۰٫۹
۱۹۷۰ء		۰٫۶۵
۱۹۷۵ء		۰٫۵۰
۱۹۸۰ء		۰٫۴۳
۱۹۸۵ء		۰٫۵۰
۱۹۹۰ء		۰٫۶
۱۹۹۲ء		۰٫۵۲
۱۹۹۵-۹۶ء		۰٫۵۷

۲۔ مجموعی اندرونِ ملک کے فی صد کے طور پر ہندوستان کی برآمدات اور درآمدات

سال	برآمدات	درآمدات
۱۹۹۵ء	۶	دستیاب نہیں ہے
۱۹۹۶ء(ا)	۴	،
۱۹۹۷ء	۶	״
۱۹۹۸ء	۶	״
دستیاب نہیں ہے		
۱۹۹۰-۹۱ء	۶٫۲	۹٫۴
۱۹۹۱-۹۲ء	۷٫۳	۸٫۳
۱۹۹۲-۹۳ء	۷٫۸	۹٫۸
۱۹۹۳-۹۴ء	۸٫۹	۹٫۴
۱۹۹۴-۹۵ء	۸٫۹	۱٫۴
۱۹۹۵-۹۶ء•	۱۰٫۰	دستیاب نہیں ہے

• تخمینے (منصوبہ بندی کمیشن)

(اے) دہے کے لیے اوسط فی صد

ماخذ: اقتصادی جائزہ۔ وزارت خزانہ' ۹۶-۱۹۹۵ء

ریزرو بینک آف انڈیا کی سالانہ رپورٹ۔ ۹۶-۱۹۹۵ء

گوشوارہ نمبر ۳

برآمدات اور درآمدات کی صورتِ حال۔ ۱۹۹۰ء کے دہے میں

* (فی صد)

برآمدات اشیا کا گروپ	۱۹۹۱-۹۲	۱۹۹۲-۹۳	۱۹۹۳-۹۴	۱۹۹۴-۹۵	۱۹۹۵-۹۶
۱۔ زراعت اور متعلقہ پیداوار (چائے، کپاس وغیرہ)	۱۷٫۹	۱۶٫۴	۱۸٫	۱۶٫۱	۱۹٫۱
۲۔ خام دھاتیں اور معدنیات	۵٫۲	۴٫۰	۴٫۰	۳٫۸	۳٫۷
۳۔ تیار کردہ سامان، جس میں سے	۷۳٫۶	۷۶٫۳	۷۴٫۹	۷۷٫۵	۷۴٫۴
(۱) چمڑے کی اشیاء	۷٫۱	۶٫۵	۸٫	۸٫۲	۶٫
(۱۱) جواہرات اور جڑاؤ زیورات	۱۵٫۳	۱۴٫۵	۱۸٫	۱۷٫۱	۱۴٫۶
(۱۱۱) سوتی دھاگہ، کپڑے سے تیار کردہ اشیاء وغیرہ	دستیاب نہیں ہے	دستیاب نہیں ہے	۶٫۹	۸٫۵	۸٫۱
(۱۷) ملبوسات	۱۲٫۳	۱۲٫۹	۱۱٫۶	۱۲٫۵	۱۱٫۶
(۷) دستکاریاں	۴٫۷	۴٫۶	۳٫۴	۳٫۱	۲٫۶
درآمدات					
(۱) بڑے پیمانے پر درآمدات	۴۴٫۶	۴۴٫۱	۳۹٫۲	۳۹٫۵	۳۹٫۱
۱۔ پی۔ او۔ ایل	۲۷٫۳	۲۰٫۱	۲۳٫۷	۲ ٫۷	۲ ٫۸
۲۔ کیمیاوی کھادیں، دھاتیں اور بڑے پیمانے کی دیگر اشیاء	۱۵٫۷	۱۴٫۷	۱۳٫۱	۱۴٫۸	۱۵٫
(۱۱) بڑے پیمانے پر نہ کی جانے والی درآمدات	۵۵٫۳	۵۵٫۹	۶ ٫۸	۶ ٫۵	۶ ٫۹
۱۔ بڑا اسار و سامان	۲۱٫۸	۲ ٫۷	۲۴٫۸	۲۶٫۷	۲۸٫
۲۔ برآمدات سے متعلق اشیا مثلاً قیمتی پتھر، کیمیاوی اشیا، ٹیکسٹائل دھاگہ وغیرہ	۱۸٫۳	۱۹٫۰	۱۸٫۸	۱۵٫۱	۱۳٫۳
۳۔ دیگر	۱۵٫۲	۱۶٫۲	۱۵٫۲	۱۸٫۸	۱۸٫۵

* ڈالر کے لحاظ سے تیار کردہ۔

ماخذ: ریزرو بینک آف انڈیا کی سالانہ رپورٹیں ۹۴-۱۹۹۳ء اور ۹۶-۱۹۹۵ء

گوشوارہ نمبر ۴

(فی صد)

۱۹۹۰ء کے دہے میں ہندوستان کی تجارت کی سمت

مقام	۱۹۶۰-۶۱	۱۹۷۰-۷۱	۱۹۸۰-۸۱	۱۹۸۵-۸۶	۱۹۹۰-۹۱	۱۹۹۴-۹۵
	برآمدات (فی صد حصہ)					
۱۔ او ای سی ڈی جس میں سے	۶۶٫۱	۵۰٫۱	۴۶٫۶	۵ ٫۸	۵۳٫۵	۵۸٫۷
(الف) ای یو	۳۶٫۲	۱۸٫۴	۲۱٫۶	۱۷٫۷	۲۷٫۵	۲۶٫۷
(۱) جرمنی	۳٫۱	۲٫۱	۵٫۷	۴٫۷	۷٫۸	۶٫۶
(۱۱) برطانیہ	۲۶٫۹	۱۱٫۱	۵٫۹	۴٫۸	۶٫۵	۶٫۴
(ب) امریکہ	۱۶٫	۱۳٫۵	۱۱٫۶	۱۸٫۱	۱۴٫۷	۱۹٫۱
(ج) جاپان	۵٫۵	۱۳٫۳	۸٫۹	۱۰٫۷	۹٫۳	۷٫۷
۲۔ او پی ای سی	۴٫۱	۶٫۴	۱۱٫۱	۷٫۷	۵٫۶	۹٫۲
۳۔ مشرقی یوروپ	۷٫۰	۲۱٫	۲۲٫۱	۲۱٫۱	۱۷٫۹	۳٫۶
۴۔ ایشیا	۶٫۹	۱ ٫۸	۱۳٫۴	۱۰٫۶	۱۴٫۳	۲ ٫۱
۵۔ افریقہ	۶٫۳	۸٫۴	۵٫۲	۲٫۷	۲٫۱	۲٫۵
۶۔ لاطینی امریکہ	۱٫۶	۰٫۷	۰٫۵	٫۲	۰٫۴	۱٫۳
	درآمدات (فی صد حصہ)					
۱۔ او ای سی ڈی جس میں سے	۷۸٫۰	۶۳٫۸	۴۵٫۷	۵۳٫۶	۵۴٫۰	۵۱٫۴
(الف) ای یو	۳۷٫۱	۱۹٫۶	۲۱٫	۲۶٫۶	۲۹٫۴	۲۴٫۸
(۱) جرمنی	۱۰٫۹	۶٫۶	۵٫۵	۷٫۹	۸٫	۷٫۶
(۱۱) برطانیہ	۱۹٫۴	۷٫۸	۵٫۸	۶٫۴	۶٫۷	۵٫۴
(ب) امریکہ	۲۹٫۲	۲۷٫۷	۱۲٫۹	۱ ٫۵	۱۲٫۱	۱ ٫۱
(ج) جاپان	۵٫۴	۵٫۱	۶٫	۹٫	۷٫۵	۷٫۱
۲۔ او پی ای سی	۴٫۶	۷٫۷	۲۷٫۸	۱۷٫۴	۱۶٫۳	۲۱٫۱
۳۔ مشرقی یوروپ	۳٫۴	۱۳٫۵	۱ ٫۳	۱۱٫	۷٫۸	۲٫۴
۴۔ ایشیا	۵٫۷	۳٫۲	۱۱٫۴	۱۱٫۹	۱۴٫۰	۱۴٫۲
۵۔ افریقہ	۵٫۶	۱ ٫۴	۱٫۶	۳٫	۲٫۲	۲٫۹
۶۔ لاطینی امریکہ	۰٫۴	۱٫	۲٫۵	۲٫۹	۲٫۳	۲٫۷

ماخذ: اقتصادی جائزہ۔ وزارت خزانہ، ۹۶-۱۹۹۵ء

گوشوارہ نمبر ۵

ہندوستان اور منتخبہ ایشیائی معیشتیں۔ ایک موازنہ

(۱۹۹۴ء)

ارب امریکی ڈالر اور فی صد

	برآمدات ارب ڈالر	دنیا میں فی صد حصہ	درآمدات ارب ڈالر	دنیا میں فی صد حصہ	برآمدات میں مقام
۱۔ چین	۱۲۱	۲٫۹	۱۱۶	۲٫۷	۱۱
۲۔ سنگاپور *	۹۶٫۸	۲٫۳	۱۰۲٫۷	۲٫۴	۱۲
۳۔ کوریا (جنوبی)	۹۶	۲٫۳	۱۰۲٫۳	۲٫۴	۱۳
۴۔ تائیوان	۹۲٫۹	۲٫۲	۸۵٫۵	۲٫	۱۴
۵۔ ملیشیا	۵۸٫۸	۱٫۴	۵۹٫۶	۱٫۴	۱۹
۶۔ تھائی لینڈ	۴۵٫۳	۱٫۱	۵۴٫۵	۱٫۳	۲۲
۷۔ انڈونیشیا	۴۰٫۱	۱٫	۳۲٫	٫۷	۲۶
۸۔ ہندوستان	۲۵٫۱	۰٫۶	۲۶٫۸	٫۶	۳۲

* ۳۸٫۵ ارب ڈالر کی ازسرنو برآمدات سمیت

ماخذ: رجحانات اور اعداد و شمار، بین الاقوامی تجارت ۔ ۱۹۹۵ء ۔ عالمی تجارتی تنظیم۔

بقیہ: سماجی بہبود

دیہی اور غریب عورتوں کو ایک جگہ اکٹھا ہونے، خیالات و نظریات کا تبادلہ کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کرتے ہیں۔ اس عمل سے ان میں اپنے مسائل کی بہتر سمجھ پیدا ہوتی ہے اور انھیں حل کرنے کے لیے بہتر راستے ملتے ہیں۔

یہ اسکیم عورتوں کے مرتبے کے تعلق سے مقامی علاقوں کے سماجی و اقتصادی حالات کے بارے میں جانکاری دیتی ہے متعلقہ قوانین سے لے کر صحت اور صفائی ستھرائی تک جیسے موضوعات کے بارے میں معلومات بہم پہنچانا اور اس طریقہ کے بارے میں جانکاری دینا بھی اس اسکیم کا مقصد ہے جس سے کہ عورتیں ترقی کے لیے اور ناانصافی کے خلاف منظم ہو سکیں۔

یوجنا، نئی دہلی

غذائیت سے متعلق پالیسی

غذائیت سے متعلق قومی پالیسی کا مقصد، جو مرکزی حکومت نے ۱۹۹۳ء میں اختیار کی تھی، حکومت کی تمام اہم طویل مدتی پالیسیوں میں غذائیت سے متعلق امور کو شامل کرنا ہے۔ اس نے کمزور گروپوں کے لیے غذائیت کے مقابلے میں براہِ راست مداخلت نیز طویل مدتی ادارہ جاتی اور ڈھانچہ جاتی تبدیلیوں پر مشتمل براہ راست پالیسی کا خاکہ پیش کیا۔

سڑک پر رہنے والے بچے

وزارتِ بہبود اور یونیسف کے ذریعے آٹھ بڑے شہروں میں سڑک پر رہنے والے بچوں کے بارے میں کیے گئے سروے میں کہا گیا ہے کہ ایسے بچوں کی ایک بڑی تعداد، جو سڑکوں پر رہتی ہے، ناداری، نظر اندازی اور استحصال کا شکار ہے جس کی وجہ وہ حالات ہیں جو ان کے کنٹرول سے باہر ہیں۔

رضاکار تنظیموں کو سڑک پر رہنے والے بچوں کی دیکھ بھال، تحفظ اور ترقی کے لیے مربوط اجتماعی غیر ادارہ جاتی بنیاد پر مبنی خدمات مہیا کرنے کے سلسلے میں امداد دی جا رہی ہے۔ ان کا زور استحصال اور غلط استعمال کو کم کرنے اور بچوں کو مضر صحت کاموں سے نکالنے پر ہے۔ اس سلسلے میں لڑکیوں کو اور نعیر کنبے والے بچوں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔

چھوٹے بچوں کے سلسلے میں ترجیح ان کو ان کے کنبے میں دوبارہ بھیجنے اور ان کی رسمی ابتدائی تعلیم میں شمولیت پر ہے۔ بڑے بچوں کے لیے کوششوں کا مقصد ان کی تعلیمی سطح میں اضافہ کرنا اور ان کو بالغ زندگی کے لیے پیداواری ہنر کے سلسلے میں پیشہ ورانہ تربیت دینے کا اہتمام کرنا ہے۔

منشیات کی عادت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے وزارتِ بہبود نے کمیونٹی پر مبنی نظریہ اپنایا ہے۔ کمیونٹی کی شرکت کے سلسلے میں سہولیات، صلاحیتوں، کمیونٹی میں دستیاب افرادی قوت کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس حکمت عملی میں لوگوں کو منشیات کے استعمال کے مضر اثرات کے بارے میں تعلیم دینا اور ان میں بیداری پیدا کرنا، ترغیب، صلاح مشورے، علاج معالجے اور نجات دلائے گئے لوگوں کو سماج میں شامل کرنے کے ایک مربوط پروگرام کے ذریعے منشیات کے عادی لوگوں کو اس لعنت سے نجات دلانا شامل ہے۔ منشیات کے غلط استعمال کی روک تھام اور بعض آباد کاری کا کام کرنے والے رضاکاروں کو تربیت دی جاتی ہے تاکہ روک تھام کی خدمات مہیا کرنے والوں کا ایک قابل کیڈر بنایا جا سکے۔

ایم. کے. دھرم راجہ

کھیل کود — آزادی کے بعد کا منظر نامہ

آزادی کے بعد کے پچاس برسوں میں بھارت نے کھیل کود کے کئی شعبوں میں کامیابیاں حاصل کی ہیں حالانکہ یہ بھی صحیح ہے کہ ملک میں انسانی وسائل کا جتنا بڑا ذخیرہ ہے اس کے حساب سے بین اقوامی سطح پر ہماری کارکردگی متوازن نہیں رہی ہے۔ ہندوستان کا وہ مقابلتاً چھوٹا سا طبقہ جسے اسپورٹس میں دلچسپی رہی ہے اسے بھی بین اقوامی مقابلوں کے بڑھتے ہوئے معیار کے مدمقابل آنے کے قابل بنانے میں بہت تاخیر سے کام لیا گیا۔ برسوں کی بے اعتنائی اور ناموافق صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میدان میں ہندوستان کی جو قدیم روایت رہی تھی وہ بھی ماند پڑ گئی۔

لیکن جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں ہندوستان کے مرد اور عورت کھلاڑیوں کی بین اقوامی سطح پر شاندار کارکردگی کے بھی کچھ واضح سنگ میل نظر آتے ہیں۔ یہاں پارلیمانی کمیٹی کی اس رپورٹ کا حوالہ دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں بین اقوامی کھیلوں میں ہندوستان کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ رپورٹ میں لکھا ہے "ہندوستانی اسپورٹس کے ابر آلود منظر نامے میں کہیں کہیں کامیابی کی سنہری کرنیں بھی نظر آتی ہیں۔ ہندوستان برسوں تک ہاکی میں سب سے افضل رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہم بلیئرڈ اور اسنوکر میں عالمی چیمپئن رہ چکے ہیں۔ ہندوستانی کرکٹ نے متعدد بار ہمیں مسرور کیا ہے۔ دوسرے کھیلوں میں بھی گاہے گاہے روشنی کے جھماکے ہوتے ہیں مثلاً کے ملیشوری اور کنجورانی نے ویٹ لفٹنگ کے عالمی خطاب جیتے اور جسپال رانا نے نشانے بازی میں امتیاز حاصل کیا۔ اس رپورٹ کے کئی مہینے بعد لینڈر پیس نے ٹینس میں کارنامہ انجام دیا جب انھوں نے اٹلانٹا اولمپکس میں عالمی سطح پر اپنے سے برتر کھلاڑیوں کو شکست دے کر ہندوستان کے لیے کانسے کا تمغہ جیتا۔

کھیل کے میدان میں آزاد ہندوستان کا پہلا اہم کارنامہ ۱۹۵۱ء میں دہلی میں پہلے ایشیائی گیمس کا انعقاد تھا۔ یہ گیمس اسپورٹس کے زبردست مداح پروفیسر جی۔ ڈی۔ سوندھی کے خوابوں کی تعبیر تھے جس میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا پُر اشتیاق تعاون اور حوصلہ افزائی بھی شامل تھی۔ ان برسوں میں ہندوستانی کھلاڑیوں نے ایشیائی کھیل، دولت مشترکہ کھیل اور کئی اور بین اقوامی مقابلوں میں اپنا اور ملک کا نام روشن کیا ہے۔ لیکن پہلے ایشیائی کھیلوں میں ہندوستان کی کارکردگی اب بھی سنہری یادیں بن کر چمکتی ہے۔ ہندوستان نے ایتھلیٹکس مقابلوں میں ۴۹ رکنی ٹیم رکھی تھی جس نے دس طلائی تمغے جیتے۔ مقابلوں میں اول نمبر پر رہنے والے ملک جاپان کو اس سے صرف ایک طلائی تمغہ زیادہ ملا تھا۔ ہر مقابلے میں ہندوستان نے کم از کم تمغہ ضرور جیتا تھا۔ ہندوستان نے مجموعی طور پر سونے کے دس، چاندی کے دس اور کانسے کے سات تمغے جیتے تھے۔ ہندوستانی خواتین کو اگرچہ بین اقوامی سطح کے مقابلوں کا تجربہ نہیں تھا لیکن انھوں نے چاندی کے ۲ اور کانسے کے ۵ تمغے حاصل کر دکھائے تھے۔

پہلے ایشیائی کھیلوں میں لیوی پنٹو نے سو اور ۲۰۰ میٹر دوڑ کے مقابلے جیتے تھے جس پر انھیں "ایشیا کا تیز ترین آدمی" قرار دیا گیا تھا۔ مدن لال نے شاٹ پٹ میں سونے کا تمغہ حاصل کیا اور نری مل رائے نے جو "مسٹر ایشیا ۱۹۵۱ء" کا خطاب جیت چکے تھے، بھی ہندوستان کی حوصلہ افزا کارکردگی میں اپنا حصہ ادا کیا تھا۔

ایتھلیٹکس میں شاندار کارکردگی کے علاوہ ہندوستان نے فٹبال فائنل کے مقابلے میں ناقابل تسخیر ایران کو شکست دینے کا افتخار حاصل کیا تھا۔ یہ کارنامہ گیارہ سال بعد پھر انجام پایا جب ہندوستان جکارتہ ایشیائی کھیلوں میں فٹبال چیمپئن ہوا۔ ان کھیلوں میں ہندوستان نے چار طلائی تمغے جیتے اور مجموعی طور پر سونے کے ۱۵، چاندی کے ۱۶ اور کانسے کے ۲۱ تمغے جیتے۔

اگلی تین دہائیوں میں متعدد ہندوستانی کھلاڑیوں نے ایشیائی اور دولت مشترکہ کھیلوں نیز دیگر بین اقوامی مقابلوں میں اپنے نام کی مہر ثبت کی۔ "فلائنگ سکھ" ملکھا سنگھ کا نام سر فہرست ہے کہ وہ ایتھلیٹکس مقابلوں کا ایک غیر معمولی کھلاڑی رہا ہے۔ ٹوکیو میں ہوئے تیسرے ایشیائی کھیلوں میں اس نے دو سو اور چار سو میٹر دوڑ کے مقابلے جیتے اور دونوں میں نئے ریکارڈ بنائے۔ اس کے بعد اس نے اور اعلیٰ سطحوں پر بھی اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔ ۱۹۵۸ء میں کارڈف میں ہوئے دولت مشترکہ کھیلوں میں ۴۰۰ میٹر دوڑ کا مقابلہ جیتنے کے بعد ملکھا کو مقابلوں

میں بہترین دوڑنے والے کا انعام ـ ہیلمز ٹرافی ـ دیا گیا۔ دو سال کے بعد روم اولمپک میں وہ مقابلہ دیکھنے میں آیا جسے "صدی کا سب سے عمدہ دوڑ مقابلہ" گردانا جاتا ہے۔ اس مقابلے میں ملکھا نے ۴ میٹر کی دوڑ صرف ۴۵٫۶ سیکنڈ میں پوری کی ہے۔ وہ چوتھے نمبر پر رہا جس میں امریکی کھلاڑی اوٹس ڈیوس نے ۴۴٫۹ سیکنڈ میں دوڑ پوری کر کے طلائی تمغہ جیتا تھا۔ اس دوڑ میں ملکھا سمیت چار کھلاڑیوں نے پچھلا اولمپک ریکارڈ توڑا تھا۔ ملکھا تمغہ نہیں جیت سکا لیکن اس کا نام اولمپک ریکارڈ توڑنے والے جیالے کھلاڑیوں میں ضرور درج ہو گیا۔

ایشیائی کھیلوں کا دوسری بار دہلی میں منعقد ہونا حافظے سے کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ اس مقابلے میں پہلے سبھی ایشیائی کھیلوں کی نسبت زیادہ ممالک نے شرکت کی اور زیادہ قسم کے مقابلے ہوئے۔ ۳۳ ممالک کے کھلاڑیوں نے ۲۱ مقابلوں میں زور آزمائی کی۔ سب سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ صرف ۲ مہینوں میں اتنے بڑے کھیل مقابلوں کے لیے بہترین کھیل مراکز اور دیگر انتظامات شاندار طریقے سے مکمل کر لیے گئے۔ "بھارت یہ کر سکتا ہے"! اس زمانے میں کھیل کے مداحوں اور حامیوں کا یہی نعرہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی جادوئی لمحہ چھیڑ گیا ہے۔ کم از کم آدھے درجن جدید ترین اسپورٹس اسٹیڈیم ریکارڈ وقت میں تعمیر کیے گئے جن میں جواہر لال نہرو اسٹیڈیم اور اندرا پرستھ انڈور اسٹیڈیم بھی شامل ہے، جو ایشیا کا سب سے بڑا اور دنیا میں تیسرا سب سے بڑا انڈور اسٹیڈیم ہے۔

ہندوستان کی راجدھانی میں ایشیائی کھیلوں کے بہترین طریقے سے انجام پا جانے کے بعد وزیر اعظم اندرا گاندھی کو عالمی اسپورٹس کا شانِ امتیاز ـــ اولمپک گولڈ آرڈر ـــ ملا تھا۔ یہ اعزاز محترمہ اندرا گاندھی کو ملک میں کھیلوں کو فروغ دینے کے سلسلے میں ان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں دیا گیا تھا۔

نئی دہلی ایشیائی کھیلوں میں ہندوستان کو مجموعی طور پر ۵۷ تمغے حاصل ہوئے جو ایشیا کی دو بہترین اسپورٹس قوموں سے تھوڑا کم ہی تھا۔

پچھلی دہائی میں پی ٹی اوشا ایشیا کی تیز ترین خاتون دوڑاک کے روپ میں ابھری۔ ۱۹۸۴ء کے لاس اینجلز اولمپک کھیلوں میں صرف بال بھر کے فرق سے وہ کانسے کے تمغے سے محروم رہ گئیں۔ لیکن اس کے بعد چند برسوں تک انھوں نے بین اقوامی سطح پر سو میٹر، ۲۰۰ میٹر اور ۴ میٹر رکاوٹ دوڑ میں متعدد خطاب جیتے۔ انھوں نے ۱۹۸۵ء میں جکارتہ میں ہوئے ایشیائی ٹریک اینڈ فیلڈ مقابلوں میں سونے کے ۵ اور کانسے کا ایک تمغہ جیتا۔ پھر ۱۹۸۴ء کے سیول ایشیائی کھیلوں میں سونے کے چار اور چاندی کا ایک تمغہ جیتا۔ شائنی ابراہیم (اب شائنی ولسن) دوسری خاتون کھلاڑی ہیں جنھوں نے ہندوستان کا نام روشن کیا ہے۔

۱۹۸۶ء سیول ایشیائی کھیلوں کے بعد ہندوستانی اتھلیٹوں نے بین اقوامی سطح پر کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا ہے سوائے اس کے کہ چند ایک نے ایشیائی ٹریک اینڈ فیلڈ مقابلوں میں تمغے جیتے۔

ہندوستانی ہاکی کا سنہری دور آزادی کے بعد تین اولمپک کھیلوں تک باقی رہا — ہندوستان نے ۱۹۴۸ء میں لندن میں ہاکی کا اپنا خطاب برقرار رکھا۔ اس کے بعد ہیلسنکی (۱۹۵۲ء) اور ملبورن (۱۹۵۶ء) اولمپک ہاکی کا اعزاز بھارت ہی کے قبضے میں رہا۔ ۱۹۶ء میں روم اولمپک میں پاکستان نے ہندوستان کو فائنل میں ایک گول سے ہرا کر ہندوستان کے ۳۲ سالہ ریکارڈ کو دھچکا پہنچایا۔ اس اثنا میں دیگر قوموں نے اس کھیل میں دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ لیکن ہندوستان کو ۱۹۶۴ء میں ٹوکیو اولمپکس میں ہاکی کا خطاب پھر حاصل کر لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے بعد پھر یہ خطاب ہندوستان سے چھن گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۸ء کے ماسکو اولمپک میں ہندوستان نے ایک بار پھر یہ اعزاز حاصل کیا۔ اس کے بعد سے اب تک بہتیری کوششوں کے باوجود ہندوستانی ہاکی اپنے ماضی کی گرد کو نہیں پہنچ پائی ہے۔

بیڈمنٹن میں ابتدا ہندوستان کی کارکردگی کافی اچھی رہی ہے۔ تب اس کے پاس دیویندر موہن اور امرت دیون جیسے بین اقوامی درجے کے کھلاڑی تھے۔ بعد میں چھٹی دہائی تک نندو ناٹیکر، ڈی این سیٹھ اور سریش گوئل جیسے کھلاڑیوں نے بین اقوامی سطح پر ہندوستان کا پرچم بلند رکھا۔ ناٹیکر کبھی دنیا کے چوتھے نمبر کے کھلاڑی تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۶ء میں سیلانگر انٹرنیشنل ٹورنامنٹ جیتا تھا۔ اس کے بعد بھی ناٹیکر نے کئی خطاب جیتے۔ دنیش کھنہ نے بھی بین اقوامی بیڈمنٹن مقابلوں میں بھارت کا نام روشن کیا ہے۔ لیکن آٹھویں دہائی کے آخر میں ابھرنے والے کھلاڑی پرکاش پڈوکون نے صحیح معنوں میں ہندوستان کا نام اونچا کیا ہے۔ وہ اپنے وقت کے بہترین کھلاڑیوں کے ہم پلہ تھے اور انھیں بجا طور پر دنیا کے بہترین کھلاڑیوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ انھوں نے کئی اعلا درجے کے کھلاڑیوں کو شکست دے کر بین اقوامی بیڈمنٹن میں اپنی جگہ بنائی۔ ۱۹۷۸ء کے دولت مشترکہ کھیلوں میں انگلینڈ کے ڈیرک ٹیلبوٹ کو ہرا کر پہلا بڑا خطاب جیتا۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۷۹ میں سوینڈ پری اور فراسٹ ہینسن جیسے کھلاڑیوں کو شکست دے کر لندن میں ماسٹرز ٹورنامنٹ جیتا۔ اس کے بعد انھوں نے ڈینش اور سویڈن اوپن جیتے۔ اس طرح یوروپ کے سبھی خطاب حاصل کیے۔ اس کے بعد آل انگلینڈ چیمپئن شپ کی باری آتی ہے۔ اس بار پرکاش نے دو بار کے چیمپئن انڈونیشیائی کھلاڑی لیم سوئی کنگ کو ۱۵-۳، ۱۵-۱ سے ہرا کر خطاب جیتا۔ یہ خطاب جیتنے والے وہ پہلے ہندوستانی کھلاڑی ہیں۔ بعد میں کئی ذہنی اور جسمانی الجھنوں کے باعث وہ اپنا وقار قائم نہ رکھ سکے۔ لیکن اب وہ ہمارے نئے ابھرنے والے کھلاڑیوں کو اپنے تجربوں سے فیضیاب کرنے کے لیے انھیں تربیتیں دے رہے ہیں۔

آج ٹینس میں بھارت کو ایک باعزت مقام حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈیوس کپ چیمپئن شپ میں ہندوستان کی کارکردگی خاصی حوصلہ افزا رہی ہے۔ برسوں تک ایشیائی

ٹینس میں ہندوستان سرفہرست رہا ہے۔ متعدد کھلاڑیوں نے ملک کا وقار بڑھایا ہے۔ راماناتھن کرشنن، وجے امرت راج اور رمیش کرشنن نئے کھلاڑیوں کے لیے منارۂ نور ہیں۔ اب یہ بارِگراں لینڈر پیس کے کاندھوں پر ہے جنھوں نے ڈیوس کپ مقابلوں میں دنیا کے کئی اعلا کھلاڑیوں کو شکست دی ہے۔ پیس نے اپنی آمد کا اعلان ۱۹۹۰ء میں ومبلڈن جونیئر خطاب جیت کر کیا تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۵۴ء میں راماناتھن کرشنن نے ومبلڈن جونیئر خطاب جیتا تھا۔ انھوں نے تین بار ایشین چیمپین شپ جیتی اور دوبار ومبلڈن کے مردوں کے مقابلے میں سیمی فائنل تک پہنچے۔ راماناتھن کرشنن کے بعد وجے امرت راج کا زمانہ آتا ہے جنھوں نے دنیا کے سبھی بڑے ٹینس کھلاڑیوں کو ایک نہ ایک بار ہرایا ہے وہ بھی ۱۹۷۳ء میں ومبلڈن کے سیمی فائنل تک پہنچے۔ وجے امرت راج کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کا نام لیور، بورگ اور کونر جیسے کھلاڑیوں کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ یہ تینوں اے۔ بی۔ سی (یعنی امرت راج، بورگ اور کانرز) کے نام سے جانے جاتے تھے۔

اپنے باپ کی طرح رمیش کرشنن نے بھی جونیئر ومبلڈن خطاب جیتا اور برسوں تک بین اقوامی ٹینس میں ہندوستان کا پرچم بلند رکھا۔ انھوں نے بھی مختلف مقابلوں میں کئی بڑے کھلاڑیوں کو شکست دی ہے۔ وہ ۱۹۸۶ء میں ومبلڈن مقابلوں کے کوارٹر فائنل تک پہنچے۔ ۱۹۸ء کی دہائی میں ہندوستانی ڈیوس کپ ٹیم کے وہ روحِ رواں ہوتے تھے۔ اس سے پہلے ۶ کی دہائی میں راماناتھن کرشنن، پریم جیت لال اور جے دیپ مکھرجی کے ساتھ مل کر ڈیوس کپ میں ہندوستان کی نمائندگی کرتے تھے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء کے دوران ہندوستان انٹرزونل مقابلوں کے فائنل میں چار بار پہنچا۔ اسی اثنا میں وجے اور آنند امرت راج دونوں بھائیوں نے ہندوستان کا پرچم سنبھالا۔ ۱۹۷۴ء میں ہندوستان ڈیوس کپ کے فائنل میں پہنچا لیکن ساؤتھ افریقہ کی نسل پرست پالیسی کے خلاف احتجاج کے طور پر اس نے اس کے ساتھ فائنل میں کھیلنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد رمیش کرشنن اور لینڈر پیس کی جوڑی نے سوئٹزرلینڈ، فرانس اور کئی اور ممالک کو، جن کے پاس اعلا پائے کے کھلاڑی تھے، شکست دی ہے۔ رمیش کے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جیت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ لینڈر پیس اپنے جونیئر ساتھیوں گورو ناٹیکر اور مہیش بھوپتی کے ساتھ مل کر ہندوستانی ٹینس کو بلند مقام تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ایشیائی ٹینس میں ہندوستان کی برتری مسلّم ہے۔ ۱۹۹۴ء کے ہیروشیما ایشیائی کھیلوں میں بھارت نے ٹیم خطاب بھی جیتا اور ڈبلس خطاب بھی۔ اور اب ۱۹۹۶ء کے اٹلانٹا اولمپک میں لینڈر پیس نے کانسے کا تمغہ حاصل کر دکھایا۔

کرکٹ میں سنیل گواسکر اور کپل دیو بالترتیب بیٹنگ اور بولنگ میں شاندار انفرادی کارکردگی کے باعث اپنے وقت کے سب سے ممتاز کھلاڑیوں میں رہے ہیں۔ گواسکر نے دنیا میں سب سے زیادہ ۳۴ ٹیسٹ سنچریاں بنائی ہیں۔ آل راؤنڈر کپل دیو کو ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ یعنی ۴۳۴ وکٹیں حاصل کرنے کا افتخار حاصل ہے۔ ادھر کے برسوں میں ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے موجودہ کپتان سچن تندولکر کا شمار دنیا کے بہترین بلّے بازوں میں ہوتا ہے۔

کرکٹ کے کھیل نے ہندوستان میں بتدریج ترقی کی ہے۔ ۱۹۷۱ء ایک اہم موڑ ہے جب ہندوستانی ٹیم نے ویسٹ انڈیز اور انگلینڈ کو ان ہی کی سرزمینوں پر شکست دی تھی۔ اس کے بعد سے ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے کرکٹ کھیلنے والے سبھی ممالک کو شکست دی ہے — ہندوستانی کرکٹ کا سنہرا دور وہ تھا جب اب سے دو دہائی قبل اسپنروں کی ایک زبردست فوج، پرسنا، وینکٹ راگھون، چندر شیکھر اور بشن سنگھ بیدی کے روپ میں ہندوستانی ٹیم میں شامل تھی۔ ان چاروں اسپنروں نے اپنی جادوئی گیند بازی سے ساری دنیا کے بلّے بازوں کو پریشان اور کرکٹ شائقین کو مسحور کر رکھا تھا۔ ان سے پہلے وینو منکڈ کرکٹ کے میدان میں ایک بہترین آل راؤنڈر بن کر چمکے۔ ہندوستان کا سب سے مایہ ناز لمحہ وہ تھا جب اس نے ۱۹۸۳ء میں لارڈز کے میدان میں ناقابلِ تسخیر ویسٹ انڈیز کی ٹیم کو شکست دے کر عالمی کپ جیتا۔ اس جیت نے ہندوستانی کرکٹ کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ اس کے بعد ہندوستان نے روتھمین کپ، ایشیا کپ اور شارجہ کپ وغیرہ جیت کر یہ ثابت کر دیا کہ یک روزہ کرکٹ میں ہندوستان کا عالمی چیمپین ہو جانا کوئی محض اتفاق نہیں تھا۔ ۱۹۸۵ء میں آسٹریلیا میں ہوئی عالمی کرکٹ چیمپین شپ میں ہندوستانی ٹیم کی شاندار کارکردگی رہی اور ہندوستانی کھلاڑی روی شاستری کو "چیمپین آف چیمپینز" قرار دیا گیا۔ یک روزہ مقابلوں میں ہندوستان کی شاندار کارکردگی ابھی حال ہی میں ایک بار پھر دیکھنے میں آئی جب ٹائٹن ٹرائنگولر سیریز میں اس نے ٹورنامنٹ کی مضبوط ترین اور سخاطور پر دعوے دار ٹیم ساؤتھ افریقہ کو فائنل میں پراعتماد طریقے سے شکست دی۔

بلیئرڈز میں بھی ہندوستان کو کئی قابلِ ذکر کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ ہندوستانی کھلاڑیوں نے کئی بار عالمی خطاب جیتے ہیں۔ ولسن جونز پہلے ہندوستانی کھلاڑی تھے جنھوں نے کلکتہ میں ۱۹۵۳ء میں بلیئرڈز کا عالمی خطاب جیتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۶۴ء میں آکلینڈ میں یہ خطاب دوبارہ جیتا۔ مائیکل فریرا نے ۱۹۷۷ء میں ہندوستان کے لیے عالمی خطاب جیتا۔ وہ چار بار بلیئرڈز کے عالمی چیمپین رہ چکے ہیں۔ گیت سیٹھی نے ۱۹۸۵ء میں نئی دہلی میں ہوئی عالمی چیمپین شپ میں مائیکل فریرا کو ہرا کر اعزاز حاصل کیا۔ سیٹھی ہندوستان کے پہلے پیشہ ور کھلاڑی ہیں جس نے ۱۹۹۱ء میں عالمی چیمپین کا خطاب حاصل کیا۔ انھوں نے چار سال میں تین بار یہ خطاب جیتا۔

اسنوکر میں اوم اگروال نے ۱۹۸۵ء میں غیر پیشہ ور کھلاڑیوں کا عالمی خطاب جیتا۔

پچھلے چند برسوں میں دو ہندوستانی خواتین ملیشوری اور کنجورانی نے ویٹ لفٹنگ مقابلوں میں

باقی صفحہ ۳۴ پر

یوجنا، نئی دہلی

رابندر سیٹھ

ہندوستان میں سیاحت

مصنف کے مطابق سیاحت کا سلسلہ ہندوستان میں ازخود ہی شروع ہوا ہے۔ بین اقوامی اداروں نے پیشین گوئی کی ہے کہ ایشیا۔ بحر الکاہل کا علاقہ مستقبل میں سیاحت کا اہم مرکز بنے گا اور ہندوستان اس کا ایک حصہ ہے۔

ہندوستان میں ایک عام اقتصادی سرگرمی اور سماجی امر کے طور پر سیاحت کا سلسلہ آزادی کے بعد شروع ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جو دنیا بھر میں پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ سیاحت سب سے بڑی برآمداتی صنعت بن گیا ہے۔ اسی وجہ سے عالمی بینک اور سیاحت کی عالمی تنظیم نے اسے تسلیم کیا ہے۔ ہندوستان اس صنعت کا بڑا حصہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے، اگرچہ مختلف وجوہات کی بنا پر اس کو عالمی ٹریفک کے صرف ۰٫۴ فی صد حصے پر ہی قناعت کرنی پڑی ہے۔ لیکن کوششوں کا سلسلہ جاری رہے گا اور ہندوستان کے ایک پسندیدہ مقام بننے کے امکانات پہلے سے کہیں زیادہ روشن ہیں۔ گزشتہ سال لگ بھگ ۲۱٫۲ لاکھ سیاح غیر ممالک سے ہندوستان آئے تھے۔

سیاحت کو غیر ملکی زر مبادلہ کے سب سے بڑے واحد ذریعے کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ سیاحت کے مختلف پہلو ہونے کی وجہ سے اس سے کسی دوسری صنعت کے مقابلے میں روزگار کے بہت زیادہ اور کم اخراجاتی مواقع پیدا ہوتے ہیں، جو کہ ایک قومی ترجیح کا معاملہ ہے۔ اقتصادی اصلاحات، جن کی وجہ سے غیر ملکی سرمایہ کاری کے مواقع میں اضافہ ہوا ہے، نیز بین اقوامی طیاروں کے ذریعہ اڑانوں سمیت سیاحوں کے لیے سہولیات میں اضافہ، سہولت بہم پہنچانے والے عناصر ہیں۔ ابھی تک سیاحت کے شعبے کی توسیع کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء تک یہ سرکاری امداد والی ایک منظم سرگرمی نہیں تھی۔ کچھ غیر ملکی لوگ چھٹیوں میں تاج محل دیکھنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ کوئی پیکیج نہیں تھے، نہ ہی بڑے بڑے ہوٹل تھے اور نہ کوئی اندرون ملک ہوائی نظام تھا، جس کے ذریعے سیاح سیاحتی مقام تک جاسکیں۔ ان دنوں سفر کرنے والے لوگ یا تو سرکاری کام کاج سے سفر کرتے تھے یا پھر کسی یونیورسٹی میں تحقیق کرنے کے سلسلے میں سفر کرتے تھے۔ اندرون ملک سفر لازمی طور سے زیارت کے لیے یا کسی گھریلو وجہ سے کیا جاتا تھا۔ چھٹیوں کے دنوں میں سیر تفریح کرنے کا خیال آتا ہی نہیں تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی طرح کی سہولیات موجود تھیں۔

نوآبادیاتی حکومت کے دوران انتظامیہ کے لوگ اس وقت کے تقریباً تمام صوبوں میں موسم گرما کے زمانے میں ہل اسٹیشنوں (پہاڑی مقامات) پر چلے جاتے تھے۔ اس وقت بھی نقل و حرکت بیشتر عملے کے لیے واضح وجوہات کی بنا پر ان علاقوں کے لیے لازمی طور سے محدود ہوتی تھی۔ بڑے ہوٹلوں کے معاملے میں بھی، صرف بڑے شہروں میں اس طرح کی کچھ سہولیات موجود تھیں، جن سے زیادہ تر ہندوستان آنے والے انگریز یا جنگ کے زمانے میں متعلقہ فوجی افسران استفادہ کرتے تھے۔ آزادی کے فوراً بعد صورت حال میں کافی تبدیلی آگئی۔ یہ تبدیلی لانے میں جواہر لال نہرو کی بصارت اور بین اقوامی مفاہمت کے سلسلے میں ان کے عزم سے کافی مدد ملی۔ ان کا یہ مقولہ، جو اکثر نقل کیا جاتا ہے، کہ "ایک مہمان کا خیر مقدم کرو اور اسے ایک دوست بنا کر رخصت کرو" اس عزم کو اجاگر کرتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں سیاحت کا ایک شعبہ سب سے پہلے نقل و حمل کے محکمے میں قائم کیا گیا تھا۔

یہ ایک ایسے عمل کی شروعات تھی جو ۱۹۶۰ء کے دہے میں کابینہ وزیر کے چارج میں سیاحت کی ایک علیحدہ وزارت کی تشکیل کی شکل میں اپنے عروج پر پہنچا۔ پہلے کابینہ وزیر ڈاکٹر کرن سنگھ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ سیاحت یورپ اور شمالی امریکہ کی اہم ابتدائی منڈیوں میں ایک منظم صنعت کی شکل میں فروغ پا چکی

تھی اور ایئر انڈیا نے اپنی اڑانوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ سوماناتھ جیب، رمیش تھاپر اور ایم۔ ایس۔ او براے جیسے کچھ دور اندیش افراد نے سیاحت کے شعبے کی امکانی صلاحیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ جب قومی اقتصادی ترقی کے عناصر پر توجہ مرکوز کی گئی تو سیاحت کو بھی ایک اہم امکانی ذریعے کے طور پر تسلیم کیا گیا لیکن زراعت، صحت اور تعلیم جیسے دیگر اہم قومی شعبوں کے پیش نظر سیاحت کو زیادہ ترجیح نہیں مل سکی۔ جہاں چہ کچھ نئے صنعت کاروں نے خود ہی سفر سے متعلق خدمات شروع کیں اور سیاحت کے بنیادی ڈھانچے کی ضرورت کو اجاگر کیا۔

اس طرح سیاحت کے فروغ کے لیے ایک اہم ایجنٹ کا کردار ادا کرنے کی غرض سے ہندوستان میں سیاحت کے فروغ سے متعلق کارپوریشن یعنی انڈین ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن (آئی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی) وجود میں آئی۔ بین الاقوامی معیارات کے مطابق ہندوستان کا پہلا ہوٹل یعنی اشوکا ہوٹل جواہر لال نہرو کی ایما پر ہی قائم کیا گیا جنھوں نے اس کے نقشے سے لے کر چالو ہونے تک کے تمام مرحلوں میں ذاتی دلچسپی لی تھی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، ہندوستان میں ایسے ہوٹل موجود تھے، جو مغرب پر مبنی تھے، لیکن اشوکا ہوٹل ایسا پہلا ہوٹل تھا جو نہ صرف فن تعمیر اور سجاوٹ کے لحاظ سے بلکہ اپنی ثقافت، تفریح، پکوان اور دیگر سہولیات کے اعتبار سے بھی مکمل طور سے ہندوستان پر مبنی ہے۔

اس زمانے تک سیاحت متعدد جہتیں اختیار کر چکی تھی، جن میں سے ایک جہت اجتماعی سیاحت تھی۔ یہ دیکھنے میں آیا تھا کہ بین الاقوامی کانفرنسیں نیز کارپوریٹ اور تجارتی اداروں کے کنونشن بھی بڑی تعداد میں مندوبین کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں، جو اپنے کاروباری اوقات کے علاوہ، اپنا وقت سیر و تفریح میں گزارتے ہیں۔ درحقیقت بنیادی طور سے یونیسکو کے لیے، جس کی میٹنگ پہلی بار پیرس سے باہر منعقد ہو رہی تھی، وگیان بھون اور اشوکا ہوٹل کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔ دونوں ہی عمارتیں سیاحت کی امکانی صلاحیت کے بارے میں جواہر لال نہرو کے تصور کے سلسلے عظیم قومی اثاثہ اور یادگار ثابت ہوئی ہیں۔ اشوکا ہوٹل کو روایت ساز ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ اس نے نہ صرف ہندوستانیت کا سلسلہ شروع کیا، بلکہ یہ ہندوستان کی ثقافتی نشاۃ ثانیہ کا ایک ذریعہ بھی بنا۔ آج آرٹ کی دنیا کی بیشتر مشہور شخصیتیں اشوکا ہوٹل کے کنونشن ہال میں اپنی فنی تخلیقات پیش کر چکی ہیں، جہاں مہمان ہندوستان کے فنون لطیفہ سے مستفید ہوئے ہیں۔ اشوکا ہوٹل کے رہنمائی کرنے پر، دوسرے فوراً نقش قدم پر چلے ہیں۔ اشوکا ہوٹل کی کامیابی سے نہ صرف بڑے شہروں میں بلکہ دوسرے مقامات پر بھی اس طرح کے معیاری ہوٹلوں میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔

حکومت کی اسپانسر شدہ انڈیا ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن ایسے شعبوں میں داخل ہوئی جہاں نجی شعبہ جانے سے جھجک رہا تھا۔ تقریباً تمام سیاحتی مقامات پر آئی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی نے ہوٹل، موٹل اور تفریح گاہیں قائم کیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس نے ایک علاحدہ ڈویژن بھی قائم کیا تاکہ عالمی معیار کا ایسا ترقیاتی مواد تیار کیا جائے، جس کی ابھی تک کمی تھی۔ آج یہ بات عجیب سی لگتی ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے آزاد ہونے تک، تاج محل اور دیگر عظیم یادگاروں کے بارے میں معلومات ان کتابوں میں ملتی تھیں، جو غیر ممالک میں لکھی گئی تھیں اور شائع ہوئی تھیں۔ اب پہلی بار ایک سیاح کو کسی مقام کے بارے میں تاریخ اور دستیاب سہولیات سمیت تمام متعلقہ معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں۔

دریں اثنا، عالمی سیاحت کو زبردست فروغ حاصل ہوتا رہا تھا اور ہندوستانی صورت حال پر اس کا لازمی طور سے اثر پڑا تھا۔ ٹکٹ، رہائش اور دیگر سہولیات کا انتظام کرنے کے سلسلے میں نئے نئے ادارے شروع کیے گئے تھے۔ اس کام میں بنیادی طور سے معروف ٹریول ایجنسیوں اور خاص طور سے غیر ملکی سیاحوں کے لیے کام کرنے والے ٹور آپریٹروں نے زوردار کام شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے کچھ نے ہندوستان کی تشہیر کے لیے غیر ممالک میں اپنے دفتر قائم کیے تھے نیز وہ ایئر انڈیا اور غیر ممالک میں محکمہ سیاحت کے دفاتر کے ساتھ اشتراک عمل میں کام کر رہے تھے۔ یہ دفاتر امریکہ، برطانیہ، یوروپ اور جاپان جیسی ابتدائی منڈیوں میں نیز بعد میں مغربی ایشیا میں واقع تھے۔

ہندوستان نے بھی بین اقوامی سیاحتی پروگراموں مثلاً پیسیفک ایشیا ٹریول ایسوسی ایشن، امریکن سوسائٹی آف ٹریول ایجنٹس کی سالانہ میٹنگ، برلن اور تجارتی منڈیوں میں بین اقوامی سیاحتی تبادلے کے پروگراموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر بین اقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرنے والے ہندوستانی وفود نے ان اداروں کو ہندوستان میں اپنی آئندہ میٹنگیں منعقد کرنے کے لیے مدعو کیا اور اس طرح ہندوستان کی سیاحت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

۱۹۷۰ء کے دہے تک ثقافتی سیاحت پر زور دیا گیا تھا۔ اس میں اب بھی کافی کمی پائی جاتی تھی۔ چناں چہ سیاحت کو گوناگوں بنا کر سیاحوں کی ترجیحات کے سلسلے میں عالمی رجحانات کا خیال رکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ عمر، منڈی مختلف مقامات پر دستیاب معاشی مواقع کے مطابق ترجیحات مختلف تھیں۔ چناں چہ ساحل سمندر پر چھٹیاں گزارنے، جنگلی جانور دیکھنے، مہماتی سفر اور خصوصی دلچسپی والے ٹور جیسی باعث دلچسپی چیزوں کو فروغ دیا گیا۔ شدید سردی والے شمالی یوروپ سے دھوپ اور ریت کی تلاش میں بڑی تعداد میں چھٹیاں گزارنے والے لوگ ادھر ادھر جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ میڈیٹیرینین ساحل یا شمالی افریقہ سے دور ساحلوں پر یا کیریبین جایا کرتے ہیں۔ پہلی بار کووَلم، گوا، ماملاپورم اور پوری میں

ہندوستانی ساحلوں کی تشہیر کی گئی۔ یہی سہولیات شروع ہونے اور ان کی تشہیر کیے جانے تک ان مقامات پر صرف غیر ممالک سے سیاح آتے تھے۔ ساحلی سیاحت کے فروغ کا ایک اقدام یہ ہے کہ درجنوں چارٹرڈ اڑانیں گوا اور کووَلم (کیرالہ) کے لیے ہر ہفتے چلائی جا رہی ہیں۔ کیرالہ میں بیکل، گجرات میں دیو اور احمد منڈوی کے مقام پر نئے ساحلی علاقوں نیز اڑیسہ میں کونارک۔ پوری کے علاقے میں کچھ تفریح گاہوں کو فروغ دیا گیا۔

مزید مہمات کے سلسلے میں، پہاڑوں پر پیدل چڑھنے، دریا میں بیڑے چلانے، ڈونگے چلانے، چھوٹی کشتیاں چلانے، برف پر پھسلنے وغیرہ جیسی جوکھم بھری تفریحات کو مقبول عام بنایا جا رہا ہے اور ان کی طرف ہر سال زیادہ سے زیادہ سیاح راغب ہو رہے ہیں۔ صرف اسی حصے پر توجہ دیا سوری تجارت کے سلسلے میں کافی منافع بخش کاروبار ثابت ہو رہا ہے۔ پہاڑوں اور ساحلوں کو بہتر بنانے کے سلسلے میں، ماحول کے تحفظ پر از سر نو زور دیا جا رہا ہے۔ ہمارا ملک قدرتی آثاروں سے اتنا زیادہ مالا مال ہے کہ یہ قدرت سے لگاؤ رکھنے والے لاکھوں لوگوں کا خیر مقدم کر سکتا ہے۔ ماحولیاتی سیاحت، جس کے خواہش مند قدرت سے لگاؤ رکھنے والے لوگ ہیں، ایک اور اہم شعبہ ہے، جس کو پہاڑوں، جزیروں اور دیگر دور دراز علاقوں میں تیزی سے فروغ دیا جا رہا ہے۔

اقتصادی اصلاحات کی روشنی میں منڈی کے ایک اور جزو کو فروغ دیا گیا ہے اور وہ ہے کارپوریٹ ٹریول۔ ہندوستانی معیشت میں فراخدلانہ نظریہ اپنائے جانے کی وجہ سے دستیاب سرمایہ کاری اور دیگر کاروبار کے مواقع کے پیش نظر صنعتی طور سے ترقی یافتہ ممالک کے ہزاروں سیاح ہندوستان آ رہے ہیں۔ کاروباری سفر میں زبردست اضافے کا قابل دید ثبوت بڑے شہروں یعنی دہلی، ممبئی، کلکتہ، چنئی اور بنگلور کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں قیام کرنے والے لوگوں کی زیادہ شرح ہے۔ ان مقامات پر کمروں کی شدید قلت رہی ہے۔ آزادی کے بعد سے گزشتہ پچاس برسوں میں وہاں رہائشی شعبے میں ۵ گنا اضافہ ہوا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ملک میں صرف چار سال میں ۱۲۵۰۰۰ کمروں کا نشانہ حاصل کرنے میں ۷۵۰۰۰ کمروں کی کمی ہے، جب کہ اس وقت تک بین الاقوامی سیاحوں کی تعداد ۵۰ لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ یہ تعداد آزادی کے وقت سرکاری طور سے درج شدہ ۱۷۰۰۰ سے کہیں زیادہ ہے۔

سیاحوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا ہے، جب کہ اندرونِ ملک سفر کے معاملے میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ڈسپوزایبل آمدنی والے لوگوں کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے رہن سہن کے انداز میں تبدیلی، چھٹیوں کے دنوں میں سیر و تفریح زندگی کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ اندرونِ ملک سیاح کے لیے مقامات اب زیارتی مرکزوں اور پہاڑی علاقوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ وہ اپنے کنبوں کے ساتھ چھٹیوں میں دور دراز مقامات مثلاً انڈمان اور لکش دیپ تک بھی جاتے ہیں۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نیز سرکاری شعبے کے اداروں کے لاکھوں ملازمین کے لیے لیو ٹریول الاؤنس کی ترغیبات کی وجہ سے تفریح پر مبنی سفر کے لیے ترغیبات میں اضافہ ہوا ہے۔

لوگوں کی اس وسیع پیمانے پر آمد و رفت کی ضروریات پوری کرنے کے لیے سیاحت کی مرکزی وزارت اور ریاستی حکومتوں نے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ سیاحت ایک ریاستی معاملہ ہے۔ نئے صنعت کاروں کے ذریعے سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے کم سے کم ۲۲ ریاستوں نے سیاحت کو ایک صنعت قرار دیا ہے، جس کے تحت سیاحت کو فروغ دینے والے لوگوں کو ٹیکس میں مختلف رعایات اور دیگر ترغیبات دی گئی ہیں۔ یہ ریاستیں ہیں۔ آندھرا پردیش، آسام، بہار، ہریانہ، ہماچل پردیش، جموں و کشمیر، کیرالہ، مدھیہ پردیش، تامل ناڈو، تریپورہ، کرناٹک، اتر پردیش، پانڈیچری، مہاراشٹر، میزورم، اروناچل پردیش، انڈمان و نکوبار جزائر، راجستھان، لکشدیپ، اڑیسہ، چنڈی گڑھ اور مغربی بنگال۔ دیگر ریاستیں بھی متعدد ترغیبات کی پیش کش کر رہی ہیں۔ نئے نئے مقامات کو فروغ دیا جا رہا ہے، جیسا کہ ہماچل پردیش میں، تاکہ شملہ اور منالی جیسے مقامات سے دباؤ کو کم کیا جائے۔ نئی مصنوعات کو بھی فروغ دیا جا رہا ہے مثلاً کیرالہ کی بنار کھاڑی (ساکن پانی) میں ہاؤس بوٹ، جو ملکی اور غیر ملکی دونوں سیاحوں میں کافی مقبول ہوئی ہیں۔

سیاحت کے لیے ایک قومی منصوبۂ عمل ۱۹۹۲ء میں پیش کیا گیا تھا تاکہ بنیادی ڈھانچے کے پروجیکٹوں کو فروغ دیا جائے۔ اس پر عمل درآمد کرتے ہوئے حکمت عملی سے متعلق ایک دستاویز بھی تیار کی گئی ہے، جس میں رسائی سڑکوں سے لے کر ہوائی اڈوں کے فروغ اور بہتری تک بنیادی ڈھانچے کے مختلف حصوں میں سرمایہ کاری کرنے پر زور دیا گیا۔ نجی شعبہ اس عمل میں اہم کردار ادا کرے گا جس پر اندازے کے مطابق ۳۱ کروڑ روپے کے اخراجات آئیں گے۔ بین الاقوامی سیاحت کو فروغ دینے کے لیے مارکیٹنگ کی نئی حکمت عملیوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور انھیں لاگو کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ مزید بین الاقوامی ایئر لائنوں کو ہندوستان سے ہو کر اپنی اڑانیں چلانے کی اجازت دی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر ایئر لائنوں کو ہندوستانی منڈی میں اپنا مستقبل روشن نظر آتا ہے اور اسی وجہ سے وہ زیادہ سے زیادہ اڑانوں اور جہاز اتارنے کے حقوق چاہتی ہیں۔

اس طرح ہندوستان میں سیاحت کی توقعات ارحود ہوئی ہے۔ بین الاقوامی اداروں نے پیش گوئی کی ہے کہ ایشیا۔ بحر الکاہل کا علاقہ مستقبل میں سیاحت کا اہم مرکز رہے گا اور ہندوستان اس کا ایک حصہ ہے۔ اس نے نئے نئے چیلنج اور مواقع پیش کیے ہیں۔ اقتصادی نرمی کا جو سلسلہ جاری

باقی صفحہ 16 پر

ہندوستانی ہوابازی۔ روشن امکانات

ہندوستان میں ہوابازی کی شروعات مشہور صنعت کار جناب جے آر ڈی ٹاٹا نے پہلا طیارہ اڑا کر کی۔ اس کے بعد سے اب تک ہندوستانی ہوابازی نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ گرچہ اس عرصے میں یہ بلند و پست ہر دو مقامات سے گزری۔

بیسویں صدی کے اختتام میں اب ہندوستانی ہوابازی اس منزل پر ہے کہ اسے ۴۰۔۳۰ قسم کے جدید ترین طیارے استعمال میں لانا چاہیے لیکن اسے ابھی ان کمیوں کا بھی سامنا ہے جس کے نتیجے میں سعودی ہوائی جہاز اور قزاقستان کے طیارے کا حادثہ ہوا۔ اس حادثے کے بعد یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں شہری ہوابازی کو زیادہ مستحکم روپ دینے کے لیے کن کن اقدامات کی ضرورت ہے۔

ہوائی سفر ہمارے عہد میں ہوئی ٹکنالوجیکل ترقیوں کا ایک اہم نمونہ ہے۔ سفری افادیت کے علاوہ اقتصادی ترقی میں بھی اس کا بہت اہم رول ہے۔

ہمارا ملک اس معنوں میں خوش نصیب ہے کہ یہاں طیارہ سازی سے متعلق سرگرمیاں ۴۰ کی دہائی میں ہی شروع ہو گئی تھیں جب ہندوستان ایئر کرافٹ لمیٹڈ بنگلور میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کمپنی کو اب ہندوستان ایروناٹکس لمیٹڈ کہتے ہیں۔ اس عرصے میں طیاروں اور ہوابازی کی تحقیق و ترقی کے لیے متعدد سائنسی ادارے قائم کیے گئے۔ جنہوں نے تکنیک و تربیت دونوں زمروں میں اہم خدمات انجام دیے ہیں۔

اندرونِ ملک مضبوط بنیادوں کی بدولت ملک کی ہوائی سفر کی صنعت نے کافی حد تک اقتصادی سرگرمیوں کو تیز کیا ہے۔ اب جب کہ ہماری معیشت کے دروازے کھل رہے ہیں۔ ملکی صنعت اپنے فروغ کی خاطر نئی شراکت داریوں کے لیے کوشاں ہے۔ یہ بات فضائی سفر پر بھی صادق آتی ہے۔ تمام صلاحیتوں اور تجربوں کے باوجود عالمی فضائی صنعت میں ہندوستان کا حصہ فقط ۱۱ فی صد ہے۔

روشن امکانات

یہ دیکھتے ہوئے کہ ہمارے پاس تکنیکی طور پر تربیت یافتہ افراد کی اتنی بڑی تعداد ہے، اجرتیں مقابلتاً سستی ہیں اور راستے جامع کار جا رہے ہیں؛ ہمیں مغرب کے بازار سے اور زیادہ منافع کمانے کی پوزیشن میں ہونا چاہیے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے سماجی تکنیکی و تربیتی ادارے اور پبلک و پرائیویٹ دونوں سیکٹر کے کارخانے مل جل کر کام کریں تاکہ نہ صرف ملک کی ضروریات پوری ہوں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ہندوستانی ہوابازی کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔

اندازہ کیا جا رہا ہے کہ ۲۰۱۲ء تک فضائی سفر کرنے والے مسافروں کی تعداد دوگنی سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ سب سے زیادہ اضافہ ایشیا بحرالکاہل خطے میں ہوگا۔ اسی عرصے میں ہوائی اڈوں کو بنیادی ڈھانچہ فراہم کرنے میں ۳۵ ارب امریکی ڈالر درکار ہوں گے۔ فضائی ٹریفک مینجمنٹ، ترسیل، ملکی معلومات، حفاظتی انتظامات اور ہوائی اڈوں کے دیگر نظاموں کے لیے بھی بہت بڑی سرمایہ کاری کی ضرورت ہوگی۔

اگلے دس پندرہ برسوں میں اندرونِ ملک ضروریات کے لیے متعدد نئے طیاروں کی ضرورت ہوگی۔ ہوائی اڈوں کے نظام کو اور بہتر بنانا ہوگا۔ اور بڑے پیمانے پر تربیت یافتہ افراد تیار کرنے ہوں گے۔

ہم نے مختلف شعبوں میں بھی قابلِ ذکر ترقی کی ہے مثال کے طور پر جنگی طیارے، خلا میں لے جانے والی گاڑی اور سیارچوں کے سانچے میں داغنے والے طیاروں، ہلکے لڑاکا طیاروں اور جدید ترین ہلکے ہیلی کوپٹر کو بنانے اور ڈیزائن کرنے کے سلسلے میں نئی معلومات اور تکنیکیں حاصل کی گئی ہیں اس سب کو استعمال کر کے ہم بین الاقوامی بازار کے معیار کی مصنوعات اور خدمات فراہم کر سکتے ہیں۔

غیر ملکی دوستوں سے ہمارا کہنا ہے کہ بڑھتی ہوئی ہندوستانی معیشت اور ہوابازی سیکٹر میں باہمی تعاون کے لیے مفید مواقع دستیاب ہیں۔ ہندوستان باہمی مفاد کی شراکت داریوں کا خیر مقدم کرے گا جس میں ہم اپنی معلومات، صلاحیت اور وسائل سے ایک دوسرے کو فیض پہنچا سکیں۔ یہ باہمی تعاون اس طرح ہو سکتا ہے کہ طرفین اپنے اپنے وسائل طے کر لیں اور اسی اعتبار سے تجارتی منافع تقسیم کریں۔

۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران اندرونِ ملک فضائی نقل و حمل میں قابلِ تعریف اضافہ ہوا ہے۔ انڈین ایئر لائنز اور نجی ہوا باز کمپنیوں نے مجموعی

طور پر سو کروڑ ۲۸ لاکھ روپے کی تجارت کی۔ سات پرائیویٹ کمپنیوں کو ہوائی جہاز چلانے کی اجازت دی گئی اور ۱۸ کمپنیوں کے پاس ہوائی ٹیکسی چلانے کا پرمٹ ہے۔

بہتر کارکردگی

اس عرصے میں ان سات کمپنیوں کی طرف سے ۸۰،۹۶۷ پروازیں ہوئیں جن میں ۴۴،۴۱،۴۹ مسافروں نے سفر کیا۔ ہوائی ٹیکسی والوں کی ۸۸۰۰ سے زیادہ پروازیں ہوئیں جن میں ایک لاکھ ۴ ہزار سے زیادہ افراد نے سفر کیا۔ اسی عرصے میں سیاحتی چارٹر طیاروں کی ۸۴۴ پروازوں سے ۸۴۸۱۱ سیاح آئے۔

ایئر انڈیا نے ۹۶۔۱۹۹۵ء کے دوران چار نئے مقامات تک اپنی پروازوں کا آغاز کیا۔ یہ ہیں — مانچسٹر، ایمسٹرڈم، اینٹیبے (ENTEBBE) اور تل ابیب۔ ایئر انڈیا نے اس مدت میں ۱۸۵۱۲ حاجیوں کو لانے لے جانے کے لیے ۱۸۲ پروازیں کیں جو ملک کے مختلف حصوں سے چلیں۔

انڈین ایئر لائنز کا منافع ۹۶۔۱۹۹۵ء میں بڑھ کر ۱۴۰ کروڑ ۳۵ لاکھ روپے ہوگیا جو ۹۵۔۱۹۹۴ء میں صرف ۳۶ کروڑ ۴۲ لاکھ تھا۔

پون ہنس لیمیٹڈ نے پچھلے سال کے دوران ۱۰ کروڑ ۵۸ لاکھ روپے کا خالص منافع کمایا۔ کمپنی نے دسمبر میں ملک کی شمال مشرقی ریاست اروناچل پردیش کے لیے ہیلی کوپٹر سروس شروع کیا۔ اس طرح ریاست سے ہوائی رابطہ جوڑنے کا ایک دیرینہ مطالبہ پورا ہوا۔ اس نے اپنے توسیعی پروگرام کے تحت دو BELL ہیلی کوپٹر کی خریداری کا سودا بھی کیا ہے۔

الائنس ایئر (ایئر لائن الائیڈ سروسز لیمیٹڈ) پوری طرح انڈین ایئر لائنز کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔ اس نے ۱۵ اپریل ۱۹۹۶ء کو انڈین ایئر لائنز سے بوئنگ ۷۳۷ لے کر اپنی پروازیں شروع کیں۔ ۲۵ اپریل کو انڈین ایئر لائنز نے اس کمپنی کو ایک اور طیارہ دیا۔ اس کے بعد جولائی اور اگست میں اسے دو طیارے اور ملے۔ اس کا عملہ ۱۸۳ افراد پر منحصر ہے۔ یہ سبھی انڈین ایئر لائنز کے سینئر ملازمین تھے۔ انڈین ایئر لائنز کی پروازوں کی پابندیٔ اوقات کی صورت حال بھی بہتر ہوئی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں ۸۷ فی صد مسافر ہوا کرتے تھے جو ۱۹۹۵ء میں بڑھ کر ۳۰۲/۲۷ فی صد ہوگئے۔

مارکیٹنگ کے لیے خصوصی کوششیں کی گئیں جن میں خصوصی کاؤنٹر، خودکار کمپیوٹر، اطلاعاتی نظام، مسافروں کو پروازوں میں تاخیر یا رد کی اطلاع دینے والے دستے، تمام ۳۲۰۔A پروازوں میں جے کلاس کا آغاز اور بہتر خدمات اور حفاظتی اقدامات وغیرہ شامل ہیں۔ اس ایئر لائن نے اپنی بین اقوامی پروازوں میں کوالالمپور اور یانگون (رنگون) کو بھی منزل بنایا۔ سال کے اختتام میں انڈین ایئر لائنز کو مضبوط کی ہوا باز کمپنیوں کے مقابلے میں بہترین ایئر لائن کمپنی کا ایوارڈ دیا گیا۔

پچھلے برس استحکام کا عمل تیز رہا۔ اندرون ملک ہوائی خدمات میں پرائیویٹ ایئر لائنز کمپنیوں نے اپنی خاطر خواہ موجودگی کا ثبوت دیا۔

پرائیویٹ کمپنیوں کو ۲۴ طیاروں کی منظوری دی گئی جن میں ۱۳ بوئنگ طیارے شامل ہیں۔ انڈین ایئر لائنز اور پرائیویٹ کمپنیوں کے جہازوں میں کل ملاکر روزانہ ۵ ہزار افراد کے سفر کرنے کی گنجائش ہے۔ ان میں سے انڈین ایئر لائنز کی صلاحیت ۲۸ ہزار افراد کی اور باقی پرائیویٹ کمپنیوں کی ہے۔ اوسطاً روزانہ ۳۶ ہزار لوگوں نے سفر کیا۔ مسافروں کی ۳۴ فی صد نے پرائیویٹ کمپنیوں کے جہازوں سے سفر کیا۔ اندرون ملک ہوائی مسافروں کی تعداد ۱۹۹۱ء میں ۵۷ لاکھ تھی جو ۱۹۹۵ء میں بڑھ کر ایک کروڑ ۲ لاکھ ہوگئی۔

ایئر انڈیا

جہاں تک بین اقوامی ہوا باز کمپنیوں کا تعلق ہے بین اقوامی مسافروں کو ۲۰ لاکھ سے زیادہ اضافی سیٹیں مہیا کی گئیں۔ ایئر انڈیا نے ۴ ہوائی کمپنیوں کے ساتھ مخصوص شراکت داری کے سمجھوتے کیے۔

ایئر انڈیا اس عرصے میں کئی ادوار سے گزری، کئی منزلیں سر کیں۔ اس ہوا باز کمپنی کا زیادہ زور روٹوں کی توسیع، نئی منزلوں کے آغاز، بہتر خدمات، وسائل کے زیادہ بہتر استعمال اور نئی ساکھ بنانے پر رہا۔ تقریباً ایک دہائی کے وقفے کے بعد ایئر انڈیا نے چار نئے B طیارے ۴۰۰۔۷۴۷ خریدے۔ دو اور طیاروں کا آرڈر بھی دیا گیا تھا جو اس سال نومبر میں حاصل ہوئے۔

پرتھ، جوہانسبرگ، ڈربن، مانچسٹر، ایمسٹرڈم، میڈرڈ، اینٹیبے اور تل ابیب وغیرہ منزلوں پر قیام کا آغاز ہوا۔ مدراس، تری وندرم اور بنگلور سے کچھ اور بین اقوامی پروازیں بھی شروع کی گئیں۔

زیادہ سے زیادہ پروازوں کے لیے طیاروں کی تعداد بڑھانے کے پروگرام پر غور کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس سال اس کے منافع میں کمی ہوئی ہے کیوں کہ نئے طیاروں کی خرید کے بعد ان کے سود اور DEPRECIATION کا بوجھ بڑھا ہے اور طیاروں کو چلانے کے اخراجات میں بھی اضافہ ہوا ہے تاہم اس سب کے باوجود یہ کمپنی ترقی کر رہی ہے۔

بین اقوامی ہوائی کمپنیوں کے درمیان اپنا کھویا ہوا اعتبار حاصل کرنے کے لیے اس نے جس جہد و جذبے کے ساتھ کام کیا ہے ان سے بھی اس کمپنی کو آگے بڑھنے میں مدد ملی ہے۔ مسافروں کی تعداد ۵۹ فی صد سے بڑھ کر ۶۸ فی صد ہوگئی۔

ایئر انڈیا نے اپنی خدمات کو بہتر بنانے کے لیے کئی اقدامات کیے۔ ان میں خلیجی ممالک کو جانے آنے والی پروازوں میں ملیالم زبان کا استعمال، لمبے سفر کے دوران جہاز پر عمدہ خدمات کی فراہمی اور دہلی و ممبئی ہوائی اڈوں پر خصوصی کاؤنٹر اور آمد و رفت کی دیگر سہولیات شامل ہیں۔ بڑے مراکز مثلاً ہانگ کانگ، نیویارک، بینکاک اور لندن وغیرہ میں اعلا درجے کے لاؤنج بنائے گئے ہیں۔

ایئر انڈیا نے اسکنڈے نیوین ایئر سروسز، یونائیٹڈ ایئر لائنز، فن ایئر اور کویت ایئر ویز کے ساتھ کوڈ شیئر کرنے کا بھی انتظام کیا ہے۔ اس نے گلف ایئر، ملائیشین ایئر ویز اور ماریشس کے ساتھ مشترکہ کاروبار کے معاہدے بھی کیے ہیں۔

درمیانہ سائز کے لمبے سفر کرنے والے طیارے حاصل کرنے کا عمل بھی تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ اس سال کا اختتام اس امید کے ساتھ ہوتا ہے کہ یہ پرانے طیاروں کو رد کر کے نئے طیارے شامل کرے گی اور اپنی خدمات میں توسیع کرے گی۔

ایئرپورٹس اتھارٹی آف انڈیا

اس عرصے کی ایک اور اہم بات یہ رہی کہ نیشنل ایئرپورٹس اتھارٹی آف انڈیا اور انٹرنیشنل ایئرپورٹس اتھارٹی آف انڈیا کو ضم کر کے ایک نیا ادارہ ایئرپورٹس اتھارٹی آف انڈیا کے نام سے بنایا گیا۔ ۱۹۹۵ء میں ٹرمنل بلڈنگوں کی تعمیر، فضائی معائنے میں مدد دینے والے آلات کی فراہمی اور ترِوِندرم اور حیدرآباد میں بہترین قسم کے راڈار کی تنصیب جیسے اہم کام انجام پائے۔ شمال مشرقی خطہ، جموں و کشمیر، اتر پردیش کے چھوٹے ہوائی اڈوں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ جے پور، لکھنؤ، بڑودہ اور کالی کٹ ہوائی اڈوں پر نئی ٹرمنل بلڈنگیں تعمیر کرائی گئیں۔ کئی ہوائی اڈوں پر۔ مثلاً اگرتلہ، بیلگام، جورہاٹ، تیزپور، تروپتی، جموں، سارس، منگلور اور کالی کٹ میں اطلاعات و ترسیل کی اعلا سہولیات فراہم کی گئیں۔ ہوائی اڈوں کے بنیادی ڈھانچہ کو بہتر بنانے کے لیے اس برس ۴۴۰ کروڑ روپے خرچ کرنے کا منصوبہ ہے۔

لکھنؤ اور جے پور میں ماڈل ہوائی اڈوں کا افتتاح ہو چکا ہے اور اس طرح کے دیگر دس ہوائی اڈوں کی تعمیر کا کام بھی تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ جموں و کشمیر میں کارگل، میگھالیہ میں تارو، میزورم میں لینگ پوئی اور لکش دیپ میں اندورکھ کے مقامات پر نئے ہوائی اڈے بنانے کا کام بھی شروع کیا جا چکا ہے۔

کالی کٹ ہوائی اڈے کی تعمیر کی تجویز کو کابینہ کی طرف سے ملی منظوری کے بعد اب ہوائی اڈوں کی تعمیر میں نجی سرمایہ کاری کے دروازے کھل گئے ہیں۔ کرناٹک سرکار اور ایک پرائیویٹ کمپنی کے درمیان بنگلور میں ایک بین اقوامی ہوائی اڈے کی تعمیر کے لیے پچھلے دسمبر میں سمجھوتے کی ایک یادداشت پر دستخط ہوئے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۹۷ء کے آخر تک سبھی ۱۲ ماڈل ہوائی اڈے بن جائیں گے۔ جو اپنے مسافروں کو بہتر اور محفوظ خدمات فراہم کر سکیں گے۔

پون ہنس لمیٹڈ نے دس سال پورے کر لیے ہیں۔ اس کمپنی نے ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۴۰ کروڑ روپے کا منافع کمایا۔ کمپنی نے ۱۹۹۵ء میں اروناچل میں آٹھ مسافروں والے ہیلی کوپٹر کی خدمات شروع کی۔ اس برس یہ ۸ کی بجائے ۲۵ مسافر والے ہیلی کوپٹر کی سروس شروع کرے گی۔

یہ کمپنی ONGC اور دیگر گاہکوں کی مانگ کے پیش نظر اپنی خدمات میں توسیع کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ یہ کسٹمر ڈپارٹمنٹ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے BFI L 2061 4 قسم کے دو ہیلی کوپٹر اور ONGC کی مانگ پوری کرنے کے لیے MI-172 ساخت کے دو ہیلی کوپٹر خرید رہی ہے۔ پون ہنس کمپنی مارچ ۱۹۹۷ء تک اپنے کل ہیلی کوپٹروں میں دس اور ہیلی کوپٹر کے اضافے کا ارادہ رکھتی ہے۔

بقیہ کھیل کود۔ آزادی کے بعد کا منظر نامہ

ایشیائی اور عالمی خطابات جیتے ہیں۔ ملیشوری نے ۱۹۹۴ء کے استنبول عالمی چیمپئن شپ اور ۱۹۹۵ء کے پوسان ایشیائی چیمپئن شپ دونوں میں سونے کے تمغے جیتے۔ پوسان مقابلوں میں ہندوستانی خواتین ٹیم اس براعظم کی سب سے اچھی قرار پائی۔

نشانہ بازی کے مقابلوں میں ہندوستانی کھلاڑیوں نے اچھی کارکردگی دکھائی ہے، اگرچہ انھیں محدود کامیابیاں ہی حاصل ہوئیں۔ کرنی سنگھ پہلے ہندوستانی کھلاڑی تھے جنھوں نے ۱۹۶۲ء کے عالمی چیمپئن شپ میں چاندی کا تمغہ جیتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۷۴ء میں تہران ایشیائی کھیلوں میں چاندی اور کانسے کے تمغے جیتے۔ رندھیر سنگھ نے ۱۹۷۸ء کے ایشیائی کھیلوں میں سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ مانشیر سنگھ نے ۱۹۹۳ء میں منیلا میں ایشیائی ٹریپ شوٹنگ مقابلوں میں چاندی کا تمغہ جیتا۔ اس کے بعد کم عمر کھلاڑی جسپال رانا سامنے آئے۔ انھوں نے ۱۹۹۴ء میں جونیئر عالمی شوٹنگ چیمپئن شپ میں سونے کا تمغہ جیتا۔ اسی سال ہیروشیما میں سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں منیلا میں ہوئے ایشیائی شوٹنگ مقابلوں میں بھی انھوں نے سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ ان مقابلوں میں ہندوستان کو چاندی کا ایک اور کانسے کے دو تمغے اور ملے۔

مہم جوئی کے میدان میں دو ہندوستانیوں نے اپنا نام گنیز بک میں درج کرایا۔ مہر سین نے ۱۹۶۶ء میں ۳۰ سال کی عمر میں ساتوں سمندر تیر کر دنیا کے سب سے لمبی دوری کے تیراک ہونے کا اعزاز و افتخار حاصل کیا۔ ان کے ریکارڈ کو ایک بارہ سالہ لڑکے گوڑ ایشورن نے توڑا جب اس نے انگلش چینل پار کیا۔ ایک سال کے بعد اس نے دوسرے سبھی سمندروں کو تیر کر پار کرنے کا مایہ ناز کارنامہ انجام دیا۔

شطرنج میں گرینڈ ماسٹر وشوناتھن آنند نے، جنھیں شطرنج کے ماہرین "اسپیڈ گاڈ" کہتے ہیں، سب سے اعلا سطح کے بین اقوامی شطرنج مقابلوں میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے پہلے گرینڈ ماسٹر ہیں بلکہ انھوں نے نوجوانوں میں شطرنج کے لیے ایک نئی لہر پھونک دی ہے۔ اس کا پہلا نتیجہ یوں سامنے آیا ہے کہ آندھرا پردیش کے ہی ہری کرشنا نے دس سال سے کم عمر کے کھلاڑیوں کا عالمی خطاب مینورکا، اسپین میں جیتا۔

تاہم یہاں یہ بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ کئی کھیلوں میں ہماری کارکردگی ناقص رہی ہے مثلاً فٹبال، باسکٹ بال، اسکواش وغیرہ میں۔

ہندوستان میں کھیل کود کے شعبے میں ترقی مناسب بنیادی ڈھانچہ کی فراہمی کے بعد ہی شروع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۸۲ء میں نئی دہلی ایشیائی کھیلوں کے زمانے میں کھیلوں کی ترقی و فروغ کے لیے کام کیے گئے۔ آزاد ہندوستان میں کھیل کود کا شعبہ ابھی اپنے پر کھول رہا ہے اور بین اقوامی مقابلوں میں ایک شاندار مقام حاصل کرنے کے لیے انتھک مسلسل کوششیں جاری ہیں۔ ●

سمیر پال

سماجی بہبود

آئینی منشور کا مقصد عوام کے لیے آمدنی، رتبہ اور مواقع کی عدم مساوات کو کم سے کم کرنا ہے۔ لیکن کمزور طبقوں کی اقتصادی اور سماجی ترقی کے پروگراموں کے لیے وسائل کی فراہمی اور مساوی انصاف کے حصول کی غرض سے کی جانے والی کوششوں کو مستحکم بنانے، ان کی بہت زیادہ نگرانی کرنے اور وقتاً فوقتاً ان کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

ماضی کے مصلحین اور سیاسی طور سے سرگرم افراد کے ذریعے سماجی عمل کے مشنوں میں سماج کے سب سے زیادہ نادار اور کمزور طبقوں کی دیکھ بھال کا معاملہ آزادی کے بعد ہندوستان کے منصوبہ بند ترقی کے پروگرام کے تحت اب زیادہ تر ریاستوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اولین رضاکار اداروں مثلاً برہمو سماج، آریہ سماج اور رام کرشن مشن نے ستی کی روک تھام اور بیواؤں کی شادی، بیمار اور معمر افراد کی دیکھ بھال، نادار لوگوں کے لیے تعلیم اور گھر جیسے سماجی امور کے متعلق مہمیں چلائی تھیں۔ ان اداروں کے کردار کو بہبود کی مملکتی ذمہ داریوں کے طور پر اپنایا گیا ہے نیز آئینی دفعات اور قانونی اقدامات کے ذریعے اس کے دائرے کی توسیع کی گئی ہے۔

ان خدمات کا مقصد معذوروں، بوڑھوں، منشیات کے عادی لوگوں، عورتوں، بچوں، اقلیتوں، پسماندہ اور کمزور طبقوں، درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کو روک تھام، ترقی اور بازآبادکاری کے سلسلے میں امداد مہیا کرنا ہے۔ حال میں نوجوانوں کو ایک جزو کے طور پر اجاگر کیا جا رہا ہے، بنیادی طور پر ان مسائل کے سلسلے میں جن سے نوجوان دوچار ہیں۔

سماجی دفاع کے اقدامات کا زیادہ تر مقصد بوڑھوں کی بہبود، منشیات اور شراب کی روک تھام کے کام میں رضاکار تنظیموں کو شامل کرنا ہے۔ پنچایتی راج کے اداروں کو فیصلہ کرنے والے مقامی لوگوں نے اکثر کسوں کی حقیقی ضرورتوں کا خیال رکھنے کے بجائے حمایت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا۔

اسکیمیں جو اوپر سے نیچے کی سمت چلائی جاتی ہیں، وہ اکثر بنیادی حقائق سے دور ہوتی ہیں۔ وسائل کا ایک بڑا حصہ انتظامی مشنری قائم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جب کہ صرف ۳۵ فی صد حصہ اصل عمل درآمد پر خرچ ہوتا ہے۔ مجوزہ پروگراموں کا مقصد صحیح اور اچھا ہوتا ہے لیکن دفترشاہی ان کے عمل درآمد میں بے رغبتی، سست روی پیدا کر دیتی ہے۔ مقررہ نشانے حاصل نہیں ہو پاتے ہیں۔

آئینی منشور کا مقصد عوام کے لیے آمدنی، رتبہ اور مواقع کی عدم مساوات کو کم سے کم کرنا ہے۔ لیکن کمزور طبقوں کی اقتصادی اور سماجی ترقی کے پروگراموں کے سلسلے میں مدد کرنے کے لیے وسائل کی فراہمی اور مساوی انصاف کے حصول کی غرض سے کی جانے والی کوششوں کو مستحکم بنانے، ان کی بہت زیادہ نگرانی کرنے اور وقتاً فوقتاً ان کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

نادار لوگوں کے زمرے میں بیشتر منتخبہ لوگوں کے لیے ترقی کے اشاریے اب بھی خواندگی، شیر خوار بچوں کی شرح اموات اور متوقع عمر کے سلسلے میں بہت ہی قابلِ قبول سطح پر ہیں۔

خواندگی کے پروگرام

خواندگی کے متعلق اقدامات کا تعلق گاؤں اور بستی کی سطح پر رسمی اسکولوں سے جوڑنا ہوگا۔ ابھی بہت سے اسکولوں میں صرف ایک ٹیچر ہے، بہت سے اسکولوں میں بلیک بورڈ تک دستیاب نہیں ہے۔ دیگر تدریسی ساز و سامان کا تو ذکر ہی کیا۔ ٹیچر صاحبان اکثر آتے ہی نہیں کیوں کہ وہ بہت دور رہتے ہیں۔

نئی تعلیمی پالیسی کے "آپریشن بلیک بورڈ"

کا اثر جس کا مقصد تعلیمی طور پر پسماندہ ریاستوں میں تدریسی ساز و سامان فراہم کرنا تھا، یکساں نہیں ہوا ہے۔ عوام کے تئیں کوئی جواب دہی نہ تھی، جو کہ منتظمین کا مقصد تھا۔

ابتدائی تعلیم کے ضلعی پروجیکٹ کے لیے حقیقی غریبوں کی مدد کرنے کے سلسلے میں عالمی بینک اور یورپی برادری سے "سیفٹی نیٹ" پروگرام کے ایک حصے کے طور پر امداد ملی ہے۔ اس پروجیکٹ کے تحت اب زیادہ مصمم عمل درآمد پر زور دیا جا رہا ہے، عطیہ دینے والی بین الاقوامی ایجنسیوں کو لاطینی امریکہ، افریقہ اور فلپینز میں تعلیم اور صحت پر کم سرکاری اخراجات کی، ان کی شرط کے سبب ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ابتدائی تعلیم کا ضلعی پروگرام مقامی سماجی شعبے پر زرم کاری کے اثرات کو متوازن کرنے کے لیے شروع کیا گیا تھا۔

یہ دو فی صد سود کی شرح پر آسان قرض کی فراہمی کے لیے سات سال کا پروجیکٹ ہے، لیکن اس بات پر ابھی تک کوئی دھیان نہیں دیا گیا ہے کہ سات سال کے بعد کیا ہوگا۔ رقم کی اس فراہمی سے ڈھانچہ تیار کیا جا رہا ہے اور مشاورتی خدمات فراہم کی جا رہی ہیں۔ حقیقی تعلیمی کام اور تدریسی ساز و سامان کی فراہمی کے سلسلے میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے ان کی مالی طور پر مدد نہیں ہو رہی ہے۔

اصل ضرورت ہے ایسے اساتذہ کی جو چھوٹے قصبوں اور گاؤوں میں جا کر اسکولوں کے اساتذہ کے ساتھ موقع پر اپنے تجربات کی بنیاد پر دیہاتی اور نیم دیہاتی علاقوں میں نصاب کو بہتر بنائیں، اسباق کو مزید معلوماتی بنائیں۔ اسکول کو مناسب کتابوں اور دیگر وسیلہ جاتی مواد سے مزین کریں۔ ان "مشیروں" کو اسکول کے تعلیمی عملے کے رویے کے مقابلے میں بہتر رویہ اختیار کرنا چاہیے اور مقامی حالات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنی چاہیے۔

کچھ ریاستوں میں جاگیردارانہ سرپرستی کی مثالیں سامنے آئی ہیں جیسے مدھیہ پردیش، جہاں پنچایت کے ممبر اکثر بااثر زمین دار ہیں، وہ اسکول کے اساتذہ کو کنٹرول کرتے ہیں، اپنے نمائندوں کو ۵۰۰ سے ۸۰۰ روپے ماہوار تنخواہ پر دس ماہ کے لیے مقرر کرتے ہیں۔ زیادہ تر یہ اساتذہ بلاک ہیڈ کوارٹر والے شہروں یا چھوٹے شہروں سے ہوتے ہیں۔ وہ ملازمت میں توسیع کی امید پر رہتے ہیں اور ان کی مدت ملازمت کی غیر یقینی طلبا کے لیے ان کی کوششوں میں جھلکتی ہے۔ پرائمری اسکولوں کے مستقل اساتذہ جن کو تین ہزار روپے ماہانہ ملتے ہیں، شہروں میں پڑھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بالغوں کی خواندگی کی تحریک میں اپنے ضلعوں کو سو یا ۹۰ فی صد خواندہ قرار دلانے کے لیے انتظامیہ کی کوششوں سے غیر ضروری جلد بازی کی جا رہی ہے۔ مکمل خواندگی کے ماڈل کو پانچ سال قبل کیرالہ شاستر ساہتیہ پریشد کی ارناکلم میں ایک ماڈل مہم کے طور پر زبردست کوششوں کے ذریعے کامیاب بنایا جا رہا ہے۔ عوامی جوش و خروش، سیاسی اور سماجی وجوہات کی بنا پر اس نے اچھا کام کیا ہے۔

مکمل خواندگی کے ماڈل میں مقامی لوگوں کی شرکت کی ضرورت ہے۔ ڈسٹرکٹ کلکٹر کی سربراہی میں بیرا رکین کے طور پر مفید افراد، غیر سرکاری تنظیم کے نمائندوں اور سماجی عمل کے ممد و مددگاروں کے ساتھ چلائے جا رہے ہیں۔ خود مختار مقامی سہولیاتی ڈھانچے نمائندگی پر مبنی سمجھے جاتے ہیں۔ فیصلہ کرنے والوں کی ایسی ہی تنظیم گاؤں اور بلاک کی سطح پر ضروری سمجھی جا رہی ہے جو رضاکارانہ عمل کا پیغام دینے والے ثقافتی گروپوں کے ساتھ عوامی بیداری کی مہموں کے سلسلے میں رہنمائی کرے۔ ناخواندہ بالغوں کے مسائل کے بارے میں بات چیت کا عمل جاری ہے۔ چوں کہ عورتیں زیادہ تر ناخواندہ ہیں اس لیے زیادہ تعداد میں وہ خواندگی کی کلاسوں میں آتی ہیں۔ مردوں کا رجحان ان کلاسوں سے دور رہنے کا ہے کیوں کہ ان کی انا انھیں اس بات کو تسلیم کرنے سے روکتی ہے کہ وہ ناخواندہ ہیں۔

خواندگی کی تحریک کے تنظیمی ڈھانچے کا استحکام اس کے سہولیاتی کردار میں مضمر ہے، جس میں تعلیم کے محکمے سے باہر کی شرکت اور ساجھے داری شامل ہے۔ ایک ماحول بنایا جاتا ہے۔ ابھی تک خواندگی کی تحریک عورتوں اور مردوں کے معاملے میں خاموش ہے۔ یہ ان عورتوں کو جو خود کو بہتر بنانے کے لیے سامنے آتی ہیں آگے بڑھانے سے قاصر ہے۔

خواندگی کے فروغ کے مراکز میں بڑی تعداد میں عورتوں کی موجودگی کے موقع سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے، کیوں کہ ایک پڑھی لکھی ماں اچھی ماں بننے اور بچوں کی دیکھ بھال کے معاملات کو روایتی طریقوں سے آگے بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے۔ انھیں اپنے بچوں کی غذائیت اور تعلیم کے لیے امدادی بنیاد کے طور پر رکھنا چاہیے۔ ایسی عورتوں کو جو بچہ پیدا کرنے کی عمر کو پار کر چکی ہوں اور گھر چلا رہی ہوں نیز خاندان کو چلانے اور سماجی ترقی کے عمل میں ان کی بات سنی جاتی ہو، علم سیکھنے کے سلسلے میں مدد دی جانی چاہیے، ان کی توقعات کو جو خواندگی کی تحریک سے وابستہ ہیں پورا کیا جانا چاہیے۔

لیکن یہ سہولیاتی ڈھانچے اپنے اندر دفتر شاہی رکھتے ہیں کیوں کہ ان میں ڈسٹرکٹ کلکٹر کی مرکزی حیثیت ہے۔ فعال کلکٹر کاموں کی تکمیل میں مدد دیتے ہیں۔ جب ایک مخصوص کلکٹر تبدیل ہو جاتا ہے تو تمام نظام ختم ہونے لگتا ہے۔ تنظیمی سسٹم میں محکموں کے نمائندے آ گئے ہیں۔ مقامی آبادی کے نمائندوں کو دفتری اہل کاروں کے ذریعے کنارے لگا دیا جاتا ہے۔

خواندگی پر گنتی سیکھنے، پڑھنے اور لکھنے کے لحاظ سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکمل خواندگی کا ماڈل ایک فریب نظر ہو گیا ہے، جب کہ ان کے مسائل کو وسیع تر انداز میں سمجھنے کی ضرورت ہے جس سے کہ ان میں اہم بیداری پیدا ہو سکے۔ جیسا کہ برازیل کے 'تعلیم بالغاں' کے ماہر 'پالو فریئرے' نے تیسری دنیا میں سیکھنے کے عمل کا تصور دیا ہے' زیادہ بڑے سماجی، سیاسی اور ثقافتی امور، روٹی اور روزی کے مسائل پر غور کیا جانا چاہیے۔

درحقیقت خواندگی کے بعد کی کوشش کے بارے میں بالکل نہیں سوچا گیا ہے حتیٰ کہ بنیادی خواندگی کا معاملہ، جو سکھائی جا رہی ہے، ناقص ہے۔ کیوں کہ دور دراز کے دیہاتی علاقوں میں نئے حاصل کردہ مواصلاتی ہنر کو استعمال کرنے کے مواقع

کم ہونے کی وجہ سے دوبارہ جہالت کے گڑھے میں گرنے کے کافی امکان رہ جاتے ہیں۔

ناخواندہ لوگوں کے لیے آگے بڑھنے کی ترغیب موجود ہے۔ خواندگی کی تحریک کو ابھی ان کے مفادات کی طرف توجہ دینی ہے کیوں کہ خواندگی کے بعد کے پروجیکٹ کی تنظیم کے سلسلے میں ٹامک ٹوئیاں جاری ہے۔

درمیان میں ہی تعلیم کا سلسلہ چھوڑ دینے والوں کے لیے غیر رسمی تعلیم پروجیکٹ ناکام ہو چکا ہے۔ کیوں کہ جس کم ترجیحی طریقے سے اس کا منصوبہ بنایا گیا تھا وہ خامیوں سے پُر تھا۔ جاری اسکولی نظام کی مدد سے اصلاح کی جانی ضروری ہے، یہ اس کے باہر دوسرے درجے کی تعلیمی کوششوں کے طور پر برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔

۱۹۸۰ء کے دہے کے اوائل میں جب سے یونیسیف نے پہل کی ہے، سماجی عمل کی توجہ حالیہ سالوں میں لڑکیوں کی طرف مرکوز ہو گئی ہے۔ اس پہل کے بعد لڑکیوں کا سال منایا گیا، ایک بچے پر مبنی کنبہ کی مہم، جس میں لڑکی کو اجاگر کیا گیا اور اس موضوع پر ڈاک ٹکٹ کے اجراء نے لڑکیوں کا کردار صرف ماں کی مددگار کے طور پر محدود کر دینے نیز تعلیم اور طبی سہولیات مہیا کرنے کے سلسلے میں انھیں کم ترجیح دینے کے رویے کے خلاف لوگوں کے ضمیر کو بیدار کیا ہے۔

آئی۔ سی۔ ڈی۔ ایس

بچوں کی ترقی کی مربوط خدمات (آئی۔سی۔ڈی۔ایس) جن کے تحت مزید غذائیت مہیا کرائی جا رہی ہے، بیماریوں سے محفوظ رکھا جا رہا ہے، صحتی دیکھ بھال کی جا رہی ہے، حوالہ جاتی خدمات مہیا کی جا رہی ہیں، اسکول سے قبل کی غیر رسمی تعلیم، نیز ماؤں کی صحت اور غذائیت کے بارے میں تعلیم دی جا رہی ہے، کامیابی کے ساتھ زیادہ تر ریاستوں میں مہیا کی جا رہی ہیں اور مثبت نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ چھ سال تک کی عمر کے بچے، حاملہ اور دودھ پلانے والی مائیں اور ۴۵ سال تک کی عمر کی عورتیں منتخبہ گروپ میں شامل ہیں۔

مزید غذائیت کے لیے یہ پروجیکٹس ۲۱/۶ ملین بچوں اور ماؤوں کو مستفید کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تین سال سے چھ سال تک کی عمر کے ۱۰/۱ ملین بچے اسکول سے قبل غذائی ترغیب حاصل کر رہے ہیں، جو خاص طور سے بالکل نچلی سطح کے آئی سی۔ ڈی۔ ایس یونٹ "آنگن واڑی" کے ذریعے مہیا کی جا رہی ہے، جو عام طور پر دیہی اور گندے علاقوں میں، جن کی آبادی ۱۰۰۰ ہے، قائم کیے گئے ہیں۔ یونیسیف ان کے لیے ماپ تول پیمانے اور چیپ مہیا کر رہا ہے جب کہ عالمی خوراک پروگرام اور کوآپریٹو فار امریکن ریلیف ایوری ویئر (CARE) مکئے اور سویابین کے آٹے سے مدد کر رہا ہے جسے آنگن واڑیوں میں تیار کیا جاتا ہے اور ان بچوں کو فراہم کیا جاتا ہے جو اسکول سے قبل کی کلاسوں اور کھیلنے کے لیے آتے ہیں۔ آنگن واڑی کارکن کا تعلق مقامی گاؤں سے ہونا چاہیے تاکہ وہ روزانہ آسکے اور علاقائی برادری سے واقف ہو۔ ان خدمات میں بیماریوں سے محفوظ رکھنا، وٹامن "اے" کا احتیاطی طور پر دیا جانا، کمئ خون کی روک تھام کے لیے آئرن اور فولک ایسڈ دیا جانا شامل ہے۔ بچوں میں سانس کے زبردست انفیکشن (ARI) اور اسہال کی روک تھام کی طرف کامیابی سے توجہ دی جا رہی ہے۔

آئی۔سی۔ڈی۔ایس کی زبردست کوششوں سے چھوٹے کنبے کے اصول کو مقبولیت عام حاصل ہوئی ہے۔ بچہ پیدا یا نہ پیدا کرنے کے سلسلے میں عورتوں کے اختیارات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ کم آمدنی والے چھوٹے پروجیکٹ جیسے کہ شہد کی مکھیاں پالنا، بچت اور قرض سے متعلق انجمنوں کی رکنیت کی حوصلہ افزائی، عورتوں میں اعتماد پیدا کرنے کے عمل کے ایک حصے کے طور پر کی جا رہی ہے۔

آئی۔سی۔ڈی۔ایس پروگرام کے اندر اب تک نظر انداز کی گئی تعلیم ادھوری چھوڑنے والی نوعمر لڑکیوں کو زیادہ ضرورت والی خدمات مہیا کرانے کی شروعات ہو چکی ہے۔ اس کا مقصد نوعمر لڑکیوں کو مستقبل کی ایک ذمہ دار ماں بنانا اور ان کو ضروری ہنر سکھانا ہے، جن میں کام کاج لائق تعلیم بھی شامل ہے، تاکہ وہ آئندہ ایک خوش حال سماج کی تشکیل کر سکیں۔

نوعمر لڑکیوں کے لیے پیکج میں آنگن واڑی میں صحت، غذائیت، اسکول سے قبل کی تعلیم اور بچوں کی دیکھ بھال کے شعبوں میں تربیت اور تجربہ دینا شامل ہیں۔ بال واڑی غذائی پروگرام ۳ سے ۵ سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے مزید غذائیت، تفریح کی سہولیات اور اسکول سے قبل کی غیر رسمی تعلیم دینے کے لیے ۷۱-۱۹۷۰ء سے جاری ہے۔ دیہی، قبائلی اور گندے علاقوں میں ۵۰۵۳ بال واڑیاں ہیں، جن سے تقریباً ۲٫۳۰ لاکھ بچے مستفید ہو رہے ہیں۔

عورتوں کو اختیارات

آزادی سے ہی ترقیاتی منصوبہ بندی کے عمل میں عورتوں کا معاملہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے دہے میں عورتوں کو اختیارات دینے کے معاملے میں اس وقت مزید تیزی آئی جب عورتوں کو ایک علاحدہ منتخبہ گروپ تسلیم کر لیا گیا اور چھٹے پنج سالہ منصوبہ میں ترقیاتی منصوبہ بندی کے عمل میں ان کو ان کا صحیح مقام دیا گیا۔ اس سے محض عورتوں کی بہبود کے نظریے سے ہٹ کر مسائل پر توجہ دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ تب سے عورتوں کو اختیارات دینے کا مقصد سماجی، اقتصادی، قانونی، سیاسی، غرض یہ کہ ان کی مجموعی حیثیت کو مرد کی حیثیت کے برابر لا کر عورتوں کو قومی ترقیاتی عمل کے دھارے میں شامل کرنا ہو گیا۔

۸۸-۱۹۸۷ء سے سماجی بہبود کا مرکزی بورڈ رضاکار تنظیموں کے تعاون سے دیہی اور غریب عورتوں کے ایک وقت میں ۲۵ کے گروپ کے لیے جانکاری پیدا کرنے والے کیمپ لگا رہا ہے۔ اس کا مقصد دیہی اور غریب عورتوں کی نشاندہی کرنا نیز خاندان اور سماج میں ان کی حیثیت کے بارے میں بیداری پیدا کرنا اور ان کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کام کرنے کے سلسلے میں متحرک کرنا ہے۔ عوامی صحت اور صفائی ستھرائی، تکنالوجی اور ماحولیات جیسے سماجی امور سے نپٹنے کے لیے ان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ جانکاری پیدا کرنے والے پروجیکٹ

باقی صفحہ ۲۵ پر

دیپاسری بنرجی

آبادی کے مسئلے سے نمٹنے کا عمل

بھارت کی آبادی خطرناک بم کی صورت اختیار کر چکی ہے جیسا کہ ملکی آبادی کا ۲/۱۲ فی صد کی در سے سالانہ اضافہ بغیر کسی رکاوٹ کے پیہم جاری ہے۔ مستقبل قریب میں دنیا میں بھارت سب سے بڑی آبادی پر مشتمل ملک ہوگا حتیٰ کہ اس کی آبادی چین سے بھی متجاوز ہو رہی ہے۔

اس سال کے شروع میں یونیسیف (UNICEF) کے ذریعہ مجریہ دستاویز " دی پروگریس آف دی انڈین اسٹیٹس" کہتی ہے کہ بھارت کی آبادی ۱۹۵۱ء میں ۳۶/۱ کروڑ اور ۱۹۹۴ء میں ۹ کروڑ تھی یعنی تین گنا اضافہ ہو چکا ہے اور "ایرو وِنگ دیمنز ہیلتھ ان انڈیا" نام کی ورلڈ بینک کی ایک دستاویز کے مطابق آبادی کو قابو کرنے کی واحد کلید تخلیقی صحت کو قرار دیا گیا ہے۔

بہتر رویّے کی ضرورت

پالیسی ساز آج بھی خاندانی بہبود سے متعلق پروگرام میں مصروف ہیں جو کہ گزشتہ پچاس سالوں کے دوران روز بروز بڑھتی ہوئی ملکی آبادی کو روکنے میں ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ برتھ کنٹرول (ہر عورت کا انسانی حق) اور پاپولیشن کنٹرول (خواتین کی قوت تخلیق کو معاشی اور سیاسی اسباب کی بنا پر کنٹرول کرنے کے لیے دوسرے لوگوں کی کوششیں) کے درمیان مایوس کن تذبذب کے باوجود پالیسی سازوں نے متعدد بار پروگرام کی تشکیل نو کی ہے لیکن ہر اختراع سے صرف نئی محض رٹی رٹائی باتوں کا اضافہ ہوا ہے اور خواتین کی تخلیقی آزادی کی راہ میں نیا خطرہ سامنے آیا۔

بھارت کے خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی نگاہ ہمیشہ ملک کی غریب اکثریت پر رہی ہے جو رشوت اور ظلم کا شکار رہے ہیں حتیٰ کہ مانع حمل کے استعمال سے عوام کو مغالطے میں رکھا جاتا رہا ہے لیکن رضاکارانہ طور پر چھوٹا کنبہ پسند کرنے کے لائق صورت حال پیدا کرنے سے متعلق بہتر رویّے موجود ہیں۔

صحیح سمت کی کمی

بھارت ان ممالک میں سے ایک ہے جس نے ۱۹۵۱ء میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کو پہلے پہل سرکاری طور پر اختیار کیا۔ بین اقوامی ایجنسیز جیسے یو۔ایس۔اے۔آئی۔ڈی (یونائیٹڈ اسٹیٹس ایجنسی فار انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ) کے تعاون سے اس کا آغاز کلینک پر مبنی طریقہ کار کے ساتھ پہلے پنج سالہ منصوبہ میں ہوا۔

امریکی ماہرین کے ذریعہ تشکیل شدہ "ایکسٹنشن ایجوکیشن" پروگرام کی منظوری کے ساتھ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں اسے وضع کر دیا گیا اس کا بنیادی تصور چھوٹے کنبے کی خوبیوں پر عوامی تعلیم کے ذریعے خاندانی منصوبہ بندی خدمات کے لیے طلب پیدا کرنا تھا۔

قبل اس کے کہ ایکسٹنشن ایجوکیشن پروگرام مقبول ہوا انٹرا یوٹیرین مانع حمل طریقہ کار کے حق میں اسے ترک کر دیا گیا۔ اس بار عالمی بینک اور اقوام متحدہ مشاورتی مشن کی جانب سے اس کی وکالت کی گئی تھی جب وہ بھی ناکام ثابت ہوا تو اس کی ناکامی کے اسباب پر نگاہ کرنے کے لیے فرصت کم نکالی گئی اور دوسرا طریقہ کار پیش کر دیا گیا۔

"واسیکٹومی" کیمپ طریقہ کار کو سب سے پہلے کیرل میں آزمایا گیا۔ بین اقوامی ایجنسیز نے اس کی کفالت کا ذمہ لیا تھا تاہم بالکل آغاز میں ہی وہ اختلافات کا شکار ہو گیا جیسا کہ ۱۹۷۲ء میں ٹیٹنس سے گیارہ "واسیکٹومائیزڈ" افراد ہلاک ہو گئے۔

ایمرجنسی کے دوران (۷۷-۱۹۷۵ء) نس بندی کیمپ اور زبردستی واسیکٹومیز کا سیلاب امنڈ پڑا جو کہ بہت برا ہوا اور خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کو اس سے اُبھرنا ابھی باقی ہے۔

خواتین پر خصوصی توجہ

خواتین کے بین اقوامی دہے (۸۵-۱۹۷۵ء) کے دوران خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کی توجہ خواتین پر مبذول ہو گئی۔ نس بندی (اسٹیریلائیزیشن) کو خاص طور سے خواتین پر آزمایا گیا۔ ۷۰ فی صد سے زائد خاندانی منصوبہ بندی کے طریقہ کار استعمال میں لائے گئے نیز عورتیں خطرناک انجکشنوں اور امپلانٹس جیسے ڈیپو پروویرا (DEPO PROVERA) اور نارپلانٹ (NORPLANT) کا بھی شکار ہو گئیں۔

تحریک نسواں کے ترجمان دعویٰ کرتے ہیں کہ ترقی اور آبادی کنٹرول پالیسیز کے لیے خواتین نے اپنے اجسام سے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ ان پالیسیوں کو تشکیل دینے والے وہ مرد ہیں جو

عورتوں کی زندگی کے بارے میں کم فہم ہیں مزید براں ان کا لحاظ وخیال اور بھی کم کرتے ہیں۔

بڑے دعوے

۱۹۶۱ء میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کی توسیع کے لیے جو مقاصد اور ترغیبات پیش کی گئیں ان سے بھی بدعنوانی اور ناقابل اعتبار ڈاٹا کو اور ہوا ملی۔ زیادہ تر ریاستوں نے کیے گئے اسٹیریلائزیشن کی تعداد کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا یا کنڈوم کی تقسیم کاری کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا جیسا کہ معروف ماہر آبادیات آشیش بوس کہتے ہیں۔

باوجودیکہ مانع حمل استعمال کرنے والے جوڑوں کی تعداد گزشتہ برسوں میں دوگنی ہو گئی لیکن پیدائش کی شرح اسی نقطے پر برقرار ہے۔ نیشنل فیملی ہیلتھ سروے (۹۳-۱۹۹۲ء) کے مطابق مانع حمل کے جدید ترین طریقۂ کار کو استعمال میں لانے والے ازدواج کا تناسب ۱۹۷۰ء میں دس فی صد سے بلند ہو کر تقریباً ۱۹۹۳ء میں ۴۰ فی صد ہو گیا۔

نئی شروعات

ایسے اعدادی اور ٹارگیٹ پر مبنی طریقۂ کار کو یکم اپریل ۱۹۹۶ء سے ترک کر دینے کے سرکار کے حالیہ فیصلے اور افزائش نسل کی نشوونما اور بچوں کی صحت وحفاظت کے لیے اٹھائے گئے اقدامات سے خاندانی منصوبہ بندی کی جدوجہد کو ملک میں نئی زندگی ملی ہے۔

اس لائحہ عمل کو مرکزی حسب حال طریقۂ کار کا خاکہ "بین اقوامی کانفرنس برائے آبادی وترقی" (آئی۔ سی۔ پی۔ ڈی) میں منظور کیا گیا جس کا انعقاد ۱۹۹۴ء میں قاہرہ میں کیا گیا۔ دلیل یہ تھی کہ ماں اور بچے کی صحت میں بہتری لانے سے بچوں کی بقا کے شرح میں سدھار ہوگا اور اس طرح پیدائش کے شرح میں کمی واقع ہوگی۔

نئی دہلی میں منعقد ایک پریس کانفرنس میں عالمی بینک دستاویز کو ریلیز کرتے ہوئے سرلا گوپالن سکریٹری ڈپارٹمنٹ آف ویمن اینڈ چائلڈ نے کہا کہ "آزاد نشانے کا رویہ عورتوں کی صحت کی طرف ہمارے تمام تر رجحانات میں ایک تبدیلی کی شروعات ہوگا۔"

مرکزی حکومت کے فی الحال "ریپروڈکٹیو اینڈ چائلڈ ہیلتھ کیئر" (آر سی۔ ایچ) اپروچ کو اپنا لیا ہے۔ حاملہ خواتین کے لیے بہتر غذا فراہم کرنے اور بچہ کی پیدائش کے موقع پر عمدہ سہولیات مہیا کرنے پر زور دیا جائے گا۔

سینئر ماہر صحت اور عالمی بینک رپورٹ کے مصنف انتے شنکر کہتے ہیں "دنیا میں مادری شرح اموات کی سب سے اونچی شرحوں میں سے ایک کا باعث بالغ بھارتی خواتین کے لیے مناسب غذا اور طبی سہولیات کی کمی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

سست رفتار ترقی

"چائلڈ سروائیول اینڈ سیف مدرہڈ پروگرام" کو ۱۹۹۲ء میں اپنایا گیا تاکہ ...... ارندہ پیدائشوں میں سے ۲۰۰ مادری اموات کو کم کیا جاسکے۔ حاملہ خواتین کو ٹیٹنس ٹاکسائیڈ ایمونائزیشن اور اینٹی ناٹل کیئر بہم پہنچایا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ تربیت یافتہ پرسونل کے ذریعہ ڈلیوری کی دیکھ بھال کی گئی ہے تاہم اس سمت میں انتہائی سست پیش رفت ہو سکی ہے۔

اتر پردیش، بہار، اڑیسہ، آسام اور راجستھان میں اینٹی ناٹل اور پوسٹ پارٹم کیئر خدمات کی توسیع بہت کم رہی ہے اور ان علاقوں میں مادری شرح اموات اور جان لیوا امراض کو کم کرنے اور چھوٹے بچوں کی صورت حال کو نشوونما دینے کے لیے جدوجہد کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے جیسا کہ عالمی بینک کی رپورٹ کہتی ہے۔

تربیت پر توجہ

حالاں کہ بھارتی سرکار کوٹہ اور اعداد سے متعلق اپنے جنون کو ترک کر رہی ہے تاہم دیہی کارکناں جیسے دائی اور آکسیلری نرس مڈوائیوز کی ٹریننگ انتہائی اہم ہو چکی ہے۔ نئے مبنی بر خود رویے میں ہیلتھ ورکر اپنے کام کے ذمہ داری از خود متعین کریں گے اور بنیادی مرکز صحت کے میڈیکل آفیسر کو اس سے آگاہ کریں گے اور وہ پھر متوقع ترقی کے اضلاع کو مطلع کریں گے۔

دشواریاں

خاندانی بہبود پروگرام میں فنڈ اور ترغیبات کی کمی مہلک بیماری کا اثر رکھتی ہے جیسا کہ مطالعات سے واضح ہوتا ہے کہ بہت کم تربیت یافتہ دائیاں ہیں جو گاؤں میں خدمات ادا کرنے کے لیے رضامند ہوں۔ پیدائش کرانے سے متعلق سامان کی سپلائی ایک دم ناموزوں ہے اور ملک کے بنیادی مراکز صحت میں عام طور سے ساز وسامان کی کمی پائی جاتی ہے۔

فی الوقت ہمارا ملک ۱۹ روپے فی آدمی کی شرح سے زچہ بچہ اور فیملی پلاننگ پر خرچ کرتا ہے جب کہ عالمی بینک صرف فیملی پلاننگ پر ۲۸ روپے خرچ کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ تخلیقی صحت کے لیے بھارت میں موجودہ عالمی بینک کا قرضہ ۴۵۰ ملین ڈالر سالانہ ہے۔

جے سی پنت سکریٹری ڈپارٹمنٹ آف فیملی ویلفیئر کے مطابق طبی سہولیات کو بہتر بنانے، اسٹاف ٹریننگ کو سدھارنے اور کمیونیٹیز اور این جی اوز کے ساتھ رشتے کو استوار کرنے کے لیے کوششیں برابر جاری ہے تاہم صرف نسائی تخفیف کاری سے بھارت کا فیملی ویلفیئر پروگرام اپنی ذمہ داری کم نہیں کر سکتا۔

ذہنی تبدیلی کی ضرورت

جیسا کہ کے۔ بی۔ سہائے پروفیسر آئی۔ آئی۔ ٹی۔ دہلی کہتے ہیں "یہی وقت ہے کہ مرد خاندانی منصوبہ بندی کے حقیقی عمل میں اپنی ذمہ داری ادا کریں" ہمارے خاندانی بہبود پروگرام میں خواتین پر مخصوص زور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ مردوں کی برتری پر مبنی سوسائٹی میں فیملی سائز پر تمام تر فیصلے عجیب وغریب انداز سے مردوں کے ذریعے ہی کیے گئے ہیں۔

شنکر کی سفارش کے مطابق "آئندہ رویوں اور طریقۂ کار کو تشکیل دینے میں اسکول پر مبنی اور ماس میڈیا پروگرام کے توسط سے

باقی کور ۳ پر

تیل اور قدرتی گیس کارپوریشن

مزید تیل کی تلاش میں

پٹرولیم ازجی کا ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے گھریلو، صنعتی اور زرعی صنعتوں، ٹرانسپورٹ اور کیمیاوی اشیاء کی صنعتوں کو چلانے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح سے پٹرولیم ترقی پذیر ملکوں کے لیے بقا کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ آج کے دور میں پٹرولیم کے بغیر زندگی کا تصور ہی دشوار ہے یہ ہر گھر کی ضرورت بن گیا ہے یہ روشنی کے لیے ایک ایندھن ہے، کھانا پکانے میں اس کی ضرورت ہے اور گھروں کو گرم رکھنے میں بھی اس کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد صنعتی اور زرعی انقلابات نے جنم لیا جن کی وجہ سے پٹرولیم کی مصنوعات کی مانگ بڑھی۔ پٹرولیم مصنوعات کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو اس طرح پورا کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ملک کے محدود زرمبادلہ کے ذخیروں پر زیادہ بوجھ نہ پڑے، لہٰذا خام تیل کی اندرون ملک پیداوار بڑھانے پر زور دیا گیا ہے۔

ہندوستان میں تیل کی کھوج میں تیل اور قدرتی گیس کمیشن نے نمایاں رول ادا کیا ہے یہ کمیشن یکم فروری ۱۹۹۴ء سے کارپوریشن بنا دیا گیا ہے۔ یہ ادارہ پبلک سیکٹر میں ہے۔ یہ ایک ایسا منفرد ادارہ ہے جو کئی طرح کی سرگرمیاں انجام دیتا ہے۔ اسے تیل کی کھوج اور برمائی نیز اس سے استفادہ کرنے وغیرہ کے کاموں کا بہ حیثیت مجموعی تجربہ حاصل ہے۔

یہ ادارہ خشکی کے قطعات پر ۱۰۳ رگس (برمانے والی مشینوں) کا ایک بیڑہ رکھتا ہے اور ساحل سمندر سے دور اس کے پاس ۲۵ رگس ہیں۔

اس کارپوریشن کے پاس اب ۴۴۵۴ کنویں ہیں۔ تیل کی کھوج کے لیے برمائی کے مختلف طریقے استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً ڈرین ہول، افقی کنویں وغیرہ ان طریقوں سے کنوؤں کی پیداواری صلاحیت بڑھی ہے۔ یہ کارپوریشن خشکی کے قطعات پر ۲۰۔ اور ساحل سمندر سے دور ۱۵۰ پیداواری تنصیبات کا استعمال کرتی ہے۔ اس میں پانی کے دخول کے پلیٹ فارم اور گیس کو نرم بنانے اور گیس کی درجہ بندی کرنے کے پلانٹ بھی شامل ہیں۔ اس عظیم نظام کو جوڑنے کے لیے تیل اور گیس کی پائپ لائنیں ہیں جو سمندر کے نیچے ۲۸ کلومیٹر فاصلے پر پھیلی ہوئی ہیں۔ خشکی کے قطعات پر بھی ۶۷۸ کلومیٹر فاصلے پر یہ لائنیں پھیلی ہوئی ہیں۔ کارپوریشن کے کاموں کے تحت طاسوں میں ہائیڈروکاربن کے ذخائر کا اندازہ ۴ر۱۸ ملین ٹن ہے۔

ابتدائی سال

اس کارپوریشن نے "تیل اور قدرتی گیس کمیشن" کے نام سے ۱۹۵۶ء میں اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔ ابتدا میں ہندوستان میں خام تیل کی پیداوار صرف چار لاکھ ٹن سالانہ تھی جو آسام کے تیل کے چشموں سے حاصل کی جاتی تھی اس دور میں برطانوی ماہروں کا عام خیال یہ تھا کہ ہندوستان میں ہائیڈروکاربن کے ذخیرے صرف آسام میں ہیں۔ تیل کے نہ ملنے کے خیال اور اس کی کھوج کے تاریک امکانات کو جھٹلاتے ہوئے اس کمیشن نے گجرات میں خلیج کھمبات میں تیل کی کھوج شروع کی اور ۱۹۵۸ء میں پہلا کنواں کھودتے ہی تیل مل گیا۔ اس کے بعد تیل کی کھوج کی جو کوششیں ۱۹۶۰ء میں انکلیشور، ۱۹۶۱ء میں کلول اور ۱۹۶۲ء میں سانند اور ۱۹۶۶ء میں احمدآباد میں کی گئیں، وہ سب کی سب کامیاب رہیں۔

ان کامیابیوں سے حوصلہ پا کر کمیشن نے دیگر علاقوں میں بھی تیل کی کھوج اور برمائی کا کام شروع کیا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آغاز میں ساحل سمندر سے دور بھی تیل کی کھوج کی کوششیں کی گئیں۔ ممبئی ہائی اس وقت وہ علاقہ ہے جہاں تیل کے سب سے بڑے چشمے ہیں۔ یہ مغربی ساحل سمندر سے فاصلے پر ہے جہاں بڑے پیمانے پر ۱۹۷۴ء میں زلزلہ پیما سروے بھاؤنگر اور دیگر مقامات پر کیے گئے اور انہیں کوششوں کے نتیجے میں ممبئی ہائی میں تیل کے ذخیرے دستیاب ہو سکے۔ مئی ۱۹۷۶ء میں ساحل سمندر سے دور تیل کے چشموں سے تجارتی مقاصد کے لیے تیل حاصل کیا جانے لگا۔ یہ کام دو سال کے مختصر سے عرصے میں انجام دیا گیا۔ مغربی خطے میں تقریباً اسی وقت ایک بڑا گیس کا ذخیرہ بیسین ملا اس سے ۲۰۰ بلین مکعب میٹر گیس حاصل کیے جانے کا اندازہ لگایا گیا۔ ان کوششوں کی وجہ سے مغربی خطہ تیل اور قدرتی گیس کمیشن کا سب سے بڑی سرگرمی والا ایک مرکز قرار پایا۔ اس خطے میں کھمبات کے طاس سے ہائیڈروکاربن کی کھوج کر کے اس سے استفادہ کیا جانے لگا۔ اس میں خلیج کھمبات، کچھ، سوراشٹر اور راجستھان کے طاس شامل ہیں۔

ممبئی ہائی کا خام تیل زیادہ تر بھارت پٹرولیم کارپوریشن اور اس کے قریب واقع ہندوستان پٹرولیم کارپوریشن کو سپلائی ہوتا ہے۔ گجرات کے تیل

ذخیروں سے تیل ٹرنک پائپ لائنوں کے ذریعے سے بڑودہ میں واقع گجرات ریفائنری کو بھیجا جاتا ہے۔ کھمبات کے طاس سے قدرتی گیس کی پیداوار اس وقت ۶/۸۰ ملین مکعب میٹر یومیہ ہے۔ یہ گیس بجلی کی تیاری کے لیے ۸ صارفین کو مہیا کی جارہی ہے۔ یہ کیمیاوی کھادوں کی تیاری اور کپڑا ملوں، کیمیاوی اشیاء تیار کرنے والے کارخانوں اور ان تمام صنعتوں کو مہیا کرائی جاتی ہے جو شمالی اور جنوبی گجرات میں واقع ہیں۔

حصول آزادی کے وقت اندرون ملک پیداوار صرف اعشاریہ ۲۵ ملین میٹرک ٹن تھی جو بڑھ کر ۳۲/۳ ملین میٹرک ٹن سالانہ تک پہنچ چکی ہے۔ اسی طرح ریفائنریوں یعنی تیل صاف کرنے والے کارخانوں کی تعداد بڑھ کر ۱۲ ہو گئی جب کہ شروع میں صرف ڈگبوئی میں اس کے لیے ایک کارخانہ تھا۔ تیل صاف کرنے کی مجموعی نصب شدہ صلاحیت تقریباً ۵۶/۴ ملین میٹرک ٹن سالانہ تک پہنچ گئی ہے۔ جب کہ ۵۰ سال قبل یہ صرف اعشاریہ ۲۳ ملین میٹرک ٹن تھی۔ پٹرولیم کی مصنوعات کی بڑھتی ہوئی مانگ جو اس وقت تقریباً ۷۰ ملین میٹرک ٹن سالانہ ہے۔ آئندہ صدی کے پہلے برس تک بڑھ کر سو ملین میٹرک ٹن سالانہ تک پہنچ جائے گی۔ اس بڑھتی ہوئی مانگ کے مقابلے اس وقت ملک میں ہر سال ۳/۲۲ ملین میٹرک ٹن خام تیل اور تقریباً ۳۱ میٹرک ملین اسٹینڈرڈ مکعب میٹر یومیہ قدرتی گیس پیدا کی جارہی ہے۔

بچت کے لیے کوششیں

اس قیمتی قدرتی وسیلے کی اگر اسی طرح مسلسل کھوج چلتی رہی اور اس سے اس طرح بڑھتی ہوئی شرح سے استفادہ کیا جاتا رہا تو اس کے ذخیرے خالی ہو سکتے ہیں۔ خام تیل کی پیداوار میں ہونے والی کمی کی روک تھام کرنے کے لیے اور اس کی پیداوار بڑھانے کے لیے تیل اور قدرتی گیس کارپوریشن نے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ مختصر مدتی اور کچھ طویل مدتی اقدامات ہیں۔ مختصر مدتی اقدامات میں ابتدائی پیداواری نظام، افقی کنویں، موجودہ کنوؤں کو گہرا کرنا، مصنوعی لفٹ اور متعدد دیگر طریقوں سے تیل کی برآمدگی کا کام شامل ہے۔ اس کے لیے ۲۴ گھنٹے کام کر کے اور رگس کی تعداد بڑھا کر پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ تیل کے نئے چشموں کی بہتری اور ان کا فروغ تیل کے موجودہ چشموں کا مزید فروغ اور تیل کی زیادہ مقدار میں حصولی، ایسے درمیانہ مدت کے اقدامات ہیں جن سے تیل کی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے۔

تیل اور گیس کی کھوج کی کوششوں کو تیز کرنے کے لیے سرکار نے ایک ایسا پروگرام تیار کیا ہے جس سے تیل کی کھوج کے کام کو مرحلہ وار طریقے پر آگے بڑھایا جا سکے۔ اس پر ۲ کروڑ امریکی ڈالر کے اخراجات کا اندازہ ہے۔ اس کے چند اہم اجزاء یہ ہیں۔ گہرے پانی میں کھوج، سرحدی علاقوں میں کھوج، دھماکے کی تکنیک سے سروے کا قومی پروگرام وغیرہ۔ اس پروگرام کو تیل اور قدرتی گیس کارپوریشن اور آئل انڈیا لیمٹیڈ عملی جامہ پہنائے گی۔ منتخبہ علاقوں میں یہ دونوں مل کر مشترکہ کوششوں سے تیل کی دریافت کریں گے۔ سرکار نے حال ہی میں نجی سیکٹر کو بھی شرکت کی دعوت دی ہے اور ہائیڈروکاربن سیکٹر کے تمام شعبوں میں ان کے ساتھ اشتراک عمل کی پیشکش کی ہے۔

ہندوستان میں پٹرولیم کا شعبہ ترقی کے راستے پر نئے نئے طریقوں سے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جو بین اقوامی سطح پر مقابلہ کی سکت پیدا کر رہا ہے اور اب اس کا مقابلہ اس کام میں مصروف عالمی سطح کے اداروں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ تیل اور قدرتی گیس کارپوریشن فراخدلانہ پالیسی کے بدلتے ہوئے کاروباری ماحول میں کامیابیوں کی نئی منزلیں طے کر رہی ہے۔ یہ مشترکہ پروجیکٹوں کے امکانات تلاش کر رہی ہے اور غیر ملکی منڈیوں کی تلاش کر رہی ہے نیز اس بات کو یقینی بنا رہی ہے کہ ہندوستانی معیشت میں کلیدی رول ادا کرنے والی پٹرولیم کی مصنوعات اور گیس مستقل بنیادوں پر برقرار رہیں۔

قلم کار حضرات سے

گزارش ہے کہ

(۱) مضامین / دیگر تصانیف جو بھیجیں کوارسال کریں انہیں کہیں اور چھپنے کے لئے قطعاً نہ بھیجیں۔

(۲) ہر مضمون کے آخر میں طبع زاد / غیر مطبوعہ لکھ کر اپنا دستخط، نام اور پتہ ضرور درج کریں۔

(۳) مضمون کی اصل ہمیں ارسال کریں فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۴) مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کریں۔

(۵) مضامین میں جو اقوال (QUOTATIONS) استعمال کئے گئے ہیں، ان کے سورس کا حوالہ دینا لازمی ہے۔

(۶) مضامین میں انگریزی الفاظ کا استعمال بدرجۂ مجبوری ہی کریں۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں

(ادارہ)

❀❀

بی بی ناگپال

ہندوستان کا ۲۸واں بین اقوامی فلمی میلہ

ہندوستان فلموں کی تیاری کے سلسلے میں پوری دنیا میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ہر سال یہاں تقریباً ایک ہزار فیچر فلمیں اور ڈاکومنٹریز تیار کی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں جس قدر زبانوں اور بولیوں میں فلمیں تیار کی جاتی ہیں، اس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ تقریباً ۴۰ سال سے بھی زیادہ عرصے سے ہندوستان اپنے سالانہ بین اقوامی فلمی میلوں کے لیے مشہور رہا ہے۔ یہ فلمی میلے وہ ہیں جنہیں فلم تیار کرنے والوں کی ایسوسی ایشن کی بین اقوامی فیڈریشن دنیا میں اعلیٰ ترین دس فلمی میلوں میں شمار کرتی ہیں، جس کا صدر مقام پیرس میں ہے۔

ہندوستان کے بین اقوامی فلمی میلے کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ میلوں کا میلہ ہے یہ اس طرح کی کوشش ہے جس کے ذریعے کم سے کم بین اقوامی سینما میں ایسی فلموں کو دکھایا جاتا ہے جنہوں نے دیگر بین اقوامی فلمی میلوں میں اعزاز پایا ہے یا جن کی بڑے پیمانے پر تعریف ہوئی ہے یا جن کے بارے میں اچھے تبصرے کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ملک میں ۱۹۵۲ء سے بین اقوامی فلمی میلے منعقد ہونے شروع ہوئے مگر ۱۹۷۵ء سے تو یہ بہت باقاعدگی سے ہر سال جنوری میں منعقد ہوتے رہے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں ۳ جنوری سے ۷ جنوری تک دہلی میں ہندوستان کا بین اقوامی فلمی میلہ منعقد کیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ ہندوستان میں اس شکل میں یہ میلہ شروع ہوا جس شکل میں یہ آج بھی ہوتا ہے۔ ڈائرکٹریٹ آف فلم فیسٹول نے اس کا اہتمام کیا تھا اور ڈائرکٹریٹ ۱۹۸۳ء میں نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا ایک حصہ ہو گیا۔

اس وقت جس پالیسی کو اپنایا گیا، اس کے تحت دہلی میں ہر دوسرے سال مقابلہ جاتی فلمی میلہ منعقد کرنے کی بات کہی گئی اور درمیان کے برسوں میں مختلف فلمی شہروں میں باری باری سے غیر مقابلہ جاتی فلم اتسو منعقد کرنے کے لیے کہا گیا۔ حیدرآباد میں ۱۹۸۶ء میں فلم اتسو سے میلے کی تاریخیں بدل کر ۱۰ جنوری تا ۲۴ جنوری کر دی گئیں۔ اس طرح ہندوستان میں میلے ۱۹۹۶ء تک غیر مقابلہ جاتی رہے اور ۱۹۹۶ء میں دہلی میں فلمی میلے میں محدود قسم کا مقابلہ جاتی سیکشن ایشیا کی خاتون ڈائرکٹروں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔

۱۰ جنوری ۱۹۹۷ء سے ہندوستان کا ۲۸واں بین اقوامی فلمی میلہ تھروننتاپورم میں منعقد ہونے والا ہے۔ جنوبی ہند میں منعقد ہونے والا یہ دوسرا میلہ ہے۔ اس سے قبل جنوری ۱۹۸۸ء میں یہاں فلم اتسو ہوا تھا۔ سابقہ برسوں کی طرح، اس میلے میں دو سیمینار منعقد ہوں گے اور سات سیکشن ہوں گے۔

جنوبی افریقہ کا سینما

سب سے بڑا سیکشن سینما آف دی ورلڈ (عالمی سینما) کے نام سے ہوگا۔ اس میں ۴۰ سے زیادہ ملکوں کی تقریباً ۷۰ فلمیں دکھائی جائیں گی۔ یہ وہ فلمیں ہوں گی جو یکم جنوری ۱۹۹۵ء کے بعد بنی ہیں اور جن کو اعزاز مل چکا ہے یا جن پر بہت اچھا تبصرہ ہوا ہے۔ فلم تیار کرنے والے بیشتر ممالک بشمول ایشیائی ممالک اس سیکشن میں حصہ لیں گے۔ فلمی میلے میں یہ سیکشن دلچسپی کا خاص موضوع ہوگا۔

ہر سال ہندوستانی فلمی میلے میں ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ کے ملکوں کی فلموں پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۸۴ء سے جاری ہے۔ سابقہ فلمی میلوں میں تمام خطوں اور براعظموں کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اس سال جنوبی افریقہ کے سینما پر خاص توجہ دی جائے گی۔ اس میں دس فلمیں رکھی گئی ہیں جو زیادہ تر جنوبی افریقی باشندوں نے خود بنائی ہیں۔ اس ملک کا چھ رکنی وفد میلے میں آئے گا۔ اس کی قیادت پروفیسر فاطمہ میر کریں گی۔ موصوفہ نے ایک مہاتما کی لو آموری کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ انگریزی میں اس کا نام ہے "دی اپرنٹس شپ آف اے مہاتما"۔ اس کو سامنے رکھ کر شیام بینیگل نے ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے تعاون سے ایک فلم بنائی جس کا نام ہے "دی میکنگ آف دی مہاتما"۔ جنوبی افریقہ کے تعاون سے بنائی جانے والی یہ پہلی فلم ہے۔

ریٹرو سپیکٹیو سیکشن

اس میلے کا ایک اور سیکشن ہے جس کا نام ہے غیر ملکی خراج عقیدت اور ریٹرو سپیکٹیو کا سیکشن۔ اس فلمی میلے میں اس تیسرے اہم سیکشن میں پولینڈ کے کرزس توف کیس لووسکی، جن کی وفات پچھلے سال ہوئی تھی، کی فلمیں، ایران کے محسن مخمل باف کی فلمیں، کیوبا کے میگوئل لیٹن کی فلمیں دکھائی جائیں گی۔ بہترین اداکارہ سمتا پاٹل کی کچھ مشہور فلمیں بھی دکھائی جا رہی ہیں۔ سمتا پاٹل کی وفات چند برس پہلے ہو چکی ہے۔

محسن مخمل باف کی جو فلمیں اس میں شامل کی گئی ہیں، ان میں دی پیڈلر، دی سائیکلسٹ، بازار حاملار کی تصاویر کا انتخاب، اے ٹائم آف لو، سلام سینما، گبہ اور دی بریڈ اینڈ دی ویس شامل ہیں۔

باقی صفحہ ۴۶ پر

یوجنا، نئی دہلی

ڈاکٹر شفقت اعظمی

اسہالِ اطفال

(بچوں کو دست آنا)

تعریف: اگر معا مستقیم کی راہ خارج ہونے والا فضلہ طبعی مقدار سے زائد، بار بار نیز طبعی اوقات سے بیشتر خارج ہونے لگے تو اسے اسہال سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اکثر قراقر کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ اسہال زردی مائل، گاہے مٹیالے اور کبھی کف دار ہوتے ہیں۔

امراضیات: چھوٹی آنتوں کے فعل یا ساخت میں کسی طرح کا خلل واقع ہو جانے سے تشنج کے بغیر بار بار دست ہوتا ہے۔

اسباب: بچوں میں اس کے گوناگوں اسباب ہوتے ہیں۔ تفہیم میں سہولت کی غرض سے اس کے اسباب کو تین حصوں کے تحت بیان کیا جاتا ہے:

(ا) جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، بچپن میں ہائیڈرو کلورک ایسڈ معمولی مقدار میں پیدا ہوتا ہے، جس کے سبب معدہ کی قوت تطہیر بھی کم ہوتی ہے۔ جرثوموں کو آنتوں کے خمل یا غشائے مخاطی پر حملہ کرنے کا زریں موقع بھی مل جاتا ہے، بالخصوص اوپر کا دودھ پینے والوں میں۔ اسی طرح غذائی خلل جیسے شحوم (چربی)، اجزائے نشاستہ و شکریہ یا لحمین کے کثرت استعمال سے بھی دست آنے لگتا ہے۔ بعض بچے اتنا زیادہ کھا پی لیتے ہیں کہ معدہ کی بساط سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس طرح کی غذا فاسد ہو کر خارج ہونے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

(ب) دودھ پینے کا زمانہ چونکہ اعصابی طور پر ایک غیر متوازن دور ہوتا ہے ساتھ ساتھ سرایتوں اور متعدی حمیات میں مبتلا ہونے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے، نتیجتاً آنتوں کی حرکات دودیہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان حالات میں آنتوں کے غشائے مخاطی میں خراش اور لذع پیدا ہو جاتا ہے، اسی لیے اسے اسہال لذعی بھی کہتے ہیں۔ یہی صورت حال دانت نکلنے کے زمانے میں کیڑوں کی موجودگی کی صورت میں بھی درپیش ہوتی ہے۔

بعض امراض مثلاً نمونیہ اور دیگر نوعی بخار مثلاً حمیٰ معویہ، حصبہ، سل اور گردہ کی چند بیماریوں، ضعف جگر اور عمومی ضعف کی ابتدا بھی عموماً اسہال سے ہوتی ہے۔

(ج) موسمی فصلی تبدیلیاں مثلاً سخت سردی، گرمی، مرطوب لیکن گرم ہوا یا مرطوب مقامات پر مکھیوں کی کثرت بھی اسباب میں شامل ہیں۔

(د) صفرا، بلغم کے اختلالات، دانت نکلنا، ضعف ہضم وغیرہ بھی اسباب میں شامل ہیں۔

اسہال کی تقسیم حسب ذیل اعتبار سے کی جاتی ہے:-

(۱) اسہال غذائی (۲) اسہال سرایتی (۳) اسہال علامتی اور (۴) مخلوط اسہال۔

اول الذکر تین قسمیں جلد علاج قبول کر لیتی ہیں لیکن آخری قسم دراصل مشکل سے علاج پذیر ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کی خصوصیات قدرے تفصیل سے بیان کی جا رہی ہے۔

مخلوط اسہال کی چند اہم خصوصیات

کبھی اسہال زرد رنگ کا ہوتا ہے، جو عموماً التہاب صفرا کے وقت ہوا کرتا ہے، کیونکہ صفراوی مادے آنتوں پر گر کر خراش پیدا کرتے ہیں اور بالآخر معدہ اور آنتیں کیلوس اور دیگر فضلات کے ساتھ اسے خارج کر دیتے ہیں۔

گاہے اسہال مخاطی ہوتا ہے، جس کی وجہ معدہ میں بلغم کی زیادتی یا لیس دار رطوبتیں بتائی جاتی ہیں، جس سے معدہ کی سطح چکنی اور پھسلن دار ہو جاتی ہے۔

کبھی اسہال کا کوئی قطرہ اگر جلد کے کسی حصہ پر لگ جائے تو اس جگہ آبلہ پڑ جاتا ہے۔ اس کا سبب بلغم شور یا تیز سودا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں بچے کی آنتوں میں تخمی یا شکری تیزاب اور مختلف قسم کے سموم کی کثرت ہوتی ہے، جس کے سبب ترشہ بیوٹرک (BUTRYC ACID) بننے لگتا ہے۔

گاہے اسہال متعفن اور چھوٹی چھوٹی پھٹکیوں کی شکل میں ہوتا ہے۔

کبھی اسہال پنیر نما ہوتا ہے اور اس میں چھوٹے بڑے پھٹکے ہوتے ہیں، جس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ بچہ اپنی استطاعت سے زیادہ دودھ کھینچ لیتا ہے، نتیجتاً کار اختلائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

علامات و امارات: عمومی علامتیں درج ذیل ہیں:

زیادہ کمی میں شاید اسہال کے سبب بے آبی کی

اسسٹنٹ ڈائریکٹر انچارج، لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، جامعہ ہمدرد کیمپس، نئی دہلی - ۶۲

شکایت ہو جاتی ہے اور نمک کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ جلد کی طبعی لچک جاتی رہتی ہے۔ زبان پر سفید تہہ جم جاتی ہے، تالو بیٹھ جاتا ہے، آخر کار بار بار آنے والے اسہال نما ہو جاتا ہے۔ بلڈ پریشر گھٹ جاتا ہے اور تسمم (زہر پھیلنے) کی عمومی علامتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ معدہ اور آنتوں کے ورم میں ایسا دست زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ ترشہ، ملوثر کی مخلوط اسہال میں کثیر مقدار میں خارج ہونے لگتا ہے اور ماء الشعیر (جو کے پانی) جیسا اسہال آنے لگتا ہے۔ ایسا اسہال انتہائی مہلک ہوتا ہے بالخصوص جب کہ خون بھی زائد مقدار میں جاسع ہونے لگتا ہے، جس میں البیومن تولیت (ALBUMINMIA) لاحق ہو جاتا ہے۔

تشخیص: اصل سبب کا پتا لگانے کے لیے براز کا معائنہ ضروری ہے، جہاں جھاگ دار دست شمی بدہضمی یا بلغم ستور کی علامت ہے، ایسی حالت میں متلی آنے لگتی ہے اور قے کے ساتھ بلغم نکلتا ہے، علاوہ بریں بلغم غذا کے ساتھ مل کر براز کے ہمراہ بھی خارج ہوتا ہے۔

معدہ کی سطح پر لیس دار رطوبت کی موجودگی کی حالت میں غذا التغیر و تبدل کے بغیر بہت جلد معدہ سے گزر جاتی ہے۔

نشاستے کی صورت میں دست بیدار ہونے کے بعد آتے ہیں جو جھاگ دار ہوتے ہیں۔

ضعف ہضم کی حالت میں غذا کے بعد دست آتے ہیں، جن کی تعداد دن میں زیادہ ہوتی ہے۔

سفید پھٹکی والا دست پروٹینی سوء ہضم کی علامت ہے۔

گہرے زرد رنگ کی اجابت صفرا کی موجودگی پر دلالت کرتی ہے، جو ٹائیفائڈ بخار اور تیسرے دن کے باری کے بخار کے بعد نمایاں ہوتے ہیں۔

ہلکے پیلے اور گہرے زرد رنگ کے اسہال صفرا کی موجودگی پر دلالت کرتے ہیں۔

اگر دانت نکل رہے ہوں تو مسوڑھے پھولے ہوتے ہوں گے، سبز و زرد رنگ کے پتلے پتلے دست آئیں گے۔

گرم امعا کی صورت میں دست میں کیڑے نکلیں گے۔

علامتی اسہال میں جسم کے امتحان عمومی کے ساتھ ساتھ کان اور قارورہ کا امتحان خاص طور سے کر لینا چاہیے۔

تدابیر و علاج

اسہال اطفال کی متذکرہ اقسام میں حسب ذیل تدابیر بروئے کار لائی جاتی ہیں۔

(۱) فاقہ کرانا

(۲) ضائع شدہ سیال کی بھرپائی۔

(۳) فضلات غذائی کے فضلہ کو دور کرنا۔

علاوہ بریں علامتی اسہال میں اصل سبب کا تدارک بھی ضروری ہے۔

فاقہ کرانا بچوں میں زیادہ مفید نہیں ثابت ہوتا، تاہم رضاعت کے وقفے کو بڑھا دینا عموماً مفید ہوتا ہے۔ وقفے کے دوران صرف سادہ پانی، آش جو (پتلا)، دودھ کا پھاڑا ہوا پانی یا انڈے کی سفیدی دی جائیں۔

اگر قے یا غذائی نیم ہضم غذا مختبس ہو کر سمیت کا سبب بن جائے تو بچے کو اول ۴۸ گھنٹے صرف نمکین پانی (نارمل سیلائن کا) پلایا جائے، اس کے بعد پھلوں کا رس یا پتلا دودھ دیا جائے۔ صحت ہو جانے کے بعد بتدریج غذا دی جائے۔

راہ دہن آب رسانی کا عمل ہندوستان میں ۳۰ برس قبل ایجاد ہوا تھا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے باوجود اسہال سے اس ملک میں فی گھنٹہ ۸ بچے لقمۂ اجل بن جاتے ہیں کیوں کہ آج یہ عمل رواں آمادہ ہو گیا ہے۔ بہر حال خوردنی سیال رسانی کی غرض سے سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کا حسب ذیل مجوزہ فارمولہ مفید ثابت ہوا ہے۔

ست لیموں	۴ حصہ
نمک سانبھر	۱ حصہ
نمک سیاہ	۱ حصہ
الائچی خورد	۲ حصہ
سوڈا خوردنی	۱ حصہ
شکر	۲ حصہ

سفوف تیار کریں۔

ترکیب استعمال۔ ۵ گرام سفوف ۱۰ ملی لیٹر پانی میں حل کر کے رکھ لیں اور وقفے وقفے سے پلاتے رہیں۔

وریدی سیال رسانی

کثرت اسہال اور خونی دست و قے کے سبب بچہ نڈھال ہو گیا ہو تو بالعموم مذکورہ بالا طریقے سے نارمل سیلائن وغیرہ کا استعمال کافی ہوا کرتا ہے، لیکن سقوط قوت کی حالت میں، نارمل سیلائن نسیج خلوی کے ذریعہ جسم میں پہنچا دیا جائے۔ حسب ضرورت HYALINF (ساختہ ٹاٹا فنش) بھی اس میں حل کیا جا سکتا ہے۔

فضلات کا اخراج: اس کے دو طریقے ہیں:

(۱) حقنہ (ENEMA) کے ذریعہ آنتوں کی صفائی۔ اس غرض سے روغن زیتون، روغن بیدانجیر یا نمکین پانی آنتوں کی راہ چڑھانا مفید ہوتا ہے۔

(۲) قے لانا۔ بچوں میں عموماً اس کی ضرورت نہیں ہوتی ہے کیوں کہ قدرت اس حالت میں از خود قے میں استعانت کرتی ہے۔ پھر بھی ضرورت ہو تو نمکین گرم پانی سے یا عرق سویا وائنم اپیکاک سے قے کرائی جا سکتی ہے۔

اگر بچہ کی غذا میں بالائی، مکھن، روغنی اجزا کی زیادتی ہو تو اس کی اصلاح کی جائے اور بالائی اترا ہوا یا مکھن نکالا ہوا دودھ یا چھاچھ پلایا جائے۔

اگر دانت نکلنے کے زمانے میں دست آ رہے ہوں تو خصوصی احتیاط برتی جائے اور سردی سے تحفظ کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اگر علاج کی ضرورت درپیش ہو تو میانہ روی اختیار کی جائے یعنی قابض، مفتح (سدہ کھولنے والی) اور جبر دادویہ سے مرکب معالجہ بروئے کار لایا جائے۔ حکیم شفائی خاں نے علاج الاطفال (فارسی) میں حسب ذیل نسخہ مفید بتایا ہے۔

(نسخہ) سبدارہ، گل خطمی ہر ایک نصف گرام، عرق مکوہ میں رات کو بھگو کر صبح صاف کر کے شیرہ تخم خرفہ ۵ گرام، شیرہ الائچی ۵ گرام تر کپڑے میں ۵ ملی لیٹر لپیٹ کر آب گرم میں گزار کر زہر مہرہ ہمراہ گلاب پیس کر بارتنگ ۵ گرام، کتیرا ۵۱۲ ملی گرام علاحدہ سے پیس کر اوپر سے چھڑک کر نوش کرائیں۔

باقی صفحہ کور ۳ پر

ملکہ نسیم

حسرت موہانی غزل کے آئینہ میں

اردو کے صفِ اول کے شاعر، ادیب، نقاد، صحافی اور جنگِ آزادی کے عظیم مجاہد مولانا حسرت موہانی قصبہ موہان میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ لکھنؤ اور کانپور کے درمیاں ضلع اُناؤ میں واقع ہے۔ موہان حکیموں اور طبیبوں کے لیے مشہور رہا۔ حسرت کے آبا و اجداد میں ایک بزرگ سید محمد نیشاپوری التمش کے زمانے میں موہان آئے۔ سید محمد نیشاپوری کے دو صاحبزادے تھے سید منتخب اور سید جمال۔ حسرت کا تعلق سید منتخب کی اولاد سے ہے۔ حسرت ۷ بھائی بہن تھے۔ حسرت کے والد کو اپنی دادی صاحبہ کی طرف سے ضلع فتحپور ہسوہ کھجوہ میں تین گاؤں وراثتاً ملے تھے جس کی آمدنی پر قناعت کر کے زیادہ تر ضلع فتحپور اور کم تر موہاں میں زندگی بہ فراغت بسر کرتے تھے۔

حسرت کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا جہاں مرد ہی نہیں عورتیں بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ حسرت نے بہت کم عمر میں فارسی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں حسرت موہانی نے باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز کیا۔ پہلی غزل ۵ شعر کی تھی جس کا مقطع اور مطلع دونوں ہی ہیں ؎

میں تو سمجھا تھا قیامت ہو گئی
خیر پھر صاحب سلامت ہو گئی
عشق نے اس کو سکھا دی شاعری
اب تو اچھی فکرِ حسرت ہو گئی

حسرت کا پہلا دیوان ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا جس کو بیگم حسرت موہانی نے مرتب کیا۔ حسرت نے جب شاعری کا آغاز کیا تب اردو غزل پر جاگیرداری نظام کے اثرات تھے۔ نئے سامراجی نظام سے اردو غزل خوف زدہ تھی۔ خیال، جذبہ، وجدان، تخیل اور فکر سے عاری غزلیں کہی جا رہی تھیں لیکن حسرت ان موضوعات سے متاثر نہیں ہوئے۔ حسرت نے غزل کو ایک نیا رنگ دیا۔

حسرت جب میدانِ شاعری میں آئے تو غزل کا نشاۃ ثانیہ شروع ہو چکا تھا۔ داغ اور امیر کے نغمے پھیکے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ غزل میں بھی نئی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور اس طرح ہمارے بہت سے نقادوں نے غزل کے نشاۃ ثانیہ کا سہرا حسرت کے سر باندھ دیا۔ حالاں کہ حسرت نے فلسفے اور زندگی کی الجھنوں کو شاعری کا موضوع نہیں بنایا۔ بلند خیالی اور معنی آفرینی سے دامن بچائے رکھا۔ وہ زندگی بھر دار و رسن کی کڑی آزمائش سے گزرتے رہے لیکن انھوں نے حسن و عشق کی رعنائیوں سے دل کی دنیا کو سجائے رکھا۔

حسرت سے پہلے اردو شاعری کا محبوب یا تو مرد تھا یا طوائف لیکن حسرت نے غزل کو کوٹھے سے اُتار کر آنگن کی زینت بنایا۔ حسرت کا محبوب ایک پردہ نشین اور شرمیلی لڑکی کی شکل میں سامنے آیا۔ جو جاگیر داری گھرانوں کی تہذیبی وضع داری سے مجبور ہو کر انکار تو کرتی ہے لیکن اس طرح کہ اس انکار میں اقرار کا پہلو چھپا ہوا ہے۔ ؎

دلِ مایوس کو گرویدۂ گفتار کر لینا
وہ اُن کا پردۂ انکار میں اقرار کر لینا
چھپے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی
وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

حسرت کی شاعری میں خاندانی روایات کی شائستگی بھی ہے اور سماجی وقار کا رکھ رکھاؤ بھی کہتے ہیں۔ ؎

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی اُن کا
جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

اور حسرت حُسن کے مزاج سے واقفیت بھی رکھتے ہیں۔ ؎

دیکھنا بھی تو اُنھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رُسوا کرنا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

سکھا دی ہیں نرالی شوخیاں کچھ لطف جاناں نے
مرے دستِ تمنا کی شرارت بڑھتی جاتی ہے

حسرت کی سماجی حیثیت اور شاعری میں بڑا تضاد ہے۔ سماج میں وہ ایک جنگِ آزادی کے مجاہد اور صاحب نسبت صوفی تھے۔ جب کہ ان کی شاعری کا وہ جذبہ جس نے انھیں اپنے عہد کے بڑے غزل گو شعرا میں ایک مقام دلایا۔ مادّی عشق پر مبنی ہے۔

حسرت کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا آمد، دوسرا آورد اور تیسرا جس میں آمد اور آورد دونوں ہی پائے جاتے ہیں۔

ویسے حسرت کا کہنا ہے کہ "عاشقانہ شاعری کی دو قسمیں ہیں اول وہ جس میں جذباتِ شوق کی صحیح کیفیت نگاہِ حق شناس کے روبرو عشق کو خدا نمائی کی اس شان میں پیش کرتی ہے جس کی

بارلیوں کی گلی موتی کٹلہ بازار جے پور (راجستھان)

نسبت نظامی نے ہُوالتر فرمایا اور جیسے مولانا روم نے اپنی تمام علتوں کی دوا قرار دیا۔ ایسی شاعری کی ایک سرحد، تصوف اور عشق کے قریب اور دوسری عشقِ مجازی اور پاک محبت سے ملحق ہوا کرتی ہے۔ اردو زبان میں تصوف اور عشقِ حقیقی کا شاذ ہے۔ البتہ محبت کے جذبات میرؔ و مصحفیؔ یا دردؔ اور قائمؔ کے کلام میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ عاشقانہ شاعری کی دوسری قسم وہ ہے جس میں پاک اور بے لوث عشق کے بجائے ہوس پرستی کے جذبات کی صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ جس کے نمونے جرأت، میاں نظیر اور انشاؔ کے کلام میں بہ کثرت ملتے ہیں۔

"حسرت کا کہنا ہے کہ جب شاعری کا مقصد صحیح جذبات کی عکاسی کرنا ہے تو پھر ان جذبات کو صرف پاکیزہ جذبات تک کیوں محدود رکھا جائے۔ جب عشق مجازی ہے تو پاکبازی اور غیر پاکبازی کا وہاں گزر کہاں ہے"! عاشق تو اپنے محبوب کی ایک ایک ادا سے متاثر ہوتا ہے۔ بقول حسرت ؎

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حُسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

حسرت محبوب کے پیراہن کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ؎

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بہ خود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرح داری کا
طرفہ عالم ہے تری حُسن کی بیداری کا

حسرت کے ذہن میں محبوب کا تصوّر خوشبوؤں اور رنگوں کا حسین امتزاج ہے۔ ؎

دل پذیری کے ہر انداز کی ہے تجھ میں نمود
رُخ بھی رنگیں ہے ترا قد بھی ہے دلجو تیرا

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوبِ یار
خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

حسرت کی پوری شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کی شاعری روایتی اور رسمی نہیں ہے اور نہ انھوں نے کلاسیکی شاعری کے مضامین دہرائے ہیں۔ بلکہ حسرت کی شاعری میں ایک انوکھی سی فضا ملتی ہے جس وعشق کے بڑے دلچسپ و معصوم واقعات ملتے ہیں۔ ؎

حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا

ہو کے نادم وہ بیٹھے ہیں خاموش
صُلح میں شان ہے لڑائی کی

حسرت موہانی کے مزاج کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ انھیں مخالف رائے پیش کرنے میں بہت لطف آتا تھا۔ کانگریس میں رہے تو گاندھی جی کی مخالفت کی، مسلم لیگ میں رہے تو جناح صاحب سے نہیں بنی۔

حسرت کی زندگی مفلسی اور ناداری میں گزری مگر کبھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوئے بی۔ اے کی ڈگری لینے کے بعد دونوں میاں بیوی مل کر "اردوئے معلیٰ" نکالتے تھے اور کل آٹھ روپیہ ماہوار میں زندگی بسر کرتے تھے۔ انھیں ہر قسم کے رسمی اور مصنوعی تکلف اور بناوٹ سے سخت نفرت تھی۔

غرضیکہ حسرت جیسے عظیم اور باکردار لوگ دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔

تیری نسیم سے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام ●

بقیہ: ہندوستان کا ۲۸واں بین اقوامی فلمی میلہ

ایشیائی ملکوں کے سینما پر زور

فلمی سہ ماہی رسالہ "سینمایا" اور ایشیائی سینما کے فروغ کے نظام نے ایک خصوصی سیکشن میں ایشیائی ملکوں کے ڈائرکٹروں کی نو فلموں کو، جو ایشیائی ملکوں کے تناظر میں تیار کی گئی ہیں، دکھانے کا بندوبست کیا ہے۔ ان میں سے ایک فلم انڈونیشیا کی ہے جس کا نام ہے "وینڈ دی مون ڈائز" دوسری فلم ایران کی ہے، جس کا نام ہے "پری" تیسری فلم ملیشیا کی ہے جس کا نام ہے "دی آر سونسٹ" چوتھی فلم جنوبی کوریا کی ہے جس کا نام ہے تین دوست (تھری فرینڈس)' پانچویں فلم سری لنکا کی ہے جس کا نام ہے ڈارک نائٹ آف دی سول، چھٹی تائیوان کی فلم ہے جس کا نام ہے گڈ بائی ساؤتھ، ساتویں فلم ترکی کی ہے، جس کا عنوان ہے کاکروچ' تھائی لینڈ کی فلم کا نام ہے "دی ہاؤس آف دی پی کاک" ویتنام کی فلم نا ستیلجیا فار دی کنٹری لینڈ کے نام سے ہے۔

ہندوستانی پینوراما

اس سیکشن میں ۲۴ فیچر فلمیں اور چھ غیر فیچر فلمیں دکھائی جائیں گی ان کا انتخاب کل ہند پیمانے کے دو پینلوں نے کیا ہے جن کی سربراہی ترتیب وار شری اری وام شیام شرما اور ڈاکٹر ایس کرشنا سوامی نے کی ہے۔ فیچر فلموں میں ملیالم فلم کتھا پروشن شامل ہے یہ اوور گوپال کرشنن کی فلم ہے۔ اس کا انتخاب خود بخود عمل میں آیا ہے کیوں کہ اس نے بہترین فیچر فلم کا ایوارڈ حاصل کیا ہے۔ کچھ اور فلمیں جن کا تعلق اس سیکشن سے ہے اس طرح ہیں۔ بدھا دیب داس گپتا کی "لال درجہ" رام متراکی "نین تارا" سنتوش سیوان کی "ہیلو" شیام بینیگل کی "سرداری بیگم" اور شیام بینیگل کی ایک اور فلم "دی میکنگ آف دی مہاتما"۔

سولہ غیر فیچر فلموں میں چند اہم فلمیں یہ ہیں۔ اروند سنہا کی "اجیت" دولت پال مجمدار کی "دھاتو چتر" یش چودھری کی "فلیش بیک" پرین ہزاریکا کی "ہترکینا" کے جی داس کی "کرم ویر گوری شنکر رائے" راکیش مہو کی "معمولی رام چھوٹا بڑا آدمی" کے۔ کے حیدرن کی "پیٹریٹ آف اے فلم ڈائریکٹر" شاجی این کرون کی "شام ویرتن" تبنید و چٹرجی کی "دی بلیڈنگ ان وی سن" اور کلدیپ سنہا کی "کھروا سے لیفس اسٹار کلی"۔

میں اسٹریم' کے نام سے جو سیکشن قائم کیا گیا ہے، اس میں ۱۲ ایسی فلمیں رکھی گئی ہیں جن کی ۱۹۹۶ء میں بڑی پذیرائی ہوئی ہے۔ فلم فیڈریشن آف انڈیا نے ان کو چنا ہے۔

آخری سیکشن فلم مارکٹ کے نام سے ہے جسے نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کی طرف سے میلے کے کمپلیکس میں قائم کیا جائے گا۔ اس میں ایسی جگہ ہوگی جہاں فلمیں اور ویڈیو دکھائی جائیں گی۔ فلموں کی خریداری اور ان کی فروخت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ سیکشن بہترین موقع فراہم کرے گا۔

مختلف سیکشنوں میں مختلف ملکوں کی تقریباً ۲۰۰ فلموں کو دکھا کر ہندوستان کا یہ ۲۸ واں بین اقوامی فلمی میلہ کیرالہ میں ناظرین کے لیے سینما کا بیش قیمت میلہ فراہم کرے گا۔ یہ وہ ریاست ہے جسے اچھی فلموں کا سب سے زیادہ شعور اسی طرح حاصل ہے جیسا کہ مغربی بنگال کو۔ ●

غزلیں

ڈاکٹر ایم۔ آر۔ قاسمی

کچھ دیر کناروں پہ ٹھہر شامِ شفق رنگ
دریا میں ابھی سے نہ اُتر شامِ شفق رنگ

اشجار کی حیرت رہے کچھ دیر تو قائم
اس دشت سے آہستہ گزر شامِ شفق رنگ

دریاؤں کی آغوش میں سونے کے لیے روز
آتی ہے پہاڑوں سے اُتر، شامِ شفق رنگ

پتے تری آمد سے پُراسرار ہوئے ہیں
گلشن میں ذرا دیر ٹھہر شامِ شفق رنگ

خیمہ تو لگانے کا ہنر ہے، پہ کریں کیا؟
لکھا ہے مقدر میں سفر شامِ شفق رنگ

کتب کدہ "کھجور والی مسجد گلی نمبر ۳۹/۶ جعفر آباد۔ دہلی ۵۳

ڈاکٹر سلمان عباسی

رگ رگ میں زمانے کی اتر کیوں نہیں جاتے
جب ٹوٹ گئے ہو تو بکھر کیوں نہیں جاتے

جس در پہ مقدر نے جھکایا تم کو کیا تھا
اس در پہ کبھی چھوڑ کے سر کیوں نہیں جاتے

جس راہ میں ہنگامہ ہو، شورش ہو خطر ہو
اس راہ سے خاموش گزر کیوں نہیں جاتے

لمحوں میں بدل ڈالے جو صدیوں کا مقدر
تم کام زمانے میں وہ کر کیوں نہیں جاتے

جب تم کو زمانے کی حقیقت کا پتا ہے
پھر تہہ میں سمندر کی اُتر کیوں نہیں جاتے

سلمان اسی فکر میں ہیں سارے منافق
تم تلخیٔ حالات سے ڈر کیوں نہیں جاتے

E-۳/۴۔ پیپر مل کالونی لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۶

عادل اسیر دہلوی

سحر میں جب سے پتے جھڑ رہے ہیں
نئے پنچھی بسیرا کر رہے ہیں

مٹا کر ڈالا جن کو روشنی نے
وہ زندہ اپنے سائے پر رہے ہیں

زمانہ تو ترقی کر رہا ہے
مگر ہم بھوک سے کیوں مر رہے ہیں

ہمیں کیا راس آئے فقر ایسا
مگر کیا شاد اہلِ زر رہے ہیں

اکیلا جب سے عادل ہو گیا ہوں
مرے احباب مجھ سے ڈر رہے ہیں

۳۲۱۲۔ پھاٹک تیلیاں ترکمان گیٹ دہلی ۶

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

وبائی امراض کی روک تھام کا منصوبۂ عمل

صحت و خاندانی بہبود کی مرکزی کونسل کی پانچویں کانفرنس نے محسوس کیا ہے کہ وبائی امراض کی نگرانی اور اس کی روک تھام و ردعمل کے نظام کو مزید مستحکم بنایا جانا چاہیے۔ اس کے لیے عوام الناس کی صحت کے لیے خطرہ بن جانے والی واچانک پھوٹ پڑنے والی بیماریوں کی تشخیص اور معالجے کے لیے وافر تجربہ گاہ سہولیات کی ضرورت ہے۔ کونسل نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ منصوبۂ عمل وضع کرے اور وبائی امراض کی لپیٹ میں آنے والی ریاستوں سمیت تمام ریاستوں میں روک تھام کی سرگرمیوں کی فہرست فراہم کرے تاکہ وبائی امراض سے نمٹنے کے لیے ہر جگہ مستعدی سے کام ہو سکے۔ منصوبۂ عمل کی نگرانی کا کام وزارت کے ذریعہ کیا جائے گا تاکہ اس کے نفاذ کی سختی سے نگرانی ہو سکے۔

بنیادی حفظان صحت نظام، بنیادی کم از کم خدمات کا ایک حصہ ہے۔ اس مد کے لیے ریاستوں کو مرکز کے ذریعہ خصوصی عطیہ جاتی امداد فراہم کی جانی چاہیے۔ ریاستی حکومتوں سے یہ درخواست بھی کی گئی ہے کہ وہ اپنے وسائل سے منصوبہ جاتی و غیر منصوبہ جاتی مقاصد کے لیے مزید فنڈز فراہم کرائیں۔

خصوصی مسائل کے حامل علاقوں کے لیے تقریباً ۳۴ قراردادیں پیش ہوئیں۔ کمیونٹی صحت نظام کو مستحکم بنانے کے لیے متعدد اقدامات کی نشاندہی کی گئی۔ چوں کہ متعدد اقدامات کے بعد بھی آبادی میں اضافہ ہوتا ہی جا رہا ہے لہٰذا شرح زرخیزی کو کم کرنے کے لیے گیارہ قراردادیں منظور کی گئیں۔

دیہی علاقوں میں ڈاکٹروں کی خالی اسامیاں پُر کرنے کے لیے کونسل نے فیصلہ کیا کہ ریاستیں علاقائی لا مرکزی بھرتی پالیسی شروع کر سکتی ہیں اور پوسٹ گریجویٹ کورس جوائن کرنے و رجسٹریشن سے قبل دو تین برس کی لازمی دیہی خدمت کی شرط لگا سکتی ہیں۔

دیسی طریقۂ علاج اور ہومیوپیتھی (آئی۔ایس۔ایم اینڈ ایچ) پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے اور نویں پنج سالہ منصوبے کے دوران اس شعبے کے لیے مزید فنڈز فراہم کرانے کے لیے منصوبہ بندی کمیشن سے گزارش کی گئی ہے۔ کونسل نے تعلیم، تربیت، تحقیق و ترقی ادویہ کی معیار بندی، کوالٹی کنٹرول اور خام اشیاء کی دستیابی بڑھانے کے لیے جڑی بوٹیوں کے باغیچے قائم کرنے کے ضمن میں متعدد سفارشات پیش کیں۔ ●

ریاستوں / مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لیے اناج کی تخصیص

وزارت خوراک (محکمہ وصولی و تقسیم) نے ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو سرکاری نظام تقسیم / نوتشکیل شدہ سرکاری نظام تقسیم کے تحت، مرکزی پول سے ۷۹ر۱۲ لاکھ ٹن چاول اور ۷۲ر۹ لاکھ ٹن گیہوں، برائے ماہ فروری ۱۹۹۷ء مختص کرنے کا آرڈر دیا ہے۔ گیہوں کی یہ تخصیص ریاستوں سے بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر، اعلا سطح پر کی جا رہی ہے۔ حالاں کہ گیہوں کا آرڈر بالترتیب اکتوبر۔نومبر ۱۹۹۶ء میں ۳۲ر۷ اور ۶۱ر۹ لاکھ ٹن تھا۔ اس تخصیص میں ۷۱ر۷ لاکھ ٹن اناج نوتشکیل نظام تقسیم (آر۔پی۔ڈی۔ایس) کے علاقوں کے لیے ہے۔ جنوری ۱۹۹۷ء میں ریاستوں / مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لیے چاول اور گیہوں کی تخصیص بالترتیب ۷۹ر۱۲ لاکھ ٹن اور ۱۲ر۹ لاکھ ٹن تھی۔ ●

بحری نقل و حمل کے شعبہ میں بھارت کروشیا معاہدہ

بھارت اور کروشیا دونوں ملکوں نے بحری نقل و حمل کے شعبہ میں ایک معاہدہ پر دستخط کیے ہیں۔

اس معاہدہ کے تحت دونوں ملک کے نقل و حمل کے فروغ کا اہتمام کریں گے اور معاہدہ کرنے والی پارٹیوں کے ذریعہ جہاز رانوں کو جاری کردہ دستاویزات کو تسلیم کریں گے۔ بندرگاہ پر جہاز لنگر انداز ہونے پر جہاز رانوں کو سہولت مہیا کریں گے۔ دونوں ملکوں کے درمیان بحری نقل و حمل میں جہازوں کی تعداد میں اضافہ کریں گے۔

بحری نقل و حمل پر تجاویز کی ابتدا مارچ ۱۹۹۴ء میں ہو گئی تھی اور لمبے عرصہ بحث و مباحثہ کے بعد دونوں سرکاروں کے مابین معاہدہ کو آخری شکل دے دی گئی ہے۔ معاہدہ کے تحت ایک مشترکہ کمیٹی کی تشکیل کی جائے گی۔ اس کے علاوہ بحری نقل و حمل سے متعلق دلچسپی کے دیگر امور کو بھی مدنظر رکھا جائے گا۔

باقی صفحہ ۱۶ پر

...ور ۲ آزاد ہند فوج۔ قربانی کی ایک عظیم مثال

...ے کر قائم کی گئی تھی جو قوم کی جد و جہد آزادی کے
...ایسا حصہ ادا کرنے کو بے قرار تھیں۔ اس
...ٹ نے کیپٹن لکشمی کی کمان میں ملک کی آزادی
...ڑائی میں ایک اہم رول ادا کیا جو تاریخ
...تہ ہو گیا ہے۔

...ا۔ این۔ اے میدان عمل میں

جنوری ۱۹۴۴ء میں نیتا جی نے اپنا ہیڈ کوارٹر
...میں منتقل کر لیا اور اس کے بعد جلد ہی فوجی
...روائیوں کا میدان تیار ہو گیا اور پھر آئی۔ این۔
...ملایا سے تھائی لینڈ اور برما کے راستے
...وستان کی سرحد تک پہنچ گئی اور وہ برما ہند
...رکے آکڑ سیکٹروں میں، امپھال کے میدانوں
...و ہیما کے نواحی علاقوں میں برسرِ پیکار ہو گئی۔
آئی۔ این۔ اے کی ایک ٹکڑی کرنل ایس۔
...۔ ملک کی قیادت میں ہندوستانی علاقے
...کافی اندر تک گھس آئی اور اس نے ۱۴ اپریل
...۱۹۱ء کو منی پور میں موئرنگ کے مقام پر اس
...ت کی علامت کے طور پر قومی ترنگا لہرایا کہ
...میں کا ایک ٹکڑا انگریز حکمرانوں سے آزاد
...لیا گیا ہے اس کے بعد کوہیما کے قلعہ اور دیماپور
...یمار وڈ پر ایک چھاؤنی پر قبضہ کیا گیا۔ بعد
...ں آئی۔ این۔ اے امپھال کا محاصرہ کرنے
...لیے آگے بڑھی۔ انگریز اس محاصرہ کو صرف
...میں ہی ختم کر سکے وہ اس لیے کہ ان کی افواج
...ہتھیاروں کی تعداد اور رسدات بہت
...دہ تھیں۔

...وسناک پسپائی

اس وقت تک لڑائی کا رخ آئی۔ این لیے
...خلاف ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مون سون کے
...سلا دھار بارش کا پانی اس کی صفوں میں بھر گیا
...ملیریا اور پیچش نے تباہی مچا دی۔ آئی۔ این۔
...کو پیچھے ہٹنا پڑا لیکن اس سے آئی۔ این۔ اے
...سپاہیوں یا اس کے کمانڈر کا حوصلہ پست
...یں ہوا۔ آئی این اے کی ناکامی کی افسوسناک

حقیقت برما کی سویلین آبادی کو بتاتے ہوئے
نیتا جی نے انھیں زیادہ روپیہ پیسہ اور مال
اسباب اکٹھا کرنے اور فوج میں زیادہ آدمی
بھرتی کرنے کے لیے اپنی کوششیں دوگنی کرنے
کی تلقین کی انھوں نے اعلان کیا کہ "ہم امپھال پر
پھر حملہ کریں گے"، ایک بار نہیں دس بار — ان
کی یہ پکار کہ "تم مجھے خون دو میں تمہیں آزادی
دوں گا" ایک بار پھر مشرقی ایشیا میں گونج اٹھی
اس وقت تک انگریز قریب قریب رنگون پہنچ
چکے تھے اور بھاری ہوائی حملہ کر رہے تھے۔ نیتا جی
نے اپریل میں رنگون سے اور اگست میں سنگاپور
سے پسپائی اختیار کی کیوں کہ اس وقت مشرقی
ایشیا میں جنگ ختم ہو گئی تھی۔ آئی۔ این۔ اے کو
سب سے بڑا دھکا اس وقت لگا جب نیتا جی کا
ہوائی جہاز ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو سنگاپور سے
پرواز کے دوران نیچے گر کر تباہ ہو گیا۔ یہ ان کی آخری
پرواز تھی۔ ۱۵ اگست کو انھوں نے اپنی آخری
تقریر میں اپنے سپاہیوں سے کہا تھا کہ "دہلی جانے
کے بہت سے راستے ہیں اور دہلی اب بھی
ہماری منزل مقصود ہے"۔

لال قلعہ میں مقدمے کی سماعت

انگریز آئی۔ این اے کے سپاہیوں کو گرفتار
کر کے مشرقی ایشیا سے ہندوستان لائے۔ پھر
آئی۔ این اے کے خلاف دہلی کے تاریخی لال قلعہ
میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس وقت عوام کے جوش
و خروش کی کوئی حد نہ رہی۔ آئی۔ این۔ اے کے کارناموں
پر ان کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ آئی۔ این۔ اے کے
سورماؤں کا مقدمہ لڑنے کے لیے ایک ڈیفنس کمیٹی
بنائی گئی جس میں سر تیج بہادر سپرو، بھولا بھائی
ڈیسائی اور جواہر لال جیسی سرکردہ قومی شخصیتیں شامل
تھیں۔ اگرچہ کورٹ مارشل میں آئی۔ این کے تین
افسروں شاہ نواز، سہگل اور ڈھلوں کو شہنشاہ
انگلستان کے خلاف جنگ کرنے کے سلسلے میں
مجرم قرار دیا گیا تاہم ان کے لیے عوام کے جوش و
خروش کو دیکھتے ہوئے ان کی عمر قید کی سزائیں
معاف کر دی گئیں۔
اگرچہ آئی۔ این۔ اے محاذ پر جنگ آزادی
میں فتح حاصل کرنے میں ناکام رہی تاہم اس سے
ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے خاتمہ میں
مدد ملی۔ آئی۔ این۔ اے کی حب الوطنی، شجاعت
اور قربانی کی داستان، جو آج بھی ہندوستانیوں
کے دلوں کو گرماتی ہے، ہماری جد و جہد
آزادی کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے اور
ہمیشہ رہے گا۔ ●

بقیہ: اسہال اطفال

یہ مقدار خوراک یک سالہ بچہ کے لیے
کافی ہے۔
جگر کی حرارت اور کثرت سودا کی صورت میں
نسخہ ذیل پلائیں۔
(نسخہ) شیرہ تخم خرفہ سیاہ، شیرہ تخم کاہو
ہر ایک ۲۔۳ گرام عرق گاؤزبان ۱۲۵ ملی لیٹر میں
پیس کر چھان کر شربت انار ۲۵ ملی لیٹر ملا کر صبح
و شام پلائیں۔
(نوٹ: یہ بڑوں کی تعداد خوراک ہے بچوں کی خوراک ان
کی عمر کے لحاظ سے متعین ہو گی۔ نسخوں کے استعمال سے پہلے
کسی مستند حکیم سے رجوع کر لیں۔)
(نسخہ) کلی انار ۳ عدد، مازو مقشر ۲ گرام،
سوت زرد ۲ گرام، برگ مورد ۱ گرام، زیرہ سفید
۲ گرام، زرد چوب ۲ گرام، برگ نیم ۲ گرام۔
جملہ دوائیں باریک پیس کر مونگ کے برابر
گولیاں بنائیں۔
مقدار خوراک: ایک گولی ماں کے دودھ
میں گھس کر چٹائیں۔ ●

بقیہ: آبادی کے مسئلے سے نمٹنے کا عمل

بچوں کا جوانی میں قدم رکھنا خاص طور سے مفید
ثابت ہو سکتا ہے"۔
اس وقت رجحانات میں تبدیلی انتہائی
ضروری ہے جس سے کہ سوسائٹی کی مردانہ عصبیت
پر سوالیہ نشان لگایا جا سکے اور محفوظ سیکس
اور مانع حمل کے وسیع تر استعمال میں مردوں
اور عورتوں کو برابر کا شریک اور حصہ دار
بنایا جا سکے۔ ●

RGD. NO. D(DN) 204
N. 27032/81
VOL-16 NO 11-12
YOJANA (URDU)
LICENSED U (DN)
PREPAYMENT AT NDPSO, NEW DELHI
FEBRUARY-MARCH 1997

PUBLISHED BY THE DIRECTOR PUBLICATIONS DIVISION PATIALA HOUSE NEW DELHI-110001
Printed at Bengal Offset Works, 335, Khajoor Road, Karol Bagh, Delhi-5.